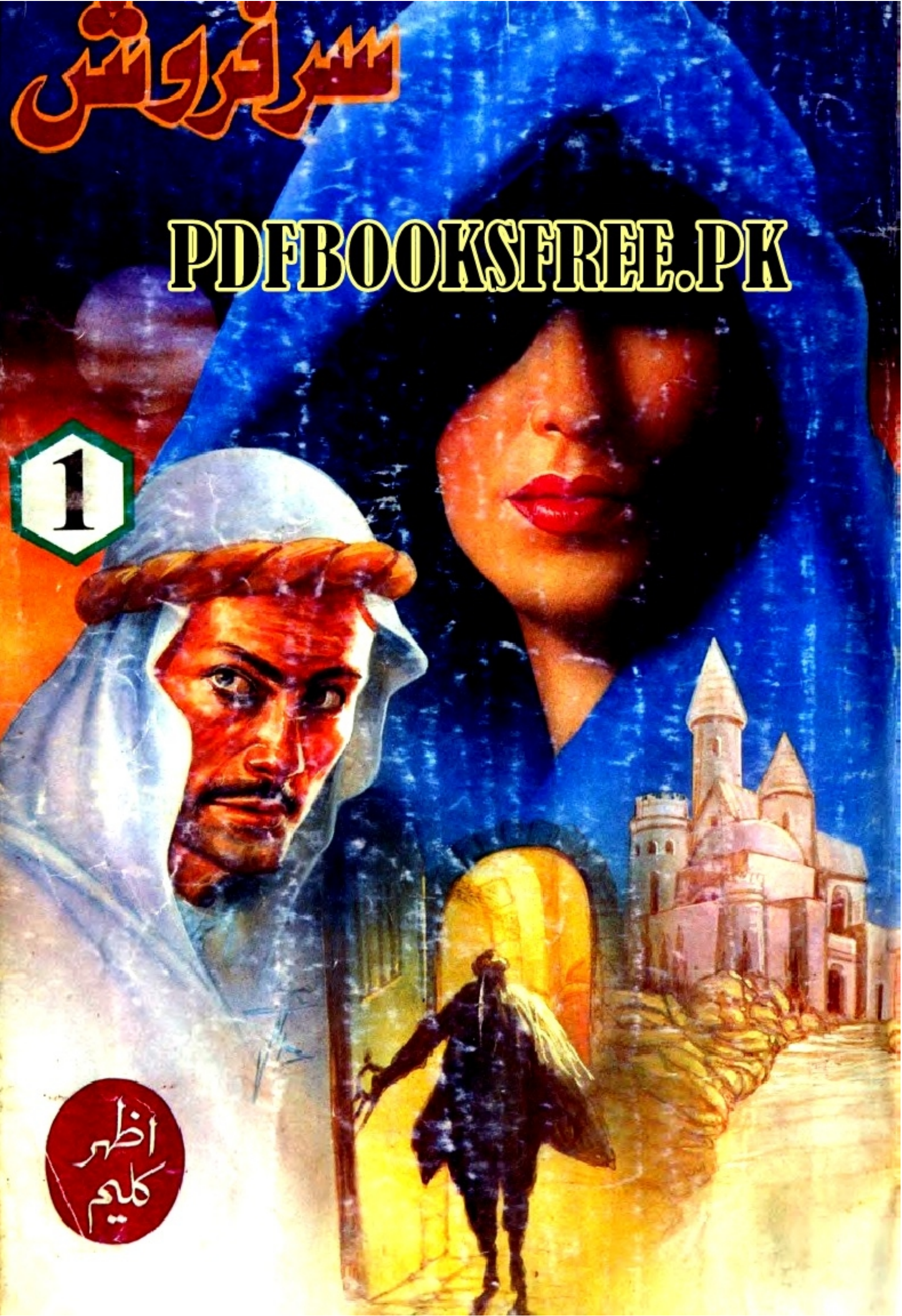


سرفروش
PDFBOOKSFREE.PK
1
اظہر
کلیم

دوڑتے دوڑتے میرے برہنہ تلووں میں آبلے پڑ گئے۔ اب تو شاید یہ آبلے پھٹ کر رسنے بھی لگے تھے لیکن میں تکلیف کی پروا کیے بغیر پاگلوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ یہ زندگی کی طرف ایک ایسی دوڑ تھی جس میں موت کا سایہ میرا حریف تھا۔ تقدیر اس دوڑ کو جتنا طول چاہتی، دے سکتی تھی اور اسے مختصر کرنا بھی اسی کے ہاتھ میں تھا لیکن اس دوڑ کو جیتنے کی میری کوشش، آخری سانس کے ساتھ ہی دم توڑنا چاہتی تھی کہ میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

میرے گلے میں محاورے والے نہیں بلکہ حقیقی کانٹے اُگ آئے تھے۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا۔ آتی جاتی سانس سے میرے پھیپھڑوں میں ایک عجیب سی چبھن ہونے لگی تھی۔ زخمی پیر جب کنکریوں پر پڑتے تو جسم کے ساتھ ساتھ میری رُوح بھی کانپ جاتی اور یوں لگتا جیسے میں دہکتے ہوئے انگاروں پر دوڑ رہا ہوں۔

بیڑیوں کی وجہ سے دوڑنے میں کافی دُشواری ہو رہی تھی اور میں کئی بار مُنہ کے بل بھی گر چکا تھا۔ چہرہ بچانے کی کوشش میں میری ہتھیلیاں زخمی ہو گئی تھیں اور ماتھا، آہنی ہتھکڑیوں سے ٹکرا کر خون کے چھینٹے اُڑانے لگا تھا۔ خون کی یہ بوندیں میری آنکھوں میں گر گر کر رُخساروں پر لڑھکتی ہوئی، میری باچھوں تک پہنچ رہی تھیں اور میں اپنے ہی خون کا ذائقہ محسوس کر رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میری ٹانگیں بھی شل ہو گئی تھیں اور بیڑیوں کی وجہ سے میرے ٹخنے زخمی ہو کر ناکارہ ہوتے جا رہے تھے لیکن میں اس وقت تک نہ رُکا، جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو گیا کہ میں بہت دُور نکل آیا ہوں اور کوئی میرا تعاقب بھی نہیں کر رہا ہے۔

میں رُک گیا اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔

دُور... بہت دُور دُھوئیں کا ایک مرغولہ فضا میں معلق، کوئی آسیب نظر آ رہا تھا۔ اس کے نچلے حصّے میں شعلوں کی سُرخی نظر آ رہی تھی۔ جیل کی جس گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا، وہ ابھی تک جل رہی تھی۔ غالباً اس کا پیٹرول ٹینک پھٹ چکا تھا لیکن اندھا دُھند دوڑنے اور فاصلے کی وجہ سے میں یہ دھماکا سُننے سے قاصر رہا تھا۔ حادثات ہوتے ہیں تو لوگ عموماً مر جاتے ہیں لیکن مجھے جو حادثہ پیش آیا، اس کی وجہ سے مجھے زندگی مل گئی تھی۔ اگر اس گاڑی کو حادثہ پیش نہ آتا تو میں اپنی موت کی آخری ہچکی کا وقت بڑے وثوق سے بتا سکتا تھا... لیکن مجھے زندگی مل گئی تھی... ایک بالکل ہی نئی زندگی... یہ الگ بات ہے کہ اس زندگی کو موت کی نظر لگی ہوئی تھی اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے ہر انسانی نگاہ سے چھپا کر رکھنا چاہیے تھا۔

اُف کتنے بھیانک تھے، وہ لمحات!

عدالت نے مجھے ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں سزائے موت سُنا دی تھی اور مجھے قیدیوں کی مخصوص گاڑی میں واپس جیل لے جایا جا رہا تھا۔ اس گاڑی میں میرے اور ڈرائیور کے علاوہ صرف دو محافظ تھے۔ ایک مسلح محافظ اگلے حصّے میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا جب کہ عقبی حصّے میں، میرے دائیں بائیں، منکر نکیر کی طرح دو سرکاری فرشتے براجمان تھے۔ جیل کے راستے میں دس بارہ میل کا ایک ویرانہ تھا۔ اس ویرانے میں چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے کئی سلسلے تھے اور یہاں دُور دُور تک کوئی عمارت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جیل گاڑی جیسے ہی اس علاقے کی سنسان سڑک پر پہنچی... مخالف سمت سے آنے والی ایک گاڑی سے ٹکرا گئی۔ حادثہ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ یہ بھی سمجھ میں نہ آ سکا کہ کیا ہوا ہے؟ میں

زندہ بھی ہوں یا نہیں؟ غالباً میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ذہنی غفلت زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ میری آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں لیکن اپنے زندہ ہونے کا یقین نہیں آ رہا تھا... اور جب میں نے ملبے میں پڑے ہوئے دو باوردی سپاہی دیکھے اور انھیں بے حس و حرکت پایا تو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ موت میرا بوسہ لیے بغیر ہی رخصت ہوگئی ہے۔

تصادم کی وجہ سے عقبی حصے کا دروازہ کھل گیا اور میں دھچکا لگنے کے باعث سڑک کے کنارے جاگرا۔ سڑک کے کنارے پاؤڈر جیسی نرم نرم دھول تھی جس نے میرے جسم کو کسی شدید ضرب لگنے سے پہلے ہی اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔ جسم و جاں کو سلامت پایا تو حواس تیزی سے قابو میں آگئے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پہلی بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ شاید میری کوشش بارآور ثابت ہوئی تھی۔

سڑک کے کنارے کھڑے کھڑے میں نے متصادم گاڑیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے میں دھنس کر رہ گئی تھیں۔ درمیانی حصے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اس کی کثافت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ عقبی حصے کے دونوں محافظ مردہ تھے اور ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان آدمیوں کے بارے میں کچھ کہنا اس لیے ممکن نہ تھا کہ میری آنکھیں انھیں ملبے میں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ یہ حادثہ ایک ایسے قیدی کے لیے یقیناً روح افزا تھا جسے تین روز بعد علی الصباح سزائے موت دی جانے والی تھی۔ میں نے عقب میں اور سامنے دیکھا۔ دونوں طرف حدِ نگاہ تک سڑک خالی تھی۔ کار تو درکنار، کسی آدمی کا ہیولہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک طرف دوڑنا شروع کردیا۔ اس سے پہلے کہ حادثے کی خبر قانون کے کانوں تک پہنچتی، میں اس مقام سے دور نکل جانا چاہتا تھا... اتنی دور جہاں میری گردن پر مسلط کی ہوئی جبری موت کا سایہ بھی مجھ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

دوڑتے دوڑتے مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔

میری سماعت سے کسی گاڑی کی آواز ٹکرانے لگی تھی۔

پلٹ کر دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر میرے تعاقب میں چلا آ رہا ہو... اور اگر میں کسی محفوظ جگہ پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس کی لہریں مجھے نگل لیں گی۔ ایک سرکاری جیپ اچھلتی کودتی میری طرف چلی آ رہی تھی۔ میں ایک بار پھر دوڑنے لگا۔ اس مرتبہ میں یوں دوڑا تھا جیسے میرے پیروں کے نیچے پر لگ گئے ہوں۔ موت کا خوف مجھے اڑائے لیے جا رہا تھا۔

دفعتاً نشیب میں مجھے ایک عمارت دکھائی دی۔

عمارت کے گرد خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ میں جب اس باڑ کے قریب پہنچا تو ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ جیپ نظر تو نہیں آ رہی تھی البتہ میں اس کی آواز ضرور سن سکتا تھا... لیکن میری نگاہ اگلے ہی لمحے تاروں پر جھولتی ہوئی ایک تختی پر جم کر رہ گئی جس کی تحریر کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

"اس باڑ سے گزرنے والے کی واپسی ناممکن ہے۔
چاہے وہ کسی بھی عہدے یا شخصیت کا مالک
کیوں نہ ہو۔ سرکاری و غیر سرکاری، ہر شخص اس
عمارت سے دور رہے ورنہ اس کی زندگی کی کوئی
ضمانت نہیں دی جاسکتی۔"

میں ہانپ کر رہ گیا۔ ایک مصیبت سے نکلا تھا تو دوسری مصیبت سامنے آگئی تھی۔ یہاں سے آگے بڑھنا خود کو قانون کے حوالے کرنے کے مترادف تھا جب کہ باڑ کو پار کرنا بھی موت کی علامت بن سکتا تھا... لیکن یہ ایک غیر یقینی موت تھی اس لیے میں نے اس کو قبول کرلینا گوارا کرلیا اور تاروں میں گھستا چلا گیا۔ تاروں میں گھستے ہی مجھے یوں لگا جیسے جسم و جان کا رشتہ اچانک ہی منقطع ہوگیا ہو۔

میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

★★

میری آنکھیں دیر سے کھلی ہوئی تھیں لیکن چشمِ ہوش کو ابھی بینائی میسر نہیں آئی تھی۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور ٹیسیں، میری ہستی کو ہلکان کیے دے رہی تھیں۔ میں نے کراہ کر کروٹ لینے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ میں جسم کو حرکت دینے کی خواہش تو کرسکتا ہوں، اسے حرکت نہیں دے سکتا۔ میرا جسم بندھا ہوا تھا لیکن کوئی بندش دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے میرے پٹھے اکڑ کر ناکارہ ہوگئے ہوں... لیکن میں اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ اتنی بھاگ دوڑ کی وجہ سے یوں بے جان ہوکر رہ جاتا۔ یقیناً کوئی اور ہی بات تھی۔

میں اپنی آنکھوں کو جہاں تک حرکت دے سکتا تھا، انھیں متحرک کرکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرے جسم پر نیلی نیلی روشنی کی لہریں پڑ رہی ہیں۔ غالباً ان روشن لہروں نے ہی میری توانائی سلب کر رکھی تھی۔ اس نیلی روشنی کے پار مجھے ایک چہرہ دکھائی دینے لگا جس کے خدوخال ساکت تھے اور جس پر سجی ہوئی چشمے کے

شیشوں کی اوٹ میں، دو غیر متحرک آنکھیں مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں۔

"آقائے سرفروش!" اچانک اسی چہرے کے ہونٹوں نے حرکت کی اور بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "تم اس وقت جن شعاعوں کی زد میں ہو، ان سے نکل جانا انسانی طاقت سے بعید ہے۔"

"اوہ! تو یہ شخص میرا نام بھی جانتا ہے۔" میں نے سوچا اور اس سے بات کرنے کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔

"ٹھہرو..." اس شخص نے کہا اور اس مشین کا رخ پھیرنے لگا جس سے منتشر ہونے والی شعاعوں نے مجھے حصار میں لے رکھا تھا۔ مشین سے نکلنے والی شعاعیں میرے چہرے سے ہٹ گئیں اور سینے سے پیروں تک میں نیلی نیلی روشنی میں نہایا رہا۔ گویا اس نے سر اور گردن ان پراسرار شعاعوں کے اثر سے نکال دی تھی۔ "اب تم بات کرسکتے ہو۔" اسی شخص کی آواز سنائی دی۔

"تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ دیر قبل ریڈیو پر جیل کی گاڑی کو پیش آنے والے حادثے کی خبر نشر ہوچکی ہے اور تمھارے متعلق مجھے سب کچھ معلوم ہوچکا ہے۔"

"پھر تم نے ابھی تک مجھے قانون کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"

"شاید تم نے تاروں میں گھسنے سے پہلے باہر لکھی تنبیہ نہیں پڑھی تھی۔" اس شخص نے کہا۔ "یہاں صرف شہنشاہ اور تین سائنس دانوں کی آزادانہ آمد و رفت ہے۔ ان کے علاوہ کوئی بھی شخص زندہ باہر نہیں جاسکتا۔"

"تو پھر میں اب تک کیسے زندہ ہوں؟"

"تم جب تک اس عمارت میں ہو، زندہ ہو۔ اس سے باہر جاتے ہی تمھارے جسم و جان کا رشتہ ختم کردیا جائے گا۔" اس شخص نے خوف ناک لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ میں نے تمھارے بارے میں خصوصی معلومات حاصل کرکے خاص اجازت نامہ طلب کیا ہے۔ اگر شہنشاہ نے میری درخواست منظور کرلی تو میں تمھارے سامنے ایک تجویز رکھوں گا جسے قبول یا رد کرنا تمھارا کام ہوگا۔ اس کے بعد ہی تمھارے مقدر کا کوئی فیصلہ ہوگا۔"

"کیا میں تمھارے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "اور میں اس پراسرار عمارت کے متعلق بھی جاننے کے لیے بے چین ہوں۔"

"جب تک اوپر سے واضح ہدایات نہیں آجاتیں تمھیں کچھ نہیں بتایا جاسکتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مشین کا رخ بدل کر میرے چہرے کو بھی نیلی روشنی کے حصار میں دے دیا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ عجیب روشنی تھی۔ آنکھوں کے علاوہ میں جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا... سوچیں بھی منجمد نہیں تھیں اس لیے میں اپنے مقدر کا فیصلہ سننے کے انتظار میں کسی لاش کی طرح بے حس و حرکت لیٹا سوچتا رہا... لیکن میں واضح طور پر کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ نیند کی گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد پھر میری آنکھ کھلی۔

اس بار میرے قریب چار آدمی کھڑے تھے۔ ان میں ایک وہی تھا جس نے پہلی دفعہ ہوش میں آنے پر مجھ سے بات چیت کی تھی۔ میرے سینے سے پیروں تک نیلی روشنی کا حصار تھا لیکن گردن آزاد تھی۔ میں نے باری باری ان چاروں کی طرف دیکھا۔

"میرا نام ڈاکٹر فریدان ہے۔" مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "آقائے سرفروش! تمھارے بارے میں شہنشاہ کے احکامات آچکے ہیں اور اب میں وہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں، جسے قبول کرنا یا رد کرنا تمھارے اپنے اختیار میں ہے۔ اس سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلو کہ تم ایک مردہ آدمی ہو۔ تمھاری موت کا وقت طے ہوچکا ہے۔ تجویز رد کرنے کی صورت میں تمھیں یہیں سزائے موت دے دی جائے گی اور اس طرح قانون کا وہ تقاضا بھی پورا ہوجائے گا جس سے تم اپنی دانست میں، فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔"

"ڈاکٹر فریدان..." میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ "میں نہیں جانتا یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں کیا ہو رہا ہے البتہ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں بے گناہ ہوں، میں نے قتل نہیں کیا۔ میرے خلاف ایک سازش کی گئی تھی۔ اگر مجھے مہلت دی جاتی تو میں یقیناً اپنی بے گناہی ثابت کردیتا۔ بہرحال، تم لوگوں نے بھی شاید میرے متعلق تحقیقات کی ہیں، ان سے تمھیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں ایک انسان دوست اور کھرا آدمی ہوں۔"

"بے شک! لیکن واقعاتی شہادتیں تمھارے خلاف ہیں۔" ڈاکٹر فریدان نے کہا۔ "بہرحال، یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تم ایک بے جگر، مضبوط اور غیر معمولی آدمی ہو اس لیے میں نے تمھارا وجود اپنے تجربے میں استعمال کرنے کی اجازت حاصل کرلی ہے۔ اگر تمھیں بخوشی منظور ہو تو تیار ہوجاؤ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اس تجربے میں تمھارے زندہ بچ جانے کی امید صرف ایک فی صد ہے۔"

"ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔" ڈاکٹر فریدون!" میں نے تلخی سے ہنس کر کہا۔ "ننانوے فی صد موت میں سے ایک فی صد زندگی بچ گئی تو میں اسے بھی بہت سمجھوں گا۔ وہ تجربہ کیا ہے؟"

"تمھیں کمپیوٹر میں ڈال کر ماضی کے سفر پر روانہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تمہارا وجود تحلیل ہو جائے گا اور ماضی میں کہیں جا کر دوبارہ مجسم ہو جائے گا۔"

"ایک فی صد یا سو فی صد؟"

ڈاکٹر فریدون ہنس پڑا۔ اُس کی آنکھوں میں میرے لیے تعریفی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے داد طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جنھوں نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کر دی۔ گویا ڈاکٹر فریدون نے تنہائی میں انھیں۔۔۔ کہا تھا، وہ تینوں اس سے متفق ہو گئے تھے۔ یہ غالباً وہی تینوں سائنس دان تھے جن کا ڈاکٹر فریدون نے پہلے مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔

"اس سلسلے میں کوئی بھی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔۔۔" ڈاکٹر فریدون نے میری طرف متوجہ ہوتے ہُوئے کہا۔ "تم پہلے جان دار ہو جو اس کمپیوٹر میں سفر کرو گے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر فریدون نے کمپیوٹر کے تجربات اور ان کے نتائج پر ایک طویل بات چیت کی جسے میں خاموش لیٹا سُنتا رہا تھا۔ جب ہر بات مجھ پر واضح ہو گئی تو میں نے ایک لمحے کے لیے بھی سوچنا گوارا نہ کیا۔ موت سامنے ہو اور فرار کا کوئی راستہ نہ ہو تو لائحہ عمل ترتیب دینے کی کوئی گنجائش بھی تو نہیں ہوتی۔ بہرکیف، مجھے حیرت ضرور تھی کہ آخر ڈاکٹر فریدون میری رضامندی کیوں چاہتا ہے۔ گیند اس کے کورٹ میں تھی اور وہ اس سے اپنی مرضی کے مطابق کھیل سکتا تھا۔۔۔ لیکن میں نے اس سلسلے میں یا کسی بھی سلسلے میں کوئی سوال کرنے کی بجائے ٹھوس لہجے میں کہا: "ڈاکٹر فریدون! تم ایک عظیم آدمی ہو۔ میں تمھارے انداز اور باتوں سے تمھاری شخصیت کا اندازہ لگا چکا ہُوں۔ میں تمھارے تجربے کے لیے تیار ہُوں۔ اگر زندہ رہا تو انشاءاللہ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔۔۔ اور اگر مر گیا تو اس حسرت سے، مجھے ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں سزائے موت دی گئی ہے۔"

ڈاکٹر فریدون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے تینوں ساتھیوں نے عجیب وضع کے ریوالور نکال لیے اور ڈاکٹر نے نیلی روشنی کی مشین بند کر دی۔ لمحوں میں میرا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا اور تب پہلی بار مجھے احساس ہُوا کہ میرے جسم پر لباس نام

کی کوئی بھی چیز نہیں ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ محسوس کر کے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ میرے جسم پر زخم کا ہلکا سا بھی نشان موجود نہیں ہے۔ تھکن کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ مجھے ریوالور کی نال پر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں اَن گنت مشینیں تھیں اور بے شمار بلب جلنے بجھنے میں مصروف تھے لیکن وہاں ایک بھی آدمی موجود نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا کام کسی خودکار نظام کے تحت ہو رہا ہو۔

مجھے ایک آرام دہ کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔

مَیں بیٹھ گیا تو میرے ہاتھ پیر بالکل اسی انداز میں شکنجوں سے کَس دیے گئے جیسے سزائے موت کی کُرسی پر بیٹھے ہُوئے مجرم کو بے بس کر دیا جاتا ہے۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیل گاڑی سے فرار ہونے سے پہلے اور بعد کی بہت سی باتیں، بہت سی اُلجھنیں میرے ذہن میں سر اُبھار رہی تھیں لیکن میں سب کو نظر انداز کر کے آنکھیں بند کیے کُرسی پر نیم دراز پڑا رہا حتیٰ کہ میرا جسم یکایک سرد پڑنے لگا اور پھر ٹھٹھری ہُوئی یہ حالت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ تب میں نے قلب و ذہن کو گرمانے والی ایک ہستی کا پیکر اپنے تخیل میں اجاگر کر لیا۔ وہ میری دھڑکنوں سے بھی زیادہ قریب تھی لیکن میں اپنی ہستی کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کے لیے مجبور تھا۔۔۔ اور میری ہستی، اس عزیز از جان ہستی سے دُور ہوتی چلی گئی۔ مجھے اپنا وجود ذرات میں ڈھلتا محسوس ہونے لگا اور پھر نہ جانے کب میں ہوش و خرد کی فضاؤں سے نکل کر بے ہوشی کے سمندر میں تہ نشین ہوتا چلا گیا۔

★★

مجھے ہوش آیا تو شام کا پہلا ستارہ نمودار ہو چکا تھا۔ درد کی ہلکی ہلکی لہریں ابھی تک میرے دماغ میں دوڑ رہی تھیں۔ دفعتاً مجھے احساس ہُوا کہ میں ایک انجانی دُنیا میں موجود ہُوں۔۔۔ مَیں مخملیں گھاس کی دبیز چادر پر پڑا ہُوا تھا۔ میرے چاروں طرف کیڑوں مکوڑوں اور جھینگروں کی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی اور کہیں دُور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ قریب ہی ایک چشمہ رل ترل کی آواز کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ مَیں نے آنکھیں کھول دیں، ڈوبتے سورج کی سُرخ ٹکیہ لمحہ بہ لمحہ تحلیل ہو رہی تھی۔

دفعتاً قریب ہی ایک سایہ سا لہراتا محسوس ہُوا اور اس کے ساتھ ہی ٹھنڈے پانی کی دھار میرے چہرے کو تر کر گئی۔

سرد پانی کی کاٹ نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ مَیں غصّے اور صدمے سے جھلّایا ہُوا اُٹھ بیٹھا۔ اُسی لمحے میری سماعت سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔

"اب ٹھیک ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم مُردہ نہیں ہو۔ دیکھو! اَب تم فوراً میری مدد کرو۔ مَیں شہزادی تاشیہ تمھیں حُکم دیتی ہُوں۔"

مَیں آنکھوں سے پانی صاف کرنے لگا۔

مطمئن تھا کہ مَیں زندہ ہُوں اور میری زندگی اس تجربے کے بھینٹ نہیں چڑھی۔ جس میں ننانوے فی صد موت کی توقع تھی۔

یکایک وہی نسوانی آواز دوبارہ سُنائی دی۔

میں خیالوں کی دُنیا سے نکل کر حقیقت کی دُنیا میں آ گیا۔

"جلدی کرو۔" لڑکی نے بے چین آواز میں کہا۔ "اور یہ گنواروں کی طرح آنکھیں ملنا بند کرو۔ وہ قریب آتے جا رہے ہیں۔ اگر انھوں نے ہمیں تلاش کر لیا تو مار ہی ڈالیں گے اور میں ایک قیدی کی حیثیت سے ملکہ زُوبا کے سامنے جانے کی بجائے مرنا ہی پسند کروں گی۔"

حواس ٹھکانے آتے ہی مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میرے جسم پر لباس نام کی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ اس چیز سے تو مجھے کمپیوٹر میں ڈالنے سے پہلے ہی محروم کر دیا گیا تھا۔ اچانک وہی نسوانی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"لو، اسے پکڑو۔ فرار ہونے کے لیے مجھے ایک نگراں کو ہلاک کرنا پڑا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا خون تھا شاید اسی لیے مجھے دُشمن کو ہلاک کر کے کوئی لطف نہیں آیا۔ تم کوئی جاں باز دکھائی دیتے ہو، لہٰذا اس ہتھیار کا استعمال بھی جانتے ہو گے۔ سُنو، سُنو، وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔"

میں نے آواز کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک نوخیز اور بے حد دلکش لڑکی تھی۔ سُرخی مائل بھورے بال اس کی کمر تک آئے ہُوئے تھے جنھیں اس نے ایک طلائی چھلّے سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے جسم پر گہرے رنگ کا ریشمی لباس تھا، جس سے صحیح معنوں میں پردہ داری نہیں ہو رہی تھی۔ نازک کمر سے بندھی ہُوئی کانسی کی پیٹی سے سینگ کی بنی ہُوئی چھاگل جھُول رہی تھی۔ غالباً اسی چھاگل سے میرے چہرے پر پانی ڈالا گیا تھا۔ لڑکی کے پیروں میں چمڑے کی خوش نُما چپل تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے مجھے گھُور رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں حیرت یا حجاب نہیں ہے۔ اس کا انداز تحکمانہ تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں بھاری تلوار دبی ہُوئی تھی جس کی دھار پر خشک خون کے دھبّے نظر آ رہے تھے۔

معاً میں چند آوازیں سُن کر چونک پڑا۔ لڑکی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ کہیں قریب ہی کتے بھونک رہے تھے اور اُن کے ساتھ ہی کچھ لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ اُن آوازوں کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ آوازیں مغرب میں پھیلی ہُوئی سرسبز پہاڑیوں کے عقب سے آ رہی تھیں، جہاں میں اور لڑکی کھڑے تھے، وہ ایک چھوٹی سی وادی تھی۔ قریب سے ایک چشمہ اٹھکھیلیاں کرتا ہُوا گزرتا تھا اور اس کے ساتھ بلوط کا گھنا اور بلند و بالا جنگل دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔

میں نے فی الفور فیصلہ کیا اور لڑکی کے ہاتھ سے تلوار لے لی۔

مجھے شکار کرنے اور شکار ہونے کا بڑا وسیع تجربہ تھا... آخر میں مارشل آرٹس کا ماسٹر تھا اور فنونِ حرب سیکھنے کے بعد مجھے بڑے ہی سنگین حالات سے گزرنا پڑا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ مزید کچھ سوچنے اور غور کرنے کا وقت نہیں رہا۔ آوازیں اب زیادہ سے زیادہ چوتھائی میل کے فاصلے پر رہ گئی ہوں گی۔ میں نے تلوار تولتے ہُوئے کہا "تم نے کہا تھا کہ تم کوئی شہزادی ہو؟"

"تمھیں اس میں کوئی شبہ ہے؟" لڑکی کی بھُوری آنکھیں ناگواری سے سکڑ گئیں۔

میں غیر ارادی طور پر، غالباً مضحکہ اُڑانے کے لیے اس کے آگے ذرا سا جھُکا اور تلوار کو سلامی کے انداز میں اُٹھاتے ہُوئے کہا "میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ تمھارے شہزادی ہونے میں کوئی شبہ ہے بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ صورتِ حال میری عقل میں نہیں آئی۔ یہ تمام باتیں مجھے بے حد عجیب لگ رہی ہیں کیوں کہ میں اس سرزمین پر اجنبی ہوں۔"

وہ تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لینے لگی "ہاں، میں بھی یہی محسوس کر رہی ہوں۔" اس بار اس کا لہجہ نرم تھا "میں نے احباز میں تم جیسا آدمی پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن تم کوئی بھی ہو، فی الحال تمھیں میرے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔ میں احباز کے بادشاہ کی بیٹی تاشیہ تمھیں حکم دیتی ہُوں کہ میری مدد کرو۔ میں خطرے میں ہوں۔ اگر تم نے میری مدد کی تو میں غور کروں گی کہ تمھیں کیا انعام دیا جا سکتا ہے۔ یقین کرو، احباز کا بادشاہ انعام و اکرام دینے میں بے حد فراخ دل ہے۔ اب تم احمقوں کی طرح مجھے گھُورنا بند کرو اور یہاں سے نکل چلنے کی فکر کرو، ورنہ میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

میں نے ایک بار پھر تلوار کو سلامی کے انداز میں حرکت دی اور مسکراتے ہُوئے کہا "میں، تمھارے ہر حکم کی تعمیل کروں گا... شہزادی تاشیہ! میں تمھارا سچا خادم ہُوں لیکن تم مجھ سے کس قسم کی خدمت لینا چاہتی ہو، فی الحال تو کوئی خطرہ نہیں۔ اگر تم خود کو دُشمنوں کے نرغے میں محسوس کرتی ہو تو وہ ابھی کافی دُور ہیں۔"

لڑکی کے خوب صُورت لبوں پر دلکش مُسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ وہ بھرپُور نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی۔ "نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ تمھارا تعلق کسی نیچ ذات سے نہیں ہے۔ تمھارا تعلق طبقۂ اشراف سے معلوم ہوتا ہے۔ تم کسی دوسری سرزمین سے آئے ہو، جو یہاں سے بہت دُور ہے۔ تمھارا نام کیا ہے؟" نام پوچھتے ہُوئے اس کا لہجہ ایک بار پھر تحکمانہ ہو گیا۔

"میرا نام سرفروش ہے اور سرفروشی ہی میرا پیشہ ہے۔ میں جس سرزمین سے آیا ہوں، وہاں بھی انسان ہی بستے ہیں لیکن وہاں کا انسان بے حد ترقی یافتہ ہے۔ وہاں تلوار جیسے ہتھیار متروک ہو چکے ہیں۔"

"ترقی یافتہ!" اس نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا اور اس کی انگشتِ شہادت تیر کی طرح میری طرف اُٹھ گئی "اتنے ترقی یافتہ کہ تمھیں لباس تک میسّر نہیں!"

"یہ ایک ضمنی بات ہے جس کی وضاحت میں پھر کسی وقت کروں گا۔" میں نے کھسیا کر کہا۔

"تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟" شہزادی تاشیہ نے پوچھا۔

"سرفروش۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مُسکرا کر بولی "عجیب سا نام ہے... لیکن اچھا لگتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم آسانی سے میری زبان سمجھ سکتے ہو اور تمھاری باتیں بھی میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔"

"ہاں... اس پر میں بھی حیران ہُوں لیکن شاید یہ ڈاکٹر فریدون کے کمپیوٹر کا کمال ہے۔" میں نے وضاحت کی "تم وہ فارسی بول رہی ہو جو میرے لیے قدیم ہے۔"

وہ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے میں نے اس بار کوئی ناقابلِ فہم بات کہہ دی ہو "سار... فروش!" اس نے زیرِ لب کہا۔ غالباً وہ ابھی تک میرے نام ہی میں اُلجھی ہُوئی تھی... پھر اُس نے سر جھٹکتے ہُوئے کہا "ہُرمزد کی قسم! یہ بڑا ہی عجیب نام ہے میری تو زبان پر ہی نہیں چڑھ رہا ہے۔ خیر، ہم ان تمام باتوں کے بارے میں بعد میں بات کریں گے، فی الحال میں، تمھیں حکم دیتی ہوں کہ میرے عم زاد، شاہ یوطا با کے شہر تک میری محافظت کرو۔ اس شہر کا نام عکران ہے اور کہیں قرب و جوار ہی میں واقع ہے۔"

"یہ شہر کہیں قرب و جوار میں واقع ہے۔ یعنی خود تمھیں بھی ٹھیک سے نہیں معلوم کہ شہر کس طرف ہے۔ بہت خوب... اور تم چاہتی ہو کہ ایک ایسا آدمی تمھاری رہنمائی کرے جو بذاتِ خود اس سرزمین پر اجنبی ہے۔" میں نے طنزیہ کہا "واقعی یہ تو شہزادیوں جیسی ہی ایک بات ہے۔"

"ایک راستہ اس شہر تک جاتا ہے..." وہ غصّے سے بولی۔

"یقیناً، کوئی نہ کوئی راستہ تو اس شہر تک ضرور جاتا ہو گا، ورنہ لوگ وہاں کیسے آتے جاتے ہوں گے۔" مجھے اب اس لڑکی سے چھیڑ چھاڑ میں لُطف آنے لگا تھا "گویا ہمیں وہ راستہ تلاش کرنا ہے ورنہ ہم زندگی بھر اِدھر اُدھر ہی بھٹکتے رہیں گے۔"

لڑکی نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ اچانک سامنے جنگل سے ایک کُتا تیر کی مانند برآمد ہُوا۔ وہ اپنے گروہ سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے سُرخی جھلک رہی تھی اور تھوتھنی سے جھاگ چھُوٹ رہا تھا۔ اس کے تیوروں میں ہلاکت آفرینی تھی۔ غالباً اُسے اسی مقصد کے لیے سُدھایا گیا تھا... بال کھڑے کیے اور حلق سے غرّاہٹیں بلند کرتے ہُوئے اس عفریت نما کُتّے نے ہماری طرف چھلانگ لگائی۔

میں جلدی سے لڑکی کے سامنے آ گیا... اور فوراً ہی اس کی کمر سے سینگ کی نوک دار چھاگل ایک جھٹکے سے الگ کر کے بائیں ہاتھ میں لے لی اور سرگوشی کی۔

"میرے پیچھے ہی رہنا، بالکل خاموش اور ساکت۔" میرے لہجے میں دبا دبا سا جوش و خروش تھا۔

اُس بپھرے ہُوئے درندے نے کوئی دس قدم کے فاصلے سے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اس کے بھاری جبڑے کھُلے ہُوئے تھے۔ بے رحم اور خون آشام دانت ڈوبتے سُورج کی سُرخی میں چمک رہے تھے۔ میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور ذرا آگے کو جھُک آیا۔ کُتا جبڑے پھیلائے، سیدھا میرے حلق پر آ رہا تھا۔ قریب سے پتہ چلا، اس کی جسامت کسی چھوٹے ٹٹو سے کم نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے جسم پر گرتا اور اس کے دانت میرے حلق میں پیوست ہوتے، میں نے بایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور خود کو ایک طرف ہٹاتے ہُوئے اس کے جسم کو نوک دار سینگ پر روک لیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میں نے دائیں ہاتھ سے تلوار اس کے پیٹ میں گھسیڑ کر دو تین جھٹکے دے دیے۔

کتّے کا بھاری جسم زوردار آواز کے ساتھ زمین پر گرا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ پھُوٹ پڑا اور جسم جان کنی کے عالم میں آہستہ آہستہ کانپنے لگا۔ اس کے حلق سے گھُٹی گھُٹی غرّاہٹیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کی موت آسان بنانے کے لیے تلوار سے اس کی گردن پر بھرپُور وار کیا اور اُسے جان کنی کی اذیّت سے نجات مل گئی۔

تلوار کو گھاس پر اچھی طرح صاف کرنے کے بعد میں نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مُنہ پر ہاتھ رکھے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری ہی طرف متوجہ تھی۔ شدید حیرت کے باوجود اس کی آنکھوں میں میرے لیے تحسین کی جھلک نمایاں تھی لیکن وہ شہزادی تھی، اس لیے فوراً ہی شاہی نخوت آڑے آئی "بے حد خوب صورت کُتّا تھا، تم نے اسے ضائع کر دیا۔" اس نے عجیب انداز میں میرے کارنامے کو سراہا تو بے اختیار جی چاہا کہ تلوار کا ایک ہاتھ اس کی کھوپڑی پر بھی رسید کر دوں۔ میں نے بہ مشکل خود کو روکا۔

میں اُس سرزمین پر اجنبی بلکہ ایک طرح سے اسیر تھا۔ شہزادی مزید کچھ 'فرمانا' چاہ رہی تھی کہ میں نے یک لخت ہاتھ کے اشارے سے اُسے بولنے سے روک دیا۔ آدمیوں اور کتّوں کی آوازیں بے حد قریب آ گئی تھیں۔

وہ اس قدر نزدیک پہنچ گئے تھے کہ گھنے جنگل سے مشعلوں کی روشنی چھن چھن کر باہر آنے لگی تھی... پھر نیم تاریکی میں وہ مشعلیں یکے بعد دیگرے صاف دِکھائی دینے لگیں۔

چند لمحے بعد وہ مشعلیں نیم دائرے کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ وہ لوگ اناڑی نہیں تھے۔ شہزادی کی تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسی انداز میں حرکت کرتے رہے تو ہمارے لیے راہِ فرار اختیار کرنا مشکل ہو جائے گی۔ ہمیں بھیگے ہُوئے چوہوں کی طرح پکڑ لیا جائے گی۔

میں نے پلٹ کر شہزادی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا تھا اور وہ مجھے ایک سہمی ہُوئی ہرنی نظر آ رہی تھی۔

میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر اِدھر اُدھر دیکھا۔ فوری طور پر کچھ کر گزرنا چاہیے تھا جو تھوڑی سی مہلت تھی اُسے ہم نے باتوں میں گنوا دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ یہ راستہ چشمے سے ہو کر گزرتا تھا۔ میں نے جھپٹ کر لڑکی کا ہاتھ تھام لیا اور چشمے کی طرف دوڑنے لگا۔

"جلدی سے نکل چلو، شہزادی! تمھیں تھوڑی دیر دوڑنے کی زحمت اُٹھانا ہو گی۔"

چشمے میں رانوں سے زیادہ گہرا پانی نہیں تھا لیکن اس کی

تہ ناہموار اور پتھریلی تھی۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ مجھے اپنا جسم برف ہوتا محسوس ہونے لگا۔ چشمے کی تہ میں جا بجا درختوں کی خشک ٹہنیاں اور گرے ہوئے تنے بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ رات کی بڑھتی ہوئی سردی اور دُھند کی یلغار نے پریشان کر دیا۔ مجھے تو خیر اس قسم کی صورتِ حال اور مشقت کی عادت تھی لیکن شہزادی تاشیہ کا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ راستے کی رُکاوٹوں، تھکن اور ٹھنڈک سے بے حال ہو رہی تھی۔ اگر میں اُسے سہارا نہ دے رہا ہوتا تو وہ کب کی گر چکی ہوتی۔ وہ کسی نرم و نازک سی بیل کی مانند مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور میں اس کے ہانپنے کی آوازیں سُن رہا تھا۔ اُسے میرے جسم سے حرارت مِل رہی تھی۔ غالباً اسی لیے وہ یوں چپکی ہوئی تھی اُس نے تقریباً سارا بوجھ میرے اوپر ڈال رکھا تھا۔ میں اس اجنبی سرزمین کی اجنبی شہزادی کو سہارا دیے دوڑتا رہا۔

ہم چشمے کے بہاؤ پر چل رہے تھے۔ مجھے تھکن کا احساس نہیں تھا البتہ اَب سردی مزاج پوچھنے لگی تھی۔ چشمے کے ٹھنڈے پانی اور یخ بستہ ہواؤں نے رگوں میں خون منجمد کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگر ہم دوڑ نہ رہے ہوتے تو شاید اَب تک ہماری نسوں میں خون جم بھی چکا ہوتا۔ اوپر دُھند اور نیچے یخ بستہ پانی قیامت ڈھا رہا تھا۔

کچھ آگے جاکر چشمے کی مشرقی سمت میں، گھنے درختوں کا تھمتا ہی سلسلہ شروع ہو گیا ——— آسمان پر نیم روشن چاند نکل آیا تھا جس کی زرد زرد چاندنی سے فضا کسی حد تک صاف نظر آنے لگی۔

میں نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جہاں سے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ وہاں دُھند کچھ زیادہ ہی گہری تھی اور شاید یہی دُھند ہماری ڈھال بن گئی تھی۔ تعاقب کرنے والے کسی اور طرف جا چکے تھے اور کوئی مشعل دِکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آدمیوں کی آوازیں بھی سُنائی نہیں دے رہی تھیں اور کتّوں نے بھی بھونکنا بند کر دیا تھا۔ وہ لوگ یا تو کہیں دُور نکل گئے تھے یا پھر اُنھوں نے ہماری تلاش کا کام سپیدۂ سحر کے اِنتظار میں ملتوی کر دیا تھا۔

میں نے سکون کی سانس لی اور شہزادی تاشیہ کو سنبھالے ہوئے کنارے پر آگیا۔

کنارے پر سبز گھاس کا تختہ تھا۔ میں اس پر گر گیا۔ گھاس کا یہ بستر حرارت تو نہیں پہنچا سکتا تھا تاہم یہ جگہ چشمے سے کہیں بہتر تھی۔ ہم غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے قریب قریب ہی دراز ہو گئے۔

شہزادی تاشیہ نے دھیمے لیکن تحکمانہ لہجے میں کہا: "مجھے سخت سردی لگ رہی ہے اس لیے میں حرارت کی خاطر تمھارے ریچھ جیسے جسم کی پناہ لینے پر مجبور ہوں۔ کہیں تم کچھ اور نہ سمجھ لینا۔" میرا ہنسنے کو جی چاہا لیکن مُسکرا کر رہ گیا۔

"میں خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں، تم بہر حال ایک شہزادی ہو اور میں ایک غریب اجنبی ہوں، جس کے جسم پر ایک تار بھی نہیں ہے تمھیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی حیثیت جانتا ہوں اس لیے حدود سے تجاوز نہیں کروں گا۔" میں نے مُسکرا کر کہا حالانکہ اس کی بات پر مجھے ایک بے ساختہ قہقہہ بڑی مشکل سے ضبط کرنا پڑا تھا۔

اُس نے سر اُٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولی۔ "نہ جانے کیوں، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔ میں ایک شہزادی ہوں لیکن تم نے جس لہجے اور جس انداز میں بات کی ہے کوئی اس لہجے میں شہزادی سے بات نہیں کرتا۔ مجھے تمھارا لہجہ پسند نہیں آیا۔ کیا تم مجھے شہزادی تسلیم نہیں کرتے اور تمھارا شُبہ اب بھی برقرار ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے، شہزادی! مجھے افسوس ہے اور میں معذرت چاہتا ہوں کہ اپنے لہجے کے سلسلے میں بے بس ہوں: مجھے کچھ اسی انداز میں بات کرنے کی عادت ہے۔"

"اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو، یقین کرو کہ عکران پہنچ کر میں، تمھیں کوڑے ضرور لگواتی۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ ایسا ہی کرتی۔" اس نے ایسے لہجے میں کہا جسے میں شاہانہ بے بسی ہی قرار دے سکتا تھا۔

"شاید یہ ممکن نہ ہوتا شہزادی!" میں اوّل شب کی چاندنی میں اس کے سحر انگیز چہرے پر نگاہ جمائے مسکرا کر بولا۔ "میں اس وقت مسلح ہوں۔ . . اور جب میرے پاس کوئی ہتھیار موجود ہو تو مجھے کوڑے نہیں لگائے جا سکتے۔ ایسا صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب خون بہے۔ . . وہ خون چاہے میرا اپنا ہو یا میرے حریفوں کا۔ . . لیکن خون بہنا لازمی ہے۔ بہر حال مجھے کوڑے لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیوں کہ میں نے تمھارا مذاق نہیں اُڑایا!"

یہ سن کر لڑکی کی آنکھوں میں میرے لیے احترام کی جھلک نمایاں ہوئی۔ اس کے یاقوتی لب دِل کش انداز میں کھل گئے: "تو پھر ٹھیک ہے۔ اب ہم دوبارہ دوست ہیں۔ تم اپنے قُرب سے مجھے حرارت پہنچا سکتے ہو۔ میں سردی سے منجمد ہوئی جا رہی ہوں۔"

. . . لیکن ابھی میں دوستی کی تجدید کا آغاز نہیں کر پایا تھا کہ اچانک ہی مشرق کی طرف سے گھنے سیاہ جنگل کے قلب کو چیرتی ہوئی مترنم آوازیں سُنائی دیں۔ یہ ندائیہ اور دُعائیہ آوازیں تھیں . . . جیسے مذہبی رسوم انجام دیتے وقت کوئی مقدس گیت گایا جا رہا ہو۔

تاشیہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی اور ہاتھ سینے پر لے جاکر عجیب انداز میں حرکت دینے لگی۔ میرے خیال کی تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ اس مقدس گیت سے متاثر ہو گئی تھی۔

"ہُرمزد ہماری حفاظت کرے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ قبردتی ہیں۔ آج رات مقدس معبد میں ان کا اجتماع ہے اور سرفروش! مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس وقت ہم کس جگہ ہیں۔ اگر ہم چکر کاٹ کر اس معبد کے دوسری طرف نکل جائیں تو وہ راستہ مِل جائے گا جو عکران کی طرف جاتا ہے۔ آؤ!" میرا ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئی۔

میری نگاہ اسی طرف اُٹھی ہوئی تھی جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی بلوط کے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان کوندا سا لپکتا دِکھائی دیتا تھا جیسے وہاں کوئی بہت بڑا الاؤ روشن ہو۔

میرے وجود میں بے چینی اور تجسس کی عجیب سی لہر دوڑ گئی۔ اس آگ اور اُن دُعائیہ کلمات نے میرے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے اندر دم بہ دم اُس جگہ کو دیکھنے اور اس کے بارے میں جاننے کی خواہش تیز ہوتی جا رہی تھی اور جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار تاشیہ سے کیا تو اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ دو قدم ہٹ کر مجھے اس طرح گھورنے لگی جیسے اُسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو گیا ہو۔

"نہیں . . . نہیں!" اس کی آنکھوں سے دہشت جھانکنے لگی۔ "قبردتیوں کی ٹوہ میں رہنا سختی سے منع ہے۔ اُن کی اپنی ایک پُراسرار دُنیا ہے اور پُراسرار رسوم ہیں جن میں مداخلت ناقابلِ معافی جُرم ہے اگر ہم پکڑے گئے تو مار ڈالے جائیں گے۔"

"لیکن یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کسی کو قربان کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر اُنھوں نے ہمیں پکڑ لیا تو ہمارے اعضا جُدا کر دیں گے اور پھر دھیمی آنچ پر کسی خرگوش کی مانند بھون کر چٹ کر جائیں گے۔ نہیں سرفروش! نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم چکر کاٹ کر ان سے دُور نکل جائیں گے اور ہمیں بہت احتیاط سے نِکلنا ہو گا۔ وہ ان اوقات میں اپنے نگراں مقرر کر دیتے ہیں۔"

تاشیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور اس کی دہشت ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اُسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔

اس کا جسم کانپ رہا تھا، سردی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ کپکپاہٹ خوف کی لرزش تھی۔ میں نے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا: "کیا تم نے کبھی یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے؟"

"کیا سب کچھ؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"یہی قربانی کا منظر . . . اور ان کے نگراں؟"

"نہیں . . ." تاشیہ نے سر کو انکار میں جنبش دی: "میں اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔ میں احمق نہیں ہوں جو اس طرح مرنے کی خواہش کروں۔ البتہ میں نے احباز میں ان کی بہت سی داستانیں ضرور سُنی ہیں اور یہ داستانیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ قبردتی بہت طاقت وَر، بااثر اور مقتدر ہیں۔ ان کا اپنا قانون ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں اور تمھیں بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اجنبی اور لاعلم ہونے سے جُرم اور سزا کی نوعیت میں تبدیلی نہیں آجاتی۔"

وہ مجھ سے دُور کھڑی ہو گئی اور میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی: "میں سمجھتی ہوں کہ تم اتنے بے وقوف نہیں ہو جو اس قسم کی موت کو پسند کرو۔"

"نہ میں بے وقوف ہوں اور نہ اس قسم کی موت پسند کرتا ہوں۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا: "لیکن میں کسی قبردتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مجھے اس سرزمین پر نہ جانے کتنا عرصہ قیام کرنا تھا۔ اپنی بقا کے لیے ضروری تھا کہ میں ہر ممکن معلومات حاصل کر لیتا۔ تاشیہ کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ قبردتی بے حد خطرناک لوگ ہیں اور میرے دُشمن بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ میں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کروں چنانچہ میں نے مضبوط لہجے میں کہا: "شہزادی تاشیہ! مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے ارادے سے باز نہ رہ سکوں گا۔ اگر وہاں کوئی خطرہ ہے تو میں تمھیں اپنے مصائب میں شریک نہ کروں گا۔ تم یہیں ٹھہرو اور میری واپسی کا اِنتظار کرو۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" اس نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "قبردتی ان لوگوں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، جو میرے خون کی پیاس میں مبتلا مارے مارے پھر رہے ہیں۔"

"لیکن میں انھیں نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھنا چاہتا۔ . ."

میں نے کہا: "تم یہیں ٹھہرو۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔"

"نہیں۔۔۔ میں تنہا نہیں رہ سکتی۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔۔۔ جو مقدر میں لکھا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ جب تمہارا سر کٹنے لگے تو یاد کر لینا کہ میں نے تمھیں روکنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔"

"بے فکر ہو کر میرے ساتھ آؤ۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور اُدھر چل دیا جدھر سے آوازیں آرہی تھیں۔ آوازوں کی شدت میں گہری ہوتی ہوئی رات کے ساتھ ساتھ تیزی آگئی تھی۔

تاشیہ ہانپتی کانپتی میرے ساتھ چل دی۔

راستہ خاصا دُشوار گزار ثابت ہوا۔ ہر طرف خاردار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جن سے ہمارے جسموں پر جا بجا خراشیں آگئیں۔ میں آگے آگے چل رہا تھا اور تاشیہ میرے نقشِ قدم پر چل رہی تھی۔ کئی جگہ سے، اس کا لباس جھاڑیوں میں اُلجھ کر پھٹ گیا تھا اور میرے اطمینان دلانے کے باوجود بھی وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔

فاصلہ سمٹنے کے ساتھ ساتھ وہ آوازیں بلند اور واضح ہوتی گئیں۔ ان آوازوں میں ہم آہنگی اور موسیقیت نہیں تھی بلکہ انھیں سُن کر دل پر دہشت طاری ہوتی تھی۔ آوازوں کے علاوہ اب الاؤ سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کی لپکتی ہوئی لمبی لمبی زبانیں بھی واضح ہو گئی تھیں۔ آگ یقیناً ایک بڑے دائرے میں جل رہی تھی۔ میں آگے بڑھتا رہا کہ اچانک ایک کرخت آواز سُنائی دی۔

"کون ہے، جسے مقدس معبد کی طرف آنے کی جُرأت ہوئی ہے؟"

آواز سے میں بولنے والے کی جنس کا تعین نہ کر سکا لیکن یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ آواز عقب سے آئی تھی۔ تاشیہ بے ساختہ اُچھل پڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُسے الگ ہٹاتے ہوئے سرگوشی میں وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی اور آواز کی سمت چل دیا۔ آواز دینے والا یقیناً کسی درخت کی اوٹ میں تھا ورنہ میری نگاہ سے چھُپا نہ رہتا۔

میں نے چند ہی قدم اُٹھائے تھے کہ ایک سفید سائے پر نظر پڑی۔ تلوار پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی پہلے جیسی خشک، کھُردری اور کرخت آواز دوبارہ اُبھری۔

"وہیں ٹھہر جاؤ۔ میرے قریب نہ آؤ۔ میں قبروتی ہوں اور جو شخص میری نافرمانی کرتا ہے، اس پر سارے جہان کے دیوتاؤں کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ اُسے ابدی تاریکی اور قہر کا دیوتا ہمیشہ کے لیے نگل جاتا ہے۔ وہیں رُک جاؤ۔ یہ میرا حکم ہے۔"

میں نے بولنے والے کی لن ترانیوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور آگے بڑھتا رہا۔ یہ دیکھ کر وہ سایہ غضب ناک ہو گیا۔ وہ اُچھل کر میرے سامنے آگیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سفید لبادے میں ملبوس ہے۔

"موت تمہارا مقدر ہو گئی ہے۔ تم نے عقل کی بات پہ کان نہیں دھرا۔ اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" قہر آلود آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

بھرپور چاندنی میں، اس سفید پوش کے ہاتھ میں مجھے ایک تیز دھار خنجر چمکتا دکھائی دیا۔ میں اس کے خطرناک ارادے کو بھانپ گیا اور تیزی سے تلوار والا ہاتھ گھمایا۔ سفید لبادے والی یہ خوف ناک مخلوق غالباً تلوار سے بے خبر تھی۔ گھومتی ہوئی تلوار کی چمک محسوس کرتے ہی، وہ ٹھٹک گیا۔ تذبذب کا یہ ایک ہی لمحہ اس کی موت کا پیغام بن گیا۔ تلوار اس کی گردن پر پڑی اور اگلے ہی لمحے وہاں سے سُرخ سُرخ خون اُبل پڑا۔

وہ گھٹنوں کے بل جھکتا چلا گیا۔

ابھی تک اس نے کوئی آواز نہیں نکالی تھی تاہم میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں وہ مدد طلب کرنے کے لیے چیخنا نہ شروع کر دے، اس پر پے در پے وار کیے۔

وہ چند بار تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

میں نے تلوار کی نوک سے وہ سفید لبادہ چاک کر کے مرنے والے کا جسم دیکھا تو مجھے ٹھٹک کر لڑکھڑا جانا پڑا۔

وہ ایک بوڑھی عورت تھی اور اس کا چہرہ بھی بے حد بھیانک تھا۔

تاشیہ نہ جانے کب میرے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔ لاش پر نظر پڑتے ہی اس کا جسم بری طرح کانپنے لگا۔ "بُزرمزد ہماری حفاظت کرے۔ تم نے اسے مار ڈالا، ایک قبروتی کو مار ڈالا۔ ہم پر عذاب ہی عذاب نازل ہو گا۔ اب ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔" اس کا لہجہ رو دینے والا تھا اور آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"فضول باتیں نہ کرو شہزادی!" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "تمھیں یہ بات پہلے ہی بتا دینی چاہیے تھی کہ قبروتیوں میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ میں عورتوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا، چاہے وہ میری جانی دُشمن ہی کیوں نہ ہوں۔"

تاشیہ نے جلدی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ایک طرف کھینچتی ہوئی بولی: "اب یہاں ایک لمحہ بھی رُکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ آؤ یہاں سے نکل چلیں۔ ابھی جان بچانے کا موقع ہے۔"

میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ میری نگاہ اُس دُور افتادہ الاؤ پر جم گئی۔۔۔ جس سے اُٹھتے ہوئے شعلے پہلے سے کہیں زیادہ غضب ناک ہو گئے تھے۔

"میں یہاں تک آگیا ہوں اور میرے ہاتھوں ایک قتل بھی ہو گیا ہے تو میں اپنا مقصد حاصل کیے بغیر آگے نہیں جاؤں گا۔ میں پُراسرار قبروتیوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ ان میں کتنی عورتیں شامل ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"قبیلۂ قبروت سے تعلق رکھنے والی ساری کی ساری عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ میں نے غیر اہم سمجھ کر یہ بات تمھیں نہیں بتائی تھی۔ آہ۔۔۔ تم نے یہ کیا کر دیا؟ اب یہ تمھیں کبھی نہیں بخشیں گے، کسی نہ کسی طور ڈھونڈ نکالیں گے اور انتقام لیں گے۔ کاش میری تم سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم قبروتیوں کی ٹوہ میں لگ جاؤ گے۔ اجنبی! تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

"میں نے تم پر جبر تو نہیں کیا تھا۔۔۔ پھر تم میرے ساتھ کیوں چلی آئیں؟ اب بھی موقع ہے، تم اپنے راستے پر جا سکتی ہو۔"

"اور تم۔۔۔؟" اس نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"میں اُدھر جاؤں گا۔" میں نے کہا اور تاشیہ کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا لیکن قدموں کی چاپ سے محسوس ہوا کہ وہ میرے پیچھے ہی آرہی ہے۔

الاؤ کے قریب پہنچ کر ہم ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ ہماری نگاہیں وسیع دائرے میں روشن آگ کی سُرخ سُرخ زبانوں پر جم کر رہ گئی تھیں۔ سفید لبادوں والے قبروتی ہیولے آگ کے گرد رقص کر رہے تھے اور بلند آواز سے کچھ پڑھ بھی رہے تھے۔

میں نے تاشیہ کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں پوچھا: "وہ عورت جو ایک طرف کھڑی ہے، یہ کون ہے؟" میرا اشارہ اس عورت کی طرف تھا جو نہ تو گا رہی تھی اور نہ ہی رقص میں شریک تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک طلائی تلوار چمک رہی تھی۔ اس کا جسم دُبلا پتلا تھا اور وہ دراز قامت تھی۔ اس کا چہرہ نقاب میں چھُپا ہوا تھا۔

"یہ نوبیس ہے، بڑی پجارن۔" تاشیہ نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "میرا اعلم زاد یوطابا اس سے ہمیشہ خوف زدہ رہتا ہے بلکہ ہر کوئی اس سے ہمیشہ دہشت زدہ رہتا ہے اور میں بھی اس سے ڈرتی ہوں۔ اگر تم بالکل ہی احمق نہیں ہو تو تمھیں بھی اس سے خوف آئے گا۔ ذرا رقص کرنے والوں سے پرے، درخت کے نیچے دیکھو تو تمھیں اندازہ ہو جائے گا۔"

میری نگاہ اب تک اس طرف نہیں گئی تھی۔ درخت کے نیچے ایک بے لبادہ لڑکی ٹکٹکی سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر تسموں سے بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھُنسا ہوا تھا۔ فاصلے کے باوجود اس کی آنکھوں سے دہشت اُبلتی ہوئی صاف دِکھائی دے رہی تھی۔

اچانک رقص تھم گیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ مہیب شور بھی ختم ہو گیا۔ رقص کرنے والی لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں منتشر ہو گئیں۔ چار لڑکیاں ٹکٹکی سے لٹکی ہوئی لڑکی کی طرف جا رہی تھیں۔ آٹھ لڑکیاں آہنی کھانچوں سے آگ کو مزید دہکانے میں مصروف ہو گئیں اور کچھ لڑکیاں کوئلہ لا کر آگ کے ڈھیر میں ڈالنے لگیں، جس سے شعلے بھڑک کر درختوں کی چوٹیوں سے بھی اوپر تک اُڑنے لگے۔

میری نگاہ دوبارہ ٹکٹکی سے لٹکی ہوئی لڑکی پر جم گئی۔ اُسے تسموں سے آزاد کیا جا رہا تھا لیکن اس کے منہ سے کپڑا نہیں نکالا گیا۔ لڑکی کا چہرہ دہشت کی زیادتی سے سفید پڑ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود میں لہو کی ایک بوند بھی باقی نہ رہ گئی ہو۔ اس کی آنکھیں خوف سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔

آزاد ہونے کے بعد اس نے سر کو اِدھر اُدھر جھٹکا اور تھوڑی سی جدوجہد کی لیکن مضبوط گرفت کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ اُسے گھسیٹ کر ایک بڑے شاہ بلوط کے نیچے پہنچا دیا گیا پھر ایک چوبی تختے پر گرانے کے بعد اس کے ہاتھ پیر دوبارہ جکڑ دیے گئے۔

اب وہ ذرا بھی جنبش نہیں کر سکتی تھی۔

میرے خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی۔

مجھے اپنا پورا وجود گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

تاشیہ نے شاید میری اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی: "نہیں سرفروش! تم اب مزید کوئی حماقت نہیں کرو گے۔ اس لڑکی کو بچانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے بچانا، کسی وحشی درندے کے منہ سے شکار چھیننے کے مترادف ہے۔ قبروتی، وحشی درندوں سے بھی زیادہ سفاک ہیں۔ یہ پل بھر میں ہماری تکا بوٹی کر دیں گے۔"

شہزادی تاشیہ کی بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ میں جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ اُس لڑکی کو بچانے کا صاف مطلب تھا کہ میں تاشیہ اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دوں۔۔۔ لیکن وہ لڑکی پھر بھی محفوظ نہ رہتی۔ اب مجھے اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ قبروتیوں کے بارے میں تاشیہ کی بتائی ہوئی باتیں محض قصہ کہانی نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہیں۔ جو کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا، یہ اس بات کا زندہ ثبوت تھا۔

دفعتاً تاشیہ چونک پڑی . . پھر اس کی گھٹی گھٹی سی آواز سُنائی دی: "یہ لڑکی، جسے قربان کیا جانے والا ہے، مَیں اسے پہچانتی ہُوں. یہ میرے عم زاد شاہ یوطابا کی خاص ملازمہ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اُس کی ایک حیثیت تھی. یہ یوطابا کی منظورِ نظر بھی تھی. اب میں کچھ کچھ درپردہ بات کو بھی سمجھ رہی ہوں. پچھلے دنوں، یوطابا اور اس لڑکی کے بارے میں کئی افواہیں سُننے میں آئی تھیں. ہُرمزد ہم پر رحم کرے، بالآخر وہ افواہیں سچ ہی ثابت ہُوئیں"

میری توجہ لڑکی سے ہٹ کر اس عورت پر مرتکز ہو گئی، جو آہستہ آہستہ اپنے شکار کی طرف بڑھ رہی تھی. اس نے تلوار والا ہاتھ اُٹھا رکھا تھا. اس کی چال میں وقار اور دبدبہ تھا. اُس کا چہرہ ابھی تک نقاب میں چھُپا ہُوا تھا. وہ شکار کے قریب پہنچی تو بے بس لڑکی کا جسم، ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود تشنج کی کیفیت میں بَل کھانے لگا.

لڑکی کے قریب پہنچ کر وہ عورت رُک گئی . . پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار پکڑ کر سَر سے بلند کر لی. اُسی وقت ہَوا کے جھونکے سے یا پھر دونوں ہاتھ اُٹھانے کے باعث اس کی نقاب سرک گئی.

ایک ثانیے کے لیے اس کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آگیا.

وہ بے پناہ حسین تھی.

مَیں اس کے حُسن کی دِل کشی سے مسحور ہو کر رہ گیا. اسی لمحے تاشیہ بول پڑی اور یہ سحر ٹوٹ گیا. وہ جوش سے کانپتی ہُوئی آواز میں کہہ رہی تھی.

"یہ نوبیس نہیں ہے بلکہ کوئی اجنبی ہے. آخر آج یہاں کیا ہو رہا ہے؟ پے در پے حیرت انگیز چیزیں سامنے آ رہی ہیں. پہلے تم . . پھر یہ لڑکی اور اب یہ اجنبی عظیم پجارن. مَیں اسے بالکل ہی نہیں جانتی"

عظیم پجارن نے تلوار کو سَر سے اُوپر اُٹھا رکھا تھا اور ساتھ ہی زیرِ لب کچھ بولتی بھی جا رہی تھی.

میرے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جم گئے اور شدید سردی کے باوجود میرے ماتھے سے پسینہ پھُوٹ پڑا. مَیں سحر زدہ سا عظیم پجارن کو یک ٹک دیکھے جا رہا تھا.

اچانک تلوار بڑی تیزی سے اور قوت کے ساتھ نیچے آئی اور لڑکی کے دِل میں دھنس گئی. لڑکی کا جسم بُری طرح تڑپا اور ایک ہی لمحے میں ساکت ہو گیا.

عظیم پجارن لڑکی کے مُردہ جسم پر یُوں جھُکی کھڑی تھی، جیسے اُسے خود اپنا بھی ہوش نہ رہا ہو. کافی دیر بعد اُس نے سَر اُٹھایا اور چاروں طرف دیکھا. . . دوسری پجارنوں کی طرف اور اس طرف، جہاں میں اور شہزادی تاشیہ چھُپے ہُوئے تھے. ایک لمحے کو مجھے یُوں محسوس ہُوا، جیسے وہ ہم دونوں کی موجودگی سے آگاہ ہو گئی ہو.

میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی.

مَیں نے سانس روک لی.

. . لیکن عظیم پجارن نے ایک جھٹکے سے سَر گھُمایا اور مُردہ لڑکی کے جسم سے دُور ہٹ گئی . . . پھر وہ سَر جھُکائے، سامنے درختوں کے جھُنڈ کی طرف چلنے لگی. اس کے بعد کا منظر بڑا ہی گھناؤنا تھا. پجارنیں، لڑکی کی لاش کے قریب پہنچیں اور اس کے اعضا کاٹ کاٹ کر دھڑ سے جُدا کرنے لگیں. مَیں جھُرجھُری لے کر رہ گیا. واقعی تاشیہ نے ان کی بہیمیت اور شقاوت کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بالکل دُرست تھا.

مَیں ابھی واپسی کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ایک اور منظر سامنے آیا. یہ منظر بھی دِل ہلا دینے والا تھا. اگر مَیں تاشیہ کے مُنہ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو یقیناً اُس کی چیخ نے اُن سب کو ہماری طرف متوجہ کر دیا ہوتا یکایک چیخ و پکار کی آواز بلند ہُوئی تھی اور دو پجارنیں ایک اور لاش اُٹھائے ہُوئے درختوں کے جھُنڈ سے برآمد ہُوئی تھیں. لاش دُور ہی سے پہچانی جا سکتی تھی. یہ اُس بوڑھی قبروتی عورت کی لاش تھی جو کچھ دیر قبل میرے ہاتھوں ہلاک ہُوئی تھی.

قبروتی بڑھیا کی لاش آگ کے قریب رکھ دی گئی اور بین شروع ہو گیا. پجارنیں مَرنے والی کا سوگ منا رہی تھیں. "یہ تو بہت بُرا ہُوا!" میں نے سوچا. "اس طرح انھیں پتہ چل گیا کہ اُن کے درمیان کوئی اجنبی یا کوئی دُشمن بھی موجود ہے، جس نے اُن کی ساتھی کو ہلاک کر دیا ہے. قبروتی سمجھ گئے ہوں گے کہ بڑھیا کو ہلاک کرنے والے نے اُن کی وہ پُراسرار قربانی کی رسم بھی دیکھ لی ہو گی. گویا جلد ہی ہماری تلاش شروع ہونے والی تھی.

میں نے مُڑ کر دیکھا تو تاشیہ کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہُوئی تھیں. مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اُس نے کہا: "مَیں نے تمھیں پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا. ہر بات سے آگاہ کر دیا تھا. اب تو ہُرمزد ہی ہمیں بچائے تو بچائے. پجارن کی لاش دریافت کر لی گئی ہے. اب ہمیں بھی اِن کی درندگی کی بھینٹ چڑھنا پڑے گا!"

مَیں نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہُوئے دِل کش چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت و اپنائیت سے کہا: "تم بالکل

فکر نہ کرو! مَیں، تمھیں یہاں تک لایا ہُوں اور میں ہی تمھیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا. تمھیں صرف اتنی زحمت کرنا ہو گی کہ بہت آہستہ اور بے حد محتاط ہو کر چلنا ہو گا. . . کچھ دور جانے کے بعد تمھیں ایک بار پھر دوڑ لگانی پڑے گی. تھک گئیں تو میری پیٹھ حاضر ہے. آخر تمھارا یہ خادم کب کام آئے گا"

میری باتوں سے ڈھارس بندھی تو شہزادی کے بھیگے بھیگے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی.

★★

چاند کے غروب ہوتے ہوتے تاشیہ نے عکران جانے والا راستہ تلاش کر لیا. قبروتیوں کی حدود سے نکلنے کے بعد اس کی دہشت کسی حد تک کم ہو چکی تھی لیکن ان کا خیال اَب بھی اس کے ذہن سے چپٹا ہُوا تھا. اس کے مطابق قبروتیوں کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا. وہ مُوآبہ پر بُری طرح چھائے ہُوئے تھے. زندگی کے ہر شعبے میں ان کا عمل دخل تھا. اس لیے وہ کسی بھی وقت ہم تک پہنچ سکتے ہیں.

تاشیہ نے راستے میں، اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں.

وہ ساحل پر واقع ایک قبروتی اسکول میں چار سال تک زیرِ تعلیم رہنے کے بعد اپنے محل واپس آ رہی تھی کہ ملکہ رُوبا نے اُسے اغوا کروا لیا. ملکہ رُوبا اس کے باپ احباز کے بادشاہ کی بہن تھی لیکن دونوں کے درمیان نفرت کی دیوار حائل تھی. تاشیہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی، اس لیے ملکہ رُوبا کا خیال تھا کہ وہ اُسے قیدی بنا کر احباز کے بادشاہ سے بھاری تاوان اور متعدد مراعات حاصل کر سکے گی.

قید میں تاشیہ بے حد پریشان رہی. وہ ہر وقت فرار کی تدبیریں سوچتی رہتی تھی. آخر اُسے ایک تدبیر سُوجھ ہی گئی. اُس نے ملکہ رُوبا کو پیغام بھجوایا کہ وہ تنہائی کی اذیت سے ہلاک ہو رہی ہے اس لیے اُسے جنگلوں اور میدانوں میں گھُومنے پھرنے کی اجازت دے دی جائے. اس حبس کی فضا میں اس کا دم گھُٹ جائے گا. ملکہ رُوبا اُسے ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی کیوں کہ تاشیہ کے اغوا کا مقصد ہی ختم ہو جاتا. . . پھر وہ اس کی جان کی دُشمن نہیں تھی. اب وہ تو تاشیہ کو عارضی طور پر روک کر اس کے باپ سے کچھ مراعات اور کثیر زرِ تاوان حاصل کرنا چاہتی تھی. چنانچہ اُس نے تاشیہ کو گھُومنے پھرنے اور طویل سیر کی اجازت دے دی. البتہ ایک محافظ دستہ اس کے ساتھ کر دیا جو اُسے ایک لمحے کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا.

"مگر شہزادی!" مَیں نے مسکرا کر کہا: "تم تو ایک دھان پان اور بے حد کمزور دِل کی لڑکی ہو، تم اس محافظ دستے کو جُل دینے میں کیسے کامیاب ہو گئیں؟"

"یہ ایک الگ کہانی ہے" تاشیہ نے سر ہلاتے ہُوئے کہا. کافی دیر بعد اس کے لبوں پر بے باک اور شوخ مُسکراہٹ اُبھری تھی "محافظوں کا دستہ دُور رہ کر ہر وقت میری نگرانی کرتا رہتا تھا. اُن سے بچ نکلنا آسان نہیں تھا. تھک ہار کے مَیں نے وہی نسخہ کیمیا استعمال کیا جو ایسے وقت پر عمُوماً استعمال کیا جاتا ہے"

"مثال کے طور پر؟" مَیں نے پوچھا.

"مَرد یُوں تو بہت ہوشیار، عقل مند اور دُور اندیش ہوتا ہے لیکن کسی عورت کو اپنی طرف مائل دیکھ کر وہ تمام اوصاف گروی رکھ دیتا ہے سو میرے ساتھ بھی یہی ہُوا. دستے میں سے ایک نوجوان کو منتخب کر کے مَیں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے اشارے کرنے شروع کر دیے. ایک شہزادی کو اپنی طرف مائل پا کر اُس نے اپنے مستقبل کے بارے میں نہ جانے کیا کچھ نہ سوچ لیا ہو گا کہ ایک روز موقع پا کر مَیں نے اس سے کہا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے ملے، مَیں بے چینی سے اُس کی منتظر رہوں گی. وہ تنہائی میں ملنے کے لیے شاید مجھ سے بھی زیادہ بے چین تھا" یہ کہتے ہُوئے وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی.

"پھر وہ تنہائی میں تم سے ملا، تم نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے اُسے ہلاک کر دیا اور وہاں سے فرار ہو گئیں؟" مَیں نے تاشیہ کی بات مکمل کر دی.

وہ مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی: "تم بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ عقل مند بھی معلوم ہوتے ہو"

"مگر ویسا عقل مند نہیں، جیسے تم جھانسہ دے کر ہلاک کر آئی ہو" مَیں نے ہنستے ہُوئے کہا.

"مَیں نے تمھارے متعلق ایسا نہیں سوچا ہے، سرفروش! تم اپنی سرزمین پر یقیناً بہت بڑے آدمی رہے ہو گے. بہادر، دانش مند اور صاحبِ تدبیر. . . ورنہ قبروتیوں کے درمیان اس طرح جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا"

مَیں خاموش رہا.

"تم کس سوچ میں ڈوب گئے؟" اس نے ناگواری سے پوچھا.

"مَیں، تم سے چند باتیں معلوم کرنا چاہتا ہُوں" مَیں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے کہا: "کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ کون سا دَور ہے؟"

"ارے! تم اتنا بھی نہیں جانتے؟" اس کے لہجے میں پہلے تو حیرت پیدا ہوئی... پھر اس نے اثبات میں سرہلا دیا: "میں بھول گئی تھی کہ تم اس سرزمین پر اجنبی ہو۔ بہرحال یہ عہدِ اشکانی ہے۔"

"اشکانی عہد؟" میں نے دُہرایا: "اُف میرے خُدا!" میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر فریدون کے کمپیوٹر نے مجھے اس دور میں لا پھینکا تھا جس کے بارے میں، میں نے ایران کی قدیم تاریخ میں پڑھا تھا... یہ غالباً ۲۴۹ قبل مسیح کا دور تھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" تاشیہ نے میری اُلجھن سے پریشان ہو کر سوال کیا: "اور تمھاری زبان تھوڑے سے فرق کے ساتھ اتنی آسانی سے میری سمجھ میں کیسے آرہی ہے؟ جب کہ تم اس سرزمین کے باشندے نہیں لگتے؟"

"میں اسی زمین کا رہنے والا ہُوں۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا: "تمھارا مذہب کیا ہے، تاشیہ؟"

"ہم ہُرمزد کو خُدا مانتے ہیں اور آفتاب کی پرستش کرتے ہیں، جو انسان کو زندگی، توانائی اور نعمتیں بخشتا ہے۔"

"اور قبردتیوں کا مذہب کیا ہے؟"

"قبردتی زرتشت ہیں۔" اس نے جواب دیا: "لیکن تم مجھے اپنے بارے میں کچھ کیوں نہیں بتاتے؟"

"میں بھی تمھاری طرح کا ایک انسان ہی ہُوں۔" میں نے کہا: "لیکن میں جس دَور کا رہنے والا ہُوں، وہ ہزاروں سال بعد آئے گا۔"

وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے میری باتیں اس کی سمجھ میں نہ آئی ہوں لیکن میں اُسے اگر اپنے بارے میں کچھ بتاتا بھی تو شاید وہ نہ سمجھ پاتی۔ میں ایران کے ایک معروف کلب کا انسٹرکٹر تھا اور مارشل آرٹس کی تربیت دیتا تھا... لیکن اور پیشوں کی طرح اس پیشے میں بھی حسد پایا جاتا ہے... اور اسی حسد کی وجہ سے ایک حریف نے میرے ایک شاگرد کو قتل کر کے میرے ہی کلب میں یوں پھنکوا دیا کہ اس کے قتل کا الزام میرے سر آیا اور مجھے سزائے موت دے دی گئی لیکن خوش قسمتی سے میں بچ نکلا اور تقدیر بالآخر مجھے اس قدیم عہد میں لے آئی۔

میں متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ میری بے لباسی تھا۔ مجھے سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔ مَیں چاہتا تھا کوئی ایسا بندوبست ہو جائے کہ میں کسی طرح اپنا جسم ڈھانپ لوں۔ میں اس حالت میں آبادی میں داخل ہونے کے تصوّر ہی سے گڑا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تاشیہ نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ اس وقت ہم کھڑی فصلوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ دفعتاً وہ چلتے چلتے رُکی اور ایک جانب اشارہ کر کے بولی: "تمھارے لباس کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔"

میری گرفت تلوار پر مضبوط ہو گئی۔

مَیں نے تاشیہ کی بتائی ہُوئی سمت میں دیکھا پھر کھسیانے ہُوئے انداز میں ہنس دیا۔ کھیت کے ایک کونے پر پرندوں اور جانوروں کو ڈرانے اور فصل کو نقصان سے بچانے کے لیے بانس کا ایک پُتلا کھڑا تھا۔ سر کی جگہ، اُلٹی ہانڈی رکھی ہُوئی تھی اور بقیہ جسم پر ایک بوسیدہ سا چوغہ لٹکا دیا گیا تھا۔

"ہر وقت لڑنے بھڑنے کے لیے تیار رہتے ہو؟" تاشیہ نے میرے تیور دیکھ کر ہنستے ہُوئے کہا: "یہ چوغہ تو شاید تمھارے جسم پر بالکل ہی نہ آئے، کیوں کہ تم آدمی تو ہو نہیں۔ بس جانور ہو جانو۔ بہرحال، کوشش کرو۔ شاید پھنس پھنسا کر پہن لینے میں کامیاب ہو جاؤ۔"

تاشیہ کا خیال دُرست نکلا۔ مَیں نے وہ چوغہ پہن تو لیا لیکن پھر بھی میرا جسم جگہ جگہ سے جھلک رہا تھا کیوں کہ تنگ لبادہ پہنتے وقت کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ میری اس ہیئت کذائی پر تاشیہ بچّوں کی طرح محظوظ ہو رہی تھی۔

"یہ کیسی سرزمین ہے جہاں ایک اجنبی کو لباس تک میسّر نہیں؟" مَیں نے جل کر کہا۔

"اپنا جُملہ دُرست کر لو۔ تم یہاں آئے تھے تو تمھارے جسم پر ایک تار بھی نہیں تھا اور تم غیر مسلح تھے جب کہ اس وقت نہ صرف تمھارے جسم پر ایک چوغہ ہے بلکہ تم ہاتھ میں تلوار بھی لیے ہُوئے ہو۔"

مَیں نے شکریے کے طور پر جُھکنا چاہا لیکن لبادے کی تنگی نے اجازت نہ دی۔

ہم رات بھر، بغیر کچھ کھائے پیئے چلتے رہے۔ ہنگامی حالات اتنے تواتر سے پیش آئے تھے کہ کھانے پینے کا ہوش ہی جاتا رہا تھا۔ ہم جنگل پیچھے چھوڑ آئے پھر ایک دن طلوع ہُوا تو بھوک اور پیاس بھی جاگ اُٹھی۔ تاشیہ پر بھوک پیاس سے زیادہ تکان غالب تھی۔ مارے تھکن کے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا لیکن جیسے ہی اُفق پر دُھوئیں کی پہلی لکیر دِکھائی دی، تاشیہ خوشی سے بے قابو ہو گئی۔ مجھ سے لپٹتے ہُوئے بولی: "یہ علاقہ قریب آرہا ہے۔ سارے دَرد کا درماں ہو جائے گا۔" پھر وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

ذرا دیر بعد جب ہم مویشیوں کے ایک ریوڑ کے درمیان سے گزر رہے تھے، وہ فکرمند لہجے میں بولی: "سرفروش!"

"جی، شہزادی صاحبہ!" مَیں نے مؤدب ہو کر کہا۔

"میری ایک بات کا خیال رکھنا۔ جو کچھ گزر چکا ہے، یعنی رات ہم جس ہولناک واقعے سے دوچار ہوئے ہیں، عکران میں کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ سب کچھ بھول جاؤ، بلکہ ان واقعات کو ذہن کی گہرائی میں کہیں دفن کر دو۔ سمجھ لو کہ وہ واقعہ کبھی رُونما ہی نہیں ہُوا۔ قبیلہ قبردت اور بوڑھی قبردتی پُجارن کا قتل اور وہ لڑکی جسے قربان کیا گیا۔ تمھیں اپنے مفاد میں یہ سب کچھ بھولنا ہوگا۔"

"جیسا حُکم سرکار کا..."

"خاص طور پر اُس مظلوم لڑکی کو تو بالکل ہی بھول جاؤ۔ مجھے اس کے پیچھے کوئی گہری سازش نظر آتی ہے۔"

"اگر مجھے بھی اس بارے میں کچھ بتا دیا جائے تو میری اُلجھن دُور ہو جائے گی۔"

"ہاں، مَیں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔" تاشیہ سوچ میں ڈوبے ہُوئے لہجے میں بولی: "اس لڑکی کی ہلاکت میں مجھے ردمہ کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ ردمہ، یوطابا کی بیوی ہے۔ وہ عورت نہیں بلکہ کُتیا ہے۔ بہت تُند خُو اور ظالم... مَیں اُسے بالکل پسند نہیں کرتی۔ جب کہ میرا ابن زاد بڑا احمق بلکہ گھامڑ ہے۔ وہ ایک ایسے مُرغ کی مانند ہے جو ہر چُگتی ہُوئی مُرغی کو اپنی ملکیت سمجھ کر اس پر بیٹھنا اپنی پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ مَیں نے یوطابا اور اس لڑکی کے بارے میں، جو اس کی ملازمہ خاص تھی اور جو، اب مر چکی ہے، جس افواہ کا ذکر کیا تھا، وہ اپنی جگہ سچ ہے۔ وہ اُس ملازمہ سے لُطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ ردمہ کو اس حقیقت کا علم ہُوا تو اس نے انتقاماً اس لڑکی کو قربانی کے لیے قبیلہ قبردت کے حوالے کر دیا۔ یوطابا اس سلسلے میں بے خبر ہے اور اپنی حسین ملازمہ کی گمشدگی سے پریشان ہے۔ اگر اسے حقیقت معلوم ہو گئی تو وہ جوشِ غضب میں نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ سب سے پہلے تو وہ ردمہ کا قِصّہ پاک کر دے گا پھر قبیلہ قبردت پر لشکر کشی کرنے دوڑے گا۔ اُسے قبردتیوں سے شدید نفرت ہے کیوں کہ یہ لوگ اُس کے معاملات میں دخل دینے لگے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا صفایا کرنے کے لیے موقعے کی تاک میں ہے۔ اس واقعے سے اُس کو ایک بہانہ مل جائے گا پھر میں کہہ نہیں سکتی کہ کیا ہو جائے گا۔"

مَیں خاموش رہا تو تاشیہ نے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑ دیا۔

"موآبہ کے باشندے بے حد سفاک ہیں۔ یہ لوگ اجنبیوں کو بالکل پسند نہیں کرتے، اُنھیں شک و شُبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں موآبہ میں کوئی اجنبی مارا جائے تو کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔ اگر ہم اپنا مُنہ بند رکھیں اور یوطابا خوش گوار حالت میں ہُوا تو ہمارا کام بن سکتا ہے۔ مَیں اُس سے کہوں گی کہ وہ اپنی سپاہ کے ساتھ ہمیں میرے باپ، شاہِ احباز کے پاس پہنچا دے۔ مَیں تمھاری احسان مند ہُوں کہ تم نے مجھے ملکہ رُدبا سے بچایا۔ میرا باپ بھی اس کے لیے ذاتی طور پر تمھارا شکر گزار ہوگا۔"

عکران کی طرف بڑھتے ہُوئے تاشیہ نے مجھے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں۔ اس دَور کی مختلف حکومتوں، عکران، احباز اور ملکہ رُدبا کی مملکت کے بارے میں، اُن مملکتوں کے مذاہب اور رسم و رواج کے بارے میں۔ وہاں کے رہن سہن اور طور طریقوں کے بارے میں کئی انکشاف کیے۔ تاشیہ نے بتایا کہ قبردتیوں کی حیثیت مذہبی نہیں ہے بلکہ انھیں ساحر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بدی کی علامت ہیں۔ لوگ ڈرتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔ انھیں مجبوراً قبول کیا جاتا ہے کیوں کہ ان کے قبضے میں بدی کی قوتیں ہیں اور وہ عوام الناس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً قربانی کے ذریعے قبردتیوں کو خوش رکھا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں پر بدی کی قوتیں نہ چھوڑیں اور لوگ محفوظ و مامون رہیں۔ کچھ عرصے سے محسوس کیا جا رہا تھا کہ قبردتی مملکتوں کے معاملات میں دخل دینے لگے ہیں اور اُن پر اپنا اثر و رسوخ جمانا چاہتے ہیں۔ یہ بات بادشاہوں اور ملکاؤں کو پریشان کیے ہُوئے ہے۔ اس لیے سبھی اپنی اپنی جگہ ان سے نجات کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔

شہزادی تاشیہ نے مجھے معلومات سے مالا مال کر دیا تھا۔ میں ایک اجنبی تھا اور نہ جانے کتنے عرصے تک مجھے یہاں رہنا تھا۔ یہ باتیں میرے لیے بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے صحیح اور دُرست معلومات بھی مؤثر ہتھیاروں سے کم نہیں ہوتیں۔

ہم ایک ٹیلے پر پہنچ گئے تھے۔ نیچے عکران اپنی شان و شوکت کے ساتھ دُور تک پھیلا ہُوا تھا لیکن اس وقت وہاں غیر معمولی بے چینی اور نقل و حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک وسیع میدان میں دُور دُور تک خیمے نصب تھے۔ اُسے جشن تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن بظاہر سماں ایسا ہی تھا۔ خیموں سے باہر سپاہیوں اور افسروں کا لشکر مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہُوا تھا۔ سب کے سب مسلح تھے لیکن ناؤ نوش اور عیش کوشیوں میں مصروف تھے۔ غازے میں لپی پتی عورتیں، اُن کے درمیان گردش کر رہی تھیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟" تاشیہ بڑبڑائی۔ "یل نے

"میں بھی کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں تبصرہ کیا۔

دفعتاً مجھے اپنے پیچھے کسی وزنی ہتھیار کی جھنکار سنائی دی۔ میں نے برق رفتاری سے پلٹ کر تلوار سونت لی۔ تاشیہ بھی میرے ساتھ ہی گھوم گئی تھی۔

دیکھا تو سامنے سے سپاہیوں کا ایک دستہ چلا آ رہا تھا۔ آگے آگے اُن کا افسر تھا۔ افسر پر نظر پڑتے ہی تاشیہ کے چہرے کا کھچاؤ ختم ہو گیا۔ اُس نے میرا تلوار والا ہاتھ پکڑتے ہوئے سرگوشی کی "خطرے کی کوئی بات نہیں، سرفروش! وہ شخص جو سب سے آگے ہے، قنبر ہے۔ وہ سپہ سالار کا نائب اور یوطابا کا خاص آدمی ہے . . . تم خاموش رہنا، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔"

قریب آ کر دستہ رُک گیا اور قنبر آگے بڑھ کر تاشیہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ اونچے قد کا مضبوط آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر داڑھی تھی اور سر کے بال چاندی کی طرح سفید تھے۔ اس کے سر پہ آہنی خود تھا جس پر اُڑتے ہوئے عقاب کی شبیہ کندہ تھی۔ اس کے طور طریقے میں رُعب اور دبدبہ تھا۔ اُس نے مجھ پر سرسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی، جیسے میں وہاں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وہ بڑے انہماک سے تاشیہ کو دیکھ رہا تھا پھر اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے سلامی دینے کے انداز میں تلوار سر تک اُٹھاتے ہوئے کہا "ایک عرصے بعد شہزادی کو دیکھنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ شہزادی پہلے بھی خوب صورت تھی اور اب تو اس حُسن میں چار چاند لگ گئے ہیں۔"

"تم وہی پُرانے، ہو، ذرا بھی نہیں بدلے۔" تاشیہ اس کے چاندی جیسے چمک دار بالوں کو چھوتے ہوئے ہنس کر بولی "لیکن قنبر! یہ عکران میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ سپاہ کیوں جمع ہے؟"

"یہ راخیل کا شاخسانہ ہے۔ وہ ایک بار پھر ہم پر حملہ کرنے آ رہا ہے۔ وہ اپنے قزاقوں کے ساتھ سمندر سے نکل آیا ہے۔ راستے میں اُس نے کئی بستیوں کو لوٹا، جگہ جگہ آگ لگائی اور سینکڑوں افراد کو تہ تیغ کر دیا۔ ہمارے مخبروں کی اطلاع کے مطابق وہ بہت جلد عکران میں قدم رکھنے والا ہے۔ اگر اس کا راستہ نہ روکا گیا تو وہ یہاں بھی تباہی و غارت گری کا بازار گرم کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عکران کا ہر سپہ گر میدان میں جمع ہو رہا ہے۔ راخیل کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے زور و شور سے تیاری کی جا رہی ہے۔"

قنبر ابھی تک مجھے نظر انداز کیے ہوئے تھا، جو میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ وہ شہزادی تاشیہ کو غور سے دیکھتے ہوئے دوبارہ بولا "میں تمھاری یہاں اچانک موجودگی پر حیران ہوں شہزادی! لیکن میں وجہ نہیں پوچھوں گا کیوں کہ مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ اس وقت میں عجلت میں ہوں، میرے جوان بھوک سے بے تاب ہو رہے ہیں۔ ہم پڑاؤ میں جا کر آرام کریں گے۔ لگتا ہے، بھوک تمھیں بھی ستا رہی ہے۔ کیا تم شاہ یوطابا سے مل چکی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، ہمارا ارادہ شاہ یوطابا کے ساتھ دسترخوان پر شریک ہونے کا ہے۔" تاشیہ نے مسکرا کر کہا۔

لفظ 'ہمارا' پر قنبر نے پہلی بار مجھ پر نظر ڈالی۔ اس کی نگاہ میں، میرے لیے تحقیر تھی۔ تاشیہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی "اس کی طرف سے مطمئن رہو، میں اس کی ضامن ہوں۔"

تاشیہ کی یقین دہانی کے باوجود قنبر کے روّیے میں تبدیلی نہ آئی تو وہ دوبارہ بولی "یہ میرا خاص آدمی ہے۔ یہ آزاد ہے اور ہتھیار سجانے کا حق رکھتا ہے۔ البتہ یہ ہماری حیثیت اور مرتبے کا نہیں ہے لیکن اس نے غیر معمولی خدمت کی ہے اس لیے میں اس کا خیال رکھتی ہوں۔"

قنبر نے اس بار سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا پھر تاشیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "کہا جاتا ہے، راخیل دُشمن پر غلبہ پانے کے لیے اپنی عیارانہ چال بازی سے کام لیتا ہے۔ حملہ آور ہونے سے پہلے وہ دُشمنوں کے درمیان اپنے مخبر چھوڑ دیتا ہے۔ مخبر آبادی میں گھل مل جاتے ہیں۔ ہر طبقے کے افراد سے ربط و ضبط بڑھا لیتے ہیں اور کمزوریاں تلاش کر کے راخیل کو آگاہ کر دیتے ہیں پھر راخیل کے لیے اس مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چٹکی بجانے کی بات ہوتی ہے۔"

تاشیہ کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے اور وہ قدرے سخت لہجے میں بولی "میں کہہ چکی ہوں کہ اس کی میں ضامن ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

قنبر معذرت چاہنے کے انداز میں بولا "عام حالات میں یہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہوتا لیکن اس وقت حالات دوسرے ہیں۔ تم ابھی نوخیز اور نوعمر ہو۔ تم وہ باتیں نہیں جانتیں جو ایک سپاہی جانتا ہے۔ اس وقت عکران جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور راخیل کے مخبر بہت چالاک اور فطین ہیں۔ اگر یہ شخص تمھارے بقول ایک آزاد شخص ہے اور ہتھیار سجانے کا حق رکھتا ہے تو یہ مسلح کیوں نہیں ہے۔ اس کا خود، زرہ، ڈھال اور برچھی بھالا کہاں

ہیں؟ اس کے پاس ایک کند تلوار کے سوا کچھ بھی نہیں نظر آتا اور پھر اس کا لباس؟ کیا یہ ایک جاں باز کا لباس ہے؟ اس کے جسم پر سوائے ایک چوغے کے کچھ نہیں ہے اور یہ چوغہ بھی کہیں سے چُرایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

میں بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ پر قابو رکھ سکا۔ تاشیہ بھی بڑی کوشش سے ہنسی روک پائی اور قنبر کو گھور کر بولی "مجھے تمھاری بات پسند نہیں آئی۔ میں ایک بار پھر کہوں گی کہ یہ شخص جس کا نام سرفروش ہے، اس کی ذمّے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اب میں اپنی بات دُہرانا پسند نہیں کروں گی۔ ہمیں شہر تک لے چلو اور مجھے مزید مشتعل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں اپنے عم زاد، شاہ یوطابا کو خود ہی سمجھا لوں گی۔ اس سلسلے میں تمھیں یا کسی اور کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ گئے تم؟"

قنبر، تاشیہ کے آگے جُھکا اور پھر ایک طرف ہٹتے ہوئے مؤدب لہجے میں بولا "مجھے افسوس ہے شہزادی! میں نے جو کچھ کہا، اس لیے کہا کہ آج کل ہوا یہ ہے ہر اجنبی کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ شاہ یوطابا کے وفادار اور نمک خوار کی حیثیت سے میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔"

قنبر اپنے دستے کو لے کر ٹیلے سے اُترنے لگا۔ میں اور تاشیہ، دستے سے کافی پیچھے رہ کر چل رہے تھے۔ راستے میں، میں نے تاشیہ سے پوچھا "یہ راخیل کون ہے؟"

"اسے ایک عفریت سمجھو۔ وہ بحری قزاق ہے۔ کچھ لوگ اسے سُرخ شیطان بھی کہتے ہیں، کیوں کہ اس کے چہرے پر سُرخ داڑھی ہے۔ وہ چند سال بعد اپنے قزاقوں کے ساتھ سمندر سے نکلتا ہے پھر آبادیوں کو لُوٹ کر اور انھیں تہس نہس کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ وہ ترس اور رحم جیسے الفاظ سے ناواقف ہے۔ اس کے ساتھی بے حد وحشی اور سفاک ہیں۔ لُوٹ مار اور عصمت دری اُن کا شعار ہے اور راخیل تو وحشیوں کا وحشی ہے۔ اس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ دیو نژاد ہے۔ کوئی حربہ، کوئی ضرب اس پر کام نہیں کرتی۔ اُسے کسی طرح بھی ہلاک نہیں کیا جا سکتا . . ." تاشیہ کچھ دیر خاموش رہی پھر سرگوشی میں بولی "میں نہیں سمجھتی کہ یوطابا جیسا احمق اس کے آگے ٹھہر سکے گا۔ بہادر ہونے کے باوجود شکست ہی اس کا مقدر ٹھہرے گی۔"

"لیکن یوطابا کے علاوہ یہاں اور بھی تو حکمران ہیں۔ سب مل کر راخیل کا مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟ سب مل جائیں تو اسے ختم کرنا دُشوار نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے۔" تاشیہ بولی "سب کے سب آپس میں ناچاقی کے شکار ہیں۔ دل ہی دل میں ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں اور بغض و عناد رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی حریف مملکتیں ختم ہو جائیں تاکہ اُن کے ہاتھ پیر پھیلیں۔ مشترکہ مقاصد کے لیے بھی اُن سب کو ایک جگہ جمع کرنا بہت مشکل ہے۔"

"مشکل تو ہے، مگر ناممکن نہیں ہے۔ اگر وہ سب مل کر ایک جنگی مشاورتی جماعت قائم کر لیں تو راخیل کے دانت کھٹے کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ سمندر تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور کبھی خشکی کا رُخ نہیں کرے گا۔"

"اور یہ جنگی مشاورتی جماعت کون قائم کرے گا . . . ؟ میں؟" تاشیہ استہزا کے ساتھ بولی "تمھیں شاید معلوم نہیں کہ یہاں عورتوں کو جنگ کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کوئی بات نہیں سُنی جاتی، کوئی مشورہ قبول نہیں کیا جاتا . . . بہرحال ایک بات طے ہو گئی کہ تم بے حد ذہین اور دانش مند آدمی ہو۔ بلا کی سمجھ بُوجھ رکھتے ہو۔ میں کوشش کروں گی کہ یوطابا کو تمھاری طرف متوجّہ کر دوں کہ وہ اس نازک گھڑی میں تمھارے مشوروں سے فائدہ اُٹھائے لیکن اس عرصے میں، میں تم سے دُور رہوں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں، تمھیں شاہی محل میں نہ لے جا سکوں گی۔ تم مجھ سے الگ رہو گے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں تمھارے لباس، خوراک اور قیام کا بندوبست کر دوں گی۔ جب میں یوطابا کو ہموار کر لوں گی تو اُس سے تمھاری ملاقات کراؤں گی۔ اب یہ تمھاری ذہانت پر منحصر ہے کہ تم اُسے متاثر کر لیتے ہو یا نہیں . . . بس تم سے ایک درخواست ہے کہ اپنی زبان پر اور اپنے اشتعال پر قابو رکھنا۔"

ہم ٹیلے سے اُتر کر پڑاؤ کے قریب پہنچ گئے۔

قنبر نے اپنے دستے کو رخصت کر دیا اور اب ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو تاشیہ نے اسے ایک طرف لے جا کر کچھ بات کی۔ قنبر اثبات میں سر ہلاتا رہا پھر اس نے ایک سپاہی کو بُلایا اور ضروری ہدایات دے کر مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ جب میں تاشیہ سے رُخصت ہو رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاموش التجا دیکھی۔ اور اس التجا کا مفہوم میرے ذہن میں بالکل واضح تھا . . . کہ "دیکھو سرفروش! خود پر قابو رکھنا!"

★★

وہ ایک تاریک اور سیلن زدہ جھونپڑا تھا، جس میں، میں نے

اپنا سارا دن بے کیفی اور بے زاری میں گزارا تھا۔ چھت میں ایک سوراخ تھا جو ہوا اور روشنی کا واحد وسیلہ تھا۔ میری تلوار لے لی گئی تھی اور جھونپڑے کے دروازے پر ایک نگراں متعین کر دیا گیا تھا۔ نگراں کیا تھا، تیجا خاصا مسخرا تھا۔ اس کی ہئیت کذائی دیدنی تھی۔ چھوٹا قد، سر پر چھدرے بال، خرگوش جیسے ہونٹ اور ٹھوڑی پر داڑھی کے نام پر دو چار بال۔ میرے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ نہیں تو مزاحمانہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنا نام سِلارو بتایا تھا۔ وہ ایک غلام تھا، جسے اب آزاد کر دیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں، وہ مجھے بالکل پسند نہ آیا تھا۔

مَیں یوں بھی بے حد بیزار تھا لیکن جب چھت کے سوراخ سے مجھے شام کا پہلا تارہ دکھائی دیا تو میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا، غُصّہ نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ تاشیہ، قنبر کے حوالے کر کے یا تو مجھے بھول گئی تھی یا پھر نظر انداز کر دیا تھا۔ قنبر کے آدمی نے مجھے لا کر اس جھونپڑے میں دھکیل دیا تھا، پھر دروازہ مقفل کرنے اور ایک نگراں متعین کرنے کے بعد غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کسی نے میری خبر تک نہیں لی تھی۔

رات ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے کیڑے مکوڑے نکل آئے اور انھوں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ آدمیوں سے جارحانہ جنگ لڑتے لڑتے مَیں نے اُن حشرات سے مدافعتی جنگ شروع کر دی۔ اچانک جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور سِلارو داخل ہُوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چوبی طشت تھا، جس میں گوشت کے پارچے اور سیاہ روٹی رکھی ہُوئی تھی۔ ساتھ ہی ایک پیالہ بھی تھا جس میں موجود مشروب سے ابھی تک جھاگ اٹھ رہی تھی۔

سِلارو کے دائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بھالا دبا ہُوا تھا۔ اس نے دُور سے بھالے کی نوک میری طرف اُٹھاتے ہُوئے کہا: "مالک اتم اُس کونے میں چلے جاؤ۔ مجھے اتم سے ڈر لگتا ہے۔ بُرمزد کی قسم... تمھارے بازو ایسے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط سانڈ کی گردن دبا سکتے ہیں۔"

وہ اپنا فرض انجام دے رہا تھا، اس لیے مَیں مُسکراتا ہُوا، ایک گوشے میں چلا گیا اور وہیں سے پوچھا: "مَیں اِس ڈربے میں کتنے دن بند رہوں گا؟"

جواب میں سِلارو کے خرگوش نُما ہونٹ پھیل کر رہ گئے۔ شاید وہ مُسکرا رہا تھا اور وہ مُسکراہٹ لاعلمی کا اظہار تھی۔ کھانا رکھنے کے بعد وہ دروازے کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ مَیں نے روٹی کے ٹکڑے پر گوشت کا پارچہ رکھا اور مُنہ میں ڈال کر چبانے لگا پھر مشروب کا گھونٹ لیتے ہُوئے بولا: "مَیں تمھارا شکرگزار ہُوں، دوست! اگرچہ تم میرے نگراں ہو... مگر میں تمھیں نگراں نہیں سمجھتا۔ مجھ پر یہ قید تم نے نہیں مسلط کی... بلکہ تم ایک درمیانی کڑی ہو، مجبورِ محض۔ میں تمھارا اس لیے شکرگزار ہُوں کہ اس سرزمین پہ قدم رکھنے کے بعد تمھارے توسط سے مجھے پہلی بار دانہ پانی نصیب ہُوا ہے ورنہ وہ لوگ تو مجھے بھول ہی گئے تھے۔"

سِلارو کے چہرے کی کیفیت تبدیل ہو گئی۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی دھنسی ہُوئی آنکھیں کسی اندرونی جذبے سے چمک اٹھیں۔

"اس تخاطب کے لیے تمھارا بھی شکریہ مالک!" آخر وہ بول اُٹھا: "غریب سِلارو سے آج تک کسی نے ایسے لہجے میں بات نہیں کی۔ میرے کانوں نے کبھی ایسے مہربان الفاظ نہیں سُنے۔ مجھے ہمیشہ ملامتیں، تضحیک اور ٹھوکریں ہی ملتی رہی ہیں۔ مَیں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے الفاظ سُننے کا بھی اہل ہُوں۔ میرے نزدیک محبت کے الفاظ اپنا مفہوم کھو چکے تھے۔ اس پذیرائی کے لیے تمھارا بہت بہت شکریہ مالک!"

"مَیں کب تک یہاں قید رہوں گا؟" مَیں نے دوبارہ پوچھا۔

"مَیں اس کا جواب دوں گا تو وہ جھوٹ ہی ہوگا مالک! اور سِلارو، جو بڑا گناہگار ہے، اس نے سب کچھ سیکھا ہے، مگر جھوٹ بولنا نہیں سیکھا۔ صحیح جواب تو شاہ یوطابا ہی دے سکے گا۔ صبر کرو، صبر، میری طرح... میں تم سے مختلف نہیں ہوں۔ بس فرق یہ ہے کہ تم اس جھونپڑے میں قید ہو اور میں آزاد رہتے ہُوئے بھی حالتِ قید میں ہُوں۔"

دفعتاً دروازے پر ہلکی سی دستک سُنائی دی۔

سِلارو بوکھلا گیا اور فوراً ہی دروازے تک گیا۔

دروازے سے باہر جو کوئی بھی تھا، سرگوشی میں اُس سے گفتگو کرنے لگا۔ سِلارو کی حالت غیر تھی۔ اس کے مُنہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ مَیں نے اپنی سماعت پر زور ڈالا تو محسوس ہوا کہ باہر سے آنے والی آواز نسوانی تھی۔

میرا دِل شدّت سے دھڑکنے لگا۔

کیا وہ تاشیہ تھی؟ کیا اُسے میری حالت پر رحم آ گیا تھا؟ خُدا کا شکر ہے کہ وہ مجھے بھولی نہیں تھی، ورنہ شاہی محل میں داخل ہونے کے بعد بیرونی دُنیا سے رشتے کٹ جانا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی ہے۔

کچھ دیر بعد سِلارو پلٹا تو وہ بہت خوش دکھائی دیا۔ اُس نے میرے سامنے ہتھیلی کھولی تو اس پر ایک بڑا سا طلائی سکہ چمک رہا تھا۔

"غریب سِلارو کی قسمت ہی چمک گئی۔ اب تو میں بہت کچھ کر سکوں گا۔ آج خدائے ہُرمزد مجھ پر بہت مہربان ہے۔" وہ سرشاری سے بولا۔

"بکواس بند کرو۔" مَیں نے غُصّے سے کہا: "کیا شہزادی تاشیہ آئی تھی؟ کیا وہ میرے لیے کوئی پیغام چھوڑ گئی ہے؟"

"تم نے غلط اندازہ لگایا مالک! دروازے پر شہزادی تاشیہ نہیں بلکہ ملکہ رومہ کھڑی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔ جب تم اس شرط پر قائم رہنے کا وعدہ کر لو گے تو وہ اندر آئے گی اور تم سے کچھ بات کرے گی۔ بولو! رازداری کا وعدہ کرتے ہو؟"

"اُسے اندر لے آؤ، بے وقوف! مَیں اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔" مَیں دبے دبے جوش کے ساتھ بولا: "وہ یقیناً شہزادی تاشیہ کی طرف سے کوئی پیغام لے کر آئی ہے۔"

"ٹھیک ہے مالک اتم رازداری کا خیال رکھنا، ورنہ دو بڑوں کے بیچ میں یہ غریب سِلارو مارا جائے گا۔" وہ پلٹا اور تیزی سے دروازے کی طرف چلا گیا۔

وہ جیسے ہی دروازے سے نکلا مجھے خُوشبو کی زبردست لپٹیں محسوس ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی بھاری لبادے میں لپٹا ہُوا ایک نسوانی وجود اندر آ گیا۔ ملکہ رومہ کا قد پانچ فٹ سے کسی طرح کم یا زیادہ نہیں تھا۔ اس کے بال سُنہرے تھے اور طلائی تاروں سے بندھے ہُوئے تھے، اس کے چہرے پر سفید نقاب تھی۔ وہ سُبک رفتاری سے میرے قریب آئی اور بولنے میں سبقت کی: "تمھارا نام سرفروش ہے؟ وہی جو شہزادی تاشیہ کے ساتھ یہاں آیا ہے؟"

"ہاں، مَیں وہی ہُوں، ملکہ عالیہ!" مَیں نے مؤدب ہو کر کہا۔

اس بار ملکہ رومہ فوری طور پر کچھ نہ بولی بلکہ دیر تک میری طرف انہماک سے دیکھتی رہی پھر اس نے ایک گہری سانس لیتے ہُوئے کہا: "تاشیہ نے کم از کم ایک بات تمھارے بارے میں بالکل سچ کہی ہے کہ تم ایک لاجواب جانور ہو، صحیح معنوں میں ایک وحشی آدمی۔" وہ رُکی اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ بولی: "تاشیہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم بڑے دانا اور بینا آدمی ہو، تم میں پیش بینی کی بھی صلاحیت ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے؟ ہمارے ملک میں ایسے شخص کو ساحر کہتے ہیں۔ کیا یہ بات سچ ہے؟"

"ہاں، یہ سچ ہے، ملکۂ عالیہ!" مَیں نے اُدب سے جھکتے ہُوئے کہا: "میرا علم کہتا ہے کہ تمھیں ایک ایسے ہی ساحر کی ضرورت ہے۔"

"ہاں، سرفروش! تم سچ کہتے ہو۔ مجھے ایک ساحر کی ضرورت ہے، جو میرے لیے کچھ کر سکے لیکن مجھے ایک جانباز کی بھی ضرورت ہے۔ تاشیہ نے بتایا ہے، تم زبردست لڑاکے بھی ہو۔"

ملکہ رومہ نے گفتگو کے دوران میں کئی بار تاشیہ کا نام لیا تھا لیکن مَیں نے پہلی بار محسوس کیا کہ تاشیہ کا نام لیتے وقت اس کے لہجے میں ایک عجیب سی کاٹ پیدا ہو جاتی ہے جو تاشیہ سے نفرت اور کدورت کی عکاسی کرتی تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی، مَیں فوراً سنبھل گیا۔ تاشیہ نے بتایا تھا کہ وہ ملکہ رومہ کو ناپسند ہی نہیں کرتی... بلکہ اُس سے نفرت بھی کرتی تھی۔ ملکہ رومہ یقیناً تاشیہ سے حسد میں مبتلا ہے اور جانے کیا سازش اور شیطانی منصوبہ لے کر آئی ہے؟

مَیں نے محتاط لہجے میں کہا: "ہاں ملکہ عالیہ! تاشیہ نے تمھیں دُرست بتایا ہے۔ مَیں اپنے دُشمنوں کو بہت بُری طرح موت سے ہمکنار کرتا ہُوں۔"

جھونپڑے میں آویزاں مشعل کی زرد اور بیمار روشنی میں وہاں کا ماحول بے حد پُراسرار ہو گیا تھا۔ ملکہ رومہ کسی سوچ میں گُم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چونک پڑی اور میرے قریب آتی ہُوئی بولی: "وعدہ کرو سرفروش کہ یہاں ہمارے درمیان جو گفتگو ہو گی، وہ ہمیشہ راز رہے گی۔"

"مَیں اس ملاقات کو ہمیشہ راز ہی رکھوں گا۔ سِلارو کے ذریعے یہ بات کچھ دیر پہلے بھی میں تم تک پہنچا چکا ہوں۔"

"وقت بہت کم ہے، اس لیے میں اختصار سے کام لوں گی لیکن اس کے باوجود تم میرے معاملے کو سمجھ لو گے۔ بہت پہلے، جب میری شادی نہیں ہُوئی تھی تو قبروتیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک روز مَیں موآبہ پر حکمرانی کروں گی۔ قبیلہ قبروت کی بوڑھی بڑی پجارن نے، جو اب مر چکی ہے، مجھے بتایا تھا کہ میری شادی کسی بادشاہ سے ہو گی۔ اس کی یہ بات سچ نکلی، میری شادی یوطابا سے ہو گئی، اس لیے مجھے یقین ہے کہ دوسری بات بھی سچ ثابت ہو گی، یعنی میں کسی نہ کسی روز موآبہ کی حکمران بن جاؤں گی لیکن اس پیش گوئی کے مطابق میرے حکمراں بننے میں ایک اجنبی میری مدد کرے گا۔ وہ کسی دور

دیس اور کسی اجنبی سرزمین سے آیا ہوگا۔ وجیہہ اور بہادر ہوگا۔ عقل مند، بے پناہ قوت کا مالک، زبردست لڑاکا اور جانباز بھی ہوگا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ شخص تمھی ہو۔"

میں خاموش رہا۔

"جب میں کنواری تھی تو نجومیوں کے قول و فعل پر مجھے یقین نہیں تھا۔ میں انھیں جھوٹا سمجھتی تھی لیکن اب تمھیں دیکھا تو معلوم ہُوا کہ وہ جھوٹے نہیں بلکہ سچے ہی ہوتے ہیں۔"

موقع، ایسا تھا کہ میرا خاموش رہنا ہی مناسب تھا، چنانچہ میں چپ رہا۔ وہی بولتی رہی۔

"میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تاشیہ تم سے بے حد متاثر ہے۔ اگر تم بھی اس میں دل چسپی لیتے ہو تو میں تمھارے لیے راہ ہموار کروں گی۔۔ تاشیہ یہاں آنے کے بعد فوراً مجھ سے ملی اور تمھارے بارے میں بتانے کے بعد سفارش کی کہ میں کسی طرح تمھیں جنگی مشاورتی جماعت میں شامل کروا دوں چنانچہ میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ تم آج رات مشاورتی جماعت میں بیٹھو گے۔"

"مگر مگر میں نے تاشیہ سے یہ تو نہیں کہا تھا۔" میں چونک پڑا۔ "بلکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ اگر تمام حکمران مِل کر جنگی مشاورتی جماعت قائم کر لیں تو وہ راخیل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ملکہ رومہ مسکرا دی۔ "مگر اس میں تھوڑا سا میرا اپنا اضافہ بھی ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"مشاورتی جماعت میں شریک ہو کر، تم یوطابا کے خاص آدمیوں کو قریب سے دیکھ سکو گے۔"

"مگر کیوں؟ مجھے اس سے کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟ میں تو شہزادی تاشیہ کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے شہزادی کو بہ حفاظتِ تمام اس کے باپ شاہ اعجاز تک پہنچانا ہے۔"

"صبر، صبر۔۔" ملکہ رومہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "میں تمھارے تمام سوالوں کے جواب ایک ساتھ نہیں دے سکتی۔ اپنے پہلے سوال کا جواب سُنو۔ تمھارا مشاورتی جماعت میں بیٹھنا اور یوطابا کے خاص آدمیوں کو قریب سے دیکھنا یا سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ یوطابا کی ہلاکت کے بعد انھیں تمھی سنبھالو گے۔۔۔ رہی شہزادی تاشیہ۔۔ تو وہ اس قابل نہیں ہے کہ سفر کر سکے۔ وہ بیمار ہے اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی بیماری کس قدر طول کھینچے گی۔"

میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

ملکہ بہت گہرا کھیل کھیل رہی تھی۔ ایک طرف تو وہ میرے ذریعے یوطابا کو اپنی راہ سے ہٹا کر عکران کی ملکہ بننا چاہتی تھی، دوسری طرف، تاشیہ سے اُس کی نفرت اس حد تک بڑھی ہُوئی ہے کہ وہ ہماری آپس کی دل چسپی کو سمجھنے کے باوجود مجھے اُس سے چھین کر اپنے تصرف میں لانا چاہتی تھی۔

دفعتاً مجھے محسوس ہُوا کہ تاشیہ کی زندگی خطرے میں ہے۔۔۔ وہ بیمار نہیں ہے بلکہ اس خبیث ملکہ نے اُسے کسی مہلک اور مضر رساں دوا کے زیرِ اثر رکھا ہوگا۔ کیا یہ تاشیہ کی زندگی کا چراغ گُل کر دینا چاہتی ہے؟ یہ تاشیہ کو اس طرح ختم کرے گی کہ کسی کو اس پر شبہ تک نہیں ہوگا، سب یہی سمجھیں گے کہ تاشیہ کسی مہلک بیماری کا شکار ہُوئی اور جاں بر نہ ہو سکی۔ اس ہوس پرست عورت نے ایک تیر سے دو شکار کا منصوبہ بنایا تھا۔ تاشیہ اور یوطابا کا خاتمہ، پھر عکران اور سرفروش پر قبضہ۔

میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ اس سازشی ملکہ کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہونے دوں گا لیکن اس وقت صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ میں کھُل کر اس سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے آج رات بہرحال جنگی مشاورتی جماعت میں شریک ہونا تھا۔ اس کے بعد کی صورتِ حال کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت تھا لیکن ایک بات طے تھی کہ میں موقع ملتے ہی تاشیہ کو لے کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے تاشیہ کو ہر حال میں اس کے باپ تک پہنچانا تھا۔ وہ ملکہ زُدہا سے بچ نکلی تھی لیکن ملکہ رومہ کے چنگل میں پھنس گئی، آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔

میں سوچوں کی دُنیا سے واپس آیا تو دیکھا کہ رومہ میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگے تھے؟" اس نے پُوچھا۔

"ایک دو باتیں ہی سوچنے لگا۔۔" میں نے بات بنائی۔ "تم نے تو مجھے امتحان میں ڈال دیا ہے۔"

"جری اور بہادر لوگوں کا کام ہی آزمائش میں پڑتے رہنا ہے، اس سے انھیں جِلا ملتی ہے۔" رومہ مسکراتی ہُوئی بولی۔

دفعتاً وہ میرے بے حد قریب آ گئی۔۔۔

اس کے لبادے سے اُٹھتی ہُوئی تیز خوشبو سے میرا چہرہ تمتمانے لگا۔ اُس نے اپنا سفید، ریشمیں ہاتھ میرے شانے پر رکھا، اور مخمور لہجے میں بولی۔ "سرفروش! تم اپنے دل میں میرے لیے کیسے جذبات محسوس کرتے ہو؟"

دِل تو یہی چاہا کہ کہہ دوں، نفرت اُبلی پڑ رہی ہے میرے وجود سے۔۔ لیکن یہ کہنا، اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن کم کرنے کے مترادف تھا، وہ ایک خونخوار عورت تھی۔ میں نے خود کو سنبھالا، اور بات بناتے ہُوئے کہا۔ "اس سلسلے میں، میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں ملکہ عالیہ! کہ میں ایک مرد ہوں کسی خوب صورت اور دل کش عورت کے لیے کسی مرد کے دِل میں جو جذبات موجزن ہو سکتے ہیں، وہ میرے دِل میں بھی ہیں اور میں، اس معاملے میں، دوسروں سے مختلف تو نہیں ہو سکتا۔"

"تم نے میری صورت دیکھی ہے؟" اُس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں۔۔"

"دیکھو گے؟" اس نے میری بات قطع کر کے جلدی سے کہا۔

"کفرانِ نعمت کون کرتا ہے۔"

"اچھا تو یہ لو۔۔" رومہ نے ایک جھٹکے سے نقاب، چہرے سے الگ کر دی۔

اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اور رومہ کے چہرے پر زہر خند دوڑ گیا۔

ملکہ رومہ کا چہرہ دو حصّوں میں تقسیم تھا۔ دایاں حصّہ صاف و شفاف اور مخملیں جلد لیے ہُوئے تھا۔ اس حصّے کی رنگت گلابی تھی۔ ہونٹ شاداب اور آنکھ بے حد پُرکشش تھی لیکن دوسرا حصّہ بے حد مکروہ تھا۔ اس حصّے پر آنکھ نہیں تھی بلکہ ضائع ہو چکی تھی۔ رومہ ایک چہرہ رکھنے کے باوجود دو چہروں کی مالک تھی۔ ایک چہرہ حسین اور دوسرا بھیانک۔۔ چہرہ بیچوں بیچ تقسیم ہُوا تھا جیسے کسی نے تلوار سے الگ کر دیا ہو۔

"کیا خیال ہے؟" اُس نے زہر میں ڈوبی ہُوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ "اب تمھارے دل میں میرے لیے کیسے جذبات ہیں؟"

میں خاموش رہا۔

اب مزید حاشیہ آرائی اور لیپا پوتی، مکاری ہی کے مترادف ہوتی۔ رومہ نے دوبارہ چہرے پر نقاب ڈال لی اور دُکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "کبھی میں واقعی دل کش ہُوا کرتی تھی لیکن بحری قزاقوں کے ایک حملے میں کچھ اس طرح زخمی ہُوئی کہ کسی کو صُورت دکھانے کے قابل بھی نہیں رہ گئی اور کسی کو کیا کہوں، آئینے میں خود اپنی شکل دیکھتی ہُوں تو خوف سے چیخ پڑتی ہُوں۔ اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔ قزاق مجھے مُردہ سمجھ کر، چھوڑ گئے تھے۔ کاش وہ مجھے مار ہی ڈالتے۔" رومہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد افسردہ لہجے میں بولی۔ "اس واقعے کا دردناک اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس حملے کے دوران یوطابا مجھے تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، بزدل، بھگوڑا اور خود غرض۔" رومہ کے لہجے سے نفرت اُبل رہی تھی۔ "اور اب وہ ہر اُس عورت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، جو ایک بار بھی اس کے قریب سے گزر جاتی ہے۔"

"مجھے بے حد افسوس ہُوا، ملکہ عالیہ!" میں نے سر جھکاتے ہُوئے کہا۔

واقعی مجھے بے حد صدمہ پہنچا تھا۔۔۔

"اگر یوطابا اُس وقت نہ بھاگتا تو شاید میری اب یہ کیفیت نہ ہوتی۔"

"تمھارا خیال دُرست ہے، ملکۂ عالیہ۔ مرد کو آخر دم تک اپنی عورت کی حفاظت کرنی چاہیئے۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔۔" رومہ نے گہری سانس لیتے ہُوئے کہا۔ پھر وہ قدرے شوخ لہجے میں بولی۔ "اس کے باوجود تمھیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ چہرہ میرے پاس نہیں رہا لیکن میرے پاس ایک ایسا سراپا ہے، جس کی مثال اس سرزمین پر نہیں مِل سکتی۔ اگر تم نے یوطابا کو مار ڈالا تو اسے اپنا انعام سمجھنا۔ تم چاہو گے تو ساری عمر اسے اپنے قریب رکھ سکو گے۔"

اس نے مجھے جو انعام دینے کا وعدہ کیا تھا، اگلے ہی لمحے وہ انعام میرے سامنے بے حجاب کر دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

میرے جسم کا سارا خون میرے چہرے پر کھنچ آیا۔

"اب میں چلوں۔" اس نے خود کو ملفوف کر کے کہا۔ "میری بات ذہن میں رکھنا۔ مشاورتی جماعت سے نمٹنے کے بعد میں دوبارہ تم سے ملاقات کروں گی۔ اب تم جماعت میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سلارد تمھاری رہ نمائی کرے گا۔" یہ کہہ کر وہ جھونپڑے سے چلی گئی۔

اُس کے جاتے ہی سلارد سرپٹ بھاگتا ہُوا آیا۔ "مالک! شاہ یوطابا کے محل میں چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" اس نے ہانپتے ہُوئے کہا۔

"تیاری کیا خاک کرنی ہے۔" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔ "چلو۔ میں تیار ہُوں۔"

★★

مشاورتی جماعت میں شریک، میں ایک کُشادہ لیکن کھُردری سی کُرسی پر بیٹھا ہُوا، خود کو ایک ایسا مُجرم تصوّر کر رہا تھا، جسے موت کی سزا دی جانے والی ہو۔ کمرہ خوب روشن تھا اور فضا میں مچھلی کے تیل کی بُو چکرا رہی تھی۔ ایک بہت بڑے آتشدان

میں آگ جل رہی تھی، جس کے قریب متعدد خونخوار اور جسیم کتے آنکھیں میچے، سو رہے تھے۔ وہ کتے اُسی نسل کے تھے، جس کتے کو مَیں تاشیہ کا دفاع کرتے ہُوئے ہلاک کرچکا تھا۔

اس وقت کمرے میں کل دس آدمی موجود تھے، جن میں میرا واحد شناسا قنبر بھی شامل تھا لیکن وہ مجھے مسلسل نظرانداز کر رہا تھا۔

وہ دس آدمی ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہُوئے تھے۔ ٹھیک میرے سامنے، کمرے کے گوشے میں ایک عمر رسیدہ قبرونی عورت بیٹھی تھی۔ اس کا جسم بھاری لبادے میں لپٹا ہُوا تھا۔ چہرے پر سفید نقاب تھی۔ کمرے میں چکراتے ہُوئے دُھوئیں کی وجہ سے وہ بار بار کھانسنے لگتی تھی۔ اس کے سامنے چوکور شکل میں کسی درخت کی چھال کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھے ہُوئے تھے اور وہ اُن پر کچھ لکھتی جارہی تھی۔

میز کے ایک سرے پر شاہ یوطابا براجمان تھا۔ اس کی حیثیت مشاورتی جماعت کے سربراہ کی تھی۔ اس کے دائیں طرف قنبر تھا اور بائیں طرف ایک کسرتی جسم کا لحیم شحیم، گنجا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ بہت دیر سے بحث میں مصروف تھے۔ موضوعِ بحث میری ذات تھی لیکن بحث کے دوران، وہ مجھے یُوں نظرانداز کیے ہُوئے تھے جیسے میں کوئی بے حد حقیر سی شَے تھا اور میری طرف توجہ دینا ان کے لیے باعثِ توہین تھا۔

اس وقت وہی لحیم شحیم گنجا اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہہ رہا تھا۔ "اس کا کہنا ہے، یہ ایک دانش مند اور زیرک ہے۔ اس کے خیال کے مطابق یہ ایک بہترین لڑاکا اور فنِ حرب کا ماہر ہے لیکن مَیں کہتا ہُوں کہ یہ کچھ اور بھی ہے۔ مَیں اسے سُرخ شیطان کا بھیجا ہُوا بہترین مخبر کہوں گا، لہٰذا اِسے وہی سزا ملنی چاہیے، جو ایک مخبر کی ہوتی ہے... یعنی سزائے موت۔"

"میں اِس سلسلے میں شہزادی تاشیہ کی بات ایک بار پھر دُہراؤں گا۔" قنبر نے مداخلت کی۔ "یہ شہزادی تاشیہ ہے، جو اِس کو دانش مند کہتی ہے۔ وہ قسم کھاتی ہے کہ اس شخص نے اُسے ملکہ رد بلکے آدمیوں سے بچایا ہے اور اس سلسلے میں ایک خوف ناک کتے کو بھی ہلاک کیا تھا۔"

"اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔ ایک معمولی بات کو اتنا بڑھایا کیوں جارہا ہے۔" میز کے دوسرے سرے پر بیٹھا ہُوا ایک بھورے بالوں والا شخص بول اُٹھا۔ "اس سلسلے میں ہمارے ہاں ایک رسم ہے، اُسے کیوں نہیں آزما لیتے؟" آخری جُملہ کہتے ہُوئے اُس نے شاہ یوطابا کی طرف دیکھا۔

اَب مجھے اندازہ ہوچلا تھا کہ میری قسمت کا فیصلہ یوطابا ہی کے ہاتھوں میں ہے، وہی حرفِ آخر تھا۔ میں نے یوطابا کی طرف دیکھا... چالیس کے پیٹے میں، فربہی مائل، ایک سُست اور آرام طلب شخص... جس کی باریک، لمبی مونچھیں اس کی ٹھوڑی تک لٹکی ہُوئی تھیں۔ اس کے سر پر ایک خُود رکھا ہُوا تھا، جس پر تاج کے نمونے کی کندہ کاری کی گئی تھی۔ وہ آگے کو جُھکا ہُوا مسلسل پیئے جارہا تھا۔ بھُورے بالوں والے نے اپنی بات ختم کی تو اُس نے بولنا شروع کیا۔

یوطابا کا لب و لہجہ نسوانیت لیے ہوئے تھا۔ وہ مؤخرالذکر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "جو کچھ تمھاری نظروں کے سامنے ہے، بات اُس سے کچھ آگے ہے، بارقو! اگر شہزادی تاشیہ درمیان نہ ہوتی تو ہم اَب تک اس شخص کو آزما چکے ہوتے یا اسے قبیلہ قبروت کے حوالے کردیتے۔ معاملہ اتنا سہل نہیں ہے، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ شہزادی تاشیہ نے اس کی ذمّے داری لی ہے، وہ اس کی ضامن ہے۔ اگر...."

دفعتاً وہ گنجا، لحیم شحیم شخص زور سے ہنس پڑا اور یوطابا کی بات کاٹتے ہُوئے بولا۔ "مانا کہ شہزادی تاشیہ تمھاری عم زاد ہے، لیکن اس کے سوا اور کیا ہے؟ اُس کی وجہ سے اجنبیوں کے بارے میں قانون تو تبدیل نہیں کیا جاسکتا پھر وہ ایک نوعمر اور ناتجربہ کار دوشیزہ ہے۔ وہ ان معاملات کے بارے میں کیا جانے۔ عکران اس وقت دُشمن کی زد پر ہے۔ سُرخ شیطان کسی وقت بھی چڑھائی کرسکتا ہے۔ اس وقت کسی اجنبی کو پناہ دینا خودکشی کے مترادف ہے۔ یہ یقیناً سُرخ شیطان کا مخبر ہے۔ اس نے شہزادی تاشیہ کو بہلا پھسلا کر رام کرلیا ہے۔ اُسے شیشے میں اُتار لیا ہے۔ میں کہتا ہُوں کہ مزید بحث میں پڑے بغیر اسے فوراً مار ڈالنا چاہیے۔"

یوطابا کا جسم ایک دم تن گیا اور سارا خون جیسے اس کے چہرے پر سمٹ آیا۔ وہ مخاطب کو شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہُوئے بولا۔ "تمھیں میری بات کاٹنے کی جرأت کیسے ہُوئی، ہورسا... زبان کو لگام دو۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ کس سے مخاطب ہو؟"

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہُوئی کہ وہ اپنے بادشاہ کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں۔

یوطابا بات جاری رکھتے ہُوئے بولا۔ "مَیں ایک بار پھر کہوں گا کہ یہ اتنا آسان معاملہ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی نہیں ہے کہ جس ہستی نے اس اجنبی کی ذمّے داری لی ہے اور ضامن بنی ہے، وہ میری عم زاد ہے۔ اہم پہلو یہ ہے کہ وہ شہنشاہِ احباز کی

بیٹی بھی ہے۔ میں شہنشاہِ احباز کا دِل میلا نہیں کرسکتا۔ یہ بات تم سبھی جانتے ہو۔ وہ زبردست، طاقت ور اور جنگ باز ہے...؟"

یوطابا نے شراب کا ایک گھونٹ لیا اور موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہُوئے بولا۔ "اگر تم لوگ اس سلسلے میں میری مدد نہیں کرسکتے تو میں اس اجنبی کو قبیلہ قبروت کے حوالے کردیتا ہوں، وہ اس مسئلے کو بخوبی حل کرلیں گے۔"

"ہُرمزد کی مار ہو، ان قبروتیوں پر اور شہنشاہِ احباز پر، مَیں ان دونوں سے نہیں ڈرتا۔" ہورسا میز پر گھونسہ مارتے ہُوئے بولا۔ "تمھیں ایک دوشیزہ کی زبان پر اتنا بڑا کھیل نہیں کھیلنا چاہیے۔ اس مخبر سے فوراً چھٹکارا حاصل کرلو۔ اس کا سر کاٹ کر سُرخ شیطان کو پہنچادو تاکہ دوسرے مخبروں کو عبرت ہو۔"

ہورسا اس جماعت پر حاوی ہوتا جارہا تھا کہ اچانک قنبر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے اُنگلی اُٹھا کر میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "یہاں موجود لوگوں میں، مَیں واحد شخص ہوں جس نے سب سے پہلے عکران کی حدود میں اس اجنبی کو دیکھا تھا۔ پہلی نظر میں مجھے بھی شبہ ہُوا تھا کہ یہ مخبر ہے اور میں نے اپنے شُبہے کا اظہار شہزادی تاشیہ سے بھی کردیا تھا لیکن اس نے میری بات سختی سے رَد کردی تھی۔ افسوس کہ شہزادی تاشیہ کو یہاں نہیں بُلایا جاسکتا۔ یہ ہماری روایت کے خلاف ہے کہ کسی عورت کو اس قسم کی محفلوں میں شریک کیا جائے۔ اس کے علاوہ شہزادی شدید بیمار بھی ہے، مسلسل غفلت اور بے ہوشی کی کیفیت میں رہتی ہے، اس لیے اُس کے پاس جا کر بھی کچھ نہیں پوچھا جاسکتا۔" قنبر ذرا دیر کے لیے رُکا اور محفل کے ارکان پر نظر دوڑاتے ہُوئے دوبارہ بولنے لگا۔ "یہ تمام باتیں اپنی جگہ لیکن ہم ایک سنگین حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ سُرخ شیطان اپنے درندوں کے ساتھ ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور ہم بجائے اس کے بارے میں کچھ سوچنے کے ایک اجنبی کو پکڑ کر اس پر اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہے ہیں۔"

مَیں نے قنبر کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ شخص میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ مَیں اُسے اپنا دوست سمجھوں یا دُشمن؟ آخر وہ میری حمایت کیوں کر رہا تھا؟ کیا شہزادی تاشیہ کی وجہ سے؟ قنبر مسلسل بولے جارہا تھا۔ "یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہیں ہے، جتنا اسے سمجھا جارہا ہے۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا حل بے حد آسان ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسا قانون ہے جس کے تحت ہم اس مشکل سے نمٹ سکتے ہیں۔ اجنبیوں کے لیے ہمارے ہاں کا قانون ہے کہ اُسے ہمارے کسی آدمی سے دست بہ دست لڑنا ہوتا ہے۔ اس طرح یا تو وہ مارا جاتا ہے یا پھر سُرخ رو ہونے کی صورت میں ہم اُسے گلے لگا لیتے ہیں اور وہ ہم میں شامل ہوجاتا ہے... مَیں سمجھتا ہُوں کہ اس میں شہزادی تاشیہ کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور نہ ہی شہنشاہِ احباز کی ناراضگی کا سوال پیدا ہوتا ہے کیوں کہ یہ سب کچھ ایک قانون کے تحت ہوگا، اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ شہنشاہِ احباز قانون کا کتنا احترام کرتا ہے۔"

ایسا لگتا تھا جیسے محفل کے ارکان کو قنبر کی یہ بات بے حد پسند آئی ہو۔ یوطابا کے چہرے کا تناؤ بھی کم ہوگیا تھا۔

"میں سمجھتا ہُوں کہ بہتر ہوگا، اب اس اجنبی کو کچھ بولنے کی اجازت دی جائے کیوں کہ اس وقت اس کے پاس زبان ہی ایک واحد ہتھیار ہے جسے یہ استعمال کرسکتا ہے۔" قنبر بات جاری رکھتے ہُوئے بولا۔ "مَیں چاہتا ہُوں کہ اس سلسلے میں رائے طلب کرلی جائے تو اچھا ہے۔ کتنے لوگ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ اس اجنبی کو بات کرنے اور اپنا مؤقف ظاہر کرنے کی اجازت دی جائے؟" یہ کہتے ہُوئے خود اس نے اپنا ہاتھ اُٹھا دیا۔

یکے بعد دیگرے آٹھ ارکان نے بھی ہاتھ اُٹھا دیے۔

ہورسا کچھ دیر تو ان لوگوں کو کینہ توز نظروں سے دیکھتا رہا پھر اُس نے بھی، بادلِ ناخواستہ ہاتھ اُٹھا دیا اور خونخوار لہجے میں بولا۔ "مَیں نہیں جانتا کہ یہ شخص کون ہے؟ اشراف میں سے ہے، آزاد ہے، نچلی ذات کا ہے... یا کوئی مفرور غلام ہے۔ بہرحال معزز ارکان چاہتے ہیں کہ اسے زبان کھولنے کی اجازت دی جائے، تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

میرے لبوں پر بے ساختہ مُسکراہٹ دوڑ گئی، قسمت میری مدد کر رہی تھی۔ مجھے اپنا واحد ہتھیار زبان، استعمال کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

یوطابا میری طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔ "اجنبی! تم بول سکتے ہو۔ انتخاب کے ذریعے تمھیں بولنے کی رعایت مل گئی ہے۔ ہم صبر و تحمل سے سُنیں گے لیکن یہ بات ذہن نشین کرلو کہ محض الفاظ ہی تمھاری جاں بخشی نہیں کرسکیں گے۔ تمھیں ہم میں سے کسی ایک سے بہرحال لڑنا ہوگا اور اس مقابلے کا اختتام کسی ایک کی موت پر ہوگا۔ تم جس سے لڑنا چاہو، اُسے خود ہی منتخب بھی کرسکتے ہو۔ ہم اجنبیوں کو اپنا حریف منتخب کرنے کی اجازت ضرور دیتے ہیں۔"

میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

محفل پر گہرا سکوت چھا گیا۔

اس سکوت میں سرسراہٹ ہی وہ واحد آواز تھی، جو قبر رتی عورت کے چھال کی تختی پر لکھنے سے پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بہت تیزی سے حرکت کر رہا تھا اور وہ بظاہر اس سارے جھگڑے سے لاتعلق معلوم ہوتی تھی۔

سب کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

دفعتاً آتش دان کے قریب ایک کتا سوتے سوتے غرایا۔

یوطابا نے چھڑی گھما کر اسے خاموش کر دیا۔

"میں ایک اجنبی ہوں" میں نے بولنا شروع کیا۔ "اور تمہارے طور طریقوں سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ البتہ جتنا کچھ بھی مجھے معلوم ہو سکا ہے، اس سے پتہ چلا کہ تم سب بے حد بہادر لوگ ہو لیکن اس کے ساتھ ہی میں تمہیں احمقوں کا ٹولہ بھی سمجھتا ہوں۔"

محفل میں بھنبھناہٹ اور تیز سرگوشیاں گونج اٹھیں۔

ہورسا پاؤں پٹختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم جماعت کے ارکان کی اس انداز میں توہین کرو؟"

"بیٹھ جاؤ، ہورسا . . . اور سکون سے سنو۔" قنبر ہاتھ لہراتا ہوا بولا۔ "ہم انتخاب کے ذریعے اِسے بولنے کی اجازت دے چکے ہیں جو یہ کہتا ہے، کہہ لینے دو۔"

ہورسا غراتا ہوا بیٹھ گیا۔

میں نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "اگر میں راخیل، جسے تم لوگ سُرخ شیطان کہتے ہو، اس کا مخبر ہوتا تو میں اسی لمحے تمہارے سر اُتار کر شہر کے سب سے اُونچے ستون پر آویزاں کر دیتا۔ تم یہاں بیٹھے سال خوردہ بھیڑوں کی طرح ممیا رہے ہو جب کہ سُرخ شیطان ہر لمحے آگے ہی بڑھتا آ رہا ہے۔ تم میں سے ایک کہتا ہے کہ اس اجنبی کو، یعنی مجھے مار ڈالو اور دوسرا کہتا ہے کہ نہ مارو۔ کہیں شہزادی تاشیہ اور شہنشاہِ احباز ناراض ہو جائیں . . . تم کچھ بھی نہیں کر رہے ہو۔ باتیں بنا رہے ہو اور مجھے باتیں بنانے پر مجبور کر رہے ہو جبکہ اس عرصے میں سُرخ شیطان کی پیش قدمی بڑھتی جا رہی ہے۔"

میں نے اُنگلی سے شاہ یوطابا کی طرف اشارہ کیا۔

"اور تم! تم سب سے بڑے احمق ہو۔ تم ایک حکمراں ہوتے ہوئے بھی حکمراں نہیں ہو۔ یہاں موجود لوگ، شہر اور شہر کے لوگ تمہارے قبضہ و اختیار میں نہیں ہیں۔ تم جنگ کی تیاری کر رہے ہو۔ میدان میں خیمے لگے ہوئے ہیں لیکن ان خیموں میں کیا ہو رہا ہے؟ تمہاری سپاہ کیا کر رہی ہے؟ وہ لوگ جام پہ جام لنڈھا رہے ہیں۔ قحباؤں اور فاحشاؤں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ عکران میں داخل ہوتے وقت یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تمہارے سپاہی یہ بات جانتے ہیں اور تم بھی بے خبر نہیں ہو۔ کیا تم اسی انداز اور اسی تیور کے ساتھ سُرخ شیطان کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو؟ ایسا لگتا ہے، تمہاری سپاہ، سپاہ نہیں بلکہ زنخوں کا طائفہ ہے۔ سُرخ شیطان، خرگوشوں کی طرح تمہارا شکار کرے گا کیوں کہ تم لوگ اس کے لیے نرم چارہ ہو۔

"تم میرے بارے میں سُن چکے ہو کہ میں عام لوگوں سے مختلف ہوں۔ شعور اور فیصلوں میں ایک عام آدمی سے بہت بلند ہوں۔ یہ بات بالکل دُرست ہے۔ میں ایک ایسے دَور سے آیا ہُوں . . . جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اتنا وقت ہے کہ اس دُور افتادہ دَور کے بارے میں تمہیں کچھ بتاؤں۔ صرف یہ ذہن نشین رکھو کہ میرے دماغ میں تمہاری طرح بھُس نہیں بھرا ہُوا ہے۔ میرے دماغ میں بہترین صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ میں، سُرخ شیطان پر غالب آنے کے لیے تمہیں ایسے جنگی حربے بتاؤں گا جو اس کے ذہن میں کبھی پیدا نہیں ہُوئے ہوں گے اور تمہارا دماغ تو اُن کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن یہ سب کچھ میں اُس وقت کروں گا جب اپنے منتخب آدمی سے دست بہ دست لڑ کر اُسے ہلاک کر چکا ہوں گا۔ تم اپنے ایک آدمی سے محروم ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، شاہ یوطابا! میں لڑنے کے لیے ہورسا کو منتخب کرتا ہُوں۔"

میں نے ہورسا کی طرف دیکھتے ہُوئے، حقارت سے تھوک دیا۔

"میں نے قتل کرنے کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے، ہورسا! اگر تمہیں خوف آ رہا ہے، تو میں کسی اور کو منتخب کر لیتا ہُوں۔"

ہورسا غضب کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔

اس کا چہرہ غصے کی شدت سے مسخ ہو گیا . . .

وہ میز پر گھونسے مارتا اور مُنہ سے جھاگ اُڑاتا ہوا چنگھاڑنے لگا۔ "تم . . . تم بھگوڑے مخبر، غلام، بدذات، طوائف زادے، تمہیں مجھ سے اس انداز میں بات کرنے کی جرأت کیسے ہُوئی؟" وہ اشتعال سے بُری طرح کانپ رہا تھا۔ "میں، ہورسا، موآبہ کا شہ زور اور سب سے بڑا جاں باز ہوں۔ میں نے کتنوں کے سر جھکائے ہیں، کتنوں کی گردنیں توڑی ہیں۔ اگر میں تمہارا کلیجہ نہ چبا جاؤں تو مجھ پر ہُرمزد کا قہر نازل ہو۔"

میں ہورسا کی لاف و گزاف پر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

میری تدبیر کارگر ثابت ہُوئی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب

[illegible] رہا تھا۔ میں نے ہورسا کو اشتعال دِلا کر اُسے پرکھ لیا تھا۔ وہ جلد [illegible]شتعل ہو جانے والا آدمی تھا۔ جو اشتعال سے بے قابو ہو جاتے [illegible]یں اور جو جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، اُنھیں مغلوب کرنا [illegible]مجھے آتا تھا۔

"ہورسا! تم نے جو بکواس کی ہے، اگر اس میں نصف صداقت [illegible]بھی ہُوئی، تو تم مجھے بلاشُبہ ابھی سے ایک مُردہ انسان سمجھ لو۔" میں [illegible]نے مُسکرا کر کہا اور اس کی طرف دوبارہ تھوک دیا۔

"اجنبی . . ." یوطابا نے میری طرف دیکھا اور بولنا شروع کیا۔ [illegible]س بار اس کے نسوانی لب و لہجے میں عجیب سی تبدیلی آ گئی تھی۔ اس [illegible]کے دیکھنے کے انداز اور طرزِ تخاطب میں میرے لیے احترام تھا۔ "اب [illegible]جب کہ تم نے اپنا انتخاب ظاہر کر دیا ہے تو تم آج ہی رات ہورسا [illegible]سے مقابلہ کرو گے . . . لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔"

جھُولتی ہُوئی باریک مونچھوں کے نیچے اُس کے ہونٹ [illegible]بھنچ گئے۔

"ہورسا نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس میں مبالغہ [illegible]نہیں ہے۔ یہ بلاشُبہ سارے موآبہ کا شہ زور ہے اور آج تک کوئی بھی [illegible]حریف اس کی ضرب نہیں سہار سکا۔ ہُرمزد نے اتنی عورتوں کو بیوہ [illegible]نہیں کیا ہوگا، جتنی کہ ہورسا کے ہاتھوں بیوگی کی زندگی گزار رہی ہیں۔"

"اس طرح تو ہورسا گھاٹے میں رہا۔" کسی کی چہکتی ہُوئی آواز [illegible]سُنائی دی۔ "یہ اجنبی اپنے پیچھے کوئی بیوہ نہیں چھوڑے گا۔"

اس پر محفل میں قہقہوں کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ لوگ ہورسا پر [illegible]فقرے چُست کرتے ہُوئے بے ہودہ مذاق کرنے لگے جس سے مجھے [illegible]اندازہ ہُوا کہ یہ سب کے سب عیاش اور پرلے درجے کے احمق ہیں [illegible]انھیں وقت کی نزاکتوں کا بھی احساس نہیں رہتا۔

یوطابا نے بڑی مشکل سے اُنھیں خاموش کرایا۔

ہورسا جھُومتا ہُوا، اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور یوطابا کی طرف [illegible]دیکھتے ہُوئے بولا۔ "چونکہ اس بانکے نے مجھے للکارا ہے، اس لیے [illegible]قاعدے کے مطابق مقابلے کی نوعیت مجھے اپنی پسند سے ظاہر کرنی [illegible]ہے۔ یہی بات ہے نا، یوطابا؟" اس نے اپنی شہ زوری کے زعم [illegible]میں اپنے بادشاہ کو عجیب سے انداز میں مخاطب کیا۔

"بے شک، یہ تمہارا حق ہے۔" یوطابا نے اثبات میں سر [illegible]ہلاتے ہُوئے کہا۔ "تم اپنی پسند ظاہر کرو۔"

ہورسا دوبارہ کھڑا ہو گیا اور میری طرف چبھتی نظروں سے [illegible]دیکھ کر بولا۔ "مقابلے کے لیے میں آگ کا حصار پسند کروں گا، الاؤ [illegible]روشن کرنے کا حکم دیا جائے۔ میں دیکھنا چاہتا ہُوں کہ جلتے پیر دل کے

ساتھ یہ کس طرح رقص کرتا ہے۔"

یوطابا نے ایک معمر آدمی کو اشارہ کیا اور وہ فوراً ہی محفل سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

ہورسا کے بیٹھنے کے بعد قنبر ایک بار پھر کھڑا ہُوا۔ اس نے باری باری سب پر نظر ڈالی، پھر میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "اب جب کہ مقابلہ طے پاچکا ہے۔ قاعدے کے مطابق ان لڑاکوں کو ایک ایک معاون چاہیے، جو بوقتِ ضرورت ان کے قریب ہوں گے... اُن کے لیے اسلحہ برداری کریں گے۔ تم میں سے کون اس اجنبی کا معاون بننا پسند کرے گا؟"

محفل پر ایک بار پھر سکوت چھا گیا۔

سب نے نظریں پھیر لیں۔

"اِن میں سے کوئی بھی میرا معاون نہیں بننا چاہتا۔" میں نے قنبر کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا: "ان کے نزدیک میں ایک مُردہ شخص ہوں، یہ چشمِ تصوّر سے میری لاش دیکھ رہے ہیں اور ایک مُردہ شخص کا معاون بننا کوئی بھی پسند نہیں کرے گا لہٰذا اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں اپنے طور پر کسی کو منتخب کرلوں... میں سلارد کو اپنا معاون منتخب کرتا ہُوں۔ سلارد، وہی شخص ہے، جو میرے جھونپڑے پر پہرہ دے رہا ہے۔"

کمرے کا سکوت بھنبھناہٹ سے تار تار ہوگیا۔

لوگ ایک دوسرے سے مختلف سوالات کرنے لگے۔

"یہ سلارد کون ہے؟ نام تو اس کا سُنا ہُوا ہے لیکن یاد نہیں آرہا... نام تو میں نے بھی سُنا ہے لیکن یہ ہے کون؟ کیا کوئی غلام ہے یا آزاد ہے؟ طبقۂ اُمرا میں سے تو ہرگز نہیں ہے، ورنہ ہم اُسے ضرور جانتے ہوتے۔"

سُرخ بالوں والا ایک دُبلا پتلا آدمی اُٹھ کھڑا ہُوا اور مُنہ بناتے ہُوئے بولا: "میں سلارد کو اور اس کے بارے میں خوب جانتا ہوں۔ وہ یہیں کا باشندہ ہے۔ کاش! وہ ہماری مملکت کا باشندہ نہ ہوتا۔ وہ اوّل درجے کا بدمعاش، مسخرا، اور لالچی ہے۔ شراب اور عورت کا رسیا ہے۔ بدصورت اتنا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، ہُرمزد نے کیا سوچ کر اسے پیدا کیا ہے؟ وہ ایک چور اور اُٹھائی گیرا ہے لیکن اس میں ایک صفت ہے کہ وہ جری اور بہادر ہے۔ یہی ایک صفت ہے، جس کی وجہ سے وہ اب تک محفوظ ہے، ورنہ اُسے کب کا پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہوتا۔" وہ میری طرف مُڑا: "اگر تم اس بدمعاش کو معاون کے طور پر منتخب کررہے ہو تو ہُرمزد ہی تمھارا حافظ ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ تمھارا یہ واحد بچا کھچا

چوغہ بھی نہ اُتار لے جائے۔"

اس پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔

میں بھی بے حد خوش گوار طبعیت میں تھا اس لیے م... پن سے اُنھیں جُھک جُھک کر سلام کرنے لگا۔

شاہ یوطابا نے نشست برخاست کا اشارہ کیا اور اپنے... محافظ کے ساتھ محفل سے اُٹھ کر چلا گیا۔ باقی لوگ بھی ہنستے اُ... مذاق کرتے ہُوئے باہر جانے لگے۔

میں دروازے کی طرف بڑھا تو ہورسا نے عقب سے پُ... کر کہا: "جاؤ اجنبی! اپنی موت کی گھڑیاں گننا شروع کردو۔ یہ رات تمھاری زندگی کی آخری رات ہے، اب تمھاری زندگی میں کو... سورج طلوع نہ ہوگا۔"

میں جھونپڑے میں پہنچا تو سلارد میرا منتظر تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مسّرت، ذہانت اور تجسّس سے چمکنے لگیں۔

"آہ مالک! آج تم نے پورے عکران کو جھنجوڑ کر رکھ دیا... آج شہرِ عکران کی ساری خلقت آگ اور خون کا تماشہ دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے گی۔ کوئی بھی تمھاری موت کے سنسنی خیز منظر... محروم رہنا ہرگز پسند نہیں کرے گا۔"

"میری موت..." میں نے اُسے سرد نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے کہا: "کیا میں سمجھ لوں کہ تمھیں ہُرمزد کی نیابت مِل گئ... ہے، جو یوں بے دھڑک پیش گوئی کررہے ہو؟"

سلارد اپنی چپٹی داڑھی کے بال نوچتے ہُوئے بولا: "یہ نہ... مالک! جیت تمھاری ہی ہوگی اور اُس موٹے بھینسے کو آگ... جائے گی۔ مجھے ہورسا سے شدید نفرت ہے۔ میں چاہتا ہُوں کہ وہ... ہلاک ہوجائے کیوں کہ اس نے مجھے ایک بار محض اس لیے کوڑ... لگوائے تھے کہ میں اُسے سلام کرتے ہُوئے زیادہ نہیں جُھکا... مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی، مالک؟ میں ایک آزاد ان... ہوں، غلام تو نہیں ہُوں۔"

میں نے ہنستے ہُوئے اس کا شانہ تھپ تھپایا: "تو پھر ٹھ... ہے، اس مقابلے میں تم میرے معاون کے فرائض انجام دوگے اور ہورسا کو جہنم رسید کرنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔" میں نے کہا۔

سلارد ایک گھٹنے کے بل جُھک گیا...

"تمھاری خدمت کے لیے بسر و چشم حاضر ہوں، مالک..." سلارد نے اَدب سے کہا۔

"بہت خوب! تو اب سیدھے کھڑے ہوجاؤ۔ آیندہ میر...

...گے اس طرح کبھی نہ جُھکنا۔ ہمیشہ مجھ سے برابری سے بات کرو اور جو کچھ کہنا ہو، بے خوف و خطر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو... بلاشبہ تم مجھے مالک کہتے ہو لیکن میں، اپنے اور تمھارے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں کرتا کیوں کہ تم آزاد ہو... اب میں تم سے جو کہوں، اسے غور سے سنو کیوں کہ اس پر حرف بہ حرف عمل کرنا ضروری ہے۔"

میں نے اُسے آیندہ کا لائحہ عمل بتانا شروع کیا۔ وہ بڑی توجہ اور انہماک سے سُنتا رہا اور اثبات میں سَر ہلاتا رہا۔

جب میں نے بات ختم کی تو وہ آنکھیں پھاڑتے ہُوئے بولا۔

"تم نے تو اپنی اور میری موت کا بندوبست کرلیا ہے، مالک!"

"ایسا نہیں ہے، سلارد..." میں نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہُوئے کہا: "شاید تم بھول گئے ہو کہ ہورسا کی موت کے بعد اس کا مرتبہ اور اختیار میری طرف منتقل ہوجائے گا۔ لوگ پینے پلانے میں مصروف ہوں گے تو اس سے ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔ بس شرط صرف یہ ہے کہ تم اپنے حصّے کا کام ہوشیاری اور ذمّے داری سے انجام دو۔ اچھا اب وہ باتیں دُہراؤ جو میں نے تمھیں بتائی ہیں اور جو کام تمھیں انجام دینا ہیں، ان کی تفصیل مجھے سُنادو۔"

سلارد کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی: "مالک جو کام بھی تم نے مجھے سونپے ہیں، ان میں سے ایک کے بارے میں تو میں پہلے بھی سوچتا رہا ہُوں لیکن وقت کی کمی کے سبب نہ کرسکا... مجھے ملکہ رومہ کے محل میں داخل ہونا ہے اور کسی ملازمہ پر دست درازی کرنا ہے لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں اس لیے میں ایسا نہیں کرسکوں گا، مالک!"

"احمق آدمی! تم دست درازی نہیں کروگے بلکہ تمھیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ دست درازی کررہے ہو اور یہ خیال رکھنا کہ وہ کوئی ملازمہ ہی ہو۔ بس اس کا لباس چاک کردینا اور اُسے اس حد تک خوفزدہ کردینا کہ وہ چیخنے لگے۔ وہ جس قدر زور سے چیخے گی اتنا ہی بہتر ہوگا۔ محل کے سارے لوگ اس جگہ جمع ہوجائیں گے اور میرا کام بھی آسان ہوجائے گا۔"

سلارد کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔

وہ اپنے خرگوش جیسے ہونٹ سکیڑ کر بولا: "مالک! شاید تمھیں معلوم نہیں کہ یہاں کسی عورت پر دست درازی کی سزا کتنی بھیانک ہے۔ ایسے اخلاقی مجرم کو کھولتے ہُوئے تیل میں پھینک کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ ملکہ رومہ نے شہزادی تاشیہ کو بے ہوشی کی دوا دے کر محل کے کسی خُفیہ حصّے میں رکھا ہوگا۔ اُسے تلاش کرنے میں تمھیں یقیناً دیر لگے گی... اس عرصے میں مجھے ملازمہ کے پاس ہی رُک کے رہنا ہوگا۔ اتنی دیر میں تو لوگ وہاں پہنچ کر میرا ریشہ ریشہ الگ کردیں گے۔"

"میں دیر نہیں لگاؤں گا۔" میں نے وعدہ کیا: "ملکہ رومہ نے کہا ہے کہ شہزادی تاشیہ بیمار ہے، اس لیے اس نے اُسے چُھپا کر نہیں رکھا ہوگا۔ چُھپانے کی صورت میں لوگ اس پر شک کرسکتے ہیں۔ لہٰذا شہزادی، محل کے کسی ایسے ہی حصّے میں ہوگی، جہاں وہ دوسروں کی نظروں میں رہے اور لوگ ملکہ رومہ کی نیت پر کسی قسم کا شُبہ نہ کرسکیں۔ میں شہزادی کو لے کر سیدھا اصطبل پہنچوں گا، تم وہاں موجود رہنا... اور دیکھو، گھوڑے بالکل تیار رہنے چاہئیں۔"

"ہُرمزد ہماری حفاظت کرے۔" سلارد سینے پر ہاتھ لے جاتے ہوئے بولا: "گھوڑے چُرانا ایک اور جُرم ہے۔ معلوم ہے، اس کی کیا سزا ہے؟ یہ ایک بدترین سزا ہے۔ پھندے سے چور کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے ہیں پھر اس کی کھال اُتار کر، سانپ کی کھال سے تیار کی گئی بوری میں سی دی جاتی ہے۔ اگر ہم ناکام رہے تو ہمارا انجام یہی ہوگا۔"

"ہم ناکام نہیں رہیں گے، ابھی سے ہاتھ پاؤں مت ڈال دو۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

دفعتاً دو مسلح سپاہیوں کی معیّت میں ایک افسر جھونپڑے میں داخل ہُوا۔ سلارد کو نظرانداز کرتے ہُوئے، وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہُوا: "الاؤ تیار ہے، اجنبی! ہمارے ساتھ اسلحہ خانے چل کر اپنی پسند کے ہتھیار لے لو۔"

میں نے سلارد کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "یہ بھی میرے ساتھ جائے گا۔ یہ میرا مددگار ہے۔"

"جیسی تمھاری مرضی... لیکن جلد کرو۔ ہورسا بہت بے چین ہورہا ہے۔"

اسلحہ خانے کی طرف جاتے ہُوئے، میں نے سرگوشی میں سلارد سے پوچھا: "یہ ہورسا کس طرح لڑتا ہے، لڑائی میں کون سا ہتھیار استعمال کرتا ہے؟"

"وہ کانسی کا ایک بھاری کلہاڑا استعمال کرتا ہے، مالک..." سلارد نے سرگوشی میں جواب دیا: "اس کے ساتھ ایک ڈھال بھی استعمال کرتا ہے لیکن چونکہ مقابلے کے دوران اپنے حریف پر حملے ہی کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ڈھال استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ وہ جنونی اور وحشیانہ انداز میں حملے کرتا ہے، مالک... اس لیے ہورسا کے وار سے بچ جانا معجزہ ہی تصوّر کیا جاتا ہے۔

اس کا کلہاڑا اس قدر بھاری ہے کہ مجھ جیسا آدمی شاید ہی اُسے اُٹھا بھی نہ سکے۔"

مَیں نے اسلحہ خانے میں سے اپنے لیے کانسی اور چمڑے کی بنی ہُوئی ایک مضبوط ڈھال اور لمبی، دو دھاری تلوار منتخب کی۔ تلوار وزنی تھی لیکن میں اسے بہ آسانی اُٹھا سکتا تھا اور اسے چلانے میں کوئی مشکل بھی پیش نہیں آ سکتی تھی۔

مجھے دُور سے ہجوم غفیر کا شور صاف سُنائی دے رہا تھا۔ یہ آوازیں خون کی پیاسی تھیں... میرے خون کی پیاسی۔ مَیں نے اپنے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ کی ایک لکیر کھینچ لی کیوں کہ یہ آوازیں تبدیل بھی کی جا سکتی تھیں۔ مَیں مجمعے کی نفسیات سے آگاہ تھا۔ انھیں تو صرف خون چاہیے تھا، خواہ وہ کسی کا بھی ہو... میرا اپنا... یا ہورسا کا... مجھے یقین تھا کہ ہورسا کا خون گرتے ہی ان آوازوں کا آہنگ تبدیل ہو جائے گا۔

اُن کے جھنجھلانے اور ناک بھوں چڑھانے کے باوجود، مَیں نے تلوار پہ نئے سرے سے دھار چڑھائی۔ افسر جلدی جلدی، کی رٹ لگائے جا رہا تھا اور مجھے تاخیر میں لُطف آ رہا تھا۔ ہورسا کو انتظار اور اضطراب کی آگ میں جلنے دینا چاہیے تھا۔ اس طرح تاخیر کا ہر لمحہ میرے حق میں جا سکتا تھا۔

ہم میدان میں پہنچے تو وہاں موجود مجمع دیدنی تھا۔ لگتا تھا، جیسے پورا مکران اُمنڈ آیا ہو۔ ہمیں ہجوم کے درمیان سے گزرنے اور الاؤ کے حصار تک پہنچنے میں خاصے جبر کم سے کام لینا پڑا... مجمع آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے تھا۔ کچھ لوگ مجھ پر فقرے بازی کر رہے تھے تو کچھ میری حوصلہ افزائی بھی کر رہے تھے لیکن زیادہ تر لوگوں کے طنز کا نشانہ ہورسا ہی بن رہا تھا۔

آگ دہکائی جا چکی تھی اور مزید دہکائی جا رہی تھی۔ سپاہی آگ کے دائرے پر لکڑیاں اور مچھلی کا تیل لا لا کر ڈال رہے تھے، جس سے آگ کچھ زیادہ ہی بھڑک اٹھی تھی اور شعلے میری کمر تک آ رہے تھے۔

مَیں اور سِلارد الاؤ کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔

یوطابا کا تخت بھی لایا جا چکا تھا...

وہ اب بھی بُری طرح پینے میں مصروف نظر آیا۔ گاہے گاہے وہ اپنے دائیں بائیں موجود مصاحبین سے بات بھی کر لیتا تھا۔ یوطابا کے تخت کے پیچھے ایک اور تخت بھی تھا جس پر بھاری لبادے میں ملبوس ایک عورت بیٹھی ہُوئی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاب تھی اور وہ اپنے قریب موجود عورتوں سے باتوں میں مصروف تھی۔

ایک بار اس کا کھنکتا ہُوا قہقہہ فضا میں بلند ہُوا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ ملکہ رومہ ہے۔

یک بہ یک مجمعے کا شور بڑھ گیا۔

ہورسا نمودار ہوا...

وہ شعلوں کو پھلانگ کر دائرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے اُس کے تیور اور وہ منظر اس قدر بہیمانہ تھا کہ میری طبیعت عجیب سی ہو گئی۔

مَیں نے غور سے ہورسا کی طرف دیکھا۔

اس کے سر پر خُود نہیں تھی۔ اس کا گنجا سر شعلوں کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا لیکن جسم پر سُرخ رنگ کا کھُردرا لبادہ تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی گول ڈھال تھی اور دائیں ہاتھ میں، جس پر کسی پُرانے زخم کا مندمل نشان بھی تھا، اُس نے وزنی کلہاڑا تھام رکھا تھا۔ مجھ سے نگاہیں چار ہوتے ہی اس نے جارحانہ انداز میں کلہاڑا لہرانا شروع کر دیا، جیسے مجھے اپنی حرکات سے مرعوب کرنا چاہتا ہو۔

ہورسا، کلہاڑا لہراتے ہُوئے داد طلب نظروں سے مجمع کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے کلہاڑے کو کئی بار اپنے سر سے اُوپر گھمایا تھا۔ میری نگاہ ہورسا سے زیادہ اس کے کلہاڑے پر تھی۔ ایک لمبے دستے والا کلہاڑا تھا جس کے ذریعے حریف کی رسائی سے دُور رہتے ہُوئے وار کیا جا سکتا تھا۔ کلہاڑے کا پھل دو طرفہ تھا اور اس پر منعکس ہوتی ہُوئی شعلوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

مَیں اپنے طور پر مقابلے کا ڈھب متعین کرنے لگا۔

مَیں نے سوچا کہ زیادہ تر اُسی کو وار کرنے کا موقع دوں گا اور ہر وار خالی دوں گا پھر اسی دوران موقع دیکھ کر اپنا کام کر جاؤں گا۔ یہ میری اپنی منطق تھی۔ باقی آیندہ صورتِ حال پر منحصر تھا۔

ہورسا نے اپنا سُرخ لبادہ اُتارا اور دُور پھینک دیا۔ اب وہ کمر تک بے لباس تھا۔ اس کا ڈھول جیسا سینہ، گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ اگرچہ وہ قد میں مجھ سے چھوٹا تھا اور جسم بھی میرے جیسا نہیں تھا تاہم مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ طاقت میں مجھ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے اور میرا بہترین حریف ثابت ہو سکتا ہے۔

دفعتاً وہ کلہاڑے کے دستے کے بل جھُکا اور لپکتے ہُوئے شعلوں میں میری طرف استہزائی نظر سے دیکھ کر بولا: "تم نے شیر کے مُنہ میں ہاتھ دیا ہے، اجنبی! تمھاری زندگی کے دن پُورے ہو چکے ہیں۔ سر اُٹھا کر اچھی طرح آسمان دیکھ لو، یہ تمھاری زندگی کی آخری رات ہے پھر میں تمھارا سَر تن سے جُدا کر کے تمھارے آقا

سُرخ شیطان کے پاس روانہ کر دوں گا۔ ہورسا کا تمسخر۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

مجمع بُری طرح چیخ چلا رہا تھا۔

شاہ یوطابا کی بے چینی بھی بڑھ گئی تھی۔

مَیں نے ہورسا کی لاف و گزاف نظر انداز کرتے ہُوئے قریب ہی کھڑے سِلارد سے سرگوشی کی: "جو کچھ مَیں نے کہا ہے، اسے یاد رکھنا۔ اس پورے قضیے میں وقت کا عنصر بے حد اہم ہے۔ وقت آگے پیچھے ہُوا تو سمجھو کہ مارے گئے۔ سارا کھیل صحیح وقت پر، صحیح کام ہونے کا ہے۔ ہورسا کو ہلاک کرتے ہی میں آرام کے لیے تخلیہ چاہوں گا اور اسی بہانے میں تمھارے قریب پہنچ جاؤں گا۔ جیسے ہی مجھے نسوانی چیخ سُنائی دے گی، مَیں فوراً محل میں جا کر شہزادی تاشیہ کو اُٹھا لاؤں گا پھر تمھیں کیا کرنا ہے، وہ تو تمھیں معلوم ہے نا؟"

"مَیں فوراً بھاگ اُٹھوں گا، مالک!" جواب میں سِلارد کی سرگوشی سُنائی دی۔

"ٹھیک ہے۔ میرا یہ کام کر دو، پھر تم دیکھو گے کہ گھاٹے میں نہیں رہے ہو۔" مَیں نے کہا اور سِلارد، الاؤ کے قریب ہوتے ہُوئے دوسری طرف پھلانگ گیا۔ مَیں نے ہورسا پر نگاہ رکھتے ہُوئے تلوار اُٹھا کر یوطابا کو سلامی دی۔ میری یہ احتیاط اور پیش قدمی ہی کام آئی۔ ہورسا چیخ مار کر وحشیانہ انداز میں میری طرف جھپٹا تھا۔ لپکتے شعلوں کی تیز روشنی میں، اس کے کلہاڑے کے تیز دھار پھل کی چمک میرے سر پر لہرائی تھی۔ اگر میں نے اپنا سر فوراً ہی ایک طرف نہ ہٹا لیا ہوتا تو شعلوں کی سُرخی میں، میرے خون کی سُرخی بھی شامل ہو گئی ہوتی۔

اس نازک ترین لمحے میں، مجھے سِلارد کی ڈوبتی اُبھرتی سانس اور پھر اس کی گھُٹی گھُٹی سی آواز سُنائی دی: "میرے مالک کو فتح نصیب کر سُرخ دیوتا! مَیں صدقِ دل سے وعدہ کرتا ہُوں کہ آیندہ پُورے ایک سال تک چوری نہیں کروں گا۔ مَیں قسم کھاتا ہوں۔"

★★

مقابلہ میں اپنے ڈھب سے کر رہا تھا۔ ہورسا دیوانہ وار مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ مَیں اُس کے ہر حملے کو، وار خالی دے کر ناکام بناتا رہا۔

مَیں نے اَب تک اپنا دفاع ہی کیا تھا۔ اس پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس صورتِ حال سے ہورسا کچھ زیادہ ہی جوش میں آ گیا۔ اُس نے میرے دفاع کو میری کمزوری اور بے طاقتی پر محمول کیا، چنانچہ وہ اور شد و مد سے وار کرنے لگا۔ اِدھر مجمع تھا کہ اس کی چیخ و پکار سے آسمان میں شگاف ہو رہا تھا۔ مکران کے لوگ حلق پھاڑ پھاڑ کر اپنے شہ زور ہورسا کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ہورسا میرے ٹکڑے اُڑا دے... اور اگر مَیں نے ساری توجہ اپنے دفاع پر مرکوز نہ کی ہوتی تو یقیناً وہ میرے ٹکڑے ہی اُڑا دیتا۔

پھر مجمع میری بُزدلی اور پست ہمتی پر لعن طعن کرنے لگا۔ اُن کے نزدیک میرا دفاع، میری کمزوری پر دلالت کرتا تھا۔

ہورسا مجھے کئی بار رگیدتا ہُوا آگ کے قریب لے گیا۔ اتنے قریب کہ شعلوں کی تپش نے مجھے اپنا جسم جھُلستا ہُوا محسوس ہُوا لیکن مَیں ہر بار بڑی خوب صُورتی سے جھکائی دے کر اس کے دباؤ سے نکل آتا۔ اگر ہورسا اشتعال کی کیفیت میں نہ ہوتا اور ٹھنڈے دماغ سے کام لیتا تو شاید اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس نے عقل و تدبر کو ایک طرف رکھ دیا تھا اور اندھا دُھند کلہاڑا گھُما رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے دفاع سے مہلت ہی نہیں مل رہی تھی کہ اس پر حملہ آور ہونے کی سوچتا۔ میری ایک ذرا سی چُوک غلط اندازہ یا غلط حرکت میرے کاسۂ سر کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتی یا پھر میں اپنے جسم کے کسی عضو سے محروم ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر مجھے مزید سنبھل کر اور پورے ہوش و حواس کے ساتھ اس کا ہر وار روکنا یا خالی دینا پڑ رہا تھا۔ اسی کوشش میں ہر بار آگ کے قریب پہنچ جاتا، جو میرے لیے دُہری مصیبت کا باعث بنتی۔

ہورسا میری پسپائی اور بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے جبڑے کسی خون آشام بھیڑیے کی مانند کھُلے ہُوئے تھے اور ان سے سفید دانتوں کی قطار جھانک رہی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھ پر فقرے کستا، میری تذلیل کرتا اور بجائے دفاع کرنے کے حملہ آور ہونے کی دعوت دیتا لیکن میں جذباتی یا مشتعل نہیں ہُوا کیوں کہ اسی میں میری سلامتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ دفاع کرتے رہنے میں ہی میری عافیت ہے۔ وہ اپنا کھیل، کھیل رہا تھا اور مَیں اپنے کھیل میں مصروف تھا۔

مقابلہ ہوتے کافی دیر ہو گئی اس لیے مجمعے کا رویّہ بھی تبدیل ہونے لگا۔ اَب لوگ میری بُزدلی نظر انداز کر کے ہورسا کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اُنھیں حیرت تھی کہ اُن کا شہ زور ابھی تک مجھے خاک و خون میں کیوں نہیں نہلا سکا، ایک طرح سے یہ بھی اُس کی جاں بازی پر ایک دھبّہ تھا۔ اجنبی کو ہلاک کرنے میں اتنی دیر... ہجوم کی خون کی پیاس نکتۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔ تماشائیوں کے ضبط کا دامن چھُوٹ رہا تھا پھر وہ برملا ہورسا کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ شاید اُس

نے کسی کو ہلاک کرنے میں اتنا وقت کبھی نہیں لیا تھا۔"

اِدھر میں اپنے ضبط اور برداشت کی انتہائی منزل پر تھا۔ مجھے مناسب وقت اور مناسب گھڑی کا انتظار تھا، میں ہورسا پر بھرپور ضرب لگانے کے لیے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

... پھر وہ وقت بھی آگیا۔

میں نے ہورسا کو گھبراہٹ کا شکار، تھکا ہُوا اور مضمحل محسوس کیا۔ وہ اپنے حملوں کی ناکامی پر بُری طرح جھلا گیا تھا، اوپر سے مجمعے کی لعن طعن جلتے پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ وہ بُری طرح کھسیا رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، اُس کے سر اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے فنا کرنے کے لیے کیا کرے۔ اُس نے حرب، ضرب اور گالی گلوچ سبھی کچھ آزما ڈالا تھا لیکن مجھے ذرا بھی تاؤ نہیں آیا۔ میں نے یہ سب کچھ مقدر سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ آخر ہورسا ہانپتا کانپتا ہُوا، پیشانی اور آنکھ پر سے پسینہ پونچھتا ہُوا، مجھ سے دُور جا کھڑا ہُوا۔

میں نے اپنے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سجالی... پھر ایک نظر مجمعے پر دوڑانے کے بعد براہِ راست ہورسا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہُوئے کہا: "کیا بات ہے مداری! حملہ کیوں نہیں کرتے؟"

یہ سُنتے ہی ہورسا نے ایک زوردار چیخ ماری اور کلہاڑا بلند کرتے ہُوئے مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اُس کا یہ حملہ پہلے حملوں کے مقابلے میں شدید تھا۔ میرے لیے، خود کو بچانا دُشوار ہو گیا۔ وہ جنونی کیفیت میں مجھ پر کلہاڑا برسا رہا تھا۔ مجمعے میں ایک بار پھر جان پڑ گئی تھی اور وہ ایک بار پھر ہورسا کے ہم نوا بن گئے تھے۔

میں ہورسا کے وار روکتا، جھکائی دیتا ہُوا ایک بار پھر آگ کے قریب پہنچ گیا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہُوا کہ ہورسا کے حملوں میں پہلے جیسی جان اور قوت نہیں رہی۔ وہ محض بھرم قائم رکھنے کے لیے کلہاڑا گھما رہا تھا، اندھا دُھند، چاہے وہ میرے جسم پر لگے یا نہ لگے۔ اَب اس کا سینہ دھونکنی بنا ہُوا تھا اور سارے جسم پر پسینہ بہہ رہا تھا۔

ہورسا اپنے حصّے کا کھیل، کھیل چُکا تھا، اَب میری باری تھی۔ مجھے اپنے کھیل کا آغاز کرنا تھا اور اُس کے ساتھ ہی اختتام بھی کرنا ضروری تھا۔

ہورسا نے بچی کھچی قوت کا سہارا لے کر، اپنے جسم کا پُورا زور استعمال کیا اور مجھ پر حملہ آور ہُوا۔ میں نے پھرتی سے خود کو جھکایا اور ایک طرف ہٹتے ہُوئے، بھرپور لات، اُس کی کمر پر جمادی۔ ہورسا مُنہ کے بل شعلوں پر گر پڑا لیکن اگلے ہی لمحے حیرت انگیز پھرتی سے دوبارہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کا کلہاڑا کہیں دُور جا گرا تھا ہاتھ میں صرف ڈھال رہ گئی تھی، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُسے استعمال کرنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ ہورسا کے ستارے گردش میں آگئے تھے اور اُسے اپنے دفاع کے لیے اُس ڈھال کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔

مجمعے کی چیخ وپکار دیوانگی کو چھُونے لگی۔

مقابلے کا یہ غیر متوقع رُخ اُنھیں پسند آیا تھا۔ اس پورے خونی کھیل کے دوران پہلی بار کسی حریف نے خاک چاٹی تھی اور شعلوں نے اس کے جسم کو چھُوا تھا۔ میں نے سکون سے ہورسا کا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ جھُلس گیا تھا۔ اس کے پائنچوں نے آگ پکڑ لی تھی جو کھُلے میدان کی تیز ہَوا میں لمحہ بہ لمحہ پھیلتی جا رہی تھی لیکن ہورسا آگ اور اذیت سے بے پروا مجھ پر نظر جمائے ہُوئے تھا۔ وہ ڈھال سنبھالے، دفاعی انداز میں تنا کھڑا تھا اور متحیر تھا کہ میں اُس پر حملہ کیوں نہیں کر رہا ہوں۔

آگ پائنچوں سے اس کی کمر تک پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی فضا میں گوشت جلنے کی بُو پھیل گئی۔ مجھے پہلی بار ہورسا کے چہرے پر کرب کے آثار دِکھائی دیے لیکن وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہُوا۔

"کیا حال ہے، دوست! بکران کے لوگوں نے اس سے پہلے اپنے کسی جانباز کی ایسی درگت بنتے ہُوئے نہیں دیکھی ہوگی، اور تم تو پُورے مو آبہ کے شہ زور ہو:" میں نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

جواب میں ہورسا کے حلق سے ایک غراہٹ بلند ہُوئی اور اُس نے ڈھال میرے مُنہ پر کھینچ ماری لیکن میں نے سر ایک طرف کر کے خود کو بچا لیا۔ میرا دُشمن ایک دفاعی ہتھیار سے بھی محروم ہو گیا تھا۔

شعلوں نے ہورسا کے پورے جسم کا احاطہ کر لیا تھا اور فضا میں جلتے گوشت کی بُو پھیل رہی تھی۔ اس نے شعلوں کے گرداب سے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے مُنہ سے ایک معمولی سی سسکی یا کراہ بھی نہیں نکلتی تھی، البتہ چہرے پر زلزلے کے آثار طاری تھے۔

ہورسا اگرچہ عقل و تدبر سے کورا تھا لیکن وہ بہرحال ایک جری اور غیور حریف ثابت ہُوا تھا۔ ایسے شخص کو ایک عام دُشمن کی طرح برتنا قرینِ انصاف نہیں تھا۔ تقاضا یہ تھا کہ میں اُس کی موت کو آسان بنا دیتا۔ چنانچہ میں نے پورے مقابلے میں اس پر

اپنی تلوار پہلی اور آخری بار بلند کی اور ایک بھرپور ضرب کے ساتھ اس کے سر کو سینے تک دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔

میں نے تلوار کھینچی تو اس کے جسم سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور اُس کا بھاری بدن دہکتے شعلوں میں جا گرا۔ چٹ چٹ کی آوازوں کے ساتھ اس کے جسم پر آتشی بگولے رقص کرنے لگے... فضا میں جلتے گوشت کی بدبُو کچھ اور بڑھ گئی۔

میں نے ہورسا کا کلہاڑا تلاش کر کے اُٹھا لیا پھر اپنی تلوار گھاس پر رگڑ کر صاف کی۔ اس کے بعد دائرے کے دوسری طرف جا کر ہورسا کا سُرخ لبادہ اُٹھا کر اپنے جسم پر ڈال لیا۔ ایک ہاتھ میں اپنی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ہورسا کا کلہاڑا اُٹھا کر، سر سے بلند کر کے میں یوطابا کی طرف رُخ کر کے تعظیم کے انداز میں جھک گیا تھا...

مجمع، جو چند لمحے پہلے کے خونیں لمحات میں گُنگ ہو کر رہ گیا تھا، یک بہ یک چیخنے لگا۔

لوگ میری تعریف و توصیف اور مدح سرائی میں چیخ رہے تھے... میں نے ان کی خون کی پیاس بُجھا دی تھی۔ ان کے سفاک اور وحشیانہ جذبے کی تسکین کر دی تھی۔

یکایک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے مُڑ کر اُس طرف دیکھا، جہاں سِلارد کھڑا ہُوا تھا۔

اب وہ اپنی جگہ پر نہیں تھا...

میں نے پورے مجمعے کا جائزہ لیا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ گویا وہ طے شدہ منصوبے کے مطابق اپنے حصّے کا کام انجام دینے کے لیے جا چُکا تھا... میں نے اُس سے کہا تھا کہ وقت، ایک اہم عنصر ہے، ہماری کامیابی کا دارومدار، بروقت اقدام پر ہے۔ وقت کے آگے پیچھے ہونے سے ہمارا کام بگڑ بھی سکتا تھا۔ چنانچہ اب میرے لیے بھی تاخیر کرنا کسی طور مناسب نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہاں سے نکلا کس طرح جاتا۔ اس قسم کے خونیں مقابلوں کے بعد وہاں کی روایات کا مجھے علم نہیں تھا۔ اگر جشنِ رقص و سرود کی ٹھن گئی تو میرا ستیاناس ہو جانا ضروری تھا۔

اسی وقت شاہ یوطابا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"سیدھے کھڑے ہو جاؤ، اجنبی! تم مبارک باد کے مستحق ہو، تم نے ایک قوی دُشمن کو زیر کیا ہے۔"

میں سیدھا کھڑا ہُوا تو ایک بار پھر غلغلہ مچا اور اسی کے درمیان شاہ یوطابا نے بلند آواز سے دوبارہ کہا: "دستور کے مطابق اب ہورسا کی دولت، جائداد، مکان اور عورتیں غرضیکہ ہر چیز تمھاری ہے۔"

میں تعظیماً دوبارہ جھکا...

پھر سیدھا ہوتے ہُوئے بولا: "شاہ یوطابا پر بُرمزدا اپنی برکتیں نازل کرے، میں خود کو بے حد تھکا ہُوا محسوس کر رہا ہوں، اس وقت مجھے آرام اور نیند کی سخت ضرورت ہے۔"

"قنبر، ہورسا کے مکان تک تمھاری رہ نمائی کرے گا۔ ہم کل تم سے ملاقات کریں گے اور سُرخ شیطان کے شر سے بچنے کے لیے تمھاری تجاویز سُنیں گے۔" اس کے ساتھ ہی یوطابا نے مجمعے کو منتشر ہونے کا اشارہ کر دیا۔

قنبر کے آنے تک میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

مجمع منتشر ہُوا تو قنبر میرے پاس آیا اور میرے شانے پر تھپکی دیتے ہُوئے مسکرا کر بولا: "میری طرف سے مُبارک باد قبول کرو تمھیں، ایک نئی زندگی ملی ہے، ہورسا کا کوئی حریف آج تک اپنا سر سلامت نہیں لے جا سکا تھا۔"

"یہ تجویز تمھاری ہی پیش کردہ تھی۔ ہورسا واقعی ایک سخت جان اور مشکل حریف تھا لیکن اُس میں عقل کی کمی تھی۔ ویسے قنبر!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "کیا اس تجویز کے پیش کرنے میں تمھاری یہ حکمت نہیں تھی کہ مجھ سے پیچھا چھُوٹ جائے اور شہزادی تاشیہ اور شہنشاہِ احباز بھی ناراض نہ ہوں؟"

"اَب گزری باتوں کے ذکر سے کیا حاصل؟ اُن باتوں کو بھول جاؤ۔ اس وقت تمھاری حیثیت فاتح کی ہے اور شاہ یوطابا تم سے بے حد خوش ہے۔" قنبر نے بڑی خوب صورتی سے میری بات ٹال دی۔

ہم میدان سے گزر کر تاریک گلیوں میں چل رہے تھے... کافی آگے جا کر بڑے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ایک محل نُما مکان کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پوچھا: "یہ کس کا مکان ہے؟"

"یہ ملکہ رومہ کا محل ہے۔ اس مکان میں کبھی بھُول کر بھی داخل ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ ایک خونخوار عورت ہے، نہ صرف خونخوار بلکہ مردم خور بھی ہے۔" قنبر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

ملکہ رومہ کے محل سے کچھ فاصلے پر ہورسا کا حویلی نُما مکان تھا۔ قنبر نے دروازے پر لے جا کر چھوڑ دیا۔

"جاؤ آرام کرو دوست! یہ تمھاری بدقسمتی ہے کہ ہورسا شادی شدہ نہیں تھا۔ بہرحال شہر میں اس کی عورتیں موجود ہیں، تم جب چاہو، اُن سے مِل سکتے ہو۔ وہ بھی بے چینی سے تمھاری

منتظر ہوں گی"۔

قنبر نے ایک بار پھر میری پیٹھ پر تھپکی دی اور واپس چلا گیا۔ اُسے دکھانے کے لیے میں دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر ایک ستون کی اوٹ میں چھپ گیا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا، میں وہیں کھڑا رہا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ قنبر بہت دُور جا چکا ہو گا تو میں ستون کی اوٹ سے نکل آیا۔ میرا رُخ ملکہ رودمہ کے محل کی طرف تھا۔

. . . اور پھر سب کچھ منصوبے کے مطابق ہی عمل میں آیا۔ خُدا کا شکر ہے کہ ذرا سی بھی گڑبڑ نہیں ہُوئی اور میں شہزادی کو ملکہ رودمہ کے محل سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

★★

کوئی مجھے بُری طرح جھنجوڑ رہا تھا. . .

پھر کسی کی چیختی ہُوئی آواز سُنائی دی "مالک، مالک. . ."

میں نے آنکھیں کھول دیں. . . سِلارو میرے اوپر جھکا ہُوا تھا۔ میں ناراضگی سے بولا "کیا بات ہے؟ کیوں شور مچا رہے ہو؟"

"مالک، تم سوتے میں بُری طرح چیخ رہے تھے اور درسیلا نامی کسی عورت کا نام لے کر بار بار پُکار رہے تھے" سِلارو مسمسی صورت بنا کر بولا "مجھے خوف ہُوا کہ کہیں کوئی تمھاری چیخ سُن کر اس طرف نہ آ جائے"۔

میں آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھ بیٹھا۔

سورج ابھی نہیں نکلا تھا، ہر طرف صبح کاذب کے آثار ہویدا تھے۔ آسمان پر اس وقت بھی دُھند چھائی ہُوئی تھی۔ ہم ایک دلدلی علاقے میں تھے اور سرکنڈوں کے درمیان ایک صاف سُتھری جگہ آرام اور شب بسری کے لیے رُک گئے تھے۔

رات کے پچھلے پہر کی سرد ہَوا نرکلوں کے درمیان سرسرا رہی تھی اور مجھے گزرا ہُوا واقعہ یاد آ رہا تھا۔

منصوبہ حسبِ توقع کامیاب رہا تھا. . . سِلارو نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہُوئے اپنے حصّے کا کام بڑے احسن طریقے سے انجام دیا تھا۔ البتہ اس سلسلے میں ہمیں خون سے ہاتھ رنگنے پڑے تھے۔ فرار ہوتے وقت مجھے دو اور سِلارو کو ایک محافظ ہلاک کرنا پڑا تھا پھر اس کے بعد راستہ صاف تھا۔ ہم عکران کی حدود سے نکل آئے تھے۔ اس کے بعد دُھند اور رات کی سیاہی نے ہمیں اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔

شہزادی تاشیہ ہمارے ساتھ تھی اور اُس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ مسلسل بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ میرا خیال دُرست ہی نکلا۔ تاشیہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے کوئی شراب آور دوا آہستہ آہستہ سرایت کرنے والا زہر دیا جا رہا تھا۔ اگر تاشیہ کچھ دن اور ملکہ رودمہ کے قبضے میں رہ جاتی تو اس کی ہلاکت یقینی تھی اور یہی سمجھتے کہ وہ کسی شدید بیماری کے باعث مر گئی ہے۔

ہورسا سے مقابلے کے بعد میں بے حد تکان محسوس کر رہا تھا۔ دو رات سے میں سویا بھی نہیں تھا پھر اس کے علاوہ تاشیہ کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اُسے گھوڑے پر سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا چنانچہ یہی بہتر سمجھا گیا کہ عکران سے کافی فاصلے پر نکل آنے کے بعد آرام کر لیا جائے تاکہ اگلی صبح سفر کے لیے تازہ دم ہو سکیں۔ ایک مناسب اور محفوظ جگہ دیکھ کر ہم گھوڑوں سے اُتر آئے تھے۔

گھوڑوں سے اُترتے ہی میں ایسا بے سُدھ ہُوا تھا کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا اور اب جب کہ کچھ دیر بعد صبح ہونے والی تھی . . . سِلارو مجھے جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔

میں نے جماہی لی اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

سرکنڈوں کے درمیان ننھی مُنّی چڑیاں پھُدکنے لگی تھیں۔ قریب ہی تینوں گھوڑے ایک درخت سے بندھے، گھاس پر مُنہ مار رہے تھے۔ میری نگاہ گھوم پھر کر سِلارو پر جم گئی "میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا میں زور زور سے چیخ رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ایسی ویسی چیخ تھی وہ؟ میرا تو کلیجہ دہل گیا تھا. . . ڈر کے مارے مجھے یوں بھی نیند نہیں آ رہی تھی کہ تمھاری چیخ نے تو خون ہی خشک کر دیا۔ اندھیری رات ہے، میں نے سوچا کہیں کسی دُشمن نے تو نہیں آ لیا۔ اُٹھ کر دیکھا تو تم گہری نیند سو رہے تھے لیکن چیخ رہے تھے۔ مالک یہ درسیلا کون ہے؟ جس کا نام لے کر تم چیخ رہے تھے"۔

"میرا سابقہ آج تک اس نام کی کسی ہستی سے نہیں پڑا۔ میں خود حیران ہُوں کہ یہ نام میری زبان پر آیا کیسے"؟

"تم نے خواب میں کیا دیکھا تھا؟" سِلارو نے پوچھا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں، ذہن اس سلسلے میں بالکل خالی ہے لیکن ٹھہرو! شاید وہ کسی عورت کی شبیہہ تھی، جو سر سے پیر تک سفید لبادے میں لپٹی ہُوئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے تھے اور اس کے ہاتھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُس نے خون آلود ہاتھ میرے گلے میں حمائل کرنا چاہے تھے کہ میری چیخ نکل گئی"۔

"تو پھر درسیلا اسی عورت کا نام ہُوا؟"

"میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ بس یہ نام خود بخود میرے مُنہ سے نکل گیا تھا. . . شہزادی تاشیہ کا کیا حال ہے؟" میں نے خوابیدہ

شہزادی کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "یہ میری چیخ پر نہیں جاگی؟"

سِلارد بے بسی سے سر ہلاتے ہُوئے بولا: "اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، مالک! یہ کسی شیرخوار کی مانند گہری نیند میں ڈوبی ہُوئی ہے لیکن شیرخوار بچے بھی اتنی دیر نہیں سوتے اور وہ بھی چیخ پکار سُن کر جاگ پڑتے ہیں۔ میرا خیال ہے، اسے جگا دینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ سوتی ہی رہ جائے۔ اس حالت میں یہ نیند، ابدی نیند میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔"

مَیں اُٹھ کر تاشیہ کے قریب گیا۔

وہ میرے سُرخ لبادے میں، جو کبھی ہورسا کا ہُوا کرتا تھا، لپٹی سو رہی تھی تاہم اس کا چہرہ لبادے سے باہر تھا۔ اس کے سُرخی مائل بھُورے بال بے ترتیب تھے اور مُنہ کھُلا ہُوا تھا۔ چہرے پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی اور سانس کی آمدورفت معمول کے مطابق نہیں تھی۔ آنکھوں کے نیچے سُرخ جھُرّیاں اور چتّیاں سی پڑی ہُوئی تھیں۔ اُس کی سیمیں پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ مَیں اُس کے چہرے پر جھُک گیا اور سُرخ لبادے کے ایک کونے سے اس کا پسینہ پونچھ دیا۔

یہ تاشیہ، میرے سامنے لیٹی ہُوئی تاشیہ، اب وہ تاشیہ نہیں تھی، جو چشمے کے کنارے، اس سرزمین پر میری آمد کی پہلی شام کو ملی تھی۔ یہ تاشیہ، وہ تاشیہ بھی نہیں تھی جس نے ایک بھرپُور چاندنی رات میں ہنستے کھیلتے میرے ساتھ عکران تک سفر کیا تھا۔ . . بلکہ یہ تاشیہ، ایک ایسی تاشیہ تھی جس کا گلاب جیسا چہرہ کھملا گیا تھا اور وہ قریب المرگ تھی۔

مَیں خود کو اور ملکہ رومہ کو کوسنے لگا۔

تاشیہ کی اس حالت کے ذمّے دار ہم دونوں ہی تھے . . . ملکہ رومہ نے اُسے اس حال تک پہنچایا تھا اور مَیں نے اس کی بڑی دیر بعد خبر لی تھی۔

سِلارد میرے پاس آیا اور تاشیہ کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔ "زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مالک! میں ایک ایسی دُوا تیار کر سکتا ہُوں، جس سے شہزادی کی طبیعت کافی حد تک سنبھل جائے گی۔ دُوا پیتے ہی اسے قے ہو گی اور معدے سے وہ سارا زہر خارج ہو جائے گا، جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے، اس کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے، شہزادی کی جان کو خطرہ ہے۔"

"یہ تم طبیب کب سے بن گئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

اُس نے جواب دینے میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ فوراً ہی گھوڑوں کی طرف گیا۔

ایک گھوڑے پر بیٹھ کر وہ کہیں چلا گیا. . .

کافی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کانسی کا ایک چھوٹا سا برتن تھا۔

"جب مجھے یقین ہو گیا مالک! کہ تم ہورسا پر فتح پا لو گے، تو مقابلہ ختم ہونے سے پہلے ہی میں ہورسا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کے گھر سے کچھ چیزیں اکٹھا کیں اور ہُرمزد کی قسم . . . یہ چوری نہیں کہلائی جا سکتی کیوں کہ یہ تمام چیزیں تمھاری ملکیت بننے والی تھیں، میرے مالک کی ملکیت . . . اور تمھارا خاص خادم ہونے کی وجہ سے مجھے ان چیزوں کو اُٹھانے اور قبضے میں رکھنے کا حق پہنچتا تھا۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر وضاحت کی۔

مَیں ہنس پڑا۔

سِلارد میری توقع سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار ثابت ہُوا۔

"اچھا اب اس دُوا کی طرف آ جاؤ شاہی طبیب!" مَیں نے اُسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

سِلارد نے قریبی جوہڑ سے برتن میں پانی بھرا، اس میں تھوڑی سی کیچڑ شامل کی۔ پھر اس برتن میں کچھ پتّیاں کُچل کر ڈالیں۔ اس کے بعد کمر کی پٹّی کے ایک خانے سے بھُورے رنگ کا سفوف نکال کر برتن میں ڈالا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنا خنجر سنبھالا اور دلدل کے قریب کچھ تلاش کرنے لگا۔ اس کی تلاش کامیاب رہی . . . اُس نے ایک مینڈک خنجر کی نوک میں پرو دیا اُسے ٹکڑوں میں تبدیل کر کے برتن میں ڈال دیا پھر اُس نے کچھ کیڑے مکوڑے تلاش کیے اور اُنھیں بھی برتن میں ڈال دیا۔

مَیں حیرت سے اس نیم حکیم کو دیکھتا رہا جو ایک دَم توڑتی ہُوئی شہزادی کے لیے دُوا تیار کر رہا تھا۔ نہ جانے یہ محلول پی کر تاشیہ کی کیا حالت ہو گی؟

مَیں اس برتن کو ٹھوکر مار کر پھینکنے ہی والا تھا کہ سِلارد نے برتن ہلانا شروع کر دیا اور بولا: "میں اس خاص دُوا کے سلسلے میں بڑی شہرت رکھتا ہوں مالک!" اس کے ہونٹوں پر فخریہ مسکراہٹ آ گئی۔ "پورے موآبہ میں، کوئی میری طرح یہ محلول نہیں تیار کر سکتا۔ مَیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ محلول ایک گھوڑے کا معدہ بھی اُلٹ دینے کی خاصیت رکھتا ہے۔"

"کیوں نہ اس محلول کو پہلے تمھی پر آزما لیا جائے۔" مَیں نے تلخی سے کہا۔

"مَیں مذاق نہیں کر رہا ہوں، مالک! میری یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ میرے دعوے کی تصدیق ابھی ہو جاتی ہے۔ بس، تمھیں شہزادی کا مُنہ کھولنا ہو گا تاکہ مَیں یہ محلول اس کے حلق میں اُنڈیل سکوں۔"

سِلارد اپنے دعوے میں بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا اس لیے میں نے تاشیہ کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اس کا مُنہ کھول دیا۔ وہ جھک کر شہزادی کے حلق میں محلول اُنڈیلنے لگا۔

تاشیہ کھانسنے لگی. . .

پھر اُس نے سر میری گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں بُری طرح کھانسنے لگی۔

"ٹھہرو . . . ذرا یہ سانس لے لے۔" مَیں نے مُنہ پھیرتے ہُوئے کہا۔

سِلارد خالص حکیمانہ انداز میں معترض ہو کر بولا: "اسے یہ سارا محلول پینا ہے، مالک! ذرا اس کا سر اُوپر اُٹھاؤ تاکہ دُوا آسانی سے حلق سے اُتر جائے۔"

مَیں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

محلول کا آخری قطرہ بھی تاشیہ کے حلق سے اُتر گیا تو اس کا چہرہ، جو زرد پڑا ہُوا تھا، یکا یک اس کی رنگت تبدیل ہونے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ چہرے کی رنگت کاہی ہوتی جا رہی تھی. . . اچانک تاشیہ کے جسم میں بھنچاؤ سا پیدا ہُوا اور وہ لڑھک کر پیٹ کے بَل لیٹ گئی۔

"دُوا نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، مالک!" سِلارد تاشیہ سے دُور ہٹتے ہُوئے بولا: "اب تم ایک ایسا منظر دیکھو گے، جو تم نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھا ہو۔"

سِلارد دُرست ہی کہہ رہا تھا۔

تاشیہ کے جسم پر تشنج طاری تھا۔ اس کا چھریرا اور نازک بدن تڑاتڑا جا رہا تھا پھر ہلکی چیخوں اور کراہوں کے ساتھ اُس نے ایک بڑی قے کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔

"تم سخت بیمار تھیں تاشیہ! لیکن اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" مَیں نے اُسے تسلّی دی۔

"یہ سب کیا ہے، سرفروش! ہم کہاں ہیں؟" اُس نے کمزور آواز میں پُوچھا۔

"مَیں، تمھیں سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا لیکن اس وقت بات نہ کرو تو اچھا ہے۔ کوشش کرو کہ جو کچھ تمھارے معدے میں ہے وہ نکل جائے، اس سے تمھاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

دُور کھڑے سِلارد نے بڑے مطمئن انداز میں اپنی مریضہ کی طرف دیکھا اور ہاتھ باندھتے ہُوئے، سر ہلا کر بولا: "مَیں نے اپنی گناہگار زندگی میں اس سے زیادہ خراب حال مریض نہیں دیکھا۔"

تاشیہ نے بڑے وقار سے اپنا سر اُٹھایا اور سِلارد کو گھُورتے ہُوئے برہم لہجے میں بولی: "یہ بدشکل اور بدہیئت شخص کون ہے؟ اور یہاں کیا کر رہا ہے؟" اِس کے ساتھ ہی اُسے زور کی اُبکائی آئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ تھام کر جھُک گئی۔

وہ سنبھلی تو مَیں نے سِلارد کا تعارف کرایا۔

"یہ بدہیئت اور کریہہ المنظر شخص، تمھارا معالج ہے، شہزادی تاشیہ! اس نے تمھیں نئی زندگی دی ہے۔ اس وقت تمھاری حالت جو سنبھلی ہے تو یہ اسی علاج کا نتیجہ ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اب تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو، ہمیں بہت لمبا سفر درپیش ہے۔ تمھارے ذہن میں جو سوالات مچل رہے ہیں. . . اُن کا جواب مَیں بعد میں دوں گا۔ مزید تاخیر سے ہم دُشواری میں پڑ سکتے ہیں۔ سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

مَیں سِلارد کی طرف متوجہ ہُوا۔

"جیسے ہی شہزادی تاشیہ گھوڑے پر بیٹھنے کے قابل ہو گی، ہم چل پڑیں گے۔" مَیں نے سِلارد سے کہا اور اُسے گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا۔

"لیکن مالک . . ." سِلارد ہچکچاتے ہُوئے بولا: "میرے خیال میں سفر رات کی تاریکی میں بہتر رہے گا۔"

"جو کہہ رہا ہُوں، وہی کرو۔ مجھے توقع ہے کہ اب ہمارا تعاقب نہ کیا جائے گا۔ کچھ ہونا ہوتا تو رات ہی کو ہو جاتا۔ اس وقت تو شاہ یوطابا اور اس کے حواری، سُرخ شیطان کے خوف سے نیم جاں ہو رہے ہوں گے۔ کیا تم اس راستے سے ہمیں شمال کی طرف لے جا سکتے ہو؟"

"مَیں اِن اطراف کے چپّے چپّے سے واقف ہوں۔ میں ان راستوں سے اس طرح واقف ہوں، جیسے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے۔ کوئی بیس کوس چلنے کے بعد ہم دوبارہ ایک جنگل میں داخل ہو جائیں گے۔"

اگرچہ تاشیہ زندگی اور موت کی کشمکش سے نکل آئی تھی۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح گھوڑے پر جم کر بیٹھ ہی گئی اور ہمارا مختصر، سہ نفری قافلہ سُست رفتاری سے شمال کی طرف چل پڑا۔

سورج نکل آیا لیکن دُھند کی وجہ سے دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک چمک دار ٹکیہ سی دِکھائی دیتی، پھر وہ بھی

رُوپوش ہو جاتی۔ ہمارا سفر خاموشی سے جاری تھا۔ کوئی بھی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ تاشیہ اس وقت بھی سُرخ لبادے میں لپٹی ہُوئی تھی۔ صبح کی خنکی میں، وہ بھاری لبادہ اس کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہو رہا تھا۔ مَیں نے رات، فرار ہوتے وقت بہ عجلت اپنے لیے ایک جوڑا حاصل کیا تھا اور وہی اس وقت میرے جسم پر تھا۔ اس کے علاوہ ہورسا کا کلہاڑا بھی اب میرے قبضے میں تھا۔ یہی کچھ میرا مال و متاع تھا لیکن سِلارد کے گھوڑے کی جانب دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بھاگتے بھاگتے بھی کافی کچھ ہتھیا لیا تھا۔ اس کے گھوڑے پر ایک بڑا سا تھیلا لدا ہُوا تھا اور اُس میں نہ جانے کیا کچھ ٹھُنسا ہُوا تھا۔ وہ ہمارے آگے کسی قائد کے انداز میں چل رہا تھا۔

کافی دور نکل آنے کے بعد تاشیہ نے ہمیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھاڑیوں کی طرف چلی گئی۔ ہم نے اپنا سفر ذرا دیر کے لیے روک دیا۔ مَیں اور سِلارد تنہا ہُوئے تو مَیں نے اُ ا کے گھوڑے پر بار تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "ہورسا کے گھر سے کیا کچھ لُوٹ لائے ہو؟"

"بات یہ ہے مالک! کہ مَیں ایک ماہر اور تجربہ کار چور ہُوں کسی کے گھر میں داخل ہوتا ہُوں تو ہتھیلی میں خارش ہونے لگتی ہے اور ہاتھ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ اس تھیلے میں ضرورت کی بہت ساری چیزیں بھری ہُوئی ہیں جو دورانِ سفر ہمارے کام آئیں گی۔ کچھ کپڑے، کچھ اہم دوائیں اور دیگر چھوٹی موٹی چیزیں۔ . . تم نے زیادہ وقت نہیں دیا ورنہ کچھ اور چیزیں بھی ڈال لیتا۔"

"اور کیا لے آتے؟" میں نے ہنس کر کہا: "اس تھیلے کے علاوہ تین گھوڑے، ایک خنجر اور ایک شہزادی چُرا لائے ہو۔ کیا یہ کم ہے؟"

"کھانے پینے کی چیزیں بھی اُڑا لاتا مگر افسوس کہ موقع نہیں ملا۔ اب منزل آنے تک بھُوکا رہنا پڑے گا۔"

"ہم اس وقت تمھاری رہنمائی میں چل رہے ہیں۔ ہمارے کھانے پینے کا بندوبست تو تمھی کو کرنا پڑے گا۔"

"ہرمزد نے چاہا تو یہ بھی ہو جائے گا۔" سِلارد درویشانہ انداز میں بولا پھر یک بہ یک وہ چونک کر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا: "معاف کرنا مالک! مجھے ایک بات یاد نہیں رہی تھی۔ مَیں ہورسا کے گھر سے کچھ اور بھی لے آیا ہُوں۔"

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

اس نے، کمر سے بندھی ہُوئی ایک تھیلی کھول۔ میری نگاہ اُس تھیلی پر نہیں پڑ سکی تھی۔ وہ، تھیلی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ذرا اس تھیلی کو کھول کر دیکھو۔ میں چور ضرور ہُوں لیکن احسان فراموش نہیں ہوں۔ تمھارا برتاؤ میرے ساتھ بہت اچھا رہا ہے اس لیے میں اس تھیلی کو تم سے چھُپا کر نہیں رکھ سکتا۔ یہ سب تمھارے ہیں مالک!"

مَیں نے تھیلی لے کر کھولی اور اُسے زمین پر اُلٹ دیا۔

اس میں سے بہت سارے سِکّے برآمد ہوئے۔ چھوٹے اور بڑے، طلائی اور نقرئی سِکّے۔ . . اس کے علاوہ اُس تھیلی میں سے ایک چھوٹی سی تھیلی بھی برآمد ہُوئی۔

"کافی دولت ہے، مالک!" اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔ "ان سے مین کھیت، مویشی، گھوڑے اور خدمت کے لیے غلام خریدے جا سکتے ہیں۔ ایک بیوی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بچ رہے گا۔"

مَیں نے چھوٹی تھیلی کا مُنہ کھول کر اُسے ہتھیلی پر اُلٹ لیا۔ میری ہتھیلی پر بیس سیاہ موتی پڑے دمک رہے تھے۔ اُس وقت دھوپ نکلی ہُوئی تھی۔ موتی سُنہری دھوپ میں بڑا عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ مَیں نے تھیلی سِلارد کو واپس کرتے ہُوئے کہا: "یہ ہورسا اِس قدر امیر و کبیر کیسے بن گیا؟"

سِلارد اُن موتیوں سے متاثر نظر نہیں آ رہا تھا، وہ شانے اُچکا کر بولا: "اگرچہ مَیں ان چیزوں کو پہلے بھی دیکھ چُکا ہُوں لیکن ان کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ موتی سمندر کے ایک دُور افتادہ ساحل پر پائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے، بحری قزاق انھیں دوسری تمام چیزوں پر فوقیت اور ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ ہورسا نے انھیں یقیناً جنگ کے دوران اپنے کسی مُردہ دُشمن سے حاصل کیا ہوگا۔"

مَیں نے سِکّے سِلارد کو واپس کر دیے اور موتیوں کی تھیلی اپنے پاس رکھتے ہُوئے کہا: "سِکّے تمھارے اور موتی میرے۔ . . اب ہمیں چل دینا چاہیے تاکہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے جنگل میں داخل ہو جائیں۔"

تاشیہ واپس آئی تو بے حد ہشاش بشاش تھی۔

. . . ہم دوبارہ چل پڑے۔

راستے میں، مَیں نے تاشیہ کو وہ واقعات تفصیل سے بتائے جو اُس سے الگ ہونے کے بعد پیش آئے تھے۔ وہ بڑی توجہ سے سُنتی رہی۔

جب مَیں نے بات ختم کی تو وہ نفرت سے اپنے ہونٹ سکوڑتے ہُوئے بولی: "ملکہ رومہ بہت کینہ پرور اور منتقم مزاج عورت ہے۔ تم نے اُس سے غدّاری کی ہے اس لیے وہ تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گی اور بدلہ لینے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ہرمزد سے میری دُعا

ہے کہ سُرخ شیطان راخیل جلد از جلد حکمران کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور یوطابا اور رومہ کو تہ تیغ کر دے۔"

"مگر یوطابا تو تمھارا عمزاد ہے۔ اُس نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟"

"اُس کے گناہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ موقع ملے تو وہ بھی ڈسنے سے باز نہیں آتا۔" تاشیہ نے کہا پھر قدرے توقف سے سَر جھٹکتے ہُوئے بولی: "مَیں بھی کس قدر احمق تھی جو رومہ کے دھوکے میں آ گئی۔ پہلے تو اُس نے باتوں باتوں میں تمھارے بارے میں تفصیلاً پوچھا پھر نہ جانے کیا کیا کہ میری طبیعت خراب ہو گئی۔ دسترخوان سے اُٹھتے ہی میرے ہاتھ سنسنانے لگے اور سر بُری طرح گھُومنے لگا پھر میرا ذہن ایک دم تاریک ہو گیا اور کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو محل سے دُور تم دونوں کے ساتھ تھی۔ یہ تو اب پتہ چلا کہ وہ مجھے بے ہوشی کی دوا دے کر تم سے ساز باز کرنے والی تھی کیتنی خطرناک عورت ہے وہ۔ . . یوطابا اور مجھ سے بہ یک وقت چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اور وہ بھی اِس انداز میں کہ اُس پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ مَیں سمجھتی ہوں کہ یوطابا کی ہلاکت کے بعد وہ تمھیں بھی مروا دیتی کیوں کہ تم راز دار تھے۔ وہ ایک ہرجائی عورت ہے۔ اُس کے لیے عاشقوں کی کمی نہیں ہے۔"

"اب تو اُسے بھول ہی جاؤ، شہزادی!" مَیں نے سامنے اُفق پر نظر جمائے ہُوئے کہا: "وہ خود بخود اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ یہ بتاؤ، تم اس علاقے کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟ احباز یہاں سے کتنی دور ہوگا؟"

تاشیہ کی آنکھیں سوچنے کے انداز میں سکُڑ گئیں۔ . . پھر وہ سر نفی میں ہلاتے ہُوئے بولی: "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اس راستے سے گزری ہوں۔ یہ راستہ اور یہ علاقہ میرے لیے انجانا ہے۔ تمھارا یہ غلام کس کام آئے گا، کچھ دیر پہلے تو بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔" اس نے سِلارد کی طرف اشارہ کیا جو ہم سے کافی آگے چل رہا تھا۔

مَیں خاموش رہا۔

سورج غروب ہونے والا تھا اور دُھند دوبارہ دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے گھنا جنگل نظر آ رہا تھا۔

. . . یہی جنگل رات کو ہماری قیام گاہ اور پناہ گاہ بن سکتا تھا۔

"راستہ معلوم کرنے کے معاملے میں قبرِدی بہت تیز ہوتے ہیں۔" وہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولی: "وہ چاند اور ستاروں کی مدد سے سمت اور منزل کا تعین کر لیتے ہیں۔"

"قبرِدی۔ . . اور درسیلا۔" میرے ذہن میں خواب میں دیکھی عورت کا نام گونجنے لگا لیکن میں مصلحتاً خاموش رہا۔ ایک عورت کا ذکر تو ہو چکا تھا لہٰذا دوسری عورت کا ذکر نہیں سُننا چاہتا تھا۔ میرے ستارے بتاتے تھے کہ عورتیں مجھے راس نہیں آتیں۔ وہ ہمیشہ میرے لیے کسی نہ کسی مصیبت کا باعث بن جاتی ہیں۔ اَب درسیلا کا شجرۂ نسب پوچھنا، گویا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

ڈوبتے سورج کی سُرخی ابھی تحلیل نہیں ہُوئی تھی کہ ہم جنگل کے قریب پہنچ گئے۔

بلند و بالا درختوں پر دُھند گہری ہو گئی تھی اور یک لخت خنکی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے خنکی نہیں، گرسنگی ستا رہی تھی۔ مَیں نے تاشیہ کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "تمھاری سرزمین پر آنے کے بعد پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہُوا۔ آج رات بھی یوں ہی گزرے گی۔"

"مَیں تم سے مختلف نہیں ہوں مگر اس فرق کے ساتھ کہ مجھے کھانا تو ملا لیکن بے حد مہنگا پڑا۔ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ آج رات تم بھُوکے رہو گے تو مَیں بھی بھُوکی رہوں گی۔" تاشیہ نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا۔

ہم جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔

سِلارد نے گھوڑے سے اُتر کر ایک صاف ستھری جگہ تلاش کی پھر گھوڑے درخت سے باندھنے کے بعد وہ خشک لکڑیاں تلاش کرنے لگا۔ ہم بیٹھے، اُسے کام کرتے دیکھتے رہے۔ لکڑیوں کا ایک انبار لانے کے بعد وہ اپنے گھوڑے تک گیا اور تھیلے سے چقماق نکال لایا۔

لکڑیوں کو آگ دِکھانے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم لوگ اِدھر آ جاؤ۔ جب تک آگ تاپو گے، مَیں کوئی خرگوش مار لاؤں گا۔" اس نے اپنے خنجر کی طرف اشارہ کیا: "تجربہ بتاتا ہے کہ آدمی ہاتھ پیر ہلائے تو جنگل میں بھُوکا نہیں سو سکتا۔"

پھر سِلارد گھنے درختوں میں غائب ہو گیا۔

مَیں سوچنے لگا کہ خنجر سے کسی آدمی کو تو ہلاک کیا جا سکتا ہے کیا خرگوش کا شکار بھی کیا جا سکتا ہے؟ مَیں نے اس مسئلے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ سِلارد کا مسئلہ تھا۔ اس نے از خود ایک ذمّے داری لی تھی اور ہمیں اس پر تکیہ کرنا تھا۔ اب تک تو اس نے کسی معاملے میں مایوس نہیں کیا تھا، ذمّے داری اور بیدار مغزی کا ثبوت دیتا آیا تھا لہٰذا توقع تھی کہ اَب بھی وہ کامیاب و کامران ہی واپس آئے گا۔

سِلارد کے جاتے ہی مَیں اور تاشیہ اُٹھ کر آگ کے قریب چلے گئے۔ وہ ہاتھ سینکنے لگی تو میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ ہمّت اور حوصلے میں وہ بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ اس کی دو راتیں خاصے ہنگاموں اور خطرات میں گزری تھیں اور اِس رات بھی ہمارے سر پر کوئی سائبان یا کوئی چھت نہیں تھی۔ تاشیہ اس گھنے، پُرخطر اور دہشت ناک جنگل اور غیر یقینی صورتِ حال اور نامساعد و ناموافق حالات میں ذرا بھی خوف

زدہ نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر تکان اور نقاہت کے آثار ضرور تھے اور وہ اس عالم میں بھی پُرکشش لگ رہی تھی۔ میں اس کی دل کشی اور معصومیت سے مسحور ہو کر رہ گیا۔

دفعتاً تاشیہ نے سر اٹھایا اور مجھے اپنی طرف محویت سے دیکھتے پا کر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "کیا بات ہے؟" اُس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں شہزادی! یونہی تمھیں دیکھ رہا تھا۔"

"کوئی خاص بات؟ تم پرسوں شام سے مجھے دیکھتے ہوئے آ رہے ہو۔"

"سوچ رہا ہوں کہ اِس سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے کیسا انوکھا ساتھی ملا ہے۔" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تمھاری ساتھی ہوں؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ "ہوش میں رہو ورنہ احباز پہنچتے ہی کوڑے لگواؤں گی۔"

"خادم حاضر ہے، بشرطیکہ زندہ و سلامت منزل تک پہنچ جائیں۔"

"تمھارا ساتھی ابھی تک واپس نہیں آیا، بڑی دیر ہو گئی۔" وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

میں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

واقعی اُسے بہت دیر ہو گئی تھی...

میں نے باتوں اور محویت میں محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

"تم یہیں ٹھہرو، میں اُسے تلاش کر کے لاتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی، تمھارے ساتھ چلوں گی۔ تمھاری غیر موجودگی میں نہ جانے کیا حالات پیش آئیں۔" وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا تو پھر ایک بات کا خیال رکھنا، میرے بالکل قریب نہ رہنا تاکہ کسی خطرے کے وقت میں آسانی سے کلہاڑا چلا سکوں۔"

ہم دونوں اسی طرف چل دیے جدھر سِلارد گیا تھا...

لیکن ابھی ہم بمشکل پچاس قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک بڑا سا جال ہمارے اوپر آ گِرا...

ہم ہاتھ پاؤں مارنے سے پہلے ہی بُری طرح جکڑے گئے۔

...پھر جنگل متعدد انسانی آوازوں سے گونج اٹھا۔

متعدد لوگ چیختے چلاتے، درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر ہماری طرف جھپٹ پڑے، کچھ درختوں پر سے بھی کُود پڑے تھے۔

میں مچھلی کی طرح تڑپا۔

...کلہاڑے والا ہاتھ بلند کیا۔

لیکن مضبوط جال اس قدر تن گیا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تاشیہ بُری طرح چیخ رہی تھی: "یہ ملکہ رُدبا کے آدمی ہیں، ہمیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

کلہاڑا میرے لیے بے کار ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے کلہاڑا پھینک کر اپنے اوپر جُھکے آدمیوں کو دبوچ لیا، اور اُن کے سر ٹکرانے لگا۔

اُن میں سے کئی کے سَر، تربوز کی طرح چٹخ گئے۔

وہ بُری طرح چیخنے لگے...

مجھ سے نصف درجن آدمی چمٹے ہُوئے تھے اور نقصان اُٹھا رہے تھے لیکن پھر اُن کا زور بڑھ گیا اور پلّہ بھاری ہونے لگا۔ کسی مردِ دانا نے اُن کی مشکل آسان کرنے کے لیے میرے سَر پر بھالے کی بھرپُور ضرب لگائی۔

کھوپڑی میں میرا بھیجا تک ہل گیا...

میں دو آدمیوں کو اپنی گرفت میں لیے ہُوئے، زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

ذہن تاریک ہونے سے پہلے، ہوش و حواس کے بالکل آخری لمحے میں، میری سماعت سے کسی کی چیختی ہُوئی تحکمانہ آواز ٹکرائی: "اِسے جان سے نہ مارنا، یہ ملکہ رُدبا کا حُکم ہے۔ وہ اِسے زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔"

★★

میری آنکھ کھلی تو میں ایک کوٹھڑی میں تھا۔ پتھریلے فرش پر پڑے پیال پر میرا بے حرکت جسم شَل پڑا تھا۔ ایک بڑے سے پیالے میں مچھلی کے تیل میں جلتا ہُوا ایک فتیلہ تھا جو اس کوٹھڑی میں روشنی کا واحد وسیلہ تھا۔ میرے ہاتھ پیر زنجیر سے جکڑے ہُوئے تھے اور زنجیر کا سِرا سنگی دیوار میں پیوست ایک آہنی حلقے سے جُڑا ہُوا تھا... اپنی بے بسی کا احساس ہوتے ہی غصّے کی ایک شدید لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ اس قسم کی صورتِ حال میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے جسم کے عضلات پر زور ڈالا اور زنجیر پر قوت آزمائی کرنے لگا۔ زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ کوٹھڑی میں گونج گئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے سر میں شدید تکلیف کا احساس ہُوا۔ کھوپڑی کے پچھلے حصّے میں درد کی تیز ٹیس اُٹھی تھی۔ میں نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"بیکار ہے مالک!" کمرے کے نیم تاریک گوشے سے آواز سُنائی دی: "ہم بُری طرح پھنس چکے ہیں۔ ملکہ رُدبا نے ہمیں قید کر لیا ہے اور

وہ ملکہ ردمہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ سفاک ہے۔ جب سے ہم یہاں لائے گئے ہیں، میں مسلسل اس مسئلے پر غور کر رہا ہُوں۔ تم تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کتنی بڑی مشکل میں آ پھنسے ہیں۔ اب دیکھو، آگے کیا ہوتا ہے۔"

سِلارد بول رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس کے قریب سے زنجیر کی جھنکار سُنائی دے رہی تھی۔ "تو سِلارد میرے ساتھ ہی پھنس گیا" میں نے سوچا اور اُسی لمحے مجھے شہزادی تاشیہ کا خیال آیا۔ "شہزادی کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہے؟ مجھے اس کی آواز نہیں سُنائی دے رہی ہے۔" میں نے سِلارد سے پوچھا۔

زنجیر کی جھنکار ایک بار پھر سُنائی دی۔

پھر نیم تاریک گوشے سے سِلارد کی آواز اُبھری۔

"وہ خیریت سے ہے مالک! اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا، اس کا بال بھی بیکا نہیں ہُوا۔ ملکہ رُدبا نے شاہِ احباز سے زرِ تاوان حاصل کرنے کے لیے اُسے بطور یرغمال روک رکھا ہے۔ وہ ایک بار پہلے بھی کوشش کر چکی تھی لیکن تم شہزادی کو اس کے چُنگل سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔" سِلارد کے ہنسنے کی آواز سُنائی دی۔ "تم اور شہزادی ایک بار پھر اُسی مقام پر آ گئے ہو، جہاں سے چلے تھے۔ بہرحال رقم ملنے کے بعد ملکہ رُدبا، شہزادی تاشیہ کو تو بحفاظت تمام اس کے باپ تک پہنچا دے گی لیکن ہمارا کیا بنے گا، یہ سُن کر ہی جاں تاہے۔ مجھے تو اس سلسلے میں سوچتے ہُوئے بھی خوف آتا ہے۔ ہمارا انجام اچھا نہیں ہو گا مالک! تم خود دیکھ لینا۔"

میں اپنے جسم پر زور ڈال کر ایک بار پھر زنجیر کی مضبوطی کو آزمانے لگا۔ خاصی مضبوط زنجیر تھی... بے دم ہو کر میں نے جسم پیال پر ڈال دیا اور سِلارد کی تشفی کے لیے بولا: "تم دِل مضبوط رکھو سِلارد۔ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جو حل نہ ہو سکے اور کوئی مشکل ایسی نہیں ہوتی جو ٹل نہ سکے۔ کوئی بات یقینی نہیں ہوتی بلکہ ہر بات امکانی ہوتی ہے۔"

میں نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا؟

...یہ مصیبت کیسے ٹلے گی؟

"مجھے تمھاری بات کا یقین ہے، مالک!" سِلارد کی آواز سُنائی دی۔ اس بار اس کا لہجہ پژمُردہ نہیں تھا۔

اُسے میری بات سے سہارا ملا تھا...

"میں بھول گیا تھا کہ تم ایک دانش مند آدمی ہو اور ہر مشکل سے نکل آتے ہو۔ مجھے اس کا اندازہ یوں ہے کہ تم نے ہودسا جیسے وحشی اور جنگجو کا خاتمہ کر دیا۔ تم سے پہلے کوئی مائی کا لال اس کے جسم پر خراش بھی نہیں ڈال سکا تھا۔" اُس نے خوش دِلی سے کہا۔

میں نے ایک بار پھر عضلات پر زور ڈالا اور زنجیر پر قوت آزمائی کی لیکن اگلے ہی لمحے احساس ہو گیا کہ ہر جگہ دانش مندی نہیں چلتی۔ یہاں دانش مندی کے علاوہ بھی کچھ چیزوں کی ضرورت تھی، جو اس وقت دستیاب نہیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ سِلارد سے کچھ معلومات ہی کیوں نہ حاصل کی جائیں۔ کبھی کبھی دُرست معلومات بھی کام دے جاتی ہیں۔

"یہ کون سی جگہ ہے، سِلارد؟" میں نے پوچھا۔ "انھوں نے مجھے جکڑ لیا تھا اور مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کیا ہُوا؟"

"یہ ایک بہت بڑا قلعہ ہے، مالک! یہ علاقہ سمندر کے مغربی ساحل پر ہے۔ مجھے یہاں تک پیدل لایا گیا تھا۔ شہزادی تاشیہ گھوڑے پر سوار تھی اور تمھیں ڈولی میں لایا گیا تھا۔ تمھیں بے ہوش رکھنے کے لیے دَوا دی گئی تھی، مالک! ملکہ رُدبا کے آدمی تم سے بے حد خوف زدہ تھے۔"

دُکھتے ہُوئے سر کے ساتھ مجھے ہلکی بُو بھی محسوس ہُوئی تھی۔ اب پتہ چلا کہ وہ کسی دَوا کی بُو تھی، جو ملکہ رُدبا کے بُزدلوں نے مجھے قابو میں رکھنے کے لیے دی تھی۔

"ہمیں قابو کرنے کے لیے اُنھوں نے جال استعمال کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے تعجب ہے سِلارو! کہ اُنھیں ہماری نقل و حرکت، مقام اور وقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیسے ہو گیا۔ وہ تو باقاعدہ ہماری گھات میں بیٹھے ہُوئے تھے۔"

"اِس پر خود مجھے بھی حیرت ہُوئی تھی، مالک! میں تو کسی خرگوش کی طرح پکڑ لیا گیا تھا۔ بعد میں غور کیا تو احساس ہُوا کہ ملکہ ردمہ نے یقیناً ملکہ رُدبا کے پاس ہمارے فرار کی اطلاع پہنچوا دی ہو گی۔ اِن کے مزاج اور خیالات میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ شاہِ یوطابا تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کیوں کہ ملکہ رُدبا اور شاہِ یوطابا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔"

"تو یہ بات ہے۔" میں نے سوچا۔ ملکہ ردمہ نے بڑی گہری چال سوچی تھی۔ میرے اور تاشیہ کے سلسلے میں اُسے ناکامی ہُوئی تو اس کی سازش بھی ناکام ہو گئی۔ وہ تاشیہ سے حسد کرتی تھی اور مجھے اپنا آلۂ کار بنانا چاہتی تھی لیکن اس کا گھناؤنا اور شیطانی منصوبہ، ہمارے فرار کے نتیجے میں دَھرا کا دَھرا رہ گیا۔ اس لیے وہ اب اپنی

سازش کی تکمیل ملکہ رُدبا کے ہاتھوں کروانا چاہتی ہے۔

"کچھ، اس ملکہ رُدبا کے بارے میں بھی بتاؤ"میں نے رومہ کا خیال ذہن سے جھٹکتے ہُوئے کہا۔

سیلارد نے ملکہ رُدبا کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ مجھے سیلارد کی بات میں مبالغے کا شائبہ تک محسوس نہیں ہُوا۔

"وہ ایک حرافہ عورت ہے، مالک!"سیلارد کہہ رہا تھا"بے حد اوباش اور پہلے درجے کی عیاش ہے اور اس میں خرابی یہ ہے کہ لذت کوشی کے بعد اپنے ہر محبوب کو قتل کر دیتی ہے تاکہ خواب گاہ کی داستانیں باہر نہ جاسکیں لیکن یہ باتیں بھی کہیں چھپی رہ سکتی ہیں۔ اپنے خادموں اور غلاموں کے ساتھ، اس کی زیادتیاں اور سفاکیاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اس کے بہت سے آدمی اپنے بائیں کان اور عورتیں جسم کے حسین حصّوں سے محروم ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس کی رفاقت میں رہ چکے ہیں۔ جب ہم قلعے میں داخل ہُوئے تھے تو میں نے کئی محافظوں کو دیوار کے ساتھ آہنی شکنجوں میں لٹکے ہُوئے دیکھا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ، وہ لوگ ہیں جن کی غفلت سے شہزادی تاشیہ نکل بھاگی تھی۔ اُن میں سے ایک اُس وقت بھی جانکنی کے عالم میں تھا"

"ملکہ رُدبا کس عمر کی ہوگی؟"میں نے پوچھا۔

"کون بتا سکتا ہے"سیلارد، زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ بولا"کچھ کہتے ہیں پچاس سال کی ہے اور کچھ پانچ سو سال کی بتاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ساحرہ ہے، چڑیل ہے لیکن اس کے باوجود، میرے خیال میں وہ پانچ سو سال کی تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بہرحال ایک بات بالکل دُرست ہے کہ وہ بے حد حسین اور زہرہ شکن ہے لیکن وہ کسی کو اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ عورتیں بڑی مکّار ہوتی ہیں، مالک! چاہے وہ چڑیل ہی کیوں نہ ہو۔ چال بازی عورتوں کی سرشت ہے"

سیلارد کا تجزیہ ابھی مکمل نہیں ہُوا تھا کہ چھت پر ایک دروازہ کھُلا اور ایک چہرہ جھانکتے ہُوئے بولا"تم میں سے جس کا نام سرفروش ہے، ملکہ رُدبا اُسے فوراً اپنے حضور دیکھنا چاہتی ہے۔ . . اور کان کھول کر سُن لو، کوئی چال بازی نہیں چلے گی۔ زیادہ ہوشیار اور چالاک بننے کی صُورت میں تمھارا سَر دھڑ سے جُدا ہو جائے گا"

کمرے میں ایک سیڑھی لٹکائی گئی . . .

پھر چند مسلح آدمی نیچے آئے۔ اُن کے جسم پر مخصوص وردی تھی لیکن اُن میں سے ہر ایک اپنے بائیں کان سے محروم تھا۔ اُنھوں نے مجھے زنجیر سے آزاد کیا اور سیڑھی کی طرف دھکیل دیا تھا۔

اچانک سیلارد کی غصّے بھری آواز سُنائی دی۔ وہ شکوہ کرنے کے انداز میں کہہ رہا تھا"مجھے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا گیا۔ کیا تم لوگ اپنے ہی جیسے ایک آدمی کو بھوکا پیاسا مر جانے دو گے؟ اس کے علاوہ یہ جگہ بڑی غلیظ ہے۔ یہاں چوہے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ میں نے اس سے زیادہ گھناؤنا بدبودار تہ خانہ تو زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا"

جواباً وہ لوگ زور سے ہنس پڑے۔

پھر اُن میں سے ایک سیلارد کے قریب گیا اور اُسے ٹھوکر رسید کرتے ہُوئے بولا"میں تمھاری اوقات جانتا ہُوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم تہ خانوں ہی میں رہتے آئے ہو لیکن اپنا گندا مُنہ بند رکھو، ورنہ مقررہ وقت سے پہلے ہی جہنم رسید کر دیے جاؤ گے"

میں سیڑھی کی طرف بڑھا اور یہ دیکھ کر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ مجھ سے دُور دُور چل رہے تھے، کوئی میرے قریب نہیں آرہا تھا۔ گویا وہ مجھ سے بُری طرح خوف زدہ تھے۔ میں دروازے سے گزر رہا تھا کہ نیچے سے سیلارد کی آواز سُنائی دی۔

"خوش رہو، مالک! لیکن اپنے غلام کو فراموش نہ کر دینا"

● ملکہ رُدبا کا قلعہ بے حد وسیع و عریض ثابت ہُوا۔ مجھے کئی ایسی طویل راہ داریوں سے گزرنا پڑا جن میں مشعلوں کی روشنی پھیلی ہُوئی تھی پھر راستے میں کئی زینے بھی آئے۔ اوپر پہنچ کر مجھے ہَوا میں تُرشی کا احساس ہُوا۔ قریب ہی سمندر کی سرکش لہروں کے ساحل سے سر ٹکرانے کی آواز آرہی تھی۔ قلعے کے اطراف میں گہری دُھند کا حصار تھا۔ اوپر آسمان تاریک نظر آیا . . . چاند یا کوئی ستارہ دیکھنے میں نہیں آرہا تھا۔

ہم قلعے کے ایک بلند و بالا مینار کے قریب پہنچ گئے پھر مزید زینے طے کرنے پڑے۔ اس کے بعد مجھے ایک بڑے کمرے میں دھکیل دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی عقب میں زور سے دروازہ بند کرنے اور اسے مقفل کرنے کی آواز سُنائی دی۔

اَب میں کمرے میں اکیلا تھا۔

لیکن میری چھٹی حِس کہہ رہی تھی کہ میں تنہا نہیں ہُوں۔ یہ احساس مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا لیکن میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے ظاہر ہوتا کہ کمرے میں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی سے باخبر ہو گیا ہُوں۔

میں گھوم پھر کر اس بڑے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

اگر ملکہ رُدبا میرے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیلنا چاہتی تھی تو یہی سہی۔ میں بارہا ایسے کھیل کھیل چُکا تھا۔ میری طمانیت کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ مجھے اور سیلارد کو فوری طور پر [illegible]ل نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اس ایک گنجائش سے بہت سی گنجائشیں [illegible]ل آنے کا امکان تھا۔

وہ کمرہ کئی کمروں سے جُڑا ہُوا تھا اور اس کی سجاوٹ میں [illegible]ی خوب صورتی برتی گئی تھی۔ جس سے مکین کی طبیعت کی نفاست [illegible]سندی کے علاوہ عیش کوشی کا بھی پتہ چلتا تھا۔ فرش پر نہایت [illegible]، قیمتی اور گداز کھالیں بچھی ہُوئی تھیں۔ ایک کھال ریچھ کی تھی [illegible]پنی زندگی میں یقیناً دس فٹ کا رہا ہوگا۔ کمرے میں نرم اور ملائم [illegible]ن بھی تھے، جن پر کھال ہی کے غلاف چڑھے ہُوئے تھے، البتہ [illegible]ں کوئی کھڑکی نہیں دِکھائی دے رہی تھی۔ کمرہ حیرت انگیز طور پر [illegible]تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے گرم رکھنے کے لیے [illegible]ریقہ اختیار کیا گیا ہوگا۔

کمرے کے ایک گوشے میں بڑی سی میز پر، طشت میں گوشت [illegible]پچے اور سفید روٹی رکھی ہُوئی تھی اور اسی میز پر ایک طرف [illegible]ب اور متعلقہ ظروف رکھے ہُوئے تھے۔ میں نے بے دھڑک [illegible]ی آگ بجھانا شروع کی لیکن شراب کو ہاتھ نہیں لگایا کہ اس [illegible]ع نہیں تھا۔ میں خود پر اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتا تھا . . .

[illegible]م پُری کے دوران میں، دیواروں پر آویزاں منقش اور طلائی کام [illegible]ردوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک میں نے پردوں کے بیچ، ایک [illegible]و اپنی جانب نگراں دیکھا۔ دائیں ہاتھ میں گوشت کا پارچہ [illegible]ر تیز تیز مُنہ چلاتے ہُوئے، میں ذرا سا جُھکا اور مؤدب لہجے [illegible]لا"اس ضیافت کے لیے تمھارا شکریہ، اے مہربان ملکہ! [illegible]ھوکا تھا۔ یہ کھانا واقعی بے حد عمدہ اور لذیذ ہے۔ کیا یہ ممکن [illegible] اس میں سے کچھ میرے اُس ساتھی تک بھی پہنچا دیا [illegible] جو تمھارے تہ خانے میں قید ہے اور مجھ سے زیادہ ہی [illegible]ہے"

[illegible]آنکھ چمک اُٹھی اور اس کے ساتھ ہی دبی دبی سی ہنسی کی [illegible]ائی دی . . . پھر بھاری اور گہری آواز اُبھری"میں نے [illegible]ے بارے میں سچ ہی سُنا تھا۔ تم واقعی دلیر اور جری نظر [illegible]۔ رومہ نے تمھارے چہرے اور جسم کے بارے میں بھی [illegible]ہیں لکھا، سرفروش! کیا تم وہی ہو، جو نظر آتے ہو؟ [illegible]ں سوال کے جواب پر تمھاری زندگی کا انحصار ہے، یہ بات میں پہلے ہی واضح کیے دیتی ہُوں"

ملکہ رُدبا کے لب و لہجے میں ایسی تنبیہہ تھی کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں ایک کڑی آزمائش کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میں دوبارہ خم ہوتے ہُوئے ذو معانی انداز میں بولا۔

"میں کیا ہُوں اور کیا نہیں ہُوں، یہ تو وقت ہی بتائے گا، ملکہ عالیہ! اگر کوئی آزمائش یا کوئی امتحان مقصود ہو تو میں اس کے لیے تیار ہُوں"

. . . پھر وہی ہنسی . . . بھاری ہنسی . . . جیسے کوئی مَرد ہنسا ہو۔

"تم قبر دیتوں کے انداز میں لفّاظی بھی کر لیتے ہو، مجھے یہ انداز پسند نہیں آیا لیکن تم مجھے پسند آئے ہو . . . اور یہ پسند تمھیں عملی طور پر ثابت کرنا ہوگی۔ تمھیں اس کے لیے ایک موقع دیا جائے گا۔ اگر تم اس حسّاس اور لطیف آزمائش پر پورے اُترے . . . دوسرے الفاظ میں اگر تم جیت گئے تو تمھاری جاں بخشی کی جا سکتی ہے"

"اور میرا وہ ساتھی ملکہ عالیہ . . . ؟ کیا اُس کی بھی جاں بخشی کر دی جائے گی؟ اور کیا شہزادی تاشیہ کو بھی رہا کر کے، اس کے باپ شاہ اخباز کے پاس بھیج دیا جائے گا؟"

پردے کی اوٹ میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی . . .

پھر ایک بے حد سرد آواز اُبھری"تم بہت دُور چلے گئے ہو، سرفروش! تم نے مجھ سے سودے بازی کی جرأت کیسے کر لی؟ ایسا لگتا ہے، جیسے یہاں تمھیں کچھ حقوق حاصل ہیں!"

میں نے اس معرکے کا آغاز جرأت سے کیا تھا اور معاملہ جرأت سے ہی جاری رہنا چاہیے تھا۔ میں نے اس آنکھ کی طرف گھورتے ہُوئے، اُسی جیسے سرد لہجے میں کہا"میں درخواست تو بہرحال کر سکتا ہوں، ملکہ عالیہ! وہ مَرد، مَرد ہی کیا، جو اپنے ساتھیوں کے کام نہ آیا"

"کافی ہے" دوسری طرف سے کہا گیا"تمھیں، میرے لیے تیار کیا جائے گا اور تمھارے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ زبان کو اپنے قابو میں رکھو"

اس کے ساتھ ہی وہ آنکھ غائب ہو گئی۔

کہیں قریب ہی سے متعدد قدموں کی آوازیں اُبھرتی سُنائی دیں . . .

اگلے ہی لمحے دروازہ کھُلا اور چار دوشیزائیں کمرے میں داخل ہُوئیں۔ اُنھوں نے جو لباس زیبِ تن کر رکھا تھا، وہ بے لباسی

کا نظیر تھا اور مجھے ایک ہی نظر میں معلوم ہوگیا کہ وہ قدرت کی عنایت کردہ نسوانی دل کشی اور سرمایۂ فخر سے یکسر محروم ہیں۔ اس حصے پر فقط ایک طشتری نما سُرخ نشان ہی باقی رہ گیا تھا اور یہ غالباً ملکہ رُدبا کی طرف سے عطا کردہ تمغۂ خدمت تھا۔ وہ اپنی ظالم اور سفّاک ملکہ کی درندگی اور بہیمیت کا شکار ہُوئی تھیں۔

وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔ اُن میں سے کسی نے ہنسنا تو درکنار، مجھے دیکھا تک نہیں اور نہ ہی آپس میں کلام کیا۔ یہ میرے لیے ایک حیرت انگیز بات تھی۔ یہ خاموشی جنسِ لطیف کی فطرت کے خلاف تھی۔ مَیں نے سُنہرے بالوں والی ایک نازک بدن لڑکی کو پکڑ لیا اور اُس کا مُنہ کھول کر دیکھا تو میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

لڑکی کی زبان کٹی ہُوئی تھی۔

اُس سے گویائی چھین لی گئی تھی۔

مَیں جھُرجھُری سی لے کر رہ گیا۔

سلارو کی بتائی ہُوئی ہر بات دُرست ثابت ہوتی جارہی تھی۔ مَیں نے ملکہ رُدبا کو کچھ دیر پہلے اس کی دی ہُوئی دھمکی کی روشنی میں تصوّر کی آنکھ سے دیکھا تو وہ مجھے ایک خونخوار اور خون آشام چڑیل نظر آئی۔ وہ ملکہ ردمہ سے بھی بہت آگے کی چیز تھی۔

چاروں لڑکیوں نے کانسی کے ایک بڑے برتن میں پانی بھرا اور مجھے غسل دینے لگیں۔ پانی گرم اور جھاگ دار تھا۔ نہانے سے فارغ ہُوا تو اُنھوں نے معطّر تولیوں سے میرا جسم خشک کیا . . . پھر مجھے بہترین اور شان دار لباس پہنایا گیا۔ پہننے کے لیے ملائم چمڑے کے جُوتے دیے گئے جن کے تسمے گھٹنوں تک آتے تھے۔ اس سرزمین پر مَیں نے پہلی بار پیٹ بھر کھانا کھایا اور قاعدے کا لباس پہنا تھا۔ میرا لباس کچھ ایسا تھا جو میں نے یہاں طبقۂ اُمرا اور جانبازوں ہی کو پہنے ہُوئے دیکھا تھا اور یہ سب کچھ ایک ایسی عورت نے فراہم کیا تھا جو میرے اور میرے ساتھیوں کے مستقبل پر اپنا منحوس سایہ ڈالنے والی تھی۔

لڑکیاں اپنی ذمّے داری سے سُبک دوش ہوکر مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد پردے کی دوسری طرف قدموں کی چاپ سُنائی دی . . .

پھر پردہ درمیان سے سرکا اور ملکہ رُدبا اندر آگئی۔

وہ سادہ سا سیاہ رنگ کا لبادہ پہنے ہُوئے تھی جو اس کے جسم پر کَسا ہُوا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا تھا اور اُس پر زردی کھنڈی ہُوئی تھی۔ اس کی ناک اور ٹھوڑی بھی لمبوتری تھی . . . دہانے پر کسی سُرخ لکیر کا گمان ہوتا تھا۔ اُس کے بال آراستہ نہیں تھے اور ان میں سیاہی کے درمیان، کہیں کہیں سفیدی بھی جھلک رہی تھی۔

مَیں نے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اور سَر جھُکاتے ہُوئے کہا: "تم ایک حسین و جمیل عورت ہو، ملکہ عالیہ!" یہ کہتے ہُوئے مَیں نے مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ جوان نہیں تھی لیکن خوبصورت ضرور تھی۔ اس کے سراپا میں پاگل کردینے والی کشش تھی۔

جواب میں وہ خاموش رہی . . . اور اپنی بادامی آنکھوں سے میرا جائزہ لیتی رہی پھر تحکمانہ لہجے میں بولی: "جو میری رضامندی کے طلب گار ہوتے ہیں، اُن کی طرف سے یہ ایک فرسودہ اور روایتی جُملہ میرے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مجھ سے عقیدت اور ارادت کے اظہار کی یہاں ایک اور رسم رائج ہے۔ تم گھٹنوں کے بَل چلتے ہُوئے میرے قریب آؤ گے۔"

میں اس کی رضامندی کا طلب گار ہرگز نہیں تھا بلکہ یہ رضامندی مجھ پر مسلط کی جارہی تھی۔ تاہم حُکم کی تعمیل ضروری تھی کیوں کہ اس میں میری اور میرے ساتھیوں کی زندگی مضمر تھی۔

میں گھٹنوں کے بَل جُھکا اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا تھا کہ ملکہ ردبا نے اوڑھی ہُوئی سیاہی فرش پر پھینک دی۔ مَیں نے سیاہ لبادے کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔

ہوش کی آنکھیں بیدار ہُوئیں تو ملکہ رُدبا آنکھیں بند کیے، ہنستے ہُوئے بولی: "واقعی تم اپنے قول و فعل میں پورے اُترے ہو اور آزمائش میں کامیاب رہے ہو۔ مَیں تمھاری جاں بخشی کرتی ہوں۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ تم خوش نصیب ہو، جو اس خواب گاہ سے یوں زندہ و سلامت جارہے ہو۔ اگر تم کوئی عام آدمی ہوتے تو یہ تمھاری زندگی کی آخری رات ہوتی۔ جاؤ، جلدی سے نکل جاؤ اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔ جلدی جاؤ، ایسا نہ ہو کہ میرا ارادہ بدل جائے اور میرے دِل میں خون کی پیاس جاگ اُٹھے۔" یہ کہتے ہُوئے ملکہ رُدبا نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔

مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا لیکن تن ڈھانپتے ہُوئے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا: "میرے ساتھی سِلارو کا کیا ہوگا، اور کیا شہزادی تاشیہ بحفاظت اپنے باپ تک پہنچادی جائے گی؟"

ملکہ رُدبا نے آنکھیں کھول دیں: "تمھیں میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ تم زندہ ہو۔ کیا یہ تمھارے لیے کافی نہیں ہے، جو

اپنے ساتھی اور تاشیہ کی رٹ لگائے ہُوئے ہو؟"

مَیں بے خوف و خطر بول پڑا: "تم نے میرے بارے میں بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کہ میں ایک عام آدمی نہیں ہُوں۔ چونکہ مَیں چھوٹا آدمی نہیں ہُوں اس لیے کوئی چھوٹی سی رعایت بھی قبول نہیں کرسکتا۔ اپنی زندگی بچا لے جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی سوچا جائے۔ مَیں سِلارو اور شہزادی تاشیہ کو ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، چاہے اس کے لیے مجھے اپنی زندگی سے ہی ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑیں۔"

ملکہ رُدبا مجھے غور سے دیکھنے لگی: "آج تک کسی نے مجھ سے اس انداز اور اس لہجے میں بات نہیں کی۔ کیا تمھیں مجھ سے خوف نہیں آرہا؟ کیا تم نے لوگوں سے میری سفّاکی اور درندگی کی داستانیں نہیں سُنیں؟ کیا تمھیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟"

"مَیں مَرد ہُوں ملکہ عالیہ اور ایک مَرد کی ہی موت مَرنا چاہتا ہوں۔ مجھے مَرتے ہُوئے کوئی دُکھ نہیں ہوگا کیوں کہ مَیں اِس لیے نہیں مَروں گا کہ تمھارے امتحان میں ناکام رہا بلکہ میری موت اس لیے ہوگی کہ مَیں اپنے ساتھیوں کی زندگی کی ضمانت حاصل نہیں کرسکا۔"

"تم بے حد دلیر آدمی ہو۔" ملکہ رُدبا اُٹھ بیٹھی۔

مجھے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے تحسین و ستائش کی جھلک دِکھائی دی۔

. . . پھر یک بہ یک اس کی آنکھوں میں اُداسی تیر گئی: "میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ مَیں آخر ایک عورت ہی تو ہُوں۔ میری رعایا اپنے حکمران کو طاقت وَر اور جابر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ اگر میں ذرا بھی کمزور پڑجاؤں تو وہ میری بوٹیاں اُڑادیں۔ میری حکمرانی اسی وقت تک ہے جب تک مَیں ظالم اور جابر ہُوں۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں سفّاکی اور درندگی کے مظاہرے کرتی رہتی ہُوں۔ اس طرح عوام قابو میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مَیں اُن کی تسکین کے لیے خونی تماشے بھی کرتی ہوں۔ میری رعایا ایک ایسی رعایا ہے، جس کی خون کی پیاس کبھی نہیں بُجھتی۔ چنانچہ مجھے ایک ایسا رُوپ دھارنا پڑتا ہے، جیسے میں ایک خون آشام ملکہ ہُوں، اس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ تمھیں، مَیں ایک خطرہ مول لیتے ہُوئے یہاں سے نکل جانے کی اجازت دے رہی ہُوں لیکن اگر تاشیہ اور تمھارے ساتھی سِلارو کو بھی نکل جانے دیا تو اسے میری کمزوری اور ناتوانی پر محمول کیا جائے گا۔ رعایا پر میری گرفت کمزور ہوجائے گی اور اس طرح کسی بھی وقت میرا خاتمہ ہوسکتا ہے۔"

ملکہ رُدبا کچھ دیر خاموش رہی پھر دوبارہ بولنے لگی: "مجھے افسوس ہے، سرفروش! میں تمھارے ساتھیوں کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں دے سکتی۔ اُن کو رعایت دے کر میں اپنی رعایا کو اُن کے مخصوص خونی کھیل اور تفریح سے محروم نہیں کرسکتی۔ مجھے عوام کو بھی خوش رکھنا پڑتا ہے . . . اُن پر حکومت کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ہاں اگر تم اُنھیں بچانا چاہو تو تمھیں کوشش کرنے کا موقع ضرور دے سکتی ہوں۔ اس طرح لوگ بھی لُطف اندوز ہوں گے اور میری کمزوری بھی ظاہر نہیں ہوگی۔ تمھیں موقع دیا جائے گا کہ خود کو اور اپنے ساتھیوں کو ہلاکت سے بچاسکو۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ تم خواب گاہ کے شہ زور ثابت ہوگئے ہو، اب دیکھنا ہے کہ مردِ میدان بھی ثابت ہوتے ہو یا نہیں۔"

ملکہ رُدبا نے اشارہ کیا تو اگلے ہی لمحے دو لڑکیاں کمرے میں داخل ہُوئیں۔ اُنھوں نے فرش پر پڑی لبادے کی سیاہی ملکہ کے جسم پر ڈال دی اور پھر مجھے خواب گاہ سے باہر لے گئیں، جہاں مسلّح محافظ پہلے سے موجود تھے۔

اس بار مجھے اس کمرے میں نہیں لے جایا گیا، جہاں سلارو قید تھا بلکہ یہ کوئی اور ہی کمرہ تھا۔ بڑا کُشادہ اور بے حد آرام دہ۔ وہاں کھانے پینے کی مزید اشیا موجود تھیں۔ ایک گوشے میں اوڑھنے اور بچھانے کے لیے نرم اور نفیس کھالوں کا بھی انبار لگا ہُوا تھا۔

مسلّح محافظ مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے لیکن جاتے ہُوئے دروازے کو مقفل کرنا نہیں بھُولے تھے۔

مَیں، کمرے کی چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہُوا اور سوچنے لگا کہ دیکھو کل کا دِن میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے اپنے جلو میں کیا لے کر آتا ہے؟ یہ حقیقت تھی کہ مَیں شہزادی تاشیہ اور سلارو کے لیے بے حد پریشان تھا۔ شہزادی تاشیہ میری ذمّے داری تھی۔ اُس نے مجھ سے مدد مانگی تھی اور اب یہ میرا فرض تھا کہ مَیں اُسے بخیریت اس کے باپ شہنشاہ اجباز تک پہنچاتا . . . رہا سلارو کا معاملہ، تو وہ بھی اپنی جانثاری کے باعث میری ذمّے داری بن چکا تھا۔ اُس غریب نے میری خاطر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ میرے لیے جلاوطن ہوگیا تھا۔ اب وہ، لوطابا اور ملکہ ردمہ کی زندگی میں، کبھی موآبہ میں داخل نہیں ہوسکے گا۔ اس کے لیے دُنیا میں کوئی ہستی، کوئی سہارا تھا تو صرف میں ہی تھا۔ اس لیے مَیں اسے مایوس نہیں کرسکتا تھا۔ شہزادی تاشیہ کے لیے کم ازکم مجھے ایک بات کا اطمینان تھا کہ ملکہ رُدبا اُسے کوئی گزند

نہیں پہنچائے گی بلکہ کسی نہ کسی بہانے بچانے کی کوشش کرے گی کیوں کہ شہنشاہ احباز بہرحال اس کا بھائی تھا۔ بھاری تاوان لے کر وہ تاشیہ کو رہا کر دے گی۔ تاشیہ کو شہنشاہ احباز تک پہنچانے سے میرے بھی کئی مفاد وابستہ تھے۔ ظاہر ہے، انعام واکرام کے طور پر میرے وقار اور مرتبے میں اضافہ ہوتا اور میں اس سرزمین پر، جہاں مجھے نہ جانے کتنا عرصہ رہنا تھا، باعزت طور پر رہ سکتا تھا۔

رات دم توڑ رہی تھی اور سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ ساحل پر لہروں کا شور بدستور جاری تھا اور قلعہ آہستہ آہستہ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔

میرے سامنے پورا ایک دن تھا اور آزمائش بھی کڑی تھی، پھر اس کے علاوہ تھکن اور نیند سے میری بُری حالت ہو رہی تھی۔ میں کھڑکی سے ہٹ آیا اور کھالوں کو دبیز اور آرام دہ بستر کی صورت دے کر بہتر فردا کی اُمید لیے ہُوئے، سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔

★★

اس خونیں کھیل کے آغاز سے پہلے مجھے تاشیہ اور سلارو سے تفصیلی ملاقات کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ دونوں، قلعے کے اندر ایک بڑے سے احاطے میں الگ الگ ستونوں سے بندھے ہُوئے تھے اور ملکہ رُوبا کی پاگل اور خون کی پیاسی رعایا اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہو چکی تھی۔ اسی احاطے میں ایک طرف تین بڑے آہنی پنجرے رکھے ہُوئے تھے جن میں تین جسیم اور قوی ہیکل ریچھ مشتعل اور غضب ناک ہو کر بُری طرح غرا رہے تھے۔

"ہرمزد ہماری حفاظت کرے" سلارو پنجروں کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔

مَیں نے پہلی بار اُسے حقیقی معنوں میں خوف زدہ ہوتے دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پُشت پر بندھے ہُوئے تھے اور ایک موٹی ڈوری کمر سے گزار کر اُسے ستون سے باندھ دیا گیا تھا۔ سلارو خوفزدہ ہونے کے باوجود مستعد اور چاق وچوبند نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی اندرونی جذبے سے چمک رہی تھیں اور وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا "مجھے معلوم ہے، مالک! اگر ہرمزد نے ہمیں بچایا، تو تمہارے ذریعے ہی بچائے گا۔ میری بات غور سے سُنو! اگر تم ان میں سے کسی ایک ریچھ کو فوری طور پر ہلاک کر دو، تو ہمارے بچ نکلنے کی صورت بن سکتی ہے۔ یہ وحشی جانور ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں۔ اگر تم ایک ریچھ کو ہلاک کر کے ڈال دو تو باقی دونوں ریچھ اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس وقفے سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے تمھیں بہت کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ . . اور مالک! تم جانتے ہی ہو کہ اصل چیز وقت کا صحیح استعمال ہے، بروقت فیصلہ، بروقت اقدام، یہ ملکہ رُوبا. . . ہرمزد اس کا قلب پارہ پارہ کرے، اس نے تمھارے لیے ایک چھوٹی سی گنجائش چھوڑی ہے۔ ذرا میرے اور شہزادی تاشیہ کے ستونوں کی طرف دیکھو۔ یہ اتفاقی بات نہیں ہے"

مَیں نے پہلے سلارو اور پھر شہزادی تاشیہ کے ستون کی طرف دیکھا. . .

سلارو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

مَیں نے پہلے یہ بات محسوس نہیں کی تھی۔ اب جو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ دونوں ستونوں کے درمیان تقریباً بچاس قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بیک وقت ان دونوں کو نہیں بچا سکتا تھا۔ صرف ایک کو بچانا ممکن تھا۔ اب یہ میری مرضی پر منحصر تھا کہ مَیں کسے بچاتا ہُوں اور کسے ریچھوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہُوں۔ گویا ملکہ رُوبا نے یہاں بھی میرا امتحان لیا تھا۔ اس کے خیال میں، مَیں تاشیہ کو بچاتا کیوں کہ اس سے شہنشاہ احباز کی خوشنودی حاصل ہوتی اور سلارو کو یوں ہی مر جانے دیتا کیوں کہ وہ کوئی اہم آدمی نہیں تھا: . لیکن کیا واقعی سلارو ایک اہم آدمی نہیں تھا، میرے نزدیک ایسا نہیں تھا۔ وہ میرے لیے بے حد اہم تھا۔ میری نگاہ میں اس کی قدر و قیمت شہزادی تاشیہ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ میں اس شخص کے ضائع ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شہزادی کی حیات نو، اُسی کی مرہونِ منت تھی۔ مَیں نے دائیں ہاتھ میں کانسی کا بھاری کلہاڑا سنبھالتے ہُوئے، دُور چبوترے پر، ایک چوبی تخت پر براجمان ملکہ رُوبا کی طرف دیکھا اور اس کے خیالات پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں شہزادی تاشیہ کو سلارو پر فوقیت دوں گا اور اُسے ریچھوں کا لقمۂ تر نہیں بننے دوں گا۔ اس طرح ریچھ شہزادی تاشیہ کی طرف سے مایوس اور ناکام ہو کر سلارو پر چڑھ دوڑیں گے اور اس کی رعایا کو تفریح کا سامان مہیا ہو جائے گا۔ اس طرح ملکہ رُوبا سب کچھ مجھی پر ڈال رہی تھی۔ ایک تیر سے دو نہیں بلکہ تین شکار. . . زرِ تاوان حاصل کرنے کے لیے شہزادی تاشیہ محفوظ رہتی، سلارو کی ہلاکت سے رعایا کے سفاک جذبوں کی تسکین ہو جائے گی اور مَیں اپنی جگہ سمجھتا رہوں گا کہ ملکہ نے مجھے اپنے ساتھیوں کو بچانے کا موقع فراہم کیا تھا. . . لیکن مَیں کامیاب نہ ہو سکا اس لیے ایک ساتھی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ واقعی کیا دماغ پایا تھا اس بدبخت عورت نے. . . مَیں اس کی ذہانت کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

مَیں نے احاطے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا. . .

ہر ستون کے قریب، چوبی رُکاوٹوں کے عقب میں. . . تیر اندازوں کا ایک ایک دستہ متعین تھا اور قلعے کا ایک افسر اُنھیں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ اس رمز کو سمجھنے میں بھی مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس انتظام و انصرام میں دو ہی باتیں پوشیدہ تھیں۔ پہلی یہ کہ ملکہ ہم تینوں کو تحفظ دینا چاہتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ریچھ ہمیں ختم کر دیں، تیر انداز تیروں کی بوچھار کر کے انھیں ختم کر دیں گے۔ ریچھوں کی موت کی صورت میں بھی رعایا کی تفریح ہو جاتی، یا پھر ملکہ نے اس خیال کے تحت تیر اندازوں کا دستہ متعین کیا تھا کہ اگر میں نے شہزادی تاشیہ کو چھوڑ کر سلارو کو بچانا چاہا تو تیر انداز شہزادی کے قریب پہنچنے والے ریچھ کو چھلنی کر دیں گے۔ بہرحال ملکہ ایک ذہین عورت تھی اُس نے سب کو خوش کرنے کے لیے بہت اچھا منصوبہ بنایا تھا۔ دونوں صورتوں میں اگر کوئی ملزم ٹھہرتا تھا، تو وہ صرف میری ہی ذات تھی۔

سلارو بھی ان تمام باتوں کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا "مَیں جانتا ہُوں، مالک! کہ تم ہمیں بچانے کی پوری پوری کوشش کرو گے لیکن مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مَیں شہزادی تاشیہ کی خاکِ پا بھی نہیں ہُوں، اس کے سامنے میری حیثیت حقیر ہے. . . لیکن مالک اگر کوئی ایسا لمحہ آئے اور تمھیں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو بے دھڑک شہزادی کو تحفظ دینا میں ایک بے نام ونشان آدمی ہوں، میری کمی کسی کو بھی محسوس نہیں ہو گی"

میں نے سلارو کی پیٹھ پر آہستہ سے تھپکی دی اور اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اب اس سے کچھ کہنے کے لیے وقت ہی کہاں رہ گیا تھا۔ مَیں، تاشیہ کے قریب پہنچا تو اُسے مطمئن اور بے خوف پایا۔ اُس کی گردن تنی ہُوئی تھی اور سر فخر سے اُٹھا ہُوا تھا۔ مجھے اس کی مضبوطی اور استقامت پر حیرت ہُوئی۔ وہ ایک متوقع موت کو گلے لگانے کے لیے پُوری طرح تیار تھی۔

"وہ میری موت کی خواہاں ہے، سرفروش! مجھے اپنے قریب پاکر اس نے سرگوشی کی "البتہ اپنے گھناؤنے مقاصد کے حصول کی خاطر وہ تمھیں مَرنے نہیں دے گی۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میری موت کا بدلہ ضرور لو گے۔ وعدہ کرو۔ اجنبی سرزمین کے شہزادے۔ مجھ سے وعدہ کرو؟

"کسی وعدے کی ضرورت نہیں ہے، شہزادی! وہ نہ تمھاری موت کی خواہاں ہے اور نہ ہی مجھے ہلاک کرنا چاہتی ہے۔ ہم دونوں اس کے شکار نہیں ہیں بلکہ اس کا اصل شکار تو بیچارہ سلارو ہے۔ جس کی موت پر آنسو بہانے والا بھی کوئی نہیں ہے"

تاشیہ کی بھوؤں میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور اس کی بھوری آنکھوں میں اضطرابی سی کیفیت اُبھری "تو پھر تم اپنے اسی ساتھی کو بچاؤ۔ اُسے تحفظ دینا، تمھارا فرض ہے. . . لیکن وعدہ کرو کہ بعد میں تم اس غلیظ عورت سے میرا انتقام ضرور لو گے"

عجیب بات تھی. . . سلارو اور تاشیہ، دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ایثار سے کام لے رہے تھے۔ مَیں نے مسکراتے ہُوئے کہا "تم بے فکر رہو۔ خدا نے چاہا تو مَیں، تم دونوں کو بچاؤں گا اور اگر مرنا ہے تو ہم تینوں ساتھ ہی مریں گے"

مجمع بے چین ہو رہا تھا۔

ریچھوں کی غراہٹ بھی بڑھتی جارہی تھی۔

مجھے فوری طور پر ملکہ کے حضور طلب کر لیا گیا۔

مَیں اس کے تخت کے قریب پہنچا تو وہ کچھ آگے جھک گئی۔ کچھ دیر اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی پھر مسکرا کر بولی: "مَیں نے اس صورتِ حال کے بارے میں بہت غور کیا ہے، سرفروش! تمھیں بہرحال کسی ایک کو بچانا ہے۔ . . اور تم اس لڑکی کو بچاؤ گے۔ اس حقیر شخص کو مَر جانے دو گے۔ مَیں نے اس سلسلے میں احکامات دے دیے ہیں لیکن تمھیں بہادری اور جواں مردی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ میری احمق اور گنوار رعایا تفریح چاہتی ہے اور یہ تفریح ایک دو ریچھ اور تمھارے حقیر ساتھی کی موت کی صُورت میں ہی اِنھیں مل سکتی ہے۔ جاؤ میں آج رات تم سے پھر ملوں گی۔"

مَیں نے کلہاڑا سر سے بلند کیا اور مؤدب ہو کر کہا: "مَیں تیار ہوں، ملکہ عالیہ۔ ریچھوں کو پنجروں سے نکالنے کا حکم دے دو۔"

مَیں واپس اُس جگہ آگیا، جسے مَیں نے بہت غور و فکر کے بعد منتخب کیا تھا۔ یہ جگہ دونوں ستونوں کے درمیان تھی۔ مَیں اس جگہ رہ کر بیک وقت اور ضرورت کے مطابق کسی بھی ستون تک پہنچ سکتا تھا۔

تینوں پنجرے دھکیل کر ستونوں سے کچھ فاصلے پر رکھ دیے گئے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ محض اتفاق تھا یا پھر سوچا سمجھا منصوبہ۔ . . کہ تینوں پنجرے ایک ساتھ نہیں کھولے گئے بلکہ انھیں ایک ایک کر کے کھولا گیا۔ یہ میرے لیے ایک بہتر صورت تھی۔ مجھے کچھ کر گزرنے کے لیے چند قیمتی لمحے مِل گئے تھے . . .

پہلا ریچھ پنجرے سے باہر آیا تو اس کی تھوتھنی کھلی ہُوئی تھی۔ جس سے غیر معمولی بھیانک جبڑے جھانک رہے تھے۔ وہ پچھلے دو پیروں پر کھڑا ہو گیا اور بُری طرح غرانے لگا۔

اس کا قد دس ہاتھ سے کم نہ رہا ہوگا، اس کا جسم کوئلے کی مانند سیاہ تھا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہُوئے تھے اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ توز آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر اُس نے تھوتھنی اُوپر اُٹھائی اور ہَوا میں کچھ سُونگھنے لگا۔ اس کے نتھنوں میں انسانی جسم کی مخصوص بُو پہنچ گئی تھی۔ اس کے ڈھول جیسے سینے سے زوردار غراہٹ بلند ہُوئی اور وہ جھومتا ہُوا تاشیہ کی طرف بڑھا۔

مَیں نے کلہاڑے پر گرفت مضبوط کی اور اسے سَر سے بلند کر کے، لہراتا ہُوا ریچھ کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی بلند آواز سے چیختا بھی رہا تاکہ ریچھ کی توجہ میری طرف ہو جائے لیکن ریچھ نے ایک نسوانی جسم کی خوشبو محسوس کر لی تھی، لہٰذا اُس نے مجھے نظر انداز کر دیا اور تاشیہ کی طرف بڑھتا رہا . . .

اُسی لمحے مجھے دوسرا ریچھ پنجرے سے نکلتا دکھائی دیا۔

مَیں نے سوچنے میں مزید وقت ضائع کیے بغیر پہلے ریچھ پر حملہ کر دیا۔

کلہاڑے کا پھل ریچھ کی موٹی گردن میں دھنس گیا۔ وہ زور سے غرایا اور غضب ناک ہو کر مجھ پر حملہ آور ہُوا۔ اُس کا طاقت ور پنجہ پُوری قوت سے میری طرف آیا، جسے میں پھرتی سے، ایک طرف ہٹ کر بچا گیا۔

بچتے بچتے مَیں نے کلہاڑے کا دوسرا وار کیا۔

ریچھ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مجھے اپنی گرفت میں لے کر، سینے سے بھینچ کر، مار ڈالے۔ اس کے جبڑے بھیانک انداز میں کھُلے ہُوئے تھے۔ حملے کے دوران کئی بار میرے کلہاڑے کا پھل اُس کی موٹی کھال میں دھنس گیا اور پھل نکالتے ہُوئے مَیں ریچھ کی گرفت میں آنے سے بال بال بچا۔ میرے مسلسل حملے اور اپنی ناکامی سے ریچھ پاگل ہونے لگا۔ اس کے چیخنے اور اس کے غرانے کا انداز دیدنی تھا۔ اَب وہ تاشیہ کو بھُول چکا تھا اور اس کی ساری توجہ میری طرف ہو چکی تھی۔

اُس وحشی ریچھ سے نبرد آزما ہوتے ہوئے، ایک لمحے کے لیے پلٹ کر مَیں نے دوسرے ریچھ کی طرف دیکھا۔

. . . میرے پسینے چھُوٹ گئے۔

وہ سیدھا سِلارد کی طرف جا رہا تھا . . . اَب پچھلے ریچھ سے جنگ کو مزید طول نہیں دیا جا سکتا تھا۔ مَیں نے کلہاڑا بلند کیا اور قوت پیدا کرنے کے لیے اُسے تیزی سے سَر کے اُوپر گھُمایا . . . پھر ایک چیخ مار کر تمام تر توانائی کے ساتھ ریچھ کے سَر پر دے مارا۔ یہ ضرب بہت گہری اور کاری ثابت ہُوئی۔ پھل ریچھ کی کھوپڑی کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہُوا مغز تک اُتر گیا۔

ریچھ کے سر سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔

وہ زور سے غرایا اور لڑکھڑا کر میرے قدموں میں گر پڑا۔

پھر اس کی غراہٹ مدھم پڑتی گئی اور ارد گرد خون کا چھوٹا سا تالاب بنتا گیا۔ یک بہ یک ریچھ کا جسم زور سے کانپا اور ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

مَیں فوراً پلٹا . . .

اور دوسرے ریچھ کی طرف دوڑنے لگا۔

وہ ریچھ سِلارد کے قریب پہنچ چکا تھا اور سِلارد کے حلق سے خوف زدہ چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس کے چیخنے کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ دوسرا ریچھ، پہلے ریچھ کے مقابلے میں کہیں زیادہ جسیم و قد آور تھا اور غراتا ہُوا، حملہ آور ہونے کے انداز میں سِلارد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُن کا درمیانی فاصلہ قریب الختم تھا ریچھ کے غیر معمولی بازو سِلارد کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بڑھے تو وہ بے چارا دہشت سے چیخ اُٹھا لیکن اُس وقت مَیں نے کلہاڑے کا بھرپُور وار ریچھ کی گردن پر کیا۔

ریچھ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میری نگاہ ایک اور دہشت ناک منظر پر پڑی۔

تیسرا ریچھ تاشیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میرا دِل بیٹھنے لگا۔

وہ نازک گھڑی آگئی تھی جس سے میں خوف زدہ تھا۔ دو میں سے کوئی ایک . . . تاشیہ یا سِلارد . . . اور تاشیہ کے پاس پہنچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

یہ سب کچھ ایک ثانیے سے بھی کم وقت میں ہو گیا تھا۔ مَیں نے دوبارہ سِلارد کی طرف دیکھا تو ریچھ کے پنجے اُسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے جسم کے قریب پہنچ چکے تھے اور سِلارد کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی تھی۔ اَب اُس کے حلق سے آوازیں نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے غالباً اس موت کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چشمِ زدن میں، مَیں اُچھل کر سامنے آیا اور پُوری قوت سے کلہاڑے کا وار کیا۔ ریچھ کا ایک پنجہ کٹ کر دُور جا گرا۔

ریچھ غرا کر پیچھے ہٹا۔

مَیں نے دوسرا وار کر دیا . . .

یہ ضرب پہلے ریچھ کی مانند اس کی کھوپڑی پر ثبت ہُوئی۔ ریچھ کا سَر کھُل گیا اور خون کا فوارہ اُبل کر میرے چہرے، جسم اور کپڑے بھگو گیا۔ گرم گرم خون کی تلخی مجھے اپنی زبان پر بھی محسوس ہُوئی۔ . . ریچھ غراتا ہُوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ مَیں نے آخری وار کیا اور اس کا سَر الگ کر دیا . . . پھر مَیں اضطراری طور پر پلٹا اور تاشیہ کی طرف دوڑنے لگا۔

اچانک میرے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ اُبل پڑا۔ سِلارد کی بات دُرست ہی ثابت ہُوئی تھی۔ وہ واقعی دانش مند دل کا دانش مند تھا۔ تیسرا ریچھ تاشیہ کو بھُول کر اپنے مُردہ ساتھی کے جسم سے ضیافت اُڑا رہا تھا۔ اس نے مُردہ ریچھ کے ٹکڑے کر دیے تھے اور شکم پُری میں اس قدر منہمک تھا کہ مَیں اس کے عقب سے دوڑتا ہُوا تاشیہ کی طرف گیا تو اس نے میری طرف توجہ تک نہیں دی۔ مَیں نے تاشیہ کے قریب پہنچتے ہی پلٹ کر کلہاڑے کے ایک ہی بھرپُور وار سے تیسرے ریچھ کا سر بھی تن سے جُدا کر دیا۔

مَیں نے تاشیہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک ایسا جذبہ اُمڈتے دیکھا، جو کسی بھی مَرد کے لیے سرمایۂ حیات اور حاصلِ زندگی ہوتا ہے۔ اس جذبے، اس تحسین اور اس پیار کو ایک اندھا آدمی بھی محسوس کر سکتا تھا۔ تاشیہ مجسم خود سُپردگی بنی ہُوئی تھی۔ اس کیفیت میں کئی لمحے گزر گئے کہ اچانک مجمعے نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"مار ڈالو، ان تینوں کو مار ڈالو . . . اور ریچھ لائے جائیں۔ اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو اور دونوں مَردوں کو مار ڈالو۔"

. . . پھر چیختی پکارتی آوازوں کا ایک دوسرا ریلا آیا۔

"ہمارے تین بہترین ریچھوں کا نقصان ہُوا، اس سے کیا حاصل ہُوا؟ یہ شخص شیطان ہے، جادُوگر ہے، اسے تیروں سے چھلنی کر دو۔"

مجمع چیختا چلّاتا اور احتجاج کرتا رہا لیکن ملکہ کے سپاہیوں نے اِن آوازوں پر کان نہیں دھرا۔ اس کے برعکس ملکہ رُوبا کچھ مشتعل ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور قلعے کے افسروں کو کچھ احکامات جاری کیے۔ اگلے ہی لمحے مجمعے پر تیروں کی بارش ہونے لگی . . . مجمع چیختا چلّاتا، بے قابو ہو کر اندھا دُھند بھاگ اُٹھا۔

مَیں نے کلہاڑے کی مدد سے تاشیہ کے بند کاٹ دیے پھر اس کا ہاتھ تھام کر سِلارد کی طرف دوڑنے لگا۔ مَیں نے اُسے بھی آزاد کر دیا۔ اس وقت تک مجمع یا تو منتشر ہو چکا تھا یا پھر قابو میں آ چکا تھا۔ سِلارد بندشوں سے آزاد ہوتے ہی سرگوشی میں بولا۔ "جلدی سے میرے ساتھ نکل چلو، مالک! مَیں نے اس قلعے میں ایک خفیہ راستہ دیکھا ہے۔ اگر ہم عجلت سے کام لیں تو یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

مَیں نے سِلارد کے مشورے پر عمل کرتے ہُوئے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا لیکن میری اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ تیر اندازوں

کا ایک دستہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ ملکہ رُدبا یقیناً ایک تیسری آنکھ بھی رکھتی تھی جو بہت دُور تک دیکھنے کے علاوہ لوگوں کے پوشیدہ ارادے بھی بھانپ لیتی تھی۔ وہ ہم سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی تھی۔ یعنی تاشیہ کی شکل میں بھاری زرِ تاوان سے اور میری صورت میں اپنی لذت کوشیوں سے محرومی کے احساس نے اُسے مجبور کر دیا تھا اور تیر انداز ہمیں گرفتار کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ . . لیکن مَیں یا میرے دونوں ساتھی کوئی لوٹ کا مال نہیں تھے کہ اَب یوں آسانی سے خود کو اُن کے حوالے کر دیتے۔ اس وقت میں آزاد تھا، مسلح تھا اور میری رگوں میں خون کا بہاؤ بھی بہت تیز ہو چکا تھا۔ ملکہ رُدبا مجھے یوں تو نہ چھوڑ دیتی۔ جان سے نہ مارتی لیکن میرے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑ لیتی۔ وہ بھی ایک طرح کی موت ہی ہوتی اور جب جلد یا بدیر مرنا ہی ٹھہرا تو تاخیر کس بات کی۔ . . لڑو۔ . . مارو اور مر جاؤ۔

مَیں نے کلہاڑا سر سے بلند کر لیا تو قلعے کے اَفسر کا اشارہ پا کر تیر اندازوں کا دستہ ایک گھٹنے کے بَل زمین پر جُھک گیا۔ اُنھوں نے تیر اپنی کمانوں میں چڑھا لیے تھے۔

"نہیں مالک!" سِلارد چیخ پڑا۔ "یہ تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہتھیار ڈال دو۔"

"نہیں، سرفروش۔" تاشیہ میرے قریب آ کھڑی ہُوئی۔ اس کے لہجے میں بَلا کی کاٹ تھی۔ "تم ان سے ضرور لڑو گے۔ ہم یہیں اور اسی وقت مریں گے۔ اس طرح ہم اس کُتیا کے قابو میں نہیں آ سکیں گے اور اس کے شیطانی منصوبوں کو خاک میں مِلا دیں گے۔ وہ ہمیں زندہ پکڑنا چاہتی ہے لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم لڑتے ہُوئے مریں گے اور مَیں بھی تمھارے ساتھ ہی مروں گی۔"

دفعتاً قلعے میں سنکھ اور قرنا پھونکے جانے لگے۔ اُن کی آوازیں بڑی کریہہ اور بھیانک تھیں۔ یہ سنکھ اور قرنے اس وقت پھونکے جاتے تھے جب قلعے پر کوئی تباہی نازل ہوتی تھی۔ معاً قلعے کے دَر و دیوار سے عجیب وحشیانہ ہاہاکار گونجنے لگی۔ قرنوں اور سنکھوں کی آوازیں مہیب سے مہیب تر ہوتی گئیں۔ ان ہیبت ناک آوازوں میں قلعے کے لوگوں کی چیخ وپکار بھی شامل ہو گئی۔

اچانک احاطے میں لمحاتی سنّاٹا چھا گیا پھر اس سنّاٹے کی جگہ دہشت نے لے لی۔ سپاہیوں اور قلعے کے افسروں کے چہرے اُتر گئے اور ان پر موت کی زردی چھا گئی۔ یہ سکوت۔ . .

سکوتِ مرگ تھا۔ ہر شخص کی آنکھیں ویران قبروں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ . . پھر ایک جھٹکے سے سکوت اور سنّاٹا ٹوٹ گیا۔ عورت اور مرد سبھی، جس کے جدھر سینگ سمائے، بھاگ کھڑا ہُوا۔ مائیں اپنے بچّوں کو بھول گئیں۔ دوست، دُشمن کی تفریق ختم ہو گئی۔ اعصاب کو چٹخا دینے والا شور بپا ہو گیا۔ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دے رہی تھی۔ مَیں نے تیر انداز دستے کی اَفسر کی طرف دیکھا، اُس نے کوئی حُکم دیا تھا جس کے ساتھ ہی تیر اندازوں نے ہمیں نظر انداز کر دیا اور وہ سب داخلی دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

اسی لمحے قیامت کے اس شور میں کسی کی، آسمان کو چیرتی ہُوئی چیخ سُنائی دی۔

"سُرخ شیطان۔ . ."

. . . اور یہ چیخ احاطے میں منجمد ہو کر رہ گئی۔

سب سے پہلے سِلارد کی نظر اس پر پڑی تھی۔ اس نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔ "اُدھر دیکھو مالک! اس عظیم مینار کی طرف۔ ہُرمزد ہماری حفاظت کرے، وہ بلاشبہ راخیل ہے، جو سُرخ شیطان کے نام سے مشہور ہے۔"

تاشیہ میرے قریب کھڑی بُری طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی ساری دلیری اور جرأت رُخصت ہو چکی تھی اور اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔

"اَب ہمارا خاتمہ ہی سمجھو سرفروش! اَب ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ وہ ایک ایسا شیطان ہے کہ ہُرمزد بھی بدی کی اس قوت کو شکست نہیں دے سکا۔" وہ بولی تو اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

کلہاڑے کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔

میں اس مینار کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں گزشتہ رات مَیں نے

ملکہ رُدبا کے لیے ایک خصوصی خدمت انجام دی تھی۔ میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ جنم لے رہا تھا۔ نئے خطرات کے پیشِ نظر اپنی بقا کے لیے نئے حربوں کی ضرورت تھی۔ اَب کسی اور ہی انداز سے کام لینا ہو گا۔

میری نگاہوں کے سامنے، مینار کے قریب جو شخص کھڑا تھا، اس کا قد سات فٹ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ اس کا جسم متناسب. . . اور بے حد مضبوط نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر رکھا ہُوا فولادی خُود اس کی گردن تک آتا تھا۔ خُود کے بالائی حصّے پر ایک نوک دار طلائی میخ اُبھری ہُوئی تھی۔ چوڑے چکلے شانے پر ایک ارغوانی رنگ کا قیمتی لبادہ پڑا ہُوا تھا، جو ہَوا میں کسی زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ صلیب کی شکل میں سینے پر بندھے ہُوئے تھے۔ وہ خود مسلح نہیں تھا البتہ اپنے مسلح ساتھیوں کو بھاری اور گونجدار آواز میں احکامات دے رہا تھا۔ اس کے ساتھی بڑی دلجمعی کے ساتھ قتلِ عام اور قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں مصروف تھے۔

راخیل کی شخصیت میں، جو چیز سب سے نمایاں تھی، وہ اس کی داڑھی تھی جس کا سِرا اُس کی ناف کو چھو رہا تھا۔ یہ داڑھی شعلے کی مانند سُرخ تھی اور درمیان سے دو حصّوں میں بٹی ہُوئی تھی، جنھیں رنگین پٹیوں کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ وہ بار بار اپنی داڑھی سے کھیلنے لگتا اور رنگین پٹیوں کو دُرست کرنے لگ جاتا تھا۔

اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی۔

وہ صرف ایک لمحے کے لیے مجھے دکھائی دی پھر کسی سائے کی مانند غائب ہو گئی۔ . . لیکن اُس ایک ہی لمحے میں، میں نے اسے پہچان لیا۔ . . اور میرا دِل اپنے قالب میں بڑے زور سے اُچھل پڑا تھا میری حالت اتنی عجیب ہو گئی کہ مجھے اپنی ہستی پر سنّاٹوں کا پہرہ محسوس ہونے لگا۔ ان سنّاٹوں میں جسم پر بہنے والے پسینے کی سرسراہٹ تک مجھے سُنائی دینے لگی تھی۔ وہ میرا واہمہ یا التباسِ نظر نہیں تھا بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ میں اس عورت کو پہچانتا تھا۔

میرے ذہن میں ایک گزرا ہُوا منظر گھوم گیا۔

بلوط کے درخت، سفید لبادے اور سفید نقاب میں دلکش چہرہ اور سُنہرے بال۔ . . یہ سب کچھ ایک خواب کی مانند تھا لیکن میں نے ایک جھلک میں بھی اسے پہچان لیا تھا، وہ درسیلا تھی، قبروتیوں کی بڑی پُجارن!

مَیں حیران تھا کہ آخر وہ سُرخ شیطان کی رفاقت میں یہاں کیا کر رہی ہے؟

درسیلا غائب ہو چکی تھی اور میں دوبارہ راخیل اور اس کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ لوٹ مار اور قتلِ عام کا وحشیانہ اور سفاکانہ کھیل وسیع پیمانے پر جاری تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سُرخ شیطان اور اس کے چیلے چانٹے وہاں موجود کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اور قلعے کو خاک میں مِلا کر ہی دم لیں گے۔

دفعتاً سِلارد میری آستین کھینچتے ہوئے بولا۔ "تم دیر کیوں کر رہے ہو، مالک؟ اس خفیہ راستے سے بھاگ نکلنے کا اَب بھی امکان ہے اور ہر گزرتے ہُوئے لمحے کے ساتھ یہ امکان کم ہوتا جا رہا ہے۔"

سِلارد کی بات اپنی جگہ دُرست تھی لیکن میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ میں، تاشیہ اور سِلارد کو لیے ہوئے ایک دیوار سے ٹیک گیا۔ اب اگر کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو سامنے کی جانب سے ہوتا۔ . . عقبی حصّے کی طرف سے بے فکری ہو گئی تھی۔ سِلارد میری طرف پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تم کیا کرنے جا رہے ہو، مالک! کیا یہاں سے نکلنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"سِلارد. . ." میں نے کہا۔ "اب مَیں جو کچھ بھی تم سے پُوچھوں تم خوب سوچ سمجھ کر اس کا جواب دینا۔ اس لیے کہ صحیح معلومات ہی پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔ یہ بحری قزاق اپنی زندگی میں کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟ میرا مطلب ہے، انھوں نے اپنی اس پیشہ ورانہ زندگی کی بُنیاد کن قدروں پر رکھی ہے؟ اُن کے کچھ اصول اور کچھ ترجیحات ضرور ہوں گی؟ کیا تم اس سلسلے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

غریب سِلارد، میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے شبہ ہو کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ تاشیہ مداخلت کرتے ہُوئے بولی۔ "یہ تم نے کیسی گفتگو چھیڑ دی، سرفروش! اَب جب کہ ہم موت کے مُنہ میں ہیں، کیا اس قسم کی گفتگو ضروری ہے؟"

"بے حد ضروری ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمھارا نازک دماغ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔" میں ایک بار پھر سِلارد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "ہاں! تم نے بتایا نہیں؟"

سِلارد نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ اچانک اُچھل کر جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ایک بھالا سنسناتا ہُوا آیا اور ہمارے عقب میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگر سِلارد اپنی پہلی جگہ پر ہوتا تو بھالے کی اَنی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو چکی ہوتی۔

"مالک!" سِلارد گہری گہری سانس لیتے ہُوئے بولا۔ "یہ بحری

قزاق شیطان سے کم نہیں ہیں۔ بلاشبہ ان کے بھی اپنے کچھ اصول ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کے اپنے مخصوص معیار مقرر ہیں۔ یہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ہمت و جرأت اور مردانگی و شجاعت کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ لڑتے لڑتے ماردینا یا مرجانے ہی کو سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ بہادر، دلیر اور جاں باز لوگوں کی عزت کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جاں باز ہونا زندگی کی معراج ہے... لیکن مالک! ہم بحری قزاق نہیں، جو اِن کے زمرے میں آئیں۔ یہ اپنے آدمیوں کے سوا ہر ذی نفس کو قتل کر دیتے ہیں، خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ یہ تو کسی کو قیدی بھی نہیں بناتے البتہ عورتوں کو ساتھ لے جاتے ہیں۔"

سلارد کی بات ختم ہوتے ہی تاشیہ بول پڑی: "وعدہ کرو، سرفروش! کہ وقت آنے پر تم مجھے اپنے ہاتھ سے ختم کر دگے۔ میرا سر بہت نازک ہے۔ تمھارے کلہاڑے کے ایک ہی وار سے میرا کام تمام ہو جائے گا۔ مجھے اُن کے حوالے نہ کرنا!"

میں نے تاشیہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اُن دونوں کو حکم دیا کہ میرے عقب میں، دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جائیں اور تاحکمِ ثانی دونوں وہیں کھڑے رہیں۔

"اور تم لوگ کوئی بات نہیں کروگے۔ بالکل خاموش رہوگے، سلارد! تمھیں میری مدد کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں اور تاشیہ! یہی ہدایت تمھارے لیے بھی ہے۔ تم لوگ میری راہ میں بالکل نہیں آؤ گے ورنہ میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں، اپنے اور تم دونوں کے لیے ایک بے حد خطرناک کھیل کھیلنے جا رہا ہوں اور یہ کام مجھے تنہا ہی کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک بات کا تم دونوں کو خاص طور سے خیال رکھنا ہوگا۔ میں کتنا ہی جھوٹ بولوں، تم دونوں اس پر حیرت کا اظہار نہیں کروگے۔ اگر تم دونوں خاموش رہو تو بہتر ہے لیکن اگر بولنا ضروری ہوا تو تمھیں میرے ہر جھوٹ کی تائید کرنا ہوگی خواہ وہ کتنا ہی بڑا جھوٹ کیوں نہ ہو۔ اب میں کھیل شروع کرتا ہوں، تم دونوں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ اور خود کو خوف زدہ ظاہر کرنے کی کوشش کرو۔"

قلعے میں برسرِ پیکار لوگوں کی لڑائی اختتام کو پہنچ رہی تھی اور ملکہ رُدبا کے کچھ ہی آدمی باقی رہ گئے تھے جو اَب بھی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ بقیہ نے یا تو ہتھیار ڈال دیے تھے یا مارے گئے تھے لیکن بحری قزاق اماں چاہنے والوں کو بھی نہیں بخش رہے تھے اور انھیں بڑی سفاکی سے گاجر مولی کی مانند کاٹا جا رہا تھا۔

احاطے کے ایک گوشے میں، کچھ قزاقوں کی نگرانی میں، قیدی عورتیں کھڑی تھیں۔ میں نے اُن کے درمیان ملکہ رُدبا کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ یا تو وہ مار ڈالی گئی تھی یا پھر کسی خفیہ راستے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بہر حال جو بھی صُورت رہی ہو، مجھے ملکہ رُدبا کی اتنی پروا بھی نہیں تھی کیونکہ اب میدان رُدبا کی بجائے سُرخ شیطان کے ہاتھ میں تھا اور ہماری حیثیت ایک بار پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔ احاطہ، چبوترہ اور زینے لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ بہت سے اعضا بریدہ جسم جان کنی کی اذیت سے تڑپ رہے تھے۔

بحری قزاق قتل و غارت گری سے فارغ ہو کر راہ میں آئی ہوئی لاشوں کو ٹھوکروں میں اُڑاتے ہوئے ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ پھر اُنھوں نے نا ؤنوش اور قیدی عورتوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک شروع کر دیا۔

میں نے اس گھناؤنے پن سے نگاہ ہٹائی اور مینار کی طرف دیکھنے لگا۔ راخیل اپنے دو آدمیوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ وہ دونوں اس کے نائب معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے جسموں پر بھی ارغوانی لبادے اور سر پر خود تھے لیکن اُن میں اور راخیل میں فرق یہ تھا کہ اُن کے خود کے بالائی حصے پر اُبھری ہُوئی نوک دار میخ راخیل کی مانند طلائی نہیں بلکہ نقرئی تھی۔ وہ دونوں خاصے جسیم اور قدآور تھے لیکن راخیل کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے نظر آتے تھے۔

راخیل نے اُن میں سے ایک آدمی کو کوئی حکم دیا۔ وہ شخص جواباً جھک کر کورنش بجا لایا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے راخیل کے اردگرد متجسس نظر دوڑائی لیکن نقرئی بالوں والی حسینہ درسیلا پھر دکھائی نہیں دی۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کی جھلک محض ایک واہمہ ہی تھی؟ جنگ و جدل کا عالم ہو اور بے دریغ خُون بہہ رہا ہو تو اچھے اچھے سورماؤں کا ذہن آئیں بائیں شائیں ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اگر مجھے کسی پر حسین درسیلا کا دھوکا ہو گیا تھا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

اُس وقت تک بھی خاصی دُھند چھا چکی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ دُھند اس قدر دبیز اور گہری تھی کہ بارش میں تبدیل ہُوا چاہتی تھی۔ ہم تاریکی کا حصّہ بن جانے کی وجہ سے اُن میں سے کسی کی نظر میں نہیں آئے تھے۔ ہم نے کوئی حرکت کی ہوتی تو شاید اُن کی نظر میں آجاتے ورنہ وہ اپنی فاتحانہ سرگرمیوں میں اس قدر مصرُوف تھے کہ ہماری طرف متوجہ ہونا محال ہی تھا اور وہاں مستقل طور پر اس طرح معطل کھڑے رہنا بھی میرے منصُوبے میں

شامل نہیں تھا۔ اس طرح تو پُوری رات بیت جاتی۔ اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے میں کلہاڑا سر سے بلند کر کے اسے ہوا میں گھماتا ہُوا اُن کی طرف چل پڑا۔

معاً اُن میں سے ایک کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔

وہ بھاری بدن کا پستہ قد آدمی تھا۔ اس نے ریچھ کے خُون میں لتھڑے ہُوئے میرے چہرے، لباس اور فضا میں بلند میرے کلہاڑے کو دیکھا تو اس کا مُنہ حیرت و استعجاب سے کھُل گیا۔ فوراً ہی اس کے چند ساتھی بھی اس کے عقب میں آکھڑے ہُوئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے کلہاڑا ہوا میں دائرے کی صُورت میں گھمایا اور چیخ کر کہا: "سُرخ شیطان کے بھیڑیو! تم آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا کیوں گئے۔ اتنی عورتوں سے نمٹ رہے تھے، اب ایک تنہا مرد سے پنجہ آزمائی کرتے ہُوئے تمھیں شرم کیوں آرہی ہے؟"

یہ سُنتے ہی وہ بھڑک اُٹھے۔

سب نے بیک وقت غیظ و غضب سے چیخنا شروع کر دیا۔ اُن کا شور اتنا بلند تھا کہ سُرخ شیطان بھی اُن کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میرا مقصد حاصل ہو گیا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے سُرخ شیطان کو مُڑتے اور احاطے کی طرف گھُورتے ہُوئے دیکھا تو سوچا کہ مجھے اس سُنہرے موقعے سے استفادہ کرنا چاہیے۔

میں نے کلہاڑے کو ایک بار پھر گھمایا اور دھاڑتے ہُوئے بولا۔ "سُرخ شیطان کے چیلو! میں نے تمھارے بارے میں سُنا تھا کہ تم لوگ طاقت، ہمت اور جرأت و شجاعت کے پُجاری ہو۔ میدانِ جنگ میں لڑتے ہُوئے مرجانا ہی تمھارے نزدیک عظیم کارنامہ ہے۔ اس لیے میں تمھیں اپنی طاقت آزمانے کا موقع دیتا ہُوں۔ آؤ، تم میں سے کون پہلے مرنا پسند کرے گا؟ اس لمحے اور اس ساعت کو، کون اپنے لہُو سے رنگین کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے؟ جلدی کرو، آگے بڑھو اور ایک جاں باز کی طرح موت کو خوش آمدید کہو۔ میرا کلہاڑا پیاس بُجھانے کے لیے بے قرار ہے۔"

ایک قزاق نے شانے سے کمان اُتاری اور ترکش سے تیر نکال کر کمان میں جوڑنے لگا لیکن اس کے قریب کھڑے قزاق نے جلدی سے کمان پر ہاتھ مارا اور غرّا کر بولا: "احمق آدمی! تم اسے اس طرح مارو گے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ سب بُزدل کہلائیں؟ یہ سُورما ہمیں بُزدل کہہ رہا ہے اور تم اس الزام کی تائید کرنا چاہتے ہو۔ کیوں اچھی بھلی لڑائی کو ضائع کر رہے ہو۔ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ملکہ کے گیدڑوں میں ایک تو جاں باز نکلا جو گڑگڑا کر زندگی کی بھیک نہیں مانگ رہا... بلکہ ہمیں بیچ میدان میں کھڑا، تن تنہا للکار رہا ہے۔ ہم نے اس وقت بڑی گھٹیا اور بے ہودہ لڑائی لڑی ہے، کچھ مزا نہیں آیا۔ شکر ہے کہ ہمیں اپنا جوہر دکھانے کا ایک خوبصورت موقع ہاتھ آگیا۔ تم میں سے کون پہلے اس سے لڑے گا؟"

وہ تیز لہجے میں آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ کون پہلے میرے مقابلے پر آئے گا۔

میں نے دیکھا کہ راخیل پُوری طرح اس طرف متوجہ ہو چکا ہے۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے بڑی دل چسپی سے احاطے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے موٹے اور بھدے لبوں پر بھرپور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"میں ملکہ رُدبا کا پروردہ نہیں ہُوں!" میں نے چیخ کر کہا۔ "میری اپنی ایک حیثیت ہے۔ میں اپنے مُلک کا شہزادہ ہوں۔ نہ صرف شہزادہ بلکہ ایک دانش مند شخص بھی ہُوں۔ اس کے علاوہ ایک لڑاکا اور جاں باز ہُوں۔ میں اس سرزمین پر اپنے اس خادم اور خادمہ کو بچانے آیا ہُوں جو اس طرف، میرے پیچھے، دیوار کے ساتھ کھڑے ہیں۔ میں انھیں بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ہم یہاں سے رُخصت ہونے ہی والے تھے کہ تم لوگ آگئے۔ اس لیے اب مجھے دوبارہ لڑنا ہوگا۔ یہ سب میں نے اس لیے کہا کہ واضح ہو جائے، ہم لوگ ملکہ رُدبا کے ساتھی نہیں ہیں۔ ہاں، تم میں سے کون پہلے لڑنے اور مرجانے کے لیے میرے سامنے آرہا ہے؟"

چند ہی لمحوں میں ان کا ایک منتخب آدمی کُود کر میرے سامنے آیا۔ وہ ایک سیاہ فام، کالا بھجنگ آدمی تھا۔ اس کی ٹانگیں چھوٹی

تھیں لیکن سینہ اور شانے غیر معمولی چوڑے تھے۔ اس کے پاؤں میں بھدے جوتے تھے اور جسم پر بھیڑیئے کی کھال کا لباس تھا۔ اس کے بال پیال کی مانند خشک اور پیلے تھے۔ آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ اُن سے سفاکی اور درندگی ٹپکتی تھی۔ اس کے سر پر ایک ایسا خود تھا جس پر دو سانپوں کے نشان کندہ تھے۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک وزنی کلہاڑا دبا ہُوا تھا۔ مَیں نے دیکھا کلہاڑے کے دستے پر دو سانپوں کے نشان کندہ ہیں۔

حریف میرے سامنے آیا تو بقیہ قزاقوں نے پھیل کر ہمارے نزدیک ایک دائرہ بنا لیا... پھر وہ فلک شگاف آوازوں میں چیخنے لگے "دُلفا... دُلفا! اسے اپنے کلہاڑے کا ایک نغمہ سناؤ۔ مَیں شرط لگاتا ہوں کہ یہ اس نغمے کو ناپسند نہیں کرے گا۔"

دُلفا نامی اس قزاق کے دُوسرے ہاتھ میں لکڑی اور چمڑے کی ایک ڈھال بھی تھی۔ اس کا ہاڑا میرے کلہاڑے سے چھوٹا تھا۔ اُسے شاید اپنے کلہاڑے کو صاف کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کیوں کہ کلہاڑے کے پھل پر خُون کے دھبّے جمے ہُوئے تھے۔

دُلفا نے اُچھل کر، مجھ پر کلہاڑے کا پہلا وار کیا۔ مَیں نے پھُرتی سے ایک طرف ہٹ کر اس کا وار خالی کر دیا اور ہنس کر بولا: "تم کچھ ہچکچا رہے ہو دُلفا تمھاری زبان میں ایسے شخص کو کیا کہتے ہیں؟... بُزدل؟"

مجمعے میں شور مچ گیا۔

"اسے بدزبانی کا مزا چکھا دو دُلفا! اس کی گندی زبان کاٹ ڈالو" ایک قزاق غرّایا۔

دُلفا اس چڑھاوے پر جنُونی انداز میں آگے بڑھا اور کلہاڑا میرے سینے پر دے مارا۔ مَیں نے اپنے کلہاڑے پر اس وار کو روکا اور اس کے ساتھ ہی پُوری قوت سے جوابی حملہ کیا۔ دُلفا نے جلدی سے ڈھال سامنے کر دی۔ میرے کلہاڑے کا پھل اس کی ڈھال پر سے پھسلا اور اس کا ہاتھ زخمی کر گیا۔ چشمِ زدن میں اس کی دو اُنگلیاں کٹ کر کیچڑ میں جا گریں۔ مَیں اُچھل کر پیچھے ہٹا اور دوبارہ دفاعی حالت اختیار کر لی۔

اپنی کٹی ہُوئی انگلیوں پر نظر پڑتے ہی دُلفا پاگل ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار مجھ پر وار کرنے لگا۔ اس کے تابڑ توڑ حملوں سے مَیں بہ مشکل سنبھل پا رہا تھا۔ اس کا کوئی وار کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھی مسلسل اس کی ہمت بڑھا رہے تھے لیکن دُلفا پر تو گویا جنُون سوار تھا۔ وہ سوچے سمجھے اور دیکھے بھالے بغیر ہی اندھا دُھند وار کیے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہمارے کلہاڑوں کے پھل آپس میں ٹکرا جاتے تو فضا میں چنگاریاں بکھر جاتیں۔

مَیں نے دُلفا کی جنُونی کیفیت سے فائدہ اُٹھایا۔ اس نے ایک موقع پر کلہاڑے کا بھرپُور وار میری گردن پر کیا۔ مَیں جھکائی دے کر اس کی زد سے نکل آیا اور دُوسرے وار کا موقع دیے بغیر پُوری قوت سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔

دُلفا اپنا کلہاڑا بلند کر ہی رہا تھا کہ میرے کلہاڑے کا پھل اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو گیا۔ مجھے ضرب کی شدّت کا اندازہ اس وقت ہُوا جب پھل اس کے سر سے گزر کر سینے کو چیرتا ہُوا دُلفا کی ناف تک جا پہنچا۔

مَیں نے کلہاڑے کو ایک جھٹکے سے کھینچا تو وہ مُنہ کے بل کیچڑ میں گر پڑا۔ فوراً اس کے دو ساتھی دوڑتے ہُوئے آئے اور تڑپتے ہُوئے دُلفا کو ٹانگوں سے پکڑ کر دُور گھسیٹ لے گئے۔

مَیں کلہاڑے کے لمبے دستے پر جھکا اور اُن کی طرف دیکھتے ہوئے مُسکرا کر بولا: "دُوسرا کون ہے؟"

مجمعے پر سنّاٹا چھا گیا۔

وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ کچھ مضطرب ہو کر اُوپر مینار کی طرف دیکھنے لگے تھے، جہاں سُرخ شیطان کھڑا اس منظر سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔

میرا دُوسرا حریف میرے ہی قد و قامت کا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ داڑھی لیکن سر گھٹا ہُوا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں خنجر لیے میرے مقابلے پر آیا تھا۔ مَیں نے اس مقابلے کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے کس تک گنتی گِننا تھی، اس سے آگے خود کو تھکانا وقت کی بربادی تھی۔ مَیں نے نو تک گنتی گنی تھی کہ مقابل کا سر اس کے تن سے جُدا ہُوا اور کیچڑ میں لتھڑ گیا۔

"اگلا کون ہے؟" مَیں نے مجمع کی طرف دیکھتے ہُوئے پُوچھا۔ "اور دیکھو جاں بازو! اس معاملے میں دیر نہ کرو۔ زندہ رہنے میں بھلا کیا شہرت ہے۔ اس لیے جلدی جلدی آتے جاؤ اور مرتے جاؤ۔"

اپنے تیسرے حریف کے سلسلے میں، مَیں نے ایک جُوا کھیلا۔ اسے دُوسرے ہی وار میں خاک و خُون میں سُلا دیا۔ میرے کلہاڑے کے تیز دھار پھل نے اس کا نرخرہ کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے حلق سے بھل بھل خُون بہنے لگا۔ جیسے برسات میں پرنالہ بہتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیچڑ کی سیاہی سُرخی میں تبدیل ہو گئی۔ میرے پاؤں کے نیچے خُون کا ایک چھوٹا سا تالاب کھڑا ہو گیا تھا۔

اب مَیں بے پناہ تھکن محسوس کر رہا تھا لیکن اُن پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مَیں نے اپنی ناہموار سانس پر قابو پاتے ہُوئے کہا: "لگتا ہے جیسے آج میرا کلہاڑا پیاسا ہی رہے گا۔ ویسے اس کی پیاس اَمر ہے۔ اگلا کون ہے؟ کون ہے، جو میرے کلہاڑے کی پیاس بُجھانے آئے گا؟"

اُن سب کو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ اُن میں سے کسی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

ہوا میں نمی بڑھ گئی تھی پھر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ میرا خُون آلود جسم بھیگ رہا تھا اور اس پر جما ہُوا سیاہی مائل خون بہہ رہا تھا۔

دفعتاً قزاق بیک آواز چیخے: "جارل... جارل... جارل!"

مجمع کو چیرتا ہُوا جو شخص میرے سامنے آیا، وہ خاصے قد و قامت کا تھا اور اس کے بازو میرے بازوؤں کی طرح ٹھوس اور مضبُوط تھے۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ اس کی ٹانگیں موٹی اور قدرے خمیدہ تھیں۔ ان پر بڑے بڑے بال تھے۔ وہ ارغوانی رنگ کا لبادہ جسم پر ڈالے ہوئے تھا۔ سر پر خود تھا جس کے بالائی حصّے پر ایک نقرئی میخ ابھری ہُوئی تھی۔ مَیں اس شخص کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ اُن دو افراد میں سے ایک تھا جو مرتبے اور عہدے کے اعتبار سے قزاقوں کے افسر تھے اور مینار پر سُرخ شیطان کے دائیں بائیں کھڑے دکھائی دیے تھے۔

جارل ایک پُراسرار مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائے میرے سامنے آ کھڑا ہُوا۔ بحری قزاقوں کے مخصوص حُلیے کے برعکس اس کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی۔ وہ دُوسری وضع قطع کا آدمی تھا۔ باقاعدہ شیو کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی بھُوری آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ ارغوانی لبادے کے نیچے چمڑے اور کانسی کی زرہ پہنے ہوئے تھا۔ پہلی نگاہ میں اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باوقار شخصیت کا مالک ہے۔ اس نے تلوار سر سے بلند کرتے ہُوئے مجھے سلام کیا۔ اس کی تلوار بالکل ویسی تھی، جیسی تلوار سے مَیں نے ہورسا نامی شہ زور کو قتل کیا تھا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میرے ساتھ کتّوں نے تمھیں کافی پریشان کیا ہے" جارل نے بولنا شروع کیا: "لیکن مَیں اُنھیں کچھ زیادہ موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ کیوں کہ تم بھی تو کسی شیطان کی مانند لڑ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے، تم شیطان ہی ہو لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیوں کہ تمھیں بہرحال مرنا ہے اور مجھے اس کا افسوس رہے گا کیوں کہ تم بلاشبہ ایک اچھے لڑاکے اور جاں باز ہو۔ تمھارا کلہاڑا برتنے کا انداز مجھے پسند آیا۔"

جارل کے بارے میں میرا خیال دُرست ہی ثابت ہُوا۔ وہ بلاشبہ دُوسرے قزاقوں سے مختلف تھا اور اس کے بات کرنے کا انداز بھی منفرد تھا۔ وہ اپنے طور طریقے اور لب و لہجے سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ تاہم مَیں اپنے کھیل کو سمجھتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ مَیں آزمائش کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہا ہوں۔

میرے سامنے کھڑا ہُوا شخص کچھ ایسا پُختہ اور منجھا ہُوا تھا کہ اس سے قبل اس قدیم سرزمین پر اُس جیسے کسی آدمی سے میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مَیں ایسا کوئی تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جس سے وہ نتیجہ اخذ کرتا کہ مَیں اس سے متاثر ہو گیا ہُوں۔ مجھے بہر طور اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کو برقرار رکھنا تھا۔ مَیں نے ترش روئی سے کہا: "آؤ میرے کلہاڑے سے ملاقات کرو لیکن مجھے شُبہ ہے کہ تمھیں میرے کلہاڑے کی کاٹ پسند نہیں آئے گی!"

جارل اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے بڑے سکون سے بولا۔ "ہتھیار ڈال دو نوجوان! میرا جی نہیں چاہتا کہ تمھیں ہلاک کر دوں۔ باعزّت طریقے سے ہتھیار ڈال دو، ہو سکتا ہے، ہم تمھارے بارے میں کچھ غور کر ہی لیں!"

"مَیں ہتھیار ڈال سکتا ہُوں لیکن فقط وعدوں پر ٹلنے والا آدمی نہیں ہُوں۔ مَیں اپنے ملک کا شہزادہ ہوں اور چاہوں گا کہ اسی کے شایانِ شایان میرے ساتھ سلوک کیا جائے۔ مَیں یہ بھی چاہوں گا کہ میرے خادم اور خادمہ کو بھی تحفظ فراہم کیا جائے" مَیں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔

"مَیں چاہوں گا! بہت خوب" جارل کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔ "کیا تم اس حالت میں ہو کہ اس لب و لہجے میں بات کر سکو؟" جارل نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن اس کا لہجہ نرم ہی رہا۔

"مَیں سمجھتا ہُوں کہ یہی لب و لہجہ مجھ پر سجتا ہے" مَیں نے اپنے کلہاڑے کو لہراتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے، مجھے اختیار نہیں کہ کسی کا کوئی مطالبہ منظور کروں۔ یہ اختیار صرف عظیم راخیل ہی کو ہے لیکن ہر مطالبے کے جواب میں اس کے پاس صرف ایک ہی جواب ہوتا ہے... اور وہ جواب ہے... موت۔ مَیں سمجھتا ہُوں کہ تم ایک سمجھدار آدمی ہو۔ ہمارے خلاف لڑنے کی بجائے ہمارے ساتھی کیوں نہیں بن جاتے۔ تم جیسے جاں باز مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں! اس لیے اپنا آپ ضائع نہ کرو۔"

"تو پھر اپنے عظیم راخیل کو یہاں بُلاؤ، اُسی سے سودے بازی ممکن ہو گی۔ مَیں ماتحتوں اور نچلے درجے کے لوگوں سے مذاکرات نہیں کیا کرتا!"

یک لخت جارل کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ تلوار سونت کر بولا۔" تو پھر ٹھیک ہے، ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ نچلے درجے کا آدمی کون ہے۔ اپنا دفاع کرو، نوجوان!" جارل کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

بات ختم کرتے ہی جارل نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ حملہ اس قدر بھرپور اور جچا تُلا تھا کہ خوف کی سرد لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ مَیں نے پہلی بار موت کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا۔ پھر مَیں سر جھٹکتے ہُوئے اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ہر آدمی کو کبھی نہ کبھی مرنا ضرور ہوتا ہے، پھر موت سے کیا ڈرنا۔ جارل کی تلوار سنسناتی ہُوئی میرے قریب سے گزر گئی۔ اگر مَیں نے بروقت خُود کو نہ بچا لیا ہوتا، تو میرا سَر دھڑ سے جُدا ہوچکا ہوتا۔

میرے سنبھلتے سنبھلتے جارل نے فوراً ہی دوسرا وار کیا۔ بچتے بچتے بھی تلوار کی نوک میرے بازو پر گہری خراش ڈال گئی۔

قزاق دائرے میں کھڑے تھے اور خوشی سے چیخ رہے تھے۔" جارل ... جارل ..."

جارل کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ غیر معمولی اور ناقابلِ یقین سکون اور نرمی سے بولا۔" جب مرنا تمھارا مقدر ہی ٹھہرا تو اے بہادر شخص! کیا مَیں تمھارا نام پُوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام سرفروش ہے۔" مَیں نے ہانپتے ہُوئے کہا۔" فارس کا شہزادہ سرفروش۔" اور اس کے ساتھ ہی مَیں نے اُچھل کر کلہاڑے کا وار کیا۔

جارل جست لگا کر پیچھے ہٹ گیا۔

مَیں تھکا ہُوا تھا، جسم کی ساری توانائی مسلسل پیکار میں صَرف ہوچکی تھی، خُود کو نہ سنبھال سکا۔ اس لیے اپنے ہی زور میں کلہاڑا لیے ہُوئے مُنہ کے بل زمین پر گر گیا ... پھر اس سے پہلے کہ مَیں جنبش کرتا، تلوار کی سرد نوک میری گردن سے آ لگی۔

"رُک جاؤ!" اچانک مینار کی طرف سے ایک گرجتی ہُوئی آواز سنائی دی۔ وہ تنہا آواز، دائرے کی صُورت میں خوشی سے چیختے چلّاتے قزاقوں کی آواز پر بھاری تھی۔

احاطے میں گہرا سکوت چھا گیا۔

قزاقوں کی سانسیں تک رُک گئی تھیں۔ یک لخت میری گردن پر نوک کا دباؤ کم ہوگیا ... پھر تلوار ہٹا لی گئی۔

مَیں پسینے میں نہایا ہُوا، اُٹھ کھڑا ہُوا۔ قزاق مکھیوں کی مانند بھنبھنا رہے تھے۔ عین موقعے پر اُن کے آقا کی مداخلت سے اُن کا لُطف غارت ہوگیا تھا۔ اُن کی آنکھوں سے مایُوسی اور ناگواری جھلک رہی تھی لیکن وہ کھُل کر اس کا اظہار بھی نہیں کرسکتے تھے۔

مَیں نے مُڑ کر مینار کی طرف دیکھا۔ سُرخ شیطان مُنہ کے گرد دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنائے، بلند آواز میں جارل کو ہدایت دے رہا تھا۔" اس شخص کو زندگی اور وقار بخش دو اور اس کے ساتھیوں کو بھی۔ ایسے جاں باز کو اس طرح نہیں مرنا چاہیے۔ اگرچہ اس کی گردن پر میرے تین ساتھیوں کا خُون ہے ... پھر بھی مَیں اس سے مہربانی سے پیش آؤں گا۔ تم اس سے بات شروع کرو، جارل!"

"اور تم اجنبی!" سُرخ شیطان نے مجھے مخاطب کیا۔" جارل کی بات غور سے سُنو۔ اس کے مُنہ سے نکلے ہُوئے الفاظ میرے ہی الفاظ ہوں گے۔ تم چاہو تو میری پیش کش قبُول کرسکتے ہو اور چاہو تو اسے ٹھکرا سکتے ہو۔ یہ تمھاری اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ مَیں دوبارہ یہ پیش کش نہیں کروں گا۔"

سُرخ شیطان نے بات مکمل کی اور اپنے دُوسرے افسر کے ساتھ وہاں سے ایک طرف چلا گیا۔

جارل تلوار کو نصف قد سے بلند کرتے ہُوئے بولا۔" اب کیا کہتے ہو، سرفروش! کیا ارادے ہیں؟"

قزاق سرگوشیوں میں مصروف ہوگئے تھے۔ پھر اُن کے ایک آدمی نے جارل کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔" اسے مار ڈالو جارل! ہم تمھاری خاطر جھُوٹ بول دیں گے کہ اس نے زندگی کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

ایک اور قزاق نے اپنے تین ساتھیوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔" اُن کے خُون کی قیمت کون ادا کرے گا؟"

جارل اُن کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہُوئے بولا۔" چُپ ہو جاؤ، کُتو! تم سب نے عظیم راخیل کی بات سُن لی ہے۔ اب اگر کسی نے مداخلت کی تو اُس کا سر اُڑا دیا جائے گا۔"

دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہُوا۔ اُن سب نے چُپ سادھ لی۔

جارل دوبارہ میری طرف متوجہ ہُوا۔" کیا تم ہتھیار ڈالتے ہو؟"

دیوار کے قریب سے سِلارد کی آواز سُنائی دی۔" ہتھیار ڈال دو مالک! اس وقت یہی بہتر ہے۔ ہمارے جسم پر سر سلامت ہیں۔ یہ میری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ قبرِدتیوں کا قول ہے کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔"

"اور تم تاشیہ! تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" مَیں نے تاشیہ کو مخاطب کیا۔

"جو تمھاری مرضی، وہی میری مرضی ہے۔ مَیں تو تمھارے ساتھ جیوں گی اور تمھارے ساتھ ہی مروں گی۔"

مَیں جارل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ہم دونوں کچھ دیر ایک دُوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ پھر مَیں نے اپنا کلہاڑا جارل کے قدموں میں پھینک دیا۔" مَیں عظیم راخیل کی پیش کش قبول کرتا ہُوں۔"

جارل نے جھُک کر کلہاڑا اُٹھا لیا۔ کچھ دیر غور سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر مجھے واپس کرتے ہُوئے بولا۔" اچھا اور خوب صُورت کلہاڑا ہے ... لیکن افسوس، ہماری طاقت آزمائی درمیان ہی رہ گئی۔ اب یہ کبھی معلوم نہ ہوسکے گا، ہم میں سے برتر کون ہے۔" وہ رُکا اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ بولا۔" تاہم، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت دوبارہ آجائے۔ پھر اس کا فیصلہ، ہم نہیں مقدر ہی کرے گا۔"

مَیں نے اس کی حسرت کو نظرانداز کرتے ہُوئے مسکرا کر کہا۔" مجھے اور میرے ساتھیوں کو فوری طور پر آرام کرنے کے لیے جگہ چاہیے لیکن اس سے پہلے ہم غُسل کرنا چاہیں گے۔ ہمیں عمدہ لباس بھی چاہیے۔ اس کے بعد بہترین کھانا درکار ہوگا۔ اپنے سُرخ شیطان سے کہو کہ یہ چیزیں ہمیں فوراً مہیا کردے ... پھر وہ جب بھی ملنا چاہے، مَیں اُسے تیار ملوں گا۔"

جارل کے لبوں پہ پہلے جیسی پُراسرار مسکراہٹ نمُودار ہُوئی۔" عظیم راخیل سے تو رات ہی کو ملاقات ہوسکے گی۔ اُسے ابھی کئی اہم کام انجام دینے ہیں۔ لُوٹ کے مال کی تقسیم، ملکہ کے لیے کوئی عبرت ناک سزا اور ایسی کئی باتیں فوری طور پر توجہ طلب ہیں لیکن جب ہم آج رات جشنِ فتح منائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ اس وقت عظیم راخیل سے تمھاری ملاقات ہوجائے گی۔ آؤ، میرے ساتھ۔" جارل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

مَیں اس کی اعلا ظرفی سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔

چلتے چلتے مَیں نے بھی جارل کے شانے پر ہاتھ رکھا اور میٹھے لہجے میں کہا۔" تم اپنی اور میری ادھوری لڑائی کے بارے میں اپنا دل چھوٹا نہ کرو، دوست! حسرتِ مبارزت میں خُود کو ہلکان مت کرو۔ کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آئے گا جب ہم ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ مردوں اور جاں بازوں کی زندگی میں ایسے موقعے آئے دن آتے ہی رہتے ہیں۔"

جارل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ میرے شانے پر اس کی گرفت بے حد مضبُوط ہوگئی تھی۔

★★

میرے ذہن میں جس منصُوبے نے جنم لیا تھا اس کا نصف حصّہ مکمل ہوچکا تھا اور بقیہ نصف حصّے کی تکمیل باقی تھی۔

ہمیں جو کمرہ دیا تھا، وہ خاصا کشادہ اور آرام دہ تھا لیکن میرے ساتھ صرف سِلارد کو رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ جارل نے کہا تھا کہ تاشیہ کو ہم سے الگ رکھا جائے گا اور یقین دلایا تھا کہ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ کیوں کہ اس کی حیثیت ہمارے ساتھی کی سی ہے، ہماری ہی طرح اس کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھا جائے گا۔

مَیں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

ضرورت کی تمام اشیا ہمیں فراہم کر دی گئیں۔ ہم نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور خُوب ڈٹ کر کھانے کے بعد سو گئے۔ سہ پہر کو آنکھ کھُلی تو جارل کے ایک آدمی نے آکر بتایا کہ مَیں رات کو ملکہ رُدبا کے بڑے کمرۂ طعام میں عظیم راخیل سے مِل سکوں گا۔ ملکہ رُدبا کا ذکر آیا تو مَیں نے اس شخص سے ملکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہُوا کہ اُسے بڑی درندگی سے بے آبرُو کرنے کے بعد پھانسی دے دی گئی ہے۔ اس کے تمام آدمیوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا اور اب عورتیں اور بچّے غلام بنا کر ساتھ لے جائے جائیں گے اور پھر اُنھیں کہیں فروخت کر دیا جائے گا۔

ملکہ رُدبا جیسی عورتوں کو ایک نہ ایک روز اسی انجام پر پہنچنا ہوتا ہے! مَیں اس کے انجام پر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

جارل کا آدمی چلا گیا تو مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے اپنے منصُوبے کے دُوسرے اور آخری حصّے کی فکر تھی اور وہ وقت آرہا تھا جب مجھے منصُوبے کے اس حصّے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ یہی سوچتے ہُوئے مَیں سِلارد کی طرف متوجہ ہُوا۔

"کیا تمھارے پاس کچھ اور سیاہ موتی موجود ہیں؟ میرے موتی تو شاید ملکہ رُدبا کے آدمیوں نے میری بے ہوشی کے دوران نکال لیے تھے۔"

"کچھ اور تو نہیں مالک! البتہ وہی موتی ہیں، جو پہلے تمھیں دیے تھے۔" سِلارد نے بڑے انکسار سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" مَیں حیرت زدہ رہ گیا۔

"اُن بدمعاشوں نے میری تلاشی لے کر میری رقم کی تھیلی نکال لی تھی۔ اُسی وقت مجھے خیال آیا کہ اُنھوں نے ضرور تمھاری بھی تلاشی لی ہوگی اور تمھارے موتیوں پر ہاتھ صاف کر دیا ہوگا۔ پھر مَیں موقعے کی تلاش میں لگ گیا اور جیسے ہی موقع مِلا، مَیں نے رقم کی تھیلی اور تمھارے موتی اُن کے قبضے سے واپس لے لیے۔ معاف کرنا مالک! مَیں نے قسم کھائی تھی اور ہرمزد کو درمیان لاکر عہد کیا تھا کہ آیندہ ایک سال تک چوری نہیں کروں گا لیکن یہ ایک ایسی مجبوری تھی کہ مَیں بے بس ہوگیا ... اور پھر مالک! یہ چوری تو نہ ہُوئی۔ اپنی چیز واپس لینا

چوری نہیں ہوتی نا؟"

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ اور سلارد کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا: "مجھے تمہاری یہ چوری پسند آئی۔ تم نے بتایا تھا کہ یہ بحری قزاق ان سیاہ موتیوں پر جان دیتے ہیں؟"

"ہاں مالک! یہ درست ہے۔ میری معلومات اب تک بہت کم غلط ثابت ہوئی ہیں۔" سلارد نے کہا اور پھر کسی خیال کے تحت ہنس پڑا۔ "بڑا لطف آیا تھا، مالک! ملکہ رُوبلا کے آدمی آپس ہی میں لڑ پڑے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے کہ ان میں سے کسی نے وہ رقم کی تھیلی اور موتی چرا لیے ہیں۔ انھوں نے مارے خوف کے ملکہ رُوبلا سے اس بات کا ذکر تک نہ کیا ہوگا۔"

"لاؤ، ذرا وہ موتی دکھاؤ۔" میں نے کہا۔

سلارد نے موتیوں کی تھیلی میرے حوالے کی تو میں نے اُسے تھیلی پر اُلٹ دیا۔ سیاہ موتی میری ہتھیلی پر چمکنے لگے۔ میں نے سب سے بڑے موتی کو منتخب کر کے اپنی جیب میں ڈالا اور باقی موتی اُسے واپس کر دیے۔

سلارد میری اس حرکت کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا لیکن اُس نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا کیوں کہ اُس کے نزدیک میں ایک دانش مند آدمی تھا۔

رات ہوتے ہی جارل بذاتِ خود مجھے لینے آ پہنچا۔ میں اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ہمارا رُخ بڑے ہال کی طرف تھا۔ راستے میں جارل کی زبانی مجھے ایک بڑی عجیب بات معلوم ہوئی۔ جارل راخیل کا بہنوئی تھا اور شاید یہی وجہ تھی جو اُسے دوسروں کے مقابلے میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔

"میں تمھیں پسند کرنے لگا ہوں سرفروش!" جارل نے دوستانہ لہجے میں کہا: "لیکن راخیل کسی کو پسند نہیں کرتا۔ اُسے صرف ایسے لوگ پسند ہیں جو میدانِ جنگ میں ہمت و جرأت اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُسے اچھے رہنماؤں کی شدید ضرورت ہے۔ ہمارے یہ گُتے لڑتے تو اچھا ہیں لیکن اس کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اُن کے سر پر نہ ہو تو آپس ہی میں ایک دوسرے کو بھنبھوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے راخیل سے بات کر لی ہے۔ وہ تمھیں سالار کے عہدے پر فائز دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کے لیے تمھیں ایک کڑی آزمائش سے گزرنا ہوگا۔ ایک بات ذہن نشین کر لو، ابھی تمھارا مرتبہ ایسا نہیں ہے کہ تمھیں سوالات کرنے کا حق دیا جا سکے۔ مجھے تو خیر اس کی پروا نہیں لیکن راخیل کو سوالات سے اور سوال کرنے والوں سے شدید نفرت ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر اعتماد نہیں کرتا اور اُنھیں شک و شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُسے صرف تابع داری اور بے چون و چرا حکم کی تعمیل کرنے والے پسند ہیں۔ بات تمھاری سمجھ میں آ رہی ہے نا؟"

"شکریہ جارل! میرا خیال ہے، ہم اچھے دوست بنتے جا رہے ہیں۔" میں ذرا سا جھکا اور انگلیوں کو پیشانی تک لے جاتے ہوئے کہا: "لیکن میں ایک سوال پوچھے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ جب راخیل پر پہلی بار میری نگاہ پڑی تھی تو میں نے اس کے قریب ایک عورت کو دیکھا تھا۔ وہ سفید لبادہ اوڑھے ہوئے تھی جیسا کہ قبر دوتی پہنتے ہیں۔ اس کے بال چاندی جیسی رنگت کے تھے۔ کہیں وہ عورت میری نگاہ کا دھوکا تو نہیں تھی؟"

جارل گڑبڑا کر مجھ سے دو قدم دُور ہٹ گیا اور غیر دوستانہ لہجے میں بولا: "تم نے کچھ زیادہ ہی دیکھ لیا ہے، سرفروش! بہتر ہے کہ اس بات کو بھول جاؤ۔"

"گویا درسیلا یہاں موجود ہے۔" میں نے زیرِ لب کہا اور مجھے اپنا بھولا بسرا خواب یاد آ گیا۔

"درسیلا نام نہیں بلکہ خطاب ہے۔" جارل نے ناگواری سے کہا اور پھر تنبیہ کے انداز میں بولا: "اب تم اس موضوع کو ذہن سے جھٹک دو اور زبان کو لگام دو، ورنہ ہماری دوستی کی مدت بہت مختصر ہوگی۔"

میں نے جارل کی دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے زبان کو لگام دے دی۔

ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں قیامت کا شور بپا تھا۔ محفلِ نشاط جاری تھی۔ مشعلوں کی روشنی میں دو سو کے قریب قزاق لمبی لمبی میزوں پر رکھی ہوئی گوشت کی قابوں پر ہاتھ مارنے اور بے ڈھنگے پن سے جام لنڈھانے میں مصروف تھے۔ اُن کے درمیان تندرست و توانا اور دلکش عورتیں گھوم پھر کر ان کی ضروریات کا خیال رکھ رہی تھیں۔ کچھ قزاق بے قابو ہو کر دست درازی پر اُتر آتے تھے لیکن عورتوں کی پیشانی پر ایک شکن بھی نمودار نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس وہ ہنس کر اُن کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں اور اُن کی آتشِ شوق کو ہوا دے رہی تھیں۔

جارل نے بتایا کہ یہ عورتیں جنگ باز دوشیزائیں کہلاتی ہیں لیکن یہ میدانِ جنگ میں جا کر دشمنوں سے نبرد آزما نہیں ہوتیں۔ بلکہ لڑاکوں کی دل جوئی کرتی ہیں۔ راخیل ہمیشہ انھیں ساتھ لے کر چلتا ہے اور اپنے آدمیوں کو تازہ دم رکھنے کے لیے اُن کا وجود ضروری سمجھتا ہے جب کہ خود جارل کو یہ بات پسند نہیں تھی۔

سُرخ شیطان کچھ فاصلے پر ملکہ رُوبا کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اس کے افسر براجمان تھے۔ جن سے وہ گفتگو میں مصروف تھا۔ میں اور جارل ایک چھوٹی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب لگی تھی کہ ہال میں ہمارے داخلے پر راخیل نے توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے سوچا کہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ بہترین وقت ہے اور اس کا آغاز جارل سے کرنا چاہیے حالانکہ وہ میرا اصل ہدف نہیں تھا۔

جارل نے سامنے رکھی ہوئی صراحی سے شراب کی اچھی خاصی مقدار حلق میں انڈیل لی تھی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بلند آواز میں کہا: "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اس طرح الگ تھلگ بٹھایا جائے گا۔ میں اتنا گرا پڑا تو نہیں کہ اس بھاری تن و توش والے آدمی کے ساتھ بیٹھ کر دو گھونٹ بھی نہ پی سکوں، جو بالوں میں لڑکیوں کی طرح رنگ برنگے ربن باندھتا ہے۔"

میں نے راخیل کی طرف اشارہ کیا تھا اور آواز اتنی بلند رکھی تھی کہ وہ خوب اچھی طرح سن لے۔ جارل کا مُنہ مارے حیرت کے کھل گیا۔ اس نے جام اتنی زور سے میز پر رکھا کہ اس میں بچی ہوئی شراب چھلک کر میز پر آ رہی۔

"یہ تم کیا بک رہے ہو، سرفروش! کیا تم خود کو اور مجھے تباہ و برباد دیکھنا چاہتے ہو؟"

"بالکل درست۔" میں نے اپنی آواز کچھ اور بلند کرتے ہوئے کہا: "میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ایک عظیم چال باز کا درجہ حاصل کر لیا ہے... پھر میرے ساتھ اس کے شایانِ شان سلوک کیوں نہیں کیا جا رہا؟"

"تم ہمارے رواج سے واقف نہیں ہو۔" جارل بڑی رسانیت سے بولا: "تمھیں وہ عظیم درجہ دیا جا چکا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عظیم راخیل کا ایک اہم آدمی اور ایک خاص نمائندہ، یعنی میں تمھارے پاس بیٹھا ہوں۔ میں ایک دوست اور ایک بھائی کی حیثیت سے تمھیں یہاں کے طور طریقوں کی تعلیم دُوں گا... پھر تمھیں ایک آزمائش سے گزرنا ہوگا۔ اس کے بعد تم آزادانہ عظیم راخیل کے ساتھ بیٹھ سکو گے، جیسے کہ دوسرے افسران بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"میں کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو خود تو اپنی جگہ اکڑا بیٹھا ہے اور دوسرے کو مہمان نوازی کے لیے بھیج دے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے سُرخ شیطان کی طرف دیکھا۔ اب وہ اور اس کے ساتھی میری طرف پوری طرح متوجہ ہو چکے تھے۔ گویا میرا کام بن رہا تھا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ ہم دشمن بن جائیں؟" جارل غرایا۔ وہ واقعی بہت ضبط سے کام لے رہا تھا۔

"تم دوستی کا دم تو بھرتے ہو لیکن حمایت سُرخ شیطان کی کرتے ہو۔ آخر ہو نا اس کے بہنوئی۔" میں نے چیخ کر کہا۔

میری زبان سے آخری الفاظ نکلے ہی تھے کہ راخیل اپنی جگہ سے اُٹھتا دکھائی دیا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے اس کی دیو قامتی کا صحیح اندازہ ہوا۔ وہ پہاڑ کا پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ ایک متحرک چٹان۔

اُس نے میرے اور جارل کی طرف دیکھتے ہوئے بھاری اور گونج دار آواز میں حکم دیا: "اس شخص کو میرے پاس لایا جائے۔"

"میں نے تمھیں دوست اور بھائی کہا تھا اور دشمنی سے کترا رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دشمن بناتے رہنا تمھارا خاص مشغلہ ہے۔ اب جاؤ، اس سے دشمنی کا لطف اُٹھاؤ۔" جارل کے دبے دبے لہجے سے تاسف جھلک رہا تھا۔

راخیل کا ایک نائب تخت سے اُتر کر میرے پاس آیا اور مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا: "تم نے ہمارے سردار کا حکم سُن لیا ہوگا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ مجھے سُرخ شیطان کے قریب لے گیا، تب مجھے اپنی اوقات کا پتہ چلا۔ میں قد و قامت میں کچھ کم نہیں تھا لیکن راخیل کے آگے بونا نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی مینار کی مانند مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ تب پہلی بار مجھ پر خوف کا غلبہ ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میں غلط فیصلہ تو نہیں کر بیٹھا۔ بہرحال اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ میں خود کو سمجھانے لگا کہ ڈیل ڈول ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ دماغ اور قوتِ ارادی بھی کوئی چیز ہے۔

ہال میں سناٹا چھا گیا اور قزاق اپنے مشاغل سے دست کش ہو کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ راخیل کچھ دیر تو اپنی چھوٹی چھوٹی سفاک آنکھوں سے میرا جائزہ لیتا رہا... پھر خلافِ معمول نرم لہجے میں بولا: "تم جارل سے لڑ رہے تھے، اجنبی؟"

میں نے دونوں ہاتھ کولھے پر رکھے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا: "نہیں، سُرخ شیطان! میری لڑائی تو تم سے ہے۔"

وسیع کمرے میں یہاں سے وہاں تک لوگوں کی گہری گہری سانسیں لینے کی آواز سنائی دی۔

"وہ کیوں اجنبی؟" راخیل نے اپنی شعلہ رنگ اور ناف تک آئی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔ "میں

سمجھتا ہُوں کہ تمھارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا ہے۔"

"بے شک میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا ہے اور اس کے لیے تمھارا شکریہ۔ لیکن مَیں سمجھتا ہُوں کہ وہ سلوک میرے شایانِ شان نہیں ہے۔ مَیں کوئی گرا پڑا آدمی نہیں ہُوں۔ مَیں شہزادہ ہُوں۔ شاید یہ بات مَیں تمھیں بتا بھی چُکا ہُوں۔ چونکہ مَیں بھی ایک سردار ہُوں، اس لیے سربراہی میرے حصّے میں آنی چاہیے۔" مَیں نے ملکہ رُوہا کے تخت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے مزید کہا۔ "تم وہاں بیٹھے ہُوئے ہو اور مَیں بھی وہاں بیٹھوں گا لیکن وہ جگہ ہم دونوں کے لیے کافی نہیں ہے۔ ایک تخت پر دو حکمراں نہیں بیٹھ سکتے۔"

راخیل کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھ پر جم گئیں پھر اس کے موٹے اور بھدّے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ ہونٹ کُھلے تو درمیان سے سیاہ بے ترتیب دانت جھانکنے لگے۔ اُس نے جمے ہُوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"تم ایک جاں باز ہو اجنبی، یہ مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہُوں اور مَیں اب تمھاری موت تک تمھیں شہزادہ ہی تسلیم کروں گا، جیسا کہ تم نے اپنے بارے میں بتایا ہے۔ ہوسکتا ہے، تم شہزادے ہی ہو۔ اس لیے کہ تم جرأت مندی سے بات کرتے ہو۔ کوئی معمولی درجے کا آدمی مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا جبکہ تم وقت ضائع کیے بغیر مطلب پر آگئے۔ مَیں اس بات کو بہت پسند کرتا ہُوں۔ مَیں ایک سیدھا سادا آدمی ہوں اور لفاظی بالکل نہیں جانتا۔ یہ کام جارل خُوب کر لیتا ہے۔ جب کوئی ایسا موقع آتا ہے تو وہی میری ترجمانی کرتا ہے اور وہی اس وقت میری جگہ تم سے لڑے گا۔ اگرچہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اس میں تھوڑی سی لچک آگئی ہے لیکن وہ ایک عظیم جاں باز ہے۔"

"لیکن مَیں نے جارل سے نہیں، تم سے لڑنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔"

راخیل نے مجھ پر ایک سرد نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "مَیں نے اس فاحشہ ملکہ کو بدترین سزا دینے کے بعد ایک ستون سے لٹکا دیا ہے اور ابھی اسے موت نہیں آئی۔ موت کی آخری گھڑی تک اسے سسکتے رہنا ہوگا۔ کیا تمھیں خوف نہیں آتا، تمھارا بھی وہی انجام ہوسکتا ہے۔ یہاں اب میری حکمرانی ہے۔"

"بے شک تم ایسا کرسکتے ہو۔" مَیں نے بے خوفی سے کہا۔ "لیکن ایسا کر کے تم ایک بزدل کہلاؤ گے کیوں کہ مَیں نے تمھیں ایک کُھلی دعوت دی ہے۔ اصُولاً تمھیں یہ دعوت قبول کر کے مجھ سے لڑنا چاہیے۔"

مَیں نے کن انکھیوں سے لوگوں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور اندازہ ہُوا کہ صُورتِ حال میرے حق میں جارہی تھی۔ مَیں جو چاہتا تھا، بتدریج منزلِ مُراد میرے قریب آتی جارہی تھی۔

مَیں نے جیب سے سیاہ موتی نکالا اور راخیل پر ایک بھرپور ضرب لگانے کے لیے موتی کو انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کے درمیان دبا کر سر سے بلند کیا تاکہ وہاں موجود تمام قزاق اسے اچھی طرح دیکھ لیں۔ موتی کبوتر کے انڈے کے برابر تھا اور مشعل کی روشنی میں کسی عفریت کے آنسُو کی مانند چمک رہا تھا۔

"مَیں نے سُنا ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی سیاہ موتیوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ میرے پاس اس جیسے بہت سے موتی ہیں۔ اگر تم مجھ سے خوف زدہ ہو تو مَیں تمھارے ان آدمیوں کو اور تمھاری حکمرانی کو خریدنے کے لیے تیار ہوں۔"

سُرخ شیطان بلاشُبہ دلیر اور جاں باز تھا لیکن یہ اس کے لیے ایک تلخ گھونٹ تھا۔ اُسے غصّے اور اشتعال سے پھٹ پڑنا چاہیے تھا لیکن مَیں نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ قزاق بے قابو ہو کر بُری طرح چیخنے اور چلّانے لگے۔

"اسے مار ڈالو۔ اس کا سر اُڑا دو۔ اس نے بہت گھٹیا بات کی ہے۔"

راخیل نے ہاتھ اُٹھا کر اُنھیں خاموش کرا دیا... پھر اُس نے قریب ہی کھڑے ایک افسر کی طرف جُھک کر سرگوشی میں کچھ کہا۔ افسر نے سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا۔ افسر کے جانے کے بعد راخیل نے اپنا ریچھ جیسا بڑا اور بھدّا ہاتھ اُٹھایا اور ایک موٹی انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے پُرسکون لہجے میں بولا۔

"شہزادے! اب تک تُم ہی بولتے رہے ہو اور مَیں بڑے صبر اور ضبط سے سُنتا رہا ہُوں... لیکن اب میری باری ہے۔ کچھ مجھ سے بھی سُنو۔" یہ کہتے ہُوئے اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ "مَیں تمھارا شکرگزار ہوں گے۔ تم نے میری ایک مشکل دُور کردی۔ تمھارے ساتھ جو عورت ہے وہ خُود کو شہزادی تاشیہ اور شہنشاہ احباز کی بیٹی کہتی ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ تم دونوں منسُوب ہو... اور احباز پہنچنے کے بعد تمھاری شادی ہو جائے گی۔ کیا یہ دُرست ہے؟"

"ہاں، یہ دُرست ہے لیکن شہزادی تاشیہ کا ہمارے معاملے سے کیا تعلق ہے؟" مَیں نے کہا۔ "تم کیسے جاں باز ہو جو لڑنے سے کترا رہے ہو اور اِدھر اُدھر کی ہانک رہے ہو۔" مَیں نے سیاہ موتی اس کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔ "یا تو مجھ سے لڑو یا اس کے عوض خود کو اور

اپنے آدمیوں کو میرے ہاتھ فروخت کردو۔"

راخیل نے میرے ہاتھ سے موتی لے کر دُور پھینک دیا اور حقارت سے بولا۔ "بات یہ ہے شہزادے! کہ مَیں سفید موتی پر مرتا ہُوں... اور وہ سفید موتی شہزادی تاشیہ ہے۔ اگر مَیں شہزادی تاشیہ کو یُوں ہی ہتھیا لُوں تو یہ خلافِ اصُول اور میرے شایانِ شان بات نہ ہوگی کیونکہ مَیں نے تم لوگوں کو بحیثیت دوست قبول کیا ہے... لیکن اب جبکہ تم حریف بن کر مجھ سے لڑنا چاہتے ہو تو شہزادی تاشیہ کو حاصل کرنا میرے لیے دُشوار نہیں رہا۔ یہ ہمارا دستُور ہے کہ دُشمن کے مرنے کے بعد فاتح کو دُشمن کی چیزوں پر قبضہ کرنے کا حق مل جاتا ہے۔ مَیں ایک بار پھر تمھارا شکریہ ادا کرتا ہُوں۔"

'تو یہ شیطان شہزادی تاشیہ پر نگاہ رکھتا ہے۔' مَیں نے سوچا اور میرا خون کھولنے لگا۔ اچانک کمرے میں سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ مَیں نے دیکھا کہ راخیل کا وہی افسر شہزادی تاشیہ کو لے کر آرہا ہے۔

تاشیہ کا چہرہ تر و تازہ اور شاداب تھا۔ اس کا لباس بھی شاہانہ تھا اور سراپا کے تمام نشیب و فراز خوب نمایاں تھے۔ شاید اُسے موقعے کی نزاکت کا علم نہیں تھا۔ اس کے خیال میں اُسے مجھ سے ملاقات کے لیے لایا جارہا تھا۔ قریب آکر وہ بازو پھیلائے تیزی سے میری طرف لپکی لیکن افسر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے قریب رکھی ہوئی کُرسی پر بٹھا دیا تو تاشیہ کو صُورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا اور اُس کے ساتھ ہی اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور جسم ہلکے ہلکے کانپنے لگا۔

سُرخ شیطان غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے آدمیوں نے اِدھر اُدھر ہٹ کر کمرے کے درمیان لڑنے کے لیے جگہ بنادی۔

"تم نے میرے آدمیوں کے سامنے مجھے لڑنے کی دعوت دی ہے، اس لیے مجھے ہتھیار منتخب کرنے کا حق پہنچتا ہے۔" راخیل نے کہا۔

"تمھاری مرضی، جو ہتھیار چاہو استعمال کرو لیکن مَیں اپنا کلہاڑا استعمال کروں گا۔" مَیں نے جواب دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں، شہزادے!" وہ مسکراتے ہُوئے بولا۔ "مَیں ان سے کام لُوں گا۔" اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا دیے۔

مَیں نے اُس کے ریچھ جیسے بھاری اور مضبُوط ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے دونوں ہاتھوں کے برابر... بلکہ کچھ نکلتا ہُوا ہی تھا۔

راخیل نے اپنا لبادہ اُتار دیا اور تخت سے اُتر کر نیچے کُھلی جگہ آگیا۔ اب اس کے جسم پر صرف زیر جامہ ہی رہ گیا تھا۔ ہم ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اُس نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی اور بجائے حملہ کرنے کے وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ایک آخری مرحلہ شہزادے! یہ ہماری روایت ہے کہ ہم کسی فیصلہ کُن لڑائی سے پہلے 'موت کا جام' ضرور پیتے ہیں کیونکہ یہ لڑائی کسی ایک کی موت پر ختم ہوتی ہے۔"

اُس نے قریب کھڑے ایک قزاق کو اشارہ کیا۔ قزاق آگے آیا اور صراحی سے پیالے میں شراب اُنڈیل کر میری طرف بڑھایا۔ مَیں نے پیالے کو غور سے دیکھا تو وہ مجھے غیر معمُولی اور عجیب سا نظر آیا۔ اسے انسانی کھوپڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ بڑے بڑے سفید دانت ابھی تک کھوپڑی کے ایک حصّے سے جھلکتے نظر آرہے تھے۔

مَیں نے پیالہ لے لیا اور اُسے جیسے ہی اپنے ہونٹوں کی طرف بڑھایا تو یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ دانت مسکرا رہے ہوں۔

پیالہ خالی کر کے مَیں نے واپس کیا تو قزاق نے اسی پیالے کو دوبارہ لبریز کر کے سُرخ شیطان کی طرف بڑھا دیا۔ سُرخ شیطان نے پیالہ لے لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا بھیانک قہقہہ گونج اُٹھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کردیا اور دُور پھینکتے ہُوئے بولا۔ "یہ ھوتھو کی کھوپڑی ہے، وہ آخری شخص جس نے مجھے لڑنے کی دعوت دینے کا حوصلہ کیا تھا۔ اب اس کی جگہ تمھاری کھوپڑی کا پیالہ بنایا جائے گا۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

مَیں نے پلٹ کر قزاقوں کی طرف دیکھا، جارل اُن کے درمیان موجود نہیں تھا۔ وہ اُن سے دُور ایک میز پر سر جُھکائے بیٹھا تھا پھر میری نگاہ تاشیہ کی طرف چلی گئی جس کا چہرہ کسی لاش کے چہرے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ اس کا نازک بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور خُود پر قابُو پانے کے لیے اُس نے نچلا ہونٹ اتنی سختی سے دبا رکھا تھا کہ اس سے خُون چھلک پڑا۔

مَیں نے راخیل کی طرف دیکھا۔

اس کا دیو جیسا جسم میری طرف بڑھ رہا تھا۔

★★

راخیل میری طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے دونوں بازو مجھے دبوچ لینے کے انداز میں پھیلے ہُوئے تھے۔ مَیں آہستہ سے پیچھے ہٹا اور ہر قسم کی فوری جُنبش کے لیے سر اور جسم کو اکڑا لیا۔ مجھے صرف ایک بات کا خیال رکھنا تھا کہ کسی بھی طرح اس کی گرفت میں نہ آؤں۔ اس کی گرفت میں آنے کا مطلب تھا کہ وہ مجھے بھینچ کر مار ڈالتا۔ اس وقت صورت ایسی تھی جیسے کوئی عقاب کسی کبُوتر پر جھپٹنے کے لیے پَر تول رہا ہو۔

دفعتاً اس نے اپنا ہاتھ پوری قوت سے میرے سر کی طرف

چلایا۔ میں نے سر جھکا کر اس کا وار بچایا اور اُڑتا ہُوا دُوسری طرف نکل گیا۔ نکلتے نکلتے میں نے ہاتھ کی ایک بھرپور ضرب اس کے پیٹ پر لگائی اور اس کے ساتھ ہی دَرد کی ایک چیخ میرے حلق سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ مجھے یُوں لگا تھا جیسے میرا ہاتھ کسی چٹان یا آہنی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔

مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اگر اس شیطان کو جلد ہی ختم نہ کیا گیا تو یہ مجھے پیس کر رکھ دے گا۔ اس کے ساتھ ہورسا جیسی لڑائی نہیں لڑی جا سکتی تھی۔ وہ تھکنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا جبکہ حریف کو تھکا کر، جھپٹنے اور شکار کرنے والا عفریت تھا۔ وہ ایک ایسا دُشمن تھا جو سارا دن اور ساری رات بغیر تھکے لڑ سکتا تھا۔ اس سے لڑنے کے لیے قوت کی نہیں، تدبّر کی ضرورت تھی۔ مجھے کوئی اور ہی صُورت اختیار کرنا تھی۔ اس وقت پھرتی اور حاضر دماغی ہی میرے کام آ سکتی تھی۔ میں یہ کسی طور پر گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک اجنبی دَور میں، میرا کاسۂ سر شراب پینے کے لیے استعمال کیا جائے۔

سُرخ شیطان نے، دونوں ہاتھ اُٹھائے اور مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے شانے پر پڑا اور میں ایک جھٹکے سے کئی قدم دُور جا گرا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کتنی لڑھکنیاں کھائی تھیں البتہ جب میں رُکا تو شانے میں قیامت کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے میرے شانے کی ہڈی اپنی جگہ سے سرک گئی ہو۔

قزاقوں کے شور سے چھت اُڑی جا رہی تھی۔ وہ بیک آواز چیخ چیخ کر راخیل کو اُکسا رہے تھے کہ مجھے فوراً مار ڈالے۔ راخیل نے مجھ پر دوبارہ چھلانگ لگائی اور اس بار اُس کے تیور ایسے تھے جیسے مجھے دبوچ لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میں خود کو سنبھالتا ہُوا فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہُوا۔

اس سے پہلے کہ سُرخ شیطان مجھ پر آتا، میں نے اپنا توازن دُرست کیا، جسم کو تولا اور پُوری قوت سے ہوا میں اچھلا۔ میرے دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیاں بیک وقت دائیں بائیں اس کی ٹھوڑی پر پڑیں۔ حریف کا مُنہ کُھل گیا اور وہ ایک زور دار آواز کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔

میں بھی زمین پر آ رہا۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے تربیت یافتہ ہاتھوں نے بڑی بھرپور ضرب لگائی ہے۔ راخیل کی جگہ کوئی دُوسرا ہوتا تو اس کا جبڑا چکنا چُور ہو چکا ہوتا لیکن اپنی ٹھوڑی کو وہ یُوں سہلا رہا تھا جیسے کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ اس کے حلق سے خفیف سی کراہ بھی نہیں نکلی تھی۔

وہ ایک بار پھر اُٹھا لیکن میں نے زمین پر پڑے پڑے چھلانگ لگائی اور اس پر سولٹے کا داؤ آزمایا۔ میری لات اس کے چہرے پر پڑی اور اس کا مُنہ گھوم گیا۔ میرے جُوتے کی ایڑی سے اس کا چہرہ کرد گیا تھا۔

اس کی دائیں آنکھ کے قریب سے خُون جاری ہو گیا۔

وہ ہنستے ہُوئے بولا۔ "یہ تو تم کسی کنواری لڑکی کی طرح ٹانگیں چلا رہے ہو۔ مرد ہو تو آؤ ہاتھ ملاؤ اور زور آزمائی کرو... پھر دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے کون شہ زور ہے۔"

جواب میں میں ایک بار پھر ہوا میں اچھلا۔ اس بار میری بھرپور ٹھوکر اس کے پیٹ پر پڑی لیکن وہ کسی مضبوط اور تن آور درخت کی مانند اپنی جگہ تنا اور جما کھڑا رہا۔

میں نے پے در پے اس پر گھونسے برسائے، لاتیں چلائیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہُوا۔ اس کے چہرے سے خُون بہہ بہہ کر اس کی داڑھی کو بھگو رہا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے میرے ہر وار اور ہر ضرب کو شرفِ قبولیت بخش رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک بھُوسہ بن چکا ہوتا۔

میرے ہاتھ پیروں میں درد ہونے لگا اور پیٹ میں اینٹھن شروع ہو گئی۔ اس طرح تو میں اُسے کبھی شکست نہیں دے سکوں گا میں نے سوچا۔ وہ فولادی جسم کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھے، وہ میری ہر کوشش ناکام کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ ڈٹا ہُوا تھا اور میں اپنے ہی زور میں تھک کر چُور چُور ہوتا جا رہا تھا۔

میری تھکن اور مایُوسی محسوس کرتے ہُوئے اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی... پھر یک بیک اس نے چھلانگ لگائی اور میرے سنبھلنے سے پہلے ہی اپنے دونوں ہاتھ میری کمر کے گرد جما دیے۔

"آہا! اب میں دیکھوں گا کہ شہزادے کی ہڈیاں کس طرح کڑکڑاتی ہیں۔" اور اس کے ساتھ اُس نے اپنے ہاتھوں پر زور

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں کسی چٹان کے نیچے دب ہی گیا ہوں۔ موت کے تصوّر سے، میرے جسم سے پسینہ جاری ہو گیا اور یہی موت کا خوف میرے کام آ گیا۔ میں جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے عقب میں جھکا اور پھر ایک جھٹکے سے آگے آتے ہُوئے انگلیاں سُرخ شیطان کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور اس کے ساتھ ہی دائیں گھٹنے کی بھرپور ضرب اس کی ناف کے نیچے لگائی۔

کوئی اور ہوتا تو ڈکرا کر نیچے گر پڑتا لیکن ردِ عمل یہ ہوا کہ اس کی گرفت بڑھ گئی اور مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میری پسلیاں سینہ توڑ کر باہر آ رہی ہوں۔ میں نے اضطراری طور پر اس کی دو حصوں

میں بٹی ہُوئی داڑھی پکڑ لی اور جسم و جاں کی پُوری قوت سے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

سُرخ شیطان کے حلق سے دَرد و اشتعال کی غرّاہٹ اُبھری۔

میرے جسم پر ایک ثانیے کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی ہُوئی اور اسی سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے میں ایک جھٹکے سے اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ نیم جاں ہونے کے باوجُود میرے حلق سے قہقہہ اُبل پڑا۔ اس کی داڑھی کا ایک حصّہ اُکھڑ کر میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

"آؤ، اپنی یہ داڑھی واپس لے جا سکتے ہو تو مجھ سے چھین لو۔" زندگی اور موت کی اس جنگ کے دوران میں نے پہلی بار اپنے حریف کو مخاطب کیا۔

سُرخ شیطان زور سے دہاڑا اور کسی اندھے بھینسے کی مانند مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کا بس چلتا تو مجھے حقیر کیڑے مکوڑے کی طرح مسل دیتا اور بھینچ کر ملغوبے میں تبدیل کر دیتا لیکن میں ایسا ہونے ہی کیوں دیتا۔ میں طاقت کے بل پر نہیں لڑ رہا تھا بلکہ نفسیاتی حربوں کو استعمال میں لا رہا تھا اور اس یقین کے ساتھ لڑ رہا تھا کہ ہر بشر میں خامی اور کمزوری ہوتی ہے۔ وہ فانی ہوتا ہے اور اُسے فنا کی طرف لے جانے کے لیے اس کا کوئی نہ کوئی کم زور پہلو ضرور ہوتا ہے۔ ہر آدمی کی مانند، موت سُرخ شیطان کا بھی مقدر تھی۔ وہ آدم زاد تھا اور اُسے بہرحال مرنا تھا... لیکن کس طرح؟

... اور پھر وہ پہلو میری سمجھ میں آ ہی گیا۔

میں نے ایک طرف ہٹتے ہُوئے سُرخ شیطان کا وار خالی جانے دیا۔ میرے ہاتھ میں اس کی داڑھی کے شعلہ رنگ بال اب بھی موجُود تھے اور اس دبیز گچھے پر خُون کے چھینٹے جم گئے تھے۔ بال مضبوط تھے۔ ان کی لمبائی تین فٹ سے کم نہ رہی ہوگی۔ بالوں کا وہ طویل گچھا کسی سُرخ سانپ کی طرح میرے ہاتھ میں بل کھا رہا تھا۔

وہ دوبارہ پلٹ کر میری طرف آیا تو میں نے کوڑے کی مانند گچھا اُس کے مُنہ پر دے مارا۔ راخیل غصّے اور اشتعال سے کانپنے لگا۔ اس کی ساری ہنسی مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ غیظ و غضب سے اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اب وہ مجھے بھینچ کر مار ڈالنے کے ارادے پر بھی قائم نہیں تھا... بلکہ میری گردن مروڑ کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔

مزید تاخیر اب میرے لیے بھی مناسب نہیں تھی۔ راخیل اپنے غصّے اور اشتعال کے نقطۂ عرُوج پر تھا۔ وہ بُری طرح جھنجھلایا ہُوا تھا اور اندھوں کی طرح بے سوچے سمجھے وار کیے جا رہا تھا اور میں اس حالت سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت میرے لیے سُود مند تھی۔ جب آدمی دماغ اور عقل کی بجائے جذبات اور ہیجان کا اسیر ہو جائے تو چُوہے سے بھی زیادہ بے بس اور ناتواں ہو جاتا ہے۔ میں نے طے کیا کہ اس دیو پیکر شیطان کو کسی چُوہے ہی کی موت ماروں گا۔

وہ غرّاتا ہُوا ایک بار پھر میری طرف جھپٹا۔

میں نے تیزی سے ایک طرف ہٹتے ہُوئے اس کی پُشت پر لات جمادی۔ وہ کسی کٹے ہُوئے بھاری درخت کی مانند دُور جا گرا۔

قزاقوں کی بھنبھناہٹ ایک بار پھر گونجنے لگی۔ اُنھوں نے اپنے آقا کو غلاموں کی مانند لاتیں کھاتے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ میں تیزی سے اُس کی طرف بڑھا لیکن وہ فوراً ہی کھڑا ہو گیا... اس کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی میں نے اُس کی داڑھی کے بٹے ہُوئے بالوں کو کوڑے کی طرح گھمایا اور اس کی آنکھ پر دے مارا۔

اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔

وہ دونوں ہاتھ پھیلائے مجھے جکڑ لینے کے لیے لپکا لیکن میں کسی لٹّو کی طرح گھوما اور پُوری قوت سے اس کے کولھے پر لات جمادی۔ وہ اپنے ہی زور میں لڑکھڑاتا ہُوا آگے گیا اور شراب کے ایک بڑے برتن سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اس کا سر شراب کے برتن میں ڈُوب گیا تھا۔

میں کسی ایسے ہی موقعے کا منتظر تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔

میں نے اس لمحے کو ضائع نہیں کیا۔ کبھی کبھی زندگی اور موت کے درمیان ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے جو حدِ فاصل کہلاتا ہے... لیکن وہ لمحہ بڑا مختصر ہوتا ہے۔ اس لمحے کے ایک طرف زندگی اور دُوسری طرف موت ہوتی ہے۔ وہ لمحہ درمیان سے ہٹ جائے تو فاصلہ مِٹ جاتا ہے اور زندگی، موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ دُشمن کے سر اُٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دینا ضروری ہوتا ہے۔

میں نے ایک بھرپور جست لگائی اور سُرخ شیطان کی پیٹھ پر سوار ہو گیا پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کی داڑھی کے بال سے بٹی ہُوئی رسّی گلے میں ڈال کر، پیچھے سے، دونوں ہاتھوں کے ذریعے تھام لی۔

وہ کھانستا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں نے گرفت قائم رکھنے کے لیے دونوں گھٹنے مضبوطی سے اس کے دونوں پہلوؤں میں جما دیے اور اس کے ساتھ ہی بالوں کی رسّی کا حلقہ تنگ کرنے لگا۔ رسّی سُرخ شیطان کی موٹی گردن میں کَسنے لگی۔ اُس نے مجھے اپنی

پیٹھ پر سے پھینکنے کے لیے کسی مُنہ زور اور سرکش گھوڑے کی مانند اُچھلنا کُودنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دونوں لمبے لمبے ہاتھ پُشت پرلے جاکر میرے جسم سے بھی زور آزمائی کرنے لگا۔

یہ جنگ، میری زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ سُرخ شیطان کو ذرا بھی ڈھیل دینا، اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ اُس کی آہنی اُنگلیوں اور بڑے بڑے ناخنوں سے اپنے زخمی ہوتے اور جسم کی طرف سے توجہ ہٹاتے ہُوئے مَیں نے رسّی کا حلقہ تنگ کرنے پر پُورا زور صرف کر دیا۔ مضبوط بالوں کی بٹی ہُوئی رسّی سُرخ شیطان کی موٹی گردن میں دھنسنے لگی۔۔۔

اس کے حلق سے خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ رسّی اُس کے حلقوم میں دھنستی چلی گئی۔ اپنی پیٹھ سے گرانے کی ساری کوششیں ناکام دیکھ کر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اس طرح بھی رہائی نہ ملی تو جسم کو جھٹکا دے کر مجھے سامنے گرانا چاہا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُس کی قوّت نچُڑ چکی تھی۔۔۔ پھر جان کنی کے عالم میں وہ اُلٹ گیا۔

اُس کا پہاڑ جیسا جسم میرے اُوپر آ رہا۔

اس کے بوجھ سے مجھے اپنا دم گھُٹتا ہُوا محسوس کیا لیکن مَیں اپنی زندگی اور بقا ہی کے لیے تو لڑ رہا تھا۔ مَیں نے قوّتِ ارادی سے کام لیتے ہُوئے اپنے حواس بحال کیے اور رسّی کا حلقہ تنگ سے تنگ کرتا چلا گیا۔

مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ وحشی کبھی دم نہیں توڑے گا شاید کاتبِ تقدیر اس عفریت کے لیے موت لکھنا بھُول گیا تھا لیکن یکلخت اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔

اس کا بھاری سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

مَیں نے بڑی مشکل سے خود کو اس کے نیچے سے نکالا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں اُبل پڑی تھیں اور زبان لٹک گئی تھی۔

چہرے پر موت کی سیاہی پھیل گئی تھی۔

راخیل، جو سُرخ شیطان کہلاتا تھا اور جس سے ایک خلقت دہشت کھاتی تھی، وہ مر چکا تھا۔

مَیں لڑکھڑاتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔

میرا ایک ایک جوڑ چٹخ رہا تھا۔

ایک ایک رُواں درد سے چیخ رہا تھا۔

سر بُری طرح چکرا رہا تھا:

آنکھوں کے آگے سُرخ و سیاہ دھبّے ناچ رہے تھے۔

مَیں نے آنکھیں مُوند لیں اور کچھ دیر اسی حالت میں کھڑا رہا۔ فضا قوں پر سنّاٹا سوار تھا۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی بگتا تھا اُن سب کو سانپ سُونگھ گیا ہو یا وہ سب کے سب اپنے سردار کے ساتھ ہی موت کی آغوش میں جا سوئے ہوں۔

کچھ دیر بعد مَیں نے آنکھیں کھولیں اور ایک ہاتھ بلند کر کے توانائی مجتمع کرتے ہُوئے بلند آواز میں بولنے لگا: "اب مَیں تمھارا سردار ہوں۔ مَیں جادل کو اپنا نائبِ اوّل مقرّر کرتا ہُوں۔ تم اسی طرح اُس کی اطاعت کرو گے، جس طرح میری۔"

مَیں نے اپنے قدموں میں پڑے ہُوئے لحیم شحیم مُردہ جسم پر نظر ڈالی۔

"اس لاش کو ایک دلیر اور جاں باز کی لاش کے شایانِ شان اور پُورے اعزاز و احترام کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اس کام کو جادل دیکھے گا اور تم سب لوگ جو اب میرے خادم ہو، بدستور اپنے مشاغل میں مصروف ہو جاؤ۔ راخیل کی تدفین ہوتے ہی ہم۔۔۔"

اچانک میری آواز حلق میں اٹک گئی۔

مجھے اپنی پُشت میں ایک تیز دھار خنجر دھنستا ہُوا محسوس ہُوا۔ درد کی ایک تیز لہر میرے وجُود میں دوڑ گئی۔ مَیں خود کو سنبھالتے ہُوئے نیم جان کیفیت میں اپنے حملہ آور کی طرف مُڑا۔ میرا حملہ آور، آنکھوں میں نفرت لیے مجھ پر دُوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ جادل اپنی جگہ سے اُچھلا اور اس نے بجلی کی مانند تڑپ کر تلوار کا ہاتھ گھمایا۔ حملہ آور کا سر کسی خربوزے کی مانند کٹ کر دُور جا گرا۔

اُس کی گردن سے گرم گرم خون اُبلنے لگا، جس کے چھینٹے مَیں اپنے جسم پر بھی محسوس کر رہا تھا۔۔۔ پھر میرا ذہن آہستہ آہستہ تاریک ہونے لگا۔ مَیں بتدریج تحت الثریٰ کی طرف جا رہا تھا اور ڈوبتے ذہن کی دہلیز پر جادل کی آواز دستک دے رہی تھی۔ شاید وہ مجھ ہی سے مخاطب تھا: "یہ ضحاک تھا شہزادے! راخیل کا حقیقی بیٹا۔ اس کا خنجر زہر میں بجھا ہُوا تھا۔ افسوس کہ ہمارے پاس زہر کا کوئی توڑ یا کوئی تریاق نہیں ہے۔۔۔ مگر نہیں، ہمارے درمیان قبوتی خاتون موجود ہے۔ وہی جو قبروتیوں کی بڑی پجارن ہے جس کے بارے میں تم نے ذکر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قبروتی ہر قسم کے زہر کا علاج کر لیتے ہیں۔"

❁

وہ تاریکی کا ایک طویل سفر تھا، جس میں مَیں کبھی ڈُوبتا تھا، کبھی اُبھرتا تھا۔

تاریکی چھٹی تو ایک چہرہ اُبھرتا ہُوا دکھائی دیا۔ وہ چہرہ مجھ پر جھُکا ہُوا تھا۔ مَیں نے آنکھیں پُوری طرح کھول دیں۔

ہاں وہ ایک چہرہ ہی تھا۔ نسوانی، دل کش اور مہربان۔ شہابی چہرے پر بڑی بڑی روشن آنکھیں، نگینے کی مانند جڑی ہُوئی تھیں۔ اُن آنکھوں میں مہربانی اور محبت تھی۔ اس کے نقرئی، لانبے بال میرے سینے کو چھُو رہے تھے اور اس کے یاقوتی لبوں پر دل نواز اور ہر زخم کو مندمل کر دینے والی مسکراہٹ تھی۔

مَیں نے اس چہرے کو پہچان لیا۔ یہ درسیلا تھی، جسے مَیں نے قربانی کی ایک شب قبروتیوں کے معبد میں رسمِ قربانی انجام دیتے دیکھا تھا۔۔۔ اور جو ایک بار ذرا دیر کے لیے میرے خواب میں بھی آئی تھی۔۔۔ پھر مَیں نے اُسے قلعے میں، مینار کے پاس راخیل کے قریب ایک لمحے کی جھلک کے طور پر دیکھا تھا۔۔۔ اور پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہوتے ہُوئے آخری لمحات میں، جادل کے طفیل اس کا نام میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا تھا۔

"درسیلا!" بے ساختہ یہ نام میری زبان سے ادا ہُوئے۔

"درسیلا نام نہیں بلکہ ایک خطاب ہے، جو قبروتی قبیلے کی ہر بڑی پجارن کو دیا جاتا ہے۔" اس کے لبوں پر شرابی مسکان اُتر آئی۔ "میرا نام کلانسی ہے۔"

"بڑا خوبصورت نام ہے۔" مَیں نے کہا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔

کلانسی نے اپنا نرم و گداز ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ "نہیں نہیں، ابھی اُٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ لیٹے رہو۔ ابھی تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

لیٹے لیٹے مَیں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں مَیں نے راخیل کو شکست دی تھی اور پھر اُس کے بیٹے نے مجھے زہریلا خنجر گھونپ دیا تھا۔

"مَیں کہاں ہُوں؟" مَیں نے کلانسی کی طرف دیکھتے ہُوئے پوچھا۔

"مَیں جانتی تھی کہ تم یہ سوال ضرور پُوچھو گے۔" وہ مسکرائی۔ "ہم اس وقت سمندر کے سینے پر سفر کر رہے ہیں اور ہمارا رُخ احباز کی طرف ہے۔ تم پُورے دس روز بعد ہوش میں آئے ہو۔ زہر تمھارے جسم میں سرایت کر گیا تھا اور تم زندگی و موت کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ تمھیں سنبھالنے میں میری صلاحیتوں کی اچھی خاصی آزمائش ہُوئی لیکن مجھے اپنی کوششوں کا ثمر مل گیا۔"

دس روز۔۔۔ مَیں پُورے دس روز بے ہوش رہا تھا۔ گویا میری زندگی کے دس دنوں کی نفی ہو گئی تھی۔ میری زندگی کے دس قیمتی دن چُپ چاپ میرے عمرِ حیات سے خارج ہو گئے تھے اور وہ دن میرے شعُور کی گرفت میں آئے بغیر نکل گئے تھے۔ ایک طرح سے مَیں دس روز مُردہ رہا تھا اور اب دوبارہ جی اُٹھا تھا اور اس حیاتِ نو کے لیے مَیں اس عورت کا ممنونِ منّت تھا جو میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اگر درسیلا نہ ہوتی تو مَیں تہِ خاک جا سویا ہوتا۔ عالمِ بے ہوشی ہی میں زندگی کے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ مَیں اپنی محسنہ کو شکر گزار نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" کلانسی نے پوچھا۔ اس کے یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ، کسی سدا بہار پھُول کی طرح کھِلی ہُوئی تھی۔

"سوچ رہا ہُوں کہ تمھارا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ مر کر جیا ہُوں، اس لیے حیاتِ نو کے سلسلے میں تمھارا مقروض ہو گیا ہُوں۔ نہیں شاید مَیں غلط کہہ رہا ہُوں۔ زندگی قرض میں نہیں ملتی۔ مجھے تو یہ کہنا چاہیے کہ تم میری مسیحا ہو۔"

"بے شک زندگی کسی کو قرض نہیں دی جا سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو مَیں تمھاری جگہ خاک میں سو رہی ہوتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی کی ڈُوبتی نبض کو سہارا دیا جا سکتا ہے، ڈُوبتی ہُوئی کشتیٔ حیات کو کنارے لگایا جا سکتا ہے۔ اسے تم مسیحائی ہی کہہ سکتے ہو لیکن مسیحا کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہ اُس کا فرضِ منصبی ہے اور اگر شکریہ ادا کرنا ضروری ہی ہے تو اس کے لیے تمھیں ایک بار نہیں، تین بار شکریہ ادا کرنا ہو گا کیونکہ مَیں نے تمھیں تین بار موت کے مُنہ سے نکالا ہے۔"

"تین بار۔۔۔!" مارے حیرت کے مَیں سکتے میں رہ گیا۔

"ہاں تین بار لیکن اس کی تفصیل بعد میں بتاؤں گی۔۔۔ اور اگر تم اس سلسلے میں میرا شکریہ ادا کرنے پر مُصر ہی ہو تو اس کی بھی ایک صُورت ہے۔۔۔ بلکہ اس معاملے میں تم سے درخواست کروں گی اور مدد کی طالب ہُوں گی۔"

"تمھارے کام آتے ہُوئے مجھے بے حد خوشی ہو گی، کلانسی!" مَیں نے جذبات سے بے چین ہو کر کہا۔

"تمھیں معلوم ہے، سر فردش۔۔۔ کہ بڑی پجارن کا نام لینا گناہ ہے؟ اُسے صرف درسیلا ہی کہہ کر پُکارا جاتا ہے۔" کلانسی شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم پر عتاب بھی نازل ہو سکتا ہے۔"

"اگر عتاب تم جیسا حسین ہوتا ہے تو مَیں زندگی کے باقی دن معتوب ہو کر گزارنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر یہ نام لینا گناہ ہے تو اس میں بڑی ہی لذّت ہے۔ تم مجھے زندگی کے قریب لائی ہو تو زندگی سے دُور بھی لے جا سکتی ہو۔"

"بڑی خوبصورت باتیں کر لیتے ہو۔ جب مَیں پجارن نہیں

بی تھی تو تھی جیسے آدمی کے خواب دیکھتی تھی لیکن تم بہت دیر سے ملے۔ پجارن شادی نہیں کر سکتی لیکن میرا وعدہ ہے کہ ہمارا رُوحانی تعلق ہمیشہ قائم رہے گا۔"

وہ بولتے بولتے اُداس ہوگئی۔ آخر وہ ایک عورت ہی تو تھی... نازک احساسات اور لطیف جذبات تو ہر ایک کے ساتھ ہوتے ہیں جو آخری سانس تک اسے ڈستے رہتے ہیں۔

"ابھی تین روز کا سفر باقی ہے۔ پھر ہم سلطنت اجاز کے شان دار ساحل پہ پہنچ جائیں گے۔ وہاں پہنچتے ہی تمھاری اور شہزادی تاشیہ کی شادی ہو جائے گی۔ میں نے یہی سُنا ہے۔" کلانسی کا لہجہ حسرت زدہ تھا۔

تاشیہ! اچانک میرے ذہن میں ایک جھما کا سا ہُوا اور مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال آ گیا۔ "میرے ساتھی کہاں ہیں؟ تاشیہ، سلارد اور جارل..." میں نے بے تابی سے پُوچھا۔

"وہ سب اسی جہاز پر ہیں اور خیریت سے ہیں۔" کلانسی نے جواب دیا۔

"اُنھیں بلاؤ، میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مجبُوری ہے۔ تم کل تک اُن سے نہیں مل سکتے۔ اگر درسیلا کسی کا علاج کر رہی ہو تو زیرِ علاج شخص کے پاس کسی کو نہیں جانے دیا جاتا۔ تم کل کے بعد اُن سے مل سکتے ہو اور اُن کے ساتھ وقت گزار سکتے ہو۔"

میں خاموش رہا۔

"اب میں چلوں گی۔" وہ اُٹھتے ہُوئے بولی۔ "دوبارہ آؤں گی تو تم سے اپنے ایک مسئلے پر تفصیل سے گفتگو کروں گی۔ وہی جس کی طرف ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اشارہ کیا تھا۔ شاید تم اسی لیے مجھے ملے ہو کہ وہ کام انجام کو پہنچ جائے۔"

"ابھی کیوں نہیں بتا دیتیں۔" میں نے کہا۔

"مناسب نہیں ہے۔ تم ابھی ہوش میں آئے ہو اور تمھارے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔ جب میں تمھارے لیے کھانا لے کر آؤں گی تو بتاؤں گی۔ اس وقت تک تم آرام کرو۔"

وہ چلی گئی لیکن مجھے اُلجھن میں ڈال گئی۔ وہ میرے دماغ پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی لیکن میرے دماغ پر بوجھ پڑ گیا تھا۔ اُس نے کسی مسئلے کا ذکر کیا تھا اور اس سلسلے میں میری مدد کی طالب تھی۔ پھر میں سوچے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس نے مجھے دُوسری زندگی دی تھی۔

کلانسی کے جانے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم ایک بحری جہاز پر سفر کر رہے ہیں۔ میرا کمرہ ڈول رہا تھا اور مجھے اپنے نتھنوں میں سمندری پانی کی مخصوص بُو گھستی محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی جہاز سے ٹکراتی ہُوئی سرکش لہروں کا شور اور مستول کی چرچراہٹ بھی کانوں میں در آتی تھی۔

اچانک کیبن کا دروازہ کُھل گیا۔

میں نے آنے والے کو دیکھا اور اپنی نقاہت کی پروا کیے بغیر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔

کمرے میں داخل ہونے والی تاشیہ تھی۔

اُس نے احتیاط سے دروازے کا پٹ بند کیا اور دبے پاؤں میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ جس انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی، میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ بھی تھا اور پیار بھی... حکایت بھی تھی اور شکایت بھی... محبوبیت بھی تھی اور عداوت بھی...

میں نے اس تعطل کو توڑنے کی خاطر کہا۔ "کیسی ہو شہزادی؟"

"اُس نے مجھے دس روز سے یہاں نہیں آنے دیا۔ میں چُھپ کر آئی ہُوں۔" تاشیہ نے پیشانی پر بل ڈالتے ہُوئے کہا۔ وہ تو گویا بھری بیٹھی تھی۔

"ہائیں! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ بڑی پجارن ہے کیا تمھیں اُس سے خوف نہیں آتا؟"

"اب نہیں آتا۔"

"پہلے تو تم بہت ڈرتی تھیں، اب کیا معجزہ ہو گیا... اور تمھارا یُوں چُھپ کر آنا، اچھا نہیں، یہ تمھارے وقار کے منافی ہے۔"

"اُس ساحرہ نے تم پر جادو چلا دیا، نا۔ مجھے تو پہلے ہی شُبہ تھا۔ دس بارہ دن وہ تمھارے پاس تنہا رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ خیر تمھیں تو میں دیکھ لُوں گی۔ اجاز چلو، کوڑے نہ لگوائے تو میرا نام بھی تاشیہ نہیں۔"

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ "شہزادی! کیوں ناراض ہو رہی ہو۔ کوڑے تم مجھے شوق سے لگوا دینا لیکن اس بے چاری کا کیا قصور؟ وہ میری معالج ہے۔ میرا علاج کر رہی ہے۔ مجھے موت کے مُنہ سے نکال کر لائی ہے۔ وہ نہ ہوتی تو تم کب کی میرا کفن دفن کر چکی ہوتیں۔ آدمی کو اتنا ناشکرگزار نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں سب سمجھتی ہُوں۔ آج میں نے اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے۔ عورتیں اس چمک کا مفہوم خُوب سمجھتی ہیں۔ ایسی ہی چمک میں نے ملکہ رُومہ اور پھر ملکہ تُوبا کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔"

"تمھیں کلانسی کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ مجھے ابھی کچھ دیر ہُوئے ہوش آیا ہے۔ میں پُورے دس روز زندگی اور موت کی کش مکش میں مُبتلا رہا ہُوں اور وہ میرا علاج کرتی رہی تھی۔" میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"اور ہوش میں آتے ہی اس کا نام تک معلوم کر لیا، کیوں؟"

"کسی کے نام سے واقف ہونا بُری بات تو نہیں۔" میرا لہجہ مزید بگڑ گیا۔

"کسی کے نام سے واقف ہونا بُری بات نہیں، یہ تو میں بھی جانتی ہُوں لیکن درسیلا کا معاملہ مختلف ہے۔ اُسے کوئی نام لے کر نہیں پُکار سکتا۔ تمھیں یہ اجازت کیسے مِل گئی؟"

تاشیہ کسی جھگڑالو بیوی کی طرح لڑ رہی تھی اور میں کسی خیانت کار شوہر کی طرح دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس طویل اور ناگوار گفتگو سے میرے سر میں تکلیف شروع ہو گئی۔ تب کہیں اُسے مجھ پر رحم آیا۔ شاید اُس نے میری خستہ حالی محسوس کر لی تھی۔

وہ جانے کے لیے مُڑی اور جاتے جاتے تنبیہ کے انداز میں بولی۔ "میں، وہ کچھ نہیں ہونے دُوں گی، جو تم چاہتے ہو یا اُس کے دل میں ہے۔"

وہ جس خاموشی سے آئی، اسی خاموشی سے چلی گئی لیکن میرے دل و دماغ میں سینکڑوں طوفان اُٹھا گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں باقاعدہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر بیٹھا نہ گیا تو لیٹ گیا۔ میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا اور کنپٹیوں پر درد کے دھماکے ہو رہے تھے۔

★★

مجھے وقت کا اندازہ نہیں... شاید شام ہو رہی تھی کہ کلانسی دوبارہ میرے پاس آ گئی۔ اُس نے مجھے ایک تلخ مشروب دیا پھر شوربہ پلانے لگی۔

"کل تم اپنے ساتھیوں سے مِل سکو گے۔" اُس نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں اپنے ایک ساتھی سے تو مِل چکا ہُوں اور اس ملاقات نے میری کیا حالت بنا دی ہے۔

"تم نے اپنے کسی مسئلے کا ذکر کیا تھا؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میرا اتنا خیال ہے؟" اس کے چہرے پر بشاشت کی سُرخی بکھر گئی۔

"ہاں میں صنفِ نازک کے لیے اپنے دل میں بہت لطیف احساسات رکھتا ہُوں، خواہ وہ میری دُشمن ہی کیوں نہ ہو۔"

"لیکن میں تو تمھاری دُشمن نہیں ہُوں اگر دُشمن ہوتی تو تمھیں تین بار موت کے مُنہ سے نہ نکالتی۔ تمھارے عناصر کب کے بکھر گئے ہوتے۔" اس نے بڑی لگاوٹ سے پھر وہی پُراسرار بات کی جس نے مجھے حیرت میں شدید جھٹکا لگایا تھا۔

"تم ایک بار پہلے بھی اس طرف اشارہ کر چکی ہو۔ اگر تفصیل سے بتا دو تو میری اُلجھن دُور ہو جائے۔ اس سے پہلے وہ کون سے دو موقعے تھے، جب تم نے میری جان بچائی تھی؟" میں پُوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

کلانسی میرے بالکل قریب بیٹھ گئی تو میں اُس کے آتشیں سراپا کی حرارت اپنے رگ وپے میں دوڑتی محسوس کرنے لگا۔ ایک ٹھنڈی ٹھنڈی اور میٹھی میٹھی سی آگ میرے وُجود میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

"تمھیں وہ چاندنی رات یاد ہے، سرفروش! جب تم تاشیہ کے ساتھ قبروتی معبد کے قریب درخت کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ اس وقت قربانی کی رسم ادا کی جا رہی تھی اور تم نے ایک قبروتی پہرے دار عورت کو ہلاک کر دیا تھا۔ تم اپنی دانست میں سمجھ رہے تھے کہ سب کی نظروں سے چھپے ہُوئے ہو لیکن یہ محض تمھارا خیال تھا۔ میں نے تمھیں دیکھ لیا تھا۔ دستور کے مطابق تمھیں گھیرے میں لے کر قتل کر دینا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں میں نے ایسا نہیں کیا اور تمھیں نظر انداز کر گئی... اور اب سوچتی ہُوں کہ میں نے اچھا ہی کیا تھا۔"

یہ سُن کر میں اُسے بے یقینی سے گھُورتا رہ گیا لیکن یہ ایک ایسی بات تھی جس کا میں نے اپنی زبان سے تذکرہ تک نہیں کیا تھا اور تاشیہ سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اس نے وہ راز فاش کر دیا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ کلانسی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، اس نے نہ صرف مجھے اس چاندنی رات کو دیکھ لیا تھا بلکہ وہ مجھے نظر انداز بھی کر گئی تھی۔ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ اس رات مجھے بھی نہ جانے کیوں یہ احساس ہُوا تھا کہ بڑی پجارن مجھے دیکھ چکی ہے۔

وہ میری سوچوں کو، میرے چہرے کے تاثرات سے پڑھ کر مسکرانے لگی تو میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس رات اگر تم مجھے نظر انداز نہ کرتیں تو میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہوتے... بہرحال دُوسری بار تم نے میری زندگی کب بچائی تھی؟"

"دُوسرا موقع وہ تھا جب تم عکران کی مشاورتی جماعت میں ایک ملزم کی حیثیت سے پیش ہُوئے تھے۔ اس وقت تمھارے بارے میں گفتگو کی جا رہی تھی کہ تمھیں موت کے حوالے کر دیا جائے یا تمھاری جاں بخشی کر دی جائے۔ وہاں ایک قبروتی نمائندہ بیٹھی محفل کی کارروائی

قلم بند کر رہی تھی۔ اگر میں چاہتی تو کسی وقت بھی اپنا فیصلہ مسلط کر دیتی اور کسی تردد میں پڑے بغیر تمھارا سر قلم کر دیا جاتا لیکن میں نے اپنی نمائندہ کو فیصلہ محفوظ رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ہر آزمائش پر پورے اُترو گے۔ چنانچہ یہی ہوا، تم نے ہورسا کو شکست دے دی اور اپنی بقا کی جنگ جیت گئے۔ مجھے اس وقت بھی حیرت ہوئی تھی کہ آخر میں تمھیں کیوں بچاتی آ رہی ہوں۔"

میں نے اس احسان کے لیے بھی اس کا شکریہ ادا کر دیا۔

"اور تیسرا واقعہ تو تمھارے علم میں ہی ہے اور اب پتہ چلا کہ میں تمھیں کیوں بچاتی آ رہی تھی اور میں بھی نہیں بلکہ کوئی نادیدہ ہاتھ تمھیں بچاتا آ رہا تھا۔"

میرے ذہن میں گزرے ہوئے مناظر گھوم گئے۔

میں نے چشمِ تصور سے کلانسی کو بڑی پجارن کے رُوپ میں دیکھا، جو تلوار سر سے بلند کیے ایک مجبور و بے کس لڑکی کے سینے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہی عورت تھی، جو اپنے دلکش سراپا کے ساتھ مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔

"میرا خیال ہے، تمھیں اپنا وہ کام بتانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں اب پوری طرح صحت مند ہوں اور میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔"

وہ خیالوں میں کھو گئی۔ اس کی سیمیں پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اور آنکھوں سے فکرمندی جھلکنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

"کچھ عرصے سے ہم قبردتی محسوس کر رہے ہیں کہ یہاں کی مملکتوں اور بادشاہتوں میں ہماری مخالفت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ عام لوگ تو کچھ نہیں کہتے، البتہ بادشاہ اور ملکائیں درپردہ ہمارے خلاف سازشیں کر رہی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ہمارا قبیلہ اُن کے کاروبارِ مملکت میں کچھ زیادہ ہی مداخلت کرنے لگا ہے۔ اسی لیے وہ ہم سے چھٹکارا پانے کے لیے ہمارا قلع قمع کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے مخالفوں میں شاہ یوطابا اور ملکہ رُدبا پیش پیش تھی۔ ان کی سرکوبی نہ کی جاتی تو ہمارا نام و نشان مٹ جاتا۔ چنانچہ ان کے خاتمے کے لیے میں نے سُرخ شیطان رخیل سے مدد لی۔ اُسے عظیم حکمران بننے کا خبط تھا چنانچہ میں نے اُس کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا۔ ملکہ رُدبا کا حشر تو تم نے دیکھ ہی لیا۔ اس سے ایک روز قبل عکران کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی۔ شاہ یوطابا، ملکہ دُمرا اور دُوسرے حواری

تہ تیغ کر دیے گئے تھے۔ شہنشاہ احباز اور دُوسری مملکتیں ابھی قبردتیوں کے خلاف تو نہیں ہوئیں لیکن کسی وقت اُن کے ذہن بھی بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ سُرخ شیطان کو اُن پر مسلط رکھوں گی اور اس طرح وہ قبردتیوں کے آگے سر نہیں اُٹھا سکیں گے لیکن تم نے سُرخ شیطان کو ہلاک کر دیا۔ پتہ چلا کہ اس سرزمین پر کوئی اس سے بھی زیادہ طاقت ور ہستی موجود ہے اور اتفاق سے وہ تم نکلے۔"

"تمھارے دُشمن تو مارے جا چکے ہیں، اب تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے پُوچھا۔

"ابھی متوقع دُشمن تو موجود ہیں۔ مثلاً شہنشاہ احباز، لیکن میرا ارادہ اُسے ہلاک کرنے کا نہیں ہے۔ تم طاقت ور ہونے کے علاوہ دانش مند بھی ہو۔ سُرخ شیطان بھی طاقت ور تھا لیکن اس میں دانش مندی نہیں تھی۔ تمھاری شادی شہزادی تاشیہ سے ہونے والی ہے . . . اس لحاظ سے شہنشاہ پر تمھارا اثر و رسوخ بھی ہو گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے اثر و رسوخ اور دانش مندی سے کام لیتے ہوئے شہنشاہ کے خیالات کو ہمارے لیے ہموار کر دو۔ میں جانتی ہوں تم یہ کام آسانی سے کر سکتے ہو۔ میں نے تمھارے ساتھ پیش آنے والے جن نازک واقعات کی طرف اشارہ کیا، اس کا مقصد احسان جتانا نہیں تھا اور نہ ہی میں اس کا معاوضہ تم سے مانگتی ہوں بلکہ میری یہ درخواست ہے کہ میرے کام آؤ، جس طرح میں تمھارے کام آئی تھی۔ ہمیں بچاؤ، جس طرح ہم نے تمھیں بچایا تھا۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے، کلانسی! میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔" میں نے اس کا مرمریں ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے کہا۔

کلانسی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ تپتے ہوئے رخساروں کے ساتھ بولی: "پہلے تم نے میرا نام لیا . . . اور اب میرا ہاتھ تھام لیا۔ جانتے ہو، قبیلہ قبروت کا دستور ہے کہ کسی بڑی پجارن کا ہاتھ پکڑنے والے کو سزائے موت دے دی جاتی ہے۔"

"عجیب مخمصے میں پھنس گیا ہوں،" میں نے مسکرا کر سوچا۔ "کوئی کوڑے لگوانے کی دھمکی دیتی ہے اور کوئی قتل کی سزا کا مستوجب قرار دے رہی ہے۔" میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر کلانسی کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کر دی۔

"تین بار بچایا ہے، چوتھی بار قتل کر دو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم خوبصورت جسم ہی نہیں خوبصورت ذہن کے مالک بھی ہو، کاش! میں تمھیں اپنا سکتی۔" اُس نے مخمور لہجے میں کہا اور میں قبیلہ

قبروت کے دستوروں کی سنگینی کو بالائے طاق رکھ کر نقب لگانے میں مصروف ہو گیا۔

●

اگلا روز میرے لیے ایک بھرپور، خوش گوار اور مسرتوں کا دن تھا۔ مجھے کلانسی کا انتظار تھا اور میں اپنے ساتھیوں سے بھی ملنا چاہتا تھا جن سے ملاقات ہوئے غالباً بارہ دن بیت گئے تھے۔ وہ میرے بُرے بھلے کے ساتھی تھے۔ تاشیہ، سلارو اور جارل . . . یہ تین نام میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

دن گزر گیا، سہ پہر ہو گئی لیکن کلانسی نہیں آئی۔ البتہ اُس کے بجائے سلارو مجھ سے ملنے آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی جو کیفیت ہوئی۔ اس کا احاطہ الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ بس یُوں لگ رہا تھا جیسے کسی یتیم بے بس بچے کو اچانک پتہ چل جائے کہ اس کا باپ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اس کے "نہیں نہیں" کرنے کے باوجود میں نے اُسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اُس نے بتایا کہ تاشیہ مجھ سے ناراض ہے۔ اس لیے نہیں آئی۔ جارل کے بارے میں بتایا کہ وہ مصروف ہے اور کچھ دیر بعد ملنے آئے گا۔

جب میں نے کلانسی کے بارے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر خوف چھا گیا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"وہ رات سے دکھائی دی نہیں مالک! وہ بڑی پُراسرار قوتوں کی مالک ہے۔ سب کہتے ہیں، چونکہ تمھارا علاج ہو گیا اور اس کی ضرورت نہیں رہی، اس لیے وہ کسی پُراسرار عمل کے ذریعے غائب ہو گئی۔ وہ جہاز پر موجود نہیں ہے۔"

میرے لیے یہ بات بے حد عجیب تھی اور میں اس پر یقین کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

تیسرے روز بادبانی جہاز احباز کے ساحل پر لنگر انداز ہو گیا۔ اس وقت تک میں حیرت انگیز طور پر سنبھل چکا تھا۔ تاشیہ مجھ سے بدستور کھنچی کھنچی رہی۔ اس نے مجھ سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔

جہاز ساحل پر رُکا تو جارل میرے پاس آیا اور مؤدب ہو کر بولا: "میرے بارے میں کیا حکم ہے؟"

اُس لمحے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں نے سب کے بارے میں تو سوچا تھا لیکن جارل کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ وہ کب تک میرے ساتھ رہ سکتا تھا؟ اور کہاں تک جا سکتا تھا؟ تبھی میں نے اس کے بارے میں ایک بڑا فیصلہ کر ڈالا، جو اس کے شایانِ شان تھا۔

"تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گے، دوست! میں تو ایک سیلانی آدمی ہوں، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا مستقبل کیا ہے۔" میں نے کہا۔

جارل تعظیم کے طور پر جھکتے ہوئے بولا: "میں تمھارا خادم ہوں، میرے لیے جو بھی حکم ہو، میں اس پر عمل کروں گا۔"

میں نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سر جھکنے کے لیے نہیں، جارل۔ یہ ایک جاں باز کا سر ہے اور تم میرے خادم کیسے ہو گئے؟ کیا تم نے نہیں سُنا کہ میں نے تمھیں دوست کہہ کر مخاطب کیا ہے؟"

جارل شدتِ جذبات سے خاموش ہو گیا۔

"سُنو جارل! میرے دوست! میں تمھیں ایک حقیر سا تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ تم اپنے دوست کا تحفہ قبول کر لو گے۔ ملکہ رُدبا اور سُرخ شیطان رخیل کی موت کے بعد آج وہ سارا علاقہ خالی پڑا ہے۔ تم جا کر اُسے آباد کرو۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ اس مملکت پر حکومت کرو کہ تمھی اس کے صحیح حق دار ہو۔ تم اسی جہاز سے واپسی کا سفر شروع کر دو۔ میری منزل اب احباز ہے۔"

جارل کے لب کانپے اور کانپ کر رہ گئے . . . پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کبھی کبھی ایک جاں باز بھی روتا ہُوا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں اُسے توجہ سے دیکھتا رہا اور میری دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی رہیں۔

★★

تاشیہ راستے بھر مجھ سے کھنچی کھنچی رہی لیکن ابھی تک ہم دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کن مرحلہ نہیں آیا تھا اس لیے میں بھی اس کے رویّے کی تبدیلی خاموشی سے برداشت کرتا رہا۔

سفر دُشوار ثابت نہیں ہُوا۔

ہم کسی زحمت میں پڑے بغیر احباز پہنچ گئے لیکن وہاں ہر طرف خوف و دہشت کی فضا چھائی ہُوئی تھی۔ لوگ سُرخ شیطان کے متوقع حملے سے بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ تاشیہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو بلاشبہ ہمیں سُرخ شیطان کے مخبر ہونے کے الزام میں دھر لیا جاتا۔

اپنی مملکت میں پہنچتے ہی شہزادی تاشیہ بااختیار ہو گئی۔ اُس نے مجھے اور سلارو کو ایک مسلح دستے کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ کل ہمیں شہنشاہِ احباز کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اُس نے ہدایت کی کہ مجھے اور سلارو کو الگ الگ رکھا جائے کیونکہ ہمارے مراتب میں فرق تھا۔

میں تاشیہ کے سرد رویّے پر حیران تھا۔ وہ چاہتی تو اُسی وقت ہمیں شہنشاہِ احباز کے پاس بھیج سکتی تھی لیکن اُس نے ایسا نہیں

کیا بلکہ معاملہ اگلے روز پر ٹال دیا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ ایک ہی بات کی تو بات ہے، ہو سکتا ہے، وہ اس عرصے میں اپنے باپ کو طولانی اور پُرخطر سفر کی داستان سنانا اور پھر میرے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتی ہو۔

ایک شان دار عمارت میں داخل ہونے کے بعد مجھے اور سلارڈ کو الگ الگ کر دیا گیا۔ سلارڈ نے موقع دیکھ کر جیب سے سیاہ موتیوں کی تھیلی نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے تم رکھ لو، مالک! تمھاری تلاشی لینے کی شاید وہ جرأت بھی نہ کریں لیکن مجھے کھنگال ڈالیں گے۔"

سپاہی اُسے لے کر چلے گئے تو مَیں اس کمرے میں آ گیا جو میرے لیے مخصوص تھا۔ مَیں نہیں جانتا کہ سلارڈ کو کیسا کمرہ دیا گیا تھا، البتہ مجھے جو کمرہ مِلا تھا، وہ کُشادہ اور آرا۔ ستہ تھا۔

رات سر پر آئی تو مجھے خوش ذائقہ کھانا دیا گیا۔ تب مجھے قدرے اطمینان ہُوا۔ ورنہ خدشہ تھا کہ کمرے میں مقیّد کر کے سب لوگ مجھے بھُول نہ گئے ہوں۔

کھانا کھا کر مَیں لیٹ گیا اور زندگی کی بوقلمونی پر غور کرنے لگا۔ اس عجیب دَور میں آنے کے بعد مجھے سکون کا ایک دن بھی نہیں مِلا تھا اور ایک رات بھی سُکھ کی نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مَیں نے سوچا کہ آج رات اگلی پچھلی کسر پوری کرتے ہُوئے صبح کی ہی خبر لاؤں گا۔

پلکیں نیند سے بوجھل ہُوئی تھیں کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھُلا۔

مَیں چونک پڑا اور فوراً اُٹھ بیٹھا۔

تاشیہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اب اُس کے نوخیز جسم پر ایک ڈھیلا ڈھالا سفید رنگ کا لبادہ پڑا ہُوا تھا۔ کمر کے گِرد ایک ریشمی ڈوری کسی ہُوئی تھی۔ وہ شاہانہ وقار سے چلتی ہُوئی میرے قریب آ کھڑی ہُوئی۔

کچھ دیر وہ مجھے گھُورتی رہی... پھر اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

"کیسے ہو، سرفروش؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"میرا حال تم سے چھُپا ہُوا نہیں البتہ مَیں تمھارا حال سمجھنے سے قاصر ہُوں۔"

"میرا حال یہ ہے کہ تمھیں قیدی بنا کر مَیں بے حد خوش ہُوں۔" اس نے طنزیہ لہجہ برقرار رکھا۔ "چونکہ تم نے اب تک مجھے بے حد پریشان کیا ہے اس لیے کل علی الصباح تمھیں کوڑے لگائے جائیں گے۔"

"صرف یہی اطلاع دینے آئی تھیں؟" مَیں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں... ایک اور بھی اطلاع ہے۔" اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ رخصت ہو گئی اور ان میں نفرت آمیز کھچاؤ پیدا ہو گیا جسے محسوس کر کے مَیں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

مَیں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ کیا؟"

"مَیں نے دکسیلا... یعنی تمھاری کلاسنی کو سمندر میں دھکا دے دیا تھا۔" اس نے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے میرے سینے میں تیز دھار خنجر اُتار دیا ہو۔ میرے حلق سے چیخ نِکل گئی۔ "نہیں...!"

"خاموش رہو۔" وہ نفرت سے پاؤں پٹخ کر بولی۔ "یہ ملکہ نعمہ یا ملکہ ندبا کا عشرت کدہ نہیں ہے۔ یہاں میری حکمرانی ہے اور مَیں زیادہ شور پسند نہیں کرتی۔ اُس نے بھی جہاز میں بہت شور مچا رکھا تھا اس لیے مَیں نے اُسے خاموشی کے کفن میں لپیٹ کر سمندر کی تہ میں بھیج دیا۔"

"تم جھُوٹ بول رہی ہو۔" میرا لہجہ اب بھی سخت تھا۔

"حدِ ادب سے باہر نہ جاؤ۔" اس نے متانت سے تنبیہ کی۔ "مَیں نے اُسے سمندر میں دھکا دے دیا تھا۔ چاندنی رات میں وہ عرشے پر کھڑی چاند کی کرنوں اور سمندر کی لہروں میں ہونے والی آنکھ مچولی دیکھ رہی تھی کہ مَیں نے پیچھے سے جا کر اسے دھکا دے دیا۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟ تمھیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" مَیں نے کراہ کر پوچھا۔ "تم اتنی ظالم تو نہیں تھیں۔"

"جب رقابت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے تو عورت دُنیا کی سب سے ظالم ہستی بن جاتی ہے۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا جیسے یہ کارنامہ سرانجام دے کر وہ فتح و کامرانی کی خوشی سے پھُولی نہ سما رہی ہو۔

"وہ تمھیں مجھ سے چھین رہی تھی۔"

"یہ غلط ہے۔" مَیں نے احتجاج کیا۔

"اور تم بھی مجھے نظرانداز کرنے لگے تھے۔" تاشیہ کا لہجہ برہمی سے ہمکنار ہو گیا۔ "تم نے شروع ہی سے مجھے توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ مَیں تمھارے نزدیک شاید کوئی ناسمجھ سی بچّی ہُوں۔ تم نے میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ اب مَیں تمھیں بتاؤں گی کہ مَیں کیا ہُوں۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟" اُس نے کمر کے گرد لپٹی ہُوئی پھُندنے دار ڈوری کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"اِدھر دیکھو... میری طرف۔"

مَیں نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا اور نگاہ جھُکا لی۔ سُورج کی طرف نظر بھر کر زیادہ دیر کون دیکھ سکتا ہے۔ یہی حالت اس وقت میری بھی ہو رہی تھی... لیکن یہ سُورج اپنی تابناکیوں سمیت

شاید مجھے جھُلسا کر راکھ ہی کر ڈالنا چاہتا تھا۔ مَیں حرارتوں کی شدّت سے گھبراہٹ محسوس کرنے لگا... اور اُسی لمحے میرا سر کسی چیز سے ٹکرا گیا یا پھر خود مَیں نے ہی جھٹکا کھایا تھا۔ تاشیہ مجھ سے دُور ہٹ گئی اور پھر مَیں نے اُس کی دلدوز چیخ سُنی۔ اتنی طویل اور لرزہ خیز چیخ کہ خود میرا دل شدّت سے کانپ گیا... لیکن مَیں خود ایک نئی مُصیبت میں مُبتلا ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے دماغ میں ان گنت قمقمے جل بُجھ رہے ہوں۔ مَیں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاشیہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اب میرے سامنے دُھندلا رہا تھا۔ وہ محض ایک ہیولہ ہی دکھائی دے رہی تھی... پھر ایسے لگا جیسے میرے اعضا دھڑ سے الگ ہو رہے ہوں۔

مَیں ٹوٹ رہا تھا۔

مَیں بکھرتا جا رہا تھا۔

میری ہستی تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔

تاشیہ کی جو حالت مَیں نے آخری بار دیکھی تھی، وہ غالباً میرے تحلیل ہوتے وجُود کو دیکھ کر ہُوئی تھی۔ مَیں اس دَور کے ہنگاموں میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ خُود کو اسی دَور کا ایک انسان سمجھنے لگا تھا۔ یہ بھی بھُول گیا کہ مَیں کہیں اور سے آیا ہُوں اور جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے، وہ میری واپسی کے لیے کوشش کر رہا ہوگا۔ ڈاکٹر فریدوں کی کوششیں رنگ لائیں اور میرا منتشر وجُود گہری تاریکیوں کی سمت سفر کرتا رہا... تاریکی... گہری تاریکی...

... اور پھر مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا جیسے میری سوچیں، میرے خیالات اور میرا دماغ تک منتشر ہو گیا ہو۔

●

مَیں جس زیرِ زمین کمرے میں دراز تھا، وہاں گہری خاموشی تھی۔ مَیں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مَیں قدیم فراعنہ کے دَور کی ایک حنوط شدہ لاش ہُوں اور کسی خاموش مقبرے میں لیٹا ہُوا ہُوں۔

میرا ذہن ابھی تک کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہُوا تھا۔

مَیں آنکھیں کھولنے سے نہ جانے کیوں ڈر رہا تھا۔

ابھی مَیں کسی فیصلہ کُن مرحلے پر نہیں پہنچا تھا کہ اچانک مجھے اپنے قریب کسی کی موجُودگی کا احساس ہُوا۔ لمحے بھر کے لیے یہی لگا جیسے مَیں شہزادی تاشیہ کے محل میں ہُوں اور وہ میرے قریب بے چینی سے ٹہل رہی ہے... پھر میرے ذہن پر غبار سا چھاتا چلا گیا۔ جو کچھ بیت گیا تھا، وہ لمحے بھر کے لیے روشن ہوتا اور پھر دماغ میں تاریک بگولے چکرانے لگتے تھے۔

کافی دیر بعد ذہن پُرسکون ہو گیا۔

مجھے اپنے بازو میں ڈنک جیسی کسی چیز کی چبھن محسوس ہُوئی تھی اور مَیں نیند کی گہرائی میں یُوں ڈوبتا چلا گیا تھا جیسے کوئی بھاری بھرکم جسم پانی میں تہ نشین ہوتا جا رہا ہو۔ اس بار غفلت بے حد طویل ثابت ہُوئی... اور جب مَیں ہوش میں آیا تو ماضی کی بیشتر باتیں چپکے سے میرے لاشعور میں جا کر گُم ہو گئی تھیں۔ مَیں ہوش میں آیا تو مجھے اپنے پپوٹے بے حد بھاری لگ رہے تھے اس لیے اُنھیں کھولنا یا حرکت دینا طاقت سے باہر محسوس ہونے لگا۔

"مَیں نے اسے ایک ایسا انجکشن دیا تھا جس سے یہ بارہ گھنٹے سکون کی نیند سوتا رہا ہے۔ اس کے اعصاب اور دل و دماغ بُری طرح متاثر ہوئے ہیں... لیکن جب یہ بیدار ہوگا تو بالکل تر و تازہ ہوگا۔"

یہ ڈاکٹر فریدوں کی آواز تھی۔

میرا دل خوشی سے جھُوم اُٹھا۔ گویا مَیں نے کمپیوٹر کے ذریعے ماضی کا ایک یادگار سفر کامیابی سے سرانجام دیا ہے اور اب مَیں صحیح و سالم اپنے دَور میں واپس آ گیا ہُوں۔ بے اختیار جی چاہا کہ مَیں خوشی کا ایک نعرہ بُلند کرتا ہُوا اُٹھوں اور ڈاکٹر فریدوں سے لپٹ جاؤں... لیکن اُسی لمحے ایک اور آواز سُن کر مَیں نے خود پر فوری قابو پا لیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، ڈاکٹر۔" بولنے والے کی آواز سے احساس ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر فریدوں کی طرح عمر رسیدہ نہیں ہے۔ "لیکن آپ کے کمپیوٹر کا ایک معمُولی سا نقص کتنے بڑے خطرے کا باعث بن گیا تھا۔ اگر اس شخص کی واپسی عمل میں نہ آتی تو شاید ہمیں اس سلسلے میں مزید تحقیقات ہی سے روک دیا جاتا۔"

"میرا حساب بالکل ٹھیک تھا، ڈاکٹر نوشیرواں۔" ڈاکٹر فریدوں کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "بس کمپیوٹر میں کوئی معمُولی سا نقص رہ گیا تھا۔ نہ جانے کمپیوٹر نے اسے کس زمان و مکاں میں لے جا پھینکا تھا۔ مَیں پچاسویں کوشش میں اسے واپس لا سکا ہُوں۔ یہ میری آخری کوشش تھی، اس کے بعد کمپیوٹر ناکارہ ہو جاتا اور پھر سرفروش کی واپسی کبھی ممکن نہ ہوتی، یہ نہ جانے کہاں کہاں بکھر جاتا۔ بہرحال، یہ جہاں کہیں بھی رہا ہے، اس نے بڑا ہی مصرُوف اور جدّوجہد سے بھرپُور وقت گزارا ہے۔ اس کی رنگت ہی بدل گئی ہے۔ تیز دھُوپ اور محنت و مشقت سے اس کا رنگ سنولا گیا ہے۔ اس کے جسم پر جابجا زخموں کے نشان اور خراشیں ہیں۔ خُدا جانے یہ کس عہد میں چلا گیا تھا، کس سرزمین پر رہا اور کیا کچھ کرتا رہا ہے۔"

"ہاں... جب یہ ہوش میں آئے گا تو بڑی ہی دلچسپ کہانی سُنائے گا۔" ڈاکٹر نوشیرواں کی جوان آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"اس طرح سائنس کی دُنیا میں ہماری دھاک بیٹھ جائے گی اور دُنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔"

"مَیں اپنے کمپیوٹروں کو از سرِ نو دیکھوں گا تاکہ وہ ہر قسم کی خامی سے پاک ہو جائیں۔" ڈاکٹر فریدوں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "مَیں سمجھتا ہُوں کہ ہم بہت جلد اسے حسبِ منشا، جہاں چاہیں گے بھیج سکیں گے اور یہ نوجوان ہمارے لیے ایک بہترین جاسوس کا کام سرانجام دے گا۔ اسے ہوش میں آنے دو پھر تحقیق کی ایک نئی راہ کھل جائے گی۔"

"یہ آتے ہُوئے کچھ مواد بھی ساتھ لایا ہے؟" ڈاکٹر نوشیرواں نے پُوچھا۔

"ہاں... اس کے قبضے سے کچھ سیاہ موتی برآمد ہوئے ہیں۔ مَیں نے انھیں تجزیے کے لیے بھیج دیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق یہ موتی کئی سو سال قبل مسیح کے کسی دَور میں پائے جاتے تھے کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں؟"

اُسی لمحے میرے شعور میں کچھ ہیولے چکرانے لگے اور مَیں بے ساختہ اُن کا نام لے لے کر پکارنے لگا۔

"تاشیرہ... سِلارد... جارل... کلانسی..."

مجھے اپنے ہونٹ کانپتے محسوس ہونے لگے اور مَیں نے بے خودی کے عالم میں کئی بار ان ناموں کو دُہرایا۔ اس وقت مَیں یہ بھی بھُول گیا کہ کہاں لیٹا ہُوا ہوں اور میرے قریب کون لوگ موجود ہیں۔

... اور جب مَیں ماحول سے آشنا ہُوا تو ڈاکٹر فریدوں کی خوشی سے کانپتی ہُوئی آواز سُنائی دی۔ "بہت خُوب! بہت خُوب! اسفرِدش! کیا تم ہوش میں آ گئے ہو؟"

مَیں نے بمشکل اپنے وزنی پپوٹے اٹھائے اور اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر خوشیوں کے دھنک رنگ بکھرے ہُوئے تھے۔

"کیا تم مجھے پہچان سکتے ہو، مَیں کون ہُوں؟" ڈاکٹر فریدوں نے میری طرف یوں دیکھتے ہُوئے محبت سے کہا جیسے کوئی خالق اپنی مخلوق کو فخریہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔

"ہاں۔ ڈاکٹر فریدوں۔ مَیں آپ کو پہچان سکتا ہُوں۔"

"آفرین... صد آفرین۔" ڈاکٹر نوشیرواں کی آواز سُنائی دی۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم آرام کرو۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا۔ "تمھارے جسم کو ہر امتحان سے گزارا جا چکا ہے صرف کھانے پینے میں ذرا احتیاط برتنا۔ جلد ہی تم سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔ تب مَیں تمھیں ایک زبردست خوش خبری بھی سناؤں گا۔"

"میرا خیال ہے، اسے کسی سرسبز علاقے میں منتقل کر دینا چاہیے۔" ڈاکٹر نوشیرواں نے کہا۔ "اس طرح اس کی ذہنی حالت جلد قابو میں آ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، مَیں اسے اسی محل نما عمارت میں بھجوا دیتا ہُوں جہاں مَیں تحقیقی کاموں کی منصوبہ بندی کرتا ہُوں۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا اور دونوں کمرے سے نکل گئے۔

مَیں چھت کی طرف گھُورتا رہا اور سوچتا رہا۔

تب مجھے پہلی بار احساس ہُوا کہ میرا ذہن سوچوں سے بالکل ہی خالی ہو گیا ہے۔ مَیں نے دماغ پر زور ڈالنے کی کوشش کی تو بھی یہ کیفیت برقرار رہی... کافی دیر بعد ایک ہیولا میرے ذہن کی اسکرین پر نمودار ہُوا اور رفتہ رفتہ واضح ہوتا چلا گیا۔

"لالہ رُخ... لالہ رُخ..." مَیں نے زیرِ لب کہا اور وہ حسین پیکر واضح تر ہوتا چلا گیا۔ تب مَیں اپنی محبوبہ لالہ رُخ کے نقش و نگار میں کھو گیا اور انوکھی لذتیں میرے احساسات میں گھلتی چلی گئیں۔

★★

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

رات زینہ زینہ اُتر رہی تھی اور چاند دھیرے دھیرے بلند ہوتا جا رہا تھا۔

مَیں ایک آرام دہ کمرے میں لیٹا ہُوا تھا جب سے اس محل نما قدیم عمارت میں مجھے منتقل کیا گیا تھا، میری حالت بڑی ہی عجیب سی ہو گئی تھی۔ مَیں سب کچھ سُن سکتا تھا، سب کچھ سمجھ سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں بیان کرنے کی صلاحیت کہاں کھو گئی تھی۔ دراصل میری قوتِ گویائی ہی نہیں ذہن بھی متاثر ہُوا تھا۔ وجوہ میرے لیے ناقابلِ فہم تھیں۔ صرف اتنا ہی دل کو سمجھا کر خوش ہو لیتا تھا کہ ڈاکٹر فریدوں جس انداز میں مجھ پر توجہ دے رہا ہے، اس سے مَیں جلد ہی نارمل ہو جاؤں گا۔

اس عمارت میں آئے ہُوئے مجھے پورا ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ اس دوران میں مجھ پر اَن گنت تجربے کیے گئے۔ لاتعداد طبی معائنے ہُوئے اور نہ جانے کتنی بار مجھے مختلف مشینوں کو امتحان دینا پڑا تھا۔ ایک ہفتے بعد میری حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی لیکن ذہن پر کبھی کبھی زبردست غبار چھا جاتا اور پھر ہر چیز دُھندلا جاتی تھی۔

مَیں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تختۂ گلاب پر چہل قدمی کرتے ہُوئے تین آدمی مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر فریدوں اور اس کا نائب ڈاکٹر نوشیرواں آگے آگے تھے اور دُم چھلے کی طرح ڈاکٹر جمشید ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی باتوں میں نہ تو حصّہ لے رہا تھا اور نہ ہی دلچسپی لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں اور نوشیرواں، انسان کو سالموں میں تقسیم کرنے اور پھر ان سالموں کو یکجا کر کے دوبارہ انسانی شکل میں لانے کی تھیوری پر بحث کر رہے تھے

جو میری فہم و ادراک سے بالاتر تھی... لیکن ایک بات میں اچھی طرح محسوس کر چکا تھا کہ وہ لوگ مجھے کمپیوٹر میں ڈال کر ایک بار پھر کسی نامعلوم دور میں بھیجنا چاہتے تھے۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور ان کی طرف سے توجہ ہٹالی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ کمپیوٹر میں خامی کے باوجود میرے معاملے یکجا ہو گئے تھے اور مجھے دوبارہ زندگی مل گئی تھی ورنہ میں ہمیشہ کے لیے ذرّوں کی شکل میں اس نامعلوم سرزمین پر بھٹکتا رہ جاتا جس کے تذکرے میں جدید دور کی تاریخی کتابیں بھی خاموش تھیں۔

چہل قدمی کرتے ہوئے وہ تینوں تختۂ گلاب کے آخری حصے میں پہنچ کر رک گئے۔ وہ تمباکو نوشی کرتے ہوئے چاندنی میں چمکتے دمکتے دریا کا نظارہ کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک تالاب میں ایک بطخ اپنی چونچ پروں میں دبائے سو رہی تھی۔ اس بطخ کو دیکھ کر مجھے اپنی لالہ رخ یاد آ گئی۔ ایسی ہی کانچ کی بنی ہوئی ایک نازک سی بطخ اس نے مجھے تحفے میں دی تھی جو اب بھی شاید میرے کمرے میں گول آئینے پر رکھی ہو گی۔ لالہ رخ یاد آئی تو میری بے چینیاں بڑھنے لگیں۔ بے اختیار جی چاہا کہ اڑ کر اس تک جا پہنچوں۔ اس کی شب رنگ زلفوں سے کھیلوں اور اس کی مہک چراؤں... لیکن یہ ایک ایسی خواہش تھی جس پر سنگین حالات کے پہرے تھے میں توقع کر سکتا تھا، خواہش کرنا میرے بس میں تھا لیکن اس کی تکمیل مقدر کے ہاتھ میں تھی جس کا رویّہ میرے ساتھ بڑا ہی ستم ظریفانہ تھا... میں نے تختۂ گلاب کی طرف دیکھا۔

وہ تینوں آہستہ آہستہ میرے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور یوں بن گیا جیسے گہری نیند میں ڈوبا ہوا ہوں۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے ڈاکٹر فریدوں کا وعدہ یاد آ گیا جس کے مطابق اسے یہاں پہنچتے ہی مجھے کوئی خوش خبری سنانا تھی لیکن یا تو وہ بھول گیا تھا یا پھر ابھی وہ خوش خبری سنانے کا وقت ہی نہیں آیا تھا۔

ڈاکٹر فریدوں کا رویّہ اب میرے ساتھ بے حد محبت آمیز تھا لاشکانی عہد سے واپسی پر نہ جانے مجھ میں سرخاب کا کوئی پر لگ گیا تھا کہ اچانک ڈاکٹر فریدوں کا لہجہ ہی بدل گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھول گیا ہو کہ مجھ پر قتل کا الزام ہے اور میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ موقع ملتے ہی اس سلسلے میں ڈاکٹر فریدوں سے ضرور بات کروں گا۔ فی الحال میرے لیے یہی کافی تھا کہ میں اس عمارت سے نکل کر قدیم طرز کے اس محل میں آ گیا تھا ورنہ اس عمارت کا قانون تو یہ تھا کہ وہاں داخل ہونے والا کبھی واپس نہیں جا سکتا جب اتنی گنجائش نکل آئی ہے تو مزید گنجائشیں خود بخود نکل آئیں گی۔ اس اُمید پر میری دھڑکنیں خوش گوار ہو گئیں۔

معاً ان کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔

وہ کمرے میں آئے اور بیٹھ گئے۔

غالباً انھوں نے میری طرف دیکھا تھا لیکن مجھے گہری نیند میں ڈوبے پاکر آپس میں باتیں شروع کر دی تھیں۔ مجھے انھی باتوں سے دلچسپی بھی تھی اور میں انھیں سننے کے لیے ہی دکھاوے کی نیند خود پر طاری کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"ڈاکٹر فریدوں، آپ نے سرفروش کے حافظے کو وسعت دینا کیوں ضروری سمجھا؟" نوشیرواں نے سوال کیا۔

جواباً فریدوں ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔ میری سماعت سے اس کی خوش گوار آواز ٹکرانے لگی۔

"جب ہم نے اسے کسی نامعلوم عہد میں منتقل کیا تو اس کی یادداشت بہت کمزور ہو گئی۔ اس کا حافظہ درحقیقت کمپیوٹر کے مرحلے سے گزرتے وقت ہی کمزور ہو گیا تھا یا کسی پُراسرار سرزمین پر پہنچنے کے بعد ایسا ہوا تھا، حد تو یہ ہے کہ اسے خود بھی یاد نہیں۔ بہرکیف اس کی یادداشت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ واپسی میں اس نامعلوم سرزمین کی بہت تھوڑی اور وہ بھی بے حد دھندلی یادیں رہ گئی تھیں۔"

"پھر آپ نے کیا کیا، ڈاکٹر؟"

"میں وہی بتانے والا تھا۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ ہماری اس جدوجہد کا مقصد علم اور خزانوں کا حصول ہے۔ وہ علم جو امتدادِ زمانہ کے باعث ختم ہو گیا اور وہ بیش بہا خزانے جو ہماری زمین میں دفن ہیں لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کہاں دفن ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ سرفروش کے پہلے سفر میں ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ فائدہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ وہاں جا کر جو کچھ دیکھے اسے سیکھے اور پھر ذہن میں محفوظ بھی رکھے۔"

"آپ نے یادداشت بڑھانے کے لیے اسے کیا دیا ہے؟"

"جدید ترین دوا پیٹی لینی ٹیٹرازول۔ یہ دوا دماغی خلیوں کو اچھے معنوں میں متاثر کرتی ہے۔ تم یہ جان کر یقیناً خوش ہو گے کہ چند روز میں سرفروش نہ صرف ایک خودکار حافظے کا مالک ہو گا بلکہ اس کے حافظے کو یادیں محفوظ رکھنے کے لیے ایک فالتو ذخیرہ گاہ بھی فراہم کی جا رہی ہے۔ اب یہ جس بھی دور میں جائے گا، وہاں اسے کچھ یاد رکھنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی بلکہ سب کچھ خود بخود ذہن نشین ہوتا جائے گا۔ اس کا کام صرف اتنا ہو گا کہ یہ اپنی بقا کے لیے حالات کا مقابلہ کرتا رہے۔ واپسی پر ہم اس کے ذہن سے وہ ساری معلومات یوں برآمد کر لیں گے جیسے بوتل سے گلاس میں کوئی مشروب انڈیل لیا جاتا ہے۔"

"بہت خوب، ڈاکٹر فریدوں۔ مرحبا، مرحبا۔" دونوں معاون سائنس داں بیک وقت بولے اور ڈاکٹر فریدوں کا فاتحانہ قہقہہ پورے کمرے میں گونجنے لگا۔

"میں سرفروش کی کارکردگی سے بے حد مطمئن ہوں۔" کچھ دیر بعد ڈاکٹر فریدوں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ابھی تک سویا ہوا ہے خیر جب جاگے گا تو میں اسے ایک خوش خبری سناؤں گا۔"

"وہ کیا، ڈاکٹر؟" ڈاکٹر جمشید نے میرے دل کی بات پوچھی۔

"اس پر قتل کا جو الزام تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ دراصل سرفروش ایک دیانت دار آدمی ہے۔ حریفوں نے اسے اپنی راہ پر لگانے کی کوشش میں ناکامی کے بعد اس خوف سے اسے ہلاک کروانا چاہا کہ کہیں یہ ان کے مقابل نہ آ جائے۔ اس کے کلب میں جس شاگرد کی لاش پائی گئی تھی، اسے سیمرغ کلب کے ایک نوجوان نے قتل کیا تھا۔ بعض اختلافات کے باعث وہ نوجوان معتوب ہو گیا تو اس نے قانون کی پناہ حاصل کی اور پھر سب کچھ ظاہر کر دیا۔ سیمرغ اگرچہ مفرور ہے لیکن اس کے بعض ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں۔ انھوں نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ سرفروش قاتل نہیں ہے۔"

یہ سن کر میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ مجھ پر شادیِ مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی اور میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ "کیا یہ سب کچھ سچ ہے، ڈاکٹر... یا میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہا تھا؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے تو میری اس مداخلت پر وہ تینوں ہکا بکا رہ گئے... پھر ڈاکٹر فریدوں نے مسکرا کر تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ سچ ہے، جانِ فریدوں۔" اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ "اور اصل خوش خبری یہ ہے کہ میں نے تمھارے بارے میں شہنشاہ سے خصوصی اجازت نامہ بھی حاصل کر لیا ہے۔"

"وہ کس سلسلے میں؟" میں نے حیرانی ظاہر کی۔

"لالہ رخ..." اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کیا تم اس سے ملنا نہیں چاہتے۔ وہ بے چاری تمھاری تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ بہرحال، آج رات تمھارا ایک خصوصی آپریشن ہو گا۔ اس کے تین روز بعد تم کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہو گے... لیکن اس آزادی کا مطلب کہیں یہ نہ لے لینا کہ تم ہمیں دھوکا دے کر کہیں فرار ہو جانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہمیں جب بھی تمھاری ضرورت پڑے گی صرف ایک لمحے میں تم خود بخود ہمارے پاس پہنچ جاؤ گے۔"

"لیکن جب قانون نے مجھے بے گناہ قرار دے دیا ہے تو مجھ پر آپ کی پابندیاں بھی ختم ہو جانا چاہئیں۔ اب یہ میری مرضی پر منحصر ہونا چاہیے کہ میں آپ کے لیے کام کروں گا یا نہیں۔"

"ایسا نہیں ہے، سرفروش۔" ڈاکٹر فریدوں یکایک بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ "باہر کے قانون اور میری تجربہ گاہ کے قوانین میں فرق ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ اس تجربہ گاہ میں داخل ہونے والے کے لیے باہر کیا تحریر کیا گیا ہے؟"

میں ایک طویل سانس لے کر مسکرانے لگا۔

"ڈاکٹر..." میں نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یہ زندگی تمھاری ہی مرہونِ منت ہے۔ اسے جس طرح چاہے استعمال کرو۔ میں کبھی اف بھی نہیں کروں گا۔ اگر اس روز میری زندگی کا آخری باب بند ہو جاتا تو آج یہ سب کچھ سوچنے اور کہنے کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"میں تمھارا خوب جائزہ لے چکا ہوں، سرفروش!" ڈاکٹر فریدوں کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔ "تم ایک بے مثال نوجوان ہو۔ یہ میری ہی نہیں ماسٹر کمپیوٹر کی بھی رائے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر بار ان گنت پرسنل فائلز میں سے صرف تمھارا ہی کارڈ منتخب کرتا ہے۔"

"گویا میری خوبیاں اور صلاحیتیں ہی میری دشمن بن گئی ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا اور ان تینوں کی مسکراہٹیں بھی گہری ہوتی چلی گئیں۔

"بس اب تم آرام کرو۔ جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر کے نہیں، حقیقی آرام۔ تمھیں آج ایک نازک آپریشن سے گزرنا ہے۔" ڈاکٹر فریدوں نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

مارے خوشی کے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ میں اپنے دل کی بے چین دھڑکنیں سنتا رہا، جو لالہ رخ کے قدموں کی دبی دبی آہٹیں معلوم ہو رہی تھیں۔

●

رات پر روپ کی رُت اُتر آئی تھی۔

آسمان لالہ رخ کی خوبصورت نیلی آنکھوں کی طرح صاف تھا۔ چار سو چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور ہوائیں نہ جانے کہاں جا کے سو گئی تھیں لیکن خوشبو جاگ رہی تھی... اور خوشبو اس لیے جاگ رہی تھی کہ میں اور لالہ رخ معطّر کے خوشبودار پودوں کے درمیان

پاس پاس لیٹے ہوئے تھے۔ میں بڑی آسودگی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کروٹ لے کر لالہ کی طرف دیکھا۔ وہ باہوں کا تکیہ بنائے یوں چپ چاپ اور ساکت لیٹی ہوئی تھی جیسے کسی طلسم نے اسے مرمریں مجسمے میں تبدیل کر دیا ہو۔

ہر مرد کو اپنی محبوبہ دُنیا کی سب سے زیادہ حسین لڑکی نظر آتی ہے لیکن لالہ کا حسن تو ویسے ہی بے پناہ تھا۔ یہ اچھا ہی تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں موند رکھی تھیں ورنہ جب وہ مجھے متوجہ پاتی تو مسکراتے ہوئے اپنے نچلے ہونٹ کا بایاں کونا دانتوں تلے دبا لیتی۔ تب اس کی یہ ادا میرے لیے بڑا ہی پُرلطف لیکن دُشوار امتحان بن جاتی میرا خون مجھے آنچ دینے لگتا اور وہ میری اس کیفیت کا لطف لینے کے لیے کہتی۔

"آؤ جان! وہ باتیں کریں جو شاعر ہمارے لیے کر چکے ہیں۔"

وہ کسی خوبصورت شعر کا ایک مصرعہ سناتی اور اس کے جواب میں مجھے بھی کسی شعر کا مصرعہ سنانا پڑتا۔ "مصرعے بازی" کا یہ شغل اسے بے حد پسند تھا اور قربت کے خوش گوار لمحوں میں ہم اکثر یہ کھیل بھی کھیلا کرتے تھے۔

ان لمحوں میں ڈاکٹر فریدوں اور اس کی مہم کا خیال میرے لیے بڑا ہی سوہانِ رُوح ثابت ہونے لگا تھا۔ مجھے لالہ رُخ کے پاس آئے آج چوتھی شب تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے ہم ابھی ایک لمحے قبل ہی ایک دوسرے سے ملے ہوں۔ ڈاکٹر فریدوں نے وعدے کے مطابق میرا آپریشن کر دیا تھا۔ یہ آپریشن درحقیقت مجھے ماسٹر کمپیوٹر سے مستقل طور پر وابستہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اب کمپیوٹر کو جب بھی میری ضرورت پڑتی، وہ مجھے فی الفور تحلیل کر کے اپنے رلیسیونگ سیٹ میں بُلا سکتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر نے مجھے اتنی فراخ دلی سے لالہ رُخ کے ہاں آنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ گویا میں اب ایک آزاد قیدی تھا۔ میں نے ان خیالوں کو ذہن سے دھکیل دیا اور لالہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو کچھ خاموش اور رُوٹھی رُوٹھی سی لگ رہی تھی۔

"آؤ لالہ... وہ باتیں کریں جو شاعر ہمارے لیے کر چکے ہیں۔" میں نے کہا اور پھر یہ مصرعہ سنایا۔ "میرے دل کی آگ، تیرا رنگ رُوپ!"

اس نے نہ آنکھیں کھولیں اور نہ ہی میری طرف کروٹ لی بلکہ اس نے تو اپنا نرم و نازک ہاتھ بھی میری طرف نہیں بڑھایا اور رُوکھے پھیکے لہجے میں یہ مصرعہ سنا دیا۔ "محبتوں کے مہکتے گلاب راکھ ہوئے!"

مجھے اس سے اس جواب کی توقع نہیں تھی کیونکہ وہ ہمیشہ ایسے مصرعے سنایا کرتی تھی جن میں اس کا پیار جھلکتا اور دل دھڑکتا تھا۔ مجھے اس کے ردِ عمل اور اس جواب نے چونکا دیا۔ میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے لالہ جان۔ تم نے ایسا جواب کیوں دیا؟"

اس نے ایک جھرجھری سی لے کر آنکھیں کھول دیں اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "تاشیہ کون ہے؟"

"تاشیہ؟" میں ذہن پر زور دے کر سوچنے لگا لیکن مجھے ایسا کوئی نام یاد نہ آسکا۔ آسمانی دورے سے واپسی کے بعد میرے حافظے پر جو گہری دھند سی چھا گئی تھی، کبھی کبھی کوئی یاد اس دھند میں جگنو کی طرح چمکتی اور پھر اُسی اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر فریدوں نے بتایا تھا کہ گزرے دنوں کی یادیں میرے حافظے کی تحویل سے نکل گئی ہیں اور میرا ذہن انھیں دوبارہ نہیں سمیٹ سکے گا۔ میں اپنے ذہن پر بہت زیادہ زور ڈال کر حافظے کی راکھ کریدنے میں کامیاب ہو جاؤں، تب بھی یاد کی کوئی ایک آدھ چنگاری ہی نکلے گی اور چشم زدن میں بجھ جائے گی۔

میں نے تاشیہ کے لیے حافظے کی راکھ کریدی تو میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ شعور اور لاشعور کی درمیانی منزلوں میں ایک لڑکی کا ہیولا اُبھرا، جس کا حسن وحشی تھا اور رنگت سونے جیسی تھی۔ اس دہکتی ہوئی لڑکی کی باہنیں میرے گلے کی زنجیر بنی ہوئی تھیں... پھر وہ چہرہ، وہ آنکھیں، وہ باہنیں اور وہ لڑکی دھند میں غائب ہو گئی میرے ذہن کی تختی پر کوئی نقش اور کوئی تصویر باقی نہ رہی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، سرفروش!" لالہ رُخ نے مجھے خیالوں میں غرق دیکھ کر بے چینی سے پوچھا تو میں چونک پڑا۔

'سرفروش...' وہ تو ہمیشہ مجھے پیار سے سرفی کہا کرتی تھی مگر آج وہ دن بھر مجھے سرفروش کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی مجھے سرفی کہہ کر نہیں پکارا تھا، کیوں؟... مگر میں نے اس سے یہ پوچھنے کی بجائے کہا۔ "میں کسی ایسی ہستی کو نہیں جانتا جس کا نام تاشیہ ہو... تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

لالہ اسی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی... پھر اس نے مجھے ہٹا کر منہ پھیر لیا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟... وہ تو مجھ پر ہمیشہ مہربان رہتی تھی... پھر اچانک یہ بے رُخی کیوں؟ میں سوچتا اور اُلجھتا رہا۔

"ایسا مت کرو، لالہ! مجھے پاگل مت بناؤ۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"پاگل تو تم نے مجھے بنایا ہے، سرفروش۔" وہ پلٹتے ہوئے بولی۔ "تم نے مجھے دھوکے میں رکھا ہے۔ میں تم سے اس سلوک کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ ہم نادان بچے نہیں ہیں جو ایک دوسرے کو جھوٹی باتوں سے بہلاتے رہیں۔ اگر تم نے کسی دوسری عورت کو

اپنے دل میں سجا لیا ہے تو صاف صاف بتا دو۔ میں تمھارے پاؤں کی زنجیر نہیں بنوں گی۔ تمھارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گی۔" وہ جذبات کی رَو میں نہ جانے کیا کیا بولتی چلی گئی۔

"بس، چپ ہو جاؤ لالہ۔ میں نے تمھیں دھوکا نہیں دیا اور میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر تاشیہ کسی عورت کا نام ہے تو میں اُسے نہیں جانتا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔ لیکن یہ نام آتے ہی میرے ذہن میں پھر ایک جھماکا سا ہوا اور چشم زدن میں ایک کُندنی سراپا لہرا گیا۔

لالہ کچھ نہ بولی۔ بس میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ میری زبان تو جھوٹ بول سکتی ہے لیکن میری آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ آنکھیں ہمیشہ سچ کہتی ہیں۔ میں نے اُسے بازوؤں کی دیوار میں چُن دیا تو وہ چیخ اُٹھی۔ "اُف... ایسا نہ کرو سرفی! میرا دم گھٹ جائے گا۔" اس نے آج پہلی بار مجھے سرفی کہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے، جان!" میں نے بازوؤں کی دیواروں کو وسعت دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمھیں بتانا پڑے گا کہ یہ سب کیا چکر ہے؟"

"اچھی بات ہے۔" لالہ نے کہا۔ "ہو سکتا ہے، یہ ایک خوابِ پریشان ہو اور جذبۂ رقابت نے مجھے ایسا سمجھنے پر مجبور کر دیا ہو... مگر لگتا ہے کہ تمھارے پیار نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا... لیکن پھر بھی دل اس خیال سے لرز اُٹھتا ہے کہ تم کسی دوسری عورت کو چاہ سکتے ہو۔ کل رات میری آنکھ کھل گئی۔ اس کا باعث تمھاری وہ باتیں تھیں جو تم خواب میں کر رہے تھے۔ تم نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی جگہ تاشیہ کے لیے خالی کر دوں اور یہ کہتے ہوئے تم نے مجھے پرے دھکیل دیا۔ پھر تم نے تاشیہ کو آواز دی اور اسے اپنے قریب بٹھا لیا... پھر... پھر..."

وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور رونے لگی۔

میں نے لالہ کی طرف دیکھا۔ میرا دل جو طوفانوں سے ٹکرانے کی ہمت رکھتا ہے، لالہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ میں نے جلدی سے اُس کے آنسو پونچھے اور بولا۔ "تم نے مجھے جگایا کیوں نہ دیا، پگلی!"

"میں نے کوشش کی تھی مگر ایسا نہ کر سکی۔ میں تم سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ تم بے حد طاقت ور ہونے کے باوجود میرے لیے اپنے دل میں نرمی ہی نرمی رکھتے ہو لیکن کل رات تم آدمی نہیں، وحشی بن گئے تھے۔ تمھیں اس عالم میں دیکھ کر مجھے تم سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں تم سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ تمھیں چھوڑ کر دُور کھڑی ہو گئی اور وہ باتیں سُنتی رہی جو تم تاشیہ سے کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے تماشا دیکھتی اور سسکتی سُلگتی رہ گئی۔

جب لالہ یہ بتا رہی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ اسی سائنسی عمل کے نتیجے میں تو نہیں ہوا جو ڈاکٹر فریدوں کچھ عرصے سے مجھ پر کرتا رہا ہے۔ میرا ذہن تو ایک بند مقبرہ بن گیا تھا۔ اگر کل رات اُس میں ایک دراڑ پڑی ہے یا کوئی روزن کھلا ہے تو پھر اس میں مزید دراڑیں بھی پڑ سکتی ہیں اور بہت سے روزن بھی کھل سکتے ہیں۔ تب میں لالہ کو کیا جواب دُوں گا جو میرے لیے دُنیا کی سب سے زیادہ عزیز ہستی ہے۔ تاہم میں نے لالہ سے کہا۔ "مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو لالہ۔ کیا میں ایسا گھٹیا ہو سکتا ہوں؟ کیا تم مجھے اتنا ہیچ سمجھتی ہو؟ یہ صرف ایک خواب تھا، جاناں... اور خواب بھی میرا نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی اور کا خواب تھا جو میں نے دیکھ لیا ہے۔"

"ہاں، یہ خواب ہی ہو گا لیکن اس نے میرے ذہن میں اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں۔" لالہ بولی اور کچھ سوچنے لگی۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت نہ مجھے چاند اچھا لگ رہا تھا اور نہ ہی جھلملاتے ہوئے ستارے... میں نے دل ہی دل میں ڈاکٹر فریدوں کو اور اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ اس معاہدے پر لعنت بھیجی جس کے تحت میں زندگی کے آخری لمحے تک کمپیوٹر کا پابند تھا۔ آفیشل سیکرٹ ایکٹ نے مجھے ہمہ تن چشم تو بنا دیا تھا مگر میرے ہونٹوں پر مہر لگا دی تھی۔ اگر میں اس تجربے اور اپنے کام کے بارے میں ذرا سی بات بھی ظاہر کرتا تو فوری موت میرا مقدر بن سکتی تھی۔ میں انھی سوچوں میں غلطاں تھا کہ لالہ کی آواز سُن کر چونک پڑا۔

"چند ماہ پہلے تک تم مجھے شادی کی زنجیروں میں جکڑنے پر بضد تھے اور میں اس لیے رضامند نہیں ہو رہی تھی کہ میں تمھیں اچھی طرح نہیں جان پائی تھی۔ خود اپنے بارے میں بھی مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ واقعی میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں اور جب مجھے محسوس ہوا کہ میں تمھارے بغیر ادھوری ہوں تو تم نے مجھ سے شادی کے لیے کہنا ہی چھوڑ دیا... پھر تم طویل وقفے کے لیے غائب ہو گئے اور جب واپس آئے تو تمھارے چہرے پر خراشوں اور جسم پر زخموں کے نشان تھے۔ تمھاری نگاہوں سے اجنبیت جھلکتی تھی۔ ان ساری باتوں کے باوجود تم مجھ سے وہی پہلی سی محبت چاہتے

ہو اور میں تمھیں تمھاری طلب سے کہیں زیادہ محبت دے چکی ہوں۔ میں شعوری طور پر ایسا نہیں کرتی۔ میرا دل اپنے آپ ہی تم پر دیوانہ وار نچھاور ہونے لگتا ہے . . لیکن میں جانتی ہوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں عورت ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں اور ایسے شوہر کی آرزو مند ہوں جسے میں روز دیکھ سکوں جس کی ہر شب میری ہو لیکن تم نے مجھے اتنا بھی نہیں بتایا کہ کلب بند کرنے کے بعد اب تمھارا وسیلۂ رزق کیا ہے؟"

میں جو اتنی دیر سے چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا، بول پڑا: "تم جانتی ہو لالہ کہ میں بعض ایسی خوبیوں کا مالک ہوں جو عام مردوں میں نہیں پائی جاتیں۔ بس یہی سب کچھ میرا دشمن ہو گیا ہے۔"

لالہ نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا اور بولی: "مجھے بہلاوے مت دو، سرفردش! میں اس کام کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں جو تم حقیقت میں کرتے ہو۔ دکھاوے کا نہیں، اصلی کام . . . تم نے اپنے آپ کو جس ادارے سے وابستہ ظاہر کیا ہے۔ وہ ایک پردہ اور ایک آڑ ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کافی چھان بین کی ہے لیکن کچھ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ . . آخر کیوں؟"

میں نے لالہ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس لیے کہ کوئی جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر پھر آنکھیں موند لیں اور کروٹ بدل لی۔ دوسرے لمحے مجھے ایک گداز بوجھ محسوس ہوا اور لالہ کی میٹھی سرگوشی سنائی دی: "سرفی . . . اگر تم کوئی سیکرٹ ایجنٹ ہو، انتہائی خفیہ اور خطرناک کام سرانجام دیتے ہو تو مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟ میں تم سے جدا تو نہیں، تمھارا ہی حصہ ہوں اور تمھارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ مجھے اشاروں ہی میں بتا دو۔"

"میں نہیں بتا سکتا لالہ! کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

"اچھا میرے سوالوں کا ہاں یا نہیں میں جواب دیتے جاؤ۔"

"میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں، جاناں!"

وہ خاموش ہو گئی تو میں نے بھی خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ میں ابھی تک نرم نرم بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور دبا ہی رہنا چاہتا تھا کہ دور کہیں پپیہا بول اٹھا۔ خاموشی ٹوٹی تو لالہ بولی: "اچھا سرفی! میں تمھیں مجبور نہیں کرتی۔ مجھ سے شادی کر لو۔ آج ابھی اسی وقت اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھارے لیے کبھی سد راہ نہیں بنوں گی۔ بولو منظور ہے؟"

لالہ سے شادی میری آرزو تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ایک گھر کے اور ننھے منے کلکاریاں مارتے ہوئے بچوں کے خواب دیکھے تھے لیکن اب یہ سب کچھ ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ میری زندگی جس راہ پر چل رہی تھی، وہ موت کا راستہ تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ آنسو بھری آنکھوں سے میرا انتظار کرے اور یہ آنسو اس کا مقدر ہی بن جائیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جواب دیا: "میں شادی نہیں کر سکتا۔"

"تم شادی کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے؟" وہ چیخ پڑی۔

اس سے پہلے کہ میں لالہ کو کوئی جواب دیتا، فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ لالہ نے اٹھتے ہوئے کہا: "میں کسی فون کال کی متوقع نہیں۔ یہ کال میری نہیں ہو سکتی۔"

"مجھے اس کی توقع تھی۔" میں نے جواب دیا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر ہٹ کی طرف دوڑنے لگا۔ جہاں فون کی گھنٹی مسلسل چیخے جا رہی تھی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس پر بولا: "ہیلو . . ."

"ہیلو برخوردار۔" ڈاکٹر فریدوں کی آواز سنائی دی۔ "معاف . . . ٹھیک ٹھاک ہیں، نا؟"

"شاید اب سدھر جائیں۔" میں نے لالہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جو پلنگ پر بیٹھی، ٹھوڑی کو ہتھیلیوں کے پیالے میں رکھے مونالزا کی طرح مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے، میں نے دخل در معقولات نہیں کی ہو . . ." ڈاکٹر کے لہجے میں شرارت تھی۔

"اگر باہمی جھگڑے کو آپ معقولات کہتے ہیں تو آپ نے یقیناً دخل دیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اب بھی میری آنکھیں لالہ کو اور اس کی آنکھیں مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔

"تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔ تمھیں علی الصباح واپس آنا ہے۔"

"بہتر جناب! پہنچ جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا اور (ریسیور) رکھتے ہوئے لالہ سے نگاہیں چرا لیں۔ میں اس کے چہرے پر اداسی اترتے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اب اس کی آنکھیں مجھ سے نہیں ہٹیں گی۔

"کہیں جانا ہے ہو، جاناں؟"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے کب تک انتظار میں سلگنا ہو گا؟" اس نے پھر سوال (کیا)۔

"میں نہیں جانتا لالہ . . میرے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی (ذریعہ) بھی نہیں ہے۔" میں نے الماری سے کپڑے نکال کر چھوٹے سوٹ کیس میں رکھنے شروع کر دیے۔

میں اسے کیسے بتا سکتا ہوں، وہ آگے بڑھ کر انھیں للکارتے، آ سکوں۔ اگر میں اسے بتا دیتا کہ تب۔ میں نے سوچا کہ فریق مخالف بھیجا جا رہا ہے اور میری واپسی کے لمحے پر اپنے حصار سے نکل آنے ہو جاتی یا پھر مجھے دیوانہ سمجھتی۔ تاہم انتہا نہ رہی کہ فصیل کا بڑا پھاٹک کہا۔ "کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں لالہ! ر یادہ جنگجو نکلے اور حملہ آور ل . . . کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔" شں نعرے لگائے اور ان

"سرفی! میری طرف دیکھو۔" اس نے بد یکھتے کشتوں کے پشتے

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بازو دلیہ آگے میں آنسو لیے کھڑی تھی اور اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔ اگر اس وقت وہاں کوئی دیکھنے والا ہوتا تو وہ اس ملاپ کو غیر منکلم فلموں کا کوئی ایسا منظر سمجھتا جس میں کچھ کہے بغیر ہی سب کچھ کہہ دیا جاتا تھا۔

● پو پھٹے میری کار اسی قلعہ نما عمارت کے دروازے پر پہنچی تو باہر ہی میں نے ڈاکٹر فریدوں کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے یخ بستہ ہوا سے بچاؤ کے لیے چمڑے کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور سگار کی بجائے پائپ پی رہا تھا۔ آج وہ عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: "اس کام سے نجات کا بھی کوئی طریقہ ہے جناب؟"

"ہاں . . . ایک ہی طریقہ ہے . . . اور وہ ہے موت۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

میں خاموش ہو گیا۔ وہ غالباً رات بھر کام کرتا رہا تھا اس لیے بے حد تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ تھکن تو مجھے بھی ہو رہی تھی لیکن میرے کام کی نوعیت ڈاکٹر سے مختلف تھی۔ تجربہ گاہ پہنچ کر میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بوڑھا، کبڑا اور لنگڑا سائنسداں آج ایک مخصوص سفید لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ مختلف کمروں سے گزرتے ہوئے ان چھوٹے چھوٹے کمپیوٹرز کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا جن سے مختلف اقسام کی آوازیں آ رہی تھیں یعنی کمپیوٹر کے اسپیکر سے وان ہو . . . وان ہو . . . ون ہو اور کسی سے پی، ہاپ، پا، ہاپ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

بالآخر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے جہاں کمپیوٹر نمبر میرا منتظر تھا۔ میں پہلے سفر کے بعد آج دوسری بار اس کمرے میں آیا تھا۔ مجھے اس کمرے میں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دی۔ وہی مشین تھی اور مختلف رنگوں کی وہی ان گنت تاریں تھیں جو کسی سوراخ سے مشین کے اندر جا رہی تھیں اور کسی سوراخ سے باہر آ رہی تھیں۔ بیسیوں چھوٹے چھوٹے بلب جل بجھ رہے تھے اور اس گورکھ دھندے کے بیچوں بیچ فرش کے ایک مربع نما ٹکڑے پر ربڑ کی

دیکھا جن میں سے کچھ کرچیاں میری کمین گاہ کے قریب آ گری تھیں میں نے ایک بار پھر فصیل اور میدان جنگ پر نظر ڈالی۔ فصیل پر دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور حملہ آوروں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ وہ چیختے چلاتے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

گولے کی وہ کرچیاں جو میری کمین گاہ سے کچھ فاصلے پر گری تھیں، اب تک چمک رہی تھیں اور ان کی یہ چمک بڑی دل آویز تھی۔ میں جذبۂ تجسس کے تحت اپنی پناہ گاہ چھوڑنے اور ان کی طرف بڑھنے پر مجبور ہو گیا اور جب میں نے ایک کرچی اٹھا کر دیکھی تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ نہایت عمدہ قسم کے ملتے اس ٹکڑا تھا۔ مجھے اس کی پہچان اس لیے تھی کہ میرے والد میں کئی بنیادی تبدیلیاں نے کا جنون تھا مگر میں نے ان کے ذخیرے میں پیتت تھا جبکہ یہ کم از کم نہیں دیکھا تھا۔ وہ اتنا شفاف تھا کہ اس میں جواباً خاموش لہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرے لیے کرنا میرے لیے ممکن بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اتنا قیمتی پتھر گولے

تھوڑی دیر بعد مجھے شیشے کے ٹوٹے ٹکڑا دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اور بوڑھا سائنسداں میرے جسم پر ٹیپ کی مدد سے کا وہ ٹکڑا دہیں چپکنے کرنے لگا۔ یہ الیکٹروڈ سیاہ سانپ کے پھن سے مشابہ استعمال کرتے ہیں تھے۔ اس نے یہ کام مکمل کرنے کے بعد اپنی زردی مائل بھور سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: "آج تم پچھلی مرتبہ سے زیادہ گھبرائے ہوئے دکھائی دے رہے ہو، سرفردش۔ کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟"

مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے کہا: "آپ کا خیال ٹھیک ہے جناب۔ پہلے سفر میں کمپیوٹر نے کچھ گڑبڑ کر دی تھی اور سب کچھ اتنی تیزی سے عمل میں آ گیا تھا کہ مجھے گھبرانے کا وقت ہی نہیں ملا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے کہاں منتقل کیا جا رہا ہے۔"

اس نے میرے شانے تھپ تھپاتے ہوئے جواب دیا: "اب بھی تم نہیں جانتے کہ اس بار تمھیں کہاں بھیجا جا رہا ہے لیکن تمھیں گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس مرتبہ ہر چیز اور ہر عمل کی پہلے سے آزمائش کر لی گئی ہے اور کسی غلطی یا حادثے کا امکان باقی نہیں رہا۔ وقت آنے پر میں تمھیں خود ہی واپس بلاؤں گا۔"

"میں تیار ہوں جناب!" میں نے کہا: "آپ اپنا کام کیجیے۔"

ڈاکٹر فریدوں نے کوٹھ سے نکل کر دروازہ بند کیا اور ایک سوئچ پر انگلی رکھ دی۔ پچھلی مرتبہ مجھے اس مرحلے سے گزرتے ہوئے شدید تکلیف ہوئی تھی اور میں درد کی شدت سے بلبلا اٹھا تھا۔ یوں

ہو اور میں تمھیں تمھاری طلب سے کہیں زیادہ محبت دے چکی ہُوں۔ میں شعوری طور پر ایسا نہیں کرتی۔ میرا دل اپنے آپ ہی تم پر دلوازدار نچھاور ہونے لگتا ہے ... لیکن میں جانتی ہُوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں عورت ہُوں۔ میں شادی کرنا چاہتی ہُوں۔ بچوں کی ماں بننا چاہتی ہُوں اور ایسے شوہر کی آرزُو مند ہُوں جسے میں روز دیکھ سکوں جس کی ہر شب میری ہو لیکن تم نے مجھے اتنا بھی نہیں بتایا کہ کلب بند کرنے کے بعد اب تمھارا وسیلۂ رزق کیا ہے ؟"

میں جو اتنی دیر سے چُپ چاپ اُس کی باتیں سُن رہا تھا، بول پڑا "تم جانتی ہو لالہ کہ میں بعض ایسی خوبیوں کا مالک ہُوں جو عام مَردوں میں نہیں پائی جاتیں۔ بس یہی سب کچھ میرا ذریعۂ معاش بن گیا ہے ؟"

لالہ نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا ... "مجھے بہلاوے مت دو، سرفروش! میں اُس ... میری انتڑیاں نیلے اور گلابی ہوں۔ جو تم حقیقت میں کہتے ہو ... مجھے خود اپنا ہی ایک تم نے اپنے آپ کو جس ... دکھائی دیا جس نے برق رفتاری سے میرے اور ایک آڑ ... میں درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا۔ شاید میری لیکن کچھ معلوم ... پاش ہو گئی تھی۔

★★

جواب ... میں نے اپنے آپ کو اوندھے منہ ایک چٹان پر لیٹے ہُوئے پھر اُس میں دھوپ کی تمازت باقی تھی حالانکہ اردگرد پڑے پتھروں کے سائے بہت طویل ہو گئے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ سُورج غروب ہونے والا ہے۔ میں کسی نونائیدہ بچے کی حالت میں ساکت پڑا تھا اور مارے خوف کے سانس بھی آہستہ آہستہ لے رہا تھا۔ کمپیوٹر نے دوبارہ مجھے جہانِ قدیم میں بھیج دیا تھا اور یہ سرزمین پُرخطر بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ مجھے بے حد احتیاط سے کام لینا تھا اور میرے لیے کسی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میں نے سر اُٹھائے یا اِدھر اُدھر گھمائے بغیر ہی ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا اور دیکھا کہ یہ ایک پیالہ نما سطحِ مُرتفع ہے۔ میرے گِرد و پیش بڑے بڑے پتھر اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں سر اُٹھائے کھڑی ہیں۔ میں جس چٹان پر لیٹا ہُوا تھا، وہ خاک آلود تھی۔ میں نے تھوڑی سی خاک سمیٹی اور اُسے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا۔ یہ بہت باریک اور قدرے سیاہی مائل تھی۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے ہَوا اس پیالہ نما سطحِ مُرتفع پر بگولے کی طرح گھوم رہی ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ ہَوا کسی درّے سے داخل ہوتی ہے اور اردگرد کی چٹانوں سے ٹکرا کر گھومتی ہُوئی اُوپر چلی جاتی ہے۔ ہَوا

گھر کے اور ننھے مُنّے ... کلکاریاں ... میری آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ اس ... دیکھے تھے لیکن اب یہ سب کچھ ... گیا۔ پہلے چند لمحوں تک مجھے کچھ سُنائی ... جس راہ پر چل رہی تھی وہ موت ... پر آنے والی آوازیں بھی میری ... کہ وہ آنسو بھری آنکھوں سے ... ہی عجیب آوازیں تھیں۔ ان میں ... کا مقدر ہی بن جائیں۔ ... بھی شامل تھے۔ میں نے ایک کان ... جواب دیا: "میں شادی ... گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں بھی سُنا ... "تم شادی کر ... مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ ان آوازوں کا باعث ... میدانِ کارزار ہے جہاں آدمی، آدمی کا خُون بہا رہے ہیں ... ہے ہیں اور طبلِ جنگ اُنھیں ایسا کرنے پر اُکسا رہا ہے ... ایک زبردست دھماکا سُنائی دیا۔ ایسی آواز میں نے زندگی ... پہلی بار سُنی تھی۔ اب میرے لیے یہ معلوم کرنا ناگزیر ہو گیا تھا کہ یہ آواز ... کہاں سے آ رہی ہیں، متحارب کون ہیں، میدانِ کارزار کہاں ... مجھ سے کتنی دُور ہے۔ چنانچہ میں نے ہَوا کی مخالف سمت میں رینگنا ... کر دیا تاکہ آوازوں سے فاصلے اور سمت کا تعین کر سکوں۔

رینگتے رینگتے میں ایک بہت بڑے، چٹان نما پتھر پر چڑھ گیا اور جس سمت سے آوازیں آ رہی تھیں، اُدھر دیکھنے لگا۔

میرے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا جہاں جنگ لڑی جا رہی تھی۔ وہ مقام جہاں میں یہ نظارا کر رہا تھا، میدانِ جنگ ... تقریباً ایک کوس عقب میں واقع تھا اور یہ سطحِ مُرتفع تقریباً دو سَو ہاتھ بلند تھی۔ فاصلے اور بلندی کا تعین کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر میدانِ کارزار کی طرف دیکھا تو حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری حیرت کا باعث متحارب فریق نہیں بلکہ وہ بلند و بالا فصیل تھی جس کے سائے میں یہ جنگ لڑی جا رہی تھی۔ زرد سانپ کی طرح بل کھاتی ہُوئی یہ فصیل اُفق کے ایک سِرے سے دُوسرے سِرے تک پھیلی نظر آتی تھی۔ اس کی بلندی تقریباً پچاس فٹ اور چوڑائی اتنی تھی کہ بیک وقت چار گھڑسوار اس پر اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا سکتے تھے۔

فصیل کا وہ حصّہ جو مجھ سے قریب تر تھا، حملہ آوروں کی خصُوصی توجّہ کا مرکز بنا ہُوا تھا۔ گھڑسواروں کے دستے نعرے لگاتے اور چلّاتے ہُوئے آگے بڑھتے تھے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ یہ لوگ عجیب قسم کی چھوٹی چھوٹی کمانوں سے آتش گیر تیر برسا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ یہ تیر اس کوہ پیکر سنگی دیوار کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے میرے دَور کی ائیر گن سے ہاتھی شکار کرنے کی کوشش کی جائے۔

چند لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ حملہ آور اپنے حریفوں کو

تاؤ دلانے کے لیے یہ حرکت کر رہے ہیں، وہ آگے بڑھ کر اُنھیں للکارتے، آوازے کستے اور پیچھے ہٹ جاتے۔ میں نے سوچا کہ فریقِ مخالف اتنا احمق نہیں ہے کہ اُن کے تاؤ دلانے پر اپنے حصار سے نکل آئے گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فصیل کا بڑا پھاٹک کھلا، اس میں سے بے شمار گھڑسوار اور پیادہ جنگجو نکلے اور حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے۔ ادھر حملہ آوروں نے بھی پُرجوش نعرے لگائے اور اُن سے ٹکرا گئے۔ گھمسان کا رن پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے کُشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ حملہ آوروں کا ایک دستہ لمبی لمبی سیڑھیاں لے کر آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ساتھ تیر انداز بھی تھے جو دیوار کے اُوپر سے دفاع کرنے والے عسکریوں پر آتش گیر تیر پھینک رہے تھے لیکن انھوں نے بھی تیروں اور برچھوں سے اُن کا استقبال کیا۔ جہاں جہاں ... سیڑھیاں لگائی گئی تھیں، وہاں وہاں، اُوپر سے گرم تیل کے کڑھاؤ انڈیلے اور پتھر برسائے جانے لگے۔ ہر طرف سے آہ و بکا کی صدائیں آنے لگیں۔ حملہ آور دفاعی کارروائی سے گھبرا اُٹھے اور پسپا ہونے لگے۔ فصیل سے باہر آنے والے بھی پیچھے ہٹے۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہ لڑتے ہُوئے اندر چلے گئے۔

دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

میری نگاہ ایک عجیب و غریب توپ پر جا پڑی جسے فصیل کی اُس جانب ان گنت آدمی کھینچ کر آگے بڑھا رہے تھے۔ اس توپ کی نال بے حد لمبی اور نال کا گھیر کافی کشادہ تھا مگر یہ دیکھ کر مجھے بے حد تعجب ہُوا کہ انھوں نے توپ کو بڑے غلط زاویے پر رکھا ہے۔ اُس کی نال کا رُخ نہ تو حملہ آوروں کے خیموں کی جانب تھا اور نہ ہی وہ فصیل کے باہر اُن کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ میں حملہ آوروں کے خیمے دیکھ چکا تھا۔ وہ سطحِ مُرتفع کے دائیں جانب لگے ہوئے تھے جبکہ نال کا رُخ اُن سے ہٹ کر دُوسری طرف واقع پہاڑیوں کی جانب تھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ توپ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں مگر جب وہ اُسے داغنے کی تیاری کرنے لگے تو میں اُن کا مطلب سمجھ گیا ... وہ اُس کے دھماکے اور دُھوئیں سے غنیم کو خوفزدہ کرنا چاہتے تھے۔

چند لمحے بعد توپ نے شعلہ اُگلا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے زور کا دھماکا ہُوا اور ایک چمک دار گولہ اُڑتا ہُوا اُن چٹانوں سے جا ٹکرایا جو حملہ آوروں کے خیموں کے دُوسری جانب واقع تھیں۔ میری چھٹی حِس نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ اس لیے میں دھماکے کے ساتھ ہی دُبک گیا تھا۔ تاہم میری رفتار توپ کے گولے سے زیادہ تیز نہیں تھی اس لیے میں نے گولے کو ٹکراتے اور کرچیوں میں تبدیل ہوتے

دیکھا جن میں سے کچھ کرچیاں میری کمین گاہ کے قریب آ گری تھیں۔ میں نے ایک بار پھر فصیل اور میدانِ جنگ پر نظر ڈالی۔ فصیل پر دُھوئیں کے بادل چھائے ہُوئے تھے اور حملہ آوروں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ وہ چیختے چلّاتے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

گولے کی وہ کرچیاں جو میری کمین گاہ سے کچھ فاصلے پر گری تھیں، اب تک چمک رہی تھیں اور اُن کی یہ چمک بڑی دل آویز تھی۔ میں جذبۂ تجسّس کے تحت اپنی پناہ گاہ چھوڑنے اور اُن کی طرف بڑھنے پر مجبور ہو گیا اور جب میں نے ایک کرچی اُٹھا کر دیکھی تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ نہایت عمدہ قسم کے نیلم کا ٹکڑا تھا۔ مجھے اس کی پہچان اس لیے تھی کہ میرے والد کو قیمتی پتھر جمع کرنے کا جنُون تھا مگر میں نے اُن کے ذخیرے میں بھی اتنا اعلا قسم کا نیلم نہیں دیکھا تھا۔ وہ اتنا شفاف تھا کہ اُس کے نیچے سے مجھے اپنی ہتھیلی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرے لیے یہ بات بھی بڑی حیرت انگیز تھی کہ اُن لوگوں نے اتنا قیمتی پتھر گولے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ابھی میں وہ ٹکڑا دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اندھیرا چھانے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے نیلم کا وہ ٹکڑا وہیں پھینک دیا۔ جب یہ لوگ اُسے توپ کے گولے کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو یہاں اس پتھر کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی تھی۔

شام گہری ہو گئی تو جنگ بند ہو گئی۔ میں تذبذب میں تھا کہ اب کیا کروں، رات یہیں بسر کروں یا کہیں جاؤں؟ جب چاندنی پھیل گئی تو میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے حملہ آوروں کی خیمہ گاہ کے پس منظر میں چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اس دوران خیمہ گاہ میں سینکڑوں مشعلیں جل اُٹھی تھیں۔ کہیں کہیں الاؤ بھی روشن تھے اور چند خیموں سے گانے کی ہلکی ہلکی آواز بھی اُبھر رہی تھی۔

میں نے ایک نظر فصیل کی طرف ڈالی۔ وہاں بھی لوگ مشعلیں اُٹھائے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب تک جو کچھ بھی دیکھا ہے، اُسے یاد رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ڈاکٹر فریدل جب چاہے گا، اُنھیں میرے ذہن کے نہاں خانوں سے برآمد کر لے گا بشرطیکہ اس نے چاہا ... اور مجھے واپس بُلا لیا تو ... ورنہ مجھے اب اسی سرزمین پر اپنی بقا کی جدّ و جُہد جاری رکھنا تھی جہاں پہلے سے دو لشکر برسرِ پیکار تھے اور کسی وقت میں کسی بھی فریق کے ہاتھوں مارا جا سکتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس کٹورا نما سطحِ مرتفع سے نیچے آیا اور غیر ارادی طور پر میرے قدم فصیل کی جانب اُٹھنے لگے۔ میری چھٹی حِس مجھے بتا رہی تھی کہ اگر میں شہر پناہ کی اس

جانب پہنچ گیا تو بچ جاؤں گا ورنہ موت سمجھے! بلوچ لے گی اور ڈاکٹر فرندوں کے سارے ہی خواب ادھورے رہ جائیں گے۔

جب میں اس کوہ پیکر فصیل کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ میدان لاشوں سے اَٹا ہُوا ہے۔ کہیں مرنے والوں کے انبار سے لگے ہیں اور کہیں لاشیں ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ اُن کے درمیان بہت سے گھوڑے بھی لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ میرے لیے سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہاں میں نے کسی زخمی کو کراہتے یا دم توڑتے نہیں پایا۔ جنگ میں بہت سے سپاہی زخمی تو ہو جاتے ہیں لیکن مرتے نہیں۔ زخمیوں کی عدم موجودگی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں فریقوں نے ایک دُوسرے کے زخمیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا . . . یا پھر ممکن ہے وہ اپنے اپنے زخمی اُٹھا کر لے گئے ہُوں۔

میں کسی ایسی لاش کی تلاش میں تھا جس کے لباس سے اپنی ستر پوشی کر سکوں۔ اس لیے میں چوپایوں کی طرح اُن کے درمیان گھُومنے لگا۔ مشکل یہ تھی کہ آسمان ابر آلُود تھا اور چھوٹی چھوٹی بدلیاں چاند کو اوجھل کر دیتی تھیں۔ میں اندھیرے میں کئی ایسی لاشوں سے بھی ٹکرایا جن سے بدبُو اُٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ اچانک مجھے کھڑبڑ اور چپڑ چپڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں اپنی جگہ ساکت اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ دُوسرے ہی لمحے غرانے اور خوخیانے کی آوازوں نے مجھے بتا دیا کہ گیدڑ اور بگڑ بھگے لاشوں پر ضیافت اُڑانے پہنچ گئے ہیں۔ جب چاند بدلی سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ لاشیں نوچنے والے گیدڑوں اور بگڑ بھگوں نے میری آمد کو خلل معقولات سمجھا تھا اس لیے دیکھتے [illegible] کاروں کی طرح سُرخ آنکھوں سے دیکھ کر غرا اور خوخیا رہے تھے مگر انھوں نے مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے مُردوں کی بوٹیاں نوچنا زیادہ بہتر سمجھا اور لاشیں اُدھیڑنے میں لگے رہے۔ تاہم میں اپنی جگہ بُری طرح خوف زدہ ہو گیا تھا اس لیے جلدی جلدی اپنے قد و قامت کی لاشیں تلاش کرنے لگا۔ لاشوں کا جائزہ لیتے ہُوئے مجھے پتہ چلا کہ حملہ آور اور شہر پناہ کے اندر رہنے والے دو مختلف نسلوں کے افراد ہیں۔ اُن کے خدوخال، رنگ، قد و قامت اور لباس ایک دُوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ شہر پناہ کے اندر رہنے والے اپنے غنیم سے زیادہ قد آور تھے اور اُن کی رنگت زردی مائل تھی۔ یہ لوگ کانسی کے ہتھیار استعمال کرتے تھے لیکن جب میں نے ایک تلوار اُٹھائی تو وہ بہت ہلکی پھُلکی نکلی۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ لکڑی کی بنی ہوئی ہے اور اس پر کانسی جیسا روغن کر دیا گیا ہے۔ تاہم وہ بہت مضبوط اور تلوار کی طرح دھار دار تھی۔

حملہ آوروں کے بال سیاہ اور قد بہت چھوٹے تھے۔ اُن کے لباس چرمی تھے۔ وہ چمڑے کی مخروطی ٹوپی اور گھٹنوں تک لمبے بُوٹ پہنتے تھے۔ اُن کی خمیدہ ٹانگوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ شہسوار ہیں اور اُن کا زیادہ تر وقت گھوڑوں کی پیٹھ پر گزرتا ہے۔ میں لاشوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ اتنے میں ایک بگڑ بھگا، جو اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں کہیں بڑا اور خونخوار تھا، مجھ پر غرانے لگا۔ میں نے اُسے ڈرانے کے لیے وہی چوبی تلوار لہرائی تو وہ ہچکچا کر پیچھے ہٹنے لگا لیکن اس خیال سے کہ کہیں وہ اچھل کر مجھ پر حملہ نہ کر دے، میں اس کی طرف دیکھتا اور ہوا میں تلوار چلاتا رہا۔ اچانک مجھے اُس کے پیچھے کوئی سُنہری سی چیز چمکتی نظر آئی۔ میں اُسے ڈراتا اور دھمکاتا ہُوا آگے بڑھا تو وہ بھاگ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس چمکدار چیز کو دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ ایک لاش کی زرہ بکتر پر بنا ہُوا ہلال نما طلائی نشان ہے۔ یہ لاش شہر پناہ کے اندر سے آنے والے کسی عہدے دار کی تھی کیونکہ اُس کے کاندھوں پر سُنہری جھالر لگی ہوئی تھی اور گلے میں سونے کی ایک ایسی زنجیر پڑی تھی جسے تاروں سے گوندھ کر بنایا گیا تھا۔ یہ خوبصورت صناعی کا شہکار تھی۔ اس لشکری کی خود پر بھی سُنہری کلغی لگی ہُوئی تھی اور یہ ساری چیزیں اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ کوئی بہت بڑا عہدے دار تھا۔ اتفاق سے یہ لاش قد و قامت میں میرے برابر ہی نکلی۔ میں نے بلا تاخیر اُس کی زرہ بکتر، خود، گلے کی طلائی زنجیر اور خون آلُود لباس اُتار لیا کہ اب اُس سے زیادہ ان کی مجھے ضرورت تھی۔ میں نے جلدی جلدی وہ لباس پہنا مگر مرنے والے کا سینہ میرے سینے جتنا چوڑا نہیں تھا۔ اس لیے میرا سینہ کچھ ننگا رہ گیا تاہم سینہ بند اور زرہ بکتر نے یہ برہنگی بھی ڈھانپ لی۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس کی خود مجھے ٹھیک آگئی جس کے ساتھ کانوں، آنکھوں اور ناک کو چوٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک بڑا فائدہ اُس وقت مجھے یُوں ہُوا کہ میرا چہرہ کافی حد تک ڈھک گیا۔ چہرے کی باقی ماندہ شناخت کو مبہم بنانے کے لیے میں نے اُسی لاش کا تھوڑا سا خون اپنی ٹھوڑی پر مل لیا حالانکہ یہ ایک کراہت آمیز عمل تھا لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

اس کام سے بعجلت فارغ ہونے کے بعد میں نے مرنے والے کی تلوار ڈھونڈنے کے لیے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ فصیل کی طرف سے کچھ لوگ مشعلیں اُٹھائے اس طرف آ رہے ہیں۔ میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی کہ لباس اور زرہ بکتر پہنتے وقت احتیاط کیوں نہ برتی۔ شاید اسی بے پروائی کے باعث میں اُن لوگوں کی نگاہوں میں آ گیا تھا۔ مجھے اس وقت یہی ایک ترکیب سُوجھی کہ لاشوں کے درمیان لیٹ کر خود کو ایک لاش

ظاہر کروں تو شاید وہ مجھے نظر انداز کرتے ہُوئے لوٹ جائیں۔ چنانچہ مَیں نے اس ترکیب پر عمل کیا اور لاشوں کے درمیان لیٹ گیا۔

چند لمحے بعد وہ لوگ اتنے قریب آ گئے کہ مجھے اُن کی باتوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ اس سرزمین پر آنے کے بعد یہ پہلی واضح آوازیں تھیں جو میری سماعت سے ٹکرائی تھیں ورنہ ان سے پہلے تو صرف چیخ و پکار، دھماکوں اور جانوروں کے غرّانے کی آوازیں ہی سُنائی دی تھیں۔ مَیں نے آنے والوں کی آواز پر کان لگا دیے۔ ان میں سے کسی نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

"اِدھر تلاش کرو جہاں آسوریوں کی لاشوں کا ڈھیر لگا ہُوا ہے اور سُنو احمقو۔ اُسے چہرے سے پہچاننے کی کوشش میں وقت ضائع نہ کرنا۔ خَود اور زرہ بکتر سے پہچاننے کی کوشش کرنا۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ بادشاہ کی زرہ بکتر پر سنہرا نشان اور خود پر سُنہری کلغی ہے۔"

یہ سُن کر مجھے جُھرجُھری سی آ گئی کیونکہ یہ زرہ بکتر اور خود تو مَیں پہنے ہُوئے تھا۔ مَیں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو کوسا کہ یہ لباس اور زرہ بکتر کیوں پہنی تھی۔ اگر کسی عام سپاہی کا لباس اور زرہ بکتر پہنتا تو وہ میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ . . مگر اُس وقت مَیں بھی مجبور تھا کہ مجھے اپنے قد و قامت کی کوئی لاش نہیں مِل سکی تھی۔ . . پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ تو بہت اچھا ہُوا۔ . . اس طرح وہ خُود ہی مجھے شہر پناہ کے اندر لے جائیں گے۔ اس کے بعد جو ہونا ہے، ہوتا رہے' مَیں دُعا مانگنے لگا کہ وہ جلدی سے میری یعنی بادشاہ کی لاش تلاش کر لیں تو اس خاک و خُون اور تعفن سے نجات ملے جس سے مجھے متلی ہونے لگی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی کی آواز آئی۔ "میرا خیال ہے، اس وقت ہم بادشاہ سلامت کی لاش نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔"

"کیوں؟" کسی نے سوال کیا۔

"ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ بادشاہ سلامت کہاں ڈھیر ہُوئے تھے۔ دُوسرے اگر آسوریوں نے ہماری مشعلیں دیکھ لیں تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ بکواس رہنے دو اور وہی کرو جو تم سے کہا گیا ہے۔" یہ اُن کے سردار کی آواز تھی۔ "اگر تم لوگوں نے حکم عدولی کی تو کل صبح گرفتار شدہ آسوریوں کے ساتھ تمھاری بھی گردن ماری جائے گی۔"

اب تیسرے آدمی کی آواز آئی۔ "آخر ملکہ ہوشی اپنے شوہر کی لاش کے لیے اتنی مُصر اور مضطرب کیوں ہے؟"

"شاید وہ پُوری تعظیم و تکریم کے ساتھ اس کی تدفین کرنا چاہتی ہے۔ چلو آگے بڑھو، بُزدلو۔"

"ہم بُزدل نہیں ہیں۔" چوتھے آدمی نے کہا۔ "اور آسوریوں سے ڈرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کیونکہ وہ خُود بھی رات کو لاشوں کے قریب نہیں آتے، اُن کی رُوحوں سے ڈرتے ہیں۔ گڑبڑ یہ ہے کہ ان بے شمار لاشوں میں بادشاہ سلامت کی لاش تلاش کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی اور مجھے اپنی یہ اُمید خاک میں ملتی نظر آنے لگی کہ مَیں بغیر کسی جدّ و جُہد کے شہر پناہ کے اندر پہنچ جاؤں گا مگر پھر وہی گرج دار آواز آئی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں کو اپنی جان پیاری نہیں۔ اگر مَیں ملکہ ہوشی کو تمھاری یہ باتیں بتا دُوں تو وہ کھڑے کھڑے تمھاری گردنیں کٹوا کر تمھارے ہاتھوں پر رکھوا دے گی۔"

اس دھمکی یا انتباہ پر وہ لوگ بڑبڑاتے ہُوئے آگے بڑھے اور مشعلوں کی روشنی میں میرے اردگرد لاشوں کے انبار اُلٹ پلٹ کر بادشاہ کی لاش تلاش کرنے لگے۔ وہ ایسا کرتے ہُوئے بادشاہ کو بھی کوستے جا رہے تھے۔ اچانک مجھے اپنے سینے پر کسی کی ٹھوکر محسوس ہوئی۔ شاید نیم تاریکی میں کسی کا پاؤں میری لاش یعنی مجھ

سے ٹکرا گیا تھا۔ دُوسرے ہی لمحے مشعل کی روشنی مجھ پر ڈالی گئی اور پھر کوئی مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "بادشاہ سلامت کی لاش مل گئی۔ یہ رہی۔ مَیں نے تلاش کیا ہے اِسے۔"

مَیں نے سوچا کہ اگر اُنھوں نے خَود اُتار کر میرا معائنہ کیا تو میری خیر نہیں کیونکہ مَیں تنہا اور نہتا ہُوں جبکہ وہ کم از کم چھے تھے اور تلواروں سے مسلح بھی تھے۔ اتنے میں اُن کے سربراہ کی آواز آئی۔ "ہاں۔ یہ شاہ افشار کی لاش ہے۔ وہ دیکھو۔ شاہی زنجیر اور کلغی۔ اب اسے جلدی سے ڈولے میں ڈالو اور لے چلو۔ یہ مت سمجھنا کہ مَیں آسوریوں کے ڈر سے جلدی کر رہا ہُوں۔ نہیں، مجھے ان مکروہ لگڑ بھگوں سے گھن آتی ہے۔ جو لاشیں بھنبھوڑنے کے لیے میدانِ جنگ میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

مَیں حیران تھا کہ اس وقت میرا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ پہلے کبھی لاش بننے کا تجربہ نہیں ہُوا تھا۔ . . اور وہ بھی ایک ایسے بادشاہ کی لاش جسے اُس کی بیوہ تکریم کے ساتھ کفنانے دفنانے کی منتظر ہو۔

اُنھوں نے مجھے اُٹھا کر ڈولے میں پٹخ دیا اور ڈولا اُٹھا کر چل پڑے۔ کافی دیر چلنے کے بعد اُن میں سے ایک ہانپتا ہُوا بولا۔ "مَیں شروع ہی سے بادشاہ کا پالکی بردار رہا ہُوں مگر مَیں نے کبھی اسے اتنا بھاری محسوس نہیں کیا جتنا اس وقت کر رہا ہُوں۔ کیا مرنے کے بعد آدمی بھاری ہو جاتا ہے؟"

"یہ فضول باتیں رہنے دو اور تیز تیز چلو۔" ان کا سرغنہ بولا۔ "جتنی جلدی یہ کام نمٹے گا، اتنی جلدی ہم گھر جا کر آرام سے سو سکیں گے۔"

"بشرطیکہ سونے دیا گیا تو۔ . ." ایک پالکی بردار نے بے ساختہ کہا جس پر سب ہنس پڑے۔

کچھ دُور جا کر وہ رُک گئے۔ مَیں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ فصیل کے بڑے پھاٹک میں بنے ہُوئے چھوٹے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ جُونہی دروازہ کُھلا، وہ اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک سُرنگ نُما راستہ تھا جس میں جگہ جگہ مشعلیں جل رہی تھیں اور ایک عجیب سی خوشبُو پھیلی ہُوئی تھی۔

پالکی برداروں کا سفر جاری رہا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک ایسے باغ سے گزرے جس میں پھُول دار جھاڑیوں اور گھنے پتّوں والے چھوٹے چھوٹے درختوں کو اس انداز سے تراشا اور کاٹا چھانٹا گیا تھا کہ اُن سے انسانوں اور جانوروں کی شکلیں بن گئی تھیں۔ . . پھر وہ ایک طویل تالاب کے پاس سے گزرے جس میں مشعلوں کے عکس لہرا رہے تھے۔ یہ مشعلیں بڑے بڑے ستونوں کے شمع دانوں میں لگی ہُوئی تھیں۔ مَیں ڈولے میں اپنی گردن ایک طرف ڈھلکائے یہ سب کچھ دیکھتا جا رہا تھا۔ اچانک میری نظر اس رہگزر پر جا پڑی جس پر وہ میری پالکی لیے جا رہے تھے۔ . . یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس راستے کا فرش نیلم کی اینٹوں سے بنا ہُوا تھا۔ یہ فرش پھسلواں ہوگا۔ اس لیے پالکی برداروں کی رفتار کچھ سُست پڑ گئی تھی۔

"رفتار بڑھاؤ احمقو۔ ملکہ ہوشی' بادشاہ کی منتظر ہوگی۔" عہدے دار چیخ پڑا۔

"اب انتظار کا کیا فائدہ' جناب؟" وہی مسخرہ پالکی بردار بولا۔ "مجھے خدشہ تھا کہ بیواں شاید اُنھیں ساری رات جگائے رکھنا چاہیں گی۔"

"مَیں آج تک ملکہ ہوشی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکا۔" دُوسرا بولا۔ "کیا آپ نے اُسے دیکھا ہے' جناب؟"

"نہیں۔" عہدے دار نے جواب دیا۔ "ہم جیسے لوگوں کی آنکھیں اُس کا دیدار نہیں کر سکتیں۔"

"وہ کیسی ہوگی؟" تیسرے نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے' سلطنت میں اُس سے زیادہ حسین عورت کوئی نہیں ہو سکتی۔" عہدے دار بولا اور اُس کی اس بات نے میرے دل میں شوقِ دید کو بھڑکا دیا۔

"ہو سکتا ہے' آج ہم اُس کی جھلک دیکھ ہی لیں۔" چوتھے نے قیاس آرائی کی۔

"ناممکن۔" عہدے دار بولا۔ "وہ مُردوں کے معبد میں اُس وقت داخل ہوگی جب ہم بادشاہ کی لاش رکھ کر وہاں سے نکل جائیں گے۔ اب باتیں بند کرو اور رفتار بڑھاؤ۔"

پالکی برداروں کی رفتار تیز ہو گئی۔

مَیں نے اپنا سر ذرا سا اُوپر اُٹھایا' سامنے ایک گنبد والی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ یہ گنبد بھی نیلم ہی کا بنا ہُوا تھا اور چاندنی میں اُس کی چمک قابلِ دید تھی۔

پالکی بردار چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک طویل راہ داری میں داخل ہُوئے۔ اس میں بھی مشعلیں روشن تھیں جو روشنی کے ساتھ ساتھ عجیب سی خوشبُو بھی بکھیر رہی تھیں جو نہ تو عُود و عنبر کی تھی اور نہ ہی اگر کی خوشبُو جیسی تھی۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی حسین بیوہ یعنی ملکہ ہوشی کے خوش آیند تصوّر میں ڈوب گیا۔ عین ممکن تھا کہ آنے والے چند لمحات میں مجھے واقعی لاش ہی میں تبدیل کر دیا جاتا لیکن اب مَیں مرنے سے پہلے ملکہ ہوشی کو ضرور دیکھ لینا چاہتا تھا جسے پُکی

برداروں کے سردار نے اس سلطنت کی سب سے حسین عورت بتایا تھا۔

معاً پالکی بردار رُک گئے۔ اُن کے سرغنہ نے ایک دروازہ کھولا۔ وہ لوگ ڈولا اُٹھائے ایک بڑے کمرے میں داخل ہُوئے جس کی دیواریں بھی نیلم کی تھیں۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر ڈولا فرش پر رکھ دیا مجھے اُٹھا کر نیلم ہی کے بنے ہُوئے ایک چبوترے پر لٹایا۔ میرے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے، ڈولا اٹھایا اور چپ چاپ وہاں سے نکل گئے۔

مَیں نے آنکھیں کھولیں تو پتہ چلا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس پر بنا ہُوا گنبد میں دیکھ چُکا تھا۔ یہ گنبد اتنا شفاف تھا کہ چاندنی اس سے جھلک رہی تھی۔ مَیں نے سر اُٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک طویل عریض کمرہ تھا جس میں صرف وہی ایک دروازہ تھا اور دروازے کے اُوپر شمع دان میں صرف ایک مشعل روشن تھی۔ کسی دیوار میں کوئی دریچہ یا کوئی روزن نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس دروازے کے علاوہ یہاں سے فرار کا اور کوئی راستہ نہیں... اور مَیں جانتا تھا کہ آنے والا وقت میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ بہرصورت جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا اس لیے مَیں نے اپنے خیالوں کا رُخ ایک بدسیر ملکہ ہوشی کی طرف موڑ دیا۔

کمرے میں مکمل سکوت تھا اور وہاں مسحور کن خوشبو رچی ہُوئی تھی۔ مَیں دھڑکتے دل کے ساتھ ملکہ ہوشی کا انتظار کرنے لگا۔ جو ایک وفا شعار ملکہ کی حیثیت سے اپنے شوہر کی آخری رُسوم پُورے اعزاز کے ساتھ ادا کرنا چاہتی تھی۔ اپنے محبوب کی لاش دیکھ کر اُس کے دل پر کیا بیتے گی، گزرتے وقت کی یادیں اسے خون رُلائیں گی اور آنے والے وقت کے دامن میں اُس کے لیے محرومیوں کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔ پھر میری چشمِ تصوّر نے دیکھا کہ ملکہ ہوشی سیاہ ماتمی لباس پہنے اور بال کھولے میرے سرہانے کھڑی بین کر رہی ہے اور اس کی دیوانہ بنا دینے والی آنکھوں میں خوابوں کی راکھ ہے یا آنسو ہی آنسو مچل رہے ہیں۔

مَیں یہ سوچ رہا تھا اور میری نیم وا آنکھیں مشعل کے شعلے پر جمی ہُوئی تھیں کہ صرف وہی شعلہ مجھے ملکہ ہوشی کی آمد سے مطلع کر سکتا تھا۔ بالآخر وہ لمحہ آ گیا جب مشعل کا شعلہ تھرتھرایا اور اس نے مجھے بتا دیا کہ کمرے کی ساکت ہَوا میں یہ ارتعاش دروازہ کھلنے سے پیدا ہُوا ہے۔ دروازہ کھلا ہے تو کوئی آیا ہوگا اور یہاں ملکہ ہوشی ہی کو آنا تھا۔

مَیں نے اپنی آنکھیں نیم وا ہی رکھیں اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

دم سادھنے سے میری چھاتی پھٹنے لگی تھی اور دل تھا کہ بے تحاشا دھڑکے جا رہا تھا... پھر ایک سایہ مجھ پر محیط ہو گیا اور مشعل اوجھل ہو گئی۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ جُوں جُوں وہ بے آواز قدموں سے آگے آ رہی تھی، میرے دلِ وحشی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھ پر ایسی کیفیت ہمیشہ اُن لمحات میں طاری ہُوا کرتی تھی جب کسی سے جان جوکھوں میں ڈالنے والا مقابلہ ہُوا کرتا تھا مگر اس وقت تو یہاں ایک ایسی عورت تھی جس کا دل غموں سے چُور چُور تھا اور جو محبوب کی دائمی جُدائی کے دُکھ سے نڈھال تھی... پھر نہ جانے مجھ پر یہ اضطرابی کیفیت کیوں طاری تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی چبوترے کے قریب آئی اور مجھ سے چھ قدم کے فاصلے پر رُک گئی۔ چست ریشمی لباس نے اس کی نسوانیت کو کچھ اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ پالکی برداروں کے سردار نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ بلاشبہ بےحد حسین تھی... لیکن وہ رُونے اور بین کرنے کی بجائے اپنے ہاتھ پُشت کے پیچھے کیے ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ شاید اُس پر وہی سکتے کی سی کیفیت طاری تھی جو شدید صدمے سے جنم لیتی ہے اور غم زدہ انسان سے آنسوؤں کے ساتھ قوتِ گویائی بھی چھین لیا کرتی ہے۔ اگر ایسی حالت میں اُسے رُلایا نہ جائے تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے مگر مَیں اُسے کیسے رُلا سکتا تھا؟

اچانک اُس نے اپنی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور پُشت کی طرف کیے ہُوئے ہاتھ چھوڑ دیے۔ تب میری نگاہ اُس کے دائیں ہاتھ میں چمکتے ہُوئے خنجر پر جا پڑی... اوہ... تو وہ خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے نہ تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ ہی ہونٹوں پر بین... اس کی گردن کا جھٹکا خودکشی کے عزم کا اعادہ تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ مَیں کیا کروں، قدرت کی اس حسین ترین مخلوق کو مرنے سے کیسے باز رکھوں،... ابھی مَیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بول اُٹھی۔

"وہ گھڑی آ گئی ہے، شاہ افشار جس کا مجھے انتظار تھا...

... تمھاری لاش یہاں مُردوں کے اس معبد میں لے آئے ہیں تاکہ تمھیں وہی عزت و توقیر دی جائے جو قوم و وطن کے لیے جاں نثار کرنے والے بہادر بادشاہوں کو دی جاتی ہے... اور مجھے بھی ظاہر کرنا ہے کہ تم اس اعزاز کے مستحق ہو لیکن یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے، شاہ افشار! تم نے بھی اپنی قوم کو دھوکا دیا اور مَیں بھی اپنی قوم کو دھوکا دے رہی ہُوں... لیکن اس دھوکے میں بڑا فرق ہے۔"

وہ بول رہی تھی اور مَیں مُردوں کی طرح آدھی آنکھیں کھولے اُس کا حُسنِ بے محابا دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ گلابی تھے۔ آنکھیں میخانے اور سراپا قیامت تھا۔ کس غضب کی عورت تھی وہ اور کتنا بے بس تھا مَیں... سچ مچ کی لاش کی مانند... اگر اس وقت مَیں لاش نہ ہوتا تو وحشت میرے وجود پر طاری ہو گئی ہوتی۔

وہ ایک قدم آگے بڑھی اور اپنے اَبرو کی طرح خم دار خنجر کو ایک نظر دیکھتے ہُوئے پھر بولنے لگی۔

"تم مر چکے ہو، شاہ افشار لیکن مَیں تمھیں ایک بار پھر مارنے آئی ہُوں۔ سیانے کہتے ہیں کہ آدمی کو ایک ہی بار موت آتی ہے لیکن مَیں اپنی عزتِ نفس کی تسکین کے لیے تمھیں دوبارہ قتل کرنا چاہتی ہُوں۔ تمھیں میرے ہاتھوں بھی مرنا چاہیے تاکہ مجھے سکون مل سکے۔ جب مَیں تم سے اپنا انتقام لے لُوں گی تو اپنے نئے محبوب کی رفاقت میں مجھے تم یاد نہیں آؤ گے۔ مَیں بھول جاؤں گی کہ کبھی تم میرے محبوب اور میرے شوہر تھے۔"

اتنا کہہ کر وہ ایک قدم آگے بڑھی۔

اُس کی سانسیں اُلجھنے لگی تھیں... اور ان اُلجھی سانسوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا زیر و بم دیدنی تھا۔

"تمھاری رُوح جن تاریکیوں میں بھٹک رہی ہوگی، میری باتیں سُن رہی ہوگی اور یہ بات تو مَیں اُسے بطورِ خاص سُنانا چاہتی ہُوں کہ تم جنگ میں آسوریوں کے ہاتھوں نہیں مارے گئے بلکہ مَیں نے تمھیں قتل کروایا ہے... اور اسی لیے قتل کروایا کہ تم اپنی سرزمینِ وطن تاغان سے غداری کرنا چاہتے تھے۔ تم نے تاغان کی غلامی کی سازش کی تھی۔ مَیں نے تمھارے پیچھے آدمی لگا دیا تھا جس نے تمھاری پیٹھ میں خنجر گھونپ کر تمھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا... اور پھر مَیں نے اُس آدمی کو خود ہی موت کی میٹھی نیند سُلا دیا تھا تاکہ وہ مجھ سے غداری نہ کر سکے۔ یہاں آنے سے پہلے مَیں نے اُس آدمی کی لاش ٹھکانے لگا دی ہے، شاہ افشار... اب یہ راز صرف مَیں جانتی ہُوں یا پھر تمھاری اندھیروں میں بھٹکنے والی رُوح کو معلوم ہے۔"

وہ رُک گئی اور اس کے خنجر والا ہاتھ بلند ہونے لگا۔ اب وہ کسی بھی لمحے وہ تیز دھار خنجر میرے دل میں اُتار سکتی تھی۔

ملکہ ہوشی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اگرچہ میری نگاہ اُس کے ہاتھ میں چمکتے ہُوئے خنجر پر تھی لیکن مَیں اُس کی سحر آنکھوں کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔ اُس کی سمندروں جیسی سبز آنکھوں میں مجھے جنّت اور جہنّم کی جھلک نظر آئی۔ وہ آنکھیں اگر پیار سے کسی کی طرف اُٹھیں تو اُسے اپنا گرویدہ بنائے بغیر نہ چھوڑیں اور نفرت سے دیکھیں تو آدمی اپنے مرنے کی دُعائیں مانگنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسی تھیں وہ فسُوں کار آنکھیں جن پر لمبی پلکوں کی جھالریں آویزاں تھیں۔ میرا جی چاہا کہ مَیں ان پلکوں کی چھاؤں میں پہنچ جاؤں۔ مگر مَیں ایک لاش تھا اور اگر میری نظر خنجر سے چوکتی تو میرا سچ مچ کی لاش بن جانا بھی یقینی تھا۔

ملکہ ہوشی کے ہونٹوں پر نفرت آمیز تبسّم کی لکیر گہری ہو گئی۔

"تم ایک بار تاغان کی آزادی اور تحفّظ کی خاطر قتل کیے گئے تھے اور اب ملکہ ہوشی تمھیں اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے دوبارہ قتل کر رہی ہے۔"

اُس کا خنجر والا ہاتھ بجلی کی سی سُرعت سے میرے سینے کی طرف گرتا چلا گیا۔

اُس نے بجلی کی سی سُرعت سے خنجر میرے دل میں اُتار دینا چاہا تھا مگر جب خنجر میرے دل سے چند انچ کے فاصلے پر آیا تو میرے ہاتھ نے بڑھ کر اُس کی کلائی پکڑ لی اگر اس عمل میں مجھ سے ذرا سی بھی چُوک ہو جاتی تو اُس کا خنجر میرے دل میں اُتر گیا ہوتا۔ مَیں نے نہ صرف اُس کی کلائی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لی تھی بلکہ اُسے اپنی طرف کھینچ بھی لیا تھا۔ اب اس کا چہرہ میرے چہرے سے صرف بالشت بھر دُور تھا۔

"چیخنے کی کوشش نہ کرنا۔" مَیں نے کہا۔ "اگر تم خاموش رہیں تو مَیں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

ملکہ ہوشی کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کے سائے لہرانے لگے مگر وہ خاموش رہی اور نڈھال سی ہو کر میرے اُوپر آ رہی۔ اُس کے لب کچھ کہنے کو ذرا سے وا ہوئے لیکن آواز نہ نکل سکی۔

"اُونھوں... کچھ مت بولو۔ پہلے میری بات سُن لو۔" مَیں نے جلدی سے کہا۔

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بے ہوش ہو گئی۔ اُس کا خوبصورت سراپا جو چند لمحے پہلے آگ تھا، اب برف کی مانند ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مَیں نے آہستہ سے اُسے اُٹھایا اور وہاں لٹا دیا جہاں پہلے مَیں دراز تھا... پھر مَیں نے اُس کے خم دار خنجر کا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ اس تلوار کی طرح وہ بھی لکڑی کا بنا ہُوا ہو گا جو مَیں نے میدانِ جنگ میں دیکھی تھی... لیکن یہ خنجر فولاد کا بنا ہُوا ثابت ہُوا! اگر وہ اسے گھونپنے میں کامیاب ہو گئی ہوتی تو...؟ یہ سوچ کر ہی مجھے جھُرجھُری آ گئی۔ مَیں نے ایک نظر ملکہ ہوشی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔

مَیں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ ذرا سا کھولا اور جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ مُردوں کے معبد کو پہرے داروں کی ضرورت ویسے بھی نہیں ہوتی۔ باہر باغ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں مشعلیں جل رہی تھیں... مگر اُن کی روشنی اندھیروں کو دُور کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ فضا میں وہی عجیب سی خوشبو رچی ہوئی تھی جسے مَیں پہلے بھی محسوس کر چکا تھا۔ مجھے قدرت نے ایک خصوصی صلاحیت سے نوازا تھا کہ مَیں جانوروں کی طرح خطرے کی بُو محسوس کر لیتا ہوں۔ اسی صلاحیت کی بنا پر مَیں کئی بار موت کے مُنہ سے بچا ہُوں۔ یہ صلاحیت مارشل آرٹس کی تربیت کے دوران میں پیدا ہوئی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی جب مَیں ماحول کا جائزہ لے رہا تھا، میری چھٹی حِس نے مجھے کسی خطرے کا احساس نہ دلایا تو مَیں ملکہ ہوشی کے پاس واپس آ گیا۔

وہ ابھی تک ساکت لیٹی ہوئی تھی۔

اُس کی باتوں سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بڑی ہوشیار عورت ہے۔ مَیں نے سوچا کہ اگر کسی طرح یہ میرے قابُو میں آ جائے تو پھر میرے لیے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا لیکن سوال یہ تھا کہ یہ قابُو میں کیوں اور کیسے آئے؟... نہ جانے ہوش میں آنے پر اُس کا ردِ عمل کیا ہو۔ بہر صورت مجھے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا... مَیں نے خود اُتار دیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا جب مَیں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پتہ چلا کہ بالوں کی نئی فصل رُخساروں کے کھیتوں پر سر اُٹھا رہی ہے لیکن یہاں اِن حالات میں داڑھی کیسے بنائی جا سکتی تھی اور اس کے لیے سامان کہاں سے آتا؟ مَیں نے ایک بار پھر ملکہ ہوشی کی طرف دیکھا تو اُس کے حُسن و شباب نے مجھے اُس کے قریب بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ مَیں نے اُس کے شفاف لباس کو چھُو کر دیکھا، وہ ریشم کا لگتا تھا مگر ریشم کا نہیں تھا اور ہوشی کی جلد نہ سفید تھی اور نہ ہی زرد تھی بلکہ کچھ ایسی تھی جیسے پُرانا ہاتھی دانت کچھ زردی مائل ہو جاتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ مَیں اُس کی بند آنکھوں کو چھُو کر دیکھوں جنھوں نے مجھے مسحور کر دیا تھا... مگر مَیں نے اپنی اس خواہش کو خود ہی رَد کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت چہرے اور شاداب سراپا مجھے بُری طرح لُبھاتے اور اُکساتے ہیں... مگر مَیں یہاں کسی ایسی آسُودگی کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ مجھے معلوم کرنا تھا کہ یہ کون سی سرزمین ہے اور یہاں کی تہذیب نے کس حد تک ترقی کی ہے۔ ملکہ ہوشی نے اپنی خود کلامی میں تاغان کا ذکر کیا تھا لیکن تاغان شہر کا نام ہے یا ملک کا؟ مجھے یہ ساری باتیں معلوم کرنا تھیں۔ اس لیے مَیں نے اپنی خواہشوں کی سرگوشیاں سُننی بند کر دیں اور ملکہ ہوشی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب اس کے جسم میں ذرا سی جُنبش پیدا ہوئی تو مَیں نے جلدی سے اپنا ہاتھ چہرے پر رگڑا تاکہ وہ خون اُتر جائے جسے مَیں نے اپنی شناخت کو مبہم بنانے کے لیے لگایا تھا۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر ڈر جائے۔ میرے مستقبل کا دارومدار اُسی پر تھا۔ اتنے میں ہوشی نے آنکھیں کھول دیں اور تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔ مَیں نے نرمی سے ایک ہاتھ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیا

"وہ چیخنے نہ پائے۔"

"مَیں نہ تو تمھارا دشمن ہُوں اور نہ ہی تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہُوں، ملکہ! مجھے اپنا دوست سمجھو اور میری مدد کرو۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ کوئی آواز نکالنے کی بجائے پہلے میری بات توجہ سے سُن لو۔"

اس پر ہوشی جو پہلے اُٹھنے اور میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی نرم پڑ گئی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش ترک کر دی اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"میرا نام سرفروش ہے اور مَیں یہاں تاغان میں اجنبی ہوں یہاں میرا کوئی دوست یا کوئی شناسا نہیں۔ میرے پاس ان کپڑوں اور اس ہتھیار کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔" یہ کہتے ہُوئے مَیں نے اُسے اُسی کا خنجر دکھایا۔ "مَیں تمھارا دوست رہُوں گا اور تمھارے کام آؤں گا بشرطیکہ تم بھی میرے ساتھ دوستانہ سلوک کرو۔ بولو منظور ہے؟"

مگر اُس نے اثبات میں سر نہ ہلایا۔ بول اس لیے نہیں سکتی تھی کہ مَیں نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھا ہُوا تھا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے اُس خنجر کو دیکھتی رہ گئی جو میرے ہاتھ میں تھا۔ مَیں نے جلدی سے خنجر اپنے کمربند میں اُڑس لیا اور کہا۔ "اگر تم وعدہ کرو کہ شور نہیں مچاؤ گی تو مَیں تمھارے مُنہ سے ہاتھ ہٹا لوں گا۔ منظور ہو تو سر ہلا کر اشارہ کر دو۔"

ملکہ ہوشی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مَیں نے اپنا ہاتھ اُس کے ہونٹوں سے ہٹا کر اُس کے جسم سے دُوسری جانب چبوترے پر ٹیک لیا۔ اُس نے اپنی نرم و نازک مخروطی انگلیوں سے اپنے یاقوتی لب صاف کیے اور میری طرف دیکھتی رہی۔

"تم آہستہ سے بات کر سکتی ہو۔ جیسے مَیں کر رہا ہُوں!" مَیں نے کہا۔ "میری زبان سمجھ رہی ہو نا؟"

وہ آہستہ سے مسکرائی پھر مدھم اور میٹھے لہجے میں بولی۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم تاغان میں اجنبی ہو۔ جب تک مَیں خود کسی کو نہ بُلاؤں، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ مَیں یہاں کی ملکہ ہُوں۔"

اب اُس کی آواز میں نفرت نہیں تھی بلکہ اس کے لہجے میں رَس گھُل گیا تھا۔ ذرا سے وقفے کے بعد وہ پھر کہنے لگی۔

"تم نے مجھے چھُو کر اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ تمھاری زندگی اب میرے اختیار میں ہے کیونکہ کوئی ملکہ کو چھُونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بہرحال، مَیں نے اب تک تم جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ مَیں تمھاری بات ضرور سُنوں گی، اجنبی! بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اب تمھیں مجھ سے ڈر تو نہیں لگ رہا؟" مَیں نے پوچھا کیونکہ ایک خوفزدہ عورت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔"

اُس نے ناک سکوڑتے اور کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ "مَیں تم سے خوفزدہ نہیں، اجنبی بلکہ مَیں تو یہ سوچ کر بے ہوش ہو گئی تھی کہ غالباً شاہ افشار کو میدانِ جنگ میں قتل نہیں کیا گیا اور وہ مرنے کا ڈھونگ رچا کر مُردوں کے اس معبد میں مجھے قتل کرنے آ گیا ہے۔ مَیں تمھاری حرکت سے اس غلط فہمی میں مُبتلا ہو گئی تھی۔"

"تمھارا شوہر مر چکا ہے، ملکہ۔ اگر مَیں نے اُس کی زرہ بکتر نہ پہنی ہوتی تو وہ مجھے اُس کے دھوکے میں نہ اُٹھا لاتے۔ مَیں اور کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی میرے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔ فی الحال اس سے زیادہ مَیں تمھیں نہیں بتا سکتا مگر بعد میں سب کچھ بتا دُوں گا۔ مجھے خوراک، لباس اور پناہ کی ضرورت ہے اور مَیں کوئی ایسا طریقہ بھی جاننا چاہتا ہوں جس کی بدولت کوئی مجھ پر شک و شبہہ نہ کر سکے۔"

"زرہ بکتر تم پر سجتی ہے، اجنبی! یہ افشار پر بالکل نہیں جچتی تھی۔"

"شکریہ ملکہ۔ اب یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کرو گی یا نہیں؟ کیا تمھیں میری اس بات پر اعتماد ہے کہ مَیں تمھیں یا تاغان کو کبھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا؟"

"مجھے تم پر اعتماد ہے اور مَیں تمھاری مدد ضرور کروں گی، اجنبی۔ اب اپنا بازو ہٹاؤ اور مجھے اُٹھنے دو... اور ہاں، آیندہ مجھے چھُونے کی جسارت نہ کرنا۔" اس کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔

مَیں نے اپنا بازو ہٹا لیا۔

وہ اُٹھ بیٹھی۔ اگرچہ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی مگر اُس کے چہرے پر تناؤ تھا جس نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ اچانک وہ تیزی سے اُٹھی اور بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ مَیں نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا۔ غالباً اُس نے باہر گشت کے پہرے داروں کی آواز سُن لی تھی جو مَیں نہیں سُن پایا تھا۔ اُس نے چیخنا چاہا مگر مَیں نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اُس نے مدافعت کرتے ہُوئے مجھے دھکیلا۔

اُس وقت اُس میں بلا کی طاقت آ گئی تھی۔ وہ دوبارہ چیخنا چاہتی تھی۔ مَیں نے ایک بار پھر اُس کا مُنہ بند کر دیا... اور اس کے ساتھ ہی مَیں نے اسے دوبارہ چبوترے پر لٹا دیا۔ وہ چند لمحے کسمساتی رہی... پھر پُرسکون ہو گئی۔

اگر اس وقت پہرے دار بھی وہاں آ جاتے اور مجھے برچھیوں سے چھلنی کر ڈالتے تب بھی مَیں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا تھا۔ پھر، سوچے بغیر نہ رہا کہ میری اس دیوانگی کا ردِ عمل میرے لیے بے حد خطرناک بھی ہو سکتا ہے... مگر لمحے، ایک بار بیت جائیں تو کبھی واپس نہیں آیا کرتے۔ اس لیے پچھتاوا فضول تھا۔

میں آنکھیں موند کر لیٹ گیا کہ جو ہونا ہے، وہ ہو جائے... اور جو کچھ بھی ہوا اس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ مجھے اپنے سینے پر روئی کے گالے جیسا بوجھ محسوس ہوا تو میری آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ ملکہ کا چہرہ میرے چہرے سے زیادہ دُور نہیں تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔

"مجھ سے ناراض تو نہیں ہو، ملکہ ؟"

اس نے سر کو منفی جنبش دی۔ وہ مسکراتی رہی۔

"کیا تم میری مدد کرو گی ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اجنبی! میں تمھاری مدد ضرور کروں گی اور میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں کہ تم تاغان کے ہر مرد سے مختلف ہو۔ اُن میں سے ایک بھی تم جیسا نہیں ہے۔" اور پھر جس طرح کچھ دیر پہلے میں نے اس کا مُنہ بند کیا تھا، اسی طرح اس نے بھی مجھ سے گویائی چھین لی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میں بھی جلدی سے اُٹھ گیا۔

"گھبراؤ نہیں اجنبی!... اب میں نہ کسی کو آواز دوں گی اور نہ ہی یہاں سے بھاگوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"لیکن یہ جگہ... میرے لیے محفوظ نہیں ہے، ملکہ! ہمیں کہیں اور جانا چاہیے۔"

اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کہنے لگی: "ہاں، ہاں۔ ابھی چلتے ہیں۔ تم گھبراتے کیوں ہو۔ میں یہاں کی حکمران ہوں۔ میرا ہر لفظ یہاں کے قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور اب تمھاری بھی ہر بات یہاں کے قانون کا درجہ حاصل کر لے گی۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا... پھر بولا۔

"مگر ملکہ... !"

اُس نے میری بات کاٹ دی: "تم آیندہ مجھے ملکہ نہیں کہو گے۔ کبھی ملکہ مت کہنا۔ سمجھ گئے ؟"

"تو پھر کیا کہوں ؟" میں نے پوچھا۔

"تم مجھے لالی کہہ کر مخاطب کیا کرو۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو میرا باپ مجھے لالی کے نام سے پُکارا کرتا تھا۔ میرے بچپن میں وہ آسوریوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ تب سے کسی نے بھی مجھے اس نام سے نہیں پکارا۔ کسی نے بھی مجھے لالی کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔"

"لالی!" میں نے دُہرایا: "لیکن مجھ میں اور تمھارے باپ میں تو بڑا فرق ہے۔"

"بے شک... اس کے باوجود تم مجھے لالی کہو گے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم جس نام سے چاہو گی، میں اسی نام سے تمھیں مخاطب کروں گا مگر اب یہاں سے نکل چلو لالی۔ دیکھو نا، اگر پہرے دار یہاں آ گئے تو تم اُنھیں میرے بارے میں کیا بتاؤ گی ؟ اُنھیں کیسے مطمئن کرو گی ؟"

"بات صرف پہرے داروں تک ہی محدود نہیں، سرفروش! مجھے اپنے عوام اور عمائدینِ سلطنت کو بھی تو تمھارے متعلق کچھ نہ کچھ بتا کر مطمئن کرنا ہے۔ کیا اور کیسے ؟ یہ سوچنے کے لیے وقت درکار ہے۔ مجھے کچھ جھوٹ گھڑنے پڑیں گے لیکن گھبراؤ نہیں۔ مجھے جھوٹ بولنے میں کافی مہارت حاصل ہے۔"

"جھوٹا تو میں بھی ہوں اور اس کام میں تمھارا اچھا مددگار ثابت ہو سکتا ہوں۔" میں نے کہا: "لیکن اچھا جھوٹ اسی وقت میرے ذہن سے جنم لے سکتا ہے جب میں نہا دھو کر پیٹ بھر لوں اور کچھ دیر سو کر تازہ دم ہو جاؤں۔"

وہ میری طرف دیکھ کر اک ادائے دل نشین سے مسکرائی اور پھر میری طرف اُنگلی نچاتے ہوئے بولی: "ہاں۔ اس وقت تمھیں بہت بھوک لگ رہی ہو گی۔ آؤ چلیں۔"

وہ مجھے لیے ہوئے ایک دیوار کے پاس آئی اور قریبی ستون میں بنے سوراخ میں انگلی سے کوئی کھٹکا دبا دیا تو دیوار کی ایک بڑی سِل کسی آواز کے بغیر ہٹ گئی۔ اب ہمارے سامنے ایک سُرنگ نما ڈھلوان راستہ تھا جس میں مشعلیں جل رہی تھیں۔

"یہ راستہ میری نجی رہائش گاہ تک جاتا ہے۔ وہاں پہلے ہم غسل کریں گے... پھر کھانا کھائیں گے اور اس کے بعد میں چاہوں گی کہ تم ویسے ہی بن جاؤ جیسے کہ پہلے بن چکے ہو۔"

مجھے اس کے ارادوں سے کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی، اس لیے میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چلتے چلتے اچانک ہی اُس نے پوچھا: "کیا تمھیں یقین ہے کہ شاہ افشار مر چکا ہے؛ اگر وہ نہیں مرا تو سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔ میں تم سے کسی صُورت دستبردار نہیں ہوں گی جس پر جھگڑا ہو گا اور میں نہیں چاہتی کہ تاغان میں ایسے وقت کوئی ہنگامہ برپا ہو جب ہم بیرونی دشمنوں سے نبرد آزما ہیں۔"

"دیکھو لالی!" میں نے کہا: "میں ایک اجنبی ہوں اور تمھارے شوہر کو نہیں پہچانتا لیکن زرہ بکتر، خود اور یہ طلائی زنجیر میں نے جس شخص کے گلے سے اتاری تھی، وہ یقیناً مر چکا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس آدمی کو شاہ افشار کے قتل پر مامور کیا تھا۔ اُس نے اپنا کام بخوبی انجام دیا تھا۔"

وہ مطمئن ہو گئی... مگر مجھے ایک نئے خیال سے جھرجھری سی آ گئی۔

"فرض کرو کہ کل دن کی روشنی میں کوئی تمھارے شوہر کی لاش پہچان لے تو کیا ہو گا ؟" میں نے تشویش ظاہر کی۔

اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی: "تم اس کی فکر نہ کرو۔ مُردار خور گوریلے اور سگ بھگے راتوں رات ساری لاشیں چٹ کر جائیں گے۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ گوریلے سب سے پہلے لاشوں کے چہرے ہی نوچتے ہیں۔ مُردوں کے معبد سے لاش غائب ہو جانے کے لیے بھی میں کوئی کہانی گھڑ لوں گی لیکن تمھاری موجودگی کی وضاحت قدرے مشکل ہے... اور اس لیے مشکل ہے کہ تمھاری شکل و صُورت تاغان کے لوگوں سے نہیں ملتی۔ ویسے گھبراؤ نہیں۔ میں ضرور کوئی ایسا جھوٹ تراش لوں گی جس پر سب کو یقین آ جائے گا۔"

کچھ دیر بعد ہم دونوں ایک نیم گرم پانی والے تالاب میں اُتر گئے جس کے کنارے نوخیز لڑکیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ تالاب میں کوئی خوشبودار شے چھڑک دیتی تھیں۔ صابن کی بجائے ایک طلائی طشتری میں خوشبودار سفوف رکھا ہوا تھا۔

میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر ان باندیوں میں سے کسی نے میرے متعلق کسی کو بتا دیا تو کیا ہو گا ؟

"ان میں سے کوئی بھی اپنی زبان نہیں کھول سکتی۔ یہ سب جانتی ہیں کہ میری انگلی کا ہلکا سا اشارہ اُن کی گردنیں اُڑا سکتا ہے۔"

کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں ملکہ لالی کی بات کا اعتبار نہ کرتا۔

کھانے کے بعد وہ مجھے اپنی خواب گاہ دکھانے لے گئی جہاں پلنگ کی بجائے فرش پر ایک گول اور بے حد نرم گدا پڑا تھا۔ اُس نے بتایا کہ تاغان میں سب فرش پر سوتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد کنیزوں نے ہمارے اردگرد پردے آویزاں کر دیے۔

ملکہ لالی جھوٹ بولنے میں اپنی مثال آپ تھی۔ اُس نے میرے بارے میں اپنی قوم اور عمائدینِ سلطنت کو یہ کہہ کر مطمئن بلکہ زیرِ بار احسان کر دیا تھا کہ میں جنوبی حصے میں واقع فارس سے تاغان آیا ہوں تاکہ آسوریوں کے خلاف جنگ میں اہلِ تاغان کے عسکری مشیر کے فرائض انجام دے سکوں اور یہ کہ میں فارس کا سورینا یعنی سپہ سالار ہوں۔ اس جواز نے جہاں سب کو مطمئن کر دیا تھا وہاں میرے لیے لالی کے محل میں رہنے کی بھی گنجائش پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ گزشتہ تین ہفتوں سے میرے دن جنگ کا نظارا کرتے گزر رہے تھے اور راتیں وقت ملکہ کی خدمت میں بسر ہو رہا تھا۔ لالی مجھ پر اس قدر مہربان بلکہ دالہ و شیدا تھی کہ اُسے ایک پل کی جُدائی بھی گراں گزرتی تھی۔

میں شب و روز کی یکسانیت سے اکتاہٹ اور بے چینی سی محسوس کرنے لگا اور مجھے یہ احساس بھی کچوکے دینے لگا کہ میں یہاں کشت و خون کا نظارا کرنے اور لالی کی زلفوں کا اسیر بننے نہیں آیا بلکہ میرا مقصد کچھ اور ہی ہے... مگر میں یہ بات نہ تو لالی کو بتا سکتا تھا اور نہ ہی اپنے کسی عمل سے اُسے برہم کرنا چاہتا تھا کہ وہ عورت بیک وقت شبنم بھی تھی اور شعلہ بھی... مہربان ہو کر اُس نے مجھے اپنا دیوتا بنا لیا تھا تو نامہربان ہو کر وہ میرے لیے فرشتۂ اجل بھی بن سکتی تھی۔

ایک صبح میں فصیل کے ایک بُرج سے جنگ میں گرفتار ہونے والے آسوریوں کی گردن زنی کا نظارا کر رہا تھا۔ وہ ایک قطار میں کھڑے تھے اور اُن کے ہاتھ پُشت پر باندھ دیے گئے تھے مگر اُن کے چہروں پر خوف و دہشت کے آثار نہیں تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر قیدی جلد از جلد اپنے سر کا نذرانہ دینے کا متمنی ہو۔

وہ باری باری آگے بڑھتے، اپنا سر مقتل کے چبوترے پر رکھتے، جلاد کا تیشہ بلند ہوتا، "ٹھک" کی آواز آتی اور آسوری کا سر تن سے جُدا ہو کر ایک گڑھے میں جا پڑتا۔ اس کے ساتھ ہی دُوسرا آسوری آگے بڑھتا اور اپنا سر چبوترے پر رکھ دیتا۔

میرے ساتھ اُس وقت تاغان کا سورینا آذر بھی کھڑا تھا۔ اُس کا قد تو میرے برابر تھا لیکن جسامت اور طاقت میں آذر ہی نہیں بلکہ تاغان کا کوئی بھی مرد میرے ہم پلہ نہیں تھا۔ جب میں نے آسوریوں کو یوں مردانہ وار اپنی گردنیں کٹواتے دیکھا تو بے اختیار میرے مُنہ سے نکل گیا...

"انھیں بہادروں کی طرح مرنا آتا ہے۔"

یہ سُن کر آذر بولا: "یہ بہت بے حس اور عقل سے عاری لوگ ہیں سردار سرفروش! اسی لیے یہ کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہوتے... پھر انھیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مرنے کے بعد حیاتِ جاوداں اُن کی منتظر ہو گی۔ ممکن ہے، اُن کا یہ عقیدہ دُرست ہو، بہرکیف ہم انھیں تہِ تیغ کرتے ہوئے تھک گئے ہیں مگر بدبخت وحشی اپنی گردنیں کٹوانے سے نہیں تھکتے۔ ان کی تعداد کم ہونے میں ہی نہیں آتی۔"

میں نے ایک نظر آذر پر ڈالی۔ تاغانی مَردوں کی طرح اس کی داڑھی مونچھوں کے بال بھی برائے نام ہی تھے مگر میرے چہرے پر گھنی داڑھی اُگ آئی تھی جسے اب تک تراشنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر نہ جانے کیا سمجھا اور بولا: "میرا

خیال ہے تم نے ہمیں ان بدبخت وحشیوں سے نجات دلانے کا کوئی طریقہ سوچ لیا ہوگا۔ یہ تو ہمیں جونکوں کی طرح چمٹ گئے ہیں، سردار سرفردش؟"

"سردار کا خطاب بھی مجھے لالی کے جھوٹ نے عطا کیا تھا۔ میں نے اسے صرف اتنا کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی مجھے ایسا کوئی طریقہ نہیں سوجھا۔

سپہ سالار آزدر یہ سن کر وہاں سے چلا گیا اور میں دوبارہ اُن قیدی آسوریوں کی طرف دیکھنے لگا جو مردانہ وار خوشی خوشی جامِ مرگ پی رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود بھی یہاں ایک اسیر کی حیثیت رکھتا ہوں۔

دفعتہً مجھے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے اسیر بنانے والی لالی گھوڑے پر چلی آرہی تھی۔ میں برج سے نکل کر فصیل پر آگیا۔ لالی جنگی لباس اور سینہ بند پہنے بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ خود کے نیچے لہراتی زلفیں اُس کے گالوں سے کھیل رہی تھیں اور سبز گہری آنکھیں چناروں سے گھری جھیلوں کی مانند نظر آرہی تھیں۔

اُس نے چابک والے ہاتھ سے مجھے سلام کرتے ہوئے کہا۔
"صبح بخیر سردار سرفردش!"

"صبح بخیر لالی!" میں نے جواب دیا اور ہم دونوں کے ہونٹوں پر ایک خاص مسکراہٹ اُتر آئی۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا اور بولا۔ "آؤ ذرا توپ کا معائنہ کرلیں۔"

ہمارے گھوڑے فصیل پر دُلکی چال چلنے لگے۔ فوجیوں اور افسروں نے لالی کو اور مجھے دیکھ کر سلام کیا اور دوبارہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ لالی نے مجھے تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"آج صبح جب میں بیدار ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو تنہا پایا تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں سردار سرفردش... میری آنکھیں سب سے پہلے تمھیں ہی دیکھنا چاہتی ہیں۔"

"میں معائنے کے لیے جلدی اُٹھ گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور ان بدبخت آسوریوں سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ سوچنا چاہتا تھا۔ یہ کام خوابگاہ میں نہیں ہوسکتا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" لالی بولی۔ "لیکن تم نہیں جانتے کہ میں تمھارے آنے سے پہلے کس قدر محرومیوں کا شکار تھی۔

میں یہ سن کر مسکرا دیا۔

"آج تو میں تمھیں معاف کرتی ہوں لیکن آیندہ نہیں کرو گی۔ یہ مت بھولو کہ رات کو آنکھیں بند کرتے وقت اور صبح آنکھیں کھولتے ہی میں تمھارے علاوہ کسی کو نہیں دیکھنا چاہتی۔"

اتنے میں ہم وہاں پہنچ گئے جہاں وہ عجیب و غریب توپ رکھی ہوئی تھی۔ اُسے تقریباً درجن بھر آدمی کھینچتے تھے۔ توپ میرے اس اندازے سے قدرے مختلف نکلی تھی جو میں نے پہلے دن سطحِ مرتفع سے لگایا تھا۔ اُس کے آٹھ پہیے تھے جو بارہ فٹ اُونچے تھے اور اُسے داغنے کے لیے دس پیپے بارود درکار ہوتا تھا مگر میرے لیے اُس کی سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اُس کی نال فولاد کی نہیں بلکہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی جس پر فولادی پٹیاں منڈھی ہوئی تھیں۔ تعجب خیز امر یہ تھا کہ بار بار داغنے کے باوجود اس کی نال نہیں پھٹی تھی۔

اُس رات لالی نے بتایا۔

"آسوریوں کا بادشاہ تمبور اسی توپ کے لیے برسوں سے جنگ کر رہا ہے۔ اگر ہم یہ توپ اُسے دے دیں تو وہ جنگ بند کرکے واپس چلا جائے گا۔"

"تو پھر تم لوگ یہ توپ اُس کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے؟" میں نے کہا۔ "اس کا فائدہ بھی کیا ہے؟ تم اُس سے آسوریوں کو ہلاک نہیں کرتے بلکہ صرف دھماکے سے ڈراتے ہو۔ وہ خوفزدہ ہوکر تتر بتر ہوجاتے ہیں... مگر پلٹ کر پھر لڑنے لگتے ہیں۔"

میری بات سن کر لالی بپھر گئی۔ اُس کی سبز آنکھوں میں غیظ و غضب کے ساتھ ساتھ خوف کے سائے بھی لہرانے لگے۔
"ہم یہ توپ تمبور کے حوالے کردیں؟... تم پاگل تو نہیں ہوگئے سرفردش؟... مگر نہیں... تم اجنبی ہو، اس لیے نہیں جانتے کہ یہ توپ ہماری عظمت کی علامت ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے اگر یہ توپ ہم سے چھن گئی تو تاغان تباہ و برباد ہوجائے گا۔ روایت یہ بھی ہے کہ توپ جس قوم کی تحویل میں ہوگی، وہی دُنیا پر حکمرانی کرے گی۔ اس لیے شاہ تمبور سالہا سال سے اسے حاصل کرنے کے لیے لڑ رہا ہے۔ وہ اپنے لاتعداد سپاہیوں کو جنگ کی بھینٹ چڑھا چکا ہے۔ نہیں سرفردش، آیندہ ایسا کبھی نہ کہنا۔ اگر میری قوم کو یہ معلوم ہوجائے کہ تم نے ایسا کہا ہے تو وہ تمھاری بوٹیاں اُڑا دے گی۔ میں بھی تمھیں اُن کے قہر سے نہیں بچا سکوں گی۔"

میں نہیں جانتا تھا کہ میری اس بات کا اتنا شدید ردِعمل ہوگا اور وہ یوں غم و غصے میں بپھر جائے گی۔ اُسے معمول پر لانے کے لیے مجھے نہ جانے کیا کیا جتن کرنے پڑے۔

دُوسری صبح وہ بے صدا آسودگی اور فرحت محسوس کر رہی تھی لیکن میں کچھ تھکا تھکا سا تھا۔ جب ہم حسبِ معمول فصیل پر آئے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آج میدانِ جنگ میں وہ ہلچل اور ہنگامہ نہیں ہے جو روز ہوا کرتی تھی۔ آسوریوں کی خیمہ گاہ سے کھانا پکانے کے لیے دھواں ضرور اُٹھ رہا تھا مگر آج اُن کے گھڑسوار صف بستہ نہیں تھے اور نہ ہی مجھے وہ پیادہ دستے دکھائی دیے جو تیر اندازوں کے ساتھ لمبی لمبی سیڑھیاں لے کر آگے بڑھا کرتے تھے۔

"مجھے کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے، سردار سرفردش! آج آسوری حملہ کیوں نہیں کر رہے ہیں؟"

"شاید تمبور کو عقل آگئی ہے اور اسے یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ اس طرح جنگ نہیں جیت سکتا۔ اگر اُس کی جگہ میں ہوتا تو کب کا خیمے سمیٹ کر جا چکا ہوتا۔"

"اگر ایسا ہوا تو اچھا نہیں ہوگا۔" وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے بولی۔ "یہ لوگ بھاگ نکلے تو ہم ان کی گردنیں کیسے کاٹیں گے۔ اب تو یہ ہمارا معمول بن چکا ہے۔"

"شاید وہ سوار تمھارے سوال کا جواب دے سکے۔" میں نے اُس گھڑسوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو آسوریوں کی خیمہ گاہ سے فصیل کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا آرہا تھا... مگر جب وہ قریب آیا تو پتہ چلا کہ وہ ایک بونا ہے اور خچر پر سوار ہے۔ اس نے ایک لمبا سا نیزہ بلند کر رکھا تھا جس کے ساتھ گھوڑے کی دُم بندھی ہوئی تھی۔

"یہ تو ایلچی ہے... لیکن اگر تمبور صلح کرنا چاہتا ہے تو اس نے اس بونے مسخرے کو کیوں بھیجا ہے؟" یہ کہتے کہتے لالی کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ "اُس نے بھونڈا اور توہین آمیز مذاق کیا ہے۔ مگر نہیں۔ ایسا گھٹیا خیال تمبور کی بہن سادیہ کو ہی سوجھ سکتا ہے۔"

اتنے میں بونا گھوڑے کی دُم والا نیزہ لہراتا ہوا فصیل کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں پہنچا جہاں نیچے بونا ایلچی رُکا تھا۔ آزدر اور دوسرے عہدے دار پہلے سے وہاں موجود تھے۔

بونا رکابوں پر کھڑا ہوگیا۔

میرا خیال ہے، وہ بمشکل تین فٹ قد کا مالک تھا... مگر اُس کے اعضا متناسب اور ٹانگیں مضبوط تھیں ورنہ وہ رکابوں پر کھڑا ہوکر اپنا توازن قائم نہ رکھ پاتا۔

اُس نے اپنے دونوں ہاتھ بھونپو کے انداز میں منہ پر رکھے اور زور سے بولا۔ "اہلِ تاغان اور تاغانی سپاہیو، ملکہ ہوشی اور ارکانِ سلطنت! میں شاہ تمبور کی طرف سے پیغام لایا ہوں۔ اسے غور سے سنو۔ شاہ تمبور جو حاکمِ دوراں ہے جس سے دھرتی لرزتی ہے، جو دُشمنوں کے لیے بلائے بے درماں اور دوستوں کے لیے مہربان ہے، وہ تمھاری اس کوہ پیکر فصیل کے اندر رُونما ہونے والے واقعات سے بھی بے خبر نہیں ہے۔"

وہ سانس لینے کے لیے رُکا تو لالی میری طرف جھک کر بولی۔
"یہ ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کے بہت سے جاسوس ہیں۔"

بونا پھر بولنے لگا۔ "خادِ اعظم تمبور کو معلوم ہے کہ تمھارے ہاں فارس سے سردار سرفردش نامی ایک شخص آیا ہوا ہے۔ اُسے فارس سے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ اُن اسباب کا کھوج لگائے جن کی وجہ سے تم ہم آسوریوں کو شکست نہیں دے سکتے۔ وہ سردار تین ہفتے پہلے رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا تمھارے ہاں پہنچا تھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

بونے ایلچی کے اس سوال پر میں نے اور لالی نے ایک دُوسرے کی طرف ذومعانی نگاہوں سے دیکھا... پھر میں نے فصیل سے جھانکتے ہوئے بآوازِ بلند کہا۔
"ہاں... یہ درست ہے۔ میں سردار سرفردش ہوں۔ بولو... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

بونا ایلچی میری طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ صورت سے ہی مسخرہ لگتا تھا۔

اُس نے گھوڑے کی دُم والا نیزہ لہراتے ہوئے کہا۔ "میں خادِ اعظم تمبور کی طرف سے تمھیں سلام کہتا ہوں، سردار۔ تم ویسے ہی نظر آتے ہو، جیسے ہمارے جاسوسوں نے ہمیں بتایا ہے۔ تم واقعی قوی الجثہ، طاقتور اور بہادر ہو اس لیے میں اُمید کرتا ہوں کہ تم خادِ اعظم تمبور کی پیش کش قبول کرلو گے۔"

"وہ پیش کش کیا ہے مختصر خاں؟" میں نے پوچھا۔

لالی اور اُس کے ارکانِ سلطنت سرگوشیاں کر رہے تھے۔ شاید اُنھیں میرا یہ عمل ناگوار گزرا تھا۔

"خادِ اعظم تمبور چاہتا ہے کہ تم تنِ تنہا اُس کے ایک سُورما سے مقابلہ کرو۔ یہ مقابلہ اسی فصیل کے سامنے کسی منتخب مقام پر ہوگا۔ اگر تم نے خادِ اعظم کے سُورما کو شکست دے دی تو خادِ اعظم کا وعدہ ہے کہ وہ محاصرہ اُٹھا کر یہاں سے چلا جائے گا اور پھر کبھی تاغان کا رُخ نہیں کرے گا... لیکن اگر ہمارے سُورما نے تمھیں شکست دے دی تو پھر اہلِ تاغان کو اپنی توپ خادِ اعظم تمبور کے

حوالے کرنا پڑے گی ۔"

" ٹھہرو ... میں ابھی تمھیں جواب دیتا ہوں ۔" یہ کہہ کر میں لالی کی طرف پلٹا جو عمائدینِ سلطنت اور لشکری عہدے داروں کے حلقے میں کھڑی تھی ۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے ۔

میں قریب آیا تو آزور نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا ۔" یہ پیش کش کیوں نہ قبول کر لی جائے ' ملکہ عالیہ ؟ سردار سرفروش کسی بھی آسوری کے مقابلے میں ایک دیو کی سی حیثیت کا مالک ہے ۔ وہ فنِ حرب کا بھی ماہر ہے اور بڑی آسانی سے اپنے مقابلے پر آنے والے سُورما کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہے ۔"

لالی یہ بات سُن کر برافروختہ ہو گئی اور جھڑک سے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے بولی ۔" نہیں ۔ میں اس احمقانہ پیش کش کے لیے سردار سرفروش کی جان کا خطرہ مول نہیں لے سکتی ۔ اسے فارس سے ایک مشیر کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے ۔ میں ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھنا اور اس کے مشوروں سے مستفید ہونا چاہتی ہوں ۔"

میرے لیے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات دُور کرنے کا یہ بہترین موقع تھا ۔ میں اپنے آپ کو تا غان اور تا غانیوں کا پُرخلوص دوست ثابت کر سکتا تھا لیکن لالی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا نہیں چاہتی تھی ۔

" نہیں ملکہ ! آسوریوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ ایک بہترین موقع ہے ۔ میں شاہ تمبور کے بڑے سے بڑے سُورما کو بڑی آسانی سے خاک چاٹنے پر مجبور کر دُوں گا ۔"

یہ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا ... مگر میں جانتا تھا کہ میں دیانتداری سے یہ مقابلہ نہیں جیت سکوں گا بلکہ مجھے ایسے داؤ پیچ آزمانے پڑیں گے جو آسوری سُورما نہیں جانتے ۔

لالی میری طرف مڑتے ہوئے بولی ۔

" تم نہیں جانتے سردار سرفروش کہ تمبور کتنا جھوٹا اور عیار بادشاہ ہے ۔ اگر تم نے اُس کے سُورما کو شکست دے دی تو وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہے گا ۔"

یہ سُن کر ایک لشکری عہدے دار جو دُوسروں کی نسبت زیادہ دلیر تھا ، ہنس پڑا ۔

" اگر سردار سرفروش ہار گیا تو ہم بھی اپنے وعدوں پر قائم رہنے کے لیے مجبور نہیں ہوں گے ۔ ہم اُسے توپ نہیں دیں گے ۔" اسی عہدے دار نے کہا ۔

تقریباً سارے عہدے داروں نے سر ہلا کر اس بات کی تائید کر دی ۔

" لیکن اس کا فائدہ کیا ہوگا ؟ سردار سرفروش کی جان مُفت میں چلی جائے گی ۔ نہیں میں کسی قیمت پر ایسا نہیں ہونے دُوں گی ۔" لالی نے گرج کر کہا ۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اپنی ذات تک محدُود رکھنے کے لیے اِس مقابلے کی منظوری نہیں دینا چاہتی ۔ اتنے میں فصیل کے نیچے پر گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی ... اور پھر گھوڑے کی ہنہناہٹ جیسی آواز میں کسی کا جُملہ سُنائی دیا ۔

" تا غان کے لوگ احمق یا بُزدل ہیں ورنہ میرا بھائی گدھا بھی اس سے آدھے وقت میں کسی فیصلے پر پہنچ چکا ہوتا ۔"

یہ بات کہنے والا وہی مسخرہ ایلچی تھا جو گھوڑوں کے ہنہنانے جیسی آواز میں بول رہا تھا ۔ اس کی اس حرکت پر سب ہنس پڑے اور ماحول کی کشیدگی قدرے کم ہو گئی ۔

" میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے ۔ مجھ پر اعتماد کرو ، ملکہ اور وہ شرط بھی سُن لو جو میں شاہ تمبور کو پیش کرنے والا ہُوں ۔" میں نے کہا ۔

میں دوبارہ فصیل کے کنارے پہنچا اور جھانک کر نیچے دیکھا ۔ بونے کا خچر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا تھا اور بونا ہنہناہٹ میں ... رہا تھا ...

" جلدی کرو سردار سرفروش ! میں بھوکا ہُوں ۔ خادِ اعظم کے اِس کام کی وجہ سے مجھے آج گھاس اور دانہ بھی نہیں ملا ۔ اور یہ دیو قامت شہسوار میری پیٹھ توڑے دے رہا ہے ۔ جلدی کرو ۔"

مجھے بونے کی اس حرکت پر ہنسی آ گئی ۔

" اپنے خچر کا مُنہ بند کرو تو میں تمھیں کوئی جواب بھی دُوں ، مختصر خاں ۔"

بونے نے خچر کی لگام ڈھیلی کی تو اس نے اگلی ٹانگیں پھر رکھ دیں پھر اس نے اپنی ٹوپی چھو کر مجھے سلام کرتے ہوئے ...

" میں ہمہ تن گوش ہُوں ، سردار سرفروش ۔"

" اپنے بادشاہ کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میں اُس کے ... سے مقابلہ کروں گا مگر میری بھی ایک شرط ہے ۔ اگر میں ... جیت گیا تو شاہ تمبور اپنی بہن سادیہ کو میرے حوالے کر دے ... جاؤ اور اُس کا جواب لے آؤ کہ اُسے میری شرط منظور ہے ۔"

بونے کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہُوئے ... اُس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک اُبھری اور وہ مسکرا کر بولا ۔" اچھی بات ہے سردار سرفروش ! میں ابھی جواب لاتا ... اُس نے خچر کو ایڑ لگائی اور اُسے آسوریوں کی خیمہ گاہ

اُڑاتا چلا گیا ۔

میں نے مقابلے کی یہ شرط جان بُوجھ کر رکھی تھی ۔

گزشتہ تین ہفتوں کے دوران میں مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ملکہ لالی ' خادِ اعظم کی بہن سادیہ سے شدید نفرت کرتی ہے ۔ اُس کے شوہر شاہ افشار نے محض سادیہ کی وجہ سے غدّاری کی تھی اور آسوریوں پر شہر پناہ کے دروازے کھول دینا چاہتا تھا ۔ ملکہ ہوشی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ سادیہ کی بوٹیاں نوچ کر چیل کوّوں کو کھلا دیتی ۔ میں نے یہ افواہ بھی سُنی تھی کہ خادِ اعظم اور اس کی خوبصورت مگر بے آبرو ہمشیرہ سادیہ کی آپس میں نہیں بنتی ۔ گویا میں اگر اُس کے سُورما کو شکست دیتا ہُوں تو وہ اپنی بہن سے نجات حاصل کرنے کے لیے بخوشی اسے میرے حوالے کر دے گا اور اپنے آپ کو قول کا دھنی ثابت کرتے ہوئے محاصرہ چھوڑ کر چلا جائے گا ۔ دُوسرے ملکہ ہوشی بھی اپنی رقابت کی آگ بجھانے کے لیے مجھے مقابلے سے نہیں روکے گی ۔ بصورتِ دیگر وہ مجھے گرفتار بلکہ قتل بھی کروا سکتی تھی ۔

میری یہ ترکیب کارگر ثابت ہُوئی اور ملکہ لالی خاموش ہو گئی ۔

خادِ اعظم تمبور نے بھی میری شرط منظور کر لی ۔

یہ طے پا گیا کہ دُوسرے روز مقابلہ ہوگا ۔

یُوں تو ہر شام ملکہ اور میں ایک ہی تالاب میں غسل کیا کرتے تھے مگر آج وہ تنہا چلی گئی تھی ۔ اس لیے مجھے سوچ و بچار کا وقت مل گیا تھا ۔ میں دریچے میں کھڑا حالات پر غور کر رہا تھا ۔ فضا میں وہی جانی پہچانی خوشبو رچی ہُوئی تھی جس کا مخرج ہانیوس کے پھُول تھے ۔ یہ پھُول دن رات کھلتے اور خوشبو بکھیرتے رہتے تھے ۔

دُور جنوب میں نیلم کے پہاڑوں پر بجلی چمک رہی تھی ۔ نیلم کے یہ پہاڑ ان خزانوں میں سے تھے جو ڈاکٹر فریدوں حاصل کرنا چاہتا تھا ۔ مگر میں ابھی تک یہ پہاڑ نہیں دیکھ پایا تھا ۔ آسوریوں اور تا غانیوں کی یہ جنگ ختم ہوتی تو میں کہیں آ جا بھی سکتا تھا ...

پھر مجھے خیال آیا کہ سُورج غرُوب ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے لیکن ملکہ ہوشی ابھی تک واپس نہیں آئی ۔

کہیں وہ میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہی ؟

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر بستر کا گدا اُٹھایا ' وہ خنجر موجُود تھا جو پہلے روز مجھے ملکہ ہوشی سے حاصل ہُوا تھا اور میں نے اسے بستر کے نیچے چھپا دیا تھا ۔ بس یہی واحد ہتھیار میری ملکیت تھا ۔ اگر لالی کے سپاہیوں کا دستہ مجھے گھیر لیتا تو میں اس خنجر کی مدد سے دو چار سپاہیوں کو تو ڈھیر کر ہی سکتا تھا لیکن خود موت سے نہیں بچ سکتا تھا ... پھر بھی میں نے احتیاطاً اسے چھپا لیا تھا کہ کچھ نہ ہونے سے تھوڑا ہونا بھی بہتر ہی ہوتا ہے ۔

میں اب ملکہ ہوشی سے خوف زدہ تو نہیں تھا لیکن اُس کے ایک اقدام نے مجھے چونکنا ضرور کر دیا تھا ۔ دو ہفتے پہلے مجھ سے وہی غلطی ہو گئی تھی جو مردوں کی فطرت کا خاصہ ہوتی ہے ۔ ملکہ کی ایک نوشباب کنیز میری طرف دیکھ کر مسکرائی تو جواباً میں بھی مسکرا دیا تھا ۔ اگرچہ ملکہ اس وقت وہاں موجُود نہیں تھی ، پھر بھی دُوسرے روز میں نے اُس کنیز کا بُریدہ سر اپنی خواب گاہ کے ایک کونے میں رکھا ہُوا دیکھا تھا ۔ تبھی سے میں کچھ محتاط ہو گیا تھا ۔

ملکہ نے مجھ سے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن میں اُس کے جذبۂ رقابت کو ایک پل کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا ۔ اسی لیے مجھے یہ خیال آیا تھا کہ کہیں وہ اس غلط فہمی میں تو مُبتلا نہیں ہو گئی کہ میں سادیہ کو اپنے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں ؟

یہ غلط فہمی اُسے میرے قتل پر بھی اُکسا سکتی تھی ۔

میں انہی سوچوں میں ڈُوبا ہُوا تھا کہ وہ آ گئی ۔

آج اُس نے سولہ سنگار کیے ہُوئے تھے ۔ وہ آتے ہی میرے گلے کا ہار بن گئی ۔ کچھ دیر میری دھڑکنیں سُنتی رہی پھر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں کے کشکول میں تھام کر غم ناک نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے بولی ۔" میرا جی تو نہیں چاہتا تھا مگر میں تمھیں مقابلے کی منظوری دینے پر مجبور ہو گئی تھی ، جانتے ہو ، مجھے یہاں آنے میں دیر کیوں ہُوئی ہے ؟"

" نہیں لالی ۔" میں نے لہجے میں بے پناہ پیار سمو لیا ۔

" میں اپنے جاسُوسوں سے معلومات حاصل کر رہی تھی ۔ جس طرح شاہ تمبور نے ہمارے ہاں اپنے جاسُوس چھوڑ رکھے ہیں ' اُسی طرح شاہ تمبور کی صفوں میں میرے بھی بہت سے جاسوس کام کر رہے ہیں ۔ انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ شاہ تمبور نے اپنی بہن سادیہ کو ایک خیمے میں محبوس کر رکھا ہے اور اس پر کڑا پہرہ لگا دیا ہے ۔ پہرے داروں کو بتا دیا گیا ہے کہ اگر سادیہ فرار ہو گئی تو ان سب کی گردنیں اُڑا دی جائیں گی ۔ اس لیے سادیہ کو اپنے بھائی پر بے انتہا غصہ ہے ۔ یاد رکھو ! سرفروش ! تمھیں ہر حال میں کل کا مقابلہ جیتنا ہے اور اگر تم اپنے مدِ مقابل کو شکست نہ دے سکو تو اپنی جان دے دینا مگر آسوریوں کے قیدی نہ بننا ۔ میں نے تمھیں دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے ۔ اس لیے فصیل کے سامنے تمھارے جسم کے ٹکڑے ہوتے نہیں دیکھ سکتی ۔ وہ وحشی تمھارے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے ۔"

میں نے اُسے دلاسا دیتے ہُوئے کہا ۔" گھبراؤ نہیں لالی ۔ میں اپنے مدِ مقابل کو شکست دے کر سادیہ کو تمھارے قدموں میں ڈال دُوں گا تاکہ تم اپنے دل کی بھڑاس نکال سکو اور آسوری بھی پہلی

سے دفعان ہو جائیں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم بہت مضبوط اور طاقت ور ہو لیکن آسوری بڑے وحشی اور عیار ہیں اگر تم ان کے قیدی بن گئے تو سادیہ اپنی توہین کا انتقام لینے کے لیے تمھیں بطور غلام مانگ لے گی اور تمھارے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو میں اُس کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے دو پنجرے بنوائے ہیں۔" لالی نے مسکرا کر کہا... "ایک سادیہ کے لیے ہے اور دوسرے میں وہ گوریلے بند ہیں جنھیں ہم پکڑ لائے ہیں۔ میں سادیہ کو پنجرے میں بند کر دوں گی تاکہ وہ گوریلوں کو اور بھُو کے گوریلے سادیہ کو دیکھتے رہیں۔ ۔ پھر جب میں سادیہ کو جی بھر کے ایذا پہنچا لوں گی تو اُسے بھُو کے گوریلوں کے حوالے کر دوں گی۔"

میں نے لالی کی اس بات پر آنکھیں بھینچ لیں اور سوچا کہ یہ نرم و نازک سی عورت اندر سے کتنی بے رحم اور سفاک ہے۔

لالی نے مجھے خاموش اور آنکھیں موندے دیکھا تو بولی۔ "کیا سوچ رہے ہو، سرفروش؟"

"بس یہ سوچ رہا ہوں کہ تمھاری ایذا رسانی کے بعد بھُو کے گوریلوں کے لیے کیا بچے گا؟"

ملکہ لالی نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ "تم اس کی فکر نہ کرو۔ بھُو کے گوریلے ہڈیاں تک چبا جاتے ہیں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ثابت کرنا شروع کر دیا کہ وہ خود بھی کسی گوریلے سے کم نہیں ہے۔

اگلی صبح جب میں گھوڑے پر سوار شہر پناہ کے پھاٹک سے باہر آیا تو میدان میں دھول اُڑ رہی تھی۔ فصیل پر تاغان کے ہزاروں سپاہی میرا اور شاہ تمبور کے سُورما کا مقابلہ دیکھنے کے لیے بے تاب کھڑے تھے۔

ملکہ لالی شہر پناہ کے سب سے بڑے بُرج میں شاہی تخت پر بیٹھی تھی اور اُس کے ارکانِ سلطنت دست بستہ اس کے گرد کھڑے تھے۔ اس وقت میں سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہُوا تھا۔

میں نے آسوریوں کی خیمہ گاہ کی طرف دیکھا۔

خیموں کے آگے ہزاروں آسوری قطاروں میں کھڑے تھے قطاروں کے آگے ایک بڑا سیاہ خیمہ نصب تھا جس کے باہر ایک چوبی چبوترے پر شاہ تمبور بڑی تمکنت سے براجمان تھا۔ اس کے گرد لشکری عہدے دار باادب کھڑے تھے۔

میں نے اپنا گھوڑا اس نیزے کے قریب روک دیا جو حدِ فاصل کے طور پر زمین میں گاڑ دیا گیا تھا اور جس کے بالائی حصّے پر گھوڑے کی دُم لہرا رہی تھی۔ آج صبح بونے ایلچی کے ساتھ جو تفصیل طے پائی تھی اس کے مطابق مجھے وہیں رُکنا تھا۔

معاً مجھے بونے ایلچی کی ایک بات یاد آ گئی۔

اُس نے جاتے جاتے کہا تھا: "میدان پر نگاہ رکھنا سردار سرفروش! زمین سے خبردار رہنا۔"

اُس کی یہ بات نہ اُس وقت میری سمجھ میں آئی تھی اور نہ ہی اب واضح ہو رہی تھی۔ اگر یہ انتباہ تھا تو اس کا مطلب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ تاہم میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور میدان کو غور سے دیکھا مگر مجھے سپاٹ ہموار سطحِ زمین اور اس پر بھُوری ریت اور چھوٹے چھوٹے کنکروں کے علاوہ کوئی بھی چیز دکھائی نہیں دی۔

اتنے میں مجھے آسوریوں کی خیمہ گاہ سے ایک شہسوار آتا دکھائی دیا۔ میں نے اپنا زنجیردار گُرز گھما کر اپنے اعضا گرم کیے۔ یہ زنجیردار گُرز میں نے کل ہی تاغان کے آہن گروں سے تیار کروایا تھا۔ چھوٹے سے چوبی دستے کے بعد ایک مضبُوط آہنی زنجیر منسلک کر دی گئی تھی جس کے دُوسرے سرے پر آہنی گولہ تھا اور اس گولے میں نیلم کی اُنی جیسی تیز دھار کرچیاں جڑ دی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک تلوار، ایک چوکور ڈھال اور وہی لالی والا خنجر تھا جسے میں نے اپنی پیٹی میں اُڑس رکھا تھا۔

اِسی دوران آسوری سُورما قریب آ کر میرے اردگرد چکر کاٹنے لگا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو کھڑے کھڑے گھمانا شروع کیا تاکہ اپنے مدِمقابل پر نظر رکھ سکوں۔ میں چاہتا تھا کہ حملے میں پہل وہی کرے اور میں اُس کے وار خالی دے کر اسے تھکا دُوں لیکن آسوری سُورما بھی عُجلت میں اوچھا وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے بیس گز کے فاصلے پر دائرے میں گھُومتا اور اپنے مُنہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا رہا پھر اُس نے اچانک اپنے پستہ قد گھوڑے کی لگام کھینچی تو وہ الف ہو گیا۔

"میرا نام پارس ہے۔ میں آسوری سُورماؤں کا سرخیل ہُوں اور خاوندِ اعظم کے لیے تمھیں قتل کرنے آیا ہُوں۔" اتنا کہہ کر وہ نگاہوں سے مجھے تولنے لگا۔

وہ قد و قامت میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا مگر اُس کے ہاتھ بے حد مضبُوط تھے۔ اُس نے مرزِطی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ چھاتی پر چرمی سینہ بند تھا۔ اُس کا نچلا لبادہ بھی چرمی تھا اور اُس نے گھٹنوں تک موٹی کھال چڑھا رکھی تھی۔ چند لمحوں تک ہم ایک دُوسرے کو نگاہ ہی نگاہوں میں تولتے رہے... پھر میں نے کہا...

"اگر تم مجھے قتل کرنے آئے ہو تو آگے بڑھو اور حملہ کرو۔ تمھارا بادشاہ بے چین ہو گا۔"

یہ سُن کر آسوری سُورما نے اپنے سُدھائے ہُوئے گھوڑے کی لگام کھینچی تو وہ اُچھلنے کُودنے اور کلیلیں کرنے لگا جب کہ پارس نے کندھے سے کمان اُتاری اور چلّے پر تیر چڑھانے لگا۔

میں نے اپنی ڈھال مضبُوطی سے تھام لی۔

میں چاہتا تھا کہ جب وہ تیر چلا چُکے تو اُس پر چڑھ دوڑوں۔ میرا گھوڑا اُس کے پستہ قامت گھوڑے سے بھاری بھرکم اور نسبتاً طاقتور تھا۔ اُس کے تصادم سے پارس اور اُس کا گھوڑا دونوں زمیں بوس ہو جاتے اور جب پارس گھوڑے کی پیٹھ سے محرُوم ہو جاتا تو میرا گُرز اُس کا کام تمام کرنے کے لیے کافی تھا۔

پارس نے نعرہ لگایا اور ایک ادائے بے نیازی سے چلّا کھینچا۔ میں نے ڈھال کی آڑ لے رکھی تھی مگر اُس نے مجھے نشانہ بناتے وقت پینترا بدل کر تیر میرے گھوڑے پر چلا دیا جو اس کے جھول میں اٹک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ جو کچھ میں اُس کے لیے سوچ رہا تھا، وہی وہ میرے لیے بھی سوچ چکا تھا اور پہلے ہی وار میں مجھے پیادہ دیکھنا چاہتا تھا۔

نشانہ خطا ہو جانے کے بعد اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے میرے گرد گھوڑا دوڑانے لگا۔

وہ بلا کا شہسوار تھا۔

کبھی گھوڑے کے ایک جانب جُھک کر غائب ہو جاتا اور کبھی ایک رکاب پر کھڑے ہو کر تیر چلا دیتا تھا۔

میں نے بھی اپنے گھوڑے کو مسلسل ایک ہی مقام پر گردش میں رکھا۔ ایک بار اُس نے رکاب سے لٹک کر اپنے گھوڑے کے پیٹ کے نیچے سے تیر چلایا جو میرے گھوڑے کے ٹخنے کو چھُوتا ہُوا زمین میں گڑ گیا۔

میرا گھوڑا بدکا اور الف ہو گیا مگر میں نے اسے سنبھال لیا۔ تھپکی دی تو وہ پُرسکون ہو گیا۔

میرا مدِمقابل اپنا ہر وار خالی جاتے دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا۔ اُس نے تیر چلانے بند کر دیے اور خالی چکر کاٹنے لگا۔

میں نے اپنا گُرز گھماتے ہُوئے اسے للکارا۔

"تم نے اپنا نام پارس بتایا تھا۔ کیا تمھاری زبان میں پارس بُزدل کو کہتے ہیں؟"

یہ سُن کر اُس نے ایک نعرہ لگایا اور گھوڑا دوڑاتا ہُوا خیمہ گاہ کی طرف چلا گیا۔ میں وہیں رُکا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ ایک نیزہ اور ڈھال لے کر پلٹا اور دُور ہی سے نیزہ تول کر برق رفتاری سے میری طرف بڑھا وہ جیسے ہی میرے قریب آیا، میں نے اپنا گھوڑا ذرا سا موڑ کر اُس کا نیزہ اپنی ڈھال پر روک لیا اور اس کے ساتھ ہی گُرز اُس کے سر پر مارا... لیکن اُس نے چشم زدن میں سر جُھکا کر میرا وار خالی کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔

کچھ دُور جا کر وہ پلٹا اور نیزہ تول کر پھر برق رفتاری سے میری طرف بڑھنے لگا۔

اس بار میں نے گُرز استعمال کرنے کی بجائے دُوسری چال چلی۔ جُونہی وہ میرے قریب آیا، میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اچانک اُس پر یلغار کر دی۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ نتیجتاً وہ نہ تو اپنے گھوڑے کو روک سکا اور نہ ہی اُسے روکنے میں کامیاب ہُوا۔ یُوں ہمارے گھوڑے ایک دُوسرے سے ٹکرا گئے۔

اس تصادم سے اُس کا گھوڑا لڑکھڑایا... مگر اُس کے گرنے سے پہلے ہی پارس نے اسے سنبھال لیا۔ اب اُس نے بھی غیر متوقع چال چلی۔ گھوڑے کو آگے لے جانے کی بجائے اس نے اُسے وہیں سے موڑا اور نیزے کی اَنی میرے جسم میں اُتار دینا چاہی لیکن میں نے اُسے ڈھال پر روک لیا۔

پیشتر اس کے کہ میں اُس پر گُرز سے وار کرتا، اُس نے دُوسرے ہاتھ سے مجھ پر تلوار کی ضرب لگائی۔ میں بھی غافل نہیں تھا۔ اُس کی تلوار میری ڈھال سے ٹکرا کر رہ گئی۔ اسی دوران میں نے اپنا خالی ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی طرف گھسیٹنا چاہا مگر اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ اُس کی گردن تک پہنچتا، وہ غوطہ کھا کر گھوڑے کی دُوسری جانب غائب ہو چکا تھا۔ پھر وہ گھوڑا دوڑاتا اپنی صفوں کی طرف نِکل گیا۔

پارس اور اُس کا گھوڑا دونوں سیماب صفت تھے۔ انھوں نے میری ساری ترکیبیں ناکام بنا دی تھیں۔

اب تک میں نے آسوری سُورما کو حملے میں پہل کرنے دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں اُسے تھکا کر اور اُس کے حملے کی نوعیت کا اندازہ کر کے اُس پر غالب آ جاؤں گا مگر یہ خیال دُرست ثابت نہ ہُوا۔

میں اُس کے تابڑ توڑ حملوں سے پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

میں نے اس کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ وہ زمین میں گڑے ہُوئے بھالوں میں سے ایک بھالا منتخب کر رہا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ اس طرح وہ دم لینا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے گھوڑے کو تھپکی دی اور پارس کے پلٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ بھالا لہراتا اور گھوڑا دوڑاتا ہُوا میری طرف آنے لگا تو میں نے بھی اپنا گھوڑا اُس کی جانب دوڑا دیا۔

اب میں پہل کرنا چاہتا تھا اور ایک بار پھر اپنا گھوڑا اُس کے گھوڑے پر چڑھانے والی ترکیب آزمانا چاہتا تھا۔ میں نے پارس کو

پُرّہ دینے کے لیے گُرز گھمانا شروع کیا تو اس نے ڈھال سنبھال لی اور بھالا بھی تان لیا۔ مگر میں نے ڈھال کی آڑ لیتے ہُوئے پُوری رفتار سے اپنا گھوڑا اُس کے گھوڑے سے ٹکرا دیا۔

میری توقع کے عین مطابق پارس کا گھوڑا اس ٹکر کی تاب نہ لا کر گرا تو فصیل سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہُوئے اور آسوریوں کی صفوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پارس گھوڑوں کی ٹکر سے قبل ہی کُود گیا تھا۔ اس نے پہلے سے اندازہ کر لیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہُوں، اس لیے اُس نے مجھ پر بھالے سے حملہ کرنے کی بجائے گھوڑوں کے تصادم سے قبل ہی چھلانگ لگا دی تھی اور اب اپنی صفوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔

میں نے اُسے گھیرنے کے لیے گھوڑا دوڑایا اور آسوریوں کے قریب پہنچ گیا لیکن نہ تو اُنھوں نے مجھ پر تیر برسائے اور نہ ہی نیزے یا بھالے پھینکے... بلکہ خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے۔

مجھ پر خون سوار ہو گیا۔

میں اپنے مدِمقابل کو جلد از جلد موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا جو جُل دیتا ہُوا میرے آگے، دائیں بائیں بھاگ رہا تھا وہ کبھی پیچھے پلٹتا اور کبھی آگے بڑھتا... مگر ہر بار میرے گُرز کی زد سے نکل جاتا تھا۔

میں جھنجلا گیا۔

میں نے اپنا خود سر سے اُتار کر پھینک دیا تاکہ اُسے آسانی سے نگاہ میں رکھ سکوں۔ اتنے میں پارس جو مجھ سے تقریباً پچاس قدم آگے نکل گیا تھا، ایک جگہ رُک گیا۔

اس نے اپنا بھالا زمین میں گاڑا، ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا اور چلّے پر تیر چڑھانے لگا۔

میں نے گھوڑا روک لیا۔

اگر میں آگے بڑھتا تو تیر کھا کر میرے گھوڑے کا بھی وہی حشر ہوتا جو پارس کے گھوڑے کا ہُوا تھا۔ مجھے گھوڑے کی اتنی فکر نہیں تھی جتنا کہ خود اپنا خیال تھا اگر میں گھوڑے سے گرتا تو مجھے سر میں چوٹ آنا یقینی تھا کیونکہ وہاں زمین بھی پتھریلی تھی اور ارد گرد بھی پتھر پھیلے ہُوئے تھے۔

پارس نے مجھے گھوڑے کی باگیں کھینچتے دیکھ کر نفرت سے میری طرف تھُوکا اور بولا: "تف ہے تجھ پر۔ تمھارے پاس گھوڑا ہے اور میں پیدل ہُوں، پھر بھی تم ڈر رہے ہو۔ آگے بڑھ کر مجھے ختم کیوں نہیں کرتے بزدل؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اشتعال دلا کر اپنے نشانے کی زد میں لانا چاہتا ہے۔

"گھبراؤ نہیں پارس! میں تمھیں ضرور ختم کروں گا۔ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ تمھیں کس طرح موت کے گھاٹ اُتاروں کہ مجھے اور دیکھنے والوں کو بھی مزا آ جائے۔"

وہ ہنس پڑا: "تو پھر ٹھیک ہے۔ جب تک چاہو، سوچ لو۔ مجھے بھی مرنے کی جلدی نہیں ہے۔"

میں نے گھوڑا کچھ آگے بڑھایا تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ اُس کے ترکش میں کتنے تیر باقی رہ گئے ہیں اور پھر میں نے اس کے بازو تیر گن لیے۔ وہ صرف تین تھے۔ میں نے سوچا کہ خطرہ مول لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر میں گھوڑے سے اُتر کر اُسے موت کے گھاٹ اُتاروں گا تو سب کے دلوں پر میری دھاک بیٹھ جائے گی... پھر شہزادی مرزانگی بھی یہی چاہتی ہے کہ مقابلہ برابر کا ہو۔ ممکن ہے، میرا یہ بہادرانہ اقدام آگے چل کر شاہ بتور سے معاملات طے کرنے میں کوئی اہم کردار ادا کرے۔

یہ سوچ کر میں گھوڑے سے اُتر گیا۔

میں نے گھوڑے کو تھپکی دے کر ایک طرف ہانک دیا اور آہستہ آہستہ پارس کی طرف بڑھنے لگا جو تیر کمان میں ڈالے، چلّا کھینچے بیٹھا تھا کہ جونہی میں اس کی زد میں آؤں تو وہ تیر چلا دے۔

میں گرز گھماتا ہُوا قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔

جب میرے اور اُس کے درمیان صرف بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا تو اُس نے تیر چلا دیا۔

"ٹھک" کی آواز کے ساتھ میری سپر نے سنسناتا ہُوا تیر روک لیا جو بصورتِ دیگر میری گردن میں پیوست ہو جاتا۔ میں نے تیر ڈھال سے نکال کر ایک طرف پھینکتے ہُوئے کہا: "اب تمھارے پاس صرف دو تیر باقی رہ گئے ہیں، پارس!"

"تمھاری موت کے لیے صرف ایک ہی کافی ہوگا، سردار سرفرزش!" اُس نے جواب دیا اور دُوسرا تیر چلّے پر چڑھانے لگا۔

میں ڈھال تولے اور گُرز گھماتے ہوئے بڑی احتیاط سے قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میرا مقابلہ ایک مَرد سے ہُوا ہے۔ تم نے گھوڑے سے اُتر کر ثابت کر دیا ہے کہ بہادروں کی طرح مقابلہ کرنا جانتے ہو۔ نسخے تاغانی ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔

میں قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔

"تم شکل و صورت سے تاغانی نہیں لگتے... پھر اُن مہذب

بے وقوفوں کے ساتھ کیوں مل گئے ہو۔ تمھیں تو ہم آسوریوں کے ساتھ ہونا چاہیے اجنبی۔ تم اپنی داڑھی کی وجہ سے بھی آسوری لگتے ہو حالانکہ آسوریوں میں تم جیسے لمبے چوڑے آدمی نہیں ہوتے۔"

... اور اچانک ہی اُس نے تیر چھوڑ دیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی کیونکہ اُس نے نشانہ نہیں لیا تھا۔ وہ تیر چھیلتا ہُوا میری ران زخمی کر گیا۔ درد کی تیز لہر نے مجھے تڑپا دیا... مگر میں نے خود پر قابو پاتے ہُوئے کہا: "اب صرف ایک تیر رہ گیا ہے، پارس!"

اُس نے وحشیانہ قہقہہ لگاتے اور نفرت سے تھُوکتے ہُوئے جواب دیا: "وہی ایک تیر تمھاری موت کا پیغام بھی بن سکتا ہے سردار سرفرزش! یا ہو سکتا ہے کہ بھُوری مٹی میرے ہی خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہو۔"

اب ہمارے درمیان صرف دس قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

پارس نے تیسرا تیر بھی چلّے پر چڑھایا اور بغیر کچھ کہے یا بغیر انتظار کیے اُسے بھی چھوڑ دیا۔ اس بار اُس نے میرے اُس حصّۂ جسم کا نشانہ لیا تھا جہاں زرہ بکتر کے تسموں کے درمیان ذرا سی جگہ خالی رہ گئی تھی... مگر میری سپر نے بروقت اسے ڈھانپ لیا۔ اس کے ساتھ ہی پارس نے دھاڑتے ہُوئے مجھ پر یلغار کر دی۔

میں نے ڈھال پھینک دی اور پھُرتی سے ایک جانب ہٹ کر تلوار نکال لی۔ اب میرے دائیں ہاتھ میں زنجیر والا گُرز اور بائیں میں تلوار تھی۔

اُس نے پلٹ کر مجھ پر تلوار سے وار کیا۔ میں نے اُسے تلوار سے روکتے ہُوئے گُرز چلایا لیکن وہ پینترا بدل کر اُس کی زد سے بچ گیا۔

میں نے آسوریوں کو اپنی گردنیں کٹواتے دیکھا تھا اور جانتا تھا کہ وہ کس طرح مردانہ وار اپنے سر مقتل کے چبوترے پر رکھتے تھے۔ اس لیے مجھے پارس کے بھاگنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اُسے یا تو مجھے مارنا تھا یا پھر میرے ہاتھوں مر جانا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر مجھ پر اندھا دُھند حملہ کر دیا۔ ہماری تلواریں آپس میں ٹکرائیں اور ایک دُوسرے کی روک بن گئیں۔ پارس نے اپنی تلوار پر اتنا دباؤ ڈالا کہ مجھے گُرز چلانے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ اس کا دباؤ لمحہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے اچانک اُس کے سینے پر لات ماری تو وہ لڑکھڑاتا ہُوا دُور جا گرا۔

میں نے گُرز گھما کر اسے نشانہ بنانا چاہا مگر وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہُوا اور پینترا بدل کر مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔

اب وہ بھی ہانپ رہا تھا اور مجھے بھی تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ گُرز اپنے وزن سے دُگنا بھاری لگ رہا تھا مگر ہم دونوں میں کسی کی ڈھیل اُس کی موت بن سکتی تھی۔ ہم سر دھڑ کی بازی لگائے ایک دُوسرے سے شمشیر زنی میں مصروف تھے۔

"تم دلیر ہو، سردار سرفرزش... مگر میں برفانی علاقوں میں تم سے کہیں زیادہ جسامت رکھنے والوں کو تہ تیغ کر چکا ہُوں!" یہ کہتے ہُوئے اُس نے بائیں ہاتھ سے کمر کی پیٹی سے خنجر بھی نکال لیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ تلوار سے لڑتے ہوئے قریب ہونا اور مجھے خنجر گھونپنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ چال بے حد خطرناک تھی کیونکہ میرے دائیں ہاتھ میں گُرز تھا اور بائیں ہاتھ میں تلوار تھی۔ وہ گُرز کی زد میں آ ہی نہیں رہا تھا اور کسی بھی وقت مجھے کائی دے کر خنجر گھونپ سکتا تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے گُرز گھمانا شروع کر دیا اور پھر ایک دم پیچھے ہٹا تو وہ گُرز کی زد میں آ ہی گیا۔

گُرز نے اُس کے گھٹنوں کی ہڈیاں توڑ دیں۔

وہ درد کے مارے چیختا ہُوا پیٹھ کے بل گرا۔ میں اس کی طرف لپکا تو پارس نے اس حال میں بھی تلوار سے اپنا دفاع کرنا چاہا مگر میری تلوار اُس کے نرخرے میں اُتر گئی اور بھُوری ریت اُس کے گلے سے اُبلنے والے خون سے اپنی پیاس بجھانے لگی۔

میں نے اپنے مدِمقابل کو خاک و خون میں ڈوبے دیکھ کر جوشِ مسرت سے فتح کا نعرہ لگایا جو فصیل پر بلند ہونے والے نعرہ ہائے تحسین میں مدغم ہو گیا۔ شہر پناہ پر تاغانی مارے خوشی کے تالیاں بجا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے اور ادھر آسوریوں پر مُردنی اور خاموشی چھا گئی تھی۔

میں نے سیٹی بجا کر اپنے گھوڑے کو بُلایا جو قریب ہی بھُوری مٹی میں اُگنے والی زرد زرد گھاس پر مُنہ مار رہا تھا۔ شاید اُسے بھی میری فتح یابی کا احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ بھی ہنہناتا اور کلیلیں کرتا میرے پاس آ گیا۔ جب میں اُس پر سوار ہونے لگا تو مجھے بوڑھے ایلچی کی ایک اور بات یاد آ گئی۔ آج صبح مقابلے کی تفصیل طے کرتے ہُوئے اُس نے کہا تھا کہ اگر میری قسمت یاوری کرے اور میں آسوری سُورما پر غالب آ جاؤں تو اپنی جیت کا بھرپور فائدہ اُٹھاؤں کہ آسوری بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔ یہی بات مجھے آزدر نے بھی بتائی تھی... مگر یہ بھی کہا تھا کہ وحشی آسوری صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔

جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر آسوریوں کی طرف جانے لگا تو مجھے احساس ہُوا کہ مقابلہ آسوریوں اور فصیل کے درمیانی حصّے میں شروع ہُوا

لیکن اس کا اختتام آسوریوں کی صف سے تقریباً سو قدم دُور ہُوا تھا۔

مَیں نے ایک نظر شاہ تمبور کی طرف دیکھا جو چوبی تخت پر بیٹھا اپنے سُورما کی لاش تک رہا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ مجھے اُس سے کن الفاظ اور کس پیرائے میں بات کرنا چاہیے کہ وہ جرأت و بہادری کے ساتھ ساتھ میری خود اعتمادی کا بھی قائل ہو جائے۔ اِدھر جاتے ہوئے مَیں نے اپنے ذہن میں ایک مختصر سی تقریر تیار کی...

"اے دھرتی ہلا دینے والے خادِ اعظم تمبور، تم نے بچشمِ خود دیکھ لیا کہ مَیں نے تمھارے سورماؤں کے سرخیل کو شکست دی ہے۔ اب معاہدے کے مطابق سادیہ میرے حوالے کردو اور کل کا سُورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اپنا لاؤ لشکر اُٹھا کر..."

ابھی مَیں اپنے ذہن میں تقریر کے اتنے ہی الفاظ دُہرا پایا تھا کہ اچانک میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور مَیں سر کے بل پتھریلی زمین پر گر گیا۔ ہُوا یہ کہ مَیں فتح کے زعم میں گردن اکڑائے اور گھوڑے کی لگام کھینچے آگے بڑھتے ہوئے شاہ تمبور کو دیکھ رہا تھا اور اس جال پر میری نظر نہیں پڑ سکی تھی جسے آسوریوں نے راستے میں بچھا رکھا تھا۔ اُنھوں نے گڑھا کھود کر اسے کھالوں اور مٹی سے ڈھک دیا تھا۔ تب مجھے بونے ایلچی کا انتباہ یاد آیا کہ زمین کا خیال رکھنا... مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور ہر شے دُھند میں گم ہوتی چلی گئی۔

جب مجھے ہوش آیا اور مَیں نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں میں مضبوط زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ دائیں اَبرو کے اوپر ایک سخت اُبھار پیدا ہو گیا تھا اور بائیں ٹانگ میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہُوئیں تو پتہ چلا کہ مَیں ایک سیاہ خیمے میں، گھوڑے کے بالوں کے بنے ہُوئے نمدے پر لیٹا ہُوا ہُوں۔

حواس پُوری طرح بحال ہُوئے تو مجھے ساری باتیں یاد آگئیں اور پھر باہر سے لوگوں کی آوازیں بھی سُنائی دینے لگیں۔ کہیں دُور سے موسیقی اور گانے کی صدا بھی آ رہی تھی جس میں لوگوں کا شور بھی شامل تھا۔ ہَوا کی سائیں سائیں بتا رہی تھی کہ وہ تیزی سے چل رہی ہے۔ مَیں سمجھ گیا کہ جس خیمے میں مجھے قید کیا گیا ہے، وہ آسوریوں کی خیمہ گاہ کے درمیان واقع ہے۔

یکایک خیمے کے دروازے کا پردہ ہٹا تو چاندنی کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی مگر دُوسرے ہی لمحے خیمہ پھر تاریکی میں ڈُوب گیا۔ پردہ ہٹا کر کوئی خیمے میں داخل ہُوا تھا۔

مَیں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔

اُٹھنے سے زنجیریں جھنجنا اُٹھیں۔

"کون ہے؟" مَیں نے پُوچھا۔

کوئی جواب نہ ملا تو مَیں نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔

اندھیرے میں کسی کی چاپ سُنائی دے رہی تھی مگر آنے والا خاموش تھا۔ میرے دل میں اُمید کی ایک کرن چمکی کہ آنے والا میرا دوست ہی ہو سکتا ہے، دُشمن نہیں کیونکہ دُشمن کو خاموشی اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنے میں چقماق رگڑنے کی آواز آئی اور ایک دیا روشن ہو گیا۔

دیا جلانے والا وہی بونا ایلچی تھا۔

"اوہ... تو تم ہو خادِ اعظم۔ مَیں تمھارے انتباہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا ورنہ یُوں زنجیروں میں نہ جکڑا ہوتا۔ براہِ کرم آیندہ مجھ سے پہیلیوں میں باتیں نہ کرنا۔"

بونا یہ سُن کر جلدی سے میرے قریب آیا اور اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دیے کی مدھم روشنی میں مجھے اُس کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے لرزتے نظر آگئے... مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ اس عالم میں بھی مسکرائے جا رہا تھا۔ پھر وہ فوراً ہی خیمے سے نکل گیا۔

میری سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ کیا چکر ہے؟

چند لمحوں کے بعد بونا واپس آیا اور میری دسترس سے باہر بیٹھ کر سرگوشی میں بولا: "شکر ہے کہ تمھاری بات کسی نے نہیں سُنی اور مَیں بچ گیا۔ آیندہ اپنی زبان قابو میں رکھنا اور اُس بات کا ذکر کبھی نہ کرنا۔"

"اچھا۔" مَیں نے کہا۔ "کیا تم میری مدد کے لیے آئے ہو؟"

"اُونہوں۔" وہ بولا۔ "اگر مَیں تمھاری مدد کے قابل ہوتا تو بھی کچھ نہ کر سکتا مگر تم میری مدد ضرور کر سکتے ہو سردار سرفروش!... اور وہ یُوں کہ اُس تنبیہ کو بھُول جاؤ ورنہ میرا حشر بھی تم سے مختلف نہیں ہوگا۔"

یہ کہتے ہُوئے بھی وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا مگر مسکراہٹ اب بھی اُس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

"اچھی بات ہے دوست! مَیں وہ بات ہمیشہ کے لیے بھُول گیا۔" مَیں نے کہا۔

اب بونا خاموشی سے میرا اور مَیں اُس کا جائزہ لینے لگا۔ ہم نے ایک دُوسرے کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔

بونا مجھے ایلچی کم اور مسخرہ زیادہ نظر آیا۔ اُس کی مخروطی ٹوپی کے پھُندنے میں گھنگھرو بندھے ہُوئے تھے اور گلے میں لوہے کا طوق پڑا ہُوا تھا۔ اُس نے چمڑے کا تنگ لباس پہن رکھا تھا اور اُس کے جوتوں

کی نوکیں بہت لمبی اور اُوپر کو اُٹھی ہُوئی تھیں۔ یہ ساری چیزیں اُسے درباری مسخرہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ چونکہ مجھے موجودہ صورتِ حال میں کسی ہمدرد اور دوست کی ضرورت تھی اس لیے مَیں نے ٹوہ لگانے کی خاطر پُوچھا۔

"کیا خادِ اعظم یا سادیہ جانتی ہے کہ تم اس وقت یہاں آئے ہو؟"

بونے نے اچانک اُلٹی قلابازی لگائی اور تن کر بولا: "خادِ اعظم نہیں جانتا البتہ سادیہ جانتی ہے مگر تم مجھ سے سوال کرنے والے کون ہوتے ہو۔ پُوچھ گچھ کرنے کے لیے تو مجھے بھیجا گیا ہے۔"

"تمھیں کس نے بھیجا ہے اور تمھارا نام کیا ہے، خادِ اعظم؟"

"مجھے مارنو کہتے ہیں اور مَیں سادیہ کا معتمدِ خاص ہُوں۔ اُس نے مجھ سے تمھارے متعلق رائے مانگی ہے۔"

"تو پھر اُسے ایسی رائے دینا جو میری زندگی کی ضمانت بن سکے۔ مَیں کبھی نہ کبھی تمھارے اس احسان کا بدلہ ضرور چُکا دُوں گا۔"

بونا کوئی جواب دینے کی بجائے سر کے بل ہاتھوں پر کھڑا ہو گیا اور پھر ہتھیلیوں پر چلتا ہُوا خیمے کے اندر چکر لگا کر میرے سامنے آ رُکا۔ اب بھی اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے اُس کی بتیسی جھانکنے لگتی تھی۔ مجھے اُس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہُوئی۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہر وقت مُسکرا کر اپنی بتیسی دکھاتے رہو؟ یہ مذاق کا موقع نہیں ہے مختصر خاں!"

یہ سُن کر بونے نے قلابازی کھائی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولا: "مَیں ہر وقت مسکراتے رہنے پر مجبور ہُوں سردار سرفروش! مَیں خاندانی احمق ہُوں۔ جب مَیں ننھا سا بچہ تھا تو جراحوں نے باچھیں چیر دی تھیں۔ غور سے دیکھو تو تمھیں ان چیروں کے نشان نظر آجائیں گے۔ یہ اُنھوں نے اس لیے کیا تھا کہ میری باچھیں ہمیشہ کھلی رہیں اور مَیں مرنے کے بعد بھی اسی طرح مسکراتا نظر آؤں۔"

مَیں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی باچھوں کے پاس واقعی چیرے کے نشان موجود تھے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ مَیں نے بھی اُسے نہ کُریدا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ خود ہی کچھ بولے... پھر اُس نے نتھنے میں اُنگلی ڈال کر کچھ سوچا اور سرگوشی میں بولنے لگا۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے، سردار سرفروش! ایک ایسے آدمی کے ساتھ جو اذیت ناک موت مرنے والا ہو، ہمدردی کے سوا کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟... مگر تم نہ تاغانی ہو اور نہ ہی آسوری... پھر تم کیا ہو؟ ہمارے جاسوس تمھارے متعلق صرف اتنا ہی جان سکے ہیں کہ ملکہ ہوشی تم سے بے حد خوش تھی۔ اُنھیں یہ بھی معلوم ہُوا تھا کہ تم فارس سے خصوصی اختیارات کے ساتھ یہاں آئے ہو... مگر یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ملکہ ہوشی نے اپنے شوہر شاہ افشار کے اچانک غائب ہو جانے پر سوگ منانے کے لیے مخصوص لباس پہننے کی بجائے ہار سنگار کیوں شروع کر دیا ہے۔ وہ غم زدہ دکھائی دینے کی بجائے تمھارے ساتھ چہکتی بہکتی رہتی ہے۔ آخر یہ کیا چکر ہے سردار سرفروش؟"

میرے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا کہ مَیں جو چاہوں اُسے بتا دُوں اور وہ اُسے بڑھا چڑھا کر آگے بتا دے۔ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شاہ تمبور بے حد لالچی اور عیار آدمی ہے اور اس کی بہن بدنامیوں میں کوئی ثانی نہیں رکھتی۔

"شاہ افشار مر چکا ہے اور گدھ اُس کی ہڈیاں تک چٹ کر گئے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ مَیں فارس سے آیا ہُوں۔ مجھے شہنشاہِ معظم نے شاہ افشار کی جگہ بھیجا ہے اور وہ یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ تم آسوریوں کو اب تک مغلوب کیوں نہیں کیا جا سکا۔ فارس میں سبھی یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ آخر سالہا سال سے جنگ کیوں لڑی جا رہی ہے؟"

مارنو اپنی سیاہ چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا جن میں مجھے یقین کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی۔

"اچھا مَیں یہ باتیں سادیہ کو بتا دُوں گا۔" پھر وہ مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھتے ہُوئے بولا۔ "اور اسے وہ بات بھی بتا دُوں گا جس میں وہ سب سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے... یعنی تم اُس کے بہترین غلام بن سکتے ہو۔ تم سے وہ ایسا کام لے سکتی ہے جو دُوسرے غلاموں سے نہیں لیا جا سکتا۔ ممکن ہے، اِسی بنا پر وہ خادِ اعظم سے تمھاری جان بخشی کرا دے۔"

میرے دل میں ایک بار پھر اُمید کی کرن چمکی۔ مَیں نے کہا۔ "مگر سادیہ مجھے خادِ اعظم سے کیسے بچا سکتی ہے مختصر خاں؟ ہمارے جاسُوسوں نے بتایا تھا کہ وہ خود شاہ تمبور کی قیدی ہے اور اگر مَیں مقابلہ جیت جاتا تو وہ میرے حوالے کر دی جاتی۔ ان باتوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں بہن بھائی ایک دُوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں... پھر شاہ تمبور، سادیہ کا کہنا کیسے مان لے گا؟"

"ہاں!" مارنو بولا۔ "وہ ایک دُوسرے سے نفرت کرتے ہیں، کرتے تھے اور ہمیشہ کرتے رہیں گے... مگر اس کے باوجود وہ بہن بھائی ہیں... اور جب تک زندہ ہیں، دونوں مِل کر ہم آسوریوں پر حکومت کریں گے۔ اقتدار میں دونوں کا حصّہ ہے اور زندگی بھر رہے گا۔ وہ آپس میں مستقل جھگڑتے اور صُلح کرتے رہتے ہیں

اور آیندہ بھی ایسا ہی کرتے رہیں گے۔ آج جب تم نے مقابلہ جیت کر ہار دیا ہے تو اس خوشی میں شاہ تمبو نے سادیہ کو اپنے خیمے سے باہر آنے کی اجازت دے دی ہے۔ آج رات اس خوشی میں ایک تقریب بھی منعقد کی جا رہی ہے جس میں تمھاری قسمت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اسی لیے یہاں آیا ہوں کہ تقریب سے پہلے سادیہ کو رائے دے سکوں۔ اگر تم اُس کے لیے کام کے آدمی ہوئے تو وہ تمھاری جاں بخشی کی کوئی صورت نکال ہی لے گی۔"

"مگر کیسے؟" میں اطمینان چاہتا تھا۔ "خادِ اعظم اس کی بات رد بھی تو کر سکتا ہے۔"

"نہیں... آج سادیہ کا پلہ بھاری ہے۔ وہ اس لیے کہ اگر تم اپنی حماقت سے جیتی ہوئی بازی نہ ہار جاتے تو خادِ اعظم، سادیہ کو تمھارے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس طرح اُسے اپنی بہن سے نجات بھی مل جاتی... مگر چونکہ پانسہ پلٹ گیا ہے اس لیے وہ سادیہ کی بات نہیں ٹال سکے گا۔"

"اور سادیہ اُس سے مجھے بطور غلام مانگ لے گی؟" میں نے پوچھا۔

"اگر تمھاری قسمت یاور ہوئی اور تم سادیہ کو پسند آ گئے تو یقیناً ایسا ہو گا، ورنہ کل صبح تمھیں اذیتیں پہنچا کر ہلاک کر دیا جائے گا... اور جانتے ہو تمھیں کس طرح ہلاک کیا جائے گا... نہیں، تم نہیں جانتے۔ مجھ سے سنو۔ تمھیں فصیل کے سامنے میدان میں پابہ زنجیر لے جایا جائے گا۔ سارے تاغانی فصیل سے یہ منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ اُن سے کہا جائے گا کہ وہ توپ خادِ اعظم کے حوالے کر دیں... مگر وہ توپ نہیں دیں گے... پھر اُن کے سامنے تمھیں قسم قسم کی اذیتیں دی جائیں گی۔ تمھیں تیروں کی نوک سے کچوکے اور برچھیوں سے چرکے لگائے جائیں گے۔ تم چیخو گے، چلاؤ گے مگر تمھاری فریاد کوئی نہیں سنے گا... اور جب تم دم توڑ دو گے تو ہمارے گھوڑے تمھاری لاش روند ڈالیں گے۔"

یہ خوفناک باتیں کرتے ہوئے بھی بونے کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مجھے اپنے حشر سے خوف کے ساتھ ساتھ بونے کی مسکراہٹ سے گھن بھی آئی اور رحم بھی آیا۔ یہ غریب اپنی شدید ترین تکلیف پر بھی مسکراتا دکھائی دینے پر مجبور تھا۔

اچانک ایک سیاہ فام خیمے میں داخل ہوا۔

اُس نے ایک خاص ادا سے بونے کے سامنے تلوار لہرائی۔ بونا تن کر کھڑا ہو گیا اور پھر اچانک اس نے اُلٹی زقند بھری تو سیاہ فام جلدی سے واپس چلا گیا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا چکر ہے۔

اگر وہ سیاہ فام پہرے دار تھا تو یوں کیوں بھاگ نکلا؟

"یہ خواجہ سرا، سادیہ کا غلام ہے۔ خادِ اعظم نے اپنے پہرے داروں کی بجائے تمھاری نگرانی سادیہ کے خواجہ سرا غلاموں کو سونپ دی ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ شاید تمھاری جاں بخشی ہو جائے۔ تاہم یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہوتا وہی ہے جو خاکِ سیاہ پر پہلے سے تحریر کیا جا چکا ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

اُس نے دو قلابازیاں کھائیں اور خیمے کے دروازے پر پہنچ گیا مگر باہر نکلنے سے پہلے رُک گیا۔

"میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کروں گا کہ سادیہ تمھیں اپنا غلام بنا لے۔ میرا مطلب سمجھ گئے یا نہیں؟" اُس نے پلٹ کر پوچھا۔

"اگر وہ ساری باتیں سچ ہیں جو میں سادیہ کے بارے میں سنتا رہا ہوں تو تمھارا مطلب اُس کی ذات کے لیے مخصوص غلامی سے ہو سکتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔" بونا بولا۔ "اور تمھارے لیے یہ کوئی مشکل یا نیا کام نہیں۔ ملکہ ہوشی تمھاری انھی خدمات کی وجہ سے خوش تھی... اور ہاں جانے سے پہلے تمھیں اتنا اور بتا دوں کہ خوف کا اظہار بالکل نہ کرنا اور بہادر بننا... مگر بہت زیادہ بہادر بننے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں زندہ و سلامت دیکھنا چاہتا ہوں، سردار سرفروش!" یہ کہہ کر وہ خیمے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی سیاہ فام تین پہرے داروں کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا۔ انھوں نے تلواروں کے علاوہ مشعلیں بھی اُٹھا رکھی تھیں۔ وہ گونگوں کی طرح غوں غاں کرتے ہوئے تلواروں کے اشارے سے مجھے اُٹھنے اور جسم کے گرد ایک چادر لپیٹنے کی ہدایات دینے لگے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ میرا خیال ہے، اُن کی زبانیں کاٹنے کے ساتھ ساتھ اُنھیں کسی عمل کے ذریعے بہرا بھی بنا دیا گیا تھا۔

میں نے وہ چادر اپنے جسم پر لپیٹ لی۔

خیمے کا دروازہ کھلا اور ایک عہدے دار داخل ہوا۔ اُس نے کینہ توز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں آسوری لشکر کا سُورنیا اور حاکمِ دوراں، خادِ اعظم کا معتمدِ خاص رُستم ہوں۔ تمھیں خادِ اعظم اور اس کی ہمشیر سادیہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ کیا تم چلنے کے لیے تیار ہو، اجنبی؟"

آنے والے کا تکبر آمیز اندازِ تخاطب، لباس اور چال ڈھال اس اَمر کی تصدیق کر رہی تھی کہ وہ واقعی لشکر کا اعلا عہدے دار ہے۔ میں نے آسوریوں میں اتنا قدآور اور جسیم آدمی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں آسوریوں کی طرح سیاہ نہیں بلکہ گہری بھوری تھیں۔

وہ میری طرف نفرت و نخوت سے گھور رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ آغاز ہی سے خود اعتمادی اور حوصلے کا مظاہرہ کیا جائے تو بہتر ہو گا۔

"مجھے لفظ اجنبی سے خطاب نہ کرو کمان دار۔ میں سردار سرفروش ہوں۔ فارس سے آیا ہوں۔ میری رہائی کے لیے تم لوگوں کو کافی بڑا تاوان ادا کیا جائے گا اس لیے مجھ سے آبرو مندانہ سلوک کرو۔ وہ سلوک جس کا میں مستحق ہوں ورنہ بعد میں تمھیں پچھتانا پڑے گا۔"

اُس کی بھوری آنکھیں اس طرح سکڑ گئیں جیسے اُسے میری کسی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر وہ مسکرایا تو اُس کی گھنی داڑھی مونچھ سے اس کے دانت چمکتے نظر آنے لگے۔ اُس نے سر کو ذرا سا خم دیا اور طنزیہ انداز میں بولا۔

"مجھے اپنے رویے پر ندامت ہے، سردار سرفروش! میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے لیکن میں نے کہیں ایسا خطاب نہیں سنا جو تمھارے نام کے ساتھ ہے۔ کیا تم اس پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کرو گے؟"

اُس کے لب و لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی ہے اور آسوری نہیں ہو سکتا۔ میں نے اُسے مرعوب کرنے کے لیے کہا...

"تاغان کے جنوب میں بہت دُور ایک ایسا عظیم معاشرہ قائم ہے جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں کیونکہ وہاں کسی غیر قوم کے آدمی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ سردار کا خطاب وہاں کی عظیم اور اہم ترین شخصیتوں کو دیا جاتا ہے۔ وہاں کے شہنشاہ کے بعد میری شخصیت سب سے زیادہ اہم ہے۔ میرے قد و قامت اور خد و خال سے تم خود بھی اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں تاغانی نہیں ہوں۔ اپنے پُراسرار معاشرے کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کے باعث میں کسی پر یہ انکشاف نہیں کر سکتا کہ میں کون ہوں۔ تمھارے لیے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ میں دنیا کی ایک ایسی سرزمین سے آیا ہوں جہاں آبِ حیات تیز رَو ندی کی صورت بہتا ہوا موت کے اندھے ریگ زاروں میں گم ہو جاتا ہے۔ جس طرح تقدیر کی تختی پر جسے تم خاکِ سیاہ کہتے ہو، میری آمد کا وقت لکھا ہوا تھا۔ اُسی طرح واپسی کا لمحہ بھی تحریر کر دیا گیا ہے اور وہ لمحہ آتے ہی میں اُس پُراسرار سرزمین کی طرف واپس چلا جاؤں گا۔ جسے تم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا، جسے کسی کی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ ہی تم میں سے کسی کی آنکھ دیکھ سکے گی۔"

میرا خیال تھا کہ وہ میری ان گول مول باتوں سے مرعوب ہو جائے گا لیکن اُس نے اُن کا کوئی اثر قبول نہ کیا، البتہ اس کے پیچھے کھڑے سپاہی کچھ بے چین سے ہو گئے۔

کمان دار رستم نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور بولا۔ "یہ باتیں خادِ اعظم کو بتانا سردار سرفروش! ممکن ہے اُسے اِن پر یقین آ جائے۔" وہ اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو، اسے لے چلو مگر نہ اس سے کوئی بات کرنا اور نہ ہی اس کی بات سننا ورنہ مسحور ہو جاؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی ایڑی پر گھوما اور خیمے سے نکل گیا۔

آسوریوں کی خیمہ گاہ سے گزرتے ہوئے میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ میرے ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ہر قدم پر زنجیریں اور بیڑیاں نہ صرف جھنجھنا اُٹھتی تھیں بلکہ چلنے میں بھی رکاوٹ پیدا کر رہی تھیں۔ میرے اردگرد سپاہی بے نیام تلواریں لیے چل رہے تھے اور تاغان کی فصیل ایک میل دُور دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔

میرے لیے فرار کا ہر راستہ مسدود تھا اور جائے پناہ کوئی نہیں تھی۔ اس لیے میں کسی جیالے سرفروش ہی کی طرح تن کر آگے چلتا رہا۔ اب بھی میری کوشش یہی تھی کہ کمان دار رستم مجھ سے مرعوب ہو جائے۔ وہ ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔

خیموں کے درمیان ایک جگہ چھوٹے سے میدان میں مجھے دس بارہ آدمی دار پر لٹکے دکھائی دیے۔ یہ سب آسوری تھے۔ ان میں سے کچھ کو پھانسی دی گئی تھی اور کچھ اُلٹے لٹکے ہوئے تھے مگر سب مر چکے تھے۔ اُن کی بے لباس لاشیں صرف عبرت دلانے کے لیے لٹکتی چھوڑ دی گئی تھیں۔

بڑا ہی دل دوز منظر تھا۔

معاً رستم پلٹا اور سفاک مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم نے خادِ اعظم کے انصاف کا نمونہ دیکھا، سردار سرفروش؟ ان میں سے کوئی چور تھا، کوئی بھگوڑا، کوئی قاتل اور کسی کی زبان سے خادِ اعظم کے خلاف الفاظ نکلے تھے۔ ویسے تمھارے تاوان میں کیا کچھ مل سکتا ہے؟" یہ کہہ کر اُس نے خوفناک قہقہہ لگایا۔

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر سرسراتی محسوس ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے ہر خوف اپنے قلب و ذہن سے جھٹک دیا اور اپنی بقا کے بارے میں سوچنے لگا کیونکہ اس سرزمین پر درحقیقت یہی میرا فرض بھی تھا۔

میدان کے بعد پھر خیموں کی قطاریں شروع ہو گئیں جہاں سے کھانا پکانے کی خوشبو اور بچوں کا شور میری توجہ بٹانے لگا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ہم خیمہ گاہ کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں سے مجھے

ہزاروں گھوڑے اور خچر بیٹھے، بیٹھے اور چرتے دکھائی دیے۔ چاروں طرف اُن کے رکھوالے موجود تھے... پھر ہم چھکڑوں کی ایک لمبی قطار کے پاس سے گزرے۔ یہ چھکڑے چاروں طرف سے بند تھے اور باہر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ چھکڑوں کے اندر سے رونے، گالیاں بکنے اور گلنے کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ رستم نے اپنی تلوار سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ غلاموں کے چھکڑے ہیں، سردار سرفروش! اگر تقدیر تم پر مہربان ہوئی تو ان میں سے کسی ایک پر تمہیں بھی جگہ مل جائے گی!"

کچھ اور آگے بڑھے تو سب سے الگ تھلگ ایک بہت بڑا خیمہ دکھائی دیا۔ جس کے چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں اور پہریدار متعین تھے۔ یہ خادِ اعظم تمبور کا خیمہ تھا۔ خیمے کے اندر سے طنبورے، دَف اور قرنا پر مشتمل موسیقی کی آوازیں آرہی تھی۔

ہم دروازے پر رُک گئے۔ جہاں دو نیزے گڑے ہوئے تھے اور اُن پر گھوڑوں کی دُمیں لہرا رہی تھیں۔ ان کے درمیان ایک اور لمبے نیزے پر انسانی کھوپڑی ٹنگی ہوئی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ کھوپڑی مجھ پر ہنس رہی ہو۔

کمان دار رستم نے ایک چوبدار کے ذریعے ہماری آمد کی اطلاع بھجوائی۔ جب چوبدار نے خیمے کے دروازے کا پردہ ہٹایا تو مجھے ایک نوشباب رقاصہ کی جھلک دکھائی دی جو ایک تخت کے سامنے محوِ رقص تھی۔ اس کا سراپا مشعلوں کی روشنی میں دہکتا نظر آتا تھا۔ وحشت آمیز موسیقی کی لے تال پر اس کا انگ انگ متحرک رہا تھا۔ مجھے لانے والے سپاہیوں میں سے ایک نے کہا: "آج تو صنوبری کا رقص شباب پہ ہے!"

دُوسرا ہنستے ہوئے بولا: "یہ رقاصہ عمدگی کا نایاب نمونہ ہے!"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ میں نے اپنی تنخواہ پس انداز کرنا شروع کر دی ہے تاکہ ایک شب اسے اپنے خیمے میں مہمان بنا سکوں۔" تیسرے نے کہا۔

اس بات پر تمام پہریدار ہنس پڑے۔ رستم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "احمق... تمہیں اس کی ایک شب کی میزبانی کے لیے اپنی زندگی بھر کی تنخواہ خرچ کرنا پڑے گی!"

اتنے میں خیمے کا دروازہ پھر کھلا اور چوبدار نے اُلٹے پاؤں نکل کر کمان دار کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ رستم نے بازو سے پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور خیمے میں داخل ہو گیا۔ میری زنجیریں اور بیڑیاں جھن جھنا اٹھیں۔

چند قدم آگے بڑھ کر رستم نے میرا بازو چھوڑ دیا اور اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے قہر آلود نظروں سے اُسے دیکھا اور پھر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اب سب کی نگاہیں مجھ پر جم گئی تھیں۔ موسیقی بند ہو گئی۔ رقص تھم گیا اور ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ میرے لیے ہر آنکھ میں نفرت تھی، ہر جبیں پُرشکن تھیں اور میں شاہ تمبور کے بھرے پُرے دربار میں اپنے آپ کو یکسر تنہا محسوس کر رہا تھا۔

"اسے آگے لاؤ!" خادِ اعظم نے جو اپنے تخت پر نیم دراز تھا، حکم دیا: "تاکہ میں دیکھ سکوں کہ میرے سورما کو شکست دینے والا کیسا آدمی ہے؟"

یہ سن کر رستم نے مجھے آگے دھکیلا اور دھیمی آواز میں کہا: "تخت کے پاس جا کر گھٹنے ٹیک دو اور سر خم، زبان بند رکھو!"

میں اس طرح آگے بڑھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں نہیں بلکہ پھولوں کے ہار پڑے ہوئے ہوں، میرے جسم پر محض ایک چادر نہیں بلکہ زربفت کا لباس ہو... اور سر پر تاجِ شاہی جگمگا رہا ہو۔ میں نے نہ گھٹنے ٹیکے اور نہ ہی اپنا سر خم کیا۔ بس ایک باوقار فاتح کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ بونا مارنو بھی ایک جانب بیٹھا میری طرف دیکھ رہا ہے مگر اس کی آنکھوں میں آشنائی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔

خادِ اعظم مجھے غور سے دیکھنے کے لیے اُٹھ بیٹھا۔

وہ دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کے شانے چوڑے نہیں تھے اور اس کی بائیں آنکھ پر پڑا ہوا کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا کسی ایسے بحری قزاق کی یاد دلا رہا تھا جس کی آنکھ جاتی رہی ہو۔ وہ جھک کر اپنی دائیں آنکھ سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے بھی اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں تو وہ تخت پر پہلو بدلتے ہوئے غصے اور تعجب سے بولا: "تمھاری یہ جرأت کہ میرے سامنے یوں تن کے کھڑے ہو!"

"ہاں... سردار سرفروش، نہ تو کسی آدمی کے سامنے جھکا ہے اور نہ ہی کبھی جھکے گا!" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

میری اس بات پر کسی نے سسکاری سی لی اور کوئی پھیکے سے انداز میں ہنس دیا، پھر فوراً ہی خاموشی چھا گئی۔

شاہ تمبور نے گردن موڑ کر ایک عورت کی طرف دیکھا جو اس کے پہلو میں تخت سے قدرے چھوٹی شاہی نشست پر بیٹھی تھی۔ "تم اسے اپنا غلام بنانا چاہتی تھیں سادیہ... لیکن تم نے دیکھا یہ کیسا آدمی ہے؟ غلام ایسے تو نہیں ہوتے!"

سادیہ نے آنکھوں سے نیچے باریک نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس کی بلوری آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ میں نے بھی اس سے نگاہیں ملائے رکھیں۔ اُن آنکھوں میں بلا کی کشش تھی اور ملکہ لالی اگر اس سے رقابت محسوس کرتی تھی تو اس کی رقابت بے جا نہیں تھی۔ سادیہ حُسنِ وحشی کا نمونہ تھی اور اُس کی آنکھیں جسے بھی دیکھتیں اسے اپنا بنا لیتی تھیں۔

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے، سادیہ۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں سردار سرفروش کو کچھ آداب سکھانے چاہئیں!" شاہ تمبور نے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا: "اسے گھٹنے ٹیکنا سکھاؤ!"

یہ سنتے ہی سپاہیوں نے نیزوں کے پچھلے سرے میرے گھٹنوں پر مارنے شروع کر دیے مگر میں نے گھٹنے اکڑا لیے اور اس تکلیف کی پروا نہ کی جو ہر ضرب کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اچانک سادیہ نے اپنا ہاتھ بلند کر کے انہیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ اس کا ہاتھ نرم و نازک تھا اور انگلیاں مخروطی تھیں۔ پھر وہ بولی: "بیلوں اور غلاموں کو پیٹا جاتا ہے لیکن یہ شخص نہ بیل ہے اور نہ ہی ابھی غلام بنایا گیا ہے!" یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی کی طرف پلٹی اور سرگوشیوں میں اس سے بات کرنے لگی۔

میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے تو زنجیروں کی جھنکار خیمے کی خاموشی میں گونج گئی۔

میں نے سادیہ کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اُس نے اپنے شب رنگ بال ایک مخروطی جوڑے کی شکل میں باندھ رکھے تھے اور ایک چھوٹی سی تنگ واسکٹ پہن رکھی تھی جس نے اُس کا حُسن نمایاں تر کر دیا تھا۔ اُس کے پاؤں چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت تھے۔ اس نے ہاتھوں کی طرح پاؤں کے ناخنوں پر بھی کوئی خوش رنگ روغن لگا رکھا تھا اور اس کے ٹخنوں میں طلائی کڑے سجے مگر کر رہے تھے... لیکن آنکھوں کے نیچے سے گردن تک اُس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس لیے میں یہ نہ جان سکا کہ اُس کے رخساروں اور ہونٹوں کو کن پھولوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

وہ سرگوشیوں میں مصروف تھی جن کے جواب میں شاہ تمبور سر کی جنبش سے انکار کیے جا رہا تھا۔

یہ خاموشی میرے لیے جان لیوا ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر بونے مارنو کی طرف دیکھا مگر اُس نے مجھ سے نگاہ ملانے کی بجائے چار گیندیں اچھالنا شروع کر دیں اور اپنی نگاہوں کو اُن پر مرتکز کر دیا۔

"ٹھیک ہے!" شاہ تمبور نے کہا: "یہ اس وقت تک تمھاری تحویل میں رہے گا جب تک کہ اس کی رہائی کے لیے تاوان وصول نہیں ہو جاتا!"... پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "تم نے سُن لیا۔ تم جو اپنے آپ کو سردار سرفروش کہتے ہو۔ کیا تمھارے تامان اور فارس والے دوست تاوان ادا کر دیں گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا: "وہ تاوان ضرور ادا کریں گے۔" شاہ تمبور: "مگر اس کے لیے تمھیں اپنا پیامبر فارس بھیجنا پڑے گا کیونکہ شہر پناہ کے پیچھے تامانیوں کے پاس اتنا خزانہ نہیں ہے!" میں نے یہ بات اس لیے کی تھی کہ ہو سکتا ہے ملکہ ہوشی زرِ تاوان دینے پر آمادہ نہ ہو۔ میری اس بات کے جواب میں شاہ تمبور نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ اس مقصد کے لیے مجھے اپنا آدمی فارس بھیجنا پڑے گا۔ تمھاری گرفتاری کے بعد میں نے ملکہ ہوشی کو پیغام بھیجا تھا مگر وہ توپ دینے کے لیے رضامند نہیں ہوئی۔ اگر مجھے توپ نہ ملی تو پھر مجھے تامان کا آدھا خزانہ ملنا چاہیے!"

خیمے میں کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں تو شاہ تمبور نے ہاتھ اُٹھا کر حاضرین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا: "سنو... میں اس آدمی کو غلام کے طور پر اپنی بہن سادیہ کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ وہ جو سلوک چاہے، اس کے ساتھ کرے مگر اسے تاوان وصول کرنے کے لیے زندہ رکھے!" پھر وہ سادیہ کی طرف پلٹا: "میں، تمھیں اس پر تشدد کرنے سے نہیں روکتا... مگر یہ خیال رکھنا کہ تاوان کی وصولی تک اس کا دم نہیں نکلنا چاہیے اور میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ مجھے دھوکا دیا جائے!"

یہ کہہ کر اُس نے یُوں ہاتھ اُٹھائے جیسے معاملہ ختم ہو گیا ہو... پھر اُس نے بونے مارنو کی طرف دیکھا۔ بونے نے پھرتی سے ایک بڑے برتن میں ہاتھ ڈال کر برف میں لگا ہوا تربوز نکالا، اس کے دو ٹکڑے کیے اور شاہ تمبور کی خدمت میں پیش کر دیے۔ شاہ تمبور تربوز بڑے شوق سے کھاتا تھا اور اُنھیں ٹھنڈا رکھنے کے لیے دُور دراز سے پہاڑی برف منگواتا تھا۔ اُس نے تربوز پر مُنہ مارتے ہوئے میری طرف دیکھا... پھر اس کا گُودا چباتے ہوئے سادیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں تو میری ہمشیر! یہ اب تمھاری تحویل میں ہے مگر یہ دیکھ لو کہ تم اسے غلام بنا سکتی ہو یا نہیں۔ غلام بنانے کے لیے اس پر اتنا تشدد نہ کرنا کہ یہ مر جائے اور میں تاوان سے محروم ہو جاؤں!"

شاہ تمبور کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھے جان سے نہیں

جائے گا اور سادیہ میرے لیے دُوسری ملکہ لالی ثابت ہوگی جس کی آنکھیں ایک بار پھر مجھ پر مرکوز ہوگئی تھیں۔ وہ میرے قد و قامت، خدو خال اور مضبُوط اعضا کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے اس جائزے سے اُس کی آنکھوں میں چمک آگئی ہو... پھر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ایک اُنگلی سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا:

"تم اب سردار سرفروش نہیں بلکہ میرے غلام ہو۔ میرے قریب آؤ غلام۔ بعد میں اگر تم نے میری خوشنودی حاصل کرلی تو میں تمھیں دُوسرا نام دے دُوں گی۔"

میں پُروقار انداز سے اُس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

ہم دونوں کی نگاہیں چار ہُوئیں تو سادیہ نے اپنی نشست والے قالین پر اُنگلی مارتے ہُوئے کہا۔ "تم نے خادِ اعظم کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے لیکن میرے سامنے ضرور جُھکو گے کیونکہ اب تم میرے غلام ہو۔"

مجھے میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اگر میں اپنی بات پر نہ اڑا رہا اور سادیہ کے سامنے جُھک گیا تو میری خیر نہیں۔ آسُوری بہادری کی قدر کرتے اور طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔ اگر میں نے گھٹنے ٹیک دیے تو میری بہادری کا بھرم جاتا رہے گا اور یہ لوگ تاوان کی پروا کیے بغیر میرے پرخچے اُڑا دیں گے۔

"میں نے ایک مرد کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تو کسی عورت کے سامنے کیسے جُھک سکتا ہُوں؟" میں نے کہا۔

سادیہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

شاہ تمبور کا قہقہہ گُونج اٹھا۔

"تم نے اپنی کاروائی کا آغاز اچھا نہیں کیا میری ہمشیر۔ لاتوں کے بھُوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

سادیہ نے مجھے جُھکنے کا اشارہ کرتے ہُوئے غصّے سے کہا۔ "میں تمھیں آخری موقع دے رہی ہُوں، غلام۔ جُھک جاؤ۔"

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے مسکراتے ہُوئے جواب دیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے جو فیصلہ کیا تھا اب مجھے اُس پر کاربند رہنا تھا۔

سادیہ نے خیمے کی ایک جانب دیکھتے ہُوئے اشارہ کیا۔ دُوسرے ہی لمحے دو سیاہ فام غلام بغلی دروازے سے خیمے میں داخل ہُوئے۔ ایک غلام نے لکڑی کا ایک بڑا کُندہ اور دُوسرے نے چمکدار تیز دھار والی چھُری اُٹھا رکھی تھی۔ سادیہ نے سیاہ فام غلاموں سے کہا۔ "تیاری کرو۔"

ایک سیاہ فام نے لکڑی کا وہ کُندا میرے سامنے رکھ دیا اور چھُری بدست غلام میرے پہلو میں کھڑا ہو کر چھُری کی دھار دیکھنے لگا۔

"گھٹنے ٹیکتے ہو یا نہیں؟" سادیہ نے پُوچھا۔

"نہیں۔" میں نے دو ٹوک جواب دیا۔

سادیہ نے اشارے سے اُس غلام کو بُلایا جس کے بارے میں ابھی مارنو نے بتایا تھا کہ وہ سادیہ کا خواجہ سرا ہے۔ سادیہ نے اسے حکم دیا: "اسے دکھاؤ کہ تمھارے ساتھ کیا کچھ کیا گیا تھا۔"

وہ غلام میرے سامنے آیا اور اُس نے اپنا مُنہ کھول دیا۔ اُس کی زبان آدھی کٹی ہوئی تھی... پھر اُس نے واسکٹ اُتاری۔ اُس کے سینے اور پیٹھ کو گرم لوہے سے داغا گیا تھا... اور جب اُس نے باری باری باقی کپڑے ہٹائے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"میں تمھیں ایک بار پھر تنبیہہ کرتا ہُوں میری ہمشیر! اُس کا اتنا خوُن نہ بہنے پائے کہ یہ مر جائے۔" شاہ تمبور نے کہا۔

"میں یقین دلاتی ہُوں کہ اسے مرنے نہیں دیا جائے گا۔" سادیہ نے کہا اور مجھ سے مخاطب ہُوئی: "تم نے اس غلام کا حشر دیکھ لیا؟ تمھارے ساتھ بھی یہی سب کچھ کیا جائے گا۔"

میں نے ایک نظر اس مخنّث غلام پر ڈالی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرے لیے اس حال میں زندہ رہنے کی نسبت موت زیادہ بہتر تھی لیکن اب میں اپنی ضد اور آن کے لیے اتنا آگے جا چکا تھا کہ پیچھے ہٹنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اگرچہ میں اپنی مہماتی زندگی میں کبھی اتنا خوف زدہ نہیں ہُوا تھا۔ اس کے باوجود میں نے جُوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا۔

"بہادر جان تو دے سکتے ہیں مگر اپنی بات سے نہیں پھرتے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

سادیہ نے غلاموں کو اشارہ کیا۔

اُن سب نے مجھے پکڑ لیا اور میرے جسم سے چادر اُتار پھینکی۔ سادیہ نے تالی بجائی تو ایک غلام دہکتی ہُوئی انگیٹھی لے آیا جس میں لوہے کی سلاخ تپ کر سُرخ انگارہ بن چکی تھی۔ لکڑی کا کُندا میری ٹانگوں سے قریب تر رکھ دیا گیا۔ چھُری والے غلام نے چھُری کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور سادیہ کو دیکھا جیسے وہ حکم کا منتظر ہو۔

"آخری بار پُوچھ رہی ہُوں، غلام۔ میرے سامنے جُھکتے ہو یا نہیں؟" سادیہ نے مجھ سے کہا۔

"نہیں..." میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا اور میں نے اپنی آنکھیں سامنے خیمے کے سیاہ پردے پر جما دیں۔ ہر شخص خاموش تھا۔ غلام تیار اور اشارے کے منتظر تھے۔ سادیہ میری طرف دیکھتی رہی اور میں پسینے میں شرابُور ہوتا چلا گیا۔

پھر سادیہ نے غلاموں کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ اشارے کے لیے بلند ہوتا چلا گیا۔

☆

سادیہ کے اشارے پر میری گردن بھی اُڑائی جاسکتی تھی، میرا جسم دہکتی سلاخوں سے بھی داغا جاسکتا تھا، میری صُورت بھی بگاڑی جاسکتی تھی اور میں مخنّث غلاموں کی صف میں شامل کیا جاسکتا تھا... مگر میں اس آخری لمحے میں اپنے چہرے پر خوف و دہشت کا کوئی تاثر نہیں لانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی نگاہیں بلند رکھیں اور خیمے کی سیاہ چادر پر گاڑ دیں۔

سادیہ کا ہاتھ اُٹھنے اور اشارہ کرنے میں اگرچہ صرف ایک لمحے کا وقفہ آیا تھا لیکن میرے لیے یہ ایک لمحہ صدیوں کا کرب لیے ہُوئے تھا۔ یہ میری زندگی کا طویل ترین لمحہ تھا اور جب دُوسرے لمحے اُس نے اشارہ کیا تو عقوبتوں کے اس طوفان کا دھارا ایک دم مُڑ گیا جو مجھے اپنی لپیٹ میں لینے والا تھا۔

سادیہ نے چھُری اور سلاخ بردار غلاموں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے دیا۔

میں نے زندگی کا سب سے بڑا جُوا جیت لیا اور سادیہ ہار گئی۔

اس نے غصّے کے عالم میں کانپتے ہُوئے حکم دیا کہ مجھے قیدیوں والے ایک چھکڑے میں محبوس کر دیا جائے۔ یہ چھکڑا دُوسروں سے الگ تھلگ اُسی سطحِ مرتفع کے قریب کھڑا کیا گیا تھا۔ جہاں مجھے کمپیوٹر نے اس سرزمین پر منتقل کیا تھا اور جہاں سے مجھے پہلی بار آسوریوں کی خیمہ گاہ، میدانِ کارزار اور شہرپناہ دکھائی دی تھی۔

دن بھر بگولوں کی طرح گردش کرتی ہُوا دھول اُڑاتی اور آسوری گروہ در گروہ آکر مجھ سے مشغول کرتے، میرا مذاق اُڑاتے اور نعرے کستے۔ میں اپنے قفس کی مضبُوط چوبی سلاخوں کے پیچھے لیٹا یا سر نیہوڑائے بیٹھا، اپنی بے بسی پر کُڑھتا یا پھر ڈاکٹر فریڈن کو کوستا رہتا جو مجھے یہاں بھیجنے کے بعد بالکل ہی بھُول گیا تھا۔

میرے لیے چھکڑے کے اس پنجرے سے فرار ناممکن تھا۔

اوّل تو اس کی چوبی سلاخیں بے حد مضبُوط تھیں، دُوسرے اگر میں انھیں توڑنے میں کامیاب ہو جاتا، تب بھی ان چھ آسوری پہرے داروں سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا جو شب و روز میری نگرانی پر مامُور تھے۔

میری بے بسی کا تماشا دیکھنے والوں میں سادیہ بھی شامل تھی۔ وہ ہر صبح گھوڑے پر سوار آتی اور میرے پنجرے سے کچھ دُور گھوڑا روک کر، دیر تک میری طرف دیکھتی رہتی۔ اُس کے چہرے پر پڑی نقاب کے باعث میں یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹ نفرت سے بھینچ جاتے ہیں یا اُن پر فتح مندی کی مسکراہٹ اُبھر آتی ہے۔

میں اُس سے نگاہیں چُرا کر بے نیاز سا بن جاتا۔

وہ کچھ دیر بعد گھوڑے کو ایڑ لگاتی اور آسُوری شہسواروں کی طرح اسے سرپٹ دوڑاتی چلی جاتی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اپنا ذاتی غلام بنائے گی۔ بونے مارنو نے بھی یہی کہا تھا مگر سادیہ نے مجھے تماشائے عبرت بنا دیا تھا۔ آسوریوں کے گروہ مجھ پر نہ صرف آوازے کستے بلکہ نوک دار چھُریاں بھی چبھو کر قہقہے لگاتے تھے۔

ایک روز جب ایک آسوری نے بار بار یہ حرکت کی تو میں نے چھُری چھین کر دو ٹکڑے کرنے کے بعد اسے حملہ آور کے سینے پر چبھو دیا۔ وہ چیختا چلاتا بھاگا تو دُوسرے اُس پر قہقہے لگانے لگے لیکن اُس کے بعد کسی کو یہ حرکت دُہرانے کی جرأت نہیں ہُوئی۔

اب وہ میرے پنجرے سے کچھ دُور کھڑے ہو کر پھبتیاں کستے اور اپنا دل خوش کرکے چلے جاتے تھے۔

اس دوران میں بونا مارنو ایک بار بھی میرے پاس نہیں آیا اور نہ ہی کہیں ادھر آتا جاتا دکھائی دیا۔

مجھے اس پنجرے میں قید ہُوئے کئی روز گزر گئے۔

خدا کا شکر ہے کہ سادیہ نے مجھے بھُوکا رکھنے کی سزا نہیں دی تھی جو دُنیا کی بدترین سزا ہے اور انسان کو ذلیل ترین افعال کے لیے مجبُور بنا دیتی ہے۔ مجھے دو وقت سیاہ آٹے کی روٹی، تھوڑا سا گھوڑے کا گوشت اور ایک بڑا گلاس بردس کا دیا جاتا تھا۔ بردس آسوریوں کا خاص مشروب تھا جو گھوڑی کے دُودھ کے علاوہ کسی اناج یا جڑی بوٹی کا آمیزہ ہوتا ہے۔

شروع شروع میں تو مجھے اس مشروب سے بہت گھن آتی رہی... مگر بعد میں اس سے شراب جیسا لُطف آنے لگا۔ یہ مشروب خاصا مقوّی بھی تھا۔

ہر صبح آسوری فصیل پر حملہ آور ہوتے اور ہر شام شکست خوردہ لَوٹ آتے۔

دن میں متعدد بار توپ کے زبردست دھماکے بھی سُنائی دیتے اور میں جاگتی آنکھوں اپنی رہائی کے خوش آئند خواب دیکھنے لگتا۔ میں سوچتا کہ لالی کسی رات اپنے لشکر کے ساتھ شہرپناہ سے نکلے گی، آسوریوں پر شب خوُن مارے گی اور مجھے چھُڑا لے جائے گی

مگر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سپنے ٹوٹتے بکھرتے چلے گئے اور اس سوچ کی سیاہ چادر خوبصورت خوابوں کا کفن بنتی گئی کہ لالی میرے لیے اپنے سپاہیوں کو موت کے منہ میں کیوں دھکیلنے لگی؟ وہ آخر کوئی خطرہ مول کیوں لے؟ وہ مجھ سے آسودگی ہی تو حاصل کرتی تھی' یہ کام وہ کسی سے بھی لے سکتی ہے۔

خادِ اعظم کا کمان دار رستم بھی روزانہ گشت پر آیا کرتا تھا۔ وہ میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہتا مگر اس نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی بلکہ اپنے پہرے داروں کو ہدایات دیتا اور چلا جاتا تھا۔

مجھے اس پنجرے میں محبوس ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔

میری داڑھی بڑھ گئی اور جسم میں کھجلی اٹھنے لگی۔ میرے تن پر صرف ایک پھٹا پرانا میلا کچیلا لبادہ تھا اور پنجرے میں بچھی ہوئی گھاس گندگی کا ڈھیر بن گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی اور اس حال میں جینا بھی عذاب تھا۔ اوپر سے آسوریوں کی پھبتیاں' دن میں گرمی اور رات بھر سردی مجھے چین نہ لینے دیتی۔

میں ہر وقت جلتا بھنتا، کڑھتا اور ڈاکٹر فریدوں کو کوستا رہتا تھا۔ مجھ پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی تھی۔

نویں روز اچانک رستم دو آسوری سپاہیوں کے ساتھ وہاں آیا۔ جنھوں نے ایک بڑا چوبی طوق اور چمڑے کی لگامیں اٹھا رکھی تھیں۔ رستم پہلے تو اپنے مخصوص انداز سے میری طرف دیکھتا رہا پھر مسکرانے لگا۔

"تم نہ صرف اس رات موت کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گئے بلکہ اس بدبودار پنجرے میں سزا بھگتنے کے باوجود تمھاری صحت ٹھیک ٹھاک ہے۔ شاید اس لیے کہ تمھیں بھوکا نہیں رکھا گیا اور پیٹ بھر کھانا دیا جا رہا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اب یہ اور بات ہے کہ ہم ایسی غذا جانوروں کو نہیں دیتے۔ خادِ اعظم سے کہنا کہ مجھے میرے مرتبے کے اعتبار سے اچھی غذا بھیجے اور تم یہ گھاس بھی بدلوا دو۔"

یہ سن کر رستم نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔

"اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تم واقعی سردار ہو ورنہ اس حال میں تمھیں ایسی باتیں ہرگز نہ سوجھتیں۔ بہرصورت اب نہ خادِ اعظم کو پیغام دینے کی ضرورت ہے اور نہ گھاس بدلنے کی۔" پھر اس نے مزید آدمیوں کو بلایا اور انھیں حکم دیا۔ "اسے باہر نکالو اور یہ طوق اس کے گلے میں ڈال دو۔"

میں پنجرے سے نکلا تو آٹھ شمشیر و نیزہ بردار آسوری سپاہیوں نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا۔

ان کا مقابلہ اور بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔

"آج سے تمھاری غلامی کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے' سردار سرفروش! یہ طوق پہننے کے بعد تم سادیہ کے نجی غلاموں میں شامل ہو جاؤ گے۔ اگر سادیہ تمھیں زندہ نہ رکھنا چاہتی تو دنیا کی کوئی طاقت تمھیں بچا نہیں سکتی تھی۔ تم بہادر ضرور ہو لیکن بہادری کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حماقت سے اپنی زندگی ہی گنوا دو۔ میری نصیحت ہے کہ بے جا اکڑفوں چھوڑ دو ورنہ یہ تمھاری موت کا پیغام بن جائے گی۔ تمھیں بہتر خوراک اور بہتر رہائش ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ جلد ہی تمھارے گلے میں اس بڑے چوبی طوق کی بجائے چھوٹا طلائی طوق ڈال دیا جائے۔"

رستم کی اس بات پر پہرے دار بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ رستم نے انھیں ڈانٹ دیا اور حکم دیتے وقت گرج پڑا۔ "پہنا دو اسے۔"

میں نے چپ چاپ وہ طوق اپنے گلے میں ڈلوا لیا۔ یہ بھدا سا طوق میری گردن کے لیے ذرا تنگ تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ میری سانس ہی رک جاتی۔ اس کی رگڑ سے البتہ گردن پر خراش آنے کا خطرہ ضرور تھا۔ تاہم میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہیں میرا احتجاج مجھے پھر اسی قفس میں واپس نہ بھجوا دے۔

طوق پہنانے کے بعد انھوں نے اس میں چمڑے کی ایک لمبی پٹی باندھی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور میں پیدل تھا۔۔ میری ران کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا اس لیے میں لنگڑاتے ہوئے ان کے ساتھ دوڑنے لگا۔۔ مگر ایک مقام پر پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔

سپاہی اور تماشا دیکھنے والے آسوری قہقہے لگانے لگے۔ وہ سپاہی جس نے میرے طوق والی لگام اپنے گھوڑے کی زین سے باندھی تھی' گھوڑے کو آگے بڑھا کر مجھے گھسیٹنے لگا۔ اس پر رستم نے اسے ڈانٹ دیا۔

"رک جاؤ۔ یہ سادیہ کا غلام ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

وہ رک گیا۔

میں زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میرا دل اپنی توہین و تکلیف پر بری طرح کڑھ رہا تھا۔

وہ مجھے خیمہ گاہ سے ایک ایسے مقام پر لے آئے جہاں ایک چوبی چار دیواری بنی ہوئی تھی جس کی نگرانی پر گھڑ سوار مامور تھے۔ ان گھڑ سواروں کا لباس اور ہتھیار عام سپاہیوں سے مختلف جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاہ تیمور کے نہیں بلکہ سادیہ کے سپاہی ہیں۔

رستم نے آگے بڑھ کر دروازے پر متعین پہرے دار سے کچھ باتیں کیں۔۔۔ پھر پلٹ کر میرے پاس آیا اور مخصوص انداز میں آنکھیں سکیڑتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"خدا حافظ سردار سرفروش! مجھے امید ہے کہ تم اچھے غلام بن کر جلد از جلد سنہری طوق حاصل کر لو گے۔"

اس کی اس بات پر سپاہی پھر ہنس پڑے۔ میری سمجھ میں اب بھی نہ آ سکا کہ آخر وہ طلائی طوق کے ذکر پر کیوں ہنس پڑتے ہیں۔ جب رستم اور اس کے سپاہی چلے گئے تو مجھے نیزے کی زد پر چار دیواری کے اندر لے جایا گیا۔

چار دیواری میں چھوٹے چھوٹے سیاہ خیموں کے درمیان ایک بہت بڑا خیمہ نصب تھا جس کے سامنے سرخ گھوڑوں کی دُمیں لہرا رہی تھیں۔

جب ہم اس بڑے خیمے کے قریب سے گزرے تو مجھے اس کے اندر سے نسوانی قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں اور خوشبو بھی آئی۔ اس خیمے میں جگہ جگہ گول سوراخ سے بنے ہوئے تھے جن پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک سوراخ کے سرکے ہوئے پردے سے مجھے ایک ایسا چہرہ جھانکتا دکھائی دیا جس کی بھوری آنکھوں کے نیچے نقاب پڑا ہوا تھا۔ یہ چہرہ اور یہ آنکھیں سادیہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھیں۔

چھوٹے خیموں کے آخر میں ایک اور چوبی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ اس چار دیواری کے چوبی ستون زمین میں گڑے ہوئے تھے اور ان کے اوپری نوک دار سروں پر چمڑے کی پٹیوں سے چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں تاکہ اگر کوئی انھیں اکھیڑنے یا ان پر چڑھنے کی کوشش کرے تو ان کے ہلنے سے گھنٹیاں بج اٹھیں اور نگہبانوں کو خطرے سے آگاہ کر دیں۔

یہ چار دیواری' انسانوں کا باڑہ تھی اور اس باڑے کے نگراں شاہ تیمور کے وہ سپاہی تھے جو جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ ان میں سے کچھ بوڑھے ہو گئے تھے اور کچھ معذور تھے۔ تقریباً ہر نگراں کے چہرے پر زخموں کے نشان نمایاں نظر آتے تھے۔ بعض کے ناک اور کان بھی کٹے ہوئے تھے۔ ان کے برعکس سادیہ کے سارے سپاہی جوان اور ہنسوڑ تھے۔ جیسے بات بات پر قہقہے لگانا بھی ان کے فرائض میں شامل ہو۔

مجھے اس انسانی باڑے میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ گلے میں پڑے ہوئے طوق سے مجھے الجھن اور تکلیف محسوس ہو رہی تھی مگر یہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے بہرحال بہتر تھا۔ میں نے باڑے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کی دائیں اور بائیں جانب والی چوبی دیواروں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں سی بنی ہوئی تھیں جنھیں ڈربے کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ ان کی چھتیں بہت نیچی تھیں اور ان میں داخل ہونے کے لیے آدمی کا کمر تک جھکنا لازمی تھا۔

ابھی میں ان ڈربوں کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کہیں سے آواز آئی۔

"مجھ سے بات کرو، سردار سرفروش! میرے پاس آؤ کہ میں تمھارے پاس نہیں آ سکتا۔"

یہ آواز بائیں جانب کی کونے والی کوٹھری سے آئی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔

سامنے ایک ایسا آدمی لیٹا نظر آیا جس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے کٹی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے مضبوط ہاتھوں کے سہارے اٹھتے ہوئے بولا۔ "خوش آمدید سردار سرفروش! میں اپنے اس محل سرا میں تشریف لانے پر آپ کا شکرگزار ہوں۔"

مجھے اس کی خوش دلی پر بے حد تعجب ہوا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، وہ پھر کہنے لگا۔ "میرے خدام بھاگ گئے ہیں اور میرے پاس آپ کی خاطر مدارات کے لیے کھانے پینے کی کوئی بھی چیز نہیں ہے۔ دوسرے میں صاحبِ فراش ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری مجبوری و معذوری کے تحت مجھے معاف کر دیں گے۔"

"آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟" میں نے بھی لہجہ تعظیمی رکھا۔

وہ ہنس پڑا۔

"میں جادوگر نہیں ہوں سردار سرفروش! سارے تاتاری اور آسوری آپ کا نام جانتے ہیں۔ آپ کی شہرت آپ کے یہاں آنے اور قیدی بننے سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔۔ اور پھر جب آپ نے سادیہ کے حکم کی تعمیل نہ کی تو آپ کی عظمت کچھ اور بڑھ گئی۔۔۔ لیکن یہی عظمت آپ کی دشمن بھی بن گئی ہے۔ آخر میں آپ کو اس کا گراں قدر معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔"

میری چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ یہ معذور اچھا آدمی ہے اور اس پر کسی حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ میں مسکرانے میں کوئی عار نہ سمجھتے ہوئے گھاس پر بیٹھ گیا جو گندگی کا ڈھیر بن چکی تھی۔

"اس شہرت و عظمت کے باوجود مجھے ایسا کھانا نہیں دیا گیا جیسا کہ دیا جانا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"آپ کھانے کی بات کر رہے ہیں۔۔۔ شکر کیجیے کہ آپ زندہ ہیں اور یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ سادیہ آپ کو دیکھتے ہی اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ اب اگر آپ اس کے معیار پر پورے اترے تو یہ آپ کی خوش بختی ہوگی چاہے مختصر وقت کے لیے ہی سہی۔"

اس کا مطلب تھا کہ سادیہ اور ملکہ ہوشی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی کشتی کی سوار ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس معذور لیکن شائستہ و شگفتہ مزاج شخص کی طرف دیکھا تو میری نگاہ اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی۔

مجھے اس کے خدوخال کچھ جانے پہچانے سے لگے... پھر مجھے یاد آگیا کہ اُس کے نقش و نگار اور آنکھیں رُستم سے ملتی جُلتی ہیں۔ اُس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پاکر ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

"مجھے بابر کہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے میرے چہرے مہرے سے اندازہ لگایا ہوگا، میں آسُوری نہیں ہُوں۔ میرا تعلق کاؤسا قبیلے سے ہے۔ آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں کہ میری شکل شاہ تیمُور کے کمان دار رستم سے مشابہت رکھتی ہے۔"

"بلاشبہ وہ ایک ذہین آدمی ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کردی۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی کاؤسا قبیلے ہی کا ایک فرد ہے۔ آپ یقین کریں یا نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے طویل عرصہ ایک ساتھ گزارا ہے، ایک ساتھ جنگیں لڑی ہیں... مگر اب مجھے اس حال میں دیکھ کر کون یقین کر سکتا ہے کہ کبھی وہ میرا ماتحت تھا اور میں اُس کا کمان دار ہُوا کرتا تھا۔"

"کوئی مانے یا نہ مانے مگر مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔" میں نے کہا۔

"شکریہ سردار سرفروش!" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اب یہ آپ جناب والا تکلف ختم کر دینا چاہیے۔ جب تک تکلف کے پردے حائل رہیں، آدمی ایک دُوسرے کے قریب نہیں آسکتے اور نہ ہی ایک دُوسرے کے دوست بن سکتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ نہیں، تم کہو۔ خیر اب پہلے کام کی ایک بات سُن لو۔ اب تم بے جا اکڑ نہ دکھاؤ، کوئی بڑی غلطی نہ کرو اور سادیہ کو فرماں برداری کا ثبوت بہم پہنچاؤ تاکہ تمھارا یہ چوبی طوق بہت جلد طلائی طوق میں بدل جائے۔"

"یہ طلائی طوق ہے کیا بلا؟ جب بھی اس کا ذکر آتا ہے، سپاہی ہنس پڑتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"طلائی طوق اُس غلام کے گلے میں ڈالا جاتا ہے، جو سادیہ کے دل پر حکمرانی کرتا ہے، جسے وہ اپنا محبوب بنا لیتی ہے لیکن محبوب بنانے سے پہلے وہ اس مرد کی انا کچل دینا چاہتی ہے۔ میں مدتوں سے یہاں اسیری کے دن کاٹتا آرہا ہُوں اور میری آنکھوں نے بارہا یہ تماشا دیکھا ہے۔ سادیہ کو اپنے محبوب بدلتے رہنے کی عادت ہے۔ تم اُس کے نئے محبوب بنو گے مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہُوں، وہ تمھارے قریب آنے سے پہلے جی بھر کے تمھاری توہین کرے گی۔ تمھاری خود اعتمادی اور انا کو ٹھوکریں لگائے گی اور پھر تمھارے قریب آجائے گی۔ تم جتنی جلدی اپنے آپ کو فرماں بردار غلام ثابت کرو گے، اتنی ہی جلدی تمھارے مصائب ختم ہو جائیں گے۔"

"مگر عورتوں کی فرماں برداری میرے بس سے باہر ہے، بابر دوست! میں خوفزدہ ہونے کے باوجود خوف کا اظہار کرنا اچھا نہیں سمجھتا۔ جس شب خاوِ اعظم کے دربار میں میری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، میں بُری طرح خوفزدہ ہوگیا تھا لیکن تب بھی میں نے گھٹنے ٹیکنے کی بجائے زندگی کا جُوا کھیلنا بہتر سمجھا اور آج اُسی کے نتیجے میں زندہ ہُوں۔ اب خود ہی بتاؤ کیا میرے لیے اُس کا تابع فرمان ہونا ضروری ہے؟"

"اُس رات جو کچھ ہُوا مجھے سب معلوم ہے۔" بابر نے کہا۔ "اسیروں میں خبریں اور ایسی باتوں کے چرچے بڑی تیزی سے پھیلتے ہیں۔ اِس لیے مجھے اُس رات کی ہر بات معلوم ہو چکی ہے... مگر تم اُس وقت غلام نہیں تھے دوست!... پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک بار کارآمد ہونے والی ترکیب ہر بار اور ہر موقعے پر کارگر ثابت ہو۔ ہر فرد کی قوتِ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ نہ جانے سادیہ کی قوتِ برداشت کب جواب دے جائے۔ میں تو اتنا جانتا ہُوں کہ آدمی جب تک موت اور مصائب سے محفوظ رہ سکے، اُس کے لیے بہتر ہے۔ ہمارے کاؤسا قبیلے میں ایک کہانی زبانِ زدِ عام ہے۔ کہو تو سُنا دُوں؟"

"ہاں ہاں ضرور سُناؤ۔" میں نے کہا۔

"ایک بادشاہ اپنے درباری ساحر پر بہت بھروسا کرتا تھا اور ہر کام اور ہر مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ساحر سے مشورہ کرتا اور پیش گوئی کا طالب ہوتا۔ ساحر کی پیش گوئیاں ہمیشہ دُرست ثابت ہوئیں... مگر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ساحر کی ساری پیش گوئیاں جھُوٹی نکلیں اور بادشاہ نے اُس کا سر قلم کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ تب ساحر نے بادشاہ سے التجا کی کہ اُس کی یہ سزا ایک سال کے لیے ملتوی کر دی جائے تاکہ وہ اس عرصے میں بادشاہ کے کتے کو اپنے جادو کے علم سے انسانی زبان میں بات کرنا سکھا دے جو ساحر کی موت کے بعد اُس کی یاد دلاتا اور بادشاہ کو محظوظ کرتا رہے گا۔ بادشاہ نے اس شرط پر اُس کی بات مان لی کہ اگر کتے نے ایک سال بعد انسانی زبان میں کلام نہ کیا تو ساحر کو تیل کے کڑھاؤ میں بٹھا کر تیل آہستہ آہستہ گرم کیا جائے گا تاکہ ساحر انتہائی تکلیف کی موت سے ہمکنار ہو۔ جب ساحر کو ایک سال کی مہلت مل گئی تو اُس کے ایک دوست نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں

ساحر بولا: "زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے سردشت! ایک سال تو بہت لمبا عرصہ ہے۔ اس دوران میں بغیر کسی تکلیف کے طبعی موت مر سکتا ہوں، بادشاہ کو موت آ سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں سال بھر میں کُتے کو بولنا ہی سکھا دوں... تو میرے عزیز سردار! سب سے اہم بات یہ ہے کہ زندہ رہو اور صرف فرماں برداری ہی تمھاری زندگی کی ضمانت بن سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں تمھارے لیے ایسی خوشیاں لائے جو ان سارے دُکھوں کی تلافی کر دیں۔"

مجھے بابر کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا کل اُس کے لیے کیا لاتا ہے۔ حالات اچانک ہی اور غیر متوقع طور پر بھی بدل جایا کرتے ہیں اور انہونی بھی ہو جاتی ہے۔ مجھے ملکہ ہوشی سے بڑی توقعات تھیں لیکن اُس نے میرے لیے صرف اتنا کیا تھا کہ خادِ اعظم نے میرے تاوان کی وصولی کے لیے اپنا جو پیغام فارس بھیجا تھا، اُس کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے اپنا ایک آدمی اُس کے ساتھ بھیج دیا...

میں نے سوچا کہ دو تین ماہ بعد جب شاہ تمبور کے پیغام پر فارس سے جواب آئے گا کہ وہاں مجھے کوئی بھی نہیں جانتا تو خادِ اعظم میری تکا بوٹی کیے بغیر نہیں رہے گا۔ اس لیے اس دوران جتنا وقت آرام سے گزر جائے بہتر ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے، ڈاکٹر فریدوں مجھے شاہ تمبور کے غیظ و غضب سے پہلے ہی واپس بُلا لے۔ لہٰذا مجھے بابر کے مشورے پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔

بابر جو میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا، بولا: "میں نے تمھارا چہرہ پڑھ لیا ہے، سرفروش! میری بات تمھاری سمجھ میں آ گئی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ شاید تم اُن تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کرو گے جن کے رُونما ہونے کی عمرِ دراز سے توقع کی جا رہی ہے۔"

"کیسی تبدیلیاں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"میں اُن کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں لیکن کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور... خادِ اعظم اور ساویہ جو کبھی ایک دُوسرے سے شدید محبت کرتے تھے، اب ایک دُوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں لیکن وہ اقتدار میں برابر کے شریک ہیں اور اُن میں سے کوئی ایک تنہا اپنی قوم پر حکمرانی نہیں کر سکتا۔ وہ ایک دُوسرے سے خائف ہیں جس کا احساس اُن کی پُوری قوم کو ہو چکا ہے۔ جوہڑ میں پھینکا جانے والا پتھر جس طرح سطحِ آب پر لہروں کو جنم دے کر دائرے بناتا ہے بالکل اُسی طرح جوہڑ کی تہ میں بھی ہلچل کا باعث بنتا ہے۔ باہمی نفرت نے جہاں شاہ تمبور اور ساویہ کو بے سکون و مضطرب کر رکھا ہے وہاں اُن کی قوم میں بھی بے چینی اور بے اطمینانی کا باعث بن گئی ہے لیکن چونکہ تمبور خاندان صدیوں سے اُن پر حکومت کرتا آ رہا ہے۔ اس لیے کسی کو اُن سے بغاوت کی جرأت نہیں ہوئی... مگر سال ہا سال سے لڑی جانے والی یہ جنگ جس پر ہر ماہ ہزار ہا آسوری نوجوان اپنی جانوں کی بھینٹ چڑھاتے آ رہے ہیں، رنگ لا کر رہے گی۔ خادِ اعظم کی دیوانگی اُنھیں بغاوت پر اُکسا دے گی اور..."

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کسی کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا... پھر پیچھے ہٹتے ہوئے سرگوشی میں بولا: "خلیدی آ رہا ہے۔ طلائی طوق آج اُسی کے گلے کی زینت ہے اور وہ ہمارا نگران اعلیٰ ہے۔ اُس کی حرکتوں پر ہرگز غصے میں نہ آنا اور صبر سے کام لینا۔"

میں خاموشی سے خلیدی کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے خوب احساس ہو چکا تھا کہ وہ طلائی طوق سے محروم ہونے والا ہے۔ اس لیے مجھے اپنا رقیب سمجھ کر مجھ پر بھرپور تشدد کرے گا۔ میں ذہنی طور پر تشدد برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گیا اور اُسے آتا دیکھنے لگا۔

وہ اگرچہ آسوری نسل سے تعلق رکھتا تھا لیکن عام آسوریوں کے برعکس خاصا کشیدہ قامت تھا۔ اُس کے خدوخال بھی تیکھے تھے اور اُس کے گلے میں ایک خوبصورت طلائی طوق چمک رہا تھا۔ اُس نے بڑے قرینے سے بال بنا رکھے تھے اور بے حد خوبصورت رنگین لباس پہنے ہوئے تھا۔

وہ ہاتھ میں چمڑے کا ایک چابک لیے کوٹھری میں داخل ہوا اور میری طرف نفرت سے دیکھنے لگا۔

"تو تم وہ سردار سرفروش ہو جسے خاتون ساویہ کے ذاتی غلام کے فرائض انجام دینے ہیں؟" اس نے بڑی نخوت سے کہا۔

میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: "جی ہاں! میں ہی وہ سردار سرفروش..."

میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ تڑاخ سے چابک میرے چہرے پر پڑا۔ ساتھ ہی خلیدی کی دھاڑ سُنائی دی۔

"کھڑے ہو کر ادب سے بات کرو۔"

وہ مجھ پر تابڑ توڑ چابک برسانے لگا۔ میں ضبط کرتا رہا حتیٰ کہ اُس کی سانس پھُولنے لگی اور میرا خون کھول اُٹھا۔ مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری رگ رگ میں چنگاریاں سی بھر گئی ہوں۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں اُس کی ٹانگیں چیر کر رکھ دُوں۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا البتہ مشکل یہ تھی کہ میں اپنے غصے پر کس طرح قابو پاؤں؟

میں بُری طرح ہونٹ کاٹنے لگا۔

مجھ پر چابک برس رہے تھے اور میں اپنے آپ سے جنگ میں مصروف تھا۔ بالآخر میں اپنے اندر کے وحشی پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھنے لگا تو خلیدی نے غراتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میرے سامنے جھکنا پڑے گا۔ جھکو... جتنا جھک سکتے ہو اُس سے بھی زیادہ جھکو۔"

میں اُس کے سامنے جھک گیا اور میری ہونٹ کاٹنے کی رفتار تیز ہو گئی۔

جھکتے وقت میں نے دیکھا تھا کہ وہ مارے خوف کے دو قدم پیچھے ہٹ گیا ہے... لیکن میں نے اپنے تاثرات چھپانے کے لیے جونہی سر جھکایا، اُس خبیث نے میرے سر اور شانوں پر تابڑ توڑ مُکے مارنے شروع کر دیے۔

مجھے بابر کی بات یاد آ گئی کہ زندہ رہو... اور میں نے یہ سوچ کر اپنے شانوں پر پڑنے والے مُکوں کی گنتی شروع کر دی کہ وقت آنے پر خلیدی کا یہ قرض ضرور چُکاؤں گا۔

وہ مارتے مارتے تھک گیا تو چابک سے دُوسرے ڈبے کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

"وہ ہے، تمھارا ڈربہ... جب تک میں تمھیں باہر آنے کے لیے نہ کہوں، تم اُسی میں بند رہو گے اور اس بڈھے احمق سے بات نہیں کرو گے۔"

یکایک اُس نے چابک سے بابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے مخاطب کیا: "اور تم بھی سمجھ گئے، او بڈھے گیدڑ! میں تمھاری نگرانی کراؤں گا۔ اگر مجھے یہ پتہ چلا کہ تم نے اس اڑیل ٹٹو سے بات کی ہے تو تم اپنی موت کی دُعائیں مانگنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ میں تو کب کا تمھیں کُتے کی موت مار چکا ہوتا مگر خاتون ساویہ ایسا نہیں چاہتی... پھر بھی میں اس طرح تمھاری چمڑی اُدھیڑ دوں گا کہ تم مرنا زیادہ پسند کرو گے۔"

وہ ایک بار پھر میری طرف پلٹا اور چابک برساتے ہوئے دھاڑنے لگا۔

"غلاموں کا کوئی خطاب نہیں، نا غلیظ خچر!... اب تم سردار نہیں ہو۔ اگر خاتون ساویہ کو لفظ خنزیر سے کراہت محسوس نہ ہوتی تو میں تمھیں یہی نام دیتا۔ جب تک وہ تمھارے لیے کوئی نام تجویز نہیں کرتی، تم صرف سرفروش کہلاؤ گے۔ کل سے تمھیں کام کرنا ہے۔ تم غلاموں کی طرح سر جھکا کر چلو گے اور جب تک میں حکم نہ دوں، تم اپنی نظریں نیچی ہی رکھو گے۔ سمجھ گئے آقائے خنزیر؟"

"جی ہاں سمجھ گیا۔" میں نے نگاہیں اُٹھائے بغیر جواب دیا۔

وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا لیکن اُس کے قہقہوں سے احساسِ شکست جھلک رہا تھا۔ اس کے قہقہے کھوکھلے تھے۔

معاً وہ ہنسنا چھوڑ کر ایک بار پھر بابر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ساویہ تمھیں موت کے گھاٹ اُتارنے کی اجازت کیوں نہیں دیتی؟" اس کے لہجے میں حیرت اور تجسس کے تاثرات تھے... پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں کل پھر تم سے نمٹوں گا۔" اس تنبیہہ کے ساتھ ہی وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر متعین پہرے دار اُس کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جانے لگا تو پہرے داروں کے تاثرات بدل گئے۔ اُن کی خوشامدانہ مسکراہٹ نفرت میں بدل گئی۔

میں یہ دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

اتنے میں مجھے بابر کی سسکاری سُنائی دی۔ ساتھ ہی اُس کی مدھم آواز آئی۔

"دیوار سے پیٹھ لگاؤ اور ہونٹ ہلائے بغیر بات کرو۔ پہرے دار جانتے ہیں کہ ہم قیدی باتیں کیا کرتے ہیں لیکن جب تک ہمارے ہونٹ نہ کھلیں، اُنھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ بھی ہماری طرح خلیدی سے نفرت کرتے ہیں۔"

"ہاں! مجھے بھی اس کا اندازہ ہو چکا ہے۔" میں نے بند ہونٹوں کے ساتھ جواب دیا۔

"دُنیا میں ہر جگہ نفرت کا دَور دَورہ ہے سرفروش! میں نے اپنے ملک میں بھی، جو یہاں سے دو ماہ کی مسافت پر ایک فلک بوس پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، نفرت ہی کو پھُولتے پھلتے دیکھا۔ انسان تعداد میں تو بڑھ رہے ہیں مگر انسانیت گھٹتی جا رہی ہے۔ خیر... میں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں تم غصے میں آ کر خلیدی کو مار ہی نہ ڈالو۔"

"میرا جی تو یہی چاہتا تھا مگر میں نے زہر کا گھونٹ پی لیا۔" میں نے لب بستہ جواب دیا۔

"اگر تم صرف احتجاج بھی کرتے تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ ساویہ کا دل اُس سے بھر چکا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اب کسی بھی لمحے، قہرِ اجل بننے والا ہے۔ اس لیے وہ تمھیں قتل کر ڈالتا۔ بعد میں چاہے اُسے خود بھی ہلاک ہونا پڑتا لیکن تمھاری جان تو ضائع ہو جاتی۔ بہرحال لعنت بھیجو اُس پر... کوئی اور بات کرو۔"

"تم کچھ تبدیلیوں کا ذکر کر رہے تھے جو یہاں رُونما ہونے والی ہیں۔" میں نے یاد دہانی کرائی۔

"ہاں... لیکن وہ کب رُونما ہوں گی، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تاہم مجھ سے وعدہ کرو، سردار سرفروش کہ تم یہ تبدیلیاں لانے یا انقلاب برپا کرنے میں نہ تو تنہا آگے بڑھو گے اور نہ ہی جلد بازی سے کام لو گے۔ یہ سارا عمل خود بخود اور اپنے آپ ہی ہو گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کیونکہ مجھے تم پر اعتماد ہے۔" میں نے جواب دیا

"شکریہ سرفروش! میں بھی اسی وقت کا منتظر ہوں کیونکہ میں یہاں مرنا نہیں چاہتا... اور یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ یہ صرف میری قیاس آرائی ہے۔ جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ رستم میرا ہم وطن اور ایک عظیم جنگجو ہے۔ ہم لوگ کرلائے کے سپاہی ہیں جو دُوسرے قبیلوں کے لیے لڑتے ہیں۔ اس بار میں آسوریوں کے خلاف اور رستم آسوریوں کے لیے برسرِ پیکار ہُوئے تو وہ قبیلہ جنگ ہار گیا جس کی طرف سے میں لڑ رہا تھا۔ مجھے قیدی بنا لیا گیا تو خادِ اعظم نے میری گردن اُڑانے کا حکم دے دیا مگر رستم نے میرا سر قلم کرنے کی بجائے میری ٹانگیں کٹوا دیں اور مجھے مرنے سے بچا لیا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا، میں نہیں جانتا۔ اب جبکہ سادیہ اور خادِ اعظم کے درمیان نفرت کی سرد جنگ جاری ہے، وہ تنے ہُوئے رستے پر چلنے والے بازی گر کی طرح محتاط انداز اختیار کیے ہُوئے ہے کیونکہ ایک طرف تو شاہ تمبور اُس پر اعتماد کرتا ہے اور دُوسری جانب سادیہ بھی اُس کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتی۔ رستم کسی ایک کو بھی اپنے خلاف شک و شبہے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ صرف اسی فریق کا ساتھ دینا پسند کرتا ہے جو فاتح ہو لیکن تمھارے قیدی بن کر یہاں آجانے سے صورتِ حال پیچیدہ ہوگئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"تم نے آسوری سورماؤں کے سرخیل کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جو رستم کے لیے ناممکن تھا۔ تمھیں دیکھنے کے بعد میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہُوں کہ سادیہ تم سے اپنی ذاتی خدمت ہی نہیں بلکہ کوئی اور کام بھی لینا چاہے گی۔" بابر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اگر میرا یہ خیال درست ثابت ہُوا تو وہ پہلے تمھیں اچھی طرح آزمائے گی، پھر دل کی بات زبان پر لائے گی لیکن سادیہ بھی اپنے بھائی کی طرح خونخوار، وحشی اور پاگل ہے۔ اُس کے برسرِ اقتدار آنے پر بھی جنگ یونہی جاری رہے گی۔ امن صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب دونوں بہن بھائی ختم ہوجائیں۔ رستم بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے اس لیے وقت آنے پر وہ تمھیں اپنا ساتھی دیکھنا چاہے گا۔"

میں نے بابر کی باتوں پر غور کیا تو یہ باتیں میرے دل کو لگیں۔

اس کا تجزیہ حالات بڑی حد تک درست تھا۔

"تم کہتے ہو کہ شاہ تمبور پاگل ہے مگر اُس رات تو وہ مجھے اچھا بھلا دکھائی دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں، سرفروش! جب کوئی مرد یا عورت اور خصوصاً کم عمر لڑکیاں اس کی دیوانگی سے محفوظ نہیں رہتیں۔ وہ اُن کے لیے درندہ بن جاتا ہے۔"

مجھے یہ سُن کر جھرجھری سی آگئی۔

"بچیوں کے والدین کچھ بھی نہیں کرتے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے ہیں کہ اپنی بچیوں کو چھپا لیں یا محتاط انداز میں اُس کی درندگی پر ماتم اور شکوہ کرلیں... لیکن اگر شاہ تمبور کو ان باتوں کی بھنک بھی پڑ جائے تو وہ انھیں سُولی پر لٹکا دیتا ہے۔ جب دیوانگی کا یہ دورہ ختم ہوجاتا ہے تو وہ اپنے دیوتا اُدبل کے بُت کے سامنے گڑگڑاتا ہے، فریادیں کرتا ہے اور اپنی درندگی کا شکار ہونے والی بچیوں کے والدین کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے مگر اس بار ایک بچی کے باپ نے خادِ اعظم پر قاتلانہ حملہ کردیا تھا۔ شاہ تمبور تو بچ گیا لیکن اس بچی کے باپ کی لاش ابھی تک سُولی پر جھول رہی ہے۔"

"ہاں، میں نے کچھ لوگوں کو سُولی پر لٹکے دیکھا تھا۔ کیا خادِ اعظم آتش پرست نہیں ہے؟"

"نہیں... اس نے ایک خودساختہ دیوتا سے ساری اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔" بابر نے جواب دیا۔ "بہرحال اس بچی کے باپ نے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ ہم لوگوں میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ اس انتقام کا پھل زیادہ بھرپور ہوتا ہے جو طویل عرصے بعد لیا جائے۔ تم بھی ہماری یہ کہاوت ذہن نشین کرلو۔" بابر نے مجھے نصیحت کی۔

"تم اس بونے ایلچی کے متعلق بھی کچھ جانتے ہو؟" میں نے ذہن پر زور دیتے ہُوئے کہا۔ میں بڑی دیر سے یہ سوال کرنے کے لیے بے چین تھا۔

بابر کچھ دیر تک سوچتا رہا... پھر بولا: "میں نے اُسے دیکھا ہے لیکن مجھے نہ تو اس کی کسی اچھائی کا علم ہے اور نہ ہی کوئی بُرائی میرے علم میں ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ شاہ تمبور کا حامی ہے یا سادیہ کا طرف دار ہے، بہرکیف! وہ اپنی نوعیت کا واحد آدمی ہے اور میں اس کے علاوہ مارتو کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔"

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے شام ہوگئی۔

پہرے داروں نے چار بڑی بڑی مشعلیں روشن کرکے اس انسانی باڑے کے چاروں کونوں میں گاڑ دیں اور کچھ غلام ہمارے لیے کھانا لے آئے۔ آج بھی کھانے میں گھوڑے کا گوشت تھا مگر روٹی کچھ بہتر اور بروس کا گلاس قدرے بڑا اور عُمدہ تھا۔

میں نے کھانا کھایا، بروس پی اور لیٹ گیا۔

بابر کو شاید مسلسل بولنے کی عادت تھی یا وہ باتیں کرنے کو ترسا ہُوا تھا، اس لیے وہ ہونٹ بند کیے لگاتار بولتا رہا اور میں سُنتا رہا۔ آج بروس پینے کے بعد مجھے نشہ نہیں ہُوا تھا اور نہ ہی نیند آئی تھی بلکہ مجھ پر ایک قسم کی غنودگی سی طاری ہوگئی تھی۔ اس غنودگی کے عالم

میں میں بابر کی شاعری سُنتا رہا کہ وہ اپنے قبیلے کا ایک مقبول شاعر بھی تھا لیکن اُس کے اشعار نے میرے لیے لوری کا کام کیا اور مجھے نیند آنے لگی۔

سونے سے پہلے آخری بات میں نے یہی سوچی کہ اگر اس وقت ڈاکٹر فریدوں مجھے واپس بلالے تو کیسا رہے؟... میں جو اتنے مصائب کا شکار ہُوا تھا، جس نے خلیدی کا تشدد برداشت کیا تھا، جس نے اپنی اَنا کچل کر اُس کے سامنے سر جھکایا تھا، سادیہ کو دیکھے اُس کے قرب و لذت سے آشنا ہُوئے بغیر اپنی دُنیا میں واپس چلا جاؤں تو کیسا محسوس ہوگا؟

میرا ذہن اس سوچ کا جواب نہیں دے پایا تھا کہ میں نیند کی وادی میں اُتر گیا اور نہ جانے کتنی دیر کے لیے اس سہانی اور سکون بخش وادی میں گُم ہوگیا۔

●

مجھے سادیہ کے نجی غلام کی حیثیت سے کام کرتے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ مجھے ہر صبح ان خیموں میں پہنچا دیا جاتا جو قبیلے کی خواتین کے لیے مخصوص تھے۔ وہاں میں پہلے جھاڑو لگاتا اور پھر برتن مانجھتا۔ اس دوران میں آسوری لڑکیوں کی نقاب سے اُوپر جھکتی ہُوئی سیاہ آنکھیں مجھے اشتیاق سے دیکھتیں مگر زیرِ نقاب ہونٹ مجھ پر پھبتیاں کستے رہتے۔ ہر چند کہ میرا سر جُھکا رہتا تھا لیکن میری آنکھیں سادیہ کی متلاشی رہتی تھیں جو اُن دنوں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی اور نہ ہی اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ البتہ ایک روز اُس کے خیمے سے بونے مارتو کی آواز ضرور سُنائی دی تھی۔

اس آواز سے مجھے یہ پتہ چل گیا کہ شاہ تمبور پر دیوانگی کا دَورہ پڑنے کی علامات پھر ظاہر ہونے لگی ہیں۔

خواتین کے خیموں میں جب کوئی کام نہ ہوتا تو مجھے باہر کام پر لگا دیا جاتا۔ کبھی مجھے بیت الخلا کے لیے گڑھے کھودنے پڑتے اور کبھی چھکڑوں کی مرمت کرنا پڑتی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ آسوری چھکڑوں کے پہیوں اور دھُروں کو تیل دینے سے آشنا نہیں تھے۔ کبھی کبھی مجھے اُن چرواہوں کی بھی مدد کرنا پڑتی جو گھوڑوں کے ریوڑوں کی نگہبانی کیا کرتے تھے۔

اس دوران میں میری اس طرح نگرانی کی جاتی رہی جیسے شاہ تمبور کے ذاتی دیوتا اُدبل کے مجسمے کی ہوتی تھی۔ ادبل کا مجسمہ ایک بڑے سیاہ چھکڑے میں رکھا ہُوا تھا اور اس چھکڑے میں خادِ اعظم کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ سادیہ کو بھی اُس چھکڑے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں عورتوں کے خیموں میں کام کرنے کی بجائے باہر کام کرنا زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ یہاں مجھے خلیدی کو جان سے مارنے کی خواہش دبانے کے لیے اپنے آپ سے لڑنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ خبیث نسوانی حصے میں، مجھے عورتوں کے سامنے کوڑے مارا کرتا تھا جو میرے لیے ناقابلِ برداشت سزا ہوتی تھی اور ضبط کا دامن میرے قابو میں رہنا دُشوار ہوجاتا تھا۔

رات کو جب مجھے دوبارہ انسانی باڑے میں بند کیا جاتا تو میں اور بابر باتیں کیا کرتے بلکہ بابر ہی باتیں کرتا اور میں سُنتا رہتا تھا۔

دُوسرے ہفتے کے پہلے روز میں خاک میں لتھڑا ہُوا کھانا کھا رہا تھا کیونکہ خلیدی نے اُسے زمین پر اُلٹ دیا تھا کہ اتنے میں سادیہ اپنے خیمے سے برآمد ہُوئی۔ اُس نے حسبِ معمول آنکھوں کے نیچے نقاب ڈالا ہُوا تھا لیکن اُس کے بالائی لباس کے بند کھُلے ہُوئے تھے اور اُس کی سرکشی عیاں تھی۔

وہ ہماری طرف بڑھنے لگی۔

میری نگاہیں اُس کے لچکتے ہُوئے سراپا پر جم گئیں۔

اچانک خلیدی نے میرے چہرے پر چابک مارتے ہُوئے کہا۔

"نگاہ نیچی رکھو سردار خنزیر!"

میں نے نگاہ جُھکالی لیکن دل تھا کہ بُری طرح مچلا جارہا تھا۔

سادیہ قریب آئی تو میرے اندر کا وحشی جاگ اُٹھا لیکن میں مجبور تھا۔

خلیدی نے اُس کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے کہا: "صبح بخیر خاتون سادیہ! اُدبل کی قسم آپ کے حُسن نے صبح کا حُسن دوبالا اور آپ کی خوشبُو نے ہواؤں کو معطر کردیا ہے۔ آپ کی نوازشوں کے بوجھ تلے دبا ہُوا یہ طلائی طوق بردار غلام اپنی مالک و محسن کی کیا خدمت کرسکتا ہے؟"

"اس بدبُو کے مارے غلام کو غسل کرواؤ، خلیدی! اس سے تو اُس لاش جیسی بدبُو آرہی ہے، جو کئی روز سے سڑ رہی ہو اور جسے گوریلے بھی کھانا پسند نہ کریں۔ اسے اچھی طرح رگڑ رگڑ کر غسل کروانا، میری کنیزیں اس کے لیے لباس بھیج دیں گی۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور وہاں سے چلی گئی۔

خلیدی اور میں اُسے جاتے ہُوئے دیکھتے رہے... پھر جب خلیدی میری طرف گھُوما تو اُس کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے تیر رہے تھے اور وہ پسینے میں شرابور تھا۔

"تمھارا وقت ختم ہوگیا ہے، خلیدی! اب میرا دَور شروع ہونے

والا ہے۔" میں نے کہا۔

اتنا سُنتے ہی وہ آپے سے باہر ہوگیا اور مجھ پر چابک برسانے لگا لیکن آج چابک کی ہر ضرب کے ساتھ میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ نڈھال ہوگیا اور اس میں چابک مارنے کی بھی سکت نہیں رہی... مگر میرے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اُس کا قرض ادا کرنے کا وقت آگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے گرم پانی کے ایک بڑے چوبی ٹب میں بٹھا دیا گیا اور وہی لڑکیاں جو مجھ پر پھبتیاں کستی تھیں میرا جسم رگڑ رگڑ کر دھونے لگیں۔ اب اُن کا رویّہ یکسر بدل گیا تھا اب وہ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھیں۔

میری داڑھی اور سر کے بال تراشے گئے، مجھ پر عطر چھڑکا گیا اور مجھے خوبصورت لباس پہنایا گیا۔

میں دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا کہ اب مجھے سادیہ کے خیمے میں لے جایا جائے گا لیکن اُنھوں نے دوبارہ میرے گلے میں وہی چوبی طوق ڈال دیا اور مجھے اُسی چار دیواری کے پہرے داروں کی تحویل میں دے کر چلے گئے۔

مجھے بڑی مایوسی اور کوفت ہوئی۔

اس کا مطلب تھا کہ سادیہ مجھ سے چوہے بلّی کا کھیل کھیل رہی تھی۔ مگر دُوسرے ہی لمحے جب ایک پہرے دار نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے بتایا کہ سادیہ کے حکم پر میرا چوبی طوق اتارا جارہا ہے تو مجھے یقین نہ آیا۔ اُس نے میرے گلے سے طوق نکال دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ غلیدی کا خاتمہ ہوگیا۔" پہرے دار بولا۔

"یہ چوبی طوق مجھے دے دو۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کیا اس کے اتنے ہی عادی ہوگئے ہو کہ اس کے بغیر سو بھی نہیں سکو گے؟"

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہ طوق مجھے کیوں چاہیے۔ دراصل میں نے اس انسانی باڑے میں آنے اور بابر سے ملنے کے بعد ایک ترکیب سوچ لی تھی اور اُسی ترکیب کے تحت اُس وقت ایک چاقو بھی اُڑا لیا تھا، جب میری داڑھی اور بال تراشے جارہے تھے۔

پہرے دار نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا: "اگر تمھیں یہ طوق اچھا لگتا ہے تو لے جاؤ اور اپنے دوست کے ساتھ جی بھر کے باتیں بھی کرلو کیونکہ اب تم پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔"

میں طوق اُٹھا کر سیدھا بابر کے ڈربے میں آگیا۔

بابر نے مجھے بنا سنورا دیکھا تو بہت خوش ہُوا۔

"دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ اچھا وقت جلد آجائے گا مگر اب یہ طوق کیوں اُٹھائے پھرتے ہو؟" اس نے حیرت سے کہا۔

میں نے وہ طوق اور چاقو اُسے دیتے ہُوئے کہا۔ "یہ دونوں چیزیں اپنے پاس رکھو۔"

چاقو دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا۔ "تم نے یہ چاقو چُرا کر اپنی جان داؤ پر لگادی ہے، میرے دوست۔ اگر تم پکڑے جاتے تو وہ اُسی وقت تمھاری بوٹیاں کردیتے لیکن اگر یہ میرے لیے لائے ہو تو یہ میرے کس کام کا؟ میں تو ویسے بھی ٹانگوں سے محروم اور معذور ہُوں۔"

"تم اس طوق سے چار چھوٹے چھوٹے پہیے بنالینا... پھر میں کہیں سے تمھیں ایک تختہ لادوں گا۔ اس طرح تمھارے لیے ایک چھوٹی سی گاڑی بن جائے گی۔" میں نے اُسے وہ ترکیب بتادی جسے میں نے خاص طور سے سوچا تھا۔

"لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا، سرفروش؟"

"ہوسکتا ہے کہ وہ انقلاب جلدی آجائے گا جس کی تمھیں توقع ہے۔ تمھیں اُس وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"کیا تمھیں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں... لیکن اب مجھے تھوڑی بہت آزادی نصیب ہوگی تو کچھ معلومات بھی حاصل ہوہی جائیں گی۔"

"میں نے تمھیں کہا تھا کہ جلدی مت کرنا۔ طلائی طوق کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمھیں آزادی مل گئی ہے۔ اب تم پر غلامی کا بوجھ اور بھی بڑھ جائے گا۔ تم سادیہ کو نہیں جانتے۔ وہ بے حد متلوّن مزاج کی عورت ہے۔ اس سے یہ بعید نہیں کہ تمھارے ساتھ چند لمحے گزارنے کے بعد دُوسری صبح تمھیں سُولی پر چڑھوادے۔"

"ایسا نہیں ہوگا بابر... ابھی تک اُس کا مجھ جیسے آدمی سے پالا ہی نہیں پڑا۔ یقین رکھو، مجھے آزمانے کے بعد اس کے ذہن میں کوئی نیا تجربہ جنم ہی نہیں لے سکتا... مگر مجھے ایک بات بتادو۔ میں نے تم سے بونے مارنو کے بارے میں پوچھا تھا تو تم نے مجھے ٹال دیا تھا۔ دیکھو بابر! میرا خیال ہے کہ میں، تم، رستم اور وہ پُراسرار بونا ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ مجھے صرف اتنا بتادو کہ مارنو دشمن ہے یا دوست؟"

بابر نے اپنا گنجا سر کھجاتے ہُوئے کچھ سوچا پھر بولا۔ "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس اتنا ہی جانتا ہُوں کہ وہ رُستم کی طرح شاہ تیمور کا آدمی ہے لیکن اگر کبھی وہ تمھارے پاس کوئی پیغام لے کر آئے تو اُس پر اعتماد کرلینا حالانکہ یہ بھی خطرناک سی بات ہے۔ تاہم کبھی کبھی خطروں سے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے البتہ یہ احتیاط ضرور برتنا کہ خود نہ اُس سے ملنا اور نہ ہی اُسے اعتماد میں لینے کی کوشش کرنا۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد کچھ پہرے دار آتے دکھائی دیے۔

"یہ تمھیں سادیہ کے پاس لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ احتیاط برتنا تاکہ ہم تم زیادہ سے زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکیں۔" بابر نے زیرِ لب کہا۔

"فکر نہ کرو بابر... اور اپنے لیے پہیے ضرور تیار کرلینا۔ میں تمھیں اور تمھاری ہدایات نہیں بھولوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

میں پہرے داروں کے ساتھ چل پڑا۔

وہ مجھے ایک چھوٹے سے خیمے میں لے آئے جو خواتین کے خیموں کے باہر لگایا گیا تھا۔ اس خیمے میں ایک پہرے دار طلائی طوق کپڑے سے صاف کررہا تھا۔ یہ کپڑا خون آلود تھا۔ مجھے یہ سوچ کر بے حد دُکھ ہُوا کہ اب میں غلیدی کا قرض نہیں چُکا سکوں گا کیونکہ کپڑے پر لگے دھبے اُسی کے خون کے تھے۔

پہرے دار نے طلائی طوق ایک آدمی کو دیتے ہوئے کہا: "یہ طوق اسے پہنا دو۔ آج سے یہ خاتون سادیہ کی خواب گاہ میں کام کرے گا۔"

اس تبصرے پر سارے پہرے دار ہنس پڑے۔

اُن میں سے ایک بولا: "غلیدی میرے اندازے سے کہیں زیادہ عرصے چل گیا اور میں شرط میں دو گھوڑے ہار گیا۔"

"ہاں..." دُوسرا بولا۔ "وہ کمبخت دُوسروں کی بہ نسبت زیادہ دنوں تک سادیہ کا رفیق رہا..." پھر اُس نے... میری طرف دیکھا اور اُنگلیوں پر گنتے ہُوئے کہنے لگا: "دو سال کے دوران تم خاتون سادیہ کے گیارھویں غلام ہو۔ اگر تم دیوتا اُوبی کے معتقد ہو تو اپنی بخشش کے لیے ابھی سے دُعائیں مانگنا شروع کردو۔"

میں خاموش کھڑا رہا۔

وہ پہرے دار جو مجھے طوق پہنا رہا تھا، بولا: "یہ طوق اس کے لیے چھوٹا ہے کیونکہ اس کی گردن کسی بھینسے کی طرح موٹی ہے۔ سادیہ کو اس کے لیے نیا طوق بنوانا پڑے گا۔"

"یا پھر اسے غلام تبدیل کرنا پڑے گا۔" خیمے والا پہرے دار بولا۔ "چلو جلدی کرو، وہ بے تابی سے اس کی منتظر ہوگی۔"

وہ مجھے سادیہ کے بڑے خیمے کے دروازے پر متعین ایک پہرے دار کے حوالے کرگئے۔ وہ مجھے لے کر اندر داخل ہُوا تو پتہ چلا کہ اس خیمے کو مختلف حصّوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ہم جس راہ داری سے گزر رہے تھے، اُس میں دبیز قالین بچھا ہُوا تھا۔

"میں بُزدل ہُوں ورنہ اب تک وہاں پہنچ چُکا ہوتا، جہاں تم جارہے ہو۔" پہرے دار نے بڑی حسرت سے کہا۔

راہ داری کے اختتام پر ایک سنہری پردہ آویزاں تھا۔ پہرے دار مجھے اندر جانے کا اشارہ کرکے پلٹ گیا۔ میں نے پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔ خیمے کا یہ حصّہ ایک کمرے کی مانند تھا جس کے بیچوں بیچ میز پر ایک اُونچے شمع دان پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ فرش پر قالین اور ایک جانب ایک بستر بچھا ہُوا تھا لیکن یہ بستر ملکہ ہوشی کے بستر کی طرح گول نہیں بلکہ چوکور تھا۔ کمرے میں مُشک کی خوشبو پھیلی ہُوئی تھی اور موم بتی کی مدّھم روشنی میں ہر شے دُھندلی دُھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔

... میری آنکھیں اس مدّھم روشنی میں مرمریں انسانی مجسّمے پر جم گئیں۔ مگر آج بھی اُس نے نقاب ڈالا ہُوا تھا۔ اُس کے شب رنگ بال شانوں پر لہرا رہے تھے اور اُس نے پاؤں میں سونے کے کڑے پہن رکھے تھے۔

میں بُت بنا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"کیا تم اب بھی میرے سامنے نہیں جھکو گے؟" اس نے مترنّم آواز میں کہا۔

میں اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار تھا، ہر چند کہ پچھلے چند روز سے میں جھکتا اور سرنگوں ہوتا آیا تھا لیکن اب ایک بڑے خطرے سے کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور کہا۔

"خاتونِ محترم! میں سمجھتا ہُوں کہ آپ کا مقصد مجھے گھٹنوں کے بل جُھکانا نہیں بلکہ ایک بہادر مرد کا حصُول ہے۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو آپ جو چاہیں مجھے سزا دے سکتی ہیں۔ میں محبت کے ایک بول پر سر جُھکانے کی بجائے سر کٹوانے میں بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

میری اس بات پر اُس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

باریک نقاب کے پیچھے سے ہونٹوں کی کلیاں نیم وا ہوتی دکھائی دیں جو مسکراہٹ کی غمّاز تھیں۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوگیا۔

میرا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔

"اچھا تو تم ایسا سمجھتے ہو، سرفروش! مجھے تمھاری جرأت پر حیرت ہے لیکن اس وقت تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں نے تمھیں بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس طرح تمھاری نگرانی کرتی رہی ہُوں کہ تمھارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوسکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک قابل مرد ہو... لیکن ایک بات یاد رکھنا، میں ایک بار تنبیہہ کے بعد دُوسرے انتباہ کا موقع نہیں دیا کرتی۔"

یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی تو ایک جانب کا پردہ ہٹا اور اس کے دو نوجوان اور خوش شکل محافظ اندر آگئے۔

میں اُنھیں پہلے بھی دیکھ چُکا تھا۔ یہ بڑے ہنس مُکھ جوان تھے

لیکن اس وقت وہ بے حد سنجیدہ اور مؤدب نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر سادیہ کے سامنے سر خم کیا اور حکم کا انتظار کرنے لگے۔ انھوں نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

سادیہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"میرے محافظ ہر وقت چوکنا اور گوش بر آواز رہتے ہیں سرفروش۔ اگر میرا لہجہ یا آواز ذرا سی بھی بدل جائے تو یہ بلا تامل اندر آ جائیں گے۔"

اس نے پہرے داروں کو جانے کا اشارہ کیا تو وہ سر جھکائے باہر چلے گئے۔

سادیہ کے اس عمل سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ خائف بھی ہے۔

جب وہاں ہم دونوں ہی رہ گئے تو سادیہ بولی: "میں تمھارے لیے کوئی نام تجویز نہیں کر سکی۔ اس کی [illegible] یہ ہے کہ تم بہت عجیب آدمی ہو۔ دُوسروں سے بے حد مختلف ہو اس لیے میں تمھیں سرفروش ہی کہا کروں گی، سردار سرفروش نہیں کیونکہ میرے خیال میں غلاموں کا کوئی خطاب نہیں ہوتا۔"

"میں آپ سے متفق ہوں خاتون! جب تک میں آپ کا قیدی ہوں، سردار کے خطاب سے دست بردار رہوں گا۔"

میری اس بات پر پہلی بار سادیہ نے قہقہہ لگایا۔ یہ دلآویز قہقہہ اس کی مسرت کا عکاس تھا۔ نقاب کے پیچھے اس کے خوبصورت دانتوں کی قطار آب دار موتیوں کی طرح چمک اٹھی تھی۔

میں نے اپنا سر ذرا سا خم کیا اور کہا: "مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کو میری بات دلچسپ محسوس ہوئی۔"

اس نے پھر قہقہہ لگایا: "تمھارا کام مجھے خوش رکھنا ہے مگر جس انداز سے میں چاہوں گی، تمھیں اس کا پابند رہنا ہوگا... اور جب تم مجھے خوش نہیں رکھ سکو گے تو سمجھ لو کہ تمھارا آخری وقت آ پہنچا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔

اس نے اپنی ٹھوڑی ایک ہتھیلی کے پیالے میں رکھ لی۔

"تم نے ہمارے شہ زور سے مقابلے کی جو شرط رکھی تھی، اس نے میرے دل میں چنگاریاں بھر دی تھیں۔ میں تمھیں دیکھنا چاہتی تھی مگر میرے بھائی نے مجھے اس خیمے میں نظر بند کر رکھا تھا۔ میں نے ملازمہ کا بھیس بدلا اور لوگوں میں گھس گئی۔ تمھیں پکڑنے کے لیے وہ جال بھی میری ہدایت ہی پر بچھایا گیا تھا۔ میں نے تمھارا مقابلہ نہایت غور سے دیکھا۔ اس وقت تمھاری آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا اور ان میں رحم یا نرمی کی ہلکی سی پرچھائیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مگر اب ان میں نرمی ہی نرمی نظر آ رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے سرفروش؟"

"آپ اس کی وجہ بھی جانتی ہیں خاتون۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ نے مجھے یہاں بلوایا ہے۔ آپ کا غلام حاضر ہے پھر ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟"

اس نے پھر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"... کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، ان باتوں کا فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ تم اس وقت تک کسی قسم کی بھی جرأت نہیں کرو گے جب تک میں تمھیں حکم نہیں دیتی۔"

"میں نے آپ کی ہدایت ذہن نشین کر لی ہے، خاتون۔" میں نے جواب دیا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ جرأت مندی پسند کرتی ہے لیکن بہت زیادہ جرأت مندی کو گستاخی سمجھتی ہے۔ مجھے اس کہانی کے ساحر کی طرح وقت حاصل کرنا تھا جو مجھے بابر نے سنائی تھی۔ سادیہ اٹھ کر میری طرف بڑھنے لگی۔

"وہیں کھڑے رہو۔ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"بجا ارشاد ہوا۔" میں نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ میرے قریب آ گئی تو میری رگوں میں خون سنسنانے لگا۔

اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں شعلے لپک اٹھے ہوں۔ اس نے اپنے ٹخنوں میں پڑا ہوا کڑا دوسرے کڑے سے بجایا اور بولی: "کیا تم مجھے پسند کرتے ہو؟ کیا میں تمھیں اچھی لگتی ہوں؟"

میری سانسیں اُلجھنے لگیں اور میرے لیے جواب دینا مشکل ہو گیا۔ میں نے پہلے تو اثبات میں سر ہلایا... پھر بمشکل بولا: "آپ پسند کی بات کرتی ہیں! آپ تو میری سب سے بڑی خواہش بن گئی ہیں۔ آخر آپ مجھے اپنے حسنِ جہاں سوز سے کب تک جلائیں گی؟"

اس نے پھر قہقہہ لگایا اور بولی: "جب تک میرا جی چاہے گا۔"

میری سانسیں تیز تر ہو گئیں لیکن میں نے خود پر قابو رکھا حتیٰ کہ اس نے خود ہی میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں اس سنہرے پردے کے سامنے قالین پر لیٹا ہوا تھا جو سادیہ کی رہائش گاہ کے دروازے پر آویزاں تھا۔ پردے کی دوسری جانب راہداری میں صرف ایک مشعل روشن تھی جہاں سادیہ کا ایک تیغ بردار محافظ پہرہ دے رہا تھا۔ جب وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا مشعل کے قریب پہنچتا تو اس کا سایہ پورے پردے پر محیط ہو جاتا اور جب وہ پردے کی طرف بڑھتا تو اس کا سایہ سکڑتا سمٹتا چلا جاتا۔

مجھے سادیہ کا طلائی طوق بردار غلام بنے آج چوتھی شب تھی۔ وہ چابک اور کند چوبی خنجر بھی مجھے دے دیا گیا تھا جو کبھی غلیدی کی تحویل میں ہوا کرتا تھا۔ آسوری سورما یہ کھلونا نما خنجر دیکھ کر حقارت آمیز انداز میں مسکرایا کرتے تھے۔ اگر میں سادیہ کی تنہائیوں کا رفیق بننے کی بجائے اپنے مؤقف پر ڈٹا رہتا اور اپنی آن کے لیے جان دے دیتا تو وہ مجھے عظیم سمجھتے اور میری بہادری کے گن گاتے۔ میں جانتا تھا کہ آسوری شہ زور کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد جب میں نے شاہ تمبور کے دربار میں سادیہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا تو آسوری جنگ جو مجھ سے بے حد مرعوب ہوئے تھے لیکن اب وہ مجھے بزدل سمجھنے لگے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ان کے اس ردِ عمل سے مطمئن اور مسرور تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے بزدل سمجھ کر مجھ سے کوئی خوف یا خطرہ محسوس نہ کریں تاکہ وقت آنے پر میں ان کے نرغے سے بہ آسانی فرار ہو سکوں۔

چوتھی شب میں سادیہ کی خدمت گزاری کے بعد تھکا ماندہ لیٹا ہوا تھا۔ نیند آہستہ آہستہ میری پلکوں پر ڈیرے ڈال رہی تھی کہ اچانک مجھے ایک سرگوشی سنائی دی۔

"سردار سرفروش... کیا تم سن رہے ہو، سردار سرفروش!"

میں نے نیم غنودگی کے عالم میں سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر مجھے محافظ کے گھٹتے بڑھتے سائے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ شاید میں نے کچی نیند میں کوئی خواب دیکھا ہوگا ورنہ یہاں زنان خانے میں کون آواز دے سکتا ہے؟

اتنے میں کسی اندھیرے گوشے سے پھر سرگوشی اُبھری: "میں مارنو ہوں، سردار سرفروش!... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں رگڑیں، جماہی لی اور سرگوشی ہی میں پوچھا: "تم کہاں ہو مارنو؟"

"تمھاری بائیں جانب۔ ترینا کے خیمے میں۔ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔"

سادیہ بھی گہری نیند سو چکی تھی اور صبح تک اس کے اٹھنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں قالین پر لوٹتے ہوئے ترینا کے خیمے کی طرف سرکنے لگا... اور دریافت کیا: "کیا بات ہے مارنو؟" میں نے آواز بے حد دھیمی رکھی تھی۔

"میں تمھارے لیے ایک ضروری پیغام لایا ہوں سردار سرفروش! یہ بھی ہو، کل بابر سے ضرور مل لینا۔"

"کیوں؟" میں نے اپنی حیرت پر بہ مشکل قابو رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ تمھیں اس انقلاب کے متعلق مزید معلومات فراہم کرے گا جس کے بارے میں تم سے گفتگو کر چکا ہے۔"

میں کچھ دیر تو ورطۂ حیرت میں غوطہ زن رہا... پھر میں نے آواز کی سمت دیکھتے ہوئے کہا: "یہ پیغام کس نے دیا ہے؟"

جواباً خاموشی طاری رہی۔

میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

"مارنو...!" میں نے اسے اوپر تلے کئی بار دھیمی آواز میں پکارا لیکن ہر بار سناٹا ہی میری پکار کا جواب ثابت ہوا۔

میں سمجھ گیا کہ مارنو جا چکا ہے۔

زنان خانے کے اس حصے میں طلبی کے بغیر کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن مارنو جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ غالباً اپنے بونے قد کی وجہ سے وہ کسی محافظ کی نظروں میں نہیں آ سکا تھا ورنہ بے موت مارا جاتا۔

میں دیر تک سوچتا رہا کہ کیا واقعی خادِ اعظم کو اقتدار سے محروم کرنے کا وقت قریب آ چکا ہے۔

حسنِ اتفاق سے اگلی صبح شاہ تمبور نے سادیہ کو بلوا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد خوف زدہ ہے۔ سننے میں آیا تھا کہ خادِ اعظم پر پھر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ان دوروں کی وجہ سے پھیلنے والی تباہیوں اور بربادیوں کا احوال میں سن چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ شاہ تمبور پر ایسی وحشت طاری ہوتی ہے کہ دوسرے تو دوسرے خود اس کی بہن سادیہ بھی اس دیوانگی کا شکار ہو جاتی تھی۔ یہی وہ ایام ہوتے تھے جب آسوری اپنی نوعمر کلیوں کو چھپا لیا کرتے تھے تاکہ معصومیت درندگی کی بھینٹ نہ چڑھ سکے۔

جب سادیہ اپنے محافظوں کے ساتھ شاہ تمبور سے ملنے چلی گئی تو میں اپنا چابک لیے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس انسانی باڑے کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں میں نے بابر کے ساتھ کچھ دن گزارے تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر آسوری محافظ ناگوار تاثرات کے ساتھ چوکنے ہو گئے۔ میں غلیدی کے سے خشمگیں انداز میں دروازے پر رکا اور محافظوں کی طرف دیکھ کر دھاڑنے لگا۔

"میں اس بڈھے پاگل کی خبر لینے آیا ہوں جو دن بھر سو کر گھاس کو غلاظت کا ڈھیر بناتا اور مفت کی روٹیاں توڑتا رہتا ہے۔ خاتون سادیہ نے مجھے ایک ذاتی غلام رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ میں بابر کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں اس لیے اسے اپنے کوڑے کا مزا چکھانا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اس کی یہ خوش فہمی دور ہو جائے کہ میں اس سے کوئی رعایت برتوں گا۔"

میری اس تاویل پر ایک آسوری محافظ نے مسکراتے ہوئے

کہا۔" آپ نے بجا ارشاد فرمایا عالی جاہ۔ بابر نے بہت دنوں سے کوڑے نہیں کھائے لیکن آپ ایک معذور کو غلام کیسے بنا سکتے ہیں؟"

میں نے اُسے غصّے سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔" تم احمق ہو اور نہیں جان سکتے کہ اس لنگڑے لُولے کو کیسے غلام بنایا جا سکتا ہے۔ جاؤ اور چھکڑوں کے پاس پڑے ہوئے لکڑی کے تختوں میں سے ہاتھ بھر لمبے اور دو بالشت چوڑے ٹکڑے لا دو۔"

" لکڑی جیسی قیمتی چیز غلاموں پر برباد نہیں کی جا سکتی حضورِ والا۔ اسے بہت دُور سے لایا جاتا ہے۔" محافظ نے جواب دیا۔

میں نے غضب ناک ہو کر اُسے ایک چابک جڑ دیا اور پاؤں پٹخ کر چنگھاڑنے لگا۔" جاؤ اور وہی کرو جو میں نے تمھیں کہا ہے یا تم خاتون سادیہ کے محبوب کی حکم عدولی کر کے اپنی گردن کٹوانا چاہتے ہو؟"

محافظ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور طنز و نفرت سے میری طرف دیکھ کر سر خم کرتے ہوئے بولا۔" خاتون سادیہ کے طوق بردار محبوب کے حکم کی تعمیل ضرور کی جائے گی۔"

میں اُسے گھورتا ہُوا باڑے میں داخل ہُوا اور اُس کوٹھڑی کی طرف بڑھنے لگا جس میں بابر کو رکھا گیا تھا۔ اب اُس کے سامنے والی کوٹھڑیوں میں تین مزید قیدی آچکے تھے۔ اُنھوں نے مجھے دیکھ کر آپس میں کھُسر پھُسر شروع کر دی۔ وہ تینوں چور تھے اور عنقریب اُن کے دائیں ہاتھ قطع کیے جانے والے تھے۔ میں اُن کی طرف توجہ دیے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔

بابر نے مجھے دیکھا تو بازوؤں کے بل رینگتا ہُوا دروازے میں آگیا اور میری طرف دیکھ کر مُسکرانے لگا۔ میں نے اُسے چابک مارتے ہوئے آہستہ سے کہا۔" سب ادھر دیکھ رہے ہیں اس لیے مجھے تم کو کوڑے مارنے پڑیں گے۔"

" ہاں۔ مگر زیادہ زور سے نہ مارنا۔ کیا مارتو تم سے ملا تھا؟"

میں نے چابک لہراتے ہوئے جواب دیا۔" بات کہاں تک پہنچی ہے؟"

" جو کچھ جانتا ہوں، وہ بتا دیتا ہوں۔ ویسے اس لباس میں تو تم خوب جچتے ہو۔"

میں نے اُس پر جھُوٹ مُوٹ کے کوڑے برسانے شروع کر دیے ور بآوازِ بلند بولا۔" بکواس بند کرو بڈھے گیدڑ! تجھے میرا غلام بننا ہی پڑے گا۔ میں تم جیسے لنگڑے لُولے سے کام لینا بھی جانتا ہوں۔"

" تم ایک اچھے اداکار بھی ہو سردار سرفروش۔" بابر نے سسکاری بھرتے ہوئے کہا۔

" جلدی جلدی بولتے جاؤ، ایسا نہ ہو کہ گھونسے اور کوڑے کھا کھا کر تمھارا دم نکل جائے اور بات ادھوری ہی رہ جائے۔" میں نے دھیمے لیکن کرخت لہجے میں کہا۔" میں سادیہ کی لاعلمی میں یہاں آیا ہوں اس لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ صرف مقصد کی بات کرو۔"

" رات مارتو میرے پاس آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ رستم آمادہ ہو چُکا ہے۔ آج سے تین روز بعد شاہ تمبور اپنی سالگرہ منائے گا۔ اس موقعے پر ایک شاندار تقریب منعقد کی جائے گی۔ رستم اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اپنے منصُوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ اگر تم اُس کا ساتھ دینے کو تیار ہو تو تمھیں ہتھیار فراہم کر دیے جائیں گے . . . لیکن یہ تم نے ہاتھ کیوں روک لیا ہے؟"

" میں اُس کا ساتھ دینے کو تیار ہُوں۔" میں نے اُسے گھونسہ مارتے ہُوئے کہا۔

" مگر رستم پہلے تم سے بات کر کے ہی کسی فیصلے پر پہنچے گا۔"

" میری اُس سے ملاقات کیسے ہوگی؟ وہ شاہ تمبور کا سپہ سالار ہے اور میں سادیہ کا غلام ہُوں۔"

" قدرت نے خود ہی اس کا انتظام کر دیا ہے۔ ایک تاغانی جاسُوس پکڑا گیا ہے جس نے اعتراف کیا ہے کہ ملکہ ہوشی نے اُسے تمھیں تلاش کرنے اور فرار میں مدد دینے کے لیے بھیجا تھا۔ شاہ تمبور کافی برہم ہے اور رستم نے اُس کے غصّے کو مزید ہَوا دی ہے۔ اُس نے خادِ اعظم سے کہا ہے کہ تم بھی اس جاسُوس کی طرح مجرم اور خطرناک ہو۔ لہٰذا تم سے پُوچھ گچھ ضروری ہے تاکہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ اور کتنے جاسُوس تمھاری مدد کو آئے ہیں۔ اس نے خادِ اعظم سے تمھاری گرفتاری کی سفارش بھی کی ہے۔"

" تو پھر اب تک میں آزاد کیسے گھُوم رہا ہُوں؟" میں نے چابک لہراتے ہُوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

" خادِ اعظم پر دیوانگی کے دَورے کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اُسے معلوم ہے کہ سادیہ تمھیں بے حد چاہتی ہے اور تمھیں نقصان نہیں پہنچنے دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے پہلے سادیہ کو بُلوایا ہے۔"

میں نے بابر کو دکھاوے کی دو تین لاتیں جڑتے ہُوئے پوچھا۔" کیا سادیہ بھی اس سازش میں شریک ہے؟"

" نہیں۔ رستم اُس پر اعتماد نہیں کرتا۔ کیا سادیہ نے یہ کہا ہے کہ رستم اُس کا آدمی ہے؟" اُس نے بلند آواز میں آہ و زاری کرتے ہوئے مدّھم آواز میں کہا۔

" نہیں . . . مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بھی کوئی منصُوبہ بنائے ہُوئے ہے اور اس منصُوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھ

استعمال کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ فی الحال وہ مجھ پر اعتماد نہیں کرتی، اس لیے ابھی خاموش ہے۔"

" تو پھر اُسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا وقت نہیں ملے گا اور رستم موقعے سے فائدہ اُٹھالے گا۔ میرا خیال ہے، رستم کی درخواست پر شاہ تمبور تمھاری گرفتاری کا حکم دے دے گا۔ اس طرح رستم کو تم سے بات کرنے اور تمھیں پرکھنے کا موقع مل جائے گا۔ تم تیار رہو۔" یہ کہہ کر وہ زور سے کراہا اور اس نے گھاس میں مُنہ چھُپا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی ادھر آرہا ہے۔ میں نے گرج گرج کر اُسے گالیاں دیں اور چابک یُوں برسایا کہ آواز زیادہ پیدا ہو اور اسے کوئی چوٹ نہ آئے۔ اسی دوران میں نے پُوچھا۔" تم نے پہیے تیار کر لیے ہیں؟"

" ہاں . . . اور میں نے اُنھیں گھاس میں چھُپا رکھا ہے۔"

" محافظ کچھ تختے لا رہا ہے۔ ان سے بیٹھنے کا تختہ اور دُھرا تیار کر لینا۔ دو نوک دار لکڑیاں بھی بنا لینا تاکہ اُنھیں کشتی کے چپوؤں کی طرح زمین پر چلا کر گاڑی کھینچ سکو اور اس مار پیٹ کے لیے مجھے معاف کر دینا۔" معذرت کرنے کے بعد میں پھر گرجنے برسنے لگا۔" بدبخت بُڈھے۔ اگر تُو نے پھر کبھی میرے سامنے زبان چلانے کی جرأت کی تو میں تمھاری کھال اُدھیڑ ڈالوں گا۔"

میں غصّے سے بل کھاتا کوٹھری سے باہر آگیا۔ اتنے میں وہ محافظ بھی قریب آچکا تھا جسے میں نے تختے لانے کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے بڑی رعونت سے کہا۔" یہ تختے اس گیدڑ کی کوٹھری میں پھینک دو اور اپنے ساتھیوں کو بتا دینا کہ وہ مجھے خاتون سادیہ سے شکایت کا موقع نہ دیں۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور تختے کوٹھری میں پھینک دیے۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف چلنے لگا . . . لیکن ابھی میں نے دو تین ہی قدم اُٹھائے ہوں گے کہ مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔

دروازے اور میرے درمیان ایک جسیم آدمی حائل تھا۔ اس کی آنکھوں میں درندگی اور ہونٹ سفاک مسکراہٹ سے پھیلے ہُوئے تھے۔ عقب سے مجھے محافظ کی کراہ سُنائی دی۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ بے حد خوف زدہ ہو لیکن اس کی آواز میں حیرت بھی تھی جیسے اس غیر معمولی ہستی کو یہاں دیکھ کر اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔

" آقائے جلالی . . ." وہ بڑبڑایا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ انسانی باڑے کا ہر قیدی سہم کر اپنی کوٹھری میں دُبک گیا تھا اور محافظوں کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے اس شخص کو نہ تو پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔

اچانک وہ حرکت میں آگیا۔

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔

میں اپنی جگہ خاموش کھڑا اس دیوقامت شخص کو گھورتا رہا جس کا جسم کسی درخت کے تنے جیسا مضبوط اور بازو موٹے موٹے شہتیروں جیسے تھے۔ ہر بڑھتے ہُوئے قدم کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں خونخواری کی جھلک بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یکایک اس نے دونوں ہاتھ اپنے سر سے بلند کر لیے۔ اُسی لمحے انسانی باڑہ محافظوں کی للکار سے گونج اُٹھا۔" آقائے جلالی!" وہ بیک وقت چلّائے اور میں نے متحیر نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سب کے سب گھٹنوں کے بل جھُکتے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ مجھے صُورتِ حال کا اندازہ ہوتا میں نے آقائے جلالی کا دایاں ہاتھ اپنی کھوپڑی کی طرف گرتے دیکھ لیا۔ ایک ساعت کے لیے مجھے یُوں لگا جیسے میرے سر پر کسی وزنی کلہاڑے کی چوٹ پڑی ہو اور میری کھوپڑی ان گنت ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے اُتر آئے اور میرا وجود اُنہی اندھیروں میں ڈُوبتا چلا گیا۔

میں نے زور سے اپنا سر جھٹکا لیکن تاریکیوں نے ذہن پر کچھ اس طرح پنجے گاڑ رکھے تھے کہ اُنھیں محض جھٹکنے سے دُور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کھوپڑی پر پڑنے والی اس ضرب نے مجھے ایک آدھ تارا نہیں بلکہ پُوری کہکشاں ہی دکھا دی تھی اور میں جو خود کو اندھیروں میں ڈُوبتا محسوس کر رہا تھا تو درحقیقت بات یہ تھی کہ میں اس غیر معمُولی چوٹ کے زیرِ اثر زمین بوس ہو رہا تھا۔

زمین سے ٹکراتے وقت تھوڑی بہت جو شعوری کیفیت باقی رہ گئی تھی، اس کے تحت میں نے خود کو لڑھکنیاں کھانے کے انداز میں متحرک کر لیا۔ یہ حاضر دماغی میرے کام آگئی ورنہ جلالی کی دُوسری ضرب مجھے تقسیم ہی کر ڈالتی۔ لڑھکنیاں کھانے کا یہ عمل میرے لیے یُوں بھی فائدے مند ثابت ہُوا کہ میرے اور آقائے جلالی کے درمیان کچھ فاصلہ پیدا ہو گیا جب

تک اس نے یہ فاصلہ طے کیا' میں نہ صرف سنبھل کر اُٹھ گیا بلکہ اس کے اگلے حملے کے لیے تیار بھی ہو چکا تھا۔

میں مارشل آرٹس کا ماہر ہونے کے باوجود اب تک قدیم طرزِ حرب اپنانے پر مجبور تھا اگر ایسا نہ کرتا تو یقیناً میری شخصیت اُن کے لیے ایسے تجسس کا باعث بن جاتی' جو میرے لیے مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اپنے تربیت یافتہ جسم کی پھرتی اور طاقت ہی استعمال میں لاتا اور داؤ پیچ انھی جیسے اختیار کرتا تھا۔

جلالی' انسان نہیں درندہ تھا۔ اس کی دہکتی ہوئی آنکھیں حریف کو یقیناً احساسِ کمتری کی دلدل میں گرا کر بے بس کر دیتی ہوں گی۔ میں نے کن انکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ سرنگوں محافظ اب سیدھے ہو کر حیرت سے منہ پھاڑے میری طرف دیکھنے میں مصروف تھے۔ گویا انھیں یقین نہ آرہا ہو کہ کوئی شخص آقائے جلالی کے کلہاڑے جیسے ہاتھ کی ضرب کھا کر زندہ بھی رہ سکتا ہے... لیکن میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ میرے انداز سے مقابلے کی دعوت بھی جھلک رہی تھی۔

میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ خادِ اعظم نے تم جیسے بزدل کو کہاں چھپا رکھا تھا؟" میں نے زہر خند سے کہا۔ "بہرحال سامنے آئے ہو تو تمھیں مایوس نہیں کروں گا۔"

وہ رُک گیا۔ انداز ٹھٹک جانے جیسا ہی تھا۔ میری بات نے غالباً اسے میری قوّتِ ارادی اور خود اعتمادی کی انتہا سے آگاہ کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے اب وہ اندھا دُھند مجھ پر چڑھ دوڑنے سے باز رہا تھا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بس کھڑا ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔

"میں دشمنی کا تعین کیے بغیر لڑنا پسند نہیں کرتا۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "بتاؤ' تم کون ہو اور تمھیں مجھ پر ہاتھ اُٹھانے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟"

وہ ہنس پڑا۔ اس کا قہقہہ سارے جہان کی سفاکیوں کا مظہر تھا۔

"اسے بتاؤ' میں کون ہوں؟" اس نے ایک محافظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس نے شاید پہلے کبھی میرا نام بھی نہیں سنا۔"

میں نے اُسے نگاہ میں رکھتے ہوئے اس محافظ کی طرف دیکھا جسے جلالی نے تعارف کرانے کی ذمّے داری سونپی تھی۔

"یہ... یہ آقائے جلالی... خادِ اعظم کے خاص شہ زور ہیں... اور انھیں آشوری قبیلے میں طاقت کے دیوتا کا درجہ حاصل ہے۔" محافظ نے ہکلا ہکلا کر بتانا شروع کیا۔ "آقائے جلالی' اسی شہ زور پارس کے بھائی ہیں جس سے تم نے پہلا مقابلہ کیا تھا۔"

"ہُوں..." میں نے حقارت آمیز انداز میں ہلتے ہوئے کہا۔ "اس بات سے دشمنی کا تعین تو ہو گیا لیکن تم اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے' بدبودار گوریلے؟" میں نے براہِ راست جلالی سے کہا۔

غالباً اس سے پہلے کسی نے اس سے اتنے حقارت آمیز انداز میں مخاطب ہونے کی جرأت بھی نہیں کی تھی' اس لیے میری بات سن کر لمحے بھر کو وہ سناٹے میں رہ گیا اور پھر اگلی ہی ساعت اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

غصّے سے اندھے شیر کو پچھاڑنا اُسی وقت ممکن ہوتا ہے' جب مقابل اپنا ذہن بے حد ٹھنڈا رکھے۔ میں اس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کنگ فو اور کراٹے کے دو ایک داؤ آزمانے چاہییں۔ اس وقت تماشا دیکھنے والے چند محافظ ہی تھے اس لیے میرا یہ اندازِ حرب زیادہ نگاہوں میں نہیں آ سکتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

اس کے جبڑوں سے جھاگ گر رہے تھے۔

یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے دانتوں سے بھنبھوڑ کر رکھ دینا چاہتا ہو۔ لیکن میں یہاں زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے واپس سادیہ کے خیمے میں بھی پہنچنا تھا۔ جیسے ہی وہ میری زد میں آیا' میں نے ایک نعرہ لگا کر اپنا جسم فضا میں اچھال دیا۔

اس سے قبل کہ وہ میرے حملے سے آگاہ ہوتا' میری دونوں ٹانگیں اس کے پیٹ سے ٹکرائیں اور کھڑی ہتھیلی نے کسی وزنی کلہاڑے کی طرح اس کی کھوپڑی پر قیامت ڈھا دی۔

کھوپڑی ٹوٹنے اور پیٹ میں پیروں کے پنجے گھسنے سے بیک وقت موت تین جگہ سے اس کے جسم میں داخل ہوئی اور پل بھر میں اُس کی رُوح نکال کر پرواز کر گئی۔

وہ گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر کی طرح زمین پر گرا۔

تازہ تازہ خون زخموں سے فواروں کی طرح بہہ نکلا لیکن اس کے جسم میں وہ تڑپ نہیں تھی جو ذبح ہونے والے بکرے میں ہوتی ہے بلکہ اس کے جسم کے کپڑوں سے بے نیاز حصّوں کی بوٹیاں یُوں پھڑک رہی تھیں جیسے کھال اُتر جانے کے بعد گوشت

پھڑک دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اطراف میں دیکھا۔

تمام محافظ یُوں جھکے ہوئے تھے' جیسے انھیں اسی حالت میں ساکت ہو گیا ہو۔ میں نے ایک فاتحانہ نگاہ اپنے شکار پر ڈالی اور انسانی باڑے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اب مجھے خیمے میں جا کر سادیہ کا انتظار کرنا تھا... لیکن سارا دن گزر گیا۔ رات آ گئی مگر سادیہ اپنے خیمے میں واپس نہیں آئی۔ میں نے باہر جا کر حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرا دل خطروں اور خدشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی وہ اُن جانے خطروں سے لرز اُٹھتا اور کبھی ڈاکٹر فریدوں کے خلاف غصّے سے لبریز ہو جاتا۔ جس نے ہر آنے والا لمحہ میرے لیے کچے دھاگے سے لٹکتی شمشیرِ برہنہ بنا دیا تھا جو کسی بھی وقت گِر کر میری شہ رگ کاٹ سکتی تھی۔ یہاں مجھے قدیم دور کی جنگ لڑنے کے ساتھ ساتھ اب سازشوں کا بھی تجربہ ہو رہا تھا لیکن یہ تجربہ کس کام کا جب زندگی کا اعتبار ہی اُٹھ چکا ہو اور ہر پل آخری پل محسوس ہو رہا ہو۔

اسی ذہنی کشمکش کے دوران اچانک میرے خیالوں کی رَو لالی کی طرف بہہ گئی جو مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے لیے اپنے جاسوس بھیج رہی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ مجھے بھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکی لیکن اس کا یہ پیار بھی میری جان کا دشمن بن گیا تھا۔ کاش میں کسی طرح اسے یہ پیغام بھیج سکتا کہ وہ میرے لیے اپنے جاسوس بھیجنا بند کر دے ورنہ مجھے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔

اتنے میں توپ کا دھماکا سُنائی دیا۔ توپ کا یہ گولہ قریب ہی خیمہ گاہ میں کسی جگہ گرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ کبھی کبھی تاتاری رات کی خاموشی میں اچانک توپ چلا دیتے تھے تاکہ آشوری خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلیں۔ مجھے لالی کا سپہ سالار یاد آ گیا جو اکثر ٹھنڈی سانس کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ وقت کتنا خوش گوار ہو گا جب وہ شہر پناہ کی بلندی سے میدان پر نظر ڈالے گا تو اُسے آشوریوں کے خیمے نظر نہیں آئیں گے۔ لیکن اس کی یہ خواہش حسرت بن کر رہ گئی تھی۔ آشوری ابھی تک میدان میں خیمہ زن تھے اُن کے سینکڑوں شہسوار روزانہ اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے تھے لیکن یہ جنگ ماؤں سے بیٹے' بہنوں سے بھائی' بچوں سے باپ اور سہاگنوں سے شوہر چھین رہی تھی اور ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ یہ دَور بھی ہماری سرزمین جیسا ہی ہے اور یہاں بھی اقتدار کے لیے وہی کچھ کیا جا رہا ہے' جو ہمارے دَور میں ایک قوم دُوسری قوم پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کرتی آئی ہے اور اب تک کر رہی ہے۔ وہاں بھی ماؤں کی گودیں اجاڑی جاتی ہیں اور بچے یتیم کیے جاتے ہیں اور یہاں بھی خونِ انسانی سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

نہ جانے آج نیند مجھ سے کیوں رُوٹھ گئی تھی؟

اچانک مجھے خادِ اعظم تمبُور کا خیال آ گیا جو دیوانگی کے دَورِ دل میں نوعمر بچوں کی زندگی سے کھیلتا اور پھر اپنے دیوتا اُدبی کے سامنے گڑگڑا کر فریادیں کرتا تھا۔ میں نے سوچا' کیا رستم بھی کسی نوشباب بیٹی کا باپ ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ شاہ تمبور کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟ میں رستم کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ بابر کا ہم وطن اور کراٹے کا جنگجو ہے۔ اگر وہ برسرِ اقتدار آ جائے تو کیا میں اور آشوری اُس کے زیرِ سایہ بہتر زندگی گزار سکیں گے؟ اس سوال کا جواب آسان تھا۔ رستم' خادِ اعظم سے یقیناً بہتر تھا۔ نہ اس پر شاہ تمبور کی طرح دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور نہ ہی وہ معصوم بچّوں کو اپنے جنُون کا شکار بناتا تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا اور اُسے ٹھوس دلائل سے قائل کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر یک گونہ اطمینان محسوس ہُوا کہ اگر رستم کا منصوبہ کامیاب ہو گیا تو میں اُس وقت تک ضرور زندہ رہ سکوں گا جب ڈاکٹر فریدوں مجھے واپس بُلا لے گا۔ اس لیے مجھے بہرطور رستم کا ساتھ دینا چاہیے۔

سوچوں کے جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

ە

دُوسری صبح سادیہ کی بجائے رستم کے چھ آدمی آئے اور اُنھوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا۔ مجھے اپنا چابک اور چوبی خنجر تو اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی لیکن وہ میرا تمسخر اُڑاتے اور نیزوں سے ٹہوکے دیتے ہوئے ایک چھوٹے سے خیمے میں لے آئے جو خادِ اعظم کے شاہی خیمے کے قریب گاڑا گیا تھا... پھر وہ مجھے خاموشی سے انتظار کرنے کا حکم دے کر باہر چلے گئے۔

چند لمحوں کے بعد رستم خیمے میں داخل ہُوا اور حسبِ عادت کچھ بولے بغیر مجھے گھورتا رہا پھر وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کیا بونا تمھارے پاس آیا تھا اور تم بابر سے مل چکے ہو؟"

"ہاں کمان دار۔" میں نے ادب سے جواب دیا کہ میں اس

احترام کرتا تھا۔

وہ اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا "میں زیادہ
چوڑی بات نہیں کروں گا اگر خادِ اعظم اس وقت دوسرے معاملات
مصروف نہ ہوتا تو شاید میں اس ملاقات کا خطرہ مول نہ لیتا میں
اس دوران تم پر کڑی نظر رکھی اور اپنے آدمیوں سے تمہاری
انی کروائی ہے۔ تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے والے آدمی ہو۔
ایک غلام کی بھی بہت اچھی اداکاری کر رہے ہو مگر تم مجھے بے وقوف
بنا سکتے۔ تم نے آقائے جلالی کو جس انداز میں خاک نشین کیا
وہ اس صدی کا سب سے عجیب واقعہ ہے۔ جن محافظوں نے
وہ منظر دیکھا ہے' وہ اب تک اپنے حواسوں میں نہیں آئے۔
یال تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ میرا ساتھ دو گے یا نہیں؟"

یہی وہ گھڑی تھی جب رستم سے سودے بازی کی جا سکتی
اس لیے میں نے نرم لہجے میں کہا: "اگر معاملہ شاہ تیمور کو ہلاک
نے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہتا
کہ اس کے بعد میرا مستقبل کیا ہوگا؟"

یہ سن کر رستم کی آنکھیں سکڑ گئیں: "تمہیں آزادی کے
ساتھ عہدہ بھی ملے گا سرفروش! تم میرے نائب بنو گے اور
ہمارا تاوان ادا کر دیا گیا تو تمہیں تاغان جانے کی اجازت بھی
دی جائے گی۔" اتنا کہہ کر وہ مسکرایا اور بات جاری رکھی۔
حالانکہ یہ تاوان والی بات میرے پلے نہیں پڑتی۔ ویسے میں چاہتا
کہ تم میرے ساتھ رہو۔ میں نے تمہیں پہلے شہزادے سے مقابلہ
دیکھا ہے۔ مجھے تم جیسے بہادروں کی ضرورت ہے لیکن تمہاری
میرے لیے پُراسرار بھی ہے۔ خیر' اس سلسلے میں بعد میں بات
گے۔ فی الحال صرف یہ بتا دو کہ تم میرا ساتھ دے رہے ہو یا نہیں؟"

مجھے اپنا ساتھی سمجھو کمان دار۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر غور سے سنو۔ میں چند لمحوں کے بعد تمہیں شاہ تیمور کے
لے جاؤں گا کہ اس بہانے میں نے تم سے ملاقات کا
نکالا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں وہاں کوئی خطرہ پیش نہیں
کیونکہ سادیہ تمہاری وکالت کے لیے وہاں موجود ہوگی۔
کو طیش مت دلانا۔ اپنی دیوانگی کے دوروں میں اُسے
کا احساس نہیں ہو پاتا اور اگر ہم محتاط رہیں تو اُسے کبھی
نہیں ہوگا کہ وہ لقمۂ اجل بننے والا ہے۔ البتہ سادیہ
انیال ہے۔ اُسے دو روز تک اندھیرے میں رکھنا بے حد
ہے۔ لہٰذا دو روز تک تمہیں اس طرح اُس کے ساتھ
کہ اُسے اپنی خبر بھی نہ رہے۔ تم میرا مطلب سمجھتے ہو نا؟"

"میں تو سمجھتا ہوں لیکن اگر اس دوران وہ میری ضرورت
محسوس نہ کرے تو کیا ہوگا؟"

"تو تمہیں خود ہی اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ کم از کم خادِ اعظم
کے جشن تک اُسے گرد و پیش سے بے خبر رہنا چاہیے۔ اس کے
بعد اُس کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ اب میرے منصوبے کی
تفصیل بھی سن لو۔"

وہ سرگوشی میں مجھے تفصیل بتلانے لگا۔ بات ختم کرتے
ہی اُس نے بڑے زور سے میرے جبڑے پر مُکا رسید کیا اور بولا: "یہ
اس لیے ضروری تھا کہ تمہارے ہونٹوں سے رِسنے والا خون تاخیر کا
جواز بن سکے۔ شاہ تیمور یہ سمجھے کہ تم سے حقیقت اُگلوانے کے
لیے سختی کی گئی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

رستم اور اُس کے چھ آدمی مجھے لے کر خادِ اعظم کے شاہی خیمے
کی طرف چل دیے۔ ان آدمیوں نے رستم کے ساتھ جینے مرنے کی
قسم کھا رکھی تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ اُس کے ساتھ ایسے اور
کتنے آدمی ہیں۔

خادِ اعظم کے خیمے سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی لیکن جب
ہم خیمے میں داخل ہوئے تو خیمہ تقریباً خالی تھا۔ ایک کونے میں
چند ساز ندے بیٹھے ساز بجا رہے تھے اور دوسرے کونے میں
شاہ تیمور کے آدمیوں کے درمیان ایک تاغانی قیدی زنجیروں
میں جکڑا کھڑا تھا۔ خادِ اعظم اور اس کی بہن سادیہ معمول کے مطابق
اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے مگر آج شاہ تیمور کے دائیں جانب
بھی ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر بارہ تیرہ سالہ ایک حسین لڑکی براجمان
تھی۔ اُس کا اُداس چہرہ اور بھاری پپوٹے بتا رہے تھے کہ وہ روتی رہی
ہے۔ جب میں خادِ اعظم کے تخت کی جانب بڑھا تو مجھے دیکھ کر سادیہ
کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اُٹھے ... مگر وہ جلدی سے دوسری
جانب دیکھنے لگی۔

خادِ اعظم کے قدموں میں بونا مارو سب سے بے نیاز حسبِ معمول
چار رنگین گولے اُچھالنے میں مصروف تھا اور اُس کے ہونٹوں پر وہی
حزنیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو عملِ جراحی سے ہمیشہ کے لیے اس
کے چہرے پر چپکا دی گئی تھی۔

خادِ اعظم مجھے دیکھتے ہی آگے کو جھکا اور اپنی داہنی آنکھ مجھ
پر گاڑ دی جو انگارے کی طرح سُرخ ہو رہی تھی اور جس کی پُتلی مسلسل
گردش کر رہی تھی۔ اُس نے وقت ضائع کیے بغیر مجھ سے کہا: "وہ ملعون
ملکہ ہوشی تمہیں بھول نہیں سکی سرفروش! اُس نے تمہیں ہماری قید
سے نجات دلانے کے لیے اس جاسوس کو یہاں بھیجا ہے۔ تم اس

سلسلے میں کیا جانتے ہو؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتا، عالم پناہ!" میں نے ادب سے جواب دیا۔

خادِ اعظم اپنے مکروہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مسکرایا اور بولا: "یہ جاسوس بھی یہی کہتا ہے کہ تم اس معاملے میں ملوث نہیں ہو لیکن رستم کو تم پر اعتماد نہیں ہے اور اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں تم سے براہِ راست استفسار کروں۔ اس جاسوس کو سامنے لاؤ!"

خادِ اعظم کا حکم سنتے ہی اس کے سپاہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تاغانی جاسوس کو دھکے دیتے اور کھینچتے ہوئے اس کے سامنے لے آئے۔ جب زنجیروں کی جھنکار موسیقی میں مدغم ہو گئی تو خادِ اعظم مجھ سے مخاطب ہوا: "کیا تم نے اس آدمی کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہے، سرفروش؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"نہیں عالم پناہ!" میں نے جواب دیا اور بے بس تاغانی کی طرف دیکھا جس نے جنگ میں کام آنے والے کسی آشوری کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کا حلیہ بدلنے کے لیے بھی کسی آشوری کی داڑھی کے بال کاٹ کر اس کے رخساروں اور ٹھوڑی پر چپکا دیے گئے تھے... مگر اب وہ بال کہیں کہیں سے اکھڑ چکے تھے۔

"کیا تم نے اسے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے تاغانی گیدڑ؟"

شاہ بمتور نے غرا کر پوچھا۔

تاغانی جاسوس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور بولا: "ہاں، میں نے عظیم سردار سرفروش کو دیکھا ہے۔ اسے ملک فارس سے بھیجا گیا تھا۔ اس نے تمہارے سورما کو شکست دی مگر گھوڑے سے گر کر گرفتار ہو گیا۔ مجھے اس سے ملنے اور فرار کا منصوبہ بنانے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن میں اس سے ملنے اور بات کرنے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔" جاسوس نے یہ بیان دے کر خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ وہ دم لینے کو رکا اور پھر بولا: "مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر میں سچ بتا دوں گا تو مجھے اذیت پہنچا کر نہیں مارا جائے گا۔ اس لیے اس وعدے پر عمل کیا جائے!"

"میں نے تجھ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا، بدبخت!" خادِ اعظم شیر کی طرح دھاڑنے لگا۔

"آپ کے آدمیوں نے تو وعدہ کیا تھا۔" جاسوس نے گھبرا کر یاد دہانی کرانے کی کوشش کی۔

اس سے پیشتر کہ خادِ اعظم اسے کوئی جواب دیتا، سادیہ میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف جھکی اور کہنے لگی: "اب تو یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے، برادرِ عزیز کہ سرفروش نے فرار کا منصوبہ نہیں بنایا، اس لیے اسے دوبارہ میرے حوالے کر دیا جائے۔ یہ میرا غلام ہے!"

شاہ بمتور نے یہ سن کر دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے شروع کر دیے اور اس وقت تک ہنستا اور اپنے سینے پر ہاتھ مارتا رہا جب تک کہ اس کی آنکھوں میں پانی نہیں آ گیا۔ پھر وہ بولا: "اگر تم قسم... میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارا غلام ہے اور تم اس سے کیا... ہو۔ مگر اس کا فیصلہ میں نہیں، میرا گھوڑا برق کرے گا۔ برق کو یہاں لایا جائے!" اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ لایا تو گھوڑا ہی جائے گا مگر گھوڑے... میں بونا مارنو باتیں کرے گا۔ میں نے بونے کی طرف دیکھنے کی... بھی نہیں کی۔ وہ اسی طرح بے نیازی سے رنگین گولے اچھالنے میں مصروف تھا۔ میں نے سوچا کہ بونے مارنو کی دوستی اور دشمنی کی گھڑی بھی آ ہی گئی۔ اگر یہ میرا دشمن ہو گا تو گھوڑے کی زبانی میری موت کا فیصلہ سنا دے گا اور دوست ہو گا تو یقیناً...

اتنے میں خادِ اعظم کا ذاتی گھوڑا برق وہاں لایا گیا جو... کے عام گھوڑوں سے قد میں بڑا تھا۔ گھوڑا سازوں کی آواز سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ ایک سیاہ فام غلام نے برق کی باگ... اور اسے تخت کے قریب لے گیا۔ خادِ اعظم نے جھک کر اس... پر ہاتھ پھیرا اور بولا: "اے میرے میدانِ کارزار کے ساتھی، پیارے برق، تمہیں ان آدمیوں کی تقدیر کا فیصلہ کرنا ہے۔ تاغانی گیدڑ کے متعلق بتاؤ کہ یہ مجرم اور سزاوار ہے یا نہیں؟"

سیاہ فام غلام نے ہلکے سے باگ کھینچی تو گھوڑے نے... میں سر ہلایا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اگرچہ بونے کے... بند تھے لیکن گھوڑے کی ہنہناہٹ جیسی آواز اس کے حلق...

"یہ تاغانی مجرم ہے!" خادِ اعظم کسی بچے کی طرح خوش ہو... بجاتے ہوئے بولا: "میں تم سے متفق ہوں، برق... کہ اس کی سزا موت ہے مگر اسے آسان موت ملنی چاہیے... اذیت ناک؟"

میں یہ سوچ کر ہی لرز گیا کہ بونا مارنو اس سوال کا... دے گا جو خادِ اعظم چاہتا تھا۔ وہ لب ہلائے بغیر گھوڑے... میں بولا: "اسے اذیت ناک موت ملنی چاہیے مالک! اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے تو اسے سزا بھی بھگتنا..."

میں نے بے اختیار مارنو کی طرف دیکھا مگر وہ... گولے اچھالنے میں مصروف تھا۔ موت کی سزا سناتے...

اس کے ہونٹوں پر وہی مستقل مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی حالانکہ اس کے ہونٹ بند تھے۔

"اور اب سرفروش کے متعلق تمہارا کیا فیصلہ ہے، برق؟ کیا یہ اتنا ہی معصوم اور بے گناہ ہے جتنا میری بہن سمجھتی ہے اور یہ خود کو ظاہر کرتا ہے؟" شاہ بمتور نے پوچھا۔

گھوڑا یعنی مارنو خاموش رہا۔ اگرچہ اس کی خاموشی کا یہ وقفہ صرف چند لمحوں تک محدود تھا لیکن یہ چند لمحے مجھ پر موت سے بھی زیادہ بھاری گزرے... پھر مارنو کے غیر متحرک ہونٹوں کے باوجود گھوڑے جیسی ہنہناتی ہوئی آواز نکلی۔

"سرفروش احمق نہیں ہے، مالک کہ کوئی ایسا منصوبہ بنائے۔ یہ تو اپنے تاوان کا منتظر ہے جو اسے آزادی دلائے گا۔ آپ کی بہن نے اس معاملے میں سچ کہا ہے، عالم پناہ! سرفروش کو اس جرم کی سزا نہیں ملنی چاہیے جس کا وہ مرتکب نہیں ہوا!"

یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔

خادِ اعظم سادیہ کی طرف پلٹا اور بولا: "میرا برق تم سے متفق ہے میری ننھی بہن! کیا تم اس کے تھان پر جا کر اسے مٹھائی کھلاتی رہی ہو؟" یہ کہہ کر وہ بے ہودہ انداز میں ہنس پڑا۔

سادیہ نے بھی قہقہہ لگایا اور بولی: "آپ نے برق سے فیصلہ لے کر بڑی دانش مندی سے کام لیا ہے، برادرِ عزیز! ہو سکتا ہے آپ کا گھوڑا ہم دونوں سے زیادہ عقل مند ہو!"

خادِ اعظم نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا: "سرفروش مجرم نہیں ہے۔ میں اسے دوبارہ سادیہ کی تحویل میں دیتا ہوں اور اس تاغانی کو اسی وقت قتل گاہ میں لے جاؤ... پھر وہاں ان سب لوگوں کو اس کی موت کا دلچسپ تماشا دکھانے کے لیے بلا لو جو کسی اہم کام میں مصروف نہ ہوں!"

اب میں خادِ اعظم کا قیدی نہیں بلکہ دوبارہ سادیہ کا غلام بن گیا تھا۔

جب وہ اپنے محافظوں اور کنیزوں کے جلو میں اپنے خیمے کی طرف جا رہی تھی تو میں بھی چند قدم پیچھے چلتا رہا۔ خیمے کے قریب پہنچ کر اس نے محافظوں اور کنیزوں کو رخصت کر دیا اور میرے پاس آ کر کہنے لگی: "تم موت کی دہلیز تک پہنچ گئے تھے، سرفروش! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں تمہیں بچانے کی اتنی کوشش کیوں کرتی ہوں!"

"کیوں کہ میں آپ کا غلام ہوں اور آپ کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، خاتونِ محترم!"

"شاید یہی بات ہے... لیکن اگر تم زیادہ مصیبت میں پھنس جاتے تو مجھے خوش نہیں رکھ سکتے تھے!"

"اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں تھا، خاتونِ گرامی قدر!"

"ہاں... مگر رستم کیوں مصر تھا کہ تم سے ضرور استفسار کیا جائے؟ یہ آدمی میری سمجھ سے بالا ہوتا جا رہا ہے!" وہ پریشانی سے بولی: "میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ جب بھی موقع ملے، رستم پر نظر رکھو لیکن اسے یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے اور کیا باتیں کرتا ہے!"

میں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا: "لیکن اس پر نظر رکھنے کے لیے مجھے آنے جانے کی اجازت درکار ہو گی، خاتونِ گرامی قدر۔ میں زنان خانے میں رہ کر اس پر نظر نہیں رکھ سکوں گا!"

"میں جانتی ہوں!" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی: "میں اس کا بندوبست کر دوں گی مگر یاد رکھو..." اس نے مقتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: "اگر تم نے میرے ساتھ کوئی چال چلی تو اس تاغانی کی اذیت ناک موت، اس موت کے مقابلے میں نہایت آسان ہو گی جو تمہارے حصے میں آئے گی!"

اس رات میں نے اپنی خدمت گزاری کی انتہا کر دی۔

سادیہ اور ملکہ ہوشی میں یہ فرق تھا کہ لالی آتشِ وصال میں جل کر صبح تک راکھ ہو جاتی تھی، جب کہ سادیہ ایک ایسی راکھ کی مانند ہو جاتی جسے جب بھی کریدا جائے اس میں ایک آدھ چنگاری ضرور موجود ہوتی تھی۔

"تم نے مجھے انوکھے جذبوں سے روشناس کرایا ہے، سرفروش!" وہ سرگوشی میں بولی: "میں ان جذبوں سے آشنا نہیں تھی۔ میری رفاقت میں بہت سے لوگ آ چکے ہیں۔ تمہارا حریف فروزد پارس جو تمہارے ہاتھوں مارا گیا، وہ بھی میرا رفیق رہ چکا ہے۔ شاید یہ بات تمہارے لیے حیرت انگیز ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاہ افشار بھی میری محبت کا دم بھرتا رہا ہے۔ اگر وہ صرف ایک ہفتہ مزید زندہ رہ جاتا تو جیسا اس نے وعدہ کیا تھا، وہ ہم پر تاغان کی شہر پناہ کا دروازہ کھول دیتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ میدانِ جنگ میں کیسے مارا گیا؟ ہم نے اپنے لشکریوں کو ہدایت کی تھی کہ کوئی اس پر حملہ نہ کرے اور کسی کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ حکم عدولی کرتا مگر اس کے باوجود شاہ افشار مر گیا اور میرے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ فصیل آج بھی سدِ راہ بنی ہوئی ہے اور میرا بھائی آج بھی اس توپ کے حصول کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شاہ افشار کو کس نے

مار بھا تو میں اُس کے ساتھ وہی سلوک کروں گی جو آج تا غانی جاموس کے ساتھ کیا گیا ہے۔"

میں خاموشی سے سادیہ کی باتیں سُنتا رہا۔ صرف لالی اور میں ہی جانتا تھا کہ شاہ افشار کو کس نے ہلاک کیا تھا۔ مجھے اس بات پر بے حد تعجب تھا کہ شاہ افشار اور سادیہ ایک دوسرے کے قریب رہ چکے ہیں لیکن میں اس سلسلے میں سادیہ سے کچھ پوچھ کر اپنے لیے کوئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ رات تو میرے لیے بے پناہ حیرتیں لے کر آئی تھی۔ سادیہ ہر لمحے ایک نئے راز اور ایک نئے اسرار سے پردے اُٹھائے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے خود ہی پوچھا یہ جانتے ہو، میں خاموش کیوں ہو گئی تھی؟"

"نہیں خاتونِ مکرم۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے سوچا تھا کہ تم میرے اور شاہ افشار کے بارے میں پوچھو گے۔"

"ایک غلام کو اس قسم کے استفسار کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے، خاتونِ محترم؟"

سادیہ نے قہقہہ لگایا اور بولی: "یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا، سرفروش! میں یہی پرکھنا چاہتی تھی کہ تم اس سلسلے میں متجسس ہوتے ہو یا نہیں۔ بہرحال، تم جیت گئے اس لیے میں خود ہی تمھیں بتائے دیتی ہوں۔ تاہم یہ خیال رکھنا کہ میں تمھیں اعتماد میں لے رہی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنا مقام بھول جاؤ۔"

"نہیں سرکارِ عالیہ... میں خوش فہم احمقوں میں سے نہیں ہوں۔"

اس یقین دہانی کے بعد سادیہ نے مجھے بتایا کہ میدانِ کارزار سے چند میل مغرب کی طرف فصیل میں ایک موری نما چھوٹا سا دروازہ ہے۔ کبھی کبھی سادیہ اپنے چند محافظوں اور کنیزوں کے ساتھ رات کے وقت وہاں جایا کرتی تھی۔ شاہ افشار اپنے عمائدینِ سلطنت اور ملکہ سے جان چھڑا کر اس دروازے سے باہر آتا اور سادیہ کے ساتھ چھوٹے خیمے میں کچھ وقت گزارا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ سادیہ کی محبت میں اتنا ڈوب گیا کہ اس نے اپنی قوم سے غداری کرتے ہوئے شہر پناہ کا دروازہ کھولنے کا وعدہ کر لیا۔ اس نے سادیہ کو یہ قول بھی دیا کہ وہ ملکہ ہوشی کو اس کے حوالے کر دے گا تاکہ سادیہ اس سے انتقام لے سکے۔ ملکہ ہوشی کے تذکرے پر سادیہ بولی: "اگر شاہ افشار نہ مرتا تو میں ملکہ ہوشی کو ایسی عبرت ناک سزا دیتی کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ میں نے تو اس کُتیا کے لیے ایک پنجرہ بھی تیار کروا لیا تھا۔"

سادیہ کی یہ بات سُن کر میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔ لالی نے سادیہ کے لیے اور سادیہ نے لالی کے لیے پنجرے تیار کروا لیے تھے۔ انتقام کے سلسلے میں عورتوں کی سوچ بھی کتنی یکساں قسم کی ہوتی ہے۔

ان باتوں کے بعد سادیہ دیر تک خاموش رہی تو میں سمجھا کہ شاید وہ سو گئی ہے۔ میں اس کے بدلے ہوئے رویّے پر غور کرنے لگا کہ اس اچانک تبدیلی اور میرے لیے پیار کے اظہار کا محرک کون سا جذبہ ہے؟

ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ وہ بول اُٹھی: "سرفروش!"

"جی خاتونِ محترم!"

"میں سمجھی تھی کہ تم سو گئے ہو۔ سُنو... میں نے تم پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"یہ میرے لیے باعثِ عزت و افتخار ہے خاتونِ مکرم... آپ ہمیشہ مجھے اپنے اعتماد کا اہل پائیں گی۔"

اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی: "میں نے خادِ اعظم کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ پھر میں تنہا آسوریوں پر حکمرانی کروں گی۔ تمھیں اس سلسلے میں میری مدد کرنا ہو گی۔"

میں نے یہ سُن کر اس طرح کروٹ بدلی جیسے اس بات سے مجھے حیرت ہوئی ہو اور میں کچھ خوف زدہ بھی ہو گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے اسی ردِ عمل کی متوقع ہو گی۔ چنانچہ میں نے اداکاری کرتے ہوئے کہا: "میں آپ کی مدد کیسے کر سکتا ہوں، خاتونِ محترمہ... میں تو ایک بے بس غلام ہوں جس کے پاس نہ کوئی ہتھیار ہے اور نہ ہی کوئی اختیار ہے۔"

چونکہ وہ خواب گاہ میں مکمل تاریکی پسند نہیں کرتی تھی اس لیے خیمے کے ایک گوشے میں شمع جل رہی تھی۔ اس نے شمع کی مدھم روشنی میں اپنی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں نے اپنا عکس اس کی خوب صورت بادامی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ اُسے بھی اپنا عکس میری آنکھوں میں جھلکتا نظر آ رہا ہو گا۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی: "تمھیں اختیار اور ہتھیار مل جائیں گے۔ اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو میرے ساتھ حکمرانی کرو گے... لیکن نہیں... میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔ حکمرانی میں کروں گی اور تم میرے دوش بدوش بیٹھو گے۔"

میں سادیہ کی اس پیشکش سے پریشان ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہ تیمور کو قتل کرنے کے لیے بیک وقت دو منصوبے بنائے گئے ہیں اور انھیں ایک ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے گا مگر منصوبوں

پر عمل درآمد کرنے والے فریقین ایک دوسرے کے منصوبے سے لاعلم ہیں... اور یہ بات سب سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ کسی بھی لمحے اور کسی بھی مقام پر فریقین کا آپس میں ٹکراؤ ہو سکتا تھا... پھر ان کا یہ تصادم ایک دوسرے کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے کافی سے زیادہ ثابت ہو سکتا تھا۔

میں انھی سوچوں میں گم تھا کہ سادیہ بولی: "تم خاموش کیوں ہو گئے، سرفروش؟"

"میں... میں غور کر رہا تھا خاتونِ محترم۔ دراصل مجھے اس کی توقع نہیں تھی بلکہ میں نے تو ایسا بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔ خادِ اعظم کو قتل کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ محافظ ہر وقت اس کی حفاظت اور نگرانی پر مامور رہتے ہیں اور وہ اس کے وفادار ہیں۔"

"اگر اس کے پاس وفادار جنگ جو ہیں تو میرے پاس بھی ہیں جو میرے لیے اپنی جانوں پر کھیل سکتے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ ایسے وفادار ساتھی رستم کے بھی ہیں اور جال ہر طرف پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

سادیہ نے ایک نوک دار رنگین ناخن سے اپنی ناک کھجائی اور کہنے لگی: "اگر میرا منصوبہ کامیاب ہو گیا تو اس میں کوئی معرکہ آرائی نہیں ہو گی۔ میں خوں ریزی نہیں چاہتی اگر لڑائی ہوئی تو میں ماری جاؤں گی کیونکہ میرے پاس اتنی نفری نہیں جتنی کہ خادِ اعظم کے پاس ہے۔ اس لیے میں اُسے عیاری سے قتل کرنا چاہتی ہوں... مگر میں یا تم اُسے قتل نہیں کرو گے۔ میرے پاس ایک ایسا آدمی ہے جو اُسے قتل کرے گا اور سارا الزام بھی اپنے سر لے لے گا۔ اس جُرم کے لیے اُسے اپنی جان دینا پڑے گی۔"

"یہ سب کچھ کیسے عمل میں آئے گا، خاتونِ محترم؟"

"تم بونے مارنو کو جانتے ہو؟ خادِ اعظم کا وہی مسخرہ جو ہر وقت گولے اُچھالتا رہتا ہے؟"

مارنو کا نام سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر وہ سادیہ کا ساتھی ہے تو پھر میری اور رستم کی جانیں اس کی مُٹھی میں تھیں۔

"زیادہ مت سوچو، سرفروش! وہ بونا میرا ساتھی ہے وہ بظاہر اپنے آپ کو خادِ اعظم کا وفادار ظاہر کرتا ہے لیکن کسی بنا پر وہ میری وفاداری کے لیے مجبور ہے۔ میں نے اُسے کہہ رکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو شاہ تیمور کا وفادار ظاہر کرتا رہے لیکن جب میں اُسے حکم دوں گی تو وہ بلا چون و چرا اس کی تعمیل کرے گا۔"

میں یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ بونا مسخرہ بیک وقت کس کس سے کھیل کھیل رہا ہے۔ خادِ اعظم اُسے اپنا ساتھی سمجھتا ہے سادیہ اُسے اپنا وفادار کہتی ہے، رستم اور بابر کے نزدیک وہ معتبر ہے اور ان کی وجہ سے میں بھی اِسے معتبر سمجھ رہا تھا۔

سادیہ کہہ رہی تھی: "دو روز بعد میرے بھائی کی سالگرہ ہے جس کے لیے ایک شان دار تقریب منعقد کی جائے گی۔ اس تقریب میں بونا اُسے قتل کر دے گا۔ میں اُسے خادِ اعظم کے قتل پر مجبور کر دوں گی اور یہی وہ وقت ہو گا جب مجھے تمھاری مدد درکار ہو گی۔ میں تمھیں لکڑی کے کُند خنجر کی بجائے فولاد کا تیز دھار خنجر دوں گی۔ تم تقریب میں میرے ساتھ جاؤ گے جب بونا میرے بھائی کو قتل کرے تو تم اُسے کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر اس خنجر سے بونے کا کام تمام کر دو گے۔ اگر اُسے بولنے کا موقع مل گیا تو سب کچھ غارت ہو جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی: "میرا منصوبہ ناکام نہیں ہو سکتا سرفروش... اس عیارانہ منصوبے پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔ بونا خادِ اعظم کو قتل کرتے ہی مجرم بن جائے گا اور تم مجرم کو قتل کر کے عہدے داروں اور آسوریوں کی نگاہوں میں اعلا مقام حاصل کر لو گے۔ میں روتے اور بین کرتے ہوئے خادِ اعظم کو سپردِ خاک کر دوں گی اور اس کے بعد جب میں اپنی قوم کی واحد حکمراں بن جاؤں گی تو تم تخت پر میرے دائیں ہاتھ بیٹھا کرو گے۔"

"مگر کتنے دن؟" میں نے یہ الفاظ کہے نہیں بلکہ صرف دل ہی دل میں سوچے تھے: "نہ جانے کب تمھارا جی مجھ سے بھر جائے اور تم میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرو جو مجھ سے پہلے غلام کے ساتھ کیا گیا تھا۔" پھر میں نے سادیہ کی طرف دیکھا اور کہا: "آپ کا منصوبہ بہت عمدہ اور مکمل ہے خاتونِ محترم لیکن آپ بونے مارنو کے متعلق اتنی پُر یقین کیسے ہیں؟"

"اس یقین کی وجہ میں تمھیں نہیں بتا سکتی۔ تمھارے لیے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ وہ میرے کہنے پر خادِ اعظم کو ضرور قتل کر دے گا۔ تم اس دوران رُستم پر نظر رکھو۔ میں نہیں جانتی کہ اس کی وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے معاملے اور منصوبے میں دخل در معقولات نہ کرے۔"

میں خاموشی سے اُسے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ اب کبھی

ہونے پر اعتماد نہیں کروں گا۔

"آج میں نے بہت باتیں کی ہیں اور میں نے اپنا دِل تم پر کھول دیا ہے۔ کیا تم میرے لیے ایک بار پھر..."

میں سادیہ کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

• ▣

آنے والی صبح صرف میرے لیے ہی حسرتیں اور اُداسیاں نہیں لائی بلکہ سادیہ اور رستم کے لیے بھی اس کے دامن میں مایوسیاں ہی مایوسیاں تھیں۔ ان کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے کیونکہ رات کے کسی لمحے خادِ اعظم نے لشکر کو فوری کُوچ کا حکم دے دیا تھا۔ جس شدّت و سُرعت کے ساتھ اُس پر جنون کا دَورہ پڑا تھا، اسی تیزی سے وہ ختم بھی ہو گیا تھا۔ دیوتا اُوبی نے اُسے خواب میں جلوہ دکھایا تھا اور بشارت دی تھی کہ وہ یہاں جنگ نہیں جیت سکتا۔ اس لیے وہ فوراً کُوچ کر کے مشرق کی طرف روانہ ہو جائے جہاں فتح و نصرت اس کی منتظر ہے۔ دیوتا نے اُسے خواب میں اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں مگر سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان باتوں کا انکشاف کسی پر نہ کرے۔ اِس لیے اُس نے چُپ سادھ رکھی تھی۔

خادِ اعظم کے اس اچانک اقدام نے میری ساری اُمیدیں اور سارے خواب بکھیر دیے تھے۔ قافلے کے ساتھ چلتے چلتے ایک مقام پر میں نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچی اور پلٹ کر دیکھا تو مجھے تا حدِ نظر لشکر کے چھکڑے ہی چھکڑے دکھائی دیے۔ یہ چھکڑے یا گاڑیاں ایک دو دِل قطاریں آگے بڑھ رہی تھیں اور ان کے پیچھے گرد کا ایک بادل اُڑ رہا تھا۔

کُوچ کرتے وقت سادیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اب ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ سالگرہ کی تقریب ملتوی کر دی گئی ہے اور جب خادِ اعظم پر دیوانگی کا دورہ نہ ہو تو وہ محافظوں کے گھیرے میں رہتا ہے پھر اُوبی کی بشارت کے بعد شاید وہ بروں بھی بہت کم بیٹھے گا اس لیے اب اُسے قتل کرنے کی کوشش بے حد خطرناک ہو گی... لیکن فکر نہ کرو۔ اس پر پھر جنون کے دَورے پڑیں گے اور کوئی نہ کوئی تقریب بھی ضرور منائی جائے گی۔"

کُوچ کے بعد رستم سے بھی میری مڈبھیڑ ہوئی تھی اس نے سر کی معنی خیز جنبش سے بتا دیا تھا کہ اب منصوبے پر عمل نہیں کیا جا سکتا... اور پھر میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے صرف یہ ایک لفظ کہا تھا: "صبر۔"

ہمیں سفر کرتے ہوئے کئی روز گزر چکے تھے مگر اس دوران بونامارو مجھے ایک بار بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے خادِ اعظم کے ذاتی عملے میں بھی نہیں دیکھا تھا اور یہ بات میرے لیے تعجب خیز تھی۔ شاید سفر کے دوران یا ہنگامی حالات میں شاہ تمبود اس مسخرے کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔

... دوسرے روز میں نے سادیہ سے بابر کو مانگ لیا۔ میری درخواست پر اس نے مجھے تیز نگاہوں سے تو ضرور دیکھا لیکن میری درخواست قبول کر لی۔ میں نے بابر کو غسل کروایا اور اسے نیا لباس بھی فراہم کر دیا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی گاڑی بھی کمل کر لی تھی جسے وہ دو نوک دار چھڑیوں کی مدد سے چلایا کرتا تھا۔ آسوری اسے اپنی گاڑی چلاتا دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے۔ میں نے اسے چھکڑے کے ساتھ ایک تختہ بھی لگوا دیا تھا تاکہ وہ اس پر سے اپنی گاڑی اُتار یا چڑھا سکے۔

ایک روز اس نے مجھ سے کہا: "سادیہ آج کل تمھیں بڑی عجیب نظروں سے دیکھتی ہے، سرفروش! میرا خیال ہے، اب تم پہلے کی بہ نسبت زیادہ مشکل میں پھنس گئے ہو... لیکن یہ مشکل دوسری قسم کی ہے۔ میرے دوست، جب میں جوان تھا تو میری بیوی بھی مجھے ایسی ہی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی لیکن میں ناتجربہ کاری اور نادانی کے باعث ان نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھ سکا اور جب اُسے محبت کا جواب محبت سے نہ ملا تو وہ بے وفائی پر مائل ہونے لگی۔ تب میں نے اُسے اپنے قبیلے کے دستور کے مطابق ہلاک کر دیا تھا... مگر اب بھی مجھے اس کی یاد دُکھوں اور پچھتاووں میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

بابر کی اس بات سے مجھے احساس ہوا کہ سادیہ سچ مچ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے اور اس کا التفات محض ڈھونگ نہیں ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہو سکتا تھا کہ مجھے زندہ رہنے کی زیادہ مُہلت مل سکتی تھی۔

سفر کا چوتھا یا پانچواں روز تھا کہ چلتے چلتے میں نے گھوڑا ایک ٹیلے پر چڑھا دیا اور مڑ کر لشکری کارواں دیکھنے لگا جو کسی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پس منظر میں بہت دُور، اُفق کے پاس شہر پناہ دکھائی دے رہی تھی۔ سفر کے دوران جب تک ہم فصیل کے متوازی چلتے رہے تھے جگہ جگہ تاتانی سپاہی اور گھڑسوار فصیل پر ہماری نگرانی کرتے دکھائی دیے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ فصیل کے اس پار دوسرے شہر اور گاؤں آباد ہیں۔ جنھیں خبردار کر دیا گیا ہے کہ اگر

خادِ اعظم کا لشکر مشرق کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک پلٹے اور چین پر حملہ کر دے تو وہ مقابلے کے لیے تیار رہیں لیکن خادِ اعظم چُپ سادھے اپنے لشکر کی رہنمائی کرتا رہا اور فصیل سے ہٹ کر آگے بڑھتا رہا۔

لشکر کے آگے آگے ہراول دستہ تھا جس کے گھڑسوار تیزی سے سفر کرتے ہوئے راستے کا جائزہ لیتے اور واپس آ کر شاہ تمبود کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ خادِ اعظم اپنے گھوڑے برق پر سوار محافظوں کے دستے میں گھرا دُور اُفق پر نظریں جمائے رہتا۔ اُس کے محافظوں نے اپنے نیزوں کی نوک پر انسانی کھوپڑیاں اور گھوڑوں کی دُمیں لٹکا رکھی تھیں۔ اُن کے درمیان یک چشم خادِ اعظم اپنے مکروہ چہرے کی وجہ سے کوئی خبیث روح ہی دکھائی دیتا تھا اور اس کے محافظ غول بیابانی لگتے تھے۔ ان کے پیچھے سادیہ اپنے چہرے پر مہین نقاب ڈالے کبھی گھوڑے پر سفر کیا کرتی اور کبھی اپنی گاڑی میں آرام کرنے چلی جاتی تھی۔ اس کی کنیزوں اور ذاتی محافظوں کے لیے بیس چھکڑے وقف تھے۔ ان کے بعد رستم کا چھکڑا تھا جس کے پیچھے اس کے خصوصی عملے کی گاڑیاں تھیں... پھر فوج کے عہدے داروں اور سپاہیوں کے بعد قیدیوں اور خدمت گاروں کے چھکڑے تھے میں ان چھکڑوں کو گزرتے ہوئے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ شاید بونے مارنو کے لیے بھی کوئی چھکڑا مخصوص کیا گیا ہو گا ورنہ وہ ان پانچ دنوں میں کہیں نہ کہیں تو ضرور دکھائی دیتا۔

"اس کا چھکڑا کہاں ہے؟" یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

آخری چھکڑے کے تقریباً ایک میل پیچھے گھوڑوں اور بچھڑوں کے گلّے لائے جا رہے تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد پانچ ہزار سے کم نہیں تھی۔ ان گھوڑوں اور بچھڑوں کو چھوٹے چھوٹے گلّوں میں اس لیے بانٹ دیا گیا تھا کہ ان کی رکھوالی آسانی سے کی جا سکے۔ ان کے رکھوالوں میں چرواہوں اور سلوتریوں کے ساتھ ساتھ قصاب بھی شامل تھے جو وقتِ ضرورت گھوڑے ذبح کرتے تھے۔ رکھوالوں کے پاس کافی تعداد میں ایسے تربیت یافتہ کتّے بھی تھے جو گلّے سے بھاگنے والے گھوڑوں کو گھیر کر واپس لاتے اور انھیں گلّے کے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر پلٹ کر فصیل کی جانب دیکھا تو میری نگاہ ان دو آسوری شہسواروں پر جا پڑی جو میرے عقب میں گھوڑے ٹہلتے ہوئے یک ٹک میری ہی جانب دیکھ رہے تھے۔ یہ دراصل میرے نگراں تھے اور چوبیس گھنٹے مجھ پر نظر رکھتے تھے۔ میں نے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ، انگلی سے طلائی طوق کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے انھیں بتانا چاہتا تھا کہ میں اس حسین حصار سے باہر کہیں نہیں جاؤں گا۔ اگرچہ سادیہ نے یہ طوق ڈھیلا کروا دیا تھا اور اب اس سے میری گردن نہیں چھلتی تھی مگر جب تک یہ میرے گلے کی زینت تھا، میں ایک غلام تھا اور مجھے تلوار رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔

سفر مسلسل جاری رہا اور ہر صبح شام مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی رہی کہ آسوری لمحوں میں اپنے خیمے اُکھاڑتے اور لمحوں میں نصب کر دیتے ہیں۔ قیام کے دوران وہ کچھ اور ہوتے ہیں اور سفر کے دوران کچھ اور... جب کُوچ کا وقت آتا تو ہر فرد حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی کام میں جُت جاتے۔ ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے قیام و سفر کے لیے جو اصول و قواعد بنائے ہیں، ان سے کوئی بھی روگردانی نہیں کر سکتا۔

چھٹے روز مجھے سادیہ کا پیغام ملا کہ آج رات مجھے اس کے حضور پیش ہونا ہے چنانچہ جب پڑاؤ ہوا تو میں اپنے چھکڑے میں گیا اور تیار ہو کر سادیہ کے چھکڑے کی طرف چل دیا۔ آسمان پر تارے جگ مگ کر رہے تھے اور رات کچھ خنک ہو گئی تھی اس لیے متعدد جگہوں پر الاؤ روشن تھے۔ جس میدان میں پڑاؤ ڈالا گیا تھا، اس کی زمین کچھ ریتلی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آگے ریگستان آنے والا ہے۔

سادیہ کا چھکڑا بڑا اور خوب آراستہ پیراستہ تھا۔ اس کی سیڑھیوں کے قریب کھڑے محافظ نے مُسکرا کر مجھے سلام کیا لیکن اب محافظوں کے تبسم میں میرے لیے توہین کُھلی ہوئی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے رویے میں یہ تبدیلی میرے ساتھ سادیہ کے مہربان رویے کا نتیجہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب بھی مجھے سادیہ کا کھلونا اور غلام سمجھتے ہیں مگر انھیں طنزیہ تبسم یا ذو معانی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر چھکڑے میں داخل ہو گیا... اور جب عقبی حصّے کا پردہ ہٹا کر آگے بڑھا تو سامنے ہی سادیہ بستر پر دراز نظر آ گئی۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ جوں ہی میں اُس کے قریب پہنچا اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"میں نہیں جانتی کہ تم نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے یا میں خود ہی اپنا آپ ہار بیٹھی ہوں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم میری کمزوری بن گئے ہو، جیسے تمھارے بغیر میری

تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔"

میں نے جواب میں بولنا چاہا تو اس نے میرے ہونٹوں پر اپنی دو انگلیاں رکھ دیں۔

"نہیں، تم مت بولو۔ مجھے بولنے دو۔ میں چھ روز سے تم سے بات کرنے کو ترس گئی ہوں۔"

میں خاموش رہا اور وہ بولتی رہی۔ حتیٰ کہ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "جب ہم شاہ تمبور کو ختم کر دیں گے تو میں تم سے شادی کر لوں گی... پھر تم بھی میرے ساتھ میری قوم پر حکمرانی کرو گے۔ کرو گے نا؟"

"آپ نے میری اتنی عزت بڑھائی ہے خاتونِ محترم کہ مجھے شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے، سرفردش! جو میں نے پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔"

"میں نہیں جانتا کہ آسوری قوم پر حکومت کیسے کی جاتی ہے، خاتونِ محترم۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک دم میرے پہلو سے اُٹھ بیٹھی اور قدرے غصّے سے بولی۔ "میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھے ٹالتے ہو اور بہلانے کی کوشش کرتے ہو۔ مجھے تمھارا یہ بزدلانہ اور محتاط رویّہ قطعاً پسند نہیں اور ہاں تنہائی میں مجھے خاتونِ محترم نہیں بلکہ صرف سادیہ کہا کرو۔ سمجھ گئے؟"

"جی ہاں خاتون... سادیہ۔" میں نے جواب دیا۔

"خاتون نہیں... صرف سادیہ... یہ آپ شاپ والا تکلّف بھی ختم ہونا چاہیے۔ اب بتاؤ کہ میں تمھیں کیسی لگ رہی ہوں؟"

"بے حد غصّے میں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ایسے میں کیا تمھارا فرض یہ نہیں کہ میرا غصّہ ٹھنڈا کرو؟" اس نے غصّے سے پوچھا۔

میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے لیٹی رہی پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "سنو سرفروش! جب سے اُوبی نے شاہ تمبور کو بشارت دی ہے، اس نے آج پہلی بار مجھے بلوایا اور اپنے اعتماد میں لے کر بہت سی باتیں کیں۔"

"اچھا! کیا میں وہ باتیں پوچھ سکتا ہوں؟"

"وہ تو میں خود ہی تمھیں بتانے والی تھی۔" اس نے کروٹ لے کر بات جاری رکھی۔ "وہ ہر صبح کوچ سے پہلے اس چھکڑے میں جاتا ہے جس میں دیوتا اُوبی کا مجسمہ رکھا ہوا ہے۔ آج کل وہ بہت نیک ہو گیا ہے۔ لڑکیوں کی طرف تو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ وہ کہتا ہے کہ دیوتا اُوبی نے اُسے ہدایت کی ہے کہ اس وقت تک مشرق کی طرف بڑھتا رہے جب تک کہ وہ دیوار ختم نہ ہو جائے جس کے دوسری جانب تاغانی رہتے ہیں پھر وہ دیوار کی دوسری جانب سے مغرب کی طرف چلتا رہے اور ملکہ ہوشی کی فوج پر پیچھے سے حملہ کرے تو نہ صرف اُسے فتح نصیب ہوگی بلکہ توپ بھی مل جائے گی۔"

"یہ تو اُسے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا، سادیہ۔ اُس نے پہلے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

اِس پر سادیہ نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور بولی۔ "تم بھی پاگل ہو، سرفروش! پہلے اُسے اُوبی نے یہ بشارت ہی نہیں دی تھی۔ دوسرے میں نے سُنا ہے کہ اس دیوار کے اختتام تک راستہ بے حد خطرناک ہے۔ وہاں تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے سینکڑوں سپاہی مر جائیں گے بغیر ہتھیار اُٹھائے۔ تم صرف رستم پر نظر رکھو اور وقت کا انتظار کرو۔ خادِ اعظم پر دیوانگی کا دورہ ضرور پڑے گا... پھر وہ بروس پی کر اپنی حفاظت سے بے پروا ہو جائے گا اور اس کی غیر فطری طلب جاگ اُٹھے گی تب میں خود ہی کوئی تقریب منعقد کر ڈالوں گی اور ہم اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیں گے۔"

گردشِ لیل و نہار کے ساتھ لشکر کا سفر جاری رہا۔ آہستہ آہستہ دن خنک اور راتیں خنک تر ہوتی گئیں۔ مجھے گھوڑوں کی ایال سے بنا ہوا ایک جُبّہ، کمبل اور کتّے کی کھال سے بنی ہوئی ٹوپی دی گئی تاکہ سردی سے اپنا تحفظ کر سکوں۔ سردیوں میں آسوری یہی چیزیں استعمال کیا کرتے تھے۔

اب تاغانی فصیل نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور ہم جس صحرائی علاقے سے گزر رہے تھے، وہ بتدریج چڑھائی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اس بے آب و گیاہ میدان میں صرف دو ہی چیزیں مسلسل متحرک تھیں۔ ایک لشکر اور دوسری ریت... دن رات چلنے والی تیز ہوائیں بگولوں کو جنم دیتیں اور ایسی باریک دُھول اُڑانے لگتیں جو چہروں پر لپٹے ہوئے کپڑوں کے بھی پار ہو جاتی۔

میں بار بار سانس کے ساتھ مُنہ میں جانے والی دُھول تھوکتا اور ڈاکٹر فریدون کو کوستا رہتا جس نے مجھے اپنے تجربے کی بھینٹ چڑھا کر اس عجیب دور کے وحشی قبیلوں میں پھینک دیا تھا۔ سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لا کر بچّے اور بوڑھے مرنے لگے

آسوری انھیں دفنانے کی بجائے لاشیں رہگزر کے کنارے پھینک دیتے اور لشکر کے پیچھے پیچھے آنے والے گوریلے انھیں چٹ کر جاتے۔ یہ گوریلے، جنھیں میدانِ جنگ میں کام آنے والوں کی لاشیں کھانے کی چاٹ لگ چکی تھی، آغازِ سفر سے ہی لشکر کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے لیکن جب انھیں اپنی مرغوب غذا کافی مقدار میں نہ ملی تو انھوں نے گھوڑوں کے ریوڑوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔

کئی روز بعد جب ریت کا طوفان تھم گیا تو لشکر ایک ایسے درّے میں داخل ہُوا جو اچانک فراز میں بدل گیا تھا اور دُور دکھائی دینے والے ان پہاڑوں کی طرف راہ نمائی کر رہا تھا جن کی چوٹیوں پر برف چمک رہی تھی۔ اب خادِ اعظم نے اپنے گھوڑے برق پر سواری ترک کر دی تھی اور چھکڑے میں سفر کر رہا تھا۔ سادیہ تقریباً روزانہ مجھے اپنے چھکڑے میں بلا لیا کرتی تھی اور اس کی مہربانیاں مجھ پر بڑھتی جا رہی تھیں۔ پہلے مجھے اس کی دشمنی سے خوف آتا تھا تو اب دوستی سے ڈر لگنے لگا... مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

چند روز بعد لشکر برفانی پہاڑوں کے دامن میں پہنچ گیا جہاں درختوں اور ہریالی کی بہتات تھی۔ آسوریوں نے یہاں تقریباً ایک ہفتہ پڑاؤ ڈالے رکھا۔ وہ درخت کاٹتے اور لکڑی جمع کرتے رہے جو اُن کے لیے بے حد قیمتی تھی اور دُور دراز سے لائی جاتی تھی۔ اس لیے وہ لکڑی بطورِ ایندھن کبھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ایندھن کے لیے گھوڑوں کی لید استعمال کی جاتی تھی اور آسوری قوم کا سب سے نچلا طبقہ لید جمع کیا کرتا تھا۔

جوں جوں ہم آگے بڑھے، درّے کا راستہ تنگ تر ہونے لگا۔ جس میں سے بہ مشکل تمام ایک چھکڑا گزر سکتا تھا۔ اب برفانی علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ ہمارے سروں پر برفانی چوٹیاں تنی کھڑی تھیں اور نیچے وادیوں میں بادل گھوم رہے تھے۔ سرد ہوائیں جسم کے آر پار ہونے لگی تھیں۔ وہ مُردار خور گوریلے جو تاغان کے میدانِ کارزار سے ہمارا پیچھا کرتے آ رہے تھے، برفانی علاقہ شروع ہوتے ہی پلٹ گئے تھے اس لیے اب مرنے والوں کو گہری کھائیوں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اموات کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ تو بیماری سے مر رہے تھے اور کچھ تنگ راستے پر سے پھسل کر جان دے رہے تھے۔ کبھی کبھی تو چھکڑے بھی کھڈوں اور کھائیوں میں جا گرتے تھے لیکن ان تمام مشکلات و مصائب کے باوجود خادِ اعظم اپنے دیوتا اُوبی کی ہدایت پر سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ شام کا اندھیرا اُترنے سے پہلے ہر فرد اور ہر چھکڑا جہاں ہوتا تھا، وہیں رُک جاتا تھا اور الاؤ روشن کر دیئے جاتے تھے۔ میں آسوریوں کی بہ نسبت اچھی صحت اور تن و توش کے باوجود زکام اور نزلے کا شکار ہو گیا تھا۔ جس کا علاج وہ گرم گرم بروس سے کیا کرتے تھے چنانچہ گرم گرم بروس کے ساتھ مجھے برف کی طرح یخ گوشت کھانا پڑتا تھا مگر اب مجھے گھوڑے کا گوشت کھانے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

میرا چھکڑا سادیہ کے چھکڑے سے کافی پیچھے تھا اور میں خوش تھا کہ اُس نے کئی دنوں سے مجھے نہیں بلوایا تھا۔ دو روز سے مجھے وہ دو آسوری شہسوار بھی دکھائی نہیں دیئے تھے جو سائے کی طرح میری نگرانی کیا کرتے تھے۔ شاید وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے تھے کہ میں اس برف زار سے فرار ہو کر کہاں جاؤں گا۔ اُن کی یہ سوچ بجا تھی۔ اس لیے وہ بھی اپنے چھکڑے میں جا دُبکے تھے۔ چنانچہ رات کو میں بلا خوف بابر کے چھکڑے میں چلا جایا کرتا تھا جہاں ہم اپنے کمبلوں اور گھاس کے ڈھیروں میں چھپے جی بھر کے گپیں مارا کرتے تھے۔

ایسی ہی ایک شام اچانک چھکڑے کے عقبی دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی تو ہم دونوں چونک گئے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بابر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔ "ایسی ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سرد اور اندھیری رات میں سادیہ بھی تمھیں نہیں بلوا سکتی، پھر کون آیا ہوگا؟"

"میں دیکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور وہ چاقو جو کبھی میں نے بابر کو اپنی گاڑی بنانے کے لیے دیا تھا، ایک ہاتھ میں چھپا کر اُٹھا، عقبی حصّے میں گیا اور دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ یخ بستہ طوفانی ہَوا بھیڑیوں کی طرح غرّاتی ہوئی چھکڑے میں در آئی۔

میں نے سر باہر نکال کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ آنے والا بونا مارنو تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اُٹھا لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

"تم نے ملاقات کے لیے بڑا اچھا وقت منتخب کیا ہے۔" بابر اُسے دیکھتے ہی بولا۔ "آج تو گھوڑوں نے بھی اپنے سر ایک دوسرے کی ٹانگوں میں چھپا رکھے ہوں گے۔ بتاؤ کیا خبر لائے ہو۔ کیا خادِ اعظم نے اپنی دیوانگی کے دورے میں کسی کھڈ میں چھلانگ لگا دی ہے؟"

بونا اسے جواب دینے کے بجائے اپنے جُبّے، کمبل اور ٹوپی سے برف جھاڑتا رہا۔ وہ اپنے لبوں پہ چپکی مخصوص مسکراہٹ کے باوجود بے حد پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے میری کلائی تھامی اور کہنے لگا۔۔۔

"میں تمہارے جھکڑے پر گیا تھا مگر جب جواب نہ ملا تو میں نے سوچا کہ شاید تم یہاں ہو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، سردار سرفروش! میں ہر طرف سے مایوس ہو کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ دیوتا اُوبی کے نام پر میری مدد کرو۔"

میں نے اب تک بابر کو یہ نہیں بتایا تھا کہ بونا مارنو بقول سادیہ اُسی کا آدمی ہے۔ وہ اصل میں کس کا وفادار تھا، مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا تھا، اس لیے میں نے بابر سے یہ بات چھپائی تھی اور اب وہ مجھ سے مدد مانگ رہا تھا۔ وہ کیسی مدد چاہتا تھا اور مجھ ہی سے کیوں چاہتا تھا جب کہ خادِ اعظم، رستم اور سادیہ اس کی مدد کے لیے موجود تھے؟ تاہم میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری مدد ضرور کروں گا مارنو۔۔۔ کیا تم خطرے میں ہو؟"

"میں خطرے میں نہیں ہوں بلکہ وہ کوئی اور ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ میرے ساتھ آؤ سردار سرفروش اور دیکھو کہ تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو۔"

میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں بابر سے مشورہ طلب کیا مگر اس نے کندھے اُچکا دیئے جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ میں خود ہی فیصلہ کروں کہ مجھے جانا چاہیے یا نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ پُراسرار بونا مجھے دھوکے سے تو کسی جگہ نہیں لے جانا چاہتا؟ اتنے میں اس نے پھر کہا: "دیر مت کرو سردار سرفروش! وقت بہت کم ہے اور ہمیں کافی دُور جانا ہے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں، مارنو!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ مدد کی ضرورت کسے ہے اور تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

بونا مارنو یہ سُن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر دحشت اور مایوسیوں کے سائے پھیل گئے تھے وہ بولا: "میں نہیں بتا سکتا۔ یہاں نہیں بتا سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ بابر کو اس بات کا علم ہو، ورنہ اس کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"اگر ایسا ہے تو میں بھی نہیں جاننا چاہتا۔" بابر بولا۔ "تم اس کے ساتھ جاؤ۔ سرفروش۔"

"چلو مارنو۔" میں نے اُسے کہا، ہم جھکڑے سے نکل آئے اور دروازہ بند کر دیا۔

باہر تُند اور یخ بستہ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور اُن کی سائیں سائیں کے علاوہ کچھ سُنائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے چلّا کر مارنو سے پوچھا۔ "ہمیں کہاں چلنا ہے، مارنو۔ جلدی بتاؤ ورنہ یہ ہوا تو ہمارا خون جما دے گی۔"

مارنو نے اسی طرح چلّاتے ہوئے جواب دیا: "ہمیں بہت پیچھے جانا ہے جہاں لید جمع کرنے والوں کے جھکڑے ہیں۔ میں وہیں سے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جھکڑوں کی آڑ لیتا ہُوا اُس خطرناک برفانی راستے پر چل پڑا۔ لید جمع کرنے والوں کے جھکڑے یہاں سے کم از کم پانچ میل دور تھے۔ راستہ بے حد خراب اور خطرناک تھا۔ ہوا تیز تھی اور اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اگر میرا یا بونے مارنو کا پاؤں پھسل جاتا تو پاتال جتنی گہری کھائیوں میں گر کر ہماری ہڈیاں چُور ہو جاتیں۔

میرے ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت سردی نقطۂ انجماد سے بیس درجے کم ہو گی۔ ایسے عالم میں کوئی بھی چوکیداری اور گلہ بانی نہیں کر رہا تھا۔ گھوڑوں کے گلے جھکڑوں کی قطار سے بہت پہلے ایک کُھلے مقام پر روک لیے گئے تھے تاکہ انھیں اس وقت آگے بڑھایا جائے جب سارے جھکڑے اس تنگ اور دُشوار گزار راستے سے نکل جائیں۔

اگرچہ اس وقت برف باری نہیں ہو رہی تھی مگر تیز ہوا سے برف کے ذرّات اُڑ کر چھروں کی طرح جسم سے لگ رہے تھے۔ اچانک ایک مقام پر بونا مارنو گر پڑا۔ میں نے اُسے سہلا دے کر اُٹھایا۔

"اگر تمہارے لیے چلنا مشکل ہو تو میں تمہیں اُٹھا کر لے چلوں؟" میں نے کہا۔

بونے نے نفی میں سر ہلا دیا مگر چند قدم چلنے کے بعد وہ پھر لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اب کے میں نے اس سے پوچھنے کی بجائے اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور تیز تیز مگر بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ جب بونا مارنو بولنے کے قابل ہُوا تو اس نے کہا: "تقریباً ایک میل کا فاصلہ باقی ہے۔"

اس نے یہ اندازہ یوں لگایا تھا کہ جھکڑوں کی قطار ختم ہو گئی تھی مگر کچھ فاصلہ خالی چھوڑنے کے بعد یہ قطار دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ یہ فاصلہ جان بُوجھ کر چھوڑا گیا تھا [illegible]

لانے والے جھکڑے باقی جھکڑوں سے اتنی دُور رہیں کہ اُن کی بدبُو اور غلاظت اگلے جھکڑوں کو متاثر نہ کر سکے۔ بالآخر میں اُپلوں والے جھکڑوں تک پہنچ گیا۔ چھ سات جھکڑوں کے بعد ایک جھکڑے میں سے ہلکی سی روشنی باہر آ رہی تھی۔

"بس اسی جھکڑے کے پاس رُک جانا۔" بونے نے کہا۔

میں نے جھکڑے کے قریب پہنچ کر اسے کندھوں سے اُتارا تو وہ کہنے لگا: "جھکڑے میں داخل ہونے سے پہلے تمہیں ایک حلف اُٹھانا پڑے گا، سردار سرفروش!"

"کیسا حلف مارنو؟ یہ بکواس رہنے دو اور اندر چلو ورنہ اس سردی میں ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔"

"تمہیں صرف اتنی قسم کھانی ہے کہ جو کچھ جھکڑے میں دیکھو گے، اس کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔"

"اچھی بات ہے، مارنو۔ میں قول دیتا ہوں کہ جو کچھ... دیکھوں گا، اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔ اب اندر چلو ورنہ سردی ہڈیوں میں اُتر جائے گی۔"

مارنو مطمئن ہو گیا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے جھکڑے کا دروازہ کھولا جو نسبتاً چھوٹا تھا چنانچہ مجھے جُھک کر اندر جانا پڑا۔ بونے نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ اگرچہ جھکڑے میں روشنی تھی مگر وہ اتنی مدھم تھی کہ واضح طور پر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہاں ایک ناگوار سی بُو بھی پھیلی ہُوئی تھی۔ جب میری آنکھیں اس نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سب سے پہلے میری نگاہ ایک بڑھیا پر پڑی جس کے سامنے گدے پر ایک لڑکی لیٹی ہُوئی تھی۔ بڑھیا نے ہماری طرف دیکھنے کی بجائے لڑکی پر ہی اپنی نگاہیں مرکوز رکھیں۔ مارنو لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ میری بیٹی تانتی ہے اور یہ مر رہی ہے، سرفروش۔ نہ میں اس کی مدد کر سکتا ہوں اور نہ ہی یہ بڑھیا کچھ کر سکتی ہے۔ اگر تم نے بھی اس کی مدد نہ کی تو یہ مر جائے گی۔۔۔ اور میری مشکل یہ ہے کہ میں تمہارے سوا کسی سے بھی مدد کی التجا نہیں کر سکتا۔" یہ کہتے کہتے بونے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مجھے اس پر رحم کے ساتھ ساتھ غصّہ بھی آیا کہ اس نے آج ایک بار پھر مجھے نئے اسرار سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کی ہر بات اور ہر ادا اسرار کے پردے میں لپٹی ہُوئی تھی۔ وہ جب بھی مجھے ملتا ایک نئے معمّے، نئے راز اور نئے اسرار سے دوچار کر جاتا تھا۔ اس وقت میں نے غصّے پر قابو پا لیا اور کہا: "میں تمہاری بیٹی کو بچانے کے لئے جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا مارنو مگر مجھ سے کسی معجزے کی توقع مت رکھنا۔ یہ کب سے بیمار ہے؟" میں نے اس کی بیمار اور بے ہوش بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پوچھا۔

"پانچ روز سے بخار میں بُھن رہی ہے۔ دیکھو اس کا پنڈا کیسا تپ رہا ہے۔"

میں گھٹنوں کے بل لڑکی کے قریب بیٹھا تو وہ بڑھیا پرے ہٹ گئی جو اس کے چہرے سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔ میں نے لڑکی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا، سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اس کی سانس بہت آہستہ چل رہی تھی مگر اس کا سینہ جکڑا ہُوا نہیں تھا۔ جیسا کہ نمونیے میں ہوتا ہے۔

"پہلے میرا خیال تھا کہ اسے کھانسی والا بخار ہے جس سے سانس لینی مشکل ہو جاتی ہے مگر اسے وہ نہیں بلکہ کوئی دوسرا بخار ہے۔ میں نے آج تک کسی کو ایسے بخار میں مبتلا نہیں دیکھا کیا تم کوئی مدد کر سکتے ہو؟"

میں نے چراغ اُٹھا کر اس کی روشنی لڑکی کے چہرے پر ڈالی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ لڑکی کے خدوخال آسوریوں جیسے نہیں بلکہ تاغانیوں جیسے ہیں۔ تاہم اُسے اپنے باپ سے ورثے میں آسوریوں کی ایک ہلکی سی جھلک بھی ملی تھی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح نہ تاغانی قوم جیسی تھیں اور نہ ہی آسوریوں جیسی۔۔۔ اس کے ہونٹ گلاب کی طرح سُرخ تھے جن پر بخار کی وجہ سے پپڑیاں جم گئی تھیں۔ ابھی میں اس کے خدوخال ہی دیکھ رہا تھا کہ لڑکی کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔

وہ ہوش میں آ گئی تھی لیکن اسے یوں آنکھیں جھپکتے دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ یوں محسوس ہُوا جیسے ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی ہو۔ اس کی آنکھیں اگرچہ ملکہ ہوشی کی آنکھوں کی طرح گہری سبز تھیں مگر وہ بینائی سے محروم تھیں۔ اتنی حسین آنکھوں میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پھول، چاند ستارے اور نیلا آسمان کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس نے میری موجودگی محسوس کرتے ہُوئے اپنا نرم و نازک ہاتھ اُٹھایا جو میرے چہرے سے ٹکرا گیا۔ وہ میری داڑھی کو محسوس کرتے ہُوئے بولی۔

"تم کہاں ہو بابا۔ یہ کون ہے جس سے میرا ہاتھ ٹکرایا ہے؟"

یہ سُن کر بونا اس کے قریب بیٹھ گیا اور جُھک کر اس کا رُخسار چُومتے ہُوئے بولا۔ "یہ میرا دوست ہے تانتی۔ یہ تمہارا علاج کرنے

آیا ہے، میری بچی۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

لڑکی کا ڈال جیسا ہاتھ پھر اُٹھا اور اس کا ہاتھ میرا چہرہ ٹٹولنے لگا۔ اس نے میری داڑھی، ہونٹ، آنکھیں اور پیشانی چھوتے ہوئے کہا: "تمھارا دوست اچھا ہے بابا۔" پھر وہ ہاتھ سے اپنے باپ کو ٹٹولنے لگی۔

لڑکی کی اس بات سے میرا دل بھر آیا۔

"ہاں میری لختِ جگر۔ یہ بہت اچھا ہے اور تمھیں جلد ہی اچھا کر دے گا۔" مارنو کہہ رہا تھا کہ اتنے میں لڑکی پھر بے ہوش ہو گئی۔

"میں کوشش کروں گا مارنو... اس کی عمر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بارہ سال۔ اتنی کہ..." بونے نے فقرہ اُدھورا چھوڑ دیا مگر میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ خاوِ اعظم اپنی دیوانگی کے دوروں میں اتنی ہی عمر کی لڑکیوں پہ ستم ڈھاتا تھا۔

"جتنی جلدی ہو سکے، ہمیں اس کا بخار ختم کر دینا چاہیے، مارنو، کیا تمھارے پاس کوئی ایسا برتن ہے جس میں برف لائی جا سکے؟"

"برتن تو چھوٹے ہیں لیکن چھکڑے کے نیچے وہ ٹوکریاں لٹک رہی ہیں جن میں لید جمع کی جاتی ہے۔ کیا وہ کام آ سکتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ بھی کام دے جائیں گی۔" میں نے کہا: "دو پیالے بھی لے لو۔"

ہم چھکڑے سے باہر آ گئے اور طوفانی ہوائیں پیالوں سے برف سمیٹ سمیٹ کر ٹوکریاں بھرنے لگے۔ جب ٹوکریاں بھر گئیں تو ہم انھیں چھکڑے میں لے آئے۔ میں نے مارنو کو مزید برف لانے کے لیے بھیج دیا اور خود تانتی پر پڑا کمبل ہٹا کر بڑھیا کو سمجھانے لگا کہ وہ مریضہ کا لباس بھی اُتار دے۔

بڑھیا نے مریضہ کا ملبوس اُتار دیا تو میں نے اسے کندھوں کی طرف سے برف میں دبانا شروع کر دیا اور بڑھیا نے پاؤں کی جانب سے۔ بونا برف لاتا رہا اور ہم تانتی کے جلتے بھنتے جسم کو برف سے ڈھانپتے رہے یہاں تک کہ وہ پوری طرح برف سے ڈھک گئی۔

مارنو نے بڑھیا کو ایک کونے میں چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود میرے قریب بیٹھ گیا۔

میں نے تانتی کی طرف دیکھا۔ وہ شفاف برف میں دبا ہوا ایک خوبصورت مرمریں مجسمہ لگ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ بے حس و حرکت پڑی رہی تو میں ڈر گیا کہ کہیں وہ مر نہ گئی ہو... مگر جلد ہی اس نے سانس لینی شروع کی تو سینے کے زیر و بم سے برف ہٹنے لگی۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سردی سے ٹھٹھر جائے۔" مارنو نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اگر ہم نے زیادہ دیر برف میں دبائے رکھا تو یقیناً ٹھٹھر جائے گی۔ کیا تم انگیٹھی کا بندوبست کر سکتے ہو؟"

مارنو نے بڑھیا کو انگیٹھی لانے کا حکم دیا۔ وہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا کھوکھا لے آئی جسے اندر سے چاروں طرف مٹی سے لیپ دیا گیا تھا۔

"جب تم کہو گے اس میں اُپلے جلا دیں گے۔" مارنو نے دُکھی لہجے میں کہا۔

"کچھ کمبل ہوں تو وہ بھی تیار رکھو۔ برف ہٹانے کے بعد اسے ہوا نہیں لگنی چاہیے۔"

"میرے پاس کافی کمبل ہیں۔" وہ بولا: "تانتی ہی میرا سب کچھ ہے، سرفروش! میں صرف اسی کی خاطر زندہ ہوں۔"

"تم نے اسے بڑی خوبی سے چھپا رکھا ہے۔ مارنو۔ ان غلیظ چھکڑوں کی طرف کوئی بھی نہیں آتا ہو گا۔" میں نے بونے کی ذہانت کو سراہتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں شاہ تیمور کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔ کوئی اسے بتا نہ دے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ کج روی کا شکار ہے۔ اُسے میری تانتی کا حُسنِ معصوم دیوانہ بنا دیتا اور میں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں مارنو کہ تانتی کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کروں گا۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔

"مجھے تم پر اعتماد ہے، سرفروش!" میں نے زندگی میں سوائے تمھارے کبھی کسی پر اعتماد نہیں کیا اور میں اسی لیے تمھارے پاس آیا بھی تھا۔ پہلے یہ بڑھیا اور صرف میں ہی جانتا تھا کہ تانتی میری بیٹی ہے۔ اب تمھیں بھی معلوم ہو گیا۔ اُپلا جمع کرنے والوں کو میں نے یہ بتا رکھا ہے کہ تانتی میری بھتیجی ہے۔ میں اسے چیتھڑوں میں اور میلا کچیلا رکھتا ہوں۔ یہ ان لوگوں کے ساتھ اُپلے تھاپتی ہے۔ اپنی شہزادیوں جیسی خوبصورت بیٹی کو شاہ تیمور کی نظرِ بد سے بچائے رکھنے کا صرف یہی ایک طریقہ میری سمجھ میں آ سکا تھا۔"

اتنے میں تانتی کراہنے لگی۔ میں اور مارنو اُس کے قریب آ گئے۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے بابا۔" تانتی کراہ کر بولی۔

مارنو نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "گھبراؤ نہیں میری بچی۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔" یہ کہہ کر وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

تانتی پھر غش کھا گئی۔

میں نے بھی اُس کا ماتھا چھو کر دیکھا جو ابھی خاصا گرم تھا۔ میں نے سوچا کہ مزید کچھ دیر اُسے برف میں دبا رہنے دیا جائے تو اس کی حرارت دم توڑ دے گی۔ مارنو، تانتی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

"اسے آرام کرنے دو مارنو۔ اور یہ بتاؤ کہ تمھاری تانتی کیا اپنی ماں پر گئی ہے؟"

"ہاں!" وہ بڑبڑایا: "میں جانتا تھا کہ تم کسی وقت یہ سوال ضرور کرو گے یا یہ ضرور پوچھو گے کہ میری بیٹی اتنی خوبصورت کیوں ہے؟ بات دراصل یہ ہے سرفروش کہ تیرہ چودہ سال پہلے ہم نے اپنے علاقے میں تا تاریوں کا ایک گروہ پکڑا تھا جس میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ ہم نے مردوں کو تو قتل کر دیا مگر ان کی عورتیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ خاوِ اعظم اس وقت بروس کے نشے میں مدہوش تھا۔ اس نے مذاق ہی مذاق میں ایک عورت مجھے دے دی۔ میں جانتا تھا کہ عورتیں کسی مسخرے بونے کو پسند نہیں کرتیں مگر میں نے دکھاوے کے لیے شاہ تیمور کا بے حد شکریہ ادا کیا اور اس عورت کو اپنے چھکڑے میں لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرے گی۔ مگر وہ مجھے چاہنے لگی۔ اور پھر مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔ ایک سال بعد تانتی پیدا ہوئی اور میری بیوی کھانسی والے بخار سے مر گئی۔ تانتی اتنی خوبصورت تھی کہ میں نے اسی وقت اُسے چھپا کر رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے ان گھٹیا لوگوں میں لے آیا۔"

"کیا یہ پیدائشی نابینا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں مگر یہ بچپن ہی سے اپنی انگلیوں کے ذریعے ہر شے دیکھتی آئی ہے۔ اس نے تمھارا چہرہ ٹٹول کر بتا دیا کہ تم اچھے آدمی ہو اور اس کی پہچان کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی۔"

"اگر تم مجھے اچھا آدمی سمجھتے ہو تو پھر مجھے کچھ سوالات کے سچ سچ جواب دو، مارنو۔" میں نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا تو مارنو نے میری طرف جھکتے اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے سرگوشی کی: "اس وقت کوئی سوال نہ کرو سرفروش۔ اگرچہ بڑھیا قابلِ اعتماد ہے لیکن اگر اس پر تشدد کیا گیا تو یہ ہر وہ بات اُگل دے گی جو اس نے سُنی ہو گی۔ وقت آنے پر میں ہر بات تم پر خود ہی واضح کر دوں گا۔"

"بابا۔ مجھے بہت سردی لگ رہی ہے، بابا!" تانتی چیخنے لگی۔

میں نے جلدی سے اس کا ماتھا چھوا جو اب ٹھنڈا ہو چکا تھا: "جلدی سے انگیٹھی جلواؤ مارنو۔" یہ کہہ کر میں تانتی کے جسم سے برف ہٹانے لگا۔

مارنو نے بڑھیا کو انگیٹھی جلانے کا حکم دیا اور خود میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ برف ہٹاتے ہی ہم نے تانتی پر کئی کمبل ڈال دیئے۔ اتنے میں انگیٹھی بھی جل گئی۔ میں اُپلوں کے دُھوئیں سے کھانسنے لگا مگر مارنو، تانتی اور بڑھیا اس کے عادی تھے۔

چند ہی منٹوں میں بند چھکڑا گرم ہونے لگا۔

تانتی ایک بار پھر بے سُدھ ہو گئی۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی اور مارنو بڑی خاموشی سے اپنی بیٹی کا چہرہ تکے جا رہا تھا جس پر سے میں نے کمبل ہٹا دیا تھا۔ مجھے اُپلوں کی اس بھدی سی انگیٹھی کی کارکردگی پہ تعجب ہونے لگا جس نے ذرا سی دیر میں چھکڑے کو بہت گرم کر دیا تھا۔

چند لمحوں کے لیے میرا دھیان انگیٹھی کی طرف بٹ گیا۔ مگر جلد ہی وہ خدشہ پھر جاگ اُٹھا کہ کہیں تانتی مر نہ گئی ہو کیونکہ وہ ابھی تک بے حس و بے حرکت پڑی تھی۔ مارنو بُت بنا اُسے گھورے جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

اچانک میں یہ دیکھ کر چونک اُٹھا کہ تانتی کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے ہیں۔ میں نے جلدی سے اُس کا پسینہ پونچھ دیا۔ چند لمحوں بعد قطرے دوبارہ اُبھر آئے۔ میں نے کمبل کے نیچے ہاتھ ڈال کر تانتی کے شانے چھوئے تو پتہ چلا کہ وہ پسینے میں شرابور ہے اور اس کا بخار ٹوٹ گیا ہے۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور مارنو سے بولا: "تمھاری بیٹی کا بخار ٹوٹ گیا ہے مارنو۔ اسے ہوا نہ لگنے دینا۔ چھکڑا گرم رکھنا اور اسے کچھ گرم بروس بھی پلا دینا۔ مگر زیادہ نہیں۔ اب میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مارنو میرے پیچھے آتے ہوئے بولا: "میں تمھارا بے حد شکر گزار ہوں سرفروش۔ تم نے مجھ پر زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا ہے اور آج سے میں تمھارا غلام بن گیا ہوں۔ تم مجھے جو کہو گے میں وہی

کروں گا لیکن تم سے صرف ایک استدعا ہے کہ اپنے وعدے پر قائم رہنا اور تانتی کے بارے میں بابر کو بھی نہ بتانا۔ وہ اچھا آدمی ہے مگر تشدد اسے بھی زبان کھولنے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو مارنو! میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔ مجھے تانتی کی حالت سے آگاہ کرتے رہنا لیکن مجھ سے کھلے عام مت ملنا کیونکہ ہم کبھی لوگوں کے سامنے ایک دوسرے سے نہیں ملے اور نہ ہی پہلے کبھی دوست رہے ہیں۔ اب اگر تم نے مجھ سے برسرِ عام بات کی تو لوگ شک و شبے میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

ایک لمحے کے لیے بونے کی آنکھوں میں وہی عیارانہ چمک اُبھری اور وہ بولا: "میں جانتا ہوں، سرفروش! اور محتاط رہوں گا۔ دوسری باتوں کے متعلق اپنے ذہن پر کوئی دباؤ نہ ڈالو اور وقت کا انتظار کرتے رہو۔"

میں باہر آگیا اور بونے نے جلدی سے چھکڑے کا دروازہ بند کر دیا۔ چھکڑا اندر سے جتنا گرم تھا، باہر اتنی ہی شدید سردی تھی یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے اور مجھے پانچ میل ایک ایسے راستے پر سفر کرنا تھا جو برف سے ڈھکا ہوا تھا اور جس کے ایک جانب ہزاروں فٹ گہری کھائی اپنا خوفناک جبڑا کھولے ہوئے تھی۔

میں قدم قدم ڈاکٹر فریدوں کو کوستا رہا اور آگے بڑھتا رہا میرا جی چاہا کہ وہ مجھے اسی وقت واپس بلا لے مگر یہ سب کچھ میری خواہشات کے مطابق تو ہو نہیں رہا تھا۔ اس لیے مجھے صبر کے گھونٹ پینا پڑ رہے تھے۔

☐

اگلے چند روز مجھے تانتی کے بارے میں سوچنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ ہمیں نئے طوفان نے گھیر لیا تھا اور سردی بہت بڑھ گئی تھی... مگر سفر پھر بھی جاری تھا کچھ لوگ شدید سردی اور کچھ نمونیے کے باعث مر رہے تھے جسے آسوری کھانسی کا بخار کہتے تھے۔ اس پورے ہفتے کے دوران سادیہ نے صرف ایک بار مجھے اپنے چھکڑے میں طلب کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سوچوں، خوابوں اور خیالوں کی گھمر گھیریوں میں پھنسی ہوئی ہو لیکن اس نے خادِ اعظم کے خلاف اپنے منصوبے کے متعلق ایک لفظ بھی ظاہر نہیں کیا۔

جُوں جُوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، خوراک اور ایندھن کے ذخیرے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ بالآخر ہم برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے... میں نے ایسا عجیب منظر اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چہار جانب اور اوپر نیچے برف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ دُھند اور بادلوں سے جھانکنے والا آسمان بھی برف ہی کی چادر جیسا نظر آتا تھا۔ پھر راستہ ڈھلان کی طرف مُڑ گیا اور چھکڑے تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔

اب سفر پہلے کی نسبت آسان ہو گیا تھا۔

مارنو مجھے عام طور پر خادِ اعظم کے ذاتی عملے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے صرف ایک بار میرے قریب سے گزرتے ہوئے غیر محسوس انداز سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اس کا یہ ہلکا سا اشارہ مجھے یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ تانتی بچ گئی ہے۔

تین روز بعد ہم تنگ درے سے نکل کر ایک کھلے گر ریتلے میدان میں آگئے اور شاہ تھور نے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ وہ یہاں رُک کر لشکر کو پھر سے ترتیب دینا اور گھوڑوں کے گلّوں کا انتظار کرنا چاہتا تھا چنانچہ چھوٹے چھوٹے سیاہ خیمے چھکڑوں سے اُتار کر میدان میں نصب کر دیے گئے اور زندگی کی وہی گہما گہمی پھر لوٹ آئی جسے اس مسلسل اور پُرخطر سفر نے وقتی طور پر معطل کر دیا تھا۔

سادیہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی کہ وہ بہت جلد مجھ پر ایک راز منکشف کرنے والی ہے لیکن ہر بار وہ صرف راز ظاہر کرنے کی خواہش کا اظہار کر کے ہی خاموشی اختیار کر لیتی تھی اس لیے میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں سادیہ کو مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک عجیب سے تذبذب کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ایک طرف سادیہ تھی اور دوسری جانب رستم اور بونا مارنو... مگر سب کے سب میرے لیے پُراسرار بن گئے تھے۔ کوئی بھی تو مجھ پر نہیں کُھل رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی بازی گر کی طرح تنے ہوئے رسّے پر چل رہا ہوں اگر میرا توازن ذرا سا بھی بگڑا تو میں سر کے بل نیچے آ رہوں گا۔

... اور وہ لمحہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہو گا۔

تقریباً ایک ہفتے تک لشکر وہاں پڑاؤ ڈالے رہا۔ اس اثنا میں لشکر کے اعداد و شمار جمع کیے گئے تو پتہ چلا کہ سفر کے دوران ایک ہزار سے زائد بچے، بوڑھے، عورتیں اور چار سو گھوڑے لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔

اسی رات جب سادیہ نے پھر وہی الفاظ دُہرائے کہ وہ مجھ پر ایک راز کا انکشاف کرنا چاہتی ہے تو میں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس پر وہ مُسکرا کر بولی: "چلو آج بتا ہی دیتی

ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہُوں، لیکن تم یہ بات اس وقت تک کسی کو نہیں بتاؤ گے جب تک ہمارا منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا... اور ہاں یہ صرف نصف خوشخبری کے برابر ہے۔ دوسری نصف خوشخبری سناؤں گی۔"

میں نے سادیہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بابر تک کو نہیں بتائی لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ کاش سادیہ نے جھوٹ بولا ہو۔ میں نیم آسوری بچے کا باپ بننا پسند نہیں کرتا تھا اور پھر فریدوں نے مجھے کسی بھی وقت بلا لینا تھا۔ تب اس بچے کا کیا ہو گا؟ کیا اُسے بھی بے ضابطہ اولاد کی چھاپ لگا کر آسوریوں کے سب سے نچلے طبقے میں شامل کر دیا جائے گا؟

میں اپنے بچے کو لید جمع کرنے والوں میں چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باتیں میرے لیے ذہنی کشمکش ہی نہیں بلکہ دلی کوفت کا باعث بھی بن گئی تھیں۔

جس روز ہم نے اس میدان میں پڑاؤ ڈالا تھا، اُسی روز شاہ تھور نے اپنے کچھ سوار شمال، جنوب اور مشرق کی سمت روانہ کر دیے تھے تاکہ وہ ان کی فراہم کردہ معلومات کے تحت اپنی منصوبہ بندی کر سکے۔ شمال اور جنوب کی طرف جانے والے سوار تو چند روز بعد لوٹ آئے تھے اور انھوں نے خادِ اعظم کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھی مگر مشرق کی طرف جانے والے سوار ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ چھ روز بعد جب وہ آئے تو خادِ اعظم نے ایک ہنگامی اجلاس منعقد کیا اور دوسری صبح لشکر کو کُوچ کا حکم دے دیا۔

کئی روز بعد ہم ایک ایسے وسیع و عریض میدان میں پہنچے جو بڑی بڑی چراگاہوں پر مشتمل تھا۔ یہ چراگاہیں گھوڑوں کے لیے جنت ثابت ہُوئیں اور انھیں جی بھر کر چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ جب کہ آسوریوں کی اکثریت سُوکھی گھاس کاٹنے میں مصروف ہو گئی۔

روانگی سے پہلے بے انتہا گھاس چھکڑوں پر لادی گئی تھی۔

سفر پھر شروع ہو گیا۔

کئی روز بعد مجھے ہوا میں نمی محسوس ہُوئی اور پھر یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ سمندری ہوا ہے۔ ایک روز شاہ تھور کے وہ سوار جو لشکر سے آگے آگے جا کر خبریں لایا کرتے تھے اپنے ساتھ ایک قیدی بھی لے آئے۔ یہ قیدی اگرچہ خدوخال سے تاغانی ہی لگتا تھا مگر اب تک جو تاغانی میں نے دیکھے تھے وہ اُن سے قد و قامت میں بڑا بلکہ میرے ہی برابر تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا مگر اس کے ہاتھ پشت پر اور پاؤں رکابوں میں باندھ دیے گئے تھے اور یہ رکابیں گھوڑے کے پیٹ کے نیچے سے ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ دی گئی تھیں تاکہ وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر فرار نہ ہو سکے۔

وہ اپنے لباس سے لشکری عہدے دار معلوم ہوتا تھا اور اُس نے قید کے عالم میں بھی کسی فاتح کی طرح اپنا سر بلند کر رکھا تھا۔

اس رات سادیہ نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے آپ کو بحری تاغانی بتاتا ہے۔ آسوری سپاہی اُسے ایک سرحدی چوکی سے پکڑ لائے ہیں۔ انھوں نے اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور اسے پوچھ گچھ کے لیے خادِ اعظم کے پاس لے آئے مگر وہ بدبخت اتنا ضدی ہے کہ کچھ اُگل کر ہی نہیں دے رہا۔

میں نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا: "اس کا انجام کیا ہو گا سادیہ؟"

"کیا معلوم!... اور پھر کسی کو اس کے انجام کی پروا بھی کیا ہے؟" سادیہ نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا اور پھر ایک دم بپھرتے ہوئے بولی: "آئندہ کبھی میرے سامنے جماہی مت لینا سرفروش! اس سے اُکتاہٹ کا اظہار ہوتا ہوتا ہے... اور اگر تمھیں اُکتاہٹ محسوس ہونے لگی ہے تو میں یہ اُکتاہٹ دور کرنے کا کوئی اور طریقہ ڈھونڈ لوں گی۔" یہ کہتے ہُوئے وہ مجھے پہلے والی خونخوار سادیہ محسوس ہوئی اور ایسا لگا جیسے اس نے میرے بچے کی ماں بننے کی خبر سُنا کر اور میرے ساتھ سختی سے پیش آکر اپنے اس رُوپ پر فریب کی چادر ڈال لی تھی۔

میں نے دل میں اپنے آپ کو کوستے ہوئے کہا: "جاناں میں کبھی تم سے نہیں اُکتا سکتا۔ میرا رُواں رُواں تم سے محبت کرتا ہے۔"

اُس نے بھوئیں سکوڑ کر یوں میری طرف دیکھا جیسے یہ الفاظ اس کے لیے بے معنی ہوں، جیسے وہ میرے دل کا حال بخوبی جانتی ہو۔ میں نے اُسے ہتھے سے اُکھڑتے دیکھ کر لجاجت سے تاویل پیش کی: "مجھ سے جماہی لینے کی گستاخی لاشعوری طور پر سرزد ہوئی ہے، سادیہ۔ دراصل دن بھر بھاگ دوڑ کے باعث میں بُری طرح تھکا ہُوا ہوں اور مجھے نیند آ رہی ہے... لیکن

سچ تو یہ ہے کہ آج کل میں سو بھی نہیں سکتا۔ جب میں سونے کے لیے لیٹتا ہُوں تو مجھے اپنے تصور میں اُس بچّے کی معصوم کلکاریاں سُنائی دینے لگتی ہیں جو ابھی تمھارے بطن میں ہے۔ تم نے یہ خوشخبری سُنا کر مجھے پاگل کر دیا ہے، سادیہ کہ میں باپ بننے والا ہُوں۔"

... مگر جب میری اس بات پر بھی اس کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے تو میں خوفزدہ ہو گیا کہ شاید اس پر میری ناکام اداکاری کا پول کھل گیا ہے ... مگر دوسرے ہی لمحے وہ مُسکرانے لگی۔ وہ خونخوار سہی مگر ایک عورت بھی تھی اور میں نے وہی کچھ کہا تھا جو اس کی ممتا سننا چاہتی تھی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا بلکہ شرما کر میرے قریب آ گئی۔ اس وقت تک میری پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

دوسری صبح اس بحری تاغانی نے تشدّد سے مجبور ہو کر سب کچھ بتا دیا۔ آسوریوں کا دستور تھا کہ جب وہ دُشمن سے راز اُگلوا لیتے تو اُسے قتل کر دیتے تھے۔ انھوں نے اس بحری تاغانی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور لشکر آگے چل پڑا۔

جلد ہی ہم اس سرحدی چوکی تک پہنچ گئے جہاں سے کل اس بحری تاغانی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اب اس چوکی پر آسوری دستے کا قبضہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ کل کی جھڑپ کے بعد بحری تاغانیوں کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس لیے لشکر نے اپنا سفر جاری رکھا۔ جُوں جُوں ہم آگے بڑھے، ہَوا میں نمی بڑھتی گئی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ سمندر قریب تر آتا جا رہا ہے۔

جس علاقے سے لشکر گزر رہا تھا، وہ کافی سرسبز اور شاداب تھا لیکن صحرا کے یہ جفاکش بیٹے، آسوری ایسے علاقوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ان کی سماعت پر گراں گزرتی تھی اور کسی مقام پر مستقل قیام کا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ انھوں نے صحراؤں کے درمیان خیموں میں آنکھیں کھولی تھیں اور خانہ بدوشی ہی کو اصلِ حیات سمجھتے تھے البتہ میں اس علاقے کے چھتنار درختوں اور خودرو پُھولوں کو حسرت سے تکتا رہ گیا تھا۔

راہگزر کا چڑھائی والا موڑ مڑتے ہی آسوریوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اس کی لہریں جھاگ اُڑاتی ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ شاہ تمبور نے جو اس وقت لشکر کی راہ نمائی کر رہا تھا، ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور ایک ہاتھ بلند کر کے لشکر کو رُکنے کا حکم دے دیا۔

میلوں لمبی چھکڑوں اور گھڑ سواروں کی قطار جلد رُک گئی۔ میں اور سادیہ جو شاہ تمبور کے محافظ دستے کے تھے، اپنے گھوڑے بڑھا کر آگے لے گئے۔ خادِ اعظم گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اپنی واحد اچھی آنکھ سے سمندر اور کھاڑی کی دوسری جانب واقع شہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس کے گرد مضبوط شہر پناہ موجود تھی چونکہ ہم لوگ فراز پر تھے اور شہر نشیب میں تھا، اس لیے اس کی عمارتیں، گلیاں، بازار اور بندرگاہ واضح دکھائی دے رہے تھے۔ بندرگاہ میں چھوٹی بڑی کشتیاں موجود تھیں اور لوگ بڑے اطمینان سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ان کا یہ اطمینان بجا تھا کیونکہ سمندر کی جانب سے انھیں حملے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

شہر پر حملہ صرف سامنے والے میدان سے کیا جا سکتا تھا لیکن اِدھر سے بھی ان لوگوں نے زبردست دفاعی انتظامات کر رکھے تھے۔ شہر پناہ کے سامنے ایک چوڑی کھائی تھی جس کے میدانی کنارے پر نیزوں کی مانند نوکدار چھڑیاں گاڑی گئی تھیں جن کا رُخ میدان ہی کی طرف تھا۔ آدمی تو ان نوکوں سے بچ کر آگے بڑھ سکتے تھے لیکن گھوڑے ان کے درمیان نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کھائی کے دوسرے کنارے پر نوّے درجے کے زاویے پر مضبوط فصیل کھڑی تھی جس سے تیر برسائے جا سکتے تھے اور سیڑھی لگانے کی کوشش کرنے والوں پر کھولتا پانی یا تیل انڈیلا جا سکتا تھا لیکن یہ دفاعی تدابیر تو ہر فصیل سے کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود فصیلیں اور شہر فتح ہوتے رہے ہیں۔

خادِ اعظم کی طرح میں بھی بحری تاغانیوں کے دفاعی انتظامات کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ یہ انتظامات آسوریوں کی یلغار نہیں روک سکتے تھے لیکن تاغانیوں کا سب سے مضبوط دفاع وہ خندق تھی جو شہر پناہ کے ساتھ ساتھ بندرگاہ تک چلی گئی تھی۔ اس وقت وہ خشک تھی لیکن میں بندرگاہ میں وہ دروازے دیکھ چکا تھا جن کے کُھلتے ہی سمندر کا پانی ایک بلاخیز لہر بن کر خندق میں آتا اور خندق میں موجود ہر شے کو تنکے کی طرح بہا لے جاتا۔ میں اس دانش مندانہ دفاعی انتظام پر تاغانیوں کو دل ہی دل میں داد دیتا ہُوا سادیہ کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا کیونکہ اب شاہ تمبور اور دوسرے حملے کے متعلق ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات میں مصروف ہو گئے تھے۔

کچھ فاصلے پر پہنچ کر سادیہ نے اپنا گھوڑا روک لیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر یہ اطمینان کر لیا کہ کوئی ہماری گفتگو نہیں سُن سکے گا تو بولی: "اب ہمیں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار رہنا ہے سرفروش۔ اگرچہ خادِ اعظم پر دیوانگی کے دورے کی علامات ظاہر نہیں ہوئی ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ بہت جلد جنون کی کیفیت میں آ جائے گا۔ دوسرے اس شہر کی تسخیر کے بعد اس کے شکرانے میں ایک بڑی تقریب منعقد کی جائے گی۔ وہ بھی ہمارے لیے ایک شاندار موقع ہوگا۔ بس تم تیار رہو۔"

"مجھے تمھاری ہر ہدایت یاد ہے، جاناں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس موقعے پر کیا کرنا ہے۔" میں نے اُسے اطمینان دلایا۔

یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ سادیہ نے مجھے خادِ اعظم کے قتل جیسے جُرم پر کیسے اُکسایا مجبور کر سکتی ہے۔

سادیہ نے اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے قریب تر لا کر میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی کی: "اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمھیں اس خوشخبری کا دوسرا حصّہ بھی سُنا دوں۔ اسے سننے کے بعد تم قائل ہو جاؤ گے کہ میں کتنی چالاک اور زیرک ہوں۔" وہ کسی بچّے کی طرح خوش ہوتے ہُوئے بولی: "یہ جنگ شروع ہونے سے پہلے میں خادِ اعظم سے کہوں گی کہ وہ تمھیں غلامی سے آزاد کر دے۔ اس آزادی کا یہ مطلب ہوگا کہ طلائی طوق تمھارے گلے سے اتار دیا جائے۔ وہ مجھ سے اس فرمائش کی وجہ پوچھے گا تو میں اُسے کسی حد تک سچّی بات بتا دوں گی۔ میں اُسے کہوں گی کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ یہاں تک تو وہ خاموشی سے سنتا رہے گا لیکن جونہی میں اسے یہ بتاؤں گی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو وہ غصّے کے مارے آپے سے باہر ہو جائے گا مگر بالآخر وہ اس کی اجازت دے ہی دے گا کیونکہ اس سے پہلے بھی آسوری شہزادیاں اپنے غلاموں سے شادیاں کرتی آئی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ مثالیں اُسے قائل کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔"

اس دوران میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا تھا جو زیادہ سے زیادہ زیرِ نقاب تھا لیکن اب میں اس کی آنکھوں سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا۔

ایک لمحے کو رُک کر وہ پھر بولی: "لیکن فی الوقت کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں ماں بننے والی ہُوں۔ یہ اس لیے ضروری ہے سرفروش کہ جب خادِ اعظم ہمیں شادی کی اجازت دے دے گا اور ہم آسوری رسم و رواج کے مطابق میاں بیوی بن جائیں گے تو ہمارا ہونے والا بیٹا یا بیٹی ہماری جائز اولاد کہلائے گی اور وارثِ تخت و تاج ہوگی۔ پھر جب خادِ اعظم راستے سے ہٹ جائے گا تو تم میرے شوہر کی حیثیت سے میرے ساتھ تخت پر بیٹھا کرو گے اور ہم دونوں مل کر آسوری قوم پر حکمرانی کریں گے۔"

اب تک میں نے سادیہ کو صرف اپنی ذات تک خوشیاں سمیٹنے والی لالچی عورت سمجھا تھا مگر آج اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو میرے سامنے آیا تھا۔ یا شاید یہ اس محبت کا کرشمہ تھا جو اس کے پتھر دل سے ایک چشمے کی طرح پھوٹ نکلی تھی۔

خادِ اعظم نے وقت ضائع کیے بغیر بحری تاغانیوں کی طرف اپنا ایلچی روانہ کر دیا اور کہلوا بھیجا کہ اگر وہ غیر مشروط ہتھیار ڈال دیں گے تو انھیں جان کی امان مل جائے گی ورنہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

اس دوران رُکا ہُوا قافلہ درّے سے میدان کی طرف چل پڑا تھا۔ جو لوگ میدان میں پہنچ گئے تھے، وہ اپنے خیمے نصب کر چکے تھے اور جو پہنچ رہے تھے خیمے نصب کرتے جا رہے تھے۔ کئی مقامات پر آگ جلا کر دیگیں چڑھا دی گئی تھیں اور رات کے کھانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔

خیمہ گاہ میں ایک بار پھر قہقہے اور نغمے سُنائی دینے لگے تھے۔ ہر آسوری خوش تھا کہ اُسے بڑے عرصے کے بعد خوں ریزی اور لُوٹ مار کا موقع ملنے والا ہے۔ انھیں اپنی فتح کا پورا پورا یقین تھا کیونکہ دیوتا اُوبی نے خادِ اعظم کو اس کی بشارت دے دی تھی۔ صرف میں اور شاید رستم ہی دو ایسے افراد تھے جنھیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں آسوریوں کو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

ایلچی ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ اور اس کی واپسی کا انتظار کرتے ہُوئے شاہ تمبور نے اپنے شاہی خیمے میں ایک محفل منعقد کر ڈالی تھی جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن میں سب سے پیچھے بیٹھا ہُوا یہ ہنگامہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ خادِ اعظم بہت خوش تھا اور بار بار بروس پی رہا تھا۔ بظاہر مجھے اس میں دیوانگی کے دورے کی علامات دکھائی نہ دیں۔ لیکن میرا خیال تھا کہ سادیہ کا اندازہ ٹھیک ہی ہوگا۔ وہ ایک بار پھر چیخنے چلّانے اور معصوم نوشباب بچوں پر ستم ڈھانے لگے گا۔ اس وقت وہ بھرپور تفریح کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ ناچنے گانے والی لڑکیوں کے علاوہ شعبدے باز بھی بلائے گئے تھے اور مزاحیہ مختلف

کرتب دکھا رہا تھا۔ خادِ اعظم کے مرغوب تربوز جنھیں دور دراز علاقے سے لایا اور برف میں دبا کر رکھا جاتا تھا، کافی تعداد میں اس کے قریب رکھے ہوئے تھے۔ آج مارنو گھوڑوں کی بجائے تربوز کی زبان میں تمبور سے استدعا کر رہا تھا کہ حضور اپنے دانت میرے نرم نرم گودے میں گاڑ دیجئے۔

اس دوران مارنو نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ جب شاہ تمبور کے لیے نوخیز لڑکیاں تلاش کی جائیں گی تو اس کی تانتی ایلید جمع کرنے والوں کے درمیان ہمیشہ کی طرح اس بار بھی محفوظ رہے گی۔

خادِ اعظم کو قہقہے لگاتے دیکھ کر سادیہ جو حسبِ معمول اس کے قریب بیٹھی تھی، اپنے بھائی کی طرف جھکی اور اس کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ شاہ تمبور نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور سادیہ کی بات سننے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ سادیہ اسے کیا کہہ رہی ہے۔ اتنے میں خادِ اعظم نے انگلی کے اشارے سے مجھے بلایا تو میرے اعصاب کھنچ سے گئے مگر میں اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے آگے بڑھا اور اس کے سامنے سرخم کرتے ہوئے بولا: "خادم حاضر ہے عالی جاہ۔"

خادِ اعظم نے اپنی واحد آنکھ سکیڑ کر میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر گھٹنے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا: "تم اور ہمارے خادم! ہمارا خیال تھا کہ تم ہماری ہم شیر کے خادمِ خاص ہو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس خدمت کے دوران میں کیا محسوس کیا؟"

آخری فقرے پر اس کی آنکھ سے نفرت جھلکنے لگی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کانچ کے کچے فرش پر چل رہا ہوں جو ذرا سے دباؤ سے کرچی کرچی ہو جائے گا۔ میں دوبارہ سرخم کرتے ہوئے بولا: "خادم کا کام صرف خدمت بجالانا ہوتا ہے۔ عالی جاہ۔ اپنے احساسات کا خیال رکھنا نہیں۔"

خادِ اعظم نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا تو اس کے خوشامدی بھی قہقہے لگانے لگے... مگر جونہی خادِ اعظم نے اپنا ہاتھ بلند کیا قہقہے تھم گئے اور سکوت چھا گیا۔

"سنو لوگو۔ ہماری بہن نے ہم سے کیا درخواست کی ہے اور ہم اس کا کیا جواب دینا چاہتے ہیں۔ غور سے سنو۔ ہماری بہن کی خواہش ہے کہ ہم سرفروش کو آزاد کر دیں اور اس کے گلے سے طوق نکلوا دیں۔ تم لوگوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس پر لوگ ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے مگر کھل کر کسی نے بھی اظہارِ خیال نہ کیا تو خادِ اعظم نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور بولا: "ابھی ابھی ہماری ہم شیر نے ایک اور درخواست بھی کی ہے۔ کیا تم وہ بھی جاننا چا

"ارشاد۔ ارشاد" اس کے درباری چلائے۔

"سادیہ چاہتی ہے کہ جب سرفروش آزاد ہو تو وہ اسے اپنا شوہر بنا لے لیکن کوئی آسوسی شہزادی غلام سے شادی نہیں کر سکتی۔ کیا خیال ہے، تم لوگ

میں نے رستم اور سارنو کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے پر نگاہ ڈالی۔ انھوں نے پہلے تو ایک نظر ایک دوسرے کی طرف اور پھر مجھے دیکھا لیکن میں ان کے چہروں سے ک سکا۔ خیمے میں موجود افراد کی سرگوشیاں بھنبھناہٹ کی محسوس ہو رہی تھیں اور ہر آدمی میری یا سادیہ کی رہا تھا۔ میں نے شاہ تمبور کی جانب دیکھا تو مجھے اس آنکھ میں دیوانگی کی شیطانی چمک ابھرتی نظر آئی۔ وہ کسی کی طرح اپنے بھدے دانت نکوستے ہوئے غرایا۔

"ہم تمھارے گلے سے یہ طوق غلامی اتروا دیں اور اس شادی کی اجازت بھی دے دیں گے... مگر اس ہم بحری تاتانیوں کا یہ شہر فتح کر لیں گے اور اسے فتح کر تم ایک اہم کردار ادا کرو گے۔ ہم تمھیں اس جنگ میں حص لیے اپنی فوج کا ایک بڑا عہدہ دینے کو تیار ہیں۔"

میں نے سرخم کرتے ہوئے جواب دیا: "میں آپ بے پایاں عنایت کا شکر گزار ہوں، جہاں پناہ اور آپ پر پورا اترنے کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی کروں گا۔"

خادِ اعظم سادیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بو ہماری ہی نہیں، ہماری ہم شیر کی توقعات پر بھی پورا اتر جانتے ہیں بلکہ ہمیں مسلسل بتایا جاتا رہا ہے کہ تم ایک ہو۔ ہم نے تمھیں اپنے سورماؤں کو مغلوب کرتے ہے اور خاص طور سے آقائے جلالی کی ہلاکت آج لیے ناقابلِ یقین ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم واقعی بہادر اس کا صحیح اندازہ کل میدانِ جنگ میں ہی ہو سکے گا۔"

"آپ نے بڑا دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے شہنشا

خادِ اعظم کی بات پر رستم نے میری طرف دیکھے بغیر کہا آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے میرے اور میر کے دوش بدوش لڑنے کی اجازت دی جائے۔ میں

کے ارشاد کے مطابق اہم عہدہ دینے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا اہم فریضہ بھی سونپوں گا جو اس سے پہلے سرفروش نے کبھی انجام نہیں دیا ہوگا۔"

"ہم تمھاری درخواست قبول کرتے ہیں۔" خادِ اعظم نے رستم کو جواب دیا۔ "ہمارا خیال ہے کہ یہ بدبخت بحری تاغانی جنگ کیے بغیر ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تو ہم سرفروش کو آزمانے کا کوئی اور موقع ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہمارا بہنوئی بننے کے لیے اسے ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ خادِ اعظم مجھے میدان کارزار میں لڑتے ہوئے یا کسی بھی دوسرے طریقے سے موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ سادیہ بھی اس کی چال سمجھ گئی تھی۔ وہ اب تک تعجب اور غصّے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ شاہ تمبور کی طرف جھکی اور شیریں لہجے میں بولی: "آپ ایک بات بھول گئے ہیں، برادرِ عزیز۔"

شاہ تمبور نے بھویں اُچکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو اس کی دیوانگی کے آغاز کی علامت تھی، پھر بولا: "ہم کیا بھول گئے ہیں، جلدی بتاؤ؟"

"سرفروش کے بدلے میں ملنے والا تاوان۔ تاغانی اسے عظیم آدمی سمجھتے ہیں اگر یہ جنگ میں مارا گیا تو آپ تاوان سے محروم رہ جائیں گے۔"

خادِ اعظم نے بھویں اُچکاتے اور گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے سادیہ سے کہا: "اس کے تاوان والی بات تو سرے سے ہمارے پلے ہی نہیں پڑتی عزیزہ۔ پھر جب ہم یہ شہر فتح کر لیں گے تو فصیل کی دوسری طرف سفر کرتے ہوئے بآسانی توپ والے تاغانیوں تک پہنچ جائیں گے۔ تب ان کی ہر چیز ہماری ہوگی۔ اس لیے ہمیں تاوان کی ضرورت ہی نہیں... اور تیسری بات جو تم ناقص العقل عورت ہونے کی وجہ سے نہیں سمجھ سکیں، یہ ہے کہ تاوان تو غلام کے عوض وصول کیا جاتا ہے، جنگجو اور بہادر بہنوئی کے بدلے نہیں۔"... پھر وہ دربار میں موجود اپنے حواریوں سے مخاطب ہوا: "کیا آسوری رسم و رواج اپنے بہنوئی کو بیچنے کی اجازت دیتے ہیں؟ زور سے جواب دو۔"

"نہیں، عالم پناہ — بالکل نہیں۔" اس کے حواریوں نے بیک زبان نعرہ لگایا۔

اتنے میں خادِ اعظم کا ایک عہدے دار خیمے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی جس سے خون رس رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ پوٹلی کسی رومال یا کپڑے کی نہیں تھی بلکہ شاہی خریطہ تھا۔

"بکتے کیوں نہیں کہ ایلچی کیا خبر لایا ہے؟" خادِ اعظم گرج اُٹھا۔

عہدے دار نے سر خم کیا اور وہ پوٹلی خادِ اعظم کے سامنے رکھ کر کھول دی۔ اس پوٹلی میں ایلچی کا بُریدہ سر تھا۔ خادِ اعظم اسے گھورتا رہ گیا۔ اس کی اکلوتی آنکھ کی پتلی تیزی سے گردش کرنے لگی۔ چہرے پر تشنج چھا گیا اور اس کے منہ سے غرّانے کی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے پنجے اپنے سینے میں گاڑ لیے اور قالین پر گر کر لوٹنے لگا۔ اس کی باچھیں کف آلود ہو گئیں، پھر وہ قالین کے سرے کی طرف کھسکا اور اُسے اُٹھا کر چبانے لگا۔

خادِ اعظم شاہ تمبور پر دیوانگی کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ سب خاموش کھڑے دیکھ رہے تھے۔

وہ قالین کا کونا چبانے کے ساتھ ساتھ چیخ بھی رہا تھا۔ مارلو نے جلدی سے آگے بڑھ کر لکڑی کا ایک گول ٹکڑا خادِ اعظم کے منہ میں دے دیا اور وہ قالین کی بجائے اُسے چبانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ لکڑی کے اس ٹکڑے پر پہلے سے دانتوں کے نشان موجود تھے۔ اتنے میں چار سیاہ فام غلام آئے اور شاہ تمبور کو اُٹھا کر چلے گئے۔

◘

رستم نے اسی وقت سپاہ کو میدان میں صف آرا ہونے کا حکم دے دیا تھا اور وہ رات بھر فصیلِ شہر کے سامنے والے میدان میں جمع ہوتے رہے تھے تاکہ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی حملے کا آغاز کر دیں۔ رستم نے قلب کے دستوں کی کمان سنبھالی تھی اور مجھے اپنے دائیں ہاتھ رکھا تھا۔ رات بھر وہ مصروف رہا تھا اور اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ پو پھٹے جب آسوری سپاہ صف آرا ہو گئی تو وہ میرے پاس آیا اور مجھے ہدایات دینے کے بہانے سپاہیوں سے کچھ فاصلے پر لے گیا۔

"یہ شادی کا کیا چکر ہے سرفروش؟ کیا تم نے اور سادیہ نے میرے خلاف کوئی سازش کی ہے؟"

اس وقت ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار کھائی کے قریب سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ یہ چاندنی رات نہیں تھی لیکن ستاروں کی روشنی میں بھی میں نے اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ لی جو مجھ پر مرتکز تھیں۔ وہ میرے جواب کا منتظر تھا اور میرے تاثرات سے اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ میں اسے سچ بتاتا ہوں یا جھوٹ بولتا ہوں۔

میں نے اسے سادیہ کا منصوبہ بتا دیا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت چالاک عورت ہے اور اس نے اچھا منصوبہ بنایا ہے لیکن وہ مارلو کو خادِ اعظم پر قاتلانہ حملے کے لیے کیونکر مجبور کر سکتی ہے۔ مارلو کی کون سی رگ دبتی ہے اس سے؟" وہ اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بڑبڑایا۔

اگرچہ میں مارلو کی ایک کمزوری سے آگاہ ہو چکا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سادیہ اس کمزوری سے کیسے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔

"یہ تو میں نہیں جانتا لیکن وہ بڑے یقین کے ساتھ کہتی ہے کہ مارلو اس کے حکم کی تعمیل ضرور کرے گا۔" میں نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔

"تم ان باتوں پر دماغ سوزی نہ کرو۔" رستم بولا۔ "میں پہل کروں گا۔ میرے آدمی اشارے کے منتظر ہیں۔ اب اس کام میں تاخیر بے حد خطرناک ہوگی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمھارا منصوبہ وہی ہے جو تم نے مجھے بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اب اس پر عمل کرنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ خادِ اعظم پر دورہ پڑ چکا ہے۔ جب تک ہم اس شہر پر قبضہ کریں گے تب تک اس کی حالت اور بھی غیر ہو جائے گی۔ فتح کا جشن مناتے ہوئے وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوگا۔ تم تیار رہنا۔"

"میں تیار ہوں مگر سادیہ کا کیا ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔

"سادیہ کا کیا ہوگا؟" رستم کسی بھیڑیے کی طرح غرّایا۔ "اُسے بھی موت کا جام پینا پڑے گا، سرفروش! سانپ کو مار کر سنپولیے چھوڑ دینا عقلمندی نہیں ہوتی۔ جب تک وہ زندہ رہے گی، میں حکمراں نہیں بن سکتا۔ اس لیے اس کی موت لازمی ہے۔"

"ٹھیک ہے رستم، لیکن اسے قتل کرنے کے لیے مجھے مت کہنا۔ میں اسے قتل نہیں کر سکوں گا۔"

رستم نے قہقہہ لگایا اور بولا: "تم بھی عجیب آدمی ہو، سرفروش! خیر ہٹاؤ اس قصّے کو، یہ بتاؤ کہ تاغانیوں نے سمندر کا پانی روکنے کے لیے جو دروازے بنا رکھے ہیں، کیا لڑائی کے دوران وہ انھیں کھول دیں گے؟"

میں رستم کے مشاہدے اور عسکری قیادت و صلاحیت

پر حیران رہ گیا اور بولا: "اگر وہ جنگ ہارنے لگیں گے تو یقیناً یہ سمندری روک ہٹا دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ شہر فتح کرنا آسان نہیں ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ جب سمندری ریلا آئے تو خادِ اعظم کے زیادہ سے زیادہ آدمی خندق میں موجود ہوں تاکہ ان کی اکثریت غرق ہو جائے۔ تب تک میں اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے سے روکے رکھوں گا۔"

"میں نے خندق کی گہرائی کا اندازہ کر لیا ہے۔ جب وہ روک ہٹائیں گے تو پانی کی کم از کم گہرائی دس ہاتھ ہوگی۔" میں نے رستم کو بتایا۔

"تم خندق کے قریب نہیں گئے پھر تم نے پانی کی گہرائی کا اندازہ کیسے کر لیا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"ایک ایسے علم کے ذریعے جو ہماری سرزمین پر ہمیں سکھایا جاتا ہے۔" میں نے اُسے بتایا۔ "مگر ہم خندق میں پانی بھر جانے کے باوجود فصیل تک پہنچ سکتے ہیں بشرطیکہ پُل بنانے والوں کو تاغانیوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔"

"میں جانتا ہوں کہ پُل کیا ہوتے ہیں۔" رستم بولا۔ "ہم بھی پُل بنایا کرتے تھے مگر وہاں درختوں اور لکڑی کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ یہاں ہمارے پاس لکڑی نہیں ہے۔"

میں نے اسے وہ ترکیب بتا دی جس کے ذریعے ہم پُل بنا سکتے تھے۔ رستم یہ جان کر خوش ہو گیا اور بولا: "میں نے تمھیں اپنا ساتھی منتخب کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔"

اتنے میں سورج نکل آیا اور قرنا پھونکے جانے لگے۔ وہ آسوری جو رات کو زمین پر ہی لیٹ گئے تھے، آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ آسوری افسران سپاہ کی صف آرائی میں لگ گئے۔ سپاہیوں نے جلدی جلدی گھوڑے کے ٹھنڈے گوشت سے ناشتہ کیا اور معرکہ آرائی کے لیے تیار ہو گئے۔

ان تاغانیوں کے پاس کوئی توپ نہیں تھی ورنہ داغ چکے ہوتے۔ اب تک وہ بھی شہر پناہ پر صف بستہ ہو چکے تھے۔ ان کے پاس بڑی بڑی کمانیں تھیں جن سے بیک وقت بارہ تیر چلائے جا سکتے تھے اور ان کا چلّہ کئی آدمی کھینچتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کمانوں سے نیزے نما تیر برسنے لگے اور انھوں نے آسوریوں کی اگلی صف میں تباہی مچا دی۔

میں نے ایک تیر دو آسوریوں کے جسموں میں اُترتے دیکھا۔ وہ دونوں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ان کا اچھا ہتھیار ہے

مگر اس میں ایک خرابی ہے۔ اسے چھوٹی کمانوں کی طرح اُوپر نیچے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم تیزی سے آگے بڑھیں تو تیروں کی زد سے محفوظ رہ جائیں گے کیونکہ یہ تیر ہمارے سروں پر سے گزر جائیں گے اور جب خادِ اعظم کے سپاہی آگے بڑھ کر ہماری جگہ لیں گے تو ان کا نشانہ بن جائیں گے۔ اب ذرا غور سے سُنو سرفروش، ہم تیزی سے آگے بڑھ کر کھائی کے کنارے گڑی ہوئی نوکدار چھڑیاں اکھیڑیں گے اور ہمارے آدمی آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ سیڑھی لگانے کی کوشش کریں گے۔ اس میں ہمارا جانی نقصان تو ہوگا مگر زیادہ نہیں۔ شاہ تمبور جو پیچھے بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا ہے، سمجھے گا کہ ہم بڑی بے جگری سے آگے بڑھ کر فصیل سر کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو خادِ اعظم واقعی ایک اونچے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی اکلوتی آنکھ پر ہاتھ سے چھجا بنا رکھا تھا۔ سادیہ اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ تخت کے اردگرد شاہ تمبور کے محافظ کھڑے تھے اور گھوڑوں کی دُموں والے پھریرے لہرا رہے تھے۔ اتنے میں تمبور نے ہاتھ اُٹھا کر حملے کا اشارہ کیا تو رستم بولا: "یہ بہادر جنگجو ہے مگر اُسے میدانِ کارزار میں بہادروں کی سی موت نہیں ملے گی۔"

اتنے میں تیروں کی ایک اور بوچھاڑ آئی لیکن اب رستم کے سپاہی پیچھے ہٹ کر ان کی زد سے محفوظ ہو گئے تھے۔ رستم بولا "جب ہم خندق میں پہنچ کر سیڑھیوں کے لیے چبوترہ یا بنیاد بنا لیں گے تو آرام کرنے کے لیے پیچھے آ جائیں گے۔ تب میں خادِ اعظم کے بہترین دستے وہاں بھیج دوں گا تاکہ وہ کام جاری رکھ سکیں۔ خادِ اعظم کو ذرا سا بھی... شک نہیں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ وقت ہوگا کہ تاغانی سمندری روک ہٹا لیں گے۔ ورنہ ہمارے آدمی فصیل پر چڑھ جائیں گے... اور اب آخری بات۔ آج عقب سے ہوشیار رہنا۔ ہو سکتا ہے کہ تم پر پیچھے سے کوئی وار کر دے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور فوجیوں سے مخاطب ہوتے ہُوئے دہاڑا: "آگے بڑھو آسوری بہادرو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

ہمارے پیچھے آسوری شہ سوار بھی برق رفتاری سے آگے بڑھے۔ اُن میں سے کچھ تو سنسناتے ہُوئے تیروں کا نشانہ بن گئے اور کچھ ان کی زد سے نکل آئے۔ ایسا لگتا تھا کہ آسوری میدانِ جنگ میں مرنے کے لیے پیدا ہُوئے ہوں۔ ایک مرتا یا زخمی ہو کر گرتا تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا تھا۔

رستم نے کھائی کے کنارے پہنچ کر سواروں کو گھوڑوں سے اُترنے اور تیر چلانے کا حکم دیا تو وہ اپنے گھوڑوں کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر جوابی تیر چلانے لگے مگر اُن کے بیشتر تیر خالی جا رہے تھے کیونکہ دیوار دور تھی... پھر رستم نے کچھ دستوں کو نوکدار چھڑیاں اکھیڑنے کا حکم دیا تو وہ چھڑیاں اکھیڑتے ہُوئے کھائی پار کر کے خندق تک پہنچ گئے۔ تاغانیوں نے اپنی کمانوں کو کسی حد تک نیچا کر لیا تھا اور مسلسل تیر برسا رہے تھے۔ مگر اب ان کی کمانوں کی کارکردگی زیادہ مؤثر نہیں رہی تھی۔ اتنے میں کچھ آسوری دستے سیڑھیاں، لکڑیوں کے ٹکڑے، تختے اور اوزاروں سے بھری ٹوکریاں اُٹھائے وہاں پہنچ گئے اور خندق میں اُتر کر فصیل کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں لگانے اور چبوترے بنانے لگے۔

یہ دیکھ کر تاغانی گھبرا گئے اور ان کی مدافعت میں شدت آ گئی۔ رستم نے دائیں جانب والے دستوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا جو سادیہ کے سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ وہ اندھا دھند آگے بڑھے تو بیک وقت بارہ تیر چلانے والی کمانوں نے ان میں سے بیشتر کو خاک و خون میں لتھیڑ کر رکھ دیا۔

تیر میرے اور رستم کے گردوپیش بھی گر رہے تھے اور ہم کسی وقت بھی ان کا نشانہ بن سکتے تھے۔ ایک تیر نے رستم کے گھوڑے کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ ہم اِدھر اُدھر گھوڑے دوڑا کر ہدایات دے رہے تھے کہ اتنے میں اچانک میری نگاہ ایک آسوری پر پڑی جو میرے بائیں جانب گھٹنے کے بل بیٹھا چلّے میں تیر چڑھا رہا تھا مگر اس کی نگاہ مجھ پر جمی ہُوئی تھی۔ مجھے رستم کی تنبیہ یاد آ گئی۔ میں نے ڈھال پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اگرچہ اس آسوری نے کمان فصیل کی طرف اُٹھا رکھی تھی مگر چلّہ کھینچنے کے بعد اس نے اچانک رُخ موڑ کر تیر میری طرف چھوڑ دیا۔ جسے میں نے عین وقت پر ڈھال پر روک لیا تو وہ اُٹھ کر بھاگا۔ میں نے اپنا گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا۔ رستم معاملے کی نوعیت بھانپ گیا تھا۔ جونہی وہ آسوری اس کے قریب سے گزرا رستم اس پر تلوار سے وار کرتے ہُوئے چلّایا: "بزدل بھگوڑے پیچھے کو کہاں بھاگ رہے ہو۔ آگے..." تلوار کا ایک ہی وار اس کے لیے کاری ثابت ہُوا۔ اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ رستم نے مجھ سے کہا: "ہوشیار رہنا۔ وہ پھر کوشش کریں گے۔"

میں نے اس آسوری پر نگاہ ڈالی۔ اس کے لباس پر خادِ اعظم کا نشان تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہ تمبور نے مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کے لیے اپنے آدمی لگا دیے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے خندق کی طرف دیکھا۔ آدمی مر رہے تھے مگر متعدد مقامات پر سیڑھیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں اور شاہ تمبور کے تازہ دم دستے کھائی میں اُتر رہے تھے۔ رستم نے اپنے آدمیوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا۔

"دوستا! اپنے آدمیوں کو پھر سے ترتیب دو۔ تھوڑی دیر بعد انھیں پھر حملہ کرنا ہے۔" رستم چیخ کر بولا۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی دیر میں آسوری کچھ ایسی سیڑھیاں بھی بنا چکے تھے، جن میں مٹی بھری جا رہی تھی تاکہ ان کے ذریعے گھوڑے اُوپر جا سکیں۔ کچھ آسوری سپاہ تیر اندازی میں مصروف تھی اور کچھ سیڑھیاں بنانے، مٹی کھودنے اور بھرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اب کھائی میں ہزاروں آسوری سما چکے تھے۔ اتنے میں رستم نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پوچھا: "یہ کیا ہیں؟"

میں نے سمندر کی جانب نگاہ ڈالی تو مجھے بڑے بڑے مینار سے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ اور پھر مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ وہ پتھر پھینکنے والی سادہ مشینیں ہیں۔ چند لمحے بعد وہ منجنیقیں پتھر کے گولے برسانے لگیں جو بیک وقت پندرہ بیس آدمیوں کو گوشت کے لوتھڑوں میں بدل دیتے تھے۔

"شکر ہے کہ میں نے اپنے دستے پہلے ہی سے باہر نکال لیے تھے۔ یہ خادِ اعظم کے آدمی مر رہے ہیں۔"

اتنے میں مٹی والی کچھ سیڑھیاں مکمل ہو گئیں اور گھوڑے پہاڑی بکروں کی طرح ان پر چڑھنے لگے۔ میں نے رستم کو بتایا: "یہی وہ وقت ہے جب تاغانیوں کو سمندری روک ہٹا رہی چاہیے۔"

اُدھر آسوریوں میں جوش و خروش بڑھ گیا۔ بہت سی جگہوں پر پیادہ سپاہیوں کے چڑھنے کے لیے فصیل کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں لگا دی گئی تھیں اور آسوری اپنی تلواریں لہراتے ہُوئے اوپر چڑھنے لگے تھے۔ میں نے پلٹ کر شاہ تمبور کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے تخت سے اُتر کر کچھ آگے آ چکا تھا اور کھڑے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ شاید اُسے یقین ہو گیا تھا کہ فتح اس کے قدم چومنے والی ہے۔

تاغانی اُوپر سے سیڑھیاں گرا رہے تھے، کھولتا ہُوا پانی اور تیل انڈیل رہے تھے مگر آسوری جان کی پروا کیے بغیر تلواریں لہراتے اور دانتوں میں خنجر دبائے اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خندق میں کھڑے ہُوئے آسوری اُوپر دفاعی... کارروائی کرنے والے تاغانیوں پر تیر برسا رہے تھے۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو رہا تھا۔ کئی مقامات پر آسوری سپاہی اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور دست بدست لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

عین اسی وقت ایک گرج دار آواز سُنائی دی اور سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے والے رستم نے مجھے بتایا کہ تاغانیوں نے سمندری روک ہٹا دی ہے۔ ہم تیزی سے کھائی کے کنارے سے پیچھے ہٹنے لگے۔ اتنے میں ایک طوفانِ بلاخیز کی طرح سمندری پانی کا زبردست ریلا آیا اور خندق میں موجود ہر ذی نفس اور ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح اپنی لپیٹ میں لے کر آگے بڑھ گیا۔

میں نے پلٹ کر شاہ تمبور کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے اپنے سینے پر دوہتڑ مار رہا تھا۔

اُدھر فصیل پر تاغانی خوشی کے مارے ناچ رہے تھے اور نعرہ ہائے مسرت بلند کر رہے تھے۔

"اب تمھاری ترکیب آزمانے کا وقت آ گیا ہے، سرفروش دیکھیں۔ وہ کس حد تک کامیاب رہتی ہے۔" رستم نے میری طرف جھکتے ہُوئے دھیمی آواز میں کہا۔

میں نے رستم کو جو ترکیب بتائی تھی اُس کا لب لباب یہ تھا کہ جب تا غانی سمندری روک ہٹا کر خندق میں پانی چھوڑیں گے تو خندق اور کھائی کی گہرائی میں برسرِ پیکار آسوری پانی کے زبردست ریلے میں ڈوب جائیں گے اور تا غانی اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں گے کہ اُنھوں نے جنگ جیت لی ہے۔ عین اُسی وقت ہم اپنے چھکڑے کھائی اور خندق میں لے آئیں گے اور یہ تیرتے ہوئے چھکڑے جب ایک دُوسرے سے باندھ دیے جائیں گے تو کھائی سے دیوار تک پُل سا بن جائے گا۔ چونکہ خندق اور کھائی میں دس ہاتھ سے زیادہ پانی ہو گا اس لیے فصیل کی اُونچائی بھی بہت کم رہ جائے گی اور یوں تا غانی آسوریوں کی یلغار نہیں روک سکیں گے۔

رستم نے میری ترکیب سے اتفاق کرتے ہوئے پچاس خالی چھکڑے منگوا لیے تھے اور ایک ہزار سپاہی بہتا ہوا پُل تعمیر کرنے کے لیے لگا دیے تھے جو اشارے کے منتظر تھے۔ جونہی رستم نے مجھے اپنی ترکیب آزمانے کے لیے کہا، میں نے کمان دار کی حیثیت سے چھکڑے کھائی کے پاس لانے کا حکم دے دیا۔

رستم کے لشکری درمیان سے ہٹے تو میری کمان کے تحت کام کرنے والے سپاہی بڑی تیزی سے چھکڑے دھکیلتے ہوئے آگے آ گئے۔ میں نے انھیں دس دس چھکڑوں کی دو قطاریں بنا کر کھائی میں اُتارنے کی ہدایت کی۔ ان چھکڑوں کے پہلوؤں میں لگے ہوئے تختے اُتار کر سامنے لگا دیے گئے تھے تاکہ وہ تیروں کے خلاف ڈھال کا کام دے سکیں۔

کھائی، ڈوبنے والے سپاہیوں اور اُن کے گھوڑوں ہی کی نعشوں سے پٹ گئی تھی جنھیں جلدی جلدی ہٹا کر چھکڑے پانی میں اُتارے جانے لگے تھے۔

بحری تا غانی، جو اَب تک فصیل پر ناچ کود اور نعرے لگا کر فتح کی خوشیاں منا رہے تھے، یہ صورتِ حال دیکھ کر پہلے تو چونکے پھر گھبرا گئے۔ انھوں نے جلدی سے بارہ تیر چھوڑنے والی کمانوں کا رُخ چھکڑوں کی طرف موڑا اور تیر برسانے لگے لیکن چھکڑوں کے سامنے لگے ہوئے تختے اب سپر کا کام دے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر تا غانیوں نے منجنیقوں والے دستے کو اشارہ کیا تو بھاری بھاری سنگی گولے ایک بار پھر برسنے لگے اور ان گولوں نے تباہی مچا دی۔

گولے گرنے سے پچاس ہاتھ کی بلندی تک پانی اُچھلتا تھا اور جو چھکڑا ابھی گولے کی زد میں آ تا تھا، چکنا چور ہو جاتا تھا۔ اس وقت تک ہم نے جو چند چھکڑے آگے بڑھائے تھے، وہ تنکوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے اور جو لوگ اُن پر سوار تھے، ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکا۔

میری ترکیب ناکام ہونے لگی تو میں غم و غصے کے مارے پاگل سا ہو گیا۔

اَب مجھ پر جنوں سوار ہو چکا تھا اور میں ہر قیمت پر آسوریوں کو فصیل تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا گھوڑا کھائی میں ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کہ کھائی کا گدلا پانی رُکا ہوا نہیں بلکہ بہہ رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ تا غانیوں نے خندق اور کھائی میں بھر جانے والے پانی کی نکاسی کا انتظام کیا ہوا تھا اور بہتے پانی میں پیراکی سے ناآشنا سپاہیوں کے لیے پُل بنانا ناممکن تھا۔ اس صورتِ حال سے رستم بھی کافی پریشان دکھائی دینے لگا۔ میں نے دھاڑ کر اپنے نائب کو حکم دیا، جو کھائی کے کنارے کھڑا تھا۔

"جلدی سے ڈنڈے منگواؤ۔"

"کون سے ڈنڈے؟" اُس نے پوچھا۔ لہجے میں حیرت تھی۔

"وہی، جو گھوڑے جوتنے کے لیے چھکڑوں کے آگے لگے ہوئے تھے۔" میں نے جواب دیا اور تیزی سے پلٹ گیا۔

میں نے یہ ڈنڈے فالتو سمجھ کر اُتروا دیے تھے۔ اب سولہ ہاتھ لمبے اور تین اُنگل چوڑے ان ڈنڈوں کو استعمال کرنے کی ترکیب مجھے سوجھ گئی تھی۔ اتنے میں رستم بھی میرے قریب آ گیا۔

"تمھاری ترکیب تو ناکام ہو گئی، سرفروش۔" اس نے پریشانی سے کہا۔

"میری پہلی ترکیب ناکام ہو گئی ہے مگر دوسری ترکیب ضرور کامیاب ہو گی۔"

"وہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں چھکڑوں کو کشتیوں کی طرح استعمال کروں گا۔" میں نے اُسے بتایا۔

"ہاں... بکھری ہوئی کشتیوں پر تا غانیوں کے تیر برسانا بھی مشکل ہو گا اور وہ گولوں کی زد سے بھی بچ سکتی ہیں۔" رستم نے میری نئی ترکیب کو سراہتے ہوئے کہا۔

"سارے چھکڑے اِدھر لے آؤ۔" میں نے اپنے دوسرے نائب کو حکم دیا اور وہ اُس کی تعمیل کے لیے پلٹ گیا۔

اس وقت تک خادِ اعظم کے بیشتر سپاہی مر چکے تھے جب کہ رستم کے دستے ابھی تازہ دم تھے۔

"شاہ تیمور کے آدمیوں کو خاصی سزا مل چکی ہے۔ وہ آدھے سے زیادہ غرق ہو گئے ہیں۔ جو بچ گئے ہیں، وہ دل شکستہ ہیں اور یہ بات ہمارے حق میں بہتر ہے۔ جب تمھیں میرے آدمیوں کی ضرورت

ہو تو مجھے اشارہ کر دینا۔ دیوار میرے دستوں کو سر کرنی چاہیے اور تمہاری کشتیوں پر بھی میرے ہی آدمی جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ کھائی کے کنارے کی طرف پلٹ گیا۔

اگرچہ تاغانیوں کی طرف سے گولہ باری اور تیراندازی جاری تھی مگر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے اُن کے پاس تیر ختم ہو گئے ہیں یا وہ اُن کی قلت کا شکار ہو گئے ہیں کیوں کہ اب اُن کی تیراندازی کی رفتار سُست پڑ گئی تھی۔ دوسرے میں نے یہ بھی پرکھ لیا تھا کہ منجنیقوں کے گولے ہمیشہ اُن کے نپے تُلے نشانے پر ہی گرتے ہیں۔ اس لیے مَیں نے اُن مقامات کا انتخاب کر لیا تھا جہاں جہاں سے مجھے چھکڑوں کی کشتیاں فصیل کی طرف بڑھانا تھیں۔

چھکڑوں کو کھائی کے کنارے سے دھکیل کر لانے والے آسوری سپاہی نہیں تھے بلکہ نہتّے لید جمع کرنے والوں کو قربانی کے بکرے بنا کر آگے بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے مارتو کی بیٹی تاتی کا خیال آیا مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔ میں نے لید جمع کرنے والوں کو حکم دیا کہ وہ ان چھکڑوں کے پہیے اُتار دیں اور انھیں اُٹھا کر کھائی میں اُتر جائیں۔

اتنے میں رستم بھی اپنے دستے کھائی کے کنارے لے آیا۔

"میرے آدمی ملّاح یا کشتی بان نہیں ہیں تمھیں ان کی رہبری کرتے ہُوئے بتانا پڑے گا کہ کشتی کیسے چلائی جاتی ہے۔" اس نے کہا۔

مَیں نے ہر چھکڑے کے لیے دس آدمیوں کو مقرر کر دیا اور سب سے پہلے چھکڑے کے قریب آ کر سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔۔۔

"بہادر آسوریو! جیسا میں کروں تمھیں بھی ویسا ہی کرنا ہو گا۔ یا تو ہم فصیل سر کر لیں گے یا مر جائیں گے۔ ہمیں واپسی کی مہلت نہیں ملے گی۔"

مَیں نے چھکڑوں کی چھتیں اُتروا کر سامنے لگوا دیں تاکہ کچھ آڑ میسّر آ جائے۔ ہر چھکڑے پر چار چار آدمیوں کو وہ سولہ ہاتھ لمبے ڈنڈے تھما دیے اور انھیں بتایا کہ ڈنڈوں سے چپّو کا کام کیسے لیا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو گیا تو مَیں نے ایک ڈنڈے کے ساتھ گھوڑے کی دُم باندھی۔ اُسے لہرا کر رستم کو اشارہ کیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ ڈنڈوں سے کشتی کو پانی میں دھکیل کر آگے بڑھنا شروع کر دیں۔

بحری تاغانی، جو فصیل پر کھڑے اب تک یہ تماشا دیکھ رہے تھے، میری چھکڑا کشتی کو فصیل کی طرف بڑھتے دیکھ کر میرا منصوبہ سمجھ گئے اور تیزی سے اس طرف بڑھے جہاں میری چھکڑا کشتی فصیل سے لگنے والی تھی۔ میرے پیچھے دوسری چھکڑا کشتیاں بھی چل پڑی تھیں۔ اس وقت تاغانیوں سے بہت بڑی حماقت یا غلطی یہ ہُوئی کہ وہ فصیل کے کنارے جمع ہو گئے تاکہ ہمیں مار بھگائیں مگر اس طرح جمگھٹوں کی شکل میں اُن کے لیے ہتھیار استعمال کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہو گیا۔ دوسرے ان کے پاس چھوٹی کمانیں اور نیزے بھی نہیں تھے۔ چنانچہ فصیل کے قریب پہنچتے ہی مَیں نے اپنے آدمیوں کو تیر چلانے کا حکم دیا۔

پہلے ہی ہلّے میں بیسیوں بحری تاغانی ہلاک ہو گئے۔

یہ دیکھ کر ان کے ساتھیوں میں افراتفری مچ گئی۔ وہ تیروں کی باڑھ سے بچنے کے لیے فصیل کے کنارے سے پیچھے ہٹے تو چھکڑا کشتیوں پر سوار رستم کے بہادروں نے پہلے ایک دوسرے کے کندھوں پر اور پھر فصیل پر چڑھنا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے مَیں سات جوانوں کے ساتھ فصیل پر چڑھا تو پیچھے ہٹ جانے والے بحری تاغانی پلٹ کر ہم پر ٹوٹ پڑے لیکن میرے آدمیوں نے نیم دائرے کی صورت میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان پر تیر برسانے شروع کر دیے۔

تاغانی جانتے تھے کہ اگر وہ یلغار نہ روک پائے تو ان کا بچہ بچہ تہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ انھوں نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا دی۔۔۔ اور نوبت دست بدست لڑائی تک آ پہنچی۔ انھوں نے میرے گروہ کو گھیر لیا۔

میرے ساتھی ایک ایک کر کے کٹنے لگے یا بُری طرح زخمی ہو گئے۔ تین تاغانیوں نے بیک وقت مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے ایک کو تلوار کی ضرب لگائی، دوسرے کو خنجر گھونپا مگر تیسرے نے میرے سر پر کلہاڑا دے مارا۔

ہر چند کہ میرے سر پر خود تھی لیکن اس ضرب سے مَیں چکرا کر رہ گیا۔ لڑکھڑا کر گرتے ہُوئے، مَیں نے خنجر اس کے پہلو میں اُتار دیا۔ اتنے میں کچھ اور تاغانی سپاہی میری طرف لپکے۔ اب مجھ میں اُن کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

اچانک مجھے رستم کی دھاڑ سُنائی دی۔ میں نے بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا ہے۔ مَیں نے اپنا سر جھٹک کر حواس قائم رکھنے کی کوشش کی اور جب چند لمحوں بعد مَیں دوبارہ آنکھیں کھولنے پر قادر ہُوا تو رستم اُن کا صفایا کر چکا تھا لیکن اس کی پیشانی پر لگے زخم سے بھی خون رِس رہا تھا۔

"تمھاری یہ ترکیب کامیاب رہی ہے، سرفرِدش! اُدھر دیکھو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

مَیں نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔

فصیل پر جگہ جگہ آسوری سپاہی چڑھ رہے تھے اور نعرے لگاتے ہُوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ رستم نے مجھے بتایا کہ وہ مزید دو سو چھکڑوں کو کشتیوں میں بدلنے کا حکم دے آیا تھا۔ میں نے فصیل کے کنارے سے میدان کی جانب دیکھا۔

بیسیوں چھکڑے کھائی میں اُتر رہے تھے اور بیسیوں میدان سے کھائی کی طرف لائے جا رہے تھے۔

تیروں پر گھوڑوں کی لہراتی دُمیں اور انسانی کھوپڑیاں بتا رہی تھیں کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔ اچانک میری نگاہ شاہ تمبور کے محل کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ تخت پر کھڑا اپنی اکلوتی آنکھ پر ہاتھ کا چھجا بنائے فصیل کی طرف دیکھ رہا تھا اور سادیہ اس کے قریب کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ شاید اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ مَیں نے رستم کی طرف پلٹتے ہُوئے کہا۔

"کچھ لوگ اُن بحری دروازوں کی طرف بھیجو تاکہ وہ انھیں بند کر کے پانی کا بہاؤ روک دیں۔ تھوڑی دیر میں خندق اور کھائی کا پانی نکل جائے گا کیوں کہ ان لوگوں نے نکاسیِ آب کا بھی انتظام کیا ہوا ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ یہاں تشریف لاتے ہُوئے خداِ اعظم کے نعل گیلے ہو جائیں۔"

رستم مُسکرایا اور بولا: "بہت اچھی بات کی ہے تم نے شہنشاہ اعظم کے پاؤں گیلے نہیں ہوں گے۔" پھر اس نے اپنے کچھ سپاہی پانی نکالنے کے لیے بھیج دیے۔

اس وقت تک فصیل بحری تاغانیوں سے خالی ہو چکی تھی اور آسوری جوق در جوق شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ مَیں اور رستم فاتح ان داروں کی طرح ایک جگہ، فصیل کی سیڑھیوں سے اُتر کر شہر کے وسط میں پہنچے۔ یہاں کچھ دیر تاغانیوں اور آسوریوں کے درمیان شدید جھڑپ ہُوئی تھی۔ اس لیے وہاں بہت سی لاشیں پڑی تھیں۔ دس بارہ مکانوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا اور جگہ جگہ سے عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا سُنائی دے رہی تھی۔

مَیں اور رستم ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔

میرے سر سے جنگ کا جنوں اُتر چکا تھا۔

عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار نے میرا دل گداز کر دیا۔ نہ جانے کتنی ماؤں سے ان کے بیٹے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے اور کتنے بچوں کے سروں سے سایۂ پدری اُٹھ گیا تھا۔ کتنی بہنیں اپنے بھائیوں کا ماتم کر رہی تھیں اور کتنی سہاگنوں کی مانگ اُجڑ گئی تھی۔

اس خیال نے اچانک مجھے سادیہ کی یاد دلا دی۔

سادیہ جو میرے بچے کی ماں بننے والی تھی اور جسے رستم موت کی میٹھی نیند سُلا دینا چاہتا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ رستم سے کہہ دوں کہ وہ سادیہ کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل دے۔ وہ جیسی بھی ہے، میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اگر اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تو وہ معصوم رُوح جو اس کے بطن میں پرورش پا رہی ہے، ناکردہ گناہوں کی سزا میں، عالمِ وجود میں آنے سے پہلے ہی موت کے اندھے کنویں میں دھکیل دی جائے گی۔

ابھی میں بات چھیڑنے کے لیے دل ہی دل میں تمہید ہی باندھ رہا تھا کہ رستم نے اپنے سر سے خود اُتارتے ہُوئے کہا: "یہ تاغانی تو بڑے زبردست جنگجو نکلے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ اتنے دلیر بھی ہو سکتے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی 'زن' سے ایک تیر ہمارے درمیان سے گزر گیا۔ ہم نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ خداِ اعظم کا ایک سپاہی ایک ستون کی آڑ لے رہا تھا۔ ہم جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں سپاہی نے پھر چلّہ کھینچا مگر اس کے تیر چلانے سے پہلے ہی ہم ایک طرف ہٹ گئے۔

"اس بن مانس کی اولاد کو جانے نہ دینا۔" رستم چیخ پڑا اور تیزی سے اس کی طرف دوڑا۔

مَیں نے بھی رستم کی تقلید کی۔

شاہ تمبور نے مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کے لیے یقیناً کوئی بڑا انعام رکھا ہو گا جبھی تو وہ آسوری سپاہی شہر میں لُوٹ مار کرنے کی بجائے مجھے اپنا نشانہ بنانے پر تُلا ہُوا تھا۔ رستم گالیاں بکتا ہُوا اس کا تعاقب کر رہا تھا اور میں رستم کے پیچھے تھا۔

سپاہی ایک تنگ سی گلی میں گھُس گیا۔

رستم نے تعاقب جاری رکھا مگر چند ہی لمحے بعد رستم پلٹا اور بولا: "دیوار سے لگ جاؤ سرفرِدش! تاغانی گھڑسوار آ رہے ہیں۔"

وہ دس سواروں کی ایک ٹولی تھی۔ اُن میں سے کچھ زخمی بھی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آسوریوں سے جان بچانے کے لیے بھاگتے پھر رہے ہیں مگر انھیں کہیں بھی جائے امان دِکھائی نہیں دیتی۔ اس لیے وہ مرنے سے پہلے دوسروں کو مارنے کے درپے ہیں۔

وہ مغلظات بکتے ہوئے میری اور رستم کی طرف بڑھے۔

ہم نے اپنی اپنی پیٹھ دیواروں سے لگا رکھی تھی۔ جیسے ہی وہ ہم پر حملہ آور ہُوئے، ہم نے جھکائی دے کر ان کے گھوڑوں کو زخمی کر دیا۔ گھوڑے بدکے اور ہم موقع ملتے ہی ایک دروازے میں گھُس گئے۔ گھڑسواروں نے پلٹ کر پھر حملہ کیا لیکن اب ہم اپنی ڈھالیں استعمال

کر سکتے تھے۔ ہم نے ان کے وار روک کر دو سپاہیوں کو تہ تیغ کر دیا... مگر تیسرے سوار کے نیزے کی اَنی مجھے زخمی کر گئی۔

مجھ پر ایک بار پھر جنون طاری ہو گیا۔

میں دروازے سے نکل آیا اور اندھا دھند لڑنے لگا۔ اتنے میں کچھ آسوری سوار بھی وہاں پہنچ گئے اور تاغانی سواروں پر ٹوٹ پڑے۔

چند لمحوں بعد ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا۔

میں لپک کر اس دروازے میں آیا جہاں رستم کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنا دایاں بازو تھامے زمین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ ہاتھ سے خون کی موٹی دھار بہہ رہی ہے اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔

"کیا ہوا رستم؟" میں چیخ پڑا۔

وہ مجروح تبسم کے ساتھ بولا: "میری قسمت خراب ہے... سرفروش! اس منحوس کی طرح" یہ کہتے ہوئے اس نے قریب پڑے ایک تاغانی کی طرف اشارہ کیا جو دم توڑ چکا تھا "اس بدبخت نے میرا بھی کام تمام کر دیا۔"

میں نے جلدی سے اس کے بازو کا جائزہ لیا اور فوراً اپنی پیٹی اُتار کر اس کے بازو پر کٹنے والے زخم سے کچھ اوپر کس کر باندھ دی، جس سے اس کے خون کا بہاؤ رُک گیا۔

"اس وقت میری حالت کسی زچہ جیسی ہے سرفروش! مجھے سہارا دے کر یہیں بٹھا دو۔"

میں نے اُسے سہارا دے کر بٹھا دیا اور آسوری گھڑسواروں کے سرخیل سے کہا: "جلدی سے ایک انگیٹھی اور لوہے کا ٹکڑا لے آؤ۔ اگر زخم فوراً نہ داغا گیا تو خون بند نہیں ہوگا اور اس کا زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا۔"

وہ فوراً وہاں سے چل دیا۔

رُستم کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ اس نے عجیب نگاہ سے میری طرف دیکھا اور نقاہت سے بولا: "میں نے آج تک کسی کو یہ نہیں بتایا کہ مجھے آگ سے ڈر لگتا ہے۔ میں کسی انسان یا شیطان سے نہیں ڈرتا مگر داغے جانے سے میری روح کانپتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے نرمی سے اُس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا: "نہیں رستم تم اس سے کئی گنا تکلیف برداشت کر سکتے ہو۔ میں نے تمہارے جیسے جگرے والا آدمی نہیں دیکھا۔ اگرچہ تم ایک ہاتھ سے محروم ہو گئے ہو لیکن اس کے باوجود تمہیں بہت کچھ کرنا ہے... یا تکلیف کی وجہ سے تم سب کچھ بھول گئے ہو؟"

"نہیں!" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ کام آج رات ہوگا لیکن اب میری بجائے اُسے تم انجام دو گے۔ جب بوڑھا شاہ تیمور کو زہر دے دے تو تمہیں فوری طور پر سادیہ کو قتل کرنا ہوگا۔ میں بھی وہاں موجود رہوں گا لیکن اس حالت میں تو میں ایک عورت کو بھی تہ تیغ نہیں کر سکتا۔ یہ کام تمہیں ہی کرنا ہوگا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر گہرا گھاؤ ڈال دیا ہو۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے سادیہ کو قتل کرنا ہوگا... اسی سادیہ کو جو میرے بچّے کی ماں بننے والی تھی۔

★★

بحری تاغانیوں کا یہ شہر صرف چار گھنٹے کے اندر اندر تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ہر گھر سے دُھواں اور شعلے اُٹھ رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے ہر گلی اور ہر کوچے سے موت اپنے بال کھولے بین کرتے گزر گئی ہو۔ تاغانی بچّوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کی لاشیں ڈھو کر اس سبزہ زار میں پہنچا دی گئی تھیں جس کے ایک کنارے آسوریوں کی خیمہ گاہ تھی۔ زندہ بچنے والوں کو بھی اسی جگہ لا کر قتل کیا گیا تھا تاکہ اُن کے بریدہ سروں سے مینار بنایا جا سکے جو وہاں سے گزرنے والوں کو فاتح اعظم شاہ تیمور کی یاد دلاتا رہے۔

اس شہر کی صرف ایک ہستی کو اُس وقت قتل نہیں کیا گیا تھا... اور یہ شخص تھا، شہر کا ناظم اوسندی... اُسے عین اُس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ خودکشی کرنے والا تھا۔ اُسے پابہ زنجیر خاوِ اعظم کے سامنے لایا گیا اور اس وقت تک اُس پر تشدد کیا جاتا رہا جب تک کہ اس نے شاہ تیمور کو مطلوبہ معلومات فراہم نہ کر دیں۔ اُس کی ہر کرب ناک چیخ پر شاہ تیمور قہقہہ لگاتا۔ بالآخر اُسے بھی قتل کر دیا گیا۔

یہ ساری باتیں مجھے سہ پہر کو بابر کی زبانی معلوم ہوئیں وہ میرے اُس زخم کا معائنہ کر رہا تھا جو مجھے تاغانی گھڑسوار کے نیزے سے آیا تھا۔ اُس وقت میں رُستم کی تکلیف دیکھ کر اپنا یہ زخم بھول گیا تھا۔ نیزے کی اَنی مجھے ایک پسلی میں چبھی تھی۔ بابر نے زخم صاف کیا اور بتایا کہ اُس کے خیال میں زخم داغنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

میں نے یہ سُن کر دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ میں رُستم کی حالت دیکھ چکا تھا لیکن میں اُس کے ضبط اور حوصلے کی

داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب اُس کا بازو کاٹ کر اُسے سُرخ لوہے سے داغا گیا تو اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری تک نہیں نکلی تھی۔

میں وہاں سے اپنے چھکڑے میں چلا آیا تھا تاکہ آرام کر سکوں۔ یہیں بابر نے میری مرہم پٹی کرتے ہوئے یہ ساری باتیں بتائی تھیں۔

"خاوِ اعظم تیمور سروں کا مینار تعمیر کروا رہا ہے اُس کے لیے زمرد کی ایک لوح کندہ کروائی جا رہی ہے۔ جس پر یہ تحریر ہوگی۔

"اے پڑھنے والو! یہ لوح اس امر کی گواہ ہے
کہ حاکمِ دوراں، خاوِ اعظم تیمور جس کے نام سے
دُنیا لرز اُٹھتی ہے۔ اس راہ سے گزرا تھا اور یہ
کاسہ ہائے سر اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ انہوں
نے حاکمِ دوراں خاوِ اعظم تیمور کے حکم سے رُوگردانی
کی تھی۔"

بابر نے یہ بھی بتایا کہ شاہ تیمور آج بہت زیادہ بردس پی رہا ہے اور دیوانگی کے بھرپور دَورے میں مبتلا ہے۔ اتنے میں چھکڑے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خود ہی اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ آنے والا سادیہ کا گونگا بہرہ سیاہ فام غلام تھا۔ وہ میرے لیے اس کا بے حد اہم پیغام لایا تھا۔ یہ پیغام لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی پر لکھا گیا تھا۔

"آج رات تک میرے پاس مت آنا۔ وہ
انتہائی غصّے میں ہے کیونکہ تم ابھی تک زندہ
و سلامت ہو۔ آج رات تمہیں وہی کرنا ہے جو
کہا گیا ہے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے بابر کو اس کے چھکڑے میں بھیج دیا اور خود سوچ کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔ میں ایک عجیب ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کس پر اعتماد کرنا چاہیے اور کس پر نہیں؟

سادیہ چاہتی تھی کہ جونہی بارنو خاوِ اعظم کا کام تمام کرے میں اُسے ہلاک کر دوں اور رستم کی خواہش تھی بلکہ یہ حکم تھا کہ میں سادیہ کو قتل کر دوں لیکن میں اپنے ہونے والے بچّے کی ماں کا قاتل نہیں بن سکتا تھا۔ مجھ میں یہ سوچنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔

میں پاگل سوچوں اور وسوسوں میں گھرا ہوا تھا کہ اتنے میں مجھے رُستم کا پیغام ملا کہ جب اندھیرا ہو جائے تو میں اُس کے پاس پہنچ جاؤں۔

میں نے ہر سوچ کو وقتی طور پر ذہن سے جھٹک دیا اور غروبِ آفتاب کا انتظار کرنے لگا۔

شام ہوتے ہوتے خیمہ گاہ میں ہر طرف ہنگامہ طرب کی گونج سُنائی دینے لگی۔ آج بردس پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی فاتح آسوری قہقہے لگا رہے تھے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے، شور مچا رہے تھے اور گا بجا رہے تھے۔ آج بچّوں اور عورتوں کو اُن سے دُور رکھا گیا تھا کیونکہ نشے میں ڈوبے شہسوار اندھا دُھند گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ ان علامات سے پتہ چلتا ہے کہ آج رات اپنے دامن میں جشنِ طرب کے بہت سے ہنگامے لانے والی ہے۔

غروبِ آفتاب کے بعد میں چھپتا چھپاتا اور الاؤ کی روشنیوں سے بچتا بچاتا رُستم کے خیمے تک پہنچ گیا۔ اگرچہ میرے گلے میں اب بھی طلائی طوق جگمگا رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ آج کے معرکے کے بعد آسوریوں کے دلوں میں میرے لیے احترام بڑھ گیا ہوگا اور وہ ایک بار پھر میری بہادری اور بے جگری کے معترف ہو چکے ہوں گے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود خاوِ اعظم میری جان کے درپے تھا۔

جونہی میں رُستم کے خیمے کے دروازے پر پہنچا چھ محافظوں کے سرخیل نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور بولا: "کمان دار آپ کے منتظر ہیں سردار سرفروش۔"

میں نے محسوس کیا کہ یہ سب لوگ پوری طرح مسلح ہیں اور انھوں نے بردس بھی نہیں پی رکھی ہے۔ مجھے "سردار سرفروش" کے الفاظ سُن کر تسکین اور خوشی محسوس ہوئی کہ اب آسوری پھر مجھے محترم سمجھنے لگے ہیں۔

میں خیمے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ بارنو بھی رُستم کے پاس بیٹھا ہے۔ رُستم ایک تخت پر نیم دراز تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے میری طرف نگاہ دوڑائی لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ البتہ اپنا بایاں ہاتھ اُٹھا کر میرا استقبال کرنا نہ بھولا۔ اس کے دائیں بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اُس نے بازو کو چمڑے کی ایک پٹی میں ڈالا ہوا تھا جو اُس کے گلے میں لٹک رہی تھی۔ اس نے خاوِ اعظم کے جراحوں کے مشورے کے باوجود بردس نہیں پی تھی وہ چمڑے کا ہلکا لباس پہنے ہوئے تھا اُس کی خود اور تلوار اُس کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔

"انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں سردار سرفروش! آج ہم ضرب لگائیں گے اسی لیے ہم نے بردس کو مُنہ نہیں لگایا۔"

"سادیہ کے آدمیوں نے بھی آج نہیں پی ہوگی۔" مارنو بول اُٹھا۔ "وہ بے وقوف عورت بھی غالباً آج ہی رات ضرب لگانا چاہتی ہوگی۔"

میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں کماندار یہ ٹھیک کہتا ہے۔"

یہ سُن کر رستم نے آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ بازو میں اُٹھنے والی درد کی ٹیس روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر لمبی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ پہل ہم کریں گے۔ میرے آدمی اُس کے آدمیوں سے بہتر طریقے پر مسلّح ہوں گے اور وہ اُس کے آدمیوں پر نگاہ رکھیں گے۔ اب تم سردار سرفروش کو بتاؤ مارنو کہ ہمارا طریق کار کیا ہوگا؟"

مارنو نے اپنی ٹھوڑی کھجائی اور کہنے لگا۔ "میں اُسے ایسا زہر دوں گا جس کا کوئی تریاق نہیں... لیکن یہ زہر چند لمحے بعد اپنا اثر دکھائے گا اور اُسے ڈھیر کر دے گا۔ اُسی وقت تمھیں سادیہ کو تہ تیغ کر دینا ہوگا سردار سرفروش۔"

"پھر تمھیں حتی الوسع اپنا دفاع بھی کرنا ہوگا۔" رستم بولا۔

"اس کی ضرورت زیادہ دیر تک پیش نہیں آئے گی۔ میں بھی وہاں موجود ہوں گا... مگر یہ ظاہر کروں گا کہ میں شدید درد میں مبتلا ہوں۔ جوں ہی سادیہ مرے گی، میں بول اُٹھوں گا اور اقتدار اپنی کمان میں لے لوں گا۔ باقی سب کچھ میرے آدمی سنبھال لیں گے۔ اس میں خطرہ تو ہے لیکن اگر ہم نے کوئی غلطی نہ کی تو سب کچھ حسبِ منشا ہو جائے گا۔"

یہی وہ وقت تھا جب مجھے اُن پر حقیقتِ حال منکشف کرنا تھی۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "میں سادیہ کو قتل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ میرے بچّے کی ماں بننے والی ہے۔"

رستم اور مارنو کو اس بات سے دھچکا سا پہنچا اور وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔ مجھے تو نے مارنو سے مخالفت کا کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ خود صاحبِ اولاد تھا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"تم یہ بات جانتے تھے پھر تم نے اب تک مجھے کیوں نہ بتائی؟" رستم نے کہا۔

"میں تمھیں بتانا چاہتا تھا، کماندار لیکن ہر بار بات بیچ میں ادھوری رہ جاتی تھی۔ آخر اُسے قتل کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم اُسے قیدی بنا سکتے ہو اور میں اس کے لیے تیار ہوں مجھے سادیہ سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اپنے بچّے سے ضرور ہے۔ زچگی کے بعد تمھیں اختیار ہوگا کہ اس کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو، سرفروش!" رستم غرّایا۔ "تم مردوں کے مرد ہو۔ میں نے آج تمھیں میدانِ جنگ میں لڑتے دیکھا ہے۔ مجھے تم جیسے ساتھی کی ضرورت ہے مگر جب تک وہ عورت زندہ ہے ہمارے سر محفوظ نہیں رہیں گے۔ آسوریوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور ہم کسی بھی لمحے قتل کر دیے جائیں گے۔"

رستم نے تائید طلب نگاہوں سے مارنو کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "میں ٹھیک کہتا ہوں مارنو یا غلط؟"

اُسی لمحے میرے ذہن میں ایک سوال نے کسی ناگ کی طرح اپنا پھن اُٹھا لیا۔ سادیہ کہتی تھی کہ مارنو اس کا آدمی ہے۔ اس وقت وہ رستم کا مشیرِ خاص نظر آ رہا تھا۔ آخر سادیہ سو فی صد یقین سے کیوں کہتی تھی کہ مارنو اس کی خاطر خادِ اعظم کو قتل کر دے گا؟ میں یہ سوال پوچھنے ہی والا تھا مگر یہ سوچ کر رُک گیا کہ یہ اُس مسئلے کا حل نہیں جو مجھے درپیش ہے۔

مارنو اُٹھ کر ٹہلنے لگا پھر اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے رستم سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں ہمیں سردار سرفروش کو مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ میں اُس کے احساسات سمجھتا ہوں مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ سادیہ کا وجود ہمارے لیے موت کی پرچھائیں بنا رہے گا لیکن آسوریوں کے سربراہ بن کر کیا تم ایک عورت پر قابو نہیں پا سکو گے؟ بہر صورت منصوبہ طے پا چکا ہے اور اب اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔" مارنو نے اپنی رائے کے ساتھ فیصلہ بھی دے دیا۔

رستم نے درد کے مارے ایک بار پھر آنکھیں موند لیں اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ "اچھی بات ہے مارنو لیکن سادیہ کی ذمے داری تم پر ہوگی، سردار سرفروش! اگر آج رات ہم کامیاب ہو گئے تو تم میرے نائب بنو گے۔ سادیہ نے کوئی گڑبڑ، سازش، دھوکے کی کوشش یا بغاوت کی تو مجھے تمھارا سر قلم کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے، کماندار۔" میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ "جب سادیہ بچّے کو جنم دے گی تو میں اُسے تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

اس کے بعد ہم تقریباً نصف گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔

آج مارنو اپنے بہترین لباس میں تھا اور جب وہ لہک لہک کر باتیں کرتا تھا تو اس کی مخروطی ٹوپی کی نوک پر بندھا ہُوا

گھنگرو بجنے لگتا تھا۔

"جب شاہ تبور کچھ کھاتا یا پیتا ہے تو پہلے تم اُسے چکھتے ہو مارنو۔ پھر تم اُسے زہر کیسے کھلاؤ گے یا پلاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بات نہ میں نے کماندار کو بتائی ہے اور نہ ہی تمھیں بتاؤں گا۔" مارنو بولا۔ "اگر ہمارا منصوبہ ناکام ہو جائے تو تشدّد سے مجبور ہو کر تم یہ راز اُگل سکتے ہو۔ اس لیے میں نے اُسے اپنے سینے میں دفن کیا ہے تاکہ وقت آنے پر اسے دوبارہ استعمال کر سکوں۔"

آخری منصوبہ بندی کے بعد میں اپنے جھگڑے میں لوٹ آیا۔ لباس تبدیل کیا اور خادِ اعظم کے خیمے کی طرف چل دیا۔

آج شاہی خیمے کے محافظوں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی جن میں سے آدھے شاہ تبور کے آدمی تھے اور آدھے رستم کے۔ مگر خادِ اعظم کے محافظ بروس کے نشے میں تھے جبکہ رستم کے سپاہیوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ بروس نہ پئیں اور اشارہ ملتے ہی شاہ تبور کے محافظوں کو تلوار کی نوک پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں۔

خادِ اعظم کے خیمے میں جشنِ طرب جاری تھا۔

وحشی موسیقی کی لَے تال پر شاداب سراپا والی لڑکیاں جواں گھوڑیوں کی طرح رقص کر رہی تھیں۔ سیاہ فام غلام بروس کے پیالے اور تاغانیوں کے شہر سے لُوٹے ہوئے پھلوں کے تشت لائے سب کو پیش کرتے پھر رہے تھے۔

خیمہ کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔

مشعلوں کے دھوئیں اور بروس کی بُو سے سانس لینی مشکل ہو رہی تھی۔

خادِ اعظم قہقہے لگا رہا تھا اور سادیہ حسبِ معمول اس کے قریب فرش پر بیٹھی تھی۔ میں خیمے میں داخل ہونے کے بعد دروازے کے قریب ہی رُک گیا تاکہ اپنے آپ کو بروس کی بُو سے محفوظ رکھ سکوں جو اپنے اندر نشے کی تاثیر رکھتی تھی۔

سادیہ بار بار خیمے کے دروازے کی طرف دیکھتی تھی شاید اسے میرا ہی انتظار تھا۔ میں نے اپنے گھٹنے موڑ کر خود کو قدرے جھکا لیا اور شاہ تبور کے عہدے داروں کی ایک ٹولی کے پیچھے چھپ گیا۔ اتنے میں بابر بھی اپنی گاڑی دھکیلتا ہُوا اندر آیا اور میرے پاس پہنچ گیا۔ آج اُسے میرے غلام کی حیثیت سے تقریب میں شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

موسیقی کی لَے بدلی اور رقاصائیں دو، دو کی ٹولی میں بٹ کر رقص کرنے لگیں جو بروس سے بدمست سپاہیوں کے لیے خاصا اشتعال انگیز تھا۔ اتنے میں مارنو برف میں لگے ہوئے تربوز کا چھوٹا سا ٹوکرا اٹھائے اندر آیا اور حسبِ معمول شاہ تبور کے دائیں جانب بیٹھ گیا۔ اُس نے جیب سے رنگین گولے نکالے اور اُنھیں اچھالنے لگا۔ اُس نے نہ تو میری طرف دیکھا اور نہ ہی ان رقاصاؤں پر نگاہ ڈالی جو رقص کے آخری مرحلے میں ایک دوسری سے جکڑی وحشیانہ انداز میں چیخ اور کراہ رہی تھیں۔ پھر موسیقی کے ایک جھٹکے کے ساتھ رقص ختم ہُوا اور رقص کرنے والی ایک بغلی دروازے سے ملحقہ خیمے میں چلی گئیں۔

بدمست سپاہی دیر تک تالیاں پیٹتے رہے۔

میں اُسی طرح جھکا کھڑا رہا تاکہ سادیہ مجھے بلند قامتی کی وجہ سے پہچان نہ لے۔ مجھے اُس وقت تک شاہ تبور کی نگاہوں سے اوجھل رہنا تھا جب تک کہ رستم کو چوکی پر بٹھا کر وہاں نہ لایا جاتا۔ میں نے دیکھا کہ اب سادیہ اپنے غصّے کو چھپانے کی کوشش کیے بغیر بار بار خیمے کے دروازے کی جانب دیکھتی ہے۔ وہ بڑی مضطرب نظر آتی تھی اور ہونٹ چبا رہی تھی۔

بالآخر رستم کے چار آدمی اُسے چوکی پر خیمے کے اندر لے آئے اور چوکی شاہ تبور کے تخت کے پاس ایک نمایاں جگہ رکھ دی گئی۔ خادِ اعظم اپنی نشست سے اُٹھا اور اُس نے اپنا ہاتھ بلند کیا تو خیمے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ اس وقت بروس کے نشے میں دُھت تھا۔ اس لیے کچھ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"میں تمھیں مبارکباد کہتا ہوں رستم... اور تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ آج تم نے تاغانیوں کو ناقابلِ فراموش سبق دیا ہے اور مجھے تمھارے زخمی ہونے پر بہت افسوس ہے۔ میرے جرّاح کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں؟"

رستم نے اپنا کٹا ہُوا بازو دکھاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ آپ کو مبارکباد دیتے ہیں اور اس تاغانی پر اُنھیں شدید غصّہ ہے جس نے میرا بازو کاٹ کر اُنھیں ان کے حق سے محروم کر دیا۔"

رستم کی اس بات پر حاضرین نے زوردار قہقہہ لگایا۔

خود خادِ اعظم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اُس کی پتلیاں تیزی سے گردش کرنے لگی تھیں۔

"یہ تو صرف ایک ہاتھ تھا جو میرے لیے بہت قیمتی تھا۔ لیکن اگر میرے سو ہاتھ ہوتے تو میں اُنھیں بھی اپنے خادِ اعظم پر قربان کر دیتا۔" رستم نے کہا۔

رستم کے یہ الفاظ میرے لیے اشارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ جب یہ الفاظ ادا کرے تو میں تخت کے

سامنے آجاؤں۔ چنانچہ میں آگے بڑھا تو لوگ مجھے راستہ دینے کے لیے ہٹ گئے۔ میں خادِ اعظم اور سادیہ کی نشستوں کے سامنے آیا تو سادیہ کا ہاتھ بے ساختہ اظہارِ تحسین میں اٹھ گیا۔

میں نے پہلے خادِ اعظم اور پھر سادیہ کے سامنے سر خم کرتے ہوئے کہا: "میں خادِ اعظم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے اپنے حضور حاضری کا اعزاز بخشا۔ پہلے میں تاغانیوں کو بہادر سمجھتا تھا اور اُن کی عزت کرتا تھا لیکن اب میرے دل میں اُن کا کوئی احترام نہیں رہا۔ آج مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ حاکمِ دوراں آپ ہی ہیں، شہنشاہِ معظم!"

خادِ اعظم میری طرف جھکا۔ اُس کے چہرے پر تشنج کے سے آثار تھے اور اس کی اکلوتی آنکھ کی پتلی گردش کرتے ہوئے چمک رہی تھی۔ ایسا محسوس ہُوا جیسے اس نے میرے خوشامدانہ فقرے سُنے ہی نہ ہوں کیونکہ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔۔۔ پھر اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سرگوشی کی۔

"تم بہت خوش قسمت ہو سردار سرفروش! آج تمھاری تقدیر یاور تھی۔ تم دو بار موت کے مُنہ سے بچے ہو یا تین بار؟"

"دو بار عالی جاہ۔ صرف دو بار" میں نے اُس سے نگاہ ملاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے بھدّے دانتوں سے ہونٹ چباتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوگیا: "میں تمھارا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، سردار سرفروش! جس طرح میں نے دوسروں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مگر نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ مجھے یکلخت کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔

میں بھی قدرے خوفزدہ ہوگیا۔

خادِ اعظم پھر بولنے لگا: "میں صرف لفظی طور پر تمھارا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہتا۔ تم ایک بار پھر سردار سرفروش بن گئے ہو اس لیے یہ طلائی طوق اپنے گلے سے اُتار دو۔"

میں نے اس کے سامنے سر خم کیا اور طوق گلے سے اُتار کر اُچھال دیا جسے ایک سیاہ فام خواجہ سرا نے جھپٹ لیا۔ لوگ تالیاں بجانے لگے۔

خادِ اعظم نے ہاتھ بلند کیا تو خاموشی چھا گئی۔

"جس بے جگری سے آج سردار سرفروش نے جنگ لڑی ہے ہم اُسے بچشمِ خود ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ سردار سرفروش نے یہ جنگ ہمارے لیے لڑی ہے اور ہم اس کی خوش بختی کے بھی قائل ہوگئے ہیں" یہ کہتے ہوئے اُس نے مجھے دیکھا اور مسکرانے لگا: "ہم آسوری خوش بختی کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ اس لیے ہم اُسے سادیہ کے ساتھ شادی کی اجازت دیتے ہیں جو تاریخ مقرر ہونے کے بعد بڑی دھوم دھام اور شاہانہ تزک و احتشام سے منائی جائے گی۔ اس کے علاوہ ہم اسے ایک اہم عہدہ بھی دے رہے ہیں۔ اس حیثیت میں سردار سرفروش صرف ہمیں جوابدہ ہوگا۔ ہمارے علاوہ اس سے کوئی دوسرا باز پرس نہیں کر سکے گا۔ اسے ہمارے خزانے اور ہماری ہر چیز پر کُلی اختیارات حاصل ہوں گے۔ یہ ہماری بہن کے ساتھ تخت پر بیٹھا کرے گا اور تم سب اس کی اطاعت کروگے۔ یہ ہمارا فرمان ہے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی دو سیاہ فام غلام جلدی سے تیسری مسند لے آئے جو سادیہ کے برابر رکھ دی گئی۔

"تم نے دیکھا سردار سرفروش کہ ہم اپنا قول کس طرح پورا کرتے ہیں" شاہ تیمور نے کہا۔

میں نے شکریہ ادا کرنے کے لیے سر خم کر دیا۔

حاضرین نے بے تحاشا تالیاں بجائیں اور نعرہ ہائے تحسین بلند کیے۔ شاہ نے مجھے مسند پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پہلی بار مجھے اندازہ ہُوا کہ وہ اپنی قوم میں کتنا مقبول ہے۔ آج مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ آسوری بہادروں کی کتنی قدر اور عزت کرتے ہیں۔

جب نعرہ ہائے تحسین اور تالیوں کا شور ختم ہُوا تو سادیہ نے خادِ اعظم کا شکریہ ادا کیا۔۔۔ پھر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں جوشِ مسرت سے چمک رہی تھیں۔ وہ میری طرف جھکی اور میرے کان میں بولی: "وقت آگیا ہے، مارنو کو قتل کرنے کے لیے تیار رہو۔"

اُدھر شاہ تیمور، مارنو سے کہہ رہا تھا: "بول بول کر میرا حلق خشک ہوگیا ہے اور بھوک لگنے لگی ہے احمق۔ جلدی سے تربوز دو۔" پھر اس نے پہلو میں رکھے پیالے سے بروس کے چند گھونٹ غٹاغٹ پیے اور تربوزوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جن میں سے مارنو اچھا دانہ چھانٹ رہا تھا۔ دریں اثنا ایک سپاہی علاگشاہ تیمور کے پاس آیا اور اس نے سرگوشی میں کچھ کہا۔

خادِ اعظم نے اثبات میں سر ہلایا اور اُسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے پھر تربوزوں کی طرف دیکھنے لگا۔

میری نگاہیں بھی مارنو پر مرکوز تھیں۔

مارنو نے ٹوکرے میں سے ایک اچھا اور بڑا سا تربوز اُٹھایا، اپنی پیٹی سے چاقو نکالا، بڑی احتیاط سے تربوز دو حصّوں میں کاٹنے کے بعد اُٹھا اور ادب سے جھکتے ہوئے آدھا تربوز شاہ تیمور کو پیش کر دیا۔

خادِ اعظم تربوز پر مُنہ مارنے سے پہلے مارنو کو غصّے سے دیکھتے ہُوئے بولا: "پہلے اسے چکھو بدبخت۔ کیا میں تمھیں اس کام کا الگ سے معاوضہ نہیں دیتا؟"

مارنو نے تربوز کا دوسرا حصّہ اُٹھا لیا۔ سب کی نگاہیں اب مارنو پر تھیں کیونکہ جب کبھی خادِ اعظم اُسے کوئی چیز چکھنے کے لیے کہتا تھا تو مارنو اُسی چیز کی زبان بن جاتا تھا۔ مارنو نے تربوز کی ترجمانی عجیب مزاحیہ لہجے میں شروع کر دی۔

"مجھے کھاؤ احمق بونے! مجھے کھاؤ تاکہ خادِ اعظم میرا دوسرا حصّہ کھا سکیں۔" پھر تربوز کی ہنسی سُنائی دی: "کٹ کٹ کٹ کٹ۔ جب میں یہاں آیا تو ثابت و سالم تھا۔ میرا چھلکا بھی ثابت سالم تھا۔ جب تم کاٹ رہے تھے تو سب دیکھ رہے تھے۔ کیا خادِ اعظم تجھے جادوگر سمجھتے ہیں؟ ورنہ تربوز کو کاٹے بغیر کون اُسے زہر آلود کر سکتا ہے۔ کھاؤ مجھے جلدی کھاؤ احمق۔"

یہ کہہ کر مارنو جلدی جلدی تربوز کھانے لگا۔ سارے حاضرین اس کی باتوں اور کھانے کے انداز پر بے تحاشا ہنسنے لگے۔ خادِ اعظم بھی قہقہے لگا رہا تھا۔۔۔ پھر وہ بھی تربوز کھانے لگا۔ میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

مارنو نے کہا تھا کہ شاہ تربوز کھانے کے چند لمحوں بعد ڈھیر ہو جائے گا۔ سادیہ میری طرف جھکی اور میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی: "کیا بات ہے سرفروش! تم اس طرح گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟ تمھیں تو ابھی ایک اہم کام کرنا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

خادِ اعظم نے جلدی جلدی کچھ اور تربوز کھایا۔۔۔ پھر کھڑے ہو کر ہاتھ بلند کیا اور جب خاموشی چھا گئی تو بولا: "میں تمھیں ایک اور خوشخبری بھی سُنانا چاہتا ہوں۔ میں تمھارا حکمران یعنی شاہ تیمور بھی شادی کرنے والا ہے۔ مجھے میرے خوابوں کی شہزادی مل گئی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی اور غلاموں کو حکم دیا کہ "خادِ اعظم تیمور کی دُلہن سامنے لائی جائے۔ آسوری قوم کے سرداروں کو اُن ہستی کا دیدار کروایا جائے جو حاکمِ دوراں کے ساتھ اس کے پہلو بہ پہلو جلوہ افروز ہُوا کرے گی۔"

حاضرین خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ خادِ اعظم نے مسکراتے ہوئے بروس کا پیالہ اٹھا لیا اور دو گھونٹ پینے کے بعد رکھ دیا۔ حاضرین میں سے کسی کو بھی اس خوش خبری کی توقع نہیں تھی وہ حیرت زدہ تھے۔ صرف سادیہ ہی بھرے دربار میں وہ واحد ہستی تھی جس کی آنکھوں میں خوشی اور حیرت کی بجائے نفرت کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔۔۔

"تیار ہو جاؤ سرفروش۔ وہ لمحہ آگیا ہے۔" پھر اُس نے ان سیاہ فام غلاموں کی طرف دیکھا جن کے درمیان خادِ اعظم کی ہونے والی نازک اندام دُلہن آرہی تھی۔ اُس کے سر پر جوڑا بندھا ہُوا تھا اور سادیہ کی طرح اُس کا آدھا چہرہ بھی زیرِ نقاب تھا۔ صرف آنکھیں نقاب سے باہر تھیں جنھیں وہ جلدی جلدی جھپک رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ لڑکھڑائی تو ایک غلام نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ایکدم بولی۔۔۔

"بابا۔ کیا تم بھی یہاں موجود ہو، بابا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے بابا۔۔۔ تم کہاں ہو، بابا!"

یہ آواز سُن کر مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کوئی تیز دھار خنجر سیدھا میرے دل میں اُتر گیا ہو۔ میرا رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔۔۔ اور پھر بونے مارنو کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی جس سے ماحول کا ذرّہ ذرّہ کانپ گیا۔ اچانک اُس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر چمک اُٹھا اور پھر یوں لگا جیسے خیمے میں آسمانی بجلی گر گئی ہو۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میرا دل یوں کانپ رہا تھا جیسے میں کوئی غیر معمولی جوان نہیں بلکہ بھیڑ کا ایک کمزور و ناتواں سا بچہ ہوں اور میری گردن پر خنجر کی دھار رکھ دی گئی ہو۔

حالات نے کس قدر اچانک اور کتنی بھیانک کروٹ لی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خادِ اعظم تمبور نے مارنو کی معصوم بیٹی تانتی کو نہ صرف تلاش کر لیا ہے بلکہ اسے اپنی ملکہ بنانے کا بھی فیصلہ کر لیا ہے... مارنو کے ہاتھ میں لمحے بھر کو اس کا تیز دھار خنجر چمکا اور پھر وہ تڑپ کر لپکا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے ایک اور ناقابلِ یقین منظر تھا۔

مارنو کا خنجر سادیہ کے دل میں اُتر گیا تھا۔

سادیہ کے حلق سے بڑی ہی دل دوز چیخ نکلی تھی اور ماحول پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ مُنہ کے بل مسند سے قالین پر گری اور اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

ابھی حاضرین اس صورتِ حال کو سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ خادِ اعظم بھی اپنی ہم قیر سادیہ کے پہلو میں گر گیا۔ اس نے دونوں... ہاتھوں سے اپنا حلق تھام لیا۔ وہ چند لمحے تڑپا اور ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔

سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور وہ بے یقینی سے مُنہ پھاڑے دیکھتے رہ گئے کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔

میں خود بھی حیرتوں میں ڈُوب گیا تھا... پھر فوراً ہی مجھے ہوش آگیا۔ اس سے پہلے کہ سیاہ فام غلام مارنو پر جھپٹتے، میں نے اپنی مسند ہی اُٹھا کر اُن پر دے ماری اور تلوار سونت کر لوٹ مار نو کے آگے آگیا۔ اتنے میں رُستم نے بھی چوکی کے گدّے کے نیچے چھُپی ہوئی تلوار نکال لی اور اسے لہراتے ہوئے گرجا...

"سُنو اے آسوری لوگو سُنو... اب میں تمہارا حکمراں ہوں!"

رُستم کا یہ اعلان سُنتے ہی خادِ اعظم کے وفادار دن میں ایک بڑبونگ سی مچ گئی۔ انھوں نے چیختے چنگھاڑتے ہوئے اپنی نیاموں سے تلواریں نکال لیں لیکن رُستم کے آدمی پہلے سے چوکس تھے انھوں نے خادِ اعظم کے آدمیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اُن میں سے دو رُستم کے آدمیوں کو غچّہ دے کر بونے مارنو کی جانب لپکے تو میں نے آگے بڑھ کر ایک کو تہِ تیغ اور دُوسرے کو بُری طرح زخمی کر دیا۔

خادِ اعظم کے کچھ وفاداروں نے خیمے سے نکل کر ہنگامہ کرنا چاہا مگر رُستم کے وفاداروں نے اُن کا راستہ روک لیا۔ اتنے میں بابر اپنی گاڑی دھکیلتا ہُوا اُن کے قریب پہنچا اور گاڑی کے تختے کے نیچے چھپائی ہُوئی تلوار نکال کر اُن کی ٹانگوں پر وار کرنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ بغاوت کچل دی گئی۔

رُستم نے اپنے آدمی اُن چند آسوریوں کو بھی ختم کرنے کے لیے بھیج دیے جو خیمہ تیہ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ہنگامہ فرد ہوتے ہی رُستم کے وفاداروں نے اسے خادِ اعظم کے تخت پر بٹھا دیا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہُوئے مسکرا کر بولا "ابھی میں اتنا کمزور ہُوں کہ چل نہیں سکتا۔"

"اب میں تمھیں کمان دار کہہ کر مخاطب کروں یا خادِ اعظم کہا کروں" میں نے پوچھا۔

"تنہائی میں تم مجھے کمان دار کہہ سکتے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ تم اور مارنو یہیں میرے پاس رہو گے تاوقتیکہ میرے آدمی اپنا کام مکمل نہ کر لیں۔"

رُستم نے اپنے منصُوبے کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے سارے انتظامات کر رکھے تھے۔ اُس کے وفاداروں نے خادِ اعظم کے ان افسروں کو فوراً گرفتار کر لیا جو جشنِ طرب میں شریک نہیں ہُوئے تھے۔ عام سپاہیوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ اُن کا حکمراں شاہ تمبور ہے یا رُستم... وہ تو صرف معاوضے سے دلچسپی رکھتے تھے اور وہ اپنے آجر کے وفادار تھے۔

رُستم کے آدمی خادِ اعظم کے وفادار افسروں کو گرفتار کر کے میں لاتے رہے۔ انھیں صرف ایک لمحے کی مہلت دی جاتی جو اس ایک لمحے میں حلفِ وفاداری نہیں اُٹھاتے تھے، اُن کا سر کر دیا جاتا تھا۔ صبح تک یہ سلسلہ جاری رہا اور شاہ تمبور کے افسروں میں سے تین چوتھائی نے رُستم کے ساتھ وفادار رہنے کا حلف اُٹھا لیا۔

رات بھر جاگنے سے رُستم کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور وہ کے مارے بے حال ہو رہا تھا۔ صبح طلوعِ آفتاب کے بعد وہیں اپنی چوکی پر سو گیا اور اُس پر کمبل ڈال دیے گئے۔

شاہ تمبور اور سادیہ کی لاشیں رات ہی کو وہاں ہٹا دی گئی تھیں مگر میں نے رُستم سے وعدہ لے لیا تھا کہ سادیہ کی لاش کی بے حُرمتی نہیں کی جائے گی بلکہ اُسے پورے احترام سے دفنایا جائے گا۔ البتہ شاہ تمبور کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند کر دیا گیا تھا تاکہ دیکھنے والے عبرت حاصل کر سکیں۔

مارنو اور تانتی نے بھی رات شاہی خیمے ہی میں گزاری تھی۔ مارنو اپنی بیٹی کو تھپکتا اور تسلیاں دیتا رہا تھا اور اب وہ سو رہی تھی۔ خود مارنو بھی اپنی بیٹی سے گلے مل کر بہت رو دیا تھا۔ میں نے اُسے تسلّی دی کہ وہ اپنا دل چھوٹا نہ کرے۔ اُسے تو خوش ہونا چاہیے کہ اُس کی معصوم بچّی شاہ تمبور کے ستم کا نشانہ بننے سے بچ گئی ہے۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ وہ اب تک اس المیے سے

جو اُس کے ساتھ پیش آنے والا تھا۔

"میں زندگی بھر تمھارا احسان نہیں اُتار سکوں گا، سردار سرفروش! تم نے پہلے میری بیٹی کی جان بچائی تھی اور اب میری زندگی بچائی ہے۔" مارنو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایسی باتیں نہ کرو مارنو۔" میں نے جواب دیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ سادیہ کو تمھاری بیٹی کا علم کیسے ہو گیا تھا؟"

"وہ شیطان کی خالہ تھی سردار سرفروش۔ وہ کئی سال پہلے یہ جان چکی تھی کہ میری ایک بیٹی ہے جو بے حد خوبصورت ہے۔ شاید اُس کے جاسُوسوں نے اُسے یہ راز بتایا ہوگا۔"

اب اُس راز سے پردہ اُٹھ گیا تھا کہ سادیہ اتنے یقین سے کیوں کہتی تھی کہ مارنو اُس کا وفادار ہے اور وہ اُس کے لیے شاہ تمبور کو قتل کر سکتا ہے۔

"تم نے مجھ سے یہ جھُوٹ کیوں بولا تھا کہ دُنیا میں صرف تین آدمی یعنی تم، میں اور وہ بُڑھیا ہی جانتے ہیں کہ تانتی تمھاری بیٹی ہے جبکہ سادیہ بھی اس حقیقت سے آگاہ تھی۔" میں نے سوال کیا۔

"میں نے یہ جھُوٹ بھی سادیہ کی وجہ سے بولا تھا، سردار سرفروش! اُس نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ وہ تانتی کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔ اُس نے مجھے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں نے اُس کے حکم کی تعمیل نہ کی تو تانتی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔"

اس کا یہ مطلب تھا کہ سادیہ اُس وقت کا انتظار کر رہی تھی جب تانتی کچھ بڑی ہو جائے اور وہ اُسے اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کر سکے۔ بہرکیف اب سادیہ مر چکی تھی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے سارے شیطانی منصُوبے بھی ختم ہو گئے تھے... لیکن اُس ہلاکت میں میرے لیے ایک دُکھ کا پہلو بھی تھا۔ میں نے جس ننھے مُنّے بچے کے خواب دیکھے تھے، سادیہ اس کی تعبیر بھی اپنے ساتھ قبر ہی میں لے گئی تھی۔

سہ پہر کو جب رُستم جاگا تو وہ تازہ دم تھا۔ اُس کی قوّت بھی کسی حد تک بحال ہو چکی تھی۔ اُس نے ناشتے کے ساتھ ساتھ احکام بھی جاری کرنے شروع کر دیے۔ جب تانتی کو ایک معتبر عورت کی نگہداشت میں دے دیا گیا تو مارنو آرام کے لیے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ رُستم نے معذور بابر کو شاہ تمبور کے آدمیوں کے ساتھ نبرد آزما دیکھا تھا اس لیے اُس نے بابر کو سپاہ میں افسرِ عملہ کے نائب کا منصب سونپ دیا تھا اور چار آدمی اُس کی پالکی اُٹھانے کے لیے مقرر کر دیے تھے... پھر رُستم اور میں شاہ تمبور کا حشر دیکھنے کے لیے چل پڑے۔

خادِ اعظم کا سر ایک نیزے پر بلند کیا گیا تھا... مگر وہ نیزہ غلاظت کے ڈھیر میں گڑا ہُوا تھا اور سر بریدہ جسم نیزے کے ساتھ غلاظت میں لتھڑا ہُوا تھا۔ آسوری عورتیں اور مرد گزرتے ہُوئے اُس پر تھوک رہے تھے۔ اب اُن کی معصوم بچیاں شاہ تمبور کی بھینٹ چڑھنے سے محفُوظ ہو گئی تھیں۔ وہ سب رُستم کو اپنا نجات دہندہ تصور کر رہے تھے۔

"مارنو نے شاہ تمبور کو زہر کب اور کیسے دیا تھا؟" میں نے رُستم سے پُوچھا۔

"میں نے اُس سے پوچھا تھا مگر اُس نے مجھے بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ اپنی بات پر اَڑا رہا مگر جب میں نے اُسے کہا کہ جس طرح شاہ تمبور کو ہلاک کیا ہے اُسی طرح مجھے بھی کر سکتا ہے تو وہ اس راز سے پردہ ہٹانے پر مجبور ہو گیا۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ اُس نے صندوق سے ثابت و سالم تربوز نکالا تھا؟"

"ہاں..." میں نے کہا۔ "اور اُس نے سب کے سامنے ہی اُسے کاٹا تھا اور اُسے تربوز کو زہر آلود کرنے کا موقع نہیں ملا تھا... مگر اس کے باوجود خادِ اعظم تربوز کھانے کے چند لمحوں بعد مر گیا۔"

"اُس نے سب کے سامنے تربوز کو زہر آلود کیا تھا، سردار سرفروش! اس نے چاقو کے پھل پر ایک طرف وہ زہرِ قاتل لگا دیا تھا۔" رُستم نے وضاحت کی۔

"اوہ... اس کا مطلب ہے کہ جب اس نے تربُوز کاٹا تو تربوز کے جس حصّے پر زہر لگا ہُوا تھا، وہی اُس نے خادِ اعظم کو پیش کر دیا... اور دُوسرا حصّہ جو زہر آلُود نہیں تھا، شاہ تمبور کے کہنے پر مزے سے کھاتا رہا۔ بونا بڑا ہی کائیاں ہے، کمان دار لیکن اگر اُس کی یہ ترکیب ناکام ہو جاتی تو پھر کیا ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنے بائیں ہاتھ سے خُود ہی شاہ تمبور کو قتل کر دیتا۔" رُستم نے جواب دیا۔

خیمے میں واپسی پر میں نے رُستم سے بہت سی باتیں کیں۔ ہمارے درمیان بحث بھی ہُوئی مگر رُستم خادِ اعظم اور آسوری نہیں تھا۔ اُس کا تعلق کا دُوسا قبیلے سے تھا، اس لیے وہ دلیلوں سے قائل ہو گیا اور جو کچھ میں اُس سے منوانا چاہتا تھا، وہ منوانے میں کامیاب ہو گیا۔

تقریباً ایک ہفتے تک ہمارا پڑاؤ اسی جگہ رہا۔ اس دوران رُستم نے آسوری سپاہ اور قبیلوں کی تنظیمِ نو کی اور اصلاحات نافذ کرتا رہا۔ آسوری اُس کے اقدامات سے مطمئن تھے۔

رستم نے مجھے، بونے مارنو اور بابر کو اپنے اعتماد میں لے کر ایک مجلسِ مشاورت قائم کر لی تھی اور مارنو نے خفیہ طور پر لشکر میں اپنے جاسوس پھیلا دیے تھے جو ہمیں آشوری سپاہیوں کے درمیان ہونے والی بات چیت اور ان کے خیالات سے باخبر رکھتے تھے۔

ایک ہفتے بعد لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ اب رستم کے بازو کا زخم بھر چلا تھا اور وہ بآسانی سفر کر سکتا تھا۔ دو روز تک ہم سمندر کے ساتھ ساتھ جنوب مغرب کی جانب سفر کرتے رہے۔ تیسرے دن ہمیں دُور اُفق پر وہ دیوار نظر آ گئی۔ اب ہم اس فصیل کی دُوسری طرف سفر کر رہے تھے جیسا کہ خادِ اعظم کا منصوبہ تھا۔

"تمھیں اپنا قول یاد ہے نا؟" میں نے رستم سے پُوچھا۔

"ہاں" رستم بولا: "ہم پُرامن رہیں گے اور تاغانیوں سے جنگ نہیں کریں گے۔ میں نے اپنے سارے افسروں کو سمجھا دیا ہے کہ جس نے بھی حکم عدولی کی، اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔"

ہمارا سفر جاری رہا۔

ہم سانپ کی طرح بل کھاتی فصیل کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف بڑھتے رہے۔

ایک شام جب سُورج دُور پہاڑیوں کی اوٹ میں غرُوب ہُوا تو مجھے اُن پہاڑیوں کے عقب میں سے سبز روشنی پھُوٹتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس روشنی کا مخرج اس سلسلۂ کوہ کے پیچھے زمرد کی پہاڑیاں ہیں۔ ایسی پہاڑیاں میں سراندیپ میں دیکھ چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے لالی یاد آ گئی۔ لالی کے ساتھ گزارے ہُوئے لمحے یاد آ گئے۔

میں ساعتوں کے پُل پار کرتا ہُوا ماضی کے اُن لمحوں میں جا پہنچا جب میں نے پہلی بار لالی کو دیکھا تھا اور جانے اب وہ کیسی ہوگی۔ جانے اب اس کا ساتھی کون ہوگا۔ وہ کس کی محبت کا دم بھرتی ہوگی؛ اِن سوچوں کو اُسی وقت جواب مل سکتا تھا جب ہم منزلیں طے کرتے ہُوئے لالی کے شہر پہنچ جائیں گے۔

لشکر کی پیش قدمی جاری رہی۔

ایک روز مغرب سے آنے والی ہوائیں اپنے ساتھ پھُولوں کی بھینی بھینی مہک بھی لے آئیں۔ یہ خوشبُو اس بات کی غماز تھی کہ ہم تاغانی سرزمین کے قلب تک پہنچ گئے ہیں لیکن اب تک نہ تاغانی فوجیوں سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی تھی اور نہ ہی نگہبانی کے کوئی بُرج اور گاؤں دکھائی دیتے تھے۔

پچھلے چند روز سے میں محسوس کر رہا تھا کہ لونا مارنو مجھ سے پہلوتہی کر رہا ہے اور کترانے لگا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس کے رویّے میں یہ تبدیلی کیوں آ گئی ہے؟ آخر ایک روز میں نے اُس سے پُوچھ ہی لیا: "کیا بات ہے، مارنو۔ تم مجھ سے کچھ دُور دُور رہنے لگے ہو؟"

"تم سچ کہتے ہو سردار سرفروش! دراصل میرا ضمیر مجھے کاٹنے لگا ہے۔ تم نے میری بیٹی کی جان بچائی لیکن میں نے تمھارے ہونے والے بچّے کو قتل کر دیا۔ ضمیر کی یہی ملامت مجھے تمھارا سامنا کرنے سے روکتی ہے۔"

"ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا، مارنو! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرے ساتھ وہی دوستانہ رویّہ روا رکھو گے تو مجھ پر احسان ہوگا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

گزشتہ دو روز سے میرا دِل کچھ گداز ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میرے سر میں مسلسل ہلکا ہلکا درد رہنے لگا تھا جو کبھی کبھی شدت بھی اختیار کر لیتا تھا۔۔۔ اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ ڈاکٹر فریدوں اپنے کمپیوٹر کے توسط سے میری کھوج میں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے پیچھے تلخ یادیں چھوڑ جاؤں۔ اسی لیے میں نے مارنو سے یہ بات چھیڑی تھی تاکہ اگر اُسے مجھ سے کوئی شکایت ہو تو دُور کرتا جاؤں۔

مارنو کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا: "کیا تم مجھے اس زیادتی پر تہِ دل سے معاف کر سکتے ہو سردار سرفروش؟ دراصل سادیہ نے چال ہی ایسی چلی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اپنی بچّی کو دیکھ کر طیش میں آ جاؤں گا اور خادِ اعظم کو قتل کر دُوں گا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اُسے زہر دے چکا ہُوں۔ اس کی شیطانی حرکت سے میں ایک دم اشتعال میں آ گیا اس لیے۔۔۔"

"سب بھُول جاؤ مارنو" میں نے اُس کی قطع کلامی کرتے ہُوئے کہا: "میں نے اُس سے متعلق ہر بات اُس کے ساتھ دفن کر دی ہے۔" میں سمجھ گیا تھا کہ سادیہ اس سلسلے میں اتنی پُریقین کیوں تھی کہ مارنو، خادِ اعظم کو ضرور قتل کر دے گا۔

"اچھی بات ہے سردار سرفروش" وہ بولا اور پھر ایک دم چونکتے ہُوئے کہنے لگا: "وہ دُھول کیسی ہے؟ ہمارے جاسوس واپس آ رہے ہیں یا تاغانی ہیں؟"

میں نے بھی پلٹ کر دیکھا تو دُور مجھے دُھول اُڑتی دکھائی دی۔ کچھ گھُڑسوار تیزی سے ہماری طرف آ رہے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو پتہ چلا کہ وہ ہمارے ہی آدمی ہیں جنھیں خبریں لانے کے لیے لشکر کی روانگی سے پہلے آگے بھیج دیا گیا تھا۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رستم کی طرف بڑھا جو اس وقت لشکر کی رہنمائی کر رہا تھا۔ میرے اس تک پہنچنے سے پہلے جاسوس وہاں پہنچ چکے تھے اور اپنی رُوداد سُنا رہے تھے۔ رستم میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا: "تم تو تاغانیوں کے دیوتا بن چکے ہو، سردار سرفروش! وہ تمھاری پُوجا کرتے ہیں۔ لو۔۔۔ اسے دیکھو!" یہ کہتے ہُوئے اُس نے ایک چھوٹا سا پُتلا میری طرف بڑھا دیا۔

میں یہ پُتلا دیکھ کر دم بخُود رہ گیا۔

زمرد سے تراشا ہُوا یہ ایک ہاتھ لمبا مجسمہ میرا ہم شکل تھا۔ میں نے تعجب سے پُوچھا: "یہ تمھیں کہاں سے ملا۔ کیا یہ لوگ لائے ہیں؟"

"ہاں!" رستم نے کہا اور جاسوسوں کے سرخیل کی طرف متوجہ ہو گیا: "اسے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ تمھیں کہاں سے ملا؟"

"اس سفر کے دوران پہلی بار ہمیں ایک گاؤں نظر آیا تو ہم وہاں پہنچے اور جیسا کہ ہمیں حکم دیا تھا، میں نے ایک آدمی گاؤں بھیج کر تاغانیوں کو پیغام بھجوایا کہ ہم جنگجو بن کر نہیں بلکہ امن کے پیامبر بن کے آئے ہیں اس لیے ہمیں دشمن نہیں مہمان سمجھا جائے۔ اُن لوگوں نے ہمیں اپنے گاؤں میں آنے کی اجازت دے دی۔ جب ہم گاؤں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُس کے مرکزی چوراہے میں تمھارا قدِ آدم مجسمہ نصب تھا۔" جاسوس نے وضاحت کی۔

"اُس گاؤں کے ہر گھر میں اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے مجسّمے تھے سردار سرفروش۔" دُوسرے نے تائید کی۔

"ہم جانتے ہیں کہ تاغانی بہت سے دیوتاؤں کی پُوجا کرتے ہیں۔ اب اُن میں تم بھی شامل ہو گئے ہو۔ جب ہم وہاں سے آنے لگے تو میں نے یہ سوچ کر ایک لڑکی سے یہ مجسمہ مانگ لیا کہ تم اسے دیکھ کر خوش ہو گے۔" سرخیل نے مسکرا کر کہا۔

میں نے تعجب سے اپنے مجسّمے کی طرف دیکھا۔ وہ بے داغ زمرد سے تراشا گیا تھا اور اس میں سے شعاعیں منعکس ہو رہی تھیں۔

"کیا تم نے اُن سے پُوچھا تھا کہ یہ مجسّمے کیوں بنائے گئے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں" جاسُوسوں کا سردار بولا: "یہ تمھاری یاد میں بنائے گئے ہیں۔ ملکہ ہوشی نے اپنی سلطنت کے ہر شہر اور ہر گاؤں کے مرکزی مقامات پر تمھارا قدِ آدم مجسمہ نصب کرنے اور ہر گھر میں ایک چھوٹا مجسمہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔"

میں نے سوچا کہ لالی شاید مجھے آنجہانی سمجھتی ہے۔

ہمارا سفر جاری رہا۔

جب ہم پہلے گاؤں کے قریب پہنچے تو میں خود گاؤں کے چوراہے پر گیا۔ دیہاتی مجھے دیکھ کر سر جھکانے لگے اور بچّے چیختے چلاتے بھاگ اُٹھے۔ مجھے خیال آیا کہ اُن کی مائیں اُنھیں یہ کہہ کر تو نہیں ڈراتی ہوں گی کہ خبردار روئے یا شرارت کی تو سردار سرفروش کے حوالے کر دُوں گی۔

میں نے گاؤں کے مرکزی چوراہے میں اپنے مجسّمے کے سامنے گھوڑا روک لیا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ مجسمہ قدِ آدم نہیں بلکہ دس ہاتھ بلند تھا اور زمرد کی چٹان سے تراشا گیا تھا۔ مجھے یہ مجسمہ بڑا باوقار نظر آیا اور میں اسے دیکھ کر خوش ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے تو کبھی بھُول کر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ لالی مجھے اتنی شدّتوں سے بھی چاہ سکتی ہے۔ اُس کی محبت نے تو مجھے دیوتاؤں کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ مجھے اُس پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔ اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر اس وقت وہ میرے ساتھ ہوتی تو مارے خوشی کے ہم دونوں ہی نہال ہو گئے ہوتے۔

جب میں دوبارہ اپنے لشکر پہنچا تو ایک بار پھر میرے سر درد میں شدت آ گئی۔ میں نے آگے کو جھک کر اپنے آپ کو گرنے سے بچایا اور ڈاکٹر فریدوں کو کوسنے لگا جو شاید مجھے سالمول میں تقسیم کرنے کی غرض سے کمپیوٹر کے ذریعے تلاش کر رہا تھا۔

لشکر حسبِ معمول آگے بڑھتا رہا لیکن ہمیں فصیل پر کوئی نقل و حرکت دکھائی نہ دی۔ تاہم ہر منزل پر ہم نے اپنے آگے آگے دُھوئیں کے بادل ضرور اُٹھتے دیکھے تھے جو ہماری آمد کی نشان دہی کرتے تھے۔ پھر ایک روز ہمیں نگہبانی کے سلسلۂ بُرج کا پہلا بُرج بھی دکھائی دے گیا۔ اس سلسلے کے ہر بُرج پر مختلف رنگوں والے تین اشارہ نما لگے ہوئے تھے جنھیں رسّوں کی مدد سے اُٹھایا یا گرایا جا سکتا تھا۔ ہر بُرج اُونچے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا اور اُسے دُوسرے بُرج سے دیکھا جا سکتا تھا لیکن کسی بُرج پر ہم نے کسی فرد کو ماٹو نہیں پایا۔ بُرج کے محافظ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی جا چکے ہوتے تھے۔

رستم کو اُن کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔

"ہم اُن لوگوں سے مفاہمت کی بات چیت کیسے کر سکتے تھے جو ہمیں دیکھ کر ہماری آمد سے پہلے ہی بھُوتوں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں!" وہ بھڑک کر بول اُٹھا۔

میں اُسے سمجھاتے ہُوئے جواب دیتا: "صبر سے کام لو کمان دار۔ اپنے نمائندے اُن کی طرف بھیجتے رہو۔۔ مگر زیادہ تعداد میں نہیں۔ ایک نہ ایک روز وہ مفاہمت کی بات چیت پر ضرور آمادہ ہو جائیں گے۔"

رستم دس دس آدمیوں کے گروہ بھیجتا جو اپنے نیزوں کے ساتھ سفید بالوں والے گھوڑوں کی دُمیں آویزاں رکھتے تھے۔ یہ سفید

وہیں امن و آشتی اور صلح کی علامت تھیں لیکن رستم کے یہ ایلچی جس بھی گاؤں میں داخل ہوتے تھے، اُسے خالی پاتے تھے اور ناکام ہو کر لوٹ آتے تھے۔ رستم جھنجلا اُٹھتا تھا اور اس خدشے کا اظہار کرتا تھا کہ کہیں ہم اُن کے جال میں نہ پھنس جائیں۔ کہیں وہ اس لیے گاؤں خالی نہ کر جاتے ہوں کہ ہم اُن کے گھیرے میں آئیں اور وہ ہم پر یلغار کردیں۔

اس دَوران بابر نے ایک بار پھر گھڑ سواری سیکھ لی تھی اور وہ ٹانگوں کے بغیر آسانی سے گھوڑے پر سفر کرسکتا تھا۔ ایک روز وہ میرے پاس آیا اور بولا: "سردار سرفروش! مَیں تمھارا آدمی بھی ہوں اور رستم کا بھی... ہم تاغانی سرزمین پر بہت آگے نکل آئے ہیں اور رستم کا خدشہ بجا ہے۔ اگر تاغانیوں نے ہمیں گھیر لیا، تو کیا تم اُن لوگوں کے خلاف لڑو گے جن سے تم مِلنا اور مفاہمت کروانا چاہتے ہو؟"

مجھے بابر کی یہ بات بُری لگی۔ مَیں نے کہا: "کیا مَیں بحری تاغانیوں سے نہیں لڑا تھا۔ کیا مَیں نے اُنھیں تہِ تیغ نہیں کیا تھا؟ کیا مَیں نے اپنی عسکری چال سے فصیل سر نہیں کی تھی؟ اگر اِن باتوں کا جواب اثبات میں ہے تو تمھیں اپنے سوال کا جواب مِل گیا ہو گا۔"

بابر نے اپنی خود اُتارتے اور گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا: "تب تم غلام تھے سردار سرفروش! تمھیں لڑنا ہی تھا... مگر اب تم آزاد اور بہت بڑے عہدے دار ہو۔ تاغانیوں کے دیوتا ہو اور یہی بات مجھے کھٹکتی ہے۔"

"ایسا مت سوچو بابر!" مَیں نے کہا: "اگر تاغانیوں نے ہم پر حملے میں پہل کی تو مَیں آسوریوں کی طرف سے لڑوں گا۔ مَیں نے یہی وعدہ رستم سے کیا تھا اور یہی تم سے بھی کرتا ہُوں لیکن جنگ نہیں ہونی چاہیے، بابر! اگر مجھے تاغانیوں سے بات کرنے کا موقع مِل گیا تو جنگ نہیں ہو گی۔ تم خود ہی بتاؤ، کیا تمھیں جنگ سے نفرت نہیں؟... یا تم جنگ کے حامی ہو؟"

"مجھے جنگ سے نفرت ہے، سردار سرفروش! مَیں اپنی باقی زندگی امن و سکون سے گزارنا چاہتا ہوں لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ جنگ کبھی نہیں ہو گی تو تمھارا خیال غلط ہے۔ جنگیں ہوتی رہتی ہیں اور آیندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ ورنہ نوجوانوں کا وسیلۂ رزق کیا ہو گا۔ کاش! ہمیں روزی کا کوئی اور وسیلہ میسّر آسکے۔"

اس سے پہلے کہ مَیں بابر کو کوئی جواب دیتا، میرے سر میں درد کی ایک اور شدید لہر اُٹھی اور مَیں پسینے سے شرابور ہو گیا۔

جب یہ لہر گزر گئی تو مَیں نے رُومال سے اپنی پیشانی صاف کی۔ ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹر نے مجھے کھوج لیا تھا لیکن اب مَیں تاغانیوں اور آسوریوں کے درمیان معاہدۂ امن کروائے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

بابر نے میری یہ حالت دیکھی تو بولا: "تمھاری طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے سردار سرفروش!"

"نہیں بابر! مَیں کچھ تھک گیا ہوں اور سب کی طرح پریشان بھی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تاغانی سامنے آئیں اور صلح و امن کی بات چیت کریں۔ اُن کا یُوں فرار ہونا اور سامنے نہ آنا میرے لیے سخت کوفت کا باعث بن گیا ہے۔"

دُوسری صبح لشکر کی روانگی کے دو گھنٹے بعد ہم ایک پہاڑی پر چڑھے تو ہمیں نیچے ایک پیالہ نُما وادی نظر آئی۔ اس وادی کے وسط میں ایک تاغانی شہر آباد تھا۔ شہر کے مرکزی چوراہے میں اُن کا پرچم لہرا رہا تھا اور اس پرچم کے قریب ہی میرا مجسمہ نصب تھا۔ شہر کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصرُوف تھے اور مصرُوف ہی رہے۔ اُنھوں نے ہمیں اپنے دروازوں پر دیکھنے کے باوجود ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ رستم نے ہاتھ اُٹھا کر لشکر کو رُکنے کا اشارہ کیا، میرے قریب آیا اور ایک درّے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولا۔

"یہ درّہ دیکھ رہے ہو، سردار سرفروش؟ اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑ ہیں جنھوں نے وادی کو گھیر رکھا ہے۔ ان پہاڑوں کے پیچھے لاکھوں تاغانی چھپ سکتے ہیں اور تم سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا کہ اب ہم پہلے جیسے طاقت ور نہیں رہے۔ پہاڑوں کے طویل سفر، بحری تاغانیوں سے جنگ اور اُس کے بعد پھر طویل سفر نے ہماری طاقت بہت گھٹا دی ہے۔ تم نے روانگی سے پہلے خود ہی مردم شماری کی تھی۔ ہمارے پاس کتنے جنگجو جوان ہیں؟"

"صرف چالیس ہزار جوان ایسے ہیں جو جنگ لڑ سکتے ہیں۔" مَیں نے جواب دیا: "لیکن مجھے کہیں تاغانی لشکر دکھائی نہیں دے رہا۔"

رستم نے ایک بار پھر چاروں طرف پھیلے ہُوئے پہاڑوں کا جائزہ لیا اور فیصلہ کُن انداز میں بولا: "نہیں سردار سرفروش! ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔ ہمارا لشکر یہیں پڑاؤ ڈالے گا۔ اگر تمھارے تاغانیوں کو مفاہمت مقصود ہے تو اُنھیں ہمارے پاس آنا چاہیے۔ مَیں اپنے آدمیوں کو وادی میں نہیں لے جاؤں گا حالانکہ یہ ہمارے

لیے اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی ہے۔ اگر یہ ہمارے قبضے میں ہو تو آسوری یہاں رچ بس سکتے ہیں، جنگ کے علاوہ وسیلۂ رزق تلاش کرسکتے ہیں اور ایک بار پھر طاقت ور بن سکتے ہیں۔" مَیں اس دوران اُس کے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "اگرچہ تم آسوری نہیں ہو کمان دار لیکن تمھاری سوچ آسوریوں جیسی ہی ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ مَیں آسوری نہیں بلکہ کاڈسا ہُوں اور مجھے اپنے کاڈسا ہونے پر فخر ہے لیکن اب آسوری میری قوم ہے۔ مَیں نے اُن کے سربراہ کو قتل کیا ہے اور اُن کی ذمّے داریاں مجھ پر عائد ہوتی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کی مَیں ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"تو پھر ذرا اپنے غصّے پر قابو رکھو۔" مَیں نے اُس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا: "تمھارا خیال ٹھیک تھا۔ یہ پہاڑ اپنے پیچھے بہت کچھ چھپائے ہُوئے ہیں مگر تم جلد بازی میں کوئی اقدام نہیں کرو گے۔ تم صرف اُن سے مفاہمت کی بات چیت کرنے کے لیے مجھے تنہا وادی میں جانے کی اجازت دے دو۔"

دراصل مَیں نے دُور سے آنے والی قرنا کی آواز سُن لی تھی جو پہاڑیوں کے پیچھے پھُونکی جارہی تھی۔ اس لیے مجھے خطرہ تھا کہ کہیں واقعی بات بگڑ نہ جائے۔

رستم کچھ سوچنے لگا... پھر اُس نے بھی میری نگاہوں کا تعاقب کرتے ہُوئے پہاڑوں کی طرف دیکھا جہاں تین اطراف سے تاغانی لشکری نمودار ہو رہے تھے۔

"مَیں نے تمھیں پہلے ہی بتا دیا تھا سردار سرفروش! دیکھو! وہ کتنی بڑی تعداد میں ہیں۔ اگر جنگ ہُوئی تو وہ ہمیں تہس نہس کردیں گے۔" تاغانی لشکریوں کی ان گنت نفری دیکھ کر مَیں سمجھ گیا کہ اُنھوں نے جنگ لڑنے کے لیے جان بوجھ کر اس مقام کا انتخاب کیا ہے اور وہ یہی چاہتے تھے کہ آسوری ایک بار یہاں تک آجائیں تو پھر اُنھیں بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مِل سکے گا۔

ہم اَن گنت تاغانیوں کے نرغے میں آچکے تھے اور ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ اتنے میں ہمیں شہر کی طرف سے ایک گھڑ سوار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

سب کی نگاہیں اُس پر مرتکز ہو گئیں۔

"ابھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کمان دار! سب کو بتا دو کہ وہ سکوُن اور خاموشی سے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہیں۔ میرا خیال ہے کہ مَیں آنے والے کو جانتا ہوں۔ مَیں تنہا اُس سے بات کروں گا۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔" مَیں نے کہا۔

رستم نے میری بات پر عمل کرتے ہُوئے اپنے افسروں کو ضروری ہدایات دے دیں۔

گھڑ سوار نے قریب آکر سفید جھنڈا لہرایا اور اپنے سر سے خود اُتار دی۔ مَیں اُسے پہچان گیا۔ وہ لالی کا سپہ سالار آژدر تھا۔

"مَیں اس شخص کو جانتا ہُوں۔ یہ ملکہ ہوشی کا سورما ہے۔" مَیں نے رستم سے کہا۔

"جاؤ۔ اُس سے بات کرو... مگر بات کرکے فوراً واپس آجانا اور تم نے مجھ سے جو قول دیا ہے، اُسے پُورا کرنا۔"

"قولِ مرداں جان دارد کمان دار۔ مَیں ضرور آؤں گا۔" مَیں نے جواب دیا اور اپنا گھوڑا درّے کی طرف دوڑا دیا، جہاں آژدر کھڑا تھا۔

اُس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر مسرّت سے ہاتھ ہلایا اور جب مَیں قریب پہنچا تو وہ بولا۔

"خوش آمدید سردار سرفروش! ہم تو سمجھے تھے کہ تم مر چکے ہو لیکن کچھ عرصہ پہلے ہمارے ایک جاسوس نے تمھیں دیکھا اور آکر بتایا کہ جس آدمی کے مجسّمے ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایستادہ ہیں، وہ تو آسوری لشکر کے ساتھ آرہا ہے۔"

"مَیں نے اپنے مجسّمے دیکھے ہیں آژدر!" مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا: "کیا یہ واقعی ملکہ ہوشی کے حکم پر نصب کیے گئے ہیں؟"

"ہاں... تم آسوریوں کے ہاتھوں گرفتار ہُوئے تو دُنیا کی ساری خوشیاں اُس سے رُوٹھ گئیں۔ حد تو یہ ہے کہ مَیں نے آسوریوں کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا جو یہ شاندار منصُوبہ بنایا ہے، اُس سے بھی ملکہ کو کوئی خوشی نہیں ہُوئی۔ میرا خیال ہے، اگر ہمارے جاسوس تمھیں ہمارا پیغام نہ پہنچاتے تو تم اُنھیں یہاں نہ لاتے اور آسوری لشکر اتنی آسانی سے ہمارے جال میں ہرگز نہ پھنستا۔"

"مجھے تمھارا کوئی پیغام نہیں مِلا، آژدر! مَیں ہی اُنھیں یہاں لایا ہوں... مگر جنگ کے لیے نہیں بلکہ معاہدۂ امن کرنے کے لیے۔"

... اور پھر مَیں نے مختصراً ساری باتیں اُسے بتا دیں۔

"کیا تمھیں یقین ہے کہ اگر معاہدۂ امن ہو گیا تو رستم اس پر عمل کرے گا؟" آژدر نے پوچھا۔

"ہاں۔" مَیں نے کہا: "جس طرح مجھے اِس بات کا یقین ہے، اُسی طرح تمھیں اور ملکہ کو بھی کرنا چاہیے اور کرنا ہی پڑے گا۔"

"تم تو اُس منصُوبے کو ہی گاؤ خُرد کر دینا چاہتے ہو، سردار سرفروش جو مَیں نے اور ملکہ ہوشی نے بنایا ہے۔ ہم نے ایک آسوری قیدی کو جان بوجھ کر یہ موقع دیا تھا کہ وہ ہمارے خفیہ اجلاس کی باتیں سُنے۔

اس جلسے میں ہم نے جھوٹ موٹ رونا رویا تھا کہ ہمارے پاس اتنا لشکر نہیں ہے جو مشرق میں فصیل کی حفاظت کر سکے۔ ہم نے دیوار کے اختتام پر رہنے والے تاغانیوں کو کمزور اور بزدل کہا تھا اور پھر اس آسوری کو فرار ہو جانے کا موقع دیا تاکہ وہ خادِ اعظم تبور کو یہ باتیں بتا کر اسے یہاں آنے پر اکسائے۔ ہماری اس چال کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ آج جب آسوری وہاں آ چکے ہیں جہاں سے کوئی زندہ بچ کر نہیں جا سکتا تو تم کہتے ہو کہ ہم صلح اور امن کا معاہدہ کر لیں۔"

آژدر کے اس انکشاف پر مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کا تو یہی مطلب تھا کہ خادِ اعظم نے دیوتا اوبلی کی بشارت کا محض ڈھونگ رچایا تھا ورنہ یہ باتیں اسے معزز قیدی سے معلوم ہوئی تھیں اور وہ ملکہ ہوشی اور آژدر کی چال میں آ گیا تھا... مگر اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم لوگوں نے بڑا اچھا منصوبہ بنایا اور خادِ اعظم تمہاری چال میں بھی آ گیا تھا لیکن اب اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اپنی جان کی بازی لگا کر رستم کو یہاں لایا ہوں۔ اگر معاہدۂ امن نہ ہوا اور جنگ ناگزیر ہو گئی تو میں آسوریوں کی طرف سے لڑوں گا۔ اب تم خود ہی فیصلہ کرو کہ جنگ لڑو گے یا معاہدۂ امن کو ترجیح دو گے؟"

"اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا، سردار سرفروش!" وہ بولا۔ "یہ اختیار صرف ملکہ کو حاصل ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسی شہر میں ہے۔" آژدر نے وادی میں واقع شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "جونہی اسے یہ معلوم ہوا کہ تم زندہ و سلامت ہو اور آسوریوں کے ساتھ ادھر آ رہے ہو، اس کی بے تابی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ آؤ، میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں۔"

"ذرا رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا گھوڑا موڑا اور رستم کی طرف چل پڑا۔

یہ سن کر میرے دل کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی کہ لالی یہیں موجود ہے۔ مجھے اس کی سبز آنکھیں یاد آ گئی تھیں جن میں ڈوبنے کے بعد نکلنا محال تھا۔ مجھے اس کا خوبصورت، ترشا ترشا یا سراپا یاد آ گیا جس کی رنگت پرانے ہاتھی دانت جیسی تھی۔ مجھے اس کے ہونٹ یاد آ گئے، جو گلاب تھے لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے معاہدۂ امن کروانا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ معاہدہ امن سے پہلے ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے سالموں میں اور ان سالموں کو غیر مرئی لہروں میں تبدیل کر کے اپنے دور میں منتقل کر لے۔

جب میں نے رستم کو حقیقت سے آگاہ کیا اور ملکہ ہوشی سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بولا۔

"اتنا خیال رکھنا سردار سرفروش کہ صلح کی شرائط ایسی نہ ہوں جن سے آسوری قوم کا وقار اور عزتِ نفس مجروح ہو۔ اگر ہمیں لڑنا پڑا تو ہم ہتھیار ڈالنے کی بجائے بہادروں کی موت مرنے کو زیادہ ترجیح دیں گے۔"

جب میں وہاں سے چلا تو بابر اور لوبنا مارنو میری کامیابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

میں آژدر کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا ہوا شہر میں داخل ہوا تو ایک بار پھر میرے سر میں درد کی شدید لہریں اٹھنے لگیں۔

میں بے ساختہ کہہ اٹھا۔ "نہیں، ڈاکٹر فریدوں... ابھی نہیں۔"

میری اس خود کلامی پر آژدر نے تعجب سے میری طرف دیکھا... مگر میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے شہر کے سب سے اچھے مکان کے سامنے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور بولا۔

"ملکہ اسی مکان میں آپ کی منتظر ہے، سردار سرفروش!"

بہت سے تاغانی محافظ اس مکان کی حفاظت پر مامور تھے۔ میں گھوڑے سے اتر کر مکان میں داخل ہوا تو محافظ میرے جسم پر آسوریوں کا لباس دیکھ کر متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن وہ اپنے نیزوں کے اشارے سے میری رہنمائی کرتے رہے۔ میں دو راہ داریوں سے گزرنے کے بعد ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا اور اسے کھول کر اندر قدم رکھا تو ٹھٹک گیا۔

سامنے لالی گول بستر پر نیم دراز تھی۔ اگرچہ اسی کے چہرے پر حزن بکھرا ہوا تھا... مگر وہ مجھے پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی اور اپنی بانہیں وا کرتے ہوئے بولی۔

"اوہ سرفروش تم آ گئے۔ اب مجھے کسی اور چیز کی تمنا نہیں رہی۔ اب مجھ سے دور نہ جانا سرفروش!"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا بس چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس کی سبز گہری آنکھوں میں میرے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے، سرفروش؟"

میں نے اس کے قریب رکھا ہوا اپنا چھوٹا سا مجسمہ اٹھا لیا اور کہا۔ "تم نے تو جیتے جی مجھے دیوتا بنا دیا، لالی۔"

"میں سمجھتی تھی کہ تم مر گئے ہو... مگر تم میرے دل میں زندہ تھے۔ میری آنکھیں بھی تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے میں

نے تمہارے مجسمے بنوا لیے۔ اب اسے رکھ دو کہ یہ باعثِ تسکینِ قلب نہیں رہا۔ تم خود جو آ گئے ہو۔ میرے پاس بیٹھو نا۔"

"بیٹھنے سے پہلے مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں لالی۔"

"تو کرتے کیوں نہیں۔ وہ کون سی باتیں ہیں جو تمہیں وصال سے بھی زیادہ عزیز ہیں؟"

اس پر میں نے اسے جلدی جلدی ساری باتیں بتا دیں۔ اس نے فوراً آژدر کو بلوایا، چمڑا، قلم اور دوات منگوائی... پھر اس کی موجودگی میں معاہدۂ امن پر دستخط کرتے ہوئے بولی۔ "اسے رستم کے پاس لے جاؤ۔ اسے کہو کہ وہ اپنے بارہ آدمی ساتھ لائے۔ جو معاہدۂ امن کی شرائط طے کریں گے۔ میری طرف سے تمہیں کلی اختیار ہے۔ اگر آسوری اس وادی میں لینا چاہتے ہیں تو یہ شہر اور علاقہ انہیں دے دینا اور اب... جب تک میں خود نہ بلاؤں میرے پاس نہ تو تم آنا اور نہ ہی کوئی اور آئے... بس اب چلے جاؤ۔"

آژدر معاہدۂ امن لے کر وہاں سے چلا گیا۔ لالی نے ایک بار پھر اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

"آؤ سرفروش! میں تمہارے لیے بہت تڑپی اور بہت ہی ترسی ہوں۔ یہ پتلا رکھ دو اور میرے قریب آ جاؤ۔"

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ مجسمہ ابھی میں رکھنے بھی نہیں پایا تھا کہ میرے سر میں درد کی انتہائی شدید لہر اٹھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی آدم خور شیر نے میرے دماغ میں اپنا خونیں پنجہ گاڑ دیا ہو... اور پھر میں لالی کے قریب گر گیا۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اس وقت لالی "کیا ہوا سرفروش! تمہیں کیا ہوا ہے؟" کہہ رہی تھی۔ وہ میرا سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور میں تڑپ رہا تھا۔

... پھر مجھے ایسے لگا جیسے میں سکڑ رہا ہوں، سمٹ کر چھوٹا ہوتا جا رہا ہوں۔ پہلے مارنو... پھر بالشتیا اور اس کے بعد انگوٹھے جتنا ہو گیا... تب ایک دھماکا سا ہوا اور میں لالی کی سبز آنکھوں میں ڈوب گیا۔

گہرائی بڑھتی چلی گئی، اتھاہ ہوتی گئی اور میں اس سبز رنگ گہرائی میں غرق ہوتا چلا گیا... پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک ابلتے ہوئے فوارے میں آ گرا ہوں، اس کے پانی میں بہتا ہوا ایک نالی سے گزر رہا ہوں۔ نالی میں پانی کی رفتار تیز ہے اور ہر ساعت تیز تر ہوتی جا رہی ہے... اور ہر طرف سے ایک آواز گونج رہی ہے... سرفروش... سرفروش... سر... فر... و... ش..."

آواز غائب ہوئی تو میں بھی غائب ہو گیا۔

میں کئی ہفتوں سے ساحلی ہٹ میں مسلسل آرام کر رہا تھا... مگر مسلسل بے آرام تھا۔

جب آدمی کا اپنا دل ہی دشمن ہو جائے تو پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کا بستر بن جاتی ہے۔ میرا دل بھی میرا دشمن بن گیا تھا۔ یادوں کی یلغاروں نے میری پلکوں سے نیندیں نوچ لی تھیں اور دھڑکنیں تھیں کہ لالہ کو پکارے جاتی تھیں، جو مجھ سے روٹھ گئی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بے کراں اور بے نظیر دنیا میں لاتعداد چاند چہرے اور ان گنت دہکتے مہکتے جسم ہیں جن میں سے بعض نے اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ مجھے چاہا تھا اور مجھ کو اب بھی مجھے محبتیں بخش سکتے تھے مگر اس کا کیا علاج کہ دل اسی دشمنِ جاں لالہ کا طالب تھا جس نے درد کی سوغات دے کر مجھ سے منہ پھیر لیا تھا۔

وہ مجھ سے چھپی چھپی پھرتی تھی۔ میں اس کے گھر جاتا تو کہلوا دیتی کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ میں اسے فون کرتا تو جواب ملتا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔

اس کی بے التفاتی روز بروز میرے دل میں اتر گئی تھی۔

وہ مجھ سے شادی کرنا اور مجھ ایک ایسا شوہر دیکھنا چاہتی تھی جسے اپنی بیوی کے سوا دنیا میں کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ، یہ بھی جاننے کی آرزو مند تھی کہ میں اچانک ہی کہاں غائب ہو جاتا ہوں اور جب مہینوں بعد لوٹتا ہوں تو میرے جسم پر زخموں کے نئے نشانات کیوں ہوتے ہیں اور میں عالمِ خواب میں کن عورتوں کو پکارتا ہوں؟

میں اسے یہ ساری باتیں کیسے بتا سکتا تھا۔ اس پر یہ راز کیسے ظاہر کر سکتا تھا کہ میری غیر حاضری کا سبب ماضی کا سفر ہوتا ہے۔ ان تاریک زمانوں کا سفر جن پر تاریخ بھی بھرپور روشنی نہیں ڈال سکتی۔

بالفرض محال میں لالہ کو بتا بھی دیتا کہ ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے ماضی کی ان سرزمینوں پر منتقل کر دیتا ہے جن کی تہذیبیں مر چکی ہیں اور میرے جسم کے زخم انہی مردہ تہذیبوں کے درمیان جہد کی نشانیاں ہیں تو وہ کیسے یقین کر لیتی کہ بہتے ہوئے لمحوں پر کمند بھی ڈالی جا سکتی ہے اور وہ واقعات جنہیں تاریخ اپنے دامن میں نہیں سمیٹ سکی میری یادداشت میں اپنے آپ کیسے سمٹ جاتے ہیں؟

میں اسے یہ سب کچھ نہیں بتا سکتا تھا، اس لیے وہ مجھ سے روٹھ گئی تھی اور آقا بیدار بخت سے شادی کرنے والی تھی جو قالینوں

کا بہت بڑا تاجر تھا جس کے یورپ اور امریکا میں کئی کئی شوروم اور ان گنت دفاتر تھے۔ آج ہی لالہ کی ایک سہیلی گوگوش فرخی نے مجھے یہ خبر سنائی تھی کہ کل اُس کی منگنی ہونے والی ہے۔ وہ بڑی دیر تک مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتی رہی اور پھر یہ کہتی ہوئی رخصت ہوگئی کہ میں خود کو تنہا نہ سمجھوں۔ میرے ایک اشارے پر وہ خود بھی لالہ بن سکتی ہے۔

گوگوش چلی گئی مگر میں لالہ کی یادوں کے حصار سے نہ نکل سکا۔ میرا جی چاہا کہ جاؤں اور اُسے بتادوں کہ مجھے کن مجبوریوں نے چُپ کا زہر پلا دیا ہے۔ میں اپنی کتابِ زیست اُس کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ وہ اُسے ورق ورق پڑھتی جائے اور اُسے پتہ چلتا جائے کہ دُنیا اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود کتنی خود غرض اور کتنی گھٹیا ہے۔ لوگ دوستی کے رُوپ میں دشمنی کس طرح کرتے ہیں اور اُن کی خود غرضیوں کے دائرے کتنے وسیع ہوتے ہیں۔

میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا مگر مجھے قتل کی ایک واردات میں ملوث کر دیا گیا... اور میں جو مارشل آرٹس کا انسٹرکٹر تھا، لوگوں اور قانون کی نگاہوں میں قاتل بن کر رہ گیا۔ ناکردہ گناہی کی سزا میں مجھے پھانسی پر چڑھایا جاتا تھا کہ گاڑیوں کے تصادم نے مجھے موت کے مُنہ سے بچا لیا۔ میں وہاں سے بھاگ اُٹھا لیکن تقدیر نے مجھے ڈاکٹر فریدوں کا "آزاد زندانی" بنا دیا۔ اب وہ جب چاہتا ہے مجھے گُزرے زمانوں کی اندھیری بھول بھلیوں میں دھکیل دیتا ہے اور جب چاہتا ہے مجھے اسی "جیٹ ایج" میں واپس بُلا لیتا ہے۔ اُس نے مجھے سکس ملین ڈالرز مین جیسی غیر معمولی اور غیر فطری طاقت اور صلاحیت تو نہیں بخشی لیکن میرے جسم میں اسپرین کی ٹکیہ جتنا ایک بم ضرور لگا دیا ہے جو ہلاکت خیزی میں ایٹم بم سے کم نہیں۔

اُس نے کسی آپریشن کے بغیر ہی میری ذہنی استعداد اتنی بڑھا دی ہے کہ اب مجھے کوئی بات یاد رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر بات اپنے آپ ہی میری یادداشت کے نہاں خانوں میں جمع ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ جب چاہتا ہے ان باتوں کو میری یادداشت سے برآمد کر لیتا ہے۔ اس صُورتِ حال میں جب میری حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہی، میں ایک آئیڈیل شوہر کیسے بن سکتا ہوں؟

میں سوچ کی اُنھی گھمن گھیریوں میں گھرا ہُوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا تو دُوسری طرف سے ڈاکٹر فریدوں بول رہا تھا۔

"ہیلو سرفروش! کیسے ہو؟" آواز میں تشویش شامل تھی۔

"بالکل ٹھیک ہُوں جناب!" میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہُوئے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے بالکل ٹھیک ہُو نا؟" اُدھر سے پُوچھا گیا۔

مجھے ڈاکٹر فریدوں کا یہ اندازِ استفسار کچھ عجیب سا لگا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکا: "بالکل ٹھیک سے کیا مُراد ہے آپ کی؟"

"بھئی وہ... تمھاری آواز کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔"

"نہیں جناب۔ میری آواز بھی بالکل ٹھیک ہے۔"

"شاید اسی لیے بدلی بدلی سی لگ رہی ہے کہ تم سے بات کیے بہت دن ہو گئے ہیں۔"

"بہت دن!" میں نے تعجب سے دُہرایا: "چار روز پہلے ہی تو بات ہُوئی تھی آپ سے۔"

"ہاں۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو اور کوئی گڑ بڑ بھی نہیں ہُوئی۔" اس بار ڈاکٹر کی آواز سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"کیسی گڑبڑ آقائے فریدوں؟" میں نے پوچھا۔

اُس سوال کے جواب میں خاموشی چھا گئی اور مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے ڈاکٹر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر قریب کھڑے کسی شخص سے بات کر رہا ہے۔ پھر آواز آئی: "یہ مت پوچھو اور فوراً یہاں آجاؤ۔"

ڈاکٹر فریدوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں اُلجھن میں پڑ گیا کہ ایسی کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے جس نے ڈاکٹر کو تشویش میں مُبتلا کر دیا ہے

جب میں ڈاکٹر فریدوں کے کمرے میں داخل ہُوا تو سیکورٹی کا سربراہ رضا آفندی بھی وہاں موجود تھا۔ علیک سلیک کے بعد ڈاکٹر فریدوں نے مسکراتے ہُوئے میری طرف دیکھا اور رضا آفندی سے پُوچھا۔

"کیا وہ سرفروش کا ہم شکل ہو گا؟"

"صد فی صد" رضا آفندی نے جواب دیا: "وہ شکل و صورت، چال ڈھال اور عادات و اطوار میں بالکل سرفروش جیسا ہی ہو گا۔"

"مگر کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھارا ڈپلی کیٹ" رضا آفندی بولا: "اگر اُسے تمھارے ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو تم خود بھی شک میں پڑ جاؤ گے کہ اصلی سرفروش تم ہو یا وہ ہے۔"

"یہ کیا چکر ہے، کچھ مجھے بھی تو بتایئے۔" میں نے دونوں کی طرف تعجب سے دیکھتے ہُوئے پُوچھا۔

"ہماری سیکرٹ سروس نے اطلاع دی ہے کہ ہمارے ایک دُشمن ملک نے تمھارا ڈپلی کیٹ یہاں بھیج دیا ہے اور اُسے وہاں سے چلے تقریباً دو ہفتے گزر چکے ہیں۔"

"مگر میرا ڈپلی کیٹ کیوں بھیجا گیا ہے؟"

"اس کی وضاحت تو آفندی ہی کر سکتا ہے۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا اور اپنا پائپ بھرنے لگا۔

سیکورٹی کے چیف نے چند لمحوں تک گہری نگاہ سے میری طرف دیکھا.. پھر گہری متانت سے بولا: "یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ہر ملک میں انٹیلی جنس اور سیکرٹ سروس ڈپارٹمنٹ ہوتے ہیں لیکن ایک خاص محکمہ ہر اُس ملک کی اہم شخصیات کے ڈپلی کیٹ تیار رکھتا ہے، جہاں اُسے جاسُوسی کرنا مقصُود ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رُوس میں یہ محکمہ ٹوئن کہلاتا ہے، جرمنی میں ڈوپل گینگر اور برطانیہ میں جیمنی کوڈ۔" اتنا کہہ کر رضا آفندی دَم لینے کے لیے رُکا۔

میں نے فوراً یہ سوال داغ دیا: "جاسُوسی تو ویسے بھی کی جا سکتی ہے۔ سی۔ آئی۔ اے کے افراد دُنیا کے تقریباً ہر ملک میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہُوئے ہیں، پھر ڈپلی کیٹ تیار کرنے کا خصوصی مقصد کیا ہے؟"

"جہاں جاسُوسی تنظیموں کے نمایندے کسی خاص منصُوبے کا کھوج لگانے میں ناکام ہو جاتے ہیں، وہاں ڈپلی کیٹ استعمال کیے جاتے ہیں۔" رضا آفندی نے وضاحت کی: "بعض اوقات ان ڈپلی کیٹس کو سالہا سال تربیت دی جاتی ہے مگر اُن سے کام لینے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہ ڈپلی کیٹ اصل شخصیتوں سے صد فی صد مشابہت رکھتے ہیں۔ انھیں اصل شخصیتوں کے حالاتِ زندگی اور ان کی تمام تر سرگرمیوں سے بھی پُوری طرح باخبر رکھا جاتا ہے اور جب انھیں کسی مشن پر بھیجا جاتا ہے تو وہ مشن اُنھیں ہر قیمت پر پُورا کرنا پڑتا ہے ورنہ ناکامی کی صُورت میں انھیں خود اپنے ہی آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں اس لیے یہ ڈپلی کیٹ جب کسی خطرناک صُورتِ حال سے دوچار ہو جاتے ہیں تو اس ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر ہنستے ہنستے موت کو گلے لگا لیتے ہیں، جہاں انھیں بھیجا جاتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب!... لیکن میرا ڈپلی کیٹ کیوں بھیجا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تفصیل تو اُسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب نقلی سرفروش زندہ و سلامت گرفتار کر لیا جائے لیکن اُس کی آمد سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے دُشمنوں کو ڈاکٹر فریدوں کے منصُوبے اور اُس میں تمھارے کردار کا کسی حد تک علم ہو چکا ہے۔ اُس کے نمایندے پُوری طرح اس منصُوبے اور اُس میں تمھاری اہمیت کا کھوج نہیں لگا سکے۔ اس لیے اُنھوں نے تمھارا ڈپلی کیٹ یہاں بھیج دیا ہے تاکہ تمھیں راستے سے ہٹانے کے بعد وہ تمھاری جگہ لے کر حقیقتِ حال معلوم کر سکے۔"

رضا آفندی کی بات ختم ہوتے ہی ڈاکٹر فریدوں بول اُٹھا۔ "اسی لیے میں نے یہ پُوچھنے پر اصرار کیا تھا کہ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ میں خوف زدہ تھا کہ کہیں اُس ڈپلی کیٹ نے تمھاری جگہ نہ لے لی ہو۔"

اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

"میرے لیے کیا ہدایات ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تمھاری ہٹ کے اردگرد سیکورٹی کے جوان متعین کر دیے گئے ہیں۔" رضا آفندی بولا: "اوّل تو تم اگلی ہدایات تک کہیں آؤ جاؤ ہی نہیں اور اگر آنا جانا ناگزیر ہو تو پھر چار محافظ تمھارے ساتھ ساتھ رہیں گے۔"

"یہ پابندی کب تک رہے گی؟" میں نے پوچھا۔

"کل تک۔" رضا آفندی کی بجائے ڈاکٹر فریدوں بولا: "میں نے کمپیوٹر سیٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر جلد از جلد تمھیں ماضی میں بھیج دُوں تاکہ تمھارا ڈپلی کیٹ تمھاری جگہ نہ لے سکے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اُس نئی مصیبت کا سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ اب یہ سرزمین بھی میرے لیے محفوظ نہیں رہی۔ گویا میں پُوری دُنیا میں واحد آدمی تھا جس کے لیے پُوری کائنات میں خطرے ہی خطرے بکھرے ہُوئے تھے۔

واپسی پر سیکورٹی گارڈ کے چار جوان میرے ساتھ تھے۔

مجھے اپنی ہٹ میں آئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہُوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر چیخنے لگی۔

میں نے ریسیور اُٹھایا تو دُوسری طرف سے لالہ کی آواز سنائی دی۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

"سرفروش... یہ تم ہو نا؟" اس نے ہانپتی ہُوئی آواز میں کہا۔

"ہاں لالہ... مگر تم رو کیوں رہی ہو؟" اس کی سسکیوں نے میرے دل میں درد بھر دیا تھا: "خُدا کے لیے جلدی بتاؤ لالہ... کیا بات ہے؟"

"میں تم سے ملنا چاہتی ہُوں سرفروش۔" اُس نے زخمی ہُوئی آواز میں کہا۔

"میں تو خود تمھاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں... مگر تم خود ہی مجھ سے اجتناب برتتی رہی ہو۔ گھر میں ہوتی تھیں

تو کہلوا دیتی تھیں کہ کہیں گئی ہوئی ہو۔ اب جلدی سے آجاؤ۔ میں تمھارا منتظر ہوں۔" میرے لہجے میں خود بخود التجا سی پیدا ہو گئی۔

"میں نہیں آسکتی، سرفروش۔" وہ رو پڑی۔ "تمھیں آنا پڑے گا۔ ابھی اور اسی وقت میرے گھر آجاؤ۔"

"مگر میرا آنا مشکل ہے۔ میں مجبور ہوں۔"

"نہیں نہیں، سرفروش! خدا کے لیے فوراً آجاؤ۔ یہ میری تم سے آخری التجا ہے۔ اگر تم نہ آئے تو تمھیں میری لاش پر آنسو بہانا پڑیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

میں تڑپ اٹھا اور سوچنے لگا کہ نہ جانے اس نے اپنے دل میں کیا سوچ رکھا ہے۔ کہیں اس نے خودکشی کا ارادہ تو نہیں کر لیا؟ ہو سکتا ہے، اس نے مجھے اشتعال دلانے کے لیے بیدار بخت سے شادی کرنے کا ڈھونگ رچایا ہو اور اب پچھتا رہی ہو... اور اس تاجر سے پیچھا چھڑانے کے لیے خودکشی کرنا چاہتی ہو۔ پھر کل ہی مجھے کمپیوٹر ماضی کی کسی اجنبی سرزمین پر بھیجنے والا ہے۔ اگر میں وہاں سے واپس نہ آسکا، اور اگر مجھے مُردہ تہذیب کے نیم وحشی انسانوں نے موت سے ہمکنار کر دیا تو لالہ کو آخری بار دیکھنے اور اس سے آخری بار ملنے کی حسرت بھی دل ہی میں رہ جائے گی۔

"اچھی بات ہے، لالہ۔ میں آرہا ہوں۔" میں نے بالآخر ہامی بھرلی۔

جواب میں مجھے لالہ کے زور سے رونے کی آواز سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے جب میں اپنے چار سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ لالہ کے گھر پہنچا تو وہ ٹیرس پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اپنے محافظوں کو گاڑی میں انتظار کرنے کا کہہ کر اوپر چلا گیا۔

لالہ کے کمرے سے اس کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ مجھے آتے دیکھ کر ٹیرس سے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی اور اب بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔ میں دیوانہ وار کمرے میں داخل ہوا اور اس کی طرف لپکا۔ عین اسی وقت مجھے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔

پانچ آدمی، جنھوں نے اپنے چہرے نقابوں سے چھپا رکھے تھے، سائلینسر لگے ریوالور میری اور لالہ کی طرف تانے کھڑے تھے۔ ساتھ ہی میری نظر دروازے کے پیچھے لالہ کی ماں، اس کے باپ، دو چھوٹی بہنوں اور اکلوتے بھائی پر جا پڑی جنھیں باندھ کر فرش پر ڈال دیا گیا تھا اور ان کے منہ پر ٹیپ چسپاں کر دی گئی تھی۔

ان نقاب پوشوں میں سے ایک بولا۔ "ہاتھ اٹھا لو آقائے سرفروش... اور یاد رکھو کہ تمھاری ذرا سی بھی جنبش نہ صرف تمھیں ختم کر دے گی بلکہ ان سب کی بھی موت بن جائے گی۔"

میرے لیے اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چار نقاب پوش میرے قریب آگئے اور انھوں نے مجھے زد میں لے لیا۔

وہی نقاب پوش پھر بولا۔ "دوسرے کمرے میں چلو۔"

میں ہاتھ اٹھائے دوسرے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب ان میں سے ایک آدمی میرے آگے الٹے قدموں چل رہا تھا اور باقی تینوں نے مجھے اسی طرح زد میں لے رکھا تھا۔

مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر درمیانی دروازہ بند کر دیا گیا۔ اتنے میں باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر آیا جسے دیکھتے ہی میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آنے والا میرا ڈپلی کیٹ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔ مجھ میں اور اس شخص میں بال برابر بھی فرق نہیں تھا۔ البتہ اس وقت ہمارے لباس ضرور مختلف تھے لیکن اس نے جو لباس اور کوٹ پہن رکھا تھا بالکل ویسا ہی لباس اور کوٹ میری ہٹ کی الماری میں بھی لٹکا ہوا تھا۔

میرے ڈپلی کیٹ نے میرے ہی لب و لہجے میں کہا۔ "حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو دوست! ہم ایک دوسرے کے ہمزاد ہیں۔"

"لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر میں نے تمھاری محبوبہ اور اس کے عزیزوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو تم نے کیا ہے۔"

"تم بھی اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ایسا ہی کرتے ہو گے دوست... خیر، میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ اگر تم اپنی اور ان لوگوں کی سلامتی چاہتے ہو تو چپ چاپ وہی کیے جاؤ جو تمھیں کہا جاتا ہے۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں عزیز ہمزاد۔" میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "لیکن یہ یاد رکھنا کہ میرے ہاتھوں انجام کو پہنچ کر تمھاری روح تک کانپ جائے گی۔"

میرے ڈپلی کیٹ نے خاموشی سے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ میری پشت پر باندھ دیے۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ چار ریوالور بدست افراد میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ میرا ہمزاد اپنا

ہم پلہ ہی نظر آرہا تھا۔ لیکن اس سے نمٹنا بھی مشکل نہیں تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ لانا، اس کے والدین اور اس کے بھائی بہن ہلاک کر دیے جاتے اور ان کا خون میری گردن پر رہتا۔

میرے ہاتھ پاؤں باندھنے کے بعد میرے ڈپلی کیٹ نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا جس میں ایک بڑی سرنج اور کسی محلول کا ایمپول رکھا تھا۔ ایمپول میں سیاہ رنگ کا محلول تھا۔ اس نے سرنج میں وہ محلول بھر لیا... پھر سرنج کی نوک مجھے اپنے بازو میں اُترتی محسوس ہوئی۔

"ڈرو نہیں سرفروش۔ یہ زہر کا انجکشن نہیں ہے۔ اگر تمھیں مارنا مقصود ہوتا تو یہ ریوالور ہی کافی تھے۔ یہ صرف بے ہوشی کا انجکشن ہے۔" میرا ہمزاد بولا۔

... اور پھر چند ہی لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تاریک خلا میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔

◘

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک میز پر دراز پایا۔ میرے ہاتھ پاؤں چمڑے کے تسموں سے میز کے ساتھ جکڑ دیے گئے تھے۔ میں نے سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔

یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جس کے بیچوں بیچ یہ میز پڑی ہوئی تھی۔ میرے سامنے کی دیوار میں ایک چھوٹی سی بیضوی کھڑکی تھی جس سے بڑے بڑے پتوں والے کسی درخت کی ایک شاخ نظر آرہی تھی۔ کھڑکی سے کچھ پرے ایک بند دروازہ تھا۔ جس کے ساتھ اسٹول پر بیٹھا ہوا ایک نقاب پوش محافظ اونگھ رہا تھا۔

میں نے کھڑکی سے جھانکنے والی درخت کی شاخ کے بڑے بڑے پتے گننے شروع کر دیے تاکہ یہ اندازہ کر سکوں کہ پوری طرح ہوش میں ہوں یا نہیں۔ ہر بار پتوں کی ایک ہی تعداد نے مجھے بتا دیا کہ میں پوری طرح ہوش میں آچکا ہوں۔

اگرچہ یہاں سے فرار ناممکن محسوس ہو رہا تھا لیکن ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے ڈاکٹر فریدوں نے میرے جسم میں اسپرین کی ٹکیہ جتنا جوہم اسٹور کر دیا تھا، میں اُسے آسانی سے استعمال کر سکتا تھا مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ میں دشمنوں کو ملیامیٹ کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی فنا ہو جاتا... پھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دشمنوں کی تعداد کتنی ہے۔

یہ باتیں سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں ایک بار پھر بے سُدھ ہو گیا۔

جب میں دوبارہ جاگا تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ مجھ پر چار تیز روشنیاں ڈالی جا رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے نشہ آور دواؤں سے مسلسل نیم بے ہوش رکھا جا رہا ہے اور مجھ پر وہ دوا بھی آزمائی جا رہی ہے جس کے زیرِ اثر مجھ سے ہر وہ بات اگلوائی جا سکے جو میں جانتا ہوں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر فریدوں نے میری ماقی استعداد بہت بڑھا دی ہے اور میں نشہ آور ادویات سے بہت کم متاثر ہوتا ہوں۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو بے ہوش ظاہر کرنا ہی بہتر سمجھا کہ اس طرح میں اُن کے سوالات سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

دفعتاً مجھے دروازہ کھلنے کی آواز سُنائی دی۔

میں نے خیرہ کُن روشنی کی وجہ سے آنکھیں تو بند کر ہی رکھی تھیں۔

اب بالکل ہی بے ہوش بن گیا۔

چند لمحوں کے بعد کچھ لوگ میز کے قریب آئے اور اُن میں سے ایک نے میرے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ غالباً ڈاکٹر تھا۔ میری دھڑکنوں کا جائزہ لینے کے بعد اُس نے کہا...

"اس شخص کی صحت حیرت انگیز حد تک بہت اچھی ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے میرے اَنگ اَنگ کی پیمائش لی۔ میرے جسم پر لگے ہوئے زخموں کے نشانات ناپے اور ان کی تفصیل لکھی جاتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ اس کارروائی کے بعد وہ مجھے پھر نشے کا انجکشن دیں گے... مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا اور چلے گئے تب نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

صبح کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہاں دو آدمی موجود تھے۔ ایک آدمی نے ناشتے کی ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ اور دُوسرا ریوالور لیے ہوئے تھا۔ ناشتے کی ٹرے میرے پہلو میں رکھنے کے بعد اُس آدمی نے میرا دایاں ہاتھ آزاد کر دیا اور میں ناشتہ کرنے لگا۔

اس دوران میں، وہ دونوں خاموش رہے۔ جب میں ناشتہ ختم کر چکا تو میرا ہاتھ پھر جکڑ دیا گیا اور وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھُلا اور ایک دراز قد آدمی کمرے میں داخل ہُوا۔ وہ بہترین سُوٹ میں ملبوس تھا لیکن چہرے پر اوڑھے ہوئے نقاب کی وجہ سے جدید جلاد دکھائی دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہُوا میز کے قریب آیا، کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا: "تو تم سرفروش ہو؟"

"یہ تو تم جانتے ہی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"بے شک میں جانتا ہوں مگر میں تمھاری زبان سے سُننا چاہتا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ اُنھوں نے وہاں کہیں ٹیپ ریکارڈر لگا رکھا ہے جس پر ہماری گفتگو ریکارڈ کی جائے گی اس لیے وہ ہر بات کی وضاحت چاہتا ہے۔

"ہاں... مجھے اعتراف ہے کہ میں ہی سرفروش ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم ڈاکٹر فریدوں کے آدمی ہو۔ اُس کے لیے کام کرتے ہو؟"

"ان بے تکے سوالوں سے تمھارا مقصد کیا ہے؟" میں جھلا گیا۔

"تم ہمارے بارے میں جانتے ہو اور ہم تمھارے متعلق معلومات رکھتے ہیں۔ یہ راؤنڈ تم لوگ جیت گئے ہو، لہٰذا سیدھی سیدھی بات کرو تم چاہتے کیا ہو... اور ہاں میں باتھ رُوم بھی جانا چاہتا ہوں۔"

"تمھیں باتھ رُوم جانے کی اجازت ضرور دی جائے گی... مگر ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر میں ہم تمھیں پھر ایک انجکشن دیں گے اگر تمھارے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہے۔ یہ خیال بھی اپنے دماغ سے نکال دو کہ ہم تمھارے ساتھ کوئی تشدد کریں گے۔ یہ انجکشن تمھیں اس لیے دیا جائے گا تاکہ تم ہر سوال کا سچ سچ جواب دے دو۔ ورنہ ممکن ہے تم جھوٹ ہی بولتے رہو۔ اس طرح بہت وقت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔"

"تمھارا خیال بالکل درست ہے۔" میں نے کہا۔ "ہوش کی حالت میں تم مجھ سے کچھ نہیں اُگلوا سکتے۔ لیکن پہلے میرا باتھ رُوم جانا بہت ضروری ہے۔ میرے پیٹ میں زبردست مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔" میں نے باتھ رُوم جانے پر کس لیے اصرار کیا تھا کہ اگر مجھے وہ ہلاکت خیز بم استعمال کرنا پڑ جائے تو مجھے جائے وقوع کا اندازہ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی زد میں بے گناہ لوگ بھی آجائیں۔

وہ آدمی میری بات سُن کر دروازے پر گیا۔ وہاں اُس نے کسی سے سرگوشی کی، دروازہ کھُلا اور تین آدمی اندر آگئے۔ اُن میں سے دو وہی تھے جو صبح ناشتہ لے کر آئے تھے لیکن تیسرا نیا تھا۔ دو کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور تیسرے نے اسٹین گن سنبھال رکھی تھی۔

میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے گئے اور مجھے ایک کمبل اوڑھا دیا گیا۔ میں اُن مسلح نقاب پوشوں کی زد میں کمرے سے باہر آگیا۔ مجھے لے جانے میں اُنھوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی تھی کہ میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی تھی اور میں بڑے آرام سے جائے وقوع کا جائزہ لے سکتا تھا۔

یہ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا جس کے گرد تقریباً چھ فٹ اونچی اینٹوں کی دیوار تھی۔ ایک دیوار میں زنگ خوردہ آہنی پھاٹک تھا۔ دُوسری دیوار کے ساتھ اصطبل بنا ہُوا تھا جس سے گھوڑوں کی بُو آرہی تھی۔ اصطبل کے قریب ہی بیت الخلا تھا۔

ماحول کا جائزہ لینے کے علاوہ میرے باتھ رُوم آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع مل جائے۔

کمرے میں واپس آنے تک میں نے سوچ لیا کہ نشہ آور انجکشن لگنے کے بعد میں اُن کے سوالوں کے جواب میں کچھ سچ اور کچھ جھوٹ اس طرح گڈمڈ کر دوں گا کہ وہ اُلجھ کر رہ جائیں۔ وہ لوگ نہیں جانتے کہ میرے اندر نشے کے خلاف مزاحمت کی غیر معمولی قوت ہے۔ وہ مجھے بہت زیادہ مقدار میں بھی نشے کی دوا نہیں دے سکتے تھے۔ اس طرح میرا ذہن ناکارہ ہونے کا امکان تھا۔ وہ تو مجھے صرف غنودگی میں مبتلا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں ذہنی طور پر تیار ہو کر آگیا کہ انھیں کس طرح غچہ دُوں گا۔

اب کمرے میں اس دراز قد آدمی کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد آدمی بھی موجود تھا۔ اس نے بھی چہرے پر نقاب چڑھا رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں پر سفید دستانے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے بلاتاخیر مجھے انجکشن لگایا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ہوا میں تیر رہا ہوں۔ اتنے میں آواز آئی جیسے کوئی بہت دُور سے بول رہا ہو۔

"کیا تم میری آواز سُن رہے ہو سرفروش؟"

"ہاں..." میں نے جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر فریدوں نے کوئی عجیب سی چیز ایجاد کی ہے اور تم اُس کے لیے آلۂ کار بنے ہوئے ہو۔"

"نہیں۔" میں نے خواب کے جزیروں میں اُڑتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ سائنس داں ہے، میں سائنس داں نہیں ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" آواز آئی۔

میں نے قہقہہ لگایا اور خلا میں ڈولتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا تم مجھے سائنس داں سمجھتے ہو؟"

"تمھارا انجکشن کام نہیں کر رہا ہے ڈاکٹر۔ کیا تم نے ٹھیک مقدار میں دوا استعمال کی ہے؟" مجھے اس دراز قد آدمی کی آواز بھی دُور سے آتی سنائی دی تھی۔

"ہاں... میں نے بالکل ٹھیک مقدار میں دوا استعمال کی ہے لیکن یہ ایک غیر معمولی نوجوان ہے۔ دوا اس پر ذرا دیر سے اثر انداز ہوگی۔" ڈاکٹر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی گہری کھائی میں معلق ہوں۔

"ڈاکٹر فریدوں نے کیا ایجاد کیا ہے؟" کھائی کے اُوپر سے آواز آتی محسوس ہوئی۔

"ایک مشین": میں نے جواب دیا۔ یہ بتانا نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

اُوپر سے قہقہے کی آواز آئی اور کوئی بولا۔" دیکھا۔ اب دوائی نے اثر دکھایا ہے"۔

یہ غالباً ڈاکٹر کی آواز تھی۔ میں پھر اپنے آپ کو خلاؤں میں اُڑتا محسوس کرنے لگا۔

دُوسرے آدمی کی آواز آئی: "وہ کس قسم کی مشین ہے؟"

میں نے اپنے اُڑتے اور ڈولتے ہوئے ذہن کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ اب جھوٹ اور سچ گڈمڈ کرنے کا وقت آگیا ہے۔

"کمپیوٹر۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا...؟ ٹھیک ٹھیک بولنے کی کوشش کرو، سرفروش! کون سی مشین ہے، وہ؟"

"پیو ہر... پیو ہر": میں نے جان بُوجھ کر لکنت سے جواب دیا۔

"کمپیوٹر کہہ رہا ہے یہ۔" ڈاکٹر کی آواز آئی۔"تم سوال کیے جاؤ"۔

"میں سمجھ گیا سرفروش۔ وہ کس قسم کا کمپیوٹر ہے۔ کیا کرتا ہے؟ تمھارا اس سے کیا تعلق ہے؟" یہ دراز قد نقاب پوش کی آواز تھی۔

میں نے پھر جھوٹ سچ کو گڈمڈ کرتے ہوئے بتایا۔"کمپیوٹر... دماغ کے... پر... ہر... پرچے اُڑاتا ہے... نئے مقام پر... بھیجتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے... لڑائی ہوتی ہے... تاشیہ... لالی اور سادیہ تینوں غضب کی عورتیں تھیں اور کاوسا... گھوڑے... گھوڑے... بہت سے گھوڑے...!"

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے ڈاکٹر؟" اندھیرے خلاؤں سے آواز آئی: "کمپیوٹر کا عورتوں اور گھوڑوں سے کیا تعلق؟... یہ تو گھوڑوں اور عورتوں کی باتیں کر رہا ہے"۔

"یہ ابھی تک نشے کے خلاف مزاحمت کر رہا ہے۔ دوا سے معجزے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسے بولنے دو۔ شاید بعد میں ان باتوں کا کوئی سلسلہ مل جائے"۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔

"ہمیں کمپیوٹر کے متعلق کچھ اور بتاؤ، سرفروش۔ کیا تم اس کی کارکردگی سے خوش ہو؟ تمھیں کیا محسوس ہوتا ہے۔ بولتے جاؤ... اپنا ذہن خالی کر دو۔ جو کچھ تمھارے ذہن میں ہے اُگل دو... پھر تم ہلکے ہو جاؤ گے اور تمھیں بڑے مزے کی نیند آئے گی۔ بولو سرفروش بولو۔"

"پیپوٹر... دماغ کے سالمے... تار... بجلی کے جھٹکے... پھر پرواز... چٹانیں... ننگ دھڑنگ... تاشیہ... تلوار... کتے ریچھ... ملکہ رُدبا اور سُرخ شیطان... لمبی دیوار... جنگ... جنگ... کھوپڑیوں کا مینار... تاشیہ... لالی...!"

"یہ نری بکواس ہے جو ہمارے کسی کام نہیں آسکتی۔" دراز قد نقاب پوش کی آواز آئی۔ "ہم خواہ مخواہ وقت برباد کر رہے ہیں"۔

"جب تم اس پر تشدد کرو گے تو یہ انھی باتوں کے حوالے سے ایک ایک راز اُگل دے گا"۔

"یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں اُنھیں فون پر اطلاع دے دیتا ہوں۔ وہ جو چاہیں کرتے رہیں۔ آؤ، چلیں"۔

اُن کے جانے تک میں اسی طرح بے ربط باتیں کرتا رہا۔ مگر جب وہ کمرے سے نکل گئے تو میں نے سوچا کہ کہیں تشدد مجھے سچ بولنے پر واقعی مجبور نہ کر دے۔ لہٰذا اب مجھے ہلاکت خیز ٹکیہ کا بم استعمال کرنا ہی پڑے گا... اور یہ سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو کھڑکی کے باہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ رات ہو چکی تھی۔ میں نقاہت محسوس کر رہا تھا اور مجھے متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اسی طرح میز سے جکڑا ہوا تھا۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ دروازے کے باہر ایک آدمی اسٹول پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔

"سُنو... مجھے سخت متلی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے باتھ رُوم لے چلو یا میں یہیں قے بھی کر دُوں اور..." میں نے کہا۔

"نہیں"۔ وہ کراہت سے بولا۔"ایسی حرکت مت کرنا۔ بس ایک منٹ صبر سے کام لو"۔ یہ کہہ کر اُس نے دروازے پر ٹھک ٹھک کی اور کچھ بولا۔

دروازہ کھل گیا اور اس کے دو ساتھی اندر آگئے۔ ایک کے ہاتھ میں حسبِ معمول ریوالور اور دُوسرے کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ اُنھوں نے جلدی جلدی میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔

میں نے کمبل اوڑھا اور اُن کے گھیرے میں باہر آگیا۔

بارش کی وجہ سے احاطے کی زمین کیچڑ میں بدل گئی تھی۔ اندھیرے میں مجھے وہ اینٹوں والی دیوار نظر نہیں آرہی تھی مگر مجھے اتنا پتہ تھا کہ واپسی پر وہ میرے دائیں ہاتھ ہو گی۔ اب وہ کام استعمال کرنے کا وقت آگیا تھا۔

میں نے باتھ رُوم پہنچ کر قے کرنے کی کوشش کی۔ کوشش سے میری مُراد صرف آواز نکالنے سے ہے۔ میں اس طرح پہرے داروں کو جُل دینا چاہتا تھا۔ دراصل میں واش بیسن پر جُھکا ہوا اُس بلیڈ کا جائزہ لے رہا تھا جو صبح میں نے وہاں رکھا ہوا دیکھا تھا۔ اسے یہاں رکھے رکھے شاید مدتیں گزر گئی تھیں۔ اس لیے وہ زنگ

آلود تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر دھویا... پھر ہاتھ صابن سے دھونے اور حلق میں انگلی ڈال دی۔

یہیں وہ ٹکیہ کا بم چھپا ہوا تھا۔ جس طرح پُرانے وقتوں میں چور اپنے حلق میں گولیاں اور سکے رکھ کر اُنھیں چھپانے کی جگہ بنایا کرتے تھے، بالکل اُسی تکنیک کے مطابق ڈاکٹر فریدوں کی ہدایت پر میں نے یہ مہلک ٹکیہ چھپانے کی جگہ بنائی تھی۔

میں نے اُنگلی ڈال کر پہلے وہ ٹکیہ نکالی اور پھر سچ مچ قے کر دی۔ یہ ٹکیہ کا بم المونیم کے خول میں بند تھا اور اگر کبھی حلق سے معدے میں چلا جاتا تو بھی کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ یہ اسی صورت میں ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا جب میں اُسے توڑ دیتا یا اس کا خول اُتار دیتا۔ خول اور ٹکیہ کے درمیان ایک ایسا سیال بھرا ہوا تھا جو ہوا لگنے سے تیزابیت خارج کرتا تھا۔ میں نے بلیڈ سے اس کا خول کاٹ کر واش بیسن میں بہا دیا اور کمبل اوڑھنے لگا۔

خول اُترنے کے بعد بم کو پھٹنے کے لیے دو منٹ درکار تھے۔ بم کی یہ ٹکیہ جدید ترین ایجاد تھی اور ہلاکت آفرینی میں عام بموں کی طرح کم نہیں تھی۔ مگر اس سے تابکاری اثرات نہیں پیدا ہوتے تھے۔ بس دھماکے کے بعد شعلے بڑھتے چلے جاتے تھے۔

جب میں باتھ رُوم سے باہر آیا تو اس مخصوص بم کے پھٹنے میں ڈیڑھ منٹ باقی رہ گیا تھا۔

بونداباندی شروع ہو گئی تھی۔

تینوں گارڈز نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

جب ہم احاطے کے درمیان پہنچے تو میں نے اچانک رُکتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو... کتنا بڑا چُوہا ہے!"

اسٹین گن والے نے مجھے پیچھے سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں اندھیرے میں تمھیں چُوہے کہاں سے دکھائی دے گئے۔ چلو آگے بڑھو"۔ مگر میں نے آگے بڑھنے کی بجائے اپنا کمبل اس کے مُنہ پر دے مارا۔ اپنے دائیں بائیں والے محافظوں کو ایک دُوسرے سے ٹکرایا اور پھر اُنھیں اسٹین گن والے پر دھکیلتے ہوئے بے تحاشا دائیں جانب کی دیوار کی طرف بھاگ اُٹھا۔ ٹکیہ کا بم میں کمبل پھینکنے سے پہلے ہی میں وہاں گرا چکا تھا اور اب کسی بھی لمحے وہ پھٹنے والا تھا۔

جُونہی میں نے دیوار پر ایک ہاتھ رکھ کر چڑھنا چاہا، ایک گولی میرے بائیں جانب دیوار سے ٹکرائی اور اینٹ کا ایک ٹکڑا اُڑ کر دور جا گرا۔ مگر میں کسی بندر کی طرح دیوار پر چڑھا اور دُوسری طرف کُود گیا... پھر میں اندھا دُھند اندھیرے میں دوڑتا چلا گیا۔

اچانک فضا میں دھماکے کے ساتھ روشنی پھیل گئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

تقریباً ایک فرلانگ دُور اصطبل میں آگ کا ایک پھول سا، رِم جھم برستی رات میں اُوپر کو اُٹھ رہا تھا۔ میں نے اپنی دوڑ جاری رکھی کہ اس روشنی میں مجھے دُور کچھ مکان دکھائی دے گئے تھے۔ مکانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی اُن کے مکین بھی جاگ چکے تھے اور تعجب سے اُسی طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے میں آیا تھا۔ میں سب سے پہلے مکان میں گھس گیا۔

مجھے لینے کے لیے آنے والی گاڑی جلد ہی اُس مکان تک پہنچ گئی اور اس نے مجھے فوراً ڈاکٹر فریدوں کے دفتر میں پہنچا دیا جہاں رضا آفندی بھی میرا منتظر تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر فریدوں کا چہرہ کھل اُٹھا۔ وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا۔"مبارک ہو سرفروش۔ تم زندہ سلامت لوٹ آئے ورنہ میں تو تمھارا ماتم کر چکا تھا"۔

"لیکن یہ تو اب بھی ماتم کناں ہی لگتے ہیں"۔ میں نے رضا آفندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"کیا آپ کو میرے بچ جانے کی خوشی نہیں ہوئی، جناب؟"

یہ سُن کر ڈاکٹر فریدوں نے قہقہہ لگایا اور بولا۔"ابھی انھیں مت چھیڑو، پہلے اپنی رُوداد سناؤ... پھر تمھیں ان کے خاموشی اور مُوڈ کی خرابی کا باعث بھی معلوم ہو جائے گا"۔

میں نے اُنھیں لالہ کے ٹیلی فون سے لے کر اپنی واپسی تک کی ساری داستان سُنا دی۔

ڈاکٹر فریدوں پائپ کا کش لیتے ہوئے رضا آفندی سے بولا۔ "اب تم بھی اسے کچھ سُنا دو، رضا"۔

"برخوردار، تمھارے عشق نے تو ہم بڈھوں کا خانہ خراب کر دیا ہے"۔ رضا آفندی بولا۔"جب تم لالہ سے ملاقات کے لیے چلے گئے تو سکیورٹی گارڈز مزے سے کار ہی میں بیٹھے رہے۔ بیس پچیس منٹ بعد تمھارا ڈپلی کیٹ اُسی لباس میں جو تم پہنے ہوئے تھے، نیچے آیا اور اسٹیرنگ وھیل سنبھالنے کی بجائے ایک گارڈ سے بولا کہ وہ ڈرائیو کرے اور سیدھا ڈاکٹر فریدوں کے آفس چلے۔ سیکورٹی گارڈز کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ تم نہیں بلکہ تمھارا ڈپلی کیٹ ہے۔ چنانچہ وہ اُسے یہاں لے آئے"۔

"پھر کیا ہوا؟" میری سانس حلق میں اٹک گئی۔

"پھر میں نے تمھاری بجائے اُسے کمپیوٹر کے ذریعے گزرے ہوئے کسی زمانے میں بھیج دیا"۔ ڈاکٹر فریدوں نے انکشاف کیا اور رضا آفندی کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں کہتا ہوں کہ ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر سرفروش کو اس کے پیچھے بھیج دیجیے۔" رضا نے کہا اور پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اُسے زندہ مت چھوڑنا برخوردار پہلی کوشش میں ہی اُسے قتل کر ڈالنا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے آقائے رضا۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر فریدوں اُسے واپس ہی نہ بلائیں تو وہ اپنے آپ ہی ٹھکانے لگ جائے گا۔"

"سرفروش ٹھیک کہتا ہے آفندی۔" ڈاکٹر فریدوں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک میں اُسے واپس نہ بلاؤں۔"

"یہ تمھاری بھول ہے فریدوں۔" رضا آفندی بولا۔ "تم خود ہی کہتے ہو کہ کمپیوٹر آدمی کو کسی بھی زمانے میں بھیج سکتا ہے۔ آدمی کو کمپیوٹر میں ڈالنے اور اس کے واپس آنے سے پہلے تمھیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اُس کی منزل کون سا زمانہ ہے۔ اگر آدمی کئی ہزار یا کئی سو سال پہلے کے زمانے میں پہنچ سکتا ہے تو کمپیوٹر اُسے کئی سو یا کئی ہزار سال مستقبل میں بھی بھیج سکتا ہے... اور مستقبل سائنسی ارتقا میں ہم سے بہت آگے ہوگا۔ فرض کرو کہ نقلی سرفروش ماضی کی بجائے مستقبل میں پہنچ جائے تو اُسے صرف اتنا ہی کرنا پڑے گا کہ وہ وہاں کے سائنس دانوں کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دے۔ وہ لوگ نہ صرف اُسے تمھارے کمپیوٹر کی مدد کے بغیر واپس بھیج دیں گے بلکہ اُسے جدید ترین ٹیکنالوجی کی بھی تھوڑی بہت تربیت دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس امکان کے تحت ہمارا دشمن ملک ہمارے لیے ہی نہیں، پوری دُنیا کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، تم خود اندازہ لگا لو۔ اس لیے نقلی سرفروش کا قتل لازمی معاملہ بن گیا ہے۔"

"تمھارا مفروضہ درست بھی ہو سکتا ہے رضا..." ڈاکٹر فریدوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس قسم کے ناقابلِ یقین مفروضوں کو سائنس حقیقت کا رُوپ دیتی آئی ہے لیکن میرے لیے مشکل یہ ہے کہ ابھی میرے تجربات مکمل نہیں ہوئے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کمپیوٹر سرفروش کو بھی اُسی زمانے میں منتقل کرے گا جہاں اُس نے اُس کے ڈپلی کیٹ کو بھیجا ہے۔"

"تم نے کمپیوٹر کی سیٹنگ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس لیے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ سرفروش کو اُسی زمانے میں منتقل کرے گا جس میں ڈپلی کیٹ کو بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کرو اور سرفروش کو کمپیوٹر میں ڈال دو۔"

"کیا تم اس کے لیے تیار ہو سرفروش؟" ڈاکٹر فریدوں نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن لالہ اور اس کے گھر والوں کا کیا ہوگا؟"

"آؤ چلیں۔ تم ان لوگوں کی فکر نہ کرو۔"

ہم تینوں ڈاکٹر فریدوں کے دفتر سے ماسٹر کمپیوٹر کے تہ خانے کی طرف چل دیے۔ سیکورٹی کے آخری مرحلے پر رضا آفندی رُک گیا اور بولا۔ "اُسے تلاش کرنا اور موت کے گھاٹ اُتارنا اب تمھارا سب سے بڑا فریضہ بن گیا ہے، برخوردار۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کمپیوٹر چیمبر میں داخل ہونے سے پہلے کی تیاریوں کے دوران میں نے ڈاکٹر فریدوں سے پوچھا۔ "آپ نے میرے ڈپلی کیٹ کو کمپیوٹر میں جانے کے لیے آمادہ کیسے کر لیا تھا؟"

"آمادہ؟" ڈاکٹر زہرخند کے ساتھ بولا۔ "آمادہ میں نے نہیں بلکہ اُس نے مجھے کیا تھا اور اتنی بڑی دھمکی سے کیا تھا کہ نہ تو میں انکار کر سکا اور نہ ہی رضا آفندی کے لیے اختلاف کی گنجائش تھی۔"

"وہ کیسے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"جب وہ دفتر آیا تھا تو اُس نے اپنے کوٹ کے نیچے انتہائی تباہ کُن بم چھپا رکھے تھے۔ اُس نے کہا کہ اُسے ساری معلومات فراہم کی جائیں ورنہ وہ اس سارے پروجیکٹ کو اُن بموں سے اُڑا دے گا اور جب اُسے اُس پروجیکٹ کی معلومات فراہم کی گئیں تو اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے کہا کہ وہ سچ جھوٹ کا پتہ چلانے کے لیے کمپیوٹر میں جانا چاہتا ہے۔ وہ اُن بموں سمیت کمپیوٹر چیمبر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کمپیوٹر ان بموں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا... مگر میں نے اللہ کا نام لے کر اُسے بھیج ہی دیا اور وہ بموں سمیت نہ جانے ماضی کے کس دَور میں پہنچ چکا ہے۔"

"شاید میں بھی ماضی کے اُسی دَور میں پہنچ جاؤں۔" میں نے کمپیوٹر چیمبر کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا جو ہمیشہ مجھے موت کی یاد دلایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر فریدوں نے حسبِ معمول میرے اعضا کے ساتھ تار باندھے اور آخر میں سوئچ دبا دیا۔ میرے رگ و پے میں بجلی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے میں راکٹ بن گیا ہوں اور یہ راکٹ تیزی سے بلند ہونے لگا اور چشم زدن میں تاریک خلا کا سینہ چاک کرتا چلا گیا۔ میرا دل اور دماغ بکھل گئے پھر ایک دھماکا ہُوا اور کچھ بھی باقی نہ رہا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں ذرّوں میں تقسیم ہو گیا۔

جہاں کمپیوٹر نے مجھے منتقل کیا تھا، وہ ماضی کے سفر

کا پہلا پڑاؤ تھا۔ حسبِ معمول میری جلد ہی میرا لباس تھی اور میں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر پڑا تھا۔ اگرچہ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا مگر اس کے باوجود میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کمپیوٹر نے مجھے ماضی کے کس دَور میں منتقل کیا ہے اور اس بار بھی میں اپنا وجود برقرار رکھ سکوں گا یا نہیں، لیکن ان باتوں کا جواب مجھے یہاں لیٹے لیٹے نہیں مل سکتا تھا۔ یہ باتیں تو آنے والا وقت اور حالات ہی بتا سکتے ہیں۔ اس سے پہلے میری ہی سرزمین کا کوئی دشمن اجنبی سرزمین پر نہیں آیا تھا اس لیے مجھے توقع تھی کہ اس بار معاملہ پہلے سے مختلف ہوگا۔

میں نے سر اُٹھا کر ایک لمبی سانس لی تو مجھے ہوا میں نمک اور نمی کا احساس ہُوا۔ ریت، نمی اور نمک کے علاوہ دُور کہیں سے آنے والی لہروں کی مسلسل آواز نے بتا دیا کہ سمندر قریب ہی ہے مگر جلد ہی مجھے ایک اور آواز نے چونکا دیا۔

یہ آواز لمحہ بہ لمحہ میرے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس آواز کا سُراغ لگانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے اپنا خُون رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہونے لگا اور دہشت کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اُترتی چلی گئی۔

چاروں طرف سے قوی الجثہ مکروہ صورت کیکڑے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی پُشت سیاہ اور پیٹ زرد تھے۔ وہ مجھے اپنی شیطانی آنکھوں سے گھورتے ہوئے دم بہ دم اپنا حلقہ تنگ کیے جا رہے تھے۔

میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور اپنے قریب ریت میں دھنسا ہُوا پتھر نکالنے لگا... کہ بچاؤ کی کوئی صُورت نکل سکتی تھی تو اُس کا ذریعہ یہی پتھر ہی ہو سکتا تھا۔

وہ عجیب الخلقت کیکڑے مجھے پتھر کے اردگرد سے ریت ہٹاتے دیکھ کر رُک گئے۔ مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے یہ خونخوار جانور سوچنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ میں نے اپنا عمل جاری رکھتے ہوئے ایک نظر پھر ماحول کا جائزہ لیا کہ اگر ان خوفناک کیکڑوں کے حصار سے نکلنے کا موقع مِل جائے تو کہاں پناہ مِل سکے گی؟

میرے بائیں جانب کھاڑی اور دائیں طرف بہت دُور پھیلے ہُوئے پہاڑ تھے۔ کھاڑی کے کنارے کنارے دُور تک کھمبے گڑے ہُوئے تھے جن کے ساتھ انسانی پنجر لٹکے ہُوئے تھے۔ ان ڈھانچوں میں سے کچھ کی ہڈیاں چمک دار تھیں اور باقی کی موسمی اثرات کے باعث مٹیالی ہو گئی تھیں۔ یہ ڈھانچے کس کے تھے اور کیوں لٹکے ہُوئے تھے، یہ سوچنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ وہ کیکڑے ایک بار پھر میری طرف بڑھنے لگے تھے۔

میں نے پتھر اُٹھا لیا اور کھڑا ہو گیا۔

کیکڑے ایک بار پھر ٹھٹک گئے اور مجھے گھورنے لگے۔ چند لمحے بعد اُن کا سردار جو جسامت میں کسی شکاری کتے سے کم نہیں تھا، دوبارہ میری طرف بڑھنے لگا۔ باقی کیکڑوں نے بھی اُس کی تقلید کی اور میرے گرد اُن کا حلقہ تنگ تر ہونے لگا۔ میں نے فاصلے کا اندازہ لگایا، پتھر سر سے بلند کیا اور آگے بڑھ کر سردار کیکڑے پر دے مارا۔ اُس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش ضرور کی مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ پتھر اس کی پُشت پر گرا۔ "کڑاچ" کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اُس کے جسم سے خارج ہونے والے بدبُودار مادّے کے چھینٹے ہر طرف پھیل گئے۔ اُس کے ساتھی بھُوکے بھیڑیوں کی طرح اُسی پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کا حصار ٹوٹتے ہی میں بھاگ اُٹھا اور آہنی کھمبوں کی قطار کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا گیا۔

جب میں کافی دُور نکل آیا تو ایک کھمبے کے پاس رُک کر اُس سے لٹکے ہُوئے انسانی پنجر کا جائزہ لینے لگا۔ یہ پنجر کسی چھوٹے قد کے آدمی کا تھا۔ مجھے کھمبے کے آس پاس نہ کپڑے کی کوئی دھجی دکھائی دی اور نہ ہی چمڑے یا لوہے کی کوئی چیز نظر آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ مرنے والوں کو بے کفن حالت میں کھمبوں کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا اور یہ قوی الجثہ کیکڑے اُنھیں چٹ کر گئے تھے... مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ آخر ان لوگوں کو ایسی اذیت ناک موت کس جُرم کی پاداش میں دی گئی تھی؟

میں نے دُوسرے کھمبے کی طرف دیکھا۔ اُس پر لٹکا ہُوا پنجر بھی کسی چھوٹے قد والے آدمی کا تھا اور جب میں نے پلٹ کر تیسرے ڈھانچے کو دیکھنا چاہا تو دم بخود رہ گیا۔ وہ کیکڑے میری طرف ہی بھاگے آ رہے تھے۔

میں ایک بار پھر بھاگ اُٹھا۔

ابھی میں تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ مجھے کسی کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا مگر مجھے اپنا تعاقب کرنے والے کیکڑوں کے سوا کوئی ذی رُوح دکھائی نہ دیا تو میں نے اس آواز کو اپنا وہم سمجھ کر ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔

دوڑتے دوڑتے میں کھمبوں کے ساتھ لٹکے ہُوئے ڈھانچوں پر بھی نگاہ ڈالتا جا رہا تھا۔ وہ سب پستہ قد افراد کے ڈھانچے تھے۔

اچانک ایک آواز نے میرے دوڑتے قدموں میں زنجیریں سی ڈال دیں۔ کوئی التجا کر رہا تھا۔ "تمھیں برق کا واسطہ ہے مالک، مجھے بچا لو۔ میری مدد کرو، مالک۔"

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو سامنے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا گولا نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ کوئی آدمی ریت میں گڑا ہوا ہے۔ صرف اس کا سر ریت سے باہر ہے۔ اس آدمی نے پھر وہی التجا دہرائی۔ "بروق کے لیے مجھے بچالو مالک۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ آدم خور کیکڑے قریب آتے جارہے تھے اور میرے سامنے ایک بے بس انسان اپنی زندگی کے لیے التجائیں کر رہا تھا۔ میں اُسے کیکڑوں کی غذا بننے کے لیے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تو مجھے اپنی جان بچانے کی مہلت مل سکتی تھی، مگر میرے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اردگرد سے ریت ہٹانے لگا۔

وہ مسلسل التجا دہرائے جارہا تھا۔

"تم بھی ذرا ہلو جلو اور پاؤں پر زور ڈال کر نکلنے کی کوشش کرو۔" میں نے ہانپ کر کہا۔

"میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔" وہ سسک کر بولا۔

میں نے آدم خور کیکڑوں کی طرف دیکھا۔ سب سے آگے آنے والا کیکڑا ہم سے تقریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا اور ابھی وہ "زندہ مدفون" آدھا ریت میں دھنسا ہوا تھا۔ میں یہ صورتِ حال دیکھ کر فوراً ہی کھمبے کی طرف لپکا جو صرف دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اُسے اکھاڑنے کی کوشش کی مگر وہ مضبوطی سے گڑا ہوا تھا اور اس آہنی کھمبے کے ساتھ نصب چوبی تختہ اُسے اکھڑنے میں مزاحم تھا۔ میں نے چوبی تختے میں لگے ہوئے کڑوں میں بازو ڈال دیے اور پوری قوت سے جھٹکے دینے لگا۔ کھمبا پہلے ڈھیلا ہوا اور پھر ریت سے نکل آیا۔ اس دوران وہ آدمی بُری طرح چیخنے چلانے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ کیکڑا اُس کے سر پر پہنچ چکا ہے اور اپنے نوکیلے پنجے سے اس کا مُنہ نوچنے والا ہے۔

میں نے کھمبے کا نیزے کی انی نما نچلا حصہ تولا اور ایک ہی جست میں کیکڑے کو چھید ڈالا۔ اتنے میں دُوسرے کیکڑے بھی قریب آگئے تھے۔ میں نے تختے کی مدد سے زخمی کیکڑا اُن کی طرف اُچھال دیا۔ وہ پہلے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔

فضا میں ایک بار پھر بدبو پھیل گئی۔

میں جلدی جلدی ریت ہٹانے لگا۔

اتنے میں ایک سیپ میرے ہاتھ لگ گئی۔ میں نے اُس سے پہلے تو اُس شخص کے ہاتھوں کو جکڑنے والے چرمی تسمے کاٹ دیے... پھر سیپ اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "تو تم بھی ریت ہٹاؤ۔ یہ کیکڑے اپنے ساتھی کو چٹ کرتے ہی ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

اب وہ بھی ریت ہٹانے لگا اور بولا۔ "یہ کیکڑے بڑے ظالم ہیں مالک!... مگر اُن لوگوں جتنے نہیں جنھوں نے مجھے یہاں گاڑا ہے۔ ہمیں جلدی کرنی چاہیے کیونکہ وہ لوگ یہ دیکھنے کے لیے آتے ہی ہوں گے کہ میں کیکڑوں کی خوراک بن گیا ہوں یا نہیں۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ مفرور غلاموں کو ڈھونڈنے اور اُنھیں سزا دینے والے گشتی دستے کے لوگ ہیں مالک! اُن کا سربراہ بردکش ہے۔ پورے سرما میں اس سے زیادہ ظالم کوئی نہیں مالک۔ بروق اسے غارت کرے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم غلام ہو۔" میں نے کیکڑوں پر نگاہ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں غلام تھا مالک... مگر بھاگ نکلا کیونکہ میں غلامی کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا... پھر میں پکڑا گیا۔ اسی لیے انھوں نے مجھے کھمبے کے ساتھ باندھنے کی بجائے ریت میں گاڑ دیا تاکہ کیکڑے مجھے آسانی سے تلاش نہ کرسکیں اور میں زیادہ سے زیادہ دیر تک خوفِ مرگ کی اذیت سے گزرتا رہوں۔"

"تم ریت ہٹاتے رہو۔ باتیں بعد میں کرلیں گے۔" میں نے کیکڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس وقت تک اپنے ساتھی کو چٹ کرچکے تھے اور پھر سے ہمیں گھورنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے کھمبا اُٹھایا اور دُوسرا کیکڑا ہلاک کردیا تاکہ اس کے باقی ساتھی اس پر ضیافت اُڑانے میں مصروف ہوجائیں۔ ابھی کیکڑے اپنے ساتھی کو پوری طرح چٹ نہیں کر پائے تھے کہ میں نے اس آدمی کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اُسے گڑھے سے نکال لیا اور اُس کے پاؤں کھول دیے... مگر بہت دیر تک ریت میں دبے رہنے کے باعث اس کی ٹانگیں شل ہوگئی تھیں۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا اور دھڑام سے گر پڑا۔ اس صورتِ حال نے مجھے ایک اور کیکڑا مارنے پر مجبور کردیا۔

میں پھر اُس آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بھی کھمبوں سے لٹکے ہوئے ڈھانچوں کی طرح چھوٹے قد کا تھا۔ اُس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پایا تو ڈر گیا۔

"ڈرو نہیں۔ اگر میں تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تو تمھاری مدد کیوں کرتا۔ لاؤ دوستی کا ہاتھ ملاؤ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا... مگر اُس نے مجھ سے ہاتھ نہیں ملایا بلکہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

"ہمارے ہاں دستور ہے کہ جب دو آدمی ایک دُوسرے پر

اعتماد کرتے اور ایک دُوسرے کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ آپس میں ہاتھ ملاتے ہیں۔ میں نے تمھاری مدد کی ہے اور اس اجنبی سرزمین پر تم سے مدد چاہتا ہوں۔ اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "میں تمھارا قرض چکانے کی پوری پوری کوشش کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ تم مجھے غلام نہیں بناؤ گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے میں غلام تھا مگر اب کبھی نہیں بنوں گا۔"

"میں کسی کو غلام نہیں بناتا۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "لیکن ہم میں سے کسی ایک کو سربراہی کا فرض تو انجام دینا ہی ہے۔ وہ فرض میں ہی انجام دوں گا۔ اگر تمھیں یہ بات منظور نہ ہو تو تم اپنی راہ لو۔ میں اپنا راستہ خود تلاش کرلوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" وہ بولا۔ "میرا نام پیلو ہے۔ پیلو تمھارا ہر حکم مانے گا مگر غلام نہیں بنے گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ تمھیں غلام نہیں بناؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ گشتی دستہ یہاں کب آئے گا؟ مجھے جب تک [illegible] تم کہو تو کیکڑوں کو مار ڈالوں۔ ابھی [illegible] بہت کچھ باقی ہے۔"

میں نے ایک نہ دو پورے چار کیکڑے چھید ڈالے۔ فضا میں ناقابلِ برداشت بدبو پھیل گئی۔ میں نے پیلو سے کہا: "کیا اب تم چل سکتے ہو؟"

"ہاں..." وہ بولا۔ "بلکہ دوڑ سکتا ہوں۔"

ہم نے سچ مچ وہاں سے دوڑ لگادی اور کافی دُور نکل آئے۔ اب ہمارے سامنے دلدلی علاقہ تھا جس میں نرکل، سرکنڈے اور بڑی بڑی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ پیلو نے ایک سرکنڈا توڑ کر اُسے نرم زمین میں گاڑ دیا اور اس کا سایہ دیکھتے ہوئے بولا۔

"تھوڑی ہی دیر میں گشتی دستہ قلعے سے روانہ ہوجائے گا۔ قلعہ ان پہاڑیوں کے پیچھے ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی بندرگاہ بھی ہے۔ گشتی دستہ ہمیشہ اسی طرف سے گزرتا ہے۔ رات دُوسرے قلعے میں بسر کرتا ہے اور دُوسرے روز اسی راستے سے لوٹ آتا ہے مگر آج ایسا نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "آج کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ جب اُنھیں میری ہڈیاں نہیں ملیں گی اور وہ خالی گڑھا دیکھیں گے تو میری تلاش شروع ہوجائے گی اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ وہ مجھے گرفتار نہیں کرلیں گے۔ اس مرتبہ وہ مجھے کیکڑوں کی خوراک نہیں بنائیں گے بلکہ میدان میں ایک کھونٹے سے باندھ کر میرے اردگرد آگ جلادیں گے۔ میں دھیمی دھیمی آنچ سے بھنتا اور چیختا چلاتا رہوں گا اور لوگ میری چیخ و پکار پر تالیاں بجاتے رہیں گے۔ میری چیخیں اُن کے لیے تفریح اور تماشا ہوں گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا پیلو..." میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے دلاسا دیا۔ "میں ایک ایسی سرزمین سے آیا ہوں جہاں لوگ اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنا خوب جانتے ہیں اور اگر میں نہ نمٹ سکا تو پھر خود بھی تمھارے ساتھ سزا بھگتوں گا۔"

پیلو نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اُسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"وقت تمھیں خود ہی بتادے گا کہ میں غلط نہیں کہتا۔ اب یہ بتاؤ کہ کپڑے اور ہتھیار کیسے اور کہاں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کپڑے اور ہتھیار!" وہ زہرخند سے بولا۔ "غلاموں کو کپڑے اور ہتھیار نہیں ملتے۔ البتہ وہ غلام کپڑے پہنتے اور ہتھیار رکھ سکتے ہیں جو لڑتے بھڑتے اور خون ریزی کرتے ہیں۔"

"غلام لڑتے بھڑتے ہیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ لوگوں کا دل خوش کرنے کے لیے آپس میں لڑتے ہیں اور ایک دُوسرے کو مار ڈالتے ہیں مگر تم اجنبی ہو اس لیے یہ بات نہیں سمجھ سکو گے۔"

"میں سمجھتا اور جانتا ہوں پیلو۔ ایسے لوگوں کو جانباز کہا جاتا ہے۔"

"تم انھیں کچھ بھی کہہ لو مگر وہ غلام ہی ہوتے ہیں۔ میں کوئی نوک دار پتھر تلاش کرلوں۔" یہ کہہ کر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"کیوں؟ نوک دار پتھر کا کیا کرو گے؟"

"گشتی دستہ یہاں سے گزرتے ہوئے اس علاقے کو چھان ڈالتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر غلام بھاگ کر انہی جھاڑیوں میں چھپتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم بھی پکڑے جائیں گے مگر میں دوبارہ غلام نہیں بنوں گا۔ نوک دار پتھر سے اپنی رگیں کاٹ لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ پتھر تلاش کرنے لگا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس گشتی دستے سے بچنے کے لیے ہمیں کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ میں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک جانب سمندر تھا اور دُوسری طرف پہاڑیاں تھیں۔

اچانک میری نگاہ کچھ گھڑسواروں پر جم کر رہ گئیں جو پہاڑی سے اُتر رہے تھے۔ اُن کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ بھی نمودار ہوئے جو پیدل تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ گشتی دستہ ہے اور اسے ہم تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ لگے گا۔

میری چھٹی حس تیزی سے کام کرنے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک نرکل توڑا اور اس کا جائزہ لیا۔ وہ کھوکھلا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور نرکل کے سرے پر لب رکھ کر سیٹی بجانے لگا۔

پیلو نے پہلے تو تعجب سے میری طرف دیکھا پھر گشتی دستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم سیٹی بجا رہے ہو۔ اُدھر دیکھو۔ موت ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔"

"ڈرو نہیں پیلو! وہ ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔ میں نے پناہ گاہ تلاش کر لی ہے۔" میں نے اُسے خوش خبری سنائی۔

وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

"اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم ان جھاڑیوں میں چھپ جاؤ گے اور اُنھیں دکھائی نہیں دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ ایک ایک جھاڑی کو نیزوں کی نوک سے ٹٹولتے ہیں۔"

"ہم جھاڑیوں میں نہیں، سمندر کے پانی میں چھپیں گے اور نرکل کے ٹکڑوں سے سانس لیتے رہیں گے۔" میں نے اُسے نرکل کا ٹکڑا منہ سے لگا کر دکھایا۔ "تم بھی اپنے لیے نرکل توڑ لو۔"

"تم نے خوب ترکیب سوچی ہے۔" وہ بولا۔ "مگر اس طرح بھی ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہو گا۔ جب وہ میری ہڈیاں نہیں دیکھیں گے تو پورے سرا میں میرے فرار کا اعلان کر دیں گے اور لوگ ہمیں شکار کرنے کے لیے نکل پڑیں گے۔ غلاموں کا شکار یہاں کے لوگوں کی دلپسند تفریح ہے۔"

"پیش از مرگ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں۔ آؤ چلیں۔"

میں سمندر کی طرف چلنے لگا۔

پیلو نے جلدی سے نرکل توڑا اور میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ سمندر کا پانی پیلو کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوا۔ وہ اپنے ہلکے وجود کی وجہ سے بھی اوپر آ جاتا تھا۔ اس لیے میں نے پاؤں سے ٹٹول کر ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں نیچے چٹانیں تھیں اور ہم ان میں پاؤں اٹکا کر بیٹھ سکتے تھے۔ میں نے پیلو کو بتا دیا تھا۔ کہ نرکل کی نلکی سطح آب پر ایک انگل سے زیادہ نہ نکلنے پائے۔

جب گشتی دستہ قریب آنے لگا تو پیلو نے ڈبکی لگا دی اور نرکل کے ذریعے سانس لینے لگا مگر میں نے اپنی ناک اور آنکھیں باہر رکھیں تاکہ دستے کا اچھی طرح جائزہ لے لوں اور پھر ڈبکی لگاؤں۔

وہ چھ گھڑسوار اور تقریباً پچاس پیادے تھے۔ انھوں نے چرمی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ کسی کے پاس لمبے نیزے اور کسی کے پاس تیر کمان تھے مگر ڈھالیں سب کے پاس تھیں۔

جب وہ اور قریب آئے تو پتہ چلا کہ اُن گھڑسواروں میں... ایک نوشباب لڑکی بھی شامل ہے اس کی سنہری زلفیں ہوا سے لہرا رہی تھیں۔ اُس نے مختصر سا چرمی لباس پہن رکھا تھا اور دوسرے سواروں کے برعکس بغیر کاٹھی کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اگرچہ اُس نے چمک دار دھات کا سینہ بند پہن رکھا تھا مگر اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اگر اس لڑکی میں بے پناہ کشش نہ ہوتی تو میں پہلے ہی ڈبکی لگا گیا ہوتا۔

اب دستہ دلدلی ٹکڑے کی جھاڑیوں میں نیزوں کی انیاں بھونک رہا تھا۔ پیادوں کا یہ عمل رقص کے انداز میں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لے تال کے ساتھ اپنے دائیں بائیں نیزے بھونکتے آگے بڑھ رہے ہیں لیکن میں اُن کی حرکات زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ میری آنکھیں پھر اُسی نوعمر حسینہ کی طرف اُٹھ گئیں۔

ایک دُبلا پتلا اور طوطے کی چونچ جیسی خم دار ناک والا گھڑسوار جو اس دستے کا سرخیل معلوم ہوتا تھا، اپنا گھوڑا بڑھا کر لڑکی کے گھوڑے کے پاس لایا اور اس کی ساق سیمیں پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنے لگا۔

لڑکی نے بڑے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر کھاڑی کی طرف چلی گئی۔

گھڑسوار کا ہاتھ پیٹی میں اڑسے ہوئے خنجر کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے خنجر تولا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے خنجر پیٹی میں اڑس لیا اور اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے ڈبکی لگا دی کہ وہ گھڑسوار بدمعاش ہی ہو گا۔

کافی دیر بعد جب میں نے اپنا سر پانی سے نکالا تو گشتی دستہ جا چکا تھا۔ میں نے پاؤں سے پیلو کو ٹہوکا دیا۔ اس نے بھی پانی سے سر نکال لیا اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس وقت تو بروق نے ہمیں بچا لیا۔ آگے پتہ نہیں کیا ہو گا۔"

"آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "فی الوقت ہم جھاڑیوں میں پناہ لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوبارہ اس علاقے کی تلاشی نہیں لیں گے۔"

جھاڑیوں کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے پیلو کو گھڑسوار اور لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

"ہاں، وہ بدبخت بدمعاش ہی تھا۔ تم کہتے ہو کہ لڑکی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا، کاش میں نے بھی یہ تماشا دیکھا ہوتا۔"

"ہم جھاڑیوں میں لیٹ گئے لیکن بھیڑوں نے ہم پر دھاوا بول دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اب بھوک بھی ستانے لگی تھی مگر وہاں کیا ملتا۔ میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے پوچھا۔

"وہ سنہرے بالوں والی لڑکی کون تھی؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

اس سوال پر پیلو کی بھویں تن گئیں مگر وہ مسکراتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ میں اسے جانتا ہوں۔ اس کا نام زینا ہے۔ وہ ملکہ فیرا کی بیٹی ہے جو یہاں دیوتا بردق کے نام پر حکمرانی کرتی ہے۔ اگر زینا، بردکش کے قابو میں آجائے تو اسے مزید اقتدار حاصل ہو جائے گا لیکن اس عالم میں جبکہ ہم ننگے، بھوکے اور نہتے ہیں، تمھارا عورتوں کے بارے میں سوچنا بہت ہی گھٹیا بات ہے۔"

مجھے پیلو کی اس بات پر غصہ تو بہت آیا مگر میں نے خود کو سنبھال کر ہنستے ہوئے کہا: "پہلی بات تو یہ ہے کہ میں عورتوں کے بارے میں نہیں بلکہ کھانے، ہتھیاروں اور کپڑوں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ دوسرے اگر میں عورتوں کے بارے میں سوچوں بھی تو تمھارا اس میں کیا جاتا ہے؟ مجھے عورتیں پسند ہیں اور جب چاہوں گا، وہ مجھے مل جائیں گی۔ تیسری بات یہ کہ مجھے کسی استاد کی ضرورت نہیں جو مجھے پند و نصائح کرتا رہے جیسے کہ تم کر رہے ہو۔ تمھارا فلسفۂ اخلاق اور پند و نصائح نہ ہمارے پیٹ بھر سکتی ہیں اور نہ ہی ہمیں زندہ رکھ سکتی ہیں۔ اگر میری باتیں تمھاری سمجھ میں آگئی ہوں تو اب مجھے نصیحت نہ کرنا اور ہاں، تم کہتے ہو کہ زینا، ملکہ فیرا کی بیٹی ہے۔ اس ناتے سے وہ شہزادی ہوئی اور شہزادیاں محلوں کی شہ نشینوں میں آرام کرتی ہیں، غلاموں کو تلاش کرنے والے دستے کے ساتھ بغیر زین کے گھوڑوں پر نہیں گھومتیں۔"

پیلو کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا، پھر دھیمے دکھ بھرے لہجے میں بولا: "تمھارے طنز نے میرے دل کے زخموں کو کھرچ دیا ہے، اجنبی مہربان۔ حقیقت یہ ہے کہ میں استاد ہی تھا۔ سراماسیڈ کے محل میں اتالیق کے فرائض انجام دیتا تھا اور یقین کرو کہ پورے سراما میں میں اپنی مثال آپ تھا لیکن ایک عورت نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا اور وہ عورت میری اپنی بیوی تھی جسے میں نے تمام رشتوں کے ساتھ چاہا تھا اور جو مجھے اپنے چھ شوہروں میں سب سے زیادہ پسند کرتی تھی مگر یہ سب کا دکھاوا تھا۔ جھوٹ تھا، فریب تھا۔ اس نے کسی اور کو اپنا چھٹا شوہر بنانے کے لیے میرے گلے میں طوقِ غلامی ڈال دیا۔ اسی لیے مجھے عورتوں سے نفرت ہے۔ وہ ظالم، دغا باز..."

"بس بس میں سمجھ گیا پیلو۔" میں نے اس کا دکھ محسوس کرتے ہوئے اس کی قطع کلامی کی اور موضوعِ گفتگو بدل کر اس کا دھیان بٹانا چاہا۔ "مجھے سراما کے بارے میں بتاؤ کہ یہ کیسا ملک ہے؟ یہاں کے لوگ کیسے ہیں؟ اس طرح کچھ وقت بھی کٹے گا اور مجھے کچھ معلومات بھی حاصل ہو جائیں گی۔"

پیلو نے اس اجنبی سرزمین کے بارے میں بولنا شروع ہی کیا تھا کہ اس طرف سے ایک گھڑسوار آتا دکھائی دیا جدھر گشتی دستہ گیا تھا۔ وہ خوف زدہ انداز میں بولا۔

"یہ پیام بر ہے۔ گشتی دستے کو پتہ چل گیا ہے کہ میں کپاڈوا کا نوالہ بننے سے بچ نکلا ہوں۔ یہ پیام بر قلعے میں اطلاع دینے جا رہا ہے۔ جلد ہی یہ خبر سراماسیڈ پہنچ جائے گی اور پھر ملک کے طول و عرض سے لوگ میری اور تمھاری تلاش میں نکل پڑیں گے۔"

"وہ سراماسیڈ کو یہ اطلاع کیسے پہنچائیں گے؟" میں نے پوچھا تاکہ اس اجنبی سرزمین کے نظامِ مواصلات کے متعلق کچھ پتہ چل سکے۔

پیلو نے پہاڑوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

"ادھر اس بڑے پہاڑ کی طرف دیکھو۔ وہاں تمھیں ایک اونچا کھمبا نظر آئے گا۔ قلعے سے لے کر سراماسیڈ تک تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اسی قسم کے کھمبے گڑے ہوئے ہیں۔ جب قلعے سے سراماسیڈ والوں کو کوئی خبر دینا مقصود ہوتی ہے تو پہلے کھمبے پر خاص اقسام کے جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر دوسرے، تیسرے، چوتھے اور باقی کھمبوں پر جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ اس طرح غروبِ آفتاب تک یہ خبر سراماسیڈ پہنچ جائے گی اور لوگ ہمارے شکار کی دل پسند تفریح کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

یہ سن کر میں نے دوبارہ گھڑسوار کی طرف دیکھا اور چونکا۔ یہ گھڑسوار وہی لڑکی تھی جس کا نام پیلو نے زینا بتایا تھا۔ اس کا گھوڑا تھکا ہوا تھا اس لیے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ابھی وہ ہم سے کافی دور تھی۔ اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ جب میں نے وہ ترکیب پیلو کو بتائی تو وہ لرز گیا اور خوف کے مارے ہکلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں... میں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ۔ آپ جان چکے ہیں کہ میں بہادر نہیں... بہت... بہت بزدل ہوں۔"

"اس میں بہادری یا بزدلی کی کوئی بات نہیں پیلو۔" میں نے درشتی سے کہا: "تمھیں کھاڑی کے کنارے لیٹنا اور یوں ظاہر کرنا ہے کہ تم مر چکے ہو۔ جلدی سے اٹھو اور اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھو جیسے یہاں تک آتے آتے تمھارا حال بہت برا ہو گیا ہے۔ ہمت کر کے اٹھو، چند قدم جاؤ مگر پھر چکرا کے گر پڑو اور مرنے کی اداکاری کرو۔ اس دوران وہ تمھیں دیکھ لے گی اور سیدھی تمھارے پاس آئے گی مگر اتنی دور مت جانا کہ میں اس پر ہاتھ نہ ڈال سکوں اور وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ نکلے۔"

"تم زینا پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو؟" اس نے بے حد تعجب اور خوف سے پوچھا: "ملکہ فیرا کی بیٹی پر... شہزادی پر؟" اور یہ کہہ کر وہ سینے پر انگلی سے کوئی نشان بنانے لگا۔

"میں کسی بری نیت سے نہیں بلکہ اپنے تحفظ کی خاطر اسے یرغمال بنانے کے لیے ہاتھ ڈالوں گا۔" میں نے وضاحت کی۔

"کچھ بھی ہو، تم اسے نہیں چھو سکتے اجنبی مہربان۔ ورنہ بردق دیوتا ہمیں نہیں بخشے گا۔ ہم بری طرح مارے جائیں گے۔ میں تمھارا کہنا نہیں مان سکتا۔" اس نے فیصلہ سنا دیا۔

مجھے اس پر بری طرح غصہ آگیا۔ میرا جی چاہا کہ میں ایک مکے سے اس کی کھوپڑی پاش پاش کر دوں مگر ناچار اپنے غصے پر قابو پایا اور اسے اشتعال دلانے کے لیے بولا۔

"اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم غلام کیوں بنائے گئے تھے۔ تم غلام بننے کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے اور غلام ہی کی حیثیت سے مر جاؤ گے۔ اس لیے کہ تم بزدل ہو اور اپنی آزادی کے لیے ذرا سا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔ اب میں اکیلا ہی اسے پکڑنے کی کوشش کروں گا لیکن اگر وہ میرے قابو میں نہ آسکی اور اس نے قلعے میں خبر پہنچا دی کہ ہم یہاں ہیں تو سپاہی فوراً یہاں پہنچ جائیں گے مگر وہ مجھے گرفتار نہیں کر سکیں گے کیونکہ میں لڑتے لڑتے جان دے دوں گا۔ البتہ تم ایک بار پھر غلام بن جاؤ گے اور اذیت ناک موت مرو گے۔"

"نہیں نہیں، میں غلام نہیں بنوں گا۔" وہ روہانسی آواز میں بولا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ "میں تمھارے کہنے پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر آگے بڑھو۔ مگر زیادہ دور مت جانا اور مرنے کی اداکاری اچھی طرح کرنا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔"

منحنی سا پیلو خوف اور ہمت کے ملے جلے جذبات کے تحت لڑکھڑاتا ہوا دلدل سے نکلا اور کھاڑی کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اس کی چال میں واقعی ایسی لڑکھڑاہٹ تھی جیسے وہ بری طرح نڈھال ہو اور دم توڑنے والا ہو۔

میں نے زینا کی طرف دیکھا۔

اس کا گھوڑا تھکا ہوا تھا اور آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے سنہرے بال ہوا سے اڑ کر بار بار اس کی آنکھوں پر آجاتے تو وہ انھیں ایک ہاتھ سے ہٹا کر ایک ادا سے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیتی اور آگے دیکھنے لگتی تھی۔ اچانک ایک بار یہ عمل دہراتے ہوئے اس کی نگاہ پیلو پر جا پڑی۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

اتنے میں پیلو چکرا کر جھولتے ہوئے گر پڑا۔

زینا نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔

میں اپنی کمین گاہ میں چھپا اس پر جھپٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

زینا نے پیلو کے قریب گھوڑا روکا اور چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ یوں بے حس و حرکت پڑا رہا جیسے سچ مچ اللہ کو پیارا ہو چکا ہو۔ ادھر میں دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ زینا گھوڑے سے اتر کر اس کا معائنہ کرنے لگے تو مجھے جھپٹنے کا موقع مل جائے مگر میری دعا کو شرفِ قبولیت حاصل نہ ہو سکا۔

زینا گھوڑے سے اترنے کی بجائے ایک طرف جھکی اور اپنی لمبی ٹانگ بڑھا کر پنجے سے پیلو کو ٹٹولنے لگی۔

یہ دیکھ کر میں بری طرح سٹپٹا گیا۔

اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا کہ اسے گھوڑے کو ایڑ لگانے کا موقع نہ دوں ورنہ اس کا میری دسترس سے نکل جانا یقینی تھا چنانچہ میں اپنی کمین گاہ سے اچھلا اور تیز رفتاری سے اس کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے لاشعوری طور پر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ میں نے جلدی سے لپک کر اس کی ٹانگ پکڑ لی مگر وہ بھی بلا کی شہسوار تھی۔ زین اور رکابیں نہ ہونے کے باوجود وہ گھوڑے سے نہ گری بلکہ الٹا مجھ پر چابک برسانے لگی۔ ادھر گھوڑے نے بھی رفتار پکڑ لی۔ اب میں نہ اسے چھوڑ سکتا تھا اور نہ گھوڑا رک سکتا تھا۔ اوپر سے زینا مسلسل چابک برسائے جا رہی تھی۔

اچانک مجھے اپنی دنیا کے وہ کاؤ بوائز یاد آگئے جو مست بچھڑوں کو گردن سے پکڑ کر گرا دیتے ہیں۔ میں نے بھی زینا کی ٹانگ چھوڑ کر جست لگائی اور اپنی بانہیں گھوڑے کی گردن میں ڈال دیں۔ گھوڑا پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ میں نے بائیں کلائی دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی اور ساری جوش کا زور لگا کر گھوڑے کی گردن مروڑنے لگا۔ میں اس ہیڈ لاک کے ذریعے اپنے کئی دشمنوں کو ٹھکانے لگا چکا تھا لیکن آج اسے ایک گھوڑے پر آزما رہا تھا۔ کچھ دیر تو گھوڑا مزاحمت کرتا رہا مگر پھر میرے ایک جھٹکے اور وار نے اس کی گردن موڑ دی تو وہ منہ کے بل گر پڑا۔

زینا اس کی پیٹھ سے پھسلتی ہوئی دُور جا گری اور بے ہوش ہو گئی۔

میں نے بے ہوش زینا کی دھڑکنیں سنیں اور نبض دیکھی۔ دونوں ٹھیک تھیں۔ وہ صرف خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اتنے میں پیلو بھی وہاں آ گیا۔

"کیا یہ مر گئی ہے؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "تم اس کی فکر نہ کرو اور گھوڑے کو اُٹھاؤ۔"

"وہ تو جانکنی کے عالم میں ہے۔ تم نے اس کی گردن توڑ دی ہے۔"

"اوہ... پھر تو یہ ہماری بدقسمتی ہے پیلو۔ اب ہمیں پیدل ہی چلنا پڑے گا خیر۔ تم زینا کا خیال رکھو۔ میں گھوڑے کو جانکنی کے عذاب سے نجات دلانے کی کوئی تدبیر ہیں۔"

"نہیں نہیں" وہ بولا۔ "یہ ہزادی زینا ہے۔ میں اسے پڑھایا کرتا تھا۔ میں اُسے نہ چھو سکتا ہوں اور نہ ہی اس کا کوئی حکم ٹال سکتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس کی خبر گیری پر مامور نہ کرو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ سارے کام مجھے ہی کرنا پڑیں گے۔ تم ہر معاملے کو اُلجھا دیتے ہو پیلو! خیر اس سلسلے میں پھر کبھی بات کریں گے۔"

یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

میں نے ایک بڑا پتھر تلاش کیا اور اُسے اُٹھا کر گھوڑے کے پاس لے آیا جو جانکنی کے عذاب میں مبتلا تھا۔ میں نے بڑے دُکھ کے ساتھ وہ پتھر گھوڑے کے سر پر دے مارا۔ گھوڑا ایک جھٹکا کھا کر ٹھنڈا ہو گیا۔

میں نے اس کی لگام نکالی اور زینا کے پاس آ گیا۔ جو ابھی تک بے ہوش پڑی تھی اور پیلو کچھ دور گھٹنوں کے بل لیٹا اپنے کسی دیوتا سے دُعا مانگ رہا تھا۔

میں نے لگام کے ٹکڑوں سے زینا کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور اس کا سر سہلانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد زینا نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی خوبصورت غلافی آنکھوں میں بے پناہ کشش ہے۔

زینا نے سر سے پیروں تک میرا جائزہ لیا تو مجھے ندامت سی محسوس ہونے لگی کیونکہ کمپیوٹر سے یہاں آنے کے بعد ابھی تک مجھے لباس میسر نہیں آیا تھا... لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اس کی اپنا بنا لینے والی آنکھوں میں نفرت کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔ جب وہ کچھ نہ بولی اور خاموشی سے میری طرف دیکھتی ہی رہی تو میں نے کہا۔

"شہزادی زینا! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ دراصل مجھے تمھارا گھوڑا درکار تھا جو مر چکا ہے لیکن اب گھوڑے سے زیادہ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔"

"تم کون ہو اور تمھیں سراما کی شہزادی پہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

"میرا نام سرفروش ہے شہزادی اور میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ میں تمھیں یرغمال بنانے پر مجبور ہوں اور اس کی وضاحت بعد میں کروں گا۔ فی الوقت ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔"

"تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"اس ٹھگنو میاں نے بتایا تھا۔ یہ کہتا ہے کہ اس نے تمھیں پڑھایا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

زینا نے ایک نظر پیلو کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں، یہ ٹھیک کہتا ہے۔ اب میں اسے پہچان گئی ہوں۔ میرے سارے اتالیقوں میں، یہ سب سے زیادہ بولتا تھا۔" پھر اس نے بھویں سکیڑتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "مگر اب یہ بھی تمھارے ساتھ سزا بُھگتے گا۔"

یہ سُن کر پیلو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو کچھ عرصے تم ہماری مہمان رہو گی شہزادی۔" یہ کہتے ہوئے میری نگاہیں زینا کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اس کی آنکھوں میں مجھے وہ تحریر دکھائی دی جو خواتین محبت سے قبل اپنی پتلیوں میں طغروں کی طرح سجا لیتی ہیں۔ میں نے کچھ کہے بغیر زینا کو کندھے پر اُٹھا لیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولی۔

"اب تم رہبری کا فرض ادا کرو گے چھوٹو میاں۔" میں نے پیلو سے کہا۔ "ہمیں جھاڑیوں کی اوٹ میں پہاڑ تک لے چلو مگر راستے میں ایک اُستاد کے ذہن سے سوچتے جانا کہ ہمیں خوراک، کپڑوں اور ہتھیاروں کی اشد ضرورت ہے۔ یہ چیزیں کیسے اور کہاں سے حاصل ہوں گی، جب اس سوال کا جواب سوچ لو تو مجھے بتا دینا۔"

پیلو نے مُردہ گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اسے دیکھ کر ہمارے تعاقب میں ضرور آئیں گے۔"

"ہاں۔ مگر وہ دستہ یہاں سے کب گزرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"کل... لیکن اس کی آمد سے پہلے شہزادی کی تلاش بھی انھیں ہمارے تعاقب میں بھیج سکتی ہے۔"

"دیکھا جائے گا۔ تم آگے بڑھو۔"

ہم کافی دیر تک دلدلی علاقے میں سفر کرتے رہے جہاں خود رو

جھاڑیوں، سرکنڈوں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی۔ کئی بار ہمیں سانپ بھی رینگتے نظر آئے مگر پہاڑ اب بھی کافی دُور تھے۔

دن ڈھلے ہم ایک جھیل پر پہنچے جس کے اردگرد خاردار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ایسی جگہ رات گزارنے کے لیے منتخب کی جہاں دو چٹانیں کمان کی طرح اُوپر مِلی ہوئی تھیں اور نیچے غار سی بن گئی تھی۔ یہاں میں نے زینا کو کندھے سے اُتار دیا۔

"کیا تم میرے بندھن ڈھیلے کر سکتے ہو سرفروش؟ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ کراہ کر بولی۔

"کیا میں یہ اعتماد کر سکتا ہوں شہزادی کہ تم فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں قول دیتی ہوں کہ بھاگوں گی نہیں... اور میں جا بھی کہاں سکتی ہوں؟"

میں بھی اُسے جکڑ بندی سے آزاد کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے اور اب اس کا ردِ عمل کیسا رہتا ہے۔ کیا اُس کی آنکھوں کی وہ تحریر سچ تھی یا اُنھوں نے مجھے جھوٹا پیغام دیا تھا؟ جب میں اُس کے پاؤں کھولنے لگا تو وہ اس طرح آہستہ سے بولی کہ پیلو نہ سُن سکے۔

"تم بہت عجیب ہو، سرفروش۔ مجھے تمھاری اس بات پر یقین آ گیا ہے کہ مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ میں نے تم جیسا شخص پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تم سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں یہاں سے نہیں بھاگوں گی۔ ویسے بھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ رات کو اس بیابان میں درندے نکل آتے ہوں گے۔"

میں نے کچھ سرکنڈے جمع کیے اور جھاڑو بنا کر وہ جگہ صاف کرنے لگا۔ جہاں ہمیں رات گزارنا تھی۔ پیلو کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں چقماق کے دو چھوٹے بڑے ٹکڑے تھے۔ جنھیں وہ جھیل کنارے سے ڈھونڈ لایا تھا۔

بڑے ٹکڑے سے اُس نے چاقو کا کام لیتے ہوئے ایک سوکھے درخت کی چھال اُتاری اور اسے ایک جگہ جمع کر کے الاؤ جلا دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ چقماق کے دو ٹکڑے کیوں لایا تھا۔ اس دوران میں نے سوکھے درخت کی کچھ شاخیں توڑ لیں تاکہ الاؤ رات بھر روشن رکھا جا سکے۔ زینا چُپ چاپ بیٹھی یہ تماشا دیکھتی رہی۔

لکڑیاں لانے کے بعد میں نے پیلو کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم تو بڑے کام کے آدمی نکلے یار۔ اب پیٹ بھرنے کا کوئی سامان کر سکو تو مزا آ جائے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی شکار ہاتھ لگ جائے۔ میں نے سُنا ہے کہ اس جھیل میں ایسی مچھلیاں بھی ہیں جو رات کو پانی سے باہر آ جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔

میں نے ایک نظر زینا پر ڈالی جو میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بالکل ویسی چمک دیکھی جو اکثر مجھے لالہ کی آنکھوں میں دکھائی دیتی تھی لیکن میں اس سلسلے میں پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنا دھیان بٹانے کے لیے ڈاکٹر فریدون اور رضا آفندی کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر میرے خیالات کا دھارا اپنے ڈبل کیٹ کی طرف مُڑ گیا جسے مجھ سے پہلے کمپیوٹر نے منتقل کر دیا تھا... خدا جانے وہ بھی سراما ہی میں وارد ہوا تھا یا اس کے سالے کسی اور سرزمین پر یکجا ہوئے تھے۔

میں انھی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے اپنے شانوں پر نرم نرم اُنگلیوں کی حرارت محسوس ہوئی۔

پلٹ کر دیکھا تو زینا کے غلافی آنکھوں والے چہرے کو قریب پایا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "تم کون ہو سرفروش؟ مجھے تم پر غصہ آنا چاہیے تھا لیکن اب میرا دل تمھاری طرف داری کرنے لگا ہے؟"

"میرے مُلک میں جو یہاں سے بہت دُور ہے، جب کسی عورت کا دل کسی مرد کی یا کسی مرد کا دل کسی عورت کی طرف داری کرتا ہے تو وہ ایک دُوسرے کے دوست بن جاتے ہیں، ایک دُوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور اپنا سب کچھ ایک دُوسرے پر نچھاور کر دیتے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"سراما میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب دونوں ایک دُوسرے کی رضامندی سے ایک دُوسرے کو چھوتے ہیں تو وہ ایک دُوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ پہلے تم نے میری رضامندی کے بغیر مجھے چھوا تھا اس لیے مجھے غصہ آ گیا تھا لیکن اب مجھے غصہ نہیں آئے گا۔"

میرے لیے اتنا ہی اذن کافی تھا۔

اُسی لمحے پیلو کے گانے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"پیلو سو جائے گا تو ہم باتیں کریں گے۔" اس نے سرگوشی کی۔

پیلو نے تین کچھوے الاؤ کے قریب پٹخ دیے۔

"میں زمین پر چلنے والی مچھلیاں تو پکڑ لایا ہوں مگر یہ اُوپر سے فولاد کی طرح سخت ہیں۔"

میں بھوک سے بے تاب ہو رہا تھا اس لیے میں نے کچھوؤں کو چیر پھاڑ کر لوکدار ٹہنیوں میں پرو دیا اور بھوننے کے لیے رکھ دیا۔ زینا اس دوران کراہت محسوس کرتے ہوئے دُوسری جانب دیکھتی رہی۔

مگر جب گوشت کے پارچے بھن گئے تو وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگئی۔ سچ ہے کہ بھوک جس قسم کی بھی ہو مصیبت بُری ہوتی ہے۔

پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد زینا جھیل کی طرف چلی گئی۔

"شہزادی زینا ..." پیلو نے کچھ کہنا چاہا۔

"وہ کہیں نہیں جائے گی" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا" وہ بولا "شہزادی زینا ملکہ فیرا کی بیٹی ہے۔ سراما میں شہزادیوں کو جنگ، عدلیہ اور انتظامیہ کے رموز سکھائے جاتے ہیں۔ آج کل وہ غلام تلاش کرنے والے دستے کے ساتھ زیرِ تربیت ہے۔ جب وہ چھوٹی تھی تو میں اُسے فنِ خطابت سکھایا کرتا تھا" اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رُکا۔

"اس کام کے لیے تم موزوں تر آدمی ہو پیلو مگر میں تم سے کوئی اخلاقی تقریر نہیں سننا چاہتا" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں بھی آپ کو کوئی پند و نصائح نہیں کرنا چاہتا، صرف یہ تنبیہہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں کوئی عام آدمی شہزادیوں کا شوہر نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی عام آدمی کسی شہزادی سے شادی کر لے تو اس کے حصے میں انتہائی اذیت ناک موت آتی ہے"

"میں زینا سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، پیلو"

"لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کو اور اُسے ایک دوسرے کو چھوتے دیکھا ہے ... اور ہمارے ہاں اسی کو شادی کہتے ہیں"

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور جمائی لیتے ہوئے کہا "اگر ایسا ہے تب بھی تم فکر نہ کرو میرے ننھے دوست۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ تم اس واقعے کے عینی گواہ نہیں بن سکتے جو تم نے دیکھا ہی نہ ہو۔ میرا مطلب سمجھ گئے تم؟"

"ہاں میں سمجھ گیا کہ میں نے نہ پہلے کچھ دیکھا ہے اور نہ ہی اب دیکھوں گا لیکن میری یہ بات نہ بھولیے گا کہ میں نے آپ کو وقت پر آگاہ کر دیا تھا"

یہ کہہ کر وہ الاؤ سے کچھ ہٹ کر لیٹ گیا اور اس نے کروٹ بدل لی۔

جب زینا واپس آئی تو وہ خراٹے لے رہا تھا۔

زینا جھیل سے نہا کر آئی تھی۔ اس کے بال گیلے تھے اور رُوپ نکھر گیا تھا۔

"تم یہاں لیٹ جاؤ" اس نے سرگوشی کی۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تو وہ میرے قدموں کی جانب کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پہلے سیاہ آسمان کی طرف دیکھا جس پر ستاروں کے جگنو چمک رہے تھے پھر اس نے زمین پر نظر ڈالی اور انگلی سے کوئی نشان بنایا۔ اس کے بعد وہ دھیمے لہجے میں دُعا مانگنے لگی۔

"اے بروق دیوتا۔ اے معبود اور دیوتا۔ اے دو جہاں والے دیوتا۔ میں تیری رضا سے سرفروش کو اپنا تسلیم کرتی ہوں۔ ہم شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہیں جو اٹوٹ ہے"

اس دُعا کے خاتمے پر وہ مسکراتی ہوئی میری طرف متوجہ ہو گئی۔

اگلی صبح سب سے پہلے مجھے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ ڈاکٹر فریدوں کے تجربے اس کے نکتۂ نظر سے بجا سہی لیکن گزرے زمانوں کی نادیدہ سرزمینوں پر مجھے اپنی بقا کے لیے جو کچھ بھی کرنا پڑتا ہے اس کے نتیجے میں کچھ اخلاقی پابندیاں میری ذات پر بھی عائد ہوتی ہیں اگر میں ماضی کے اس سفر میں بچ گیا تو واپسی پر اس سلسلے میں ڈاکٹر فریدوں سے ضرور بات کروں گا کہ وہ خواتین جو اپنی تقدیر اور اپنا مستقبل مجھ سے وابستہ کر لیتی ہیں اُن کے خوابوں اور خوشیوں کا قتل کس حساب میں ڈالا جاتا ہے؟ اگر وہ میرے بچوں کی مائیں بن گئیں تو انھیں باپ کے سائے سے محروم کرنے کا گناہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا؟ ... مگر اس وقت میں نے ان سوچوں سے اپنا دامن چھڑا لیا کہ پہلا سوال وہاں خود اپنی ہی بقا کا تھا۔ ہم نے چوری چھپے اپنا سفر جاری رکھا۔

اس دوران میری کوشش رہی کہ زینا اور پیلو پر میری برتری برقرار رہے اور میں کم سے کم غلطیاں کروں۔ میں نے اپنے بارے میں زینا اور پیلو کو یہ بتایا کہ میں اپنے جڑواں بھائی کے ساتھ، جو ہو بہو میری ہی شکل کا ہے، ایک بادبانی کشتی میں سفر کر رہا تھا کہ کشتی طوفان میں پھنس کر تباہ ہو گئی۔ میں ایک تختے کے سہارے سراما کے ساحل سے آ لگا۔ ہو سکتا ہے کہ تقدیر نے میرے بھائی کو بھی اسی ملک کے ساحل پر کہیں لا پھینکا ہو۔ میں اُسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ جب وہ مل جائے گا تو ہم دونوں بھائی یہیں رُک جائیں گے یا پھر واپس چلے جائیں گے۔

زینا نے مجھے اس کی تلاش میں بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اس من گھڑت کہانی سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اگر میرا ڈپلی کیٹ یہاں پہنچ چکا ہے تو اس سے بھی نمٹ لیا جائے۔

دورانِ سفر مجھے زینا اور پیلو سے بہت سی معلومات حاصل

ہوئی تھیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ سیاہ پانی والی جھیل کے قریب لڑاکا غلاموں کی تربیت گاہ ہے جہاں انھیں مختلف ہتھیاروں کا استعمال اور فنِ حرب سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ راجدھانی کے اکھاڑے میں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو کر لوگوں کے لیے تفریح فراہم کرسکیں۔

پیلو نے چپکے سے مجھے یہ بھی بتادیا تھا کہ اگر میں لڑاکا غلام بن جاؤں تو وہ میرے نوکر کی حیثیت سے میرے ساتھ رہ سکے گا اور اُسے غلام نہیں سمجھا جائے گا۔

میں نے کافی سوچ و بچار کے بعد... دل میں فیصلہ کرلیا کہ میں لڑاکا غلام بن جاؤں گا۔ اس طرح مجھے شہرت کے ساتھ ساتھ مرتبہ بھی مل سکتا تھا۔ چنانچہ بظاہر تو ہم لوگ سراما سیڈ کی طرف سفر کررہے تھے مگر جب سیاہ جھیل کے قریب پہنچے تو میں نے زینا سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں چھپ چھپ کر سفر کرنے اور پناہ گاہیں تلاش کرنے کی بجائے سیدھا تربیت گاہ غلاماں چلنا چاہیے۔ وہاں سے حفاظتی دستہ مل جائے گا جو تمھیں سراما سیڈ پہنچا دے گا اور ہمیں غلاموں میں جگہ مل جائے گی اور جیسا کہ تم کہتی ہو کہ اجنبی ہونے کے ناتے مجھ پر سراما کا قانون لاگو نہیں ہوتا اس لیے وہ مجھے غلام بھی نہیں بنا سکیں گے۔"

"مگر مجھے تو وہ دوبارہ غلام بنالیں گے۔" پیلو چیخ اُٹھا۔ "میں کسی قیمت پر بھی غلام بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"یہ وقتی بات ہوگی پیلو... جب زینا سراما سیڈ پہنچ جائے گی اور ہمارے لیے راہ ہموار کرے گی تو ہم بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔" میں نے اسے سمجھایا مگر وہ نہ مانا تو خود زینا اُسے سمجھانے لگی کہ میری محبت نے خود اُسے اسیر بنادیا ہے۔

پیلو اپنی ضد پر اڑا رہا اور اپنی رگیں کاٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں لڑاکا غلام بن جاؤں۔ اس طرح جہاں پیلو غلام بننے کی بجائے میرا نوکر بن جائے گا وہاں ہماری شادی پر کیے جانے والے اعتراض بھی ختم ہوجائیں گے کیونکہ پیلو نے بتایا ہے کہ شہزادیاں بہادر اور نامور لڑاکا غلاموں سے شادی کرسکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے سرفروش۔ مگر میں تمھیں لڑاکا غلام نہیں بننے دوں گی۔ اس میں تمھاری جان کا خطرہ ہے۔ میں تمھیں اپنے لیے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میری بجائے پیلو بول اُٹھا۔ "شہزادی حضور! جیسا کہ سرفروش کہتا ہے اگر یہ فنِ حرب کا ماہر ہے تو پھر اس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا کہ پورے سراما میں سرفروش جیسا طاقت ور کوئی آدمی نہیں ہے۔"

"میں نے سُنا ہے کہ لڑاکا غلاموں کا کپتان ماکونا بہت طاقت ور اور قوی الجثہ ہے۔ میں اپنے شوہر کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔" شہزادی یہ کہتے ہوئے میرے قریب سرک آئی۔

"گھبراؤ نہیں زینا!" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ماکونا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اور جیسا کہ پیلو نے بتایا ہے تم سراما کی شہزادی کی حیثیت سے ایک غلام کی سرپرست بن سکتی ہو۔ اس لیے میری کفیل بن کر مجھے تربیت گاہ میں خود ہی داخل کرادو۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے، سرفروش!" وہ بولی۔ "ایک تو میں تمھاری جُدائی گوارا نہیں کرسکتی۔ دوسرے پوچھ گچھ سے ڈرتی ہوں۔"

"تم سے پوچھ گچھ کون کرسکتا ہے، زینا، تم تو شہزادی ہو۔"

"میری ماں مجھ سے پوچھ گچھ کرے گی، سرفروش۔ وہ ہر معاملے میں چھان بین کرنے کی عادی ہے اور اپنی بیٹیوں سے بھی بدگمان رہتی ہے۔" وہ متفکرانہ انداز میں بولی۔ "میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آسکا کہ میں اُسے تمھارے متعلق کیا کہہ کر مطمئن کروں گی۔"

"اس سلسلے میں تمھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُسے کہنا کہ میں نے اور پیلو نے اپنے آپ کو تمھارے حوالے کردیا تھا۔ تمھیں ہم پر رحم آگیا۔ اس لیے تم نے ہمیں غلاموں کا کھوج لگانے والے دستے کے سپرد کرنے کی بجائے بار اسیڈ کی تربیت گاہ میں داخل کرادیا اور لڑائیوں کے آئندہ مقابلے میں میں تمھاری زیرِ سرپرستی حصہ لوں گا۔ تمھاری ماں کو ہی نہیں بلکہ سب کو اس بات پر یقین آجائے گا۔"

"لیکن میرا کیا ہوگا، سرفروش! میں تمھارے لیے تڑپتی اور ترستی رہوں گی۔"

"میں قانونی طور پر تمھارا شوہر بننے کے لیے ہی لڑاکا غلام بننا چاہ رہا ہوں، زینا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ممکن ہے، وہ مجھے پیلو کی مدد کرنے کے جرم میں موت کی سزا دے دیں۔ کیا تم یہی چاہتی ہو، زینا؟"

میرے دلائل نے زینا کو میری بات ماننے پر مجبور کردیا۔

تربیت گاہ کے کپتان ماکونا نے زینا کی بے حد تکریم کی۔ اس کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کیا اور ایک دستے کی حفاظت میں اُسے سراما سیڈ بھیج دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں مرد، عورت کی حکمرانی کو تہِ دل سے تسلیم کرتے اور اُس کا حکم بجا لانے

میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہمیں اس تربیت گاہ کی پتھروں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں ٹھہرایا گیا جو جھیل سے زیادہ دُور واقع نہیں تھیں۔ ان جھونپڑیوں کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جس کے ایک کنارے بردق کا مجسمہ نصب تھا اور اس کے پاس ہی پھانسی کے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ یہاں زیرِ تربیت غلاموں کی کڑی نگرانی نہیں کی جاتی تھی۔ اگرچہ لڑاکا غلام قانونی طور پر غلام سمجھے جاتے تھے مگر اُن کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل تھی جو غلامی سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ قسمت آزمائی کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کی کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار منصفوں پر تھا اور یہ منصف خواتین ہوتی تھیں کہ ریاست پر عورتوں کی عمل داری تھی۔

ایک روز میں میدان میں دوڑ لگا رہا تھا اور پسینے سے تر بتر ہوچکا تھا۔ جب میں مجسمے کے قریب سے گزرا تو اُسے غور سے دیکھنے کے لیے رُک گیا۔ بردق دیوتا کے مجسمے کا اوپری حصہ اور چہرہ عورت کا تھا لیکن زیریں حصہ مرد اور عورت، دونوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ سراما کے لوگ عورت کو خیر اور مرد کو شر کی علامت سمجھتے تھے۔ مجھے اس زنانہ و مردانہ مجسمے پر کوئی تعجب نہ ہوا۔

میں جانتا تھا کہ ہر دَور کے لوگوں نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق خود ہی دیوتا تخلیق کیے اور پھر اُن کے مجسمے بنا کر انھیں اپنا معبود بنالیا۔ میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ سراما کے لوگ اپنے دیوتا کو معصوم بچیوں کی قربانی دیتے ہیں۔ میں نے لاشعوری طور پر مجسمے کی طرف تھوک دیا اور جانے لگا کہ اتنے میں کسی نے مجھے آواز دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

ماکونا مجسمے کی اوٹ سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا اور کمر سے چھوٹی سی تلوار لٹک رہی تھی۔ وہ اپنے غلیظ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"تم نے ہمارے دیوتا کی توہین کی ہے، سرفروش! میں نے اپنی آنکھوں سے تمھاری گستاخی دیکھی ہے اور اس کی پاداش میں میں تمھیں کوڑے ہی نہیں لگا سکتا بلکہ چاہوں تو پھانسی کا پھندا بھی تمھارے گلے میں ڈال سکتا ہوں۔"

میں ایک غلام کو پھانسی کے پھندے پر لٹکتے دیکھ چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ بردق کی توہین، حکم عدولی یا تربیت حاصل کرنے میں کوتاہی وغیرہ پر پھانسی کی سزا دی جاسکتی ہے اور تربیت گاہ میں آنے کے پہلے ہی روز مجھے یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ماکونا سے کبھی نہ کبھی روز میری ٹکر ضرور ہوگی۔

آج وہ وقت آ ہی گیا تھا۔

اگر مجھے زینا کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو میں اور پیلو نہ جانے کب کے دار پہ لٹکا دیے گئے ہوتے۔

"میں نے دیوتا کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی۔ دوڑ لگانے سے میرا حلق خشک ہوگیا تھا، اس لیے میں نے تھوک دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے دیوتا پر تھوکا ہے۔" میں نے کہا۔

اگرچہ سراما کے باشندے ماکونا کو دیو ہیکل آدمی سمجھتے تھے مگر وہ قد میں مجھ سے کم از کم ایک ہاتھ چھوٹا تھا لیکن اس کے شانے چوڑے اور کمان کی طرح خمیدہ ٹانگیں بے حد مضبوط تھیں۔

"میں تمھاری اس حرکت سے جو مطلب بھی نکالنا چاہوں تو نکال سکتا ہوں اور سزا دے سکتا ہوں۔ سچی بات یہ ہے، سرفروش کہ میں تمھیں پسند نہیں کرتا۔ تم ہماری مملکت میں اجنبی ہو۔ میں نے تم اجنبی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا۔ مختصر یہ کہ میں چاہتا ہوں دیوتا تم پر اپنا عذاب نازل کرے اور تم فنا ہوجاؤ۔" وہ بولا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ ایسی باتیں کیوں کررہا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم اس بھری دوپہر میں اتنی دُور مجھے یہی بتانے آئے ہو، جو میں پہلے سے جانتا ہوں؟ نہیں ماکونا! نہ تم بے وقوف ہو، نہ میں احمق ہوں۔ جو کچھ تمھارے دل میں ہے، اُسے زبان پر لانے میں مت جھجکو۔"

ماکونا نے میری بات پر قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم ٹھیک سمجھے، سرفروش! میں تم پر دیوتا کی گستاخی کا الزام لگانے نہیں آیا۔ میری آمد کا مقصد کچھ اور ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ کمر سے لٹکی تلوار کے دستے پر رکھا تو میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کراٹے کی دفاعی حالت اختیار کرلی۔ یہ دیکھ کر وہ ہنسا اور بولا۔ "میں تمھیں نقصان پہنچانے بھی نہیں آیا۔ مجھ پر اعتماد رکھو۔"

"میں کسی پر اعتماد نہیں کرتا، ماکونا۔ جو کچھ تمھیں کہنا ہے صاف صاف کہو اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"میں تم سے راز کی بات کرنے آیا ہوں سرفروش! کیا تم برداش کو جانتے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"رات وہ اس وقت میرے پاس آیا تھا جب تم سب سوچکے تھے۔ وہ بھی تمھارا اتنا ہی دشمن ہے، جتنا میں ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے مجھ پر۔" میں نے کہا۔ "ہمارے مُلک میں بہادر اپنے دُشمنوں سے پہچانے جاتے ہیں۔"

"میں نہ تمھیں جانتا ہوں اور نہ تمھارے مُلک کو۔" ماکونا بولا۔ "میں تو سراما کو اور برداش کو جانتا ہوں ۔ وہ کنواری زینا کا پہلا شوہر بننا چاہتا ہے۔"

"تو پھر اُسے دیر ہو گئی ہے ماکونا۔" یہ الفاظ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل گئے۔

"اوہ۔ تمھارے ساتھ شہزادی کے محبت آمیز سلوک سے شک تو مجھے بھی ہوا تھا لیکن مجھے اس قسم کے معاملات سے کوئی دِل چسپی نہیں، مگر جب برداش کو یہ معلوم ہو گا کہ تم شہزادی سے شادی کر چکے ہو تو اس کی رگوں میں چنگاریاں دوڑنے لگیں گی۔ وہ تو پہلے ہی تمھاری موت کا خواہاں ہے۔ کل رات اُس نے تمھیں ٹھکانے لگانے کے لیے بھاری معاوضے اور عہدے میں ترقی کی بھی پیش کش کی تھی۔"

"پھر تم نے کیا سوچا؟" میں نے پُوچھا۔

"اس کی پیش کش میرے لیے خاصی دِل کش ہے۔" وہ بولا۔ "میرے دِل میں تمھاری کوئی وقعت نہیں سرفروش! لیکن اگر تم واقعی شہزادی سے شادی کر چکے ہو تو پھر مجھے دوسرے نکتۂ نظر سے سوچنا پڑے گا۔"

"یہ تمھاری مرضی پر منحصر ہے ماکونا۔ ویسے میں سراما کے قانون کے مطابق اُس سے شادی کر چُکا ہوں۔"

اس پر ماکونا کُچھ سوچتے ہُوئے بولا۔

"ہُوں ۔ ۔ ۔ تو وہ تمھیں یہاں چھوڑ کر خود ملکہ کو ٹھنڈا کرنے گئی ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"کسی حد تک یہ دُرست ہے ماکونا مگر میں اپنی بہادری سے اُسے حاصل کرنے کا حق دار ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہاں تربیت لے رہا ہوں۔"

یہ سُن کر ماکونا کافی دیر تک سوچتا رہا۔ ۔ ۔ اس کی جبیں پر شکنیں اُبھر آئیں۔

"دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی فاتح فریق کا ساتھ دے۔"

"لیکن ابھی مجھے مکمل فتح حاصل نہیں ہُوئی ماکونا!"

"پھر بھی تم برداش سے بہتر ہو کہ شہزادی کا دِل جیت چُکے ہو اور وہ سراما سیڈ میں تمھارے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ اس لیے میں برداش کا نہیں، تمھارا ساتھ دوں گا۔"

"یہ میری عزت افزائی ہو گی، کپتان۔" میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

مگر وہ میرا یہ انداز نظر انداز کرتے ہُوئے بولا۔

"لیکن ایک ذراسی گڑبڑ ہو گئی ہے، سرفروش! میں نے برداش سے رقم لے کر تمھیں ٹھکانے لگانے کا وعدہ کر لیا ہے مگر کبھی مَرے ہُوئے آدمی کو رقم واپس کرنا اور اُس کے ساتھ کیا ہُوا وعدہ نبھانا ضروری نہیں ہوتا۔ اس لیے تمھیں آج رات ہی اُسے قتل کرنا ہو گا، سرفروش! اور یہ تمھارے لیے بہت آسان ہو گا۔ سمجھ لو کہ اس سلسلے میں سارے انتظامات مکمل ہیں۔"

"انتظامات میرے قتل کے مکمل ہیں یا اُس کے قتل کے؟"

میں نے زہرخند کے ساتھ پُوچھا۔

"تھے تو تمھارے قتل کے مگر ذراسی تبدیلی کے ساتھ اب اُس کے قتل کے لیے موزوں ہو جائیں گے ۔ ۔ ۔ اُسے ٹھکانے لگانے کے بعد تم شہزادی سے کہو گے کہ میں تمھارا ایسا دوست ہُوں جس نے تمھاری جان بچائی ہے، اس طرح مجھے وہ عہدہ مل جائے گا جو برداش کی موت سے خالی ہو گا۔"

"میں ابھی سے کوئی وعدہ نہیں کرتا ماکونا۔ پہلے مجھے اپنے منصوبے کی تفصیل بتاؤ۔"

ماکونا نے پلٹ کر تربیت گاہ کے رہائشی حصّے کی طرف دیکھا، جہاں غلام چوبی تلواروں سے لڑنے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے کی مشق میں مصروف تھے اُن کی بھاگ دوڑ اور اُچھل کُود سے گرد اُڑ رہی تھی۔

ماکونا بولا: "مجھے بھُوک لگ رہی ہے اور یہاں سے وہاں تک خاصا فاصلہ ہے۔ اس لیے یہ تفصیل راستے میں بتاؤں گا ۔ ۔ ۔ آؤ، میرے ساتھ۔"

میں کُچھ فاصلے پر اُس کے پیچھے چلنے لگا۔

"اس وقت تک مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، سرفروش جب تک میں اس نتیجے پر نہ پہنچ جاؤں کہ تمھیں فتح نہیں، شکست ہو گی۔" وہ بولا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم سچ کہنے والے غلط آدمی ہو ماکونا! اگر کبھی تمھیں قتل کرنا پڑا تو مجھے افسوس ہو گا۔"

ماکونا نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی اور دُور ایک کھمبے سے لہرانے والے جھنڈوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ دیکھو۔ برداش، سیاہ جھیل سے پوچھ رہا ہے کہ اس کے منصوبے کا کیا رہا؟"

میں نے ماکونا کی بات پر اعتبار کر لیا کہ وہی جھنڈوں کا پیغام سمجھ سکتا تھا۔

"۔ ۔ ۔ یہ منصوبہ یا سازش بہت آسان تھی۔ آج رات کُچھ غلام مجھے قتل کر کے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور تم ان باغی غلاموں کے سرغنہ ہوتے۔"

"میں اُن کا سرغنہ ہوتا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ سازش کی ناکامی کے بعد وہ غلام یہی کہتے۔ منصوبے کے مطابق برداش اور اس کا دستہ تیار رہتا۔ جونہی سازشی غلام شور و غل مچاتے، وہ دستہ تمھیں گرفتار کر لیتا اور غلاموں کی گواہی پر تمھیں فوراً ہی تہِ تیغ کر دیا جاتا۔ اب بولو کیسا تھا یہ منصوبہ؟"

"بہت عمدہ۔" میں نے جواب دیا۔ "اپنی جگہ مکمل اور آسان۔"

"اب یہ اور بھی عمدہ، آسان اور مکمل تر ہو گیا ہے۔" ماکونا بولا۔ "میں تمھیں پہلے سے وہ جگہ دِکھا دوں گا جہاں برداش انتظار کرے گا۔ تمھیں بہر طور اُسے ختم کر دینا ہے کیوں کہ میں اُسے اپنا دُشمن نہیں بنا سکتا۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر ماکونا سے پُوچھا۔

"ایک بات تو بتاؤ ماکونا۔ برداش کو میرے اور زینا کے بارے میں کیسے معلوم ہوا نیز اُسے یہ پتہ کیسے چلا کہ میں یہاں زیرِ تربیت ہوں؟"

ماکونا نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولا: "جھنڈوں کے ذریعے، سرفروش!"

میں کُچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"جب شہزادی غائب ہوئی تھی تو فوری طور پر سراما سیڈ کو اُس کی گم شدگی کا پیغام بھیجا گیا تھا۔ ملکہ فیرا نے اس کے جواب میں جو پیغام بھیجا تھا، برداش نے اس کے بارے میں مجھے آگاہ کر دیا اور جب شہزادی یہاں پہنچی تو میں نے ملکہ کو پیغام بھیج دیا کہ وہ متفکر نہ ہوں۔ شہزادی تمھارے ساتھ یہاں آگئی ہے۔ اس کے بعد برداش مجھ سے روزانہ جھنڈوں کے ذریعے تمھارے بارے میں پوچھتا رہا۔ مگر جھنڈوں کے ذریعے ہم سودے بازی نہیں کر سکتے تھے اس لیے برداش کو یہاں آنا پڑ گیا۔"

بات میری سمجھ میں آگئی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جب زینا سراما سیڈ پہنچی ہو گی تو اس کی ماں ملکہ فیرا کو سارے حقائق کا پتہ پہلے سے چل چُکا ہو گا۔ خدا جانے زینا پر کیا بیتی ہو گی؟ وہ معاملات کو سُلجھا بھی سکی ہو گی یا نہیں؟ اِدھر بھی حالات کا رُخ یکسر بدل گیا تھا۔ مجھے ایسے کام کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا جو میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مجھے سوچ میں ڈُوبے دیکھ کر ماکونا نے کہا: "اگر تم برداش کو قتل نہ کر سکے اور اس نے تمھیں قتل کر دیا تو مجھے حلفیہ بیان دینا پڑے گا کہ تم نے غلاموں کو بغاوت پر بھڑکایا تھا اور تم ان کے سرغنہ تھے۔"

میرے لیے یہ صورتِ حال، سانپ کے مُنہ کا چھچھوندر بن گئی۔

میں اپنی جھونپڑی میں واپس آیا تو پیلو میری راہ دیکھ رہا تھا۔

وہ بے حد پریشان تھا۔

اُس نے مجھے اور ماکونا کو پھانسی کے چبوتروں کے پاس باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اور جانتا تھا کہ ماکونا کسی بہانے کسی بھی لڑاکا غلام کو پھانسی پر لٹکا سکتا ہے۔

میں نے اُسے ماکونا اور اپنے درمیان ہونے والی بات چیت سے آگاہ کیا تو وہ اور زیادہ متفکر ہو گیا۔

"یہ کہیں اس کی چال نہ ہو، سرفروش! میں سراما سیڈ کے محل میں شہزادیوں کو پڑھاتا رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ سراما میں بڑی مکروہ سازشیں کی جاتی ہیں۔"

"اگر ماکونا نے میرے ساتھ کوئی گھٹیا چال چلی ہے تو بھی مجھے اس کے منصوبے میں حِصّہ لینا ہی پڑے گا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "اگر میں اس کی ہدایت پر عمل نہیں کروں گا تو مجھ پر بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر مجھے تہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ اس صورتِ حال میں مجھے خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔"

شام کے وقت ماکونا خود ہماری کوٹھری میں آیا۔

اُس نے باقی سب کو باہر جانے کا حُکم دے دیا۔

جب ہم دونوں ہی رہ گئے تو اس نے مجھ سے وہ چوبی تلوار اور خنجر لے لیا جو مجھے مشق کے لیے دیا گیا تھا اور ان کی بجائے مجھے اصلی تلوار اور خنجر دے دیا۔

اب میرے دل سے یہ شکوک و شبہات ختم ہو گئے کہ ماکونا میرے ساتھ کوئی گھٹیا چال چل رہا ہے۔

"برداش منصوبے کے مطابق طلوعِ ماہتاب کے بعد پہاڑی نالے کے کنارے میرے اشارے کا منتظر رہے گا۔ جب میرے سکھائے پڑھائے غلام جنھیں میں برداش کی دی ہوئی رقم سے حِصّہ دے چکا ہُوں، شور برپا کریں گے تو میں مشعل جلا کر اُسے اشارہ کر دوں گا تاکہ وہ اپنے دستے کو بُلا سکے لیکن اس کی نوبت نہیں آنی چاہیے، سرفروش، جوں ہی وہ پہاڑی نالے پر پہنچے، اُسے قتل کر دینا ورنہ منصوبے کے مطابق تم خود قتل کر دیے جاؤ گے۔"

میں تلوار اور خنجر سے مسلح ہو کر پہاڑی نالے کی طرف چل دیا۔

اب مجھے طلوعِ ماہتاب کا انتظار تھا۔

نالے میں چھپنے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ وہاں کوئی چھپا ہُوا نہیں ہے۔ میں ایک محفوظ مقام پر چٹان سے پیٹھ لگا کر چاند کے طلوع ہونے اور برداش کے وہاں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

ہرچند کہ میں اس منصوبے میں بادلِ نخواستہ شریک ہُوا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ برداش جیسے دُشمن کو جو مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے رقم اور اپنا وقت برباد کر رہا ہے، ختم کر دینا ہی بہتر ہے پھر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔

چاند طلوع ہوگیا مگر برداش نہ آیا۔

جُوں جُوں وقت گزر رہا تھا، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں ماکونا نے میرے ساتھ کوئی چال تو نہیں چلی... لیکن اگر اسے دھوکا دینا مقصود ہوتا تو وہ مجھے اصلی تلوار اور خنجر کیوں فراہم کرتا؟

مَیں نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر رہائشی کوٹھریوں کی طرف دیکھا۔ وہاں سوائے ایک کوٹھری کے باقی سب میں اندھیرا تھا اور جس کوٹھری کی کھڑکی سے روشنی جھانک رہی تھی اُسی میں ماکونا کی رہائش تھی اور وہیں وہ اپنا دفتری کام بھی کیا کرتا تھا۔

کُچھ وقت اور گزر گیا۔

برداش نہیں آیا اور نہ ہی نام نہاد بغاوت کرنے والے غلاموں کا شور سُنائی دیا۔

میرا اضطراب بڑھنے لگا...

مجھے پیلو کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کہا تھا...

"برداش بے حد جاہ طلب اور ہوس مند آدمی ہے... وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے سب کُچھ کر سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اور ماکونا درپردہ ایک دوسرے کے دُشمن ہیں، میرا خیال ہے کہ ان دونوں نے اپنی اپنی مقصد براری کے لیے یہ منصوبہ بنایا ہے اور تمھیں اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں اس لیے تم آج رات وہاں مت جانا۔"

میں نے سوچا، ہوسکتا ہے کہ پیلو کا خیال ٹھیک ہی ہو مگر میں یہاں آنے کے لیے مجبور تھا ورنہ خواہ مخواہ غلاموں کو بھڑکانے کے الزام میں دھر لیا جاتا... لیکن سوال یہ ہے کہ اب تک شورش کیوں نہیں ہُوئی اور برداش کیوں نہیں آیا؟ مَیں نے یہ سوچتے ہُوئے دوبارہ ماکونا کی جھونپڑی کی طرف دیکھا۔

اب اس کی روشنی بھی گُل ہو چکی تھی۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہر کام منصوبے کے برعکس کیوں ہو رہا ہے؟

اچانک مجھے چاندنی میں ماکونا کی کوٹھڑی سے چند ہیولے باہر میدان کی طرف آتے دِکھائی دیے۔ وہ فاصلے اور ہلکی ہلکی چاندنی کے باعث واضح نظر نہیں آتے تھے۔ مَیں اپنی آنکھیں ملنے لگا کہ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں؟

جب مَیں نے دوبارہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُدھر دیکھا تو وہ ہیولے غائب ہو چکے تھے اور ماکونا کی جھونپڑی کی کھڑکی سے روشنی جھانک رہی تھی۔

مَیں چکرا کر رہ گیا کہ یہ سب کیا چکر ہے؟

نہ شورش برپا ہُوئی، نہ برداش آیا اور نہ ہی ماکونا نے روشنی جلا کر خطرے کا اشارہ دیا ہے۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید کسی بنا پر ماکونا کو منصوبہ ملتوی کرنا پڑ گیا ہوگا۔ اس لیے اس نے پہلے اپنی کوٹھڑی کی مشعل بُجھائی اور پھر جلا دی کہ میں وہاں جا کر اس سے مل لُوں۔

مَیں نے ماکونا سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور تلوار ہاتھ میں لے کر کمین گاہ سے رہائشی کوٹھڑیوں کی طرف چل دیا۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ بھی ماکونا اور برداش کی چال ہوسکتی ہے۔ رات کے وقت میرا اصلی تلوار اور خنجر لے کر اپنی کوٹھڑی سے باہر آنا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مَیں یہ ہتھیار چُرا کر تربیت گاہِ غلامان سے فرار ہو رہا تھا۔ میرا یہ اقدام مجھے زینا کی سرپرستی سے بھی محروم کر سکتا تھا۔ میرے اس جُرم کی سزا صرف مجھے ہی نہیں، پیلو کو بھی بھگتنا پڑ جاتی، جسے میری وجہ سے زینا کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی... لیکن اب میں پیچھے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر ماکونا اور برداش مجھ پر بھگوڑے کا ہی الزام لگانا چاہتے تو مجھے کوٹھڑی سے غائب پا کر بھی لگا سکتے تھے، اس لیے میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

رہائشی کوٹھڑیوں کی پہلی قطار میں کُچھ لوگ زور زور سے خراٹے لے رہے تھے۔ کُچھ اندھیرے میں سسکیاں لے رہے تھے اور کُچھ سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جنھیں آج رات نام نہاد شورش برپا کرنا تھی۔

میں دبے قدموں ماکونا کی جھونپڑی کی طرف بڑھتا رہا اور بالآخر اس کے سامنے والی کوٹھڑی کی دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہوگیا تاکہ کوئی پیچھے سے مجھ پر حملہ نہ کر سکے۔ سامنے آنے والوں کے لیے میرے ہاتھ میں تلوار موجود تھی۔

میں نے اس کھڑکی سے اندر دیکھنے کی کوشش کی جس سے روشنی باہر آ رہی تھی مگر مجھے ماکونا دِکھائی نہیں دیا۔

میں آگے بڑھ کر اُسے آواز دینا چاہتا تھا کہ ناگاہ میری نظر اس

ی کوٹھری کے سامنے میدان میں جا پڑی جہاں ایک سربریدہ لاش پڑی تھی۔

مَیں نے جذبۂ تجسس کے تحت چند قدم لاش کی طرف بڑھائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لاش کا سر اس کی ٹانگوں کے درمیان رکھا ہُوا ہے... اور یہ سر ماکونا کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔

مَیں ماکونا کا یہ حشر دیکھ کر دم بخود کھڑا رہ گیا۔

خوف کی ایک لہر میرے وجود میں سرایت کر گئی۔

ماکونا کے غلیظ دانت اور پھٹی پھٹی آنکھیں چاندنی میں یُوں چمک رہی تھیں جیسے وہ اب بھی تمسخر آمیز انداز میں میری طرف دیکھ رہا ہو... اور مجھے پھانسی پر لٹکانے کی دھمکی دے رہا ہو۔

اچانک ماکونا کی کوٹھری سے کسی کی آواز آئی۔

"تم، جسے سرفروش کے نام سے پُکارا جاتا ہے، اندر آجاؤ، تمھیں ...ئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا... مگر اپنی تلوار پھینک دو۔"

مَیں نے تلوار پھینکنے کی بجائے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

آواز دوبارہ آئی۔

"حکم کی تعمیل کرو، سرفروش۔ مَیں برداش ہُوں اور ملکہ فیرا کے ...م پر تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تلوار پھینک دو۔ تمھیں کوئی نقصان نہیں ...نچے گا، کیوں کہ اب تم ملکہ فیرا کی امان میں ہو۔"

اس کا یہ مطلب تھا کہ زینا نے اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر ...حالات پر قابو پالیا تھا اور پیلو کے خیال کے برعکس ملکہ فیرا بے رحم ثابت ...ہیں ہوئی تھی۔

"کیا تم اس بات کا قول دیتے ہو، برداش؟" مَیں نے بلند آواز میں ...س سے کہا۔

"ہاں۔ میں ملکہ فیرا کے نام پر قول دیتا ہُوں کہ تم اس کی امان ...ما ہو۔"

یہ سُن کر میں نے تلوار ماکونا کی سربریدہ لاش کے پاس پھینک ...ی اور کوٹھری کی طرف جاتے جاتے ایک بار ماکونا کی طرف دیکھا تو مجھے ...ال محسوس ہُوا جیسے اس کے بریدہ سر کے چہرے والے حصّے میں چمکتی ...ڑی آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہوں۔

میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے کوٹھری کا دروازہ کھولا تاکہ برداش ...اپنی ہمت و شجاعت سے مرعوب کر سکوں لیکن جونہی مَیں نے ...ٹھری میں قدم رکھا، درجن بھر آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

اس اچانک حملے نے مجھ پر ایک جنون سا طاری کر دیا۔

مَیں کسی پر جوڈو، کسی پر کراٹے اور کسی پر کنگ فو کے داؤ آزمانے لگا۔ میں نے حملہ آوروں کو پکڑ پکڑ کر اُن کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا دیے۔

میرے گھونسوں اور لاتوں نے کئی حملہ آوروں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اُن کی جگہ دوسرے لیتے جا رہے تھے۔

اتنے میں برداش نے، جو کوٹھری کے ایک کونے میں تلوار لیے کھڑا تھا، اُنھیں غیرت دِلاتے ہُوئے کہا۔

"تم ایک آدمی پر قابو نہیں پا سکتے، بزدلو۔ اُسے نیزوں کے پچھلے حصّے سے مارو مگر یاد رکھو یہ مرنے نہ پائے۔ اگر کسی نے اسے ہلاک کر دیا تو اس وقت اُس کی تکا بوٹی کر دی جائے گی۔ اس کی ہڈیاں توڑ دو مگر اس کا دَم نہ نکلنے پائے۔"

اپنے سرغنہ کے اس حکم پر وہ مجھے اُلٹے نیزوں کے ڈنڈوں سے پیٹنے لگے۔ اس طرح وہ میری دسترس سے دُور بھی ہو گئے۔

میں ایک کی طرف لپکتا تو دوسرے مجھ پر نیزوں کے ڈنڈے برسانے لگتے۔ سر پر پڑنے والے ڈنڈوں سے میں چکرا گیا۔ مجھے کوٹھری کی دیواریں اپنے گرد گردش کرتی محسوس ہونے لگیں اور پھر یُوں لگا جیسے اس کی چھت مجھ پر آن گری ہو اور میں اس کے ملبے میں دب گیا ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں مُنہ کے بل زمین پر پڑا ہُوا تھا۔ میری کلائیوں میں آہنی کڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میرے ٹخنوں میں زنجیریں ڈال کر انھیں کڑیوں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ یہ زنجیریں بیڑی کا کام دے رہی تھیں اور کافی وزنی تھیں۔

انھیں توڑ کر آزادی حاصل کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

کوٹھری میں خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔ شاید وہ سب مجھے پابجولاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میرے انگ انگ سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور کُچھ زخموں سے ابھی تک خون بھی رِس رہا تھا۔

مَیں نے بہت ہمت سے کام لیا اور ہاتھوں کے سہارے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے میری گردن کے نیچے بڑے زور کی لات ماری۔

مَیں پھر مُنہ کے بل گر پڑا لیکن جلدی سے کروٹ بدل کر چت لیٹ گیا تاکہ اس بدبخت کو دیکھ سکوں جس نے مجھے ٹھوکر ماری تھی۔

میرے سامنے وہی خم دار ناک والا برداش کھڑا تھا جسے مَیں نے پہلی بار زینا کے ساتھ گھاڑی پر دیکھا تھا۔ وہ قد میں میرے برابر تھا اور اس کے چہرے سے سفاکی برس رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹی میں اُڑسی ہُوئی تلوار کے دستے پر تھا۔

مَیں نے غور سے اس کے خدوخال کا جائزہ لیا۔

اس کی داڑھی سیاہ تھی مگر اس میں اِکا دُکا سفید بال بھی

دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور سراما کے باشندوں کے برعکس سر گول تھا۔ اس کے یہ خدوخال اور قد غمازی کرتے تھے کہ وہ سراما کا باشندہ نہیں ہے۔

"مَیں برداش ہوں۔ ماکونا کے بعد یہ تربیت گاہ بھی میری کمان میں آگئی ہے۔ کیا تم مجھے جانتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

مَیں نے مٹی سے آلود ہونٹ ہاتھ کی پُشت سے صاف کرتے ہُوئے جواب دیا: "ہاں تم اس سرزمین کے سب سے زیادہ ظالم اور جھُوٹے آدمی ہو!"

اس نے یہ سُن کر مجھے ٹھوکر لگانے کے لیے اپنا پاؤں اُٹھایا تو مَیں نے اپنے ہتھکڑی والے ہاتھ دفاعی انداز میں سامنے لاتے ہُوئے کہا: "اگر تم نے مجھے ٹھوکر ماری تو میں تمھاری ٹانگ توڑ دوں گا یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لو!"

وہ اپنا پاؤں پیچھے ہٹاتے ہُوئے مسکرا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو... لیکن میں اس لیے بھی اَب تمھیں ٹھوکر نہیں ماروں گا کہ اگر تم نے مجھے چھُو لیا تو تمھیں قتل کرنا میرے لیے لازم ہو جائے گا جب کہ یہ ملکہ کے حُکم کی خلاف ورزی ہوگی!"

"مَیں پھر وہی الفاظ دُہراتا ہوں کہ تم جھُوٹے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا!"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔

"لیکن مجھے بُری طرح پیٹا گیا۔ اگر ملکہ کی امان کا یہی مطلب ہے تو چوہا اللہ دراہی بھلا!" میں ابھی شاید کچھ اور بھی بولتا لیکن مجھے کوٹھڑی کے ایک کونے سے زنجیروں کی جھنکار سُنائی دی تھی۔ یہ آواز سُن کر میں نے اُدھر دیکھا تو پیلو زنجیروں میں جکڑا نظر آیا۔

وہ خوف اور دہشت کی تصویر بنا ہوا تھا اور آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

میں نے مُسکراتے ہوئے اُسے آنکھ ماری اور پھر برداش کی طرف متوجہ ہو گیا، جو اَب تین ٹانگوں والے ایک چوبی تخت پر بیٹھ رہا تھا۔ اُس نے اپنا چاندی کا خود اُتار کر گھٹنوں پر رکھ لیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"میں اس وقت بہت غصّے میں تھا۔ میرے آدمی خاصے تندرست اور توانا ہیں مگر جس طرح تم نے اُن کی پٹائی کی، وہ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اُسے اپنی تعریف مت سمجھنا کیونکہ میں کسی کی تعریف نہیں کیا کرتا۔ مگر مجھے تمھارا اندازِ مدافعت اور مخالفوں کی ٹھکائی کرنے کا انداز پسند آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سراما میں تم جیسا لڑاکا کوئی اور نہیں ہے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے

کہ تم ہتھیاروں کا استعمال بھی خوب جانتے ہو؟"

"میں اُن کے استعمال کا مظاہرہ اس وقت بھی کر سکتا ہوں بشرطیکہ تم مجھے اِن زنجیروں سے آزاد کر دو؟"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ سرفروش۔ مجھے ملکۂ عالیہ کے حکم پر تمھیں سراما سیڈ لے جانا ہے کیونکہ وہ تمھیں دیکھنے کی بے حد مشتاق ہیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ وہاں جا کر تمھیں بہت جلد معلوم ہو جائے گی۔ ہاں تمھیں اپنی طاقت اور فن کا مظاہرہ کرنے کا بھی موقع دیا جائے گا مگر یہ موقع تمھیں اُس وقت ملے گا جب کالا برق شہر میں آئے گا اور اس کے اعزاز میں موت کے کھیلوں کے مقابلے منعقد کیے جائیں گے۔ اگر ملکہ تمھیں دیکھنے کی مشتاق نہ ہوتی اور تمھیں موت کے مقابلوں کے لیے منتخب نہ کیا گیا ہوتا تو اب تک تمھاری لاش کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن چکی ہوتی!"

"تم اتنے بڑے جھُوٹے ہو کہ مجھے تمھاری کسی بات پر یقین نہیں آ سکتا!" میں نے کہا۔

اس نے فوراً اپنی جیب سے ایک خریطہ نکالا اور پڑھنے لگا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ سرفروش نامی ایک اجنبی کو جسے طوفان نے ساحلِ سراما پر لا پھینکا تھا اور جو اَب تربیت گاہِ غلاماں میں زیرِ تربیت ہے، ملکۂ عالیہ کی خوشنودی و مسرّت کے لیے

سراما سیڈ لایا جائے۔

"خوشنودی و مسرّت!" کے الفاظ ادا کرتے ہوئے برداش نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا تھا... پھر وہ خریطہ پڑھتے ہوئے بولا: "ملکہ کی خوشنودی اور مسرّت کا مطلب تمھیں وہیں جا کر معلوم ہوگا!"

میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور سوچنے لگا کہ زینا نے اپنا کام بخُوبی انجام دیا ہے۔ اس طرح میرے جڑواں بھائی والی بات بھی پھیل جائے گی۔ اب ہزارہا لوگ میرے ڈپلی کیٹ کو دیکھنا بلکہ تلاش کرنا چاہیں گے اور نادانستہ طور پر میرے مددمعاون ثابت ہوں گے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، برداش! ماکونا نے بتایا تھا کہ تربیت گاہ کے کچھ غلام نام نہاد بغاوت کریں گے اور مجھے ان کا سرغنہ قرار دے کر تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ منصوبہ تمھاری ایما پر بنایا گیا ہے۔ اُس منصوبے کا کیا ہوا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو، سرفروش! ہم نے یہی منصوبہ بنایا تھا مگر اس پر عمل کرنے سے پہلے ہی ملکہ کا پیغام بر یہ فرمان لے کر یہاں پہنچ گیا۔ اس سے پہلے مجھے جھنڈوں کے ذریعے صرف تمھاری تلاش کا حکم دیا گیا تھا اور میں نے تمھیں تلاش کر لیا تھا!"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور جس چھوٹے سے چوبی تخت پر بیٹھا تھا، اُسے ٹھوکر مار کر دُور پھینک دیا۔

"ماکونا ایک احمق آدمی تھا۔ ہم دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے لیکن وہ ہمیشہ سے کم عقل تھا۔ مجھے اُس کے دوسرے منصوبے کا علم نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے مگر مجھے اس پر کبھی اعتماد نہیں رہا جس طرح اُس کے جاسوس میرے دستے میں کام کرتے ہیں، اُسی طرح میرے جاسوس بھی اس تربیت گاہ میں موجود ہیں اور وہ اس مرتبہ ماکونا کے جاسوسوں سے برتر ثابت ہوئے۔ نتیجے میں ماکونا کو اپنے سر کا نذرانہ دینا پڑا۔ تم بھی اس لیے زندہ ہو کہ ملکہ تمھیں دیکھنے کی... خواہشمند ہے ورنہ تمھارا حشر بھی وہی ہوتا جو ماکونا کا ہُوا ہے۔ میرا خیال ہے، آگے جا کر تم یہی خواہش کرو گے کہ کاش تم بھی ماکونا کے ساتھ ہی مر جاتے تو زیادہ اچھا ہوتا!"

اتنے میں اُس کے دستے کے کچھ مسلح جوان کوٹھری میں داخل ہوئے۔

برداش نے اُنھیں حکم دیا: "ان دونوں کو لے چلو!"

پیلو کی زنجیریں ایک دم جھنجھنا اُٹھیں۔

میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے برداش سے کہا: "یہ میرا نوکر ہی نہیں، دوست بھی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے!"

برداش نے کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا: "میں نوکروں، غلاموں حتیٰ کہ اساتذہ کی بھی پروا نہیں کیا کرتا۔ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی اچھا سلوک کیا جائے گا، جیسا کہ تمھارے ساتھ ہوگا!"

مجھے برداش کے اس جواب میں طنز محسوس ہُوا مگر میں نے پیلو کو دلاسا دیتے ہوئے کہا: "گھبراؤ نہیں پیلو! ہم ملکہ کی امان میں ہیں اور ہمارا اچھا وقت ضرور آئے گا!"

آخری جُملہ میں نے برداش کو سُنانے کے لیے کہا تھا مگر مجھے اُس کا ردِ عمل معلوم نہ ہو سکا کیونکہ اُس وقت وہ دروازے کی طرف مڑ چکا تھا اور میں اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکا تھا۔

◘

لڑاکا غلاموں کی نصف میل لمبی قطار کسی اَدھ مُوئے سانپ کی طرح بھُوری مٹی والے میدان میں رینگ رہی تھی۔ ہر غلام کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنانے کے بعد ایک طویل زنجیر سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ غلام دو دو کی قطار میں چل رہے تھے اور برداش کا دستہ اُن پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ خود برداش اپنے سفید گھوڑے پر سوار سب سے آگے آگے چل رہا تھا۔

میں اور پیلو اس قطار کے درمیانی حصّے میں تھے۔ تربیت گاہِ غلاماں سے چلے ہوئے آج ہمیں دوسرا دن تھا اور ابھی تین منزل سفر باقی تھا لیکن پیلو کی حالت ایک ہی روز کے سفر سے غیر ہو چکی تھی۔ وہ کل ایک بار گر پڑا تھا اور جو غلام تین بار گر پڑتا تھا، اُسے زنجیر سے علیٰحدہ کر کے برداش کے سامنے پیش کر دیا جاتا تھا جو بذاتِ خود اُس کا معائنہ کرتا اور اگر اُسے زندہ رکھنا مناسب سمجھتا تو اُس غلام کو گھوڑوں سے کھینچی جانے والی گاڑی میں ڈال دیا جاتا ورنہ وہ اپنے سپاہیوں کو اشارہ کرتا جو اُسی وقت اُس غلام کو برچھیاں مار مار کر ہلاک کر دیتے اور اُس کی لاش وہیں پھینک دی جاتی۔

پہلے دن کے سفر میں بارہ بدنصیب غلاموں کا یہی حشر ہو چکا تھا اس لیے میں پیلو کی وجہ سے خاصا فکرمند تھا۔ مجھے اُس سے بڑی اُنسیت ہو گئی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ برداش کے عتاب کا شکار ہو۔ چنانچہ میں نے اُس سے قریب تر ہو کر زنجیر کا بوجھ اپنے ہاتھ پر سہار لیا تھا اور اس کی ہمت بڑھاتا جا رہا تھا کیونکہ آج بھی وہ گر چکا تھا۔ اب اگر وہ تیسری بار گر پڑتا تو اُسے برداش کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ جو پہلے ہی سے اُس کی تاک میں تھا۔

کھانے پینے کے معاملے میں ہم سے بُخل نہیں برتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ غلاموں کو چاق و چوبند رکھنا ضروری تھا تاکہ وہ کالے بروق کی آمد پر اُس کے اعزاز میں منعقد ہونے والے موت کے مقابلوں میں حصہ لے سکیں۔ میں اپنے حصّے کا کچھ کھانا اور پانی پیلو کو دے دیا کرتا تھا تاکہ اُس کی قوت برقرار رہے۔

کبھی کبھی برداش غلاموں اور اپنے آدمیوں کا جائزہ لینے کے لیے پیچھے آتا تھا۔ ایک بار وہ ہمارے قریب سے گزرا تو میں نے پُوچھا۔

"کیا میں پیلو کو اُٹھا لوں، یہ میرے لیے بہت ہلکا پُھلکا ہے۔"

"نہیں۔" برداش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایسا کرنا ممنوع ہے۔ اگر یہ تیسری بار گِرا تو میں خود اس کا معائنہ کروں گا۔"

پھر اُس نے دو سپاہیوں کو بلا کر انھیں کچھ ہدایات دیں اور وہاں سے چلا گیا۔ اب وہ سپاہی ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے برداش سے اجازت لے کر خواہ مخواہ مصیبت مول لے لی تھی۔

میں نے پیلو کو ہدایت کی کہ اگر وہ گرنے لگے تو پہلے مجھے آواز دے دے۔ میں فوراً اُسے سنبھال لوں گا۔

"مجھے مر جانے دیجئے۔ مجھ سے یہ صعوبت برداشت نہیں ہو سکتی۔" اس نے سِسک کر کہا۔

"نہیں پیلو، مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ اس ملک میں صرف تم ہی تو میرے دوست ہو۔"

"اور شہزادی زینا؟" وہ چونک کر بولا۔ "حالانکہ مجھے تعجب . . ."

"مجھے بھی تعجب ہے، پیلو۔ اگر زینا نے ہمارے لیے راہ ہموار کی ہوتی یا حالات اُس کے قابو میں ہوتے تو ملکہ کے داماد کی حیثیت میں مجھ سے یہ سلوک نہ کیا جاتا۔" میں نے پیلو سے پہلی بار اپنا خدشہ بیان کیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے برداش کے وہ الفاظ بھی یاد آ گئے کہ ملکہ اپنی خوشنودی اور مسرت کے لیے مجھ سے ملنے کی مشتاق ہے۔

رات کو سوتے وقت بھی ہمیں زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لیے غلام آرام کی نیند نہیں سو سکتے تھے۔ اور میں تو پیلو کو اور بھی دیر تک جگائے رکھتا تھا تاکہ سراما کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکوں۔ میں نے اُس سے یہاں کے حروف تہجی بھی سیکھ لیے تھے اور جھنڈوں سے دیے جانے والے پیغامات کو بھی تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگا تھا۔ پیلو نے مجھے مقامی مذہب اور دیوتا بروق ـــ کے بارے میں بھی کافی معلومات فراہم کی تھیں اور یہ ساری باتیں اپنے آپ ہی میری یادداشت میں محفوظ ہوتی جا رہی تھیں۔

اور پھر وہی ہُوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ میں نے پیلو کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں اور وہ لہرا رہا تھا... پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گِر گیا۔

اُس کے گرتے ہی شمشیر بردار آدمی تیزی سے آگے بڑھے۔ اُن کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ پیلو کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیں گے۔ اس سے قبل کہ ان کی تلواریں پیلو کے جسم تک پہنچتیں، میں ان کے سامنے جم گیا اور میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہ آئے۔"

وہ حقارت آمیز انداز میں ہنس پڑے۔ اتنے میں برداش بھی گھوڑا دوڑاتا ہُوا پہنچ گیا۔ اس نے پیلو کو زمین بوس دیکھا تو اس کی آنکھیں کسی شیطانی جذبے کے تحت چمک اُٹھیں... پھر جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے گہری نگاہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے شمشیر زنوں سے پُوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو۔ اس گرے ہوئے آدمی کو اُٹھاتے کیوں نہیں؟"

"اجنبی مزاحمت پر آمادہ ہے۔" ایک شمشیر زن بولا۔

"اوہ . . ." برداش نے سفّاک انداز میں مُسکراتے ہوئے کہا۔ "شاید تم نہیں جانتے، یہ مزاحمت، بغاوت کے مترادف ہے۔ میں تمھیں صرف ایک موقع دے سکتا ہوں۔ اگر تم سامنے سے نہ ہٹے تو تمھارا انجام بھی اس حقیر آدمی سے مختلف نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر اُس نے تین انگلیاں اُٹھا دیں۔ "میں باری باری اپنی انگلیاں... جُھکاؤں گا۔ تیسری انگلی جُھکنے تک تمھارے پاس مہلت ہے۔"

میرا جسم ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے میں بھیگنے لگا۔

اس کی ایک انگلی جُھک گئی۔ پیلو اب بھی بے حس و بے حرکت پڑا تھا۔ دوسری انگلی بھی جُھک گئی... اور پھر تیسری انگلی جُھکتے ہی تلواروں اور زنجیروں کی جھنکاروں سے ماحول کانپ اُٹھا۔ برداش کی للکار ہر آواز پر بھاری تھی۔ میری سانس حلق میں جس مقام پر تھی، وہیں اٹک گئی اور دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا۔



میں چند ساعتوں کے لیے شل سا کھڑا رہ گیا۔

یُوں لگ رہا تھا جیسے میری سوچیں اور میرے خیالات تک انجماد کا شکار ہو گئے ہوں۔ میرا رُواں رُواں ٹھٹھر گیا ہو اور میری ہستی برف کی وزنی سِلوں کے نیچے دب کر رہ گئی ہو۔ پیلو کا وجود اب بھی ساکت پڑا تھا۔ معلوم نہیں اس بے چارے کی رُوح جسدِ خاکی سے رُوٹھ گئی تھی یا وہ وقتی طور پر بے ہوشی کی دُھند میں ڈُوب گیا تھا... برداش نے جیسے ہی تیسری انگلی اُٹھا کر مہلت کا وقت ختم ہونے کا اشارہ کیا تھا، اس کے فوراً ہی بعد گویا موت چاروں طرف سے اپنے بھیانک جبڑے کھولے ہماری طرف لپک پڑی تھی۔

"رُک جاؤ۔" میں نے برداش کی للکار کے جواب میں دھاڑ کر کہا۔ "برداش! تم جانتے ہو کہ تمھارا یہ پُورا دستہ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر تمھیں یقین نہ ہو تو تم میری بات عمل کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہو... اور اگر تم سمجھتے ہو کہ میں دروغ بیانی سے کام لے رہا ہوں تو اپنے شمشیر زنوں کو روک لو۔"

میری آواز میں بے پناہ سفّاکی تھی۔

غالباً اس سے پہلے سراما کے ان باشندوں نے کسی کی آواز میں ایسی گھن گرج نہیں سُنی تھی کہ شمشیر زن یکایک رُک گئے۔ تلواریں بے ہوش پیلو سے کچھ ہی فاصلے پر ساکت ہو گئیں ورنہ اُس کا مختصر سا وجود بوٹیوں میں بٹ چکا ہوتا۔

"میں پہلے بھی بتا چُکا ہُوں کہ مجھے ملکہ کی امان حاصل ہے۔" میں نے مزید مؤثر لہجے میں کہا۔ "اور یہ شخص میرا نوکر ہے۔"

"لیکن اصُول یہ ہے کہ جو شخص تین بار گِر جائے اُسے..."

"ایسا صرف اُسی صُورت میں ہوتا ہے، جب گرنے والے کا بوجھ اُٹھانے والا کوئی نہ ہو۔" میں نے اُس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ "میں اسے اُٹھا سکتا ہُوں۔ ہاں... اگر میں تین بار تو درکنار ایک بار بھی گِر پڑوں تو تم مجھے بے شک ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ انداز میں بے چینی تھی جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کر رہا ہو۔ اس کے سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ چند ساعتوں تک وہ میری طرف گھُورتا رہا پھر اُس کے شیطانی ذہن میں کوئی مافوق منصُوبہ جنم لینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹ سفّاک انداز میں مسکرانے لگے جبکہ چہرہ کسی دیوار کی طرح بے شکن رہا اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی رہیں۔

"ٹھیک ہے۔" وہ غرّایا۔ "اسے اُٹھا لو... لیکن خیال رہے۔ اگر تم ایک بار بھی گرے تو تمھیں اور اسے آخری ہچکی زمین کے سینے میں دفن ہو کر ہی لینی پڑے گی۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور قافلے کے آگے آگے گھوڑا دوڑانے لگا۔

میں نے پیلو کا جائزہ لیا۔

وہ زندہ تھا لیکن اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔

میں نے اُسے کندھے پر اُٹھا لیا اور قافلہ منزلِ مقصُود کی طرف بڑھتا رہا حتیٰ کہ چوتھے روز ہم پابہ زنجیر غلاموں کی قطار ایک تنگ درّے سے گزر کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئی۔ دو روز میں پیلو کی حالت کافی سنبھل گئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک وہ اپنے پیروں سے چل رہا تھا۔

میں پلکیں جھپک جھپک کر وادی میں آباد سراما سیٹ کا نظارا کرنے لگا۔ برداش نے ہمیں تھوڑی دیر آرام کرنے کی اجازت دے دی تھی حالانکہ ہمیں اب آرام کی ضرورت نہیں تھی۔

میری نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ شہر کے پس منظر میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور بندرگاہ بادبانی کشتیوں سے اَٹی ہوئی تھی۔ پیلو مجھے بتا چکا تھا کہ سراما سیٹ اس ملک کی تجارتی بندرگاہ ہے۔ شہر خاکنائے کی وجہ سے بڑی محفوظ جگہ آباد تھا۔ جس کے عین وسط میں ملکہ فیرا کا محل واقع تھا۔ اس محل میں ایک اُونچا مینار تھا جس پر ایک بڑے ڈنڈے کے ساتھ مختلف اقسام اور رنگوں کے پرچم لہرا رہے تھے میں نے پیلو کے بتائے ہوئے طریقے سے ان جھنڈوں کا پیغام پڑھنے کی کوشش کی... اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ پیغام یہ تھا۔

"خوش آمدید برداش! اجنبی کو فوراً لے آؤ۔ فیرا"

پیلو جو اَب بے حد تازہ دم ہو چُکا تھا، بولا۔ "اب میرے اور آپ کے بچھڑنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"ہماری یہ علیحدگی بہت مختصر وقت کے لیے ہو گی پیلو۔ میں زینا سے ملتے ہی کہوں گا کہ وہ تمھیں بُلوا کر میرے ساتھ رکھے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی۔"

"اگر آپ اُس سے مِل سکے تو..." پیلو بولا۔ "آپ سراما کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔ ملکہ فیرا بڑی سخت مزاج اور ظالم ہے مگر برداشت مجتی نہیں۔ وہ اپنے حُسن اور تاج و تخت کے سلسلے میں بے حد محتاط ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ خوبصورت بچوں کو مَروا دیتی ہے تاکہ کوئی عورت اُس سے زیادہ حسین نہ کہلا سکے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اَزل سے زندہ ہے اور ابد تک زندہ رہے گی۔ نہ کبھی بوڑھی نہیں ہو گی اور اس کا حُسن ہمیشہ اسی طرح قائم و دائم رہے گا۔"

"بس رہنے دو پیلو۔ یہ نری بکواس ہے۔ ایسی کہانیاں تو

بچّوں کو ڈرانے کے لیے سُنائی جاتی ہیں۔" میں نے درشتی سے کہا۔
وہ بے چارہ خاموش ہوگیا۔

اتنے میں ایک گرج دار آواز سُنائی دی اور نشیب سے اُٹھنے والے زرد رنگ کے کثیف دُھویں کے ساتھ بدبُو بھی پھیل گئی۔ یہ بدبُو ایسی تھی جیسے چمڑا اور ہڈیاں جلائی جا رہی ہوں۔

"یہ دُھواں اور بدبُو کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے شہر کی فصیل سے پرے دیوتا برِق کے ایک بہت بڑے مجسّمے کی طرف اشارہ کیا جو کم از کم سو ہاتھ اُونچا ہوگا۔ یہ زرد کثیف دُھواں اُسی کے مُنہ سے نِکل رہا تھا۔

"یہ سراماسیڈ کا آتشیں برِق ہے۔ یہ بدبُو ہڈیوں اور آگ میں جھونکے جانے والے غلاموں اور مجرموں کے مُردہ اجسام کی ہے۔ جب کالا برِق یہاں آئے گا تو برِق کے لیے قربانیاں دی جائیں گی۔ غلاموں اور مجرموں کو برِق کی بھینٹ چڑھایا جائے گا۔ اس لیے پُجاری اس کی صفائی کر رہے ہیں۔"

اتنے میں برداش چھ سپاہیوں کے ساتھ ہمارے پاس آیا۔ اور بولا: "چلو سرفروش... شاید شہزادی تمھارے فراق میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے۔ اس لیے تمھیں فوراً حاضری کا حکم دیا گیا ہے۔"

میں نے برداش کا طنز تو محسوس کر لیا مگر اس سلسلے میں کچھ بولا نہیں، صرف اتنی یاد دہانی کرائی: "پیلو کو بھی کھول دو۔ یہ میرا نوکر ہے اور مجھے اس کی ضرورت پڑے گی۔ دُوسرے ہم دونوں ملکہ کی امان میں ہیں۔"

برداش نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور پیلو کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولا: "ملکہ اس بونے کی امین ہے؟ اس بُزدل بھگوڑے کی...؟ جسے اُس کی اپنی بیوی نے غلام بنوا دیا تاکہ وہ کسی اور کو اپنا شوہر بنا سکے"... پھر وہ پیلو سے مخاطب ہُوا: "ملکۂ عالیہ کو تمھارے اس حسین مردانہ پیکر سے محروم تو رہنا پڑے گا مگر وہ یہ دُکھ برداشت کر ہی لیں گی، بونے غلام۔"

پیلو نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اُٹھائی اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہُوئے بولا: "مجھے غلام مت کہو۔ میں غلام نہیں ہُوں اور نہ کبھی بنوں گا۔"

میں پیلو کی اس جرأتِ مردانگی پر دنگ رہ گیا جبکہ برداش نے تلوار چپٹی کر کے اس کے سر پر دے ماری۔ میں برداش کی طرف لپکا... مگر اُس کے تین سپاہی میرے بازوؤں سے لپٹ گئے۔ تلوار چپٹی ہونے کے باعث پیلو کو زیادہ زور کی چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر اُٹھایا اور بولا: "آپ کو برِق کی قسم، میری وجہ سے نہ لڑیں۔"

میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور سپاہیوں کے ساتھ جاتے ہوئے اسے تسلی دی: "میں تمھارے لیے جو کچھ بھی کر سکا ضرور کروں گا... مگر ڈرنا نہیں، پیلو۔ اب اسی طرح مرد بنے رہنا۔"

میں تقریباً دو گھنٹوں سے کسی مجسّمے کی طرح اُس چوکی پر کھڑا تھا جو ملکہ فیرا کے تخت اور اس کے پانچ مشیروں کی کرسیوں کے درمیان رکھی تھی۔

ملکہ فیرا کے دربار میں لانے سے پہلے مجھے نہلایا اور اس طرح سجایا سنوارا گیا تھا جیسے دُلہنوں کا سنگھار کیا جاتا ہے۔ میری داڑھی عمدگی سے تراشی گئی تھی، بالوں میں عطر لگایا گیا تھا اور پہننے کو حریری لباس اور نفیس جُوتے دیے گئے تھے۔ میرے جسم کا اُوپری حصہ البتہ بے لباس رکھا گیا تھا۔

ملکہ فیرا کا یہ دربار ایک طویل و عریض کمرے پر مشتمل تھا جس کے کُھلے دریچوں سے بندرگاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے کی دیواریں، تخت کا چبوترہ، چوکی اور کرسیاں سب کی سب سنگِ سفید کی بنی ہوئی تھیں جو سراماسیڈ میں عام تھا۔

ملکہ فیرا کی کرسی چبوترے پر رکھی ہُوئی تھی۔ اس کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں اس کے پانچ مشیروں کی کرسیاں تھیں جو پُجاری تھے اور درمیان میں وہ چوکی تھی جس پر میں ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔ ملکہ فیرا کی رنگت دُودھ کی طرح سفید تھی مگر بال گہرے سیاہ تھے۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ اس کے جسم اور چہرے سے اُس کی عمر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جوان بیٹیوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ جوان نظر آتی تھی اور شاید اسی لیے اُس کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ وہ نہ تو کبھی بوڑھی ہوگی اور نہ ہی اس کے حُسن کو زوال آئے گا۔

ملکہ کے مشیروں کے سر مُنڈے ہُوئے تھے اور داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ وہ اپنے سیاہ لبادوں میں ایسے بوڑھے گِدھ نظر آتے تھے جن کی گردنوں کے بال و پر جھڑ گئے ہوں۔ اُنھوں نے میرے بارے میں صرف اتنا کہا تھا۔

"یہ اجنبی ہے اور اجنبی غلاموں کے ساتھ سراماسیڈ کی شہزادیاں شادی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے زینا کے ساتھ اس کی شادی منسوخ کی جاتی ہے۔ شہزادی زینا اس کے ساتھ شادی کرنے کے جرم میں جہاز پر سزا بُھگتے گی۔"

میں نے اپنی وکالت کے لیے لب کشائی کرنا چاہی تو مجھے سختی سے روک دیا گیا۔ اب میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور تنہا

محسوس کر رہا تھا کیونکہ زینا سے وابستہ توقعات یکسر ختم ہو چکی تھیں... قبل ازیں اس قسم کے مواقع پر میرا توانا جسم اور جوانی ساتھ دیتی آئی تھی لیکن اب کے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا جسم اور جوانی بھی میرے کسی کام نہیں آ سکے گی کیونکہ ملکہ کے مشیروں کا رویّہ بے حد جارحانہ اور منتقمانہ تھا۔

یہ مجلسِ مشاورت دو گھنٹوں سے جاری تھی۔ بالآخر ملکہ کے مشیرِ اعلا کریڈ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ملکۂ عالیہ! دو روز میں کالا برِق اپنا سالانہ خراج وصول کرنے کے لیے یہاں پہنچ جائے گا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اُسے خراج ادا کر دینا چاہیے کہ ہم کمزور ہیں اور اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اُسے "میٹا" دینے کے علاوہ اس کے اعزاز میں موت کے مقابلے بھی منعقد کیے جائیں گے اور قربانیاں بھی دی جائیں گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم ملزم سرفروش کو تحفے کے طور پر کالے برِق کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اگر وہ اپنے ذوق و مقاصد کی تکمیل کے بعد اسے لوٹا دے تو ہم اسے دیوتا برِق کی بھینٹ چڑھا دیں گے۔ برِق اس کی قربانی سے بہت خوش ہوگا اور دیوی طوری سے ہماری سفارش کرے گا تو وہ ہم پر اپنی برکتیں نازل کرے گی اور ہمیں ایسی قوت بخشے گی جس کے بل بوتے پر ہم کالے برِق سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لیں گے۔"

ملکہ کے چاروں مشیروں نے اس تجویز پر سر ہلا دیے جیسے وہ بھی اس سے متفق ہوں۔ مشیرِ اعلا کی یہ تجویز، دُوسرے الفاظ میں میری موت کا منصوبہ تھی۔ اس لیے میں نے ملکہ کے تاثرات کا اندازہ لگانے کی خاطر کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے حسین سراپا نے میری دلی حالت تہ و بالا کر دی لیکن دُوسرے ہی لمحے میری توجہ جواہرات سے مرصع اُس نازک سے عصا کی طرف مبذول ہوگئی جو اُس نے اپنے دائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ وہ اسی عصا سے اپنے مشیرِ اعلا کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولی۔

"تم سوچے سمجھے بغیر بولنے کے عادی ہوتے جا رہے ہو بڑے میاں۔ تمھاری تجویز ملک و قوم کی بدخواہی کے مترادف ہے۔ کالے برِق کو خراج دینا مجھے بھی پسند نہیں لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کئی سالوں سے معاہدہ توڑنے اور ہم پر حملہ کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔ اگر اُسے یہ شک ہو جائے یا تمھاری تجویز کی بھنک پڑ جائے تو وہ فوراً ہم پر حملہ کر دے گا۔"

کریڈ نے ملکہ کی اس بات پر ندامت سے سر جُھکاتے ہُوئے کہا: "میں اپنی غلطی پر معذرت خواہ ہُوں ملکۂ عالیہ... لیکن میرا خیال تھا کہ اس طرح ہم سرفروش..."

"بس خاموش ہو جاؤ کریڈ۔" ملکہ اس کی بات کاٹتے ہُوئے بولی: "سرفروش کے سلسلے میں مجھے تمھاری تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔"

"میں آپ کی توجہ ماکونا کی طرف دلانا چاہتا ہوں ملکہ عالیہ۔" کریڈ نے پھر بولنا شروع کیا: "آپ بخوبی جانتی ہیں کہ وہ ایک محبِ وطن افسر تھا مگر کپتان برداش اسے قتل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اسی سرفروش کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ اسی نے اسے بغاوت پر اُکسایا تھا۔ اس لیے ہمیں بہر طور اسے ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔"

مجھے مشیرِ اعلا کی بات سے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ برداش کا ساتھی ہے چنانچہ میں نے بے ساختہ ملکہ کی طرف دیکھا جو عصا سے کھیلتے ہُوئے میری جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہماری نظریں ایک دُوسرے سے ملیں تو مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دکھائی دی مجھے اس چمک کا صحیح مفہوم معلوم نہ ہو سکا۔ یہ چمک مجھے پھانسی کے پھندے تک بھی لے جا سکتی تھی اور میں ملکہ کی خواب گاہ تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ پھر وہ عصا سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کریڈ سے بولی۔

"تم چاہتے ہو کہ اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے؟"

"ہاں ملکۂ عالیہ۔" مشیرِ اعلا کے اس جواب پر اُس کے ساتھیوں نے پھر تائیدی انداز میں سر ہلا دیے۔

ملکہ نے آنکھیں موند لیں اور عصا سے کھیلتے ہُوئے کچھ سوچنے لگی۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ برداش اور کریڈ کی سازش کامیاب ہو گئی ہے اور ملکہ میری سزا کے متعلق غور کر رہی ہے کہ اُسے کتنا کرب ناک بنایا جا سکتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگی۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے..." اتنا کہہ کر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میری قسمت کے فیصلے کی گھڑی آ گئی تھی۔

"موت کی سزا..." اتنا کہہ کر اُس نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں کہ موت تو کہیں بھی آ سکتی تھی پھر میں بُزدلی کا اظہار کیوں کرتا۔

"نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ اجنبی ہے اور قانونِ میزبانی کے تحت اسے تحفظ حاصل ہے۔"

"لیکن آپ اس قانون میں ترمیم کرنے کی مجاز نہیں ملکۂ عالیہ۔"

مشیرِ اعلا بولا "اگر آپ اسے موت کی سزا نہیں دینا چاہتیں تو پھر سے کالے برق کو تحفے میں دے دیجیے۔"

"تمھارے خیال میں یہ کوئی اچھا تحفہ ثابت ہوگا؟" ملکہ نے پوچھا۔

"ہاں ملکۂ عالیہ۔"

"تو پھر اُس سے زیادہ اچھے تحفے کی حق دار میں خود ہوں۔" ملکہ نے فیصلہ سُنا دیا۔

اس فیصلے سے جہاں میرے دل کا بوجھ ہٹ گیا۔ وہاں میں یہ سوچے بغیر بھی نہ رہ سکا کہ کیا ان لوگوں میں رشتوں کے تقدس کا کوئی تصور نہیں ہے؟ میں رشتے میں ملکہ کا داماد لگتا ہوں لیکن وہ... یا شاید ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے تحفے کے طور پر زینا کو دینا چاہتی ہو۔ اتنے میں کریڈ پھر بولا۔

"آپ کا ارشاد بجا ہے ملکۂ عالیہ لیکن تارسُو کا کیا ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ آپ اندھے تارسُو... سے خوش اور مطمئن ہیں۔"

"اُس کے اندھے پن میں... میرے لیے کوئی دلکشی باقی نہیں رہی اور نہ ہی وہ شاہی خاندان میں کسی لڑکی کے اضافے کا باعث بن سکا ہے۔" ملکہ بولی۔ "مگر سرفروش سے یہ فریضہ انجام دینے کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

"مگر ہم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے ملکۂ عالیہ۔" کریڈ اب تک میری موت کا خواہاں تھا۔

"سب جانتے ہیں کہ ایک اجنبی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ اپنے جڑواں بھائی کے ساتھ بحری جہاز میں سفر کر رہا تھا جو طوفان میں پھنس کر تباہ ہو گیا اور یہ سچ ہے۔ بنفشی سمندر میں طوفان آیا تھا جس میں ہمارے بھی کچھ جہاز غرق ہو گئے تھے۔"

میں نے اس اتفاق پر خدا کا شکر ادا کیا جس نے میرے جھوٹ کو سچ بنا دیا تھا۔

ملکہ ابھی تک بولے جا رہی تھی۔

"اور اس کے جڑواں بھائی والی بات بھی سچ ہے۔ تم جانتے ہو، پیغام رساں یہ خبر لایا تھا کہ بالکل اسی حُلیے کا ایک اجنبی بحری قزاقوں کو ساحل پر ملا تھا، وہ اُسے پکڑ کر لے گئے تھے اور آتشیں جزیرے پر چھوڑ آئے تھے۔"

اگرچہ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ ملکہ کی اجازت کے بغیر میں... لب کشائی نہیں کر سکتا مگر یہ بات سُن کر میں خاموش نہ رہ سکا۔

"کیا میرا جڑواں بھائی زندہ ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

اتنا سُنتے ہی کریڈ پھر بول اُٹھا۔ "اب تو فوری موت اس کا مقدر بن گئی ہے ملکۂ عالیہ۔ اس نے آپ کے حضور آپ کی اجازت کے بغیر لب کشائی کی ہے جس کی سزا فوری موت ہے۔"

"بس، بہت ہو چکی بڑے میاں۔" ملکہ نے عصا بلند کرتے ہوئے غصّے سے کہا۔ "یہ تکلفات اپنی جگہ درست سہی لیکن اس وقت میں نے اُنھیں نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر سرفروش کو مرنا ہے تو اس کی موت کا فیصلہ میں خود ہی کروں گی، سراما کی حکمراں میں ہوں، تم نہیں ہو۔"

"آپ کا فرمان سر آنکھوں پر۔" کریڈ عاجزی سے بولا۔ "میں نے تو صرف قانون کے احترام میں ایسا کہا تھا۔"

"تم مجھے سراما کی حکمراں کو قانون پڑھانا چاہتے ہو؟" ملکہ نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ملکۂ عالی مقام۔ غلام کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔" کریڈ نے سر خم کرتے ہوئے کہا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

"تم ہمارے تخت کے قریب آ سکتے ہو سرفروش۔" ملکہ نے مجھ سے کہا۔

میں چوکی سے اُتر کر ملکہ فیرا کے سامنے چلا گیا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ ہمیں گھٹنے ٹیک کر تعظیم دی جاتی ہے؟"

میں نے گھٹنے تو ٹیک دیے مگر اپنا سر بلند ہی رکھا۔ ہماری نگاہیں ایک بار پھر ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ وہ مجھے پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم جسامت میں تارسُو سے دُگنے ہو لیکن میرا خیال ہے کہ پھر بھی اُسے قتل کرنا تمھارے لیے بہت مشکل ہوگا چونکہ وہ اندھا ہے اس لیے تم بھی اندھے بن کر اُس کا مقابلہ کرو... انصاف کا یہ تقاضا ضرور پورا کیا جائے گا۔"

یہ سُن کر دہشت کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ وہ مجھے اندھا کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنی دہشت پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا۔

"کیا میرا بھائی زندہ ہے ملکۂ عالیہ؟ وہ کہاں ہے۔ اُسے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ زندہ ہے۔" ملکہ بولی۔ "میں نے کہا تھا کہ بحری قزاق اُسے آتشیں جزیرے میں لے گئے تھے۔ وہاں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ وہاں پانی نہیں ملتا اور سورج یوں آگ برساتا ہے جیسے برق کے منہ سے شعلے نکل رہے ہوں۔"

ان باتوں سے مجھے یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ میرا ڈپلی کیٹ بھی اسی سرزمین پر منتقل ہوا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا تھا۔ وہ زندہ ہے یا نہیں اور وہ آتشیں جزیرہ سراما سیڈ سے کتنی دور ہے، وہاں

کیسے پہنچا جا سکتا ہے چنانچہ میں نے کہا۔

"میں اپنے بھائی گُدرڈی کو تلاش کرنا چاہتا ہوں ملکۂ عالیہ۔ ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں۔ اگر اس کے زندہ رہ جانے کا امکان ہے۔ تو میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اُس کے پاس جانے کی اجازت دی جائے۔"

ملکہ کے پانچوں مشیر سرگوشیاں کرنے لگے۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ وہ زندہ نہیں بچا ہوگا اور اگر بچ بھی گیا تو میں تمھیں اسے تلاش کرنے کی اجازت تب تک نہیں دوں گی جب تک تم تارسُو سے مقابلے کے بعد مجھے اتنا خوش نہیں کر دیتے کہ میں تمھاری التجا ٹال سکوں۔"

"آپ کو خوش کرنا مجھے اپنے بھائی کی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے، محترم ملکہ لیکن ایک اندھے آدمی کو قتل کرنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔"

"تم اس اندھے کو نہیں جانتے سرفروش۔" ملکہ اپنے عصا سے پراسرار انداز میں تھپکتے ہوئے بولی۔ "وہ اندھا تین آدمیوں کو قتل کر چکا ہے جو اُس کی جگہ لینے کے آرزومند تھے۔ اگر اُس نے تمھیں بھی قتل کر دیا تو مجھے افسوس ہوگا۔" پھر وہ اپنے مشیروں سے مخاطب ہوئی۔ "سرفروش اور تارسُو کے مقابلے کا فوراً انتظام کیا جائے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ آج رات میری خدمت گاہ میں کون آتا ہے سرفروش یا تارسُو...؟"

●

اُنھوں نے مجھے اپنا مدِمقابل نہیں دکھایا اور بہت سے پہرے داروں کے گھیرے میں ایک چوکور اکھاڑے میں لے آئے جس کی سیڑھیوں کے نیچے بہت سی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے تنگ و تاریک کوٹھڑی میں دھکیل کر چلے گئے جس کے دروازے پر متعدد محافظ متعین تھے۔

کوٹھڑی بے حد غلیظ تھی۔ نہ صرف اُس سے بلکہ ملحقہ کوٹھڑیوں سے بھی بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ ملحقہ کوٹھڑیوں میں لڑاکا غلام محبوس تھے، ان میں سے کچھ رو رہے تھے، کچھ گالیاں بک رہے تھے اور کچھ قہقہے لگا رہے تھے۔

یہاں آتے وقت میں ان کوٹھڑیوں میں جھانکتا آیا تھا کہ شاید ہیلو دکھائی دے جائے مگر وہ کسی کوٹھڑی میں نظر نہیں آیا۔ میں یہ سوچ کر بے حد مغموم ہو گیا کہ اس غریب کا مستقبل مجھ سے بھی زیادہ تاریک ہو گیا ہے۔

مجھے بہت اچھا کھانا دیا گیا... پھر تھوڑی دیر بعد کپتان برداش اور مہا پجاری کریڈ آ گئے۔ برداش خاصا بنا سنورا اور بہت ہی خوش دکھائی دیتا تھا۔

"چونکہ تم قوی الجثہ، تندرست و توانا اور جنگجو آدمی ہو اور غلاموں کے زمرے میں بھی نہیں آتے، اس لیے تم ایک اندھے آدمی کی معذوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرو گے۔ تمھیں تارسُو کے ساتھ ایک اندھیرے کمرے میں مقابلہ کرنا ہوگا۔ تاکہ جس طرح اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا، تم بھی کچھ نہ دیکھ سکو۔ کیا تم ان باتوں سے متفق ہو؟"

"ہاں...۔" میں نے کہا۔ "مقابلے میں کون سے ہتھیار استعمال کیے جائیں گے؟"

برداش نے میرے بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تم صرف اپنے ہاتھ استعمال کرو گے مگر تارسُو کو تلوار دی جائے گی۔ وہ تمھارے مقابلے میں چھوٹا ہے۔ کیا تمھیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، مہا پجاری بول اُٹھا۔

"یہ اعتراض نہیں کر سکتا۔ ملکہ کا یہی حکم ہے اور ملکہ کا محبوب بننے کے لیے اسے جان کی بازی لگانا ہی پڑے گی۔"

برداش نے جو کبھی خوش نظر آتا تھا اور کبھی ناخوش، مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ "تم میری توقعات سے کہیں زیادہ خوش نصیب نکلے سرفروش! تم نے زینا کو ہار کر اس کی ماں کو جیت لیا ہے۔"

"تم بھی زینا کو ہار چکے ہو کپتان۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اگر وہ جہاز پر سزا بھگتنے کے لیے بھیج دی گئی ہے تو وہ تم سے بھی اتنی ہی دور ہے جتنی کہ مجھ سے... پھر میں نے تو اُسے پا کر کھو دیا ہے لیکن تم اُسے پا ہی نہیں سکے۔"

یہ سُن کر برداش نے کریڈ کی طرف دیکھا اور دونوں ہنس پڑے۔ برداش بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو سرفروش، لیکن تم نہیں جانتے اور نہ کبھی جان سکو گے کہ سراما سیڈ میں کیا کچھ ہوتا ہے؟ خیر ہٹاؤ۔ اب تم موت کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میری بددعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ تارسُو کو فتح نصیب ہوگی۔"

... پھر اُس نے محافظوں کو حکم دیا کہ مجھے اکھاڑے میں لے چلیں۔ وہ مجھے اپنے نرغے میں لیے ہوئے اکھاڑے کے وسط میں لے آئے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اکھاڑے کی سیڑھیاں تماشائیوں سے خالی تھیں لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اکھاڑے میں بیک وقت ایک لاکھ تماشائی آ سکتے تھے۔ اکھاڑے کے میدان میں ریت بچھی ہوئی تھی اور وسط میں زمین کے ساتھ

ایک جگہ تختہ نصب تھا جس میں لوہے کا ایک کڑا لگا ہوا تھا۔ یہ تختہ دراصل زمین دوز اکھاڑے کا دروازہ تھا۔

محافظوں کے اشارے پر چند غلاموں نے کڑا پکڑ کر تختہ اُٹھایا تو نیچے اُترنے والی سیڑھیاں دکھائی دینے لگیں۔ برداش، جس نے اب ہاتھ میں تلوار پکڑ رکھی تھی، زینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چلو نیچے اُترو سرفروش۔ تارسو تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔"

"تارسو اندھا ہے مگر میری آنکھیں ابھی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل نہیں ہوئیں۔" میں نے اُسے جواب دیا۔

"ملکہ نے انصاف کا تقاضا پورا کرنے کا حکم دیا ہے جسے بہر طور پورا کیا جائے گا۔ اب دیر مت کرو۔ شافران تمہاری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔"

برداش یہ کہہ کر مہا پجاری کے ساتھ واپس جانے لگا۔ میں نے غصے میں اُس کے پاؤں پر تھوک دیا اور شافران کی طرف دیکھا جو بے حد کریہہ الشکل کُبڑا تھا۔

وہ مکروہ تبسم کے ساتھ بولا۔"آپ کو شاید میری صلاحیتوں کا علم نہیں ہے جناب! میں جلاد بھی ہوں اور مجھے تشدد کے نت نئے طریقوں کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ گھبرایئے نہیں، آگے بڑھیے۔ تارسو کی تلوار بہت دنوں سے پیاسی ہے۔"

میں اُس بدطینت اور مکروہ جلاد کی رہنمائی میں سیڑھیاں اُترنے لگا۔

نیچے تہ خانے میں شاید مشعل جل رہی تھی۔ اُس کی زرد مدھم روشنی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی سُرنگ سے گزرتے ہوئے اس کے سامنے والے حصے میں نظر آیا کرتی ہے۔

تہ خانے کی تین دیواریں تو سنگِ سفید سے بنی ہوئی تھیں مگر چوتھی دیوار لکڑی کی تھی۔ شافران نے اُس دیوار پر دستک دیتے ہوئے بآوازِ بلند کہا۔"کیا تم تیار ہو تارسو؟"

دیوار کی دوسری جانب سے کرخت آواز آئی۔"ہاں میں اپنی تلوار کی پیاس اس شیطان کے خون سے بجھانے کے لیے بے چین ہوں، کُبڑے۔"

"تو دیوار پر ہاتھ رکھ دو تاکہ جب یہ بیچ سے ہٹے تو تمہیں پتہ چل جائے۔" شافران نے اسے ہدایت دی۔

"وہ میں نے پہلے سے رکھا ہوا ہے کمینے جلاد۔ اب بکواس بند کرو اور مجھے شکار کھیلنے دو۔"

شافران میری طرف پلٹا اور بولا۔"آپ سمجھ گئے نا؟ یہ کھیل بہت آسان ہے۔ میں جاتے ہوئے مشعل لے جاؤں گا اور جب اُوپر کا دروازہ بند ہو جائے گا تو روشنی کی ننھی سی کرن بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ تب یہ چوبی دیوار اُوپر اُٹھ جائے گی۔ ادھر بھی اتنا ہی بڑا اور ایسا ہی ایک کمرہ ہے پھر آپ اور تارسو موت کا کھیل کھیلنے کو یہاں رہ جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ ہاہاہا!"

مجھے اس بدطینت کُبڑے پر غصہ آ گیا۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف موڑتے ہوئے پیچھے سے کمر پر زوردار لات رسید کی اور کہا۔"دفع ہو جاؤ۔"

اس نے دیوار سے مشعل اُتاری اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔"شکریہ! تمہاری لاش گھسیٹتے ہوئے میں یہ قرض چکانا نہیں بھولوں گا۔"

"نکل جاؤ ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔" میں چلایا۔

وہ تیزی سے زینہ چڑھتا چلا گیا۔ میں جلدی سے چوبی دیوار کے قریب آیا اور پیٹ کے بل فرش پر لیٹ گیا۔ میرا ایک ہاتھ دیوار پر تھا۔ اتنے میں اُوپر سے تختے والا دروازہ گرا اور ایک دم چھا جانے والے گہرے اندھیرے میں چوبی دیوار اُوپر اُٹھنے لگی۔ میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا کہ اس سے کوئی آواز نہ پیدا ہو۔

اب وہاں گھپ اندھیرا اور سناٹا مسلط تھا۔

میں نے اپنی سانس بھی روک لی۔

چند لمحے اپنے اندر اضطراب اور خوف و دہشت کے طوفان لیے گزر گئے۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ اچانک مجھے اپنے قریب ہی انسانی پسینے کی بُو آئی اور اس کے ساتھ ہی "شپ" کی آواز سُنائی دی۔

تارسو کی تلوار میرے سر کے عین اُوپر لہرائی تھی اور یہ آواز اُسی کی تھی۔ شاید وہ بھی دُوسرے کمرے میں عین میرے مقابل کھڑا تھا اور اب اُس نے پہلا قدم اُٹھا کر ہوا میں تلوار چلائی تھی۔

میں نے فوراً بائیں جانب لوٹ لگائی۔

دُوسرے ہی لمحے مجھے کمرے کے پتھریلے فرش پر چنگاریاں سی اُڑتی دکھائی دیں۔

تلوار بڑے زور سے فرش کے ساتھ ٹکرائی تھی۔

میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کسی کیکڑے کی طرح چلتا ہوا پچھلی دیوار کی طرف لپکا اور دم سادھ کر پھر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔

میری چھٹی حس تیزی سے کام کرنے لگی تھی۔

مَیں نے ذہن میں کمرے کا نقشہ بنایا۔ زینہ میری پُشت پر تقریباً دس قدم دُور تھا۔ وہ اتنا تاریک تھا کہ اس میں تلوار نہیں گھمائی جا سکتی تھی۔ مَیں نے سوچا اگر مَیں تارسُو کو وہاں تک لے جاؤں تو کیسا رہے؟ جب وہ تلوار گھمانے کے قابل ہی نہیں رہے گا تو مَیں آسانی سے اسے ٹھکانے لگا دُوں گا... مگر یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی تو مجھے اس کے اندھے وار سے بچنا تھا... اور پھر مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی کہ اگر اندھیرے میں اس کا وار مجھ پر پڑ جائے تو...

اتنے میں ٹن سے کوئی چیز میرے سامنے فرش پر گری۔ یہ کوئی کنکر معلوم ہوتا تھا مگر مَیں اپنی جگہ ساکت رہا۔ تارسُو نے مجھے کھوجنے کے لیے بہت پُرانی چال چلی تھی۔ ایک لمحے بعد پھر وہی بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی مگر اب اس میں تیل یا چربی کی بساند بھی شامل تھی۔

میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دیوار سے ہٹ گیا۔

میرے ہٹتے ہی تلوار دیوار سے ٹکرائی اور اس ٹکر سے اُڑنے والی چنگاریوں سے مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ تارسُو کہاں کھڑا ہوگا۔ پیشتر اس کے کہ وہ دُوسرا وار کرتا ... میں فلائنگ کِک مارنے کے انداز میں اُس کی طرف اُچھلا تو میرا ایک پیر تارسُو کے جسم سے ٹکرا گیا۔

وہ گرا، تلوار فرش سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ ہی مَیں اس پر جا پڑا مگر میرا آدھا دھڑ اُس پر اور آدھا فرش پر تھا۔

مَیں نے اپنے وزن اور طاقت سے اُسے دبوچ کر بے بس کرنا چاہا لیکن اُس کم بخت نے اپنے جسم پر چربی یا تیل ملا ہُوا تھا اس لیے وہ مچھلی کی طرح پھسل پھسل جاتا تھا۔ مَیں اپنے ہاتھ اس لیے استعمال نہیں کر سکتا تھا کہ اُن سے مَیں نے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے تاکہ وہ مجھ پر تلوار کا وار نہ کر سکے۔

وہ اندھا جسامت میں مجھ سے کم ہونے کے باوجود بے حد عیار اور چُست و چالاک نکلا۔ اس جدوجہد کے دوران اُس نے اپنے دانت میرے نرخرے میں گاڑنے کی کوشش کی تو مَیں نے ٹکر مار کر اس کی ناک توڑ دی۔

اُس نے اپنا بایاں ہاتھ چھڑا کر میری داڑھی نوچنا شروع کر دی اور میرے پیٹ پر گھٹنوں سے ضربیں لگانے لگا۔ مَیں درد سے بے تاب ہو گیا مگر مَیں نے اُس کا تلوار والا ہاتھ نہ چھوڑا بلکہ اپنی تمام تر قوت سمیٹ کر اُسے توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ میری چال سمجھ گیا۔ اُس نے تلوار پھینک دی جو پھسلتی ہُوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔

مَیں نے تارسُو کو چھوڑ دیا اور اس طرف بڑھنا چاہا جدھر تلوار گری تھی مگر تارسُو کسی جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا اور بُری طرح نوچنے کھسوٹنے لگا۔ جب مَیں اُسے گرفت میں لانے کی کوشش کرتا تو وہ پھسل جاتا اور جب مَیں آگے بڑھنا چاہتا تو مجھ سے لپٹ جاتا۔ آخر مَیں فرش پر لوٹتا ہُوا تلوار کی سمت بڑھنے لگا مگر تارسُو نے بھی میرے ساتھ لوٹ لگائی اور اس کا ہاتھ مجھ سے پہلے تلوار پر جا پڑا لیکن مَیں نے اُسے تلوار استعمال کرنے کی مہلت نہ دی۔

اُس نے دوبارہ تلوار اُچھال دی۔

تلوار پھسلتی ہُوئی کمرے کی دُوسری دیوار سے جا لگی۔ وہ خود بھی میرے ہاتھوں سے پھسل کر میری دسترس سے دُور ہو گیا۔ مَیں نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے مگر اُسے تلاش کرنے میں ناکام رہا۔

یکایک دُوسری دیوار کے قریب ذرا سی آہٹ ہُوئی۔

وہ تلوار کے قریب پہنچ چُکا تھا۔

اب اُدھر جانا بے حد خطرناک تھا۔ مَیں جلدی سے ہاتھوں اور پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ اضطراب اور دہشت بھرے لمحے جاں گُسل محسوس ہونے لگے۔

دفعتہً "ہا" کے فاتحانہ نعرے کے ساتھ فرش پر تلوار کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ وہ تلوار ڈھونڈ چکا تھا۔ مَیں کسی بھی لمحے اُس کی زد میں آ سکتا تھا۔

مَیں جلدی سے پیچھے ہٹ کر زینے کی طرف کھسکنے لگا۔

زینے کی دیوار کے پاس پہنچ کر مَیں نے فرش ٹٹولا کہ شاید کوئی اُکھڑا ہُوا پتھر ہی مل جائے۔

خوش قسمتی سے مجھے ایک پتھر مل ہی گیا۔

مَیں نے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے زور لگا کر اُکھاڑ لیا۔ پتھر اکھڑنے کی آواز پر دُوسری دیوار کے قریب سے پہلی بار تارسُو کی آواز سُنائی دی۔

"تم زینے کی طرف جا رہے ہو سرفروش۔ میرے ہاتھوں مرنے والے وہ تینوں بھی زینے تک پہنچ گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مَیں تنگ زینے میں تلوار نہیں گھما سکوں گا اور وہ مجھ پر قابو پا لیں گے... مگر یہ اُن کی بھُول تھی۔"

یکایک اُس نے تلوار گھمائی تو گمبھیر خاموشی میں مجھے "شپ... شپ" کی آوازیں واضح طور پر سُنائی دیں۔ مَیں نے اپنی مٹھی سے دُگنا پتھر مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ مَیں پہلی ہی سیڑھی پر

ہُوا تھا کہ اب اُس نے ہوا میں تلوار چلائی تو اُسے پتھر کھینچ ماروں گا پھر خیال آیا کہ اگر نشانہ خطا ہو گیا تو ... محض آواز پر پتھر سے نشانہ لے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔

اچانک تارسُو نے عجیب و دہشت انگیز انداز میں مسلسل ہنسنا شروع کر دیا۔

"ہو ہو ہو ہو... ہو ہو ہو ہو... ہو ہو ہو ہو"

یہ منحوس آوازیں مسلسل سُنائی دینے لگیں اور یہ میرے اعصاب انداز ہو رہی تھیں۔ وہ ہنسنے کے ساتھ ساتھ آگے بھی بڑھ رہا تھا۔ شعوری طور پر دُوسری سیڑھی چڑھ گیا... پھر مجھے ایک خیال وہ زینے میں تلوار گھمانے کی بجائے اُسے گھونپنے کے انداز میں استعمال کرے گا کیونکہ وہاں یہی ممکن بھی تھا۔

مَیں نے چشمِ تصوّر سے دیکھا کہ مَیں سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جا چُکا ہوں، تارسُو زینے میں تلوار لیے اس طرح آگے بڑھ رہا ہے جیسے سینے میں گھونپنا چاہتا ہو... پھر وہ زینے کے دائیں بائیں اُوپر سے نیچے وار کرتا ہے اور میرے لیے مزید پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس تصوّر نے میری چھٹی حس کو بیدار کر دیا۔

مجھے کوہ نوردی کی ایک ترکیب یاد آگئی جس کے ذریعے آدمی دو چٹانوں کے درمیان ایک پر پاؤں جما کر اور دُوسری سے پیٹھ لگا کر اُوپر چڑھ سکتا ہے۔ مَیں نے یہی ترکیب آزمانے کا فیصلہ کرتے ہوئے زینے کی ایک دیوار کے ساتھ پیٹھ اور دُوسری دیوار کے ساتھ پاؤں جما کر اُوپر کھسکنا شروع کر دیا۔

کھُردری دیوار سے میری پیٹھ چھلنے لگی... مگر مَیں نے پروا نہ کی۔ وہ پتھر مَیں نے رانوں میں دبا لیا تھا اور جتنی جلدی کھسک سکتا تھا، کھسکنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد تارسُو کے قہقہے بند ہو گئے اور کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اسی سناٹے کی وجہ سے اُس نے میرے اُوپر کو کھسکنے کی آواز سُن لی اور زینے کے پاس آگیا۔ اب اُس کے پسینے یا چربی کی بُو پھر آنے لگی تھی۔

میرے کھسکنے کی آواز نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ مَیں زینے پر پہنچ چُکا ہوں۔

اُس نے اطمینان کی سانس لی۔

مَیں سمجھ گیا کہ اب وہ میرے قتل کے لیے تیار ہو چُکا ہے اور آگے بڑھنے والا ہے۔

مَیں نے آہستگی سے رانوں کے درمیان سے پتھر نکال کر مضبوطی کے ساتھ ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مَیں زینے میں اتنا اُونچا پہنچ چُکا تھا کہ وہ مجھ سے چھوئے بغیر نکل سکتا تھا۔ اُس نے تلوار سے پہلی سیڑھی ٹٹولی تو مَیں تیار ہو گیا۔

جُونہی مجھے بدبُو کا بھبکا آیا، مَیں بڑے زور سے پتھر والا ہاتھ نیچے لایا۔ میرا خیال تھا کہ پتھر اس کے سر پر پڑے گا مگر وہ اس کے شانے اور ہنسلی کی ہڈی پر لگا جو یقیناً ٹوٹ گئی ہوگی۔ تارسُو اس اچانک حملے اور ضرب کی شدت سے لڑکھڑایا اور اُس نے تلوار اُوپر اُٹھائی جو میری ران کو زخمی کر گئی۔

مَیں نے جلدی سے اُس کی گردن اپنی ٹانگوں کی قینچی سے جکڑ لی اور اپنا پورا وزن اُس پر ڈال دیا۔ وہ ڈگمگا کر گرا تو تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ مَیں بھی اُس کے ساتھ ہی گرا تھا مگر مَیں نے اس کی گردن نہ چھوڑی۔

وہ مجھے کاٹنے اور نوچنے لگا۔

پیشتر اس کے کہ اُس کی گردن میری ٹانگوں کی جکڑ بندی سے نکلتی، مَیں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا ٹینٹوا دبا یا اور اُس کا سر فرش سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ تیسری چوتھی ٹکر پر ہی اس کا بھیجا پاش پاش ہو گیا... اور اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکلیں جیسے اس نے دم توڑ دیا ہو۔

مَیں نے اُس کے مُردہ جسم کو پاؤں سے دھکیلا تو وہ فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ اب مَیں نے ہاتھ سے ٹٹول کر ران پر لگنے والے زخم کا معائنہ کیا۔ زخم گہرا نہیں تھا مگر اُس سے خُون جاری تھا جس سے میری ٹانگ تر بتر ہو گئی تھی۔

مَیں نے جلدی سے آگے بڑھ کر تارسُو کا مُردہ جسم تلاش کیا اور اُس کی کمر سے پیٹی اُتار کر اپنی ران کے زخم پر باندھ لی تاکہ خُون زیادہ نہ نکلنے پائے... پھر مَیں نے تلوار تلاش کی اور سیڑھیاں چڑھنے لگا... مگر زینہ عبور کرتے کرتے مَیں ایک دم رُک گیا۔ مَیں نے سوچا، موت کا مقابلہ تو مَیں جیت ہی چُکا ہُوں، پھر اُسے ڈرامائی رنگ دے کر لوگوں کو مرعوب کیوں نہ کیا جائے؟ اگر مَیں خُون آلود تلوار لہراتے ہُوئے تہ خانے سے باہر نکلوں تو دیکھنے والوں پر یقیناً میری بہادری کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ چنانچہ مَیں نے تلوار اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ لگا دی جس سے ابھی تک تھوڑا تھوڑا خُون رِس رہا تھا۔

چند لمحے بعد تلوار خُون آلود ہو گئی تو مَیں نے سیڑھیاں چڑھ کر تلوار سے تختے کو کھٹکھٹایا اور پُوری قوت سے چِلّایا...

"دروازہ کھولو... دروازہ کھولو۔"

باہر سے غلاموں کو کوسنے اور اُن پر کوڑے برسانے کے ساتھ ساتھ دروازہ کھولنے کے احکام سُنائی دینے لگے... اور پھر دروازہ

کھل گیا۔

تیز روشنی سے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں مگر میں نے نہ انھیں بند کیا اور نہ ہی ہاتھ سے ان پر چھجا بنایا... پھر میں فاتحانہ انداز سے باہر آ گیا۔

زخم کی وجہ سے مجھے تکلیف محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے لنگڑانے میں توہین محسوس کی۔ اس لیے سینہ تانے اُس طرف بڑھنے لگا جدھر برداش اور کرنڈ کھڑے تھے۔ وہ، سپاہی اور غلام سب حیرت سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔

جب میں اُن کے قریب پہنچا تو برداش کے نائب نے میرا راستہ روکنا چاہا... مگر میں نے تلوار سے اُسے ایک طرف ہٹا دیا۔

"تم نے تارمُو سے مقابلہ جیت لیا؟ یہ تو ناممکن تھا۔ تم .برق کی نظرِ کرم کے بغیر اس پر فتح حاصل کر ہی نہیں سکتے تھے... مگر ہمارے دیوتا اور دیوی تم پر نظرِ کرم کیوں ڈالنے لگے؟" مہا پجاری چلّا۔

وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ برداش نے اُسے روک دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم ایک بار پھر خوش قسمت ثابت ہوئے ہو سرفروش میرا خیال ہے کہ تارمُو کمزور ہو گیا تھا۔ بہرکیف اصل وجہ اب کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔"

"اصل وجہ ایک نہ ایک روز تمھیں ضرور معلوم ہو جائے گی، کپتان۔ یہ تم سے میرا وعدہ ہے۔ اب مزید تاخیر نہ کرو اور مجھے ملکہ کے پاس لے چلو۔"

کپتان برداش نے بادلِ نخواستہ میرے سامنے سر خم کر دیا۔ مہا پجاری اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"وہی کرو جو سرفروش کہتا ہے۔ اب یہ ہمیں حکم دے سکتا ہے چاہے وقتی طور پر سہی۔" برداش نے کہا اور کبڑے شافران کی طرف مڑ کر غرایا "اُس بن مانس کی لاش وہاں سے ہٹاؤ اور اُسے برق کے شکم میں ڈال کر نذرِ آتش کر دو۔"

★★

مجھے ایک بار پھر غسل دیا گیا۔ ران کے زخم کی مرہم پٹی کی گئی اور سجا سنوار کر ملکہ فیرا کی خواب گاہ میں بھیج دیا گیا۔ جونہی میں نے دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر قدم رکھا، وہ تعجب اور خوشی سے بستر پر اُٹھ بیٹھی۔

"اوہ، سرفروش! میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اندھا وحشی تم پر حاوی نہ ہو جائے مگر دیوی نے تمھیں اس پر حاوی کر دیا۔ اگر تم مر جاتے تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔"

میں نے اُسے جواب دینے سے پہلے اپنا سر ذرا سا خم کیا اور بولا "میں آپ کا شکر گزار ہوں ملکۂ عالیہ کہ آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔"

وہ کچھ کہنے کی بجائے پیار سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے تو میرے بازوؤں کی مچھلیاں اُبھر آئیں۔ میں دروازے کے قریب ہی کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اس وقت بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور ہونٹوں پر کھیلنے والا تبسم معنی خیز تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے وہ روایتیں یاد آ گئیں جو ہم نے اُس کی عمر کے بارے میں سُنائی تھیں لیکن اس کے شگفتہ اور شاداب سراپا پر وقت کا ہلکا سا نقش پا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس نے ابھی ابھی شباب کی دہلیز پر قدم رکھا ہو۔

"یہاں آؤ، میرے پاس بیٹھو۔" اس نے مترنم آواز میں کہا۔ "تم تو بے حد مرعوب لگ رہے ہو۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر ملکۂ عالیہ لیکن میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے، وہ..."

"سراما سیڈ میں صرف دل کے رشتے کو اہمیت دی جاتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے سرک کر میرے لیے جگہ بنا دی۔

اب میں اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جتنی خوش اسلوبی سے میں اُس کے حکم کی تعمیل کروں گا اتنی ہی جلدی وہ میرے زیرِ اثر آ جائے گی تب ہی میں اسے اپنے احکام کی تعمیل کرنے پر مجبور کر سکوں گا۔ دوسرے میری بقا کا دار و مدار بھی اُس کی خوشنودی پر تھا لہٰذا میں ہر قیمت پر اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ قربِ وصال کی گھڑیاں بالآخر اُسے مجھ پر مہربان کرنے میں کامیاب ہو گئیں تب میں نے پہلا سوال کیا۔

"کیا مجھے اپنا نوکر پیلو واپس مل سکتا ہے؟"

"اگر وہ کرنڈ اور برداش کے ہاتھوں اب تک مر نہیں گیا تو ضرور مل جائے گا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"مگر اُن کا پیلو سے کیا تعلق ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کرنڈ نے پیلو کو مجھ سے مانگا تھا۔ برداش نے بھی اُس کی تائید اور سفارش کی تو میں انکار نہ کر سکی اور پیلو کو اُس کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا۔"

مجھے فیرا کی اس بات نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر وہ اُن کی بات کیوں نہیں ٹال سکی؟ وہ ملکہ فیرا پر اس قدر حاوی کیوں ہے کہ وہ اس سے انکار نہ کر سکی؟

"وہ لوگ پیلو پر تشدد کریں گے اور اُسے ایذا پہنچا کر میرے بارے میں جاننا چاہیں گے مگر وہ غریب انھیں وہی کچھ بتا سکے گا جو میں نے اُسے بتایا ہے۔ وہ لوگ ان معلومات سے مطمئن نہیں ہوں گے اور اُسے مار ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم پیلو کے لیے اتنے پریشان کیوں ہو؟ تمھارا اُس سے کیا تعلق ہے، سرفروش؟"

"وہ میرا دوست ہے فیرا۔ جب طوفان نے مجھے ساحل پر پھینکا تو اس سرزمین پر وہی سب سے پہلے مجھے ملا تھا اور میرا دوست بن گیا تھا۔" میں نے بے تکلفی سے کہا اور اُسے ملکۂ عالیہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میری اس وضاحت پر فیرا نے مسہری کے پہلو میں لٹکتی ہوئی رسی کھینچی تو باہر کہیں گھنٹیاں بج اٹھیں اور چند لمحے بعد ایک غلام خواب گاہ میں داخل ہوا۔ فیرا نے اُس سے کوئی حجاب محسوس نہ کرتے ہوئے کرنڈ اور برداش کو پیغام بھجوایا کہ پیلو کو، چاہے وہ جس حال میں بھی ہو، واپس کر دیا جائے۔

جب غلام چلا گیا تو وہ میری طرف پلٹ کر بولی "میں تم سے بہت خوش ہوں سرفروش! مانگو اور کیا مانگتے ہو؟"

وہ اس گھڑی بے حد مسرور تھی۔

"میں ان بحری مقابلوں میں حصہ لینا چاہتا ہوں جو کالے برق کے اعزاز میں منعقد کیے جائیں گے۔ اس لیے مجھے ایک جہاز کا کپتان بنا دو۔ میں اپنے آپ کو اس اعزاز کا اہل ثابت کروں گا۔"

"منظور۔" وہ بولی "اور کیا چاہیے تمھیں؟"

"میں کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ تمھیں غصہ نہ آ جائے۔"

"نہیں۔ ان لمحوں میں مجھے غصہ نہیں آ سکتا۔ پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"مہا پجاری کرنڈ اور برداش کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ یہ میں اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے سازشی نظر آتے ہیں۔"

فیرا ہنس پڑی "تمھارے بارے میں سچ ہی بتایا گیا تھا کہ تم دانا اور دور اندیش ہو۔ تمھارا اندازہ ٹھیک ہے کہ وہ سازشی ہیں۔ میرے جاسوس بھی مجھے بتا چکے ہیں کہ وہ میرے خلاف سازش کر رہے ہیں۔"

"پھر بھی تم نے انھیں ڈھیل دے رکھی ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولی "یہ ہمارے ہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنی سازش کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں تو میں اُن پر ہاتھ ڈال سکوں مگر کرنڈ بزدل ہے اور وہ میری مٹھی میں بھی ہے۔"

"اوہ... اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ تمھارا جاسوس ہے اور خود اپنے خلاف ہی جاسوسی کر رہا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم ٹھیک سمجھے سرفروش۔ اب یہ بتاؤ کہ میں تمھیں اپنا سمجھوں یا نہیں؟ کیا تم کالے برق کے خلاف میرا ساتھ دو گے؟"

"مگر تم نے تو کرنڈ کو کالے برق کے خلاف بولنے پر ڈانٹ دیا تھا اور کہا تھا کہ چپ چاپ خراج ادا کرنے میں ہی عافیت ہے۔"

"ہاں سرفروش! میں نے یہی کہا تھا۔ ہر وہ آدمی جسے اپنی زندگی عزیز ہے، اسی طرح کہتا ہے لیکن دل میں ہم سب اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم اُس سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ میرے ایک جاسوس کے بدلے اس کے دس جاسوس ہماری صفوں میں کام کر رہے ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ برداش بھی اسی کا جاسوس ہے اور اُس نے براہِ راست کالے برق سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ وہ مجھے راستے سے ہٹا کر خود سراما کا حکمراں بننا چاہتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے نہ صرف اُس کی آواز بھرا گئی بلکہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی تیرنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایسی بے رحم اور سنگدل عورت جو تارمُو کی کربناک موت کا حال مزے لے لے کر سُن رہی تھی یوں آنسو بھی بہا سکتی ہے۔ میں نے اُسے زبانی دلاسا دینے کی بجائے اُس کا شانہ تھپکا تو وہ پھر بولنے لگی۔

"برداش کی غداری کا باعث شاید یہ ہے کہ وہ خالص سرامانی نہیں بلکہ دوغلا ہے اور یہ بات پورے سراما میں صرف میں ہی جانتی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا کیونکہ برداش مجھے بھی سرامانی نہیں لگتا تھا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ دوغلا ہے؟"

"میں اُس کی ماں ہوں، سرفروش!" فیرا بولی تو مجھے یوں لگا جیسے اس انکشاف سے میری کھوپڑی پر زبردست دھماکا ہو گیا ہو۔ میں سوچنے لگا کہ کیا اُس کے بارے میں مشہور روایتیں واقعی سچ ہیں؟ کیا وہ ازل سے زندہ ہے اور ابد تک جوان رہے گی؟ کیا یہ کبھی بوڑھی نہیں ہو گی؟

اُس نے مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھا تو بولی "شاید تمھیں میری بات کا یقین نہیں آیا... مگر یہ حقیقت ہے۔ وہ میری

کوکھ سے جنم لینے والا واحد بیٹا ہے۔ قریں گزرس، منگولیا سے ایک شخص یہاں آیا تھا۔ منگولیا یہاں سے بہت دُور ہے آتشیں تحزین سے بھی بہت دُور۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے لیکن یہ تعلق بہت جلد ختم ہوگیا۔ تاہم میں اُسے کبھی نہیں بھول سکی۔ وہ بہت غصّہ ور، مغرور اور جنگجو تھا۔ اُسے سرا ما پسند نہیں آیا اور وہ اپنے وطن واپس چلا گیا۔ جب مجھے اس کے واپسی کے ارادے کا علم ہوا تو میں بہت رو ئی تھی مگر میری انا نے مجھے اُس سے رُکنے کی التجا نہ کرنے دی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کی نشانی میرے بطن میں پرورش پا رہی ہے۔ اور یہ نشانی برداشش ہی تھی۔ چونکہ اس ملک پر عورتوں کی حکمرانی رہی ہے اور رہے گی، اس لیے بچہ پیدا ہوتے ہی ماں سے جدا کر کے دائیوں کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے۔ وہی اُس کی پرورش کرتی اور اسے پروان چڑھاتی ہیں۔ لڑکوں کو یہ کبھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ ان کی سگی ماں کون ہے۔ وہ دایا کو ہی اپنی ماں سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو جانتے تھے کہ برداشش میرا بیٹا ہے، انھیں میں نے کسی نہ کسی الزام میں قتل کرادیا ہے۔ اب یہ راز صرف میں جانتی ہوں یا تمھیں معلوم ہوا ہے۔ تمھیں بھی میری طرح یہ راز اپنے سینے میں دفن رکھنا پڑے گا کیونکہ یہ راز میرے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ویسے اس انکشاف سے برداشش کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ حکمرانی عورتوں کے حصّے میں آتی ہے۔ مرد زیادہ سے زیادہ کپتان بن سکتے ہیں۔"

"اگر برداشش کی سازش کامیاب ہو جائے اور کالا برق اُسے یہاں کا حکمران بنا دے تو کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر بھی وہ یہاں زیادہ عرصے تک حکمرانی نہیں کرسکے گا سرفروش۔ کالے بروق کا بیٹا جماد ابھی چھوٹا ہے۔ جب وہ بڑا ہوگا تو کالا بروق، برداشش کو کسی غلام کی طرح قتل کر کے جماد کو یہاں کا حکمران بنا دے گا۔ اس لیے میں نہیں چاہتی کہ میرا اکلوتا بیٹا تخت نشین ہو کر ذلت کی موت مرے۔ اُسے تخت نشینی کے مرحلے تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے تو بہتر ہے۔"

میں نے ایک نگاہ فیرا پر ڈالی جس کے چہرے پر دوشیزاؤں کی سی تازگی تھی جبکہ میں اُس کے بیٹے کی داڑھی میں چاندی کے تاروں جیسے چمکتے بال دیکھ چکا تھا۔ فیرا اپنے اسی بے رحم اور ظالم بیٹے کو موت کے منہ میں جانے سے روکنا چاہتی تھی جسے میں خود موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کہا:

"تم نے ہمیشہ اُس کا خیال رکھا، اُسے تحفظ دیا اور جو دے سکتی تھیں، دے چکی ہو۔ اب وہ ایک بھرپور اور بالغ مرد ہے۔ اُسے خود عقل سے کام لینا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، سرفروش۔ میں اُس کے لیے مزید کچھ نہیں کرسکتی۔ اوپر سے وہ میری موت کا خواہاں ہوگیا ہے۔"

"تمھیں یقین ہے کہ تمھارے علاوہ کوئی بھی حتیٰ کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ تمھارا بیٹا ہے؟"

"ہاں سرفروش۔ اب میرے علاوہ صرف تم یہ راز جانتے ہو۔ مجھے اعتماد ہے کہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔"

"تم کہتی ہو کہ تمھیں مجھ پر اعتماد ہے تو مجھے زیبا کے متعلق بتا دو۔ کیا وہ واقعی تمھاری بیٹی ہے؟ اگر وہ تمھاری بیٹی ہے تو اُسے سزا کیوں دی اور وہ اس وقت کہاں ہے، کیسی سزا بھگت رہی ہے؟"

یہ سن کر فیرا کا چہرہ ایک دم سُت گیا۔ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں گاڑ دیا اور مجھے گھورنے لگی جیسے میری آنکھوں میں اُتر کر دل کا حال جاننا چاہتی ہو۔ کچھ دیر اسی طرح دیکھتے رہنے کے بعد بولی...

"یہ سچ ہے کہ زیبا میری بیٹی ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دن اس ملک کی حکمراں بن جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نہ بنے کیونکہ میری متعدد بیٹیاں ہیں۔ شاید ان میں کوئی دوسری ملکہ بننے میں کامیاب ہو جائے۔ غالباً تم نہیں جانتے کہ ملکہ کی حیثیت سے میرا ایک فرض یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بیٹیوں کو جنم دوں... مگر جیسا کہ میں تمھیں بتا چکی ہوں، بچوں کو جنم دینے کے بعد ان سے میرا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ کنیزیں اور خادمائیں انھیں پالتی پوستی ہیں، اتالیق انھیں تعلیم دیتے ہیں اور پھر وہ بیماریوں کے سپرد کردی جاتی ہیں۔ مجھے اُن کے بارے میں نہیں بتایا جاتا۔ کچھ مرجاتی ہیں، کچھ قتل کردی جاتی ہیں۔ کچھ سازشیں کرتی ہیں اور کچھ شادی کر کے حکمرانی کے حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ تاہم سب کو عسکری اور انتظامی امور ضرور سکھائے جاتے ہیں۔ میں بھی ان تمام مراحل سے گزری تھی۔ میری تیس بہنیں تھیں۔ اُن میں سے صرف میں ہی زندہ رہی اور ملکہ بننے کے لیے مجھے اپنی ماں کو زہر دے کر راستے سے ہٹانا پڑا تھا۔"

میں جانتا تھا کہ ملکہ فیرا کا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ پیلو بھی مجھے اسی قسم کی باتیں بتا چکا تھا۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے فیرا، تم نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا لیکن زیبا کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں اس کے بارے میں اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ اُس نے میرے ساتھ شادی کی تھی اور وہی بتانے تمھارے پاس آئی تھی۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ صحیح و سلامت ہے یا نہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے، سرفروش۔ کوئی عام آدمی اُسے چھونے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا۔ صرف مجھے اور اس کی بہنوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اُسے سزا دے سکیں۔ اُسے بھی ہمارے خلاف سازش کرنے اور حکمران بننے کا حق حاصل ہے۔" فیرا نے وضاحت کی۔

"تو پھر جہاز پر سزا بھگتنے کا کیا مطلب ہے؟"

"وہ ایک ایسے جہاز پر سزا بھگت رہی ہے جس پر کپتان کے علاوہ باقی سب عورتیں ہیں۔ سزا کے طور پر اسے وہاں غلاموں کی طرح صرف دو گھنٹے روزانہ چپو چلانا پڑتے ہیں۔ اب میں تمھیں یہ بھی بتا دوں تو بہتر ہوگا کہ سزا یافتہ لوگوں کے بارے میں پوچھنا اور باتیں کرنا بھی یہاں خلافِ قانون ہے۔"

"میں نے اس کے بارے میں صرف اسی لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے پسند تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اُسے کوئی تکلیف پہنچے۔ اب مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ اُسے کوئی تکلیف نہیں۔ تاہم میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اُسے یہ برائے نام سزا کیوں دی گئی ہے؟"

"میں بتاتی ہوں۔" فیرا بولی۔ "یہ سزا اُسے اس لیے دی گئی ہے کہ وہ تم سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس لڑکی کے لیے مبتلائے محبت ہونا اچھا نہیں ہوتا جس کے ملکہ بننے کا امکان ہو۔ اس کے علاوہ اس نے تمھاری شجاعت اور مردانگی کی اتنی تعریف کی تھی کہ مجھے تم کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا۔ وہ تمھاری محبت میں اتنی آگے بڑھ گئی تھی کہ اس نے میری مشاورت کے سامنے حقوقِ حکمرانی سے دستبرداری کا اعلان کردیا۔ وہ صرف تمھیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھ پر زور دیا تھا کہ تمھیں تربیت گاہِ غلاماں سے رہا کرا دوں اور ایک آزاد اجنبی کی حیثیت سے تمھارا استقبال کروں۔"

"اور تم نے اس کے لیے اتنا بھی نہ کیا؟" میں نے کہا۔

"میں اُس کے لیے ایسا کیوں کرتی سرفروش۔ میں نے تمھاری ذہانت، شجاعت اور مردانگی کے اس سے اتنے قصّے سُن لیے کہ تمھیں تارسو کی جگہ لانے کا ارادہ کر بیٹھی۔ اور ملکہ جو چاہتی ہے، وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔"

...اور پھر کالا بروق سالانہ خراج وصول کرنے کے لیے سراما سیڈ پہنچ گیا۔ اُسے ہر سال سو بوریاں "میٹا" دیا جاتا تھا۔ میٹا چاندی کی طرح چمک دار دھات تھی جسے غلام مجبور سے پہاڑوں کی کانوں سے نکالتے تھے اور اُسے پگھلا کر سلاخوں کی شکل میں ڈھال دیتے تھے۔ کالا بروق ان سلاخوں کے سکّے تیار کرواتا تھا جن کے درمیان سوراخ ہوتا تھا تاکہ انھیں لڑیوں میں پرو دیا جاسکے۔ وہ جعلی سکّے بنانے والوں کو بدترین سزا دیتا تھا کہ سکّے بنانے کے تمام حقوق اس کے اپنے پاس تھے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کی کھال کھنچ کر انھیں کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال دیا جاتا تھا۔

جیسا کہ ملکہ فیرا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا مجھے بحری مقابلوں میں حصّہ لینے کے لیے ایک جہاز دے دیا گیا تھا۔ اس مقابلے میں دو حریف ہوا کرتے تھے۔ ایک گروہ کالے بروق کی طرف سے حصّہ لیتا تھا اور دوسرا ملکہ فیرا کی طرف سے۔ کالے بروق کو خوش کرنے کے لیے فیرا کا گروہ ہمیشہ ہارتا تھا اور وہ لوگ نقصان اُٹھایا کرتے تھے۔ اس بار فیرا کے گروہ کی نمائندگی میں کر رہا تھا اور اس گروہ میں حصّہ لینے والے غلاموں کا انتخاب بھی مجھ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

پیلو مجھے واپس مل گیا تھا۔ ابھی اس کی ایک ٹانگ ہی کریڈ کے تشدّد کی زد میں آئی تھی کہ ملکہ کا پیغام پہنچ گیا تھا۔ اب وہ قدرے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ میں نے غلاموں کے انتخاب کی ذمّے داری اُسے سونپ دی تھی کیونکہ وہ وہاں کے لوگوں کو مجھ سے بہتر جانتا تھا۔

اُس نے جو غلام منتخب کیے ان میں وہ مکروہ شکل کا کبڑا شافران بھی شامل تھا، جسے تارسو سے مقابلے والے روز میں نے لات ماری تھی۔ جب میں نے اُس کی شمولیت پر اعتراض کیا تو پیلو اس کی وکالت میں بولا۔

"یہ میرا پُرانا دوست ہے۔ جب اسے غلام بنایا گیا، اس وقت "میٹا" کی کانوں میں کام کرنے والے غلاموں کی سخت قلت تھی اور میٹا کی کانیں موت کی آغوش ہوتی ہیں۔ وہاں کام کرنے والے غلاموں کے اجسام پر پھوڑے نکل آتے ہیں اور وہ بیمار ہو کر مرجاتے ہیں۔ شافران نے وہاں کام کرنے کی بجائے جلّاد بننا منظور کر لیا۔ اگر اُس کی جگہ ہم آپ ہوتے تو ہم بھی یہی کرتے۔"

میں نے ایک نظر شافران کی طرف دیکھا جس نے چمڑے کی لنگوٹی باندھ رکھی تھی۔ اس کی ٹانگوں پر پھوڑے پھنسیاں دکھائی دے رہی تھیں اور گلے میں آہنی طوق پڑا ہوا تھا۔ پیلو پھر بول اُٹھا۔

"میں اس کی ہر طرح سے ذمّے داری لینے کو تیار ہوں۔

ہمارے گروہ کے ہر غلام کی طرح یہ بھی آزاد ہونے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ آپ میرے کہنے پر اسے ایک موقع دے دیجیے۔"

"اچھی بات ہے پیلو... لیکن اگر اس کی بیماری دوسروں کو لگ گئی تو...؟"

"یہ بیماری دوسروں کو نہیں لگ سکتی۔ میں تھوڑی بہت حکمت بھی جانتا ہوں۔ دوسرے یہ پھوڑے پھنسیاں تو ہر کان کن کو نکل آتی ہیں۔ اگر یہ چھوت چھات کی بیماری ہوتی تو آج سراما کی آدھی آبادی پھوڑے پھنسیوں میں مبتلا نظر آتی۔"

"اگر تم بضد ہو تو اس کے گلے سے یہ طوق اتار دو، اسے نہلاؤ دھلاؤ، دوسرے کپڑے پہناؤ اور بتا دو کہ میرے سامنے نہ آیا کرے۔" میں نے فیصلہ سنا دیا۔

"بہت بہت شکریہ کپتان۔ آزاد ہونے سے پہلے یا بعد میں، جب بھی موقع ملا میں آپ کے اس احسان کا قرض ضرور چکاؤں گا۔" پیلو کے بجائے شافران بولا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔

غلاموں کے انتخاب سے پہلے میں نے پیلو کو بتا دیا تھا کہ وہ صرف اُن غلاموں کو بھرتی کرے جو آزادی حاصل کرنے کے متمنی ہوں اس لیے کہ اس مقابلے کے ساتھ ہی مجھے فرار حاصل کرنے کی بھرپور کوشش بھی کرنا تھی تاکہ زینا اور اپنے ڈیلی کیٹ کو تلاش کر سکوں۔

پیلو اور شافران کے ساتھ میری یہ گفتگو اس جہاز پر ہوئی تھی جس کا فیرا نے مجھے کپتان بنایا تھا۔ اس جہاز کا نام بھی فیرا ہی تھا۔ یہ نیا اور خاصا مضبوط تھا۔ پیلو نے میرے نائب کی حیثیت سے جس غلام کو بھرتی کیا تھا اس کا نام ارغون تھا اور غلام بننے سے پہلے وہ ملاح کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔ میں نے اُسے بلایا اور اُس کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے لگا۔

بحری مقابلہ شروع ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ ہم اس مقابلے کے لیے پچھلے کئی روز سے تیاریاں کر رہے تھے۔ جب ارغون مجھے تیاریوں کی تفصیل بتا چکا تو میں نے پوچھا: "وہ کام کہاں تک پہنچا؟"

"میں نے دو آدمیوں کو رات بھر اس کام پر لگائے رکھا ہے۔ وہ نئی چیز جسے آپ ریتی کہتے ہیں خوب کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے، زنجیر ٹوٹ جائے گی۔"

میں نے اُس لمبی زنجیر کی طرف دیکھا جو بندرگاہ کے تنگ دہانے پر راستہ روکنے کے لیے تان دی گئی تھی۔ میرے لیے یہ بات بڑی تعجب خیز تھی کہ اہل سراما اب تک نہ ریتی بنا سکے تھے اور نہ ہی اس کا استعمال جانتے تھے۔ مگر زنجیریں بڑی مضبوط بنا لیتے تھے۔ میں نے ارغون سے پوچھا۔

"انھیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں کپتان!... اگر کوئی انھیں دیکھ لیتا تو اب تک ہم بروق کے آتشیں شکم میں جل بھن کر راکھ ہو چکے ہوتے۔"

"تم بھی وہاں گئے تھے؟"

"ہاں، زنجیر کی کڑی آدھی سے زیادہ کٹ چکی ہے۔"

یہ زنجیر ہم نے کل رات سے کاٹنی شروع کی تھی۔ اسے کاٹنے کے لیے میں نے معمولی تلواروں کو ایک دوسرے سے رگڑ رگڑ کر ریتیاں بنالی تھیں۔ زنجیر سے پرے ارغوانی سمندر پھیلا ہوا تھا اور افق پر زرد کہر اُٹھ رہی تھی۔ میرے لیے سمندر اور کہر کے رنگ بھی عجوبے کی حیثیت رکھتے تھے۔

ارغون نے مجھے بتایا تھا کہ سراما کے بالمقابل سمندر کے اُس پار مملکت نورنیہ واقع ہے جس پر کالا بروق حکومت کیا کرتا تھا۔ کالا بروق اُسے دیوتا بروق کے نام کی مطابقت سے کہا جاتا۔ بروق دیوتا جس قدر رحمتیں اور برکتیں نازل کرتا تھا کالا بروق اتنا ہی ظالم اور سفاک تھا اس لیے اُسے کالا بروق کہا جاتا تھا ورنہ اس کا نام ادلو تھا۔

بہرحال، فرار کے بعد ہمیں نورنیہ کا بھی رُخ نہیں کرنا۔ غلاموں کے لیے اس فرار کا مقصد آزادی تھا مگر میں زینا اور اپنے ڈپلی کیٹ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ صرف تین روز پہلے فیرا کی بحریہ کے ایک افسر نے بتایا تھا کہ بحری قزاقوں نے اپنی گرفتاری کے بعد اس امر کی تصدیق کی تھی کہ میرے حلیے کا ایک آدمی انھیں سمندر میں ایک تختے پر بہتا ہوا ملا تھا۔ انھوں نے اُسے محض اس لیے قتل نہیں کیا کہ انھیں کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا انھوں نے اُسے آتشیں سرزمین پر بھوکا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

میں نے ارغون کو ریتیاں سمندر میں پھینکنے کا حکم دے کر دُوربین آنکھوں سے لگالی اور بادبانی جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ دُوربین سرامانی لوگوں ہی کی ایجاد تھی۔ ایک لمبی سی نلی میں آگے پیچھے دو شیشے لگے ہوئے تھے اور درمیانی حصے میں پانی بھر دیا گیا تھا، یہی پانی محدب عدسے کا کام دیتا تھا۔ میرے لیے یہ بات بھی حیرت انگیز تھی کہ سرامانیوں نے دُوربین تو بنا لی مگر ریتیہ نہیں بنا سکے۔

بادبانی جہاز پر لہرانے والا سُرخ و سفید دھاری دار

پرچم پیغام دے رہا تھا کہ مقابلہ شروع ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ فیرا اور کالا بروق، دیوتا کو دی جانے والی قربانیوں کی تقریب سے فارغ ہو کر بندرگاہ کی طرف چل پڑے ہیں۔ گزشتہ رات میں نے ملکہ فیرا کے ساتھ اکھاڑے میں وہ مقابلے بھی دیکھے تھے جو کالے بروق کے اعزاز میں منعقد کیے گئے تھے۔ غلاموں کے دو گروہ دیوانہ وار ایک دوسرے کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ آخر میں دونوں گروہوں میں سے صرف ایک ایک آدمی زندہ بچا تھا۔ آج قربانی کی تقریب میں شمولیت کے لیے میں نے محض اس لیے معذوری ظاہر کر دی تھی کہ غلاموں کو منجنیقوں کے ذریعے سونے کے اونچے مجسمے کے شکم میں پھینکے جانے کا منظر میری برداشت سے باہر ہو جاتا۔ سرامانی منجنیقوں سے نشانے بازی کے بے مثال ماہر تھے۔ اتنے میں مجھے بروق والے میدان سے دُھواں اُٹھتا دکھائی دیا۔ ساتھ ہی اُدھر سے آنے والی ہوا اپنے ساتھ گوشت جلنے کی بُو بھی لے آئی تو میں نے منہ پھیر لیا۔ منجنیقیں، بھینٹ چڑھائے جانے والے غلاموں کو بروق کے سوراخ شکم میں پھینک رہی تھیں۔

میں نے ایک بار پھر دُوربین اپنی آنکھوں سے لگالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کالے بروق کے جہازوں پر بھی منجنیقیں نصب کر دی گئی تھیں اور ان کے ساتھ بھاری پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کالے بروق کے گروہ کا سربراہ برواش تھا جسے قدرت نے مجھے ٹھکانے لگانے کا شاندار موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس لیے کہ میرے جہاز اور گروہ کی چار کشتیوں پر منجنیقیں تو کُجا، بڑی کمانیں بھی نہیں تھیں جن سے بیک وقت متعدد تیر چلائے جا سکتے تھے۔

میں یہ جان کر بھی بھونچکا رہ گیا کہ کالے بروق کے گروہ میں جہازوں کی تعداد نو تھی۔

یکایک مقابلہ دیکھنے والے تماشائیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ملکہ فیرا اور کالا بروق بھی پہنچ گئے تھے اور وہ اپنے اپنے تخت پر بیٹھ رہے تھے۔

پیلو اور ارغون آکر میرے پاس کھڑے ہو گئے۔

ارغون کے ہاتھ میں چمڑے کا وہ بھونپو تھا جو کل رات ہی میں نے اُسے بنا کر دیا تھا اور اُسے ہدایت کی تھی کہ وہ ایسے بھونپو اپنے نائبین کو بھی بنا کر دے دے۔

ڈر کے مارے پیلو کی حالت غیر ہو رہی تھی اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں میں نے اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"ڈرتے کیوں ہو پیلو۔ میں نے تمھیں بتا تو دیا ہے کہ ہم کیسے جیتیں گے۔"

پیلو نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے گھگھیائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں مجبور ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بزدل ہوں۔ اگر ہم جیت گئے تو بھی میں مر جاؤں گا۔"

"لیکن اس وقت تم غلامی کی موت نہیں مرو گے۔ اب جاؤ اور اپنے لیے کوئی ہتھیار لے آؤ۔ میں عرشے پر کسی کو نہتا نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"مگر میں کوئی ہتھیار چلانا نہیں جانتا۔" وہ بولا۔

"تو سیکھو... اور سیکھنے کے لیے آج بہترین موقع ہے۔ ویسے کیا تم نے میرا پیغام ملکہ کو پہنچا دیا تھا؟"

"ہاں جناب۔ اُس کے نوکر نے بتایا کہ وہ سیاہ جھنڈے کی منتظر رہے گی۔"

"ٹھیک ہے، اب جاؤ اور کوئی ہتھیار لے آؤ۔" یہ کہہ کر میں پھر ملکہ اور کالے بروق کی طرف دیکھنے لگا۔

کالا بروق لیم و شحیم تھا۔ اس کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ اُسے اُٹھانے اور بٹھانے کے لیے بارہ خادموں کا ایک دستہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میری ترکیب کامیاب ہو گئی تو آج کے بعد نہ تو اُسے خدام کے دستے کی ضرورت رہے گی اور نہ ہی خادموں کو اُسے اُٹھانا بٹھانا پڑے گا۔ اتنے میں کالے بروق نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اُٹھایا جس میں ایک رنگین رُومال تھا۔ اُس نے رُومال لہرا کر مقابلے کے آغاز کا اِذن دے دیا۔

یہ اذن ملتے ہی اس کے گروہ کے نو جہاز نیم دائرے کی صورت میں ہماری طرف بڑھنے لگے اور ان پر نصب منجنیقوں نے ہمارے بیڑے سے کچھ فاصلے پر پتھر پھینک کر طوفانی کیفیت پیدا کر دی۔

میں نے ارغون سے پوچھا: "ہوا کب چلے گی؟"

اُس نے سمندر سے اُٹھنے والے ابخرات اور افق پر کہر کے بادلوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا: "فوری طور پر ہوا چلنے کا امکان نہیں ہے۔ ایک یا دو گھڑیاں بیت جائیں تو شاید ہوا چلنے لگے۔"

"تو پھر ان احمقوں نے اپنے بادبان کیوں کھول دیے ہیں؟" میں نے کالے بروق کے بیڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"برواش نے حکم دیا ہو گا وہ اناڑی ہے۔ یہ بادبان

انھیں مدد دینے کی بجائے الٹا چپو چلانے والوں کی مشقت بڑھا دیں گے ؟ ارغون نے بتایا۔ وہ بلاشبہ ایک تجربہ کار ملاح تھا۔

میں نے تلوار لہرا کر جوابی اقدام کا اشارہ کیا تو ارغون چرمی بھونپو منہ سے لگا کر اپنے نائبین کو ہدایات دینے لگا۔

ہمارا بیڑا ابھی حرکت میں آ گیا۔

چونکہ ہم نے بادبان نہیں کھولے تھے۔ دوسرے ہمارے بیڑے پر چپو چلانے والے غلام صرف مقابلے میں حصہ لینے کے لیے نہیں بلکہ آزادی کے حصول کی خاطر کام کر رہے تھے اس لیے انھوں نے جی جان سے زور لگایا اور بیڑے نے بہت جلدی رفتار پکڑ لی۔

میرا جہاز سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے چاروں کشتیاں سیدھی قطار کی صورت میں آگے بڑھنے لگیں۔ یہ دیکھ کر برداش بری طرح سٹپٹا گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ جس طرح اس نے ایک قوس کی صورت میں اپنے جہازوں کو آگے بڑھایا ہے، اسی طرح میں بھی اپنے مختصر سے بیڑے کو کمان کی شکل میں، مقابلے پر لاؤں گا... مگر میں نے اس کی توقعات پر پانی پھیر دیا۔

میں نے ارغون کو اشارہ کیا تو اُس نے بھونپو پر ڈھول بجانے کا حکم دے دیا۔ چند ہی لمحوں میں درمیانی عرشے سے "ڈھم ڈھم۔ ڈھم ڈھم" کی آوازیں آنے لگیں اور چپو اُس کی لے تال کے ساتھ چلنے لگے۔ پیادر نے بتایا کہ ڈھول شافران بجا رہا ہے۔

"ڈھول کی لے تیز کراؤ" میں نے ارغون سے کہا۔

ڈھول کی لے بڑھی تو چپو چلانے والوں کا جوش بھی بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے بیڑے کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی۔ جب حریف جہاز ہم سے تین سو گز دور رہ گئے تو میں نے حکم دیا۔

"آگ کی ہانڈیاں تیار رکھو"

ارغون اور اس کے نائبین نے اپنے اپنے بھونپو سے یہ حکم دُہرایا۔

"ڈھالوں کی آڑ لے لو" میں چلایا تو عرشے پر کام کرنے والوں نے اپنے سامنے تختے رکھ لیے جو بڑی حد تک تیروں کی بوچھار روک سکتے تھے۔

"کمانوں میں تیر چڑھاؤ" میں نے حکم دیا اور برداش کے جہاز کی طرف دیکھا جو ہم سے صرف سو گز دور رہ گیا تھا۔ اُس کا رُخ میرے جہاز کی طرف تھا۔ وہ ایک بڑا جہاز تھا۔

اگر اس کے بادبان کھلے نہ ہوتے تو اُس کی رفتار دُگنی ہوتی اور وہ میرے جہاز سے ٹکرا کر اُسے پاش پاش کر سکتا تھا۔

میں نے دُوربین سے دیکھا، چپو چلانے والے غلاموں پر کوڑے برسائے جا رہے تھے۔ علاوہ ازیں برداش جھنڈوں کے ذریعے ہدایات دے رہا تھا، جنھیں سمجھنے میں وقت لگتا تھا جبکہ میری بھونپو والی ترکیب اُس سے کہیں زیادہ تیز رفتار ثابت ہوئی تھی۔

اتنے میں ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس سے برداش کے جہازوں کے بادبان بھر گئے چونکہ یہ ہوا مخالف سمت سے آئی تھی اس لیے اُن کے جہازوں کی رفتار مزید سست پڑ گئی اور وہ ہچکولے کھانے لگے۔

برداش بُری طرح جھنجلا اُٹھا۔

میں نے ہتھیلیوں سے بھونپو بناتے ہوئے حکم دیا۔ "کشتیوں کو دائیں بائیں لے آؤ"

ارغون اور اس کے نائبین نے یہ ہدایات دُہرائیں اور میرے جہاز کے پیچھے آنے والی کشتیوں میں سے دو دائیں اور دو بائیں جانب آ گئیں۔ ان کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ اب ہم مخالف جہازوں کے درمیان سے گزر کر نکل سکتے تھے... لیکن میرا جہاز برداش کے جہاز کے سامنے تھا۔ اتنے میں برداش کے جہاز کی منجنیق نے میرے بائیں جانب کی کشتی کو نشانہ بنا دیا۔ اس کا پچھلا حصہ ٹوٹ گیا اور اس کے ملاح غلام ڈوبنے لگے۔

تماشائیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

برداش اور اس کے ساتھی خوش خوش یہ تماشا دیکھنے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے ارغون کو ایک خاص اشارہ کرنا تھا۔ میں نے بایاں ہاتھ اُٹھا کر گرا دیا۔

ارغون نے بھونپو سے ہدایات دیں اور ہمارے اُلٹے ہاتھ والے چپو اندر کھینچ لیے گئے۔ میرا جہاز برداش کے جہاز کے دائیں پہلو سے گزرا اور اس کے پچاس چپوؤں کو توڑتا ہوا نکل گیا۔

اب برداش کی نہ صرف آدھی طاقت ختم ہو چکی تھی بلکہ جہاز بھی اُس کے قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ ہم نے اس کے دائیں جانب سے گزرتے اور ٹکراتے ہوئے نہ صرف چپو توڑ دیے تھے بلکہ آگ سے بھری ہانڈیاں بھی پھینکی تھیں جن میں سے ایک بادبان پر پڑی تھی اور بادبان جلنے لگا تھا۔

میں نے آگے جا کر جہاز کو موڑا اور برداش کے جہاز کے دوسرے پہلو کی طرف لانے لگا۔ برداش کے بیڑے کے دوسرے

جہاز میرے جہاز پر منجنیق سے پتھر نہیں برسا سکتے تھے۔ اس طرح خود برداش کا جہاز بھی اُن کی زد میں آ سکتا تھا کیونکہ اب وہ بے قابو ہو کر اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔ ہوا بند ہو گئی تھی اور بادبان بھڑک رہا تھا۔ عرشے پر بھی متعدد جگہوں سے دُھواں اُٹھنے لگا تھا۔

برداش نے میرا جہاز دوسری سمت سے قریب آتے دیکھا تو اُس نے چپو چلانے والوں کو چپو اندر کھینچ لینے کا حکم دے دیا۔ یہ دیکھ کر میں نے ارغون کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے جہاز کو آگے لے جانے لگا۔

میں نے دُوربین آنکھوں سے لگا لی۔ کالے بروق کو اس کے خُدام نے سہارا دے کر کھڑا کر دیا تھا اور وہ حیرت اور غم و غصّے سے اِدھر دیکھ رہا تھا۔ نیرانے ہاتھوں سے اپنا آدھا چہرہ ڈھک لیا تھا۔ شاید وہ کالے بروق سے اپنی فاتحانہ مسکراہٹ چھپا رہی تھی... مگر اُس کی نگاہیں بھی اِدھر لگی ہوئی تھیں وہ سیاہ پرچم لہرانے کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے دُوربین ہٹا کر اپنی کشتیوں پر نظر ڈالی۔ اُس دوران میری ایک اور کشتی ڈوب چکی تھی مگر حریفوں کے پانچ جہاز جل رہے تھے۔ میری باقی ماندہ دو کشتیاں حریفوں کے چھوٹے جہاز پر حملہ کر رہی تھیں اُن سے آگ کی ہانڈیاں پھینکی جا رہی تھیں اور تیر بھی برسائے جا رہے تھے۔

برداش کے تین جہاز خاموش اپنی اپنی جگہ ڈول رہے تھے۔ شاید اُن پر کام کرنے والے غلاموں نے بغاوت کر دی تھی۔ اس بغاوت کا بیج میں نے ہی بویا تھا اور پیلو کے ذریعے غلاموں میں جاسوس چھوڑ دیے تھے جنھوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ جو غلام بھی کسی طرح سے ہمارے بیڑے تک پہنچ جائے گا، ہم اسے آزادی کی منزل تک اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ شروع میں تو ان لوگوں نے اُسے ایک افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہو گی... مگر اب پانسہ پلٹتے دیکھ کر وہ باغی ہو گئے ہوں گے۔

میں نے برداش کے جہاز کی طرف دیکھا۔ اس جہاز پر کئی جگہ آگ بجھائی جا چکی تھی۔ چار منجنیقیں اور دو بڑی کمانیں تیار تھیں اور جہاز کا عرشہ تیر اندازوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاید برداش نے جہاز پر موجود ہر فرد کو عرشے پر بلا لیا تھا اور ہر قیمت پر مجھے میرے ساتھیوں سمیت ٹھکانے لگانے پر تُل گیا تھا... مگر میں اس کے جہاز کو ابھی غرق نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس سے کام لینا تھا۔

میں نے ایک بار پھر کالے بروق پر نگاہ ڈالی۔ وہ دوبارہ اپنے تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے دل میں دُعا مانگی کہ وہ اسی طرح بیٹھا رہے ورنہ یہ ساری محنت برباد ہو جائے گی۔

ارغون جو میرے اشارے کے مطابق جہاز کو آگے لے گیا تھا، اب اسے موڑ رہا تھا۔

"ڈھول بجانے کی لے ذرا تیز کر دو"

ڈھول بجنے لگا اور اس کی لے تال کے ساتھ چپو بھی تیزی سے چلنے لگے۔ میں نے برداش کی طرف دیکھا اب وہ ایک بڑی منجنیق کے پاس کھڑا میری طرف اشارہ کرتے ہوئے منجنیق چلانے والے کو ہدایات دے رہا تھا۔ منجنیق والے نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کام میں لگ گیا چند لمحوں کے بعد ایک بڑا پتھر مجھ سے صرف چھ قدم کے فاصلے پر آ گرا۔ منجنیق کا یہ نشانہ صرف اس لیے خطا ہو گیا تھا کہ میرے جہاز کی رفتار کچھ بڑھ گئی تھی۔ تاہم میں اسی طرح سینہ تانے اپنی جگہ کھڑا رہا کہ مجھے اپنے ساتھیوں کے سامنے مثال قائم کرنا تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر مرنا ہے تو پھر بزدلی کیوں دکھائی جائے۔ اگر مقدر میں یہاں موت نہیں لکھی اور ہم بچ نکلے پھر میرے ساتھی کبھی میری حکم عدولی کا خیال بھی دل میں نہیں لائیں گے۔

میرا جہاز تیزی سے برداش کے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی مگر میں اسی طرح سینہ سپر رہا۔ ایک تیر میری خود میں پیوست ہو گیا اور دوسرا میری آستین کو چھیدتا ہوا پار نکل گیا... مگر میں نے پروا نہیں کی اور ارغون کو حکم دیا۔

"درمیانی عرشے میں ڈھول کی لے کم کرا دو۔ پچھلے حصے سے لنگر ڈالنے کے لیے تیار رہو۔ جونہی ہمارا جہاز برداش کے جہاز کے ساتھ لگے دونوں کے درمیان فوراً تختہ بچھا دیا جائے۔ جب ہم اس جہاز پر جائیں تو ہر غلام کے پاس ہتھیار ہونے چاہئیں"

ارغون ان احکام کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

جب ہمارا جہاز برداش کے جہاز کے قریب آیا تو مجھے اس کی آواز سُنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "ہر آدمی سرفروش کو نشانہ بنانے کی کوشش کرے"

اس کے ساتھ ہی میری طرف سنسناتے ہوئے تیر آنے لگے۔ ہماری طرف سے بھی جوابی کارروائی ہونے لگی۔ اچانک ایک تیر ارغون کی ہتھیلی میں پیوست ہو گیا۔ وہ چیختا ہوا گر پڑا۔ پیلو اس کی طرف لپکا۔ اور میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات

دینے لگا۔

"لنگر ڈالو اور دونوں جہازوں کے درمیان تختہ باندھ دو۔"

جونہی جہازوں کے پہلو ایک دوسرے سے ٹکرائے، میرے کچھ ساتھیوں نے بڑی جوانمردی سے برداش کے جہاز میں رسّے ڈال دیے۔ کچھ لوگ تختہ بچھانے اور اسے باندھنے میں مصروف ہو گئے۔ ادھر سے ان پر تیروں کی بوچھار ہو رہی تھی اور ادھر سے میرے ساتھی تیر برسا رہے تھے۔ ہر طرف سے چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

میرے ساتھیوں کے حوصلے بے حد بلند تھے وہ موت کے خوف سے بے نیاز اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے، جبکہ برداش کے غلام اس جذبے سے عاری تھے اس لیے اُن میں وہ جوش اور ولولہ نہیں تھا۔ اتنے میں پیلو نے نعرہ لگایا "سرفروش۔ زندہ باد۔۔۔ آزادی۔ زندہ باد۔"

۔۔۔ اور پھر ہمارے ساتھیوں کی پُرجوش آوازیں اُس کی ہم نوا بن گئیں۔ میں نے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں خنجر تھام لیا اور جونہی میرے ساتھی تختہ باندھ کر ہٹے، میں نے اُس پر قدم رکھ دیا۔ یہ پہل مجھے ہی کرنا تھی تاکہ میرے ساتھی میری تقلید کر سکیں۔ میں جوش میں ڈھال لینا بھی بھول گیا تھا مگر میرے کسی ساتھی نے میرے سامنے اپنی ڈھال کر دی جس نے تیروں کی پہلی بوچھار روک دی۔

"فتح اور آزادی تمھاری منتظر ہے دوستو۔ غلاموں کو مت مارنا مگر مالکوں کو زندہ نہ چھوڑنا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ میرے اس نعرے نے جہاں میرے ساتھیوں کا ولولہ دوچند کر دیا، وہاں برداش کے غلاموں پر بھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ انھوں نے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیے۔ بلکہ کچھ تو ہمارے شانہ بشانہ لڑنے اور اپنے ہی افسروں کو تہ تیغ کرنے لگے۔

"منجنیق کے افسر کو زندہ گرفتار کر لو۔" میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

انھوں نے اُسے زندہ گرفتار کر لیا۔

یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پیلو بھی اپنی چھوٹی سی تلوار لیے دیوانہ وار لڑ رہا ہے۔ برداش کے ایک نائب نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا تو پیلو نے اس کی ٹانگوں سے نکل کر اپنی تلوار اس کے سینے میں گھونپ دی۔

تھوڑی دیر کی دست بدست لڑائی کے بعد سارا ہنگامہ ختم ہو گیا۔ میرے ساتھی فرطِ مسرت سے نعرے لگانے اور ناچنے لگے۔

میں نے عرشے پر پڑی لاشوں پر نظر ڈالی۔

ان میں برداش کی لاش نہیں تھی۔ میں نے اُس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ مجھے جہاز کے اگلے حصّے کی سیڑھی پر کھڑا نظر آ گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی ہی شاطرانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔۔۔ مگر اس مسکراہٹ کی گہرائیوں میں خوف بھی چھپا ہوا تھا جسے صرف میں ہی دیکھ سکتا تھا۔

میں نے اُس کی طرف بڑھنے سے پہلے ساری صورت حال کا جائزہ لینا ضروری سمجھا اور ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو پتا چلا کہ میرے بیڑے کی باقی ماندہ دونوں کشتیاں بھی غرق ہو چکی ہیں۔ اُن تین جہازوں سے بھی دھواں اُٹھ رہا تھا جنھوں نے مقابلے میں حصہ نہیں لیا تھا اور جن پر کام کرنے والے غلام باغی ہو گئے تھے۔ اس طرح پورے سرامانی بحری بیڑے میں سے صرف "فیرا" ہی واحد کارآمد جہاز بچ گیا تھا۔ ورنہ باقی سب تباہی کا شکار ہو چکے تھے اور یہ صورت حال میرے فرار کے منصوبے کے حق میں تھی۔ اگرچہ کالے بروق کا جہاز جس میں وہ نمورینہ سے یہاں آیا تھا، صحیح و سالم تھا مگر وہ یہاں سے کافی دُور سمندر میں لنگرانداز تھا اور اگر وہ قریب یا بندرگاہ کے اندر ہوتا تب بھی ہمارا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔

یہ جائزہ لینے کے بعد میں نے برداش کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: "اب صرف تم سے دو دو ہاتھ کرنے باقی ہیں کپتان۔ تم نیچے آتے ہو یا میں اوپر آؤں؟"

وہ مسکرایا اور بولا: "میں احمق نہیں کہ تم سے لڑوں، سرفروش۔ میں ہتھیار ڈالتا ہوں۔ تم میرے بدلے تاوان وصول کر سکتے ہو۔"

مجھے اُس سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں نے کہا: "تم عرفِ عام میں ظالم اور بے رحم کے لقب سے مشہور ہو، برداش۔ یہ لقب تم نے واقعی بے پناہ مظالم ڈھانے کے بعد حاصل کیا ہے۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ تم ایک اور خطاب کے بھی حق دار ہو۔۔۔ اور وہ خطاب ہے۔۔۔ بزدل۔ تم بزدل بھی ہو، برداش۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسی طرح مسکراتا رہا۔ پیلو کو نہ جانے کیا سوجھی وہ تلوار لہراتا ہوا آگے بڑھا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"اس بزدل کو ہمارے حوالے کر دو سرفروش ہم خود اس سے نمٹ لیں گے۔"

بہت سی آوازیں پیلو کی تائید کرنے لگیں۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پیلو سے کہا۔

"تم تو خون کے پیاسے ہو گئے ہو، چھوٹو میاں۔۔۔ مگر کپتان ہوں اور برداش کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، اس کا فیصلہ ہی کروں گا۔" پھر میں برداش کی طرف پلٹا۔ "کیا تم لڑو گے؟"

اُس نے اپنی تلوار نکالی اور میرے قدموں میں پھینکتے ئے کہنے لگا: "تمھیں میرے قتل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا زدش۔ بلکہ اب صرف میں ہی تمھیں ملکہ اور کالے بروق کے ب سے بچا سکتا ہوں۔ تم نے نہ صرف ملکہ کا پورا بحری بیڑہ تباہ دیا ہے بلکہ اُس کے بہت سے افسر بھی موت کے گھاٹ ردیے ہیں۔ دوسری جانب تم نے یہ مقابلہ جیت کر کالے بروق وہین کی ہے۔۔۔" اُس نے ایک نظر ملکہ اور کالے بروق طرف دیکھتے ہوئے کہا: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تمھارا انہن تھا یا تم نے اور ملکہ نے کالے بروق کے خلاف سازش تھی۔۔۔ مگر ملکہ میں کالے بروق کے خلاف سازش کرنے جرأت نہیں ہو سکتی۔۔۔"

"سازش کے بارے میں تم خود ہی بہتر جانتے ہو کیونکہ کے خلاف تم خود بھی تو سازش کر رہے تھے۔"

وہ میری اس بات پر چونک سا گیا۔

اتنے میں جہاز کے نچلے حصّے میں واقع چوبی کمرے میں کھٹ پٹ سنائی دی۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "جاؤ، دیکھو۔ میرا خیال ہے، اندر مہابچاری کریڈ چھپا ہوا ہے۔ اُسے پکڑ لاؤ۔"

چند لمحے بعد میرے ساتھی جس شخص کو نکال کر سامنے لائے واقعی کریڈ ہی تھا۔ وہ اُن غلاموں سے زندگی کی بھیک مانگ تھا جنھیں وہ دیوتا بروق کے آتشیں شکم میں ڈال کر راکھ بنا یا کرتا تھا۔

"کاش ہم تجھے بھی دیوتا بروق کے جہنم میں ڈال سکتے۔" ایک غلام بولا۔

"اسے آگ کی نہیں پانی کی موت پسند ہے دوستو۔"

میری اس بات پر اُس کے مظالم کا شکار بننے والے غلاموں نے مہابچاری کو ڈنڈا ڈولی کر کے اُٹھایا اور جھلاتے ہوئے سمندر میں پھینک دیا۔

اب میں نے پیلو سے کہا کہ وہ "فیرا" پر جا کر سیاہ پرچم لہرا دے۔۔۔ پھر میں نے منجنیق کے افسر کو اپنے قریب بلایا اور اسے کچھ ہدایات دیں۔ وہ بلا چون و چرا تعمیل کے لیے راضی ہو گیا۔ میں نے ایک بڑا پتھر منتخب کیا جسے میرے ساتھیوں نے مل کر منجنیق کے کانٹے پر رکھ دیا۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو میں برداش کی طرف پلٹا جو ابھی تک وہیں کھڑا یہ ساری کارروائی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"اگر تم عزت کی موت مرنا چاہتے ہو تو نیچے آ کر مجھ سے مقابلہ کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ تمھارے لیے آخری موقع ہے۔"

یہ سن کر وہ بُری طرح گھبرا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رو پڑے گا۔ اُس نے بندرگاہ کے دہانے پر تنی ہوئی زنجیر پر نگاہ ڈالی اور بولا: "تم نے غلاموں کو آزادی کا جھانسا دے کر فرار کا جو منصوبہ بنایا ہے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو گا، سرفروش! ان سب کے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

پیشتر اس کے کہ وہ میرے ساتھی غلاموں کو مزید بھڑکاتا، میں نے سیڑھیاں چڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اُس کی ہمت اتنی پست ہو چکی تھی کہ اُس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ میں اُسے گردن سے پکڑے ہوئے نیچے لے آیا۔ اُس وقت تک منجنیق کے سامنے ایک سفید چادر تانی جا چکی تھی۔

میں، برداش کو اسی چادر کے پیچھے لے گیا اور ایک نائب جسے پیلو نے ارغون کے ساتھ بھرتی کیا تھا۔ برداش کا منہ بند کرنے اور اُسے پتھر کے ساتھ باندھنے کی ہدایت کی اور یہ دیکھنے کے لیے چادر کی اوٹ سے نکل آیا کہ کالے بروق پر اس ہنگامے کا کیا ردِعمل ہوا ہے۔ وہ اُسی طرح اپنے تخت پر بیٹھا ادھر ہی دیکھ رہا تھا جبکہ ملکہ فیرا کی نشست خالی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس نے سیاہ پرچم دیکھ لیا ہے اور کوئی بہانہ کر کے وہاں سے چلی گئی ہے۔

۔۔۔ پھر میری نگاہ اُس چھوٹی کشتی پر جا پڑی جو حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے ہمارے جہازوں کی طرف آ رہی تھی۔ میں منجنیق کے افسر کی طرف پلٹا اور اُس کی گردن پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے بولا۔

"میں منجنیقوں کی کارکردگی اور تمھارا نشانہ دیکھ چکا ہوں۔ تم برداش سمیت اس پتھر سے کالے بروق کو نشانہ بناؤ گے اور اگر تمھارا نشانہ چوکا تو یہ تلوار تمھاری گردن اُڑانے میں دیر نہیں کرے گی۔"

منجنیق افسر نے لرزتے ہوئے کہا: "میں پوری پوری کوشش کروں گا۔۔۔ مگر کبھی کبھی ہوا اور بدقسمتی کے باعث نشانہ خطا بھی ہو جاتا ہے۔"

"ہوا کا رُخ اور رفتار کو دیکھ کر منجنیق چلاؤ۔ تم اپنے کام میں ماہر ہو۔ اگر تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے تو نشانہ نہیں چوکے گا۔"

میری یہ تنبیہ اُسے مزید محتاط رکھنے کے لیے کافی تھی۔

اس نے منجنیق کا کانٹا آگے کھینچ کیا اور منجنیق داغنے کی تیاری کرنے لگا۔

میں نے اپنی نگاہیں کالے بروق پر مرتکز کر دیں۔
کالا بروق اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ اِدھر ہی دیکھ رہا تھا کبھی کبھی وہ اُس کشتی کو بھی تیزی سے چلانے کا اشارہ کرتا جو ہماری طرف بھیجی گئی تھی۔ اتنے میں ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔
منجنیق داغی جا چکی تھی۔ پتھر کے ساتھ بندھا ہوا بیداش اپنے نشانے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ کالا بروق جسے زندگی بھر کبھی موت کے خوف نے پریشان نہیں کیا تھا اپنی طرف تیزی سے آنے والا پتھر دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا اور چیختے ہوئے، خادموں کو پکارنے لگا۔ مگر وہ اپنی جان ... نے کے لیے بھاگ رہے تھے۔
کالے بروق نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اس اُڑتی ہوئی موت نے اُسے یہ دیکھنے کی بھی مہلت نہیں دی کہ پتھر کے ساتھ بندھا ہوا وجود اس کے معتمد برداش کا ہے۔
میں نے برداش کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا... بلکہ فیرا کے ساتھ کیا ہوا وعدہ بھی وفا ہو چکا تھا۔ اُسے کالے بروق سے نجات مل چکی تھی... مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اُسے میرے فرار کی اطلاع اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سے پہلے ملے۔ اس لیے میں جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کو احکام دینے لگا۔
دو منجنیقیں فیرا پر منتقل کر دی گئیں۔ عرشہ لاشوں سے صاف کر دیا گیا اور برداش کے جہاز کو آگ لگانے کے بعد ہمارا جہاز تیزی سے ہٹ گیا۔
اب ہوا خاصی تیز چلنے لگی تھی اور ہم نے بادبان کھول دیے تھے۔

میں اب تک بے حد مصروف رہا تھا اس لیے ارغون کے بارے میں نہیں پوچھ سکا تھا کہ وہ مر گیا یا زندہ ہے، جب میں نے ہیلو سے دریافت کیا تو وہ بولا: "وہ زندہ ہے۔ میں نے تیر نکال دیا ہے اور چونکہ تھوڑی بہت حکمت جانتا ہوں اس لیے ...."
"حکمت کی باتیں رہنے دو" میں نے اس کی بات کاٹ دی: "اب تم جنگجو بن چکے ہو۔ ہم زنجیر کے قریب آ گئے ہیں اگر وہ نہ ٹوٹی تو ہمیں لڑتے ہوئے جان دینا پڑے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ اب تم بزدلی نہیں دکھاؤ گے۔"
"فکر نہ کرو۔ اب مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"شاباش، جلدی سے جاؤ اور شافران سے کہو کہ ڈھول بجانا شروع کر دے۔"
چند لمحوں کے بعد ڈھول کی تیز لے تال کے ساتھ چپو اُٹھنے گرنے اور سمندر کا سینہ چیرنے لگے۔ میں نے کمان سنبھال لی اور جہاز کو زنجیر کے وسط کی سیدھ میں لے آیا تاکہ پہلے ہی جھٹکے میں وہ اپنی کمزور ہوئی کڑی سے ٹوٹ جائے۔
ہر آتے لمحے کے ساتھ جہاز کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی اور زنجیر قریب تر آتی جا رہی تھی۔ تماشائی، ملک کے اہل کار اور کالے بروق کا علاج جو اب ہمارے منصوبے سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا، دم بخود ہمارے جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا۔
جہاز پوری رفتار کے ساتھ زنجیر سے ٹکرایا مگر زنجیر نہ ٹوٹ سکی۔ تماشائیوں نے ہماری ناکامی پر مسرت کا نعرہ لگایا۔
جہاز بے قابو ہو کر ڈولنے لگا۔ میں نے بھونپو منہ سے لگاتے ہوئے چیخ کر کہا: "چپو چلاتے رہو... اور اپنی غلامی کی یہ زنجیر توڑ دو۔"

چپو چلتے تو جہاز زنجیر سے ٹکرا جاتا... زنجیر تن جاتی مگر ٹوٹنے کا نام نہ لیتی۔ ساتویں بار جب جہاز زنجیر سے ٹکرایا تو وہ ٹوٹ گئی۔ اور جہاز لہروں کا سینہ چیرتا کھلے سمندر میں داخل ہو گیا۔

کھلے سمندر میں آنے کے بعد میں نے جہاز کا رُخ جنوب کی طرف موڑ دیا۔ اس لیے کہ سارا ما کے مقابل نوریہ تھا جہاں ہم جا نہیں سکتے تھے۔ جنوب کی جانب وہ آتشیں سرزمین تھی جہاں قزاقوں نے میرے ڈیلی کیٹ کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔
مجھے اس کی تلاش میں وہاں جانا تھا۔
... لیکن فی الوقت ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ خوراک اور پانی کے ذخیرے کا تھا۔ چونکہ ہمارے جہاز کو صرف مقابلے میں حصہ لینا تھا لہٰذا اس میں خوراک اور پانی کا ذخیرہ نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ ہم نے جنوب کی طرف جاتے ہوئے جہاز کو ساحل بطرما کی طرف موڑ دیا اور سب سے پہلے آنے والی چھوٹی سی بندرگاہ سے ضرورت کی ساری اشیا حاصل کرنے کے بعد پھر ان دیکھے سفر پر روانہ ہو گئے۔
تقریباً ایک ہفتے تک میں جہاز کی مرمت، زخمیوں کی دیکھ بھال اور تنظیم نو میں مصروف رہا۔ میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جہاز پر صرف دو سو افراد کی گنجائش تھی جبکہ اس پر چار سو افراد سوار تھے۔ میں نے ارغون سے بات کی تو وہ بولا۔
"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں، اسے بڑی آسانی سے حل کیا جا

...ہے۔"
"وہ کیسے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
"جب بھی کوئی جہاز دکھائی دے، اُس پر حملہ کر دیا جائے ... قبضے میں لانے کے بعد آدھے آدمی دونوں جہازوں ... دیے جائیں۔"
"مگر یہ بڑی غلط بات ہے۔" ہیلو اپنی تلوار کے دستے پر ...تے ہوئے چلایا۔ "پھر ہم میں اور بحری قزاقوں میں کوئی فرق ...ہے گا۔"
مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ ہیلو کے اندر کا مرد ... کے ساتھ ساتھ وہ اُستاد نہیں مرا تھا جو اخلاقی قدروں کی ...کھتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ بقا کی جدوجہد میں ایسے ... بھی آتے ہیں جہاں اخلاقی اصول دھرے کے دھرے ...تے ہیں۔
گزشتہ دو تین روز سے میرے سر میں ہلکا ہلکا درد رہنے ...

میرا خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر میری کھوج ...ہے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ سر درد مسلسل بھاگ دوڑ ...لے کی تھکن کا نتیجہ تھا۔ جو بعد میں ٹھیک ہو گیا۔
ایک روز اچانک مجھ پر وہ عجیب و غریب انکشاف ہوا ...ر فریدوں کے ان تجربات کا بنیادی محرک تھا۔ وہ میرے ...مکان کے سفر سے یہ جاننے کا بھی آرزومند تھا کہ کن سرزمینوں ...ں میں قدرت نے کون کون سے خزانے دفن کر رکھے ہیں۔ ...رت انگیز بات تھی کہ میں یورینیم کے لامحدود ذخائر روندتا ...را یہاں پہنچا تھا۔ مگر مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ بھورے پہاڑ جو ...کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں، اپنے اندر یورینیم چھپائے ...ئے تھے جسے مقامی زبان میں "میٹا" کہا جاتا تھا۔
یہ انکشاف مجھ پر یوں ہوا تھا کہ ہیلو جنگجو بننے کے ساتھ ...جہاز کا خود ساختہ طبیب بھی بن گیا تھا اور جہاز پر موجود ...ے مرہم تیار کر کے شافران اور دوسرے زخمیوں کا علاج ...تھا۔ دوسرے زخمی تو اس کے علاج سے رُوبصحت تھے مگر ...کو افاقہ نہیں ہوا تھا۔
ایک روز وہ شافران کو میرے پاس لے آیا اور بولا:- ...ہر دو کے پھوڑے پھنسیاں اس لیے ٹھیک نہیں ہوتیں ...انے میٹا کا ایک ٹکڑا اپنی جیب میں چھپا رکھا ہے۔ جب ...ٹکڑا اس کی جیب میں رہے گا، یہ کبھی تندرست نہیں

ہو سکتا۔"
"میں اسے خود سے جدا نہیں کر سکتا۔" ...پنی نہیں تھی۔
دکالت کی۔ "میں اُسے اپنے لیے نیک شگون ... دیکھا جو بادلوں سے صاف ...ے محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں
"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔ ...ہے۔ میں نے ارغون سے پوچھا: "کیا
"جب کبھی میں اُسے دیکھتا ہوں ... بارہ بھی آئے گا؟"
قسمت تصور کرتا ہوں کہ مجھے میٹا کی کانوں ...
ورنہ دوسرے کان کنوں کی طرح میں بھی ...د کا یقین ہے، اسی طرح طوفان کی
"مگر میٹا کا وہ ٹکڑا اس کے پاس ...
...وں سے کہہ دو کہ وہ کھینا شروع کر دیں۔
پھر جائے گا جبکہ ہمیں اس کی ضرورت ... کی طرح تھکے ہوئے ہیں لیکن ہمیں سفر جاری
ہے اور اسے چپو چلانے والوں سے ...۔ شافران سے کہو کہ وہ جیسے چاہے، ان سے
لیے اسے حکم دو کہ وہ ٹکڑا سمندر میں ... لت ایسی نہیں ہے کہ دوسرے طوفان کا
پھینک دے۔
... ل تمہارے پہلے سے کہیں شدید ہو گا۔"
اس میں کوئی شک نہیں ...
ہیلو نے بیان کی تھیں مگر میں اُس ... میں بھی اپنے چوبی کمرے سے نکل کر عرشے پر چلا
منحوس کبڑے کی یاد دلاتا تھا اور ... کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ اس طوفان میں ہمارے
آتی تھی حالانکہ جہاز پر سفر کرنے ... بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ہمارے پاس فالتو مستول تو
تھا۔ میں نے اس سے چھٹکارا ... نصب نہیں کر سکتے تھے۔ ڈر یہ تھا کہ اس دوران
"ہیلو! اس سے میٹا کی کان نہ آ جائے۔ میں نے ایک ساتھی کو ٹوٹے ہوئے
شافران نے بادل نخواستہ ... یا اور کہا وہ اپنے آپ کو رسیوں کے ساتھ جکڑ
کو دے دیا جو اس نے میری طرف ... دیکھتا رہے۔ جونہی اُسے زمین دکھائی دے، چلا
سے کچھ چھوٹا تھا مگر جسامت کے ... کہ ہم جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کر سکیں۔ میں
ہوتا تھا۔ میں نے کالے اور بھورے ... میں آتشیں سرزمین کا ساحل دکھائی دے جائے
پر رکھ دیا اور شافران سے کہا۔ ... لے جائیں گے۔ ہمارے پاس اتنے آدمی تھے
"جب میں اچھی طرح ... دیکھ کر فیرا نامی اس جہاز کو کھڑا کر سکتے تھے...
کہ یہ تمہیں واپس مل سکے ... ن گزر جانے کے بعد بندرگاہ تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں
شافران نے میری ...
سے گھورتا ہوا چلا گیا ... میرے ساتھی مسلسل پانچ گھنٹے تک جہاز کھینتے رہے اتنے
"لاپیے یہ ... مستول پر چڑھا ہوا آدمی ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے چلایا
پھنسیاں نکل آئیں گی ... "اُدھر دیکھو۔ ایک جہاز ڈوب رہا ہے۔"
"آج نہیں، کل ... ڈوبتے ہوئے جہاز سے ہمیں خوراک اور دوسرا سامان
یعنی پگھلا ہوا میٹا یا کوئی ... تھا جو ہمارے فوری مسائل حل کر دیتا۔ میں نے آنکھوں
اُسے حکم دیا۔ ... کا چھجا بنا کر اُدھر دیکھا اور مستول والے سے پوچھا۔
"میٹا کی سلاخ ... "کیا تم پہچان سکتے ہو وہ جہاز کس کا ہو سکتا ہے؟"
"سلاخ شاید نہ ... ہاں... قزاقوں کا جہاز لگتا ہے کیونکہ اس کی نوک پر
"یہ ناممکن ہے۔" ... کھوپڑی آویزاں ہے۔ اس کا مستول ٹوٹ چکا ہے اور اگلا
...ب ہو رہا ہے۔ مگر اس پر عورتیں دکھائی دے رہی ہیں۔"

اس نے منجنیق تھا۔ ملکہ فیرا کے پاس بھی خالص میٹل کے بشکل
تیاری کرنے لگا۔
میں نے اپنی لگا ہیں، دو جہاز پر چار سو آدمی موجود ہیں۔ ان
کالا بروق اپنے بھاری ناسکہ ضرور ہو گا۔ جاؤ اور جب تک
رہا تھا کبھی کبھی وہ اُس کشتی کو بھی تہ آنا:
ہماری طرف بھیجی گئی تھی۔ اتنے پتہ بھیجا نتا تھا اس لیے چپ چاپ میرے
منجنیق داغی جا چکی تھی۔ یہ
اپنے نشانے کی طرف پرواز کر رہا تھا ایک دلچسپی کا باعث وہی خیال
موت کے خوف نے پریشان نہیں کیا یہ منتقل کرتا ہے۔ ان کی کوکھ میں کیا
آنے والا پتھر دیکھ کر بُری طرح بو ملا گیا اور سونا، ریڈیم اور یورینیم بھی ہو
کوٹکانے لگا۔۔ مگر وہ اپنی جان د نے کیو۔ اسی لیے اسے خالص شکل
کالے بروق نے اُٹھنے کی کوشش کی۔
موت نے اُسے یہ دیکھنے کی بھی مہلت نہیں۔ چھوٹا سا جو کور سکہ لے آیا
بندھا ہوا وجود اس کے معتمد برداش کا ہے۔ بار رکھا تھا۔ میں نے اُسے
میں نے برداش کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پو، شیشے کا کام کرتا تھا پھر
فیرا کے ساتھ کیا ہوا وعدہ بھی وفا ہو چکا تھا۔ اُسے کون سی دھات ہے۔
سے نجات مل چکی تھی۔۔۔ مگر میں نہیں جانتا تھا معلوم ہوتا تھا۔
فرار کی اطلاع اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر لڑے پر میری نگاہ پڑی
اس لیے میں جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کو جکا دن پر یقین نہ آیا میں
دو منجنیقیں فیرا پر منتقل کر دی گئیں۔ عرشوں نے بھی تصدیق کر دی
کر دیا گیا اور برداش کے جہاز کو آگ لگانے بٹ رہی ہے۔ جس نے ٹکڑے
تیزی سے ہٹ گیا۔
اب ہوا خاصی تیز چلنے لگی تھی اور نہ مجھ پر ایک ایسے خزانے کا
دیے تھے۔
یہ ٹر ہماری زمین پر
میں اب تک بے حد مصروف رہا تھا اس لیے قیمت پر ایٹم بم
کے بارے میں نہیں پوچھ سکا تھا کہ وہ مر گیا یا زندہ ہے
میں نے ہیلو سے دریافت کیا تو وہ بولا: وہ زندہ ہے۔ میں تابکاری
تیر نکال دیا ہے اور چونکہ تھوڑی بہت حکمت جانتا ہوں ا
لیے ....
"حکمت کی باتیں رہنے دو" میں نے اس کی بات کاٹ دیا ہوا میرے
دی: اب تم جنگجو بن چکے ہو۔ ہم زنجیر کے قریب آ گئے ہیں اُ پیش گوئی کر رہی
لوٹی تو ہمیں لڑتے ہوئے جان دینا پڑے گی۔ مجھے اُمید ہے تم ہیں اس لیے
تم بزدلی نہیں دکھاؤ گے"
"فکر نہ کرو۔ اب مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا" ۔۔ ہم جتنی جلدی
"شاباش جلدی سے جاؤ اور شافران سے کہو کہ" میں نے پوچھا

اس نے چمڑے کے ٹکڑے پر کشیدہ ایک نقشہ میرے
سامنے پھیلا دیا۔ ہم جس سمندر میں سفر کر رہے ہیں، اس کے ا
جانب سراما اور دوسری جانب نمورنیہ تھا اور ان دونوں
ملکوں کے مابین کہیں کہیں سمندر کی چوڑائی بہت زیادہ ہو جا
تھی ورنہ بیشتر حصے میں خاصی کم ہی رہتی تھی۔ شمال میں بقول
ارغون اتنا وسیع اور بے کراں سمندر تھا کہ اب تک کوئی جہاز
اس کے دوسرے کنارے نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس لیے شمال
طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور آتشین سرزمین
بھی بہت دُور تھی۔ ارغون نے بتایا کہ اس ارغوانی سمندر میں
جب بھی طوفان آتا ہے تو کئی کئی روز بلکہ ہفتوں جاری رہتا ہے
اگر ہم بادبان لپیٹ کر لنگر انداز ہو جائیں تب بھی اُن طوفانوں
کے سامنے ٹک نہیں سکتے۔
ہم نہ سراما واپس جا سکتے تھے اور نہ ہی نمورنیہ۔۔۔ اس
لیے صرف جنوب کا ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ سو ہم نے جنوب کی
طرف سفر جاری رکھا لیکن چند گھڑیوں کے اندر اندر طوفان نے
ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
سمندر میں کوہ پیکر لہریں اُٹھنے لگیں۔
ہواؤں کی شدت بڑھتی چلی گئی۔
جہاز بے قابو ہو کر ایک تنکے کی مانند اِدھر اُدھر بھٹکنے اور
ڈولنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر لہر ہمیں اتھاہ گہرائیوں
میں ڈبونے کو بے تاب اور ہر جھکڑ جہاز کو پاش پاش کرنے
کے لیے بے قرار ہے۔ کچھ لہریں جہاز کو اُٹھا کر پٹخ دیتی تھیں اور
کچھ اس کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ اُوپر سے گزرنے والی لہروں
سے جہاز میں پانی بھر جاتا لیکن چار سو افراد اپنی جان بچانے کے لیے
پانی نکالنے بیٹھے تھے ابھی وہ پانی پوری طرح نہ نکال پاتے تھے
کہ لہر پھر آ جاتی تھی۔
ہم دو روز تک بپھرے ہوئے سمندر سے لڑتے اور سائیں
سائیں کرتے جھکڑوں کے تھپیڑے برداشت کرتے رہے لیکن تیسرے
دن کسی میں مقابلے کی تاب نہ رہی اور جہاز آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگا
۔۔۔ مگر پھر اچانک ہی ایک معجزہ رونما ہوا اور جس تندی و تیزی
سے طوفان آیا تھا، اسی سرعت کے ساتھ فرو بھی ہو گیا۔۔۔ لیکن
جاتے جاتے وہ اپنی لپیٹ میں بہت سے ملاح بھی لے گیا تھا۔
موت کے سائے میں مسلسل شب روز کام کرنے والے
ہمارے ساتھی ابھی دم بھی نہیں لینے پائے تھے کہ میں نے انہیں
آرام کرنے سے پہلے پانی نکالنے اور جہاز کی صفائی کرنے کا حکم

دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ارغون کو ہدایت کر دی کہ اب
کھانے پینے کی راشن بندی کر دی جائے اور جو اس کی خلاف ورزی
کرے اُسے سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ اس لیے
ضروری تھا کہ خوراک کا بہت سا ذخیرہ تباہ ہو گیا تھا اور پینے کا
پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔
ہیلو کی حالت اگرچہ بہت خراب تھی مگر چونکہ اس نے اپنے
آپ کو جہاز کا طبیب بنا لیا تھا، اس لیے میں نے اُسے زخمیوں
اور بیماروں کی خبر گیری کا حکم دیا۔ تو وہ بولا۔
"میں تو ابھی خود بیمار ہوں۔ اُن کا علاج کیسے کروں؟"
"ہمت سے کام لو ہیلو۔ ساتھیوں کے سامنے اچھی مثال
پیش کرو۔ بُرا وقت گزر چکا ہے۔ جاؤ" میں نے اُسے دلاسا دیا
تو وہ چلا گیا۔
ارغون نے، جو اب میری جگہ کمان سنبھالے ہوئے تھا
کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا "تم غلطی پر ہو، سرفروش! بُرا وقت
گزر نہیں گیا بلکہ اب آنے والا ہے"
"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
"ارغوانی سمندر کے یہ طوفان ہمیشہ دو حصوں میں آتے
ہیں۔ یہ طوفان جو گزر گیا ہے وہ پلٹ کر آئے گا اور ہو سکتا ہے
ایک پہر، ایک دن یا اس سے بھی زیادہ دیر میں آئے۔۔۔ مگر آئے
گا ضرور۔۔۔ اور اپنے دامن میں پہلے سے زیادہ شدتیں اور
زیادہ ہلاکت خیزی لائے گا۔ یہ سکون وقتی ہے"
مجھے ارغون کی بات پر یقین کرنا پڑا کیونکہ اب تک اس نے
جو بھی پیش گوئی کی تھی حرف بحرف درست ثابت ہوئی تھی۔
"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟" میں
نے سوال کیا۔
"نہیں۔۔۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ طوفان ہمیں جنوب کی
طرف ہی لایا ہے"
"تو پھر اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ جہاز کو جنوب کی
طرف کھینا شروع کر دیں۔ کیونکہ ہوا بالکل تھم گئی ہے۔ شاید ہم
آتشین سرزمین کے قریب پہنچ گئے ہوں اور ہمیں کوئی بندرگاہ
دکھائی دے جائے جہاں ہم پناہ لے سکیں۔ کیا تم ایسی کوئی بندرگاہ
جانتے ہو؟"
"نہیں۔۔۔ بہت کم سرامانیوں نے آتشین سرزمین دیکھی
ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے تپتے ہوئے صحرا صرف منگرال ہی عبور
کر سکتے ہیں جو اس سرزمین کی دوسری جانب رہتے ہیں"
مجھے منگرالوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
میں نے آسمان کی طرف دیکھا جو بادلوں سے صاف
تھا۔ سمندر بھی پُرسکون تھا اور یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں
سے ہلاکت خیز طوفان گزرا ہے۔ میں نے ارغون سے پوچھا "کیا
تمہیں یقین ہے کہ طوفان دوبارہ بھی آئے گا؟"
"جیسے مجھے اپنے وجود کا یقین ہے، اسی طرح طوفان کی
واپسی کا بھی ہے"
"تو پھر اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ کھینا شروع کر دیں۔
میں جانتا ہوں کہ وہ بُری طرح تھکے ہوئے ہیں لیکن ہمیں سفر بلا
تاخیر جاری رکھنا ہے۔ شافران سے کہو کہ وہ جیسے چاہے ان سے
کام لے۔ جہاز کی حالت ایسی نہیں ہے کہ دوسرے طوفان کا
مقابلہ کر سکے جو بقول تمہارے پہلے سے کہیں شدید ہو گا"
۔۔۔ پھر میں بھی اپنے چوبی کمرے سے نکل کر عرشے پر چلا
گیا اور ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ اس طوفان میں ہمارے
جہاز کا مستول بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ہمارے پاس فالتو مستول تو
تھا مگر ہم اُسے نصب نہیں کر سکتے تھے۔ ڈر یہ تھا کہ اس دوران
کہیں دوسرا طوفان نہ آ جائے۔ میں نے ایک ساتھی کو ٹوٹے ہوئے
مستول پر چڑھایا اور کہا وہ اپنے آپ کو رسیوں کے ساتھ جکڑ
لے اور تاحدِ نظر دیکھتا رہے۔ جونہی اُسے زمین دکھائی دے، چلا
کر مجھے بتائے تاکہ ہم جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کر سکیں۔ میں
نے سوچا تھا کہ اگر ہمیں آتشین سرزمین کا ساحل دکھائی دے جائے
تو ہم جہاز کو وہاں لے جائیں گے۔ ہمارے پاس اتنے آدمی تھے
کہ ہم ریتیلے ساحل کو کھود کر فیرا نامی اس جہاز کو کھڑا کر سکتے تھے۔۔۔
پھر طوفان گزر جانے کے بعد بندرگاہ تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں
ہو گا۔
میرے ساتھی مسلسل پانچ گھنٹے تک جہاز کھینتے رہے اتنے
میں مستول پر چڑھا ہوا آدمی ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے چلایا
"اُدھر دیکھو۔ ایک جہاز ڈوب رہا ہے"
ڈوبتے ہوئے جہاز سے ہمیں خوراک اور دوسرا سامان
مل سکتا تھا جو ہمارے فوری مسائل حل کر دیتا۔ میں نے آنکھوں
پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اِدھر دیکھا اور مستول والے سے پوچھا۔
"کیا تم پہچان سکتے ہو وہ جہاز کس کا ہو سکتا ہے؟"
"ہاں۔۔۔ قزاقوں کا جہاز لگتا ہے کیونکہ اس کی نوک پر
انسانی کھوپڑی آویزاں ہے۔ اس کا مستول ٹوٹ چکا ہے اور اگلا
حصہ غرقاب ہو رہا ہے۔ مگر اس پر عورتیں دکھائی دے رہی ہیں۔

بہت سی عورتیں ہیں۔"

عورتوں کے ذکر پر میرے ساتھیوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔۔۔۔ یہ سرگوشیاں نئی مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے، ارغون؟" میں نے پوچھا۔

ارغون دوربین لگا کر اُدھر دیکھنے لگا حالانکہ مجھے اُس جہاز پر عورتیں، ہاتھ اور رنگین کپڑوں کے ٹکڑے ہلاتی صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ وہی جہاز تو نہیں جس پر زینا کو سزا بھگتنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

"اس پر تو بہت سی عورتیں ہیں۔" ارغون نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں ارغون۔ تم جہاز کے بارے میں بتاؤ۔"

"جہاز تو قزاقوں کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی حالت خراب ہے مگر وہ ڈوب نہیں رہا ہے۔"

"اگر یہ قزاقوں کا جہاز ہے تو قزاق کہاں ہے؟ یا یہ عورتیں ہی بحری قزاق ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے دوربین مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ انھوں نے یہ عورتیں کسی دوسرے جہاز سے اس پر منتقل کی ہوں گی۔"

"خیر پتہ چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تم اپنا جہاز اس کے قریب لے چلو۔ ہو سکتا ہے کہ قزاق نچلے حصے میں چھپے ہوئے ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ساری حقیقت ہمارے علم میں آ گئی۔ یہ واقعی وہی جہاز تھا جس پر زینا سزا بھگت رہی تھی۔ قزاقوں نے اسے گھیر کر کپتان کو جو اس جہاز پر واحد مرد تھا، قتل کر دیا اور ان مجبور عورتوں پر ظلم و ستم کرتے رہے۔۔۔ پھر اس جہاز کو ڈبونے کی غرض سے نقصان پہنچا کر بھاگ نکلے۔۔ مگر جہاز قابلِ مرمت تھا۔ اس لیے میں نے ارغون سے کہا۔ "اب تم ہی کپتان ہو ارغون۔ تم ہمارے جہاز سے ضرورت کی ہر چیز اور بڑھئی وغیرہ لے سکتے ہو۔ اس جہاز کی مرمت کروا کر اسے قابلِ استعمال بنا لو۔ تب تک ہم یہیں لنگر انداز رہیں گے۔"

یہ سن کر ارغون نے آسمان کی جانب دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ "ہو سکتا ہے کہ طوفان اتنی جلدی نہ آئے۔" میں نے اُسے دلاسا دیا۔

ارغون میری تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

"ان عورتوں کا کیا ہو گا؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیئے؟" میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

"سرامانی دستور کے مطابق تو انھیں تناسب کے اعتبار سے بانٹ لینا چاہیئے۔"

موجودہ صورتِ حال میں مجھے اُس کی تجویز سے اتفاق کرنا ہی بہتر محسوس ہوا کیونکہ پیلو نے بھی اس کی تائید کر دی تھی میں نے پیلو سے کہا کہ وہ سب سے پہلے زینا کو تلاش کر کے اس کا خاص خیال رکھے۔

ہمیں اپنے ساتھیوں کی وجہ سے جہاز کی مرمت میں زیادہ دیر نہ لگی۔ باقی انتظامات بھی جلد ہی مکمل ہو گئے اور جب میں ہر طرف سے فراغت پا کر اپنے جہاز کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں زینا کے ساتھ ایک اور عورت بھی موجود تھی جس نے اپنا نام شہزادی مریندا بتایا۔

زینا نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

مریندا نے مجھے بتایا کہ زینا قزاقوں کا مسلسل شکار بنتی رہی ہے اس لیے اس کا ذہنی توازن خراب ہو چکا ہے۔ اس نے مجھے اور پیلو کو نوچ کھسوٹ کر کیبن سے نکال دیا۔

میں بھاری دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ عرشے پر آ گیا۔ زینا کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی یادیں مجھے بُری طرح ڈسنے لگیں۔ اس نے میری وجہ سے کتنے دکھ اور کتنے صدمے جھیلے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دوں اور دل کا غبار ہلکا کر لوں مگر اتنے میں مجھے اپنے کندھے پر کسی کے نرم نرم ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میرے سامنے سرو قامت مریندا کھڑی تھی۔ سیاہ بالوں اور بادامی آنکھوں والی یہ لڑکی جو اپنے آپ کو منگرال شہنشاہ چموتان کی بیٹی کہتی تھی۔ اگرچہ بے حد خوبصورت تھی لیکن میرا دل اس کی پکار نہ سن سکا۔ میں نے اسے ٹال دیا اور سوچنے لگا کہ قدرت میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کرتی ہے؟ میں نے لالہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا مگر میری مجبوریوں نے مجھے جیب کا زہر پلایا تو وہ مجھ سے روگردانی کرنے لگی۔۔۔ اور اب جبکہ میں لالہ کا لگایا ہوا زخم زینا سے بھرنا چاہتا تھا تو اس نے بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ آخر میرے مقدر میں اتنی محرومیاں کیوں لکھ دی گئی ہیں؟

میں نے پھر زینا سے بات کرنا چاہی لیکن وہ یوں سکڑ سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی جیسے مجھ سے بُری طرح خوفزدہ ہو۔ اس

کی آنکھوں میں دہشت اور کرب کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں اُس کے اس رَدِ عمل کا سبب جان چکا تھا... مگر اب سوال یہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور میں اُس کی مدد کس طور کر سکتا ہوں؟

پہلی شب جب مرینڈا میرے پاس آئی تھی تو میں کچھ اور سمجھا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہُوا کہ یہ میری غلط فہمی تھی۔ میں نے اُس کی کسی ادا میں سُپردگی کی کیفیت محسوس نہیں کی لیکن وہ ہر وقت میری طرف دیکھتی اور عجیب انداز سے مسکراتی رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہو یا جیسے اُس نے میرے دل کا حال پڑھ لیا ہے اس کا رویّہ ہم سب کے ساتھ ایسا تھا جیسے ہم اُس کے محکوم اور غلام ہوں۔

ہمیں دوبارہ سفر شروع کیے تیسرا روز تھا کہ ہوا دوبارہ چلنی شروع ہوگئی۔ آسمان پر بادل بھی گھِر گھِر کر آنے لگے تھے اور لہریں بھی بلند و شوریدہ سر دکھائی دینے لگیں۔ یہ سب بقول ارغون طوفان کی واپسی کے آثار تھے۔ میرے ساتھی جتنی تیزی سے جہاز چلا سکتے تھے اپنے چپوؤں کی مدد سے چلاتے رہے... اور یہ بھی ایک معجزہ ہی تھا کہ طوفان آنے سے پہلے پہلے ہمیں ساحل نظر آگیا۔

یہ بے شجر و بے گیاہ ساحل آتشین سرزمین ہی کا تھا۔

تا حدِ نظر ریت کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا میرے ساتھی ساحل پر اُترنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو میں نے اُنھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ایک کشتی میں زینا، مرینڈا، پیلو، شافران اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ ساحل پر آگیا۔ میں نے اپنے ساتھ آنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا تھا۔ زینا کے سوا وہ سب خود ہی میرے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ مگر میں زینا کو نہیں چھوڑ سکتا تھا اسی لیے اُسے بھی ساتھ لیتا آیا تھا۔

ہم ساحل پر اُترے ہی تھے کہ صحرا کی جانب سے طوفانِ گرد و غبار آیا اور وہ جہاز کو بہالے گیا۔ تیز ہواؤں نے جہاز فیرا کو جلد ہی ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا طوفانِ باد و باراں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا، میں نہیں جانتا۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ صحرا کے سینے سے اُٹھنے والے بگولوں نے ہمیں ریت میں دفن کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی... لیکن خوش قسمتی سے ہم بچ گئے تھے۔

●

ہمیں اس لق و دق صحرا میں سفر کرتے کئی روز ہوگئے تھے۔ دن میں سورج ہم پر آگ برساتا لیکن رات اپنے دامن میں ایسی ٹھنڈک لیے اُترتی کہ ہم ٹھٹھرنے لگتے تھے۔ ان چند روز میں مجھ پر بڑے عجیب و غریب انکشافات ہوئے تھے۔ جنھوں نے مجھے بُری طرح چکرا کر رکھ دیا تھا... اور یہ انکشافات مرینڈا نے کیے تھے جسے اب میں منگرال شہنشاہ، جھوتان کی بیٹی تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

مرینڈا کا مزاج اور طور طریقے بھی شہزادیوں جیسے ہی تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میرا ہم شکل، میرا جڑواں بھائی منگرالوں کی سرزمین پر پہنچ چکا ہے اور اس کے باپ جھوتان نے اُسے اپنا وزیر بنالیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا... کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہے اور اس نے میری تلاش میں ہر طرف آدمی بھیج دیے ہیں۔

مرینڈا نے یہ انکشاف کبھی ایک ساتھ نہیں کیے تھے جب کبھی وہ ترنگ میں ہوتی تھی مجھے ایک آدھ بات بتا دیتی تھی جس سے میرا جذبۂ تجسس دو چند ہو جاتا اور جب میں اُسے مزید کچھ بتانے کے لیے اصرار کرتا تو وہ خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔

صحرا کے افق پر برف پوش چوٹیوں والے پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ مرینڈا نے بتایا تھا کہ ان پہاڑوں کے اُس پار منگرال بستے ہیں اور اس کا باپ اُن پر حکمرانی کرتا ہے۔ ہمارا سفر مسلسل جاری تھا مگر وہ پہاڑ اب بھی اتنے ہی دُور تھے جتنے دُور کہ پہلے روز دکھائی دیے تھے۔

یہ حقیقت تھی کہ اس صحرا میں پانی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا مگر میں نے پانی کے حصول کا ایک طریقہ معلوم کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ عام موسم میں ہَوا سمندر کی جانب سے صحرا کی طرف چلتی ہے اور اپنے ساتھ نمی کے بخارات لاتی ہے۔ چنانچہ رات کے پہر میں ریت میں دبے ہوئے پتھر ایک ڈھیر کی صورت میں جمع کر لیتا۔ ٹھنڈے پتھروں پر نمی جمع ہو کر قطروں کی صورت اختیار کر لیتی اور یہی قطرے نہ صرف ہماری پیاس بجھانے کے کام آتے بلکہ میں ان سے وہ چھوٹا سا مشکیزہ بھی بھر لیتا جو شافران نے جہاز سے آتے وقت اپنی پیٹی کے ساتھ باندھ لیا تھا۔

کھانے کا مسئلہ بھی مرینڈا کی مدد سے کسی حد تک حل ہوگیا تھا۔ مرینڈا نے بتایا تھا کہ اس صحرا میں ایسے سانپوں کی کمی نہیں جو زہریلے نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہم تلوار کی مدد سے روزانہ اتنے سانپ مار لیا کرتے جنھیں بھون کر ہماری بھوک مٹ جاتی تھی۔

مرینڈا نے یہ بھی بتایا کہ دُور دکھائی دینے والے پہاڑوں سے پہلے ایک نخلستان واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچیں گے تو ہماری خاطر مدارت کی جائے گی اور شاہ جھوتان کو ہماری آمد کا پیغام

بھیجا جائے گا۔ یہ پیغام ملتے ہی راجدھانی سے ایک گروہ ہمیں لینے کے لیے آجائے گا۔ میرے لیے اب یہ سوچ پریشان کن تھی کہ میرا ڈپلی کیٹ راجدھانی میں ایک اعلا عہدے پر فائز میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ جس حیثیت میں تھا، میرے ساتھ ہر سلوک کر سکتا تھا۔ پہلے تو میں اُس کی تلاش میں آتشین سرزمین پہنچنا چاہتا تھا مگر اب میں اس شش و پنج میں تھا کہ منگرالوں کی راجدھانی جاؤں یا نہ جاؤں۔ لیکن وہاں جائے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

اب کبھی کبھی میرے سر میں درد بھی ہونے لگا تھا جب کبھی میرے سر میں درد کی لہر اُٹھتی، میں سوچتا کہ کیا میرے ڈپلی کیٹ کے سر میں بھی درد کی ایسی ہی لہر اُٹھتی ہوگی؟ اس لیے کہ کمپیوٹر کی لہریں اس سے ٹکراتی اور اُسے بھی کھوجتی ہوں گی۔

زینا کی حالت ویسی ہی تھی۔

وہ اب تک نہ مجھے پہچان سکی تھی اور نہ ہی پیلو کو... صرف شافران ہی ایک ایسا فرد تھا جس کے ساتھ وہ قدرے مانوس ہو گئی تھی۔ وہ بھی پوری طرح اس کی نگہداشت کرتا تھا۔ ایک رات پیلو نے مجھ سے کہا۔

"زینا کی وجہ سے ہم تیزی کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔ وہ پاگل ہوگئی ہے۔ جب میں اُسے جنونی حالت میں دیکھتا ہوں تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ زندگی بھر پاگل رہنے کی بجائے مر جائے؟"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو، پیلو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم دل پر پتھر رکھ کر اُسے یہیں صحرا میں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں تو بہتر ہوگا۔"

یہ سُن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ میں نے پیلو کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم جو معلمِ اخلاق تھے؟ وہ وقت یاد کرو پیلو جب تمھاری زندگی بچانے کے لیے میں نے اُسے پکڑا تھا۔ پھر سرابانی رسم و رواج کے مطابق وہ میری بیوی بنی تھی۔ میں اُسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"میں آج بھی معلمِ اخلاق ہُوں۔" وہ بولا۔ "وقت نے میرے ہاتھ میں تلوار تھما دی تھی اور وقت نے ہی وہ تلوار میرے ہاتھ سے چھین لی ہے۔ طاقت اور اقتدار آنی جانی چیزیں ہیں لیکن علم و اخلاق کو زوال نہیں۔ میں نے تو یہ بات اس لیے کہی تھی کہ وہ ناقابلِ علاج ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا حُسن اور جوانی اُسے پھر درندگی کا شکار بنا دے۔"

"نہیں پیلو۔ اب وہ میرے ساتھ ہے میں ایسی نوبت نہیں آنے دوں گا۔" میں اُسے گھورتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے یہ مشورہ مرینڈا کے کہنے پر تو نہیں دیا؟"

"نہیں جناب۔ آپ کو یہ شک کیسے ہُوا؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ زیادہ تر تم ہی سے باتیں کرتی رہتی ہے۔"

"ہاں کپتان... اور وہ باتیں صرف آپ کے اور زینا کے متعلق ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ آپ کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتی ہے۔"

ہم اس وقت پتھروں پر جمع ہونے والے قطرے سمیٹ کر مشکیزہ بھر رہے تھے۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ اتنے میں زینا کراہنے لگی۔

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔

شافران نے جلدی سے اُسے اپنی آغوشِ شفقت میں سمیٹ لیا۔ جیسے ماں اپنے بچّے کو سردی سے بچانے کے لیے گود میں بھر لیتی ہے۔

پیلو سونے کے لیے چلا گیا مگر میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اب میں پہلے سے کہیں زیادہ جذباتی ہوگیا تھا زندگی نے میرے ساتھ کتنا بے رحمانہ سلوک کیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں مر جاؤں لیکن جب کبھی ایسا موقع آتا تھا تو میں لاشعوری طور پر اپنے تحفظ اور بقا کے لیے سینہ سپر ہو جاتا تھا۔ میرے متضاد خیالات کی رو یہیں تک پہنچی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے کچھ کھٹکا سا سُنائی دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

قریبی چٹان کے ساتھ شہزادی مرینڈا کھڑی تھی۔ وہ سرو قامت تھی۔ اور پچھلے پہر کی چاندنی میں اُس کا حُسن بے پناہ لگ رہا تھا۔ اُس نے اُسی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے، سرزوش۔"

"سردی تو مجھے بھی لگ رہی ہے مرینڈا۔ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہُوں؟"

اُس نے زینا کی طرف اُنگلی اُٹھا دی جو شافران کی آغوشِ شفقت میں سمٹی ہُوئی تھی۔ "یہ کیڑا جانور بھی جانتا ہے کہ سائبان کیسے بنا جاتا ہے۔"

مَیں سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ گیا۔

●

صبح جب ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تو مرینڈا میرے قریب آ گئی "میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی سرفروش!" اس نے کہا۔

.. "کیا فیصلہ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم دونوں بھائیوں میں سے کون بہتر ہے؟ تم یا وہ؟"

اس کا مطلب تھا کہ وہ میرے ڈپلی کیٹ سے بھی مل چکی تھی۔ میں بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

"میں اس سلسلے میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"میں جانتی تھی کہ تم ضرور جاننا چاہو گے۔ مجھے بھی تم سے دلچسپی ہے۔ میں اس سلسلے میں پیلو کو کُریدتی رہی ہوں۔ اس نے مجھے تمھارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مگر وہ باتیں نہیں بتا سکا جو میں جاننا چاہتی تھی۔ میں تم سے بات کرنے کے لیے مناسب وقت کی منتظر تھی۔ میں چاہتی تھی کہ جب نخلستان تک صرف پانچ یوم کا سفر باقی رہ جائے تو بات کروں گی اور اب وہ وقت آ گیا ہے۔ تم اپنے جڑواں بھائی کے متعلق کیا جاننا چاہتے ہو، سرفروش؟"

"وہ سب کچھ جو تم جانتی ہو" میں نے کہا۔

"عجیب سی بات ہے کہ جب اس نے تمھارے بارے میں سُنا تو بولا کہ تم اس کے جڑواں بھائی ہو اور وہ تمھارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہے۔ تم دونوں کیسے جڑواں بھائی ہو کہ ایک دوسرے کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟"

"سب کچھ جاننے سے میری مُراد بچھڑنے کے بعد حالات سے ہے، شہزادی۔ . . مگر اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں زندہ ہوں؟"

"سراما سے ایک گھڑ سوار آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اُسے وہاں کے مہاپجاری نے بھیجا ہے اور وہ جاننا چاہتا ہے کہ تمھارا جُڑواں بھائی یہاں پہنچا ہے یا نہیں؟"

میں سمجھ گیا کہ یہ حرکت کریڈ کی ہو گی لیکن ان باتوں کا آغاز جس انداز سے ہوا تھا، وہ کچھ اور ہی غمازی کرتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تمھارا کیا اندازہ ہے شہزادی کہ ہم دونوں بھائیوں میں سے کون بہتر ہے؟"

"میں فی الحال کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، سرفروش"

●

شہزادی مرینڈا نے بتایا تھا کہ ہم پانچویں روز نخلستان تک پہنچ جائیں گے۔ اس کی بات درست ہی ثابت ہوئی۔ وہاں شہزادی کی وجہ سے ہماری بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ہمیں کھانے کو عمدہ غذا اور پہننے کو نئے کپڑے دیے گئے۔ چشمے کے سامنے ہی وہ درّہ تھا جہاں سے منگرولوں کی جماعت آنے والی تھی اور جس کا ذکر مرینڈا نے کیا تھا۔

مرینڈا دن میں تو مقامی لوگوں کے ساتھ رہتی لیکن رات ہوتے ہی ہمارے پاس آ جاتی تھی۔ مقامی لوگ قد آور تھے۔ مرینڈا نے بتایا کہ وہ منگرولوں کے نچلے درجے کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی عورتیں اس طرح نقاب ڈالتی تھیں کہ چہرے کا زیریں حصہ ڈھکا رہے مگر آنکھیں آزاد رہیں۔ کچھ منگرول ٹوپی پہنتے تھے اور کچھ پگڑیاں باندھتے تھے۔ ان لوگوں نے ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا اور میرے لیے یہ بات بڑی ہی تعجب خیز تھی کہ ہمارا خیر مقدم اور مہمان داری میرے ڈپلی کیٹ کی ہدایت پر کی گئی تھی جو وہاں وزیر کے عہدے پر فائز تھا۔

صحرا کے پُرصعوبت سفر کی تھکن اور نقاہت دو تین روز میں ہی جاتی رہی۔ جب ہم ساحل پر اُترے تھے اور سفر کا آغاز کیا تھا تو کُل نو افراد تھے . . . مگر نخلستان تک پہنچتے پہنچتے صرف پانچ ہی رہ گئے تھے۔ میں، زینا، مرینڈا، پیلو اور شافران . . . میں نے ایک بار پھر زینا سے بات کرنا اور اُسے اپنا رشتہ یاد دلانا چاہا . . . مگر وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر یوں شافران سے لپٹ گئی جیسے کوئی خوف زدہ بچہ ماں سے لپٹ جاتا ہے . . . شافران بڑے پیار سے اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے اور اُسے تھپکنے لگا۔ مرینڈا بھی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے الگ لے گئی اور بولی . . .

"اس کا پاگل پن کبھی ٹھیک نہیں ہو گا، سرفروش۔ ہمارے ملک بیکال میں ایسے لوگوں کے لیے ایک مقام مخصوص کر دیا گیا ہے جہاں دیوانوں کی خبرگیری اور نگہداشت کی جاتی ہے۔ میں اسے وہاں بھجوا دوں گی"

"نہیں شہزادی" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میں یہ بات پسند نہیں کروں گا۔ زینا میری ذمّے داری ہے کیوں کہ سرامائی قانون کے مطابق اس نے مجھ سے شادی کی تھی"

"ہُش . . . !" وہ بولی "اَب تم سراما میں نہیں ہو اور پھر کیا تم ایک ایسی عورت کے شوہر کہلانا چاہتے ہو جو قزاقوں کی بربریت کا اس قدر نشانہ بنی ہے کہ اپنا ذہنی توازن تک کھو بیٹھی ہے؟"

مجھے مرینڈا کی اس بات پر غصّہ آ گیا "تم بھی تو قزاقوں کے قبضے میں تھیں شہزادی۔ انھوں نے تمھارے ساتھ بھی تو وہی سلوک کیا ہو گا جو زینا کے ساتھ کیا ہے"

مرینڈا نے پُرغرور انداز سے اپنی گردن کو جھٹکا دیا اور بولی "میں منگرول شہنشاہ کی بیٹی ہوں، سرفروش۔ قزاقوں کو میرے سامان سے ایسے ثبوت مل گئے تھے جن سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی تھی . . . پھر میں نے اُن سے گراں زرِ تاوان ادا کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا اس لیے ان کی درندگی سے محفوظ رہی ہوں۔ دوسرے جب انھوں نے مجھے قیدی بنایا تو وہ زینا کے جہاز پر قابض ہو چکے تھے اور زینا اُن کی مسلسل درندگی کا شکار بن رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ شہزادی ہے تو اس نے میری طرح قزاقوں سے زرِ تاوان ادا کرنے کا وعدہ کیوں نہیں کیا؟ اگر وہ ایسا کرتی تو اُن کی درندگی سے یقیناً محفوظ رہتی"

"تم خوش قسمت ہو شہزادی" میں نے اُسے مختصر سا جواب دیا۔ میں اُسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اگر زینا اُن سے زرِ تاوان دینے کا وعدہ کر بھی لیتی تو ملکہ فیرا اُس کی ادائیگی نہ کرتی کیوں کہ اس طرح اس کی ایک بیٹی اپنے آپ ٹھکانے لگ جاتی اور اس کے لیے زہر کے ایک پیالے کا خطرہ کم ہو جاتا۔

اتنے میں مرینڈا پھر بول اُٹھی "تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں قزاقوں کے ہاتھ کیسے لگی تھی؟"

"میں نے پوچھا تھا . . . مگر تم نے بتایا ہی نہیں"

"اوہ ہاں . . . . دراصل میری اَنا یہ برداشت نہیں کرتی تھی کہ کوئی مجھ سے پُوچھ گچھ کرے۔ خیر . . . اَب تمھیں سارا قصّہ بتائے دیتی ہوں۔ میں نمورینہ کے قریبی مُلک اردونا جا رہی تھی۔ میرے ساتھ ایک چھوٹا سا کارواں تھا۔ تم اسے میرا محافظ دستہ بھی کہہ سکتے ہو۔ ہمارا جہاز اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا کہ قزاقوں کی کشتیوں نے اُسے گھیر لیا۔ کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ نے فرار ہونا چاہا تو ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ قزاق مجھے اُسی جہاز پر لے آئے جسے تم نے مرمت کروا کر اپنے ساتھی کو دے دیا تھا۔ اس جہاز پر بہت سی عورتیں تھیں۔ زینا بھی ان میں شامل تھی اور چونکہ وہ سب سے حسین تھی اس لیے سب سے زیادہ تختۂ مشق بنتی رہی۔ اتنے میں ایک زبردست طوفان آیا۔ جہاز کا اگلا حصّہ ٹوٹ گیا۔ قزاق سمجھے کہ جہاز ڈوبنے والا ہے۔ وہ اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر جہاز سے چلے گئے لیکن طوفان نے اُن کی کشتیاں اُلٹ دیں۔ اُن میں سے دو کسی طرح دوبارہ جہاز تک پہنچ گئے . . . مگر غصّے میں بھری ہوئی عورتوں نے جوشِ انتقام میں اُنھیں مار ڈالا . . . پھر تمھارا جہاز آ گیا۔ اس کے بعد کے حالات تم خود بھی جانتے ہو"

شہزادی اُس حفاظتی دستے کے انتظار میں وہاں ٹھہری ہوئی تھی جو ہمیں لینے کے لیے بیکال سے آنے والا تھا۔ میں سارا دن بستی کے باہر ایک چھوٹے سے چشمے کے پاس درختوں کی چھاؤں میں بیٹھا سوچتا رہتا تھا۔ میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آ سکی تھی کہ میرے ڈپلی کیٹ نے ہمارے پُرتپاک خیر مقدم اور خاطر مدارت کے احکام کیوں جاری کیے ہیں؟ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اس عزت و تکریم کی بجائے اس نے میرے قتل کا حکم صادر کر دیا ہو گا۔ اس متضاد سلوک کا مطلب تھا کہ وہ کسی خاص منصوبے کے تحت ایسا کر رہا ہے۔ وہ منصوبہ یا چال کیا ہو سکتی ہے، میرے فہم و ادراک سے باہر تھی۔ اس لیے مجھے اس وقت تک کچھ بھی نہیں کرنا تھا جب تک کہ وہ خود کوئی قدم اُٹھانے میں پہل نہ کرے۔ اس سلسلے میں مجھے صرف دفاعی جنگ لڑنا تھی۔

تھوڑی دیر پہلے میرے سَر میں زور کا درد اُٹھا تھا۔ اس بار یہ درد بے حد شدید تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کمپیوٹر کی لہروں نے مجھے تلاش کر لیا ہو . . . پھر ایک دم ہی وہ درد ختم بھی ہو گیا۔ یہ اس

اُمر کی نشانی تھی کہ ڈاکٹر فریدوں، مجھے کسی بھی لمحے واپس بلا سکتا ہے۔

مَیں نے پیلو کی طرف دُکھ سے دیکھا جو مجھے سر درد میں مبتلا دیکھ کر بُری طرح پریشان ہوگیا تھا۔ وہ بولا "کیا آپ کو بہت تکلیف ہے، جناب؟ مَیں کوئی دوا تیار کردوں؟"

"نہیں پیلو، سر درد تھا جو ٹھیک ہوگیا" مَیں اُسے کیسے بتا سکتا تھا کہ اَب کسی وقت بھی ہم کبھی دوبارہ نہ ملنے کے لیے جُدا ہو سکتے ہیں۔ مَیں نے اس سے پوچھا "تم مستقبل میں کیا کرنا چاہتے ہو، شھنگو میاں؟"

"مَیں سراما جاکر ملکہ فیرا کی حمایت میں نُوریئہ کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنا چاہتا ہوں۔ مَیں غلام ملک نہیں بلکہ آزاد ملک کا آزاد شہری بننا چاہتا ہوں"

"تم دوبارہ سراما جانا چاہتے ہو؟" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

"مَیں سرامانی ہوں، جناب۔ میری جڑیں سراما میں ہیں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو میں اپنے وطن ضرور جاؤں گا۔"

مَیں نے سوچا کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ہر آدمی کی جڑیں اپنے ہی وطن میں ہوتی ہیں۔ میں خود بھی تو اپنی سرزمین اور اپنے وطن کی طرف لوٹ جاؤں گا۔۔۔ پھر اچانک مجھے ایک بات سُوجھی۔ مَیں نے کہا "تم جینئس بننا چاہتے ہو، پیلو؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ عظیم تر انسان ہوتا ہے پیلو! جسے لوگ ہمیشہ عزت و تکریم سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے ہم عصر ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس پر فخر کرتی ہیں اور اس کے مجسمے بناکر انھیں ہار پہناتی ہیں"

"جیسے دیوتا بروق کے مجسمے بنائے جاتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت" مَیں نے جواب دیا۔

"پھر تو میں جینئس بننا پسند کروں گا لیکن کیا اس کے لیے مجھے پہلے مَرنا پڑے گا؟"

مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی "موت تو برحق ہے دوست' سب کو ایک نہ ایک روز مَرنا ہی ہے۔۔۔ مگر جینئس بننے کے لیے مَرنا شرط نہیں۔ مَیں تمھیں ایک ایسی راز کی بات بتاتا ہوں، جو تمھیں جینئس بنادے گی"

"ضرور بتایئے جناب! مجھے آپ پر اعتماد ہے"

"تو پھر غور سے دیکھو اور ہر بات اچھی طرح ذہن نشین کرتے جاؤ" یہ کہہ کر مَیں نے زمین پر دائرہ بنایا۔

"یہ سورج ہے یا چاند۔۔۔ مگر یہ مجھے جینئس کیسے بنائے گا؟"

وہ فوراً ہی بول اُٹھا۔

"بیچ میں مت بولو اور غور سے دیکھتے جاؤ۔ یہ نہ تو سُورج ہے اور نہ ہی چاند ہے۔۔۔ بلکہ یہ ایک پہیّہ ہے۔۔۔ اور یہ دوسرا پہیّہ ہے" مَیں نے دوسرا دائرہ بناتے ہُوئے سمجھایا اور پھر تقریباً نصف گھنٹے بعد وہ پہیّے کی کارکردگی سے آگاہ ہوچکا تھا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔۔۔

"یہ باتیں اب تک سراما کے کسی آدمی نے کیوں نہیں سوچیں؟"

"اس لیے کہ اُن میں کوئی جینئس نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ منگرولوں میں بھی ایسا کوئی جینئس پیدا نہیں ہُوا جو پہیّے کا استعمال جانتا ہو۔ تم انھیں کسی چمڑے یا کپڑے پر مت بنانا بلکہ ہر بات اپنے ذہن میں نقش کرلو اور جب بھی موقع ملے' سراما پہنچ جاؤ"

"مَیں ایسا ہی کروں گا۔ بس سمجھ لو کہ میں جینئس بن گیا ہوں"

ابھی ہم پہیّے کی باتیں ہی کر رہے تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپیں سُنائی دیں۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا تو درّے کی سمت سے تقریباً پچیس گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ وہ میرے قریب آکر رُک گئے۔ اُن کے سربراہ نے مجھے چمڑے کے ٹکڑے پر مشتمل ایک خط دیا جس میں یہ الفاظ تحریر تھے۔۔۔

"برادرِ عزیز! مَیں تمھیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ خبر میرے لیے خوشی کا باعث بنی کہ تم زندہ ہو۔ مَیں تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں۔ فی الفور روانہ ہوجاؤ۔

تمھارا جُڑواں بھائی۔ گومرڈش"

تقدیر ایک بار پھر مجھے اپنے نقلی ہمزاد کے رُوبرو لے ئی تھی۔

ہم آمنے سامنے کھڑے، ایک دوسرے کو عجیب نگاہوں سے یکھ رہے تھے۔ اِن نگاہوں میں تجسّس، خدشے، وسوسے، نید اور خوف کے جذبے شامل تھے لیکن عدمِ اعتمادی کا رنگ ب سے گہرا تھا۔

مجھے اس کمرے میں آئے چند لمحے ہی ہُوئے تھے کہ وہ میرے س پہنچ گیا تھا۔ ہم دونوں منگراوں کے لباس پہنے ہُوئے تھے۔ فرق ا تو صرف اتنا کہ میرے ڈپلی کیٹ کی دستار قرمزی رنگ کی ں اور میری سفید۔۔۔ اس کے آنے سے پہلے مَیں نے کمرے کا اچھی ح جائزہ لے لیا تھا۔

یہ مکان، شہر کی دیگر عمارات کی طرح مٹّی کی پُختہ اینٹوں کا ہُوا تھا اور اینٹیں غالباً اس لیے استعمال کی گئی تھیں کہ شہر کے ں، طوفانوں کے تند و تیز جھکڑوں سے محفوظ رہ سکیں۔ سامنے یوار میں ایک دریچہ تھا جس سے تموتان کے محل اور شہر کے مینار ائی دے رہے تھے۔

پہلی بار جب میرا اپنے ڈپلی کیٹ سے آمنا سامنا ہُوا تھا تو ہذب دُنیا کے لباس میں تھے۔۔۔ مگر آج ہمارے جسم کے اُوپری مبے لباس تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ اس کے سینے پر بھی ال کے ویسے ہی نشانات ہیں، جیسے میرے سینے پر تھے۔ البتہ میرے ، اور جسم کے دوسرے حصّوں پر جن نئے زخموں کا اضافہ ہُوا تھا، سے میرے نقلی ہمزاد کا سینہ اور دوسرے اعضا محروم تھے۔ اس کا ب تھا کہ ڈپلی کیٹ تیار کرنے والا اصلی شخصیتوں کی ہر بات باخبر رہتا ہوگا۔ ایک بار میرا آپریشن ہُوا تھا جس کی وجہ سے میرے پیٹ دائیں جانب ٹانکے لگنے سے کن کھجورے جیسا نشان باقی رہ گیا تھا۔ میں یکھا کہ میرے نقلی ہمزاد کے پیٹ پر بھی کن کھجورے جیسا ٹانکوں کا ن موجود ہے۔

میرا ڈپلی کیٹ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا مگر مَیں کمرے میں ٹہلتا اور سے نظر آنے والے شہر کے مینار دیکھتا رہا۔ دراصل مجھے اپنے لیٹ کے اطمینان اور سرد مزاجی نے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ رئیں جانتا تھا کہ کھُد بُد اس کے دل میں بھی مچی ہُوئی ہے۔۔۔ بظاہر وہ بڑا مطمئن نظر آنے کی کوشش کررہا ہے۔

مجھے اُس کی بالادستی قبول نہیں تھی۔ پہلے راؤنڈ میں رے صرف لالہ اور اُس کے خاندان کی وجہ سے جیت گیا تھا۔ ا وقت ان کی زندگیاں داؤ پر نہ لگی ہُوئی ہوتیں تو میں جان پر کھیل کر بھی اُس کا مقابلہ کرلیتا مگر اب ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تاہم اُس ملاقات میں کشت و خون کا امکان نہیں تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اُس وقت میری بجائے میرا بریدہ سر ایک طشت میں اس کے سامنے رکھا ہوتا۔۔۔ مگر اس نے مجھے بڑے احترام سے بُلوایا تھا۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ یہ عقدہ وَا ہونا ابھی باقی تھا۔

میرے ڈپلی کیٹ نے پائپ نکالا، اس میں حشیش کا بُرادہ بھرا اور انگیٹھی سے لکڑی کا ٹکڑا جلا کر اُسے سُلگایا پھر جلدی جلدی کش لینے لگا جس سے کمرے میں سپید سا دُھواں اور ایک عجیب سی مست کردینے والی خوشبو پھیل گئی۔ اچانک وہ بولا۔۔۔

"یہاں اپنا کردار ادا کرتے ہُوئے، میں ہر طرح کا نشہ کرسکتا ہوں۔ شاید مَیں اپنے ملک میں حشیش پینے کا تصوّر بھی نہ کرسکتا۔ مجھے افسوس ہے' سرفروش! کہ تم تمباکو نوشی نہیں کرتے ورنہ اپنے ملک میں مجھے بھی اُسی برانڈ کے سگریٹ پلاکرتے جو تم پیتے"

میں اس بار پھر متعجب ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کمبخت کا لب و لہجہ بھی بالکل میرے جیسا ہی تھا۔ وہ دوبارہ پائپ کے کش لینے میں مصروف ہوگیا۔

ہماری یہ ملاقات اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر ہُوئی تھی۔ آج جونہی ہم یہاں پہنچے تھے، مرنیدا یہ وعدہ کرکے محل کے دوسرے حصّے میں چلی گئی تھی کہ پیلو، زینا اور شافران کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے جاتے ہی شاہی ملازمین زینا، شافران اور پیلو کو الگ لے گئے تھے اور مجھے تقریباً درجن بھر کنیزوں کے جُھرمٹ میں' حمام بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں غسل سے پہلے میرے بال تراشے گئے اور خط بنایا گیا پھر جب میں نہا دھوکر اور نیا لباس پہن کر حمام سے باہر آیا تو مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے چند منٹ بعد ہی میرا ڈپلی کیٹ آگیا تھا اور اب میرے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا حشیش پی رہا تھا۔

رضا آفندی نے مجھے تاکید کی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی قتل کردوں۔ میں اُسے قتل کرنے کی کوشش کرسکتا تھا، لیکن اس کے بعد۔۔۔؟ مَیں نے فی الوقت یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

میرا ڈپلی کیٹ دُھواں اُڑاتے اور مُسکراتے ہوئے بولا "آرام سے بیٹھ جاؤ، سرفروش! مجھے تم سے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں اور شاید تم بھی مجھ سے کچھ سوال کرنا چاہو گے۔ یہاں کوئی خطرہ محسوس نہ کرو۔ اب ہم اُن حالات میں نہیں ملے جب مجھے تمھارے ساتھ کچھ زیادتی کرنا پڑی تھی۔ وہاں ہم ایک دوسرے کے دُشمن تھے جب کہ یہاں دوست ہیں"

"اچھا۔۔" میں نے مصنوعی تعجب سے کہا: "یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں؟ میں تو اس پُرانے نکتۂ نظر سے سوچ رہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے مدِمقابل ہیں۔"

وہ بالکل میرے ہی جیسے انداز میں مسکرایا اور بولا: "مجھے اسی بات کا خدشہ تھا سرفروش! ہم اپنی دُنیا میں تو ایک دوسرے کے مدِمقابل ہو سکتے ہیں لیکن ماضی کی اس اندھیری دُنیا میں جہاں ہم نیم وحشی انسانوں اور خوں آشام تہذیب کے حصار میں پھنس گئے ہیں، ایک دوسرے کے دُشمن نہیں ہو سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں، میں تمھیں تلاش کر کے مار ڈالنا چاہتا تھا مگر اب مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہم اسی مُردہ زمانے کی قید میں کب تک بقا کی جنگ لڑتے رہیں گے۔ کمپیوٹر کب ہمیں اپنی زمین پر بُلائے گا اور میں کب اپنے وطن واپس پہنچوں گا؟ یہ ساری باتیں تم ہی مجھے بتا سکتے ہو۔"

"میں اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا میرے نقلی ہمزاد۔ یہ بتاؤ، کیا تم پر سر درد کے دورے پڑتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ کبھی کبھی میرا سر درد سے پھٹنے لگتا ہے۔" وہ اپنی کنپٹیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا: "اس درد کا ہماری واپسی سے کوئی تعلق ہے کیا؟"

"ہاں۔۔" میں نے اُسے سچ سچ بتا دیا: "درد کی یہ لہریں کمپیوٹر کی اُن لہروں سے پیدا ہوتی ہیں جو ہمیں کھوجتی ہیں۔"

"مجھے بھی یہ شک ہوا تھا۔" وہ بولا: "اس کا مطلب ہوا کہ ہمیں واپسی کے لیے تلاش کیا جا رہا ہے۔"

"ہاں۔ ہم کسی وقت اپنی زمین پر منتقل ہو سکتے ہیں۔"

میں نے تائید کی تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میرے جی میں آیا کہ اس پر یکبارگی حملہ کر کے اُسے ختم کر دوں مگر یہاں آتے وقت میں قاتلوں کے کٹے ہوئے سروں کی نمائش دیکھ چکا تھا جو کھمبوں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ دوسرے شہزادی مرینا ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ ہم دونوں میں سے کون بہتر ہے اور اس فیصلے کے بعد صرف اُسی کو زندہ رہنا تھا جو بہتر ہوگا۔ ان باتوں نے مجھے اس پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میرا نقلی ہمزاد مجھ سے عیاری برت رہا ہے تو مجھے بھی عیاری، مکر اور چالاکی سے کام لینا ہوگا۔

اتنے میں میرا ڈپلی کیٹ یوں بول اُٹھا جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔

"مجھے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرو، سرفروش! دھوکے میں مت رکھو۔ دیکھو میں تمھیں فی الوقت کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا حالانکہ میرے لیے ایسا کرنا بے حد آسان ہے۔ میں جموتان کا وزیر ہوں جو انگلی سے اشارہ کرتا ہے تو لوگوں کی گردنیں کٹ جاتی ہیں لیکن اپنے ساتھ مجھے تمھاری جان بھی عزیز ہے۔"

میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ عیاری کا جواب عیاری سے دوں گا چنانچہ اس کے جواب میں بولا: "میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ جس طرح تمھیں میری ضرورت ہے اسی طرح تم بھی میری ضرورت بن گئے ہو۔ میں کمپیوٹر کے بارے میں جانتا ہوں اور تم یہاں کی معلومات رکھتے ہو۔ اس لیے ہمیں ایک دوسرے کو اعتماد میں لینا پڑے گا۔ ویسے مستقبل کے لیے میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے، شاید تم بھی اس سے اتفاق کرو گے۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا مگر جب ہم دونوں کی نگاہیں ملیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں کچھ اور ہی ہو۔۔۔ اس نے بھی غالباً میرے بارے میں ایسا ہی اندازہ لگایا تھا۔ تاہم اس نے بات جاری رکھی۔

"یہ معاہدۂ دوستی ایک تقریب کا تقاضا کرتا ہے، سرفروش جسے ہم جام و مینا سے منائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے پر گیا جس کے کواڑ چمڑے کے بنے تھے اور اس پر پیتل کے نقش و نگار تھے۔ اس نے اُسے کھول کر بار تالی بجائی اور اپنی جگہ واپس آ گیا۔ چند لمحوں کے بعد دو بے حسین اور نوشباب کنیزیں ایک طشت میں جام و مینا اور دو میں پھل لیے داخل ہوئیں اور ہمارے سامنے رکھ کر مؤدب کھڑی ہو گئیں۔

میرے ڈپلی کیٹ نے انھیں اشارہ کیا تو وہ اس کے قریب آ گئیں۔ وہ حشیش کے سرور میں چند لمحے اُن سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا پھر اچانک ہی جیسے اُسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے کنیزوں کو جانے کا اشارہ کیا اور جام بھرنے لگا۔ ایک جام میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔۔۔

"اس نیم وحشی تمدن میں حُسن و شباب کی جو فراوانی ہے وہ ہماری مہذب دُنیا میں کہیں نظر نہیں آتی۔ میرے پاس ان سے زیادہ نازک اندام اور نوعمر بیسیوں کنیزیں ہیں۔ جموتان کا محل مختلف قبائل کی کنیزوں سے بھرا پڑا ہے جو ہر لمحے میری منتظر رہتی ہیں۔"

میں اس بات کے جواب میں صرف مسکرا دیا اور جام سے ایک چسکی لے لی۔

"اس میں نہ زہر ہے اور نہ ہی بے ہوشی کی دوا۔ بیوقوف" یہ کہہ کر اس نے اپنا جام مُنہ سے لگایا اور خالی کر کے دوسرا بھر

اس کی یہ حرکت صاف بتا رہی تھی کہ وہ پرلے درجے کا شرابی ہے اور یہ بات میرے حق میں بہتر ہی تھی۔

"وہ تجویز کیا ہے؟" بالآخر اس نے پوچھا۔

"اپنی زمین پر واپسی کے بعد تم ہمارے ملک میں سیاسی پناہ لے لو۔" میں نے کہا۔

"مگر کیوں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"اس لیے کہ جب تمھیں کمپیوٹر یہاں سے منتقل کرے گا تو تم وہاں دھر لیے جاؤ گے۔ تم پر دُہرے الزامات کے تحت مقدمہ چلے گا۔ جاسوسی کا بھی اور ہمارے پروجیکٹ کو اُڑانے کی دھمکی کا بھی... جیل میں جانے کے بعد خود تمھارا ملک بھی تمھاری طرف سے شُبہے میں مبتلا ہو جائے گا۔ تب خود تمھارا بھی جی چاہے گا کہ ہمارے ہاں رہ جاتے مگر اس طرح تمھاری عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ زنداں میں کٹ چکا ہو گا، لیکن اگر تم ابھی سے میرے ساتھ معاہدہ کر لو تو میں جاتے ہی تمھیں سیاسی پناہ دلوا دوں گا بشرطیکہ کمپیوٹر مجھے اور تمھیں بخیریت واپس منتقل کر دے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔

اس نے اپنا پائپ دوبارہ بھرا اور جام اُٹھا کر دریچے کے پاس چلا گیا۔ شاید وہ مجھ سے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانا چاہتا تھا۔ اس تجویز سے میرا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے کوئی بھی نقصان نہ پہنچائے... بلکہ میری زندگی کی خود حفاظت کرے۔ دوسرے اس کے سیاسی پناہ لینے پر اس کے ملک کی بدنامی ہو گی اور بین الاقوامی سطح پر اس کے وقار کو دھچکا لگے گا۔

میرا ڈپلی کیٹ پلٹا اور بولا: "کیا تمھارا کمپیوٹر کسی مُردہ شخص کو بھی منتقل کر سکتا ہے؟"

"نہیں... کمپیوٹر مُردہ خلیوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے مُردہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

اتنے میں باہر سے نفیریوں اور جھانجروں کی آوازیں آنے لگیں۔

میرا ڈپلی کیٹ مسکراتے ہوئے بولا: "آج تمھارے اعزاز میں ایک جشنِ رقص و موسیقی منعقد کیا جا رہا ہے۔ شاہی مہمانوں کے اعزاز میں ایسے جشن منانا یہاں کا دستور ہے۔ میرے اعزاز میں بھی جشن ہوا تھا۔ مگر آج کا جشن کچھ زیادہ ہی دھوم دھام سے منایا جائے گا کہ ہم دو بچھڑے ہوئے بھائی ایک بار پھر مل گئے ہیں... آج حسین کنیزوں کی نئی کھیپ دف اور مودِں کی وحشی تال پر رقص کرے گی۔ اس کے بعد تم چموتان کی بارگاہ میں پیش کیے جاؤ گے اور وہ فیصلہ کرے گا کہ ہم میں سے کون اس کا داماد بنے گا کس کے حصّے میں سیج اور کس کے حصّے میں تختۂ دار آئے گا۔ کتنی عجیب صورتِ حال ہے... ہے نا؟"

یہ سُن کر خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔

مجھے مرینڈا کی بات یاد آئی کہ وہ اب تک ہم میں سے کسی ایک کو منتخب نہیں کر سکی، اس لیے میں نہیں جانتا کہ ہم میں سے کسے بہتر قرار دیا جا سکتا ہے پھر مجھے اپنے ڈپلی کیٹ کا وہ سوال یاد آ گیا کہ کیا کمپیوٹر کسی مُردے کو بھی منتقل کر سکتا ہے؟... اور میرا خیال یہ آیا کہ شاید جان بُوجھ کر میرے ڈپلی کیٹ نے مجھے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ یہ کام خود نہیں بلکہ چموتان سے کروانا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو ان خدشات سے بے نیاز اور نڈر ظاہر کرتے ہوئے کہا...

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں، پہلے سیاسی پناہ کے بارے میں فیصلہ کر لو، کیوں کہ کمپیوٹر کسی بھی لمحے تمھیں واپس منتقل کر سکتا ہے۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں، بڑے بھائی! میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کو تیار ہوں۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ آیا ہم دونوں واپسی تک زندہ بھی رہیں گے یا نہیں۔ تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہماری واپسی کب ہو گی؟"

"ہاں... وہ اگلے چند لمحوں میں بھی ہو سکتی ہے اور مہینوں میں بھی نہیں۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کمپیوٹر ہماری کھوج میں ہے لیکن یہ مرینڈا کا چکر...؟"

"تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ یہی کہنا چاہتے ہو، نا تم؟" وہ بولا: "چموتان منگرالوں پر حکمرانی کرتا ہے... مگر وہ خود مرینڈا کے قابو میں ہے۔ مرینڈا جو چاہتی ہے، وہی ہوتا ہے اور ہم اس سلسلے میں خوش نصیب ہیں کہ وہ ہمیں چاہتی ہے۔ ہم میں سے بہتر کون ہے، اس کا فیصلہ وہ فوری طور پر نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے وہ ہمیں الگ الگ آزمائے گی اور اس آزمائش کے دوران ہمیں کچھ وقت مل جائے گا۔"

ڈپلی کیٹ کی اس بات سے میرے دل کو کچھ ڈھارس ملی۔

"اگر ہم میں سے ایک خود ہی دستبردار ہو جائے تو اُسے آزمانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ میں تمھارے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ تم چموتان کے داماد بن جاؤ۔" میں نے کہا۔

یہ سُن کر اس نے قہقہہ لگایا اور بولا: "یہ ناممکن ہے، سرفروش! مرینڈا چموتان کو بتا چکی ہے کہ ہم دونوں ہی اُسے پسند ہیں... مگر ہم میں سے بہتر کون ہے، اس کا فیصلہ نہیں کر سکی۔ دوسرے منگرالوں میں یہ رواج ہے کہ جس آدمی سے شہزادی کی شادی نہ ہو سکے، اُسے بے لباس اور نہتا کر کے صحرا میں چھوڑ دیا جاتا ہے... دوسرے دن منگرال اپنے شکاری کتوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکلتے ہیں اور جس طرح جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے، اُسی طرح وہ اس کا شکار کرتے ہیں اور پھر سر کاٹ کر چموتان کی خدمت میں لے آتے ہیں۔ وہ اُسے نیزے پر بلند کر کے محل کی دیوار پر نصب کروا دیتا ہے۔ اس عمل کو شہزادی کی خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کے تحت ہم میں سے ایک کو شکار ہونا پڑے گا۔ کیا کمپیوٹر ہمیں فوری طور پر اس مصیبت سے نجات نہیں دلا سکتا؟"

"اگر ڈاکٹر فریدون چاہے تو ہم چند لمحوں میں اپنی زمین پر پہنچ سکتے ہیں، ورنہ جو کچھ بھی ہمارے مقدر میں لکھا ہے، وہ بھگتنا ہی پڑے گا۔"

"تو پھر آزمائش کے وقت کو کسی نہ کسی طرح زیادہ طول دینا بہتر ہو گا۔" اس نے کہا: "آج چموتان سے ملاقات کے بعد تمھیں مرینڈا کے پاس بھیجا جائے گا۔ کوشش کرنا کہ وہ آزمائش کا وقت بڑھانے کے لیے رضامند ہو جائے۔" یہ کہہ کر اس نے جام دوبارہ بھرے اور ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا: "لو... فی الوقت اپنے سارے تفکرات اس میں ڈبو دو۔"

میں نے اس کی تقلید میں جام ہونٹوں سے لگا تو لیا لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے شراب میں سارے جہاں کی تلخیاں گُھل گئی ہوں...

"ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے جام رکھتے ہوئے کہا: "وہ بم کہاں گیا جسے تمھارے ساتھ ہی اس سرزمین پر منتقل کیا گیا تھا؟"

وہ کچھ دیر تو میری طرف دیکھتا رہا... پھر اس نے سوگوار سے تبسم کے ساتھ جواب دیا: "وہ بم... اُسے میں نے چموتان کے ایک دشمن ملک کے خلاف جنگ میں استعمال کر کے منگرالوں کو عظیم ترین فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ تمھارا کیا خیال ہے، انھوں نے مجھے بلاوجہ ہی تو وزیر نہیں بنا لیا ہو گا۔"

میں نے ایک طویل سانس لی۔ بم کے استعمال ہو جانے کی خبر میرے لیے بے حد خوش کُن تھی۔ گویا وہ اب میرے لیے زیادہ... خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی ہم ناؤ نوش ہی میں مصروف تھے کہ جشن میں شرکت کا بلاوا آ گیا۔

میرے نقلی ہمزاد نے سچ ہی کہا تھا کہ اس نیم وحشی تمدن میں حسن و شباب کی جو فراوانی ہے، وہ ہمارے کسی بھی تہذیب یافتہ ملک میں دِکھائی نہیں دیتی۔ اس بزمِ طرب میں نہ شراب کی کمی تھی اور نہ ہی شباب کی... ہر فرد حتیٰ کہ میرا ڈپلی کیٹ بھی لذتیں کشید کرنے میں مگن تھا مگر میں سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا کہ نہ جانے، آنے والا وقت میرے لیے، اپنے فرغل میں کیا چھپا کر لاتا ہے... خنجر یا پھول...؟

جشن کے اختتام پر مجھے ایک وسیع و عریض اور بہت ہی بلند و بالا ہال میں لے جایا گیا۔ یہ ہال جس کی چھت پر بہت بڑا مخروطی گنبد بنا ہوا تھا، کسی معبد کی یاد دِلاتا تھا۔ اس کی دیواروں پر منگرال حکمرانوں کی چرمی تصاویر آویزاں تھیں اور سامنے کوئی چالیس پچاس ہاتھ اُونچا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اگر اس مجسمے کا سر مہاتما بدھ کے سر سے تبدیل کر دیا جاتا تھا کیوں کہ اسے پتھر سے نہیں بلکہ مٹی گارے سے بنایا گیا تھا۔ مجسمے کا چہرہ برداش سے مشابہت رکھتا تھا۔ ویسی ہی خمیدہ عقابی ناک اور پتلے پتلے ہونٹ تھے۔ آنکھیں اور داڑھی بھی برداش جیسی ہی تھی۔ مجسمے کے دائیں بائیں بڑی بڑی انگیٹھیوں میں عود و عنبر سُلگ رہے تھے۔

جیسا کہ مجھے میرے ڈپلی کیٹ نے بتایا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہو کر مجسمے کے سامنے گھٹنوں کے بل جُھک گیا اور بولا...

"میں، سرفروش! آپ کی خدمت میں آداب بجا لاتا ہوں شہنشاہِ معظم۔ میں آپ کے فیصلے کا متمنی اور منتظر ہوں، عالم پناہ!"

جواب میں چموتان کی بھاری آواز آئی جس سے کمرہ گونجنے لگا۔

"ہم تمھیں خوش آمدید کہتے ہیں، سرفروش! ہمارے ہاں ہر اجنبی کو خوش آمدید کہا جاتا ہے اور مہمان داری کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ ہمارے قانون اور رسم و رواج کی خلاف ورزی نہ کرے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اپنے بچھڑے ہوئے بھائی سے مل کر تمھیں مسرت ہوئی ہو گی۔"

یہ آواز مجسمے کے کھوکھلے پیٹ سے آ رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے بھونپو استعمال کیا جا رہا ہو تا کہ سامعین پر شہنشاہ چموتان کا رُعب و دبدبہ طاری ہو جائے۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بجا فرماتے ہیں، عالی جاہ! اپنے بھائی کے ملاپ نے مجھے بے حد خوشی عطا کی ہے۔"

"لیکن اس ملاپ نے ایک مسئلہ بھی پیدا کر دیا ہے، سرفروش! ہماری دختر مرینڈا تم دونوں بھائیوں کو پسند کرتی ہے، جب کہ ہمارا قانون اور رسم و رواج اُسے صرف ایک آدمی سے شادی کی اجازت دیتا ہے۔ تم اس معاملے میں کیا کہتے ہو؟" چموتان کی آواز گونجی۔

"بندہ اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے، عالی جاہ! اس

کا فیصلہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں، شہنشاہِ معظم!"

میرے اس جواب پر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد مجھے مرینڈا کی آواز سنائی دی: "آپ خاموش کیوں ہو گئے ہیں، ابا جان!"

ہر چند کہ مرینڈا نے یہ بات آہستگی سے کی تھی مگر مجسمے کے اندر لگے ہوئے بھونپو شاید آلۂ مکبر الصوت کا کام انجام دے رہے تھے، فوراً ہی چموتان کی آواز پھر گونجنے لگی۔

"تم سچ کہتے ہو، سرفروش۔ اس مسئلے کا فیصلہ ہمیں ہی کرنا ہے۔ کیا تم ایک عورت کی خاطر اپنے بھائی سے اس وقت تک برسرپیکار رہ سکتے ہو جب تک کہ تم دونوں میں سے کوئی ایک ہلاک نہیں ہو جاتا؟"

"اگر یہ آپ کا حکم ہے تو مجھے بجالانا پڑے گا، عالی جاہ . . . لیکن ایک بھائی کے لیے دوسرے بھائی کو قتل کر دینا انتہائی کربناک عمل ہے، شاہِ معظم!"

میرا یہ جواب چموتان کی حکم عدولی کے مترادف تھا لیکن میں اب اپنے ڈپلی کیٹ کو موت کے گھاٹ نہیں اُتارنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے اپنے ملک سے غداری کرتے ہوئے ہمارے ملک میں سیاسی پناہ لینے کا وعدہ کر لیا تھا۔

"ہمارے پاس اس مسئلے کا ایک اور بھی حل موجود ہے . . . سرفروش! ہماری دختر تم دونوں کو الگ الگ آزمائے گی اور خود فیصلہ کرے گی کہ تم میں سے کون اُسے زیادہ پسند ہے۔ وہ جسے پسند کرے گی، اُسے دُلہا بنایا جائے گا اور دوسرے کو ہمارے رسم و رواج کے مطابق صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا یہ فیصلہ تمھیں منظور ہے؟"

"مجھے منظور ہے، عالی جاہ . . . لیکن میں آپ سے کچھ مراعات کا متمنی ہوں۔ یہ مراعات مجھے اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے درکار ہیں۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"بولو کیا چاہتے ہو، اگر وہ مراعات ہمارے قبضۂ قدرت میں ہوئیں تو ہم بُخل سے کام نہیں لیں گے۔"

میں نے مجسمے کے سامنے سرخم کرتے ہوئے کہا: "بندۂ ناچیز آپ کا بے حد شکر گزار ہے شاہِ عالی۔ وہ مراعات آپ جیسی عظیم ہستی کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ میری پہلی درخواست یہ ہے کہ میرے ساتھ جو پاگل لڑکی آئی ہے، اُسے پاگل خانے نہ بھیجا جائے بلکہ اُسے شافران کے ساتھ سر چھپانے کی کوئی جگہ دے دی جائے اور اگر وہ شافران کی بیوی بن جائے تو میرے لیے مسرّت کی بات ہو گی۔"

میں ان حالات میں زینا کے لیے بس اتنا ہی کر سکتا تھا۔

"ہم تمھاری یہ درخواست منظور کرتے ہیں۔" چموتان کی آواز آئی: "اور کیا چاہتے ہو؟"

"میرے دوست پیلو کو بحفاظت سراما بھیج دیا جائے، عالم پناہ!"

"اگر وہ جاسوس نہیں ہے تو ہم اُسے واپس بھیج دیں گے۔ دراصل ہمیں سراما کے لوگوں پر اعتماد نہیں ہے۔ یہ بڑی باغیانہ سرشت کے مالک ہیں۔ آج کل ان کی ملکہ نے نوریہ کے خلاف لام بندی کا حکم دے رکھا ہے۔"

"پیلو جاسوس نہیں ہے، عالم پناہ۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے اُسے بحفاظت ارغوانی سمندر تک بھیج دیں گے اور جہاز پر بھی سوار کروا دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔"

"بس مجھے اتنی ہی مراعات درکار تھیں، شہنشاہِ معظم . . . میں آپ کی عنایات کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔" میں نے سرخم کرتے ہوئے کہا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔ کچھ دیر بعد تمھیں آیندہ کے لیے احکامات مل جائیں گے۔"

میں نے ایک بار پھر سرخم کیا اور اپنے نقلی ہمزاد کی ہدایت پر اُلٹے قدموں چلنے لگا۔ اتنے میں مجھے مرینڈا کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ آگ اور لوگوں کی زندگی سے کھیل رہی تھی۔

اس معبد سے مجھے دوبارہ حمام لے جایا گیا۔ نہانے کے بعد سجانے سنوارنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر عطر پاشی بھی کی گئی۔ اب مجھے ایک ایسے کمرے میں لایا گیا جہاں پیلو بھی موجود تھا۔ میں نے اُسے واپسی کا مژدہ سنایا تو وہ رونے لگا۔

"نہیں سرفروش! میں تمھارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے خود سے جُدا نہ کرو۔" اس نے کہا۔

"مگر میں خود بھی یہاں نہیں رہوں گا، پیلو۔ تم سراما جاؤ اور پہیے کی ایجاد سے اپنے آپ کو غیر معمولی ذہین ثابت کرو۔"

ابھی میں پیلو کے ساتھ باتیں ہی کر رہا تھا کہ میرے سر میں درد کی شدید ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ میں نے اُسے باہر بھیج دیا اور خود آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے مرینڈا کا بُلاوا آ گیا اور میں محافظ کے ساتھ چل دیا۔

ہم متعدد زینے چڑھتے اُترتے مختلف راہ داریوں سے گزرے جن کے ساتھ بنے ہوئے کمروں سے نقرئی قہقہوں کی آوازیں اور خوشبو کے جھونکے آ رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ چموتان کے حرم میں تقریباً ایک ہزار عورتیں ہیں جب کہ اس کی بیٹی مرینڈا کو صرف

ایک مرد . . . ایک شوہر رکھنے کی اجازت تھی۔

محافظ مجھے مرینڈا کی خواب گاہ کے دروازے تک لے آیا، اور اس وقت تک وہیں کھڑا رہا تھا جب تک کہ میں خواب گاہ میں داخل نہیں ہو گیا۔

سامنے مسہری پر مرینڈا میری منتظر تھی۔ آج اس کا حُسن بے پناہ تھا۔ میں مسحور سا ہو کر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا اور سوچا، کیا حُسن بلاخیز آدمی کو قتل پر بھی اُکسا سکتا ہے اور زہر کا پیالہ پینے پر بھی . . . اتنے میں وہ مسہری سے اُٹھی اور باہیں پھیلائے آگے بڑھی مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی جیسے اس نے بہت زیادہ پی رکھی ہو۔ اگر میں دو قدم آگے بڑھ کر اُسے سہارا نہ دیتا تو وہ گر پڑتی۔

"کیا تم نے بہت پی لی ہے مرینڈا؟" میں نے پوچھا۔

"اُونھوں . . ." وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی: "میں نے آشی کھائی ہے۔" اس کی زبان میں بھی لکنت تھی۔

"آشی کیا ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک جڑی بوٹی . . . تم کھاؤ گے؟"

"نہیں مرینڈا!" میں نے جواب دیا اور اُسے سہارا دے کر مسہری کی طرف چلنے لگا۔ ابھی میں اُسے بستر پر لٹا کر سیدھا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ پر کوئی نوک دار چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ساتھ ہی میرے ڈپلی کیٹ کی آواز سنائی دی۔

"اپنی جگہ سے مت ہلنا میرے پیارے بھائی! ورنہ یہ بھالا تمھارے جسم میں اُتر جائے گا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے سارے مسئلوں کا حل سوچ لیا ہے، پیارے بھائی! تمھارے کمپیوٹر کو ناکام بنانے کی ترکیب بھی میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ تم کہتے ہو کہ اگر دماغ کے خلیے کام نہ کریں تو کمپیوٹر کی لہریں اُن کا ردوبدل نہیں کر سکتیں۔ اس لیے میں نے آشی کھائی ہے جو میرے دماغ کے خلیوں کو سُن کر دے گی۔ میں نے مرینڈا کو بھی کافی مقدار میں آشی کھلا دی ہے۔ تاکہ صبح وہ تمھاری لاش دیکھے تو سمجھے کہ خود اُسی نے تمھیں قتل کر دیا ہو گا۔"

"لیکن تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو، جب میں نے تمھیں سیاسی پناہ دلوانے کا وعدہ کر لیا ہے تو . . ."

"مجھے سیاسی پناہ کی ضرورت نہیں، سرفروش! میں تمھاری دنیا اور اپنے وطن واپس نہیں جانا چاہتا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ میں مرینڈا سے شادی کروں گا اور چموتان کی موت کے بعد یہاں کا حکمران بن جاؤں گا پھر اس کے حرم کی ساری کنیزیں میری ہوں گی۔ اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تمھارا کمپیوٹر کسی وقت مجھے بُلا سکتا ہے تو میں تمھیں ہرگز ختم نہ کرتا مگر اب میں مجبور ہوں۔ میرے سر میں درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں، جو واپسی کی علامت ہوتی ہیں۔ یہی بتایا تھا نا تم نے۔ میں نے آشی سے اپنے دماغ کے خلیوں کو سُن کر دیا ہے۔ اب تم مرنے کے لیے . . ."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں بجلی کی سی سُرعت سے بائیں جانب ہٹ گیا۔ اس طرح بھالے کے پھل نے مجھے زخمی تو کر دیا لیکن وہ میرا کندھا چیرتا ہوا بے ہوش مرینڈا کے سینے میں اُتر گیا جہاں سے خون کا فوارہ سا اُبل پڑا۔

میرا ڈپلی کیٹ اس اچانک افتاد سے پہلے تو سراسیمہ ہو گیا مگر پھر جلدی سے اس نے بھالا نکال کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں جلدی سے جُھکا اور اس سے پہلے کہ بھالے کا دوسرا وار مجھے موت سے ہمکنار کرتا، میں فرش پر لوٹتا ہوا مسہری کے نیچے سے دوسری طرف نکلا اور پوری قوت سمیٹ کر بھاری مسہری اُلٹ دی، جو میرے ڈپلی کیٹ پر جا پڑی اور بھالا ٹوٹ گیا۔

میں نے جلدی سے لپک کر بھالے کا ٹوٹا ہوا ڈنڈا اُٹھایا اور اپنے ڈپلی کیٹ کے سر پر دے مارا۔ اُسے بھالے کا پھل میرے سینے میں اُتارنے کی مہلت نہ مل سکی۔ وہ اُسے دونوں ہاتھوں میں تھامے ڈھیر ہو گیا۔

عین اُسی وقت درد کے مارے میری کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ یہ کمپیوٹر کا بُلاوا تھا۔ میں صرف اتنا ہی سوچ سکا کہ صبح میرا ڈپلی کیٹ مرینڈا کا قاتل ٹھہرایا جائے گا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ اس نے مجھے قتل کر کے میری لاش غائب کروا دی ہو گی۔ اس طرح زینا، شافران اور پیلو پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہو گی۔

ابھی میں اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ خواب گاہ گھومتی دکھائی دینے لگی پھر کہیں سے ایک بہت بڑے ہاتھ نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے مرینڈا کی طرف دیکھا۔

اس کے سینے سے بہنے والا خون پھیلتا چلا گیا۔ ہر شے سُرخی میں ڈوب گئی اور میں خود بھی خون کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ جب میری آنکھ کھلے گی تو ڈاکٹر فریدوں میری ناز برداری کے لیے موجود ہو گا... لیکن چشمِ ہوش نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ عقل سے بعید تھا اور میں حیران و ششدر چاروں طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ نہ تو میں ڈاکٹر فریدوں کی لیبارٹری میں تھا اور نہ ہی اپنی زمین کا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے ڈاکٹر فریدوں کو کوسنا بلکہ اس قسم کی بے ضرر سی بددعاؤں سے نوازنا شروع کر دیا کہ اللہ میاں اس بڈھے کو کسی ایسی حسینہ کے عشق میں مبتلا کر دے جو اُسے ناکوں چنے چبوا دے اور تگنی بلکہ چوگنی کا ناچ نچا دے۔

اب آپ سوچیں گے کہ میں ایسے کوسنوں اور بددعاؤں پر کیوں اُتر آیا تھا؟ ... تو جناب صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی کہ میری ساری بہادری اور جوانمردی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ خمرشان میں میرا پالا اُن لوگوں سے پڑ گیا... جنھیں آپ عرفِ عام میں ہیجڑے یا خواجہ سرا کہتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ اس قسم کے لوگوں سے تو یہاں بھی پالا پڑتا ہی رہتا ہے بلکہ بعض ممالک میں تو اُن کے بغیر خوشی کی تقریبات اُس وقت تک نامکمل سی رہتی ہیں۔ جب تک یہ لوگ ٹھمکے نہیں لگاتے... لیکن جناب! خمرشان میں صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ ذرا اپنے آپ کو میری جگہ رکھ کر چشمِ تصور سے دیکھیے آپ کے چاروں طرف زنخے ہی زنخے ہوں اور اُن کے سردار چیف زنخے نے آپ کو محبوس کر رکھا ہو اور پھر یہ زنخوں کی وہ قسم بھی نہیں جو خواتین کی طرح سج سنور کر جھوٹ موٹ شرماتی اور شتر غمزے دکھاتی ہے۔ یہ مخلوق ویسی بھی نہیں تھی جو سنگاپور یا یورپ کے کچھ بازاروں میں نوخیز حسیناؤں کو مات کرتی نظر آتی ہے۔ یہ تو زنخوں کی وہ نسل تھی جس نے ماؤں کی کوکھ سے نہیں بلکہ ترقی یافتہ سائنس کی بدولت شیشے کے مرتبانوں سے جنم لیا تھا۔ اب آپ اپنے ایمان سے بتایئے کہ میرا بوکھلانا بجا تھا یا نہیں؟

اگر آپ میری یہ سرگزشت مسلسل پڑھتے آ رہے ہیں تو جانتے ہی ہوں گے کہ مجھے کمپیوٹر کے ذریعے گزرے زمانوں میں بھیجنے سے ڈاکٹر فریدوں کا مقصد جہاں ایسی فرسودہ تہذیبوں سے واقفیت حاصل کرنا تھا جن کا سراغ تاریخِ انسانی میں کہیں نہیں ملتا، وہاں وہ اُس دور کے اُن معدنی خزانوں کا بھی پتہ چلانا چاہتا تھا جن کی اہمیت و افادیت سے اُس زمانے کا وحشی انسان ناآشنا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں کا خیال تھا کہ جس طرح کمپیوٹر نے ماضی کا سفر ممکن بنا دیا ہے، اُسی طرح زمانۂ قبل از تاریخ کے معدنی خزانے بھی موجودہ دور اور دُنیا میں منتقل کرنا ممکن ہو جائے گا۔ اس لیے مجھے اضافی تحقیق کی بھی تھوڑی بہت تربیت دی گئی تھی تاکہ میں ماضی کے ہر سفر کے دوران معدنی خزائن کا جائزہ لوں اور وقت آنے پر اُن زمینوں کا سینہ چیر کر سونا، چاندی، ہیرے، پلاٹینم اور یورینیم کے ذخائر حاصل کیے جا سکیں۔ لیکن اس بار عجیب صورتِ حال سامنے آئی۔ میں اپنی زمین پر واپس آنے کی بجائے مستقبل کے کسی دور میں پہنچ گیا تھا اور اب خمرشان میں نیم انسانی زنخوں میں گھرا ہوا تھا۔

خمرشان ایسا عجیب و غریب علاقہ تھا جہاں نہ آسمان دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی سورج، چاند اور ستارے نظر آتے تھے۔ اس کے باوجود یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف پونم کی چاندنی پھیلی ہوئی ہو۔ میں ابھی ماحول کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میری سماعت سے ایک عجیب" ٹنٹناتی سی آواز ٹکرائی۔

"مرشا... ادمرشا، ٹھیلا یہاں لا... اے احمق اُدھر نہیں اِدھر۔"

میں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے آواز کی سمت دیکھا تو تعجب سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر کپاس جیسا ایک کھیت تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ یہ آواز اُسی کھیت کے کسی گوشے سے آئی تھی مگر بولنے والا اور اُس کا مخاطب دونوں نظر نہیں آ رہے تھے اتنے میں پھر آواز آئی...

"تم بہت اچھے جانور ہو مرشا۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ فصل کل تیار ہو گی۔ تم ٹھیلا دوسری طرف لے جاؤ۔ دوسرے جانوروں کو بھی ساتھ لے جانا اور "ہوا" چُن کر اُدھر جمع کرنا۔ تم لوگوں کو پورے "شہرے" کام کرنا ہے۔"

اگرچہ میں اس زبان سے آشنا نہیں تھا مگر ڈاکٹر فریدوں کے سائنسی عمل کی بدولت میں ساری بات بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اسے سائنسی ٹیکنالوجی کا کمال ہی سمجھیے کہ ماضی کے ہر سفر میں میں ہزاروں سال پہلے بولی جانے والی زبانیں سمجھ لیتا تھا بلکہ میرے خیالات بھی اُسی زبان میں ڈھل کر کلام کی صورت خود بخود میرے ہونٹوں پر آ جاتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر کھیت پر نظر دوڑائی لیکن اُس چاندنی میں مجھے کوئی ذی رُوح دکھائی نہ دیا۔ چونکہ ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنے لیے لباس، کھانے اور کسی پناہ گاہ کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے ذاتی تحفظ کی طرح ایک پتھر اُٹھایا اور کھیت کی طرف بڑھنے لگا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، کھیت میں تاحدِ نظر کپاس جیسے پودے قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ یہ پودے میرے سینے تک بلند تھے اور ان میں سفید رنگ کے ڈوڈے لگے ہوئے تھے۔ بہت

دُور کھیت کے دُوسرے کنارے گنبد والی ایک عمارت دکھائی دے رہی تھی مگر روشنی کی کمی کے باعث طرزِ تعمیر واضح نہیں تھی... وسیع و عریض کھیت چھوٹے چھوٹے قطعات میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ان قطعات کے درمیان پختہ راستے بنے ہوئے تھے۔

مَیں ان راستوں پر آگے بڑھتا چلا گیا مگر نہ وہ آواز دوبارہ اُبھری اور نہ ہی کوئی آدمی کھیت میں کام کرتا نظر آیا۔ اس عجیب سے نیم روشن ماحول اور پُر اسرار سناٹے نے میری ہڈیوں میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑا دی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس زمین کا آسمان کہاں ہے؟... ہے بھی یا نہیں... ہے تو مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا؟... اور یہ چودھویں کے چاند کی سی روشنی کہاں سے پھُوٹ رہی ہے؟

مَیں چلتے چلتے رُک گیا اور چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا۔ اچانک میری حیران نگاہیں ایک عجیب سے منظر پر رُک گئیں اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر پر میری انگلیوں کی گرفت مضبوط تر ہو گئی۔

پندرہ بیس آدمی ڈوڈے چُننے میں مصروف تھے۔ اگر وہ مجھے دیکھ چکے ہوتے تو اس طرح ڈوڈے چُننے میں مشغول اور مگن نہ رہتے۔

... پھر میری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ ڈوڈے چُننے والے انسان نہیں بلکہ انسان نما حیوان تھے۔ آپ اُنھیں قدِ آدم بُوزنے کہہ سکتے ہیں۔ وہ اگرچہ انسانوں کی طرح دونوں پاؤں پر کھڑے ہوتے اور چل سکتے تھے لیکن کبھی کبھی وہ چاروں ہاتھوں پاؤں کے بل بھی چلنے لگتے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے مگر اُن کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اب مجھے یاد آیا کہ سب سے پہلے میری سماعت سے ٹکرانے والی آواز نے کسی مرشا کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے "اچھا جانور" کہا تھا تو ٹھیک ہی کہا تھا... لیکن اس کا تو یہ مطلب تھا کہ وہ بندر نما انسان، آدمیوں کی زبان سمجھتے تھے، جب ہی تو وہ غائب متکلم 'مرشا' کو اپنی زبان میں ہدایات دے رہا تھا...

'خداوندا... یہ کیسی سرزمین ہے؟ یہ کیسی مخلوق ہے اور مَیں کس دَور میں آ گیا ہُوں؟' مَیں نے سوچا اور دُوسرے راستے پر مُڑ گیا کہ اس عجُول بیابانی سے سابقہ نہ ہی پڑے تو بہتر ہے۔

ابھی مَیں کچھ ہی دُور گیا تھا کہ وہی کٹکناتی ہُوئی آواز پھر سُنائی دینے لگی اور میرے قدم اپنے آپ رُک گئے۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غائب متکلم اب کسی اور سے مخاطب نہیں بلکہ خُود کلامی کر رہا ہے۔

"کیا مُصیبت ہے۔ اتنے کم حیوانوں سے بیس شبروں میں فصل کیسے سمیٹی جا سکتی ہے۔ مگر گرانچو کو اس سے کیا غرض کہ مَیں حیوانوں سے کس طرح کام لیتا ہُوں۔ اُسے تو بس زیادہ سے زیادہ 'پے وا' چاہیے۔"

... پھر میری حیران نگاہوں نے اُسے تلاش کر لیا۔ وہ اب تک مجھے اس لیے دکھائی نہیں دیا تھا کہ اُن بندر نما انسانوں کی طرح اُس کا قد بھی چھوٹا تھا اور وہ اپنے قد کے برابر پودوں میں آسانی سے نظر نہیں آ تا تھا۔ مَیں نے اُسے غور سے دیکھا تو مجھ پر ایک بار پھر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ جس طرح قیدِ لباس سے آزاد تھا، اُسی طرح تذکیر یا تانیث کی "تخصیص" سے بھی بالاتر تھا۔ اُسے میری موجُودگی کا علم یا احساس نہیں تھا۔ اس لیے وہ بے دھڑک اُس طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا، جہاں مَیں پتھر تھامے کھڑا تھا۔

وہ چلتے چلتے رُکا، ایک ڈوڈا توڑا اور اُسے کھانے لگا۔

مَیں ڈوڈے کا جائزہ لے چکا تھا، اُس میں کپاس جیسا ریشہ تھا۔ اس کا مطلب ہُوا کہ یہ مخلوق کپاس خور ہے۔ ابھی مَیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خواجہ سرا ایک راستے پر مُڑ گیا۔ مَیں بھی دبے پاؤں آہستہ آہستہ اُس کے پیچھے جانے لگا۔

یہ راستہ دُوسرے راستوں کی بہ نسبت زیادہ چوڑا تھا اور سیدھا ایک بہت بڑے پلیٹ فارم کی طرف جاتا تھا جس پر اُسی ریشے دار ڈوڈے کی بڑی بڑی گانٹھیں رکھی ہُوئی تھیں اور کچھ انسان نما جانور برف پر چلنے والی بغیر پہیوں کی گاڑی سے ملتے جُلتے ٹھیلے سے ڈوڈوں کی گانٹھیں اتار رہے تھے۔ مَیں پودوں کی اوٹ میں رُک کر دیکھنے لگا کہ اُن کا اگلا اقدام کیا ہو گا۔

وہ بندر نما انسان گانٹھیں اُتار کر بغیر پہیوں کا ٹھیلا گھسیٹتے ہُوئے دُوسرے جانب کھیت میں چلے گئے اور خواجہ سرا نما وہ شخص گانٹھیں شمار کرنے لگا... پھر اُس نے ایک رجسٹر اُٹھایا اور اُس پر کچھ لکھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے اُن گانٹھوں کا اندراج ہی کیا ہو گا۔

مَیں پُختہ راستے کی بجائے پودوں کے بیچوں بیچ چلتا ہُوا پلیٹ فارم کے قریب پہنچ گیا جہاں وہ زنخہ خود کلامی میں مصرُوف تھا۔ "مَیں بھی کتنا احمق ہُوں کہ رجسٹر یہیں کھلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرشا یا دُوسرے حیوان لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اگر اُنھیں یہ معلوم ہو جائے کہ اُن کو کس طرح دھوکا دے کر استحصال کیا جا رہا ہے تو یہ حیوان بغاوت پر اُتر آئیں گے۔ بالکل اُسی طرح جیسے

نوں نے نویں صدی کے شبروں میں کی تھی۔ بہر صُورت آیندہ مجھے ناعیر محتاط ہرگز نہیں ہونا چاہیے ورنہ گرانچو مجھے مار ڈالے گا۔"

جب تک وہ خُود کلامی میں مصروف رہا، مَیں اُس کی جسمانی ساخت کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ ہلکے پھُلکے جسم کا تھا جیسے ہمارے ہاں بارہ بارہ سال کے لڑکے ہوتے ہیں۔ اُس کے جسم پر سُنہرا رُواں اُگا ہُوا تھا اور سر، جسم کی مناسبت سے قدرے چھوٹا تھا۔ وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے کسی طور بھی میرے لیے ضرر رساں ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے مَیں نے پتھر پھینک دیا۔

مَیں نے سوچا کہ چپکے سے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے رجسٹر چھین لُوں مگر پھر خیال آیا کہ کہیں وہ ڈر کر اُن حیوانوں کی طرف نہ بھاگ جائے۔ اس لیے یہی مناسب ہو گا کہ مَیں بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اُسے مِلوں تاکہ وہ مجھے اپنا دُشمن نہ سمجھے اور میرے ساتھ بات چیت کرنے لگے تاکہ مَیں اُس سے معلومات حاصل کر سکُوں۔

مَیں گربہ پا آگے بڑھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے اپنی بتیسی کی نمائش کرنے لگا۔

اُس نے بے خیالی میں سر اُٹھایا مجھے مسکراتے دیکھا تو اپنی باچھیں بھی کھول دیں مگر پھر یکایک چونکا، ایک نظر سر سے پیروں تک مجھے دیکھا اور رکوع کی حالت میں جاتے ہُوئے بولا۔

"اوہ!... انسان دیوتا! مَیں معافی کا طلب گار ہُوں، انسان دیوتا مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ پنجرے سے فرار ہو کر یہاں پہنچ گئے ہیں حکم دیجئے، انسان دیوتا، مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہُوں؟"

اُس کی پنجرے سے فرار ہونے والی بات نے مجھے چکرا دیا۔ مَیں نے کہا۔ "مجھ سے ڈرو نہیں، میرے ساتھ آؤ۔ مَیں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہُوں۔"

وہ میرے ساتھ پودوں کی اوٹ میں آ گیا تاکہ کھیت میں کام کرنے والے وہ بُوزنے ہمیں نہ دیکھ سکیں جو نہ تو میری بات سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اُن کی بات میرے پلے پڑ سکتی تھی۔

خواجہ سرا نُما وہ شخص ایک بار گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھتے اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "میری غلطی معاف کر دیجئے، انسان دیوتا۔ مَیں آپ کا غلام ہُوں۔ ابھی مَیں نے اپنی عمر کے صرف دو سو شبرے گزارے ہیں اور تین سو شبرے باقی ہیں۔ اس لیے ابھی مجھے تباہ نہ کیجئے گا۔"

"اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو مَیں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" مَیں نے نرمی سے جواب دیا۔ اور سوچنے لگا کہ لفظ "شبرے" دنوں، مہینوں یا سالوں کے لیے استعمال کیا گیا ہو گا۔ بہر صُورت یہ لفظ وقت کے پیمانے کو ظاہر کرتا تھا۔ مَیں نے اپنی اس سوچ کی تصدیق کے لیے بات جاری رکھی۔ "بلکہ تمھارے شبرے بھی بڑھا دُوں گا۔"

"اوہ!" وہ خوش ہوتے ہُوئے بولا۔ "مگر میری عمر تو صرف پانچ سو شبرے مقرّر کی گئی ہے۔ کیا آپ اسے بڑھا سکتے ہیں انسان دیوتا؟"

"ہاں۔" مَیں نے جواب دیا۔ "لیکن اس سلسلے میں پھر بات کریں گے۔ تم نے ٹھیک اندازہ لگایا کہ مَیں پنجرے سے فرار ہو کر یہاں پہنچا ہُوں۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرُورت ہے۔"

"آپ کو کس قسم کی مدد چاہیے، انسان دیوتا؟"

"بات یہ ہے کہ فرار کے دوران مَیں گر پڑا تھا اور مجھے سر پر چوٹ آ گئی تھی جس سے میری یادداشت بُری طرح متاثر ہُوئی ہے۔ مَیں پچھلی بہت سی باتیں بھُول گیا ہُوں۔ مجھے بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ مَیں یہاں کیا کروں؟ وہ پنجرہ کہاں تھا جس میں مَیں قید تھا؟ مجھے یہ ساری باتیں بتاؤ جو میرے حافظے سے نکل گئی ہیں۔"

"آپ نے "بنگو" بہت پی لی ہو گی ورنہ آپ کو چوٹ نہ لگتی اور آپ کا حافظہ خراب نہ ہوتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

بنگو سے اُس کی مُراد غالباً شراب تھی۔ مَیں نے اُس کی بات گول کرتے ہُوئے پُوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

میرے اس سوال پر اُس نے اپنا دایاں بازو اُوپر اُٹھا لیا اور اپنی بغل دکھاتے ہُوئے۔ "میرا شناخت نامہ پڑھ لیجئے انسان دیوتا۔"

مَیں نے دیکھا کہ اس کی بغل میں ایک مہر لگی ہُوئی تھی مگر مَیں اُس کی تحریر سے ناآشنا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "تم خُود ہی بتا دو۔ مَیں پڑھنا بھی بھُول چُکا ہُوں۔"

"میرا نام برد نگا ہے۔ میرا سنِ پیدائش ۴۶۱۶ شبرے اور سالِ وفات ۵۱۱۶ ہے۔ میری ذہنی سطح چھٹے درجے کی ہے۔"

"ہُوں۔" مَیں نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے سوچا کہ اس کا سالِ وفات بھی پہلے سے ہی کیسے مقرّر کر دیا گیا ہے؟ یہ چکر کیا ہے؟ مگر مَیں نے اس سلسلے میں مزید سوال کرنے کی بجائے کہا۔ "تمھارا نام برد نگا ہے اور میرا نام سرفرِدش۔"

"ایسا عجیب نام مَیں نے پہلی بار سُنا ہے، انسان دیوتا۔" وہ بولا۔ "مگر خیر، میری ذہنی سطح صرف چھٹے درجے کی ہے۔ مَیں صرف بول اور سوچ ہی سکتا ہُوں۔ اس سے آگے کا علم مجھے نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اُن بیس لوگوں میں سے ایک ہیں، جنھیں پنجروں میں بند رکھا جاتا ہے اور چونکہ میلۂ خوں قریب آ گیا ہے تو

آپ اس خوف سے فرار ہوگئے ہیں کہ کہیں آپ کو میلۂ خون کے لیے منتخب نہ کر لیا جائے۔ یہی بات ہے نا، انسان دیوتا؟"

"تم بہت باتونی ہو بردنگا۔ میں نے پوچھا تھا کہ یہ کون سی سرزمین ہے؟"

"یہ سرزمین خمرشان ہے انسان دیوتا۔ کیا آپ اپنے ملک کا نام بھی بھول گئے ہیں؟"

"میں نے تمھیں بتایا تھا کہ سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے میری یاد داشت کھو گئی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ یہ خمرشان کا کون سا علاقہ ہے؟"

"یہ خمرشان کا جنوبی صوبہ خراگ ہے انسان دیوتا۔ وہ برج گوگوش ہے۔" اس نے گنبد والی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اور ہم ہمیشہ کی طرح یہاں پے واکاشت کرتے ہیں۔"

"مرشا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مرشا!"... وہ تعجب سے بولا۔ "آپ اُس معمولی حیوان کو کیسے جانتے ہیں انسان دیوتا؟"

"تمھیں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے بردنگا۔" میں نے قدرے غصے سے کہا۔ "جو پوچھا جائے، اس کا جواب دیتے رہو۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں، انسان دیوتا۔" وہ ہاتھ جوڑتے اور لرزتے ہوئے بولا۔ "میری غلطی معاف کر دیجیے۔ میری ذہنی سطح صرف چھٹے درجے کی ہے نا، اس لیے غلطی ہو جاتی ہے۔"

"مجھے کھانا، لباس اور پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی میرے سکون و تنہائی میں مخل نہ ہو سکے؟"

"آپ جانتے ہیں کہ یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی جہاں آپ "اُن" کی نگاہوں سے اوجھل رہ سکیں۔ اوہ... معاف کیجیے گا، انسان دیوتا۔ میں پھر بھول گیا کہ آپ کا حافظہ ختم ہو گیا ہے۔ آئیے، میرے ساتھ آئیے۔ یہاں بہت زیادہ خطرہ ہے۔"

وہ میرے آگے آگے چلتا ہوا مجھے کھیت کے کنارے ایک بڑے سے گڑھے میں لے آیا اور بولا۔ "وہاں کی بہ نسبت یہاں خطرہ کم ہے۔"

"کیسا خطرہ بردنگا؟"

"جاسوسی پردے پر دیکھے جانے کا خطرہ، انسان دیوتا۔ یہ بہت ہی برا ہوا کہ آپ سب کچھ بھول چکے ہیں ورنہ آپ کو یاد رہتا کہ "وہ" سب کی نقل و حرکت جاسوسی پردے پر دیکھتے رہتے ہیں۔ اور خمرشان میں ہر وقت سروں پر خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ اب دیکھیے نا۔ اگر گراچو جاسوسی پردے پر میری نقل و حرکت دیکھنا چاہے اور میں اُسے نظر نہ آؤں تو وہ مجھ سے اس کی وجہ پوچھے گا اور اگر وہ اس وجہ سے مطمئن نہ ہو تو مجھے تباہ کر دے گا حالانکہ ابھی میرے تیرہ سو سترے باقی ہیں اور اگر اس نے آپ کو جاسوسی پردے پر دیکھ لیا تو گرفتار کر کے دوبارہ جبردت بھجوا دے گا جہاں آپ کو پنجرے میں بند کر دیا جائے گا۔"

بردنگا کی باتوں سے میں سوچوں کے گرداب میں ڈوب گیا۔ اسپائی اسکرین سے کسی کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا تو ہمارے دور اور دنیا کی تازہ ترین ٹیکنالوجی شمار ہوتی ہے۔ تب بھی یہ اسکرین وہاں عام نہیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ سائنسی ترقی میں بہت آگے جا چکے ہیں۔

مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر بردنگا نے کہا۔ "گھبرایئے نہیں انسان دیوتا۔ ابھی گراچو ہمیں نہیں دیکھ پایا۔ اگر وہ ہمیں دیکھ چکا ہوتا تو اب تک جنگجو جانور یہاں پہنچ چکے ہوتے۔ پھر بھی ہمیں یہاں سے جلد از جلد فرار ہو جانا چاہیے ورنہ وحشی سپاہی ہمارے پرخچے اُڑا دیں گے۔"

"ہم یہاں سے کیسے اور کہاں فرار ہو سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا، انسان دیوتا کیونکہ میری ذہنی سطح صرف چھٹے درجے کی ہے مگر مجھے ایک ایسی جگہ کا ضرور علم ہے جہاں ہم کچھ دیر چھپ سکتے ہیں۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک جگہ بیٹھ کر جلدی جلدی مٹی ہٹانے لگا۔ مٹی ہٹتے ہی ایک تختہ نظر آیا۔

بردنگا نے وہ تختہ اُٹھایا تو اُس کے نیچے ایک زمین دوز راستہ دکھائی دینے لگا۔

"جلدی سے نیچے اُتر جایئے انسان دیوتا۔" اُس نے بے چینی سے کہا۔

میں جلدی سے اس سوراخ میں اُتر گیا۔ میرے بعد بردنگا بھی اُترا اور اُس نے وہ تختہ جو دراصل ایک سرنگ کا خفیہ دروازہ تھا، بند کر دیا۔

یہ سرنگ اتنی اونچی تھی کہ میں جھکے بغیر آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس کا فرش اور دیواریں پتھر سے بنائی گئی تھیں۔

"یہ سرنگ کہاں جاتی ہے بردنگا؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں، انسان دیوتا۔"

"تو پھر تم مجھے اس میں کیوں لے گئے ہو؟"

"تاکہ گراچو ہمیں جاسوسی پردے پر نہ دیکھ سکے۔" وہ بولا۔ "دراصل ہوا یوں تھا انسان دیوتا کہ ایک روز کھیتوں میں کام کرنے والے

ایک جانور نے پے وا کی ایک گانٹھ غائب کر دی۔ میں اُسے تلاش کرتا ہوا گڑھے میں آیا تو میری نظر اس سرنگ کے دروازے پر پڑ گئی۔ وہ جانور گانٹھ سرنگ میں چھپانے کے بعد تختے پر مٹی ڈالنا بھول گیا تھا۔ اب جب آپ نے کسی محفوظ مقام کے بارے میں کہا تو مجھے یہ سرنگ یاد آ گئی۔"

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ سرنگ کے اندر بھی ویسی ہی چاندنی جیسی روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اس روشنی کا مخرج یہاں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کیا تم اس سرنگ کے بارے میں اور کچھ بھی نہیں جانتے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف اتنا اور جانتا ہوں، انسان دیوتا کہ عظیم جنگوں کے دوران جب پشکانی وحشیوں نے خمرشان پر لشکر کشی کی تھی تو ملکہ اور مہا پجارن نے کچھ مرد دیوتاؤں کے ساتھ اس سرنگ میں پناہ لی تھی اور وہ لوگ اس وقت تک یہیں مقیم رہے تھے جب تک کہ پشکانی لشکروں کو پسپا اور تہ تیغ نہیں کر دیا گیا تھا۔ جب آپ کا حافظہ ٹھیک ہو جائے گا تو باقی باتیں آپ کو خود ہی یاد آ جائیں گی جو مجھے یقیناً معلوم نہیں۔"

میں بردنگا کی بات پر مسکرا دیا۔ وہ غریب جتنا جانتا تھا مجھے بتا چکا تھا۔

"تم اس سرنگ میں کہاں تک گئے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"آگے جا کر ایک بہت بڑا کمرہ آتا ہے، انسان دیوتا۔ میں بس اسی کمرے تک گیا تھا اور وہ گانٹھ جو جانور نے چرائی تھی، وہیں رکھی مل گئی تھی۔" اتنا کہہ کر اس نے کچھ سوچا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ سرنگ برج گرگوش تک جاتی ہوگی جہاں سے خونخوار پشکانی قبیلے پر نظر رکھی جاتی ہے۔"

اس کے بعد میں نے بردنگا سے کوئی سوال نہیں کیا اور چپ چاپ سرنگ میں آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑی دور جا کر سرنگ وسیع ہونے لگی۔ اور وہ کمرہ آ گیا جس کا ذکر بردنگا نے کیا تھا۔

اس کمرے کے بیچوں بیچ ایک گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ یہ چبوترہ کسی پلاسٹک نما میٹریل سے بنایا گیا تھا اور چبوترے کے اوپر چھت کے مرکزی حصے میں روشنی کی ایک گیند متحرک رہی تھی۔

میں کافی دیر تک روشنی کے اس عجیب و غریب گولے کی طرف دیکھتا رہا مگر میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ کسی تار یا گلوب کے بغیر کس طرح معلق ہے۔

میں نے چبوترے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بردنگا سے پوچھا۔ "یہ چبوترہ کیسا ہے؟"

اتنا سنتے ہی وہ میرے قدموں میں گر پڑا اور بولا۔ "یہ نہ پوچھیے انسان دیوتا۔ اس کے بارے میں بات کرنا ممنوع ہے۔ میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

میں نے اُس کی حالت دیکھ کر مزید سوال نہ کیے اور کمرے کی دیواروں سے آویزاں ہتھیار اور وردیوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان ہتھیاروں اور وردیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ محافظوں کا کمرہ رہا ہوگا اور شاید یہ وہی زمانہ ہوگا جب بردنگا کے بقول ملکہ اور مہا پجارن نے اس سرنگ میں پناہ لی تھی۔

یہ دیکھ کر بھی میں متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ ہتھیار بھی اُسی میٹریل سے تیار کیے گئے تھے جو چبوترے کی تعمیر میں استعمال ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے خمرشان کے لوگ دھات کے استعمال سے واقف نہیں ہیں۔

میں نے اپنے لیے ایک وردی کا انتخاب کیا اور اُسے پہننے کے ایک سر اٹھا کر بردنگا سے بولا۔ "میں تو یہ بھی بھول گیا ہوں کہ یہ سُپر کس چیز کی بنی ہوئی ہے؟"

"یہ بھی پے وا کی بنی ہوئی ہے، انسان دیوتا۔ خمرشان میں ہر چیز پے وا سے بنائی جاتی ہے مگر شاید آپ چوٹ کی وجہ سے بھول گئے ہیں۔"

"اور یہ خود؟" میں نے خود بجاتے ہوئے پوچھا جو خاصا وزنی تھا۔

"یہ ترغون کا بنا ہوا ہے جو پے وا سے تیار کیا جاتا ہے۔"

میں نے اپنے لیے ایک تلوار منتخب کی جو اگرچہ اسی پلاسٹک جیسے مواد کی بنی ہوئی تھی لیکن اس کی دھار تیز اور پھل لچک دار تھا۔

میں پوری طرح تیار ہو گیا تو بردنگا میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں انسان دیوتا۔ اور اپنے آپ کو خوش قسمت بھی سمجھتا ہوں کیونکہ میں اپنی قبیل کا واحد وغنہ ہوں جس نے ایک مرد کا دیدار کیا ہے اور جو جانتا ہے کہ مرد اور خواجہ سرا میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

مجھے بردنگا کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا خمرشان میں مرد نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں انسان دیوتا۔" وہ بولا۔ "لیکن وہ پنجروں میں بند ہیں اور کوئی خواجہ سرا اُوری طرح اُن کا دیدار نہیں کر سکتا۔ کیا آپ یہ بات بھی بھول چکے ہیں؟"

بردنگا کی اس بات نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ یہ خمرشان

کیسی سرزمین تھی جہاں مُردوں کو پنجروں میں بند رکھا جاتا تھا۔ آخر کیوں؟... اور اُنھیں پنجروں میں کون بند رکھتا تھا؟

مَیں بردنگا سے اس سلسلے میں سوال کرنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نگاہ دوبارہ کمرے کے بیچوں بیچ بنے اُس گول چبوترے پر جا پڑی جس کے بارے میں پُوچھنے پر بردنگا بُری طرح دہشت زدہ ہوگیا تھا۔

مَیں نے سوچا کہ اگر اُس سے دوبارہ پُوچھا گا تو وہ پھر کچھ بتانے سے انکار کردے گا۔ اس لیے مَیں خود ہی چبوترے کی طرف بڑھنے لگا۔ بردنگا نے مجھے چبوترے کی طرف بڑھتے دیکھا تو گڑگڑانے لگا۔

"نہیں... نہیں، انسان دیوتا۔ اُس کے قریب مت جایے۔"

مَیں نے دیکھا کہ وہ دہشت کے مارے لرز رہا تھا۔ پھر وہ اُٹھ کر میرے قدموں سے لپٹ گیا۔ مَیں نے اُسے نرمی سے ہٹایا اور تلوار نکال کر چبوترے کے اُوپر ہَوا میں دائیں بائیں تلوار گھمائی تو بردنگا رونے لگا:

"ایسا نہ کریں انسان دیوتا۔ ایسا نہ کریں۔ مَیں نے تو آپ کا ہر حکم مانا ہے پھر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"

"مگر تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو، بردنگا؟ دیکھو۔ اِدھر دیکھو۔ کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔"

مَیں چبوترے پر کھڑا ہوگیا مگر بردنگا سر جھکائے اُسی طرح لرزتا کانپتا رہا۔ مَیں چبوترے سے اُتر کر اُس کے قریب آتے ہُوئے کہا۔

"آؤ چلیں۔ تم تو خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہے ہو۔"

وہ اُٹھتے ہُوئے بولا: "آپ نہیں سمجھتے انسان دیوتا کہ چبوترے پر چڑھنا آپ کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے کس قدر خطرناک ہے۔ آپ نے یہ حرکت شاید اس لیے کی ہے کہ آپ سب کچھ بھول چکے ہیں۔ ورنہ آپ ایسا نہ کرتے۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا۔ اب آیئے چلیں۔ شاید یہ سُرنگ ہمیں بُرج گرگوش تک پہنچا دے اور وہاں سے فرار ہوکر مَیں تباہ ہونے سے بچ جاؤں۔"

وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔

میری سمجھ میں اب تک نہیں آسکا تھا کہ بردنگا آخر اُس چبوترے سے اتنا خوفزدہ کیوں ہے مگر وہ کم بخت کچھ بتاتا بھی تو نہیں تھا۔

جب سُرنگ دوبارہ تنگ ہونے لگی تو اچانک ایک نیلگوں شعلہ نمودار ہُوا اور بردنگا اُچھل کر میرے قدموں میں آگرا۔ مَیں نے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ میرے قدموں سے لپٹتے ہوئے بولا: "گراغو... گراغو نے ہمیں دیکھ لیا ہے، انسان دیوتا۔ اُس نے برقی مقناطیسی پردے سے ہماری راہ مسدود کردی ہے۔"

وہ نیلگوں شعلہ جو ایک لمحے کے لیے نمودار ہُوا تھا، اب غائب ہوچکا تھا۔ مَیں بردنگا کو ہٹا کر آگے بڑھا تو اچانک مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے مَیں کسی آہنی دیوار سے ٹکرا گیا ہُوں۔ اُس کے ساتھ ہی وہ نیلگوں شعلہ دوبارہ چمکا اور مَیں بھی یُوں بردنگا کے پاس جا گرا جیسے کسی نے بڑے زور سے دھکا دیا ہو... لیکن اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ مجھے نہ بجلی کا جھٹکا لگا تھا اور نہ ہی شعلے سے جلن محسوس ہوئی۔ کوئی چوٹ بھی نہیں آئی تھی۔ بس یُوں لگا تھا جیسے کسی بہت بڑے فولادی ہاتھ نے مجھے پیچھے دھکیل دیا ہو۔

اتنے میں بردنگا نے روتے ہُوئے اُسی گول چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔

مَیں نے وہیں پڑے پڑے اُدھر دیکھا تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

چبوترے پر دُھویں کا ایک ہیولا بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا... پھر اُسی دُھویں نے ایک وجُود کی شکل اختیار کرلی اور یہ وجُود ایک اور خواجہ سرا کا تھا... مگر یہ زنخہ بردنگا سے زیادہ جسیم اور مضبوط تھا۔ اُس کا سر بڑا اور اُسترے سے مُنڈا ہُوا تھا... اور آنکھیں گہرے سبز رنگ کے بڑے بڑے نگینوں کی طرح یُوں چمک رہی تھیں جیسے رات کے اندھیرے میں سیاہ بلی کی آنکھیں چمکتی ہیں۔

بردنگا اُسے دیکھتے ہی رونے اور گڑگڑانے لگا: "مجھے معاف کردو گراغو۔ مجھے معاف کردو۔ مَیں نے تو قانون کے مطابق انسان دیوتا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ مَیں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ مجھے معاف کردو۔"

گراغو اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے چبوترے سے اُتر کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔ بردنگا کے برعکس اُس کے گلے میں ہیروں کی ایک مالا اور زرعون کی ایک مہر پڑی ہُوئی تھی جو اُس کے عہدے کا اظہار کرتی تھی۔

اُس نے میری طرف نگاہ ڈالے بغیر بردنگا سے پُوچھا: "تم کتنے شبروں کے ہو؟"

"ابھی مَیں نے صرف دو سو شبرے پُورے کیے ہیں۔ میری عمر کے تین سو شبرے باقی ہیں۔ مجھ پر رحم کرو۔"

گراغو اپنی گردن لٹکائے اور بھویں اُچکاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا... پھر وہ اپنی جسامت کی بہ نسبت باریک آواز میں بولا: "مجھے افسوس ہے بردنگا کہ مَیں تم پر رحم نہیں کرسکتا۔ مَیں جانتا ہُوں

کہ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ تم نے قانون کے مطابق انسان دیوتا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہم سب خواجہ سراؤں کا فرض ہے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف پلٹا اور بولا۔

"کورنش بجا لاتا ہُوں، انسان دیوتا۔" ساتھ ہی رقص کے انداز میں اُس نے اپنا دایاں بازو لہراتے ہُوئے اُوپر اٹھایا اور اپنی بغل دکھاتے ہوئے بولا: "شناخت نامہ ملاحظہ فرمایئے سرکار۔ گراغو، جودگہاں درجہ... سن پیدائش چار ہزار چھ سو پانچ شبرے... سالِ وفات پانچ ہزار چار سو چار شبرے۔ مگر میری بغل کو نہ چھُوییے گا مجھے گدگدی ہوتی ہے۔ مَیں خواجہ سراؤں کے قبیلے کا "نیم مرد" ہُوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ مَیں بردنگا سے نمٹوں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور بردنگا سے بولا: "کھڑے ہوجاؤ۔"

ایسا لگتا تھا جیسے بردنگا میں اُٹھنے کی سکت بھی باقی نہ رہی ہو۔

"رحم گراغو... رحم۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"بکواس مت کرو۔" گراغو باریک آواز میں دھاڑا۔ "مَیں نیم مرد کی حیثیت سے تمھیں حکم دیتا ہُوں کہ اُٹھو اور چبوترے پر کھڑے ہوجاؤ۔"

بردنگا سے اُٹھا نہ جاسکا۔ وہ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چبوترے کی طرف رینگنے لگا۔ وہ بُری طرح رو رہا تھا۔ جب وہ چبوترے کے قریب پہنچا تو اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"انسان دیوتا۔ آپ نے تو میرے شبرے بڑھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب کم از کم مجھے بچا ہی لیجیے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

مجھے بردنگا پر رحم آگیا۔ مَیں نے گراغو سے کہا: "اے نیم مرد... بردنگا نے جو کچھ کیا ہے، میرے حکم پر کیا ہے۔ اگر میرے حکم کی تعمیل قابلِ تعزیر ہے، تو پھر اس کی سزا اُسے نہیں، بلکہ مجھے ملنی چاہیے۔ لہٰذا اُسے چھوڑ دو اور اگر دے سکتے ہو تو مجھے سزا دو۔" یہ کہتے ہُوئے مَیں نے میان سے تلوار بھی نکال لی۔

گراغو پلک جھپکائے بغیر، سانپ کی طرح ٹکٹکی باندھے کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا... پھر اُس کے بھنچے ہوئے باریک ہونٹوں پر بڑی ہی ظالمانہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"آپ کے بارے میں کوئی بہت بڑی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے انسان دیوتا۔"... پھر وہ بردنگا کی طرف پلٹا۔ "چُپ چاپ چبوترے پر کھڑے ہوجاؤ بردنگا ورنہ تمھیں دُوسرے درجے کی اذیت ناک موت مرنا پڑے گا۔ کیا تم وہ موت مرنا چاہتے ہو؟"

بردنگا یہ سُن کر تھرا اُٹھا اور سسکیاں لیتے ہُوئے گھسٹ کر چبوترے پر چڑھنے لگا۔ مَیں یہ برداشت نہ کرسکا اور نتیجے کی پروا کیے بغیر مَیں نے بڑے زور سے گراغو پر تلوار کی ضرب لگائی مگر اپنی جھونک میں فرش پر جا گرا کیونکہ وہ تلوار گراغو کے جسم سے یُوں گزر گئی تھی جیسے ہَوا سے گزری ہو۔

گراغو نے قہقہہ لگایا اور بولا: "مَیں حقیقت نہیں، ایک خیال، ایک تصویر، ایک واہمہ اور ایک سایہ ہُوں، انسان دیوتا۔ میرا وجُود کہیں اور ہے۔ تم نے جس پر وار کیا، وہ میرے وجُود کا تصویری پیکر ہے۔ اگر تم غمر شان کے مرد یا دیوتا ہوتے تو یہ حقیقت تمھارے علم میں ہوتی اور تم میرے تصویری پیکر پر وار نہ کرتے۔ اسی لیے مَیں نے تم سے کہا تھا کہ تمھارے سلسلے میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ خیر، یہ بات بعد میں ہوگی پہلے مَیں بردنگا سے نمٹ لُوں۔"

اسی دوران بردنگا چبوترے پر چڑھ چکا تھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گراغو نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور یُوں اشارہ کیا جیسے کسی کو بردنگا کا سر قلم کرنے کا حکم دے رہا ہو۔ بردنگا کے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکلی مگر وہ اُدھوری ہی رہ گئی کیونکہ اتنے میں اُس کا وجُود دھویں میں بدل چکا تھا اور ہر طرف گوشت جلنے کی بُو پھیل گئی تھی۔

اب گراغو کے اُس تصویری پیکر نے ایک دیوار کی طرف مُنہ پھیرتے ہُوئے گویا کسی کو حکم دیا: "بردنگا کے خاتمے کا اندراج کردو۔"

مَیں یہ نفرت انگیز المیہ دیکھ کر گنگ سا رہ گیا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے مَیں کسی الف لیلوی کہانی کا ایک ایسا کردار ہُوں جو خوفناک جن کے طلسم کدے میں پہنچ گیا ہو۔ مَیں نے اپنی تلوار نیام میں ڈال دی کہ وہ کسی خیال یا تصویری پیکر کو ہلاکت سے ہم کنار نہیں کرسکتی تھی۔ پہلے تو مَیں غم و غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا... پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ اگر یہ گراغو کا تصویری پیکر ہے تو وہ حقیقی پیکر بھی تو رکھتا ہوگا۔ مجھے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے، جب وہ اپنے حقیقی پیکر میں میرے سامنے آئے... تب مَیں اس کا یہ قرض ضرور چکا دُوں گا۔ مَیں اسی سوچ میں ڈُوبا ہُوا تھا کہ گراغو میری طرف متوجہ ہوگیا۔

"اب تمھارے بارے میں بات ہوجائے، انسان دیوتا۔ کیا تم اُن بیس مُردوں میں سے ایک ہو جو دارالخلافہ جبروت میں مقید ہیں؟"

مَیں اس سلسلے میں بردنگا سے تو سُن ہی چکا تھا، اس لیے مَیں نے کہا: "ہاں۔ مَیں وہیں سے فرار ہُوا ہُوں لیکن راستے میں سر پر شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے میری یاد داشت بڑی حد تک ختم ہوچکی ہے۔"

گراغو کی سبز آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔ وہ گردن مٹکاتے

اورھویں اُچکاتے ہوئے کچھ دیر سوچتا رہا... پھر بولا "تم اُن بس مَردوں میں سے نہیں ہو، انسان دیوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟... مگر یہ سب کچھ میری سمجھ میں آنا چاہیے اور مجھے اس کا ادراک ہو کر ہی رہے گا۔ میری لوحِ پیدائش پر میری ذہنی سطح چودھواں درجہ ظاہر کرتی ہے مگر حقیقت میں وہ چودھویں درجے سے بہت آگے اور بہت بلند ہے... لیکن 'وہ لوگ' اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ پھر گردن مٹکاتے اور بھویں اُچکانے لگا۔

یہ حرکت اس امر کی غماز تھی کہ وہ سوچ رہا ہے۔

چند لمحے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "تمھاری شخصیت اسرار کے لبادوں میں لپٹی ہوئی ہے اجنبی... لیکن اسرار کے پردے زیادہ دیر تک تمھاری شخصیت اور خمرستان میں آمد کا مقصد نہیں چھپا سکتے۔ ہو سکتا ہے، تب میں تمھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کروں۔ اب تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"ٹھیک سمجھے گرانجو۔ میں اُن بس مردوں میں سے نہیں ہُوں جو جبرات میں محبوس ہیں۔"

میں نے اسے صاف صاف بتا دینا ہی مناسب جانا کہ اُس تصویری پیکر کا میں کچھ بگاڑ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا کہ وہاں سے فرار ہونے کے بعد سر پر چوٹ لگنے کے باعث میری یادداشت خراب ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تمھاری سرزمین کے لیے ایک اجنبی ہُوں۔ تم مجھے کافی سمجھدار اور عقل مند معلوم ہوتے ہو۔ آؤ ہم ایک دُوسرے کو اپنے بارے میں بتائیں اور دُشمنوں کی بجائے ایک دُوسرے کے دوست بن جائیں۔"

گرانجو اپنے مخصوص انداز میں سوچنے لگا۔

میں نے یہ سوچتے ہُوئے کہ کہیں وہ میرے وار کرنے والی حرکت کی بنا پر انکار نہ کر دے، ان الفاظ میں پیش بندی کی۔ "مجھے افسوس ہے، تھوڑی دیر پہلے میں نے اشتعال میں آکر تم پر حملہ کر دیا تھا۔ دراصل اُس وقت میں بردنگا کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ بہرصورت مجھے اپنی اس حرکت پر ندامت ہے اور میں چاہتا ہُوں کہ اب ہم دوست بن جائیں۔"

"یہ عجیب سی بات ہے کہ تم ہماری زبان میں بات کرتے ہُوئے کچھ ایسے الفاظ بھی بول جاتے ہو جو میرے لیے نئے ہیں اور میں اُن کے مفہوم و معانی سے ناآشنا ہوں۔ مثلاً لفظ 'دوست' ہماری زبان کا لفظ نہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں؟"

میں نے اپنے ہونٹوں پر دوستانہ تبسم چپکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ہم ایک دُوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں بلکہ ایک دُوسرے کے کام آئیں اور ایک دُوسرے کی مدد کریں۔"

"اوہ...!" وہ بولا۔ "میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن یہ مت سمجھنا کہ اس سوچ کا باعث تمھاری شخصیت یا یہ دُور از کار ہتھیار ہیں۔ ہم نے ہزاروں شہرے پہلے کے یہ دقیانوسی ہتھیار محض اس لیے رکھ چھوڑے ہیں کہ ہمارے نیم وحشی سپاہی ان سے کھیل سکیں۔"

میں خاموش رہا۔

وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ میری خاموشی میں یہ مصلحت تھی کہ میں اس کے دل کا حال جاننا چاہتا تھا۔

چند لمحوں بعد گرانجو نے دیوار کی طرف دیکھتے ہُوئے بآوازِ بلند کہا۔ "تمام اسپائی اسکرین بند کر دو۔ یہ میرا... نیم مرد کا حکم ہے۔ اب تک جو گفتگو ریکارڈ کی گئی ہے، اسے صاف کر دو اور جب تک میں دوبارہ حکم نہ دُوں ریکارڈنگ نہ کی جائے۔" یہ ہدایات دے کر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ ہم تخلیے میں بات کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ اُسی گول چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔

میں قدرے ہچکچایا تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شاید تم بردنگا کا حشر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے ہو۔ مگر ڈرو نہیں اجنبی... جیسا کہ تم نے کہا تھا، اب ہم دوست ہیں۔ تم میرے کام آؤ گے تو میں تمھارے کام آؤں گا۔"

میں چبوترے پر اُس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا... مگر مجھے اُس کے وجود کا مطلق احساس نہ ہو سکا۔ وہ واقعی ایک تصویری پیکر تھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور بولا۔ "تم اس تصویری پیکر والی بات اب تک نہیں سمجھ سکے اجنبی... اور تمھاری اسی بات نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہُوئے بے اختیار سوال کیا۔

"یہی کہ تم ہرموجہ نہیں ہو۔ وہ موعود نہیں ہو جس کے بارے میں "وہ لوگ" یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز وہ خمرشان آئے گا اور انھیں تمام تر مشکلات و مصائب سے نجات دلائے گا۔ اگر تم وہی موعود ہرموجہ ہوتے تو تمھیں پتہ چل جاتا کہ تم میرے تصویری پیکر پر وار کر رہے ہو، میرے وجود پر نہیں۔"

"یہ باتیں ہم آرام سے بیٹھ کر کیوں نہ کریں۔" میں نے اُسے

ٹالنے کے لیے کہا۔ مجھے اس بے حجاب خواجہ سرا کے قریب کھڑے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

"اچھا تو پھر اُس کُرسی پر بیٹھ جاؤ۔" اُس نے جواب دیا اور ایک جانب اشارہ کیا تو میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹ گئیں۔

ایک لمحے قبل ہم سُرنگ کے ہتھیاروں والے کمرے میں گول چبوترے پر کھڑے تھے اور اب کھڑے کھڑے پلک جھپکتے ہی ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے تھے جو وسیع و عریض تھا۔ اُس کی چھت بھی کافی اُونچی تھی اور دیواروں میں لگے خفیہ اسپیکروں سے موسیقی کی مدھم آواز کمرے میں تیر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرے کی دیواریں بھی ترغون کی بنی ہوئی ہُوں۔

کمرے کے وسط میں ایک بہت بڑی میز رکھی تھی جس کے ایک جانب ریوالونگ چیئر اور سامنے دو کُرسیاں موجود تھیں۔

گرانجو میز کی دُوسری جانب ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

اُس کی گہری سبز آنکھیں مجھ پر جمی ہُوئی تھیں۔

وہ یُوں مسکراتے ہُوئے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اوباش بوڑھا اپنی نئی نویلی دُلہن کی طرف دیکھتا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں ایک لمحے کے لیے بُری طرح شرما گیا۔

"بیٹھو دوست۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔

میں کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"سُنو۔ میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا ہُوں۔ میں جانتا ہُوں کہ تم ہرموجہ نہیں ہو اور تم بھی جانتے ہو کہ تم ہرموجہ نہیں ہو... لیکن "وہ" نہیں جانتے کہ تم ہرموجہ نہیں ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہُوں کہ تمھیں اُن کے سامنے اُسی ہرموجہ کی حیثیت سے پیش کر دُوں جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے۔ تم سمجھ گئے نا میری بات؟"

"ہاں... لیکن جب تک ہم سارے معاملات طے نہ کر لیں، میں ہرموجہ بننے کا وعدہ نہیں کرتا اور ہاں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم تصویری پیکر ہو یا میں حقیقی گرانجو سے بات کر رہا ہُوں؟"

یہ سُن کر اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ "چھو کر دیکھ لو۔"

میں نے اُس کا ہاتھ چھُوا تو پتہ چلا کہ وہ تجسیم اختیار کر چکا تھا۔ اس کا برف کی طرح سرد ہاتھ چھُو کر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں نے کسی مُردے کا ہاتھ چھُو لیا ہو۔

"معاملے کی بات شروع کرنے سے پہلے مجھے تمھارے کوائف کا اندراج کرنا ہے اجنبی... لیکن ٹھہرو۔ پہلے مجھ سے کوئی جھوٹ بولو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کوئی بھی ایسی بات کرو جو سچی نہ ہو۔"

"میرا نام دِلرُبا خانم ہے۔" میرے اتنا کہتے ہی اُس کی کُرسی سے ایک عجیب سی بھن بھناہٹ سُنائی دی۔ اور دونوں ہتھوں پر لگے ہُوئے بلب جلنے بجھنے لگے۔ وہ مسکرانے لگا۔

"اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ جھوٹ بول کر مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"ہاں۔ میں سمجھ گیا۔" میں نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔

اُس نے میز پر رکھی ایک سلیٹ اُٹھائی اور دُوسرے ہاتھ میں قلم تھامتے ہُوئے پُوچھا۔ "تمھارا نام؟"

"سرفروش..." میں نے جواب دیا۔

"لیکن نہیں۔ اب تم سرفروش نہیں ہو بلکہ ہرموجہ ہو... وہ انسان دیوتا جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا تھا اور جس کی آمد کا "وہ" لاکھوں شہروں سے انتظار کر رہے ہیں۔"

گرانجو اپنی سبز آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالے بولتا رہا۔ ان آنکھوں میں مجھے عیاری اور مکر کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

میں نہیں جانتا کہ خمرشان کے شہرے ہمارے ہاں کے کتنے وقت کے برابر تھے۔ وہاں دن اور رات کی شناخت بھی ناممکن تھی کہ ہمہ وقت پونم کی سی ٹھنڈی چاندنی چھائی رہتی تھی۔ گرانجو سے بات چیت کے بعد مجھے ایک وسیع و عریض آرام دہ کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہ کمرہ بھی اُسی کمرے جیسا ہی تھا جس میں میری اور گرانجو کی مفصل گفتگو ہوئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کمرے میں میز کی جگہ پلنگ بچھا ہُوا تھا اور کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

میں نہ جانے کتنے دنوں سے اس کمرے میں مقیم تھا۔

شروع شروع میں تو مجھے وقت کاٹنا مشکل ہو گیا لیکن پھر جب میں نے الماریوں سے کتابیں نکال کر دیکھنا شروع کیں تو مجھے ازخود ہی اُن کی تحریریں پڑھنا آگئیں... اب میرا بیشتر وقت اُن کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ میں ان کتابوں کا مُطالعہ بڑے شوق سے کرتا رہا کیوں کہ یہ کتابیں خمرشان کی قدیم تاریخ پر مبنی تھیں۔

میں جانتا تھا کہ اسپائی اسکرین کے ذریعے ہر وقت میری کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ لیکن اُن سے متعلق آلات کہاں نصب تھے، یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

اس کمرے میں منتقل ہونے پہلے گرانچو نے کہا تھا: "میں چاہوں تو تمھیں کسی وقت، کسی لمحے اور کسی شہر جشم زدن میں ہلاک کرسکتا ہوں... مگر جیسا کہ تم نے کہا ہے، ہم ایک دوسرے کے دوست بن کر ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں، میں تمھیں ہلاک نہیں کروں گا اور اس کے بدلے میرے کام آؤ گے۔ آج کے بعد تم سرفروش نہیں بلکہ ہر موجہ ہو۔ میں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جو منصوبہ بنا رکھا تھا، اب مجھے اُس میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں گی اور یہ تبدیلیاں بہتری کے لیے ہوں گی. تب تک تمھیں انتظار اور آرام کرنا پڑے گا۔"

یہ گرانچو کا یک طرفہ فیصلہ تھا جسے بحالت مجبوری مجھے قبول کرنا پڑا تھا اور اس کے بعد گرانچو سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران میری داڑھی بڑھ گئی تھی مگر میں نے شیو نہیں کیا. میری خدمت اور نگرانی کے لیے جو محافظ مقرر کیے گئے تھے وہ زنخوں کے علاوہ وہی بوزنے قسم کے نیم وحشی انسان تھے۔ ان خدمت گاروں میں عورتیں بھی شامل تھیں جو ستر پوشی کے لیے کپڑے کی مختصر دھجیاں استعمال کرتی تھیں۔ یہ کپڑا ابھی پیے وا، یا ترغون سے بنا ہوا تھا۔ چوں کہ یہ خدمت گار اور نگران خم شان کی زبان نہیں سمجھتے تھے، اس لیے میں نے اُن پر توجہ دینا مناسب نہ سمجھا. دوسرے بے لباس زنخوں کو دیکھ کر مجھے گھن آنے لگتی تھی... اور بروانگا بھی یاد آجاتا تھا جو میری وجہ سے مارا گیا تھا.

جب میں کمرے میں پڑے پڑے اور پڑھتے پڑھتے بور ہو جاتا تو ٹیرس پر آکر چہل قدمی کرنے لگتا۔

میرا کمرہ چوتھی منزل پر واقع تھا۔

کبھی کبھی میں ٹیرس کے جنگلے سے جھک کر نیچے بھی دیکھ لیا کرتا تھا لیکن نیچے کی منزلوں میں مجھے کبھی کوئی زنخہ یا کوئی دوسرا فرد دکھائی نہیں دیا تھا. میرے سامنے یا تو پے وا، کے کھیت تھے یا لق ودق میدان تھا... لیکن روشنی کے باعث میں زیادہ دُور تک نہیں دیکھ پاتا تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کیوں نہیں کی اور اس طرح بے دست وپا ہو کر کیوں رہ گیا؟ تو بات دراصل یہ ہے کہ گرانچو نے اس عمارت کے باہر صرف تین فٹ کے فاصلے پر وہی برقی مقناطیسی پردہ آویزاں کر رکھا تھا، جو غیر مرئی تھا لیکن جب کوئی چیز اُس سے ٹکراتی تھی تو نیلگوں شعلے کے ساتھ وہ مقناطیسی پردہ ٹکرانے والی شے کو پیچھے دھکیل دیتا تھا۔ اگر یہ غیر مرئی پردہ حائل نہ ہوتا تو میں چوتھی منزل سے تو کیا ساتویں منزل سے بھی فرار ہوچکا ہوتا.

ایک روز جب میں نے ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے، جنگلے سے نیچے جھانکا تو میری نگاہ تیسری منزل کے جنگلے کے ساتھ لگے ہوئے ایک نسوانی پیکرِ حسن پر جم کر رہ گئی۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت عورتیں دیکھی ہیں لیکن وہ جو جنگلے کے پاس کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ عجیب ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ بعض عورتوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ آگ ہوں. اُنھیں دیکھنے والے اس آگ سے کھیلنے کو تڑپ اُٹھتے ہیں لیکن وہ لڑکی اپنے تراشیدہ جسم میں تمام تر حدتیں رکھنے کے باوجود شعلہ کم اور شبنم زیادہ لگتی تھی، نہ جانے اُسے کیسے یہ احساس ہو گیا کہ میں اُوپر سے دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اُوپر دیکھا. اُس کے گلاب لب ہلکے سے تھرتھرائے، سیاہ آنکھوں پر پلکوں کی جھالر دو تین بار اُوپر نیچے ہوئی اور وہ بغیر کچھ بولے بہت کچھ کہہ کر ٹیرس سے اندر چلی گئی۔

وہ تو چلی گئی لیکن میں نہ جانے کب تک وہاں کھڑا دعائیں مانگتا رہا کہ وہ ایک بار پھر باہر آجائے مگر دعائیں قبولیت کی گھڑی میں مستجاب ہوتی ہیں اور وہ گھڑیاں شاید قبولیت کی نہیں تھیں.

دوسرے روز میرا بیشتر وقت ٹیرس پر گزرا لیکن میری آنکھیں پیاسی ہی رہ گئیں۔

تیسرے روز جب وہ مجھے دکھائی دی تو میں سیدھا کمرے میں آیا اور پلنگ پر بچھی ہوئی چادر پھاڑ کر اُس کی پٹیاں بنائیں پھر اُنھیں کھینچ کر اُن کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور اُنھیں ایک دوسری سے باندھ کر ٹیرس پر واپس آگیا۔ پٹی، جنگلے سے باندھی اور اُس کے ساتھ لٹک کر تیسری منزل کے ٹیرس پر پہنچ گیا.

وہ لڑکی کمرے میں موجود تھی۔ اُس نے پلکوں کے پٹ کھول کر ایک نظر مجھے دیکھا اور گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گئی.

"کیا تم جانتی ہو کہ میں کون ہوں ؟" میں نے پُوچھا.

اُس نے سر اُٹھائے بغیر جواب دیا: "ہاں میرے آقا تم ہر موجہ ہو... وہ دیوتا جس کا ہماری کتابوں میں ذکر آیا ہے وہ موعود جس کا لاکھوں غیبروں سے انتظار کیا جا رہا ہے۔"

لڑکی کے منہ سے یہ بات سُن کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں سمجھ گیا کہ گرانچو نے اپنا کام شروع کردیا ہے یہ لڑکی اُسی کے ایما پر مجھے نظر آئی تھی اور وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ میں اس کے پاس آؤں۔ اگر وہ ایسا نہ چاہتا تو اسپائی اسکرین اُسے یا نگرانوں کو اسی وقت مداخلت کے لیے مجبور کردیتیں. جب میں چادر پھاڑ کر یہاں آنے کی تیاریاں کر رہا تھا.

... اور جب جوشِ وجذبۂ سرکش کے، طوفانی لمحے گزر گئے تو میں نے اُس لڑکی سے پُوچھا: "تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ژروے ہے آقا... میں اُن لوگوں کی کنیز ہوں جن سے آپ کی آمد کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

میں کتابوں میں، اُن کی کنیزوں کے بارے میں پڑھ چکا تھا۔ جبروت میں اُنھیں ثانوی درجے کی عورتیں شمار کیا جاتا تھا. اور یہ بھی "اُن" کی طرح جبروت سے باہر خم شان کے کسی علاقے میں نہیں جاسکتی تھیں. میں سوچنے لگا کہ پھر ژروے یہاں کیسے آ گئی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ گرانچو نے اپنی مقصد براری کے لیے ژروے کا تصویری پیکر استعمال کیا ہو... لیکن پھر خیال آیا کہ اگر ژروے تصویری پیکر ہوتی تو مجھے اُس کے وجود اور اُس کے لمس کا کبھی احساس نہ ہوتا... ژروے سچ مچ کی عورت تھی اور ایسی عورت تھی کہ میں اُسے کبھی نہیں بُھول سکتا تھا۔ تاہم میں نے اپنے تعجب کی تسکین کے لیے اُس سے پُوچھا: "اگر تم "اُن" کی کنیز ہو تو جبروت سے یہاں جنوبی صوبۂ خراگ کے اس علاقے میں کیوں اور کیسے آگئی ہو؟"

"مجھے سزا کے طور پر یہاں بھیجا گیا ہے، آقا!" وہ بولی.

"کیسی سزا...؟" میں نے پُوچھا.

"وہی سزا جو گناہ گار لڑکیوں کو دی جاتی ہے۔ جبروت میں، میں مردوں کے پنجرے میں چلی گئی تھی... اس لیے میں آپ کے قریب آنے سے گریز کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہر موجہ دیوتا ایک گناہ گار لڑکی کو اپنی محفل سے نوازے لیکن آپ نے میری بات سُننا گوارا ہی نہیں کی۔"

"دیوتاؤں کو جو چیز اچھی لگتی ہے، وہ اُسے اپنا لیتے ہیں اور کوئی مزاحمت برداشت نہیں کرتے۔" میں نے ژروے کو جواب دیا: "تم مجھے اچھی ہی نہیں، بہت ہی اچھی لگی ہو۔"

عین اُسی لمحے مجھے گرانچو کے ہنسنے کی مدھم سی آواز سُنائی دی. میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ کمرے کے کونے میں گرانچو کا تصویری پیکر دُھواں بن کر غائب ہو رہا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر غصہ آگیا کہ وہ اس کمرے میں ہونے والی ہر بات اسپائی اسکرین پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ یہاں تماشا دیکھنے کیوں آگیا تھا؟

* *

میں ژروے کو اعتماد میں لے کر وہاں سے فرار کا منصوبہ بنانا چاہتا تھا... مگر ہماری ہر حرکت دیکھی اور ہر سرگوشی ریکارڈ کی جاتی تھی اس لیے میں اشاروں کنایوں میں بھی اُس سے مطلب کی بات نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم اُس کی خوبصورت آنکھیں جب بھی میری طرف اُٹھتی تھیں، مجھے اُن میں اپنے لیے بے پناہ پیار اور عقیدت کے ساتھ ساتھ دُکھ کے سائے بھی لہراتے نظر آتے تھے.

کیا وہ چاہتی تھی کہ میں اُسے سزا سے بچالوں؟... اگر وہ خود یہ نہیں چاہتی تھی تو بھی میرا دل مجھ سے یہی تقاضا کیے جا رہا تھا کہ اس پر دُکھ کی کبھی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہ پڑے۔

ابھی میں ژروے کے معصوم حسن کا پوری طرح جائزہ نہیں لے پاتا تھا کہ چھ انسان نما حیوان سپاہی اور چھ زنخے وہاں پہنچ گئے اور اُنھوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اگر ژروے کا قرب میرے لیے قابل تعزیر تھا تو مجھے اور اُسے اتنی چھوٹ کیوں دی گئی تھی؟

میں چپ چاپ زنخوں اور وحشی سپاہیوں کے نرغے میں ژروے کے کمرے سے نکل گیا.

وہ لوگ مجھے سیدھے گرانچو کے کمرے میں لے آئے جہاں وہ میرا منتظر تھا۔ اور آج خلافِ معمول پُورے لباس میں تھا۔ اس

نے شفاف، ترغنی لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کارٹونوں والی پٹیوں جیسی دو پٹیاں بھی تھیں۔ اُس نے ایک پیٹی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ باندھ لو۔"

پیٹی دیتے ہوئے اُس نے جان بوجھ کر میرے ہاتھوں کو چھوا تاکہ مجھے یقین دلا سکے کہ اس وقت اُس کا تصویری پیکر نہیں بلکہ وہ خود مجھ سے مخاطب ہے۔

میں پیٹی کمر میں باندھنے لگا۔

"ہمیں کافی دُور جانا ہے، دیوتا۔" اس نے کہا۔

"کہاں...؟" میں نے پوچھا۔

"گرگوشس... وہاں ہمیں موسم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے لبادہ بھی لے لو۔"

گرانچو کی موسم والی بات سے مجھے یاد آگیا کہ خمرشان میں اُنھوں نے موسم کو بے اثر کیا ہوا تھا اور گرگوشس والوں کو شاید یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسی لیے گرانچو نے ایک لبادہ مجھے بھی دے دیا۔ پھر اُس نے ایک دیوار کو چھوا تو اُس کا ایک حصّہ دروازے کی طرح کھل گیا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس دروازے میں داخل ہوگیا۔

یہ ایک تاریک اور تنگ سُرنگ تھی۔ گرانچو نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا تو ہمارے سروں پر روشنی کا ایک گولا نمودار ہوا جو ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ گرانچو میرے آگے آگے تھا۔ ایکا ایکی میرے جی میں آئی کہ اب وہ تصویری پیکر میں نہیں ہے تو کیوں نہ میں اُسے کراٹے کے ایک ہی ہاتھ سے اُس کی گردن توڑ دوں؟... لیکن میں نے اپنی اس خواہش پر قابو پا لیا کہ ابھی میں اس ماحول اور ملک میں اجنبی تھا۔ جتنا ضرورت مند گرانچو میرے لیے تھا، اتنی ہی مجھے بھی اُس کی ضرورت تھی۔

وہ تیز تیز چلتے ہوئے بولا: "آج زندگی میں پہلی مرتبہ میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ اس لیے تمھیں بے حد محتاط رہنا اور موقع و محل کے اعتبار سے مناسب اقدام کرنا ہوگا۔ یاد رکھو کہ مجھے پیش آنے والا خطرہ تمھارے لیے بھی ہوگا۔ ہم گرگوشس کے بادشاہ فروندا اور اُس کی بیٹی شہزادی راغنی سے ملنے جا رہے ہیں۔ وہ نہ تو مجھے پسند کرتے ہیں اور نہ ہی اُنھیں مجھ پہ اعتماد ہے۔ شاہ فروندا اور راغنی اُن کے دیوتا ہرموجو پر بھی یقین نہیں رکھتے۔ لیکن میں اُنھیں یہ یقین دلا دوں گا کہ تم میری اور پشکانیوں کی مدد کر سکتے ہو اور واقعی تم ہمارے لیے مددگار ثابت ہوگے... مگر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ پشکانی شاہ فروندا اور شہزادی سب کے سب بے حد ظالم اور خونخوار لوگ ہیں اور ہر صورتِ حال سے تمھیں خود نمٹنا ہوگا۔"

گرانچو کی اِن باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوا کہ عام محلاتی سازشوں کی طرح وہ بھی ایک سازش کے ذریعے خمرشان کے موجودہ حکمرانوں کا تختہ اُلٹ کر خود اقتدار پہ قابض ہونا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے مجھے آلۂ کار بنا کر پشکانیوں سے فائدہ اُٹھانے کا متمنی ہے۔ مجھے اُس سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ اس لیے میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور چُپ چاپ اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

اچانک مجھے ژروبے کے کمرے میں اُس کے تصویری پیکر کی یاد آگئی۔ میں نے گرانچو سے پوچھا: "کیا تمھیں یا تمھارے تصویری پیکر کو مجھے ژروبے کے ساتھ دیکھ کر لطف آیا تھا گرانچو...؟"

"میں کسی لطف کے لیے وہ تماشا نہیں دیکھ رہا تھا، ہرموجو۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا: "بلکہ میں وہ تماشا اپنے علم میں اضافے کی خاطر دیکھ رہا تھا۔ بوتلوں کی کوکھ سے جنم لینے والے خواجہ سراؤں کو ایسے جذبات سے محروم کر دیا جاتا ہے مگر میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میری تخلیق کے دوران ان سے کوئی بھول چوک ہوگئی تھی۔ اس لیے اُنھوں نے میری ذہنی استعداد چودھویں درجے کی مقرر کی ہے حالاں کہ وہ اس درجے سے بہت بلند ہے۔ دوسرے وہ لوگ میرے اندر سے ایسے جذبات بھی یکسر خارج نہیں کر سکے جو عام مردوں اور عورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر خواجہ سراؤں کو ان سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

گرانچو کی اس بات سے میں سمجھ گیا کہ اُس نے مجھے ژروبے کے ساتھ ملاقات کا موقع کیوں دیا تھا۔

"تم ژروبے سے کہہ رہے تھے کہ وہ تمھیں بہت اچھی لگتی ہے۔ کیا تم نے سچ کہا تھا؟" گرانچو نے سوال کیا۔

"ہاں... وہ بلا کی حسین عورت ہے اور واقعی مجھے بہت اچھی لگی ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تب تو تم چاہو گے کہ اُسے وہ سزا نہ دی جائے جس کے لیے وہ میرے پاس بھیجی گئی ہے؟"

"ہاں... اگر میں اُسے بچا سکا تو ضرور بچاؤں گا... مگر وہ سزا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اُن وحشیوں کے حوالے کر دی جائے گی جنھیں تم کھیتوں میں کام کرتے دیکھ چکے ہو۔ جب تک وہ زندہ رہے گی، وحشی اُسے بھنبھوڑتے رہیں گے اور وہ مر جائے گی تو اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرگوشس کے میدان میں پھینک دیا

جائے گا۔"

گرانجو نے مزے لے لے کر سزا کی تفصیل بتائی تو... مجھے جھرجھری آگئی۔

"نہیں... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔"

"یہ تمھارے بس کی بات نہیں ہرموجہ... البتہ اگر میں ...خواجہ سراؤں کا نیم مرد چاہوں تو وہ اس سزا سے بچ سکتی ہے۔ لیکن میں ایسا اسی صورت میں چاہ سکتا ہوں، جب تم میرے تابع فرماں رہو اور میرے خلاف کبھی کوئی اقدام نہ کرو۔ میں نے اُسے ایک خفیہ مقام پر منتقل کر دیا ہے جہاں اُس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اگر تم نے میرے کسی حکم کی تعمیل نہ کی تو اُس کے ساتھ بے انتہا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے قہقہہ لگایا۔

"میں اُن جذبات سے بھی آگاہ ہوں جنھیں پُرانی کتابوں میں محبت یا چاہت کا نام دیا گیا۔" اس نے اپنی دانست میں انکشاف کیا۔

میں گرانجو کی ان باتوں پر تلملا کر رہ گیا۔ اب آہستہ آہستہ اُس کی عیاری مجھ پر کھلتی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے علم میں اضافے کے لیے نہیں بلکہ مجھے زردلے کی محبت میں مبتلا کرنے کے لیے اُس سے ملاقات کا موقع دیا تھا... اور وہ میری اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے غصّے پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

کچھ دُور جا کر سُرنگ چوڑی ہونے لگی اور ہمارے سروں پر تھرکتا ہُوا روشنی کا گولا، ایک مقام پر ٹھہر گیا جس کے نیچے فرش میں ایک بڑا گول سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کسی دوسری سُرنگ کا دہانہ تھا... وہاں چار حیوان نما آدمی، سپاہیوں کی وردی میں موجود تھے۔ اُنھوں نے تلوار کے ساتھ ساتھ ویسی ہی بندوقیں بھی کندھوں سے لٹکا رکھی تھیں جیسی کہ میں اُس کمرے میں دیکھ چکا تھا، جہاں سے میں نے پہلی مرتبہ وردی اور تلوار حاصل کی تھی اور جہاں گرانجو نے گول چبوترے پر بروِنگا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ عجیب سی بندوقیں بارُود سے نہیں بلکہ ہَوا کے دباؤ سے گولی چلاتی تھیں۔

گرانجو نے وحشیوں کی زبان میں، اُن سے کچھ کہا تو اُنھوں نے سر جھکایا، عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سوراخ سے ہٹ گئے۔ گرانجو نے کارتوسوں والی پیٹی کا ڈائل گھمایا۔

اور مجھے بھی اپنی تقلید کرنے کی ہدایت دی۔

جونہی میں نے ڈائل گھمایا، اُس کے کارتوسوں جیسے خالی خانوں سے ہَوا گزرنے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے کششِ ثقل کم ہوتی جا رہی ہو۔ میں دل ہی دل میں خمرشان کے سائنس دانوں کو اس ایجاد پر داد دینے لگا۔

گرانجو اُس سوراخ میں کُودا اور مجھے بھی اشارہ کیا کہ کُود جاؤ۔ کودنے کے ساتھ ہی پیٹی کے سوراخوں سے خارج ہونے والی ہَوا کی رفتار بڑھ گئی اور ہم ہَوا میں تیرتے ہُوئے گہرائی میں جانے لگے۔

"مجھے یقین ہے کہ تم ویسا ہی کرو گے جیسا کہ میں نے سمجھایا ہے۔ تمھاری اپنی بقا اسی میں ہے۔" اس نے تنبیہہ کی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

اگر واقعی مجھے اپنی بقا کا خیال نہ ہوتا تو میں اس اندھیری سُرنگ میں گرانجو کا کام تمام کر دیتا مگر مشکل یہ تھی کہ مجھے پیش آنے والے حالات اور اُس نئی سرزمین گرگرش کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اس لیے میں خاموشی سے ہَوا میں تیرتا چلا گیا۔

جب ہمارے پاؤں زمین پر ٹکے اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ ہم ایک غار میں ہی کھڑے ہیں۔ گرانجو نے ڈائل گھما کر پیٹی اتار لی۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی... پھر ہم دونوں غار کے تنگ دہانے سے نکل آئے۔

"جیسا کہ تم نے مجھے اپنی سرزمین کے بارے میں بتایا ہے یہ سرزمینِ گرگرش بھی اُس سے ملتی جُلتی ہے... مگر اس کے باشندے... بڑے خوں خوار اور ظالم ہیں۔"

میں نے گرانجو کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی کیوں کہ میں اس نئے ماحول کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس وقت ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا ہُوا تھا، بارش ہو رہی تھی... اور سائیں سائیں کرتی تیز ہَوائیں چل رہی تھیں۔ فضا میں کافی خنکی تھی۔ شاید اسی لیے روانگی سے پہلے گرانجو نے خود بھی لبادہ اوڑھ لیا تھا اور مجھے بھی اوڑھ لینے کو کہا تھا۔

وہ اس گھُپ اندھیرے میں بڑی آسانی سے پتھریلے راستے پر چل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ راستہ اُس کا دیکھا بھالا ہو۔

ایک چٹان کا موڑ مُڑنے کے بعد ہم رُک گئے۔

کچھ فاصلے پر ایک الاؤ روشن تھا جس کے ارد گرد

کچھ لوگ بیٹھے تھے۔

گرانجو اور اُس کے پیچھے میں اُسی الاؤ کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ یہ الاؤ ایک غار میں روشن کیا گیا تھا۔

بارش اور ہوا کے شور کی وجہ سے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ہماری آمد کا پتہ نہ چل سکا۔ میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ میرے ہی جیسے انسان تھے لیکن اُن کے نین نقش اور سر منگولوں سے ملتے جُلتے تھے۔ اُنھوں نے جانوروں کی کھال کے لباس پہن رکھے تھے۔ سب کے پاس تلواریں تھیں۔ اُن کے قریب ہی بھالے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے کندھے پر ترکش اور کمان بھی لٹکا رکھی تھی۔ وہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بھون کر وحشیوں کی طرح کھا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اُس کتے کی طرف بھی ہڈی اُچھال دیتے تھے جو اُن کے قریب بیٹھا تھا۔

یکایک کتے نے کان کھڑے کیے اور پلٹ کر بھونکنے لگا۔ شاید اُسے ہماری آمد کا پتہ چل گیا تھا۔

"جب تک میں تمھیں نہ بلاؤں یہیں رُکے رہنا..."

یہ کہہ کر گرانجو غار کے اندر چلا گیا۔

الاؤ کے گرد براجمان آدمی چوکنا ہو گئے۔ سب نے تلواروں کے دستے پر ہاتھ رکھ لیے کچھ کھڑے بھی ہو گئے۔ تیر کمان والے نے جلدی سے ایک تیر چلّے پر چڑھا لیا۔

گرانجو نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کرتے ہُوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں دوستو۔ میں خمرشان کے زنخوں کا نیم مرد ہُوں اور تم مجھے پہچانتے ہو۔ میں یہاں اس وقت شاہ فرزندا سے ملنے آیا ہُوں۔ میرے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔ وہ بھی شاہ فرزندا کا مہمان ہے اور تم اس کے ساتھ احترام سے پیش آؤ گے۔"

"وہ کون ہے اور کہاں ہے؟" اُن میں سے ایک لحیم شحیم آدمی نے پوچھا۔

گرانجو نے بآوازِ بلند مجھے پکارا "اندر آجاؤ ہرموجہ۔"

میں غار میں داخل ہُوا تو اُن سب کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ وہ میرے قد و قامت اور جسمانی ساخت سے مرعوب دکھائی دیتے تھے۔ پھر وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد اُن کا لحیم شحیم سردار گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنی تلوار پیشانی سے چھوتے ہُوئے بولا۔ "ہم تمھارے حکم کی تعمیل کریں گے، دیوتا۔"

مجھے حیرت ہُوئی کہ اس قدر سائنسی ترقی کے باوجود یہاں اتنی جہالت بھی موجود ہے۔ میں نے اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اُٹھو... تم میرے دوست ہو اور ہمیشہ میرے دوست رہو گے۔"

"اب دیر مت کرو، ہمیں شاہ فرزندا کے پاس لے چلو، وہ ہمارا منتظر ہوگا۔"

یہ سُنتے ہی اس گروہ کے سردار نے ایک مشعل اُٹھائی اور ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اُس کے ساتھی وہیں رہ گئے۔ وہ ہماری رہبری کرتا ہُوا ایک تنگ درّے سے گزرا۔

ہَوا تیز تھی اور بارش بھی جاری تھی۔ میرا خیال تھا کہ مشعل بجھ جائے گی مگر نہ ہَوا اُسے گُل کر سکی اور نہ ہی بارش کا کوئی اثر ہوا۔ کچھ دُور جانے کے بعد مجھے ایک انبوہِ کثیر کی ہلکی ہلکی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔

بالآخر ہم ایک بہت بڑی غار کے دہانے کے قریب پہنچ گئے جس کے اندر سینکڑوں مشعلیں جل رہی تھیں اور ہزاروں لوگ ناؤ نوش میں مصروف تھے۔ ان کی سرمستیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی جشن منا رہے ہیں۔

میرے اس خیال کی تصدیق ہمارے رہبر نے کر دی۔

"آج ہم خونی میلہ منا رہے ہیں اور ایک روز جبروت میں بھی اسی طرح منائیں گے۔"

"بے شک۔" گرانجو بولا۔ "وہ وقت آگیا ہے اور میں جبروت میں تمھیں فراموش نہیں کروں گا... جاؤ شاہ فرزندا کو ہماری آمد کی اطلاع کرو۔"

جب ہمارا رہبر غار میں چلا گیا تو گرانجو نے مجھ سے کہا۔ "تم نے اپنا کردار بڑی عمدگی سے ادا کیا ہے۔ کیا تم اپنی سرزمین پر بادشاہ تھے؟"

"نہیں... میں جس سرزمین سے آیا ہُوں، وہاں بادشاہت دم توڑ رہی ہے۔" میں نے اُسے جواب دیا اور اندر سے آنے والی آوازیں سُن کر پُوچھا۔ "کیا یہ لوگ بھنگڑا پی رہے ہیں؟"

"چیز تو وہی ہے مگر یہ لوگ اُسے دامو کہتے ہیں۔ جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہُوں، یہ پشکانی بڑے ظالم اور وحشی ہوتے ہیں اور ہمارے چاروں اور خطرہ ہی خطرہ ہے۔ تمھیں وہی کرنا ہے جو میں بتا چکا ہُوں ورنہ ہم بُری طرح مارے جائیں گے۔"

اتنے میں ہمارے رہبر نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

ہم غار میں داخل ہُوئے تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ یونان کے قدیم اکھاڑے سے مطابقت رکھتا تھا۔ چاروں طرف

چٹانیں کاٹ کر دائرے میں نشستیں بنائی گئی تھیں جن پر ہزاروں بدمست پشکانی شراب سے دل بہلا رہے تھے۔ کوئی نشے کی ترنگ میں نعرے لگا رہا تھا تو کوئی گا رہا تھا۔

ہر طرف وحشیانہ قہقہے بکھر رہے تھے۔

پہلے تو انھوں نے ہماری طرف توجہ ہی نہ دی مگر جوں جوں ہم آگے بڑھتے رہے، شور و غوغا کم ہوتا گیا اور نشے میں دُھت پشکانیوں کی نگاہیں ہم پر مرتکز ہوتی چلی گئیں۔

گرانچو نے سرگوشی میں کہا: "وہ جو درمیان میں قربان گاہ بنی ہوئی ہے، اُس کے قریب جا کر احتراماً سر جھکاؤ مگر اُس پر رکھی ہوئی تلوار کو مت چھونا۔"

میں نے قدیم سپہ سالاروں کی طرح اپنا سینہ تان لیا، سر بلند رکھا اور بڑی باوقار چال سے قربان گاہ کی طرف بڑھا جو دس فٹ لمبی اور تقریباً سات فٹ اُونچی تھی اور اُس پر ایک بڑی اور وزنی خون آلود تلوار رکھی ہوئی تھی۔

قربان گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میرے قدموں کے نیچے ریت بچھی ہُوئی ہو۔۔۔ پھر میرا پیر کسی چیز سے ٹکرایا تو وہ لڑھکتی ہُوئی دُور جا گری۔

میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے جھرجھری آگئی۔

یہ کسی پشکانی کا کٹا ہُوا سر تھا۔

وہیں دو بے کفن لاشیں بھی پڑی تھیں۔ دوسری لاش کا سر بھی غائب تھا اور ریت پر خون کے لوتھڑے جم گئے تھے۔

اَب غار میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

میں اُسی طرح باوقار انداز میں قربان گاہ کے قریب تر پہنچ گیا۔ میری نگاہ ایک بار پھر اُس کے دستے پر گئی جس پر بیش قیمت ہیرے جواہرات جڑے ہُوئے تھے۔ گرانچو نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دودھاری تلوار اتنی وزنی ہے کہ کوئی پشکانی اُسے ایک ہاتھ سے نہ تو اُٹھا سکتا ہے اور نہ ہی چلا سکتا ہے۔

قربان گاہ کے اگلے حصّے سے تقریباً پچاس فٹ دُور پتھر سے تراشے ہُوئے دو تخت بھی رکھے ہُوئے تھے جن پر شاہ فروندا اور اُس کی بیٹی شہزادی راشی براجمان تھی۔ میں نے بلا جھجک ایک نظر اُن کی طرف دیکھا، پھر گھٹنوں کے بل جُھک کر ماتھا قربان گاہ پر ٹکاتے ہُوئے دونوں ہاتھ یُوں پھیلا دیے جیسے کوئی دیوتا آشیرواد دے رہا ہو۔

میرے اس عمل کے ساتھ پشکانیوں نے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیے۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ گرانچو نے بھی میری طرح قربان گاہ کو تعظیم دی ہے۔۔۔ پھر ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں گرانچو کی ہدایت کے مطابق تخت کی طرف بڑھنے لگے۔

"میں شاہ فروندا اور شہزادی راشی کے سامنے اپنا سر خم کروں گا۔۔۔ مگر تم ایسا نہیں کرو گے۔ ہر موجہ کسی کے سامنے سر خم نہیں کرتا۔ وہ دیوتا ہے۔ تم اُس وقت تک بات بھی نہیں کرو گے جب تک تم سے بات نہ کی جائے۔۔۔ اور ہاں غیر متوقع حالات سے نمٹنے کے لیے بھی تیار رہنا۔" گرانچو نے سرگوشی میں کہا۔

ہم تخت کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔

گرانچو نے ایک گھٹنے کے بل جُھک کر شاہ فروندا اور شہزادی کے سامنے سر خم کرتے ہُوئے کہا: "نیم مرد گرانچو شاہ اور شہزادی کی خدمت میں کورنش بجا لاتا ہے اور ہر موجہ کو متعارف کراتا ہے جو خمر شانیوں کا موعود ہے۔ جس کی آمد کا وہ مدت سے انتظار کر رہے ہیں۔"

شاہ فروندا جو بے حد لحیم شحیم تھا، اپنی چھوٹی چھوٹی۔۔۔ مگر انگاروں کی طرح سُرخ آنکھوں سے مجھے گھُورنے لگا۔ شہزادی راشی کی بادامی آنکھیں تو پہلے ہی سے مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ بار بار اپنے یاقوت رنگ ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی جب کہ فروندا کی آنکھیں میرے ذہن کو پڑھنے میں مصروف تھیں۔

میں نے بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

غار میں بیٹھے ہُوئے پشکانی ایک دم خاموش ہو گئے۔ وہ اپنے بادشاہ کی بات سُننے کے لیے ہمہ تن گوش تھے۔

"تم کہتے ہو کہ یہ خمر شانیوں کا موعود دیوتا ہے۔ یہ اگرچہ دیوتا ہی نظر آتا ہے مگر میں اُس وقت تک اسے دیوتا تسلیم نہیں کر سکتا جب تک تم اور یہ خود اپنے دیوتا ہونے کا کوئی ثبوت نہ دے دے۔" شاہ فروندا نے گرانچو کو گھُورتے ہُوئے کہا۔

گرانچو نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا: "آپ بجا فرماتے ہیں شہنشاہ۔ وقت آنے پر آپ کو ثبوت بھی مِل جائے گا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر آپ اسے دیوتا تسلیم کریں گے تو خمر شانی بھی اپنے آپ اسے دیوتا مان لیں گے اور ان کی پہلی شکست یہ ہو گی کہ اُن کا موعود دیوتا، جس کا ذکر اُن کی مقدّس کتابوں میں آیا ہے، خمر شانیوں کے پاس نہیں بلکہ پشکانیوں کے پاس آیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ دیوتا خمر شانیوں کو پسند نہیں کرتا اور پشکانیوں کو عزیز سمجھتا ہے، لہٰذا خمر شان پر پشکانیوں کی حکومت ہونا چاہیے۔ اس طرح خمر شانیوں کی مقدّس کتابوں

والی پیش گوئی بھی غلط ثابت ہو گی۔۔۔ پھر یہ آپ کو جبر و ت سے جانے گا جہاں اس وقت آپ کو حکمران ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ مجھ پر اعتماد کرتے ہُوئے میرے منصوبے پر عمل کیا جائے تو پشکانیوں کو اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ مل سکتا ہے۔"

شاہ فروندا، گرانچو کے اس جواب پر غور کرتا رہا جب کہ شہزادی راشی اس دوران مجھ پر نگاہوں ہی نگاہوں میں "گفتگو" کرتی رہی۔ ہمارے درمیان مسکراہٹوں کے تبادلے نے مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا اور میں اپنی جگہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اتنے میں شاہ فروندا نے اپنی موٹی گردن راشی کی طرف گھمائی اور بولا: "تمھارا کیا خیال ہے، شہزادی؟"

راشی باپ کے اس اچانک تخاطب پر چونک سی گئی۔۔۔

پھر اُس نے اپنا مُنہ شاہ فروندا کے کان کے قریب لے جا کر سرگوشی میں کچھ کہا تو شاہ نے میری طرف دیکھا اور بولا: "تم جو کوئی بھی ہو، راشی تمھیں پسند کرتی ہے۔ میں نے تمھارے بارے میں اس نکتۂ نظر سے نہیں سوچا تھا۔ شہزادی کی پسندیدگی نے میری سوچ کی راہیں بدل دی ہیں۔ کیا تمھیں شہزادی کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض ہے؟"

میں، جواب تک شہزادی کے حُسن و شباب سے بُری طرح متاثر ہو چکا تھا، کہے بغیر نہ رہ سکا: "میں۔۔۔ ہر موجہ دیوتا، شہزادی کے فیصلے کو بنظرِ پسندیدگی دیکھتا ہُوں۔"

یہ سُن کر شاہ کے مُنہ سے بے ساختہ ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ اُس نے افسوس کے لہجے میں کہا: "پھر تو میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تمھیں اپنی زندگی کی حفاظت خود ہی کرنا پڑے گی۔ اگر تم نے مقابلہ جیت لیا تو شہزادی تمھاری ہو گی۔"

میں ایک لمحے کے لیے ہونّق سا رہ گیا۔

میرا خیال تھا کہ راشی کی پسندیدگی سے سارا مسئلہ حل ہو جائے گا مگر شاہ کی بات سے پتہ چلا کہ مجھے کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا اور پھر قربان گاہ کے قریب پڑی سر بریدہ لاشوں سے ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔

میں نے گرانچو کی طرف دیکھا۔

اُس کی آنکھوں میں مایوسی اور تاسف کے سائے لہرا رہے تھے اور اب بقول اُس کے، مجھے حالات سے خود ہی نمٹنا تھا۔

یکایک شہزادی راشی نے تالی بجائی تو ایک نوجوان پشکانی سامنے آگیا۔ وہ قامت میں اپنے قبیلے کے دُوسرے نوجوانوں سے کہیں زیادہ بلند اور تنومند تھا۔ اُس نے کھال کا مختصر سا لباس اُتارا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا کہ اُس کا جسم فولاد کا بنا ہُوا ہو۔ اُس کے ایک ایک عضو کی مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مجھے یاد دلا رہی تھیں کہ تن سازی میں وہ مجھ سے کچھ آگے ہی کی چیز ہے۔

وہ شہزادی راشی کی طرف بڑھا اور آہستہ سے کچھ بولا۔۔۔ مگر راشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے "دامو" کا پیالہ اُٹھایا اور پشکانی کے چہرے پر انڈیل دیا۔

شاہ فروندا یہ دیکھ کر بُری طرح ہنسنے لگا

شہزادی تخت سے اُٹھ کھڑی ہُوئی اور میری طرف آنے لگی۔

"خبردار، اُسے غصّہ مت دلانا۔ گرگرش کی اصل حکمران راشی ہی ہے۔ یہ جو چاہتی ہے، وہی ہوتا ہے۔" گرانچو نے سرگوشی کی۔

میں نے شہزادی کی طرف دیکھا، وہ سانپ کی طرح لہراتی ہُوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس کے دہکتے چمکتے سراپا نے میرے خُون کی گردش بڑھا دی۔ بلاشبہ وہ ناقابلِ فہم حُسن کی مالک تھی۔

وہ میرے سامنے آ کر رُک گئی۔

اُس کا قد مجھ سے چھوٹا تھا اس لیے پنجوں کے بل کھڑی ہو کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہُوئے بولی: "تم ہر موجہ ہو یا نہیں۔۔۔ مگر میں تمھیں دیوتا سمجھتی ہُوں۔ اور اپنا دل ہار کر تمھیں جیتنا چاہتی ہوں، اس لیے یہ مقابلہ تمھیں جیتنا پڑے گا تاکہ وہ میری جیت بن جائے۔ غوطار سے میرا دل بھر گیا ہے، تمھیں میری خاطر اُسے شکست دینا پڑے گی۔"

اُس کی باتوں نے میرے جسم میں چنگاریاں سی بھر دیں۔

"دیوتا ہمیشہ فتح یاب ہوتے ہیں، شہزادی۔" میں نے پُر وقار لہجے میں کہا۔

اتنے میں شاہ کی بھاری بھرکم آواز سُنائی دی۔ وہ ہتھیار لانے کا حکم دے رہا تھا۔

شہزادی دوبارہ اپنے تخت کی طرف چلی گئی۔ میں نے مجمعے پر نظر ڈالی۔ سب پینا پلانا بھول کر موت اور زندگی کے کھیل کا انجام دیکھنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ مجمعے کی اکثریت غوطار غوطار کے نعرے لگا رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی آواز یکدم اُس کا جوش ان الفاظ سے بھی بڑھا دیتا تھا۔۔۔

"تمھارا تیسرا شکار آگیا ہے، غوطار۔"

"اس کا سر بھی اُڑا دو غوطار۔"

میں نے گرانچو کی طرف دیکھا۔

وہ تخت کے ایک جانب ہاتھ باندھے چُپ چاپ کھڑا تھا۔ مجھے اُس کی بات یاد آگئی کہ غیر متوقع حالات کا سامنا مجھے

خود ہی کرنا پڑے گا اور اب وہ غیر متوقع حالات سامنے آ گئے تھے۔

یکایک شاہ فروندا نے ہاتھ بلند کیا تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"یہ مقابلہ بہت سی باتوں کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ ہمیں نیم مرد گرانچو کی سچائی کا بھی پتہ چل جائے گا۔ اگر تم واقعی ہر موجو ہو تو غوطار کو ختم کر دو گے ورنہ وہ تمھارا سر اڑائے بغیر نہیں رہے گا۔ وہ ہم پشکانیوں میں میرے بعد سب سے زیادہ طاقتور، جنگجو اور بہادر ہے... اُدھر دیکھو۔" شاہ فروندا نے مجھ سے کہا اور اُس نے سربریدہ لاشوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

"ان لوگوں نے غوطار کو للکارا تھا، اور یہ ان کا حق تھا کیوں کہ آج ہمارا خونی میلہ منایا جا رہا ہے۔ ان میں سے جو بھی غوطار کو قتل کر دیتا، راشی کو جیت لیتا۔ اگرچہ تم نے مقابلے سے پہلے ہی راشی کا دل جیت لیا ہے مگر ہمارے رواج کے مطابق تمھیں غوطار سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اب اپنے لیے ہتھیار چن لو۔"

میں نے ہتھیاروں کی طرف دیکھا... مگر مجھے اُن میں سے کوئی ہتھیار پسند نہ آیا۔ میں نے اپنی تلوار نیام سے نکالتے ہوئے کہا: "بس مجھے ایک ڈھال کی ضرورت ہے۔ اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے گرانچو پر بھی ایک نگاہ ڈالی۔

اُس کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کے سارے ہی خواب بکھر کر رہ گئے ہوں۔

اچانک غوطار نے ایک نعرہ لگایا اور مجھے ٹھوکر لگانے کے لیے اُچھلا۔ میں بروقت جھکائی دے کر ہٹ گیا۔ غوطار مُنہ کے بل گر گیا... لیکن اس نے چیتے کی سی پھرتی سے پلٹ کر حملہ کرنا ہی چاہا تھا کہ شاہ فروندا کی غضب ناک آواز گونج اُٹھی۔

"رک جاؤ غوطار، جب تک میں حکم نہ دوں، تم مقابلہ شروع نہیں کر سکتے۔"

غوطار یہ سن کر اپنے دوستوں میں چلا گیا جو نعرے لگا کر اس کی ہمت بڑھا رہے تھے۔

شاہ فروندا نے مجھ سے کہا: "تمھیں غوطار کی طرح صرف ایک لنگوٹ میں لڑنا ہوگا۔ اور ہاں۔ کیا تم واقعی اس چھوٹی سی تلوار سے لڑو گے؟ یاد رکھو، مقابلے میں ڈھال استعمال کرنے کی اجازت نہیں اس لیے تمھیں ڈھال فراہم نہیں کی جا سکتی۔"

"اُسے ڈھال استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے۔" غوطار چلایا۔ "اور مجھے تیر کمان کی، اس طرح مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

فروندا نے مجھ سے پوچھا: "بولو کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں لنگوٹ باندھے سینکڑوں کے مجمعے میں کھڑے تھے۔

مجمع غوطار کا طرف دار تھا۔

غوطار کے پاس میری تلوار کے مقابلے میں بڑی تلوار تھی۔ اور تیر کمان بھی جب کہ میرے پاس چھوٹی تلوار اور چھوٹی سی ڈھال کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے غوطار کے تیروں کا مقابلہ نفسیاتی تیروں سے کرنا تھا۔

"تم لڑنے کے لیے تیار ہو یا پہلے رونا دھونا اور گناہ بخشوانے کے لیے دُعا مانگنا چاہتے ہو؟" میں نے پہلا زبانی تیر چلایا۔

غوطار نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور ایک جال اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

شاہ فروندا نے مجھ سے کہا: "تم بھی ایک جال لے سکتے ہو۔"

"میرے لیے بس یہ تلوار اور ڈھال ہی کافی ہے۔ میں غوطار کی طرح بزدل نہیں ہوں۔" میں نے دوسرا نفسیاتی تیر چھوڑا لیکن وہ میرے اس داؤ میں بھی نہیں آیا۔

اُس نے جال بائیں ہاتھ میں لے کر جھلانا شروع کر دیا۔

اُس کے دائیں ہاتھ میں تلوار تھی اور ایک کندھے سے کمان ترکش لٹک رہے تھے۔ وہ مجھے خوں خوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے قربان گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک منجھا ہوا جنگجو اور لڑاکا تھا قربان گاہ کی طرف بڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ عقب سے محفوظ رہے اور اگر میں اس پر زوردار حملہ کروں تو وہ جُل دے کر سامنے سے ہٹ جائے اور میں اپنی جھونک میں قربان گاہ کی چٹان سے جا ٹکراؤں اور اس سے پہلے کہ سنبھل سکوں، وہ میری گردن اُڑا دے۔

اُس کی یہ چال سمجھ کر میں جان گیا کہ میرا مقابلہ کسی معمولی حریف سے نہیں بلکہ ایک ایسے تجربہ کار جنگجو سے ہے جو مجھ پر غالب آ سکتا ہے... اور اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی... مگر میرے لیے بھی یہ موت و زیست کا پہلا خونچکاں کھیل نہیں تھا۔

میں ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں ڈھال لیے آہستہ آہستہ اس کی دائیں جانب بڑھنے لگا تاکہ جال کی لپیٹ میں نہ آ سکوں جسے وہ بائیں ہاتھ سے اُوپر نیچے گھما رہا تھا۔

غوطار آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

وہ بھی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ کہیں میں جال کی جھپٹ میں آنے سے پہلے ہی تلوار کی نوک اُس کے دل میں نہ اُتار دوں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہوئے وہ ایک دم برق رفتاری سے گھوما اور اُس کے جال نے میرا سر اور تلوار والا کندھا اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہُوں اور ابھی اُس کی تلوار میرے سینے میں اُتر جائے گی۔

میں نے ڈھال سامنے کر دی مگر وہ بڑا کائیاں نکلا اور اُس نے تلوار گھونپنے کی بجائے میرے سر پر ضرب لگانا چاہی لیکن اُس وقت تک میری ڈھال بُلند ہو چکی تھی اور میں نے سر جُھکا کر اس کے چہرے پر ٹکر مار دی تھی۔

میری یہ چال اور حملہ غوطار کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ بُری طرح لڑکھڑا کر گرا اور میں جال کی لپیٹ سے آزاد ہو گیا۔

اب جال میرے پاس تھا اور غوطار گھٹنوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جال اُس پر پھینکا مگر... وہ لڑھکنیاں کھاتا ہُوا ہٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں تلوار سے اُس پر وار کرتا، وہ اُٹھ چکا تھا اور ہماری تلواریں آپس میں ٹکرا گئی تھیں اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اُسے طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ عسکری حکمت عملی سے ہی شکست دی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ طاقت اور پھُرتی میں وہ مجھ سے کم نہیں تھا۔

ہر چند کہ میں ایک ماہر شمشیر زن تھا مگر غوطار بھی اس فن سے پُوری طرح آشنا تھا۔ اُس کے ہر وار سے میری ڈھال کا ٹکڑا اُڑ جاتا تھا اور وہ چھوٹی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میں اُسے یہ موقع اس لیے دے رہا تھا کہ وہ تھک جائے مگر وہ اُسی طرح تازہ دَم رہا۔

وہ حملہ کر کے برق رفتاری سے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ترکش سے ایک تیر نکال کر اپنے دانتوں میں دبا لیا مگر میں نے اُسے کندھے سے کمان اُتارنے کا موقع نہ دیا۔ اگر وہ کمان اُتار لیتا تو میری موت یقینی تھی۔

مجمع بار بار "مار دو غوطار... سر اُڑا دو غوطار" کے نعرے لگا کر اس کی ہمت بڑھا رہا تھا اور مجھے راشی، شاہ فرندا یا گرانچو کا ردِ عمل دیکھنے کی مہلت بھی نہیں مل رہی تھی۔

میں نے غوطار کو کندھے سے کمان اُتارنے کا موقع نہیں دیا۔ بالآخر اُس نے بھی کمان اُتارنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہا سے ہی تیر میری طرف پھینکا جو میری ران زخمی کر گیا۔ اپنی ٹانگ پر خُون کی لکیر دیکھ کر جیسے میں جنگی جنون میں مبتلا ہو گیا۔ دہا مجمع بھی دل کھول کر غوطار کو داد دینے لگا۔

آپ جانتے ہوں گے کہ جب مجھ پر خون سوار ہو جاتا تو میں ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر دُشمن پر ٹوٹ پڑتا لیکن ایسے دُشمن سے میرا پالا پہلی بار پڑا تھا جو طاقت اور پھُ میں میرا ہم پلّہ تھا۔ تاہم میں اُسے گھیر کر قربان گاہ کی چٹا کے پاس لے جانے کی کوشش کرنے لگا جہاں وہ بھا بھرکم دو دھاری تلوار رکھی ہُوئی تھی۔

غوطار بھی میری چال سمجھ گیا اور اُدھر جانے سے کتر لگا۔ اُس کی توجہ ذرا سی ہٹی تو مجھے اُس پر ایک بھرپُور ضر لگانے کا موقع مل گیا۔ میں نے اُس کے بازو پر وار کیا ا وہاں سے خُون کا دھارا پھوٹ نکلا۔

غوطار کا ایک ہاتھ کسی حد تک ناکارہ ہو چکا تھا۔ م نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور چند مزید زخم لگا غوطار خُون میں نہا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں جب چاہوں اُ موت کے گھاٹ اتار سکتا ہُوں اُسے چھوٹے چھوٹے ز لگانا میری مردانگی کی توہین بلکہ ایک قسم کا ظلم تھا۔ اس ی میں نے اُسے ایک ہی وار میں ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور ج وہ میرے حملے سے اُچھل کر ریت پر جا گرا تو میں اُس پر آ وار کرنے کے لیے جھپٹا... مگر جونہی میں اُس کے قر پہنچا اُس نے دونوں ہاتھوں سے ریت کی مٹھیاں میر آنکھوں میں جھونک دیں۔

میں ایک لمحے کے لیے اندھا ہو گیا لیکن میری چھٹی ح نے مجھے فوراً پیچھے ہٹ جانے کا مشورہ دیا۔ اگر میں ال تو میرا کام تمام ہو جاتا کیوں کہ غوطار نے وہیں سے مجھ پ لگائی تھی مگر تب تک میں پیچھے ہٹ چکا تھا۔

وہ دوبارہ اپنی جھونک میں ریت پر جا گرا

میں اس دوران میں اپنی آنکھیں مَل کر دیکھنے کے ہو چکا تھا۔ وہ دوبارہ ریت پر جُھکا ہُوا تھا مگر اب میں کے اس حربے سے ہوشیار ہو چکا تھا۔ میں نے ایک اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تاکہ اُنھیں ریت سے بچا سکو دُوسرے ہی لمحے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے توپ کا گول سینے میں آ کر لگا ہو۔ میں بے تحاشا اُچھل کر پیٹھ کے بل

تب مجھے اپنے قریب لڑھکتے ہُوئے سر سے یہ اندازہ ہُوا کہ غوطار نے دُوسری مرتبہ ریت نہیں بلکہ وہ بریدہ سر دے مارا تھا جو قربان گاہ کے قریب زمین پر پڑا تھا۔ وہ تلوار سونت کر مجھ پر جھپٹ پڑا۔

اس سے پہلے کہ تلوار میری کھوپڑی کو پاش پاش کر دیتی۔ میں نے ڈھال کی آڑ لے کر لڑھکنی لگائی۔ آدھی ڈھال کے پرخچے اُڑ گئے مگر میری کھوپڑی بچ گئی۔ مجمع نے زور دار نعرے لگا ر غوطار کی ہمت بڑھائی۔ وہ پھر میری طرف جھپٹا اور دوسرا وار کیا۔ میں نے اُسے بھی اپنی شکستہ ڈھال پر روک لیا اور اس کے ساتھ ہی غوطار کے کندھے سے لٹکتی کمان پکڑ کر اُسے نی طرف کھینچا تو وہ میرے اُوپر آ رہا۔

مجمعے نے ایک بار پھر نعرہ لگایا۔ غوطار نے اپنا پورا وزن جھ پر ڈال کر بھرپُور طاقت سے مجھے دبانا چاہا تو میں نے کمان اچلّہ کھینچ کر چھوڑ دیا جو کوڑے کی طرح اس کے مُنہ پر لگا تو اس ی چیخ نکل گئی۔

وہ پیچھے ہٹا تو میں اُس کی گرفت سے نکل گیا اور لوٹ لگاتے ہُوئے اُٹھ کھڑا ہُوا لیکن اب میں اپنی تلوار اور ڈھال سے محروم ہو چکا تھا۔

غوطار بھی اُٹھا اور اپنی تلوار لیے میری طرف جھپٹا۔ مگر ل وقت تک میں قربان گاہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اور رے دائیں ہاتھ کی انگلیوں نے بڑی تلوار کا دستہ ٹٹول لیا ا۔ جونہی غوطار اپنی تلوار لہراتا میرے قریب آیا، میں نے بڑی وار کی ایک ہی ضرب سے اس کی گردن اُڑا دی۔

غوطار کا سر بریدہ جسم ایک لمحے کے لیے وہیں کھڑا رہا ھر دھم سے گر پڑا اور وہ مجمع جو ایک لمحے قبل پُر شور نعرے ا رہا تھا یُوں خاموش ہو گیا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

میں نے تلوار کی نوک زمین میں گاڑ دی اور اس کے ارے کھڑے ہو کر دم لینے لگا... میری سانسیں دھونکنی کی ح چلنے لگی تھیں... اچانک مجھے خیال آیا کہ گرانچو نے مقدس ار کو چھُونے سے منع کیا تھا لیکن اب تو میں اُسے چھُو ہی ں بلکہ اُس سے پشکانیوں کے بہت بڑے بہادر کو قتل بھی کر ا تھا۔

انہونی ہو چکی تھی... اب دیکھنا یہ تھا کہ مجھے اس جُرم کی سزا ملتی ہے۔ میں نے ایک نظر شہزادی راشی کی طرف دیکھا۔ وہ اہ فرندا کی طرف جُھکی اور اُس سے سرگوشی میں کچھ کہنے لگی۔ شاہ ندا نے گرانچو کو قریب آنے کا اشارہ کیا... پھر وہ تینوں کچھ دیر تک کانا پھُوسی کرتے رہے۔ اب تک میں بھی دم لے چکا تھا اور فیصلہ سُننے کا منتظر تھا۔

شہزادی راشی، شاہ فرندا اور گرانچو میری طرف بڑھنے لگے۔

مجمع دم بخود تھا۔

مجھے اُن لوگوں کے سانس لینے کی آواز تک صاف سُنائی دے رہی تھی۔ شاہ فرندا کا ہاتھ اپنی تلوار کے قبضے پر تھا اور وہ تینوں آہستہ آہستہ میرے قریب آ رہے تھے۔

سینکڑوں پشکانیوں کی آنکھیں ہم پر مرتکز تھیں۔

مجھ سے دس، بارہ قدم دُور شہزادی راشی اور گرانچو رُک گئے۔ صرف شاہ فرندا آگے بڑھتا رہا۔ اس کا ہاتھ اُسی طرح تلوار کے قبضے پر تھا... پھر وہ بھی مجھ سے تین قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ اُس نے تلوار نکالی، اُسے چُوما اور گھٹنوں کے بل میرے سامنے جُھک گیا۔ تب پہلے اُس نے مقدس تلوار سے لگا ہُوا خُون اپنی انگلی سے سمیٹ کر پیشانی پر لگایا پھر گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔

"اے ہرموجہ دیوتا... خمرشانیوں کی مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ تُو اُنھیں نجات دِلانے کے لیے آئے گا... مگر تُو ہم پشکانیوں کے پاس آیا ہے تاکہ ہمیں دوبارہ خمرشان اور اُس کی راجدھانی جبروت لے جائے جو ہمارا کھویا ہوا وطن اور ہماری میراث ہے۔ اے ہرموجہ، ہم تمھیں خوش آمدید کہتے ہیں اور تمھیں اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔ ہم تمھارے احکام کی تعمیل کریں گے۔ مجھے اپنی خوشنودی سے نواز، اے ہرموجہ دیوتا!"

یہ کہہ کر اُس نے سر جُھکا لیا اور بڑی ہلکی آواز میں جو صرف میں ہی سُن سکتا تھا، کہنے لگا: "میرے کندھے کو مقدس تلوار سے چھُو۔ میرے بعد راشی کو بھی تلوار سے چھُونا، پھر مقدس تلوار لے کر تیزی سے اُس کے ساتھ چلے جانا۔"

صُورتِ حال کے اچانک یُوں پلٹا کھانے پر میں نے دل ہی دل میں خُدا کا شکر ادا کیا... پھر تلوار سے شاہ فرندا کا شانہ چھُوا... وہ ہٹا تو شہزادی میرے سامنے آئی اور گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہُوئے بولی۔

"میری محبت قبول کر دیوتا اور مجھے اپنے پیار سے نواز دو۔"

میں نے اُس کے نرم و نازک شانے کو بھی تلوار سے چھُوا تو وہ اُسی طرح سر جُھکائے ہُوئے سرگوشی میں بولی: "وقت ضائع کیے بغیر میرے ساتھ چل دو۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھی، اُس نے اپنا

ایک ہاتھ میری طرف بڑھایا، میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ جاتے جاتے میں نے گرانجو کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ یوں اُترا ہُوا تھا جیسے وہ اس صورتِ حال سے ناخوش ہو۔

راشی میرا ہاتھ تھامے وحشی پشکانیوں کے درمیان سے یوں گزری جیسے کوئی فاتح، کسی مغلوب قوم کے درمیان سے سربلند اور سرخ رُو گزرتا ہے۔ وہ مجھے لے کر تخت کے عقب میں جا پہنچی۔ اُس کا مرتعش ہاتھ اُس کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔ جونہی ہم تنگ اور مڑے تڑے راستے میں داخل ہوئے جو چٹانیں کاٹ کر بنایا گیا تھا، وہ مجھ سے اور قریب ہو گئی۔

اچانک ایک چٹان کے پیچھے سے دو پشکانی سپاہی آ گئے۔

راشی نے اُنھیں ڈانٹ دیا اور وہ سر جھکا کر ہٹ گئے۔

اس تنگ راستے کے خاتمے پر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کمرہ بھی ایک چٹان کاٹ کر ہی بنایا گیا تھا۔ کمرے میں ایک جانب نرم گرم کھالوں کا بستر لگا ہُوا تھا، ایک دیوار کے ساتھ مشعل جل رہی تھی اور دوسری دیوار میں ایک کھونٹی کے ساتھ پانی کا مشکیزہ لٹک رہا تھا۔ میں اُسے اتارنے کے لیے بڑھا، تو راشی نے اپنے بازو پھیلا کر میرا راستہ روک دیا۔

"مجھے پیاس لگی ہے اور میں اپنا زخم بھی دھونا چاہتا ہوں۔"

"مجھے تم سے زیادہ پیاس لگی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اور جہاں تک تمھارے زخم کا تعلق ہے، میں اُس کی مرہم پٹی کروں گی۔ گرگوش میں راشی کا حکم چلتا ہے اور وہ اگر مگر یا انکار سننے کی عادی نہیں۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا، اور یہ بھی کہ جب ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہ ہو تو تمھاری حیثیت ہر موجہ دیوتا کی نہیں ہو گی۔ میں جو یہاں کی اصل حکمراں ہوں، جو چاہوں گی، تم وہی کرو گے۔"

مجھے اُس کی بات پر غصّہ تو بہت آیا مگر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا کہ یہ سرزمین ابھی میرے لیے اجنبی تھی اور میں اس کے حالات سے بھی ناواقف تھا۔

"میں تمھاری شکر گزار ہوں کہ تم نے میرے بھائی غوطار کو قتل کر دیا جو بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ تم بھی تھوڑے سے خواب دیکھ لو اس کے بعد میں تمھیں بھی اسی طرح کسی سے قتل کرا دوں گی مگر وہ وقت ابھی بہت دُور ہے۔"

میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ غوطار اس کا بھائی بھی ہو سکتا تھا۔

میں گرگوش میں تین روز رہا۔ اس دوران راشی نے مجھے اپنے کمرے سے باہر جانے کا بہت کم موقع دیا۔ جب کبھی مجھے باہر جانے کا موقع ملا، وہ میرے ساتھ ہوا کرتی تھی اور یہ موقع مجھے اُس وقت ہی ملتا تھا جب وہ پوری طرح مطمئن ہوتی۔ میں گھڑسواری کی فرمائش کرتا تو وہ ٹال نہ سکتی۔ تب میرے ساتھ وہ بھی گھڑسواری کے لیے اپنی کُ... سے نکل آتی تھی۔

گھڑسواری کے بہانے میرے دو مقصد تھے۔ ایک تو وہ جس کی خاطر ڈاکٹر فریدوں مجھے کسی سفر پر بھیجتا تھا اور دوسرا یہ کہ میں اس سرزمین اور لوگوں کے بارے میں حالات جان کر خود اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی منصوبہ بنا سکوں۔

ان تین دنوں میں میرے، راشی، شاہ فرزندا اور گرانجو کے درمیان متعدد بار مجلسِ مشاورت ہو چکی تھی اور مستقبل کے متعلق کئی منصوبے بھی سوچے اور بنائے گئے تھے۔ میں بہت جلد اس نتیجے پہنچ گیا تھا کہ اس مجلس کے شرکا میں سے ہر فرد دوسرے تین افراد کو ٹھکانے لگانے کی ترکیبیں بھی ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا ہے۔ گرانجو بے حد عیار اور مکار تھا، شاہ فرزندا بے انتہا ظالم آدمی تھا اور راشی... وہ اُن دونوں کا مجموعہ تھی اور مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ شاہ فرزندا اور گرانجو سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ ایک بار جب وہ عالمِ سرمستی میں تھی، اُس نے مجھ سے کہا: "میں چاہتی ہوں کہ خرشان پر قبضے کے بعد تم میرا ایک اور کام بھی کر دو۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"تم میرے لیے بلکہ ہم دونوں کی خاطر میرے باپ شاہ فرزندا کو بھی قتل کر دینا کیونکہ تخت پر بیک وقت تین افراد متمکن نہیں ہو سکتے۔"

"تین افراد!" میں نے تعجب سے کہا: "تمھارا مطلب صرف ایک ہی تخت نشین سے ہونا چاہیے راشی اور وہ تخت نشین تم ہو گی۔"

اس بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی۔ "تم طاقت ور ہی نہیں بے حد عقل مند بھی ہو، مردِ جری!"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس لیے میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم مجھے کس کے ہاتھوں قتل کروانا چاہو گی؟"

"ابھی میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے برملا کہا۔ "لیکن وقت آنے پر میں کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لوں گی۔"

یہ تھی نازک اندام مگر حسنِ وحشی کی مالک راشی کی سوچ۔

ادھر شاہ فرزندا مجھے اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔ پہلے تو اُس نے خود راشی کو تحفے کے طور پر یا میری مہمان داری کے لیے تنہائیوں کا شریک

تھا اور اب مجھ سے حسد کرنے اور بُری طرح جلنے لگا تھا اور گرانجو جسے شانی سائنس دانوں نے شیشے کے مرتبان سے جنم دیا تھا اور جس ادرجہ بندی میں وہ غلطی کر گئے تھے، ان باپ بیٹی سے زیادہ عیار تھا اور اسے جدید ٹیکنالوجی کی وہ سہولتیں بھی حاصل تھیں سے ہم تینوں محروم تھے۔ اس کے باوجود مجھے گرانجو کو بھی مات باتھی ورنہ ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر میری لاش تلاش کرنے میں ناکام بھی ہو سکتا تھا۔

میں نرم گرم بستر پر لیٹا ہُوا تھا۔ میں اور راشی ابھی ابھی باہر سے واپس آئے تھے اور کچھ تھکے ہوئے سے تھے۔ اس پہاڑی علاقے میں بارش بہت ہوتی تھی لیکن جب کبھی بادل نہ ہوتے تو مجھے آسمان اور سورج دکھائی دیتے تھے اور بہت دُور خرشان اور گرگوش کی سرحد پر ایک اونچی اور افق تا افق پھیلی ہوئی فصیل بھی نظر آتی تھی جس کے اُس پار ایک عجیب سی دھند چھائی رہتی تھی۔ کیوں اور کیسے؟ یہ غالباً خرشان کے سائنس دانوں کا کمال تھا جنھوں نے دُھند کی چادر تان کر موسم پر قابو پا رکھا تھا۔ میں انھی سوچوں میں ڈوبا ہُوا تھا کہ راشی بولی۔

"میرا خیال ہے، میں تمھیں کسی سے قتل نہیں کرواؤں گی۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت ظاہر کیے بغیر پوچھا۔

"اس لیے کہ تمھیں پا کر مجھے جتنی خوشی ملی ہے، اتنی خوش میں پہلے کبھی نہیں تھی۔ تم نے مجھے حقیقی محبت سے آشنا کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بات جاری رکھی۔ "میرا خیال ہے خرشان میں بھی تم جیسا کوئی دوسرا نہیں ہو گا اور وہ آدمی جو جبروت کے پنجروں میں بند ہیں، انھیں تو بقول گرانجو مردوں میں شمار کرنا ہی حماقت ہے۔ جبروت پر قابض ہوتے ہی میں پنجروں میں بند تمام آدمی قتل کرا دوں گی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بھی تو انھی میں سے ایک ہو اور جبروت کے پنجروں سے بھاگ آئے ہو، پھر گرانجو کیسے کہتا ہے کہ پنجروں

والے آدمیوں کو مردوں میں شمار کرنا حماقت ہے؟"

چونکہ میں جبروت کے پنجروں میں بند آدمیوں کے بارے میں تفصیل نہیں جانتا تھا۔ اس لیے میں نے کہا: "اُنھیں قتل نہ کروانا بلکہ اُنھی میں سے کسی کو میرے قتل پر مامور کر دینا۔"

"نہیں نہیں... میں تمھیں قتل نہیں کراؤں گی۔" وہ بولی: "اتنا مجھے معلوم ہے کہ خرشانی تم جیسے تنومند اور کشیدہ قامت نہیں ہوتے۔ اگر میں نے تمھیں قتل کروا دیا تو پھر میرے لیے کونسا ساتھی رہ جائے گا؟"

"گراپخو۔" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

راشی نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔

"وہ تو خواجہ سراؤں کا نیم مرد ہے۔ میرا ساتھی کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم نے ایک بار خود ہی تو بتایا تھا کہ وہ جب بھی یہاں آتا ہے اپنے ساتھ یہاں کی کوئی نا کتخدا لے جاتا ہے۔ اگر وہ خواجہ سرا ہوتا تو کسی کو کیوں لے جاتا؟"

"لیکن تمھیں دُوسری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔" راشی بپھرتے ہوئے بولی: "آیندہ میرے سامنے کسی اور کا ذکر مت کرنا۔"

"بکھو راشی۔" میں نے اسے تحمل سے سمجھایا: "میں یہ سب کچھ اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ ہم گراپخو کی عیاری کا جواب عیاری سے نہیں دے پائیں گے۔ وہ ہم سب سے زیادہ مکار اور چالاک ہے۔ میں یہ بات اس لیے جاننا چاہتا تھا کہ اگر پشکانی لڑکیاں اس کی کمزوری ہیں تو ہمیں اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔"

راشی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی: "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ جن لڑکیوں کو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، میں نے اُن سے پوچھا تھا۔ وہ بتاتی تھیں کہ گراپخو خواجہ سرا ہی ہے مگر وہ ذہنی طور پر مردوں جیسی باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔"

یہ سُن کر مجھے ایک لمحے کے لیے گراپخو پر رحم آ گیا۔ خرشان کے سائنس والوں کی کسی بھول چوک سے ایک خواجہ سرائی ہستی کو مرد کی سوچ اور ذہن مل گیا تھا اور اب وہ بے چارہ نہ اِدھر کا رہا تھا اور نہ ہی اُدھر کا... پھر اچانک میرے ذہن پر ایک انوکھی ترکیب آ گئی جسے میں نے سرگوشی میں راشی کے کان میں انڈیل دی۔

وہ ایک دم بھڑک اُٹھی۔

"نہیں... میں اس کی رفاقت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی!"

"ضد نہ کرو راشی۔ اگر تم اُس کی کمزوری بن گئیں تو وہ تمھارے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔"

میں نے یہ مشورہ اُسے اس لیے دیا تھا کہ میں خود بھی اُس کی کمزوری بنتا جا رہا تھا۔ اس لیے راشی مجھے اُس کے ہاتھوں کوئی ضرر نہ پہنچنے دیتی۔

میں نے بات جاری رکھی: "اور دیکھو۔ وہ نہ تو تم پر اعتماد کرتا ہے اور نہ ہی تمھارے باپ پر اور نہ مجھ پر... وہ ہمیں اپنے مقصد براری کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تو پھر کیوں نہ تم بھی اُسے مقصد براری کے لیے استعمال کریں؟"

"تم بھی گراپخو جیسی باتیں کرتے ہو۔" وہ بولی: "بہت سے لفظ بولتے ہو۔ بالکل اُسی طرح جیسے تیز ہوائیں دروں سے گزرتی چلی جاتی ہیں مگر اُن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ بہرکیف میں تمھاری بات ماننے کی پابند نہیں کیونکہ میں شہزادی بلکہ ملکہ ہوں... البتہ میں اس پر غور ضرور کروں گی۔ اب تم کوئی بات نہیں کرو گے۔ چونکہ کل صبح تمھیں گراپخو کے ساتھ واپس جانا ہے اس لیے ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں اپنی جگہ مطمئن تھا کہ اُس کے ذہن میں ایک ایسی ترکیب کا بیج بو دیا ہے جس سے گراپخو پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

* *

جب میں گراپخو کے ساتھ جنوبی صوبہ خراگ کے برج گرگوش واپس آیا تو تلوار ساتھ لیتا آیا تھا۔ شاہ فرونداتلوار نہیں دینا چاہتا تھا مگر گراپخو نے اُسے کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ آخر گراپخو مقدس تلوار میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ چنانچہ میرے استفسار پر اُس نے بتایا۔

"مقدس تلوار اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ سرزمینِ خرشان۔ جب خرشان کے مرد اپنے وطن سے نکالے گئے تھے تو وہ یہ تلوار اپنے ساتھ گرگوش لے آئے تھے۔"

"وہ اپنے وطن سے کیوں نکالے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"عورتوں نے اُن کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور اُنھیں مار مار کر گرگوش میں دھکیل دیا تھا۔"

"لیکن عورت اور مرد کا تو ہمیشہ کا رشتہ ہوتا ہے۔ مردوں کے بغیر تو اُن کی نسل ہی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔"

"اقتدار حاصل کرنے والی وہ عورتیں نادان نہیں تھیں۔ اُنھوں نے نسل کی بقا کے لیے کچھ آدمیوں کو قیدی بنا لیا تھا۔" گراپخو نے وضاحت کی: "شکست خوردہ آدمی گرگوش میں بس کر وحشی بن گئے مگر اُن کے ذہن سے یہ بات اب تک نہیں نکلی کہ بنیادی طور پر وہ خرشانی ہیں اور ایک نہ ایک روز اُنھیں دوبارہ خرشان پر قبضہ کرنا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جب تم خرشان کے دارالحکومت جبروت جاؤ تو مقدس تلوار تمھارے پاس ہونی چاہیے تاکہ وہ

دیکھ کر مرعوب ہو جائیں اور تمھیں ہر موجہ دیوتا تسلیم کریں۔"

میں یہ تو جانتا تھا کہ گراپخو بہت عیار ہے لیکن اب مجھے اس کی دُور رس منصوبہ بندی کا بھی قائل ہونا پڑا۔ میں نے پوچھا۔

"مجھے جبروت کب جانا ہو گا؟"

"بہت جلد۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم مجھ پر ایک چھوٹا سا احسان کر سکتے ہو، گراپخو؟"

"کیا؟" اس نے ستارہ دار پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

"جبروت جانے سے پہلے میں ایک بار ژدلے سے ملنا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر گراپخو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"شہزادی راشی کے بعد بھی تمھیں اس کنیز سے دلچسپی ہے۔ آخر اس میں ایسی کیا خوبی ہے؟"

"تم ان دونوں میں فرق محسوس نہیں کر سکتے گراپخو... راشی سراپا آتش ہے مگر ژدلے شعلہ و شبنم کا لطیف امتزاج ہے۔ راشی محبت کو خراج سمجھتی ہے جبکہ ژدلے کے حُسن میں نسائیت ہے۔ وہ محبت کو تحفہ سمجھتی ہے جو محبت کرنے والوں کو قدرت کی طرف سے خود بخود ہی مل جاتا ہے، اسے زبردستی حاصل نہیں کیا جاتا۔"

"میں دو عورتوں کے درمیان یہ فرق نہیں سمجھتا مگر ایک وقت آئے گا کہ مجھ پر بھی اس فرق کا ادراک ہو جائے گا۔ بہرکیف میں ژدلے کو تم سے ملنے کی اجازت دے دوں گا۔"

میں نے اپنے کمرے میں آنے کے بعد خوشبودار پانی سے غسل کیا اور نیا لباس پہن لیا۔ جب میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو پہلی بار مجھے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ میرے چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ پھر میں ژدلے کے انتظار میں مقدس تلوار کے دستے میں جڑے ہوئے ہیرے جواہرات دیکھنے لگا۔ خرشانیوں اور پشکانیوں کے لیے وہ آرائش، پتھر کے ٹکڑے تھے لیکن ہماری دُنیا میں اُن کی مالیت کروڑوں سے کم نہیں تھی۔ اگر راشی ہر وقت میرے سر پر سوار نہ رہتی تو میں گرگوش میں ارضیاتی تجزیہ ضرور کرتا۔

ابھی میں اُن ہیروں کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ گراپخو کے حیوان نما سپاہی اور خواجہ سرا، ژدلے کو لے کر آ گئے۔ وہ حسبِ معمول بے حد پُرکشش لگ رہی تھی۔

میں نے سپاہیوں اور خواجہ سراؤں کو بھیج دیا اور ژدلے کی طرف دیکھا جو اپنی آنکھوں میں پیار کے دیپ جگائے مجھے دیکھتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ گراپخو اسپائی اسکرین پر ہمیں دیکھ رہا ہو گا مگر مجھے اُس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ جب ہماری نظریں چار ہوئیں تو ژدلے نے عجیب سے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ یُوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی پیغام دینا چاہتی ہو یا مجھے کسی خطرے سے خبردار کر رہی ہو لیکن موقع و محل ایسا نہیں تھا کہ میں اُس سے کوئی سوال کر سکتا۔ ہماری کی گئی سرگوشی تک ریکارڈ ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو اچانک اس کے ہاتھ سے بٹن کے برابر کوئی چیز میرے ہاتھ میں منتقل ہو گئی...

میں نے چونکے بغیر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے پھر ناقابلِ فہم انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا لیکن میں اس سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پگھلنے لگا۔ میں نے لاشعوری گھبراہٹ کے تحت اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دُھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

میں حلق کے بل چیخ پڑا اور میری آواز دیر تک کمرے کی چار دیواری میں کسی بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح سر ٹکراتی رہی۔

میں حیران تھا کہ وہ معصوم چہرہ لڑکی یوں اچانک ہی دھواں بن کر فضا میں کیسے تحلیل ہو گئی لیکن جو لڑکی میرے پاس آئی تھی وہ سراپا ژدلے ہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ میرے ہاتھ میں وہ بٹن نما شے کیسے منتقل کرتی؛ بہرحال جو کچھ بھی ہوا اس میں نیم مرد گراپخو کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔

میں بے ساختہ چیخ اٹھا: "یہ کیا حرکت ہے گراپخو؟"

"تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں ہر موجہ دیوتا۔ تم نے تھوڑی دیر کے لیے ژدلے کو دیکھنے کو کہا تھا۔ میں نے تم کو دکھا دیا۔ بس اب جبروت جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں سپاہی بھیج رہا ہوں۔"

میں غصّے سے بل کھا کر رہ گیا۔ لیکن قہرِ درویش برجانِ درویش کے مصداق مجھے خاموش ہی رہنا پڑا۔ میں نے یہی سوچ کر صبر کر لیا کہ ژدلے جو بٹن نما چیز مجھے دینا چاہتی تھی، وہ دینے کی اُسے مہلت مل گئی تھی اور میرا خیال تھا کہ اس میں کوئی خفیہ پیغام پوشیدہ ہو گا مگر میں اُسے یہاں نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا میں نے اُسے کمر پر ہاتھ رکھنے کے بہانے پیٹی میں اُڑس لیا۔

میں خرشان کی راجدھانی جبروت میں کھڑا تھا۔ میں یہاں کیسے پہنچا، یہ تو مجھے معلوم نہیں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ گراپخو کے حیوان نما سپاہی مجھے اپنے نرغے میں لیے ہوئے ایک لیبارٹری نما کمرے میں لے گئے تھے اور گراپخو نے مجھے ایک چبوترے پر لیٹ جانے کو کہا تھا... پھر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میری رُوح پرواز کر رہی ہو اور میرا جسم پیچھے رہ گیا ہو... کچھ دیر بعد میں نے اپنی رُوح

دوبارہ اپنے جسم میں داخل ہوتے محسوس کی اور جب آنکھ کھلی تو میں جبروت پہنچ چکا تھا۔ ہو سکتا ہے، یہ سب کچھ میرا واہمہ ہی ہو لیکن نقلِ مکانی کا یہ عمل میری عقل و فہم سے بالاتر تھا۔

جبروت کا شہر ایک میدانی علاقے میں واقع تھا۔ اُس کی گلیاں اور سڑکیں وسیع و عریض اور بے حد صاف ستھری تھیں مگر یہاں بھی وہی کہر کا پردہ چھایا ہُوا تھا اور ہر طرف نیلم کی چاندنی پھیلی ہُوئی تھی۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ میں نے اس سلسلے میں گراپخو سے پُوچھا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ دُھند کا یہ دبیز پردہ نہ صرف موسم پر قابو پانے کے لیے تانا گیا ہے بلکہ یہ "پسدا" کی کاشت کے لیے بھی بے حد ضروری ہے جو خمر شان کی واحد قیمتی فصل ہے۔ اِسی فصل سے ہی ان کی تمام ضروریات پُوری ہوتی تھیں۔

میں ایک عمارت کی اوٹ سے باہر آیا تو دیکھا کہ سڑکوں اور گلیوں میں ویسے ہی حیوان نما کارندے اور خواجہ سرا آجا رہے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر مجھے اس لیے کوئی تعجب نہ ہُوا کہ اول تو میں اس قسم کی مخلوق برجِ گرگوش میں دیکھ چکا تھا، دُوسرے گراپخو نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ راجدھانی میں بیشتر کام یہی لوگ انجام دیتے ہیں۔ البتہ ابھی تک مجھے وہ صنف نظر نہیں آئی تھی جسے جبروت بلکہ پُورے خمر شان پر اقتدار حاصل تھا۔

میں چھپتا چھپاتا محل کی طرف بڑھنے لگا جو شہر کے مرکزی چوراہے پر واقع تھا... اور جب میں محل کے قریب پہنچا تو مجھے وہ صنف بھی نظر آگئی جسے دیکھنے کی مجھے کافی دنوں سے آرزو تھی... یہ صنف... صنفِ نازک تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بے حد خوبصورت عورتیں تھیں۔ گراپخو نے مجھے بتایا تھا کہ اُن عورتوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہے مگر ملک کا اقتدار انھی کے پاس ہے۔ وہ سب کی سب کشیدہ قامت تھیں، سب کے لباس یکساں تھے۔ سب جوان تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے سب ایک ہی جیسی خوشبو استعمال کرتی ہیں کیونکہ ہر طرف فضا میں ایک ہی خوشبو ہلکورے لے رہی تھی۔

گراپخو نے روانگی سے پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ خونی میلہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے وہاں پہنچوں اور یہ خونی میلہ پشکانیوں کے میلے سے یکسر مختلف ہوگا۔ شاید اسی لیے راجدھانی کا ہر فرد، کیا خواجہ سرا، کیا حیوان نما خدمت گار اور سپاہی اور کشیدہ قامت جوانیاں، سب کے سب ایک ہی سمت رواں دواں تھے۔

میں اب تک یہ احتیاط برت رہا تھا کہ کسی کی نگاہ میں نہ آؤں۔ مجھے یہی ہدایت دی گئی تھی جب سڑک پر آمد و رفت تقریباً ختم ہو گئی تو میں آگے بڑھا مگر اب بھی میں اپنے آپ کو درختوں اور پھولدار جھاڑیوں کی اوٹ میں رکھے ہُوئے تھا۔

محل کے بیرونی دروازے کے پاس مجھے شفاف زرغون کا بنا ہُوا ایک سو فٹ اُونچا مینار دکھائی دیا جس کے دائیں اور بائیں جانب دو نوشباب حسیناؤں کے مجسمے استادہ تھے۔ دونوں ہم شکل اور جڑواں دکھائی دیتی تھیں۔ بقول گراپخو وہ دونوں بہنیں تھیں۔ ایک کا نام اشنار تھا اور دُوسری کا شمورا... شمورا خمر شان کی حکمراں دیوی تھی اور اشنار مہاپجارن تھی۔

میں نے دیکھا کہ محل کے وسیع و عریض صحن میں ایک جانب حسین و جمیل عورتیں دُوسری طرف خواجہ سرا... اور حیوان نما خدمت گار ایک دائرے میں جمع تھے۔

یہ دراصل ایک اکھاڑا تھا جس میں گلابی رنگ کی شفاف ریت بچھی ہوئی تھی اور چاروں طرف روشنی کے وہی گولے تھرتھرا رہے تھے جو میں سُرنگ اور برجِ گرگوش میں بھی دیکھ چکا تھا۔ گراپخو نے مجھے بتایا تھا کہ ان گولوں کو لیزر کی شعاعوں کے ذریعے برقی رو پہنچائی جاتی ہے۔ یہ برقی رو جوہری توانائی کے ایک تالاب سے حاصل ہوتی ہے۔ میرا کام اس برقی تالاب کو تلاش کر کے برقی رو کا سلسلہ منقطع کر دینا تھا تاکہ راج دھانی کے سائنس داں نہ تو مقناطیسی پردے آویزاں کر سکیں اور نہ ہی سُرخ آندھی جنم دے سکیں جو اس شہر بلکہ ملک کے دفاع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگر توانائی کے تالاب سے برقی رَو کا سلسلہ بند ہو جائے تو پشکانی ایک ہی یلغار میں جبروت پر قبضہ کر سکتے تھے۔

اس اکھاڑے کے ارد گرد باہر کی جانب چبوتروں پر بہت سے مینار بنے ہُوئے تھے جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ میں ایک مینار کی اوٹ سے اکھاڑے کا نظارا کرنے لگا۔

اکھاڑہ پُوری طرح بھر چُکا تھا اور اب ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی اور اس کی جگہ مدھم آواز میں موسیقی سُنائی دینے لگی تھی۔

اکھاڑے کے وسط میں دو تخت رکھے ہُوئے تھے جن پر اشنار اور شمورا کو براجمان ہونا تھا مگر وہ ابھی نہیں آئی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد موسیقی دب گئی اور نفیریوں کی آواز آنے لگی۔

اس کے ساتھ ہی محل کی جانب سے اشنار اور شمورا یکساں شفاف ملبوسات میں آتی دکھائی دیں۔ انھیں کنیزوں کے ایک دستے نے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اور یہ کنیزیں ڈرولے کے قبیلے کی تھیں۔ اس لیے ہر کنیز مجھے ڈرولے کی یاد دلا رہی تھی۔

اشنار اور شمورا اکھاڑے کے وسط میں رُک گئیں۔

اُنھوں نے ایک دُوسرے کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنے اپنے تخت پر بیٹھ گئیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خمر شان کی حکمراں ملکہ شمورا کی نیم وا آنکھیں جھپکے بغیر خلا میں گھورے جا رہی تھیں اور وہ اس ہنگامے سے قطعی لاتعلق نظر آ رہی تھی جبکہ مہاپجارن کا ہر انگ متحرک دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے ہاتھ سر سے بلند کر کے تالی بجائی تو موسیقی کے ساتھ ساتھ نفیریاں بھی زور زور سے بجنے لگیں... پھر اُس نے دوبارہ ہاتھ بلند کیے تو پُرشور موسیقی مدھم پڑ گئی۔ اب اس نے باآوازِ بلند اعلان کیا۔ "خمر شان کے خونی میلے کا آغاز کیا جائے اور مُردِل کے پنجرے کھول دیے جائیں۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی حسینانِ جبروت کے حلقے میں ہلچل سی مچ گئی اور دبی دبی سرگوشیوں نے بھنبھناہٹ کی صورت اختیار کر لی... پھر کہیں سے پنجروں کے دروازے کھلنے کی آواز آئی...

چند لمحوں کے بعد دو دو کی قطار میں بیس مرد اکھاڑے میں داخل ہوئے۔ یہ مرد کیا تھے، مردوں کے نام پر تہمت تھے۔ کیونکہ اُن میں مجھے نہ تو مردانگی کی جھلک دکھائی دی اور نہ ہی تندرستی و توانائی کا احساس ہُوا۔ اُن میں سے کسی کا قد بھی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ سب کے سب لشکری لباس میں تھے اور اُنھوں نے تلواریں بھی اُٹھا رکھی تھیں، وہ

تلوانے کی دُھن پر اکھاڑے کے مرکز میں آنے اور دس دس
کی دو قطاریں بنا کر ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔
اشنار نے پھر تالی بجائی تو اُس کے اور شمورا کے درمیان
دُھوئیں کا ایک بگولا گردش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے جُھرجُھری
سی آ گئی۔

مَیں سمجھا کہ شاید وہ گرابغو کا تصویری پیکر ہو گا لیکن
جب دُھوئیں نے تصویری پیکر اختیار کیا تو پتہ چلا کہ وہ ایک خواجہ سرا
ہی ہے مگر وہ گرابغو سے بہت مختلف تھا۔

تب مجھے یاد آیا کہ گرابغو نے بتایا تھا، وہ راج دھانی میں
اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُسے خود نہ بُلایا
جائے... یا راجدھانی پر چھایا ہُوا مقناطیسی شامیانہ ہٹا نہ
دیا جائے۔

مَیں نے تخت کے سامنے نمودار ہونے والے خواجہ سرا کے
تصویری پیکر کی طرف غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ سبز آنکھوں والا
یہ خواجہ سرا گرابغو کی بہ نسبت کافی معمر ہے۔ اُس کے چہرے پر
جھریوں کا جال بچھا ہُوا ہے اور بھویں تک سفید ہو چکی ہیں۔

اُس نے اشنار اور شمورا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تو شمورا
نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اُسی طرح بے حس و حرکت
بیٹھی خلا میں گھورتی رہی۔

"تم اپنے فرائض سے بخوبی آگاہ ہو خواجہ سراؤں کے
شہنشاہ... اُن کی تعمیل کرو۔" اشنار نے کہا۔

خواجہ سرا نے ایک بار پھر سرِ تسلیم خم کیا اور مُردوں کی
طرف بڑھ گیا جو ایک دُوسرے کے سامنے شمشیر بدست کھڑے
تھے۔ خواجہ سرا نے اُن کے قد و قامت کے مطابق جوڑے
بنائے اور طبل پر چوٹ کا اشارہ کیا۔ اعلان ہوتے ہی مرد
ایک دُوسرے سے مصروفِ پیکار ہو گئے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر
رُومیوں کے پہلوان یاد آ گئے۔ چند ہی لمحوں میں دس مرد دُوسرے
دس مردوں کے ہاتھوں مر چکے تھے۔

اب خواجہ سرا نے وحشی خدّام کو اشارہ کیا، وہ آگے بڑھے
اور دس لاشیں اُٹھا کر چلے گئے۔ کچھ خادموں نے نئی ریت بچھائی۔
طبل پھر بجنے لگا، تلواریں پھر ایک دُوسرے سے ٹکرانے لگیں
اور چند ہی لمحوں بعد پانچ مرد اور ڈھیر ہو گئے۔

اشنار موت کا یہ خونیں کھیل دیکھ کر قہقہے لگاتی رہی
لیکن شمورا اسی طرح بے حس و حرکت خلا میں گھورتی رہی۔
مرد اس وقت تک ایک دُوسرے کا خون بہاتے رہے

جب تک کہ اُن میں سے اُنتیس لقمۂ اجل نہیں بن گئے۔ آخری
بچ رہنے والا بھی بُری طرح زخمی تھا۔

اشنار نے زخمی فاتح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے
مُردوں کے مرد... جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے اور جیسا کہ مَیں
کہتی ہُوں، تم زندہ رہو گے اور مردوں کے ہنروں کے محافظ
ہو گے۔ تمہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ ہماری کنیزوں میں سے
جو کنیز تمہیں پسند ہو، وہ تمہیں عطا کر دی جائے گی!"

یہی وہ وقت تھا، جب گرابغو کی ہدایت کے مُطابق مجھے
مداخلت کرنا تھی۔ مَیں نے مینار کی اوٹ سے نکل کر ایک نعرہ
لگایا تو سب کی نگاہیں میری طرف اُٹھ گئیں۔

مَیں نے مقدس تلوار لہراتے ہوئے کہا۔ "اب تمہیں کوئی
حکم دینے اور کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رہا اشنار!...
اب میرے حکم اور فیصلے کی تعمیل ہُوا کرے گی کہ مَیں ہرموجہ
ہُوں۔ وہ دیوتا جس کی آمد کا تم لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا، مَیں
آ گیا ہُوں اور اب ہر فرد کو میرے احکام بجا لانا ہوں گے۔"

اِس دوران سارا مجمع دم بخود تھا۔ بوڑھے خواجہ سرا نے
مجھے دیکھ کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے تھے۔ کچھ عورتیں،
خواجہ سرا اور خدّام گھٹنوں کے بل جُھک گئے تھے۔ مَیں مقدس
تلوار لہراتا ہُوا اشنار اور شمورا کے تخت کے قریب آ گیا۔

اشنار تخت پر کھڑی ہو گئی۔

"اگر تم واقعی دیوتا ہرموجہ ہو تو تمہیں کتاب میں کی گئی پیش
گوئی نبھانا پڑے گی۔" وہ بولی۔

مَیں گرابغو کے منصوبے کے اس حصے پر عمل کرنا نہیں چاہتا
تھا... مگر اس سے مفر کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ چنانچہ
مَیں مُردوں کے مرد اس واحد فاتح کی طرف پلٹا اور اس سے کہا "اپنے
دفاع کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

وہ بے چارا ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ پھر دو قدم
پیچھے ہٹا اور التجا آمیز نگاہوں سے اشنار کی جانب دیکھنے لگا۔
مَیں نے اشنار کو بولنے کا موقع دیئے بغیر اُسے حکم دیا "تلوار
اُٹھاؤ اپنی..."

مَیں اس غریب کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا اور اشنار کو
اشتعال دلا رہا تھا کہ خود ہی مجھے اس کی جاں بخشی کے لیے
کہہ دے... مگر وہ ایک لفظ نہ بولی۔

فاتح مرد نے اپنی تمام تر ہمت و قوت مجتمع کرتے
ہوئے تلوار اُٹھائی مگر پھر اسے پھینک کر گھٹنوں کے بل سرے

سامنے بیٹھتے ہوئے بولا: "میں کسی دیوتا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں ہرموجہ سے جان کی امان چاہتا ہوں۔ میری جان بخش دو دیوتا۔"

میں نے ایک نظر اشنار کی طرف دیکھا۔

"کیا دیوتا کو پیش گوئی پر عمل کرنے کے لیے مہاپجارن کے حکم کا انتظار ہے۔ اگر ایسا ہے تو..." وہ بولی...

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ میں نے اشتعال میں آکر اس بے چارے کا سر بھٹے کی طرح اُڑا دیا... پھر میں نے اشنار سے کہا: "ہرموجہ حکم دیا کرتا ہے، سُنا نہیں کرتا۔ میں یہاں خرشان کے مستقل تحفظ اور گرسے دشمنوں کے خطرے سے ہمیشہ کے لیے نجات دلانے آیا ہوں۔ اشنار! یہ بندوبست فوراً کیا جائے۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے تیز نگاہوں سے اشنار کی طرف دیکھا۔ وہ بلا کی حسین لیکن بے حد نازک اندام تھی۔ اس کی سیاہ گہری آنکھوں میں بے پناہ ذہانت کی چمک نمایاں تھی۔

اُس کے یاقوتی لبوں پر ایک سحر انگیز تبسم اُبھرا... اور وہ بولی: "تم ہرموجہ دیوتا ہو تو تمھارے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ گوما کے ساتھ جاؤ دیوتا! یہ تمھارے آرام کا خیال رکھے گا۔" اس نے بوڑھے خواجہ سرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: "میں کچھ دیر بعد دیوتا کے پاس آجاؤں گی۔"

میں بوڑھے خواجہ سرا گوما کی رہبری میں اکھاڑے سے محل کی طرف جانے لگا تو وہ لڑکیاں جنھیں حسن و شباب کے پیکر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، میرے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئیں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں سچ مچ کا دیوتا ہوں اور دیوتاؤں کو 'مدیدوں کی طرح' انسانی حسن کا نظارا نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے اُن کی طرف دیکھے بغیر بے نیازی کے انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

محل کے بائیں باغ سے گزر کر ہم ایک طویل راہداری میں داخل ہوگئے جس کا اختتام ایک وسیع و عریض ہال پر ہُوا۔ اس ہال کا طرزِ تعمیر قدیم و جدید کا خوبصورت امتزاج تھا۔ ہال کی دیواروں میں مغلیہ طرز کی محرابیں بنی ہوئی تھیں لیکن طویل دریچے فرانسیسی دریچوں سے ملتے جُلتے تھے۔ اس ہال میں بیسیوں خواجہ سرا مختلف اقسام کی مشینوں پر کام میں مصروف تھے۔ عمارت اور مشینوں میں خرشان کی واحد پیداوار ترغون کو استعمال کیا گیا تھا۔ وہاں کام کرنے والے ہر خواجہ سرا کا لباس یکساں تھا۔ کچھ خواجہ سرا سلیٹوں پر کچھ لکھنے میں... مصروف تھے۔ سب نے سر جھکا کر گوما کو یا مجھے تعظیم دی... مگر مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ بولے۔

گوما میری رہبری کرتا ہُوا مجھے دُوسرے ہال میں لے گیا۔ یہ ہال تعمیر کے اعتبار سے مختلف تھا۔ اس میں تین دیواریں تو دائرے کی صورت میں بنی ہوئی تھیں مگر چوتھی دیوار سیدھی تھی۔ اس دیوار پر بے شمار سُوئچ لگے ہوئے تھے۔ ہال کے درمیان میز نما مشین پر گوما جیسا ایک اور بوڑھا خواجہ سرا بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے پہلے گوما پھر مجھے دیکھا اور سر خم کر کے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ گوما نے دائیں دیوار کے پاس جا کر ایک بٹن دبایا تو نیلی گول دیوار میں ایک دروازہ کھُل گیا۔

گوما مجھے لیے ہوئے اس دروازے میں داخل ہوگیا۔

یہ ایک مربع کمرہ تھا اور اس میں ایسی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی ں سے میرے کان بخوبی آشنا تھے۔ یہ بھنبھناہٹ دراصل صدہا پیوٹرز کی تھی اور میں ایسی ہی آواز ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹرز چیمبر ں جاتے وقت کئی بار سُن چکا تھا۔

گوما نے ایک دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے کاؤچ کی طرف اشارہ رکے کہا: "یہاں تشریف رکھیے جناب۔ آپ کو قیام گاہ تک پہنچانے سے پہلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں کہ مہاپجارن اشنار ا مجھے یہی فرمان ہے۔"

میں نے اُسے جواب دینے کی بجائے اپنے لبادے سے ب ٹکڑا پھاڑا اور اُس سے تلوار پر لگا خون صاف کرنے لگا۔ یرا مقصد یہ تھا کہ وہ مقدس تلوار اچھی طرح پہچان لے۔ میرے ں عمل کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔

"آپ یہاں تشریف لانے سے پہلے گرگوش گئے ہوں گے ونکہ یہ مقدس تلوار وہاں وحشی پشکانیوں کے ناجائز قبضے میں ی۔" اس نے بڑے ادب سے کہا۔

"ہاں گوما..." میں نے خون آلود چیتھڑا پھینکتے ہوئے بڑی بے نیازی سے جواب دیا: "اس تلوار کے لیے مجھے عوطار کو قتل رنا پڑا جو پشکانیوں میں سب سے طاقتور اور بہادر تھا... مگر یہ ساری باتیں تو تم جانتے ہی ہو گے۔"

"نہیں جناب۔" وہ بولا: "مجھے اعتراف ہے کہ گرگوش کے معاملے میں ہماری معلومات اتنی نہیں ہیں جتنی کہ ہونی چاہییں۔ ہم میرا قیاس یہی تھا۔"

مجھے محسوس ہُوا جیسے بوڑھا خواجہ سرا مجھے باتوں میں لگا کر میرے متعلق اندازہ کرنا چاہتا ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ میں نے س کی گہری سبز آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا: "تم نے کہا ہے کہ مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہو... مگر میں تم سے بات وں کروں؟ میں ہرموجہ ہوں اور صرف ملکہ شمورا یا مہاپجارن اشنار سے بات کروں گا۔ وہ کہاں ہیں۔ اُنھیں فوراً میرے حضور آنا چاہیے۔ یسے تم کون اور کیا ہو؟"

بوڑھا گوما چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا: "آپ کے مد اور یہاں آمد نے بڑی عجیب صورتِ حال پیدا کر دی ہے وتا۔ میں آپ کو دیوتا کے لفظ سے اس لیے مخاطب کر رہا ہوں آپ نے اپنے آپ کو ہرموجہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے لانکہ میں اور اشنار اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہرموجہ دیوتا کا کوئی وجود نہیں اور سیدھے سادے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے یہ ڈھکوسلا بنایا گیا ہے تاکہ وہ کبھی سرتابی کی جرأت نہ کر سکیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ گرگوش سے خرشان میں کیسے داخل ہوگئے اور پھر مقناطیسی پردوں کو عبور کرتے ہوئے جبروت کیسے آپہنچے؟ میں آپ سے یہ سوال اس لیے کر رہا ہوں کہ اشنار ان کا جواب چاہتی ہے اور اس وقت وہ ہماری گفتگو سُن رہی ہے۔"

گوما کے اس انکشاف نے کہ ہرموجہ دیوتا محض ایک ڈھکوسلہ ہے، مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ میں نے چند لمحے اس صورتِ حال پر غور کیا، پھر گوما سے پُوچھا: "کیا یہ کمرہ اور یہ جگہ خفیہ کہلا سکتی ہے۔ کیا یہاں ہونے والی بات چیت یا نقل و حرکت جبروت کے باہر اسپائی اسکرین پر تو نہیں دیکھی سُنی جا سکتی؟"

"آپ کا اشارہ غالباً جنوبی صوبہ خراگ کے بُرجِ گرگوش کی طرف ہے، جناب! نہیں۔ ہماری گفتگو اور نقل و حرکت وہاں نہیں دیکھی سُنی جا سکتی۔ البتہ مہاپجارن اشنار سب کچھ دیکھ اور سُن رہی ہے۔ اس لیے آپ بلا جھجکے سب کچھ صاف صاف اور سچ سچ بتا دیں۔"

میں نے گوما کو اوّل تا آخر اپنی ساری رُوداد سُنا دی۔ اس دوران نہ تو وہ کچھ بولا اور نہ ہی اشنار نے کوئی دخل اندازی کی جو محل میں بیٹھی ہماری گفتگو سُن رہی تھی۔

آخر میں گوما بولا: "ہمارے سائنس داں بخوبی جانتے ہیں کہ کائنات میں ہماری دُنیا کے علاوہ بھی کئی اور سیارے ہیں۔ ہم نے بارہا اُن سیاروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ ہمارے ہاں صرف ایک ہی فصل ہوتی ہے جس کا نام بیدانہ ہے۔ ہم اپنی ساری ضروریات بیدانہ کی مختلف مصنوعات سے پوری کرتے ہیں مگر اُس کی کاشت کے لیے ایک خاص قسم کا موسم درکار ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے موسم پر قابو پا لیا ہے۔"

"مگر ہمارے سائنس داں ابھی موسم پر قابو نہیں پا سکے۔" میں نے اُسے بتایا: "تم یہ مت سمجھو کہ میں کسی اور سیارے سے یہاں آیا ہوں۔ میں اسی زمین کا باشندہ ہوں لیکن ہمارا تعلق مختلف زمانوں سے ہے۔ میں تم سے بہت پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"بہرحال سائنسی ارتقا میں وقت لگتا ہے سرفروش۔" وہ بولا: "میں تنہائی میں تمھیں اسی نام سے مخاطب کروں گا۔ مہاپجارن اشنار بھی تخلیے میں تمھیں سرفروش کہے گی لیکن لوگوں کے سامنے

تم ہر موجہ ہی بنے رہو گے۔"

"تم ہمیشہ اشنار کی بات کرتے ہو گوما جبکہ میں نے کتابوں میں شمورا کا ذکر بھی پڑھا ہے۔"

"کتابوں کے مطابق ہمارے مذہب میں دو جڑواں بہنیں اقتدار کی مالک ہوتی ہیں۔ ایک کو شمورا کا نام دیا جاتا ہے اور دوسری کو اشنار کہتے ہیں۔ شمورا حکمراں ملکہ ہوتی ہے اور اشنار مہا پجارن۔ اُسے موت کی دیوی بھی کہا جاتا ہے۔ سائنسی ارتقا کے باعث ہم مذہب ترک کر دیتے لیکن اقتدار پر قابض رہنے کے لیے مذہب ہماری ضرورت بن گیا ہے۔ ایک بات اور بھی سُن لو۔ یہاں اقتدار کی ساری ذمے داریاں اشنار پوری کرتی ہے۔ کیونکہ شمورا ذہنی طور پر ایک بچی ہے۔ اُس کی ذہنی نشوونما ویسی نہیں ہوئی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔"

"مجھے گرانجو کے بارے میں بھی بتاؤ گوما۔" میں نے اُسے کہا۔

"گزشتہ کچھ عرصے سے ہم گرانجو کی ذہنی استعداد کے بارے میں مشکوک تو ہو چکے تھے لیکن ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو سکا تھا کہ اُس کی استعداد چودھویں درجے سے زیادہ ہے۔ اب تم نے بتایا ہے تو ہمیں کس سلسلے میں بھی ضروری اقدام کرنا پڑے گا۔"

"چونکہ گرانجو لڑکیوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے شہزادی راشی سے کہا تھا کہ وہ اسے اپنے دام میں پھنسا کر ختم کر دے۔" میں نے گوما اور اشنار کو بتایا جو کہیں دُور بیٹھی سُن رہی تھی۔

"گرانجو کا خاتمہ ہمارے مفاد کے خلاف ہو گا ہمسر فردش۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہے اور پشکانیوں کو اکسا کر خمرشان میں لے آئے تاکہ ہم انھیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ ویسے گرانجو اتنا عیار ہے کہ اُسے کوئی عورت ختم نہیں کر سکتی۔"

گوما نے راشی کو نہیں دیکھا تھا اور وہ اُس کی تخریبی صلاحیتوں سے بھی آگاہ نہیں تھا اس لیے وہ ایسا کہہ رہا تھا۔

"تمھاری سوچ ٹھیک نہیں سرفروش۔ خود میری تخلیق کے عمل میں بھی کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی اور جوانی میں میں بھی گرانجو جیسا ہی تھا مگر یقین رکھو گرانجو کو کوئی عورت دھوکا نہیں دے سکتی۔" گوما نے کہا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گوما دلوں کا حال پڑھنا جانتا ہو۔ میں اُس سے یہ پوچھنے ہی والا تھا کہ کمرے میں اشنار کی آواز گونجنے لگی "تم نے بہت باتیں کر لیں گوما۔ اب باقی باتیں میں خود ہی ہر موجہ یا سرفروش سے کروں گی۔ اب اُسے اُس کی قیام گاہ پر لے جاؤ۔ جب یہ آرام کر لے تو اسے میرے پاس لے آنا۔"

گوما نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں اشنار نہیں۔ جب تک رسم پوری نہ ہو جائے تمھیں یا شمورا کو ہر موجہ سے نہیں ملنا چاہیے کیونکہ کتابوں میں یہی لکھا ہے۔ تم مانو یا نہ مانو مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ خمرشان پر زبردست خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اِس لیے مجھ پر اعتماد کرو مہا پجارن اور تھوڑا سا صبر کر لو۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر اشنار نے صرف ایک لفظ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ لیکن گوما کے چہرے کے تاثرات بتلاتے تھے کہ اشنار نے اُس کی تجویز رد کر دی ہے۔ وہ کچھ دیر چُپ چاپ کھڑا رہا، پھر بولا۔ "وہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ دراصل وہ تمھیں دیکھنے کے بعد اپنے دل پر قابو نہیں پا رہی جبکہ ہمیں اور بھی بہت سے مسائل کی طرف دیکھنا ہے۔"

گوما کی ان باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب اشنار ہماری گفتگو نہیں سُن رہی۔ گوما نے میری سوچ بھانپتے ہوئے کہا: "ہاں۔ وہ ہماری بات نہیں سُن رہی۔ مگر تم کیوں مضطرب ہو؟"

میں نے اُسے ٹالنے کے لیے جیبی سے وہ بٹن نما چیز نکال کر گوما کے ہاتھ پر رکھ دی جو ژڈولے نے مجھے دی تھی: "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے اب تک مجھے اِس کے متعلق کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ اشنار کو میرے اور ژڈولے کے تعلقات کا علم ہو۔ آخر یہ ہے کیا بلا؟"

"یہ ایک پیغام ہے۔" وہ اُس بٹن نما چیز کو محدب شیشے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ژڈولے کو میں نے ہی گرانجو کے پاس جاسوسی

کے لیے بھیجا تھا۔ اُس نے اُن تمام باتوں کی تصدیق کی ہے جو تم نے بتائی ہیں اِس لیے اب تم پر کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مجھے خوشی ہے کہ ژڈولے ابھی تک زندہ ہے۔"

"لیکن ژڈولے نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ سزا کے طور پر بُرجِ گرگوش بھیجی گئی ہے؟"

"ہاں... اُس نے سچ ہی بتایا تھا... مگر تم اُس کے لیے کیوں پریشان ہو رہے ہو؟"

"وہ تمھارے لیے جاسوسی کر رہی ہے گوما۔ تمھیں اُس کو مرنے سے بچانا چاہیے۔"

"میں نے اُس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا اور کرتا بھی کیسے؟ اُس نے گناہ کیا تھا جس کی سزا اُسے بہر صورت بھگتنا تھی اگر اُس نے جاسوسی کی ہے تو یہ اُس کا فرض تھا۔ اگر اُسے سزا کے طور پر وہاں نہ بھیجا جاتا تو گرانجو مشکوک ہو جاتا اور ہم حقیقتِ حال سے بے خبر رہتے... مگر تم اُس کی اتنی حمایت کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ وہ مجھے پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُسے موت کے مُنہ میں جانے سے بچا لیا جائے اور..." ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اُس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے ساتھ ساتھ کچھ سُننے کی کوشش بھی کرنے لگا... پھر اُس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ایک دروازہ کھول کر دُوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہُوا۔

یہ بے حد طویل کمرہ تھا جس میں لاتعداد کمپیوٹر چل رہے تھے۔

"یہ پُورے خمرشان کا مرکزی کنٹرول رُوم ہے۔ سارا کاروبارِ حکومت یہیں سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ آؤ میں تمھیں دکھاتا ہوں کہ اسے چلانے کے لیے برقی توانائی کہاں سے حاصل کی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر گوما میری رہنمائی کرنے لگا۔

کمپیوٹرز کی بھول بھلیوں میں ایک جگہ زمین دوز سیڑھیاں دکھائی دیں۔ گوما اور اُس کے پیچھے میں بھی نیچے اُتر گیا۔ گوما بولا۔ "ہر موجہ کی حیثیت سے آپ کو بلا تاخیر توانائی کا تالاب دیکھ لینا چاہیے کیونکہ وہ آپ ہی کا عطا کردہ ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارا کاروبارِ حیات چل رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اور مہا پجارن اشنار اسے دانش مندانہ طور پر استعمال کرتے رہیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکائیں تاکہ میں کوئی سوال نہ کروں۔

اب ہم ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے تھے جس کی چھت گنبد نما تھی۔ اس کے نیچے عین مرکز میں ایک گول تالاب بنا ہُوا تھا جس کے کنارے کنارے ایک چھوٹا سا جنگلا لگا ہُوا تھا۔ جنگلے کی جانب بڑھتے ہوئے اچانک میری نگاہ دُوسری دیوار کی طرف اُٹھ گئی اور میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

دیوار کے ساتھ ایک تخت پر اشنار آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی لیکن اب اُس کے بال سیاہ کی بجائے سُرخ دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کے یاقوتی ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بکھرا ہُوا تھا۔

گوما نے میری نگاہیں اُس پر مرتکز دیکھیں تو میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ اوّلین ملکہ اشنار ہے جسے مرے ہوئے لاکھوں شبرے گزر چکے ہیں لیکن جب تک خمرشان زندہ ہے، یہ مر کر بھی اسی طرح زندہ رہے گی اور جب تک یہ زندہ رہے گی، خمرشان بھی زندہ رہے گا... کتابوں میں یہی لکھا ہے۔"

"لیکن یہ مر کر کیسے زندہ ہے؟"

"کیونکہ اسے موت کے بعد توانائی کے تالاب کے پاس رکھ دیا گیا تھا اور توانائی کے تالاب کی تاثیر سے ہر شے اُسی حالت میں باقی رہتی ہے تاوقتیکہ توانائی کی لہریں منقطع نہ کر دی جائیں... اور خیال ہے کہ اگر توانائی کی لہریں منقطع کر دی جائیں تو بھی ملکہ اوّل اسی طرح زندہ رہے گی کیونکہ اس کی لاش لاکھوں شبروں سے اسی حالت میں منجمد ہو چکی ہے۔"

گوما کے اس انکشاف پر مجھے جھرجھری آ گئی۔

"آیے۔ میں آپ کو توانائی کا تالاب دکھا دُوں۔ دراصل پُورے خمرشان میں یہی وہ واحد جگہ ہے، جہاں نہ ہماری گفتگو باہر سُنی جا سکتی ہے اور نہ ہی ہم اسپائی اسکرین پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں صرف ہماری آنکھیں اور ہمارے کان ہی ایک دُوسرے کو دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔"

"یہاں کون کون آ سکتا ہے؟"

"اب تک صرف اشنار، شمورا اور میں یہاں آ سکتے تھے مگر تم چوتھے آدمی ہو جو یہاں آئے ہو۔ میں نے تمھیں توانائی کا تالاب دکھا کر خمرشان کی تقدیر تمھارے ہاتھوں میں دے دی ہے جیسا کہ گرانجو چاہتا تھا۔"

ہم جنگلے کے قریب آ گئے۔

یہ جنگلا تقریباً بارہ فٹ قطر والے تالاب کے گرد پھیلا ہُوا

تھا۔ اس تالاب کی سطح اتنی پُرسکون، صاف و شفاف تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے اسے چھیڑا نہ گیا ہو۔ میں نے تالاب میں جھانک کر گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو یوں محسوس ہُوا جیسے وہ اتھاہ ہو... لیکن ذرا گہرائی میں مجھے ایک بے حد چمک دار اینٹ رکھی دکھائی دے گئی۔

"وہ چمک دار چیز کیا ہے؟" میں نے گوما سے پُوچھا۔

"یہی چیز تو ساری توانائی کا سرچشمہ ہے جناب!" وہ بولا۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ اس سے توانائی کیسے حاصل کی جاتی ہے؟"

"میں سائنس داں نہیں بلکہ جنگجو ہوں گوما۔ یہ بتاؤ کہ اگر اسے کسی طرح چھیڑا جائے تو کیا ہوگا؟"

"معلوم نہیں مگر کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر اس چمک دار چیز کو کسی طرح حرکت میں لایا جائے تو سب سے پہلے چھیڑنے والا فنا ہو جائے گا، پھر توانائی ختم ہو جائے گی اور اگر توانائی ختم ہوگئی تو خرشان تباہ و برباد ہو جائے گا۔"

"اب تم خود ہی اندازہ کرو گوما کہ گرانچو کتنا عیار اور خطرناک ہے اگر میں اس کے کہنے پر عمل کرتا تو نہ صرف خود مر جاتا بلکہ خرشان بھی تباہ ہو جاتا۔"

"صرف اتنا ہی نہ ہوتا۔" گوما بولا۔ "اس کے بعد وہ پشکانیوں کو یہاں لے آتا تاکہ بچے کھچے خرشانی بھی اُن کے ہاتھوں تہ تیغ ہو جاتے۔"

میں نے یہ سُن کر نصف تلوار نیام سے باہر کھینچ لی اور گوما سے کہا۔ "میں یہ سب کچھ اب بھی کر سکتا ہُوں گوما۔"

"ہاں۔ آپ مجھے قتل کیے بغیر یہ تلوار پھینک کر اس چمک دار چیز کو لا سکتے ہیں اور میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کہ ہم خواجہ سرا لڑنا بھڑنا نہیں جانتے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آپ محض گرانچو کی خاطر مرنا پسند کریں گے۔"

میں نے ایک اور قہقہہ لگایا اور کہا۔ "تم گرانچو کی خاطر مرنے کی کہہ رہے ہو۔ مجھے سب سے زیادہ مسرّت اُس روز ہوگی جب میں گرانچو کو ختم کردوں گا... اور میرا خیال ہے کہ وہ وقت زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"وہ وقت جتنی جلدی آئے بہتر ہے لیکن ہمیں ہر قدم بڑی احتیاط سے اُٹھانا پڑے گا اور اس سے پہلے منصوبہ بندی کرنا پڑے گی جس میں اشنار بھی شریک ہوگی۔ دُوسرے یہ بھی یاد رکھو کہ ہم بار بار یہاں آ کر باتیں نہیں کر سکتے ورنہ اشنار مشکوک ہو جائے گی... اور ہاں! وہ تڑوے والی بات اُدھوری رہ گئی تھی۔ آخر چکّر کیا ہے؟"

"چکّر صرف اتنا ہے کہ میں اُسے چاہتا ہُوں اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے اختیارات سے کام لے کر اُسے بچا سکتے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اُسے یعنی ایک ایسی لڑکی کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہو جو اعلا عورتوں کی خدمت کے لیے پیدا ہُوئی تھی اور جسے مقررہ وقت پر ختم ہو جانا ہے۔ بہرصورت میں تمھاری خاطر کوشش کروں گا مگر اس وقت وہ برجِ گرگوش میں گرانچو کی قید میں ہے اور میں اس کی خاطر گرانچو کو ختم نہیں کرسکتا۔ دوسرے جب تک گرانچو، برجِ گرگوش میں ہے میں اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے ٹالنے کے لیے کوشش کرنے

کا کہہ دیا ہے مگر صحیح معنوں میں تم ژدلے کو بچانا نہیں چاہتے؟"

"نہیں سرفروش۔ اس وقت اسے بچانے کا موقع نہیں ہے لیکن موقع ملتے ہی میں تمھاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ اگر میں اس وقت ژدلے کو واپس بلاؤں تو گرائچو فوراً مشکوک ہو جائے گا کہ تم نے سب کچھ ہمیں بتا دیا ہے۔ میں گرائچو کے لیے توانائی کی ترسیل روک کر اُسے بے بس کر سکتا ہوں مگر اس طرح خود جبروت کا دفاع بھی ختم ہو جائے گا۔ تب گرائچو 'پشکانیوں' کو لے کر ہم پر حملہ کر دے گا۔ تم یہ ساری باتیں کیوں نہیں سمجھتے؟"

"میں سب سمجھتا ہوں گوما۔ تم ژدلے کو محض اشنار کے ڈر سے نہیں بچانا چاہتے کہ کہیں وہ تم سے ناراض نہ ہو جائے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بہت عقلمند ہو، سرفروش! حقیقت یہی ہے کہ میں اشنار کی خفگی مول نہیں لے سکتا۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کتنے اختیارات کی مالک ہے۔ شمورا تو برائے نام حکمراں ملکہ ہے ورنہ سب کچھ اشنار کے ہاتھوں میں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر میں اشنار کو نہ روکتا تو وہ اب تک اپنی بہن شمورا کو قتل کر کے ... کھلم کھلا حکمراں ملکہ بھی بن جاتی۔ وہ اب بھی شمورا کو ختم کیے بغیر نہیں رہے گی۔ اب ایک بات اور بھی سُن لو۔ جس جرم کی پاداش میں ژدلے کو سزا دی گئی ... 'اشنار خود بھی وہ جرم بار بار کر چکی ہے۔ وہ خفیہ طور پر مردوں کے حجرے سے کسی نہ کسی کو بلواتی رہتی ہے۔ وہ اگلی صبح اُس مرد کو کوئی ایسا زہر کھلا دیتی کہ وہ حجرے میں واپس جاتے ہی مر جاتا۔ میں اس کے اس جرم سے آگاہ ہوں مگر وہ اتنی دیدہ دلیر ہے کہ اُسے ذرا بھی پروا نہیں۔"

اب تک تو میں راشی ہی کو انتہائی سنگدل عورت سمجھتا رہا تھا مگر اب پتہ چلا کہ اشنار جیسی نرم و نازک لڑکی اُس سے کہیں زیادہ بے رحم اور پتھر دل ہے۔ وہ مقصد براری کے لیے نہ تو رشتوں کا کوئی خیال کرتی ہے اور نہ ہی مذہب کے تقدس کا احترام کرتی ہے۔ رسم و رواج تک کی پروا نہیں کرتی۔

"اب تم خود ہی سوچو سرفروش! اگر اشنار کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا کہ تم ژدلے میں دلچسپی رکھتے ہو تو یہ شک ہی ژدلے کی موت بن جائے گا۔ صرف اُس کی ہی نہیں، تمھاری اور میری موت بھی... مجھے نہ ژدلے کی پروا ہے اور نہ اپنی! میں اپنی عمر کے شبرے پورے کر چکا ہوں بلکہ ہر بار جب مجھے ختم کرنے کی باری آتی ہے تو اشنار میرے شبرے بڑھا دیتی ہے مگر میں تمھاری موت نہیں چاہتا کیونکہ مجھے تم سے بہت سی اُمیدیں ہیں۔ آؤ۔ اشنار تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہوگی... اور پھر تمھیں "رسم فتح و جبر" بھی ادا کرنی ہے۔"

●

جب رسم "فتح و جبر" کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو گوما مجھے اپنے ساتھ اکھاڑے میں لے آیا۔ اکھاڑہ ایک بار پھر پرستان بنا ہوا تھا۔ اعلانسب حسینائیں بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ وہاں موجود تھیں اور کنیزوں کی فوج بھی موجزن تھی۔ ہر زبان پر میرے چرچے اور ہر لب پر میرا نام تھا۔ اب تک جبروت کے ہر فرد کو پتہ چل چکا تھا کہ ہر موجہ جبروت، خمرشان اور اہلِ خمرشان کو بچانے کے لیے پہنچ گیا ہے اور اب رسم فتح و جبر انجام دی جانے والی ہے۔ جس میں یا تو ہر موجہ، شمورا اور اشنار سے اُن کی بھینٹ بالجبر وصول کرے گا یا اپنا سر اُن کی بھینٹ چڑھا دے گا۔

اس بار اکھاڑے میں حیوان نما سپاہیوں کے متعدد جتھے بھی جگہ جگہ متعین کر دیے گئے تھے۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ اعلانسب کی "گرسنہ خواتین" کہیں باغی ہو کر مجھ پر نہ ٹوٹ پڑیں۔

اکھاڑے میں لانے سے پہلے مجھے عرقِ گلاب سے غسل دیا گیا تھا۔ غسل کے وقت بھی خواجہ سراؤں کا ایک دستہ میری نگرانی پر مامور تھا۔ غسل کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا کپڑا ستر پوشی کے لیے دیا گیا کہ رسم کے مطابق میرے لیے یہی طے ہوا تھا۔ میں اکھاڑے میں اپنی تلوار ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر مجھے اُس کی اجازت نہ دی گئی۔ البتہ اتنی رعایت ضرور برتی گئی کہ مقدس تلوار میرا خادمِ خاص فرزیو سنبھالے رہے جو ایک نوعمر خواجہ سرا تھا۔

اکھاڑے میں آتے وقت بتایا گیا تھا کہ مجھے شمورا اور اشنار کا مقابلہ کرنا پڑے گا جن کے پاس تلواریں، سپر اور بھالے ہوں گے مگر میرے پاس ایک تنکا بھی نہیں ہو گا۔

میں نے گوما سے پوچھا "اس رسم میں دکھاوا کتنا ہو گا اور حقیقت کتنی؟ کیا شمورا اور اشنار سچ مچ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کریں گی؟"

"وہ یقیناً تمھیں مار ڈالنے کی بھرپور کوشش کریں گی۔" گوما نے جواب دیا۔ "اگر وہ ایسا نہیں کریں گی تو کتابوں کی پیش گوئی غلط ثابت ہو گی اور تمھیں کوئی بھی دیوتا تسلیم نہیں کرے گا۔ تمھیں اسی لیے نہتا رکھا گیا ہے کہ تم دیوتا ہو اور دیوتاؤں کو مقابلے کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں پڑتی ... البتہ تم شمورا اور اشنار کو "علامتی" طور پر قتل کرو گے۔ تمھیں یہ مقابلہ ہر حال میں جیتنا ہو گا، سرفروش! ورنہ تم مارے جاؤ گے اور اگر تم مارے گئے تو

خمرشان تباہ ہو جائے گا۔"

مجھے خمرشان سے زیادہ خود اپنی فکر تھی۔ میں یہ سوچ کر ابھی سے گھبراہٹ میں مبتلا ہو رہا تھا کہ ہزاروں عورتوں، وحشیوں اور خواجہ سراؤں کے سامنے دو عورتوں سے کیسے مقابلہ کروں گا اور اگر میں نے مقابلے میں اُن پر قابو پا بھی لیا تو انھیں "علامتی موت" کیسے ماروں گا۔ میرے لیے اس مقابلے کا ہر پہلو بڑا شرم ناک تھا مگر اس کے باوجود میں مقابلہ کرنے پر مجبور تھا۔

سوچنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ تاہم میں نے کچھ نفسیاتی داؤ پیچ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

گوما نے کہا تھا کہ اگر میں مقابلہ ہار گیا تو اشنار کے ہلکے سے اشارے پر حیوان نما سپاہیوں کے دستے مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور میرے پرخچے اُڑا دیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرنے سے پہلے میں بہت سے سپاہیوں کو مار ڈالوں گا مگر پھر بھی اپنی جان نہیں بچا سکوں گا۔ شاید اسی لیے اکھاڑے میں جگہ جگہ سپاہیوں کے دستے متعین کر دیے گئے تھے اور ابھی مزید دستے آ رہے تھے۔

اکھاڑے کے وسط میں ترغون سے بنے ہوئے دو شفاف ہیرے دار کمرے رکھ دیے گئے تھے۔ اُن کی لمبائی چوڑائی ایک ریلوے اپارٹمنٹ جتنی تھی۔ ایک کمرے میں دو مرصع کرسیوں پر شمورا اور اشنار بیٹھی تھیں اور دوسرا کمرہ خالی تھا۔ شمورا اور اشنار بھی میری طرح مختصر لباس میں تھیں۔ شمورا حسبِ معمول ساکت و صامت بیٹھی ... اپنے سامنے خلا میں گھورے جا رہی تھی جبکہ اشنار بے حد چاق و چوبند اور چوکنا نظر آتی تھی۔ گوما کا کہنا ٹھیک ہی تھا کہ اشنار کم عمر اور نرم و نازک ہونے کے باوجود اندر سے فولاد ہے۔ اُس کا ذہن بے حد سازشی ہے اور اُس پر ایک پل یا ایک لمحے کے لیے بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اُس کے کسی اقدام سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ کس شکل میں نمودار ہو گا۔ اکثر یوں معلوم ہوتا کہ وہ بازی ہارنے والی ہے مگر عین وقت پر پانسہ بیشتر اُسی کے حق میں پلٹ جاتا ہے۔ یہی وہ باتیں تھیں جنھوں نے مجھے نفسیاتی داؤ پیچ آزمانے پر اُکسایا تھا۔

میں جانتا تھا کہ جبروت کی اعلانسل حسینائیں ترسی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے میں نے انھیں اپنے قد و قامت سے مرعوب کرنا اور تندرست و توانا ہاتھ پیروں کی نمائش سے اُن کی گرسنہ نگاہوں کو تسکین پہنچانا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اکھاڑے میں آنے کے بعد میں ...ن سازوں کی طرح مختلف پوز بناتے ہوئے چاروں طرف گھوم گیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے شیریں لبوں سے بے اختیار ہلکی ہلکی سسکیاں نکل گئیں۔ بہت سے چہرے تمتما اُٹھے اور بے شمار آنکھوں میں جذبے انگڑائیاں لینے لگے۔ میں اُن کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ مجھے معلوم تھا کہ سیاہ داڑھی مونچھوں میں میرے سفید دانتوں کی قطار بھلی لگتی ہو گی۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر حسینانِ جبروت بھی مسکرانے لگیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مسحور ہو کر میرے پیچھے پیچھے چل پڑی ہیں۔ میں نے اُن کی طرف ہاتھ لہرایا تو جواب میں لاتعداد بازو شاخِ گل کی طرح لہرا گئے۔

میں کن انکھیوں سے اشنار کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ بُری طرح کھول رہی تھی۔ ان حرکات سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اشنار کے دل میں زیادہ سے زیادہ جذباتِ رقابت بیدار کر دوں تاکہ اُس کے دل میں میری تمنا بھڑک اُٹھے اور اگر وہ مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا بھی چکی ہو تو کم از کم وقتی طور پر اسے ملتوی کر دے۔ چنانچہ میں نے اُسے مزید تاؤ دلانے کے لیے حسینانِ جبروت کو سلام کیا اور پھر ایک قہقہہ لگایا تو وہ بھی بے اختیار ہنس پڑیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ حیوان نما وحشی سپاہی اور خواجہ سرا بھی یوں ستائشی انداز میں سر ہلانے لگے جیسے میں نے اُن پر تنویمی عمل کر دیا ہو۔

... اور ان ساری باتوں کا اشنار پر وہی ردِعمل ہوا جو میں چاہتا تھا لیکن شمورا اب بھی اُسی طرح ایک مرمریں مجسمے کی صورت ہر بات سے لاتعلق ساکت و صامت بیٹھی تھی۔ اتنے میں نہ جانے کہاں سے موسیقی کی مدھم آواز آنے لگی، جو بتدریج بلند ہوتی چلی گئی۔

میں قدم قدم اُس شفاف کمرے کی طرف بڑھنے لگا جس میں شمورا اور اشنار بیٹھی تھیں۔ دونوں کے ... ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ڈھالیں تھیں۔ بھالے فرش پر اُن کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ وہ دو کمرے نہیں بلکہ کمرہ تو ایک ہی ہے جس کا دوسرا حصہ، شمورا اور اشنار سے مقابلے اور انھیں 'علامتی موت' ملنے کے لیے خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔ جب میں کمرے کے مختصر سے زینے کے پاس پہنچ گیا تو ایک خواجہ سرا نے اُس کا دروازہ کھول دیا۔ اشنار اپنی کرسی سے اُٹھ کر آگے بڑھی اور بولی: "آؤ دیوتا آؤ۔ ہمیں علامتی موت مارو یا خود مر جاؤ!"

میں نے ایک نظر دونوں بہنوں پر ڈالی۔ اُن کے چہرے، اُن کے جسم، اُن کے نین نقش سب یکساں تھے۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ اشنار کے بال سیاہ لیکن شمورا کے بال ملکۂ اول کے بالوں کی

مرخ سُرخ تھے جسے مَیں نے تالابِ توانائی والے چیمبر میں دیکھا تھا۔

مَیں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو اشتار کمرے کے وسط میں تن کر کھڑی ہو گئی۔

مَیں نے دُوسرے زینے پر قدم رکھا تو اُس نے تلوار یُوں سونت لی جیسے ایک ہی وار میں میرا سر قلم کر دے گی۔

مَیں نے تیسری سیڑھی پر پاؤں رکھا تو اُس نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر مضبوطی سے قدم جما لیے اور ڈھال کو بھی اُس حالت میں لے آئی کہ حملے کی صُورت میں بچاؤ کے کام آ سکے۔

چوتھے زینے پر قدم رکھنا موت کی دہلیز پر قدم رکھنے کے برابر تھا۔

مَیں ایک لمحے کے لیے رُک گیا۔

اکھاڑے میں ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

مَیں اشتار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ وہ مجھ پر کیسے وار کرنا چاہتی ہے۔ اُس کے پھیلے ہُوئے بازُو سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دائیں سے بائیں تلوار چلائے گی اور اگر مَیں اپنے دائیں جانب ہٹا تو وہ اپنی ڈھال میرے چہرے پر مارے گی چنانچہ مَیں نے کمرے کے فرش پر قدم رکھنے سے پہلے ہی اپنے دفاع کی ترکیب سوچ لی۔

مَیں نے اچانک قدم بڑھایا اور یکدم جُھکائی دے کر اشتار کی تلوار کے نیچے سے اس کے پیچھے نکل گیا مگر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اشتار نے تلوار دائیں سے بائیں نہیں چلائی تھی بلکہ اُسے میرے دل میں گھونپنے کی کوشش کی تھی گویا ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اُس کا اقدام بظاہر کچھ نظر آتا ہے مگر وہ کرتی کچھ اور ہی ہے۔ یہاں بھی اُس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اگر مَیں سانپ کی طرح لہرا کر تلوار والے ہاتھ کے نیچے سے نہ نکل جاتا تو میرا کام تمام ہو چکا ہوتا۔ اتنے میں وہ بھی پلٹ گئی اور چلّائی: "اُٹھو شمورا... حملہ کر دو!"

... لیکن شمورا خاموش بیٹھی رہی۔

اشتار ایک بار پھر زور سے چلّائی: "شمورا... اُٹھو۔ اسے قتل کر دو۔ یہ تم سے تمھاری ذات کی بھینٹ لینا چاہتا ہے!"

شمورا یُوں چونکی جیسے نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ وہ تلوار اور ڈھال لیے ہُوئے ایک دم اُٹھی مگر مجھے ایسا لگا جیسے وہ نشے میں ہو۔ اس لیے کہ اُس کی نگاہیں پھر ایک جگہ مرتکز ہو کر رہ گئی تھیں۔

اب شمورا میرے آگے تلوار سونتے کھڑی تھی اور اشتار پیچھے سے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک شمورا نے تلوار سر سے بلند کی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مَیں نے جُھکائی دی اور چشم زدن میں اُس کے پیچھے آ کر ایک بازو اُس کی کمر میں ڈال دیا اور دُوسرے ہاتھ سے کلائی مروڑ کر اُس سے تلوار چھین لی۔ شمورا تو بیلے کی ڈال جیسی نازک لڑکی تھی مجھے اُس کو نہتا کرنے میں بمشکل آدھا منٹ لگا ہو گا۔ مَیں نے اُس کی تلوار اور ڈھال دُوسری طرف پھینک دی اور ایک نظر اشتار پر ڈالی جو کسی چیتے کی طرح دبے پاؤں میرے عقب میں بڑھ رہی تھی۔ مَیں شمورا کو ڈھال بنائے پلٹ گیا۔

"جلدی کرو ہرموجہ۔ اسے علامتی موت مار دو۔ یہ مدافعت کے قابل نہیں ہے!" اشتار نے تیز سرگوشی کی۔

اشتار کی اس بات پر مجھے گُوما کی باتیں یاد آ گئیں۔ مَیں سمجھ گیا کہ اقتدار کی خاطر اشتار نے شمورا کو منشیات کا عادی بنا دیا ہے۔ اس لیے وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہتی ہے اور سارا کارِ دبارِ حکومت اشتار انجام دیتی ہے۔

"تم چاہتی ہو کہ مجھے شمورا کی طرف متوجہ کر کے عقب سے حملہ کر دو!"

"تم کیسے دیوتا ہو کہ مجھ سے ڈر رہے ہو!" اُس نے طنز کیا: "مَیں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ مجھے تمھاری ضرورت ہے!"

شمورا اب میرے بازُو کے حلقے میں جھُول رہی تھی۔ مَیں نے اُسے فرش پر گرا دیا لیکن ابھی مَیں اُسے لٹا کر اُٹھا بھی نہیں تھا کہ اشتار نے اُچھل کر مجھ پر تلوار سے ضرب لگائی۔ اگر مَیں دو سیکنڈ پہلے نہ ہٹ جاتا تو تلوار شمورا کی بجائے میری گردن پر پڑ چکی ہوتی۔

شمورا تلوار کی ضرب سے چیخی تو اشتار اُس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ مَیں نے فوراً جھپٹ کر تلوار والی کلائی پکڑ لی مگر وہ بے حد پھُرتیلی ثابت ہُوئی۔ اُس نے بائیں ہاتھ میں پکڑی ہُوئی ڈھال پھینک کر تلوار اُس میں منتقل کر لی اور مَیں اُس کی کلائی چھوڑنے پر مجبُور ہو گیا۔ جُونہی مَیں تلوار کی زد سے نکلا، اُس نے لپک کر بھالا اُٹھا لیا۔

اب اُس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں بھالا تھا۔ مَیں نے شفاف کمرے سے باہر دیکھا۔ حیوان نما سپاہی جوش و خروش سے اُچھل رہے تھے جبکہ بہت سے

خواجہ سراؤں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور املانسل کی خواتین دم بخود ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔

اشتار گرائخو سے بھی کہیں زیادہ عیار اور خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس پر کیسے قابُو پاؤں۔ مقابلے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مجھے نہ تو اُسے زخمی کرنا ہے اور نہ ہی کوئی ہتھیار استعمال کر سکتا ہوں۔

اشتار کبھی مجھ پر بھالا تولتی اور کبھی تلوار... وہ کسی بھی لمحے مجھ پر بھالا پھینک سکتی تھی۔ اس لیے مَیں بار بار جگہ بدلنے پر مجبُور تھا۔ اُدھر وہ بھالے اور تلوار کی زد پر مجھے ایک کونے میں گھیر رہی تھی۔ بالآخر مَیں ایک کونے میں گھِر ہی گیا۔ اشتار کے ہونٹوں پر بڑی ہی سفاک مسکراہٹ اُتر آئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور مشّاق نیزے بازوں کی طرح بھالا تول کر مجھ پر پھینکی۔

مَیں بجلی کی سی سُرعت سے ایک طرف ہٹا۔ بھالا کیبن کی شفاف دیوار سے ٹکرایا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر دُوسرا وار کرتی، مَیں نے بھالا پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تو وہ مجھ پر آ گری۔ مَیں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی کلائیاں پکڑ لیں۔ اب وہ وار کرنے سے قاصر تھی مگر اُس نے اپنے دانت میرے ایک بازُو میں گاڑ دیے۔

مَیں دَرد کی شدت سے بلبلا اُٹھا لیکن مَیں نے اُس کی کلائیاں اُس وقت تک آزاد نہ کیں جب تک کہ دونوں ہتھیار اُس کے ہاتھوں سے فرش پر نہیں گر گئے... پھر مَیں نے اپنا ایک ہاتھ اُس کے بالوں میں ڈال کر جھٹکا دیا تو وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گئی۔

مَیں نے اشتار پر بھی قابُو پا لیا تھا۔ اب وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مَیں نے کمرے کی شفاف دیوار سے باہر دیکھا۔

تماشائی اُچھل اُچھل کر نعرے لگا رہے تھے مگر اُن کی آواز اندر نہیں آ رہی تھی۔ تاہم اُن کے اُچھلنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ میری جیت پر خوش ہیں۔ اُنھوں نے مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر سر خم کرنے شروع کیے تو مَیں سمجھ گیا کہ اُنھوں نے مجھے ہرموجہ تسلیم کر لیا ہے۔

جہاں ایک جانب مجھے اس وحشی بلّی پر قابو پانے کی خوشی تھی، وہاں مجھے اُس کی عیاری اور مجھے قتل کرنے کی سازش پر بے حد غصّہ بھی آ رہا تھا۔ مَیں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ مَیں اُسے "علامتی موت" مارتے ہُوئے اپنا غصّہ اُتاروں گا اور مَیں نے ایسا ہی کیا۔ اس دوران وہ چیخ چیخ کر روتی اور منت سماجت کرتی رہی لیکن مَیں نے اُس کی ایک نہ سُنی۔

اب مَیں شمورا کی طرف متوجہ ہُوا تو یہ دیکھ کر میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹی رہ گئیں کہ وہ مر چکی تھی۔

●

اس رسمِ فتح و جبر کے تقریباً ایک ماہ بعد تک جبروت میں جشن منایا جاتا رہا۔ شمورا کو اگرچہ اشتار نے زہر یا منشیات کی زیادہ مقدار کھلا کر مار دیا تھا لیکن لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ وہ میرے حقیقی ہرموجہ ثابت ہونے کی خوشی برداشت نہ کر سکی اور ہلاک ہو گئی۔

اب مَیں اور اشتار، جبروت اور خمرشان کے حکمران تھے۔ اہلِ خمرشان کو اُن کا موعود دیوتا مل چُکا تھا۔ مجھے املانسل کی اُن خواتین سے متعارف کرایا گیا جن کے ہاتھوں میں ملک کا اقتدار تھا لیکن جو میرے اور اشتار کے زیرِ نگیں تھیں، وہ سب ایک ایک کر کے میرے سامنے لائی گئیں۔ مَیں نے بظاہر اُن پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ مَیں اشتار کو جذبۂ رقابت میں مُبتلا کر کے اپنے لیے کوئی نئی مُصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مَیں اُنھیں گِنتا ضرور رہا تھا۔ اُن کی تعداد نو سو ننانوے تھی۔ ہر خاتون حُسن میں یکتا اور کشیدہ قامت تھی۔ اس لیے کہ پیدائش کے بعد ہر لڑکی کو بڑی سختی سے جانچا اور پرکھا جاتا تھا۔ جو لڑکی کسی بِنا پر حُسن کے معیار پر پُوری نہ اُترتی تو اُسے اُسی وقت ہی ختم کر دیا جاتا تھا۔ اُن کی تعداد پر بھی قابو رکھا جاتا تھا جو ہمیشہ ایک ہزار سے ایک کم ہی رہتی تھی۔ مجھے اُن خواتین کی عمر کا بھی کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت اُن کے چہروں اور جسموں پر اپنے نقوش چھوڑنے میں ناکام رہتا ہے یا اُس کے نقوش ثبت ہونے سے پہلے ہی اُن کے شبروں کی تعداد پُوری ہو جاتی ہے۔

مَیں نے اُن پنجروں کا بھی معائنہ کیا جن میں خمرشان کے اعلا مرد قید رکھے جاتے تھے تاکہ میلۂ خوُن کی قربانی کے لیے اُنھیں کام میں لایا جا سکے۔ اُن کی پرورش اور نگہداشت کے سارے فرائض خواجہ سرا انجام دیتے تھے۔ مَیں نے سوچا کہ جب مَیں حقیقی معنوں میں خمرشان کا حکمران بن جاؤں گا تو موجُودہ نظام یکسر بدل ڈالوں گا۔ فی الوقت مَیں وہاں کے حالات اور دُوسری باتوں کی کھوج میں لگا ہُوا تھا تاکہ وقت آنے پر مناسب اقدام کر سکوں۔ میری آمد سے پہلے یہاں ایک مخصوص

قسم کی بادشاہت قائم تھی۔ سارے امورِ سلطنت خواجہ سرا انجام دیتے تھے جن کا سربراہ گوما تھا جو خواجہ سراؤں کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ گوما صرف شورا اور اشنار کو جواب دہ تھا۔

خرشان کے چھ صُوبے تھے۔ ہر صُوبے پر ایک ایک خواجہ سرا گورنر کی حیثیت سے متعین تھا جب تک ان صُوبوں سے پے دا کی پیداوار آتی رہتی تھی اور حیوان نما انسان بغاوت نہیں کرتے تھے۔ ان خواجہ سراؤں سے کوئی بازپُرس نہیں کی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گرانجو جیسے اقتدار کے لالچی مرکزی حکومت کے خلاف سازش کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

کنیزوں کے علاوہ کچھ لونڈیاں ایسی بھی تھیں جن سے افزائشِ نسل کا کام لیا جاتا تھا۔ مَیں نے جبروت میں بچّہ گھر بھی دیکھے۔ یہاں ان لونڈیوں کو رکھا جاتا تھا جو اُمیدسے ہوتی تھیں اور سو لڑکوں میں سے بمشکل ایک یا دو زندہ رکھے جاتے تھے تاکہ جب وہ میلۂ خُون۔ کے مرحلے سے گزر جائیں تو اُن سے مزید افزائشِ نسل کا کام لیا جاسکے۔ اسی طرح کچھ لڑکیاں زندہ رکھی اور پروان چڑھائی جاتی تھیں جو جوان ہوں یا بڑی ہوکر کنیزوں اور لونڈیوں کے فرائض انجام دے سکیں۔ خواجہ سراؤں کی نسل کشی نہیں کی جاتی تھی بلکہ انھیں سائنسی عمل کے ذریعے بوتلوں میں جنم دیا جاتا تھا اور اُن کی درجہ بندی کی جاتی تھی۔ وہ انسانی بچّوں کی بہ نسبت بہت تیزی سے پروان چڑھتے تھے اور اُنھیں مقررہ شہرے عطا کر دیے جاتے تھے۔ شہرے وہاں کے ماہ و سال کا نام تھا۔

حیوان نما غلام اور سپاہی ابھی انسانی ارتقا کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اُن کی افزائشِ نسل قدرتی طریقے پر تذکیر و تانیث کے ملاپ سے ہوتی تھی۔ محنت، مزدوری، کاشت کاری اور تمام گھٹیا خدمات انھی لوگوں سے لی جاتی تھیں۔ ان کی زبان بھی خرشانیوں سے مختلف تھی اور یہ اپنے مالکوں کے بے حد وفادار تھے۔

میرے اور گوما کے درمیان گرانجو کے متعلق اکثر بات چیت ہُوا کرتی تھی۔ گوما نے جنوبی صُوبہ خراگ کو، جہاں برج گرگوش واقع تھا، توانائی کی ترسیل کم کر دی تھی تاکہ گرانجو کھُل کر سامنے آئے مگر گرانجو توانائی کی کمی پر خاموش رہا تو گوما نے موسم کو متاثر کرنے والے مقناطیسی پردے کی استعداد بھی گھٹا دی لیکن گرانجو کی طرف سے کوئی احتجاج ہوا اور نہ ہی یہ اطلاع ملی کہ وہ پشکانیوں کے ساتھ حملے کی سازش کر رہا ہے یا نہیں۔

ایک رات جب مَیں، اشنار کے ساتھ تھا اور وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی تو مَیں نے خواب گاہ کے ایک کونے میں گرانجو کا تصویری پیکر نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ خلافِ معمول وردی میں تھا اور اُس نے ہلکے پھُلکے ہتھیار بھی جسم پر سجا رکھے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکرایا مگر مَیں خاموش رہا۔ وہ آگے بڑھا اور اشنار کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہُوئے بولا: "مَیں اسے آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ یہ واقعی بے حد خوبصُورت ہے۔ تم نے اسے کیسا پایا؟"

"ٹھیک ہے۔" مَیں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں بہت خوش ہو۔ ایسا ہونا بھی چاہیے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے میرے منصُوبے پر عمل کیوں نہیں کیا؟"

"کیا تم واقعی یہ سمجھتے تھے کہ مَیں تمھارے منصُوبے پر عمل کروں گا؟"

"نہیں۔ مَیں جانتا تھا تم اتنے بے وقوف نہیں کہ میرے منصُوبے کے مطابق توانائی کا مخزج برباد کرکے خود بھی تباہ ہوجاؤ۔ اگر مَیں تمھیں اتنا احمق سمجھتا تو کبھی تم سے کام نہ لیتا۔"

"پھر تم نے مجھے توانائی کا مخزج تباہ کرنے کے لیے کیوں کہا تھا؟"

"مَیں تمھارا امتحان لینا چاہتا تھا۔" گرانجو سر کھُجاتے ہُوئے بولا۔ "تم ہمارے لیے ایک اجنبی سرزمین کے اجنبی باشندے تھے۔ مَیں نہیں جانتا تھا کہ تم احمق ہو یا دانش مند۔"

"اب تو تم جان گئے ہو کہ مَیں احمق نہیں ہُوں۔ مَیں ہر موجہ ہُوں اور اشنار کے ساتھ یہاں کا حکمراں ہُوں۔"

"مَیں خود بھی یہی چاہتا تھا، میرے دوست۔" گرانجو نے مسکرا کر کہا۔ "دراصل، مَیں نے دو منصُوبے بنائے تھے۔ پہلا یہ کہ اگر تم اتنے احمق ثابت ہُوئے کہ تم نے توانائی کا مخزج تباہ کر دیا اور خود بھی تباہ ہوگئے تو پشکانی، خرشان پر یلغار کر دیں گے... لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میرا یہ منصُوبہ اچھا نہیں تھا۔ اس طرح مَیں خرشان پر تو قابض ہو جاتا لیکن توانائی سے محروم ہی رہتا اور اسے دوبارہ پیدا کرنے کے لیے بہت عرصہ لگ جاتا جبکہ پشکانیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے مجھے توانائی کی ضرورت ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ کیسے وحشی لوگ ہیں۔"

"ہاں۔ راشی کیسی ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"اچھی ہے۔" وہ مسکراتے ہُوئے بولا۔ "مگر اب وہ کچھ بدل گئی ہے۔ پہلے وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی اور میری توہین کرنے سے باز نہیں آتی تھی لیکن آج کل وہ مجھے پسند کرنے

لگی ہے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ مَیں بھی اُسے پسند کرتا ہُوں کیونکہ وہ منفرد شخصیت کی مالک ہے۔"

"لیکن تم تو ایک خواجہ سرا ہو گرانجو۔ پھر تمھیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے، مَیں خواجہ سرا نہ رہوں۔ کم از کم راشی کا تو یہی خیال ہے اور یہ بھی مت بھولو کہ سائنس کے سارے معجزے صرف جبروت ہی میں نہیں ہوتے۔ وہ کہیں اور بھی رُونما ہو سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" مَیں نے چونک کر پوچھا۔

"ہزارہا شہرے پہلے جب خرشان میں یہ سائنسی نظام رائج نہیں ہُوا تھا، یہاں ایک چیز بیماری کے نام سے مشہور تھی۔ لوگ اس میں مُبتلا ہوکر مر جاتے تھے مگر اہلِ خرشان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کا علاج کرتے اور حکیم یا جرّاح کہلاتے تھے۔ جب سائنسی نظام عروج پر آنے لگا تو اہلِ خرشان کو ان لوگوں کی ضرورت نہ رہی چنانچہ وہ ملک سے باہر یا دُور دراز حصّوں میں چلے گئے۔ مجھے ایک ایسے ہی حکیم یا جرّاح کی تلاش تھی۔ آخر مجھے پتہ چل گیا کہ مغربی صُوبے میں ایک ایسا حکیم و جرّاح اب تک زندہ ہے۔ مَیں نے اپنے وحشی سپاہی وہاں بھیج کر اُسے بُلوا لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَیں ذہنی طور پر تو مرد ہُوں لیکن ایک خاص عمل جسے وہ آپریشن کا نام دیتا ہے، اس کے بعد مَیں جسمانی طور پر تم جیسا بن سکتا ہوں۔ تمھارا کیا خیال ہے سرفروش، کیا ایسا ممکن ہے؟"

"تمھاری خواہشات روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں گرانجو۔ پہلے تم خرشان کے حکمراں بننا چاہتے تھے۔ اب تم مرد بھی بننا چاہتے ہو۔ مَیں تمھیں صرف یہ مشورہ دے سکتا ہُوں کہ ہر معاملے میں ہوشیار رہو اور سوچ سمجھ کر قدم اُٹھاؤ۔"

"مَیں جانتا تھا کہ تم یہی کہو گے۔" وہ بولا۔ "تم اس وقت سے بہت بدل گئے ہو سرفروش جب مَیں نے بردنگا کو تباہ کرکے تمھیں حراست میں لیا تھا۔ تمھارے دل میں میرے خلاف نفرت کا لاوا اُبل رہا ہے۔ اسی لیے تم میرے منصُوبے میں میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔"

مجھے ایک بار پھر محسُوس ہُوا جیسے گرانجو نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ مَیں نے کہا: "ہو سکتا ہے، تمھارا خیال ٹھیک ہو لیکن اب مجھے تمھاری ضرورت نہیں رہی۔ سب نے مجھے ہر موجہ کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ مجھے اشنار مل گئی ہے اور مَیں یہاں کا حکمراں بن چکا ہُوں۔ تم مجھے کیا دے سکتے ہو؟ مجھے سب کچھ حاصل ہو چکا ہے۔ تمھارے لیے یہی کیا کم ہے کہ مَیں نے تمھارے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا اور تمھیں جنوبی صوبۂ خراگ کا گورنر رہنے دیا ہے۔ اب تمھیں پشکانیوں کے ساتھ مل کر سازش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب مَیں اپنی تیاریاں مکمل کر لوں گا تو خود ہی اُنھیں تباہ کر دُوں گا۔"

"اور کچھ کہنا ہے تمھیں؟" گرانجو نے پوچھا۔

"نہیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔" مَیں نے جھُوٹ مُوٹ جماہی لے کر کہا۔ "مَیں تھکا ہُوا ہُوں اور سونا چاہتا ہُوں۔"

"مَیں چلا جاؤں اور تم میرے لگائے ہُوئے پودے سے پھل کھاتے رہو۔ نہیں سرفروش! تم نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو وحشی غلاموں سے بھی زیادہ احمق ثابت کر دیا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمھاری ایک بہت بڑی کمزوری میرے ہاتھ میں ہے۔ مگر تم یُوں ظاہر کر رہے ہو جیسے اب وہ تمھاری کمزوری نہیں رہی۔ ٹھہرو۔ مَیں تمھیں ایک دلچسپ تماشا دکھاتا ہُوں۔ اگر گوما مقناطیسی پردوں کی استعداد اور توانائی کی مقدار کم نہ کرتا تو مَیں تمھیں تماشے کی بجائے حقیقی منظر دکھا دیتا لیکن گوما چاہتا ہے کہ مَیں احتجاج یا التجا کرنے یہاں آؤں تو وہ مجھے گرفتار کر لے... مگر مَیں احمق نہیں ہُوں۔ اس لیے تصویری پیکر میں یہاں آیا ہُوں جسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اُسے بتا دینا کہ مَیں تجسیم میں اس وقت یہاں آؤں گا جب پشکانی میرے ساتھ ہوں گے اور مَیں ایک فاتح کی حیثیت سے یہاں قدم رکھوں گا۔ خیر ہٹاؤ۔ تم تماشا دیکھو۔"

"ٹھہرو گرانجو!" مَیں نے جلدی سے کہا۔ "تماشا دکھانے سے پہلے یہ بتاؤ کہ جب مقناطیسی پردوں اور تمھیں فراہم کی جانے والی توانائی کی استعداد گھٹا دی گئی ہے تو پھر تمھارا تصویری پیکر یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"یہ تو بچّوں کا سا سوال ہے سرفروش۔" وہ بولا۔ "مَیں نے بُرج گرگوش میں اپنے مخزج لگا رکھے ہیں جو اسی کم توانائی سے چل رہے ہیں اور مجھے مطلوبہ توانائی فراہم کر رہے ہیں۔ خیر۔ اِدھر دیکھو۔" یہ کہہ کر اُس نے خواب گاہ کے مرکز کی طرف انگلی اٹھائی تو ایک منظر اُبھرنے لگا۔ یہ بڑا مکرُوہ اور گھناؤنا منظر تھا۔

بُرج گرگوش کے ایک کمرے میں راشی کے ہاتھ پاؤں چار کھونٹوں سے باندھ دیے گئے تھے اور وہ فرش پر لیٹی چیخ رہی تھی، ہرچند کہ اُس کی آواز نہیں آ رہی تھی مگر مجھے یُوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ چیخ چیخ کر فریاد کر رہی ہو۔ مدد کے لیے پکار

رہی ہو... مگر اُس کی مدد کو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں راشی خنجر لیے قہقہے لگا رہی تھی اور وحشی سپاہی باری باری ژرولے کے ساتھ ذلیل ترین تشدد کیے جا رہے تھے۔ پھر راشی اُس کے قریب آئی اور اُس نے خنجر ژرولے کی گردن میں چبھونا شروع کر دیا۔ ژرولے اس نئے کرب سے کراہ اُٹھی۔ مَیں نے بے ساختہ گرانجو کے تصویری پیکر سے کہا: "بس۔ بند کرو یہ مکروہ نظارا۔"

وہ ہنسا اور بولا: "ابھی تم نے پُورا منظر دیکھا ہی کہاں ہے۔ آگے دیکھو کہ ہوتا کیا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے پھر اُنگلی سے اشارہ کیا تو دُوسرا منظر اُبھرنے لگا۔

ژرولے ہوش وحواس کھو چکی تھی لیکن اس عالم میں بھی سسکیاں لیے جا رہی تھی۔ اب چار وحشیوں نے اُسے ہاتھ پاؤں سے ڈنڈا ڈولی کر رکھا تھا۔ راشی نے اُنھیں حکم دیا تو اُنھوں نے اسے بُرج کی تیسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔ ژرولے اُن نوکیلے کھونٹوں پر جا گری جو پہلے سے وہاں گڑے ہُوئے تھے۔

یہ رُوح فرسا منظر دیکھ کر مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مَیں غم وغصّے سے لرز رہا تھا اور میرا پُورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ مجھے دُکھ تھا تو اس بات کا کہ میرے سامنے گرانجو کا تصویری پیکر ہے۔ کاش وہ حقیقت میں میرے سامنے ہوتا تو مَیں عملاً اُس کا خُون پی جاتا اور پھر اُس کے پرخچے اُڑا دیتا۔

"تمھارے خرشانہ کے سارے دیوتاؤں کی قسم! مَیں تمھارے ساتھ اس سے بھی بُرا سلُوک کروں گا جو تم نے ژرولے سے کیا ہے۔" مَیں نے کہا۔

گرانجو قہقہہ لگا کر بولا: "چلو تمھاری نیت تو ظاہر ہو گئی ویسے ابھی مَیں نے ژرولے کے ساتھ یہ سلُوک نہیں کیا اور وقت سے پہلے تمھیں وہ سب کچھ دکھا دیا ہے جو اُس وقت عمل میں لایا جائے گا جب تم میرا حکم ماننے سے انکار کر دو گے۔ بولو، کیا ارادہ ہے؟"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" مَیں نے پُوچھا۔

اِس پر اُس نے مختصراً اپنا منصوبہ بتا دیا کہ وہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ مَیں نے غم وغصّہ ضبط کرنے کے لیے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"آنکھیں بند کر لینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا سرفروش! مَیں جانتا ہُوں ژرولے تمھاری کمزوری ہے اور جو لوگ کسی کی کمزوری سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، وہ احمق کہلاتے ہیں اور گھاٹے میں رہتے ہیں۔"

اتنے میں اشنار نے کروٹ لی تو مَیں نے جلدی سے کہا: "اچھی بات ہے گرانجو۔ چلو اب دفع ہو جاؤ۔"

دُوسرے ہی لمحے وہ ہَوا میں تحلیل ہو گیا۔

اشنار نے کروٹ بدلی اور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی پھر مجھے بستر کے کنارے بیٹھا دیکھ کر بولی: "کیا بات ہے دیوتا، تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔"

"مَیں نے ابھی ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، اس لیے اُٹھ گیا۔"

"تم جبروت میں خوش تو ہو نا؟ مجھ سے کوئی شکایت تو نہیں؟"

"نہیں۔ مَیں تم سے بے حد خوش ہُوں۔" مَیں نے جواب دیا۔ "بہرحال، مَیں ذرا گوما سے ملنے جا رہا ہُوں۔"

"تم روزانہ گوما سے ملتے ہو، باتیں کرتے ہو، منصوبے بناتے ہو مگر لپشکانیوں کا مسئلہ اب بھی وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔"

مَیں نے تلوار اُٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہُوئے کہا: "اب یہ مسئلہ بلا تاخیر حل ہونا چاہیے... اور یہ حل ہو کر رہے گا۔" یہ کہہ کر مَیں خواب گاہ سے نکل گیا۔

مختلف سُرنگوں اور راہ داریوں سے گزرتے ہُوئے مَیں نے سوچا کہ اگر مَیں ژرولے کو بھُول جاؤں تو گرانجو اور لپشکانیوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتا ہے۔ آخر ژرولے سے میرا تعلق ہی کیا ہے۔ صرف اتنا کہ وہ میری خوش وقتی کی رفیق بنی تھی... اور اگر ایک فرد کی قربانی سے لاتعداد زندگیاں سنور جائیں تو مجھے اپنے دل پر پتھر رکھ ہی لینا چاہیے... لیکن کیا مَیں واقعی اپنے دل پر پتھر رکھ سکتا تھا؟

●

جب مَیں کمپیوٹر چیمبر میں گوما سے ملا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مَیں گوما کو توانائی والے تالاب کے کمرے میں لے گیا تاکہ ہماری گفتگو کوئی تیسرا فرد نہ سُن سکے۔

"جنوبی صُوبہ خراگ اور بُرج گرگوش کو توانائی کی فراہمی بالکل بند کر دو۔ گرانجو حملے کی تیاری کر چکا ہے۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ وہ بلا تاخیر جبروت پر حملہ کر دے۔ اُس کی اور لپشکانیوں کی آمد تک مَیں بھی ساری تیاریاں مکمل کر لوں گا۔"

گوما کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا: "ہاں۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے۔ مگر کیا تم گرانجو سے ملے ہو۔ کیا وہ تصویری پیکر میں یہاں آیا تھا؟"

"ہاں، وہ آیا تھا اور مجھے دھمکی دے گیا ہے۔" پھر مَیں نے اُسے ژرولے والی ساری تفصیل بتا دی۔

"کیا تم نے اُس کا ساتھ دینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے؟"

گوملنے پُوچھا۔

"مَیں نے اسے دھوکا دینے کے لیے کہہ دیا کہ مَیں اُس کا ساتھ دُوں گا۔ مجھے تم سے ملنے اور تیاری کے لیے وقت درکار تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ پہلے مَیں توانائی کی فراہمی روک دُوں۔ جب پشکانی خمرشان میں داخل ہو جائیں تو توانائی بحال کر دُوں تاکہ پشکانی مقناطیسی پردے سے باہر نہ جا سکیں اور وہیں پھنس کر رہ جائیں۔ پھر مَیں تمھیں قتل کر کے اشنار کو گرفتار کر لُوں۔ اس کے بعد وہ تمھاری جگہ خواجہ سراؤں کا بادشاہ بن کر اقتدار پر قبضہ کر لے گا۔ اُس کے خیال میں یہ ایک بہترین منصُوبہ ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اقتدار پر قبضے کے لیے اُس نے بہت عُمدہ منصُوبہ بنایا ہے مگر اُس نے تم سے یہ بھی تو کہا ہو گا کہ یہ سب کچھ ہونے کے بعد تم اسی طرح ہرموجہ ہی بنے رہو گے۔ ہے نا؟"

"ہاں... اور مجھے اُس کی اس بات پر یقین بھی ہے کیونکہ اسے دکھاوے کے لیے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔"

"لیکن کیا تم اُس کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی بن سکتے ہو؟ درپردہ تو وہی حکمراں ہو گا۔"

"تمھیں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے گوما۔ یہ نوبت ہی نہیں آئے گی کہ وہ تمھاری جگہ اقتدار پر قابض ہو سکے۔" مَیں نے جواب دیا۔

"مجھے تمھارے اس جواب سے خوشی ہُوئی سرفروش۔" گوما نے کہا۔ "لیکن ایک لمحے کے لیے فرض کر لو کہ تم اس کا ساتھ دیتے ہو۔ پھر کیا تمھارے ساتھ اشنار کی بجائے ژولے یہاں حکمرانی کرے گی؟ کہیں اُس نے تمھیں یہ سبز باغ تو نہیں دکھایا؟ اس لیے کہ ژولے تمھاری کمزوری ہے اور تم اُس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔"

گوما کی اس بات پر مَیں کھول ہی تو گیا۔ "کیا بکتے ہو گوما۔ مَیں یہ تو ضرور چاہتا ہُوں کہ ژولے گراغچو اور راشی کے... تشدّد کا شکار بن کر ہلاک نہ ہو لیکن مَیں اپنے ضمیر اور تمھیں دھوکا نہیں دے سکتا۔ میرے خُون میں غدّاری اور لالچ کے جراثیم نہیں ہیں۔"

"اچھی بات ہے سرفروش۔" وہ بولا۔ "لیکن مَیں چاہتا ہُوں کہ اشنار کو یہ علم ہرگز ہرگز نہ ہونے پائے کہ تم ژولے کو پسند کرتے ہو ورنہ وہ جذبۂ رقابت میں اندھی ہو کر صرف ژولے کو مارنے کی خاطر پُورے جبروت کو بھک سے اُڑا دے گی۔"

"یہ بات مجھ پر چھوڑ دو گوما۔ مَیں اشنار سے خُود نمٹ لُوں گا۔ میرے نزدیک تمھاری اہمیت اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ اب میری بات غور سے سُنو۔ تم جنوبی صُوبہ خراگ اور بُرج گرگوش کے لیے توانائی سلسلہ منقطع کر دو گے تاکہ پشکانی، مقناطیسی پردے کے اندر آ... تم توانائی اُس وقت بحال کرو گے جب مَیں تم سے کہوں گا۔ مَیں... میرے علاوہ تم کسی کی بات نہیں مانو گے، چاہے کچھ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے، حالات تمھیں پریشان کر دیں اور تم اپ... آپ کو مجبور سمجھنے لگو لیکن پھر بھی توانائی کی فراہمی بحال نہ کرنا سے وعدہ کرو کہ تم میری اس بات پر ضرور عمل کرو گے۔"

"اگر مَیں یہ وعدہ نہ کروں تو؟" گوما نے پُوچھا۔

مَیں نے تلوار نیام سے نکالتے ہُوئے جواب دیا۔ "پھر مَیں تم... ابھی قتل کر دُوں گا گوما... لیکن بہتر ہے کہ ایک بار پھر سوچ لو۔"

گوما مسکراتے ہُوئے بولا۔ "مَیں تمھارا امتحان لے رہا تھا کہ اس سلسلے میں کس حد تک سنجیدہ ہو۔ مَیں جانتا ہُوں کہ تم نے کیا... رکھا ہے۔ اس لیے وعدہ کرتا ہُوں کہ تمھارے حکم کے بغیر توانائی فراہمی بحال نہیں کروں گا لیکن یہ مت بھُولو کہ تم یہاں نئے ہو ا... بہت سی باتیں نہیں جانتے۔"

"جو کچھ اور جتنا کچھ مجھے جاننا چاہیے وہ مَیں جان چُکا ہُوا۔"

"اس کے باوجُود شاید یہ بات نہیں جانتے کہ جب خراگ کو توانائی کی فراہمی کُلّی طور پر بند کی جائے گی تو پُورے خمرشان ا... خُود جبروت میں بھی تمام کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ کسی چیز پر ہ... قابُو نہیں رہے گا۔ ہم پشکانیوں سے زیادہ کمزور ہو جائیں گے بلکہ ا... وحشیوں کے سامنے یکسر بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔"

مَیں نے تلوار پر ہاتھ ملتے ہُوئے جواب دیا۔ "لتنے بھی... جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"لیکن توانائی کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی یہاں اندھیرا چھا... گا۔ موسم ہمارے قابو میں نہیں رہے گا، پلے دار کھیت سُوکھ جائیں گے۔ کمپیوٹر اور نخوں کے پلانٹ رُک جائیں گے۔ خواجہ سراؤں کی فراہمی بند ہو جائے گی، خوراک تیار کرنے والے کارخانے ٹھپ ہو جائیں گے اور سب سے زیادہ ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں ہمارے خدمت گار اور وحشی سپاہی بغاوت نہ کر دیں۔" گوما نے وضاحت کی۔

"جو بھی ہو گا، دیکھا جائے گا۔ یہ گڑبڑ صرف ہمارے ساتھ نہیں، گراغچو کے ساتھ بھی ہو گی۔ توانائی کے بغیر وہ بھی کچھ نہیں کر سکے گا جبکہ مَیں بڑی آسانی سے اُسے ختم کر دُوں گا کیونکہ و... تصویری پیکر اختیار نہیں کر سکے گا۔ مَیں شاہ فروندا اور راشی کو... زندہ نہیں چھوڑوں گا اور میرا خیال ہے کہ جب شاہ فروندا اور راشی...

...رہے گی تو پشکانی جنگ نہیں لڑ سکیں گے۔"

"اچھی بات ہے سرفروش! مَیں جوہری توانائی کا سلسلہ ...کر رہا ہُوں اور وعدہ کرتا ہُوں کہ اُسے تمھارے حکم کے بغیر بحال ...روں گا۔" یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر چیمبر میں آیا اور اُس سے ملحق ...چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر اُس نے توانائی کی ترسیل کا ...بند کر دیا۔

سوئچ بند ہوتے ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی... موت کی ...اموشی... قبرستان کی سی خاموشی جس سے دل ہَول اُٹھتا ہے۔

"مَیں اشنار سے خود بات کرُوں گا۔ اگر وہ تم سے پُوچھے تو کہنا ...نے تمھیں کچھ نہیں بتایا۔ اس لیے وہ تم سے کچھ اُگلوانے کی خاطر دباؤ نہیں ڈالے گی۔ ابھی مجھے بہت سی تیاریاں کرنی ہیں۔ یہ ...اب تم کیا کرو گے؟"

"مَیں یہیں، اسی مقام پر تمھارے حکم کا منتظر رہُوں گا مگر دیر ...نا سرفروش۔ سوئچ بند ہوتے ہی موت خمرشان کے چپّے چپّے ...نکنے لگی ہے۔"

"فکر نہ کرو گوما۔" مَیں نے اُسے تسلّی دی۔ "مَیں خمرشان کو بچاؤں ...اب خمرشان پہلے سے کہیں بہتر ہو گا۔"

گوملنے رخصت ہو کر مَیں محل کا طویل زینہ طے کرتا ہُوا چھت ...پہنچا جہاں اعلا نسل کی کئی خواتین، کنیزوں سے مالش کروا ...تیں۔ مَیں نے اُن سب کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا اور ...اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ یہ چھت میرے لیے مشاہداتی مقام ...سکتی تھی۔

مَیں نے ایک خواجہ سرا کو بھیجا کہ وہ اشنار کو بُلا لائے اور ...دل سے میز کرسیاں منگوائیں۔ وہاں خمرشان اور جبروت کا ...نقشہ اور دُوربین وغیرہ نہیں تھی۔ اس لیے مجھے اُن کی مدد ...بغیر ہی اپنی مرضی اور پسند کا میدانِ کارزار منتخب کرنا تھا۔ مجھے ...تھا کہ جوہری توانائی کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی ...اور پشکانی وہاں سے چل پڑے ہوں گے۔ کیونکہ گراغچو کو پُورا ...تھا کہ مَیں جلد از جلد توانائی کی ترسیل بند کر دُوں گا۔

جیسا کہ گوملنے کہا تھا، اب ہر طرف اندھیرا چھانے لگا ہے ...اب مجھے اُفق پر دُھند کا جال پھٹتا نظر آیا اور کہیں کہیں چھوٹے ...ٹے شگاف بھی دکھائی دینے لگے جن سے آسمان نظر آ رہا تھا۔ ...سمجھ گیا کہ موسم کو کنٹرول کرنے والی کَل کی یہ چادر ہٹتے ہی سُورج ...دُھنی بڑھتے ہُوئے اندھیرے کو نگل رہی ہے۔ اتنے میں اشنار ...اپنی کنیزوں کے جھرمٹ میں وہاں آ گئی۔ مَیں نے کنیزوں کو رخصت کر دیا اور اشنار کو اپنے قریب بُلایا تو وہ ایک ادائے دلبری سے شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "اگر قریب ہی بُلانا تھا تو دُور کیوں ہُوئے تھے؟"

"یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے اشنار۔" مَیں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے نرمی سے کہا۔ "اس لمحے سے تم مجھے دیوتا نہیں بلکہ سرفروش کہہ کر مخاطب کیا کرو گی، ہرموجہ بالکل نہیں۔"

"تم ہرموجہ تھے ہی کب سرفروش؟"

"پہلے یہ بات ہم تین افراد جانتے تھے اور اب وقت آ گیا ہے کہ یہ حقیقت سب کو معلوم ہو جانی چاہیے۔ میری بات ذرا غور سے سُنو اور یہاں بیٹھ جاؤ۔"

اشنار میری باتیں غور سے سُنتی اور سمجھتی رہی۔

جب مَیں اُسے اپنے منصُوبے کی تفصیل بتا چکا تو وہ بولی۔

"صرف ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، جب پشکانی خمرشان میں گھُس آئیں گے تو ہم دوبارہ مقناطیسی پردہ ڈال کر انھیں گھیر سکتے ہیں اور سُرخ آندھی بھیج کر انھیں تباہ و برباد کر سکتے ہیں تو پھر تم اُن سے جنگ کیوں لڑنا چاہتے ہو؟"

"اس کی دو وجُوہ ہیں۔ اس طرح گراغچو کو فرار کا موقع مل جائے گا۔ دُوسرے میں سارے پشکانیوں کو ختم کر دینا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"کیوں؟... تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ظالم درندے ہمارے خُون کے پیاسے ہیں؟"

"شکست کے بعد وہ اپنی ساری وحشت و بربریت بھُول جائیں گے۔ دُوسرے تم خُود بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ تمھارے پاس اعلا نسل کے مرد برائے نام ہی رہ گئے ہیں۔"

اشنار میری اس بات سے کچھ بھڑک کر بولی۔ "تم نے یہ کیوں کہا کہ مَیں اعلا نسل کے مردوں کو خود اچھی طرح جانتی ہُوں۔ اس بات سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"بننے کی ضرورت نہیں۔ مَیں جانتا ہُوں کہ تم مردوں کے پنجروں تک جاتی رہی ہو مگر مجھ پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" مَیں نے اُسے سمجھایا۔ "تم پشکانیوں میں سے منتخب آدمیوں کے علاوہ باقی تمام مَردوں کے ساتھ جو چاہے سلوک کرنا۔"

"نہیں۔ مَیں اُن سب کو تباہ کر دُوں گی اور گوما کو بھی نہیں چھوڑوں گی جس نے تمھیں یہ ذلیل مشورہ دیا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی تو گوما کا نائب خواجہ سرا اور وحشی سپاہیوں کا ایک دستہ ہمارے قریب آ گیا جو اشنار کے محافظوں پر مشتمل تھا اور اُس کے ایک ہلکے سے اشارے پر میرے پرخچے اُڑا سکتا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں کہا: "تم بے شک گوما کو بھی ختم کرا سکتی ہو اور مجھے بھی لیکن پھر کبھی تمھیں میرا نعم البدل نہیں مل سکے گا؟ کیا مجھے خمرشان سے محبت نہیں ہے؟ کیا میں اُس کا تحفظ نہیں چاہتا؟ پہلے اپنے آپ سے یہ سوال کرو پھر مجھے تمھارا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔"

وہ کافی دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ میں نے کن انکھیوں سے محافظ سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ وہ شمشیر بدست اشنار کے حکم کے منتظر تھے۔

اشنار کچھ دیر بعد سپاہیوں سے بولی: "یہاں سے ہٹ جاؤ۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئی: "ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکا ہوں۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم جنگ کیسے لڑو گے؟"

"جبروت کے اردگرد کوئی شہر پناہ نہیں اس لیے گرانجو اور پشکانی براہِ راست شہر میں داخل ہونا چاہیں گے اور شہر میں داخل ہونے کا نزدیک ترین راستہ وہ ہے۔" میں نے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: "ہم اُن جھونپڑیوں کو مسمار کر کے ناکہ بندی کر دیں گے۔" پھر میں گوما کے نائب سے مخاطب ہوا۔ "تم فوراً یہ جھونپڑیاں توڑنے اور ناکہ بندی کے احکام جاری کر دو۔"

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

"اور...؟" اشنار نے پوچھا۔

"ہم اپنی ساری طاقت یہیں جمع رکھیں گے۔ تمھاری عورتیں ایک زمانے میں جنگجو تھیں۔ انھیں ایک بار پھر جنگ جو بننا پڑے گا اور وہ تمھاری کمان میں لڑیں گی۔ اس لیے جتنی جلدی انھیں ہتھیار بند کر سکتی ہو، کر دو۔"

"ٹھیک... اور کچھ؟"

"سب تیار ہو جائیں تو انھیں اُس مینار کے پاس جمع کر دو۔"

"لیکن میں انھیں اطلاع کیسے دوں۔ توانائی کا سلسلہ تو منقطع ہو چکا ہے؟" اشنار نے سوال کیا۔

مجھے اُس کی بات پر ہنسی آگئی۔ میں نے اپنا پاؤں زمین پر مارتے ہوئے کہا: "یہ رہی توانائی۔ پاؤں سے کام لو اشنار۔ خواجہ سراؤں کو دوڑاؤ۔ میرے اور تمھارے درمیان رابطے کے لیے ایک چوکی بھی ضروری ہے تاکہ ہم ایک دوسرے کو پیغام پہنچا سکیں۔"

اشنار کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اُس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "اچھی بات ہے سرفروش۔ میں تمھارے احکام پر عمل کروں گی۔"

اتنے میں گوما کا نائب واپس آگیا۔

"تمھارے بادشاہ گوما کا حکم ہے کہ تم میرے احکام کی تعمیل کرو گے۔ کیونکہ وہ ایک بے حد ضروری کام میں مصروف ہے۔ اس لیے اب سارے خواجہ سراؤں کے سربراہ تم ہو... مگر تمھیں میرے زیرِ اثر رہنا ہے۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں دیوتا۔ فرمائیے میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"سب سے پہلے اپنے خواجہ سراؤں کی مکمل فہرست تیار کرواؤ انھیں سپاہیوں میں بدل دو کہ تم سب کو بھی جنگ لڑنی ہے۔"

"جنگ؟" خواجہ سرا نے حیرت سے دُہرایا۔ "خواجہ سرا کبھی لڑے ہیں جو اب لڑیں گے دیوتا۔ دوسرے ہم میں سے کسی کو بھی جنگ کی تربیت نہیں دی گئی۔ مجھے ڈر ہے کہ ہم آپ کے کسی کام نہیں آسکیں گے، دیوتا۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ساری بات سردار کی ہوتی ہے۔ رہبر اچھا ہو تو خواجہ سرا بھی میدان مار لیتے ہیں۔ جاؤ سب کو پھر اکٹھا کرو۔" میں نے اُس کی ہمت بندھاتے ہوئے حکم دیا

جب وہ جانے لگا تو میں نے کہا: "سنو!"

وہ رُک گیا۔

میں نے پوچھا: "ان سپاہیوں پر کون حکمرانی کرتا ہے؟"

"ان پر کمتر درجوں کے خواجہ سرا حکمراں ہیں، دیوتا۔"

"اس پر بھی تم کہتے ہو کہ جنگ نہیں لڑ سکتے؟" میں نے حیرت سے کہا: "خیر۔ کیا یہ جنگ لڑ سکیں گے؟"

"یہ تو حکم کے بندے ہیں دیوتا۔ انھیں آگ میں کودنے کا حکم دیا جائے تو یہ آنکھیں بند کر کے کود پڑتے ہیں۔"

"مگر میں نے سُنا ہے کہ کبھی کبھی یہ بغاوت پر بھی اُتر آتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"یہ اس بڈھے کھوسٹ کی رائے ہے دیوتا مگر..." وہ .... قدرے تذبذب سے بولا: "معاف کیجیے گا مجھ سے غلطی ہو گئی۔ یہ الفاظ جلدی میں میرے مُنہ سے نکل گئے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم گوما کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو، یہ تمھارا معاملہ ہے۔ مجھے تو میرے سوالوں کے جواب دو۔"

"اگر ان پر چابک برستے رہیں تو یہ وحشی ضرور لڑیں گے، جناب! ان سے کام لینے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ کبھی کبھی ان میں سے کسی کو سرِعام پھانسی بھی دے دی جاتی ہے، پھر کافی عرصے تک یہ لوگ سر نہیں اُٹھاتے۔"

"صحیح معنوں میں ان سے کام کون لیتا ہے؟"

"سب سے کم تر درجے کے خواجہ سرا۔ وہ انھی کے ساتھ رہتے

ں اور ان کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ جنگلی اتنے بے وقوف ہیں کہ خمرشانی بان سیکھ ہی نہیں سکتے۔ اس لیے ان پر جو خواجہ سرا ماسٹر مقرر کیے ئے ہیں اُنھوں نے ان کی زبان سیکھ لی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ جاؤ وہی کرو جو میں نے کہا ہے اور ہاں میرے ام فرزیو کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔"

گوما کا نائب سر خم کر کے چلا گیا۔

میں نے ایک بار پھر ماحول کا جائزہ لیا۔ مقناطیسی گھر کا پردہ ل ہو چکا تھا اور آسمان کا ایک بڑا حصہ نظر آرہا تھا۔ آفتاب غروب ونے والا تھا۔ اس لیے مغرب میں شفق کے آثار دکھائی دے ہے تھے۔ میں نے جنوب کی جانب نظر دوڑائی۔ جہاں سے گرانجو ر پشکانیوں کو آنا تھا مگر مجھے دُور اُفق پر گرد کے ایک ہلکے سے ل کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ شاید یہ گرد پشکانی لشکر کی وجہ سے رہی تھی۔ اب تک میں خمرشانی شہروں سے وقت کا تعین کر چکا ۔ اس اعتبار سے گرانجو اور پشکانیوں کو جبروت تک پہنچنے کے لیے یباً چار دن لگنے چاہییں تھے اور ان چار دنوں میں مجھے ساری یاں مکمل کر لینا تھیں۔

خمرشانی، خاص طور پر جبروت کے لوگ سائنسی آسائشوں کے ی ہو چکے تھے اور مقناطیسی پردے کی وجہ سے انھیں اپنے دفاع وئی پروا نہیں رہی تھی حتیٰ کہ وہ لڑنا بھی بھول چکے تھے۔ مجھے تھا کہ توانائی کا سلسلہ منقطع ہونے اور ان آسائشوں سے محروم ہو نے پر کہیں وہ خوفزدہ نہ ہو جائیں یا وحشی غلام بغاوت پر نہ اتر ں مگر ایسا لگتا تھا کہ اشنار نے حالات پوری طرح سنبھال لیے ، ورنہ اب تک خوف و ہراس کے آثار نظر آجاتے۔

میں انھی سوچوں میں گم تھا کہ میرا خادم فرزیو آگیا۔ فرزیو ایک نوعمر خواجہ سرا تھا۔

اُس نے ادب سے کہا: "آپ نے مجھے یاد فرمایا، دیوتا؟"

"ہاں بیٹھو۔" میں نے جواب دیا۔

"میں آپ کے سامنے بیٹھوں؟" اُس نے ناقابلِ یقین انداز کہا۔

"ہاں... بیٹھ جاؤ۔" میں دھاڑا تو وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اُس کی اس بے ساختہ حرکت پر ہنسی آگئی۔

"میں جو کام تمھیں بتاؤں گا، وہ کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تو پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے، دیوتا۔"

"یہ بتاؤ کہ تمھارا درجہ کیا ہے؟"

"میں بارھویں درجے کا خواجہ سرا ہوں جناب۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اُسے ایک نظر دیکھا اور دل میں اُس کا تقابلی جائزہ لینے لگا۔ گرانجو کو چودھویں درجے کا خواجہ سرا شمار کیا جاتا تھا مگر وہ اس درجے سے کہیں زیادہ تھا۔ فرزیو اُس سے کم درجے سے تعلق رکھتا تھا لیکن "کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔" کے مصداق میں نے اسے اپنا ذاتی محافظ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں تمھیں اپنا خصوصی نائب بنانا چاہتا ہوں فرزیو۔" یہ کہتے ہوئے میں نے گلے میں پڑی زنجیر اُتاری اور اُسے پہنا دی۔

"یہ زنجیر اس بات کی علامت ہے کہ اب تم میرے معتمدِ خاص ہو... مگر اب تم میرے سوا کسی کا حکم نہیں مانو گے حتیٰ کہ اشنار اور گوما کا بھی نہیں... اگر تم میری توقعات پر پورے اُترے تو گوما کے بعد میں تمھیں خواجہ سراؤں کا بادشاہ بنا دوں گا اور اگر تم نے میری حکم عدولی کی یا کسی دوسرے کا حکم مانا تو میں تمھیں وحشی غلاموں کے حوالے کر دوں گا۔"

"نہیں نہیں دیوتا۔ میں آپ کے علاوہ کسی کا حکم نہیں مانوں گا۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"تم ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہو گے اور میری حفاظت کرو گے۔ حفاظت سے میرا مطلب ہے کہ میری لاعلمی میں عقب سے کوئی مجھ پر حملہ نہ کرنے پائے۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا دیوتا۔ میں اپنی جان دے دوں گا مگر آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔"

"میں تمھیں سارے وحشی غلاموں پر قابو رکھنے والے ماسٹرز کا سردار بنا رہا ہوں۔ اب سب سے پہلے تمھیں یہ کرنا ہے کہ جبروت میں خوراک اور پانی کا جتنا بھی ذخیرہ ہے تم اُسے جمع کر کے میرے بتائے ہوئے مقام پر محفوظ کر دو گے۔ جتنا پے دا ہے، اُس کی گانٹھیں منتقل کراؤ گے اور جب یہ کام مکمل ہو جائیں تو سارے وحشی غلاموں کو چوراہے میں جمع کر کے مجھے اطلاع دو گے۔ اگر کوئی بات تمھاری سمجھ میں نہ آئی ہو تو مجھ سے پوچھ لو۔"

"میں سب سمجھ گیا ہوں دیوتا مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

اس پر فرزیو نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا دی اور بولا: "آج تک کسی خواجہ سرا نے یہ چیز نہیں دیکھی۔ یہ کیا ہے دیوتا؟"

"یہ آسمان ہے۔ فکر نہ کرو، یہ کسی پر نہیں گرے گا۔" میں نے اُسے اطمینان دلایا۔

★★

اگلے تین دنوں اور راتوں کو میں مسلسل جاگتا اور تیاریاں مکمل کرتا رہا یہاں تک کہ تھک کر چُور ہو گیا لیکن ابھی ایک کام باقی تھا۔

ہر چند کہ جبروت کی اعلا نسل خواتین اور اُن کی کنیزوں نے فوجی وردیاں پہن لی تھی مگر وہ فنِ حرب سے ناآشنا تھیں۔ ابھی مجھے اُن کو میدانِ جنگ میں لڑنے کی تربیت دینا تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اشنار نے اپنی نو سو ننانوے خواتین کی فوج کو باقاعدہ متعدد دستوں میں تقسیم کر دیا تھا اور وہ اُن کی کمانڈر بنی ہُوئی تھی۔ ہر اعلا نسل خاتون کے ساتھ ایک ایک کنیز بھی تھی جس نے اُن کے ہتھیار یعنی تلوار، بھالا اور ڈھال اُٹھا رکھی تھی۔ چلتے وقت جب سب مِل کر گاتی تھیں تو بڑا جوش و جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔

میں نے اُنھیں تلوار چلانا اور بھالا پھینکنا سکھایا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے پہلے ہی دن بہت کچھ سیکھ لیا اور ایک دُوسرے کے ساتھ مشق کرنے لگیں۔

جنوب کی طرف وحشی غلاموں کی جھونپڑیاں مسمار کر کے ہر ممکن ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ میں نے سامنے شفاف ترغون کے نوکیلے ٹکڑے گڑوا دیے تھے۔ اُن کے پیچھے پے دا کی گانٹھیں رکھوا دی تھیں اور اُن کے عقب میں گانٹھوں کے متعدد بڑے بڑے مینار بنوا کر اُن پر بیک وقت چھ تیر چھوڑنے والی بڑی کمانیں اور منجنیقیں نصب کروا دی تھیں۔

کمانیں اور منجنیقیں چلانے کا کام کنیزوں کو سکھا دیا گیا تھا اور وہ تھوڑی سی مشق کے بعد یہ کام بخوبی انجام دے سکتی تھیں۔

آج چوتھا روز تھا لیکن گرانچو اور پشکانیوں کے لشکر ابھی تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے جنوب کی طرف ہرکارے دوڑا دیے تھے تاکہ جُونہی وہ اُنھیں آتا دیکھیں مجھے آگاہ کر دیں۔

صبح کے وقت جب اشنار نے اپنی فوج کی حاضری لی تو اُن میں سے ایک عورت غائب تھی۔ جب اُسے تلاش کیا گیا … تو مردوں کے پنجرے کے قریب پایا گیا۔ اُس وقت وہ دامو کے نشے میں دُھت تھی۔ اشنار نے اپنی زنانہ فوج کے سامنے، خود ہی اُس کی گردن اُڑا دی تاکہ کسی اور خاتون کو ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ جہاں مجھے اشنار کے اس اقدام کا قائل ہونا پڑا کہ وہ قانون اور اُصولوں کی پابند ہے وہاں اُس کے دل گُردے پر بھی حیرت ہوئی اور مجھے گوما کی باتیں یاد آ گئیں۔ اگرچہ میرے ساتھ اُس کے سلوک سے کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کے باوجود میں اُس پر مکمل اعتماد بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بظاہر وہ جیسی دکھائی دیتی تھی،

اندر سے اتنی ہی مختلف تھی۔ اور اس کا مجھے پہلے دن ہی تجربہ ہو گیا تھا۔

چوتھی رات چونکہ بُری طرح تھک گیا تھا اس لیے میں نے نگرانی کی چوکی پر آ کر دو میزیں جوڑیں اور اُن پر لیٹ گیا۔ ابھی بمشکل میری آنکھ لگی ہوگی کہ فرزیو نے مجھے جگا دیا

"بیدار ہو جائیے دیوتا۔"

"کیوں، کیا ہُوا؟" میں نے بڑبڑا کر اُٹھتے ہُوئے پُوچھا۔

"جنوب سے ایک ہرکارہ آیا ہے۔"

میں نے بلا تاخیر ہرکارے کو طلب کر لیا۔

"گرانچو اور پشکانی لشکر سے اِدھر آ رہا ہے دیوتا۔" ہرکارے نے بتلایا۔

"اُن کی تعداد کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر اُنھوں نے ہمارے بہت سے وحشی غلام قتل کر دیے ہیں۔"

"کیا وحشی غلام لڑے تھے میرا مطلب ہے اُنھوں نے اُن کا مقابلہ کیا تھا یا نہیں۔"

"کچھ غلام لڑے تھے مگر باقی ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ پشکانی بڑے خونخوار ہیں دیوتا۔ اُن کے پاس بڑے بڑے خنجر اور گھوڑوں والے تختے ہیں۔"

"گھوڑوں والے تختے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں دیوتا۔" اس بار فرزیو نے جواب دیا۔ "میں نے بوڑھے خواجہ سراؤں سے سُنا ہے کہ پہلے خرشانیوں کے پاس بھی ایسے ہی تختے ہُوا کرتے تھے جن میں دو چکر لگے ہوتے تھے اور گھوڑے اُنھیں کھینچتے تھے۔"

"اوہ۔" میں سمجھ گیا کہ اُس کی مُراد رتھ سے تھی۔

"مگر پشکانیوں کے تختوں میں چکروں کے ساتھ تلواریں بھی لگی ہوئی ہیں۔" ہرکارے نے بتایا۔

مجھے ہرکارے کی اس بات سے تو کوئی تشویش نہ ہُوئی لیکن یہ سوچ کر ضرور فکرمند ہو گیا کہ اگر اُن کے پاس رتھ ہیں تو وہ اُن پر وافر مقدار میں سامانِ رسد بھی ضرور لاد کر لائے ہوں گے جب کہ ہمارے پاس سامانِ رسد کی کمی تھی اس لیے ہم جنگ کو طول نہیں دے سکتے تھے۔

بہرصُورت میں نے ہرکارے کو رُخصت کر دیا اور خُود سو گیا۔

صُبح میری آنکھ کھُلی تو فرزیو نے بتایا کہ اشنار اور گوما کا

ب یہاں آیا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ وہ آہستہ ستہ آپ کی جانب بڑھ رہے تھے مگر میں بھی تلوار نکال کر سامنے آ ۔ مجھے دیکھ کر گوما کا نائب تو بھاگ نکلا مگر مہا پجارن کھڑی مجھے رتی رہی۔ میں سمجھا کہ وہ مجھے قتل کر دینا چاہتی ہے مگر وہ مجھے ں کیے بغیر ہی چلی گئی۔

مجھے فرزیو کی بات پر ہنسی آ گئی۔

"وہ تمھیں نہیں بلکہ مجھے قتل کرنا چاہتی تھی۔"

"آپ کو… نہیں نہیں۔ دیوتا کو کوئی قتل نہیں کر سکتا اور ر وہ آپ کی طرف تو اُس وقت آتی جب میں ختم ہو جاتا۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا مگر یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا اشنار موقع ملتے ہی مجھے ہلاک کر دے گی اور جنگ کے دوران اُسے موقع ملنا یقینی تھا۔

●

دُوسری شام گرانچو اور پشکانیوں کے لشکر جنوبی میدان میں نہچ گئے اور اُنھوں نے جبروت کے سامنے پڑاؤ ڈال دیے لشکر میں لنے والے الاؤ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ہمیں نیم دائرے کی صُورت میں بر کر تین اطراف سے حملہ کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے الاؤ شمار کر کے تعداد کا اندازہ لگانا چاہا۔

یہ الاؤ سو سے زیادہ تھے۔ اگر ہر الاؤ کے گرد ایک سو پشکانی وں تو بھی اُن کی تعداد دس ہزار بنتی تھی جبکہ گرانچو کے وحشی لام اُن کے علاوہ تھے۔ اُن کے مقابلے میں ہماری نفری ڈھائی تین زار سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر ایک خرابی یہ بھی تھی کہ ہماری نفری میں ورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ ہرکارے کے مطابق، وحشی لام، پشکانیوں کا مقابلہ کرنے سے ڈرتے تھے۔ یہ صُورتِ حال اگرچہ یوس کُن تھی مگر میں جنگ جیتنا چاہتا تھا۔

پو پھٹتے ہی میں نے فرزیو کو حکم دیا کہ وہ سب کو جگانے کے نتظامات شرُوع کر دے۔ اس وقت موسم خراب ہو رہا تھا اور ہلکی ہلکی بوار پڑ رہی تھی۔ تاہم ہَوا ہمارے موافق تھی یعنی اُس کا رُخ پشکانی شکر کی طرف تھا۔

چورا ہے میں خواتین کی فوج کے پیچھے میں نے پے دا کی گانٹھوں سے ایک اہرام نما مینار تعمیر کروا لیا تھا۔ میں سب سے اُوپر والی گانٹھ کھڑا ہو گیا۔ دُوسری اور تیسری قطاروں والی گانٹھوں پر فرزیو اور س کے نائب آ گئے تاکہ لڑائی کے حالات کے مطابق جب میں اُنھیں ہدایات دُوں تو وہ اُن پر عمل کراتے جائیں۔

پشکانیوں کا لشکر بھی صف آرا ہونے لگا۔

لشکر کے پیچھے اُن کے خیمے نصب تھے جن میں شاہ فرزندا، راشی اور افسروں کے خیمے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ اُن میں سے کوئی ایک خیمہ گرانچو کا بھی ہو گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ژدلے کو بھی اپنے ساتھ لایا ہو گا اور وہ کسی نہ کسی خیمے میں قید ہو گی کیونکہ وہ اُسی کی وجہ سے مجھے دھمکا رہا تھا اور توانائی کے سِلسلے کا انقطاع اپنے منصُوبے کا ایک حِصّہ سمجھ رہا تھا۔

جب روشنی بڑھی تو میں نے شاہ فرزندا کا خیمہ پہچان لیا۔ وہ دُوسرے خیموں سے الگ تھلگ نصب تھا اور اُس کے باہر ایک نیزے کے ساتھ گھوڑوں کی تین دُمیں لہرا رہی تھیں … پھر مجھے شاہ فرزندا اور گرانچو دکھائی دیے … وہ ایک مقام پر کھڑے لشکر کا جائزہ لے رہے تھے۔ اتنے میں ایک خیمے سے راشی برآمد ہوئی اور ہماری تیاریوں کا جائزہ لینے لگی۔

میں نے اُسے دیکھ کر ہاتھ اُٹھایا۔

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر گرانچو کے پاس جا کر باتیں کرنے لگی۔ میں نے تو اُسے گرانچو کے خلاف اُکسایا تھا مگر اُس کا یہ انداز کچھ اور ہی بتا رہا تھا۔

اتنے میں پشکانی لشکر میں قرنا پھُونکے جانے لگے۔

یہ اُس چال بازی کے آغاز کی نشانی تھی جس پر گرانچو عمل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں معمُولی سی مدافعت کے بعد ہتھیار ڈال دُوں اور اس دکھاوے کے بعد انھی شرائط پر اُس سے صُلح کر لُوں کہ میں اشنار کے ساتھ حسبِ معمول خرشان پر حکمرانی کرتا رہُوں گا۔ گوما کو ختم کر دیا جائے گا اور گرانچو اُس کی جگہ خواجہ سراؤں کا بادشاہ بن جائے گا۔ پشکانی گرگوش سے نقلِ مکانی کر کے دوبارہ خرشان کے میدانوں میں آباد ہو جائیں گے اور اُنھیں خرشانیوں کے ساتھ مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

یہ صُلح بھی دکھاوے کی تھی۔ گرانچو چاہتا تھا کہ اس کے بعد پشکانیوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ختم کر دے اور جب پشکانی ختم ہو جائیں تو وہ اشنار کو اور مجھے بھی جان سے مار کر اقتدار پر قابض ہو جائے۔ اگرچہ اُس نے یہ باتیں مجھے نہیں بتائی تھیں مگر میں اُس کی چال خُوب سمجھتا تھا۔

طبلِ جنگ کی بجائے پشکانیوں نے ایک بار پھر صُلح نامے کے لیے قرنا پھُونکے اور شاہ فرزندا جس کے دائیں جانب راشی اور بائیں جانب گرانچو تھا، آگے بڑھنے لگا۔ اُسے نصف فاصلے تک آنا تھا اور نصف فاصلہ مجھے اور اشنار کو طے کر کے اُن سے بات چیت کرنا تھی۔

میں نے جھُک کر فرزیو کو ہدایات دیں اور پھر مینار سے اُتر آیا۔

جب مَیں خواتین کی فوج کے پاس سے گزرا تو مَیں نے تلوار اُٹھا کر اُنھیں سلامی دی۔ اُنھوں نے جواباً سلامی دیتے ہُوئے "ہر موجو... دیوتا" کے نعرے لگائے لیکن اشنار نے، جو پنجروں کے مرد بھی میدان میں لے آئی تھی صرف تلوار سے سلامی کا جواب دیا۔ مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ بولی۔

مَیں اُسے ساتھ لیے بغیر اکیلا ہی صُلح کی بات چیت کرنے کے لیے اس میدان کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں شاہ فرزندا، راشی اور گراچو میرے منتظر تھے۔

مَیں اُن سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔

شاہ فرزندا کچھ دیر مجھے گھورتا رہا، پھر بولا: "تم یہاں آکر شاہِ غرشان بن بیٹھے، سرفروش! بولو کیا اس بار بھی ہمارے ساتھ دھوکا کروگے یا جو کچھ تم نے گراچو کے ساتھ طے کیا ہے، اس پر عمل کرنا چاہتے ہو؟" اُس نے میری جنگ کی تیاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بات جاری رکھی: "مگر یہ نشانیاں تو اس بات کی مظہر ہیں کہ تم ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتے۔"

"مجھے تمھارے اس خیال سے اتفاق ہے، شاہ فرزندا۔" مَیں نے مسکراتے ہُوئے جواب دیا۔

یہ سُنتے ہی اس کا ہاتھ اپنی شمشیر کے قبضے پر پہنچ گیا لیکن گراچو نے بیتابی کی نمائش کرتے ہُوئے اُس کا ہاتھ روک دیا۔

"تم اتنے احمق نہیں ہو سکتے، سرفروش کہ ہمارے ساتھ دوبارہ دھوکا کرو۔ مَیں تمھیں دکھا چکا ہُوں کہ اس صُورت میں کیا ہوگا۔ ژدلے ہمارے ساتھ آئی ہے اور اس وقت شاہ فرزندا کے خیمے میں موجود ہے۔"

"میرا اندازہ بھی یہی تھا گراچو۔ مَیں تمھیں کسی قسم کا دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ میرا خیال ہے، تم جانتے ہوگے کہ مَیں نے تم سے کوئی سودے بازی نہیں کی تھی... اور نہ مَیں غرشانیوں یا اپنے آپ کو دھوکا دینا پسند کرتا ہوں۔ اگر تم جبروت یا غرشان پر قبضہ کرنا چاہتے ہو تو اسے فتح کرلو۔"

یہ کہتے ہُوئے مَیں نے کن انکھیوں سے راشی کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں مجھ پر مرتکز تھیں لیکن اُس کی آنکھوں میں نفرت کا لاوا تیر رہا تھا جس نے میری ہڈیوں میں سرد سی لہر دوڑادی۔

"تم نے میرے ساتھ بھی فریب کیا ہے، سرفروش! ہمارے مابین جو باتیں ہوئی تھیں، وہ بھی جھُوٹ ثابت ہُوئی ہیں۔" وہ غصّے سے بل کھا کر بولی۔

مَیں نے اُسے اور گراچو کو دیکھتے ہُوئے جواب دیا۔ "اور تم نے بھی مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، اُس پر پُوری نہیں اُتری ہو!"

اس پر گراچو نے قہقہہ لگاتے ہُوئے کہا: "مجھے قتل کرنے کا؟ مَیں تمھیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا، سرفروش! اور راشی تمھاری طرح احمق نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اُس کا مفاد کس سے وابستہ ہے!"

"تم نے ایک غرشانی کنیز کو مجھ پر ترجیح دی ہے، سرفروش۔ جب گراچو نے مجھے بتایا کہ تم ژدلے کو چاہتے ہو تو مجھے یقین نہ آیا۔ پھر مَیں نے خود ژدلے سے بات کی تو پتہ چلا کہ وہ بھی تمھیں چاہتی ہے اور اس جُرم میں تم دونوں کو ایسی کربناک موت ملے گی کہ خود موت بھی اس سے پناہ مانگے گی!"

"بس بس بہت باتیں ہوچکیں۔" گراچو بولا: "اگر تم نے میری تجویز کے مطابق ہتھیار نہ ڈالے تو ہم تمھیں شکستِ فاش دیں گے۔ تب پہلے ژدلے کو تمھارے سامنے اور تمھیں اُس کے سامنے ایسے تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔ لیکن اگر تم ہتھیار ڈال دو تو مَیں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا!"

میری بجائے راشی نے اسے جواب دیا: "اگر یہ ہتھیار ڈال دے تو بھی مَیں ژدلے کو نہیں بخشوں گی۔"

"سُن لیا۔ تم ایسا وعدہ کیوں کرتے ہو جسے تم نباہ نہیں سکتے۔"

میرا خیال تھا کہ ان باتوں کے دوران فرزیو ترغون فیکٹری پہنچ چُکا ہوگا جس کی چھت پر بھی مَیں نے منجنیقیں اور کمانیں نصب کروا دی تھیں۔ اُدھر گراچو غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ اب جبکہ پشکانی لشکر یہاں پہنچ گیا ہے تو مقناطیسی پردہ دوبارہ کیوں نہیں تانا گیا؟ سُرخ آندھیاں اب تک کیوں نہیں چلیں؟ آخر توانائی کا سلسلہ بحال کیوں نہیں کیا گیا؟

ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے ہُوئے تھے کہ شاہ فرزندا نے نیام سے تلوار نکال لی اور اسے لہراتا ہُوا بولا: "آؤ ہم تم آپس میں لڑکر جنگ کا فیصلہ کرلیں۔ اگر تم ہار گئے تو اقتدار ہمارے حوالے کردینا۔ اگر مَیں ہار گیا تو ہم واپس چلے جائیں گے۔"

مَیں نے بھی اپنی تلوار نکالنے میں دیر نہیں لگائی اور جواب دیا: "مجھے بخوشی یہ شرط منظور ہے۔"

راشی اور گراچو جلدی سے ہمارے درمیان آگئے۔ راشی اپنے باپ سے بولی: "کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو بابا۔ سرفروش یہی تو چاہتا ہے۔ یہ تمھیں قتل کرکے ہمیں برباد کردے گا۔ تلوار نیام میں ڈالو اور میری بات سُنو۔"

قدرت نے مجھے بڑا اچھا موقع دیا تھا مگر وہ راشی اور گراچو کی وجہ سے ختم ہوگیا۔ مَیں نے تلوار نیام میں ڈالتے ہُوئے کہا: "تم جب

چاہو، مجھ سے مقابلے کی خواہش پُوری کرسکتے ہو فرزندا۔" یہ کہہ کر مَیں واپسی کے لیے چل دیا۔ جاتے جاتے مَیں نے پلٹ کر دیکھا، راشی اور گراچو، شاہ فرزندا سے بحث میں اُلجھے ہُوئے تھے۔

مَیں سیدھا مینار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اب جنگ ناگزیر تھی اور اس کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔

مَیں نے مینار پر چڑھ کر فرزیو کو اشارہ کیا تو بڑی بڑی کمانوں سے پشکانیوں کے خیموں پر آتشگیر تیر برسنے لگے۔ مَیں نے سوچا تھا کہ اگر اگلے خیموں میں آگ لگ گئی تو ہَوا اسے دُوسرے خیموں تک بآسانی پھیلا دے گی۔ مگر تیروں کی پہلی باڑ خیموں تک نہ پہنچ سکی۔ مَیں نے فرزیو کو کمانیں نشانے پر کرنے کا اشارہ کیا۔

اس بار تیر نشانے پر بیٹھے اور بہت سے خیموں میں آگ لگ گئی۔

اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ راشی، ژدلے کو فرزندا کے خیمے سے باہر لے آئی ہے۔ اُس کے ہاتھ پُشت پر بندھے ہُوئے تھے اور راشی اُسے طمانچے مار رہی تھی مگر ژدلے طمانچوں کی بارش میں بھی سربلند کھڑی رہی... پھر جلتے ہُوئے خیموں کے دُھوئیں نے اُسے میری نگاہوں سے چھُپا لیا۔

چند لمحے بعد جب دُھواں ہَوا میں تحلیل ہُوا تو مَیں نے دیکھا کہ سپاہیوں نے ژدلے کو زمین پر گرا دیا ہے اور گراچو چار گھڑ سواروں کو بلا رہا ہے۔ اتنے میں مجھے اشنار مینار پر چڑھتی دکھائی دے گئی۔ وہ میرے پاس آرہی تھی۔ مَیں ژدلے کی طرف سے انجان سا بن گیا۔ جیسے مجھے اس نظارے سے کوئی غرض، کوئی واسطہ اور کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

اشنار اُوپر آکر میرے ساتھ کھڑی ہوگئی اور اُدھر دیکھنے لگی۔

ژدلے کے ہاتھ پاؤں الگ الگ گھوڑوں سے باندھ دیے گئے تھے اور ان گھوڑوں کا رُخ متضاد سمتوں میں تھا۔ مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ گراچو اتنی جلد بازی سے کام لے گا مگر وہ جُوا کھیلنے پر تُل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ حالات بگڑتے دیکھ کر وہ ژدلے کے عوض مجھ سے سودے بازی پر مجبُور ہو جائے گا مگر یہ صُورتِ حال میری سوچ کے بالکل برعکس تھی۔

"وہ عورت کون ہے؟ یہ کوئی کنیز دکھائی دیتی ہے۔" اشنار نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں، اُس کا نام ژدلے ہے۔ شاید۔" مَیں نے بے پروائی سے جواب دیا: "گوملا نے مجھے بتایا تھا کہ اُسے سزا کے طور پر گراچو کے پاس بھیجا گیا تھا۔ گوما اس کے ذریعے جاسُوسی کرنا چاہتا تھا۔ شاید گراچو کو اس بات کا علم ہوگیا ہے۔ اس لیے وہ اُسے جاسوسی کرنے کی سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح ہم خوفزدہ ہوجائیں گے اور ہتھیار ڈال دیں گے۔"

"تو پھر وہ اس سزا پر عمل درآمد کیوں نہیں کر رہا؟" اشنار نے پوچھا: "اُسے کس بات کا انتظار ہے؟"

"یہ تو گراچو ہی بہتر جانتا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم۔" مَیں نے دُرشتی سے جواب دیا: "اب تم اپنے دستے میں واپس جاؤ اور یاد رکھو کہ تمھیں وہی کرنا ہے، جو مَیں کہوں گا۔"

اشنار نے بڑی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی: "اچھی بات ہے، سرفروش... مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ہم توانائی کا سلسلہ بحال کرکے اپنے دُشمنوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں تو تم جنگ کیوں کرنا چاہتے ہو؟ غرشانیوں کو اُن کی زندگی سے کیوں قتل کروانا چاہتے ہو؟"

"مَیں اپنے احکام کی وضاحت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ جاؤ اور وہی کرو جو تم سے کہا جارہا ہے۔"

اشنار پیچ و تاب کھاتی ہوئی مینار سے اُترنے لگی اور مَیں نے سوچا کہ اب مجھے نہ صرف اپنے عقب سے ہوشیار رہنا پڑے گا بلکہ میری زندگی اور اس جوئے کا دار و مدار اس بات پر بھی ہے کہ کہیں گوما، اشنار کے دباؤ میں آکر توانائی کا سلسلہ نہ بحال کردے۔

مَیں نے ایک بار پھر پشکانی لشکر کی طرف دیکھا۔ اب شاہ فرزندا اپنے لشکر کو دو صفوں میں ترتیب دے رہا تھا۔ ان کے بیشتر خیمے جل چکے تھے... مگر اُنھیں اُن کی پروا نہیں تھی۔ شاید لشکریوں کو یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ اب وہ خیموں میں نہیں بلکہ جبروت کے پُختہ مکانات میں رہیں گے۔

مَیں نے فرزیو کو دُوسرا سگنل دیا۔ وہ ترغون فیکٹری کی چھت پر منجنیقوں کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے میرا اشارہ پاتے ہی پے در پے ترغون کے بنے ہُوئے گولے پشکانی لشکر پر پھینکنے شروع کردیے۔ ان گولوں نے بہت سے پشکانیوں کو گوشت کے لوتھڑوں میں بدل دیا... مگر فرزندا نے اپنی صف بندی جاری رکھی۔ ایک گولا اُس کے بہت قریب گرا... مگر اُس نے ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ وہ وحشی بلاشبہ بے حد بہادر تھا۔

مَیں نے دیکھا کہ پشکانی لشکر کے پیچھے رتھ جوتے جارہے تھے۔ رتھوں کے پہیوں کے ساتھ لگے ہُوئے خنجر دُور سے چمک رہے تھے اور اُن کی یہ چمک ہمارے غلام سپاہیوں کو ڈرانے اور بھگانے کے لیے کافی تھی... مگر اس کے باوجود مَیں نے پشکانیوں کی مقدس تلوار نکالی اور اُسے سر سے بلند کرتے ہُوئے چلّایا۔

"بزدل پشکانیو... ادھر دیکھو۔ یہ رہی تمھاری مقدس تلوار۔ تم میں ہمت ہے تو آؤ اور اسے چھین لے جاؤ!"

میری اس للکار نے جیسے شاہ فرزندا اور اُس کے لشکریوں کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ مَیں نے فرزینو کو اشارہ کیا۔ منجنیقوں نے گولے اور کمانوں نے تیر برسانے شروع کر دیے اور یُوں یلغار کرتے ہوئے پشکانیوں کے قدم رُک گئے۔ اُن میں سے بہت سے ڈھیر ہو گئے۔ اتنے میں شاہ فرزندا کی آواز سنائی دی۔ وہ پشکانیوں کو واپس بُلا رہا تھا۔ پشکانی تیزی سے پیچھے ہٹ گئے اور اُن کی جگہ گرانچو کے وحشی سپاہی آگے بڑھنے لگے۔ وہ اپنے آدمی بچانا اور گرانچو کے وحشیوں کو جنگ کا ایندھن بنانا چاہتا تھا تاکہ جب ہم اپنا "اسلحہ" ختم کر بیٹھیں تو وہ آگے بڑھ کر ہمیں اپنی تلواروں اور نیزوں پر رکھ لیں۔

مَیں نے بھی شاہ فرزندا کی چال دُہرائی۔ وحشی سپاہیوں کو آگے بڑھایا۔ اُن کے پیچھے خواجہ سرا ماسٹر تھے۔ اُن ماسٹروں کی راہِ فرار مسدُود کرنے کے لیے مَیں نے پنجروں والے مردوں کو اُن کے پیچھے بھیج دیا۔ اشنار نے احتجاج تو کیا مگر میرا حُکم رَد کرنے کی جراٴت نہ کر سکی۔

میرے وحشی سپاہی گرانچو کے وحشی سپاہیوں سے ٹکرا گئے۔ خواجہ سرا ماسٹر بھاگنے لگے تو پنجروں والے مردوں نے اُن پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ خواجہ سراؤں نے اپنا غصّہ سپاہیوں پر اُتارا اور وہ اپنا غصّہ گرانچو کے سپاہیوں پر اُتارنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گرانچو کے سپاہی میدان سے بھاگ نکلے۔

جنگ کا پہلا پانسہ میرے حق میں پڑا۔

مَیں نے نعرہ لگایا تو عورتوں کی فوج نے بھی جوش و خروش سے نعرے لگانے شروع کر دیے... مگر مَیں نے دیکھا کہ اشنار کا چہرہ راکھ ہو رہا تھا۔

مَیں نے میدانِ جنگ پر نظر ڈالی۔

گرانچو کے سپاہی پسپا ہو چکے تھے۔ مَیں نے اپنے بچے کُھچے سپاہیوں کو واپس بُلا لیا تاکہ وہ تازہ دم ہو جائیں اور چلّایا "بزدل پشکانیو۔ تمھارا بھی یہی حشر ہو گا۔"

یہ سُنتے ہی شاہ فرزندا نے تلوار لہرا کر اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا تو وہ نقاروں کے تیز نقاپ کے ساتھ آگے بڑھنے لگے لیکن اُن کا رُخ اُس طرف نہیں تھا جہاں وحشی غلام ایک دُوسرے سے ٹکرائے تھے۔ وہ اُن سے قدرے ہٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، قدرت میرا ساتھ دے رہی ہے کیونکہ وہ اُس حصّے کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے جدھر مَیں نے ناکہ بندی کے لیے زعفون کی شفاف رسّیوں سے راستہ بند کر رکھا تھا اور زمین میں نوک دار کھونٹے گاڑ دیے تھے۔

پشکانی نقاروں کی پُرجوش تال پر اندھا دُھند آگے بڑھے تو رسّیوں سے ٹکرا کر کھونٹوں سے زخمی ہونے لگے۔ اُوپر سے تیروں کی بوچھار نے اُن کے کُشتوں کے پُشتے لگا دیے مگر اُن کی پیش قدمی میں فرق نہ آیا۔ ایک کے پیچھے دُوسری صف آگے بڑھتی رہی۔ مَیں نے دیکھا کہ شاہ فرزندا اگرچہ زخمی ہو چکا ہے مگر اُن کو جوش دلانے کے لیے خود بھی لاشوں کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میدان میں کُود کر اُس سے دو دو ہاتھ کروں۔ مجھے یقین تھا کہ مَیں اسے تہ تیغ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا اور جب اُس کے وحشی لشکری اپنے بادشاہ کا سر مقدس نیزے کی نوک پر بلند دیکھیں گے تو ہتھیار ڈال دیں گے مگر اتنے میں میری نگاہ رتھوں پر جا پڑی جنھیں صف آرا کیا جا رہا تھا اور اُن کی صف آرائی راشنی کر رہی تھی۔

اب مینار سے اُترنا میرے لیے بے حد خطرناک ہو سکتا تھا۔ مَیں رتھوں پر نظر نہ رکھ سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا کہ اُنھیں کس رُخ سے یا کدھر کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔

عین اُسی وقت مجھے اشنار کا پیغام مِلا کہ وہ پشکانیوں پر حملہ کر دے؟ مَیں نے پہلے تو انکار کر دیا مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا: "بشرطیکہ اس حملے میں خواتین کا دستہ شامل نہ ہو۔"

اس بات سے میرا مقصد یہ تھا کہ بچے کُھچے مردوں کے ساتھ اوّل تو وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے گی اور اگر اُس نے حملہ کیا بھی تو باقی ماندہ پنجروں والے مرد بھی ختم ہو جائیں گے۔ تب اُسے افزائشِ نسل کے لیے تندرست و توانا مردوں کی اہمیت کا احساس ہو گا اور وہ سارے پشکانیوں کو ختم کرنے کے خیال سے دست کش ہو جائے گی۔

مَیں نے دیکھا کہ اب بھی پشکانیوں کی چار صفیں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اتنے میں اشنار بچے کُھچے مردوں کے ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑی۔

مَیں اُسے اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا کہ وہ خود میدانِ جنگ میں کُود جائے گی... مگر شاید وہ اپنی دھاک بٹھانا چاہتی تھی یا پھر یہ چاہتی تھی کہ مجھے ختم کرنے کے بعد کوئی اُس پر اعتراض کی جراٴت نہ کر سکے۔

شاہ فرزندا کے خونخوار لشکری اشنار کے ساتھیوں پر بھوکے

بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے مگر اُنھوں نے بھی جم کر مقابلہ کیا کیونکہ اشنار اُن کے ساتھ تھی۔ اتنے میں شاہ فرزندا، اشنار کی طرف لپکا۔ اشنار کے لیے فرار کی کوئی صُورت نہیں تھی، اس لیے وہ اُس سے مقابلے پر ڈٹ گئی اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ فرزندا پر حملے میں پہل بھی اُسی نے کی تھی۔ شاہ فرزندا نے اُس کی تلوار، اپنی تلوار پر روکی تو مَیں صُورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے مینار سے کُود گیا۔

اگرچہ مَیں اندھا دُھند اُس طرف بھاگ رہا تھا اور راستے میں متعدد رکاوٹیں تھیں... مگر میری نگاہیں اشنار اور فرزندا پر مرتکز رہیں۔

مَیں نے دیکھا کہ فرزندا نے اپنی تلوار پر ذرا سا دباؤ ڈال کر اشنار کی تلوار کو دُور پھینک دیا۔ اب اشنار خالی ہاتھ تھی مگر اُس نے عقل مندی یہ کی کہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی اور اس کے دو ساتھی درمیان آ گئے۔

ابھی مَیں اُن سے تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر تھا کہ فرزندا نے اُن دونوں کا کام تمام کر دیا اور اندھا دُھند اشنار کی طرف لپکا مگر بیچ میں پڑے ایک پشکانی سے ٹکرا گیا جسے کمان سے پھینکے جانے والے بھالے نے مار گرایا تھا اور بھالا ابھی تک اُس کے سینے میں پیوست تھا۔ فرزندا نے جھنجلاتے ہوئے اپنے ہی سپاہی پر تلوار سے ضرب لگا کر اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا اور پھر اشنار کی طرف لپکا۔

اب موت اشنار کے سامنے تھی۔

شاہ فرزندا نے وحشیانہ نعرہ لگایا اور تلوار سر سے بلند کر لی تاکہ ایک ہی وار میں اشنار کے دو ٹکڑے کر دے لیکن اتنے میں مَیں وہاں پہنچ گیا... اور میری تلوار فرزندا کی تلوار سے ٹکرا گئی۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔" مَیں نے اشنار سے کہا۔

اشنار پیچھے ہٹ گئی پھر میرے اور فرزندا کے درمیان مقابلہ ہونے لگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ فرزندا بے حد موٹا ہونے کے باوجُود نوجوانوں سے زیادہ پُھرتیلا تھا اور غوطار سے کہیں زیادہ بہتر شمشیر زن تھا۔ مجھے اپنی شمشیر زنی پر ناز تھا لیکن فرزندا سے مقابلہ کرتے ہوئے پتہ چلا کہ مَیں نے اُس کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔

وہ پینترے بدل بدل کر مجھ پر وار کر رہا تھا اور میرے لیے اس پر وار کرنا تو کُجا، اپنا دفاع کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا کہ اتنے میں چند پشکانی سپاہی بھی اپنے بادشاہ کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔

اشنار وہاں سے جا چکی تھی۔

اس کے پنجروں والے سارے مرد مر چکے تھے اور فرزینو منجنیقوں سے میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس طرح مَیں خود بھی اُن کی زد میں آ کر ہلاک ہو سکتا تھا۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ مَیں شمشیر زنی کے ساتھ ساتھ مارشل آرٹس سے بھی کام لُوں۔ ہرچند کہ مَیں بُری طرح گِھر چکا تھا مگر میرے ہاتھ اور پیر الگ الگ اپنا کام دکھا رہے تھے۔ اتنے میں عورتوں کی فوج کا ایک دستہ پُرجوش نعرے لگاتا ہوا ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔

یہ شاید اشنار کی کارستانی تھا۔ مَیں ابھی اُنھیں جنگ کا ایندھن نہیں بنانا چاہتا تھا مگر اشنار کی حماقت نے اُنھیں میدانِ جنگ میں دھکیل دیا تھا۔

پشکانیوں نے اپنی زندگی میں ایسی خوبصُورت عورتیں کبھی نہیں دیکھی تھیں اس لیے وہ ہکّا بکّا سے ہو کر اُنھیں دیکھنے لگے۔ ان عورتوں نے بھی ایسے وجیہہ جوان نہیں دیکھے تھے اس لیے وہ بھی لڑنا بھُول گئیں اور وہ ہماری طرف سے غافل ہو گئے۔ اتنے میں شاہ فرزندا نے مجھ پر وار کرتے ہوئے کہا: "آج میری تلوار تمھارا خُون چاٹ کر ہی رہے گی، دھوکے باز!"

"شکست تمھارا مقدر بن چکی ہے فرزندا... اور یہ شکست بھی تمھیں عورتوں کے ہاتھوں نصیب ہو گی۔"

میری یہ بات دراصل ایک نفسیاتی حربہ تھی۔ جُونہی عورتوں نے یہ الفاظ سُنے، وہ فرزندا کے لشکریوں پر ٹوٹ پڑیں اور اُن کا صفایا کرنے لگیں۔ شاہ فرزندا کی توجہ اُدھر منعطف ہوئی تو میری تلوار نے اُس کا بازُو زخمی کر دیا۔ فرزندا کے مُنہ سے ایک ہیبت ناک چیخ نکلی مگر اُس نے تلوار اپنے بائیں ہاتھ میں منتقل کر لی۔

وہ ایک ماہر شمشیر زن ضرور تھا لیکن ایک طرف تو وہ زخمی ہو چکا تھا، دُوسری طرف اُس کا بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ جیسی کارکردگی نہیں دکھا سکتا تھا۔ چنانچہ اُس کے زخموں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا اور پھر وہ نڈھال ہو کر گرا تو میری آخری ضرب نے اس کی گردن تن سے جُدا کر دی۔

مَیں نے فوراً ہی اُس کا سر قریب پڑے نیزے پر بلند کیا اور نعرہ لگایا۔

"ادھر دیکھو پشکانیو! دیکھو کہ مَیں نے تمھارے بادشاہ کا کیا حشر کیا ہے۔"

پشکانیوں نے جب شاہ فرزندا کا بریدہ سر میرے نیزے کی نوک پر بلند دیکھا تو اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔ وہ تیزی سے پسپا ہونے لگے جب کہ باقی ماندہ، عورتوں کی فوج بھی نعرے لگاتی میدان میں آ گئی۔

مَیں نے اب تک گرانچو اور ٹوڈلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ دراصل مجھے اُن کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں مِلا تھا،

اب جو مَیں نے اُدھر دیکھا تو وہاں نہ گرا یخو تھا اور نہ ہی ژولے... البتہ مجھے جلے ہُوئے خیموں کے عقب میں ایک رتھ پر راشی ضرور دکھائی دے گئی۔ مَیں نے پُوری آواز کے ساتھ چلّا کر اسے مخاطب کیا۔

"راشی!... اِدھر دیکھو راشی۔ تمھارا سر بریدہ باپ تمھیں بُلا رہا ہے۔"

راشی نے میری طرف یا اپنے باپ کے کٹے ہُوئے سر کی طرف دیکھا تو فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اُس نے کمر سے بندھا ہُوا قرنا اپنے لبوں سے لگایا اور اُسے پھُونکنے لگی۔

قرنا کی آواز کے ساتھ ہی سارے رتھ ایک قوس کی صُورت میدان میں بڑھنے لگے۔ ہر رتھ پر ایک رتھ بان اور ایک تیر انداز سوار تھا اور ہر رتھ کو دو دو گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے راشی اپنے باپ کا بریدہ سر دیکھ کر پاگل ہو گئی ہو۔

وہ بڑے زوروں سے قرنا پھُونکے جا رہی تھی جس کے ساتھ ساتھ رتھوں کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اُدھر میدان میں عورتوں کی ساری فوج، بھاگتے ہُوئے پشکانیوں کا پیچھا کر رہی تھی ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچی ہُوئی تھی۔

رتھ بان جوش میں گھوڑوں پر کوڑے برسا رہے تھے۔ اُنھیں یہ احساس تک نہیں رہا تھا کہ خود اُن کے اپنے لشکری رتھوں کی زد میں آ رہے ہیں۔ مَیں نے یہ صُورتِ حال دیکھ کر چیختے ہُوئے عورتوں کو حکم دیا۔

"بھاگو... محفوظ مقام کی طرف بھاگو... اپنے آپ کو بچاؤ۔"

خُدا کا شکر ہے کہ عورتوں کی فوج اشنار کی کمان میں ہونے کے باوجُود اُس کی طرح ضدی نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اُنھیں مجھ پر اندھا اعتماد ہے۔ مَیں نے ہرکارے سے اطلاع ملتے ہی رتھوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک خندق کھدوالی تھی اور یہ خندق پودوں کے خشک پودوں سے اس طرح پاٹ دی گئی تھی کہ بظاہر میدان کا حصّہ نظر آتی تھی۔ عورتیں اس محفوظ مقام کی طرف بھاگیں تو راشی نے رتھوں کو اسی طرف موڑنے کا حکم دے دیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہاں اُس کے لیے پہلے سے جال بچھا دیا گیا ہے۔

رتھ بان گھوڑوں پر چابک برساتے ہُوئے اُدھر آئے تو بیشتر رتھ خندق میں گر پڑے اور تباہ ہو گئے۔ اُوپر سے عورتوں کی فوج نے اُن پر نیزے پھینکنے شروع کر دیے۔

راشی نے اپنے رتھ بان کو دھکّا دے کر خُود باگیں سنبھال لیں اور رتھ کا رُخ میری طرف موڑ دیا... مگر اُس وقت تک وہ تیروں

سے زخمی ہو چکی تھی۔ اُس نے ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں نیزہ اُٹھا رکھا تھا۔ وہ تلوار والے ہاتھ سے گھوڑوں کی باگیں بھی تھامے ہُوئے تھی۔

جب وہ میرے قریب آئی تو مَیں نے فرونداکا سر اُس کی طرف اُچھالا مگر وہ جھکائی دے کر بچ گئی۔ اُس کے ساتھ ہی اس نے مجھ پر نیزے سے وار کیا۔ جس نے میرا بایاں بازُو زخمی کر دیا... مگر یہ زخم کاری نہیں تھا۔ اتنے میں اُس کے پیچھے سے دُوسرا رتھ گزرا تو مَیں لپک کر اُس پر سوار ہو گیا۔ تیر انداز نے مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے کمان پھینک دی اور رتھ سے کُود گیا۔ رتھ بان کو مَیں نے اُٹھا کر نیچے پھینک دیا اور گھوڑوں کی راسیں سنبھال لیں۔

راشی اپنا رتھ موڑ کر میرے رتھ کے قریب لے آئی تھی اور اب پہلو سے رتھ ٹکرا کر میرے رتھ کو اُلٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میرے رتھ میں صرف دو گھوڑے تھے جبکہ اُس کے رتھ میں چار گھوڑے جُتے ہُوئے تھے۔ مَیں اپنے رتھ کو گرنے سے بچانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھ پر نیزے سے حملہ آور ہو جاتی۔ مَیں اپنے آپ کو نیزے کی زد سے بچاتا تو میرا رتھ بے قابو ہونے لگتا۔

یہ صُورتِ حال کافی دیر تک جاری رہی۔

ہمارے رتھ ایک دُوسرے کے ساتھ لگے، میدان میں چکر کاٹتے رہے۔

ایک بار راشی نے نیزے سے مجھ پر وار کیا تو مَیں اُس کا نیزہ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ مَیں نے نیزے کو زور سے کھینچا تو اُس نے نیزہ چھوڑ دیا اور مَیں رتھ سے گرتے گرتے بچا۔ عین اُسی وقت اُس نے خنجر تولا اور مجھ پر پھینکنے ہی والی تھی کہ اُس کی پُشت میں ایک بھالا پیوست ہو گیا۔ وہ لڑکھڑائی اور رتھ میں گر پڑی۔

مَیں سنبھلا اور اس کے چار گھوڑوں والے رتھ پر کُود گیا لیکن وہ میرے کُودنے سے پہلے ہی دم توڑ چکی تھی۔ مَیں نے بے لگام گھوڑوں کی راسیں سنبھالیں اور رتھ روک لیا۔

معاً مجھے اپنے پیچھے ایک اور رتھ رُکنے کی آواز آئی۔ مَیں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ اس رتھ میں پشکانیوں کی بجائے اشنار اور ایک خواجہ سرا سوار تھا۔

"تم نے مجھے فروندا کے ہاتھوں مرنے سے بچایا تھا سرفروش۔ مَیں نے اُس احسان کا بدلہ چُکا دیا ہے۔ راشی کو بھالا مَیں نے مارا تھا اور اگر مَیں اُسے وقت پر نہ مار دیتی تو اس وقت تم مر چکے ہوتے۔" اشنار نے کہا۔

"مَیں تمھارا شکر گزار ہُوں۔" مَیں نے جواب دیا۔

"شکر گزار تو مَیں بھی ہُوں کہ تمھاری وجہ سے ہم نے پشکانیوں پر فتح پائی ہے۔ ہم نے بہت سے پشکانیوں کو پکڑ لیا ہے۔ ہم ہر خاتون کے لیے ایک ایک پشکانی رکھ کر باقی سب کو ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"یہ باتیں پیش از وقت ہیں اشنار۔" مَیں نے ہانپتے ہُوئے کہا۔ "بعد میں اطمینان سے فیصلہ کر لینا۔"

"تم بہت تھک گئے ہو سرفروش دیوتا۔" وہ بولی اور پھر خواجہ سرا سے مخاطب ہُوئی۔ "دیوتا کو فتح کا جام پلاؤ ارمیدی۔"

خواجہ سرا نے صراحی سے جام بھر کر میری طرف بڑھا دیا۔

"فتح کا جام پہلے تم پیو اشنار۔" مَیں نے کہا۔

"نہیں مَیں بعد میں پیوں گی۔ پہلا حق تمھارا ہے۔" اُس نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

اچانک مجھے گوما کی باتیں یاد آ گئیں۔

اُس نے کہا تھا کہ اشنار پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اُوپر سے کچھ دکھائی دیتی ہے مگر اندر سے کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ خُود مجھے بھی اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مَیں نے خواجہ سرا سے کہا۔ "یہ خمرشان کی فتح کا جام ہے۔ یہ خمرشان کے عوام کی فتح ہے اس لیے پہلا جام یہ خواجہ سرا پیے گا۔"

یہ سُنتے ہی خواجہ سرا بے ساختہ بول اُٹھا۔ "نہیں نہیں دیوتا۔ مَیں زہر نہیں پیوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے صراحی پھینکی اور رتھ سے کُود کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مَیں نے قہقہہ لگایا اور جام راشی کی لاش پر انڈیلتے ہُوئے کہا۔ "تمھیں فتح مبارک ہو اشنار! مَیں گرا یخو کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

"گرا یخو کی یا اُس کنیز کی تلاش میں... مَیں خوب سمجھتی ہُوں سرفروش۔" وہ تنک کر بولی۔

"تمھارا جو جی چاہے، سمجھتی رہو۔" مَیں نے کہا اور گھوڑوں کی باگیں سنبھال لیں۔ گھوڑے اب تازہ دم ہو چکے تھے۔

مَیں رتھ دوڑاتا ہُوا سوختہ خیموں کے قریب پہنچا۔ شاہ فروندا کا خیمہ خالی تھا۔ مَیں نے ایک زخمی پشکانی سے پوچھا۔ "گرا یخو کہاں ہے؟"

"وہ کنیز کو اپنے رتھ میں بٹھا کر فرار ہو گیا ہے دیوتا۔"

"کس طرف گیا ہے وہ؟"

"اُدھر..." اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ایک جانب اشارہ کیا۔

مَیں نے رتھ اسی طرف موڑ لیا۔

میرا رتھ سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

آگے جا کر یہ راستہ تنگ ہوتا گیا۔ اس کے دونوں جانب پودوں کے کھیت تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے والے

کچھ پشکانی گھوڑوں کی ٹاپیں سُن کر بے دلے کے کھیتوں میں رُوپوش ہو رہے ہیں۔ وہ شاید گرگوش کی طرف واپس جا رہے تھے۔

مجھے وقت گزرنے کا احساس نہ ہُوا۔ میرا رتھ نہ جانے کب تک دوڑتا رہا۔

اچانک مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے طوفانوں کے دروازے کھول دیے ہوں۔ ہَوا کے ایک بے حد تیز تھپیڑے نے مجھے رتھ سے نیچے گرا دیا۔ غنیمت ہے کہ مَیں پیٹھ کے بل گِرا تھا۔ اگر مَیں سر کے بل گرتا تو یقیناً میری کھوپڑی ٹوٹ جاتی۔ میرے رتھ کو بھی شدید جھٹکا لگا تھا اور وہ اُلٹتے اُلٹتے بچا تھا۔

مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے دُور اُفق پر دُھویں کا ایک بہت بڑا درخت نُما، بادل نظر آیا جو ہر لمحے بلند ہوتا جا رہا تھا۔

مَیں دوبارہ رتھ پر سوار ہُوا اور اپنے سفر پر گامزن ہو گیا۔

بے دلے کے سائے لمبے ہو چلے تھے کہ اچانک مجھے دُور ایک رتھ دکھائی دیا۔ اُس رتھ کے ساتھ ژردلے بھی کھڑی تھی۔ جب میرا رتھ قریب پہنچا تو مجھے رتھ میں لیٹا ہُوا گراغو بھی نظر آ گیا۔ مَیں نے اپنا رتھ اُس کے پیچھے روک دیا اور اُتر کر ژردلے کے قریب جا پہنچا۔

ہر چند کہ ژردلے بڑے کرب، بڑے عذاب اور بے پناہ عقوبتوں سے گزری تھی مگر اس وقت مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر جو معصوم مسکراہٹ اُتری، اُس نے ژردلے کو ایسا ملکوتی حُسن بخش دیا جس کی یاد آج بھی میرے دل میں گلاب سے کھلا دیتی ہے۔ وہ اپنی باہیں پھیلاتے ہُوئے بولی۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے دیوتا!"

"اور میرا دل بھی یہ گواہی دیا کرتا تھا کہ تم مجھے ضرور ملو گی۔۔ اور ۔۔۔ اور مَیں اس بدبخت خواجہ سرا سے تم پر کیے جانے والے ہر ظلم کا بدلہ لے کر رہوں گا۔"

"لیکن اب آپ ایسا نہیں کر سکیں گے دیوتا!"

"وہ کیوں؟" مَیں چونک پڑا۔

"اس لیے کہ گراغو مر چکا ہے۔"

"مر چکا ہے؟" مَیں نے تعجب سے دُہرایا۔ "کس نے مارا ہے اسے؟"

"اس نے خودکشی کی ہے دیوتا!"

"کیوں؟" میری حیرت ابھی تک رفع نہیں ہوئی تھی۔

"کیونکہ جبردت تباہ ہو چکا ہے۔ اس کی جوہری توانائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی گراغو کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہُوا کہ جبردت کی توانائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے؟"

"مجھے گراغو نے بتایا تھا دیوتا! ہمارے رتھ کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ پھر اُس نے شمال سے دُھواں اُٹھتے دیکھ کر کہا تھا کہ سرفروش دیوتا ہے۔ اُس نے جوہری توانائی ختم کر دی ہے۔ اب میرے سارے خواب مر گئے ہیں اس لیے مَیں بھی مرنا چاہتا ہُوں یہ کہہ کر اُس نے ایک سُنہری گولی نکالی اور اسے کھا کر مر گیا۔ آپ نے توانائی کیوں ختم کر دی دیوتا؟"

"توانائی مَیں نے نہیں گوما نے ختم کی ہو گی۔ وہ جبردت اور خرشان کو نئی زندگی دینا چاہتا تھا، وہ زندگی جو فطری ہے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ سائنس کا ارتقا اور اُس کی عطا کردہ آسائشیں انسان کو فطرت سے مذہب سے اور خُدا سے دُور کر دیتی ہیں ۔۔۔ پھر وہ انسان نہیں رہتا بلکہ مشین بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ سائنسی ارتقا ختم ہو جانا چاہیے تا کہ انسان خُدا کی طرف لوٹ سکے مگر وہ کہتا تھا کہ لوگ اُس کی بات نہیں سُنتے اور اسے بُڈھا خبطی سمجھتے ہیں۔"

"اب کیا ہو گا دیوتا؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"خرشان کو نئی زندگی ملے گی ژردلے۔ خرشان کے انسان نئی زندگی سے آشنا ہوں گے۔ اُنھیں محنت تو ضرور کرنا پڑے گی مگر وہ خُدا سے قریب ہو جائیں گے۔"

"یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں دیوتا!"

"مجھے دیوتا مت کہو ژردلے۔ مَیں انسان ہوں اور انسان ہی رہنا چاہتا ہُوں۔ آؤ چلیں۔"

مَیں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہم چار گھوڑوں والے رتھ کی طرف بڑھ گئے۔۔۔ لیکن اُسی لمحے عقب سے ایک خونخوار قہقہہ سنائی دیا اور ہم دونوں ٹھٹک گئے۔ مَیں نے چونک کر پلٹتے ہُوئے آواز کی طرف دیکھا اور پھر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میری سانسوں کی آمد و رفت اچانک ہی رُک گئی ہو۔

دُوسرے رتھ سے گراغو کی لاش آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھی۔ لاش کے قہقہے بے حد خوفناک تھے۔ ژردلے مارے خوف کے مجھ سے چمٹ گئی اور خود میرا جسم بھی ہلکی ہلکی کپکپاہٹوں کا شکار ہو گیا۔

اس کے بعد "سرفروش" کے دوسرے حصے کا مطالعہ کریں


سرفروش
2
اظہر
کلیم

میں نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

گرانجو کی لاش اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ہونٹوں پر بڑا ہی مکروہ تبسم پھیل گیا۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل اس نے خوفناک قہقہے لگائے تھے، ان کی گونج ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھی۔ مُردے نے ایک جھٹکا کھایا اور پھر اگر رتھ میں ڈھیر ہو گئی۔

میرے رتھ میں ایک بھالا موجود تھا۔

میں وہ بھالا اُٹھا لایا۔

مسٹر فردوس! گرانجو نے ہاتھ اُٹھا کر کہا: میں سنہری گولی کھا چکا ہوں، اس لیے میرے تجربے ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن میں اب تک صرف اس لیے زندہ ہوں کہ مجھے تم سے انتقام لینا ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم کسی اور سرزمین سے یہاں آئے ہو اور تمہیں یہاں سے بُلایا بھی جا سکتا ہے... لیکن ایسا نہیں ہو گا۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ منتقل کر رہا ہوں جہاں تم زندہ رہو گے اور موت کو ترسو گے۔ اس نے اپنے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک عجیب سی چیز نکالی اور اُسے میری طرف پھینک دیا۔

اُسی لمحے میں نے بھالا اُس کی طرف پھینکا۔

بھالا اُس کے جسم میں یوں پیوست ہو گیا جیسے وہ گوشت پوست کی بجائے موم کا بنا ہوا نرم نرم سا پُتلا ہو۔ وہ گر گیا۔ اس نے میری طرف جو چیز پھینکی تھی، اس کی وجہ سے ایک زبردست جھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے چاروں طرف سے اندھیروں اور دُھند نے یلغار کر دی ہو۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مُردے کی طرف دیکھا لیکن ہر چیز تاریکی اور دُھند کی دبیز تہوں میں چھپتی جا رہی تھی۔

میں رتھ ہی میں گر گیا۔

میرا ذہن ڈوب رہا تھا... اور ڈوبتے ذہن سے مجھے صرف آخری بار گھوڑوں کی ہنہناہٹ سُنائی دی تھی اس کے بعد جیسے ہر چیز پگھل گئی تھی۔ میرا وجود اس پگھلے ہوئے سیال میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔

❁

جب مجھے ہوش آیا تو میں اوندھے مُنہ لیٹا ہوا تھا اور میرے سر میں شدید درد تھا۔ ماضی کے ہر سفر میں جب کمپیوٹر مجھے نئی سرزمین پر منتقل کرتا تھا، میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا تھا... لیکن اس بار مجھے کمپیوٹر نے نہیں بلکہ ایک خبیث شخصیت نے نہ جانے کہاں منتقل کر دیا تھا۔ میں کچھ دیر یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب میرے سر کا درد ہلکا ہوا تو میں نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں کسی پارک نما جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ نیچے سبزہ زار تھا اور اردگرد جھاڑیاں، پھول، درخت اور روشیں تھیں لیکن ہر طرف ایک

بے کراں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چہار سُو عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اُسے نہ دن کی روشنی کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی یہ چاندنی تھی۔ صبحِ کاذب تھا اور نہ ہی شام کا جھٹپٹا تھا بلکہ یُوں محسوس ہوا جیسے سُورج بادلوں کی اوٹ میں چھُپ کر پیلی پیلی سی روشنی بکھیر رہا ہو۔

مجھ پر عجیب سی دہشت سوار تھی اور یہ دہشت اُس بے پایاں خاموشی کے باعث تھی جس میں مجھے اپنی دھڑکنیں بھی صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ یہ سناٹا میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے سبزے پر ہاتھ پھیرا تو دو باتوں نے مجھے بُری طرح چونکا دیا پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ سبزہ مصنوعی تھا بالکل اُسی ٹرف کی مانند جو کھیل کے میدانوں میں بچھایا جاتا ہے اور دوسری بات یہ کہ اُس پر ہاتھ پھیرنے سے ایسی آواز پیدا ہُوئی جیسے کوئی آدمی لمبی لمبی خشک گھاس پر چل رہا ہو۔ شاید یہ اسی بے کراں خاموشی کا کرشمہ تھا جس نے اُس معمولی سی آواز کو کئی گُنا بڑھا دیا تھا۔

کافی دیر تک مجھے کوئی آواز سُنائی نہ دی تو میں اُٹھ کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ یُوں محسوس ہُوا جیسے تمام درخت، پھُول اور جھاڑیاں پلاسٹک کی بنی ہُوئی ہوں۔

میں نے روشنی کا مخرج تلاش کرنے کے لیے نگاہ اُوپر کی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ آسماں پر بہت بڑا چاند چمک رہا تھا یُوں لگتا تھا جیسے یہ سرزمین چاند کے بالکل قریب واقع ہو یا چانداس سرزمین کے اتنے قریب آ گیا ہو کہ اگر میں اُس پر ہوتا تو اس دُنیا کی ہر چیز بآسانی دیکھ لیتا... پھر یہ بھی عجیب سی بات تھی کہ اُس چاند سے کرنیں نہیں بلکہ روشنی کے موٹے موٹے دھارے پھُوٹ رہے تھے۔ جیسے وہاں سے اس سرزمین پر اسپاٹ لائٹ ڈالی جا رہی ہو۔ سب سے پہلے مجھے اپنے لیے لباس، ہتھیار، خوراک اور پانی کی تلاش تھی۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو میری رگوں میں، خُون کھولنے لگا۔ سامنے جھاڑیوں کے جُھنڈ میں ایک نوجوان جوڑا قریب قریب لیٹا ہُوا تھا۔ دونوں کھوئے ہُوئے تھے کہ انھیں میری موجودگی کا احساس تک نہ ہو سکا۔ میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہُوا جھنڈ کی دُوسری طرف پہنچ گیا اور جھاڑیاں ہٹا کر اُن پر دوبارہ نظر ڈالی تو میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ دونوں یُوں ساکت و صامت تھے جیسے مر چکے ہوں... پھر میں نے سوچا کہ ممکن ہے، اُنھوں نے مجھے دیکھ لیا ہو اور بے حس اور بے حرکت بن گئے ہوں... چنانچہ میں نے ہاتھ بڑھا کر عورت کی پنڈلی کو ہلایا مگر وہ نہ تو مجھ سے کچھ بولی اور نہ ہی اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔

"ڈرو نہیں... میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

اس پر بھی وہ خاموش رہے اور میری سرگوشی مجھے ایک چنگھاڑ سی لگی تو میں نے قریب سے اُن کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا اور جھاڑیاں ہٹا کر اُن کے سروں پر پہنچ گیا۔

وہ اُسی طرح بے حس، بے حرکت اور ساکت رہے تو میں نے نوجوان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ جب اُس نے کوئی مدافعت اور کوئی حرکت نہ کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ واقعی مر چکے ہیں۔ اس امر کی تصدیق کے لیے میں نے باری باری اپنا کان اُن کے مقامِ دل پر لگایا مگر مجھے کوئی دھڑکن سُنائی نہیں دی۔ میں نے غور سے مرد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بلاشبہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اگرچہ قدوقامت کے اعتبار سے وہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اُس کے اعضا متناسب اور نین نقش حسین تھے۔ اس طرح عورت بھی بڑے دل کش خدوخال کی مالک تھی لیکن سوال یہ تھا کہ ان کی ہلاکت کی وجہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں نے اُنھیں اُلٹا پلٹا تو مجھے مرد کے جیکٹ کے نیچے ایک اُبھار سا نظر آیا۔ میں نے اس کا جیکٹ اُتارا تو پتہ چلا کہ اس کی پیٹھ پر شانے کے پاس ایک پٹی بندھی ہُوئی ہے۔ میں نے پٹی کھول دی۔ اس کے شانے پر ہلکا سا زخم دکھائی دیا جس پر کھرنڈ آ چکا تھا... مگر عورت کے جسم پر کوئی زخم دکھائی نہیں دیا۔

اُن دونوں کے لباس ایک ہی جیسے پلاسٹک سے بنے ہوئے تھے اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ جھاڑیاں اور پھُول وغیرہ بھی پلاسٹک کے تھے میرے لیے یہ سب کچھ عجوبہ تھا۔ اچانک مجھے مرد کے دائیں کان کی لَو میں کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو ٹاپ جیسی ایک چیز تھی۔ میں نے لاشعوری طور پر عورت کی طرف دیکھا تو مجھے اُس کے کان میں ویسی ہی چیز نظر آ گئی میں نے دونوں کے ٹاپس اُتار لیے اور جھاڑیوں سے نکل کر، روشنی میں اُن کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ بیٹری یا ریسیور قسم کی چیزیں ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اُنھیں توانائی کی ترسیل بند کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ مگر انسانوں کو تو اس قسم کی توانائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر کیا یہ روبوٹ ہیں؟... اگر یہ روبوٹ ہیں تو مرد کے شانے پر زخم کیسا ہے، کیا کسی روبوٹ کو زخم لگتے اور بھر سکتے ہیں؟ گویا نہ تو یہ انسان تھے اور نہ ہی انھیں روبوٹ کہا جا سکتا تھا تو پھر یہ کیا ہیں؟

ان سوالوں نے مجھے جکڑ دیا۔

میں نے سوچا اگر یہ روبوٹ ہیں تو پھر یہ مرے نہیں ہیں بلکہ انھیں سُلا دیا گیا ہے۔

میں دوبارہ اُنھی جھاڑیوں میں چھُپ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ اس کے سوا فی الحال کوئی چارہ نہیں تھا۔

۞

میں کافی دیر تک جھاڑیوں میں دُبکا ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے سامنے، ایک جانب جھیل تھی جس کے چاروں طرف بنچ پڑے تھے اور اُن پر اسی طرح کے بہت سے جوڑے بیٹھے یا نیم دراز تھے وہ سب کے سب اُس جوڑے کی طرح بے حس اور بے حرکت تھے ایسا لگتا تھا جیسے اچانک ہی اُن سب کو ترسیلِ توانائی روک دی گئی ہو اور وہ سب مر گئے ہوں یا سو گئے ہوں جھیل کے کنارے کھانے پینے کی اشیا کے متعدد اسٹال تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید... کھانے پینے کا مسئلہ وہاں حل ہو جائے چنانچہ اپنی کمیں گاہ سے نکل کر جھیل کی طرف چل پڑا۔

وہاں پہنچ کر لباس اور ہتھیار کا مسئلہ پہلے ہی حل ہو گیا۔ یوں تو یہ سب روبوٹ یا روبوٹ نما انسان چھوٹی قامت کے تھے لیکن اخباروں کے اسٹال پر ایستادہ شخص مجھے اُن سے بلند و بالا دکھائی دیا تو میں نے اُس کا جیکٹ اور نیکر اُتار کر پہن لی۔ یہ کپڑے اگرچہ میری جسامت کے اعتبار سے چھوٹے ہی تھے مگر اُن سے لباس کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا تھا۔ اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں نے اشیائے خورد و نوش کے اسٹالوں کا جائزہ لیا۔ ایک اسٹال سے مجھے ایک چھُری اور کچھ خشک غذا مل گئی اگرچہ غذا کا ذائقہ کچھ کسیلا سا تھا مگر میں نے پیٹ کی آگ بجھالی۔ اسی اسٹال سے مجھے مشروب کی چند بوتلیں بھی مل گئیں جو بے حد میٹھی تھیں۔ میں دو بوتلیں پی کر آگے بڑھ گیا۔

پارک سے نکلنے کے بعد درختوں کے سائے سائے چلنے لگا تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے اب میرا وہ خوف دُور ہو چکا تھا، جو ہر نئی سرزمین پر منتقل ہونے کے بعد شروع شروع میں طاری ہوتا ہے۔

وہ بڑا ہی خوبصورت شہر تھا۔ پارکوں میں، دفاتر میں، دُکانوں میں اور ریستورانوں میں ہر جگہ وہ لوگ اُسی حالت میں منجمد ہو گئے تھے جس حالت میں انھیں توانائی سے محروم کیا گیا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ بعض لوگوں نے کچھ کھانے یا بات کہنے کے لیے مُنہ کھولا تھا کہ توانائی کی ترسیل رُک جانے کی وجہ سے وہ اسی حالت میں مر گئے یا سو گئے تھے۔

سڑکوں پر کہیں تو کاریں پارک کی ہُوئی تھیں اور کہیں وہ چلتے چلتے ہی منجمد ہو گئی تھیں۔ یہ کاریں جیپ نما تھیں اور ان میں انجن نہیں تھے بلکہ ہر کار میں اینٹینا لگا ہُوا تھا جو ایک ڈائینمو کو چلاتا تھا اور یہ ڈائینمو پہیوں کو حرکت میں لاتا تھا۔

اس شہر کی کوئی عمارت چھ منزلوں سے زیادہ نہیں تھی۔۔ عمارتوں میں لفٹیں بھی لگی ہُوئی تھیں جو کہیں بیچ میں رُکی ہُوئی تھیں اور کہیں لوگ اُن میں سوار ہو رہے تھے یا اُتر رہے تھے۔ یہی حال ریلوے یارڈ کا تھا۔ چلتی گاڑیاں ویسی کی ویسی رُک گئی تھیں اور اُن کے مسافر بے حس اور بے حرکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

میں نے اس شہر میں ایک وسیع و عریض عجائب گھر بھی دیکھا لیکن مجھے وہاں کوئی ہتھیار نظر نہیں آیا۔ انتہا تو یہ ہے کہ اُن کے اُس عجائب گھر میں عہدِ قدیم کی بھی کوئی تلوار موجود نہیں تھی۔ یا تو وہ لوگ عدم تشدد کے قائل تھے یا وہاں کسی قسم کا ہتھیار رکھنے پر پابندی تھی۔ پُورے شہر میں مجھے اُن چھُریوں کے علاوہ کچھ نہ ملا.. جنھیں باورچی خانے میں استعمال کیا جاتا ہے اور ان کا سائز بھی عام چاقو سے بڑا نہیں تھا۔

مجھے اس شہر میں کسی جانور کا نشان تک نہیں ملا۔

میں نے ایک اپارٹمنٹ میں جا کر وہاں کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ گھر کے کچھ افراد کھانے کی میز پر بیٹھے تھے، کچھ سو رہے تھے اور کچھ کھیل رہے تھے کہ اُسی عالم میں منجمد ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں دن اور رات کا کوئی تصوّر نہ ہو۔ لوگ کام اور آرام گھڑیوں میں وقت دیکھ کر کرتے ہوں گے۔ مجھے اس شہر میں گھومتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا مگر چاند وہیں کا وہیں تھا اور اس کی روشنی بھی ویسی کی ویسی ہی تھی۔

گھومتے گھامتے میں ایک اسپتال جا پہنچا۔ زچہ وارڈ میں ابھی ابھی ایک عورت نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا۔ نرس بچّہ اُٹھائے ہُوئے تھی مگر وہ ٹاپ یا اینٹینا بچّے کے دائیں کان میں لگا ہُوا تھا میں آپریشن تھیٹر گیا تو دیکھا کہ ایک سرجن نے ایک مریض کا سینہ چاک کر رکھا ہے۔ مریض کا دل ایک عام دل جیسا ہی تھا۔ اس نظارے سے مجھ پر واضح ہو گیا کہ یہ لوگ روبوٹ نہیں بلکہ انسان ہی ہیں۔

جب میں چلتے چلتے تھک گیا تو میں نے ایک خالی اپارٹمنٹ تلاش کیا جس میں ڈبوں والی غذا بھی وافر مقدار میں موجود تھی۔ میں نے ڈٹ کر کھایا اور آرام دہ بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

چند گھنٹے سونے کے بعد جب اُٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔

میں نے ایک جماہی لی اور اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ باہر وہی منظر تھا... ہر شے اور ہر فرد جیسے طلسمی نیند میں ڈوبا ہُوا تھا۔ میں اپارٹمنٹ سے نکل آیا اور ایک سڑک پر چلنے لگا۔ کئی گھنٹے مسلسل چلنے کے باوجود مجھے پارکوں کے علاوہ کوئی کھلی جگہ نظر نہ آئی شہر ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ مجھے یُوں لگا جیسے یہ شہر مضافات اور دیہات سے یکسر محروم ہو۔

خاموشی اور تنہائی میرے دل اور رُوح کا بوجھ بن گئی۔ میں انسانی آواز سُننے کے لیے پہلے کبھی اتنا نہیں ترسا تھا۔ یہ مُردوں کا شہر نہیں تھا بلکہ یہ کبھی نہ مرنے والوں کا شہر تھا، شہرِ خوابیدہ تھا جو کسی وقت بھی توانائی کی ترسیل بحال ہونے پر جاگ سکتا تھا۔ ہر شے پھر سے زندہ اور رواں دواں ہو سکتی تھی۔

ایک مقام پر مجھے حمام دکھائی دیئے مگر اُن میں پانی نہیں تھا۔ پھر میں ایک ریستوران میں گھس گیا وہاں بھی ڈبوں والی غذا اور بوتلوں والے شیریں مشروب سے بھوک پیاس بجھائی اور اپنے لیے ایک بھالا تیار کرنے لگا۔ میں نے ایک کھڑکی سے پردہ لٹکانے والا ڈنڈا نکالا، ایک چھُری لی اور ایک تار کے ساتھ چھُری ڈنڈے سے باندھ لی۔ میرا بھالا تیار تھا اب مجھے چاہیے تھا کہ میں توانائی کا منبع تلاش کروں لیکن اُسے تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ جب کہ میرا دل اور میری چھٹی حِس بار بار یہ انتباہ کر رہی تھی کہ اگر مجھے کوئی خطرہ پیش آسکتا ہے تو چاند ہی سے آسکتا ہے جو آسمانی آنکھ بن کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

ابھی میں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ایک آواز نے میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ یہ میری نہیں بلکہ کسی اور کی آواز تھی۔ اس آواز نے مجھے بھی اس شہرِ خوابیدہ کے خفتہ لوگوں کی طرح منجمد کر دیا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور میں پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ میں خوف زدہ نہیں تھا کیوں کہ میں تو خود ہی کسی آواز کا منتظر تھا... چاہے وہ میرے لیے کسی خطرے کا باعث کیوں نہ بن جائے لیکن جب وہ آواز دوبارہ سُنائی نہ دی تو میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ میرے لیے سانس لینا بھی دُشوار ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے گمان گزرا کہ شاید وہ آواز خود میں نے ہی نکالی تھی... لیکن پھر میرا یہ وہم دُور ہو گیا۔ کافی دیر بعد وہ آواز دوبارہ سُنائی دی... میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا... دم بخود اور ہمہ تن گوش... نہ جانے وہ کس کی آواز تھی اور کہاں سے آئی تھی؟

وہ ایسی آواز تھی جیسے لوہے سے لوہا ٹکرایا ہو یا جیسے کسی نے لوہے کا بڑا سا ٹکڑا اُٹھا کر پھینک دیا ہو یا اتفاقاً گر پڑا ہو۔

اور یہ آواز دُور سے نہیں بلکہ بہت قریب سے آئی تھی جس نے اُس بے کراں سنّاٹے کا جگر چیر دیا جو میری رُوح کا بوجھ بنا ہُوا تھا۔

میں نے نظر اُٹھا کر سامنے دیکھا تو سڑک کے بیچوں بیچ ایک ڈھکنا نظر آ رہا تھا۔ ایسا ہی ایک ڈھکنا میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور وہ ڈھکنا اتنا وزنی تھا کہ میں اُسے ہلا بھی نہیں سکا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ڈھکنے کے پاس بیٹھ کر جائزہ لینے لگا۔ اگر ایسا ڈھکنا اُٹھا کر دوبارہ رکھا جائے تو ایسی آواز پیدا ہو سکتی ہے جیسی میں نے سُنی تھی... لیکن یہ آواز اس ڈھکنے کو اُٹھانے سے نہیں آئی تھی بلکہ کہیں نیچے سے آئی تھی۔

میں پھر درختوں کے سائے میں آگیا۔

اب خوف نے میرے وجود کا احاطہ کر لیا لیکن یہ خوف اپنے اندر میرے لیے بقا کا جذبہ رکھتا تھا کیوں کہ اس خوف میں تنہائی کے جان لیوا عذاب سے نجات مضمر تھی۔ یہ احساس شامل تھا کہ اس شہرِ خوابیدہ میں صرف میں ہی زندہ انسان نہیں ہُوں بلکہ کوئی اور بھی ہے... میں نے فیصلہ کیا کہ جو کوئی بھی ہے... میں اُس کا خیر مقدم کروں گا۔

عام طور پر میں ایسے موقعوں پر للکارتا اور اشتعال انگیز جُملے کستا تھا تاکہ اگر چھُپا ہُوا فرد دُشمن ہو تو وہ خود ہی میری طرف بڑھے مگر یہاں تو موت جیسے سنّاٹے نے مجھے اپنی یہ ترکیب بھی بالائے طاق رکھنے پر مجبور کر دیا... میں للکارنے کی بجائے ایک دُکان میں گھس گیا جس کے اگلے حصّے میں دُکاندار اور گاہک خرید و فروخت کی حالت میں منجمد تھے۔ میں اُن کی طرف توجہ دیئے بغیر دُکان کے پچھلے حصّے میں چلا آیا جہاں مجھے مطلوبہ اشیا مل گئیں۔

یہ اشیا، پیلیاں کھولنے والا سبّل اور بند کرنے والا ہتھوڑا تھیں۔ نوک دار سبّل دیکھ کر میں نے اپنے بھالے سے چھُری اُتاری اور اُسے اپنی بیلٹ میں اڑس لیا کہ یہ بھالا، ہتھوڑے اور سبّل سے زیادہ مفید ہتھیار ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ دونوں چیزیں لے کر میں دوبارہ اس ڈھکنے کے پاس آیا اور سبّل کی مدد سے ڈھکنا کھولنے اور اُسے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈھکنا بے حد وزنی تھا وہ سبّل سے اُٹھ تو جاتا تھا مگر بار بار پھسل کر میری محنت ضائع کر دیتا تھا آخر ایک بار میں نے اُسے ایک کونے سے اُٹھا کر دَرز میں ہتھوڑا رکھ دیا اور پھر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ڈھکنا پرے پھینک دیا۔

گڑھا کافی گہرا نظر آتا تھا۔ میں نے سبّل اندر پھینک کر اُس

کی گہرائی کا اندازہ کرنا چاہا مگر اُس کے گرنے سے دَھپ کی جو آواز پیدا ہُوئی، میں اُس سے گہرائی کا اندازہ نہ کر سکا۔ اب میں نے ہتھوڑا کنارے سے اٹکا دیا اور لٹک کر نیچے کود گیا۔

گڑھا اندر سے خشک تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے مدّتوں سے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ وہ کافی اُونچا اور وسیع تھا اگرچہ عام حالات میں میرا اس طرح گڑھے میں کُود جانا حماقت ہوتی مگر مجھے اُس روشن چاند سے دیکھا جانا پسند نہیں تھا اور مجھے بار بار یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دُوربین سے میری نقل و حرکت کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

چونکہ سبّل ایک عمدہ ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا اس لیے میں زمین ٹٹول کر اُسے تلاش کرنے لگا۔ جونہی میری انگلیوں نے اُسے چھُوا، مجھے بائیں جانب سے کچھ روشنیاں اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دائیں جانب دیکھا تو ویسی ہی روشنیاں اُدھر سے بھی آتی نظر آئیں۔ گویا میں دونوں طرف سے گھر گیا تھا۔ لیکن بائیں طرف بہ نسبت دائیں جانب کی روشنیاں کچھ زیادہ فاصلے پر تھیں اس لیے میں دائیں طرف بھاگا۔ میری چھٹی حِس بتا رہی تھی کہ بُرا وقت سر پہ آ گیا ہے۔

ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ مجھے گڑھے کی دیوار کے ساتھ ایک ہیولا سا چپکا نظر آیا۔ وہ کسی سائے کی طرح ساکت دکھائی دیا... مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہلا ہے۔ جب میں اُس کی طرف اُچھلا اور اُسے پکڑنے کی کوشش کی تو اُس نے مجھ پر تھوک دیا اور مجھے پنجوں سے نوچنے کی کوشش کرتے ہُوئے، اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

میں نے جسے اندھیرے میں پکڑنے کی کوشش کی تھی، اُس کے جسم کی ساخت اور نرمی نے مجھے بتا دیا... کہ وہ کوئی عورت ہے۔ وہ تو میرے نرغے سے نکل گئی مگر میں خود ان لوگوں کے نرغے میں پھنس گیا جو دائیں اور بائیں طرف سے میرے قریب آ گئے تھے۔ بہرحال، وہ جو بھی تھے، اُن خوابیدہ لوگوں سے بہتر تھے جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

اس وقت جہاں میں کھڑا تھا، شاید وہ زیرِ زمین رہنے والے اُن لوگوں کی قیام گاہ تھی کیوں کہ وہاں گھٹیا قسم کی میزیں، کرسیاں اور دُوسرا سامان پڑا ہُوا تھا۔ گڑھے نے آگے آ کر ایک غار کی صُورت اختیار کر لی تھی اور یہاں ایک کمرہ سا بنا ہُوا تھا جس کی چھت سے ایک مٹکا لٹک رہا تھا مٹکے سے پانی کی بوندیں رِس رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑے زور کی پیاس محسوس ہونے لگی لیکن یہ پانی پینے کا موقع نہیں تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ اُن خوب صورت مگر خوابیدہ لوگوں اور ان زیرِ زمین رہنے والوں کے درمیان کیا رشتہ یا تعلق ہے۔ میں تو اتنا جانتا تھا کہ ماضی کے ہر سفر میں جب تک اقتدار میرے ہاتھوں میں نہیں آیا یا اقتدار میں میری شرکت اہم نہیں سمجھی گئی، میری بقا خطرے میں رہی اس لیے اُن خوابیدہ اور ان زیرِ زمین رہنے والوں کے باہمی تعلقات جو بھی ہوں، مجھے فی الوقت اِن جیتے جاگتے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھا کر اقتدار حاصل کر لینا چاہیے۔

اب وہ لوگ دونوں جانب سے میرے قریب تر آ گئے تھے اور جو شمعیں اُنھوں نے اُٹھا رکھی تھیں، اُن کی روشنی میں اُن کی شکلیں واضح نظر آ رہی تھیں۔ وہ سب کے سب مرد نہیں تھے بلکہ اُن میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ جب وہ اور قریب آئے تو پتہ چلا کہ کچھ بچے بھی عورتوں کے ساتھ چمٹے ہُوئے ہیں۔

وہ سب حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ تمام مرد گنجے تھے لیکن عورتوں کے گھنے بال اُن کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ عورتوں نے سینے بند اور مختصر کپڑوں سے ستر پوشی کر رکھی تھی جب کہ مرد صرف نیکر نما لباس پہنے ہُوئے تھے۔ وہ سب مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک کر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

میں نے محسوس کیا کہ عورتیں مجھے گھُور رہی ہیں اور سرگوشیوں میں بھی حصّہ لے رہی ہیں۔ میں نے ہتھوڑا دائیں ہاتھ میں اور نیزہ بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ پھر میں نے ہتھوڑے کو گُرز کی طرح گھماتے ہُوئے کہا: "تم سب زبان رکھتے ہو اس لیے مجھ سے بات کرو۔"

مرد جو اپنے ہاتھوں میں تقریباً پانچ فٹ لمبے آہنی ڈنڈے تھامے ہُوئے تھے، میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"مجھے تم اپنا دوست سمجھو گے یا دُشمن، اس کا فیصلہ خود تمھیں کرنا ہے۔ ویسے میں ایک دوست کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔ اب بولو، کیا کہتے ہو؟" میں نے مزید کہا۔

وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے سرگوشیاں کرنے لگے عورتیں بار بار میری طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ آخر ایک آدمی اُن میں سے نکل کر آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہُوا مجھ سے تقریباً بارہ قدم دُور کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی لوہے کا ڈنڈا تھا جس کا ایک سرا نوک دار اور دوسرا سرا چھڑی کی طرح نیم دائرے میں مُڑا ہوا تھا۔ پانچ فٹ لمبا اور تقریباً ایک اِنچ موٹا دھات کا یہ ڈنڈا غالباً اُن کا ہتھیار تھا۔

میں نے ہتھوڑا گُرز کی طرح گھماتے ہوئے کہا: "جب تک یہ فیصلہ نہیں ہو جاتا کہ تم مجھے دوست سمجھتے ہو یا دُشمن، تب تک مجھ

سے دُور ہی رہو۔"

"میرا نام دارا ہے۔ دوست یا دُشمن کا فیصلہ ہونے سے پہلے یہ بتاؤ، کیا تم اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو؟"

یہ سوال اس آدمی نے اتنی سنجیدگی سے کیا تھا کہ ایک لمحے کو میں چکرا گیا... آخر اُس نے یہ سوال کیوں کیا تھا؟

"ہاں... لیکن تمھیں اس سے کیا غرض؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

دارا پہلی بار مسکرایا اور بولا "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن یہ بات تمھارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے اجنبی تمھاری زندگی کا دار و مدار اسی بات پر ہے تمھیں ہمارا غلام بن کر رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اگر تم اس صلاحیت سے محروم ہوتے تو تمھارے حصّے میں موت کے سوا کچھ نہ آتا۔"

اس دوران اُس کے ساتھی بھی قریب آ گئے تھے۔ "اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں۔" میں نے کہا۔

دارا نے ہاتھ اُٹھایا تو اُس کے ساتھی دو قدم پیچھے ہٹ گئے پھر وہ بولا "تمھارا جواب کیا ہے اجنبی؟"

میں اُسے جواب تو دے ہی چکا تھا اور کیا بولتا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔

"مجھے آخری فیصلے سے آگاہ کرو اجنبی۔" وہ غرّایا۔

"تم اپنے سوال کا جواب سُن چکے ہو۔ میں اس صلاحیت سے مالا مال ہُوں لیکن تم لوگوں کا غلام بن کر زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ بھی مت بھُولو کہ مرنے سے پہلے میں بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہوں گا۔"

دارا خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی اور وہ کچھ سوچنے لگا جب کہ ایک آدمی نے ایک نوجوان لڑکی کو کچھ ہدایات دیں۔ لڑکی نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر وہاں سے چلی گئی۔ مجھے میری چھٹی حس نے بتایا کہ یہی وہ لڑکی تھی جسے میں نے اندھیرے میں پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر جو میرا مُنہ نوچ کر بھاگ نکلی تھی۔ اتنے میں دارا بولا "میں اس قبیلے میں تیسرے درجے کا سردار ہوں۔ مَیں تمھیں قتل کرنا چاہوں تو بھی نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر مجھے رُستم اور شیلو حکم دیں تو مَیں تمھارے پرخچے اُڑا سکتا ہوں۔ اسی لیے مَیں نے اُن سے ہدایات طلب کی ہیں۔ اگر تم صاحبِ اولاد بننے کے قابل ہُوئے اور مَیں نے تمھیں مار ڈالا تو مجھے پاتال کی سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔ لہٰذا رُستم اور شیلو کا جواب آنے تک ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔"

... لیکن انتظار میرے عزائم اور منصوبے کے خلاف تھا اُس لیے مَیں نے اُسے لڑنے پر اُکسانے کی خاطر اشتعال دلانا مُناسب سمجھا۔ مَیں نے کہا "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ مجھے ختم کر سکتے ہو؟"

دارا ایک لمحے تک خاموش کھڑا رہا پھر اُس نے ایک ساتھی کو پکارا، اپنا ڈنڈا اُسے دے دیا اور اس کا ڈنڈا لے کر بازو آگے کو پھیلائے اور زور لگا کر اُسے موڑنے لگا۔ جب آہنی ڈنڈے کے سرے ایک دوسرے سے مِل گئے تو اُس نے وہ ڈنڈا میری طرف پھینکتے ہُوئے کہا "میں تمھیں بھی اسی طرح توڑ مروڑ سکتا ہوں اجنبی۔"

اُس نے جتنی آسانی سے ایک اِنچ موٹے آہنی ڈنڈے کو موڑ دیا تھا، وہ اس کی بے پناہ طاقت ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا۔ مَیں اس سے خاصا مرعوب ہُوا لیکن پھر مَیں نے وہ مُڑا ہُوا ڈنڈا اُٹھایا اور زور لگا کر اُسے سیدھا کرنے لگا۔ مجھے ڈنڈا سیدھا کرنے میں اپنی تمام تر قوت سے کام لینا پڑا۔ جب ڈنڈا سیدھا ہو گیا تو مَیں نے اُسے دارا کی طرف اُچھال دیا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ تم بھی طاقت ور ہو، لہٰذا تمھیں قتل کرنا میرے لیے خوشی اور عزت کا باعث ہوگا لیکن کیا کروں کہ مَیں تمھیں رستم اور شیلو کے حکم کے بغیر قتل نہیں کر سکتا۔"

"تو تمھارا یہ مسئلہ مَیں حل کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر مَیں نے مُٹھی بھر ریت اُٹھا کر اس کے مُنہ پر دے ماری "تمھارے ساتھی اس بات کے شاہد ہیں کہ مَیں نے تمھیں اشتعال دِلایا تھا۔ اپنے دفاع کے لیے تیار ہو جاؤ بُزدل۔ تم چاہے مجھ سے لڑو یا نہ لڑو مگر مَیں تمھیں ختم کر دوں گا۔"

میرے اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ رستم اور شیلو کی آمد سے پہلے پہلے مَیں کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دے لوں جس سے وہ مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

دارا نے اپنا ڈنڈا سنبھالتے ہُوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم سب دیکھ رہے ہو کہ خود اجنبی مُجھ سے لڑنا چاہتا ہے، مَیں نہیں لڑنا چاہتا۔"

اتنے میں مجمعے سے دو آدمی باہر آ گئے۔ ایک دارا کے دائیں اور دوسرا بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ دارا اپنا آہنی ڈنڈا تانے آگے بڑھنے لگا۔

"میرا خیال تھا کہ تم تنہا میرا مقابلہ کرو گے لیکن اگر تم اتنے ہی بزدل ہو تو پھر میں تینوں سے نمٹ لوں گا۔" مَیں نے کہا۔

دارا نے میری بات اَن سُنی کرتے ہُوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اسے اُس وقت تک قتل نہ کرنا جب تک کہ اُسے قتل کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے۔ تم دائیں طرف آ جاؤ اور تم بائیں طرف ہو جاؤ۔"

مَیں نے دارا پر طنز کا جو وار کیا تھا، وہ خالی گیا اور وہ اپنے دونوں ساتھیوں سمیت آگے بڑھنے لگا۔ مَیں نے ہتھوڑے کو تیزی سے گھمانا شروع کر دیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتے، مَیں نے ہتھوڑا دارا پر دے مارا۔ ہتھوڑا کم از کم چار سیر وزنی تھا۔ اس کا لوہے والا حصّہ دارا کے شانے پر اور دستہ بڑے زور سے جبڑے پر لگا۔ وہ اس ضرب سے گر پڑا۔ اُس کے ساتھی اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ اس سے پہلے کہ دارا سنبھلتا، مَیں نے لپک کر ہتھوڑا دوبارہ اُٹھا لیا اور بڑے زور سے اُس کے پیٹ میں لات ماری۔

دارا تکلیف کی شدت سے لوٹ پوٹ ہونے لگا... یہ دیکھ کر اس کے ساتھی میری طرف لپکے۔ مَیں نے اچانک جُھکائی دے کر اُن کے گنجے سر آپس میں ٹکرا دیے۔ سر ٹکرانے سے وہ بُری طرح چکرا گئے۔ مَیں نے ہتھوڑے کے دستے سے ایک ایک مزید ضرب اُن کے سروں پر لگائی تو وہ اوندھے مُنہ دارا پر جا گرے۔ یہ تماشا دیکھنے والی عورتوں کے مُنہ سے سسکاریاں نکل گئیں اور انھوں نے اپنے بچوں کو سینوں سے بھینچ لیا۔

مَردوں میں سے کچھ آگے بڑھے تو مَیں نے دارا کا آہنی ڈنڈا اُٹھا کر اس کا نوکدار حصّہ تولتے ہُوئے کہا "جو بھی آگے بڑھا۔ یہ ڈنڈا اُس کے آر پار ہو جائے گا۔"

دارا کے ساتھیوں کے اُٹھتے قدم رُک گئے۔ مَیں پھر دھاڑا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ۔"

خُدا جانے یہ میری دھاڑ کا اثر تھا یا وہ اپنے ساتھیوں کی درگت سے ڈر گئے تھے کہ فوراً چار پانچ قدم پیچھے ہٹ گئے۔

اتنے میں دارا سنبھل گیا اور اُٹھ بیٹھا۔ مَیں نے اُسے آہنی ڈنڈے کی زد پر لیتے ہُوئے کہا "مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ دارا۔"

یہ سُنتے ہی وہ میرے قدموں میں گر گیا اور بولا "نہیں نہیں، تم جیتے اور مَیں ہار گیا اجنبی۔ ہمارے رواج کے مطابق اَب تم میرے مالک اور مَیں تمھارا غلام ہُوں۔"

"لیکن مجھے کسی غلام کی ضرورت نہیں ہے۔" مَیں نے پیچھے ہٹتے ہُوئے کہا "تم اَب بھی اُسی طرح آزاد ہو جیسے پہلے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مَیں بتا چکا ہُوں کہ مجھے اپنا دوست سمجھو اور اَب مَردوں کی طرح کھڑے ہو جاؤ۔"

"مجھے اپنے قدموں سے دُور مت کرو مالک۔ ڈرو نہیں، مَیں تم سے کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔ مجھے اپنے قدم چُومنے دو تاکہ سب دیکھ لیں کہ مَیں تمھارا غلام ہُوں۔" دارا نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے درخواست کی۔

"مَیں کہہ چُکا ہوں کہ مجھے غلام کی نہیں بلکہ ایک دوست کی ضرورت ہے۔"

"تم نہیں سمجھتے مالک کہ مَیں تمھارا غلام کیوں بننا چاہتا ہُوں۔ اب صرف تم ہی مجھے رستم اور شیلو سے بچا سکتے ہو کیوں کہ مَیں اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام ہو گیا ہوں۔ اگر تم مجھے اپنا غلام نہیں بناؤ گے تو وہ مجھے پاتال میں بھیج دیں گے۔ مجھ پر رحم کرو مالک! رستم اور شیلو کے آنے سے پہلے مجھے اپنا غلام بنا لو۔ وہ بڑے بے رحم ہیں۔ اگر تم مجھے پاتال میں جانے سے بچا لو گے تو مَیں تمھارا غلام ہی نہیں، ایک اچھا دوست بھی ثابت ہوں گا۔"

مَیں اُس کی باتوں سے متاثر ہو کر خطرہ مول لینے پر تیار ہو گیا اور بولا "اچھی بات ہے۔ مَیں تمھیں غلام کے طور پر قبول کرتا ہُوں۔"

یہ سُن کر وہ رینگتے ہُوئے میری طرف بڑھا اور میرے پاؤں چُومنے لگا پھر وہ اپنی باچھ سے بہتا ہُوا خون پُونچھتے ہُوئے بولا "مَیں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا۔" اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہُوا "تم سب لوگوں نے دیکھا اور سُن لیا ہے کہ اس اجنبی نے مجھے شکست دی ہے اور مجھے اپنا غلام بنانا قبول کر لیا ہے... اَب مَیں اس کی پناہ میں ہُوں۔"

مجمعے میں سے ایک آدمی بولا "ہاں دارا... ہم نے دیکھا بھی ہے اور سُنا بھی ہے لیکن اگر رُستم اور شیلو نے اس اجنبی کے قتل کا حُکم دے دیا، تب تمھارا کیا ہوگا؟"

دارا نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کر میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے ڈنڈے کی نوک سے اُسے ہٹاتے ہُوئے کہا "ابھی کچھ وقت مجھ سے دُور ہی رہو، میرے نئے دوست! اور مجھے بتاؤ کہ یہ رستم اور شیلو کون ہیں۔ جلدی بولو تاکہ اُن کے آنے سے پہلے پہلے مجھے اُن کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔"

دارا نے زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا "آپ کو مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اَب آپ کی تعظیم و تکریم میرا فرض ہے اور یہ بھی نہ بھُولیے کہ دارا جو وعدہ کرتا ہے اُس پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ جہاں تک رُستم اور شیلو کا تعلق ہے، وہ یہاں کے حُکمراں ہیں۔ مَیں مزید کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ وہ آ رہے ہیں۔"

اور چند لمحوں بعد وہ واقعی آ گئے۔

وہ ایک مینڈک نُما آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ سفید بالوں والی ایک عورت تھی جو اَب بھی کافی خوب صُورت نظر آتی تھی۔ اُن کے پیچھے بیسیوں گنجے اپنی لوہے کی لاٹھیاں لیے ہُوئے تھے۔

"مَیں رُستم ہوں اور یہ مَلکہ شیلو ہے۔" پھر وہ دارا کے دونوں

بے ہوش ساتھیوں کی طرف متوجہ ہُوا۔ اچانک وہ پلٹا اور مجھ سے پُوچھنے لگا: "کیا تم نے انھیں دیانت داری سے شکست دی ہے؟" مینڈک نُما آدمی مجھے گھُور۔ نے ہُوئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

"ہاں . . . اور اس کی گواہی خود تمھارے اپنے آدمی بھی دے سکتے ہیں"، مَیں نے جواب دیا۔

دارا میرے قدموں کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"کیا تم بچّوں کا باپ بننے کی اہلیت رکھتے ہو؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

مَیں اس سوال پر بھنّا گیا۔ ان کم بختوں کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا اور وہ نہ جانے کیوں مجھ سے بار بار یہ سوال کر رہے تھے مگر مَیں نے بہتر یہی سمجھا کہ اُس سے غیر ضروری بحث نہ کروں۔

"ہاں . . . مَیں بچّوں کا باپ بن سکتا ہوں"۔

"اگر یہ دُرست ہے تو پھر ہمیں تمھاری ضرورت ہے۔ اس لیے کہ یہاں صرف مَیں ہی بچّوں کا باپ بننے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ اس سلسلے میں تمھیں میری مدد کرنا پڑے گی یا مرنا پڑے گا فیصلہ خود کر لو اجنبی"۔

"میرا جواب ہی میرا فیصلہ ہے اور مجھے اجنبی کی بجائے تم سرفروش کے نام سے مخاطب کر سکتے ہو"۔

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمھارا نام کیا ہے یا تم کہاں سے آئے ہو۔ اگر تمھیں میری شرط منظور ہے تو میرے ساتھ چلو"، وہ بولا۔

اس دوران سفید بالوں والی شیلو خاموش کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں سبز رنگ کی تھیں۔ اس نے سیاہ لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اُس کے قد و قامت اور خد و خال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک حسین خاتون ہے۔ صرف اُس کے سفید بال یہ چغلی کھاتے تھے کہ وہ عمر رسیدہ ہے۔ اُس کا انداز بھی یہ بتاتا تھا کہ اقتدار کی اصلی مالک وہی ہے۔

چند لمحے بعد ہی میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔

رُستم نے دارا کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "اسے پاتال میں بھیج دو"۔

یہ سُنتے ہی چھ آدمی دارا کی طرف بڑھے لیکن مَیں نے ہاتھ اُٹھاتے ہُوئے بڑے رُعب اور دبدبے سے کہا: "ٹھہرو . . . اَب یہ میرا غلام ہے"۔ میرے اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ رُستم سے جو کچھ ہونا ہے، وہ بھی اسی وقت ہو جائے۔

وہ میری بات پر آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے اپنی لوہے کی لاٹھی سنبھالی تو مَیں نے بھی دارا والی لاٹھی پر گرفت مضبوط کر لی اور یہ سوچ لیا کہ مجھے رُستم کو ختم کر دینا ہے مگر اتنے میں شیلو نے اس سے سرگوشی میں کچھ کہا پھر وہ میری طرف دیکھ کر مُسکرائی مگر مجھ سے مخاطب نہ ہُوئی۔

رُستم نے قہرِ درویش برجانِ درویش کے مصداق ایک ٹھنڈی سانس لی اور شانے اُچکاتے ہُوئے بولا: "اچھی بات ہے۔ دارا آج سے تمھارا غلام ہے۔ اس کی ساری ذمّے داریاں تم پر عاید ہوں گی . . کیوں کہ ہمارے معاشرے میں غلاموں کے افعال کا ذمّے دار مالک کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اَب میرے ساتھ آؤ"۔

مجھے ایک علٰحدہ مقام پر فرض کی ادائیگی کے لیے لگا دیا گیا لیکن میری زندگی کا دار و مدار ان نتائج پر تھا جنھیں رُونما ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ البتہ مجھے یہ بتا دیا گیا کہ اگر رستم مر گیا تو مجھے اس کی جگہ بادشاہ بنا دیا جائے گا۔ اس غار سے آگے آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہاں پورا ایک شہر آباد ہے۔ مجھے جس زیرِ زمین کمرے میں رکھا گیا، اُس کے لیے سازو سامان اوپر کے شہرِ خوابیدہ سے لایا گیا تھا۔ میں نے ان کے متعلق دارا سے جو معلومات حاصل کیں، وہ بے حد مختصر تھیں۔ وہ اپنے قبیلے کو نادی کہتے تھے جس کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ وہ اپنے ماضی سے کوئی ربط نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اُنھیں اپنے مستقبل کی فکر تھی ماسوا اس کے کہ ان کی آبادی کم نہیں ہونی چاہیے۔

دارا میرے لیے ایک نفسیاتی کیس تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ سب کچھ بھُول جاتا تھا۔ مستقبل کے سلسلے میں وہ صرف پاتال کی سزا سے ڈرتا تھا اور بس . . .

شہرِ خوابیدہ کے خفتہ لوگوں کے متعلق مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا وہ ہماری دُنیا کی ایک صدی کے لگ بھگ عرصے سے اسی طرح سو رہے ہیں وہ اپنے آپ عرفانی کہتے تھے۔ جب کہ زیرِ زمین رہنے والے نادی کہلاتے تھے۔

ایک روز میں بستر پر دراز سوچوں میں گم تھا۔ دارا دوسرے کمرے میں کھانا تیار کر رہا تھا کہ اچانک اس نے میری خواب گاہ میں جھانکا بولا: "وقت ہو گیا ہے جناب"۔

"اچھا!" میں نے کہا: "تو پھر بھیج دو اُسے"۔

"بہتر جناب" اس نے جواب دیا اور چلا گیا۔

مجھے گمبھیر سنّاٹا اور تنہائی یہاں لائی تھی مگر موجودہ صورت حال بھی میرے لیے عذاب بن گئی تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ میں کسی طرح چاند نما روشن حصّے تک پہنچ جاؤں یا اگر وہاں کوئی آبادی ہو تو اُس سے رابطہ قائم کروں۔ چاند نما سرزمین کے بارے میں مجھے اب تک صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ شہرِ خوابیدہ کے لوگوں سے زیادہ سائنسی ارتقا حاصل کرنے والوں کی تخلیق ہے اور وہاں کے لوگ قرانی کہلاتے ہیں۔

نادی لوگ قرانیوں سے بہت ڈرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ عرفانیوں اور قرانیوں میں جنگ ہوئی تھی جس میں قرانی جیت گئے تھے انھوں نے عرفانیوں کو جوہری یا برقی توانائی سے محروم کر دیا . . اور وہ منجمد ہو کر رہ گئے . . . کیوں، کب اور کیسے؟ . . . یا تو دارا ان سوالوں کے جواب جانتا ہی نہیں تھا یا پھر بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن قیاس اغلب یہی تھا کہ میرا غلام حقائق سے آگاہ نہیں ہے۔

میرے لیے اب یہاں سے فرار بھی مشکل ہو گیا تھا کیونکہ میرے کمرے کے باہر تقریباً پچاس نادی پہرہ دیتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ انسان بھی کتنا ناشکرا ہے جب مجھے بھرپور تنہائی حاصل تھی تو میں اپنے جیسے کسی انسان کی آواز اور اُس کی رفاقت کے لیے ترسا کرتا تھا۔ لیکن یہ رفاقت میسّر آئی تو میں پھر تنہائی کا خواہش مند ہوں۔ میں ان خواتین کے ہجوم سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جنھوں نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔

غسل کے بعد میں نے کپڑے بدلے، کھانا کھایا اور آرام کرنے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ دارا نے کہا: "وقت ہو گیا ہے جناب"۔

"لعنت بھیجو ان پر۔ میں بہت تھک چکا ہوں؟"

"مگر آپ کی زندگی کا دار و مدار . ."

"سُنو دارا!" مجھے ایک ترکیب سُوجھ گئی: "میری جگہ تم یہ فرض کیوں نہیں سنبھال لیتے"۔

"یہ ناممکن ہے جناب۔ پھر تو ہم دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی"۔ وہ گھبرا کر بولا۔

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ رسم و رواج کے مطابق ہم نادی ایسا نہیں کر سکتے۔ فوراً میری اور آپ کی شکایت ہو جائے گی"۔

"کون کرے گا شکایت اور کس سے کرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ عورتیں رستم اور ملکہ شیلو سے شکایت کریں گی تو وہ آپ کو مروا ڈالیں گے اور مجھے پاتال میں بھیج دیا جائے گا"۔

"افوہ . . . کیا مصیبت ہے"، میں نے بیزاری سے کہا: "میں کہاں پھنس گیا ہُوں، خداوندا!" پھر میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا: "اچھی بات ہے"۔

چند لمحوں کے بعد جو لڑکی اندر آئی، میں اُسے فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی لڑکی ہے۔ جس نے پہلے دن میرا منہ نوچا تھا اور شاہ رستم اور ملکہ شیلو کو بلانے گئی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا: "تمھارا نام کیا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے کھڑی رہی۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟" میں قدرے سختی سے بولا۔

وہ پھر بھی خاموش کھڑی رہی۔

"میری طرف دیکھو"، میں نے حکم دیا۔

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر نگاہیں جھکا لیں۔ مگر میں نے ایک نگاہ میں ہی پہچان لیا کہ اس کی بھوری آنکھوں میں ذہانت کی وہ چمک ہے، جو دوسری نادی عورتوں میں مفقود تھی۔

میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ میرے قریب بیٹھ گئی تو بھی اس نے سر اوپر نہیں اُٹھایا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تیرنے لگیں۔

"اپنا نام بتاؤ؟" میں نے کہا۔

"نورے۔ میرا نام نورے ہے"۔ اس نے کانپتی ہُوئی آواز میں کہا۔

"تم بار بار کیوں آتی ہو؟" میں نے کہا کیونکہ وہ پہلے بھی کئی بار آ چکی تھی۔

یہ سُن کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی مگر میں نے لپک کر اُسے روک لیا۔ وہ کسی بلّی کی طرح مجھے نوچنے کھسوٹنے لگی مگر پھر ایک دم سسکیاں لیتے ہوئے بولی: "مجھے تم سے . . . محبت ہے آقا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں"۔

میں خود بھی یہی سمجھتا تھا مگر میں اُس کے منہ سے اعتراف سُننا چاہتا تھا کیونکہ یہ لڑکی کسی موقعے پر میرے کام آ سکتی تھی، ہر چند کہ وہ بہت خوبصورت تھی مگر قریب آنے پر مجھے اس سے کچھ ناگوار سی بُو آئی۔ میں نے دارا کو آواز دے کر کہا: "اسے لے جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ اس سے بدبُو آئے"۔

"میرے ساتھ آؤ"، دارا نے کہا۔ مگر وہ وہیں کھڑی رہی تو دارا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا: "آؤ دیر مت کرو"۔

نورے پھر کسی بلّی کی طرح بپھر گئی اور اُسے نوچتے ہُوئے بولی: "چھوڑو میرا ہاتھ۔ تم مجھے نہیں چھُو سکتے"۔

دارا نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

میں نے کہا: "اس کے ساتھ چلی جاؤ"۔

اس پر وہ بلا چون و چرا اس کے ساتھ چل دی۔

تھوڑی دیر بعد جب نورے واپس آئی تو وہ شبنم میں نہایا ہُوا گلاب لگ رہی تھی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا آقا، وہ سب شاہ اور ملکہ سے شکایت

کریں گی کہ آپ نورے پر زیادہ مہربان ہیں۔ پھر وہ اپنے سپاہی بھیج دیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ پر کوئی آنچ آئے۔" دارا نے کہا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو دارا۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے وفادار رہو گے لہٰذا جو میں کہتا ہوں وہی کرو۔ جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے نورے کو بٹھایا اور نرمی سے بولا۔

"دیکھو نورے۔ اب میں تمھاری زبان سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ تم مجھ سے جھوٹ بالکل نہیں بولو گی۔ تم یہ کہہ کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرو گی کہ مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

"سچ تو یہ ہے سرفروش کہ تم بہت چالاک ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمھیں صرف اپنا دیکھنے کی آرزومند ہوں۔"

"تم پھر جھوٹ کہہ رہی ہو، نورے۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہاں میری جاسوسی کرنے آتی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکا لیا۔

"اس بات کا اعتراف کر لو ورنہ مجھے دکھ پہنچے گا کہ جو لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے، وہ مجھے دھوکا دے رہی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "میں تمھیں دھوکا نہیں دے سکتی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ملکہ شیلو کی طرف سے جاسوسی کرنے آتی ہوں۔ میں ملکہ کی خاص کنیز ہوں اور وہ تمھارے بارے میں ہر بات جاننا چاہتی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بار بار یہاں آنا جرم ہے مگر میں مجبور ہوں۔"

"لیکن ملکہ شیلو کو میری جاسوسی کروانے سے کیا دلچسپی ہے؟ وہ میرے بارے میں کیا جاننا چاہتی ہے؟"

"یہ سب تو میں نہیں جانتی سرفروش۔ میرا کام صرف حکم بجا لانا ہے۔ وہ مجھے کچھ نہیں بتاتی۔"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"تمھارا غلام ٹھیک کہتا تھا، سرفروش۔ اگر میں زیادہ دیر یہاں رکی تو تمھارے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

"مگر تم نے مجھے ساری بات نہیں بتائی۔ اگر تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو تو مجھ پر اعتماد بھی کرو۔ ویسا ہی جیسا میں تم پر کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ ملکہ شیلو کیا چاہتی ہے؟"

"میں بہت کم جانتی ہوں سرفروش لیکن جب وقت آئے گا تو تمھیں ضرور خبردار کر دوں گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مجھ پر کوئی مصیبت آنے والی ہے؟" میں نے کہا۔

"تم پر نہیں بلکہ... بلکہ۔ خیر، سنو۔ ملکہ شیلو اور شاہ کے درمیان گڑبڑ ہونے والی ہے۔ شیلو چاہتی ہے کہ تم اُس کی طرف داری کرو۔ اس کے عوض وہ تمھیں انعام واکرام سے نوازے گی لیکن تمھیں انتظار کرنا پڑے گا اور تم کوئی گڑبڑ بھی نہیں کرو گے بلکہ جو حکم دیا جائے اس پر عمل کرو گے۔"

"لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو خود ایک قیدی ہوں تمھاری طرح بے بس۔" میں نے کہا۔

"مگر تم ہمیشہ قیدی اور بے بس نہیں رہو گے۔ میں شیلو کی پیاری ہوں، میں بار بار تمھارے پاس آیا کروں گی اور جب مناسب وقت آئے گا تو تمھیں ملکہ کے پاس لے جاؤں گی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔"

❁

اُس شب رستم نے بیس محافظوں پر مشتمل ایک دستہ بھیج کر مجھے اپنے پاس بلوا لیا۔ دارا کو میرے ساتھ چلنے کی اجازت دی گئی مگر خوف اور دہشت سے اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم دونوں، محافظ دستے کے نرغے میں گھرے ہوئے زیر زمین دنیا کی بھول بھلیوں سے گزرتے آگے بڑھ رہے تھے کہ دارا نے سرگوشی کی۔

"میں نے آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا آقا کہ رستم کو نورے کے بارے میں ضرور معلوم ہو جائے گا۔ اب اُسے شک ہو گیا ہے کہ آپ شیلو کے ساتھ مل کر اُس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ وہ آپ کو قتل کرا دے گا اور مجھے پاتال میں پھینکوا دے گا۔"

مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ میں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا: "بکواس بند کرو اور آئندہ اس وقت تک اپنی چونچ مت کھولنا جب تک میں تمھیں بولنے کی اجازت نہ دوں۔"

وہ خاموش ہو گیا مگر اس کے خوف و دہشت میں کوئی کمی نہ آئی۔ محافظ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگے کہ میں ان حالات میں بھی بظاہر بالکل ہراساں نہیں تھا۔

بھول بھلیوں سے نکل کر نسبتاً ایک اونچے اور چوڑے غار میں داخل ہوئے تو کچھ فاصلے سے لوہے پر ہتھوڑے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ آگے بڑھے تو مجھے اندھیرے میں شعلہ بداماں بھٹیاں بھی نظر آئیں۔ آتش دان جن میں لوہا گرم کر کے نوک دار آہنی سلاخیں تیار کی جا رہی تھیں جنھیں نادی لوگ بطور ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک سلاخ پر میں نے پہلے دن قبضہ کیا تھا مگر وہ پہلی ہی رات میری قیام گاہ سے غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے لیے کوئی تردد نہیں کیا تھا کہ اُس

وقت مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں نے دارا سے کہا: "اب تم اپنی چونچ کھول سکتے ہو۔ بتاؤ کہ یہاں کیا بنایا جاتا ہے؟"

"یہاں صرف نوک دار آہنی سلاخیں تیار کی جاتی ہیں۔ میں خود بھی ان بھٹیوں پر کام کر چکا ہوں۔"

"تم لوگ دوسرے ہتھیار کیوں نہیں بناتے؟"

"دوسرے ہتھیاروں کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر اس ہتھیار سے بہتر کون سا ہتھیار ہو سکتا ہے۔"

مجھے اس سے اسی جواب کی توقع تھی کیونکہ نادی لوگ ذہنی طور پر ابھی بے حد پس ماندہ تھے۔ تاہم میں نے بھٹیوں کا محل وقوع اچھی طرح ذہن نشین کر لیا کہ شاید آئندہ کبھی ان کی ضرورت پڑ جائے۔

کچھ دیر بعد ہم دربار تک پہنچ گئے۔ یہ دربار بھی ایک زیر زمین غار میں واقع تھا لیکن بہت بڑا اور نسبتاً صاف ستھرا تھا۔ زمین پر مرمت بھی ہوئی تھی اور غار کو اینٹوں کی دیواریں چن کر کئی حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ ایک چبوترے پر شاہ کا تخت رکھا ہوا تھا۔ یہ تخت ایک نام کرسی پر مشتمل تھا جو شہر خوابیدہ کے بالائی حصے سے یہاں لائی گئی تھی۔ دربار کے اوپر ایک موکھا تھا جہاں سے چاند نما سرزمین دکھائی دے رہی تھی۔ وہی چاند جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہاں سے طاقتور دوربینوں کے ذریعے میری نقل و حرکت پر نظر رکھی اور جاسوسی کی جا رہی ہے۔

جب ہمیں دربار میں لایا گیا تو شاہ اپنے تخت پر براجمان تھا اور ہماری راہ دیکھ رہا تھا۔ یہاں لاتے وقت میرے اور دارا کے ہاتھ کر باندھ دیے گئے تھے۔ دارا تو میرے قدموں میں بیٹھ گیا مگر میں تن کر کھڑا رہا حالانکہ میں بے بس تھا لیکن اپنی کسی ادا یا حرکت سے اپنے آپ کو خوفزدہ یا بزدل ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں رستم نے کہا۔

"دونوں آگے بڑھو اور میرے سامنے سیس نواؤ۔"

ہم دونوں آگے بڑھے۔ دارا تو فوراً سجدہ ریز ہو گیا مگر مجھے مینڈک نما رستم کو آرام کرسی پر اکڑ کر بیٹھے دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

"سرفروش کسی تخت یا انسان کے آگے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اس میں تمھاری توہین مقصود نہیں میرا مذہب ہی ایسا ہے کہ مجھے انسانوں کے سامنے سر جھکانے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔"

غصے کے مارے رستم کی بھوری آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ "کیا تمھارے اس غلام نے تمھیں پاتال کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟"

"اسے تو اس کے ذکر سے ہی غش آنے لگتا ہے اس لیے دارا نے اس کی وضاحت نہیں کی۔" میں نے جواب دیا۔

"دارا تم سے زیادہ دانشمند ہے، سرفروش۔" وہ بولا۔ "تمھیں اگر یہ معلوم ہوتا کہ پاتال کیسا جہنم زار ہے تو اس کے ذکر سے تمھاری رُوح تک لرز اُٹھتی۔ میں نے خود کچھ دن وہاں گزارے ہیں۔ اُن دنوں کی یاد سے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میری بات غور سے سنو سرفروش۔ اگر میں نے اب تک تمھیں اُس تاریک جہنمی غار میں نہیں پھینکوایا یا قتل نہیں کیا تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں ورنہ اب تک تمھاری ہڈیاں تک گل سڑ چکی ہوتیں۔"

میں نے اس بات پر لا اُبالی پن سے کہا: "کیا تم سے گفتگو کے دوران میرے ہاتھ بندھے رہیں گے اور میں اسی طرح کھڑا رہوں گا؟ یہ میرے ساتھ زیادتی ہے کیونکہ میں اپنا فرض انجام دے رہا ہوں۔"

وہ مسکرا دیا اور بولا: "ہاں۔ چونکہ اب تک میں خود بھی یہ فرض انجام دیتا آیا ہوں اس لیے مجھے تمھاری دشواری کا احساس ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی تو ایک اندھیرے گوشے سے ایک لڑکی نمودار ہوئی جو ایک کرسی اُٹھا لائی اور اُسے تخت کے سامنے، چبوترے سے نیچے رکھ دیا۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ لڑکی یا دوسرے محافظ اندھیرے گوشوں میں کھڑے ہیں اور کسی وقت بھی رستم کے اشارے پر مجھے ختم کر سکتے ہیں۔

لڑکی کی نگاہیں ایک بار بھی میری طرف نہیں اُٹھی تھیں۔ اُس نے کرسی رکھنے کے بعد میرے ہاتھ کھول دیے۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی کی عمر بمشکل بارہ برس رہی ہوگی۔ وہ بلا کی حسین تھی، اُس کے چہرے پر شبنم سے دُھلے گلابوں کی سی شگفتگی تھی۔ مشعل کی تھرتھراتی روشنی میں اگرچہ اس کے نقوش کہرے میں لپٹے دکھائی دیتے تھے لیکن یہ خدوخال اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتے تھے۔

"یہ میری بیٹی آشی ہے۔" رستم بولا۔ "یوں تو میری بے شمار بیٹیاں ہیں مگر اُن سب میں سے مجھے یہ عزیز تر ہے۔ جب تک یہاں ہو، یہ تمھارے ساتھ رہے گی۔"

میں اس کرم گستری پر ایک لمحے کے لیے گنگ سا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ آخر مجھے اتنا حسین تحفہ کیوں دیا جا رہا ہے۔

"میں تمھارا شکرگزار ہوں کہ تم اپنے خزانے کا اتنا قیمتی موتی مجھے دے رہے ہو۔ میں اسے سنبھال کر رکھوں گا۔"

"یہ تمھیں ساری خوشیاں دے گی۔"

"واقعی؟" میں نے آشی سے براہِ راست پوچھا۔

"حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے۔" آشی نے جواب دیا۔

"اب تم باہر انتظار کرو آشی۔ جب سرفروش میرے ساتھ بات چیت سے فارغ ہوگا تو تم اس کے ساتھ جا سکو گی۔" رستم نے حکم دیا۔

آشی چلی گئی۔
دارا میری ٹانگوں کے قریب بیٹھا' ابھی تک تھر تھر کانپ جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ مُنہ سے عجیب سی آوازیں نکالتا اور میری ٹانگیں پکڑ لیتا... میں نے اُسے ڈانٹتے ہُوئے کہا: "کھڑے ہو جاؤ۔"
وہ کھڑا ہو گیا مگر اس کی لرزش ختم نہ ہُوئی۔
"اگر تم بے خوف کھڑے نہیں ہو سکتے تو باہر دفع ہو جاؤ۔ میں رستم سے تخلیے میں بات کرنا چاہتا ہُوں۔"
وہ ہانپتا ہُوا باہر چلا گیا۔ رستم نے اسے باہر بھیجنے پر اعتراض کرنے کی بجائے کہا: "تمھیں ایک غلام سے دلیری کی توقع نہیں رکھنی چاہیے سرفروش! غلامی آدمی سے اَنا اور خودداری چھین لیتی ہے۔"
رستم کے دوستانہ رویے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تو میں نے کہا۔ "تم نے بتایا تھا کہ کچھ عرصے پاتال میں بھی رہے ہو۔ مجھے اس کے متعلق کچھ بتاؤ۔"
"وہ بڑی کرب انگیز عقوبت گاہ ہے' سرفروش۔" رستم نے جھرجھری لیتے ہُوئے جواب دیا۔ "وہاں اندھیرے، تنہائی اور بد بُو کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہاں چند روز رہنے کے بعد آدمی بینائی سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنی موت کی دُعائیں مانگنے لگتا ہے۔"
"تم وہاں کیوں رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔
"اس جہنم زار میں کوئی بھی اپنی خوشی سے نہیں جاتا۔ مجھے وہاں سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا اور یہ سزا مجھے اس لیے دی گئی تھی کہ میں ذہنی طور پر عام نادیوں سے زیادہ صلاحیت رکھتا تھا۔"
"یہ سزا کس نے دی تھی؟"
"جب میں جوان ہُوا تو ایک بار یہاں سے نکل کر اوپر اُس شہرِ خوابیدہ میں چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے عرفانیوں کو بہتر زندگی گزارتے دیکھا تو میرے دل میں بھی ویسی ہی زندگی گزارنے کی خواہش مچل اُٹھی۔ میں نے اُن سے بحث کی جس نے تکرار اور پھر لڑائی کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے اپنی آہنی سلاخ سے کچھ عرفانی مار ڈالے۔ اس جُرم کی پاداش میں اُنھوں نے مجھے گرفتار کر کے ایک اندھیری کھوہ میں ڈال دیا۔ تم اُس اندھیرے جہنم کا تصور بھی نہیں کر سکتے، سرفروش۔"
"اگر وہ ایسا ہی جہنمی عقوبت خانہ ہے تو پھر وہاں انسان زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتا ہو گا؟"
"عرفانی اپنے فلسفۂ عدم تشدد کے باوجود بڑے ظالم اور سنگدل ہوتے تھے۔ وہ اس عقوبت خانے کے قیدیوں کو نلکیوں کے ذریعے کھانا اور پانی بہم پہنچایا کرتے تھے مگر وہ ایسی غذا ہوتی تھی جو آدمی کی عمر گھٹاتی نہیں بلکہ بڑھا دیا کرتی تھی تاکہ وہ زیادہ عرصے تک زندہ رہ کر سزا کا عذاب بھگتتا رہے۔"

"نادی ذہنی طور پر پس ماندہ مخلوق ہے اور اُسے ذہنی ارتقا
رستم کی اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس غذا میں کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہے لیکن ہم دونوں اس عرصے کو مختصر کر
وٹامنز کے ساتھ ساتھ نشہ آور دوائیں بھی شامل کر دی جاتی ہوں گی سکتے ہیں۔ تم ذہنی طور پر عرفانیوں سے کم نہیں ہو جب کہ میں بھی نصف
"پھر تم اس عقوبت گاہ سے بچ کیسے نکلے؟" میں نے سوال کیا عرفانی ہُوں۔ میری ماں نادی نسل کی تھی مگر میرا باپ عرفانی تھا جسے
"اُس خوشبو دار بم کی بدولت جس نے عرفانیوں کو توانا (کسی جُرم کی پاداش میں پاتال بھیج دیا گیا تھا۔ اپنے باپ کی وجہ سے
کی ترسیل سے محروم کر کے آناً فاناً زندہ موت کی نیند سُلا دیا۔" میری ذہنی استعداد نادیوں سے کہیں بہتر ہے۔ یہی حال شیلو کا
"میں سمجھا نہیں کہ خوشبو دار بم سے تمھاری کیا مراد ہے؟" بھی ہے۔"
"وہ بم گرنے کے بعد ہر طرف ایک عجیب سی خوشبو پھیل گئی تھی۔" "کیا اُس کا باپ بھی کوئی عرفانی تھا؟" میں نے پُوچھا۔
اور اس کے ساتھ ہی عرفانی، توانائی سے محروم ہو گئے تھے۔ اس بم "نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اُس کی ماں عرفانی تھی دراصل
عرفانیوں کو اس طرح سُلا یا کہ وہ جس عالم اور جس بھی حال میں تھے ایک نادی پاگل ہو کر اُوپر چلا گیا۔ وہاں اُسے سب سے پہلے جو عرفانی
منجمد سے ہو کر رہ گئے۔ اس بم نے زیرِ زمین نادیوں کو بھی متاثر کیا عورت دکھائی دی، اُس نے اُسے زبردستی اپنی بیوی بنا لیا۔ عرفانیوں
چونکہ وہ زمین کے اندر تھے اس لیے منجمد تو نہ ہو سکے لیکن مرد، صاحبے اُس پاگل کو پکڑ کر پاتال کی کھوہ میں ڈال دیا لیکن جب اُس
اولاد بننے کے قابل نہ رہے۔ شاید اس بم کا اثر پاتال تک نہیں عورت کے بطن سے لڑکی پیدا ہُوئی تو انھوں نے اُسے نادیوں
تھا اس لیے میں بچ گیا۔ پھر مجھے نادیوں نے اُس تاریک اور گھر کے حوالے کر دیا۔ وہی لڑکی شیلو ہے۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور
جہنم سے نکال لیا۔ تب سے اب تک میں افزائشِ نسل کے اپنے سر پر اُنگلی سے گول سا نشان بنانے لگا۔ اس سے قبل میں دارا
کوشاں ہُوں۔ میں نے تمھیں بھی محض اسی لیے قتل نہیں کیا کہ ہمارا کو بھی اپنے سر پر اُنگلی سے یہی نشان بناتے دیکھ چکا تھا۔
بہترین نسل اوپر جا کر شہرِ خوابیدہ اور عرفانیوں کا ورثہ اپنا سکے۔ "تم اپنے سر پر یہ نشان بنا کر اپنے کسی دیوتا کی خوشنودی
نسل بہتر زندگی کی اہل ہو گی اور عرفانیوں کا طرزِ حیات اپنا سکے گی۔ حاصل کرتے ہو؟" میں پُوچھے بغیر نہ رہ سکا۔
نے وضاحت کی۔ "نہیں۔ ہم نادی سوچ بچار کرتے ہُوئے یہ حرکت کرنے
"بہترین نسل سے تمھاری مراد کیا ہے؟" لگتے ہیں جب عرفانی زندہ تھے، وہی ہمارے دیوتا تھے مگر اب وہ

زندہ موت کی نیند سو چکے ہیں اس لیے ہمارا کوئی دیوتا باقی نہیں رہا۔"
مجھے شہرِ خوابیدہ کے متعلق اب تک کسی سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی تھیں لیکن رستم وہ باتیں جانتا تھا جن کی مجھے لوہ تھی۔ چنانچہ میں نے بات سے بات کا سرا جوڑتے ہُوئے پُوچھا۔ "کیا عرفانیوں کا بھی کوئی دیوتا تھا؟"
"وہ قمرانیوں کی پرستش کرتے تھے جو چاند نما سرزمین پر بستے ہیں مگر پھر اُنھوں نے قمرانیوں کی پرستش چھوڑ دی اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا مگر قمرانی، عرفانیوں سے کہیں زیادہ چالاک ہیں۔ اُنھوں نے ایک بم کے ذریعے عرفانیوں کی زندگی منجمد کر دی۔ اب جب چاہیں توانائی کی ترسیل بحال کر کے عرفانیوں کو اس طویل عذاب ناک حالت سے بیدار کر سکتے ہیں۔"
میں اُس سے نیا سوال کرنا ہی چاہتا تھا کہ وہ خود ہی بول اُٹھا۔ "اب مجھ سے یہ مت پُوچھنا کہ قمرانیوں کا معبود کون ہے اور وہ کن دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ میں تمھیں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتا سکوں گا کیونکہ میں خود قمرانیوں کے بارے میں لاعلم ہُوں۔"

یہ سُن کر میں خاموش ہو گیا۔ اب اگر میں مزید سوال کرتا تو اُسے غصّہ آ جانے کا اندیشہ تھا۔
"میں نے تمھیں اس لیے زندہ رہنے دیا ہے کہ مجھے نئی اور بہتر نسل کی ضرورت ہے۔ اگر مجھے نئی اور بہتر نسل نہ مل سکی تو موت ہمارا مقدر بن جائے گی لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ تمھاری موت ہم سے بہت پہلے واقع ہو سکتی ہے۔" اس نے قدرے توقف سے کہا۔
میں اُس کی اِس دھمکی پر مُسکرا دیا اور بولا: "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، رستم؟"
"میں تمھیں بتا چکا ہُوں تم میرے پانچ نادیوں کے برابر طاقتور ہو۔ تمھاری ذہنی استعداد مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے میں نے تمھاری نگرانی کے لیے بیس محافظ مقرر کیے ہیں۔ پچاس آدمیوں کا ایک دستہ اُن کے علاوہ تم پر نظر رکھتا ہے تاکہ تم کہیں فرار نہ ہو سکو۔" اتنا کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں: "تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو... مجھے اسی سے کوئی دل چسپی نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہُوں کہ تم بہتر نسل پیدا کر سکتے ہو اس لیے تمھیں ہر طور میرا ساتھ دینا ہو گا۔ تم جانتے ہو کہ ہم نہ عرفانیوں کی طرح چالاک ہیں اور نہ ہی خوب صُورت ہیں مگر ایک معاملے میں ہمیں اُن پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ لوگ صرف انسان تھے مگر ہم مکمل انسان ہیں۔ ہمیں زندگی بسر کرنے کے لیے کسی برقی توانائی کی ضرورت نہیں۔ اس لیے ہمیں زندہ موت کی نیند نہیں سُلایا جا سکتا۔"
یہ کہتے ہُوئے اُس نے اپنے کان میں لگے ٹاپ کو چھوا۔
"اگرچہ میرے اور شیلو کے کان کی لَو میں یہ آلہ لگا ہُوا ہے لیکن ہم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ تاہم ان کی وجہ سے نادی ہمیں اپنے سے برتر سمجھتے ہیں ویسے ہم ذہنی طور پر نادیوں سے بہت آگے ہیں مگر تم ہم سے بھی آگے ہو، اس لیے مجھے تمھاری ضرورت ہے۔"
اس پر مجھے تورسے کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے میری ضرورت ہے۔ کیا وہ شیلو کے خلاف سازش کرنا چاہتا تھا؟ اچانک میری ذہنی رَو ڈاکٹر فریدوں کی طرف چل گئی جواب تک مجھے تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔
"اگر تم جانتے ہو کہ توانائی کا منبع کہاں ہے اور وہ منبع تم مجھے دکھا دو تو اس کی کارکردگی سمجھنے کے بعد میں تمھاری خواہشوں کی تکمیل کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہُوں۔" میں نے کہا۔
"نہیں... یہ بات میرے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے سرفروش! توانائی کی ترسیل بحال ہوتے ہی عرفانی اقتدار کے مالک بن جائیں گے اور ہمیں ان سے کبھی نجات نہیں ملے گی۔"

"تمھارا خیال غلط ہے۔" میں نے اُسے دلیل دی۔ "اگر توانائی کے مخرج پر تمھارا قبضہ ہو جائے تو وہ تمھارے غلام ہی نہیں ہوں گے بلکہ اُن کی زندگی بھی تمھارے رحم و کرم پر ہوگی۔ پھر وہ تمھاری اور تمھارے آدمیوں کی حکم عدولی نہیں کرسکیں گے تب تم اپنی قوم کے ساتھ اُن پر زندگی گزار سکو گے۔ تمھاری ہر خواہش بآسانی پوری ہو سکے گی۔"

"اور قمرانیوں کا کیا ہوگا۔ وہ سب کچھ جان لیتے ہیں اور ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔" رستم نے پُوچھا۔

"کیا شہرِ خوابیدہ میں ہونے والی ہر حرکت اور ہر اقدام کا اُنھیں علم ہو جاتا ہے؟"

"ہاں..." رستم نے جواب دیا۔ "جونہی تم نے شہرِ خوابیدہ میں قدم رکھا ہوگا، اُنھیں تمھاری آمد کا علم ہوگیا ہوگا۔ پھر اُنھوں نے ہماری طرح تمھاری ہر حرکت پر بھی نظر رکھی ہوگی۔ تمھیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ جھیل والے پارک سے لے کر اس زیرِزمین دُنیا پر آنے تک ہر لمحے میرے آدمی تمھاری کڑی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ تمھارا کوئی اقدام مجھ سے اور شیلو سے مخفی نہیں رہا۔"

"اوہ۔" بے اختیار میرے مُنہ سے نکل گیا۔ "مجھے بھول کر بھی یہ احساس نہ ہوسکا کہ تمھارے آدمی میرا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ لیکن ڈھکنے کی آواز سے مجھے اندازہ ہُوا تھا کہ یہاں میرے علاوہ بھی کوئی ذی رُوح موجود ہے۔"

"جس احمق نے یہ حرکت کی تھی اب وہ پاتال میں اس کی سزا بھگت رہا ہے۔"

بات پھر موضوع سے ہٹ گئی تھی اس لیے میں نے کہا۔ "ہم توانائی کے مخرج کی بات کر رہے تھے۔ اگر قمرانیوں کو یہ پتہ چل گیا کہ ہم نے مخرج پر قبضہ کر لیا ہے تو بھی وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے... کیوں کہ ہم عرفانیوں کی طرح مشینی انسان نہیں ہیں جنھیں زندگی گزارنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر ہم عرفانیوں کی طرح کوئی حماقت نہیں کریں گے بلکہ اُن سے معاہدۂ امن کیا جائے گا۔ ہم ان سے کہیں گے کہ ہمیں، ہمارے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر اُنھوں نے کہا کہ اُنھیں دیوتا سمجھا جائے تو ہم اُنھیں دیوتا سمجھ لیں گے کہ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔"

"یہ سب کچھ کہنا تو بہت آسان ہے، سرفروش مگر اس کا عمل میں آنا مشکل ہے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ قمرانی ہمیں درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھیں وہ لوگ طویل منصوبہ بندی سے کام لیتے ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ اوّل اوّل ہمارے خلاف کوئی اقدام نہ کریں۔

آہ... شہرِ خوابیدہ میں عرفانیوں جیسی خوبصورت زندگی گزارنا ہمارے لیے کتنا خوش آیند خواب ہے! لیکن یہ ساری باتیں قبل از وقت ہیں، سرفروش۔ ابھی میری قوم اور میرا قبیلہ اس قابل نہیں کہ عرفانیوں کا طرزِ حیات اپنا سکے۔ پھر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا... کہ عرفانی ہمارے ساتھ تعاون کریں گے یا جھگڑا؟ ہوسکتا ہے وہ ہمارے غلام بننے کی بجائے اس زندہ موت کو ترجیح دیں جو اُنھیں مبتلائے خوابِ دکھتی ہے۔"

"جب تک توانائی کا مخرج ہمارے قابو میں رہے گا، وہ ہمارے غلام بننے پر مجبور ہوں گے۔ مجھ پر اعتماد کرو کہ اگر اُنھیں زندگی اور خوابِ مسلسل میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ یقیناً زندگی کو ترجیح دیں گے۔ میں اس بات کے لیے اپنی زندگی کی شرط لگانے کو بھی تیار ہوں۔"

رستم خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا تو میں نے پھر کہا۔ "اچھی طرح سوچ لو اس سے زیادہ سنہرا موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا۔ مجھے توانائی کے مخرج پر لے چلو تاکہ میں اُس کی کارکردگی کا جائزہ لے سکوں۔"

"تم نے مجھے دلیلوں سے قائل کر دیا ہے کہ ہم عرفانیوں کو اپنا غلام بنا کر بہتر زندگی گزار سکتے ہیں، ہمارے تمام حسین خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے، سرفروش کہ مجھے توانائی کے مخرج کا علم نہیں ہے۔"

رستم کی اس بات نے میری ساری اُمنگیں اور اُمیدیں ختم کر دیں مگر پھر بھی میں نے کہا۔ "تم توانائی کے مخرج سے کیسے لاعلم رہ سکتے ہو، رستم! تم بادشاہ ہو اور اپنی قوم کے سربراہ ہو۔ ایک بادشاہ اور سربراہ اس بات سے کیسے لاعلم ہوسکتا ہے؟"

"مجھے عام نادیوں جیسا احمق مت سمجھو، سرفروش میرا خیال ہے کہ عرفانیوں کی اکثریت بھی توانائی کے مخرج کا محلِ وقوع نہیں جانتی تھی... پھر میرے آدمی یا میں کیسے جان سکتا ہُوں؟ البتہ ایک ہستی ضرور جانتی ہوگی۔"

"شیلو؟" میں نے اندازہ لگایا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ مخرجِ توانائی کا محلِ وقوع جانتی ہے۔ کیسے؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ جب میں بادشاہ بنا اور منصوبے بنانے لگا تو شیلو نے مجھے اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔ اُس نے مجھ سے ایک وقتِ مقررہ پر شہرِ خوابیدہ پر نظر رکھنے کے لیے کہا اور خود کہیں غائب ہوگئی۔ جب وقتِ مقررہ پر میں زمینی راستے سے باہر جھانکا تو ایک لمحے کے لیے پورے شہرِ خوابیدہ میں زندگی جاگ اُٹھی مگر دوسرے ہی لمحے شہر اور شہر کے لوگ

منجمد ہوگئے۔ اُنھیں شیلو نے جگایا تھا اُنھیں لمحے بھر کی زندگی شیلو نے عطا کی تھی۔ توانائی کے مخرج کا راز وہی جانتی ہے اور یہ راز اُس نے اپنے سینے میں دفن کر رکھا ہے اگر یہ راز مجھے معلوم ہو جاتا تو کیا شیلو تمھیں زندہ نظر آسکتی تھی؟"

اب میری سمجھ میں آیا کہ رستم کتنا گہرا آدمی ہے۔

"میں، شیلو سے یہ راز اگلوانے کی کوشش کرسکتا ہُوں بشرطیکہ وہ مجھ سے نفرت نہ کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"نفرت؟" رستم نے قہقہہ لگایا۔ "وہ تو تمھیں چاہتی ہے، سرفروش، وہ تمھارے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کا منصوبہ بنانے کی فکر میں ہے اُس کا خیال ہے کہ تم اور وہ مل کر مجھ سے بہتر حکمرانی کر سکتے ہو۔"

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں کہ نورے، شیلو کے ارادوں کی طرف نشاندہی کر گئی تھی۔ رستم نے بھی جیسے میرے دل کا حال پڑھ لیا۔

"وہ جلد ہی تم سے رابطہ قائم کرے گی۔ تم اپنے آپ کو اُس کا دوست ظاہر کروگے تاکہ توانائی کے مخرج کا محلِ وقوع معلوم ہو سکے۔ تمھیں اُس کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کرنا پڑے گی سرفروش، مگر تم اُس سازش پر عمل نہیں کروگے۔ بس میں تم سے یہی چاہتا ہُوں۔"

"کیا تمھیں مجھ پر مکمل اعتماد ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"مجھے تم پر قطعی اعتماد نہیں... لیکن میرے جاسوس اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ میرے پاس ایک ہزار جنگجو ہیں جب کہ شیلو کے پاس پچاس بھی نہیں ہوں گے۔ اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو ہمارے درمیان خون ریز جنگ ہوگی اور وہ جنگ میں ہی جیتوں گا۔ اس طرح ممکن ہے، میرے تمام منصوبے ناکام ہو جائیں اور موت میری قوم کا مقدر بن جائے لیکن تم اور شیلو بھی زندہ نہیں ہوگے۔ یہ فیصلہ تمھیں خود ہی کرنا ہے کہ میرا ساتھ دو یا شیلو کا... اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تمھاری عمر مجھ سے بہت کم ہے۔ کیا تمھارے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ مرنے کی بجائے زندہ رہو اور بڑھاپے میں حاکم بن کر جیو۔"

میں اُسے جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اب تم جاسکتے ہو مگر آشی کے ذریعے مجھے ہر بات سے باخبر کرتے رہنا۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے اس لیے آشی کا خیال رکھنا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمھاری بیٹی کم اور جاسوس زیادہ ہے۔"

میری اس بات پر رستم نے قہقہہ لگایا اور تخت سے اُٹھ کھڑا ہُوا... میں بھی باہر کو چل دیا جہاں وہ سراپا قیامت میری راہ دیکھ رہی تھی۔

میں آشی کو اپنے ساتھ لے تو آیا لیکن جب کبھی میں اُس کی طرف دیکھتا تھا، میری نگاہیں اپنے آپ جھک جاتی تھیں۔ بارہ سال کی ایک معصوم عورت کی طرف دیکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اُن فرائض کی تکمیل میں مصروف رہا جو شاہ رستم نے میرے ذمے لگائے تھے۔

اس دوران نورے میرے پاس آتی رہی اُس کی زبانی مجھے ملکہ شیلو کے بارے میں جو معلومات حاصل ہُوئیں، اُن کا لُبِ لباب یہ ہے کہ شیلو اپنے آپ کو نادیوں میں رہنے اور پروان چڑھنے کے باوجود عرفانیوں سے زیادہ قریب سمجھتی ہے اور اُس نے عادات و خصائل بھی اُنھی کے اپنا رکھے تھے۔ وہ عرفانی عورتوں جیسا مختصر لباس پہنتی تھی مگر اس لباس پر ایک سیاہ لبادہ بھی اوڑھ لیا کرتی تھی جس سے اُس کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے تھے۔

شیلو کی قیام گاہ میں ہر چیز شہرِ خوابیدہ سے لائی گئی تھی اور وہ غذا بھی عرفانیوں والی ہی پسند کرتی تھی۔ اُسے پانی کی بجائے وہ شیریں مشروب مرغوب تھا جو میں نے پہلی بار جھیل والے پارک میں پیا تھا۔

نورے نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اگر شیلو کو ایک خاص راز معلوم نہ ہوتا تو رستم اُسے بہت پہلے اپنے راستے سے ہٹا چکا ہوتا۔ میں نورے کی اس بات سے سمجھ گیا تھا کہ یہ راز برقی توانائی کے مخرج کا محلِ وقوع ہی ہوسکتا ہے جب کہ نورے اسے شیلو کا دوغلاپن سمجھتی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ شیلو، رستم سے نفرت کرنے کے باوجود اُس کی موجودگی میں اپنے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ چپکائے رکھتی ہے نورے کا کہنا تھا کہ شیلو، رستم سے اتنی خوف زدہ ہے کہ جب وہ نوجوان نادیوں کو تخلیے میں بُلاتی ہے تب بھی اس ڈر کے مارے رستم کے خلاف کچھ نہیں بولتی کہ کہیں وہ رستم کے جاسوس نہ ہوں۔

شیلو اپنے فارغ اوقات میں عرفانیوں کی کتابیں پڑھا کرتی تھی اُس نے نورے کو بتایا تھا کہ عرفانی ہر ماہ اپنا خون بدل لیا کرتے تھے اور ایسی کیمیاوی خوراک استعمال کرتے تھے جو اُنھیں ہمیشہ جوان رکھتی تھی اور اُنھی دو وجوہ کے باعث اُنھیں موت بھی نہیں آتی تھی۔

عرفانی لوگ خاندانی منصوبہ بندی پر سختی سے عمل پیرا تھے۔

جب اُن کی آبادی مقررہ حد سے تجاوز کر لی تو وہ قرعہ اندازی کے ذریعے زائد لوگ چھانٹ کر سائنسی عمل سے حنوط کر کے رکھ دیتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت اُنھیں دوبارہ جسدِ انسانی میں تبدیل کر سکیں۔

نورسے نے بتایا تھا کہ شیلو صرف اپنے سفید بالوں کی وجہ سے عمر رسیدہ نظر آتی ہے حالاں کہ جسمی اعتبار سے وہ بے حد جوان ہے اُسے اپنے نصف عرفانی ہونے پر ناز تھا اور وہ کہا کرتی تھی کہ وہی شہرِ خوابیدہ کے لوگوں پر حکمرانی کر سکتی ہے... لیکن یہی خواب رستم بھی دیکھ رہا تھا۔

جلد ہی آشی میرے لیے دردِ سر بن گئی۔ جب میں تھک ہار کر آرام کرنے کے لیے لیٹتا، وہ میرے پاس آ جاتی لیکن میں بڑی سختی سے اُسے دھتکار دیا کرتا تھا۔ اس کے سلسلے میں مجھے ایک ایسی بات معلوم ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اُس سے گھن سی آنے لگی۔ میں نے اُسے بُری طرح ڈانٹ دیا۔ میرے اس رویے پر وہ مجھے دھمکیاں دینے لگی کہ اپنے باپ سے شکایت کر دے گی۔

مجھے غصہ آ گیا۔

میں نے اُسے پکڑ کر دو گھونسے جڑ دیے۔ وہ شیطان کی خالہ بُری طرح چیخنے چلّانے لگی۔ اس وقت دروازے پر نادی خواتین موجود تھیں۔ آشی کی چیخ وپکار سُن کر ایک عورت اندر آ گئی۔

"نکل جاؤ۔" میں اُسے دیکھ کر دھاڑا تو وہ عورت گھبرا کر باہر چلی گئی اور اُس نے تمام عورتوں کو بتا دیا کہ میں رستم کی بیٹی پر ہاتھ اُٹھا رہا ہُوں اتنے میں دارا آ گیا اور ہاتھ جوڑ کر لرزتے ہوئے بولا: "ایسا نہ کیجیے۔ آشی کو مارنا رستم پر ہاتھ اُٹھانے کے مترادف ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے اُسے ڈانٹا۔ "میں باہر جا رہا ہُوں۔ اگر میرے بعد یہ کوئی گڑبڑ کرے تو تم بھی اس کا لحاظ نہ کرنا۔" یہ کہہ کر میں پاؤں پٹختا ہُوا کمرے سے نکل گیا۔

میری قیام گاہ کے باہر بیس محافظوں کا دستہ متعین تھا۔ وہ لوگ خواتین کی قطار پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ میری بھی کڑی نگرانی کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے مجھے باہر آتے دیکھا تو فوراً نرغے میں لے لیا اور اُن کا سردار بولا: "تمھیں باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" میں نے تیز لہجے میں پُوچھا۔

"تمھارے باہر آنے پر پابندی ہے۔"

"میں زیادہ دیر تک یہ پابندی برداشت نہیں کر سکتا! رستم کے پاس لے چلو۔" یہ کہہ کر میں نے قدم اُٹھایا تو محافظوں نے اپنی بھالا نما آہنی سلاخیں مجھ پر تان لیں۔

"اگر تم واپس نہ گئے تو ہم تمھیں قتل کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

میں نے اس کی سلاخ ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے جواب دیا: "اسے ہٹاؤ دوست۔ تم مجھے نہیں مار سکتے۔ اگر تم نے مجھے ذرا سا بھی نقصان پہنچایا تو تمھیں پاتال میں پھینک دیا جائے گا۔"

"اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس سلاخ کی نوک تمھارے دل میں اُتر جائے گی چاہے مجھے پاتال ہی میں کیوں نہ پھینک دیا جائے۔" محافظوں کے سردار نے پُورے عزم سے مجھے تنبیہ کی۔

میں رُک گیا۔

"اچھا تم یہ تو کر سکتے ہو کہ اپنا ایک آدمی رستم کے پاس بھیج دو اور یہ کہو کہ میں اُس سے ملنا چاہتا ہُوں۔"

محافظوں کا سردار کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا: "ٹھیک ہے، میں تمھارا پیغام بھجوا دیتا ہُوں۔"

اُس نے ایک آدمی بھیج دیا۔

"اب تم واپس چلے جاؤ۔" اس نے مجھے حکم دیا۔

"میں یہاں عاجز آ گیا ہوں ان بدبختوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کاش! یہ پریشانی مجھے لاحق ہوتی۔" ایک محافظ بولا اور باقی سب ہنس دیے۔

میں نے اُن کے سردار سے کہا: "دیکھو دوست! کمرے میں پڑے پڑے میرا جسم اینٹھ گیا ہے۔ مجھے اس وقت تک یہاں چہل قدمی کی اجازت دے دو جب تک تمھارا پیام واپس نہیں آ جاتا۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ انکار کرتا، میں پھر بول اُٹھا: "مجھ سے ڈرتے ہو کیا، تم بیس ہو اور میں اکیلا۔ اُوپر سے نہتا۔ اس لیے میں بھاگنے کی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے مجھے ٹہلنے کی اجازت دے دو۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ بولا اور اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا۔

اب دس آدمی میرے آگے پیچھے ہو گئے۔

میں اُن کے نرغے میں ٹہلنے لگا۔ میں نے چہل قدمی کے دوران غار کا جائزہ لیا۔ ایک جانب وہ تنگ تر تھا اور دوسری جانب چوڑا ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر مجھے پچاس محافظوں کا دستہ بھی نظر آ گیا گویا میرے فرار کے سارے راستے مسدود تھے مگر ایک جگہ غار کی دیوار میں مجھے آہنی سیڑھی لگی دکھائی دے گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اُوپر ڈھکنا موجود تھا جسے ہٹا کر شہرِ خوابیدہ میں پہنچا جا سکتا تھا۔

میں یہ چیزیں اس لیے ذہن نشین کر رہا تھا کہ اگر کبھی فرار کا موقع ملے تو راستے کی تلاش میں مشکل پیش نہ آئے۔ ابھی میں محافظوں کے نرغے میں تھوڑی سی ہی چہل قدمی کر پایا تھا کہ قاصد لوٹ آیا۔

"رستم کا فرمان ہے کہ سرفروش فوراً اپنی قیام گاہ میں لوٹ جائے اور پھر کبھی باہر نکلنے کی جرأت نہ کرے۔ اُسے ملاقات کے لیے پیغام بھیجنے کی جسارت بھی پسند نہیں آئی۔ وہ بادشاہ ہے اور کسی سے بھی اپنی خوشی سے ملاقات کی جا سکتی ہے، دوسرے کی خواہش پر نہیں تاہم آج کسی وقت وہ خود ادھر آئے گا تاکہ اپنی بیٹی سے ملاقات کر سکے۔ اُس وقت وہ سرفروش کو بھی شرفِ ملاقات بخشے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ آشی کا خاص خیال رکھا جائے اور اُسے ہرگز ہرگز کوئی تکلیف نہ پہنچے۔" قاصد نے ہانپتے ہوئے کہا۔

ہرچند کہ رستم نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا لیکن میں اس کے پیغام کو بھی اپنی چھوٹی سی فتح سمجھتا تھا۔ بیٹی سے ملاقات کا مطلب دراصل مجھ سے ہی ملاقات تھا... محافظوں کے سردار نے مجھے فوراً اپنے کمرے میں چلے جانے کا حکم دے دیا۔

"شکریہ دوست! میں تم سے بہت خوش ہُوں اور رستم سے تمھاری سفارش کروں گا۔"... یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں نہ تو دارا تھا اور نہ ہی آشی موجود تھی۔ میں نے دارا کو پکارا تو مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ آشی نے بھی میری صدا کا جواب نہ دیا تو میں نے اُنھیں اُن کے کمروں میں تلاش کیا مگر وہ اپنے اپنے کمروں میں بھی نہیں تھے۔ میں سوچنے لگا کہ وہ باہر بھی نہیں نکلے تو کہاں جا سکتے ہیں؟

میری قیام گاہ میں آٹھ نو کمرے تھے۔ میں ایک ایک کمرے میں اُنھیں تلاش کرنے لگا۔ جب میں آخری کمرے میں داخل ہُوا تو وہاں میں نے جو منظر دیکھا، اُس سے میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

دارا کے چہرے اور گردن پر خراشوں سے خون بہہ رہا تھا جیسے کسی نے ہتھوڑے مار مار کر آشی کے جبڑے توڑ ڈالے ہوں اور اس کی گردن مروڑ کر اُسے مار دیا گیا ہو۔ مجھے لاش کی حالت دیکھ کر جھرجھری آ گئی۔

میں نے دارا سے پُوچھا جو دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر سسکیاں لینے لگا: "یہ سب کیا ہے دارا؟ آشی کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"اسے میں نے قتل کیا ہے آقا۔" وہ لرزتے ہُوئے بولا۔ "میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اُس نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے بُلاتی تھی اور پھر مجھ پر تھوک دیتی، میرا چہرہ نوچ لیتی تھی۔ آخر مجھے اشتعال آ گیا اور میں نے اسے مار ڈالا۔"

"اس کا نتیجہ بھی جانتے ہو احمق؟" میں نے اُسے ٹھوکر مارتے ہُوئے کہا۔

"ہاں مالک رستم مجھے پاتال میں ڈال دے گا اور تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔"

"مجھے کیوں قتل کیا جائے گا؟ اسے میں نے تو نہیں مارا۔"

"مگر میری ہر حرکت کی ذمّے داری آپ پر عاید ہوتی ہے کیوں کہ میں آپ کا غلام ہُوں۔ اس لیے یا تو مجھے پاتال میں جانے سے بچا لیجیے یا مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیے۔"

"میں یہ دونوں کام نہیں کر سکتا۔ تمھیں اپنے کیے کی سزا خود ہی بھگتنا ہوگی۔" یہ کہہ کر میں جانے لگا کہ دارا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بولا: "سُنیے مالک!"

"نہیں میں محافظوں کو اطلاع دینے جا رہا ہُوں۔" میں نے اُسے ٹھوکر مار کر ہٹاتے ہُوئے کہا۔

"پہلے میری ایک بات سُن لیجیے... پھر جو آپ کی مرضی۔" وہ بولا تو میں رُک گیا۔

"جب آپ آشی کو مار رہے تھے تو ایک عورت نے دیکھ لیا تھا اور پھر سب کو بتا دیا تھا۔ اس لیے میں سب سے یہی کہوں گا کہ آپ نے ہی اسے قتل کیا ہے اور سب میری بات کا یقین کریں گے۔ اس لیے یا مجھے بچا لیجیے یا پھر مجھے مار ڈالیے۔"

میں دارا سے اس کمینگی کی توقع نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کے ذہن میں کوئی ایسی چال بھی آ سکتی ہے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ سب مجھے ہی آشی کا قاتل سمجھتے۔ اب میرے لیے

اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ رستم کی آمد سے پہلے پہلے دارا کے ساتھ فرار ہو کر اپنی اور اُس کی جان بچاؤں۔ رہی دارا کی بلیک میلنگ تو اُس کا حساب میں بعد میں بھی چکا سکتا تھا۔

میں ذہن پر زور دے کر فرار کی ترکیب سوچنے لگا۔

بظاہر فرار کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی تھی کیونکہ میری قیام گاہ کے باہر دائیں جانب تنگ غار میں بیس محافظ اور دائیں جانب کچھ فاصلے پر پچاس محافظ موجود تھے۔ پھر دروازے پر خواتین کا اجتماع تھا۔ اُوپر سے ہم دونوں نہتے بھی تھے۔ ابھی میں انھی سوچوں میں گھرا ہُوا تھا کہ باہر عورتوں نے واویلا شروع کر دیا۔

اب تک ہر مشکل وقت میں قدرت میری رہنمائی کرتی آئی تھی۔ اب بھی میں نے دل ہی دل میں خُدا سے مشکل کشائی کی دُعا مانگی تو میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہُوا اور ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔ جب میں نے دارا کو وہ ترکیب بتائی تو وہ بولا: "یہ ناممکن ہے۔ ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے۔"

"بکواس مت کرو اور وہی کیے جاؤ، جو میں کہتا ہُوں۔" میں نے اُسے ڈانٹتے ہُوئے لات مار کر کہا تو وہ بادل ناخواستہ قیام گاہ سے نکل گیا۔

چند لمحے بعد بھاگتے ہُوئے قدموں کی چاپ نے مجھے بتا دیا کہ وہ کچھ محافظوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ میں جلدی سے چھٹے کمرے میں چھُپ گیا۔ پانچ محافظ دوڑتے ہُوئے ساتویں کمرے میں داخل ہو گئے۔

میں نے فوراً کمرے سے نکل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ دارا پھر باہر کو بھاگا اور اس بار مزید پانچ محافظوں کو یہ کہہ کر پانچویں کمرے میں لے آیا کہ میں پہلے محافظوں سے لڑ رہا ہُوں۔ اُدھر ساتویں کمرے میں بند محافظ دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان آوازوں نے بعد میں آنے والے محافظوں کو اس مغالطے میں ڈال دیا کہ واقعی اندر میں اُن سے لڑ رہا ہُوں۔ اتنے میں اُن کا سردار بھی صُورتِ حال معلوم کرنے میرے کمرے میں آیا تو میں نے لسے دبوچ لیا اور اس کی کنپٹی پر کراٹے کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اب اس کی آہنی سلاخ میرے قبضے میں آگئی تھی۔ میں نے دارا کو غار میں لگی ہُوئی آہنی سیڑھیوں کی طرف بھگا دیا تاکہ وہ ڈھکنا کھول دے اور خُود باقی ماندہ محافظوں کے سامنے ڈٹ گیا۔ پہلے ہی ہلے میں میں نے چار محافظوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ پھر عورتوں میں گھس گیا۔ وہ چیختی چلاتی بھاگیں۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں جلدی سے سیڑھی کی طرف لپکا مگر دارا ابھی تک ڈھکنا نہیں کھول پایا تھا۔ میں نے آہنی سلاخ کی نوک سے اسے کھسکایا تو ڈھکنا کھل گیا۔ اتنے میں محافظ بھی سیڑھی تک پہنچ گئے اور اپنی سلاخیں پھینکنے لگے۔ میں تو اُوپر نکل گیا لیکن دارا سلاخوں کی زد سے نہ بچ سکا اور زخمی ہو گیا۔ میں نے اُسے اُوپر کھینچ تو لیا مگر اُس کی حالت خراب تھی۔

اتنے میں محافظ بھی اُوپر چڑھ آئے مگر میری آہنی سلاخ نے سطحِ زمین پر سر نکالنے والے دو محافظوں کو ڈھیر کر دیا اور وہ اپنے ساتھیوں پر جا پڑے۔ میں نے جلدی سے ڈھکنا بند کیا اور دارا کو سہارا دے کر دوڑتا ہُوا ایک عمارت میں گھس گیا۔

یہ عمارت کسی ورکشاپ سے مشابہ تھی۔

دارا کی حالت خراب تھی، اس لیے میں نے اُسے اسٹور کے کاؤنٹر کی اوٹ میں لٹا دیا اور خُود صُورتِ حال کا جائزہ لینے اور سوچنے لگا۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ میں باہر نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ رستم مجھے بتا چکا تھا کہ اُس کے آدمی پہلے بھی قدم قدم پر میرا پیچھا کرتے رہے ہیں اس لیے عمارت سے نکلنے کا مطلب اُن کی نگاہوں میں آنے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

چنانچہ میں باہر جانے کی بجائے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جانے لگا۔

ابھی میں پہلی ہی منزل پر پہنچا تھا کہ سناٹے میں مجھے ایک آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آواز باہر سے نہیں آئی تھی بلکہ یُوں لگتا تھا جیسے اسی عمارت کی کسی بالائی منزل میں کچھ کھسکایا جا رہا ہو۔

میں تیزی سے مگر بے آواز قدموں کے ساتھ اُوپر جانے لگا۔ وہ آواز اب تک آ رہی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے کوئی میز کھسکائی جا رہی ہو۔

جب میں چھٹی منزل پر پہنچا تو پتہ چلا کہ یہ آواز ایک بند کمرے کے اندر سے آ رہی ہے۔ میں گربہ پا چلتا ہُوا دروازے کے قریب آیا اور چابی والے سُوراخ سے اندر جھانکنے لگا۔

میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، وہ میرے لیے ناقابلِ یقین سا تھا لیکن میری آنکھیں اس حقیقت کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھیں۔

کمرے کے بیچوں بیچ ایک ٹیلی ویژن نما سیٹ رکھا ہُوا تھا اور اس کے سامنے شیلو بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر دکھائی دینے والے آدمی سے مخاطب تھی۔ اس آدمی کا سر بڑا، گردن پتلی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔

"میں نے تم کو اُس کے پاس کئی بار بھیجا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ میں اُسے اپنے ساتھ ملا لُوں گی مگر مشکل یہ ہے کہ رستم نے اُسے قید کر رکھا ہے۔" شیلو کہہ رہی تھی۔

اس کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے ہی بارے میں بات کر رہی تھی مگر کس سے؟ اور یہ ٹیلی ویژن نما چیز کیا ہے؟ میں نے وقتی طور پر ان سوالوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"میں نے اب تک اُسے صرف ایک بار دیکھا ہے، وہ بھی اس وقت جب رستم میرے ساتھ تھا۔ اگر وہ اس کی .... قید میں نہ ہوتا تو میں اُس سے مِل چکی ہوتی۔ تم رستم پر حملہ کیوں نہیں کر دیتے جمشید؟ آخر میں کب تک تمھارے وعدوں پر زندہ رہوں گی؟"

"سنو شیلو!" اسکرین پر دکھائی دینے والے جمشید نے کہا: "ہمارے سائنس دان اُس اجنبی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے اُسے ہر قیمت پر محفوظ رکھنا تمھاری ذمّے داری ہے۔"

"لیکن میں اُسے کب تک اور کیسے بچا سکتی ہُوں۔ میرے پاس صرف پچاس محافظوں کا دستہ ہے جس کی اکثریت رستم کی جاسُوس ہے جبکہ رستم کے پاس ایک ہزار سے زیادہ جنگجو موجود ہیں۔ اس لیے اگر تمھیں اجنبی کی ضرورت ہے تو رستم پر بلا تاخیر حملہ کر دو۔"

"نہیں شیلو ہم قمرانی ایک سو سال کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں مگر تم صرف ایک دن آگے کی سوچتی ہو۔ تمھیں صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ جہاں تک تم سے ہمارے وعدوں کا تعلق ہے، ہم انھیں ضرور پُورا کریں گے مگر مناسب وقت آنے پر... جو اب زیادہ دُور نہیں ہے۔ میری ہدایت ہے کہ تم کسی طرح اجنبی کو رستم کی قید سے رہائی دلا کر اپنے قابُو میں رکھو کیونکہ ہمارے سائنس دان اس میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھیں شبہ ہے کہ یہ شخص ماضی کے کسی دور سے یہاں آیا ہے۔ ہمیں وقتاً فوقتاً صُورتِ حال سے بھی آگاہ کرتی رہنا۔" یہ کہنے کے بعد اس آدمی کا عکس دھندلا پڑ گیا اور پھر بالکل ہی غائب ہو گیا۔

شیلو اُٹھ کر سیٹ سے وہ اینٹینا اُتارنے لگی جو کھڑکی تک چلا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی ایک اتفاق تھا لیکن اس اتفاق نے مجھ پر بہت سی باتیں منکشف کر دیں۔ پہلی تو یہ کہ شیلو ملکہ ہونے کے باوجود نادیوں کے خلاف قمرانیوں کی جاسُوس تھی۔ دُوسری یہ کہ انھوں نے اس جاسُوسی کے عوض کچھ وعدے کر رکھے تھے۔ اور ان میں سے ایک وعدہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُسے اس شہرِ خوابیدہ اور اس کے باشندوں کی ملکہ بنا دیا جائے گا... اور تیسری اہم بات یہ کہ وہ لوگ میری ذات سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچے۔ اس کا مطلب تھا کہ فی الوقت مجھے شیلو سے کسی خطرے کا اندیشہ نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے وہ میری حفاظت کی ذمّے دار تھی۔

میری ان سوچوں کے دوران شیلو نے وہ عجیب ٹی۔ وی سیٹ گھسیٹ کر ایک الماری میں رکھ دیا اور ایک ڈبہ کھول کر کوئی مشروب پینے لگی۔ اتنے میں میں نے دروازے پر دستک دی تو وہ اُچھل گئی اور بے ساختہ بولی: "کون؟"

"سرفروش!" میں نے جواب دیا۔

"سرفروش!" اُس نے بے یقینی سے دُہرایا: "نہیں تم سرفروش نہیں ہو سکتے۔"

"تم چابی کے سُوراخ سے جھانک کر اپنا اطمینان کر سکتی ہو۔" میں نے چند قدم پیچھے ہٹتے ہُوئے جواب دیا۔

چند ہی لمحے بعد دروازہ کھُل گیا۔

"مگر تم... تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" اُس نے تعجب سے پُوچھا۔

میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

"دارا کہاں ہے؟" اس نے پُوچھا۔

"میں یہاں ہُوں۔" نچلی منزل سے دارا کی آواز آئی اور پھر وہ لڑکھڑاتا ہُوا سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دیا: "رستم کے آدمی ہماری تلاش میں ہیں۔ میں نے اُن کی آوازیں سُنی ہیں۔"

دارا کی حالت مزید خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ مجھے بھی کچھ زخم آئے تھے مگر وہ کاری نہیں تھے لیکن دارا کے زخم کاری ہو سکتے تھے اس لیے میں نے شیلو سے کہا: "یہاں مرہم پٹی کا کوئی سامان ہے؟ اگر ہو تو سب سے پہلے اس کی مرہم پٹی کی جائے۔"

"مجھے مار ڈالو مالک۔" دارا بولا: "ہم دونوں رستم کے آدمیوں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔"

"نہیں دارا! تم زندہ رہو گے۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔

شیلو نے اُسے کوئی ٹانک پلایا پھر پلاسٹک نما کپڑا پھاڑ کر اُسے پٹیاں باندھنے لگی مگر اُس کے تاثرات سے صاف پتہ چلتا تھا جیسے اُسے گھن آ رہی ہو۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو گئی تو میں نے دارا سے کہا: "تم یہیں لیٹ کر آرام کرو۔ ابھی رستم کے آدمیوں کو یہاں تک پہنچنے میں وقت لگے گا۔ تب تک میں شیلو سے کچھ باتیں کر لُوں۔"

یہ کہہ کر میں شیلو کو دُوسرے کمرے میں لے آیا۔

"میں خود بھی تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔" وہ بولی۔

"وہ بعد میں کرنا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ عرفانیوں کو اس زندہ موت سے نجات دینے والی توانائی کا مخرج کہاں ہے۔ تم اس توانائی کا سرچشمہ جانتی ہو اور اس بات کا مجھے علم ہے لہٰذا مجھے جھُوٹ سے بہلانے کی کوشش نہ کرنا۔"

"لیکن وہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ وہاں جاتے ہُوئے ہم نہ صرف رستم کے آدمیوں کی نظر میں آ جائیں گے بلکہ قمرانی بھی ہمیں

دیکھ لیں گے۔"

"وہ کیسے دیکھ لیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"چاند سے جو شعاعیں نکل رہی ہیں' وہ ہمارے عکس وہاں منتقل کر دیں گی۔" شیلو نے بتایا۔

"اگر وہ دیکھ لیں تو کیا اقدام کریں گے اور کب تک کریں گے؟"

"کیا کریں گے' یہ تو میں نہیں کہہ سکتی البتہ وہ کوئی قدم جلدی نہیں اٹھائیں گے۔ وہ کوئی کام بھی طویل منصوبہ بندی کے بغیر نہیں کرتے۔"

"بہرکیف وہ جو اقدام کریں اور جب بھی کریں' مجھے اس کی پروا نہیں' تم مجھے وہ مخرج دکھا دو۔" میں نے فیصلہ سنا دیا۔

"کیا تمھارا غلام بھی ساتھ چلے گا؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں..." میں نے جواب دیا۔

ہم کمرے سے نکل آئے۔ مزمّتی سے دارا کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی اور وہ چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔

شیلو ہمیں نیچے لانے کی بجائے عمارت کی چھت پر لے گئی اور پھر ہم ان عمارتوں کی چھتوں پر آگے بڑھنے لگے۔ شہر کی طرح عمارتوں کی چھتوں کا یہ سلسلہ بھی لامتناہی معلوم ہوتا تھا۔ تاحدِ نظر چھتیں ہی چھتیں دکھائی دے رہی تھیں ہم کودتے پھاندتے مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ اچانک ایک مقام پر مجھے کچھ نادیوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے جھانک کر دیکھا' رستم کے آدمی ہمارے ساتھ ساتھ اُسی سمت میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بالآخر اُنھوں نے ہمیں ڈھونڈ نکالا ہے اور اب سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگے رہیں گے۔

چلتے چلتے ہم ایک ایسی عمارت کے قریب پہنچے جس کے بیچوں بیچ ایک گنبد تھا۔ میں نے شیلو سے پوچھا "یہ کون سی عمارت ہے؟"

"بلدیہ۔ جہاں شہر کے سارے کرتا دھرتا اس وقت محوِ خواب ہیں۔ آہ۔ اس زندہ موت میں مبتلا ہونے سے پہلے وہ کس شد و مد سے ایک دوسرے کے ساتھ مباحثے میں لگے ہوئے تھے۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہے؟"

"میں نے اُنھیں دیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمھی نے اُنھیں توانائی سے محروم کیا تھا۔"

"بے شک' مجھے اس کا اعتراف ہے۔ اُنھوں نے بھی تو مجھے پاتال میں رہنے والے نادیوں کے حوالے کر دیا تھا حالانکہ اپنی پیدائش میں میرا کوئی دخل نہیں تھا اور میں نصف عرفانی بھی تھی۔"

ہم گنبد کے چھجے پر سے کھسکتے ہوئے دوسری جانب پہنچے تو سامنے ایک بند دروازہ تھا اور شاید یہ اس شہر کا پہلا دروازہ تھا جس پر میں نے ایک بڑا سا قفل لگا دیکھا۔

شیلو آگے بڑھ کر قفل کھولنے کی بجائے کنڈی کا قبضہ کھولنے لگی۔ اس کام میں میں نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا کیونکہ اب رستم کے آدمیوں کی آوازیں قریب تر آنے لگی تھیں۔ وہ بھی غالباً چھتوں پر سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے مگر درمیانی گنبد کی وجہ سے ہم اُنھیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جب کنڈی کے پیچ کھل گئے اور کواڑ کھلا تو میں نے اندر کا نظارہ کرتے ہوئے غصے سے پوچھا "یہ کیا ہے شیلو؟ تم ہمارے ساتھ کون سی چال چلنا چاہتی ہو؟"

وہ مسکرا کر بولی "اس میں کوئی چال نہیں ہے سرفروش! یہاں سیڑھیوں کی بجائے ایک پھسلواں راستہ بنا ہوا ہے' جو میلوں گہرائی میں چلا جاتا ہے۔ کیا تم اس کے ذریعے اُترتے ہوئے ڈرتے ہو؟"

"میں پھسلتے ہوئے اُترنے سے نہیں ڈرتا لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ میلوں تک پھسلنے سے پیدا ہونے والی رفتار کا اندازہ نہ کر سکوں۔" میں نے کہا "اس وقت پینتالیس درجے کی یہ ڈھلان ہماری رفتار کو طوفانی بنا دے گی۔"

"پھسلنے کی رفتار بلاشبہ تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے سرفروش!" وہ بولی "لیکن آخری حصے میں رفتار کم کرنے کے لیے چڑھائیاں بنا دی گئی ہیں۔ تمھارے اطمینان کی خاطر پہلے میں پھسلوں گی۔"

ابھی وہ اپنی بات بمشکل ختم کر پائی تھی کہ عمارت کا دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

رستم کے آدمی تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔

"کیا وہ اس گہرائی میں بھی ہمارا تعاقب جاری رکھیں گے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنس کر بولی "نادی گہرائی سے گھبراتے ہیں۔ وہ اس پھسلواں راستے پر قدم رکھنے کی بجائے مر جانے کو ترجیح دیں گے اُنھیں تنہا شعور ہی نہیں کہ وہ اس پر پھسلنے کی سوچ سکیں۔ چلو اب دیر مت کرو۔"

"تو پھر پہلے تم جاؤ۔" میں نے کہا۔

شیلو ڈھلان پر پشت کے بل لیٹ کر پھسلنے لگی۔

رستم کے آدمیوں کی آوازیں قریب تر آتی جا رہی تھیں۔ میں نے لپک کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دارا سے کہا "چلو

تم بھی وہی کرو جو شیلو نے کیا ہے۔"

"نہیں نہیں آقا۔ مجھے مار ڈالو مگر پاتال میں مت بھیجو۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

میں نے اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے دبوچ لیا اور پیٹھ کے بل لٹا کر نیچے دھکیل دیا۔ عین اُسی وقت دروازے پر سلاخوں کے دھماکے ہونے لگے۔ میں نے باآوازِ بلند کہا "پہلے میری بات سن لو نادیو۔ رُک جاؤ۔ میں سرفروش تم سے مخاطب ہوں۔"

دروازے پر سلاخوں کی ضربیں بند ہو گئیں اور ایک آواز آئی "بولو... کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں صلح کی گفتگو کرنا اور رستم کو ایک پیغام بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"تم تو ایک مُردے کی مثال ہو سرفروش اور مُردوں سے صلح کی بات چیت نہیں کی جا سکتی۔" باہر سے آواز آئی "اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمھیں کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے اور رستم کے پاس لے جائیں گے۔ جو کہنا ہو اُسی سے کہنا۔"

"اس دعوت کا شکریہ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کیا رستم کو آشتی کی موت کا علم ہو چکا ہے یا نہیں؟"

"ہاں اور اُس نے قسم کھائی ہے کہ وہ تمھاری بوٹی بوٹی کر ڈالے گا۔"

"رستم کو بتا دینا کہ آشتی کو میں نے نہیں بلکہ دارا نے قتل کیا تھا۔ اس کا مجرم دارا ہے' میں نہیں۔"

"مگر تم نے اُسے بچایا ہے۔ وہ تمھارا غلام ہے اور اُس کے ہر فعل کے ذمے دار تم ہو... یہ بات تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو۔"

"ہاں... لیکن میں اُسے بچانے پر مجبور تھا۔ خیر بعد میں یہ تفصیل رستم کو خود ہی بتا دوں گا۔ فی الوقت اُسے میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ میں توانائی کے مخرج کی کھوج میں ہوں اور اس کا پتہ چلانا خود رستم کے مفاد میں ہے۔ اُسے کہہ دینا کہ ہم ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں اور اُسے سب سے زیادہ خطرہ قمرانیوں سے ہے۔ بچاس محافظوں والی شیلو سے نہیں۔ جب میں توانائی کا مخرج ڈھونڈ لوں گا تو اُسے قمرانیوں پر غالب آنے کا طریقہ بھی بتا دوں گا۔"

"یہ تو ہم اُسے بتا دیں گے۔" دوسری آواز آئی "لیکن تم بھی اس کا ایک پیغام سن لو۔ اُس نے کہا ہے کہ تمھاری محبوبہ لوسے اس کی قید میں ہے اگر تمھارے دل میں اُس کا ذرا سا بھی پیار ہے تو تم اپنے آپ کو اور شیلو کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ لوسے کے ساتھ عبرت ناک سلوک کیا جائے گا۔"

"لوسے میری محبوبہ نہیں ہے۔ رستم جو چاہے کرے مگر اُسے اتنا اور بتا دینا کہ مجھے دوست بنا کر وہ فائدے میں رہے گا اور دشمن بنا کر اُسے گھاٹے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔" میں نے جواب دیا۔

یکایک دروازے پر پھر سلاخوں کی ضربیں لگیں۔ میں ڈھلان پر پھسلنے کے لیے لیٹا تو دروازہ ٹوٹ گیا۔

میں نہیں جانتا کہ اُنھوں نے مجھے اس ڈھلوانی راستے پر پھسلتے ہوئے دیکھا یا نہیں البتہ پھسلنے کی تیز رفتاری کے باعث ان کی آوازیں فوراً ہی معدوم ہو گئیں۔

میں نے آہنی سلاخ سینے پر رکھ کر اُس کا گول سرا اپنی ٹانگوں میں اڑس لیا تھا اور دونوں ہاتھ اُس ڈھلان کے کناروں پر رکھ لیے تھے۔ یہ ڈھلان پینتالیس کے زاویے سے نیچے جا رہی تھی اس لیے میری رفتار سکینڈوں میں طوفانی ہو گئی۔ میرے ہاتھوں اور پیٹھ میں پلاسٹک کی رگڑ سے تپش کا احساس ہونے لگا۔ سر بھی بُری طرح چکرا گیا اور جی متلانے لگا۔

شیلو نے بتایا تھا کہ یہ ڈھلان تقریباً پانچ میل لمبی ہے یہ فاصلہ اگرچہ منٹوں میں طے ہوتا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے ہوا میں معلق ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہوں اور اب میں لامتناہی خلا میں گر رہا ہوں... پھر اچانک ہی راستے میں چڑھائیاں آنے لگیں جنھوں نے رفتار کم کر دی آخر میں یہ راستہ مسطح ہو گیا اور میں رُک گیا لیکن وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

مجھے رستم کی وہ بات یاد آ گئی جو اس نے پاتال کے متعلق بتائی تھی کہ وہاں جا کر انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ شاید میں اندھا ہو گیا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں اپنی آنکھیں ملنے لگا اور اُٹھ بیٹھا۔

کچھ دیر بعد کچھ فاصلے پر اُوپر روشنی کے نقطے سے دکھائی دینے لگے جو ستاروں کی طرح ٹمٹما رہے تھے لیکن یہ ستارے نہیں ہو سکتے تھے... تو پھر یہ ٹمٹماتی روشنیاں کیسی تھیں؟ تھیں بھی یا میرا وہم ہی تھا؛ مجھے ایک عجیب اور انجانے سے خوف کے باعث جھرجھری آ گئی۔

میں نے بے ساختہ آواز دی "شیلو! تم کہاں ہو؟"

اُوپر سے آواز آئی "میں یہاں ہوں سرفروش۔ اُوپر دیکھو۔"

میں نے اُوپر دیکھا۔ تقریباً چالیس فٹ اُوپر ایک روشنی دائیں بائیں ہلنے لگی۔ ساتھ ہی شیلو کی آواز آئی "ڈھلانی راستے کے چند قدموں پر ایک سیڑھی ہے اس سیڑھی سے اُوپر آ جاؤ۔"

میں نے ٹٹول کر سیڑھی تلاش کی اور اُوپر چڑھنے لگا۔ وہ پوری چالیس سیڑھیاں تھیں۔ پھر ایک پلیٹ فارم... اور اُسی پلیٹ فارم

پر شیلو مشعل لیے کھڑی تھی۔

"دارا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں یہاں ہوں۔" ایک تاریک گوشے سے اس کی آواز آئی۔

"جاؤ سامنے سے اپنے اور سرفروش کے لیے مشعلیں لے آؤ۔" شیلو نے اُسے حکم دیا۔

"یہ مشعلیں یہاں کیسے آگئیں اور کس نے جلائی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے جلائی ہیں۔" شیلو نے کہا۔ "یہ مشعلیں نہیں بلکہ ایک قسم کی لکڑی ہے جب دو لکڑیاں آپس میں رگڑی جاتی ہیں تو جل اُٹھتی ہیں اور مشعل کا کام دیتی ہیں۔"

اتنے میں دارا دو مشعلیں لے آیا۔

میں نے ایک مشعل سنبھالتے ہوئے شیلو سے کہا: "دیر مت کرو شیلو۔ جلدی سے مجھے توانائی کا مخرج دکھا دو کیوں کہ ابھی ہمیں کافی کام کرنے ہیں۔"

"وہ تو یہاں سے کافی دُور ہے۔"

"کتنی دُور؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"تقریباً ایک میل... لیکن مشکل یہ ہے کہ راستے میں ہمیں جنگلی چوہوں سے پالا پڑ سکتا ہے۔"

چوہوں کا نام سنتے ہی دارا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور گڑگڑاتے ہوئے بولا: "مجھے یہیں چھوڑ دیں میں ان قاتل چوہوں کا لقمہ نہیں بننا چاہتا۔"

مجھے غصہ آ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جنگلی بھینسے کی سی طاقت رکھنے والا یہ شخص غلام بن کر اتنا بزدل کیوں ہو گیا ہے۔ میں نے اُسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا: "کھڑے ہو جاؤ، بزدل! تمھیں چوہوں سے ڈرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"یہ چوہوں سے ڈرنے میں حق بجانب ہے، سرفروش!" شیلو نے کہا۔ "وہ قاتل چوہے بھیڑ کے برابر اور ببو کے بھیڑیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ بھوک میں وہ ایک دوسرے کو بھی چٹ کر جاتے ہیں۔ ادھر دیکھو۔"

یہ کہہ کر وہ ایک گوشے کی طرف بڑھی اور اس نے اپنی مشعل بلند کی تو میں نے دیکھا کہ ہڈیوں کے ایک پنجر نے ٹکنیشن نما لباس پہن رکھا تھا۔

"یہ ٹکنیشن بھی انھی خفتہ لوگوں میں سے ہے مگر بھوکے چوہے اُسے چٹ کر گئے ہیں۔" شیلو نے وضاحت کی۔

"یہ غریب زندہ موت کی وجہ سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتا تھا لیکن ہم کر سکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "چلو اب دیر مت کرو۔"

شیلو ہمارے آگے آگے چلنے لگی۔

اس راستے پر بھی نقلی سبزہ تھا۔

"ہم اس وقت کتنی گہرائی میں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سطحِ زمین سے تقریباً چھ میل نیچے۔"

"شاید اسی لیے مجھے سخت گرمی محسوس ہو رہی ہے اور پسینے کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔ کیا عرفانیوں نے یہاں ہوا کی آمد و رفت کے لیے متبادل انتظام نہیں کیے تھے؟"

"متبادل انتظام کی بدولت ہی تو ہم یہاں سانس لے رہے ہیں ورنہ ہمارا دم نہ گھٹ جاتا... لیکن تعجب ہے کہ تمھیں گرمی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔"

ہماری رفتار کافی تیز تھی۔

کچھ دیر ہم چپ چاپ چلتے رہے۔

اچانک پیچھے سے بڑی خوف ناک غراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ دارا اُچک کر میرے اور شیلو کے درمیان آ گیا اور لرزتے ہوئے بولا: "چوہے آ رہے ہیں۔"

"بھاگ جائیں گے۔ ڈرو مت۔" میں نے کہا۔

"یہ بھاگنے والے چوہے نہیں ہیں، سرفروش! یہ ہمارا پیچھا کرتے رہیں گے اور موقع ملتے ہی ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔" شیلو نے بتایا۔ "اس لیے جتنا تیز چل سکتے ہو، چلتے رہو۔"

ہم نے رفتار بڑھا دی مگر چوہوں کی آوازیں قریب تر آتی چلی گئیں۔

"اُنھیں روکنے کا کوئی طریقہ؟" میں نے سوال کیا۔

"اگر اُنھیں کچھ کھانے کو مل جائے تو یہ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔" شیلو نے جواب دیا۔

"میں اپنے وجود سے ان کی ضیافت نہیں کر سکتا۔"

"اگر انھی میں سے ایک دو چوہے مار دیے جائیں تو وہ انھیں کھانے میں جُت جائیں گے اور جب تک اُنھیں چٹ نہیں کر لیں گے، آگے نہیں بڑھیں گے۔"

"تو پھر رک جاؤ۔" میں نے کہا اور مشعل بلند کر کے چوہوں کی طرف دیکھنے لگا وہ ہم سے تقریباً بیس فٹ دُور تھے اور واقعی چھوٹی بھیڑوں کے برابر لگتے تھے: "یہ تو پورا گلہ ہے ایک کو ماروں گا تو دوسرے مجھ پر حملہ کر دیں گے۔"

"یہ چوہے اندھے ہیں سرفروش۔ صرف آواز یا بُو پر ہی حملہ کرتے ہیں۔" شیلو نے بتایا اور میں نے آہنی سلاخ سنبھالتے ہوئے

مشعل دارا کو پکڑا دی۔ پھر میں نے ایک جانب ہٹ کر سلاخ فرش پر ماری تو چوہے اُدھر مُڑ گئے۔ میں آہستہ سے کھسک کر دوسری جانب ہو گیا۔

چوہے آگے بڑھے تو میں نے سب سے پیچھے آنے والے چوہے کی گردن میں سلاخ بھونک دی۔ وہ چیخا تو چوہے پلٹ پڑے اس سے پہلے کہ میں ان کے نرغے میں آتا میں لپک کر ہٹ گیا۔

چوہوں نے شاید اپنے زخمی ساتھی کے خون کی بُو سونگھ لی تھی اس لیے وہ اُس پر پل پڑے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔

اب ہم تیز تیز چلنے کی بجائے دوڑنے لگے اور چند منٹوں میں پاور چیمبر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ پلاسٹک کا بنا ہوا ایک کمرہ تھا جس کی چاروں دیواروں پر مختلف اقسام کے پینل اور سوئچ بورڈ لگے ہوئے تھے۔

اس وقت کمرے میں چار ٹکنیشن مختلف حالتوں میں موجود تھے۔ ایک ٹکنیشن سوئچ بورڈ کے پاس کھڑا تھا۔ دوسرا کرسی پر بیٹھا، میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ تیسرا ایک بنچ پر اوندھے مُنہ لیٹا ہوا تھا اور چوتھا ملحق کمرے کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔

شیلو نے سوئچ بورڈز کی طرف اشارا کرتے ہوئے بتایا: "یہ کنٹرول رُوم ہے اور اس سے ملحق کمرہ توانائی کا مخرج ہے۔"

"پہلے ایک بات تو بتاؤ شیلو۔ تمھیں یہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں اور تم یہاں تک کیسے پہنچی تھیں؟ میرا مطلب ہے کہ یہاں سیکورٹی بھی ہو گی پھر تمھیں یہاں آنے اور توانائی روکنے کا موقع کیسے مل گیا؟"

شیلو نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی: "عورت، مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے، سرفروش اور جب کسی چیز پر کسی قسم کی پابندی لگ جائے تو اس کے حصول کا شوق فزوں تر ہو جاتا ہے۔ جس طرح کوئی نادی کسی عرفانی خاتون کو نہیں چھو سکتا اسی طرح کسی عرفانی کا کسی نادی عورت کی طرف متوجہ ہونا بہت بڑا جرم تھا اور یہی پابندی ان ٹکنیشنز کے لیے ایک سُلگتی ہوئی تمنا بن گئی تھی۔ میں نے قمرائیل کی ہدایت پر ان چاروں سے مہربانی کا سلوک کیا اور چونکہ یہ آپس میں بے تکلف دوست تھے اس لیے یہ مجھے ٹکنیشن کی وردی پہنا کر اپنے ساتھ یہاں لے آئے اور پھر ایک روز میں نے اس بنچ پر لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر سوئچ بند کر دیا اور عرفانیوں کی زندگی منجمد ہو کر رہ گئی۔"

"اوہ... کیا تم یہ بھی جانتی ہو کہ توانائی کیسے اور کس چیز سے پیدا کی جاتی ہے؟" میں نے ڈاکٹر فردیس کی دلچسپی کا سوال کیا۔

"ہاں..." شیلو نے جواب دیا۔ "توانائی عام پتھروں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ایک چھوٹا سا پتھر اس شہر کی گیارہ روزہ ضروریاتِ توانائی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ آؤ میں تمھیں وہ کمرہ دکھاؤں جہاں پتھروں کے سفوف سے توانائی حاصل کی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ملحق کمرے میں لے گئی۔

یہ ایک چھوٹا سا مدور کمرہ تھا جس کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا مقناطیس رکھا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف دائرے کی صورت میں پتھروں کے سفوف سے بھرے ہوئے تھیلے لٹک رہے تھے۔ وہاں کوئی تار نہیں تھی۔

میرے لیے یہ بات انتہائی تعجب انگیز تھی کہ عرفانیوں کے اس شہرِ خوابیدہ کو بغیر کسی تار اور سلسلے کے فقط ہوا کی لہروں کے ذریعے توانائی فراہم کی جاتی تھی۔

مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا... کہ توانائی پتھروں کے سفوف سے حاصل کی جاتی ہے اس لیے میں نے ایک تھیلے میں آہنی سلاخ چبھو کر تھوڑا سا سفوف نکالا اور اُسے بغور دیکھا تو وہ سیمنٹ جیسا نظر آیا۔

میں کچھ دیر تک توانائی کے اس مخرج میں کھڑا سوچتا رہا پھر میں نے شیلو سے کہا: "اب میں جو کچھ تم سے کہوں گا تم بلا چون و چرا اُس پر عمل کرو گی۔"

"مگر مجھے کیا کرنا ہو گا؟" وہ تجسس اور حیرت سے بولی۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ توانائی کیسے پیدا کی جاتی ہے اور اُسے بند کیسے کیا جاتا ہے؟"

وہ مجھے پہلے کمرے میں لے آئی اور دو سوئچ دکھاتے ہوئے بولی: "اگر یہ سوئچ دبا دیا جائے تو توانائی کا اخراج شروع ہو جائے گا اور اگر اس سوئچ کو بند کر دیا جائے تو توانائی کی ترسیل رُک جائے گی۔"

میں توانائی کے اخراج والے سوئچ کے قریب جا کھڑا ہوا۔ "میں توانائی پیدا کرنے والا سوئچ دبا کر دس تک گنتی کروں گا جب میں یہ گنتی پوری کر لوں تو تم اخراج بند کرنے والا سوئچ دبا دینا۔" میں نے کہا۔

"مگر کیوں؟" شیلو نے پوچھا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ توانائی کی ترسیل بحال ہونے پر ان لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ مدت مدید تک سوتے رہے ہیں یا اُنھیں معلوم ہی نہیں ہے کہ اتنا عرصہ ان پر کیا گزری ہے؟"

میں نے وضاحت کی۔ "اس لیے تم اس وقت وہی کرو گی جو اس وقت کر رہی تھیں جب تم نے سوئچ بند کیا تھا۔"

"لیکن وہ سب کچھ میں تمھارے سامنے۔۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس لیے کہ شاید پھر تم مجھ سے نفرت کرنے لگو اور۔۔۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "نہیں شیلو میں تم سے نفرت نہیں کروں گا۔"

اتنے میں دروازے پر کھڑا دارا بھاگتا ہوا اندر آ گیا اور بولا۔ "چوہے پھر غرا رہے ہیں۔ مجھے دروازے کے پاس کھڑا ہونے سے ڈر لگتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے اُسے ڈانٹا۔ "اگر تم نے بزدلی دکھائی تو میں خود تمھیں چوہوں کے سامنے پھینک دوں گا۔ یہ لو سلاخ اور دروازے پر نگرانی کرتے رہو۔"

وہ بادلِ ناخواستہ دروازے پر چلا گیا۔

شیلو اُس عرفانی کے قریب جُھک گئی جو بینچ پر اُوندھے منہ پڑا نہ جانے کب سے عارضی موت کا شکار تھا۔ میں توانائی پیدا کرنے والے سوئچ کے پاس چلا گیا۔

"کیا تم تیار ہو شیلو؟" میں نے بُلند آواز میں پُوچھا۔

شیلو نے ہاتھ بڑھا کر توانائی بند کرنے والے سوئچ کو چُھوا اور بولی: "ہاں۔ میرا ہاتھ سوئچ تک پہنچ سکتا ہے۔"

میں نے توانائی پیدا کرنے والا سوئچ دبا دیا اور گنتی کرنے لگا۔ ابھی میں صرف تین تک گن پایا تھا کہ ہر طرف روشنی پھیل گئی اور زندہ موت میں مبتلا ٹیکنیشن جاگ اُٹھے۔ تین تو وہی کام انجام دینے لگے جو وہ اس وقت کر رہے تھے، جب توانائی بند ہوئی تھی مگر چوتھا اُسی طرح میز پر سر ٹکائے سوتا رہا۔ شاید وہ اسی حالتِ خواب میں منجمد ہوا تھا۔

"چار۔۔۔ پانچ۔۔۔" میں گنتی میں مصروف تھا مگر اُن کی توجہ میری بجائے شیلو اور اُس کے ساتھی کی طرف تھی۔ وہ اُن دونوں کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔

میں آٹھ کی گنتی پر پہنچا تو شیلو نے اپنا ہاتھ سوئچ کی طرف بڑھانا شروع کر دیا مگر عین اُسی وقت دیوار کے ساتھ کھڑے ٹیکنیشن کی نگاہ اُس پر پڑ گئی اور وہ چلّایا: "او بدبخت عورت۔ ہاتھ ہٹاؤ اُدھر سے۔۔" مگر شیلو نے ہاتھ نہ ہٹایا اور میرے "دس" کہنے پر سوئچ دبانا ہی چاہتی تھی۔۔۔ کہ اُس کے ساتھی نے اُس کا ہاتھ ہٹا دیا اور تینوں شیلو پر ٹوٹ پڑے۔ یہ دیکھ کر میں اُچھلا اور اُن پر جا گرا۔

اُن کا چوتھا ساتھی بھی جاگ اُٹھا اور اس نے خطرے کا الارم بجا دیا۔ مختلف کمروں سے لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں لیکن اس سے پہلے کہ کوئی اُن کی مدد کو آتا میں اُنھیں ڈھیر کر کے توانائی بند کرنے والا سوئچ دبانے میں کامیاب ہو گیا اور کمرے میں ایک بار پھر اندھیرے بکھر گئے۔

شیلو بُری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"خوش نصیب ہیں ان کی زندگی ایک بار پھر منجمد ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

عین اُسی وقت باہر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے بآوازِ بُلند پُوچھا: "کیا ہُوا دارا؟۔۔۔ کیا چوہے آ گئے؟"

"نہیں چوہے تو روشنی ہوتے ہی بھاگ گئے تھے۔ یہ کوئی نادی معلوم ہوتا ہے۔"

"نادی!" شیلو نے دُہرایا۔ "میرے سوا کوئی نادی نہ تو اس مقام کو جانتا ہے اور نہ ہی یہاں آ سکتا ہے۔"

"ممکن ہے رستم یا اس کا کوئی آدمی ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے، سرفروش۔" وہ اصرار کرنے لگی۔

اتنے میں پھر کسی کے کراہنے اور مدد کے لیے پُکارنے کی آواز آئی تو میں اپنی مشعل اُٹھا کر باہر بھاگا۔ شیلو بھی میرے پیچھے پیچھے لپکی۔

کمرے سے پچیس تیس قدموں کے فاصلے پر کوئی گھسٹتا ہُوا اِدھر آ رہا تھا۔ جب میں نے قریب پہنچ کر مشعل کی روشنی اُس پر ڈالی تو شیلو "رومی۔۔۔ میرا بیٹا" کہتے ہُوئے اُس سے لپٹ گئی۔

رُومی کی ٹانگیں بُری طرح زخمی ہو چکی تھیں۔ ہم اُسے اُٹھا کر کمرے میں لے آئے اور بینچ پر لٹا دیا۔ "یہ تمھیں کیا ہُوا بیٹے۔۔۔؟ کس نے زخمی کیا ہے تمھیں؟" شیلو نے بے چینی سے پُوچھا۔

"چوہوں نے۔۔۔ اگر عین وقت پر توانائی بحال نہ ہو جاتی تو وہ میری بوٹیاں نوچ کھاتے۔"

اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ شیلو لپک کر فرسٹ ایڈ کا بکس اُٹھا لائی اور اس کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ چونکہ وہ پہلے بھی یہاں آتی رہی تھی اس لیے اُسے معلوم تھا کہ وہاں کیا کیا موجود ہے وہ کہیں سے خوراک اور الکحل کے ڈبے بھی اُٹھا لائی۔ جب اُس نے اپنے بیٹے کو الکحل دی تو اُس نے پینے سے انکار کر دیا اور بے ہوش ہو گیا لیکن میں بھانپ گیا کہ وہ بے ہوشی کی اداکاری کر رہا ہے۔۔۔ لیکن کیوں؟

یہ جواب تو وہ خُود ہی دے سکتا تھا۔

"یہ تمھارا بیٹا ہے؟" میں نے شیلو سے پُوچھا۔

"ہاں۔۔۔ بہت سے بیٹوں میں سے ایک۔۔۔ مگر اسے میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ پسند کرتی ہوں۔"

"مگر یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"میں خود اس بات پر متعجب ہُوں۔ یہ ہوش میں آئے تو کچھ پتہ چلے۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے شیلو کی بجائے رومی سے کہا: "مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو، رومی! میں جانتا ہوں کہ تم پورے ہوش و حواس میں ہو۔ آنکھیں کھولو اور بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

۔۔۔اور رومی نے آنکھیں کھول دیں مگر شیلو کی طرف دیکھ کر خاموش ہی رہا۔

"کیا تم پھسلنے والے راستے سے آئے ہو؟" شیلو نے پُوچھا۔

"نہیں۔۔۔" وہ بولا۔ "حالاں کہ میں وہ راستہ بھی جانتا ہُوں۔"

یہ سُن کر شیلو دنگ رہ گئی۔ "یہاں آنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟"

"ہاں۔۔۔ اور تم بھی وہ راستے جانتی ہو۔" رومی نے طنز بھری نگاہوں سے شیلو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے اُسے سمجھانا چاہتا ہو کہ بنو مت۔ ساتھ ہی اُس نے مجھے بھی آنکھ سے اشارہ کیا۔

"تم اس سلسلے میں کیا کچھ اور کتنا کچھ جانتے ہو؟" شیلو نے بیٹے سے نظریں ملائے بغیر پُوچھا۔

"تم جانتی ہو کہ رستم نے مجھے عرفانیوں کی کتابیں پڑھنے کا فرض سونپا ہُوا ہے۔ میں اُن کی کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ شہر خابیدہ کا جائزہ بھی لیتا رہا ہوں۔ میں نے کئی بار تمھارا تعاقب بھی کیا۔ میں یہ بھی جانتا ہُوں کہ تم قمرانیوں کی جاسوس ہی نہیں بلکہ ایک مہرہ بھی ہو۔ میں نے دُوربینوں کے ذریعے چاند کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ وہ کچھ کرنے والے ہیں مگر کیا، یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔" رومی نے داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہُوئے وضاحت کی۔

"تم، میرے بیٹے ہو کر میری جاسوسی کرتے رہے ہو۔۔۔ تم نے اب تک یہ ساری باتیں مجھے کیوں نہیں بتائی تھیں؟" شیلو کو غصّہ آ گیا۔

"اس لیے کہ تم مجھے ایک چوتھائی عرفانی اور کم عقل سمجھتی ہو۔ میں یہ باتیں اب بھی تمھیں نہ بتاتا مگر سرفروش کی وجہ سے بتانا پڑ رہی ہیں۔ شاید یہ میرے علم اور مشاہدے سے کوئی فائدہ اُٹھا سکے۔"

میں رومی کی اس بات سے ٹھٹک گیا۔ کیا وہ کوئی نئی چال چل رہا ہے؟ آخر اُسے میرے کام آنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔۔۔؟ میں نے اُسے آج پہلی بار دیکھا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا۔۔۔ کہ وہ کون ہے۔

"تم میرے کام کیوں آنا چاہتے ہو؟" میں نے پُوچھا۔

"میں تمھاری بہادری اور دانائی سے مرعوب ہُوں، سرفروش۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تمھیں دیوتا سمجھتا ہُوں۔ بس اسی لیے تمھارے کام آنا چاہتا ہُوں۔"

"تم جھوٹے ہو۔" شیلو بول اُٹھی۔ "دراصل تم بھی اقتدار کے بھوکے ہو، تم بھی سرفروش کی مدد سے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

"چلو یوں ہی سہی۔ اگر تم اور رستم اپنی خواہشوں کی خاطر سرفروش سے مدد لینا چاہتے ہو تو میں کیوں نہ لُوں۔ بہرصورت یہ فیصلہ سرفروش کو کرنا پڑے گا کہ کون کتنا مخلص اور کتنا لالچی ہے۔"

میں نے ماں بیٹے کی بحث میں دخل دیتے ہُوئے رومی سے پوچھا: "اگر تم ڈھلانی راستے سے نہیں آئے تو پھر کہاں سے آئے ہو؟"

"پہاڑی کانوں والی فائل کا مطالعہ کرتے ہُوئے مجھے ایک نقشہ ملا تھا۔ اس میں، ایک راستہ پاتال نامی جہنم کے قریب سے گزرتے ہُوئے دکھایا گیا ہے۔ میں اُسی نقشے کی مدد سے یہاں آیا تھا اور پاتال میں بھی گیا تھا۔"

یہ سُن کر دارا بڑبڑا اُٹھا: "اوہ۔ پاتال کا ذکر نہ کرو رومی! اُس کے ذکر سے میرے زخم خون اُگلنے لگتے ہیں۔"

"اپنی زبان بند رکھو۔" میں نے اُسے ڈانٹا اور رومی سے پوچھا: "وہاں تم نے کیا دیکھا؟"

"وہاں ہڈیوں کے پنجروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہیں سے ایک راستہ اِدھر آتا ہے۔ پہلے تو کبھی مجھے چوہے نہیں ملے تھے مگر آج اُنھوں نے مجھے گھیر لیا تھا اگر روشنی نہ پھیلتی تو وہ مجھے ہڑپ کر گئے ہوتے۔"

"کیا وہ نقشہ تمھیں زبانی یاد ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ بڑا ہی پُرپیچ راستہ ہے اس لیے میں جب بھی یہاں آیا، نقشے کی مدد سے آیا۔" رومی نے جواب دیا۔

"مگر تم یہاں کیوں آتے رہے؟" شیلو نے سوال کیا۔

"اپنا علم بڑھانے کے لیے۔۔۔ یہ سیکھنے اور جاننے کے لیے کہ توانائی کیسے حاصل کی جاتی ہے، اس کی ترسیل اور فراہمی کا طریقہ کیا ہے۔"

"کیا وہ نقشہ تمھارے پاس موجود ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے پلاسٹک کا نقشہ نکال کر مجھے دے دیا۔ "اس میں راستے پر نشانات لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے نقشہ کھولے بغیر شیلو سے پوچھا: "ڈھلانی راستے سے اوپر تو نہیں پہنچا جا سکتا۔ ہم اوپر کیسے جا سکتے ہیں؟"

"اوپر جانے کے دو ہی طریقے ہیں۔ اگر توانائی ہو تو لفٹ کے ذریعے ورنہ ہنگامی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ سیڑھیاں بلدیہ کی عمارت تک لے جاتی ہیں۔"

"لیکن اب تک رستم کے آدمی اس عمارت پر قابض ہو چکے ہوں گے۔" میں نے اُسے جواب دیا اور رومی سے پوچھا۔ "کیا تمھیں رستم کی کارروائیوں کا علم ہے کہ وہ کیا اقدامات کر رہا ہے؟"

"ہاں۔ وہ عورتوں اور بچوں کو گہرے غاروں میں بھیج رہا ہے اور خود اپنے جنگجو سپاہیوں کے ساتھ شہر پر قبضہ کر رہا ہے۔ اس نے قرانیوں کا خوف بھی اپنے دل سے نکال پھینکا ہے۔ میں کچھ اور بھی تمھیں بتانا چاہتا ہوں مگر بالکل تنہائی میں بتاؤں گا۔"

"تم دارا کے پاس چلی جاؤ شیلو۔" میں نے حکم دیا۔

وہ اکڑ گئی اور بولی۔ "نہیں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ میرا بیٹا تم سے مل کر میرے خلاف سازش کرنا چاہتا ہے، تم رومی کی شہ پر میرے ساتھ غداری کرو گے۔"

"بکو مت۔" میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ "اگر ہمارے درمیان کسی نے غداری کی تو وہ تم ہی کرو گی۔ چلو اب جاؤ۔"

یہ سن کر وہ خونخوار نظروں سے ہمیں دیکھتی ہوئی دارا کے پاس چلی گئی اور رومی مجھے سرگوشی میں بتانے لگا۔ "رستم کو معلوم ہو چکا ہے کہ آشی کو تم نے نہیں بلکہ دارا نے قتل کیا ہے ایک محافظ اور دروازے پر کھڑی عورتوں نے اُسے بتایا تھا کہ جب تم باہر چہل قدمی کر رہے تھے تو انھوں نے اندر سے آشی کی چیخیں سُنی تھیں۔ اس لیے اگر تم دارا کو اس کے حوالے کر دو تو وہ تم سے صلح کر لے گا۔"

"مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"رستم تم سے صرف دارا کا ہی نہیں بلکہ شیلو کا بھی طلب گار ہے۔" اس نے مزید انکشاف کیا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو، تم تو شیلو کے بیٹے ہو؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ بولا۔ "اُس نے کب مجھے اپنا پیار اور اپنی ممتا دی ہے... اور پھر یہ میری نہیں رستم کی خواہش ہے... وہ تو تمھیں بھی نہ بخشتا مگر تمھاری کارگزاری نے اُسے رعایت برتنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"کون سی کارگزاری؟" میں نے پوچھا۔

وہ مسکرانے لگا تو میں سمجھ گیا۔

رومی کے اس انکشاف نے میری ہمت بندھا دی۔ اب میں رستم سے سودے بازی کر سکتا تھا لیکن یہ اُسی صورت میں ممکن تھا، جب میری اس کی ملاقات ہوتی... اور اس ملاقات میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔ چنانچہ میں نے شیلو اور دارا کو بلوایا اور رومی سمیت انھیں ہدایات دے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اگرچہ روانگی سے پہلے میں نے ڈبوں والے شیریں مشروب سے پیاس بجھالی تھی مگر پاتال کی چڑھائی چڑھتے ہوئے میں پھر بے پناہ گرمی محسوس کرنے اور ہانپنے لگا تھا۔ میرے پاس دو مشعلیں تھیں تاکہ نقشے کا بآسانی مطالعہ کر سکوں۔ چوہے بھی شروع سے ہی میرے پیچھے لگے ہوئے تھے اور راستے میں جگہ جگہ ان مُردہ چوہوں کی ہڈیاں بھی بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں جنھیں خود ان کے بھائی بند چٹ کر چکے تھے۔

پاتال کا چڑھائی والا زینہ اچانک ہی ایک آہنی گیٹ پر ختم ہو گیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اُسے کھولا اور کمرے میں داخل ہوا جہاں کچھ انسانی پنجر میرے استقبال کو موجود تھے۔ کچھ پنجر خاکستر ہو چکے تھے اور کچھ ابھی صحیح حالت میں تھے۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ مجھے وہ نلکیاں بھی نظر آ گئیں جن سے پاتال کے قیدیوں کو کھانا پانی فراہم کیا جاتا تھا۔

مجھے اس کال کوٹھری کا نظارا کر کے رستم کی حیرت انگیز قوت ارادی پر رشک آنے لگا جو نہ صرف یہاں کافی عرصے تک زندہ رہا تھا بلکہ یہاں سے نکلنے کے بعد بھی اُس کا دماغی توازن خراب نہیں ہو سکا تھا اور اس کی عقل و دانش بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔

میں سستانے کے لیے وہیں ایک پنجر کے قریب بیٹھ گیا اور مشعل کی روشنی میں نقشے کا جائزہ لینے لگا۔ رومی نے کوئلے سے نقشے پر راستے کی نشاندہی کر رکھی تھی۔ یہ راستہ ان غاروں تک جاتا تھا جن میں نادی لوگ آباد نہیں تھے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد میں نقشے کے مطابق آگے بڑھنے لگا۔ یہ راستہ اُن سُرنگوں پر مشتمل تھا جنھیں عرصۂ دراز سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ ایک سُرنگ ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ راستے میں جگہ جگہ مجھے ان سُرنگوں میں آہنی سیڑھیاں بھی چڑھنا پڑیں جنھوں نے مجھے بُری طرح تھکا دیا لیکن میں وہاں رُک نہیں سکتا تھا۔

ایک بار میرے جی میں آئی کہ میں کوئی مختصر راستہ تلاش کرنے کی کوشش کروں مگر پھر میں نے یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اگر میں بھٹک گیا تو ان سرنگوں کے جال سے کبھی نہیں نکل سکوں گا۔ تاوقتیکہ کمپیوٹر مجھے نہ بُلالے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ اب ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے واپس بُلانے میں کبھی کامیاب بھی ہو سکے گا کیونکہ گرانچو نے مجھے نہ جانے کس جگہ پھینک دیا تھا۔ ممکن ہے یہاں تک ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر رسائی ہی حاصل نہ کر سکے۔

میں نے کوئی خطرہ مول لینے کی بجائے اُسی نشان زدہ راستے پر سفر جاری رکھا اور بالآخر ایک غیر آباد سُرنگ میں پہنچ گیا۔

ابھی میں سُرنگ سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ مجھے بہت سی عورتوں کے قہقہے لگانے اور گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے جلدی سے مشعلیں بُجھا دیں اور بے آواز قدموں سے دوڑتا ہوا دوسری سُرنگ میں آ گیا۔

عورتوں کے گانے اور قہقہوں کی آواز قریب تر آ گئی تو میں فرش پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے سامنے سے عورتوں کا ایک جلوس سا گزرنے لگا جس کے ساتھ بہت سے محافظ بھی مشعلیں اور سلاخیں اُٹھائے چل رہے تھے۔ عورتیں بے حد خوش نظر آتی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کرتی جا رہی تھیں جب یہ جلوس گزر گیا تو مجھے ان کے پیچھے کافی فاصلے پر ایک مشعل کی جھلملاتی روشنی دکھائی دینے لگی۔

یہ مشعل کسی محافظ نے اُٹھا رکھی تھی جو تھکے تھکے قدموں سے تنہا چلا آ رہا تھا۔ میں سانپ کی طرح رینگتا ہوا سُرنگ کے دہانے پر آ گیا اور جونہی وہ محافظ دہانے کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھا، میں نے جست لگائی اور پیچھے سے اُسے دبوچتے ہوئے اس کا منہ بند کر دیا۔

"اگر تم نے شور مچایا تو میں یہ سلاخ تمھارے نرخرے میں گھونپ دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اُس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ چُپ چاپ میری طرف دیکھنے لگا۔

"جانتے ہو، میں کون ہوں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں۔ تم سرفروش ہو۔" اس نے [illegible] میں کہا۔

"تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے یا مرنا [illegible]؟"

"جب تک موت ٹل سکے، بہتر ہی ہوتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"موت ٹل سکتی ہے بشرطیکہ تم میرے سوالوں کے صحیح صحیح جواب دو۔"

"اب [illegible] پوچھنا چاہتے ہو؟"

"یہ عورتیں کون تھیں اور انھیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

اس پر وہ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا۔ "تم نے انھیں نہیں پہچانا سرفروش؟"

"مجھے اپنے سوال کا جواب اب تک نہیں ملا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"یہ خواتین کچھ عرصے بعد مائیں بننے والی ہیں اور انھیں رستم کے ایما پر سُرنگوں میں لے جایا جا رہا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تاکہ یہ محفوظ رہیں۔"

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"قرانیوں سے۔"

"قرانیوں سے انھیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"رستم نے شہرِ خوابیدہ پر حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے جنگجو خفتہ عرفانیوں کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں جو فاتح اپنے مغلوبوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ رستم کو خدشہ ہے کہ کہیں قرانی اُس کا یہ اقدام پسند نہ کرتے ہوئے حملہ آور نہ ہو جائیں اور پھر خوشبودار بم نہ پھینک دیں۔ اس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر اُس نے ماں بننے والی خواتین کو سُرنگوں میں منتقل کروا دیا ہے تاکہ نادیوں کی نسل معدوم نہ ہونے پائے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ رستم کا یہ خدشہ بے بنیاد نکلے اور قرانی کوئی اقدام نہ کریں۔" محافظ نے وضاحت کی۔

"رستم اس وقت کہاں ہے؟"

"اوپر شہرِ خوابیدہ میں۔" پھر اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اس نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔"

"کیا زیادتی کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے عورتوں کی حفاظت کے لیے یہاں چھوڑ دیا گیا ہے جبکہ میرے بیشتر ساتھی اُوپر لُوٹ مار کر رہے ہیں۔ میں اپنے ساتھیوں سے کم بہادر نہیں ہوں سرفروش کیا یہ میرے ساتھ زیادتی نہیں ہے؟"

"کیا رُستم نے عرفانی خواتین کی بے حُرمتی کی بھی اجازت دی ہے؟"

"اگر اس نے اجازت نہ دی ہو تو بھی وہ ہر جگہ تو موجود نہیں ہو سکتا۔ زندہ موت کی نیند میں مبتلا خواتین چیخ و پکار یا اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتیں۔"

میں نے سوچا کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ زندہ موت کی نیند میں مبتلا عورتیں نہ اپنا دفاع کر سکتی ہیں اور نہ ہی ان کے احتجاج کی آواز رستم کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے اور یہ وحشی ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک سے باز نہیں آئیں گے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے لاشعوری طور پر سلاخ محافظ کو چبھو دی۔

"کیا تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟" وہ چونک کر بولا۔

"شاید... یا شاید نہیں۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نورے کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "اگر تم اُسے چاہتے ہو تو مجھے تمھارے ساتھ اظہارِ افسوس کرنا چاہیے۔"

"کیوں؟" میں چونک پڑا۔

"اگر میں تمھیں سچ سچ بتا دوں تو کیا تم میری جان بخشی کر دو گے؟"

میں نے اُسے طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے سودے بازی کر رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ، وہ کہاں ہے ورنہ میں تمھارا سر توڑ دوں گا۔"

"وہ شہر میں ہے۔" وہ کانپ کر بولا۔ "تفریح گاہ کے اندر اُسے جنگلی چوہوں کے بڑے بل پر لٹکا دیا گیا ہے۔ میں بھی اس کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا مگر نہیں دیکھ سکوں گا۔ سُنا ہے کہ عرفانی اُس بڑے بل یا گڑھے میں ایک سو چوہے رکھا کرتے تھے وہ اُنھیں بھُوکا رکھتے اور پھر جب وہ بھُوک کا شکار ہو کر ایک دوسرے کو کھانے لگتے تو عرفانی اُن کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔"

"کیا رستم یہ سمجھتا ہے کہ میں اُسے بچانے آؤں گا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، میں تو ایک معمولی سا محافظ ہوں۔"

"شہر جا کر لُوٹ مار میں حصّہ لینے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"یہ تو میری دلی تمنا ہے، سرفروش... مگر میرے دستے کے سردار نے مجھے یہاں رہنے کا حکم دیا تھا۔ اگر وہ مجھے وہاں دیکھ لے گا تو جان سے مار ڈالے گا۔"

"یہ تمھارے اپنے اوپر ہے۔ اگر تم میرے ساتھ اور شہرِ خوابیدہ میں نہیں جانا چاہتے تو میں تمھیں یہیں ختم کیے دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے پھر سلاخ چبھوئی۔

"نہیں نہیں۔ میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"فیروز..." اس نے جلدی سے کہا۔

"اب غور سے سُنو فیروز! تم مجھے مختصر ترین راستے سے شہر لے چلو گے مگر کسی ایسے غار سے نہیں گزرو گے جہاں محافظ موجود ہوں۔ تم مجھ سے دو قدم آگے آگے رہو گے کہ اس سے زیادہ اور نہ ہی اس سے کم... اگر تم نے گھومنے، بھاگنے یا مشعل پھینکنے اور شور مچانے کی کوشش کی تو میں پیچھے سے یہ سلاخ تمھارے جسم میں گھونپ دوں گا۔"

"اگر میں یہ سب کچھ فرماں برداری سے کروں تو؟" اس نے پوچھا۔

"تو پھر شہر جا کر میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔ اس کے بعد تم جو چاہے کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ اوّل تو میرے دستے کا سالار مجھے نہیں دیکھ پائے گا اور اگر اس نے دیکھ بھی لیا تو دیکھا جائے گا۔"

"تو پھر آگے چلو۔" میں نے اسے حکم دیا۔ "مگر یاد رکھو مجھ سے غداری تمھاری موت بن جائے گی۔"

"میں غداری نہیں کروں گا، سرفروش۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں مرنا نہیں چاہتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ رستم اور میرے سالار نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اُنھوں نے مجھے لُوٹ کے مال اور عرفانی خواتین سے محروم کیا ہے۔"

"کیا تم مختصر ترین راستے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میں اُسی راستے سے جا رہا ہوں۔ میری ساری زندگی انھی غاروں میں گزری ہے۔ سنبھل کے آنا، آگے موڑ ہے۔"

ہم مختلف غاروں سے آگے اور اوپر کی جانب بڑھتے رہے۔ فیروز مجھے ایک عمارت کے تہ خانے میں لے آیا۔ جہاں کچھ کارکن گہری نیند سو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ رستم کے خونخوار محافظ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

ہم تہ خانے سے نچلی منزل تک پہنچ گئے۔ میں نے فیروز کو پریٹ جانے کا حکم دیا اور خود چھُپ کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔

آج اس شہرِ خموشاں میں مختلف اطراف سے شور سنائی دے رہا تھا رستم کے جنگجو غُل مچا رہے تھے اور فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ ڈیوڑھی میں بہت سے عرفانی ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ اُنھیں رُستم کے سپاہیوں نے حقیقی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مرنے والوں کے جسموں سے بہت کم خون بہا ہُوا تھا کچھ لاشوں کے کانوں سے توانائی والے ٹاپس نوچ لیے گئے تھے۔ لاشوں کے اس انبار میں کسی عورت کی لاش شامل نہیں تھی۔

جب میں نے فیروز کو بتایا کہ میں نے کیا دیکھا ہے تو وہ بولا:

"اس کے علاوہ تم دیکھ بھی کیا سکتے ہو، سرفروش!... اب ہم نادیوں کا راج آیا ہے اور ہاں، میں نے اپنا فرض دیانت داری سے انجام دیا ہے۔ تم نے مجھے شہر پہنچ کر آزاد کر دینے کا وعدہ کیا تھا کیا اب میں آزاد ہوں یا تم بھی مجھے عرفانی خواتین سے محروم رکھنا چاہتے ہو؟"

"کچھ دیر صبر کرو۔ پھر میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگے۔ اتنے میں باہر رستم کے سپاہیوں کے بھاگنے اور نعرے لگانے کی آواز آئی تو فیروز بھول گیا اور بولا "یہ سب عیش کر رہے ہیں سرفروش!"

"میں نے کہا تھا۔ تھوڑی دیر صبر کرو۔" میں اُسے ٹھوکے دیتا ہوا چھٹی منزل پر لے آیا۔ یہاں میں نے رومی کا دیا ہُوا نقشہ نکالا اور کھڑکی میں کھڑا کر کے شہر کے بارے میں تفصیل پوچھنے لگا تاکہ نقشے سے مطابقت کے بعد مجھے کسی رہنما کی ضرورت نہ پڑے۔

فیروز جلدی جلدی میرے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ اس نے بلدیہ کی عمارت کی طرف اشارہ کیا جو دور ایک سرے پر دکھائی دے رہی تھی۔

"رستم اس عمارت کو اپنا صدر مقام بنائے گا۔ وہ بہت چالاک ہے۔ سب سے پہلے شہر کے صاحبانِ اقتدار کے کانوں سے توانائی کے ٹاپس اتارے گا تاکہ اگر فرانی توانائی کی ترسیل بحال کر دیں تو بھی وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔"

فیروز ٹھیک کہہ رہا تھا۔ رستم کو یہی کرنا بھی چاہیے تھا۔ دیکھا جائے تو اب تک یقیناً یہ کام کر چکا ہوگا اور اس وقت بھی وہیں موجود ہوگا۔ مگر میرا بھی وہاں جانا ضروری تھا کیونکہ توانائی کے مخزن تک پہنچانے والا راستہ اس عمارت میں واقع تھا، جس کے ذریعے مجھے شیلو سے رابطہ قائم کرنا تھا۔

"تفریح گاہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سامنے، بائیں جانب جو چوکور عمارت نظر آ رہی ہے، وہی تفریح گاہ ہے لیکن اگر تم نورسے کو بچانا چاہتے ہو تو میری بات سن لو۔ چونکہ تم نے اپنا وعدہ وفا کیا ہے اور مجھے قتل نہیں کیا اس لیے میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ تمھارا وہاں جانا بے حد خطرناک ہوگا کیونکہ وہاں محافظ بھی بڑی تعداد میں موجود ہوں گے۔"

"میں نے ایک بار پھر دور سے تفریح گاہ کا جائزہ لیا اور پوچھا۔" اس عمارت میں چوہوں کا گڑھا کس حصّے میں ہے؟"

"میں وہاں کبھی نہیں گیا اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس حصّے میں ہے دوسرے مجھے وہ خونخوار چوہے دیکھنے کا کوئی شوق بھی نہیں۔ دیکھو سرفروش! جو کچھ میں جانتا تھا تمھیں بتا چکا ہوں۔ کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

"جانے سے پہلے میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میرے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہنا۔ اگر تم نے کسی کو بتایا اور میں پکڑا گیا تو میں بھی رستم کو بتا دوں گا کہ تم نے کس طرح اس کی حکم عدولی کی ہے۔"

"نہیں نہیں سرفروش۔ میں نے تو تمھیں دیکھا تک نہیں، پھر میں کسی کو کیسے بتا سکتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے گڑگڑا رہا ہو۔

"بس تو پھر تم جا سکتے ہو۔" میں نے کہا تو وہ نیچے جانے کی بجائے باورچی خانے میں گھس گیا اور وہاں سے الکحل کے ڈبے نکال لایا جن میں سے دو اس نے میرے سامنے غٹاغٹ چڑھا لیے۔ پھر جھُومتے ہوئے بولا "واہ مزا آ گیا۔ میں نے زندگی میں دوسری بار یہ مشروب پیا ہے ایک بار مجھے شیلو نے اپنے کمرے میں پلایا تھا۔ دوسری مرتبہ آج پی رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں عرفانی لوگوں کا طرزِ حیات پسند کروں گا۔"

"اب احتیاط سے جانا ورنہ سیڑھیوں میں ڈھیر ہو جاؤ گے۔" میں نے اسے تنبیہ کی۔ "اور میری بات یاد رکھنا۔"

"ہاں ہاں ورنہ میں خود مارا جاؤں گا۔" وہ بولا اور لڑکھڑاتا ہُوا سیڑھیاں اُتر گیا۔

میں نے کھڑکی کے نیچے دیکھا تو بلدیہ کی جانب مجھے کچھ نادی سپاہی لڑکھڑاتے اور شور مچاتے نظر آئے۔ اُن کا انداز بدمست فاتحین جیسا تھا۔ پھر اچانک میری نگاہ چاندنما سرزمین پر جا پڑی اور میں یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ وہاں کافی گہما گہمی ہے وہاں سے بڑے بڑے سرچ لائٹیس سے روشنی کے دھارے شہرِ خوابیدہ پر ڈالے جا رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے وہاں چند طیارہ نما چیزیں بھی ایک جگہ معروفِ پرواز نظر آ گئیں۔

جانے وہ لوگ کیا سوچ رہے تھے اور کیا کرنے والے تھے بہرصورت، مجھے اتنا معلوم تھا کہ وہ لوگ میری ذات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے سائنس داں میرا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے مجھے اُن سے اب کسی نقصان کی توقع نہیں تھی البتہ میں اُن تک یا وہ مجھ تک کیسے پہنچ سکتے تھے، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔

میرے ذہن میں فرانیوں، عرفانیوں اور نادیوں کے لیے ایک منصوبہ تھا لیکن اُسے بھی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوئی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ سب سے پہلے تو موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کا سوال تھا۔ اچانک میری نگاہ پھر تفریح گاہ والی عمارت پر جا پڑی اور مجھے نورسے کا خیال آ گیا۔

میں نورسے کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس سے محبت نہیں تھی مگر انسانی ہمدردی کی جبلت بار بار میرے ذہن کا دھارا اُس کی طرف موڑ دیتی تھی۔ میں بلدیہ کی طرف جا کر رستم سے صلح صفائی کی بات چیت کرنا چاہتا تھا مگر نورسے کا خیال بار بار میرا راستہ روک دیتا تھا...



میں اس عمارت کے مختلف حصوں کی تلاشی لینے لگا۔

ایک اپارٹمنٹ میں مجھے ایک عرفانی کی لاش دکھائی دی جس کے قریب کسی نادی کا لباس پڑا ہوا تھا۔ وہ نادی اس لاش کا لباس اتار لے جا چکا تھا۔ نادی کی اُترن دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ موجودہ حلیے میں باہر نکلنا خطرناک ہے اس لیے مجھے بھی کسی نادی کا حلیہ اپنا لینا چاہیے چنانچہ میں نے اپنا لباس اُتار کر اس نادی کا لباس پہن لیا اب چہرے کو نادیوں جیسا بنانے کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا سو اس اپارٹمنٹ میں مجھے قینچی مل گئی میں نے جلدی جلدی اپنے سر کے بال کاٹ دیے۔ ہر چند کہ یہ ایک تکلیف دہ کام تھا مگر بال کاٹنے ضروری تھے کیونکہ نادی سر پہ بال نہیں رکھتے تھے لیکن ایسا کرنے کے باوجود ایک مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔۔۔ اور وہ تھا چہرے کی رنگت کا۔۔۔ اپنے چہرے کو سیاہی مائل بنانے کے لیے مجھے کسی رنگ کی تلاش تھی۔ اس تلاش میں مجھے ایک کمرہ مقفّل نظر آیا۔ یہ کمرہ اندر سے بند تھا۔ میں نے کندھے کی دو تین ضربوں سے کواڑ توڑ دیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ کمرہ غالباً ڈسپنسری تھی کیونکہ مریضوں والی میز پر ایک عورت لیٹی ہوئی تھی اور اس کے بازوؤں سے دو نلکیاں لگی ہوئی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے توانائی ختم ہوتے وقت وہ اپنا خون تبدیل کروا رہی تھی۔ یہ بات تو مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو چکی تھی کہ عرفانی اپنا حسن اور جوانی قائم رکھنے کے لیے ہر ماہ اپنا خون بدل لیا کرتے تھے۔ اس وقت میرے سامنے وہ بڑی شیشی بھی موجود تھی، جس میں خون دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے عورت کے بازو سے نلکی نکالی تو اس میں سے خون رسنے لگا۔ میں نے تھوڑا سا خون چُلّو میں لے کر اپنے چہرے اور سر کے بالوں کی رنگت تبدیل کر لی۔ حُلیہ بدلنے کے لیے اس وقت اور کوئی رنگ دستیاب نہیں تھا۔ دوسرے میرا خون آلود چہرہ اور سر دیکھ کر نادی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ یہ سب خون ریزی اور غارت گری کا نتیجہ ہے اس حُلیے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے میں نے کچھ خون اپنے سینے پر بھی مَل لیا اور سلاخ پر بھی۔۔۔ اور پھر اس عمارت سے نکل گیا۔

سڑک پر چلتے ہوئے مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ میں نے حُلیہ تو بدل لیا ہے لیکن قد کا خیال نہیں رکھا چنانچہ میں اپنی ٹانگوں کو کُبڑوں کی طرح خم دے کر چلنے لگا تاکہ کم از کم دُور سے دیکھنے والے تو مجھے نادی ہی سمجھیں۔

اب میں تفریح گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

راستے میں مجھے ایک پارک ملا جس میں بہت سے عرفانی درختوں کی اوٹ میں زندہ موت کی نیند سو رہے تھے۔ شاید نادیوں کی نظر ان پر نہیں پڑی تھی ایسا لگتا تھا جیسے نادیوں نے ساری توجہ عمارتوں کی طرف ہی مرکوز رکھی ہے ورنہ پارک میں تقریباً پانچ سو عرفانی صحیح سلامت نہ پڑے ہوتے۔ شاید کثرتِ تعداد ہی کے باعث عرفانی، نادیوں پر غالب آئے ہوں گے ورنہ رستم کے وحشیوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔

میں نے سوچا کہ کیا عرفانی اور نادی امن داماں کے ساتھ نہیں رہ سکتے؟ لیکن امن داماں تو دونوں کے درمیاں اُس وقت قائم رہ سکتا تھا جب دونوں کے مابین مساوات اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام ہوتا۔ جب کہ عرفانی نادیوں کو کم تر اور اچھوت سمجھتے تھے اور ان سے گھٹیا سلوک کرتے تھے۔

میں سرچ لائٹس سے بچتا بچاتا اور سائے سائے چلتا ہُوا نصف راستہ طے کر گیا۔ راستے میں کئی مقامات پر مجھے خفتہ عرفانیوں کی لاشیں دکھائی دیں اور ان میں کچھ عورتیں بھی نظر آئیں۔ جن کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک کیا گیا تھا۔ اس بربریت پر میرا خون کھول اُٹھا لیکن میں تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رُستم کے بدمست سپاہی مختلف عمارتوں میں گھُسے، چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے اور کہیں کہیں تو وہ خود ایک دوسرے سے بھی لڑ مر رہے تھے۔ یہ اُن کی فتح کا نہیں بلکہ الکحل کے ڈبّوں کا نشہ تھا۔ جس نے اُنھیں بے قابو اور اندھا کر دیا تھا۔ میں نے ایک مُردہ نادی کے گلے سے زنجیر نکال کر خود پہن لی۔

جب میں تفریح گاہ کے قریب پہنچا تو میں نے ایک نادی محافظ کو دیکھا وہ ایک عرفانی عورت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ اس مکروہ نظارے سے میری قوت برداشت جواب دے گئی۔

میں نے اُسے للکارتے ہوئے کہا! "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور تمھارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟" اس نے عورت کے بال نہیں چھوڑے اور سلاخ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"میں عقرب ہوں" میں نے زنجیر سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "ذرا میرے عُہدے کی زنجیر دیکھو۔ میں رستم کے حکم سے گشت پر نکلا ہوں تاکہ احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں سے باز پُرس کر سکوں۔ نام کیا ہے تمھارا؟"

"میرا نام عاتک ہے اور مجھے دُوسہ کے غاروں سے بُلایا گیا ہے میرے ساتھی بلدیہ کی عمارت میں گئے ہیں" اُس نے مرعوب ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"تم اُن کے ساتھ کیوں نہیں گئے اور اس عورت کو کیوں گھسیٹے پھرتے ہو؟"

اُس نے عورت کے بال چھوڑ دیے اور دانت نکالتے ہوئے بولا: "بات دراصل یہ ہے جناب کہ یہ لڑکی مجھے پسند آگئی ہے۔"

"بکواس مت کرو اور اپنے ساتھیوں کے پاس جاؤ آیندہ فرض سے غفلت برتی تو میں رستم کو بتا دوں گا۔"

عاتک نے کوئی جواب نہ دیا اور بلدیہ کی طرف چل پڑا مگر چند قدم آگے جا کر اپنے کسی ساتھی کو پکارنے لگا "گونا۔۔۔ او گونا، جلدی آؤ ایک افسر آیا ہے۔"

چند لمحوں کے بعد، جسے گونا کے نام سے پکارا گیا تھا وہ عمارت سے نکلا تو پسینے میں شرابور اور تھکا تھکا سا تھا۔ اس نے ایک نظر مجھے اور میرے گلے میں پڑی زنجیر کو دیکھا اور بولا "کیا حکم ہے جناب؟"

"بلدیہ کی عمارت میں جاؤ جہاں تمھارے ساتھی پہنچ چکے ہیں" میں تحکمانہ لہجے میں بولا تو وہ بلا چون و چرا چل دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں مجھے کوئی اجنبی نہیں بلکہ ایک نادی ہی سمجھے تھے اس بات سے مجھے یک گونہ اطمینان سا محسوس ہُوا اور میں بے دھڑک تفریح گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔

ابھی میں تفریح گاہ سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا کہ ناگاہ مجھ پر سر درد کا شدید دورہ پڑا۔۔۔ اور کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ اسی قسم کا درد مجھے اُس وقت ہُوا کرتا تھا جب کمپیوٹر مجھے واپسی کے لیے

تلاش کرتا تھا گویا کمپیوٹر نے میری تلاش شروع کر دی تھی اور مجھے کبھی بھی لمحے اپنے دور اور اپنی دنیا میں واپس بلایا جا سکتا تھا مارے خوشی کے میرا رُواں رُواں رقص کر اُٹھا۔

ابھی یہاں بہت سے کام ادھورے تھے۔ مجھے عام پتھروں سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کرنا تھا، چاند نما سرزمین کا اسرار حل کرنا تھا، عرفانیوں اور نادیوں کے مابین صلح کی کوئی سبیل نکالنی تھی اور ان سب سے پہلے نورے کو جنگلی چوہوں کا تر نوالہ بننے سے بچانا تھا جو محض میری محبت کے جرم میں اس بھیانک سزا کی مستوجب ٹھہرائی گئی تھی۔ سر درد کی شدید ٹیسوں کے دوران میرا جی چاہا کہ میں نورے کی جگہ ڈاکٹر فریدوں کو چوہوں کے بل پر لٹکا دوں جو ہر بار مجھے نئی مصیبتوں اور نئے جھمیلوں میں اُلجھا دیتا ہے اور اب تو اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں ماضی کے سفر پر گیا ہوں یا کمپیوٹر نے مجھے مستقبل میں منتقل کر دیا ہے؟ یہ شہرِ خوابیدہ اور قمرائیوں کی چاند نما سرزمین ماضی کی نہیں بلکہ مستقبل کی نشاندہی کرتی تھی۔

جب تکلیف کا دورہ ختم ہوا تو میں بھاگ کر تفریح گاہ میں داخل ہو گیا تفریح گاہ کی ڈیوڑھی میں چھ سپاہی اور اُن کا سالار موجود تھے مگر اُن کے اندازِ نشست سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوٹ مار اور عرفانی خواتین سے محروم رہ جانے پر ناخوش ہیں۔ چار سپاہی فرش پر بیٹھے کوئی کھیل کھیل رہے تھے اور باقی تین جمائیاں لے رہے تھے۔ اُنھوں نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی مگر جب میں ایک راہداری میں مُڑنے لگا تو اُن کا سالار بولا: ”اے... کون ہو تم؟“

میں رُک گیا اور کچھ بولنے کی بجائے اپنی گلے کی زنجیر سے کھیلنے لگا میرے اس عمل سے نہ جانے وہ کیا سمجھا کہ کہنے لگا: ”اوہ۔ شاید ہماری جگہ تمھارا دستہ آیا ہے۔ مگر تمھارے سپاہی کہاں ہیں؟“

”وہ کچھ پیچھے رہ گئے ہیں۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا اور پوچھا: ”وہ لڑکی نورے کیسی ہے؟“

”وہ اگرچہ جوان اور خوب صورت ہے مگر عرفانی خواتین جیسی نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ میں نے کہا: ”اب وہ کس حال میں ہے؟“

”اب اُس نے چیخنا چلّانا بند کر دیا ہے۔ رستم کا کوئی نیا حکم ہے کیا؟“

”نیا حکم یہ ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی اب لوٹ مار کر سکتے ہیں یہاں میں نگہبانی کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم اکیلے یہاں نگرانی کرو گے؟“ اس نے تعجب سے پوچھا

”کیسی احمقانہ بات کرتے ہو تم۔ میں نے بتایا ہے کہ میرے آدمی آ رہے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ عرفانی خواتین حُسن میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔“

ایک سپاہی بولا: ”اب ہم یہاں کیا کر رہے ہیں... ہمیں چلنا چاہیے۔“

سردار نے تائید میں گردن ہلا دی۔ سپاہیوں کے لٹکے ہوئے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے اور وہ جانے لگے تو میں نے کہا: ”رُک جاؤ...“

وہ رُک گئے اور خود وہ سوالیہ نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں

”رستم نے کہا تھا کہ کسی عرفانی مرد و زن کو بخشا نہ جائے۔“

”ہاں ہاں۔ ہم پورا پورا انصاف کریں گے۔“ اُن کے سالار نے کہا اور سب تیزی سے باہر چلے گئے۔

میں نے ڈیوڑھی کا جائزہ لیا۔

اس میں نو دروازے تھے۔ میں نے وسطی دروازے کا انتخاب کیا اور اُسے پاؤں کی ٹھوکر سے کھول کر اندر چلا گیا۔

یہ ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا جس کی چھت شفاف پلاسٹک سے بنی ہوئی تھی جس سے چاند کی روشنی اور سرچ لائٹ کا دھارا اندر آ رہا تھا اور ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے کی نشستیں اُوپر سے نیچے تک بھری ہوئی تھیں جن پر عرفانی مرد و زن منجمد بیٹھے اسٹیج پر ہونے والا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اسٹیج پر ہیرو، ہیروئن کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا کچھ کہنے کے پوز میں تھا۔ اسٹیج اور تماشائیوں کی کرسیوں کے درمیان خونخوار چوہوں کا بل تھا جس پر نورے زنجیروں سے بندھی لٹک رہی تھی۔ یہ زنجیریں اسٹیج کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ یہ زنجیریں آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتیں تو نورے بل کے نزدیک پہنچ جاتی جس میں خون خوار چوہے چیخ چیخ کر اُچھل رہے تھے مگر اُس تک پہنچ نہیں پاتے تھے۔ پھر زنجیر کھینچ کر اُسے اُونچا کر لیا جاتا تھا۔

یہ دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی اور میں نے سوچا کہ یہ بھی اچھا ہے، نورے بے ہوش ہو گئی ہے ورنہ بار بار موت کے منہ میں جاتے رہنے کا نظارا خود موت سے زیادہ دہشت ناک ہے۔“ غریب نہ جانے کتنے گھنٹوں سے خوف و دہشت کا یہ عذاب بھگت رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے نشستوں پر بیٹھے خوابیدہ عرفانی اسٹیج پر اداکاروں کا نہیں بلکہ نورے کی سسکتی اور پل پل رینگتی ہوئی موت

کا نظارا کر کے قہقہے لگا رہے ہوں۔ میں نشستوں کے درمیان سے سیڑھیاں اُتر کر گڑھے کے قریب آ گیا اور بولا: ”نورے! میں آ گیا ہوں نورے۔“ مگر نورے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر زنجیریں پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ میری دسترس سے دُور تھیں کیوں کہ اسٹیج اُونچا تھا۔ میں نے ایک عرفانی تماشائی کو حالتِ خواب میں کرسی سے اُٹھا کر اُس کے ساتھ بیٹھے تماشائی کی گود میں بٹھا دیا، نشست اکھیڑی اور اُسے اسٹیج کے قریب لا کر اس پر کھڑا ہو گیا اب میرا ہاتھ آسانی سے اُن زنجیروں تک پہنچ سکتا تھا جن سے نورے جکڑی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

ابھی میں اُسے زنجیروں سے چھڑا ہی رہا تھا کہ وہ ہوش میں آ گئی۔ چند لمحوں کے لیے تو اس سے بولا ہی نہ گیا پھر اُس نے کہا: ”لک... کون ہو تم؟“

”میں سرفروش ہوں نورے اور تمھیں بچانے آیا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔ تم سرفروش نہیں ہو سکتے۔“ اُس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید وہ مجھے اس حُلیے میں پہچان نہیں سکی تھی۔ میں نے کہا: ”غور سے دیکھو نورے... میں سرفروش ہی ہوں۔“

”آہ... ہاں... مگر یہاں کیوں آئے سرفروش۔ مجھے مر جانے دیتے اب تم بھی پکڑے جاؤ گے۔ تمھیں پکڑنے کے لیے ہی تو رستم نے مجھے یہاں لٹکا رکھا تھا۔“

”میں جانتا ہوں نورے۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والا ہے مگر تم ڈرو نہیں... وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا کیوں کہ ابھی ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔“

جب میں نے اُسے زنجیروں کی جکڑ بندی سے آزاد کر کے اسٹیج پر کھڑا کر دیا تو اس نے کہا: ”میرا خیال تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تمھیں مجھ سے اتنا پیار ہو سکتا ہے۔ اب اگر میں مر جاؤں یا رستم میری بوٹی بوٹی اُڑا دے تب بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ میں اس اطمینان کے ساتھ دم توڑ دوں گی کہ میرا محبوب بھی مجھے چاہتا تھا۔“

نورے مجھ سے محبت بھری باتیں کر رہی تھی مگر میں سوچ رہا تھا کہ میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ مجھے عرفانیوں اور نادیوں کے درمیان دوستانہ مراسم کی داغ بیل رکھنی ہے اور اس کا طریقہ میں نے یہ سوچا تھا کہ پہلے رستم سے لوٹ مار اور غارت گری رکواؤں پھر عرفانیوں کے صاحبانِ اقتدار پر قابو پا کر توانائی کی ترسیل بحال کروا دوں تاکہ ان سے معاہدۂ امن کیا جا سکے۔ مگر رستم ابھی تک یہاں نہیں آیا تھا حالاں کہ میرا خیال تھا، اُس کے جاسوس اُسے آگاہ کر چکے ہوں گے کہ میں نورے کو بچانے آ گیا ہوں... اس خیال کے ساتھ ہی میں نے نورے کی طرف دیکھا اور اُس سے پوچھا: ”کیا تم چل سکتی ہو؟“

”نہیں سرفروش، میری ٹانگیں اکڑ گئی ہیں اور میں بھوکی پیاسی بھی ہوں لیکن چلنے کی کوشش کر دیکھتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اُس نے چلنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر گرنے لگی تو میں نے اُسے سنبھال لیا اور کہا: ”ٹھہرو میں تمھیں اُٹھا کر لے چلتا ہوں۔“ میں نے اُسے کندھے پر اُٹھا لیا اور چلنے لگا تو اس نے پوچھا: ”کہاں جا رہے ہو تم؟“

”رستم کی تلاش میں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“ وہ کانپ کر بولی اور اُس نے ہال کے دروازوں کی طرف اشارہ کیا، جو ایک ساتھ کھل رہے تھے میں نے دیکھا کہ تمام دروازے دھیرے دھیرے کھل رہے ہیں ہر دروازے سے ایک تنومند آدمی نمودار ہو رہا تھا... پھر وہ وسیع و عریض کمرہ اَن گنت قہقہوں سے گونج اُٹھا اور میرے جسم میں ایک سرد سی لہر رُوح کی گہرائی تک اُتر گئی۔

میرے قریب کھڑی لڑکی نازک پتے کی مانند کانپ رہی تھی اور اس کی پیشانی پر شفاف پسینے کے موتیوں جیسے قطرے چمک اُٹھے تھے۔ جو کچھ ہوا تھا، مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شاہ رستم مجھے اس انداز میں اپنے جال میں پھانس سکتا ہے اگرچہ نادیوں کے پاس آہنی سلاخ کے علاوہ کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا جس سے وہ مجھے دُور ہی سے نشانہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس کے باوجود اَن گنت ایسے آدمیوں سے بھڑ جانا کوئی دانش مندانہ فعل نہیں تھا جن کے ہاتھوں میں آہنی سلاخیں دبی ہوئی ہوں۔

میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا حتیٰ کہ میری تیکراتی ہُوئی نظریں اُن کے سالار پر تھم کر رہ گئیں. وہ مجھ سے چھ قدم کے فاصلے پر سلاخ تھامے کھڑا تھا. میں نے اپنے اوسان بحال رکھتے ہُوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور بے خوفی سے کہا: "شاید تم مجھے نہیں جانتے. میرا نام سرفروش ہے. شاہ رُستم مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہے؟ اُسے بتاؤ کہ میں بھی اس سے ملاقات کے لیے بے چین ہُوں"

سالار میری بات پر سکرانے لگا.

میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا. تب اُس نے ایک طرف اشارہ کر دیا. میری نگاہ اُس کے اشارے کے تعاقب میں اُٹھ گئی تو میں نے دیکھا کہ شاہ رُستم بھی وہاں موجود تھا.

وہ ہال میں نشستوں کے درمیانی راستے سے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا. اس کی نگاہیں مجھ پر اور نورے پر جمی ہُوئی تھیں... پھر وہ خوفناک آدم خور چوہوں کے بل کے قریب رُک گیا اور بلند آواز میں مجھ سے پُوچھا: "شیلو کہاں ہے؟"

میں جانتا تھا کہ اگر میں نے جھُوٹ بولنے یا اُسے ٹالنے کی کوشش کی تو اُس کا ایک ہی اشارہ مجھے اور نورے کو چوہوں کی خوراک بنا دے گا. اس لیے میں نے کہا: "وہ توانائی کے مخرج میں ہے"

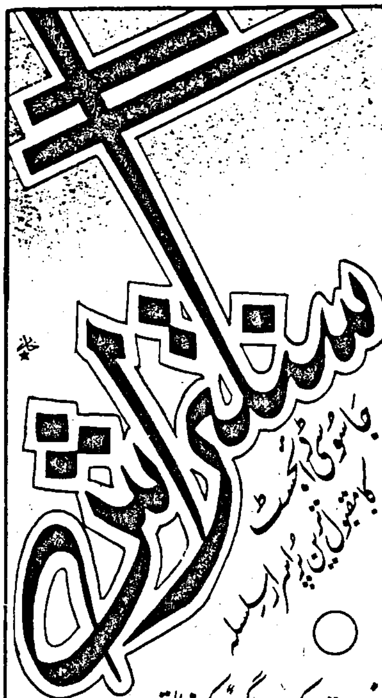
"میرے احمق آدمیوں نے یہاں وہ کچھ کر ڈالا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا. بہرحال، بتاؤ کہ تم شیلو تک پیغام کیسے بھیج سکتے ہو؟" رُستم نے سوال کیا.

"بلدیہ کی عمارت میں ایک پھسلواں راستہ ہے جو مخرج تک جاتا ہے. میں کسی بھاری چیز کے ساتھ پیغام وہاں تک پہنچا سکتا ہُوں"

رُستم میری اس بات پر مسکرایا اور بولا: "بھاری چیز نہیں بلکہ کسی بھاری جسم کے ساتھ... اور وہ جسم تمھارا بھی ہو سکتا ہے مگر ایک لاش کی صُورت میں..."

"ہاں، یہ ممکن ہے" میں نے کہا: "لیکن میں شیلو کو تم سے ملے اور بات چیت کیے بغیر کوئی پیغام نہیں بھیج سکتا اور نہ ہی بھیجنا چاہتا ہُوں"

"مگر پیغام کا مقصد؟ کیا میں چاہُوں گا کہ وہ توانائی کی ترسیل بحال کر دے. اگر میں ایسا چاہُوں تو مجھ سے بڑا احمق اور کون ہو سکتا ہے؟" پھر اُس نے ہال میں خوابیدہ عرفانی تماشائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بات جاری رکھی: "کیا میں ان بدبختوں کو جگا دُوں جو تعداد میں ہم سے بہت زیادہ ہی نہیں بلکہ بے حد خطرناک ہتھیار بھی رکھتے ہیں جبکہ ہمارے پاس صرف یہ سلاخیں ہیں. یا تم خود احمق اور پاگل ہو. اگر توانائی بحال کی گئی تو یہ عرفانی ہمارے ساتھ ساتھ تمھیں بھی مار ڈالیں گے اور تم نے شیلو پر اعتماد کر کے دُہری حماقت کا ثبوت دیا ہے کیونکہ وہ غدار



ہے اور مجھے شک ہے کہ وہ قمرانیوں سے ملی ہُوئی ہے"

"تمھارا شک صدفی صد درُست ہے. وہ قمرانیوں کی جاسوس ہے مگر ابھی تک اس نے ہم سے غداری نہیں کی... وہ مجھے اپنے ساتھ ملا کر عرفانیوں پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہی ہے. وہ قمرانیوں کے ساتھ بھی معاہدۂ امن کرنا چاہتی ہے جنھوں نے شیلو کے ساتھ بڑے بڑے وعدے کر رکھے ہیں لیکن رُستم اگر تم صبر و تحمل سے کام لو اور مجھے موقع دو تو میں شیلو سے نمٹ سکتا ہُوں"

"یہ تمھاری غلط فہمی ہے، سرفروش! وہ ان آدم خور چوہوں سے بھی زیادہ خونخوار اور خطرناک ہے. میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمھیں ختم کر دُوں یا تمھاری باتیں سُن کر وقت ضائع کر رہا ہُوں"

"پہلے میری بات سُن لو رُستم... پھر جب چاہو مجھے ختم کر دینا. یہ تو تمھیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ آشی کو میں نے قتل نہیں کیا تھا؟"

"ہاں. میں جانتا ہُوں کہ اُسے دارا نے قتل کیا ہے. میں یہ بھی جانتا ہُوں کہ تم نے فرار ہوتے وقت میرے آدمیوں کے ساتھ کیا سلُوک کیا... لیکن یہ قدرتی بات تھی اس لیے میں تمھیں اس اقدام کے لیے کسی سزا کا مستحق قرار نہیں دیتا... مگر میں دارا کو معاف نہیں کر سکتا. تمھیں اس کو میرے حوالے کرنا پڑے گا"

"وہ تو زخموں کی تاب نہ لا کر مر چکا ہے رُستم!" میں نے بے ساختہ جھُوٹ بول دیا: "شیلو کے ساتھ اُس کا بیٹا رُومی بھی توانائی کے مخرج میں موجود ہے"

"مجھے اس پلے کی کوئی پروا نہیں" وہ نفرت سے بولا جبکہ میرا خیال تھا کہ حیرت سے اس کا چہرہ بگڑ جائے گا.

"میری مانو تو ہم دونوں بلدیہ کی عمارت میں چل کر عرفانیوں کے سربراہوں کو گرفتار کر لیتے ہیں... پھر توانائی کے مخرج پر قابض ہو کر من مانی شرائط طے کریں گے" میں نے تجویز پیش کی.

"تمھاری تجویز سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اب اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میں نے عرفانیوں کے سربراہوں کو قتل کر دیا ہے اور اگر شیلو نے توانائی بحال کر دی تو یہ لوگ ہم نادیوں کو نیست و نابود کر دیں گے اس لیے سب سے پہلے ہمیں شیلو اور رومی کو ختم کرنا ہو گا"

"لیکن یہ کیوں بھُولتے ہو کہ یہ شہر خوابیدہ لامحدود وسعت میں پھیلا ہُوا ہے. تم کب تک اور کتنے عرفانیوں کو قتل کرو گے. ہو سکتا ہے کہ کوئی دُوسرا توانائی کی ترسیل بحال کر دے. ممکن ہے، قمرانی یہ کام کر ڈالیں"

"دیکھو سرفروش! اب ہم پستیوں سے باہر آ چکے ہیں اس لیے دوبارہ اُس ذلت کو نہیں اپنائیں گے، چاہے کچھ بھی ہو جائے" رُستم نے دو ٹوک اپنا فیصلہ سُنا دیا.

"اچھا میری ایک اور تجویز پر غور کرو" میں نے نرمی سے کہا: "اگر کسی طرح قمرانیوں سے میرا رابطہ قائم ہو جائے تو میں تمھارے اور قمرانیوں کے درمیان معاہدۂ امن کرا دُوں گا اور قمرانی عرفانیوں کو خود ہی سنبھال لیں گے"

"تم نے احمقانہ بات کی ہے. قمرانیوں کو نہ تو عرفانیوں کی کوئی پروا ہے اور نہ ہی ہم نادیوں کی... ہم تو اُن کے نزدیک چوہوں سے بھی بدتر ہیں"

"لیکن چاند نُما سرزمین پر ہونے والی سرگرمیاں تو اس اَمر کا اظہار کرتی ہیں کہ قمرانی یہاں کی صُورتِ حال سے خاصے متاثر ہو چکے ہیں اور شاید تمھیں یہ معلوم نہ ہو کہ عرفانیوں کو توانائی کی ترسیل شیلو نے قمرانیوں کے ایما پر ہی روکی تھی. کیا یہ راز تمھیں معلوم تھا؟"

"نہیں. میں قمرانیوں جتنی بلند سوچ کا مالک نہیں ہُوں. میں تو صرف اتنا جانتا ہُوں کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور ہم ان کے سامنے بے بس ہیں"

"اچھا ایک بات اور... قمرانی میری ذات میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچے. میں تمھاری خاطر اُن سے اپنی ذلت کی سودے بازی کر سکتا ہُوں. سب سے پہلے ہمیں بلدیہ کی عمارت میں چل کر ایک دستہ توانائی کے مخرج کی طرف بھیجنا چاہیے تاکہ وہ اس پر قبضہ کر لے کیونکہ خود مجھے بھی شیلو پر اعتماد نہیں ہے"

میں نے بات ختم کی ہی تھی کہ ہال میں روشنی تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اسٹیج پر "منجمد اداکاروں" میں زندگی کی لہر دوڑ گئی. وہ مکالمے بولنے لگے. ساتھ ہی تماشائی بھی "زندہ موت" کی نیند سے جاگ اُٹھے. یہ دیکھ کر رُستم چیخ پڑا.

"غداری ہو گئی. شیلو نے توانائی کی ترسیل بحال کر دی ہے"

تماشائیوں میں سے کئی آوازیں بیک وقت بلند ہُوئیں: "ارے اسٹیج پر نادی کہاں سے آ گئے. مارو. نادیوں کو قتل کر دو"

تماشائی عورتیں بھی چیخنے چلانے لگیں.

ایک اداکار رُستم کی طرف جھپٹا مگر میں نے اُسے چوہوں کے گڑھے میں پھینک دیا اور رُستم جو مجھے اپنی آہنی سلاخ مارنے ہی والا تھا، مفلوج سا ہو کر رہ گیا.

"یہ غداری میں نے نہیں بلکہ شیلو نے کی ہے. میرے ساتھ آؤ" میں نے کہا اور اُسے اپنی جانب گھسیٹ لیا. اتنے میں عرفانی نادیوں سے لڑنے لگے. عورتوں کی چیخ و پکار کے ساتھ ہال میں بھگدڑ مچ گئی. رُستم کے سپاہی ابھی تک صحیح صُورتِ حال نہیں سمجھ سکے تھے.

"بدبختو! دیکھتے کیا ہو۔ نکلو یہاں سے" میں نے چیخ کر کہا اور نورے کی طرف متوجہ ہوا جو میرے قریب کھڑی تھی: "تم میرے ساتھ رہنا ورنہ ماری جاؤ گی"۔

نادیوں نے بھی اپنی آہنی سلاخوں سے کام لینا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر عرفانی چلّانے لگے: "پولیس کو اطلاع دو۔ پولیس کو بلاؤ"۔

میں رستم اور اُس کے چند سپاہی لڑتے بھڑتے اسٹیج کے پیچھے آ کر تہ خانے میں اُتر گئے اور اُس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اتنے میں باہر سے سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے تہ خانے کے روشن دان سے جھانک کر باہر دیکھا۔ ابھی اس سڑک پر پولیس [illegible] یں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ہم جلدی سے دوسرے دروازے سے [illegible] ل کر بلدیہ کی عمارت کی طرف بھاگنے لگے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سڑکوں پر افراتفری کے آثار دکھائی دینے لگے اور پولیس کی گاڑیاں بھی ادھر سے اُدھر دوڑتی نظر آئیں۔ ان گاڑیوں میں چھ چھ آدمی سوار تھے جنھوں نے اپنے چہرے ماسک سے چھپا رکھے تھے۔

"اُنھوں نے ماسک کیوں لگا رکھے ہیں؟" میں نے رستم سے پوچھا۔

"ہنسنے والی موت سے بچنے کے لیے"۔ اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"وہ ایک سفوف پھینکتے ہیں جس کی خوشبو سے آدمی ہنستے ہنستے مر جاتا ہے"۔

"تو پھر بہتر یہ ہوگا کہ ہم کسی تہ خانے میں چلے جائیں اور تہ خانوں کے راستے بلدیہ کی عمارت کی طرف بڑھیں"۔ میں نے مشورہ دیا اور ہم ایک عمارت کے تہ خانے میں گھس گئے۔

"وہ ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے سرفروش، ہم چھپ نہیں سکتے"۔ رستم بولا۔

"اُس کی بھی ایک ترکیب ہے"۔ میں نے کہا: "مگر تمھارے کچھ آدمیوں کو جان کی بازی لگانا پڑے گی۔ ہو سکتا ہے اُنھیں اپنی جانوں کی قربانی بھی دینا پڑے۔ کیا تمھارے پاس ایسے جانباز موجود ہیں؟"

"میرے محافظ میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں"۔ اُس نے فخر سے بتایا۔

"تو پھر اپنے تیس آدمیوں کو حکم دو کہ وہ چھتوں پر چلے جائیں اور پولیس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیں۔ عرفانی سمجھیں گے کہ ہم اُنھی میں شامل ہیں۔ یہ لوگ بلدیہ کی مخالف چھتوں پر سفر جاری رکھیں ہم تہ خانوں کی دیواریں توڑ کر نیچے ہی نیچے بلدیہ کی طرف بڑھتے رہیں گے"۔

رستم نے میری تجویز پر تیس آدمی منتخب کیے اور اُنھیں سمجھا دیا کہ وہ کیا کریں گے۔ ہر عمارت کے تہ خانے کی دیوار ساجھی تھی۔ یہ عمارتیں اور دیواریں بھی پلاسٹک کی بنی ہوئی تھیں جو آسانی سے ٹوٹ جاتی تھیں۔ ہم نے متعدد گروہ بنا لیے۔ ہر گروہ باری باری دیوار توڑتا تھا تاکہ دوبارہ اپنی باری آنے تک تازہ دم ہو جائے۔ اس طرح ہم تیزی سے منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک ایک مقام پر رستم نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

"ہم بلدیہ کیوں جا رہے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"تاکہ وہاں سے توانائی کے مخرج تک پہنچ سکیں"۔ میں نے جواب دیا۔

"لیکن ہم سے پہلے وہاں تک پولیس پہنچ چکی ہو گی"۔ وہ بولا۔ "اور اپنے سربراہوں کا حال دیکھ کر ہمارے پرخچے اُڑا دے گی"۔

"پہلے میں سمجھتا تھا کہ تم نے عرفانی سربراہوں کو مار کر بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن اب میرا خیال بدل گیا ہے۔ تم نے عرفانیوں کو سربراہوں سے محروم کر دیا ہے۔ اس لیے اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اب وہ کیا کریں... پھر اُنھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ ایک طویل نیند سے جاگے ہیں۔ اُوپر سے تمھارے حملے نے اُنھیں ہراساں کر دیا ہے۔ یہ ساری باتیں اُنھیں بُری طرح پریشان کر دیں گی۔ ہم اُن کی اس پریشانی سے فائدہ اُٹھا کر توانائی کے مخرج تک پہنچ سکتے ہیں"۔

یہ بات رستم کی سمجھ میں آ گئی۔

میں نے ایک تہ خانے کے روشندان سے جھانک کر دیکھا۔ پولیس کی گاڑیوں کا رُخ متضاد سمت میں تھا۔ وہ رستم کے تیس آدمیوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ تتر بتر ہو کر اُنھیں گمراہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

تہ خانوں کی دیواریں توڑتے ہوئے جب ہم بلدیہ کے زیرِ زمین حصے میں پہنچے تو باہر سے پولیس والوں کی آوازیں آ رہی تھیں کسی نے بآوازِ بلند پوچھا: "کیا تم صدر بلدیہ سے مل کر آئے ہو؟"

اُسے جواب دیا گیا: "نہیں۔ جب تک میں ہنسنے والے سفوف کی توپیں عمارت کے چاروں طرف نصب نہ کروا لوں صدر سے نہیں ملوں گا۔ ورنہ اُنھوں نے انتظامات کے بارے میں پوچھا تو کیا جواب دوں گا؟"

پولیس افسر کا یہ جواب میرے لیے خاصا حوصلہ افزا تھا۔ میں نے رستم سے کہا کہ وہ اپنے کچھ آدمی باہر بھیج کر پولیس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیں تاکہ ہم بآسانی اُوپر پہنچ سکیں۔ رستم نے میرا یہ مشورہ بھی قبول کر لیا اور ہم بآسانی اس کمرے تک جا پہنچے جہاں عمائدینِ شہر کی لاشیں پڑی تھیں لیکن ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے

کہ صدر بلدیہ کی کرسی پر شیلو براجمان تھی اور اُس کے سامنے وہی ٹی وی نما سیٹ دھرا تھا جیسا کہ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے رستم اور نورے کو چھپنے کا اشارہ کیا اور ہم لاشوں کے درمیان لیٹ کر شیلو کی گفتگو سننے لگے۔

وہ کہہ رہی تھی...

"میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ رستم نے بغاوت کر دی ہے اُس کے سپاہیوں نے لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس لیے میں نے توانائی بحال کر دی۔ اب عرفانیوں اور نادیوں کے درمیان جنگ جاری ہے اور..."

دفعتاً قمرانی نے اُس کی بات کاٹ دی: "تمھاری دیرینہ آرزو پوری ہو گئی ہے اور اب تم صدر بلدیہ کی کرسی پر بیٹھ کر مجھ سے گفتگو کر رہی ہو۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟"

"یہ وقت طنز کرنے کا نہیں جمشید"۔ شیلو نے جواب دیا: "مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں تمھاری طرف سے عملی اقدام چاہتی ہوں"۔

"ہمیں کسی اقدام کی ضرورت نہیں"۔ جمشید کی آواز آئی: "اُنھیں آپس میں لڑنے دو تاکہ سب خود ہی تباہ ہو جائیں"۔

"اگر سب تباہ ہو گئے تو میں حکمرانی کس پر کروں گی؟"

جمشید کے قہقہے کی آواز اُبھری۔ پھر اُس نے کہا: "تم اب تک حکمرانی کے خواب دیکھنے سے باز نہیں آئیں شیلو"۔

"خواب؟... لیکن تم نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمھاری آلۂ کار بن جاؤں تو تم مجھے اس شہر کی حتیٰ کہ عرفانیوں کی ملکہ بنا دو گے"۔

"ہاں میں نے وعدہ کیا تھا... اور تم نے بھی تو وعدہ کیا تھا کہ سرفروش کو بغیر کوئی ضرر پہنچائے ہمارے حوالے کر دو گی لیکن تم نے اپنا وعدہ پورا کرنے کی بجائے توانائی بحال کر کے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا جس میں سرفروش کا ہلاک ہو جانا یقینی ہے۔ اس لیے اب میں کسی وعدے کا پابند نہیں رہا"۔

"لیکن میں توانائی بحال کرنے پر مجبور تھی۔ دوسرے یہ ضروری نہیں کہ سرفروش مر چکا ہو... تم جانتے ہو کہ وہ بہت بہادر اور جنگجو ہے"۔

"بہادر بھی موت سے نہیں بچ سکتے شیلو۔ وہ ہمیں شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں دکھائی نہیں دے رہا اور تہ خانوں میں ہم دیکھ نہیں سکتے۔ کیا معلوم اُسے کسی تہ خانے میں قتل کر دیا گیا ہو"۔

"اُسے یہاں اس عمارت میں آنا تھا۔ اگر وہ زندہ ہو اور یہاں آ جائے تو؟" شیلو نے پوچھا۔

"تو پھر میں تمھاری مدد کرنے اور تمھیں ملکہ بنانے کا وعدہ پورا کروں گا۔ جیسے ہی میں دیکھوں گا کہ اُسے کوئی ضرر نہیں پہنچی اور ہمارے سائنس داں اس کا معائنہ کر سکتے ہیں، میں عرفانیوں اور نادیوں کے درمیان یہ معرکہ آرائی ختم کرا دوں گا"۔

"تم اپنے وعدے سے منحرف تو نہیں ہو جاؤ گے؟" شیلو نے پوچھا۔

"میں پہلے کبھی اپنے وعدے سے منحرف نہیں ہوا۔ میں نے تم سے موزوں وقت تک انتظار کرنے کو کہا تھا مگر تم نے جلد بازی سے کام لیا اور سرفروش کو بھی ہمارے حوالے نہیں کیا"۔

اتنے میں باہر چوراہے سے نادیوں اور عرفانیوں کے جوابی نعروں اور چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں۔

"چوراہوں پر لڑائی ہو رہی ہے۔ شاید سرفروش اس لڑائی میں شامل ہو"۔ شیلو نے کہا۔

"نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ ان لوگوں میں شامل نہیں ہے اور عرفانیوں نے ہنستی موت کی توپ چلا کر نادیوں کو ختم کر دیا ہے"۔ جمشید نے اسے بتایا۔

"میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ یہ لڑائی بند کرا دو اور فرض کرو کہ سرفروش زندہ ہے تو لڑائی بند ہونے پر وہ عرفانیوں کے ہاتھوں مرنے سے بچ جائے گا ورنہ وہ اُسے بھی نادی سمجھ کر مار ڈالیں گے"۔

"تمھاری بات سمجھ میں آتی ہے شیلو۔ اسپیکر کے سوئچ آن کر دو، میں عرفانیوں سے بات کروں گا"۔

شیلو نے ایک بٹن دبایا تو ٹی وی سیٹ سے ایک مائیکروفون نکل کر اسکرین کے سامنے آ گیا۔

جمشید مائیک پر بولنے لگا۔

"عرفانیو اور نادیو سنو۔ میں چاند سے جمشید قمرانی بول رہا ہوں۔ یہ معرکہ آرائی فوراً بند کر دو۔ بچے کھچے نادی زیرِ زمین واپس چلے جائیں اور عرفانی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ شہر کی عمل داری پولیس اور فوج سنبھال لے گی۔ کسی عرفانی یا نادی نے میرے اس حکم کی خلاف ورزی کی تو اسے عبرتناک سزا دے کر نیست و نابود کر دیا جائے گا... اور سرفروش نامی اجنبی کے لیے میرا یہ پیغام ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو، بلدیہ کی عمارت میں پہنچ جائے"۔

خدا معلوم جمشید قمرانی کی آواز میں کیا تاثیر تھی کہ باہر سے جنگ و جدل کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ شیلو نے اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکا اور واپس آ کر جمشید سے بولی: "اُنھوں نے لڑائی بند کر دی ہے۔ اب سرفروش یہاں پہنچ جائے گا"۔

"اگر وہ پہنچ جائے تو مجھے بتا دینا"۔ جمشید نے جواب دیا اور اس کی شبیہ اسکرین سے غائب ہو گئی۔

اس دوران شیلو کی تمام تر توجہ جمشید قمرانی کی جانب مبذول

رہی تھی اور اُسے ہماری موجودگی کا نہ تو علم ہوا اور نہ ہی احساس ہوا جب جمشید سے اس کا رابطہ ختم ہو گیا تو رستم ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ شیلو اُسے دیکھ کر یُوں اُچھلی جیسے اُسے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو مگر جلد ہی سنبھل گئی اور اُس نے رستم کے احترام میں اپنا ایک ہاتھ بلند کر دیا۔

رستم نے آہنی سلاخ اُس پر تولی تو وہ بولی: "رُک جاؤ رستم! جنگ ختم ہو گئی ہے اور تم مجھ سے جیت گئے ہو بلکہ یُوں کہنا درست ہو گا کہ میں تم سے ہار گئی ہوں مگر ہم دونوں نے عرفانیوں پر فتح پائی ہے۔ میں نے جمشید قمرانی سے کہہ کر عرفانیوں کو نادیوں کی خونریزی سے رُکوا دیا ہے۔ آج میں تمھارے سامنے یہ اعتراف بھی کرتی ہوں کہ میں قمرانیوں کی آلۂ کار تھی۔ اب ہم دونوں اس شہر میں اُسی طرح حکمرانی کریں گے جیسے زیرِ زمین کیا کرتے تھے۔ آیندہ نادیوں اور عرفانیوں کے حقوقِ شہریت یکساں ہوں گے۔"

رستم مسکرانے لگا۔ اُس نے اپنا خون آلود ہاتھ سر پر پھیرا اور مخصوص نشان بناتے ہوئے بولا: "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، کچھ دیر پہلے تم کچھ اور کہہ رہی تھیں۔"

شیلو نے اُسے جواب دینے کی بجائے ٹی۔ وی اسکرین کی جانب دیکھا مگر وہ خالی تھی۔ تاہم اُس نے پُرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "تم جانتے ہو کہ قمرانی کتنے چالاک ہیں۔ مجھے اُن سے ایسی ہی بات کرنی چاہیے تھی ورنہ وہ اعتراض کر سکتے تھے کہ تمھیں کس بنیاد پر اقتدار میں شریک کرنا ضروری ہے۔"

"میں قمرانیوں کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں نمداہ عورت۔ وہ جھوٹے وعدے کرتے ہیں اور کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ اُنھوں نے یہ ہنگامہ آرائی اس لیے ختم کروائی ہے کہ اُنھیں سرفروش کی ضرورت ہے۔ میں تمھاری اور جمشید قمرانی کی ساری گفتگو سُن چکا ہوں مگر اس کے باوجود تم مجھے ... بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اب تمھارا کوئی مکر اور کوئی فریب مجھے تمھارے قتل سے نہیں روک سکتا۔"

یہ کہہ کر اُس نے آہنی سلاخ تولی مگر میں نے اُسے پکڑتے ہوئے کہا: "شیلو کی جلد بازی کا نتیجہ دیکھ لینے کے باوجود تم بھی وہی حرکت کرنا چاہتے ہو۔ اب کوئی قتل و غارت گری نہیں ہو گی۔ قمرانیوں کو اگر میری ذات سے دلچسپی ہے تو اُنھیں بھی عرفانیوں اور تمھارے ساتھ معاہدے کا ایک فریق بننا پڑے گا۔"

میں یہ کہتے ہوئے رستم کی طرف متوجہ تھا کہ اتنے میں مجھے شیلو کی چیخ سُنائی دی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا۔ نورے نے آہنی سلاخ اُس کے سینے میں اُتار دی تھی اور اب بھی بار بار گھونپے جا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے نورے کی کلائی تھام لی۔

"یہ تم نے کیا کر دیا، بے وقوف لڑکی؟ تم نے شیلو کو کیوں مار ڈالا؟"

"میں تم سے محبت کرتی ہوں سرفروش۔ یہ عورت اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد تمھیں قتل کر دینا چاہتی تھی اور اب بھی یہی کرتی۔ اس لیے میں نے اسے قتل کر دیا۔"

رستم نورے کی بات پر مسکراتے ہوئے بولا: "نادی عورت اپنی محبت کے تحفظ کے لیے ایسا ہی کیا کرتی ہے سرفروش۔"

شیلو کھانستے اور خون تھوکتے ہوئے اُکھڑے اُکھڑے سے لہجے میں بولی: "میں ... تمھیں ... قتل نہیں ... کر سکتی تھی ... مجھے بھی ... تم سے ..." اُس کی گردن ڈھلک گئی۔

یکایک ٹی۔ وی اسکرین سے جمشید قمرانی کی آواز سُنائی دینے لگی:

"شیلو کو شروع ہی سے خواب دیکھنے کی عادت تھی سرفروش۔ اب وہ مر چکی ہے اور اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو تم سب بھی جلد ہی اُس سے جا ملو گے۔"

جمشید کا عکس دیکھتے ہی رستم اور نورے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے جبکہ میں نے جمشید سے کہا: "تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہمیں تمھاری ضرورت ہے۔ کیوں؟ یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم دائیں جانب والا آخری بٹن دبا دو۔"

میں نے آخری بٹن دبایا تو کمرے کی چھت کا گنبد کھل گیا اور چاند نما سرزمین سے کوئی چیز نیچے پرواز کرتی نظر آئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ ایک بم ہے۔ میں نے پہلے کبھی اتنا بڑا بم نہیں دیکھا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ قریب آتا اور بڑا ہوتا جا رہا تھا۔

جمشید پھر بولنے لگا ...

"میں جمشید قمرانی ہوں اور میں صرف تم سے مخاطب ہوں سرفروش۔ اس وقت تک تیس کی گنتی پوری ہو چکی ہے۔ سو کی گنتی پوری ہونے سے پہلے میں یہ بم روک سکتا ہوں۔ بولو اب کیا کہتے ہو؟"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تم سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے سائنسدان تمھارا معائنہ کرنے کے آرزومند ہیں جس سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اگر میں تمھاری بات مان لوں تو تم بم واقعی روک لو گے؟"

"ہاں۔ پچاس کی گنتی پوری ہو چکی ہے۔ یہ خواب آور بم نہیں بلکہ آتشیں بم ہے۔ یہ ہر چیز کو ہمیشہ کے لیے بھسم کر دے گا۔"

"تو پھر یہ بم روک لو۔ میں تمھارا مطالبہ پورا کرنے پر آمادہ ہوں۔"

یہ سنتے ہی رستم اظہارِ تشکر میں میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں نے اُسے ہٹا کر بم کی طرف دیکھا جو اب بھی تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔

میں چیخ پڑا: "بم روک لو جمشید۔ میں تیار ہوں۔"

"اب صرف چالیس کی گنتی باقی رہ گئی ہے مگر ہمارے درمیان معاہدہ ہونا تھا، ہو چکا۔ ہم قمرانی ان عرفانیوں اور نادیوں سے عاجز آ چکے ہیں۔ میرا جی تو چاہتا ہے کہ اُنھیں بم کا شکار بنا دوں مگر افسرانِ بالا کی وجہ سے مجبور ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب تیس کی گنتی باقی رہ گئی ہے۔"

جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا تھا، بم قریب تر آتا جا رہا تھا اور میرے اضطراب میں بھی شدت آتی جا رہی تھی۔ میرا دل بھی بُری طرح دھڑکنے لگا تھا لیکن وہ بدبخت بم رُکنے یا اُس کا رُخ موڑنے کی بجائے باتیں کیے جا رہا تھا۔ اتنے میں مجھ پر پھر کمپیوٹر والے سر درد کا دورہ پڑ گیا لیکن اب بم اتنا قریب آ چکا تھا کہ کمپیوٹر بھی مجھے اس سے نہیں بچا سکتا تھا۔ میں نے اسکرین کو مُکا دکھاتے ہوئے کہا ...

"جب میں نے تمھاری بات مان لی ہے تو بم کو کیوں نہیں روکتے؟"

جمشید نے قہقہہ لگایا اور بولا: "ابھی تو تقریباً پندرہ کی گنتی باقی ہے۔ میں اسے چودھویں گنتی تک روک سکتا ہوں۔"

میں نے بم کی طرف دیکھا۔

وہ نیچے آ رہا تھا اور اب بہت قریب پہنچ چکا تھا پھر اچانک ہی ایک دائرے میں گھومنے لگا اور مزید نیچے آنا بند ہو گیا۔

یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا: "اب مجھے کیا کرنا ہے؟"

"چھت پر جاؤ اور انتظار کرو۔ پھسلواں راستے کے قریب تمھیں ایک ہیلی پیڈ نظر آئے گا۔ ہماری میگنا کار وہیں اُترے گی۔ اُس میں داخل ہو کر اوندھے مُنہ ساکت لیٹ جانا۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر اُوپر جاؤ۔"

میں اُوپر جانے لگا تو نورے مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں نے رستم سے کہا کہ وہ اُسے پکڑ لے۔ اُس نے روتی ہوئی نورے کو پکڑ لیا اور متشکر نگاہوں سے اس وقت تک میری طرف دیکھتا رہا جب تک کہ میں سیڑھیاں چڑھ کر گنبد والے شگاف سے اُوپر نہیں نکل گیا۔

پھسلواں راستے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا ہیلی پیڈ بنا ہُوا تھا اور وہاں تابوت نما میگنا کار میری منتظر تھی۔ میں قریب پہنچا تو اُس کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔

میں کار میں داخل ہو کر اوندھے مُنہ لیٹ گیا۔ مجھے یہ احساس تک نہ ہُوا کہ وہ اُڑنے لگی ہے بس اتنا پتہ چلا کہ اُس کے شفاف فرش سے شہرِ خوابیدہ کی جو عمارات دکھائی دے رہی تھیں وہ ہر لمحے چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔

اچانک ہی مجھے شہر میں تا حدِ نظر شعلے اُٹھتے دکھائی دینے لگے۔

جمشید نے وہ آتشیں بم گرا دیا تھا۔

میں نے دُکھ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

٭

میگنا کار کا دروازہ کھلا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ رُک چکی ہے اور میں اس چاند نما سرزمین پر پہنچ گیا ہوں جس سے شہرِ خوابیدہ پر دشمنوں کے دھاوے ڈالے جاتے تھے۔

میں کار سے باہر نکلا تو اپنے استقبال کو جمشید قمرانی کی بجائے ایک اَدھیڑ عمر کے آدمی کو اپنا منتظر پایا۔ اُس نے بڑی خندہ پیشانی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "خسرو قمرانی آپ کو خوش آمدید کہتا ہے جناب۔"

میں نے اُس سے ہاتھ ملایا اور سوچنے لگا کہ اگر خسرو کی بجائے جمشید آیا ہوتا تو میں اُس کی بدعہدی پر اُس کا ہاتھ ضرور توڑ دیتا۔ اُس نے شہرِ خوابیدہ پر بم گرا کر ان گنت انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ پُوری ایک تہذیب نیست و نابود کر دی تھی۔

"ہم آپ کے لیے بے حد متفکر تھے جناب۔ آپ نے وہاں بڑے عذاب میں وقت گزارا ہو گا۔" خسرو بڑی لگاوٹ سے بول رہا تھا۔

"اُس سے بہت کم جو اب شہرِ خوابیدہ کے لوگوں پر گزر رہا ہے۔"

میں نے تلخی سے جواب دیا مگر اُس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔

وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے آیا جہاں دو آرام کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا: "تشریف رکھیے۔"

جب ہم بیٹھ گئے تو اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہنا شروع کیا: "ہم آپ کا معائنہ کرنا چاہتے تھے جناب۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اگر ہوتا تو کیا تم اپنا ارادہ ملتوی کر دیتے؟" میں نے پُوچھا۔

"نہیں جناب۔" وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولا: "آپ کا معائنہ ہر حال میں کیا جائے گا اور یہ سرسری نہیں ہو گا بلکہ آپ کے متعدد ٹیسٹ لیے جائیں گے۔"

میں نے اُس کی اَن سُنی کرتے ہوئے پُوچھا: "جمشید نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اپنے آپ کو قمرانیوں کے حوالے کر دوں تو وہ بم نہیں گرائے گا۔ پھر یہ وعدہ خلافی کیوں کی گئی ہے؟"

"یہ وعدہ جمشید نے کیا تھا جناب، میں نے نہیں اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بھی وہی کرتا جو جمشید نے کیا ہے۔ وعدہ صرف الفاظ کا کھیل ہوتا ہے اور یہ الفاظ اُس وقت تک بامعنی ہوتے

ہیں جب تک کہ ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ یہی ہماری سیاست کی بنیاد ہے اور پھر وقت آگیا تھا کہ اریوں اور عرفانیوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیا جائے۔ ہم تو کافی دنوں پہلے بم گرا چکے ہوتے مگر اتفاق سے آپ وہاں پہنچ گئے۔ ہم آپ کی وجہ سے متفکر تھے کہ کہیں عرفانی یا ناری آپ کو قتل نہ کر دیں اور ہمیں ہماری جستجوئے تحقیق ادھوری نہ رہ جائے۔"

"ایک طرف تو تم ذوق اور جستجوئے علم کی بات کرتے ہو اور دوسری طرف جذبۂ انسانیت کی پروا بھی نہیں کرتے۔ تم لوگوں سے تو ناری بہتر تھے جو اپنے قول پر تو قائم رہتے تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تم لوگ اوّل درجے کے جھوٹے ہو۔" میں نے دل کی بھڑاس نکال ہی دی۔

"جھوٹے!" وہ بولا۔ "یہ لفظ میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ ہم نے اپنا ایک آدمی دوسرے سیارے پر بھیجا تھا جو صحیح و سلامت واپس آگیا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ لفظ استعمال کیا تھا۔"

"کیا تم نے اپنا کوئی آدمی کسی دوسرے سیارے پر بھی بھیجا تھا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارے تقریباً ایک سو آدمی دوسرے سیاروں میں بھٹک رہے ہیں۔ شاید ان میں سے کوئی واپس نہ آسکے۔ ویسے آپ کس سیارے سے تشریف لائے ہیں جناب؟"

"زمین سے لیکن دور مختلف ہے۔"

"آپ کو کیسے بھیجا گیا ہے اور کیسے واپس بلایا جائے گا؟"

میں نے اُسے ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹر کے بارے میں بتا دیا۔

"میرے ساتھ تشریف لائیے۔" وہ بولا۔

وہ مجھے ایک کمپیوٹر چیمبر میں لے گیا جہاں سینکڑوں کی تعداد میں کمپیوٹر رکھے ہوئے تھے مگر مجھے کسی میں بھی کوئی تار دکھائی نہیں دیا۔ وہ کسی تار کے وسیلے کے بغیر ہی مصروفِ کار تھے۔ خسرو بولا۔ "ہم بھی اپنے آدمی کمپیوٹروں کے ذریعے ہی دوسرے سیاروں پر بھیجتے ہیں اور انھیں کمپیوٹروں کے ذریعے ہی توانائی فراہم کرتے ہیں۔"

"کیا تم سائنس داں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔ میں تو صرف ایک افسرِ مہمانداری ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ میں تمھارے سائنس دانوں سے کچھ سوال کر سکتا ہوں اور کیا وہ ایمان داری سے اُن کے جواب دیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر سوالات سیاسی نوعیت کے نہ ہوں تو انھیں صحیح صحیح جواب دینے چاہییں۔ ویسے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"عرفانی معمولی پتھر سے توانائی کیسے حاصل کرتے تھے؟"

"اوہ!" وہ بولا۔ "یہ تو بہت آسان سا سوال ہے۔ ... تو میں بھی دے سکتا ہوں اور ہمارے ہاں کا ایک بچہ بھی جانتا ہے دراصل پتھر سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ ہم لوگ دو سو سال پہلے معلوم کر چکے تھے مگر جب ہمارے ہاں چٹانیں ختم ہو گئیں تو ہم نے روشنی اور ہوا سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا۔"

"کیا تم مجھے پتھر سے توانائی حاصل کرنے کا فارمولا بتا سکتے ہو؟"

"ہاں ہاں!" وہ بولا اور فارمولا بتلانے لگا۔ مگر وہ میری سمجھ میں نہ آسکا تو میں نے کہا: "براہِ کرم اسے کسی کاغذ پر لکھ دیجیے۔"

اُس نے وہ فارمولا لکھ دیا جسے میں نے اپنے لبادے میں اُڑس لیا۔ میں اُس وقت سائنس دانوں کی ٹیم وہاں آپہنچی لیکن اس سے پہلے کہ اُن سے میرا تعارف کرایا جاتا میرے سر میں شدید درد ہونے لگا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔

بس مجھے اتنا یاد ہے کہ اُن لوگوں نے مجھے پکڑ کر میز پر لٹا دیا تھا اور میرے اردگرد کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر اُن کے چہرے تبدیل ہونے لگے۔ خسرو نوری بن گیا تھا اور جمشید کی شبیہ ملکہ شیلو نظر آنے لگی تھی ... پھر یہ چہرے آپس میں گڈمڈ ہو کر رستم بن گئے۔ رستم دارا سے لڑنے لگا۔ دارا نے آتشی کی شکل اختیار کر لی اور آتشی چیخنے چلّانے لگی ... اور میرا جسم تحلیل ہونے لگا۔

... پھر کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

جب میں ہوش میں آیا تو رضا ہمدانی نے سب سے پہلے مجھے جو خبر سنائی وہ یہ تھی کہ معمولی پتھر سے توانائی حاصل کرنے کا جو فارمولا میں ساتھ لایا تھا وہ ڈاکٹر فریدوں کے پلّے نہیں پڑا اور وہ سخت جھنجلایا ہوا ہے۔

مجھے غصہ آگیا کہ اُسے اس بات پر جھنجلاہٹ کیوں نہیں ہوئی کہ اُس کی معمولی سی کوتاہی سے اس بار میں تحلیل ہو کر نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔

اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں میں واپسی پر اس بار میرے تاثرات بڑے ہی عجیب تھے۔ میں نے اس مرتبہ دوسرے اَدوار میں طویل ترین وقفہ گزارا تھا اور چونکہ کمپیوٹر کی خرابی یا ڈاکٹر فریدوں کی کوتاہی کے باعث میں ماضی سے حال میں منتقل ہونے کی بجائے مستقبل میں نکل گیا تھا اس لیے ڈاکٹر فریدوں کو مجھے تلاش کرنے میں بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ واپسی پر میں نے پہلی دفعہ اس کے چہرے پر زردی اور آنکھوں میں تشویش کے منجمد سائے دیکھے تھے۔ غالباً وہ میری واپسی کے سلسلے میں بالکل ہی مایوس ہو گیا تھا۔

"بہتر ہوگا کہ اس بار سرفروش کو زیادہ عرصے تک آرام کرنے کی مہلت دے دو۔" رضا ہمدانی نے کہا تھا اور ڈاکٹر فریدوں نے اس سلسلے میں فوراً ہی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

مجھے ایک نجی نوعیت کے ساحل پر بھیج دیا گیا۔

اس ساحل پر عام لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا اس لیے مجھے تنہائی کے باعث بے پناہ سکون ملا اور جب میرے اعصاب نارمل ہو گئے تو میں نے فون پر ڈاکٹر فریدوں سے درخواست کی کہ مجھے شہر جانے کی اجازت دی جائے۔ دراصل میں لالہ رُخ سے ملنا چاہتا تھا لیکن میری یہ خواہش رد کر دی گئی کیوں کہ تقریباً بیس روز گزر چکے تھے اور میری چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر فریدوں نے ماسٹر کمپیوٹر پر میری روانگی کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور ایک روز بعد مجھے ماضی یا مستقبل کے نئے سفر پر جانا تھا۔

وہ جون کی پہلی تاریخ تھی اور دن بے حد خوب صورت تھا۔ میرے سر پر نیلے آسمان کی چھتری تھی اور سامنے نیل سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ باہر کا موسم حسین ہو تو آدمی کے اندر کا موسم بھی خوش گوار ہو جاتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ شاعری کی جائے لیکن مجھے شاعری کرنی نہیں آتی بلکہ میں تو وہ شاعری اور خوب صورت شعر بھی بھول چکا تھا جو میں نے دورانِ تعلیم پڑھے تھے۔ ثانی کے وہ ترنم ریز قصائد جو کبھی میرے وردِ زبان رہا کرتے تھے، میرے ذہن سے یوں مٹ چکے تھے جیسے تیز ہوائیں ریت پر ثبت ہونے والے نقوشِ پا مٹا دیتی ہیں۔

میں نے سمندر کی جانب دیکھا جس کے سینے پر کوئی کشتی نہیں تھی۔ ہواؤں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں ساحل پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے کروٹ لی اور پیٹ کے بل لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے لیے آج کے دور اور اپنی دنیا کا یہ آخری دن تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ سفر میرا آخری سفر ثابت ہوگا یا میں صحیح و سلامت واپس آؤں گا۔ میں نہ جانے کب تک ان خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا کہ اچانک کسی کی موجودگی کے احساس نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

جب میری آنکھیں وا ہوئیں تو مجھے اپنے سامنے ہی دو خوب صورت، سپید اور نرم و نازک پیر دکھائی دیے۔ میری نگاہ ان پیروں سے اوپر کو سرکنے لگی۔ میری نگاہوں کا سفر جاری رہا، یہاں تک کہ انھوں نے ایک نہایت حسین و جمیل چہرے پر سجی ہوئی دو سبز آنکھوں پر پڑاؤ ڈال دیا جن میں قطبِ شمالی کے گلیشیر جیسی خنکی تھی اور ... مسلسل مجھے گھورے جا رہی تھیں۔

نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس خوب صورت چہرے سے آشنا ہوں۔ یہ سبز آنکھیں میری دیکھی بھالی ہیں۔ ان یاقوتی لبوں پر اُبھرنے والے الفاظ کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں میری سماعت سے ضرور ٹکرا چکے ہیں ... مگر کب اور کہاں؟ ... یہ سب مجھے یاد نہیں آرہا تھا۔ اتنے میں وہ شعلۂ جوالا بول اُٹھی: "گاؤں کے لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت اس ساحل پر کوئی نہیں ہوتا۔ یہاں مکمل تنہائی ہوتی ہے۔ میں مکمل تنہائی چاہتی تھی مگر یہاں آکر یوں لگ رہا ہے جیسے تمھارے لمبے چوڑے وجود نے پورے ساحل پر قبضہ کر رکھا ہے۔"

"گاؤں والوں نے غلط نہیں بتایا تھا۔ عام طور پر اس وقت میں یہاں نہیں آیا کرتا اور اس نجی ساحل پر ... تنہائی رہتی ہے لیکن آج میں بے وقت آگیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ صرف اُس کے پیروں اور ٹخنوں تک ہی محدود رہتیں۔

وہ میری گستاخ نگہی تاڑ گئی تو کچھ دیر بعد بولی: "میں مردوں کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوں مسٹر!" اس کے انداز میں بے تکلفی تھی۔ "میں نے کئی سال یورپ میں گزارے ہیں لہٰذا مردوں کی سوچ کا اندازہ لگانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں سے جانے کا ارادہ رکھتے ہو یا نہیں؟"

"میں کیوں جاؤں؟" یہ کہہ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کیوں کہ مجھے تھوڑی دیر مکمل تنہائی درکار ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمھاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔" میں نے دو ٹوک کہہ دیا۔

"کیا تم اپنے اس رویے کو شریفانہ کہہ سکتے ہو؟"

"کبھی کبھی آدمی کو یہ رویہ اختیار کرنا ہی پڑ جاتا ہے۔ اس کا دار و مدار حالات، موقع و محل اور موڈ پر ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تم نے یہاں آکر دخل در معقولات کی ہے۔"

"مجھے تمھاری اس صاف گوئی پر خوشی ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سمندر میں تیرنے کے لیے اس ساحل پر کوئی نہیں آسکتا ... مگر گاؤں والوں نے بتایا تھا کہ اس وقت یہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔"

"گاؤں والے شاید یہ نہیں جانتے کہ اپنے ہَٹ کے سامنے والے اس ٹکڑے کے حقوقِ استعمال مَیں نے حکومت سے خرید رکھے ہیں۔" مَیں نے انکشاف کیا۔

"اوہ . . . اگر مجھے معلوم ہوتا تو مَیں ہرگز یہاں نہ آتی . . . ویسے تم اپنی آنکھیں کھول سکتے ہو۔ مجھے اُن لوگوں سے اُلجھن ہونے لگتی ہے جو مجھ سے بات کرتے وقت نگاہیں چُرانے کی کوشش کریں۔"

مَیں نے آنکھیں کھول دیں اور اُس کے گلاب گالوں سے کھیلتی ہُوئی سُنہری لٹوں پر رشک کرنے لگا۔

"اس قدر جسیم ہونے کے باوجود آدمی تو تم شریف ہی لگتے ہو۔" اُس نے ایک ادا سے کہا۔

"مَیں نے کسی بزرگ سے یہ کبھی نہیں سُنا کہ لمبا چوڑا آدمی شریف نہیں ہوسکتا۔"

"ہاں، یہ کوئی قاعدہ یا کلیہ نہیں ہے۔ کیا تم کوئی ایتھلیٹ یا پہلوان وغیرہ ہو؟"

"پہلوان تو نہیں مگر ایتھلیٹ ضرور رہا ہوں۔ وغیرہ البتہ کبھی نہیں رہا اور نہ ہی کبھی بنوں گا۔"

وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی اور بولی "اچھا مَیں تسلیم کیے لیتی ہوں کہ تم بہت شریف آدمی ہو۔ مَیں یہاں کچھ دیر پیراکی کرنا چاہتی ہوں مگر میرے پاس غسل کا لباس نہیں ہے۔ دراصل یہاں سے گزرتے ہُوئے مجھے پیراکی کی خواہش ہوئی، ورنہ مَیں لباسِ غسل ضرور ساتھ لے آتی۔"

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ مَیں اپنا لباسِ غسل تمھیں مستعار دے دوں۔" مَیں نے شرارت سے پُوچھا۔

اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولی "تمھارا لباس میرے کس کام کا، مَیں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے تشریف لے جاؤ تو مَیں تنہائی میں اپنا شوق پُورا کروں۔"

"دیکھیے خاتون! آپ بڑے شوق سے اپنا شوق پُورا کر سکتی ہیں لیکن مَیں یہاں سے نہیں جاؤں گا، البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مَیں ابھی سے مُنہ پھیر لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر مَیں نے اپنا رُخ سمندر کی بجائے چٹانوں کی طرف کر لیا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔" اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مُسکرا رہی ہے۔

"کیا؟" مَیں نے بدستور مُنہ پھیرے ہُوئے پُوچھا۔

"تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا؟"

مَیں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "نہیں خاتون مَیں واقعی نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں؟ کیا آپ کوئی ایسی اہم شخصیت ہیں جسے ہر شخص جانتا ہے؟"

"ایک طرح سے ہوں بھی . . . بہرحال، اگر تم مجھے نہیں پہچانتے اور میرے بارے میں جاننا بھی نہیں چاہتے تو آؤ پھر ایک دِلچسپ کھیل کا آغاز کرتے ہیں۔"

"شوق سے . . . وہ کھیل کیسا ہوگا؟" مَیں نے پُوچھا۔

"ہم اجنبی اجنبی کھیلیں گے اور ایک دوسرے کو اپنا نام تک نہیں بتائیں گے۔ ایک دوسرے کا پتہ بھی نہیں پوچھیں گے اور پھر کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر آمنے سامنے آگئے تو اجنبی بن کر گزر جائیں گے۔ آج بھی ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں اور کل بھی اجنبی رہیں گے۔ آج جو باتیں کریں گے، انھیں ہمیشہ کے لیے بھُول جائیں گے یوں جیسے نہ تو ہم کبھی ملے تھے اور نہ ہی ہمارے درمیان کوئی تعلق تھا۔ بولو تمھیں یہ سب کچھ منظور ہے؟"

"پہلے ذرا اس بات کی تشریح کردو کہ تم درحقیقت چاہتی کیا ہو؟"

"یہ تو فی الحال مَیں بھی نہیں جانتی۔ ویسے اجنبی اجنبی نام کے اس کھیل کا سب سے دِلچسپ حصّہ یہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔"

"لیکن پہلے فرضی نام رکھ لیے جائیں تاکہ ایک دوسرے کو ان ناموں سے مخاطب کرسکیں۔ ٹھہرو، میں سوچتی ہوں کہ ہمارے نام کیا ہونے چاہئیں۔" اتنا کہہ کر وہ سوچنے اور میرا جائزہ لینے لگی "آگیا . . . تمھارا نام میری سمجھ میں آگیا۔ اتنے شان دار جسم کے ساتھ تمھارا نام ہرکولیس ہونا چاہیے۔ منظور ہے، تمھیں؟"

"بشرطیکہ ہرکولیس کی طرح مجھے اصطبل صاف نہ کرنا پڑے۔"

"تم سچ مچ کے ہرکولیس نہیں ہو۔" وہ ہنس کر بولی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ مَیں ہرکولیس ہُوں۔ تم اپنے لیے کون سا کلاسیکی نام پسند کرو گی یا دیومالائی؟"

"دیومالائی . . . میں ڈائنا ہوں۔"

"بہت خوب . . . چاند کی دیوی کا یہ نام تم پر جچتا بھی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم پیراکی کرنا چاہتی ہو یا . . . میرا مطلب ہے میرے کیبن میں کچھ مشروبات اور چکن وغیرہ موجود ہیں۔ اگر کچھ کھانا پینا پسند کرو تو . . ."

"یقیناً . . . مگر پہلے مَیں کچھ سوئمنگ کرنا چاہتی ہوں۔"

پھر وہ ساحلی چٹانوں کا جائزہ لینے لگی "کیا یہاں ہمیں کوئی دیکھ سکتا ہے؟"

"گاؤں کے لوگ احمق اور اسمگلر تو ہیں لیکن اُن میں تاک جھانک کی عادت نہیں ہے۔ میرے ہٹ کے قریب ایک ہٹ میں بوڑھا پروفیسر شیرازی رہتا ہے مگر اُسے اپنی ناک سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

"اگر وہ بوڑھا ہے تو مجھے اس کی پروا نہیں لیکن میں نہیں چاہتی کہ کوئی چھُپ کر میری تصویریں بنالے۔"

"میرا خیال ہے گاؤں میں کسی کے پاس کیمرہ یا دُوربین جیسی چیزیں نہیں ہیں۔" مَیں نے اُسے اطمینان دِلایا اور سوچنے لگا کہ یہ کوئی اداکارہ ہوسکتی ہے یا پھر کسی دولت مند بوڑھے کی بیوی، ورنہ اُسے دیکھے جانے سے اتنا خوف نہ آتا۔ "ویسے تم نے اپنے لیے بالکل صحیح نام منتخب کیا ہے، ڈائنا۔ تم واقعی چاند کی دیوی لگتی ہو۔"

وہ میری مشتاق نِگاہوں کا مفہوم سمجھ گئی اور بولی "جب تم اپنی نِگاہوں کو بھٹکنے سے روک لو تو بتا دینا تاکہ کھیل آگے بڑھایا جائے۔"

مَیں جھینپ کر سمندر کی جانب دیکھنے لگا۔

"ہر کھیل کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اس کھیل کے بھی ہیں۔ میں چاہتی ہُوں کہ تم اس کے ایک اصول پر سختی سے کاربند رہو۔ کھیل کے دوران تم مجھے چھُو نہیں سکتے۔ اگر تمھیں یہ اصول پسند نہ آیا ہو تو ہم کھیل یہیں ختم کردیں گے۔"

مَیں نے مُسکرا کر کہا "مجھے یہ اصول پسند آیا ہے۔ آگے بولو۔"

"تو پھر چلو، پہلے پیراکی سے لُطف اندوز ہولیں۔ دراصل پیراکی میری کمزوری ہے۔"

ہم دونوں سمندر کی طرف چلے گئے۔ جب لہریں ہمارے جسم چھُونے لگیں تو اُس نے مجھ سے کہا "اب تم آگے چلے جاؤ، تاکہ مجھے اندازہ ہوسکے کہ گہرا پانی کتنی دُور ہے۔"

"ٹھیک . . ." مَیں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ چند ہی قدموں کے فاصلے پر پانی گہرا تھا۔ مَیں نے گہرے پانی میں جا کر غوطہ لگایا تو اُس نے بھی خود کو لہروں کے سُپرد کر دیا۔ ہم تیرتے ہوئے ساحل سے تقریباً سو گز دُور نکل آئے تو وہ بولی "فرانس سے واپسی پر آج سے پہلے مَیں نے سمندر میں پیراکی نہیں کی۔ اس لیے آج یہاں سے گزری تو یہ خواہش نہ روک سکی۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ مَیں جل پریوں کی طرح ہر وقت پانی میں ڈُبکیاں لگاتی رہوں۔"

"لیکن تم ڈائنا ہی بہتر ہو . . . جل پریاں تو آدھی عورتیں ہوتی ہیں۔"

وہ کھِل کھِلا اُٹھی اور بولی "مَیں نے تمھیں دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ تم نِرے خوب صورت سراپا والے آدمی ثابت ہوگے مگر تمھاری کھوپڑی بھی خالی نہیں اور تم حسِ لطیف بھی رکھتے ہو . . . اب میں سوچ رہی ہوں کہ ہمیں اجنبی اجنبی کا کھیل شروع نہیں کرنا چاہیے تھا تاکہ ہم ایک دوسرے کے اصلی ناموں سے متعارف ہو سکتے اور یہ تعارف دوستی میں بدل سکتا۔"

"لمحوں کا کھیل بڑا عجیب ہوتا ہے ڈائنا۔ بعض لمحے ملن کی گھڑیاں بن جاتے ہیں اور بعض جُدائی کی۔"

"کیا مطلب، اگر مَیں تم سے رسم و راہ بڑھانا چاہوں تو کیا تم اسے پسند نہیں کروگے؟" اس نے پوچھا۔

"یقیناً پسند کروں گا لیکن وقت مجھے اس کی مہلت دے گا یا نہیں، یہ نہ تو مَیں کہہ سکتا ہوں اور نہ ہی تم کہہ سکتی ہو۔" مَیں نے اُسے یہ جواب اس لیے دیا تھا کہ کل مجھے ماضی کے سفر پر جانا تھا۔ مَیں ماضی کے اندھے اور اندھیرے زمانے سے لوٹ بھی سکوں گا یا نہیں، مجھے معلوم نہیں تھا۔ وہ کچھ کہنے کی بجائے میری طرف دیکھتی رہی تو مَیں نے کہا "اگر تم چاہو تو ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوسکتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی "نہیں ہرکولیس! مَیں لمحوں کے دھارے میں بہہ گئی تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہونا چاہیے۔ بعض اوقات دوستیاں دِلوں کا روگ بن جاتی ہیں۔ مَیں کوئی روگ نہیں پالنا چاہتی لیکن زندگی کے مہربان لمحوں سے اپنے حِصّے کی خوشیاں ضرور وصول کرلینا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر آؤ چلیں۔ کچھ دیر ہٹ میں بیٹھیں گے۔"

"نہیں . . ." اس نے مُسکراتے ہُوئے انکار کر دیا۔

"مَیں نے دیومالا میں ڈائنا کے متعلق کہیں بھی یہ نہیں پڑھا کہ وہ اس قسم کے ستم بھی کیا کرتی تھی۔"

"اوہ . . ." اُس نے قہقہہ لگاتے ہُوئے کہا "مگر ڈائنا بڑے غضب کی عورت تھی کبھی کبھی وہ بے حد ظالم بھی ثابت ہوتی تھی۔ تم نے اُس کے بارے میں یہ کہانی ضرور پڑھی ہوگی کہ ایک بار ایک شخص چھُپ کر اُسے دیکھ رہا تھا تو اُسے اتنا غصّہ آیا کہ اُس نے اُس گستاخ کو جنگلے میں بند کروا کے اُس پر بھُوکے کتے چھوڑ دیے تھے۔"

"میں نے یہ کہانی نہیں پڑھی اور نہ ایسی کہانیاں سُننا پسند کرتا ہوں۔" میں نے قدرے غصّے سے کہا۔

"اوہ... ہرکولیس کو غصّہ آگیا!" اس نے کہا اور ڈُبکی لگا کر مجھے بھی گہرے پانیوں میں لے گئی۔

*

جب وہ میرے ہَٹ سے رُخصت ہُوئی تو مجھے اس کی اسپورٹس کار کی آواز سُنائی دی جو تیزی سے دُور ہوتی چلی گئی اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ کسی اجنبی کی طرح آئی تھی اور کسی اجنبی کی طرح ہی چلی گئی۔ اچھا ہی ہُوا ورنہ لالہ رُخ بھی تو ایک دن میرے لیے اجنبی ہی تھی کہ ہمارا تعارف ہُوا جو دوستی اور پھر محبت میں بدل گیا اور محبت میرے لیے روگ بن گئی۔ یہ سوچیں، مجھے نہ جانے کن کرب آمیز یادوں کے جنگل میں لے جاتیں کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

چیف سکیورٹی آفیسر کا فون تھا۔

اُس نے ڈاکٹر فریدوں کا پیغام دیا کہ کل صبح آٹھ بجے میری روانگی ہے لہٰذا میں وقت پر پہنچ جاؤں۔ وقت پر پہنچنے کا مطلب تھا کہ میں رات ہی کو چل پڑوں۔ علی الصباح گھر پہنچوں، اپنی کار وہیں چھوڑوں اور ٹیکسی پکڑ کر ڈاکٹر فریدوں کے پاس پہنچ جاؤں۔

پہلے جب کبھی میں کسی سفر پر جایا کرتا تھا تو سکیورٹی کا سربراہ رضا ہمدانی، جو مجھے اپنے بیٹے کی طرح چاہتا تھا، مجھ کو ڈاکٹر فریدوں کے پاس چھوڑنے جایا کرتا تھا مگر اب وہ اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اُس نے میرے ساتھ کمپیوٹر ٹاور تک جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میرے خیر مقدم کے لیے تو آ سکتا ہے، لیکن ہر بار جب مجھے الوداع کہتا ہے تو اُسے شدید رُوحانی کرب سے گزرنا پڑتا ہے پھر میرے جانے کے بعد وہ ڈاکٹر فریدوں سے لڑتا رہتا ہے کہ آخر ہر بار مجھے ہی ماضی کے سفر پر کیوں بھیجا جاتا ہے۔ وہ کسی دوسرے آدمی کو کیوں منتخب نہیں کرتا... لیکن فریدوں کے پہلو میں دل نہیں بلکہ کمپیوٹر دھڑکتا ہے۔ اس گنجے اور لنگڑے سائنس داں کو انسانوں سے زیادہ اپنے تجربات عزیز ہیں۔ پہلے میں اپنی کار اور کاغذات وغیرہ رضا ہمدانی کے پاس ہی چھوڑ جایا کرتا تھا مگر اب میں نے کار اپنے گیراج میں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری چیزیں رضا ہمدانی کو میری یاد دلاتی رہتی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اپنے پیاروں سے بچھڑنے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ سڑکیں، وہ راہیں، وہ گلیاں اور وہ مقام جہاں سے کبھی میں اور لالہ رُخ گزرا کرتے تھے، پُرانی یادوں کو اُچھال کر میرے سامنے پھینک دیا کرتے تھے، میرے دل میں اُداسیاں بھر جاتی تھیں۔

میرا خیال ہے کہ ان دنوں میں خود بھی کچھ زیادہ ہو رہا تھا کبھی کبھی تو سوچتا تھا کہ ماضی کا یہ سفر زندگی کا آخری سفر بن جائے تو اچھا ہی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے بہت تھکا دیا ہو۔

*

میں نے کار گیراج میں بند کی۔ سُوٹ کیس الماری میں، ایک نظر لالہ رُخ کی تصویر پر ڈالی اور اپارٹمنٹ سے باہر آگیا۔ مجھے چوراہے سے ٹیکسی پکڑنا تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا آج کل لوگ صبح سویرے اُٹھنے اور اپنے اپنے کام پر جانے لگے میں نے دو ٹیکسیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا مگر وہ بھری ہُوئی نکلیں۔ میں خالی ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک اخبار فروش "ڈائنا ہو گئی... ڈائنا نے شہریار کو چھوڑ دیا" کی آوازیں لگاتا ہُوا قریب سے گزرا تو مجھے وہ لڑکی یاد آ گئی جس نے کل میرے 'اجنبی اجنبی' کھیلا تھا۔ میں مُسکرا دیا اور تیسری ٹیکسی کو رُکنے کیا مگر وہ بھی نہ رُکی، حالانکہ وہ خالی ہی تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ مجھے کمپیوٹر ٹاور مگر ٹیکسی نہیں مل رہی تھی۔ چوتھی اور پانچویں ٹیکسی بھی خالی گئی تو مجھے یاد یہ لوگ مُنہ مانگے کرائے وصول کرنے فاصلے کی سو... اُٹھانے کے لیے مضافات کی طرف ہیں اس لیے شہر کی سواریوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے میں نے نہ صرف ہاتھ اُٹھا کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا بلکہ اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ناچار ٹیکسی کو رُکنا پڑا اور اس کہ ڈرائیور مجھ سے کچھ کہتا، میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے چل پڑی۔

ابھی نصف فاصلہ بھی طے نہیں ہُوا تھا کہ ٹیکسی ہجوم میں پھنس گئی۔ میری نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف تھیں کیوں کہ ڈاکٹر فریدوں وقت کی کڑی پابندی کیا کرتا نے جھنجلا کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا: "میں سرکاری افسر ہوں ایک بے حد اہم سرکاری کام ہے اس لیے کسی طرح"

"ٹیکسی تو صرف اُسی صورت نکل سکتی ہے جناب اس میں پَر لگا دیے جائیں۔"

مجھے ٹیکسی ڈرائیور کی بات پر غصّہ تو بہت آیا

تو نہیں سکتا تھا۔ اتنے میں ایک اخبار فروش پھر آواز لگاتا ہُوا گزرا۔ "ڈائنا فرار ہو گئی!"

میں نے محض ڈائنا کے نام کی وجہ سے اخبار لے لیا۔

... اور جب اخبار کھولا تو اس سُرخی کے ساتھ ہی ڈائنا کی ایک بہت بڑی تصویر بھی نظر آگئی۔ بلاشبہ یہ وہی ڈائنا تھی جس نے کل میرے ساتھ "اجنبی اجنبی" کھیلا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اُس نے مجھے اپنا اصلی نام ہی بتایا تھا۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ تھے:

"اداکارہ ڈائنا جو پچھلے دنوں اپنی فلم 'اجنبی اجنبی' کی شوٹنگ کے لیے فرانس گئی تھی۔"

مجھے یاد آگیا، اس نے کہا تھا کہ جب سے فرانس سے واپس آئی ہوں، میں نے سیر ہی نہیں کی اور یہاں سے گزری تو میرا جی سیر کو للچا گیا... پھر وہ مجھے اس وقت صورت آشنا بھی لگی تھی۔ میں فلمیں نہیں دیکھتا لیکن شاید اخباروں ہی میں اس کی تصاویر دیکھ چُکا تھا اور غالباً وہ بار بار اسی لیے پوچھ رہی تھی کہ اُسے کوئی دیکھ تو نہیں لے گا یا کوئی اس کی تصویر تو نہیں بنا لے گا۔ اُس وقت تو وہ اسکینڈل سے ڈر رہی تھی مگر فرار کی خبر تو کسی اسکینڈل سے بھی بڑی ہوتی ہے۔

معاً ٹیکسی منجمد ٹریفک میں راستہ پا کر رینگنے لگی۔ میں اخبار دیکھنے لگا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ ڈائنا ایک آرمینی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ یورپ میں تعلیم حاصل کر چُکی ہے بلکہ اس کی زندگی کا بیشتر وقت یورپ ہی میں گزرا ہے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد جب وہ واپس آئی تو اُس نے فلموں میں کام شروع کر دیا۔ پہلی فلم کی ریلیز کے بعد ہی شاہ کا ایک عزیز شہریار اس کی زلفوں کا اسیر ہو گیا اور اُس نے ڈائنا سے شادی کر لی۔ شہریار ایک جج کے عہدے پر فائز تھا اور عرفِ عام میں لوگ اُسے "جلّاد" کے نام سے پکارتے تھے کیوں کہ اُس کی عدالت میں پیش کیے جانے والے نوّے فی صد ملزم پھانسی کی سزا پاتے تھے۔ یہ بات بھی قابلِ غور تھی کہ جج شہریار کی عدالت میں سیاسی ملزم پیش کیے جاتے تھے اور فیصلہ سُناتے وقت وہ ہمیشہ ایک سیاہ رُومال سے کھیلتا رہتا تھا۔ جب وہ پھانسی کا حُکم سُناتا تو رُومال کو ایک جھٹکے سے گانٹھ لگا لیا کرتا تھا اور غالباً اسی بنا پر "جلّاد جج" کہلاتا تھا۔ یہ ساری باتیں آف دی ریکارڈ تھیں اور غیر ملکی اخبارات کے ذریعے منظرِ عام پر آئی تھیں۔ ان اخبارات کو ہمارے ہاں ضبط کر لیا گیا تھا۔

ڈائنا کے متعلق اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اُس نے دولت کمانے کے لیے فلم انڈسٹری میں شمولیت اختیار نہیں کی بلکہ یہ اُس کا شوق تھا۔ ڈائنا کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال تھی جب کہ اُس کا شوہر شہریار پچاس سال سے زیادہ کا تھا۔ جب کبھی ڈائنا کا جی چاہتا، وہ چُپکے سے اپنی چیک بکس اور پاسپورٹ اُٹھاتی اور ملک سے باہر چلی جاتی تھی۔ کچھ دنوں بعد ہی پتہ چلتا کہ وہ رُوم، ہانگ کانگ، سنگاپور یا نیویارک پہنچ گئی ہے۔

مجھے اس بات پر بے حد تعجب ہُوا کہ آخر ڈائنا نے اُس جلّاد جج سے شادی ہی کیوں کی تھی؟ تب مجھے خیال آیا کہ اُس نے یہ شادی اپنی خوشی سے نہیں کی ہو گی بلکہ اس پر اور اُس کے خاندان پر دباؤ ڈالا گیا ہو گا۔

اخبار میں جلّاد جج کی تصویر بھی شائع ہُوئی تھی۔ عقابی ناک اور چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں والا شہریار صُورت سے ہی بے حد ظالم معلوم ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں پابہ زنجیر اُس کی عدالت میں کھڑا ہُوں اور وہ سیاہ رُومال ہاتھ میں لیے اپنا فیصلہ سُنا رہا ہے:

"تم نے میری بیوی کو اپنی وجاہت کے ذریعے ورغلایا اور اُسے مُجھ سے بے وفائی پر اُکسایا۔ یہ جھُوٹ ہے کہ اُس نے تم سے 'اجنبی اجنبی' کھیلنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ بھی جھُوٹ ہے کہ تم میری بیوی کو نہیں پہچانتے تھے۔ وہ ایک مشہور اداکارہ ہے، اور لوگ اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیتے ہیں۔ تم بھی اُسے پہچان گئے تھے مگر انجان اور اجنبی بنے رہے۔ چونکہ تم پر سارے الزامات ثابت ہو چُکے ہیں اور تم نے یہ جُرائم عمداً کیے تھے اس لیے میں تمھیں پھانسی کی سزا دیتا ہُوں۔"

یہ کہتے ہُوئے اُس نے رُومال کو گانٹھ لگائی اور اس کے ساتھ ہی ٹیکسی ڈرائیور نے میرا شانہ ہلا کر مجھے خیالوں کی دُنیا سے چونکا دیا۔

"آپ کی منزل تو کب کی آ چُکی ہے جناب... مگر آپ پُورے پانچ منٹ سے خیالوں کی دُنیا میں سرکاری کام انجام دیئے جا رہے ہیں۔"

میں نے ڈرائیور کا طنز نظر انداز کرتے ہُوئے کرایہ ادا کیا اور کمپیوٹر ٹاور کی طرف چل دیا جو بظاہر ایک چار دیواری میں گھرا ہُوا احاطہ ہی نظر آتا تھا۔

میں آپ کو یہ بتانا تو بھُول ہی گیا کہ ڈاکٹر فریدوں نے اپنی لیبارٹریز اور کمپیوٹر چیمبرز نئے مقام پر منتقل کر دیئے تھے...

اور اب اس کا ماسٹر کمپیوٹر دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے کمپیوٹرز سے بقول اس کے گیارہ پشتیں آگے تھا۔

کمپیوٹر ٹاور کے گیٹ پر گارڈز نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا اور شناخت کا مرحلہ شروع ہوگیا۔ گیٹ پر صرف شناختی کارڈ چیک کیا جاتا تھا اور صرف اسی کارڈ کے ذریعے گیٹ میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ یہاں سے گارڈز نے مجھے ایک جیپ میں بٹھایا اور دو فرلانگ دُور دوسری چیک پوسٹ پر متعین گارڈز کے حوالے کردیا۔

اس مرحلے پر مجھ سے کچھ کوڈ ورڈز بھی پُوچھے گئے جن میں میرا اپنا خصوصی کوڈ نمبر بھی شامل تھا جسے میں نے بُوتھ میں ایک ٹیلی فون پر دُہرایا تھا۔ کمپیوٹر نے میری آواز کی لہروں سے تصدیق کرکے آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ اسی قسم کے تین مزید مرحلوں سے گزرنے کے بعد میں لفٹ تک پہنچ گیا لیکن اب جو میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پتہ چلا کہ میں نصف گھنٹے کی تاخیر سے یہاں پہنچا ہوں۔

لفٹ تیزی سے زمین دوز سُرنگ میں اُترتی چلی گئی... اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مجھے اُبکائیاں آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر فریدوں مجھے تاخیر سے آنے کی سزا دے رہا ہے۔ جب خُدا خُدا کرکے لفٹ رُکی، دروازہ کُھلا اور میں باہر آیا تو ڈاکٹر فریدوں کا خشمگیں چہرہ میرے سامنے تھا۔ میں نے جلدی جلدی تاخیر کی وجہ بتا دی کہ قصور میرا نہیں کیوں کہ ٹریفک جام ہوگیا تھا۔

"یہ ساری باتیں تمھیں پہلے سے مدِنظر رکھنی چاہیے تھیں، برخوردار... میں کمپیوٹر سیٹ کرچکا تھا مگر چونکہ تم اس کے طریقۂ کار سے واقف نہیں، اس لیے میری اُلجھنیں نہیں سمجھ سکتے۔ اب روانگی کے سائیکل پر آنے کے لیے ہمیں تقریباً نصف گھنٹہ مزید انتظار کرنا پڑے گا اور مجھے سیٹنگ بھی نئے سرے سے کرنا پڑے گی۔ خیر... آؤ میرے ساتھ۔"

زرد رُو، گنجا اور پولیو کا مارا ڈاکٹر فریدوں کسی کیکڑے کی طرح میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ہم ایک طویل راہ داری طے کرکے ہینل کے بند دروازے پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر فریدوں نے اپنا دایاں ہاتھ اُس دروازے پر رکھ دیا اور مجھے بھی دایاں ہاتھ اُس پر رکھنے کی ہدایت کی۔

چند لمحوں بعد ہم نے ہاتھ ہٹا لیے تو ڈاکٹر فریدوں بولا۔ "کمپیوٹر ہمارے ہاتھوں کی لکیریں چیک کرے گا تب یہ دروازہ کُھلے گا۔ سکیورٹی کا یہ نیا نظام اس لیے تیار کیا گیا ہے تاکہ پھر کوئی ڈپلی کیٹ ہمیں دھوکا دے کر کمپیوٹر چیمبر میں داخل نہ ہوسکے۔"

کمپیوٹر نے شاید ہمارے ہاتھوں کی لکیریں چیک کرلی تھیں اس لیے خفیہ اسپیکر پر ایک مشینی آواز آئی۔ "لکیریں ٹھیک ہیں۔"

یہ سُن کر ڈاکٹر فریدوں نے دروازے کے گول ہینڈل سے نمبر سیٹ کیے تو دروازہ کُھل گیا۔

اب ہم ایک اور راہ داری سے گزر رہے تھے، جس کے اختتام پر بند دروازے میں ایک کیمرہ نصب تھا۔ ہمیں باری بار اس کیمرے کے سامنے کھڑا ہونا پڑا۔ ڈاکٹر فریدوں بولا۔ "کمپیوٹر ہمارے دماغوں کے ایکسرے چیک کرے گا۔ کیا خیال ہے، سرفروش! اس حفاظتی نظام کے باوجود کوئی ہمیں دھوکا دے سکتا ہے؟ کوئی دوسرا ڈپلی کیٹ کمپیوٹر چیمبر تک پہنچ سکتا ہے؟"

"بظاہر تو ایسا معلوم نہیں ہوتا جناب۔" میں نے جواب دیا۔

اتنے میں کمپیوٹر نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دروازہ کُھلا اور ہم کمپیوٹر چیمبر کی انیکسی میں داخل ہوگئے جس میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر کام کر رہے تھے اور ہال میں شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی۔

ہم ماسٹر کمپیوٹر والے کمرے میں آگئے، جہاں ڈاکٹر فریدوں نے میرے پُورے جسم پر مرہم جیسی کوئی دوا مَل دی اور پھر کمپیوٹر سیٹ کرنے لگا جس کے پورٹ ہولز سے لال، پیلی، ہری، اور نہ جانے کتنے رنگوں کی تاریں جھانک رہی تھیں۔

میں کمپیوٹر چیمبر کی ربر مولڈ والی کُرسی پر بیٹھ گیا جو ہمیشہ مجھے موت کی سزا والی الیکٹرک چیئر کی یاد دِلایا کرتی تھی۔

"اس بار میں نے کمپیوٹر میں بڑی اہم تبدیلیاں کی ہیں، سرفروش! اس لیے تمھیں تیس کی بجائے چالیس الیکٹروڈ لگانے پڑیں گے۔ کیا تم رضا ہمدانی سے ملے تھے؟" ڈاکٹر فریدوں نے پُوچھا۔

"نہیں جناب۔" میں نے بتایا۔ "البتہ فون پر ضرور بات ہُوئی تھی۔"

"کیا اُس نے تمھیں بتایا ہے کہ ہم کسی اور آدمی کی تلاش میں ہیں جو تمھاری جگہ لے سکے؟"

"انھوں نے ذکر تو کیا تھا مگر تفصیل نہیں بتائی تھی۔"

"کمپیوٹر نے ہزارہا کارڈز میں سے بیس کارڈ منتخب کیے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان بیس آدمیوں میں سے کوئی تم جیسی ذہنی اور جسمانی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ رضا کا اصرار ہے کہ تمھاری جگہ کوئی دوسرا آدمی لایا جائے حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم ہی اس کام کے لیے بہترین آدمی ہو۔ تمہارا

کافی تجربہ بھی ہوچکا ہے اور تمھاری صحت پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا۔"

میں نے ڈاکٹر فریدوں کو کوئی جواب نہیں دیا۔ بقول رضا ہمدانی اُس کے پہلو میں دل نہیں بلکہ کمپیوٹر دھڑکتا تھا۔ وہ کمپیوٹر سیٹ کرنے کے بعد میرے اعضا کے ساتھ الیکٹروڈز باندھنے لگا۔ جب وہ سارے الیکٹروڈز باندھ چکا تو بولا۔ "میں نے اپنی تیاریاں مکمل کرلی ہیں تمھیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

"نہیں جناب!" میں نے بے خوفی سے کہا۔ "اوکھلی میں سر دے کر مُوسلوں سے ڈرنا بے معنی ہوتا ہے۔"

یہ سُن کر وہ سُوئچ بورڈ کے قریب چلا گیا۔ کمپیوٹر نے روانگی کے سگنل دینا شروع کردیئے اور بالآخر ڈاکٹر فریدوں نے سُرخ رنگ کا ایک سُوئچ دبا دیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرا پُورا وجود بھک سے اُڑ گیا ہو۔ اُس کے پرخچے اُڑ گئے ہوں۔ یہ ٹکڑے آگ، دُھوئیں اور شعلوں کے ایک سمندر میں چکرا رہے ہوں۔ ہر طرف بادلوں کی سی گرج اور بجلی کے کڑاکوں کا شور برپا ہے اور میرے ذہن میں انگارے ہی انگارے بھر گئے ہیں... پھر مجھے ہوش نہ رہا جیسے میں مرگیا...

*

... لیکن میں مرا نہیں تھا بلکہ بے سُدھ اور بے ہوش ہوگیا تھا۔ مگر جب ہوش آیا تو بھی میں نے اپنے آپ کو بھڑکتے ہُوئے شعلوں اور دُھوئیں کے بادلوں ہی میں گھرے پایا... اور دُھوئیں کے اس پار نہ جانے کہاں سے شور وغوغا، کڑاکوں، چیخوں، نعروں، قہقہوں اور دھماکوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میں سوچا کہ کیا میں ابھی تک کمپیوٹر کے مرحلے سے گزر رہا ہوں، کیا ابھی اُس نے مجھے ماضی کے اندھے زمانوں میں منتقل نہیں کیا ہے۔ کیا میرے سالمے یکجا نہیں ہو پائے؟ لیکن جب میں نے اپنا جسم ٹٹولا تو پتہ چلا کہ میرا ذرّہ ذرّہ ہوجانے والا وجود دوبارہ تجسیم اختیار کرچکا ہے... مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ میں تجسیم اختیار کرچکا ہُوں تو میرے ہر طرف آگ اور دُھواں کیوں پھیلا ہُوا ہے؟ انگارے کیوں برس رہے ہیں؟ یہ شور وغوغا کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں۔

میں جہاں لیٹا ہُوا تھا، وہ زمین بُری طرح تپ رہی تھی۔ میں نے زمین چھُو کر دیکھی وہ زمین نہیں بلکہ پتھر کا فرش تھا... میں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا تو مجھے ایک گنبد سا دکھائی دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ کوئی معبد ہے... لیکن یہ آگ اور دُھواں کیسا تھا؟ کیا کمپیوٹر نے اس بار مجھے کسی جلتے ہُوئے معبد میں منتقل کردیا ہے؟

میں نے ایک بار پھر اُوپر نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ گنبد چوبی تھا اور اب اُس کے شہتیروں اور تختوں نے آگ پکڑ لی تھی۔

دُھوئیں سے میرا دم گُھٹنے لگا۔ مجھے کوئی راہِ فرار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اتنے میں ایک کڑاکا ہُوا اور چوبی گنبد کا ایک حصّہ ٹوٹ گیا... کسی بھی لمحے اُس کے جلتے ہُوئے تختے اور شہتیر بھی گرنے والے تھے میں لوٹیں لگاتا ہُوا ایک طرف ہٹنے لگا۔

اچانک میں کسی انسانی جسم سے ٹکرایا۔

وہ کون تھا... یا تھی، مجھے فوراً ہی معلوم نہ ہوسکا کیونکہ اب تختے گرنے شروع ہوگئے تھے۔ میں نے دوسری اور پھر تیسری لوٹ لگائی تو مزید دو لاشوں کے اُوپر سے گزر گیا۔

عین اُس وقت ایک دھماکے کے ساتھ گنبد کا شہتیر نیچے آرہا۔

اُس کے گرنے سے دُھوئیں میں شعلوں کی زبانیں لپکنے لگیں اور ہر طرف انگارے ہی انگارے پھیل گئے... مگر میں اُن لاشوں کی وجہ سے بچ گیا۔ دُھوئیں میں لپکنے والے شعلوں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ دو مردوں اور ایک عورت کی لاشیں تھیں۔

ابھی میں اس دہکتے ہُوئے جہنم سے نکلنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کسی عورت کی چیخ سُنائی دی۔ مگر میرے چاروں طرف تو دُھواں ہی دُھواں پھیلا ہُوا تھا اور باہر سے بھی چیخنے چلّانے، بین کرنے اور قہقہوں کے ساتھ ساتھ تلواریں ٹکرانے کی ہلکی ہلکی جھنکاریں بھی سُنائی دے رہی تھیں اس لیے میں اُس چیخ کی سمت کا تعین نہ کرسکا۔ اتنے میں میری سماعت سے پھر اُسی عورت کی چیخ ٹکرائی۔

یہ آواز بائیں طرف سے آئی تھی... مگر بیچ میں دُھوئیں کی گہری چادر حائل تھی۔ اس لیے اُس کے پار کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ مجھے ایک مرد کی لاش کے پاس اُس کی تلوار ضرور نظر آگئی۔

میں نے لپک کر وہ تلوار اُٹھالی کہ ذاتی تحفظ کے لیے مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت تھی۔

عورت کی چیخ تیسری بار اُبھری اور اُس کے ساتھ ہی یہ الفاظ بھی سُنائی دیے۔ "المدد اے مُونا... المدد... مجھے

بچالو دیوی ... مجھے بچالو "

اس بار میں نے آواز کی صحیح سمت کا تعین کر لیا تھا۔ چنانچہ میں بے دھڑک دھوئیں کی چادر چیرتا ہُوا اُدھر لپکا اور جو منظر میں نے دیکھا، اُس نے میری رگ رگ میں چنگاریاں سی بھر دیں ... ایک ہٹا کٹا سپاہی ایک نازک اندام لڑکی کو اپنے ستم کا نشانہ بنانے والا تھا۔ لڑکی اب تک مزاحمت کیے جا رہی تھی مگر اس مزاحمت میں نہ صرف اُس کا لباس تار تار ہو چکا تھا بلکہ وہ زخمی بھی ہو گئی تھی۔

جونہی اُس بدبخت سپاہی نے لڑکی کو فرش پر گرایا میں نے فرطِ غیظ میں اتنے زور سے اُس کی پُشت میں تلوار گھونپی کہ وہ آر پار ہو گئی ... میں نے ایک ٹھوکر مار کر اُسے فرش پر گرایا اور تلوار نکال کر لڑکی کی طرف پلٹا ... مگر اتنی دیر میں لڑکی اپنے دل میں خنجر اُتار چکی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا لڑکی؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

وہ مُنہ سے خون اُگلتے ہُوئے بولی: "مجھے ... ایسا ہی .. کرنا چاہیے تھا ... جب ... جب مونا نے مجھ سے مُنہ موڑ لیا ... تو میں کیا کرتی؟ ... پھر ... بوتھان میں ... موت کے سوا ... رہ ہی کیا گیا ہے؟" اتنا کہہ کر لڑکی نے آخری ہچکی لی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ وہ جو میرے کام آتی، مجھے اس جگہ کے متعلق معلومات فراہم کرتی، اپنے سینے میں خنجر اُتار کر مر گئی بہرحال مجھے یہاں اس نئی سرزمین پر کسی نہ کسی طرح حالات کا مقابلہ تو کرنا ہی تھا اس لیے میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے میں نے اُس ہٹے کٹے سپاہی کی وردی خود پہن لی جو ایک اُونی پتلون اور چمڑے کی جیکٹ پر مشتمل تھی اس کا خُود سُرخ رنگ کا تھا۔ وردی یا خود پر اُس کا عہدہ ظاہر کرنے والا کوئی نشان نہیں تھا۔ شاید وہ عام سپاہی تھا۔ اس کی وردی اگرچہ میری جسامت سے بہت چھوٹی تھی مگر سترپوشی کا کچھ سامان تو ہو ہی گیا تھا۔

ابھی میں وردی پہن کر فارغ ہُوا ہی تھا کہ گنبد کا ایک اور حصّہ گرا۔ ہر طرف آگ اور انگارے پھیل گئے۔

میں نے اُوپر دیکھا۔

جن دیواروں پر وہ چوبی گنبد تعمیر کیا گیا تھا، اُن میں سے ایک اندر کو جھک گئی تھی اور کسی بھی لمحے گرنے والی تھی یہ دیکھ کر میں ناک کی سیدھ میں بھاگتا چلا گیا۔ مجھے دھوئیں میں بھی گھسنا

پڑا اور شعلے بھی پھلانگنا پڑے مگر میں نے معبد سے نکلنے میں دیر نہیں کی اور جونہی باہر پہنچا، ایک زبردست دھماکے نے مجھے بتا دیا کہ وہ دیوار گر چکی ہے اور دوسری دیواریں بھی گرنے ہی والی ہیں۔

اسے کہتے ہیں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ میں ڈاکٹر فریدوں کو وہی میٹھی سی بددعا دی کہ خدا کرے وہ حسینہ کے عشق میں مُبتلا ہو جائے جس نے مجھے اس میدان میں منتقل کرایا تھا۔ اب مجھے تلواروں اور ڈھالوں کے ٹکرانے کی آوازیں واضح سُنائی دے رہی تھیں۔ زخمیوں کی چیخ و پکار اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ صاف بتا رہی تھی کہ معرکۂ جنگ وہ کہیں قریب ہی جاری ہے۔

اُس لڑکی نے سچ ہی کہا تھا کہ بوتھان مر رہا ہے بوتھان شہر تھا، صوبہ یا ملک ... جو بھی اس کی حیثیت تھی اُس سے تو میں اب تک واقف نہیں تھا لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں چپّے چپّے پر موت رقص کر رہی ہے۔ ہر طرف آہ و بکا کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور ہنستے بستے گھروں سے دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ نہ عفتوں کی تقدیس باقی رہی ہے اور معبدوں کی حُرمت کا احساس باقی رہا ہے۔

ایک دھماکا اور ہُوا۔

معبد کی کچھ اور دیواریں گر گئی تھیں ... یا کسی دوسرے حصّے کی چھت گر پڑی تھی۔ میں نے وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی اور ایک گلی میں گھس گیا۔

گلی میں بھی جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے ایک لاش کے پاس پڑی چھوٹی سی ڈھال اُٹھائی اور اُسے بائیں بازو پر لٹکا لیا۔ اس ڈھال پر ایک ایسے سانپ کی تصویر کندہ تھی جس نے اپنی دُم اپنے مُنہ میں دبا رکھی تھی جیسے وہ اپنے آپ کو کھا رہا ہو۔

یہ گلی آگے جا کر تنگ تر اور پُر پیچ ہوتی چلی گئی۔ اس کے دونوں طرف بنے ہُوئے چھوٹے چھوٹے مکانات کی چھتیں گھاس پھونس کی بنی ہُوئی تھیں اور بعض چھتیں جلنے بھی لگی تھیں ... لیکن اُن کی آگ بجھانے کو وہاں کوئی بھی نہیں تھا ... یا تو اُن کے مکین موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے تھے یا پھر وہ وہاں سے فرار ہو چکے تھے۔

اس گلی سے گزرتے ہُوئے اچانک مجھے شدّت سے پیاس محسوس ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ میں بھوکے پیٹ بھی ہُوں۔ میں تیز تیز چلنے لگا تاکہ کسی طرح، کہیں سے اپنے لیے کھانے پینے کا بندوبست کر سکوں۔

یہ گلی مجھے ایک چوراہے پر لے آئی۔

چوراہا بالکل خالی پڑا تھا۔ اس کے اردگرد مکان .. اور دُکانیں تھیں اور مرکز میں ایک چھوٹا سا فوارہ چل رہا تھا۔ میں نے اپنی توجہ اس فوارے پر مرکوز کر دی کہ مجھے اپنی زبان خشک چمڑے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ معبد کی آگ نے میرے ہونٹوں پر پیپڑیاں سی جما دی تھیں۔

میں فوارے کے قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ ایک حسین و جمیل عورت کا مجسمہ ہے جس نے ایک صراحی اُٹھا رکھی تھی اور پانی کی دھار اُسی صراحی سے اُبل رہی ہے۔

فوارے کا پانی بے حد خنک اور شیریں تھا۔ میں نے پیاس بجھائی اور پھر تلوار سے اُس خاتونِ سنگ کو سلام کیا جس نے میری تشنگی دُور کی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سر سے کر پاؤں تک اُس خوب صورت مجسّمے کا جائزہ لیا تو بُری طرح چونک گیا۔ مجسّمے کے چبوترے پر لفظ "مُونا" کندہ تھا۔

اس لفظ "مُونا" کے ساتھ ہی مجھے وہ لڑکی اور اُس کے آخری الفاظ یاد آ گئے "کہ مُونا نے مجھ سے مُنہ موڑ لیا ہے .... تو مُونا اس شہر یا ملک بوتھان کی دیوی تھی۔

ابھی میں دیوی کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ مجھے ہتھیاربند عسکریوں کے چلنے کی آواز سُنائی دی۔ تعجّب کی بات یہ تھی کہ آواز زمین کے اندر سے آ رہی تھی۔ عین اس جگہ کے نیچے سے جہاں میں کھڑا تھا۔

خداوندا! ... یہ کیا ماجرا ہے؟

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے فوارے کی دوسری جانب گلی کے فرش میں ایک بڑا سا سُوراخ دکھائی دیا یا تو یہ کسی گٹر نما چشمے کا سُوراخ تھا یا پھر زیرِ زمین راستے کا دہانہ ... اب آواز اُسی سُوراخ سے آنے لگی تھی۔

میں فوراً وہاں سے ہٹ کر ایک اندھیرے گوشے میں چھپ گیا اور سوچنے لگا کہ آنے والے میرے دوست ہو سکتے ہیں یا دُشمن ... ؟ مجھے اپنی اس سوچ پر ہنسی آ گئی۔ اس وقت تو اس شہر یا ملک کا ہر آدمی میرا دُشمن ہی ہو سکتا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اُس سُوراخ سے سپاہی باہر آنے لگے۔ اُن کی وردیاں اور خُود ویسے ہی تھے جیسا میں نے پہن رکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میرے دوست ہو سکتے تھے ... پھر بھی میں اُن پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

سُوراخ سے برآمد ہونے والا پہلا آدمی شاید کوئی عہدے دار تھا کیوں کہ اُس کا خود دوسروں سے مختلف تھا۔ چاندنی میں اُس کی ڈھال پر بنی ہُوئی مُونا دیوی کی شبیہہ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بوتھان کے سپاہی ہیں اور اپنے دُشمنوں سے شکست کھا چکے ہیں۔ اُن کا یہ چوتھائی شہر اس وقت جل رہا تھا جب کہ دُوسرے حصّوں کی بہ نسبت یہ علاقہ اب تک محفوظ تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے سپاہی باہر آ گئے۔ ان میں کچھ شمشیر زن تھے، کچھ نیزہ باز اور کچھ تیر انداز تھے۔ وہ افسر اُنھیں صف آرا کرنے لگا۔ ان سپاہیوں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مزید لڑ سکتے ان میں سے بیشتر زخمی تھے اور کئی ایک کے پٹیاں بندھی ہُوئی تھیں۔ اُنھیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اُنھوں نے بڑی خوں ریز جنگ لڑی تھی۔

جب آخری سپاہی بھی صف آرا ہو گیا تو افسر نے اپنی تلوار بُلند کرتے ہُوئے اُنھیں مخاطب کیا۔

"بوتھان کے جانبازو! میں تمھاری عظمت اور بہادری کو سلام کرتا ہُوں۔ تم نے جس پامردی سے دُشمنوں کا مقابلہ کیا ہے، وہ قابلِ داد ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز بھی ہے کیوں کہ دُشمن تم سے تعداد میں کئی گنا زیادہ تھے۔ اب تم آرام کے حق دار ہو۔"

یکایک ایک سپاہی بول پڑا: "پھر تم ہمیں آرام کیوں نہیں کرنے دیتے کماندار ہاشم! ہمیں آرام کی نہیں، زندگی کی بھی ضرورت ہے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں یہ مُردہ شہر چھوڑ کر دلدلی راستے سے ساحل پر پہنچنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، اس طرح ہم میں سے کچھ لوگ ردمو پہنچ جائیں۔ تب ہم دوبارہ شبتانیوں سے لڑ سکیں گے۔ اب ہمیں جنگ کا ایندھن نہ بناؤ کیوں کہ ہم بوتھان ہار چکے ہیں۔ بوتھان مر چکا ہے۔"

سپاہی کی بات ختم ہونے کے بعد بھی چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

یہ خاموشی اتنی گمبھیر تھی کہ ہوا کی سنسناہٹ بھی صاف سُنائی دے رہی تھی۔

کماندار نے تلوار سے اس سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیزہ بازوں سے کہا۔ "اس آدمی کو میرے پاس لے آؤ۔"

نیزہ باز اُس کے حکم کی تعمیل کرنے میں ہچکچائے تو وہ ہوا میں تلوار چلاتے ہوئے گرج اُٹھا۔ "اسے فوراً پکڑ کر میرے سامنے لاؤ، ورنہ تمھارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے گا جو..."

نیزہ باز آگے بڑھے اور اُس سپاہی کو پکڑ کر کماندار کے سامنے لے گئے۔

اُس سپاہی نے اب بھی ہمت نہ ہاری اور کماندار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "کماندار ہاشم! تم احمق ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم بوتھان میں جنگ ہار چکے ہیں۔ شہر ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ مُونا کو ہماری کوئی پروا نہیں۔ وہ اب بھی اپنے پجاریوں کے ساتھ ہے اور یہاں سے ساحل کو فرار ہونے کی تیاریاں کر رہی ہے تو پھر ہم یہاں کیوں ٹھہریں۔ یہاں کیوں مریں؟ ... اب ہماری موت بے مقصد اور بے جواز ہوگی۔"

کماندار نے غصّے میں اُسے اُلٹا طمانچہ مارتے ہوئے جواب دیا۔ "تمھاری بکواس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم بزدل، غدار اور دُشمنوں کے جاسوس ہو۔ تمھیں دفاعِ وطن سے کوئی دل چسپی نہیں اور تم طراق کے تنخواہ دار ہو... یہ تم یا تم جیسے غدار ہی تھے جنھوں نے شبستانیوں پر گندے پانی کی نکاسی والے دروازے کھول کر انھیں اس وقت شہر میں بلا لیا تھا، جب ہم سو رہے تھے۔ تم جیسے غداروں کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔"

"یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے مجھ پر... میرے ساتھیوں سے پوچھو کماندار کہ میں اوّل تا آخر اُن کے ساتھ تھا یا نہیں۔ میں دفاعِ وطن کے لیے کیسا جی جان سے لڑا ہوں، میرے دوست اس کے عینی شاہد ہیں لیکن تم ہمیں ہاری ہوئی جنگ میں خواہ مخواہ ایندھن بنانا چاہتے ہو جو حماقت نہیں بلکہ پاگل پن ہے۔ شکست کے بعد ہزیمت خوردہ سپاہیوں کی جانیں بچانا اور کامیابی سے پیچھے ہٹ جانا بھی جنگی حکمتِ عملی ہوتی ہے جس سے تم ناواقف ہو۔" سپاہی نے شدید احتجاج کیا۔

چونکہ میں فوج میں رہ چکا تھا اور جانتا تھا کہ یہ آدمی اگرچہ سچ بول رہا ہے مگر ضابطے کی خلاف ورزی کر رہا ہے اس لیے فوجی قواعد کے تحت سزا کا مستوجب ٹھہرے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کماندار نے نیزہ بازوں کو حکم دیا۔ "اس کی مُشکیں کس کر اسے گھٹنوں کے بل بٹھا دو۔"

کماندار کے حکم کی فوری تعمیل کی گئی... اُس کی تلوار چاندنی میں چمکی اور دوسرے ہی لمحے اُس بہادر سپاہی کا سر تن سے جُدا ہو گیا۔

"ہر غدار کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا۔ یہ بُزدل جھوٹ کہتا تھا کہ بوتھان مر چکا ہے... بوتھان مرا نہیں بلکہ صرف زخمی ہوا ہے۔ دُشمن نے وقتی طور پر اُسے تباہ کیا ہے اور آگ لگائی ہے لیکن بوتھان اسی جگہ، اپنے کھنڈروں پر نئی شان و شوکت سے اُبھرے گا... یہ تخریب اس کی تعمیرِ نو ثابت ہوگی۔" کماندار دوسرے سپاہیوں سے بولا۔

کماندار کے ان الفاظ میں آواز تو تھی لیکن وہ الفاظ بے رُوح اور بے معنی لگتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سپاہیوں ہی کو نہیں بلکہ خود کو بھی جھوٹی تسلی دے رہا ہو۔

سپاہیوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی۔

میں نے سوچا کہ مجھے بھی چپکے سے ان سپاہیوں میں شامل ہو جانا چاہیے۔ یوں تنہا اور الگ تھلگ رہنے میں خطرہ بھی ہے اور مجھے اس نئی سرزمین کے بارے میں معلومات بھی حاصل نہیں ہو سکیں گی لیکن میں ان سپاہیوں کے ساتھ بوتھان میں مرنا نہیں چاہتا تھا جو اُن کے کمان دار کی خواہش تھی۔

یکایک ایک گلی سے گھوڑے کی ٹاپیں اُبھریں۔

سب کی نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں۔

آنے والا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے سر پر خود نہیں تھا اور چاندنی جیسے سفید بال چاندنی میں چمک رہے تھے۔ اُس کی وردی خون آلود تھی۔ اُسے دیکھتے ہی کمان دار اور سپاہی چوکنا ہو گئے۔ کمان دار نے سپاہیوں کو چوکس ہونے کا حکم دیا اور آنے والے کو سلام کرنے کے بعد بولا۔ "جنگ کا کیا حال ہے جناب؟"

"دُشمنوں کا پلّہ بھاری رہا، ہاشم! ہم ہر محاذ پر جنگ ہار چکے ہیں اور اس وقت طراق اپنے محل میں بیٹھا ہماری دوشیزاؤں کو رقص پر مجبور کر رہا ہے... وہ عورتیں جن کے دل اپنے وطن اور اپنے پیاروں کی موت پر ماتم کر رہے ہیں، طراق کے فاتح پیاروں کے لیے گیت گا رہی ہیں۔ اُن کی عصمتیں اور مال و متاع لُوٹا جا رہا ہے... یہ بتاؤ کہ اس وقت تمھارے پاس کتنی نفری ہے؟"

یہ باتیں بتانے والا کوئی بڑا افسر یا جرنیل تھا اور اُس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میرے پاس تقریباً تین سو کی نفری ہے، جناب!" کمان دار نے جواب دیا۔ "آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ میرے جوان کتنی بے جگری سے لڑے ہیں اور اب بھی لڑنے مرنے کے لیے تیار ہیں۔"

بوڑھے افسر نے ایک نظر سپاہیوں کی صفوں پر ڈالی اور پھر اُس کی نگاہ اُس سر بریدہ سپاہی کی لاش پر ٹِک گئی جس کا دھڑ صفوں کے سامنے پڑا تھا۔

"یہ کس کی لاش ہے؟ اور اس کا قصور کیا تھا؟" اس نے سوال کیا۔

کمان دار نے اُس کے بارے میں وضاحت کی تو مجھے بوڑھے افسر کے چہرے پر ترحم اور افسوس کے تاثرات اُبھرتے نظر آئے۔

"میرا خیال ہے کہ تم غلطی پر تھے کمان دار۔ مرنے والا غدار یا جاسوس نہیں تھا۔ بوتھان کے ساتھ غداری ضرور کی گئی ہے مگر غداری کرنے والے نچلے طبقے کے لوگ نہیں۔ یہ غداری تو محلاتی سازش کا نتیجہ ہے... اس شہر میں اب صرف ہم لوگ ہی بچ گئے ہیں باقی ساری نفری تہ تیغ یا قید ہو چکی ہے اس لیے ہم جتنی جلدی شہر چھوڑ دیں، بہتر ہوگا۔ شہر کا صرف یہی علاقہ دُشمنوں کی زد سے کچھ محفوظ رہا ہے اور اس لیے محفوظ رہا ہے کہ یہ غریبوں اور مزدوروں کا علاقہ ہے جہاں سے دُشمن کو مال و متاع نہیں مل سکتا۔ وہ تو اُمرا کے علاقے میں لُوٹ مار کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔" عسکری افسر دَم لینے کے لیے رُک گیا۔

مجھے کمان دار ہاشم کے چہرے پر اختلاف کا رنگ جھلکتا دکھائی دے رہا تھا جب کہ سپاہی ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔

افسر دوبارہ کہنے لگا۔ "میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ پسپا ہوتے ہوئے شمالی دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرو۔ وہاں سے بھی فرار کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں لیکن کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ طراق نے اپنی سپاہ کو شہر کے محاصرے کا حکم دے رکھا ہے تاکہ کوئی یہاں سے بچ کر نہ نکلنے پائے... لیکن یہی غنیمت ہے کہ وہ ابھی شمالی دروازے سے شہر میں داخل نہیں ہوئے اور ہمارے بچ نکلنے کا تھوڑا سا امکان موجود ہے۔ اگر ہم دلدلی جھاڑیوں کے راستے ساحل تک سے رومو پہنچ جائیں تو شبستانیوں سے دوبارہ لڑنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

"لیکن مُونا اور اس کے پجاریوں کا کیا ہوگا، جناب؟" کمان دار نے پوچھا۔ "کیا ہم اُنھیں طراق کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں جنابِ والا۔ میں چوراہے کو پتھروں اور لاشوں سے پاٹ دوں گا مگر شبستانیوں کو یہاں سے نہیں گزرنے دُوں گا۔ کم از کم اس وقت تک اُنھیں ضرور روکے رکھوں گا جب تک کہ مُونا اور پجاریوں کو فرار کا موقع نہ مل جائے۔"

جرنیل اور کمان دار کی اس تقریر کے دوران میں چُھپتا چُھپاتا سپاہیوں کی آخری صف کے پیچھے آ گیا تھا اور اب کبھی بھی وقت ان میں شامل ہو سکتا تھا۔

کمان دار کی بات پر اس کے افسر نے کہا۔ "اگر اس سپاہی نے تمھیں احمق کہا تھا تو ٹھیک ہی کہا تھا... تم ایک بہادر احمق ہو۔ یہ مُونا اور اس کے پجاری ہیں جنھوں نے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے اپنے طور طریقوں سے ہمارے ساتھ غداری کی ہے۔ اُنھیں میری اور تمھاری اور تمھارے جوانوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اب مجھ سے کوئی بحث مت کرو اور میرے پیچھے آؤ... یہ میرا... تمھارے جرنیل کا حکم ہے۔ ہم فوری طور پر شمالی دروازے کی طرف بڑھیں گے۔"

کمان دار خاموش کھڑا رہا۔

جرنیل نے تلوار بلند کر کے اور سر بریدہ لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "حکم کی تعمیل کرو یا اسی حشر کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

کمان دار اپنے جوانوں کو ہدایات دینے لگا۔

خستہ حال سپاہی بچ نکلنے کی آس میں جلدی جلدی چار چار کی قطار بنانے لگے۔ میری طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی کیوں کہ پہلے وہ کمان دار اور جرنیل کی طرف متوجہ تھے اور اب فرار کے خیالوں میں غرق تھے۔ میں نے اپنے کندھے سکیڑ لیے اور آخری سپاہیوں کے ساتھ چلنے لگا۔

قطار کے اگلے حصّے میں کچھ سپاہیوں نے پُرسوز آواز میں مُونا دیوی کا کوئی "بھجن" گانا شروع کر دیا... لیکن پچھلے حصّے میں، بالخصوص میرے ساتھی اس بھجن سے بے نیاز اپنے دُکھڑے روتے اور سر جھکائے چلتے رہے۔

چلتے چلتے ایک سپاہی بولا۔ "جرنیل جمشید نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ ہمارا کمان دار تو واقعی احمق ہے۔ اُس نے بے چارے فیرانگس کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ وہ میرا دوست، ساتھی اور

نڈر سپاہی تھا وہ کمان دار کی طرح دلیری سے لڑا اور اس پرغداری کا الزام سراسر جھوٹ تھا۔"

"کمان دار بھی بُرا آدمی نہیں... بس اُس میں اتنی خرابی ضرور ہے کہ وہ بہت جلد غصّے میں آجاتا ہے ورنہ وہ بہادری میں جواب نہیں رکھتا" دُوسرا سپاہی بولا۔

"ہاں" پہلے نے جواب دیا" وہ ایسا بہادر ہے کہ ہمیں مروائے بغیر نہ رہتا"

"اُس کی بھی ایک وجہ ہے" دُوسرا بولا" وہ مُونا کی... خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ اُس کے حِصّے میں بھی مُونا کی کچھ رفاقت آجائے... تم تو جانتے ہو کہ مُونا بڑے بڑے بہادروں کو کبھی کبھی اپنا مہمان بنالیا کرتی ہے"

ان دو سپاہیوں کی ا۔ ں سے مجھے اندازہ ہُوا کہ مُونا ایک گوشت پوست کی عورت ہو۔ ے کے ساتھ ساتھ دیوی کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ ہمارے دَور اور ہماری سرزمین پر کچھ مذاہب ایسے ہیں جن میں انسانوں کو اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بدھمت کے ماننے والے دلائی لامہ کو امتیا بھ بُدھ کا اوتار سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مُونا کو بھی دیوی کا دوسرا رُوپ سمجھا جاتا ہوگا۔ میں نے مُونا کا فوارے والا جو مجسّمہ دیکھا تھا، اس میں وہ بے حد خوبصورت نظر آتی تھی۔ ممکن ہے پجاریوں نے کوئی خوب صورت لڑکی تلاش کرکے اُسے بچپن ہی سے دیوی کا رُوپ دھارنے کی تربیت دے رکھی ہو... اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں پجاریوں کے خلاف نفرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ یہ لوگ مذہب کے نام پر لوگوں کی ضعیفُ الاعتقادی سے کتنا غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اُنھیں دیویوں اور دیوتاؤں سے بڑا کر خود اقتدار پر قابض رہتے ہیں۔ اُنھوں نے یہاں بھی مُونا کو دکھاوے کا ایک مہرہ بنا رکھا تھا۔

میں انھی خیالوں میں گُم تھا کہ اچانک میری پنڈلیوں پر ایک زوردار ضرب لگی۔ یہ ضرب ایک موٹے تازے عسکری عہدے دار نے تلوار کی نیام سے لگائی تھی جسے پچھلی صفوں کی ترتیب درست کرنے اور رفتار بڑھانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

"صف سیدھی رکھو اور رفتار بڑھاؤ مُردارو... چال میں جان پیدا کرو۔ میں کہتا ہُوں مَردوں کی طرح سینہ تان کے چلو" وہ چیخ کر بولا اور اس نے پھر مُجھے ضرب لگائی کیونکہ میں اپنے کندھے سیکڑ کر چل رہا تھا۔

اُس کی اس حرکت نے مجھے بُری طرح مشتعل کر دیا اور مجھ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوگئی جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں ایک دم پلٹا اور اپنی پُوری طاقت سے عسکری عہدے دار کی دونوں آنکھوں کے درمیان، ناک پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ وہ مُکّے کی تاب نہ لاتے ہُوئے چکرایا اور دھم سے گر پڑا۔

میرے ساتھ چلنے والے سپاہیوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں اور وہ رُک گئے۔ اُن سے آگے جانے والے سپاہیوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ آخری صف میں کیسی بغاوت ہو چکی ہے۔ وہ اُسی طرح آگے بڑھتے رہے۔

میرے ساتھ رُکنے والے سپاہیوں میں سے ایک نے کہا۔

"یہ تو مر چکا ہے۔ اسے مرنا ہی چاہیے تھا دوستو کہ اتنا زور دار گھونسا تو کسی سانڈ کو بھی ختم کر سکتا تھا"

اتنے میں ایک ہٹا کٹا سپاہی میری طرف بڑھا اور میرا شانہ تھپکتے ہُوئے بولا" تم نے بالکل ٹھیک کیا جانِ من!... اس مردود نے ایک بار مجھے بھی کوڑے مارے تھے۔ تم اسے سر کی طرف سے پکڑو اور میں اسے ٹانگوں سے ڈنڈا ڈولی کرتا ہُوں" یہ کہہ کر اُس نے عہدے دار کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ میں نے اُسے بازوؤں سے اُٹھا لیا۔

"اسے جھلاؤ جانِ من تاکہ ہم اسے سامنے والے گھر میں پھینک دیں یہ وہاں اطمینان سے استراحت فرماتا رہے گا ورنہ اگر یہ یہاں پڑا رہا اور بارش آگئی تو بھیگ جائے گا" ہٹا کٹا سپاہی بولا۔

ہم نے اُسے تین بار جُھلایا اور سامنے والے مکان میں پھینک دیا۔

اب تک میں نے اُس ہٹے کٹے سپاہی کا پُوری طرح جائزہ نہیں لیا تھا۔ اب جو میں نے اُس کی طرف ۔ ور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھ پر پٹّی بندھی نظر آئی... وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا مگر دوبارہ کچھ نہیں بولا۔ شاید اُسے بھی میری طرح کسی ساتھی کی تلاش تھی... مگر وہ مجھ سے میل جول کی ہمّت نہیں پا رہا تھا۔

ہم دونوں زخمیوں کے گروہ میں شامل ہوگئے۔

کچھ دیر ہم چُپ چاپ چلتے رہے۔ میں نے کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا اور اُس نے میری جانب دیکھا۔ گویا ہم دونوں ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس آدمی کے سامنے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور صورت شکل سے وہ چھٹا ہُوا بدمعاش لگتا تھا... لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس قسم کے لوگ بُری خصوصیات رکھنے کے باوجود بوقتِ ضرورت اچھے مددگار

ثابت ہوتے ہیں۔

میں نے بات چیت کے لیے اس کی ہمّت بندھانے کی خاطر مسکراتے ہُوئے اُس کی جانب دیکھا تو اُس نے میری طرف دیکھے بغیر سرگوشی کے لہجے میں کہا" آپ کون ہیں جناب اور یہاں بوتھان میں کیا کرنے آئے ہیں۔ آپ بوتھان کے سپاہی تو ہو نہیں سکتے ذرا اپنی وردی ملاحظہ فرمایئے۔ یُوں لگتا ہے جیسے آپ نے میرے بیٹے کا لباس پہن لیا ہو، اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو... میرا مطلب ہے کہ آپ کا جسم وردی سے بہت بڑا ہے۔ میں نے اُس وقت کسی خیال کے تحت آپ کی مدد کی تھی مگر اب میں نے وہ خیال بدل دیا ہے۔ کیا آپ شبستانی ہیں؟ دیکھیے اس بڈھے ساحر سے جھُوٹ بولنے کی کوشش ہرگز نہ کیجیے گا کیونکہ ساحر خود بہت بڑا جھُوٹا ہے اور جھُوٹ کو صاف پہچان لیتا ہے"

مجھے اس کی خوش مزاجی اچھی لگی لیکن میں یہ بھی جان گیا کہ وہ جیل کاٹ چکا ہے کیوں کہ بات کرتے وقت اُس کے ہونٹ نہیں ہلتے تھے اور یہ مہارت جیل کے قیدیوں ہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنے نگرانوں کو متوجہ کیے اور ہونٹ ہلائے بغیر باتیں کر سکتے ہیں۔

"میں وقت آنے پر تمھارے ہر سوال کا جواب دُوں گا لیکن اس وقت تم مجھے صرف ایک سوال کا جواب دے دو... یہ تم مجھے "آپ" اور "جناب" سے کیوں مخاطب کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ آپ کوئی معمولی سپاہی نہیں ہو سکتے جناب۔" وہ بولا" میری ایک آنکھ زخمی ہے مگر میں نے اپنی اکلوتی صحت مند آنکھ سے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ آپ معمولی آدمی نہیں ہیں۔ جس طرح عہدے دار کی زیادتی کا حساب آپ نے اُسی وقت کھڑے کھڑے چکا دیا، اس طرح کوئی عام سپاہی نہیں کر سکتا... ایک عام سپاہی انتظامی کارروائی کے تحت کسی اندھیری جگہ موقع پا کر اس کے سینے میں خنجر تو گھونپ سکتا ہے مگر فوری طور پر اپنی توہین کا بدلہ نہیں لے سکتا۔ یہ کام تو کوئی غیر معمولی آدمی ہی کر سکتا ہے، جناب"

مجھے اُس یک چشم کے مشاہدے پر تعجب ہُوا۔

"تم نے کسی حد تک ٹھیک ہی اندازہ لگایا ہے دوست۔ میں نہ بوتھانی ہُوں اور نہ ہی شبستانی ہُوں۔ میں تو ایک اجنبی ہوں اور حادثاتی طور پر اس صورتِ حال میں پھنس گیا ہُوں۔ مجھے اس شکست خوردہ دستے کا ساتھ دینا پڑ رہا ہے۔ اگر تم بوقت میرے کام آئے تو گھاٹے میں نہیں رہو گے۔ اس وقت میں تم سے صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہُوں"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور ہم چُپ چاپ اس دستے کے پیچھے چلتے رہے۔ ایک مقام پر مجھے بدبُو آئی تو میں نے ناک سکیڑ لی۔

"آپ کا یُوں ناک سکیڑنا بھی میرے اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ آپ اُونچے طبقے کے آدمی ہیں مجھے یہ بدبُو اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ میں اسی گھٹیا اور غلیظ علاقے کی پیداوار ہُوں" ساحر نے کہا۔

"تم یہیں کہیں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے ہو؟" میں نے محض بات بڑھانے کے لیے پُوچھا۔

"جی ہاں... انھی گلیوں میں' دراہٹ کے میرا گھر واقع ہے"

"تمھارے خاندان کے ساتھ کیا بیتی ہوگی؟ وہ گھر پر ہے یا..."

وہ میری پُوری بات سُنے بغیر ہی بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا" خاندان کی بھی خُوب کہی۔ مجھے میری ماں نے جنم دے کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔ ایک کُبی مجھے اُٹھا لے گئی اور پالنے پوسنے لگی مگر ابھی میں نے ہوش ہی نہیں سنبھالا تھا کہ وہ طاعون کا شکار ہو کر چل بسی... پھر میں کسی آوارہ کُتّے کی طرح بھٹکتا اور بھیک پر گزارا کرتا رہا۔ مجھے یہ سب کچھ بتاتے ہُوئے بالکل شرم نہیں آتی جناب خود ہی سوچیے کہ ایسی زندگی اور موت میں کیا فرق ہے؟... بلکہ موت اس سے اچھی ہے... مگر میں فی الحال مرنا بھی نہیں چاہتا شاید جرنیل ہمیں شمالی دروازے سے بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو جائے"

اب ہم ایک بڑے چوراہے میں پہنچ گئے تھے جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں۔ جو مجھے چوربازار کی یاد دلا رہی تھیں۔ اتنے میں جرنیل اور کمان دار نے سپاہیوں کی ازسرِ نو صف بندی شروع کر دی۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو چوراہے کی دُکانوں کے پیچھے ایک سنگی دیوار اور اس کا بڑا چوبی دروازہ دکھائی دے گیا۔ شاید یہی وہ شمالی دروازہ تھا جس کے ذریعے ہم ساحل تک پہنچ سکتے تھے لیکن میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ ہم اس دروازے سے باہر نہیں جا سکیں گے۔ میں اپنے آپ کو کچھ مضطرب محسوس کرنے لگا۔

ابھی میں اس اندرونی اضطراب کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا عہدے دار ہمارے قریب آیا اور زخمیوں میں سے ایسے سپاہی چھانٹنے لگا جو لڑنے کے قابل تھے۔

اچانک اُس نے میرے ساتھی ساحر سے پُوچھا" تمھاری آنکھ پر یہ زخم کیسے لگا؟ نیزے یا تلوار سے؟"

"میری آنکھ تیر سے زخمی ہوئی ہے۔ مگر تیر چھلتا ہوا نکل گیا تھا" ساحر نے جواب دیا۔

"اوہ... پھر بھی معاملہ آنکھ کا ہے۔ مجھے زخم کا معائنہ کرنا پڑے گا"

"نہیں نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ بس ہلکی سی خراش ہے جو جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی"

... مگر عہدے دار نے ہاتھ مار کر اُس کی آنکھ پر بندھی ہوئی پٹی نوچ لی اور اس پٹی سے بہت سارے سکے، انگوٹھیاں اور بالیاں وغیرہ زمین پر گر کر پھیل گئیں۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم جنگ میں صرف لوٹ مار کے لیے شریک ہوئے ہو" عہدے دار بولا "عقرب نے بھی اسی شک کا اظہار کیا تھا... مگر وہ ہے کہاں؟... وہ تم لوگوں کی طرف ہی آیا تھا۔ بولتا کیوں نہیں... عقرب کہاں چلا گیا؟"

"اگر تمہیں عقرب کی تلاش ہے تو بہت پیچھے جانا پڑے گا۔ مجھے اُس گھر کا پتہ یاد نہیں رہا جہاں وہ آرام فرما رہا ہوگا"

"کیا بک رہے ہو تم؟ صاف صاف بتاؤ، یہ مذاق کا وقت نہیں ہے" عہدے دار غصے سے بولا۔

عین اُسی لمحے نہ جانے کہاں سے ایک خنجر آیا جو عہدے دار کے دل میں پیوست ہو گیا۔ ساحر نے جلدی سے خنجر نکال کر اپنے کپڑوں میں چھپا لیا اور ساتھ ہی گرتے ہوئے عہدے دار کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگا "کسی نے بڑے غلط وقت پر بیچارے عہدے دار سے اپنی توہین کا بدلہ لیا ہے جناب اور خنجر میں نے یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا ہے"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں ہنسوں یا عہدے دار کی موت پہ اظہارِ افسوس کروں۔ اتنے میں ساحر نے عہدے دار کو زمین پر لٹا دیا اور سکے چننے لگا۔

میں نے جھک کر دیکھا۔ عہدے دار دم توڑ چکا تھا۔

اچانک اُسی وقت ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی شمالی دروازہ کھلتا نظر آیا۔

"شبستانی سپاہ آگئی۔ اُدھر دکانوں کی طرف بھاگیے جناب" ساحر چیخ پڑا۔

میدانِ جنگ سے بھاگنا میری فطرت کے خلاف تھا... مگر یہ صورت حال ایسی تھی کہ مجھے ساحر کے مشورے پر عمل کرنا پڑا... وہ مجھے اپنے ساتھ لیے چوراہے کے ایک کنارے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے بیچ میں لے آیا۔

"جان بچانے کا صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے جناب اور وہ ہے زمین دوز غلیظ راستہ... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہاں کہیں اس سُرنگ کا ایک ڈھکنا ہوا کرتا تھا۔ وہ اسی سنگی فرش کی سلوں جیسی ایک سل ہے" یہ کہہ کر وہ سل تلاش کرنے لگا اور میں چوراہے کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو گیا جہاں اب زوروں کی جنگ چھڑ چکی تھی۔

سپاہیوں کا دستہ جرنیل اور کمان دار کی نگرانی میں پلٹ کر آنے والے شبستانیوں کا راستہ روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن شبستانی سپاہ تازہ دم تھی، تعداد میں زیادہ تھی اور اُس کے سپاہی یوتھانیوں سے بہتر جنگجو تھے۔

پہلے شبستانی نیزے بازوں نے نیزے پھینکے پھر تیر اندازوں نے تیر برسائے اور اس کے بعد گھڑسوار آگے بڑھ آئے تھے۔

یوتھانی سپاہی گاجر مولی کی طرح کٹ کر گرنے لگے لیکن اُن کے لیے نہ آگے بڑھنے کا راستہ تھا اور نہ ہی فرار کی کوئی صورت تھی۔ اس لیے وہ بھی بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔

اِدھر ساحر نے گٹر نما حصے کے ڈھکنے والی سل تلاش کر لی تھی مگر وہ اُس سے اُٹھ نہیں رہی تھی۔

"ٹھوکا کے لیے میری مدد کیجئے جناب" اُس نے ہانپ کر کہا۔

میں نے ایک جھٹکے سے وہ سل ہٹا دی۔ بدبو کا ایک تیز بھبکا اُٹھا تو میں فوراً پیچھے ہٹ گیا اور ناک پر ہاتھ رکھ کر لڑائی کا تماشا دیکھنے لگا۔ یوتھانیوں اور شبستانیوں کو لڑتے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس جنگ میں شریک ہو جاؤں لیکن میں نہ تو یوتھانیوں کا ساتھ دے سکتا تھا اور نہ ہی شبستانیوں کا دم بھر سکتا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے اپنا دشمن تصور کرتے... اور اگر یوتھانی مجھے دشمن نہ سمجھتے تو بھی اُن کا ساتھ دینے میں اب کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ تقریباً سب ہی مارے جا چکے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ بھی مرنے ہی والے تھے۔ کپتان ہاشم اور جرنیل جمشید تو پہلے ہی کام آ چکے تھے۔

میں نے پلٹ کر ساحر کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ نیچے اُتر گیا تھا۔ اس دوران شبستانی فوجی دکانوں کی طرف بڑھنے لگے۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ میں بھی زمین دوز حصے میں اُتر جاؤں۔

... اور میں بھی نیچے اُتر گیا۔

*

میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ زمین دوز حصہ اتنا گہرا ہوگا۔ وہ غلاظت اور گندے پانی سے لبریز تھا میرے لیے گندے پانی سے سر باہر رکھنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ پانی کا بہاؤ بھی خاصا طاقتور تھا اس لیے میرے پاؤں بھی نہیں جم رہے تھے۔ اوپر سے سخت اندھیرا تھا۔ مجھے اُبکائیاں آنے لگیں اور پھر میں قے نہ روک سکا جس نے میری آنتیں تک اُلٹ کر رکھ دیں۔ اب میں واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو زمین دوز گندے پانی کے ریلے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک اس غلاظت میں آگے بڑھتا رہا۔ راستے میں نہ جانے کتنے موڑ آئے اور میں نہ جانے کتنی لاشوں سے بھی ٹکرایا... مگر مجھے کہیں بھی موکھا نظر نہ آیا۔ کہیں کہیں مجھے اُوپر سے گھوڑوں کی ٹاپوں اور لوگوں کی آہ و بکا کی آوازیں البتہ سُنائی دے جاتی تھیں۔ یُوں لگتا تھا جیسے شبستانی سپاہ نے شہریوں کا قتلِ عام شروع کر دیا ہو۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں بچ گیا اور کمپیوٹر نے مجھے اپنی دُنیا اور اپنے دَور میں منتقل کر دیا تو ڈاکٹر فریدوں میرے حافظے سے یہاں کی ہر یاد اور ہر بات ٹیپ کر کے سُننے گا اور بار بار سُنے گا... مگر اس کے باوجود میں اُسے کوسنے سے باز نہ رہ سکا جس نے مجھے اس جلتے ہُوئے اور مرتے ہُوئے شہر کی غلاظت میں پھنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

خدا خدا کر کے میں ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں نسبتاً چھوٹی نالی سے صاف پانی بڑے زمین دوز حصّے میں گر رہا تھا شاید اس چھوٹی نالی کا ربط سمندر یا دریا سے تھا اور یہ پانی وہیں سے آ رہا تھا۔

میں جلدی سے اس صاف پانی کی نالی میں داخل ہوگیا۔ جس کا دھارا زیادہ تیز نہیں تھا اور میں اُس کی مخالف سمت میں بھی جا سکتا تھا۔ اس طرح اگرچہ مجھے سر جُھکا کر چلنا پڑ رہا تھا مگر میرے تن اور کپڑوں پر لگی غلاظت صاف ہوگئی۔

کچھ دُور جانے کے بعد مجھے اُوپر سے روشنی کی ایک لکیر آتی دکھائی دی تو میری جان میں جان آئی۔ میں وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ روشنی ڈھکنے والی سِل کی درز سے آ رہی ہے۔ میں نے نیچے سے زور لگا کر وہ سِل ہٹا دی۔ اگر اس سِل کے عین نیچے ایک چبوترہ سا نہ بنا ہوتا تو شاید میں اُسے ہرگز نہ ہٹا پاتا۔ میں نے دونوں ہاتھ بالائی حصّے کے کناروں پر رکھ کر زور لگایا اور سر اُونچا کیا تو پتہ چلا کہ میں ایک خلا میں ہُوں اور زمین دوز حصّے کا یہ ڈھکنا یا راستہ کسی چوراہے، سڑک یا گلی میں نہیں کھلا تھا بلکہ ایک بہت بڑے مجسّمے کے تلوے میں کھلا تھا اور یہ خلاء اسی مجسّمے کی کھوکھلی ٹانگ کا تھا مگر مجسّمے کے ساتھ ایک سلاخ دار چھوٹی سی کھڑکی بنی ہُوئی تھی۔ میں نے بہ مشکل تمام اپنا بایاں بازو اُس کھڑکی کی سلاخوں میں اٹکا لیا اور سر نکال کر اُوپر دیکھا تو حیرت سے گُنگ ہو گیا۔

یہ مجسّمہ مُونا کا تھا اور کم از کم دو سو فٹ اُونچا تھا۔

اس وقت باہر چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی اور میرے لیے یہ پہچاننا مُشکل نہیں تھا کہ مجسّمہ خالص سونے کا بنا ہُوا ہے۔

اُف خداوند... اتنا سونا!... نہ جانے اس مجسّمے کی تعمیر میں کتنا سونا صرف ہُوا ہوگا جب کہ ہمارے دَور اور دُنیا میں سونا تولوں میں بکتا ہے۔ اگر اتنا سونا ہمارے مُلک کے پاس آ جائے تو وہ دُنیا کا امیر ترین مُلک شمار ہونے لگے... پھر مجھے خیال آیا کہ اس وقت سوال یہ سونا منتقل کرنے کا نہیں بلکہ یہاں سے نکلنے اور زندہ رہنے کا ہے۔

اُوپر سے نکلنے کا راستہ نہ پا کر میں نیچے اُترنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مجھے زمین دوز حصّے میں کچھ لوگوں کے چلنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ میں اپنے بائیں بازو کے سہارے کھڑکی کی سلاخوں سے لٹکا رہ گیا اور جھانک کر نیچے دیکھنے لگا۔

وہ تعداد میں دو تھے، انھوں نے سیاہ لبادے اوڑھ رکھے تھے اور سونے کے ایسے خود پہنے ہُوئے تھے جنھوں نے اُن کے سر ہی نہیں بلکہ چہرے بھی چُھپا رکھے تھے۔ دیکھنے کے لیے آنکھوں اور سانس لینے یا بات کرنے کے لیے نقاب نُما خودوں میں تین تین سوراخ بنے ہُوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں دُعا مانگی کہ خدا کرے یہ لوگ مجھے دیکھ نہ پائیں ورنہ کہیں کوئی اور مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دُوسروں کو بُلا کر میری ناکہ بندی کر دیں۔ دُوسرے میں یہ جاننے کا بھی متمنّی تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور نیچے کیا کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس جلتے اور مرتے ہُوئے شہر سے فرار ہو رہے ہیں تو پھر میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے جا کر ساحل تک پہنچ سکتا تھا اس لیے بازو میں تکلیف ہونے کے باوجود میں کھڑکی سے لٹکا رہا اور انھیں دیکھتا رہا۔

وہ دونوں سِل کے نیچے، چبوترے پر بیٹھ کر دم لینے اور باتیں کرنے لگے۔

"یہ تو میں سمجھتا ہُوں کہ زندہ مُونا ہمیں طراق کے حوالے کر دینی چاہیے کیونکہ وہ فاتح ہے... لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ مُونا کا چہرہ جُھلسا کر اُس کی صُورت کیوں مسخ کی جائے؟ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ میں بزدل ہُوں اور کسی پر تشدد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ نہیں... تم تو جانتے ہو کہ میں خود لوگوں پر کتنا تشدد کرتا ہُوں مگر مونا کی صُورت مسخ کرنے والی بات مجھے فضول معلوم ہوتی ہے۔" ایک بولا۔

"تو تم بھی جانتے ہو کہ طراق نے ہم پُجاریوں کو ہر قسم کے ظلم اور سزا ...ری قرار دیا ہے... یا یہ بھی نہیں جانتے؟" دُوسرا بولا۔ وہ ایک ...تہ قد آدمی تھا۔

"جانتا ہُوں ٹالپ۔" پہلے نے جواب دیا جو دُوسرے کی بہ نسبت ...دراز قد اور دُبلا تھا۔ "اور یہ بھی مانتا ہُوں کہ اُس نے ہمیں تمھاری بدولت ...معاف کیا ہے۔ اگر ہم اُس سے نہ ملتے تو شاید وہ ہم پُجاریوں کو بھی نہ ...شا... مگر اس بات کا لُوتھان کے عوام پر بہت بُرا اثر پڑے گا جب ...لات معمول پر آ جائیں گے تو وہ سوچیں گے کہ ساری مُصیبتیں اُنھوں ...نے برداشت کی ہیں اور ہم کاہن مزے اُڑاتے رہے ہیں۔ عوام احمق ہوتے ...یں وہ بھول جاتے ہیں کہ ہم پُجاری اور کاہن ہی اسرار کے محافظ ہوتے ہیں۔"

ٹالپ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم تو عوام سے دُگنے تگنے بلکہ چار گنا ...وہ احمق ہو راغو۔ میری بات غور سے سُنو میں اسے دُہراؤں گا نہیں۔ ...تمھاری لُوتھان کے مذہبی رہنما ہیں ہم، ہاں کے کرتا دھرتا ہیں۔ ...زندہ مُونا دیوی کے لیے لڑکی کا انتخاب ...تے ہیں ہم اُسے تربیت ...ہیں ہم اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور ہم ہی وقت آنے پر اُسے ٹھکانے ...لگا دیتے ہیں۔ ہم قانون بناتے اور اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر ...ساری باتوں کے باوجود ہم فانی انسان ہیں راغو۔ ہم پر بھی تشدد ...جا سکتا ہے، ہم موت کے گھاٹ بھی اُتارے جا سکتے ہیں اور ہم ...ب لوگوں کی طرح ذِلت کی زندگی گزارنے پر بھی مجبُور ہو سکتے ہیں۔ ...ق ہمارے ساتھ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ احمق نہیں ہے۔ وہ ...تھان پر حکمرانی کے لیے ہمیں استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ...کہ وہ ہمیں استعمال کرے اور کسی حد تک ہمارا محتاج رہے۔ اُس نے ...صرف آٹھ گھنٹوں کی مہلت دی ہے۔ ان آٹھ گھنٹوں کے اندر اندر ...سارے معاملات طے کر کے اُس کا ہاتھ بٹانا ہے، اُس کے ہر حکم ...تعمیل کرنی ہے۔ ورنہ وہ ہمارے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا جو ...سرے لوگوں سے کر رہا ہے۔ اب ذرا سوچو کہ تم نے ایک پُجاری کی ...ت سے ہمیشہ عیش و آرام کی زندگی بسر کی ہے۔ ہاتھ پاؤں ہلائے ...تمھیں زندگی کی ساری آسائشیں میسّر رہی ہیں؟ یا تمھیں کوئی کام ...وئی ہُنر آتا ہے؟ نہیں... تم بھیک مانگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔"

پستہ قد ٹالپ کی اس تقریر پر پُجاری راغو اثبات میں سر ...ہلا رہا۔

کھڑکی سے لٹکے لٹکے میرا بُرا حال ہوگیا تھا۔

"یہ سب تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو ٹالپ۔ مجھے لڑکی پر تشدد کرنے ...کوئی اعتراض نہیں... مگر اُس کی وجہ جاننا چاہتا ہُوں۔ مجھے معلوم ...کہ ہمیں اُس کا چہرہ بگاڑنے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"کیا تم نے کبھی زندہ مُونا کے ساتھ وقت گزارا ہے؟" ٹالپ نے پُوچھا۔

"نہیں... میں نے یہ معاملہ اُس وقت کے لیے ملتوی کر رکھا تھا جب تک نئی پُجارنیں ختم نہ ہو جائیں۔"

"بس تو پھر تم نہیں جانتے کہ مُونا کیسی عورت ہے۔" ٹالپ بولا۔ "چونکہ ہمیں مُونا کو طراق کے حوالے کرنا ہے اس لیے وہ پہلے تو اُس کے حُسن کا اسیر ہو جائے گا اور پھر تجربہ اُسے بتا دے گا کہ مُونا کتنی مختلف ہے۔ تب وہ طراق کے دل پر ہی نہیں بلکہ دماغ پر بھی چھا جائے گی اور تم جانتے ہی ہو کہ مُونا، دل ہی دل میں ہم کاہنوں اور پُجاریوں سے کتنی نفرت کرتی ہے۔ وہ طراق کو بھڑکا کر ہمیں زندہ درگور کروا دے گی۔ اس لیے میں چاہتا ہُوں کہ اُس کا چہرہ مسخ کر دیا جائے تاکہ اُس کی مکروہ صُورت دیکھ کر طراق اُسے قتل کروا دے... پھر اُس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ نئی زندہ مُونا کا انتخاب ہم طراق سے کروائیں گے اور یہ بلاواسطہ خوشامد ہوگی جس کا اُسے اندازہ بھی نہیں ہو پائے گا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بڑے عقل مند اور چالاک ہو ٹالپ، لیکن طراق نے اگر پُوچھ لیا کہ مُونا کا چہرہ کیوں مسخ کیا گیا ہے اور کس نے کیا ہے تو ہم کیا جواب دیں گے؟"

اس پر ٹالپ نے پھر قہقہہ لگایا اور بولا۔ "ہم مُونا کے خلاف یہ الزام لگائیں گے کہ اُس نے طراق کے خلاف اپنے عسکری کمان داروں کا اجلاس طلب کیا تھا اور اُس کی مزاحمت کی تھی۔ وہ خود بھی اس الزام سے انکار نہیں کر سکے گی۔ اس طرح طراق ہم سے بازپُرس کرنے کی بجائے ہمیں اپنا وفادار سمجھنے لگے گا۔"

"میں تمھاری دُور اندیشی کی داد دیتا ہُوں۔" راغو نے جواب دیا

اور اُس کا شانہ تھپ تھپایا۔

مجھے اپنے بائیں شانے میں درد کی ٹیسیں زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگیں۔ میرا جی چاہا کہ میں کودتے ہوئے پہلے تو ثالب کا کام تمام کر دوں اور پھر راعو کی گردن اُڑا دوں۔

اچانک ثالب اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "آؤ چلیں۔ وہ لوگ میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

جب وہ منحوس کُتے چلے گئے اور اُن کی کائیں کائیں ختم ہو گئی تو میں نیچے اُتر آیا۔ میرا بایاں بازو اور شانہ شل ہو گیا تھا میں اُسے سہلاتا رہا اور سوچتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ میری مردانگی کے خلاف تھا کہ وہ میرے سامنے ایک مجبور اور کمزور لڑکی کا چہرہ جھلسانے کے منصوبے بناتے رہیں اور میں اس بے بس لڑکی کی کوئی مدد نہ کر سکوں۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اُسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور اگر اس کوشش میں کامیاب رہا تو وہ میری ممنونِ احسان ہو گی اور ہو سکتا ہے اس زندہ مُونا یا اُس کے دوست میرے کام آ سکیں... یا اگر کام نہ آ سکیں تب بھی ایک بے بس لڑکی کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔

یہ سوچ کر میں خاموشی سے اُن پُجاریوں کا پیچھا کرنے لگا۔

دونوں پُجاری اُس زیرِ زمین راستے سے ایک اور راستے میں مُڑ گئے۔ جب میں اُن کے پیچھے مُڑا تو پتہ چلا کہ وہ ایک آبی سُرنگ تھی اور اُس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ میں نے کافی فاصلہ رکھ کر پُجاریوں کا تعاقب جاری رکھا۔

وہ متعدد زمین دوز راستوں سے گزرتے ہوئے ایک طویل و عریض تہ خانے میں جا پہنچے جہاں بہت سی مشعلیں جل رہی تھیں اور زندہ مُونا سے پہلے کی دیویوں کے بہت سے مجسمے بھی رکھے ہوئے تھے۔

میں اُن مجسموں کے پیچھے چُھپ کر دیکھنے لگا:

یہ تہ خانہ ایک بہت بڑے ہال کے برابر تھا جس کے بیچوں بیچ سونے کا ایک مرصع تخت رکھا تھا اور اُس پر زندہ مُونا اس عالم میں براجمان تھی کہ اُس کے نازک ہاتھ پاؤں اور کمر میں طلائی زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ وہ بے پناہ پُرکشش اور حسین تھی لیکن اُس کی ساحر آنکھوں میں خوف و دہشت کی بجائے غم و غصے کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

اُس وقت تقریباً ایک درجن سیاہ پوش پُجاری سونے کے نقاب نما خود پہنے، مُونا کے اردگرد یُوں کھڑے تھے جیسے گدھ دم توڑنے والے کسی جانور کے آس پاس اُس کی موت کے منتظر رہتے ہیں۔ ثالب اور راعو وہاں پہنچے تو تمام کرگس آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔

میں ماضی کی مُونا دیویوں کے مجسموں کے درمیان لیٹ کر ہُوا آگے بڑھنے لگا۔ بظاہر سارے پُجاری مسلح نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اُن کے ڈھیلے ڈھالے سیاہ لبادوں میں کیا کچھ چُھپا تھا، یہ میں ہی جانتا تھا۔

فی الوقت زندہ مُونا بھی فوری خطرے سے ہمکنار نظر نہیں تھی۔ ثالب کی باتوں اور موجودہ ماحول سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اُس پر جرح کی جائے گی اور پھر اُسے مجرم ٹھہرا کر سزا کا اعلان کیا جائے گا اس کے بعد سزا پر عمل کرنے کی باری آئے گی۔

میں نے جائزہ لیا تو وہ جگہ مجھے اپنے ہاں کی فلموں میں دکھائے جانے والے عقوبت خانوں کی مانند نظر آئی۔ وہاں ... کے لیے رسیاں اور چرخیاں تک موجود تھیں، کوڑے اور کیلوں ... بھی تھا۔ ایک طرف بہت بڑی انگیٹھی رکھی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ دو سلاخیں اُس کے قریب ہی رکھی ہوئی تھیں مگر ... کی بجائے لوہے کا ایک بہت بڑا خود انگاروں پر تپ رہا تھا جو شاید تھوڑی دیر قبل ہی وہاں رکھا گیا ہو گا کیونکہ اب وہ سُرخ ہونا شروع ہو گیا تھا۔

یہ انگیٹھی اور خود دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا۔

ایک پُجاری نے انگیٹھی کے قریب آ کر پنکھا جھلتے ہوئے تیزی کی تو مُونا یہ دیکھ کر لرز گئی۔ وہ لوگ یہ خود اُس مجسمۂ حُسن کے سر پر رکھ کر بال جلانے کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی مسخ کرنا چاہتے تھے تو وہ پھول سی نازک لڑکی اتنی کڑی سزا کے بعد زندہ ہی نہ رہ سکتی تھی اور اگر بچ بھی جاتی تو اُسے دیکھ کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

زندہ مُونا کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے لہرانے لگے اور میری رگوں میں خون کی بجائے چنگاریاں سی دوڑنے لگیں۔

جب مجھ پر اس قسم کا جنون طاری ہوتا ہے تو میں نہ ... کی پروا کرتا ہوں اور نہ ہی اپنی جان کی... اور اب مجھ پر وہی جنون طاری ہو رہا تھا۔ اتنے میں ثالب نے اپنے لبادے سے ایک خریطہ نکالا اور تخت کے سامنے کھڑا ہو کر پڑھنے لگا... لیکن اُس کی نگاہیں دستاویز کی بجائے لڑکی کے حسین سراپا پر مرکوز تھیں اور وہ یُوں بولے جا رہا تھا جیسے خریطے کا مضمون اُسے زبانی یاد ہو۔

تمام سیاہ پوش پُجاری سر جُھکائے کھڑے تھے۔

"اب تم مُونا دیوی کا اوتار نہیں رہی ہو۔ اب تم زندہ مُونا نہیں اب تم ایک عام سی لڑکی ہو جسے یہاں اسکے جرائم کی فہرست سُنانے کے لیے لایا گیا ہے۔ ان جرائم سے انکار بھی تمہیں اُس سزا سے نہیں بچا سکے گا جو تمہارا مقدر بن چکی ہے۔" اتنا کہہ کر ثالب دم لینے کو رُک گیا۔

میں نے سوچا، اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ لڑکی اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں بول سکتی۔

ثالب پھر بولنے لگا۔

"تم پر یہ جرم ثابت ہو چکا ہے کہ جب طراق نے بوتھان کے ساتھ ... شرط پر صلح کرنا چاہی کہ بوتھانی رودبار چڑھائی کے لیے شبستانیوں کا ساتھ دیں تو تم نے محض دکھاوے کے لیے ہم کاہنوں اور عسکری عہدے داروں کا اجلاس طلب کیا مگر ہم پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہوئے بہادر طراق کی وہ فیاضانہ پیش کش ٹھکرا دی۔ تمہاری وجہ سے بوتھان کا شہر ... کا ڈھیر بن گیا ہے، سپاہ برباد ہو گئی ہے اور لاتعداد شہری موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے ہیں۔ تم ان جرائم سے منکر نہیں ہو سکتیں اے ... عورت۔"

مُونا نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر گمبھیر لہجے میں کہا۔ "مجھے ... نامے کی کوئی دستاویز نہیں دکھائی گئی تھی، پُجاریو!"

"زبان سنبھال کر بات کرو عورت۔ ورنہ تمہارا چہرہ مسخ کرنے سے پہلے تمہاری زبان کاٹ دی جائے گی۔" ثالب مکروہ آواز میں ... "ہم کاہنوں کا ادب ملحوظِ خاطر رکھو کہ اب تم دیوی نہیں رہی ہو۔"

"دوغلے پُجاری کسی احترام کے مستحق نہیں ہوتے۔ میں بزدل ... فرشتوں کی تکریم نہیں کر سکتی۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ موت کا خوف ... خاموش کر دے گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ اگر میرے پاس ہزار ... جانیں بھی ہوتیں تو میں اپنی ہر زندگی وطن کے دفاع کے لیے قربان کر ... تمہاری طرح چاپلوس غلام ہرگز نہ بنتی۔"

"بکواس بند کر، عورت۔" ثالب دھاڑا۔ "میں تم سب کو ... دلانا چاہتا ہوں کہ زندہ مُونا دیوی کی غیر موجودگی میں میں ہی ... کے تمام اختیارات کا مالک ہوں۔ ہر وہ آواز، وہ لفظ اور وہ ... جو کسی زبان پر آتا ہے، وہ اُس آدمی کے ذہن اور دل کا ترجمان ... میری یادداشت بہت عمدہ ہے۔ ماضی کی ہر بات میری لوحِ ... محفوظ ہے، اس لیے...۔" اتنا کہہ کر اُس نے انگیٹھی اور خود کی طرف ... کیا۔ "یہ مت بھولو کہ یہ خود صرف اس عورت کے لیے ہی نہیں ... کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔"

اگرچہ مُونا کی آنکھوں میں دہشت کے سائے تھے... مگر اُس نے ... ہوئے ثالب سے پوچھا۔ "کیا تمہیں اپنے ان کرگسوں سے بھی ... ہے ثالب جو حرام کی کھاتے اور عیش کرنے کے لیے پالتو کتوں ... بیشتر تمہارے آگے دُم ہلاتے رہتے ہیں۔ جہاں تک اقتدار ... ہے تو وہ ہمیشہ تمہیں حاصل رہا ہے۔ مُونا... ہر زندہ مُونا دیوی ... ایک مہرے سے زیادہ نہیں رہی۔ ہر زندہ مُونا تمہارے اشاروں پر ناچتی رہی ہے۔ وہ عوام کے لیے قابلِ پرستش ہوتی ہے... مگر تم اُسے ایک قالین کی طرح اپنے گندے قدموں اور ناپاک وجود سے روندتے رہے ہو۔ نہ جانے تم نے مجھ کتنے جنگجو لوگوں کا ساتھی بنایا اور مجھے اپنے جسم و روح کی بھینٹ چڑھانے پر مجبور کیا۔ جب بھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ تمہارے مکروہ ہاتھ میرے سراپا سے...۔"

"چُپ ہو جا بدبخت۔" ثالب گرجا۔ "تم جتنی بکواس کر سکتی تھیں کر چکیں۔ اب اس خریطے پر دستخط کر دو۔"

"جب تم نے پہلے سے مجھے مجرم قرار دے دیا ہے اور سزا بھی تجویز کر چکے ہو تو میرے دستخطوں کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟" مُونا بولی۔ "تم میرے دستخط صرف اس لیے چاہتے ہو کہ اسے میرے اعتراف نامے کے طور پر طراق کو پیش کر سکو۔"

"اے بدزبان عورت! تم ان الفاظ سے کاہنِ اعظم کے خلاف گستاخی کی مرتکب ہو رہی ہو۔ یہ میری نہیں بلکہ مذہب کی حکم عدولی کے مترادف ہے۔ کیا تم نے اجلاس بلا کر یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ بوتھان کے لوگ دمِ آخر تک شبستانیوں کے خلاف لڑیں گے؟ کیا تم نے یہ فیصلہ کر کے طراقِ اعظم کی فیاضانہ پیش کش نہیں ٹھکرائی تھی؟"

"ہاں۔ میں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا تھا۔ موت کو طوقِ غلامی پر ترجیح دی تھی۔ میں بوتھانیوں کو شبستانیوں کا غلام بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اگر ہمارے اپنے ہی ہم سے غداری کرتے ہوئے زمین دوز راستے اُن پر نہ کھولتے اور اُن کی رہبری نہ کرتے تو وہ ہم پر ہرگز ہرگز غالب نہیں آ سکتے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ہمارے ہاں کچھ ایسے وطن فروش بھی موجود ہیں جو دشمنوں کی خوشنودی اور ذاتی مفاد پر قوم و ملک سے غداری کر سکتے ہیں۔"

مُونا کی آواز میں اتنا جوش و جذبہ تھا کہ پُجاری خاموش کھڑے اُس کا مُنہ تکتے رہ گئے۔

اچانک راغو اچھل کر انگیٹھی کے قریب گیا اور چمٹا اُٹھا کر انگاروں کی طرح سُرخ ہو جانے والا خود کھٹ کھٹانے لگا۔

مُونا نے ایک بار خود کی طرف دیکھا پھر ثالپ پر نگاہیں گاڑتے ہُوئے بولی: "رات بھر تم کہاں رہے ہو ثالپ؟"

اُس کے اس سوال پر کچھ پجاریوں کے مُنہ سے سسکاری نکل گئی... مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ سسکاری کس کس نے لی تھی کیونکہ اُن کے چہرے خودوں سے چھپے ہُوئے تھے۔

مُونا کی پُرجوش باتوں نے میرے اندر بھی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا اور میں اپنی جگہ حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

ثالپ نے خریطہ اور قلم دوات مُونا کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔ "اب تم دستخط کرتی ہو یا تمھاری طرف سے میں خود ہی دستخط کر دوں؟"

"نہیں... میرے اعتراف کا مطلب قوم کے لیے طوقِ غلامی ہوگا۔"

مُونا نے صاف انکار کر دیا۔

"دیکھو۔ اگر تم دستخط کر دو تو میں تمھیں ایسی دوا پلا دوں گا جس سے تم بے ہوش ہو جاؤ گی اور تمھیں اُس کرب کا احساس نہیں ہوگا جو بصورتِ دیگر یہ خود پہنانے سے ہوگا۔"

مُونا نے ثالپ کے چہرے پر تھوک دیا۔

"نہیں نہیں نہیں۔" وہ چیخ کر بولی۔

ثالپ نے فرطِ غضب سے اُسے ایک طمانچہ مارا اور پجاریوں سے بولا: "تم سب گواہ ہو کہ اُس نے اپنے جُرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ اسی نے شبستانیوں پر شہر کے دروازے کھولے تھے۔"

مُونا یوں اُٹھی جیسے زنجیریں تڑا کر ثالپ کی گردن میں اپنے خوبصورت دانت گاڑ دے گی مگر زنجیروں نے اُسے بے بس کر رکھا تھا۔

"تم اپنے جرائم مجھ سے منسوب کر رہے ہو غدارِ وطن۔" وہ غرّا کر بولی۔

ثالپ اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے ایک پجاری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"خود لے آؤ تاکہ آگ اس کا چہرہ مسخ کر کے اس کے گناہوں کو راکھ کر دے۔"

ایک پجاری نے دو چمٹوں کی مدد سے وہ لال انگارہ خود اُٹھا لیا۔ دو پجاریوں نے مُونا کی گردن میں پٹا ڈال کر اُس کا سر دیوار سے ٹکا دیا تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے۔

مُونا بے بس ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خود کی طرف دیکھنے لگی جو قدم قدم اُس کے قریب لایا جا رہا تھا۔

وہ وقت آ گیا تھا جب مجھے اس مجبور و بے بس لڑکی کو خونخوار گِدھوں سے بچانے کے لیے میدان میں کود جانا چاہیے تھا۔

میں بڑی آہستگی سے اُٹھا۔ تلوار کے دستے پر اپنی گر کی اور پجاریوں کی تعداد گننے لگا۔

وہ تعداد میں چودہ تھے۔

جب مجھ پر کچھ کر گزرنے کا جنون طاری ہوتا ہے تو مجھے تعداد یا اسلحہ خوفزدہ نہیں کر سکتا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یک آمد سے وہ پہلے بوکھلا اُٹھیں گے اور بوکھلاہٹ کا یہ وقفہ کئ کی موت بن جائے گا۔

خود والا پجاری اب مُونا کے مقابل پہنچ چکا تھا۔

وہ ثالپ کے اشارے کا منتظر تھا مگر اس سے پہلے کوئی اشارہ کرتا، میں نے ایک خوفناک نعرہ لگایا اور اچھل کر سب کی نگاہیں مجھ پر مرتکز ہو گئیں۔ بھیگنے کے باعث اُس حلیہ یقیناً بڑا خوفناک ہو رہا تھا۔ میں نے کسی جن کی طرح قہقہہ پھر تلوار لہرانے لگا۔

"مُونا... اے عظیم دیوی! میں تمھاری حفاظت کے مُونا کو کوئی نہیں مار سکتا۔ اُسے کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ یہ رہے گی۔" میں نے کہا۔

میری شکل و صورت اور اداکاری دیکھ کر تین پجا ہو گئے اور فرش پر گر پڑے۔ ثالپ نے ایک ہاتھ راغو کی ڈال کر اُسے اپنی ڈھال بنا لیا اور دُوسرے ہاتھ سے خنجر گردن پر رکھ دیا۔

"تم جو کوئی بھی ہو پیچھے ہٹ جاؤ۔" وہ مجھ سے بولا مُونا کی شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔ چاہے میں خود مر جاؤں مگ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میں وہیں رُک گیا۔

"آگے بڑھو اور اُسے قتل کر دو۔ میری پروا نہ کرو۔ مُونا دیوی کا حکم ہے۔ اس خبیث کو مار ڈالو۔" مُونا تڑپ

... لیکن میں مُونا کی موت نہیں چاہتا تھا۔ میں ایک طرح سے یرغمال بنانے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے تل اور ثالپ کی طرف دیکھنے لگا۔

یکایک وہ تمام پجاری بھاگ نکلے جو بے ہوش نہ اُس پجاری نے خود وہیں پھینک دیا... جو اُسے اُٹھا خود لڑھکتا ہُوا میرے قریب آ گرا...

"میں جانتا ہوں کہ تمھارے ساتھی اپنے مددگا گئے ہیں... اور یہ مددگار پجاری نہیں بلکہ سپاہی ہو

کے سپاہی... مگر میں اُن سے نہیں ڈرتا۔" یہ کہنے کے ساتھ میں آہستہ آہستہ اپنی تلوار کی نوک بھی خود کی طرف کھسکا رہا تھا۔

عین اُسی وقت میرے پیچھے گرا ہُوا پجاری ہوش میں آ کر کسمسایا تو میں نے پیچھے ہٹ کر اُس کے سر پر زوردار ٹھوکر لگائی۔ وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا اور میں اپنی جگہ لوٹ آیا۔ بظاہر میں نے پجاری کو ٹھوکر مارنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا مگر ثالپ نہیں جانتا تھا کہ اب میری تلوار کی نوک فرش پر اُس خود سے صرف چھ انچ دُور رہ گئی ہے۔

"تم اب تک مجھے نہیں پہچان سکے ثالپ! میں بتاتا ہُوں کہ میں کون ہُوں۔ میں طراق کا ایک کمان دار ہُوں اور اُس کا دستِ راست ہُوں۔ تم رات طراق سے ملے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ایک دستہ قریب ہی چھپا ہُوا ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ لڑکی مجھے اپنے لیے چاہیے۔ طراق نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مُونا مجھے دے دی جائے گی۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ مسخ شدہ چہرے والی مُونا میرے حصّے میں آئے۔ ہاں میری رفاقت کے بعد تم اس کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو، کرتے رہنا مگر اس وقت اسے میرے حوالے کر دو۔" یہ کہتے کہتے میں نے اپنی تلوار کی نوک خود تک کھسکا دی۔

"میرا خیال ہے تم جھوٹے ہو اجنبی۔ اگر تم طراق کے دستِ راست اور کمان دار ہو تو بتاؤ کہ ڈھال پر "اوناغنتر" کے جو الفاظ کندہ ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟"

"میں ایک جنگجو ضرور ہُوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے مدرسے میں کبھی تعلیم حاصل نہیں کی۔ میرے دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ کسی عالم سے ان کا مطلب پوچھوں۔ تم بھی تو ایک عالم ہو، کیا تم مجھے ان الفاظ کے معنی بتا سکتے ہو؟ یا تم بھی میری طرح جاہل ہو اور عالم کا روپ دھارے پھرتے ہو؟"

"نہیں...!" وہ بولا۔ "میں عالم ہُوں اور یہ الفاظ..."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے خود، تلوار کی نوک سے ثالپ کی طرف اچھالتے ہُوئے مُونا سے کہا: "سر جھکا لو مُونا!"

ثالپ نے اگرچہ راغو کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا مگر وہ لاشعوری طور پر پیچھے ہٹا، اُدھر مُونا جھکی اور ایک طرف ہٹ گئی۔ خود دیوار سے ٹکرایا اور لڑھکتا ہُوا تخت سے نیچے گر گیا... مگر اس دوران میں میں ایک ہی جست میں دس قدم کا فاصلہ طے کر کے ثالپ کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

ثالپ نے راغو کو مجھ پر دھکیل دیا اور خود جان بچانے کے لیے بھاگا۔ راغو کے ٹکرانے سے گرتے گرتے بچا، سنبھلا اور پھر میں نے ثالپ کو خنجر پھینکنے کی مہلت نہیں دی۔

اُس نے میرا وار ہاتھوں پر روکا اور ڈھیر ہو گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ راغو کا کیا حشر ہُوا ہے۔ وہ مُنہ کے بل گرا ہُوا تھا۔ میں سیدھا تخت کی طرف آیا اور مُونا کو زنجیروں سے آزاد کرنا چاہا... مگر زنجیروں کو تخت کے ساتھ لگے ہُوئے کُنڈوں میں ڈال کر اُنھیں تالے لگا دیے گئے تھے۔ میں نے لپک کر انگیٹھی کے پاس رکھی ہُوئی سلاخیں اُٹھائیں اور تالوں کے کڑوں میں ڈال کر اُنھیں توڑنے کی کوشش کی... مگر وہ بے حد مضبوط تھے۔

سلاخیں مُڑ گئیں۔

مجھے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا کیونکہ اب کہیں سے سپاہیوں کے قدموں کی چاپ سُنائی دینے لگی تھی۔

میں نے مُڑی ہُوئی سلاخیں مروڑ کر تالے توڑ دیے اور مُونا زنجیروں سے آزاد ہو گئی۔ وہ تعجب، نفرت اور غصّے سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"میری طرف یُوں کیا دیکھ رہی ہو؟ میں اس جگہ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا کیونکہ میں اجنبی ہُوں تمھیں میری رہبری کرنی ہے تاکہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔"

...مگر وہ اُسی طرح کھڑی رہی۔

سپاہیوں کے قدموں کی چاپ اور قریب آ گئی تھی۔

"وقت ضائع مت کرو لڑکی۔ ورنہ ہم دونوں ہی مارے جائیں گے مجھے راستہ دکھاؤ تاکہ ہم شہر سے نکل کر ساحل تک پہنچ سکیں۔ جلدی کرو۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔"

"میں تمھیں راستہ دکھا سکتی ہُوں۔ وہاں میرے وفادار میری راہ دیکھ رہے ہوں گے... مگر پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔"

"یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے لڑکی۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ میں تمھارا دُشمن نہیں بلکہ دوست ہُوں۔"

"مگر میں تم پر کیسے یقین کر لوں؟" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

سپاہیوں کے قدموں کی چاپ قریب تر آ گئی تھی اور اب وہ کسی بھی لمحے اس جگہ داخل ہو سکتے تھے۔

مجھے غصّہ آ گیا۔

میں نے تلوار چپٹی کر کے اُس کی ٹانگ پر ہلکے سے مارتے ہُوئے کہا: "مجھے راستہ بتاؤ اور فالتو باتیں مت کرو۔ چلو۔"

وہ میرے تیور دیکھ کر وہاں سے چل پڑی... مگر اُس کے تیور بھی اچھے نہیں تھے، اس لیے میں نے اُسے اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور یُوں ہم ایک سُرنگ میں داخل ہو گئے۔

وہ ایک مشعل کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولی: "احتیاط سے قدم رکھنا۔ ایک موڑ کے بعد خفیہ زینہ آئے گا۔"

اتنے میں مجھے پیچھے سے شور و غل سنائی دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔
بہت سے سپاہی ہال میں داخل ہو رہے تھے۔

ہم اندھیرے میں تھے اس لیے میں انہیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ ان کی ڈھالوں پر سانپ کی شبیہہ کندہ تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ طالب سپاہیوں کی آمد پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور زخمی ہاتھوں سے سرنگ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "وہ اُدھر گئے ہیں۔ جو انہیں پکڑے گا اُسے سونے سے بھرا ہوا ٹوکرا ملے گا۔"

میں یہ سن کر دوڑنے لگا۔

مجھے خود پر افسوس ہو رہا تھا اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ میں نے اس وقت طالب کی گردن تن سے کیوں جدا نہیں کر دی۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے گا... مگر وہ مردود نہ صرف زندہ رہا تھا بلکہ اب ہمارے تعاقب میں آنے والے سپاہیوں کی رہنمائی بھی کر رہا تھا۔

جب ہم کچھ آگے نکل گئے تو مونا نے سرگوشی میں کہا: "آگے راستہ دائیں جانب مڑے گا۔ وہاں ایک مصنوعی دیوار ہے جو بظاہر راستہ روک لیتی ہے۔ لیکن اس کے بائیں طرف سے راستہ اندر جاتا ہے اور اس کے آگے سیڑھیاں ہیں... مگر سیڑھیوں سے پہلے ایک گڑھا ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا۔"

میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔
مونا کا بوجھ اب مجھے زیادہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

یہ ہمارے سفر کا چوتھا روز تھا۔

ہم دلدلی علاقے کے جنگل سے نکل کر ساحل کے قریب "نغمہ سرا" پہاڑیوں تک پہنچ گئے تھے اور یہاں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ مونا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے وفادار اس کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ واقعی مونا کے منتظر تھے... مگر اس کی آمد سے مایوس ہو چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ طالب اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے؟... مگر جب میں مونا کو لیے ان تک پہنچا تو ان دل گرفتہ لوگوں کے منہ سے خوشی کی چیخیں نکل گئی تھیں اور وہ مجھے اپنے دیوہیکل وجود کی بنا پر ہی نہیں بلکہ ان کی زندہ دیوی کو پجاریوں کے چنگل سے چھڑا لانے کے باعث عظیم سمجھنے لگے تھے۔

... مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مونا کے یہ وفادار نہ تو سپاہی تھے اور نہ ہی اہلِ حکومت... یہ لوگ مونا کے ذاتی خادموں اور کاہنوں پر مشتمل تھے۔ ان میں اکثریت خواجہ سراؤں کی تھی۔ ان کے علاوہ بہت سی عورتیں، بچے، بوڑھے اور صرف چند ایک نوجوان تھے۔

میں ان ہزیمت خوردہ لوگوں سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا، جنگ لڑنا تو کجا، اگر طراق کا ایک دستہ ہی ہمارے تعاقب میں آ جاتا تو یہ لوگ اس کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود میں ان سب کا خودساختہ کمان دار بن گیا اور دلدلی علاقے کے جنگل میں سانپوں اور دوسرے جانوروں سے لڑتا بھڑتا اور انہیں فنا کرتا ہوا "نغمہ سرا" پہاڑیوں تک لے آیا تھا۔

اپنے وفاداروں میں پہنچتے ہی مونا کا رویہ یکسر بدل گیا تھا۔ وہ اپنی داسیوں اور خواجہ سراؤں کے ہجوم میں گھری رہتی تھی۔ مجھے ملنے سے کتراتی تھی لیکن اگر کوئی کام لینا یا مشورہ دینا لینا ہوتا تو مجھے اپنے پاس بلوا لیتی تھی۔ اس کی ہر ادا اور لہجے میں تحکم شامل ہو گیا تھا اور وہ مجھے بھی اپنے ان معتقدین میں شمار کرنے لگی تھی جو اسے سچ مچ کی دیوی سمجھتے اور اس کی پرستش کرتے تھے۔

یہ ساری باتیں مجھے اندر ہی اندر کھولا رہی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

"نغمہ سرا" پہاڑیاں ساحلِ سمندر پر واقع تھیں۔ ان کے اردگرد دلدلی جھاڑیوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا جس میں زہریلے سانپوں کی بہتات تھی۔ یہاں تک پہنچتے ہوئے ہمارے قافلے کے چار افراد سانپوں کے ڈسنے سے لقمۂ اجل بن گئے تھے۔

ہم نغمہ سرا پہاڑیوں پر اس امید میں آئے تھے کہ ہمیں جزیرۂ ردمو سے کمک مل جائے گی اور وہ لوگ ہماری مدد کو آ جائیں گے... مگر کافی دن گزرنے کے بعد بھی جب نہ تو کمک آئی اور نہ ہی کوئی پیغام ملا تو مجھے وحشت ہونے لگی۔

طراق نے غالباً اس لیے ہمارا پیچھا نہیں کیا کہ وہ جانتا تھا کہ رسد ختم ہوتے ہی ہم سب ہلاک ہو جائیں گے یا مجبوراً خود ہی بوتھان واپس آ کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں گے۔ اس خیال کی تائید طراق کے اس بحری بیڑے سے بھی ہوتی تھی جو ساحل سے دور بیچ سمندر گشت کیا کرتا تھا تاکہ جزیرۂ ردمو سے آنے والوں کو روکا جا سکے۔ اس بیڑے کے محافظوں کو اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ہم نغمہ سرا پہاڑیوں میں پناہ لے چکے ہیں ورنہ شاید وہ ساحل کے قریب آنے کی کوشش ضرور کرتے۔

ان پہاڑیوں کو نغمہ سرا پہاڑیاں اس لیے کہا جاتا تھا کہ مسلسل چلنے والی سمندر کی کھاری ہواؤں نے چٹانوں میں لاتعداد چھوٹے بڑے سوراخ کر دیے تھے اور جب ہوا ان سوراخوں سے گزرتی تھی تو ہر طرف سیٹیاں گونجنے لگتی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے چٹانیں کوئی الوہی گیت گا رہی ہوں۔ ہوا کی بدلتی رفتار کے ساتھ کبھی کبھی یہ موسیقی وحشی روحوں کے نغموں کا روپ بھی دھار لیتی اور کبھی یوں محسوس ہوتا

جیسے کائنات ہماری بے بسی پر بین کر رہی ہو۔

مونا کے وفاداروں میں کچھ بوڑھی جادوگرنیاں بھی تھیں جنہوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ان سیٹیوں سے انہیں غیب سے پیغام ملتے ہیں۔ مجھے ان بے وقوف بوڑھیوں پر ہنسی آتی تھی اور رحم بھی آتا تھا مگر میں بیشتر وقت ان بوڑھیوں یا بچوں کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ بچوں سے تو میں طرح طرح کے کھیل کھیلتا اور بوڑھیوں کی داستانوں سے مجھے بوتھانیوں اور شبستانیوں کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔

ان بوڑھیوں میں ایک جس کا نام کوری تھا، سب سے بڑی جادوگرنی سمجھی جاتی تھی اور وہی لوگوں کو بتایا کرتی تھی کہ ابھی غیب سے کوئی پیغام نہیں ملا ہے۔

مجھے خواجہ سراؤں یا داسیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو ہر وقت مونا کو اپنے گھیرے میں لیے رہتی تھیں۔ میں نے برگا نامی ایک نوخیز لڑکے کو اپنا نائب مقرر کر لیا تھا۔ وہ تلوار چلانے اور نیزہ بازی کے فن سے واقف تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور بال سنہرے تھے اور مونا کی بہت سی داسیاں اسے محبت کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھیں... مگر وہ ان کی طرف توجہ دینے کی بجائے میرے ساتھ رہنا، مجھ سے کچھ سیکھنا اور میری خدمت کرنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔

جب بہت دنوں تک نہ تو کمک آئی اور نہ ہی "غیب کا پیغام" ملا تو میں بری طرح جھنجھلا گیا کیونکہ ہم جو سامانِ رسد لائے تھے وہ ختم ہونے والا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ابھی سے کسی طرح مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا جائے لیکن نیزے کی نوک سے اتنی مچھلیاں شکار نہیں کی جا سکتی تھیں۔ ضرورت کے مطابق مچھلیاں پکڑنے کے لیے مجھے ایک جال کی ضرورت تھی۔

کبھی کبھی تو میں سوچتا تھا کہ مجھے ان سب کو وہیں چھوڑ چھاڑ کر آگے بڑھ جانا چاہیے۔ مجھ پر بوریت کے دورے پڑنے لگے تھے مگر کہیں جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اس بوریت کے عالم میں میں تنہا بیٹھا گھنٹوں سوچتا اور دعا مانگا کرتا کہ میرے سر میں درد ہی شروع ہو جائے۔ وہی درد جو اشارہ نمائی کرتا تھا کہ کمپیوٹر میری تلاش میں ہے... لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس بار ڈاکٹر فریدوں مجھے بھول ہی گیا ہے۔

ایک روز میں ایک چٹان کے سائے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے بوڑھی جادوگرنی کوری آتی دکھائی دی۔ وہ گھنٹوں میرا دماغ چاٹا کرتی تھی اس لیے میں اس سے کچھ چڑ سا گیا تھا۔

جب میں نے اسے اپنی سمت آتے دیکھا تو برگا سے کہا: "اسے وہیں روک دو برگا۔ میرے پاس مت آنے دو۔ میں کچھ سوچنے میں مصروف ہوں۔"

برگا دوڑ کر بڑھیا کے پاس گیا... مگر الٹے قدموں واپس آ گیا اور بولا: "وہ کہتی ہے کہ اسے غیب سے پیغام مل گیا ہے اور وہ پیغام تم تک پہنچانا ضروری ہے کیونکہ اس کا تعلق تم سے ہے۔"

"اسے کہو کہ وہ پیغام تمہیں دے دے اور تم مجھے بتا دینا۔"

برگا میرے تیور بھانپ کر چلا گیا اور اس نے بڑھیا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ "غیب کا پیغام" اسے بتا دے۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے وہ پیغام مجھے سنایا جو بڑھیا نے نغمہ سرا چٹانوں سے وصول کیا تھا۔

اس پیغام کا مفہوم یہ تھا۔

"گاتی چٹانوں نے آج ایک نیا گیت گایا ہے اور ہوائیں غیب سے یہ پیغام لائی ہیں کہ وہ جسے بھیجا گیا تھا اور جو واپس نہیں آیا اسے صحرا میں تلاش کرو جہاں ایک بہت بڑا مکان ہے اور اس مکان میں تمہارے لیے ایک پیغام ہے اور وہ مکان یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جب تم اس مکان تک پہنچو گے تو تمہاری مصیبتیں اور مشکلیں حل ہو جائیں گی۔"

میں نے برگا سے تین بار یہ پیغام سنا مگر اس کا مفہوم میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

"مجھے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"سمجھا تو میں بھی نہیں لیکن اس میں معنے ضرور پوشیدہ ہوں گے کیونکہ یہ کوری نے وصول کیا ہے اور کوری کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ وہ مونا دیوی کی سب سے بڑی جادوگرنی ہے جو مستقبل بینی کرتی ہے اور یہ کام وہ اس وقت سے کر رہی ہے جب بوتھان بڑا شہر نہیں بلکہ ایک بستی تھی۔ آپ مجھ سے بہت عقل مند ہیں۔ اس کے پیغام میں خود ہی معنے تلاش کیجیے۔"

میں بھلا اس بے معنی سی بات کو کون سے معنے پہناتا؟

"جاؤ مونا کو یہاں بلا لاؤ۔ اس سے کہنا کہ بہت ضروری کام ہے۔"

برگا گیا اور چند لمحے بعد تنہا ہی واپس آ گیا۔

"دیوی نے آپ کو سلام کہا ہے اور...!"

"میں نے تمہیں اس کا سلام لانے کے لیے نہیں کہا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے اسے بلایا تھا۔"

"مگر دیوی کہتی ہے کہ وہ نہیں آ سکتی اور آپ اسے آنے کا حکم بھی نہیں دے سکتے۔ حکم دینے کی مجاز وہ خود ہے اور کوئی نہیں۔ اگر آپ کو کسی اہم معاملے پر بات چیت کرنی ہے تو آپ خود اس کے پاس آئیں۔"

میں یہ سن کر کھول کر رہ گیا۔

"وہ کیا کر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"داسیوں سے سنگار کروا رہی ہے۔"

"تو جاؤ اور اُسے میرے ان الفاظ میں کہو کہ فوراً میرے پاس آجاؤ۔ اگر تم نہیں آؤ گی تو مجھے تمھارے پاس آنا پڑے گا اور تم میرے آنے کا مطلب خوب سمجھتی ہو۔"

برگا چلا گیا۔

میں ایک بار پھر بوڑھی جادوگرنی کے بے معنی الفاظ میں مفہوم تلاش کرنے لگا: "وہ جو تمھارے پاس بھیجا گیا ہے اور جسے واپس نہیں بلایا گیا۔۔" میں نے سوچا کہ بڑھیا کی بات میں کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے کیونکہ وہ خواہ مخواہ کی پیش گوئی کر کے اپنی شہرت کو داغدار نہیں کرے گی۔۔۔ یا ہو سکتا ہے کہ اُس نے رُومو سے آنے والا کوئی جہاز دیکھ لیا ہو۔

میں نے سمندر کی جانب نگاہ ڈالی مگر اُس کا وسیع دامن اپنے اندر صرف نیلا پانی اور لہریں ہی رکھتا تھا۔ اُفق پر تو کیا اُفق کے اُس پار بھی کوئی کشتی یا کوئی جہاز نظر نہ آیا۔

اتنے میں مُونا میرے پاس آ گئی۔

اُس کے ساتھ نہ تو داسیاں تھیں اور نہ ہی خواجہ سرا تھے البتہ برگا ضرور ساتھ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مُونا واقعی ابھی ابھی سنگار کر کے آ رہی ہو۔ وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ اپنے مختصر لباس میں وہ یُوں لگتی تھی جیسے کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہو۔ آج اُس کے چہرے پر نہ تو خوف و دہشت کے آثار تھے اور نہ ہی نیم باز آنکھوں میں کوئی الوہی کیفیت تھی۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی اور یہاں آ گئیں۔"

وہ نچلا لب دانتوں تلے دبا کر عجیب نگاہوں سے مجھے گھورنے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ بولتی میں نے برگا سے کہا۔ "تم دیوی کے خواجہ سراؤں اور خدام کو لے کر جنگل چلے جاؤ اور سُوکھی بیلیں کاٹ کر لے آؤ۔۔۔ مگر بیلیں زیادہ موٹی نہ ہوں۔ پھر دیوی کی داسیوں اور دُوسری عورتوں سے کہو کہ وہ اُن کا جال بُنیں تاکہ مچھلی شکار کی جا سکے۔ تم سارے کام کی نگرانی کرتے رہنا۔ جاؤ۔"

"نہیں۔ تم یہیں رُکو۔" مُونا نے اُسے حکم دیا پھر مجھ سے بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ برگا یہیں موجود رہے کیونکہ ایک دیوی کو کسی اجنبی سے تنہائی میں نہیں ملنا چاہیے۔"

میں نے مُونا کو جواب دینے کی بجائے برگا سے کہا۔ "تم وہی کرو جو میں نے تم سے کہا ہے۔"

وہ میرے لہجے کی درشتی کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً وہاں سے چلا گیا۔

مُونا نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"تم نے مجھے بلایا اور میں اُصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آ گئی ہوں۔ بولو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں تم سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں مُونا!" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اُن میں پہلی اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ تمھاری یادداشت بہت کمزور ہے۔ تم بھول گئی ہو کہ اگر میں اپنی جان خطرے میں نہ ڈالتا تو اس وقت یا تو تم آنجہانی ہو چکی ہوتیں یا پھر اپنی مسخ شدہ صورت کی بنا پر مرنے کی دُعائیں مانگا کرتیں۔ میں تم سے اس احسان کا کوئی صلہ نہیں مانگتا صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ اور تعاون کرتی رہو۔"

"مجھے موت کے مُنہ سے بچا کر خود تم نے بھی اپنی جان بچائی ہے سرفروش۔ تمھاری زندگی بھی اتنی ہی خطرے میں تھی جتنی کہ میری۔ ثالب صرف میرا ہی دُشمن نہیں، تمھارا بھی تھا۔ تم نہ تو لوتھانی ہو اور نہ ہی شبستانی اور نہ ہی رُومو کے باشندے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں تم پر کیسے اعتماد کر لوں؟ اگر میں نے تم سے کوئی فائدہ اُٹھایا ہے تو تم بھی مجھ سے کوئی فائدہ اُٹھانے کے متمنی ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری غرض سامنے آ چکی ہے مگر تمھارے مقاصد ابھی پوشیدہ ہیں۔ میرا مقصد رُومو پہنچنا ہے اور میری مدد کرنے سے تمھارا کون سے مقصد وابستہ ہے، میں نہیں جانتی۔"

اس وقت وہ کوئی دُوسری ہی مُونا تھی جس نے اپنے رویے کا بڑا ٹھوس جواب اور جواز پیش کیا تھا۔ وہ اس مُونا سے یکسر مختلف تھی جس کے دُوروپ میں اُس عقوبت خانے میں دیکھ چکا تھا جہاں اُس کا چہرہ مسخ کیا جانے والا تھا۔

"تمھیں میرے رویّے سے شکایت ہے اور تم نے مجھے کمزور حافظے کا طعنہ دیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تمھارا اپنا حافظہ کمزور ہے۔ تم بھول گئے ہو کہ میں لوتھان کی ازلی اور ابدی دیوی مُونا کا جیتا جاگتا رُوپ ہوں۔ ایسی اوتار ہُوں جس کی یہاں کے لوگ پرستش کرتے ہیں۔۔۔ مگر تم میرے معتقدین کے سامنے کبھی میرے ساتھ عزت و تکریم سے پیش نہیں آئے۔ تم نے ہمیشہ میرے ساتھ اُس لہجے میں بات کی ہے جس لہجے میں کنیزوں اور داسیوں سے کی جاتی ہے جبکہ میں اپنے ماننے والوں کے سامنے کوئی غلط مثال قائم نہیں کرنا چاہتی۔ اگر تمھارا رویہ میرے ساتھ ایسا ہوتا جیسا کہ دیویوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے تو ہم ایک دُوسرے کے بہترین دوست بن سکتے تھے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔۔۔

"وہ لوگ دُور کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ اگر تم گھٹنے ٹیک

کر میرا ہاتھ چُوم لو تو اُن پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔"

مجھے اُس پر بہت غصہ آیا اور میرا جی چاہا کہ اُسے تھپڑ مار دُوں مگر میں نے اپنا غصّہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں مجھ سے ایسی توقعات ہرگز نہیں رکھنی چاہئیں جھُوٹی دیوی۔ مجھے تمھاری اداکاری پر ہنسی آتی ہے جسے روکنا میرے بس میں نہیں۔ اب تم میرے ساتھ ساحل پر چہل قدمی کرنے چلو ورنہ میں تمھیں تمھارے پرستاروں کے سامنے گھسیٹتا ہُوا لے جاؤں گا۔"

اس نے نہ صرف اپنا بڑھا ہُوا ہاتھ کھینچ لیا بلکہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اب اُس کی آنکھوں میں غصّے کے ساتھ ساتھ شرارت بھی تھی۔

"مجھے تمھارا حکم ماننا ہی پڑے گا۔ میرے پاس نہ تو مسلح نفری ہے اور نہ ہی محافظ ہیں۔ تم ہمارے درمیان واحد جنگجو ہو۔ اور میری حفاظت کر سکتے ہو۔ اسی لیے دیوی تمھارے ساتھ رعایت برتنے پر مجبور ہے۔"

"بہتر یہ ہو گا کہ تم میرے سامنے نہ تو خود کو دیوی کہا کرو اور نہ ہی دیوی جیسا انداز اختیار کیا کرو۔"

"مگر کیوں۔ جب میں دیوی ہُوں تو ایسا کیوں نہ کروں؟"

"تم دیوی نہیں بلکہ ایک بیسوا ہو!" میں نے غصّے سے جواب دیا۔ "کیا تمھارے دروازے لوتھان کے بہادروں کے لیے کھُلے نہیں رہتے تھے؟"

"دیوی کا ایک فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ وطن کے بہادروں کی حوصلہ افزائی کرے۔ بہادر صرف چڑھاوے چڑھانے کے لیے نہیں ہوتے، اُنھیں دیوی اپنی خوشنودی کا نذرانہ بھی دیا کرتی ہے۔"

"لیکن وہ موٹا کاہن ثالب نہ تو جنگجو تھا اور نہ ہی بہادر تھا۔ پھر تم نے اس کی حوصلہ افزائی کیوں کی؟"

میری اس بات پر وہ بھونچکا سی رہ گئی۔

"تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟ کہیں تم سچ مچ کے شیطان تو نہیں ہو؟" وہ بے ساختہ بولی۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے اُس کا ایک بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مجھے ثالب سے بھی گیا گزرا سمجھتی ہو۔۔۔؟"

"اوہ تو یہ بات ہے۔"

"نہیں!" میں نے اُسے ہلکے سے جھنجوڑتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں کسی بیسوا کی خوشنودی کا طلب گار نہیں ہو سکتا۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں تاکہ تم میرے سامنے دیویوں کے تقدس کا ڈھونگ نہ رچایا کرو۔"

وہ خاموش ہو گئی اور اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر جھکا لیا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی اُترنے لگی ہے مگر میں انجان بن گیا۔

اُس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے تھے؟"

"میں تم سے ایک پہیلی بُجھوانا چاہتا ہُوں۔"

"پہیلی۔۔۔ کیسی پہیلی؟" وہ چونک پڑی۔

میں نے اُسے کوری کی پیش گوئی بتا دی اور پوچھا۔ "ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟"

"میں نہیں جانتی لیکن اگر کوری نے یہ پیش گوئی کی ہے تو اس کے معنے ضرور ہوں گے کیونکہ نغمہ سرا چٹانوں کے گیت اور ہواؤں کے پیغام صرف وہی سمجھ سکتی ہے۔"

"میں اس بکواس پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ مجھے یہ مہا جادوگرنی بھی کوئی گھُنی ہی لگتی ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "اب تک اُس نے جتنی بھی پیش گوئیاں کی ہیں، وہ ہمیشہ سچ ثابت ہوئی ہیں۔"

"یہ سب ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔ میں اس بڑھیا کو ہمیشہ اِدھر اُدھر جاتے دیکھتا ہُوں۔ اُس نے قریب ہی کہیں کوئی ایسا مکان یا کھنڈر دیکھ لیے ہوں گے اور وہ چاہتی ہو گی کہ ہم اُنھیں تلاش کریں۔"

"مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو بعد کی بات ہے۔ آؤ پہلے وہ مکان یا کھنڈر تلاش کریں۔"

مُونا بلاچون وچرا میرے ساتھ چلنے لگی۔

کچھ دُور جانے کے بعد ہمیں چٹانوں کے درمیان ایک پُرانے قلعے کے بُرج نظر آئے۔

"وہ دیکھ رہی ہو۔ شاید کوری کا اشارہ اسی طرف تھا۔ آؤ قریب چل کر دیکھیں۔"

"اُسے دیکھ کر کیا کریں گے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ یہ بعد میں سوچیں گے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے اپنا ایک پیام بر رُومو بھیجا تھا؟"

"ہاں۔۔۔" وہ بولی۔ "میں نے فیڈو کو اُس وقت روانہ کر دیا تھا جب شبستانیوں نے شب خون مارا تھا اور ثالب مجھے گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فیڈو کے ذریعے رُومو سے کمک منگوائی تھی تاکہ وہاں سے جہاز آئیں اور ہمیں یہاں سے لے جائیں۔"

"فیڈو کون ہے اور کیسا آدمی ہے؟ کیا وہ جنگجو ہے؟"

میں نے پُوچھا۔

"غلط مت سمجھو، وہ میرا انتہائی قابلِ اعتماد خواجہ سرا ہے"

"کیا تم نے پہلے کبھی اُسے رومو بھیجا تھا؟"

"ہاں۔ وہ کئی بار وہاں جا چکا ہے، مگر اس بار ایسا گیا ہے کہ واپس ہی نہیں آیا"

اُس کی اس بات سے اچانک مجھے کوری کی پیشین گوئی کے الفاظ یاد آ گئے۔

گاتی چٹانوں نے آج پھر ایک نیا گیت گایا
ہے اور ہوائیں غیب کا پیغام لائی ہیں کہ وہ جسے
بھیجا گیا تھا اور جو واپس نہیں آیا، اسے صحرا میں
تلاش کرو جہاں ایک بہت بڑا مکان ہے اور اُس
مکان میں تمہارے لیے ایک پیغام ہے اور وہ
مکان یہاں سے دُور نہیں ہے جب تم اس مکان
تک پہنچو گے تو تمہاری مصیبتیں اور مشکلیں حل ہو
جائیں گی"

میں نے کوری کی پیشین گوئی مُونا کے سامنے دُہراتے ہُوئے کہا "میرا خیال ہے کہ وہاں یہ پہیلی حل ہو جائے گی۔ اگر چٹانوں کے گیتوں اور ہواؤں نے کوری کو یہ پیغام دیا ہے تو تمہارا پیامبر ہمیں وہاں مِل جائے گا جو رومو نہیں پہنچ سکا"

"لیکن میرا پیامبر یہاں کیوں آتا؟"

"ہو سکتا ہے اُس نے اپنی کشتی اُن چٹانوں کے پیچھے چھپا رکھی ہو جو سمندر میں چلی گئی ہو۔ اگر ہم وہاں چل کر کوری کی پیشین گوئی کی تصدیق کریں تو اس میں حرج ہی کیا ہے!"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ کوری وہاں تک گئی ہو گی"

"مگر مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں آئی ہے"

ہم تیزی سے اُن چٹانوں کی طرف بڑھنے لگے۔

ہم اُن کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ چٹانیں قدرتی نہیں بلکہ بڑے بڑے پتھروں کو کاٹ کر اہرام کی طرح سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ البتہ ان سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہمیں کچھ چٹانوں پر ضرور چڑھنا پڑا تھا اور وہاں سے میں نے جو منظر دیکھا، وہ بڑا ہی عجیب تھا۔

اہرام کی طرح بنی ہُوئی یہ سیڑھیاں ایک چھوٹے سے معبد تک جاتی تھیں جس کے چاروں طرف یہ چٹانیں ایک پیالے کی شکل میں اُسے گھیرے ہُوئے تھیں۔ معبد سنگِ سفید سے تعمیر کیا گیا تھا اُس کی چھت بلند اور کسی پگوڈا جیسی تھی مگر اُوپر سے اُسے جان بُوجھ کر نہیں ڈھانپا گیا تھا یا پھر سب سے اُوپر والے تختے یا پتھر امتدادِ زمانہ سے ختم ہو گئے تھے اس لیے معبد پہلی نظر میں ایک مُردہ آتش فشاں ہی دکھائی دیتا تھا۔

آخری سیڑھی سے معبد کے دروازے تک بجری بچھی ہُوئی تھی۔

مُونا یہ نظارا دیکھ کر کچھ خوف زدہ ہو گئی۔

"نہیں سرفردش! آگے مت بڑھو، مجھے ڈر لگ رہا ہے، آؤ یہیں سے لوٹ چلیں" وہ کانپ کر بولی۔

"دیویاں خوف زدہ نہیں ہُوا کرتیں" میں نے مسکراتے ہُوئے کہا "پھر میں تمہارے ساتھ ہُوں تو ڈر کیسا؟"

میں اُسے بازو سے تھام کر سیڑھیاں اُترنے لگا۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہُوا تھا۔

ہم آگے بڑھ کر معبد کے بیرونی کمرے میں داخل ہُوئے تو صرف مُونا ہی نہیں، خود میں بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔

اس کمرے کے چاروں کونوں میں کسی کی لاش کے چار ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور مقتول کا سر کمرے کے بیچوں بیچ رکھا ہُوا تھا۔ کیکڑوں یا چوہوں نے اگرچہ لاش کا بیشتر گوشت نوچ کھایا تھا مگر لباس اور خود کی وجہ سے کچھ حصّے بچ گئے تھے اور لاش قابلِ شناخت حالت میں تھی۔ مُونا اُسے دیکھتے ہی چیخ اُٹھی "یہ میرے پیامبر فیڈو کی لاش ہے۔"

ایک لمحے تک وہ خوف و دہشت سے تھر تھراتی رہی پھر اچانک میرے قریب سمٹ آئی۔

"کوری کی پیش گوئی پُوری ہو چکی ہے۔ آؤ اب یہاں سے نکل چلیں" وہ کانپ کر بولی۔

"لیکن ابھی تو پیش گوئی کا صرف پہلا حصّہ ہی پُورا ہُوا ہے۔ مشکلیں اور مصیبتیں تو حل نہیں ہُوئیں بلکہ یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ تمہارے پیامبر کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"یہ باتیں رہنے دو... میں جس بات سے اب تک ڈر رہی تھی، وہ ضرور پُوری ہو گئی ہے"

"وہ کیا...؟" میں نے پُوچھا۔

"تم نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے... سچ تو یہ ہے کہ میں دیوانہ وار تمہیں چاہتی رہی ہُوں مگر مجھے تم سے ڈر بھی لگتا رہا ہے۔ میرا دل اور سراپا تمہارے لیے تڑپتا رہا مگر... مگر اب میں تم سے دُور نہیں رہ سکتی"

میں اُس کے رویّے کی اس اچانک تبدیلی پر حیران ہُوئے

بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے سوچا کہ ایک لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر اظہارِ محبت کا یہ کونسا موقع ہے؟... کیا ایسے مواقع پر بھی محبت کے جذبات جاگ سکتے ہیں؟ نہیں، کوئی عورت اتنی شقی القلب نہیں ہو سکتی... مگر وہ اپنے پیامبر کی موت پر دل گرفتہ ہونے کی بجائے میرے ساتھ قول و قرار میں مصروف تھی۔

"یہاں سے چلو سرفردش۔ اب میں کبھی تمہارے سامنے دیوی بن کر نہیں آؤں گی۔ تم ہمیشہ اپنی داسی پاؤ گے" وہ کہہ رہی تھی۔

اُس کے اِس رویّے کے باعث میری نگاہیں لاش کے ٹکڑوں کا جائزہ لے رہی تھیں اور بالآخر مجھے وہ چیز نظر آ ہی گئی جس سے وہ میری توجہ ہٹانا چاہتی تھی۔

فیڈو کے ایک ہاتھ کے پاس ایسی نلکی سی پڑی تھی جس میں خریطے بھیجے جاتے ہیں۔

"کیا سوچ رہے ہو سرفردش... چلو نا" وہ بولی اور پھر اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ شاید وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میں کیا دیکھ رہا ہُوں۔

میں نے جلدی سے اپنی نگاہیں اُس پر مرکوز کر دیں۔

"کیا تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا؟... اگر تمہیں شک ہے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے... تو تم اسی وقت میرا گلا گھونٹ دو تمہاری بدگمانی کے ساتھ میرا جینا بیکار رہے"

"نہیں نہیں مونا... میں بھی تمہیں چاہتا ہُوں۔ میں تمہیں ویسی دیوی نہیں سمجھا جیسی کہ تمہارے دیگر پرستار سمجھتے ہیں لیکن تھوڑی دیر صبر کر لو تو بہتر ہے"

"نہیں... اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا" وہ بولی "آؤ چٹانوں کے اُس پار ساحل ریت پر بیٹھ کر باتیں کریں گے"

"اُن باتوں سے پہلے مجھے ایک دو سوالوں کے جواب دے دو"

"وہ کیا؟" مُونا یکایک چونک پڑی۔

"تم نے اپنا یہ پیامبر رومو کی طرف کب روانہ کیا تھا؟ حملے والی رات کو تو اُس کے وہاں سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا!"

"میں نے اُسے حملے سے دو روز پہلے ہی روانہ کر دیا تھا" وہ بولی "آؤ باقی باتیں اُدھر چل کر کر لینا"

"مگر میرے ذہن سے اُس کے ایک ہی جواب نے اسرار کے سارے پردے ہٹا دیے تھے۔ میں نے مُونا کو بازوؤں سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"تم نے فیڈو کو شبستانیوں کے حملے سے دو روز پہلے رومو روانہ کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم دو روز پہلے سے جانتی تھیں کہ طراق کب شب خون مارے گا... تم جانتی تھیں کہ ٹالپ زمینی سرنگ کے راستے اُس کے لشکر کی رہنمائی کرے گا اور ٹالپ تمہیں محض اس لیے ختم کرنا چاہتا تھا، تم جانتی تھیں کہ وہ غدّار ہے۔ اس کے باوجود تم نے بوتھان کے کان دارا علاکر حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کیا۔ تم مقوبت خانے میں وطن پرستی کے موضوع پر جو پُر جوش تقریر کر رہی تھیں، وہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ تم نے اپنے جلتے اور مرتے ہُوئے شہر کی مدد کے لیے نہیں بلکہ اپنی مدد کے لیے فیڈو کو رومو روانہ کیا تھا"

پہلے تو وہ غصّے اور نفرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "یہ جھوٹ ہے تم نے مجھ پر اتنا بڑا بہتان لگانے کی جرأت کیسے کی؟... اور یہ الزام اُس وقت کیوں عاید کیا جب میں نے اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا..."

وہ بلا کی اداکارہ تھی... مگر اب میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور کہا "میرا خیال ہے دیوی کہ تم اور ٹالپ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو لیکن ٹالپ تم سے زیادہ تیز اور زیادہ چالاک ثابت ہُوا۔ اس کے آدمیوں نے تمہارے پیامبر کو ختم کر دیا کہ اگر تم کسی طرح یہاں تک پہنچ جاؤ تو اس کا حشر ضرور دیکھ لو۔ ویسے ٹالپ کو یہ توقع نہیں تھی کہ تم یہاں تک پہنچ جاؤ گی۔ اس صورتِ حال میں رومو کی طرف سے کسی مدد اور کسی کمک کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے اب تمہیں مجھ پر انحصار کرنا پڑے گا... اور ہاں اب مجھ سے کبھی جھوٹ مت بولنا، کوئی فریب مت کرنا"

وہ خاموش رہی۔

"کیا اب بھی تمہیں مجھ سے محبت ہے دیوی؟" میں نے کہا۔

وہ شکست خوردہ معلوم ہو رہی تھی... مگر اس نے زور لگا کر اپنی کلائی میرے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی تو میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی کہ دیکھوں وہ کیا کرتی ہے... مگر وہ وہاں سے بھاگنے یا مجھ پر حملہ کرنے کے بجائے دوسرے ہاتھ سے کلائی مسلنے لگی۔

"تم نے مجھے بڑی تکلیف پہنچائی ہے اور تمہیں اس کی پوری پُوری قیمت چکانی پڑے گی۔ تمہیں ان معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا خیال ہے تم واقعی شیطان ہو اور اپنے اندر پُراسرار قوتیں رکھتے ہو۔ تم انھیں استعمال کر کے پھر سے وہاں کیوں نہیں چلے جاتے جہاں سے آئے ہو"

میں نے دوبارہ اس کی کلائی پکڑنا چاہی تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

"اب مجھے چھونے کی جرأت بھی نہ کرنا" وہ غرائی۔

"تمہارا یہ انداز مجھے بے حد پسند آیا ہے" یہ کہہ کر میں آگے بڑھا اور وہ نلکی اُٹھالی۔

مُونا خونخوار انداز سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے نلکی کھول کر عریضہ نکالا اور بآوازِ بلند پڑھنے لگا۔

وُزرِ شہوار ولیشا کی خدمت میں عرض گزار ہوں کہ بوتھان میں مجھے جو فرض سونپا گیا تھا، وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔ اب مجھے اور مجھ سے وابستہ افراد کو تحفظ کی ضرورت لاحق ہے۔ اس لیے میرا یہ پیام، فیڈو جہاں کہے، وہاں جہاز بھیج دیا جائے۔ براہِ کرم میری اس درخواست پر فوری عمل فرمایا جائے کیونکہ یہاں حالات ناگفتہ بہ ہوچکے ہیں اور ہم سب کو اپنی جان کا خطرہ ہے ویسے ہمارا منصوبہ پُوری طرح کامیاب ثابت ہوا، شبستانیوں اور بوتھانیوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہوگئی ہے۔ اس جنگ سے دونوں فریقوں بالخصوص طمراق کو کافی نقصان پہنچے گا اور ردمو کو جنگی تیاریوں کے لیے خاصا وقت مل جائے گا۔ چونکہ طمراق اس جنگ سے کمزور ہو جائے گا اس لیے شبستانیوں پر ہمارا حملہ کامیاب رہے گا۔

ثالپ مجھ سے مشکوک ہوگیا ہے اور اس کا خیال درست ہے کہ بوتھان اس جنگ میں تباہ ہو جائے گا اس لیے اس نے پہلے سے طمراق کی خوشنودی حاصل کرلی ہے اور وہی اس کی سپاہ کی رہبری کرے گا۔ مگر میں اس کی غداری کا پول نہیں کھول سکتی کیونکہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ باقی باتیں زبانی عرض کروں گی بہرحال میں نے اپنا فرض پورا کردیا ہے اور اب آپ کی مدد کی طالب اور جہاز کی منتظر ہوں۔

آپ کی کنیز۔ مُونا۔

میں نے یہ خط پڑھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔ "ثالپ بھی تمہیں غدار کہنے اور گمراہ کُن اجلاس بُلانے پر ملزم ٹھہرانے میں حق بجانب تھا۔ جتنی غداری اس نے بوتھان کے ساتھ کی ہے اتنی ہی تم نے بھی کی ہے"۔

"نہیں..." وہ بولی "میں نے بُوتھانیوں سے کوئی غداری نہیں کی کیونکہ میں بُوتھانی نہیں ہوں۔ میں ردمو کی رہنے والی ہوں، میرا وطن ردمو ہے اور میں نے ردمو کی ہر ممکن خدمت کی ہے۔ میں وُزرِ شہوار ردمو کی ملکہ ولیشا کی نواسی ہوں"۔

یہ جان کر ساری صورتِ حال میری سمجھ میں آگئی۔

جنگ وجدل کے اس پُورے کھیل میں ردمو نے وہی کردار ادا کیا تھا جو ہمارے دور اور دُنیا میں عظیم طاقتیں ادا کر رہی ہیں۔ ردمو نے اپنی گندی اور گھناؤنی حکمتِ عملی سے بوتھان اور شبستان کے درمیان انتہائی خونریز جنگ کرادی تھی۔

دو آدمیوں، دو قوموں اور دو ملکوں کو لڑا کر اپنی منفعت بازاری کرنا صدیوں تک انگریز کا بھی وطیرہ رہا ہے۔ اس نے بھی ہمیشہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمتِ عملی پر عمل کیا ہے اور یہی حربہ ما قبل تاریخ کے اس اندھے زمانے میں بھی استعمال کیا جا رہا تھا۔ ردمو اُن دو سلطنتوں، بوتھان اور شبستان کو آپس میں لڑا کر کمزور کر دینا اور اُن پر غالب آنا چاہتا تھا... اور اس سلسلے میں مونا ایک انتہائی اہم اور خطرناک جاسوس کا کردار ادا کر رہی تھی۔

"اوہ، تو تم نے جاسوسی کے لیے دیوی کا روپ اپنایا"۔ میں نے مُونا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

مُونا کچھ کہے بغیر میری طرف دیکھتی رہی۔ وہ دراصل میرے تاثرات وجذبات کا جائزہ لینا چاہتی تھی کہ اس صورتِ حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد میرا رویّہ کیا رہتا ہے؟ اب وہ پُوری طرح میرے رحم وکرم پر تھی کیونکہ اُسے ردمو سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی اور شبستانی کسی وقت بھی یہاں آسکتے تھے۔ وہ تو دراصل ڈھیل دے کر بلی چوہے والا کھیل کھیل رہے تھے اور انھیں یقین تھا کہ مُونا خود ہی لوٹ آئے گی۔ مُونا کو بھی اب اس بات کا پُورا پُورا احساس ہو گیا تھا۔ اِدھر میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے اپنے اعتماد میں لے کر وہ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے تو میرے حق میں بہتر ہوگا۔ اُس کے دشمنانہ رویّے سے مجھے نقصان ہی پہنچ سکتا تھا کیونکہ اُس کے ساتھ ساتھ میں خود بھی غلط حالات کا شکار ہوگیا تھا۔

"اچھی طرح سوچ لو مُونا۔ اِن حالات میں صرف میں ہی تمہارے لیے امید وکامرانی کی آخری کرن ہوں"۔ میں نے کہا۔

اس نے جو کچھ سوچنا تھا اب تک سوچ چکی تھی۔ اُس نے فوراً اپنا ہاتھ میری طرف بڑھادیا اور بولی "آؤ۔ معبد کے اندر چلیں۔ میں تمہارے سوال کا جواب وہیں دوں گی"۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"اگر مجھے زندہ رہنا اور ردمو واپس پہنچنا ہے تو مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ وُزرِ شہوار ردمو ولیشا کو میرا پیغام نہیں پہنچ سکا لہٰذا اس کی طرف سے مجھے کوئی مدد نہیں مل سکے گی۔ تم ایک اجنبی ہو اور میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اگر تم شیطان نہیں، تو شیطانی قوتوں کے مالک ضرور ہو مگر چونکہ یہاں کے حالات سے مکمل آگاہی نہیں رکھتے، اس لیے تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے گی اور جس طرح تم میری مدد کروگے، اسی طرح میں بھی تمہارے کام آؤں گی"۔

مجھے اس کے خیالات سے متفق ہونا پڑا۔

ہم معبد میں، قربان گاہ والے کمرے میں آگئے مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ معبد تعمیر نہیں کیا گیا تھا بلکہ اُسے ایک مُردہ آتش فشاں پہاڑی میں تراشا گیا تھا۔ اسی لیے سیڑھیوں سے اس کا بالائی حصہ آتش فشاں کا دہانہ دکھائی دیا تھا۔

معبد میں دو قربان گاہیں بنی ہوئی تھیں اور اُن کے سامنے کسی دَور کی مُونا دیوی کا مجسمہ استادہ تھا۔ سامنے والی دیوار میں ایک تنگ سا دروازہ تھا جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا اور روشنی کی کمی کے باعث صاف نظر نہیں آتا تھا کہ وہ کیسا ہے تاہم میں نے یہ اندازہ ضرور کرلیا تھا کہ اُس کمرے میں کیا ہونا چاہیئے اور کیا ہوگا۔

"اب میں تمہیں مُونا کہا کروں یا..."؟ میں نے مسکرا کر کہا۔

"نرگس میرا اصلی نام ہے۔ میں اپنی نانی وُزرِ شہوار ردمو کی چوتھی نواسی ہوں۔ جو نام تمہیں پسند ہو، تم مجھے اسی سے مخاطب کرسکتے ہو"۔

"میں تمہیں مُونا ہی کہا کروں گا۔ یہ نام مجھے پسند ہے کیونکہ تم سے اسی نام کے ساتھ آشنا ہوا تھا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نرگس سے مُونا کیسے بن گئیں۔ ردمو سے بوتھان کیسے اور کب پہنچیں"؟

"مجھے بڑی دُور رس منصوبہ بندی کے نتیجے میں ردمو سے یہاں بھیجا گیا تھا"۔ وہ انگلیوں پر کچھ گنتے ہوئے بولی۔ "میں نے موسمِ گرما دیکھے ہیں مگر جب میں پندرھویں موسمِ گرما میں تھی تو خفیہ طور پر بوتھان کے ایک دُور دراز گاؤں بھیج دیا گیا جہاں ایک ضعیف العمر پُجاری پارس نے مجھے دیکھا اور اعلان کیا کہ میرے اندر مُونا دیوی کی رُوح ہے۔ چنانچہ مجھے بوتھان لایا گیا اور بڑے معبد کے پُجاری مجھے تربیت دینے لگے"۔

"میرا خیال ہے، پُجاری پارس بھی جاسوس اور تمہاری نانی ولیشا کا تنخواہ دار ملازم ہوگا"۔ میں نے کہا۔

"تم ٹھیک سمجھے۔ میں نے تمہیں اُس کا نام اس لیے بتادیا ہے کہ وہ مر چکا ہے اور اپنی خدمات کے سلسلے میں وہ جو سونا وصول کرتا رہا تھا، وہ حاصل کرکے ردمو پہنچا دیا گیا ہے"۔ اتنا کہہ کر اس نے مجھے چھوٹی قربان گاہ پر بٹھادیا۔

"میں یہاں تمہیں صرف باتیں کرنے کے لیے نہیں لائی"۔

"تو پھر کیوں لائی ہو؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے تم سے بہت جھوٹ بولے ہیں... مگر میری اس بات اور اس اعتراف میں حقیقت تھی کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے اور میرا جسم وجان تمہارے لیے تڑپتے رہے ہیں۔ مانا کہ میں تمہاری نظر میں ایک کسبی سے بھی بدتر ہوں لیکن بیسوا بھی اپنے پہلو میں دل رکھتی ہے اور اپنے ہزاروں چاہنے والوں میں سے کسی ایک کو ہی چاہتی ہے۔ اگر تم مجھے کوئی سزا دینا چاہتے ہو تو بعد میں دے لینا۔ اس وقت تو میری ہر خطا معاف کرکے محبت سے میرا ہاتھ تھام لو"۔

سچ بات تو یہ ہے کہ اُس وقت خود میری بھی یہی خواہش تھی۔ چنانچہ میں نے اُسے مایوس نہیں کیا۔

❀

کافی دیر بعد میں اُٹھ کر اس نیم تاریک کمرے میں چلا گیا جو

قربان گاہ سے ملحق تھا... اور جیسا کہ میں نے سوچا تھا، اس میں وہی کچھ پایا۔

اس کمرے میں ایک ایسی کشتی کے حصّے رکھے ہوئے تھے جنھیں باہر کسی جگہ یا سمندر کے کنارے لے جا کر جوڑا جا سکتا تھا اور وہ ایک مکمل کشتی بن سکتی تھی۔ میں نے اُن حصّوں کا جائزہ لیا اور قربان گاہ میں واپس آ گیا جہاں مُونا اب تک قربان گاہ پر بیٹھی ہُوئی تھی۔

وہ بے حد مطمئن اور خوش نظر آ تی تھی۔ اُس نے آنکھیں مُوند رکھی تھیں اور یوں مُسکرا رہی تھی جیسے کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہی ہو۔

"اب جلدی سے اُٹھ جاؤ مُونا!" میں نے کہا۔

مُونا نے آنکھیں کھول دیں: "تھوڑی دیر پہلے تم کتنے مہربان بنے ہُوئے تھے مگر اب کتنے بدل گئے ہو۔" اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میرے قریب آؤ..."

"نہیں مُونا!" میں نے رُوکھے لہجے میں کہا۔ "اب ہر لمحہ بے حد قیمتی ہو گیا ہے۔ تمھارا پیامبر مر چکا ہے۔ تمھارا پیغام تمھاری وزیر غمخوار تک نہیں پہنچ سکا۔ وہاں سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ ثالب اور طراق تمھاری واپسی کے منتظر ہیں اور شاید وہ انتظار سے مایوس ہو کر چل پڑیں یا ممکن ہے تعاقب میں روانہ بھی ہو چکے ہوں، اس لیے ہمیں جلد از جلد ردمو پہنچنا ہے۔"

"مگر ہم وہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان تیس میل تک سمندر حائل ہے۔ شاید تم تیر کر جزیرۂ ردمو تک پہنچ جاؤ لیکن میں اور میرے ساتھی تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"ہم کشتیوں میں وہاں جائیں گے۔" میں نے اُسے بتایا۔

"کشتیاں کہاں سے آئیں گی؟"

اس پر میں اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور کشتی کے حصّے دکھلاتے ہُوئے کہا: "ہم ایسی کشتیاں بنائیں گے۔"

"لیکن ہمارے پاس کشتیاں بنانے کا ساز و سامان کہاں ہے؟" مُونا نے کہا۔

"میرے پاس تلوار ہے جو کلہاڑے کا کام دے گی۔ برگا کے پاس نیزہ ہے جس سے برمے کا کام لیا جائے گا۔ تم چلو تو سہی۔ اب مجھے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال کی ضرورت نہیں بلکہ کشتیوں کی ضرورت ہے۔"

"ایک بات مانو گے، سرفروش؟"

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تنہائی میں، میں تمھاری داسی ہُوں مگر میرے لوگوں کے سامنے مجھے دیوی ہی رہنے دینا۔ اس میں تمھارا بھی فائدہ ہے۔ میں دیوی بن کر اُن سے تمھارے لیے بہت زیادہ کام لے سکتی ہُوں۔"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ تم مجھے ان کی طرح احمق نہ سمجھو اور بے وقوف نہ بناؤ۔ دوسرے میرے خلاف کوئی سازش نہ کرو۔"

"میں تمھارے خلاف سازش کیوں کرنے لگی، سرفروش! میں نے تو تمھیں اپنے جسم و روح کا مالک تسلیم کر لیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ مجھے آج تک تم جیسا ساتھی نہیں ملا... اگر تم واقعی شیطان ہو تو میں انسانوں کی بجائے شیطانوں کو زیادہ پسند کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ تم جیسا دوسرا شیطان بھی کہیں نہیں ملے گا۔"

تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ جب عورت ایسی باتیں کرتی ہے تو اس کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے کہا: "اے نقلی دیوی! میں بھی تمھیں پسند کرتا ہُوں لیکن یہ مت بھولنا کہ تمھاری طرف سے ذرا بھی شبہے میں پڑا تو میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ تمھارے اس حسین چہرے کو تمھارے اس پُرکشش جسم سے الگ کر دوں۔"

"نہیں، سرفروش! جب میں نے تمھیں اپنا اور اپنے ساتھیوں کا نجات دہندہ مان لیا ہے تو تمھیں میرے بارے میں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"

اس وقت تو مُونا نے مجھے اپنی محبت اور تعاون کا یقین دلا دیا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والا وقت انھیں سچ ثابت کرتا ہے یا جھوٹ...

ہم نے جو کشتیاں تیار کیں، وہ کشتیاں کم اور ٹوکریاں زیادہ لگتی تھیں کیونکہ دلدلی جھاڑیوں سے ہمیں ایسی لکڑی تو نہیں مل سکتی تھی جس سے تختے بنائے جاتے اور اگر موٹے تنے کے درخت مل بھی جاتے تو ہمارے پاس ایسا ساز و سامان کہاں تھا کہ لکڑیاں چیرتے... بس میری سمجھ میں اتنا ہی آیا کہ جھاڑیوں کی پتلی پتلی شاخوں سے ٹوکریاں یا ٹوکرے بنا لیے جائیں۔ وہ اتنے مضبوط اور گُتھے ہُوئے ضرور ہوں کہ ٹوٹنے نہ پائیں اور ان میں اتنا گھاس پھونس بھر دیا جائے کہ پانی اندر نہ آ سکے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں کپڑے بھی استعمال کرنے پڑے۔

یہ ٹوکرے اتنے بڑے تھے کہ ان میں تین سے زیادہ افراد نہیں سما سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے تین تین کی ٹولیاں بنا دیں۔ میرے ساتھ ایک المیہ یہ بھی تھا کہ مُونا کے وفاداروں کا سارا عملہ کنیزوں، بوڑھیوں اور خواجہ سراؤں پر مشتمل تھا۔ البتہ صرف برگا ایک ایسا لڑکا تھا جسے میں مردوں میں شمار کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے ساتھ کچھ بچّے بھی تھے۔

جب ہم فرار کے لیے ٹوکرے بنا رہے تھے، اِدھر سمندر میں شبستانیوں کے جہاز گشت کرنے لگے تھے۔ شاید ثالب اور طراق، مُونا کی واپسی سے مایوس ہو چکے تھے اور اب کھلے سمندر میں گشت کرنے والے جہاز اُسے اور اُس کے حامیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ اُن کا دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ رُدمو سے کوئی جہاز ہماری مدد کو نہ آ سکے یا مُونا اور اس کے حامی فرار نہ ہو سکیں۔ چنانچہ دن بھر وہ سامنے سمندر میں گشت کرتے رہتے اور رات کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لنگر ڈال دیتے۔

ہم دن بھر تو چٹانوں، ریت کے ٹیلوں اور جھاڑیوں میں چھپے ٹوکرے بناتے رہتے... مگر شام کو جب اندھیرا پھیل جاتا تو میں ساحل پر آ کر اُن جہازوں کا جائزہ لیا کرتا۔ وہ ایک دوسرے سے تقریباً نصف میل پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہ اندازہ میں نے اُن پر جلنے والی شمعوں سے لگایا تھا۔

جب ٹوکرے تیار ہو گئے تو موسم خراب ہو گیا۔ نہ جانے قدرت کو کیا منظور تھا کہ ہر قدم پر نئی مشکلیں سامنے آ رہی تھیں۔

مجھے ڈر یہ تھا کہ اگر موسم کی خرابی نے طول پکڑ لیا تو چاندنی راتیں شروع ہو جائیں گی جو ہمارے فرار کو ناممکن بنا دیں گی... پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ طراق کے آدمی ساحل پر آ جاتے اور ہم سب کو گرفتار کر لیا جاتا۔

دو روز بعد موسم ٹھیک ہو گیا اور ابھی نیا چاند چڑھنے میں بھی دو روز باقی تھے لہٰذا میں نے اُسی رات فرار کا ارادہ کر لیا اور شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی ٹوکروں سمیت سب کو ساحل پر لے آیا۔ ہر ٹوکرے کے ساتھ میں نے ایک ایک خواجہ سرا مقرر کر دیا اور اُن کے ساتھ عورتوں کو بھی ہدایت کر دی کہ وہ بوقتِ ضرورت چپّو چلانے میں ان کی مدد کرتی رہیں۔ میں نے اُن سب کو یہ بھی سمجھا دیا کہ اُن کے یہ کشتی نما ٹوکرے جہازوں کے درمیان برابر فاصلہ دے کر آگے بڑھیں گے۔ میں نے اُنھیں ایک ہی جگہ سے نہیں بلکہ مختلف جہازوں کے درمیان سے گزرنے کی تاکید کی اور انھیں ساحل سے الگ الگ مقامات سے روانہ کرنے لگا۔

ہر ناخدا کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ ذرا سی آواز جہازیوں کو چوکنا کر کے ہم سب کی موت کا باعث بن سکتی ہے اس لیے اگر کسی نے اُس وقت تک کوئی بات کی یا آواز نکالی جب تک کہ جہاز نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتے تو ناخدا کو اختیار ہو گا کہ وہ بولنے یا بات کرنے والے کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دے۔

جب میں سوائے دو کشتیوں کے باقی سب کو رخصت کر چکا تو مُونا کی طرف آیا جسے میرے ساتھ جانا تھا۔ اب صرف میں، مُونا، برگا اور دو عورتیں باقی رہ گئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ مُونا، برگا سے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی تھی... مگر جب میں قریب پہنچا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ برگا نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور نظریں چُرا لیں۔

میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ ماجرا کیا ہے اور پھر میرے پاس غور کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے برگا کو بھی وہی ہدایات دیں۔ بوڑھی کوری اور دوسری عورت کو سوار کرایا جس کے ساتھ ایک دُودھ پیتی بچّی بھی تھی اور پھر اُنھیں بھی روانہ کر دیا۔

اب میں اور مُونا باقی رہ گئے تو میں نے اس سے پوچھا۔ "برگا سے کیا سرگوشیاں ہو رہی تھیں؟"

اُس نے قہقہہ لگایا اور بولی: "بس جل گئے۔ ایسی کوئی بات نہیں، سرفروش! دیوی ہونے کے ناتے مجھے ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔ بس اُس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔"

"میں جانتا ہُوں کہ تم اکثر اسی طرح حوصلہ بڑھایا کرتی ہو۔ یہ تمھاری عادتِ ثانیہ ہے۔"

"خواہ مخواہ خون مت جلاؤ، سرفروش۔ ابھی تو برگا کی مسیں بھی نہیں بھیگیں اور تم اُسے اپنا رقیب سمجھنے لگے ہو۔ یہ باتیں چھوڑو اور چلو۔"

میں نے تلوار کشتی میں رکھی، مُونا کو سوار کیا اور سمندر میں اُتر گیا۔

اس وقت سمندر اُتار پر تھا۔ ہوا بہت ہلکی تھی اور چاند چڑھنے میں بہت دیر تھی، اس لیے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہُوا تھا۔

میں اُس وقت تک کشتی کو ہاتھوں سے دھکیلتا رہا جب تک کہ پانی میری گردن تک نہ آ گیا پھر میں بھی کشتی میں سوار ہو کر اُسے کھینے لگا۔

سمندر کی چمکتی لہروں پر مجھے کچھ آگے، برگا کی کشتی کا مختصر سا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے درمیان اب بمشکل بیس پچیس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ دو جہازوں کے بیچ سے گزرتے ہُوئے میں اُس سے آگے نکل جاؤں گا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اُس سے زیادہ مضبوط اور طاقتور تھا، دوسرے

اس کی کشتی میں ایک عورت زیادہ تھی۔

جب ہم دو جہازوں کے درمیان سے گزرنے لگے تو اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

یہ بچی کے رونے کی آواز تھی۔

"بیڑا غرق ہوگیا۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اب ہم سب مارے جائیں گے۔"

میں نے برگا کی کشتی کی جانب دیکھا تو چکرا گیا۔ اس کی کشتی اُلٹ گئی تھی اس نے بچی یا اس کی ماں کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا ہوگا جس سے کشتی کا توازن بگڑ گیا اور وہ اُلٹ گئی۔

یہ صورتِ حال بھی بے حد خطرناک تھی کیونکہ وہ عورت بھی لہروں سے اُبھر کر مدد کے لیے چیخ و پکار کرسکتی تھی۔ میں فوراً اپنی کشتی سے کودا اور تیزی سے اگلی کشتی کی طرف تیرنے لگا جو چند گز دُور تھی۔ میں نے کشتی سیدھی کی۔ اتنے میں برگا بھی پانی کی سطح سے اُبھرا اور کشتی میں سوار ہوگیا۔

"وقت ضائع نہ کرو۔" میں نے دھیمی آواز میں لیکن تحکمانہ لہجے میں کہا۔

برگا تیزی سے کشتی کھینے لگا۔ میں نے عورتوں کی تلاش میں غوطہ لگایا تو ننھی بچی میرے ہاتھ میں آگئی... مگر عورتوں کا پتہ نہ چلا۔ میں اُسے لے کر اپنی کشتی میں آگیا۔ بچی ابھی زندہ تھی... مگر اس کے پیٹ میں پانی بھر گیا تھا۔

مُونا نے اُسے اوندھا کیا تو اس نے قے کرنے کے ساتھ ہی ایک چیخ ماری اور میرا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

ہم اس وقت دو جہازوں کے درمیان گزر رہے تھے اور ہمیں دونوں طرف کے جہازیوں کی آوازیں بھی سُنائی دے رہی تھیں۔ جب اُن کی آواز ہم تک پہنچ سکتی تھی تو بچی کی چیخ بھی یقیناً ان تک پہنچی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر چیختی' میں نے اُسے چھیننا چاہا تاکہ اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر آواز نہ نکلنے دوں... مگر مُونا نے اُسے میرے ہاتھوں کی پہنچ سے دُور کر دیا۔

بچی ایک بار پھر چیخی... مگر اس بار مُونا نے جلدی سے اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ بچی بہل گئی یا اُس کا مُنہ بند ہوگیا اور اُس نے چلاّنا بند کر دیا اتنے میں ایک جہاز سے کسی نے دوسرے جہاز کے ملاّحوں کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔ "کیا زیادہ پی گئے ہو جو بچوّں کی طرح رو رہے ہو؟"

"پینے کے بعد تو تم لوگوں کو اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ ہم تو بھینسے ہیں بھینسے۔ مٹکے پی جائیں اور ڈکار نہ لیں۔" پھر قہقہوں کی آواز آنے لگی۔ انھوں نے نیچے سمندر کی لہروں کو دیکھنے کی بجائے اپنی نگاہیں ایک دوسرے کے جہازوں پر ہی رکھی ہوں گی یا اس کی بھی زحمت نہیں کی ہوگی اور کھانے پینے میں مشغول رہے ہوں گے ورنہ ہماری کشتی کا بچ نکلنا ناممکن تھا جسے میں تیرتے ہُوئے کھینچتا جا رہا تھا کیونکہ چیخو چلانے کی آواز بھی انھیں ہماری طرف متوجہ کرسکتی تھی۔

جب ہم تقریباً آدھ میل دُور نکل آئے تو میں کشتی میں سوار ہو کر دم لینے لگا۔ مُونا بولی۔ "تم اس بچی کو مارنا چاہتے تھے؟"

"نہیں۔ میں اسے چُپ کرانا چاہتا تھا۔"

"مگر تمھاری آنکھوں میں تو کچھ اور ہی تھا۔ میں نے تمھاری آنکھیں پڑھ کر اسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ یہ میری سب سے عزیز کنیز کی بیٹی ہے۔ میں اسے پالوں گی۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور کشتی کھینے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر بولی۔ "کیا کوری اور میری کنیز ڈوب گئی"

"ڈوب ہی گئیں ہوں تو بہتر ہے ورنہ وہ ایک طرف تو ہماری موت بن جائیں گی اور دوسری طرف جہازی تمھاری کنیز کا کیا حشر کریں گے' تم بہتر جانتی ہو۔" یہ کہتے ہُوئے میں نے پلٹ کر جہازوں کی طرف دیکھا۔ ان کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ وہ اُسی طرح لنگر انداز ہیں۔

اگر کوری یا مُونا کی کنیز نے اُبھر کر مدد کے لیے پکارا ہوتا تو اب تک ہلچل مچ چکی ہوتی۔ اب اگر اُن کی لاشیں اُبھریں بھی تو جہازی یہی سمجھیں گے کہ لہریں انھیں ساحل سے بہا لائی ہیں۔

میں مسلسل پانچ گھنٹوں تک کشتی کھیتا رہا کبھی تیر کر اور کبھی چپّو سے۔ اس دوران چاند طلوع ہُوا مگر آخری دنوں کے باعث جلد ہی غروب ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے ہُوا میں صندل اور گلاب کی سی خوشبو رچی ہُوئی ہو۔ پہلے مجھے یہ اپنا واہمہ محسوس ہُوا مگر جب مُونا اس ہُوا میں تیز تیز سانسیں لینے لگی تو میں نے پوچھا۔ "ہوا میں صندل اور گلاب کی خوشبو ہے نا؟"

"ہاں۔ اور یہ خوشبو بتا رہی ہے کہ ہم ساحل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔"

"کیا؟ - کیا کہا ساحل قریب ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"اگر ساحل قریب نہ ہوتا تو ان ہُواؤں میں میرے دیس کے صندل، گلابوں اور دوسرے پھولوں کی خوشبو کیسے رچی ہوتی۔ میرا دیس پھولوں اور خوشبوؤں کا دیس ہے سرفروش!"

"میرا خیال ہے کہ مجھے تمھارا دیس ضرور پسند آئے گا۔ بوتھان بدبو کا شہر تھا۔"

میری نگاہ نے ساحل پر جلنے والا ایک الاؤ دیکھ لیا۔

"یہ آگ کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید انھیں ہماری آمد کی اطلاع مل چکی ہے' سرفروش۔" وہ خوشی سے بولی۔ "یہ آگ انھوں نے ہماری رہنمائی کے لیے جلائی ہے اور جانتے ہو یہ کون سی جگہ ہے؟"

"نہیں۔" میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"یہ ہمارا صدر مقام فیونا ہے۔ وہ ہماری راہ دیکھ رہے ہیں۔"

"مگر تمھارا پیامبر تو یہاں تک پہنچ ہی نہیں پایا تھا، پھر انھیں تمھاری آمد کی اطلاع کیسے ملی ہوگی؟"

مُونا نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ "میری نانی درِ شہوار رومو ولیشا بے وقوف نہیں ہے، سرفروش۔ اس نے بوتھان میں جاسوسوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ اُسے اپنے ذرائع سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہاں کیا بیتی ہے۔ یوں تو اس ساحلی حصّے کی حفاظت کی جاتی ہے... مگر آج اس کی حفاظت اور دفاع پر خاصی توجہ دی جا رہی ہوگی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ طراق' بوتھان پر قابض ہو چکا ہے اور اس کے جاسوس بھی یہاں اپنا کام کر رہے ہوں گے۔"

"مجھے توقع ہے کہ تمھاری نانی میرے ساتھ دوستانہ سلوک کرے گی جس کا میں حق دار ہُوں۔ اور وقت آنے پر تم بھی میری ہر ملکی مدد اور حمایت کرو گی۔" میں نے کشتی کھینا بند کرتے ہوئے کہا۔

"کشتی کھینا جاری رکھو سرفروش۔ یہ باتیں ہم ساحل پر پہنچ کے بعد بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ دیکھو نا ہمارے پاس ایسے بڑے جہاز نہیں ہیں جیسے طراق کے پاس ہیں اور وہ کسی وقت بھی ہماری طرف آسکتے ہیں۔"

میں نے ساحل کی طرف دیکھا۔

ابھی ساحل کافی دُور تھا اور صرف الاؤ کی آگ اندھیرے میں کسی مشعل کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔

میں پانی میں اُتر کر کشتی دھکیلنے لگا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد میرے قدم ریت کو چھُونے لگے۔ اب میں بڑی تیزی اور آسانی سے کشتی ساحل کی طرف بڑھانے لگا۔

جب کشتی ساحل سے کوئی دو سو ہاتھ دُور رہ گئی تو مجھے صبح کاذب کی روشنی میں الاؤ کے گرد کھڑے لوگ بھی وہاں دکھائی دینے لگے۔ کچھ اور آگے بڑھا تو پتہ چلا کہ وہ تقریباً درجن بھر آدمی ہیں انھوں نے نیزے اُٹھا رکھے تھے اور وہ سب کے سب باوردی تھے اس لیے مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ سپاہی ہیں۔

وہ الاؤ سے کچھ ہٹ کے ایک کھمبے کے پاس کھڑے تھے۔

میں نے کشتی روک کر تلوار اُٹھانے کے لیے اس میں ہاتھ ڈالا تو ہکا بکا رہ گیا۔

میری تلوار وہاں موجود نہیں تھی۔

"میری تلوار کہاں ہے دیوی؟" میں نے پوچھا۔

"تمھاری تلوار سے تو اب سمندر کی تہ میں تیرنے والی چھوٹی چھوٹی سنہری مچھلیاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں گی سرفروش۔ کچھ دیر پہلے میں نے چپکے سے اُسے سمندر کی نذر کر دیا تھا۔"

"مگر کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں تمھارا غلام نہیں بلکہ ایک جنگجو ہُوں اور مجھے ہر وقت تلوار کی ضرورت رہتی ہے۔ بتاؤ تم نے تلوار سمندر میں کیوں پھینکی؟"

"غصّے میں مت آؤ سرفروش۔ اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔"

"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں نہتا ہو کر تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو یہ تمھاری بھُول ہے' مُونا۔ میں اب بھی تمھارے دوستوں اور حامیوں کے یہاں تک پہنچنے سے پہلے تمھاری گردن مروڑ سکتا ہُوں۔"

مُونا نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔ "تم ایسا کرسکتے ہو مگر میں جانتی ہُوں کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں نے برگا کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا... اپنی نانی اور نانا کو کہلوایا تھا کہ..."

"تو یہ تھیں وہ سرگوشیاں جو تم بوتھان کے ساحل پر برگا سے کر رہی تھیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ساحل پر کھڑا کوئی آدمی چلاّیا۔

"بوتھان کی دیوی مُونا۔ ہم تمھیں درِ شہوار رومو ولیشا اور ان کے برادرِ محترم کوتار کی طرف سے خوش آمدید کہتے ہیں۔"

مُونا نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"اب وضاحت کا وقت نہیں رہا سرفروش۔ کوتار یہاں کا بادشاہ اور سمری اس کی ملکہ ہے۔ برگا اُن سے مل کر سارے حالات بتا چکا ہے۔ یہ بے حد ضروری تھا۔ ورنہ تمھاری جان کو خطرہ

لاحق ہوتا کیونکہ یہاں کے عسکری بڑے آشفتہ سر اور اکھڑ مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔ مجھے اب بھی اُن سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کیونکہ یہ مقام نہ تو بوتھان ہے اور نہ ہی رومو ہے۔"

"اور یہ خطرہ محسوس کرنے کے باوجود تم نے میری تلوار سمندر میں پھینک دی۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ میں نہتا زیادہ محفوظ رہوں گا؟" میں نے اُن سپاہیوں پر نظر ڈال کر کہا۔ "لیکن تم جنھیں خونخوار اور اکھڑ کہہ رہی ہو، ان بونوں سے تو تلوار کے بغیر ہی نمٹ لوں گا۔ ان کے لیے میرے مُکے ہی کافی ہوں گے۔"

مُونا میرے قریب آگئی اور میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی: "بس! میں اسی بات سے ڈرتی تھی، تم میری بات سنو گے یا نہیں؟ میں جانتی ہوں کہ تم بہت غصّہ ور اور توانا ہو... مگر میں تمھیں تنبیہ کر رہی ہوں کہ اپنی طاقت کے بھروسے میں مت رہنا۔ یہ مملکتِ رومو ہے۔ یہاں طاقت نہیں بلکہ سازش چلتی ہے۔ یہاں کے بچّے بھی تم جیسے دیو ہیکل آدمی کو سیاست اور سازش سے پچھاڑ سکتے ہیں۔ مجھ پر اعتماد کرو سرفروش۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ اپنے غصّے پر اس وقت تک قابو رکھو جب تک کہ تم خود حالات کو پوری طرح سمجھنے اور پرکھنے کے قابل نہیں ہو جاتے۔"

"اور اگر میں تمھارے کہنے پر یہ سب کروں اور بالکل ہی بودا بن جاؤں تو تمھارے اور تمھارے اس بادشاہ اور ملکہ کے پاس میرے لیے کیا ہے؟ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"اچھا ہی کریں گے سرفروش۔ بس تم تھوڑے عرصے اپنے آپ پر جبر کر لو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جنگ ناگزیر ہے تب میں صرف تمھارے ساتھ ہی خوش رہ سکوں گی۔ وہ لوگ ہمیں لینے آ رہے ہیں مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میرے کہنے پر عمل کرو گے۔"

"اچھی بات ہے۔ یہ بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں۔" میں نے اُسے مختصر سا جواب دیا کہ اس وقت میں خود بھی اپنے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھے کب تک یہاں رہنا ہے اور ڈاکٹر فریدوں کب مجھے واپس بلائے گا۔

سب سے پہلے جو عہدے دار کشتی کے قریب آیا، اس نے سر خم کر کے مُونا کو تعظیم دی اور میری جانب دیکھا تک نہیں ... مگر میں اس عہدے دار کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ مجھے نزاکت کا پُتلا دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے چاندی کا خود پہن رکھا تھا اور اس کی وردی کیا تھی، زرق برق قسم کا لباس تھا۔ مجھے یہ سوچ کر دُکھ ہوا کہ یہ لوگ طراق کے خونخوار سپاہیوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ تو بس کسی محل کے نمائشی حفاظتی دستے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ مُونا کہہ رہی ہے کہ یہ بڑے آشفتہ سر اور اکھڑ قسم کے سپاہی ہیں۔

... پھر میں نے سوچا کہ اگر یہاں جنگ ناگزیر ہے تو بھی میرے لیے اہم شخصیت بننے کے امکانات روشن ہیں۔

مُونا سپاہیوں کے جلو میں ساحل کی طرف چلی گئی۔ عہدے دار نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "کرم آپ میرے ساتھ آیئے کہ بوتھان کی دیوی مُونا، شہنشاہ اور ملکہ عالیہ کی بھی یہی خواہش ہے۔"

میں نے ایک نظر پھر اس عہدے دار پر ڈالی۔ اس کے بال میرے دَور اور میری سرزمین کے نوجوانوں کی طرح تک آ رہے تھے۔ اس کی مونچھیں زردی مائل تھیں اور اس نے بہت سی خوشبو لگا رکھی تھی۔ اس کا قد بمشکل میرے شانے تک وہ اور اس کے ساتھی کچھ بیزار سے لگ رہے تھے۔ انھوں نے نیزوں اور بھالوں کے ساتھ اپنی رنگین وردیوں کی طرح رنگین بانده رکھی تھیں۔

میں نے عہدے دار کے جواب میں سر ہلا کر اثبات کا اظہار اور ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔

ساحل پر ایک جانب دو پہیوں والی ایک بگھی کھڑی جس میں مُونا کو تکریم کے ساتھ سوار کیا جا رہا تھا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بگھی میں گھوڑے نہیں جوتے گئے تھے بلکہ گھوڑا جگہ بارہ آدمیوں نے سنبھال رکھی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ رومو کے معاشرے میں بھی انسانوں سے جانوروں کا سا کام لیا جاتا تھا اور ان سے سلوک بھی جانوروں ہی روا رکھا جاتا ہوگا۔

"میں مُونا سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس سے کہا۔

"شوق سے جناب۔" اس نے کہا: "لیکن زیادہ دیر نہ لگایئے گا کیونکہ قید خانہ کافی فاصلے پر واقع ہے اور اوّلین موسیقی کا وقت ہونے والا ہے۔"

میں نے "اوّلین موسیقی" کے مفہوم پر غور ہی نہیں کیا کیونکہ میرے ذہن میں تو "قید خانے" کے ایک لفظ نے ہلچل سی مچا دی تھی۔ میں تیزی سے مُونا کی بگھی کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جا کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا: "قید خانے کا کیا چکر ہے؟"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی: "مگر وہاں تم زیادہ دیر قید

نہیں رہو گے۔ مجھ پر اعتماد رکھو۔"

"اب بھی تم پر اعتماد کروں تو مجھ سے زیادہ احمق کون ہوگا؟"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، ایک محافظ بول اٹھا: "جلدی کیجیے اوّلین موسیقی چھوٹ جائے گی۔"

مُونا نے اُسے اُنگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا: "یقین کرو سرفروش۔ وہاں جا کر تم بُرا محسوس نہیں کرو گے۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا مگر منہ بند رہنا چاہیے۔ اس طرح تمھیں بہت سے سوالوں کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ اور جہاں تک میرے یقین و اعتماد کا تعلق ہے تو اب تم اس کے سوا کر ہی کیا سکتے ہو؟"

حقیقت یہ ہے کہ میرے لیے اور کوئی چارہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

میں نے گھوڑوں کی جگہ جُتے ہوئے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "یہ کون لوگ ہیں؟"

"کون؟ ... یہ زرد لوگ؟ ان کی طرف کوئی توجہ نہ دو۔ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ یہ حقیر لوگ ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی کی روانگی کا اشارہ کیا... پھر مجھ سے بولی: "الوداع سرفروش۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی میں تم سے ملنے کی کوشش کروں گی۔ تب تک میری ہدایات پر عمل کرنا اور غصّے پر قابو رکھنا۔"

جب مُونا کی بگھی ٹیلوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گئی تو عہدے دار نے خوش اخلاقی سے کہا: "اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم بھی چلیں جناب۔ اوّلین موسیقی تو ہم سے چھوٹ ہی گئی... مگر میری خواہش ہے کہ ہم دوسری موسیقی سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔"

اس نے ایک اور بگھی کی طرف میری رہنمائی کی جو پہلی بگھی سے ذرا چھوٹی تھی اور اس میں چھ زرد آدمی جُتے ہوئے تھے۔

میرے ساتھ بگھی میں وہ عہدے دار اور دو سپاہی بھی سوار ہو گئے تو زرد آدمی بگھی کھینچنے لگے۔

میں نے دیکھا کہ وہ زرد آدمی بھی کچھ بیزار سے لگتے ہیں اور بار بار جمائیاں لے رہے ہیں۔ سپاہیوں کی طرح اُن کی آنکھیں بھی شب بیداری کے باعث بمشکل کھل رہی تھیں ورنہ اُن کا بس چلتا تو وہ کھڑے کھڑے یا گاڑی کھینچتے ہوئے ہی سو جاتے۔

مجھے ایک بار پھر سپاہیوں پر تعجب ہوا اور رحم بھی آیا کہ یہ بیچارے طراق کے جنگجو سپاہیوں کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے؟

میں نے اُن زرد آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عہدے دار سے پوچھا: "کیا یہ غلام ہیں؟"

"نہیں جناب۔" وہ بھی جماہی لیتے ہوئے بولا: "یہ زرد لوگ افیون کھاتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ پینک میں رہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں سُدھر سکتے۔"

اتنے میں ہماری بگھی کچے راستے سے نکل کر لال پتھروں والے ایک تنگ راستے پر آ گئی... جس کے دونوں طرف سرسبز کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان کھیتوں سے بھی وہی صندل اور گلاب کی ملی جُلی مہک آ رہی تھی۔

میں نے غور سے کھیتوں کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

طلوعِ آفتاب کی اوّلین کرنوں میں لال، پیلے، نیلے، سبز اور نارنجی پھولوں والے یہ کھیت بڑا مسحور کُن نظارا پیش کر رہے تھے ہر پھول پیالہ نما تھا اور یہ خوشبو غالباً انہی پھولوں سے نکل رہی تھی۔ اس خوشبو میں سانس لینے سے مجھے کچھ خمار سا محسوس ہونے لگا۔

کھیتوں میں کچھ عورتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ عہدے دار نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ بھی زرد لوگوں کی عورتیں ہیں مگر کھیتوں میں صرف غیر شادی شدہ لڑکیوں ہی کو کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے، وہی پھول اور ڈوڈے جمع کرتی ہیں جن سے افیون تیار ہوتی ہے۔"

عہدے دار کی اس بات سے مجھے شک گزرا کہ کہیں یہ پوست کے کھیت نہ ہوں، شاید اسی لیے مجھ پر خمار طاری ہو رہا ہے۔ میں نے زور زور سے سانس لینا بند کر دیے اور سوچنے لگا کہ ان زرد لوگوں کو شاید افیون کی لت لگا دی گئی ہے یا اس بُرائی نے ان کے معاشرے میں اتنی گہرائی تک جڑ پکڑ لی ہے کہ اب وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اتنے میں بگھی رُک گئی۔

میں نے دیکھا کہ عہدے دار جس نے اپنا نام برگوش بتایا تھا، بار بار میری طرف دیکھ رہا ہے۔

اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ میرے دِلی تاثرات کا اندازہ لگا رہا ہو۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں نے سوچا شاید اُسے میری تمام کیفیات کا جائزہ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے میں نے سوچنا ترک کر دیا اور یوں جماہیاں لینے لگا جیسے مجھ پر بھی نشے کی کیفیت طاری ہو چکی ہو۔

"بگھی کیوں روک دی گئی ہے؟" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ موسیقیٔ اوّل اور موسیقیٔ دوم کا درمیانی وقفہ ہے۔ اس وقفے میں زرد لوگ افیون کھاتے ہیں۔" وہ بولا اور اُس نے گاڑی کھینچنے والوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہ موسیقیٔ اوّل و دوم سے کیا مُراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے دُور اُفق کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اُدھر دیکھا تو مجھے ایک پہاڑ کی برف پوش چوٹی سے دُھواں اُٹھتا دکھائی دیا۔ وہ بلاشبہ زندہ آتش فشاں تھا اور اُس کی ہلکی اور دُوسری گڑگڑاہٹ کو موسیقی اوّل روِدوم کا نام دیا گیا تھا۔

"اوہ۔۔۔ تو موسیقی کی یہ آواز وہاں سے آتی ہے!" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں۔ کیسے اور کیوں! یہ راز سوائے دُرِ شہوار رومو ویشنا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" اُس نے اپنی مُونچھیں مروڑتے ہُوئے جواب دیا۔ "کہا جاتا ہے کہ جس روز یہ موسیقی ختم ہُوئی۔ اُسی دن رومو تباہ ہو جائے گا۔"

مَیں نے کان لگا کر سُنا تو جوالا مُکھی کی ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ درختوں کھیتوں اور میدانوں سے گزرتے ہُوئے موسیقی جیسی ہی لگ رہی تھی۔۔۔ پھر میں نے اُن زرد لوگوں کی طرف نگاہ ڈالی جن میں ایک سپاہی افیون تقسیم کر رہا تھا اور وہ جلدی جلدی اُسے جھپٹ رہے تھے۔ جونہی وہ افیون کی گولی چمڑے کے تھیلے سے نکالتا، کئی ہاتھ اُسی کی طرف بڑھ جاتے مگر وہ سب کو باری باری ایک ایک گولی دیتا رہا۔

وہ لوگ جلدی جلدی گولیاں چبانے لگے۔

جب سپاہی دوبارہ بگھی پر سوار ہُوا تو میں نے بھی اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے برگوش کی طرف دیکھا۔

"گوبھتان کی دیوی کا حکم ہے کہ معزز مہمان کی ہر خواہش کا احترام کیا جائے۔" برگوش بولا۔

سپاہی نے یہ سُن کر چمڑے کا تھیلا میرے سامنے کر دیا۔ میں نے افیون کی ایک گولی نکال کر اُسے سُونگھا تو اُس سے ویسی ہی خوشبو آ رہی تھی جیسی کہ اس وقت پوری فضا میں رچی ہُوئی تھی۔ میں نے اُس کا ذرا سا ٹکڑا توڑ کر چکھا تو وہ مجھے بے ذائقہ محسوس ہُوا۔۔۔ میں نے اُسے تھوک دیا اور گولی واپس دیتے ہُوئے کہا۔ "مجھے اچھی نہیں لگی۔"

برگوش نے زرد آدمیوں کو اشارہ کیا۔

وہ پھر گاڑی کھینچنے لگے۔

ایک گھنٹے بعد جب ہماری گاڑی فیرتا میں داخل ہُوئی تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہ شہر بڑی خوبصورتی اور منصوبہ بندی کے تحت بسایا گیا تھا۔ سڑکیں کشادہ تھیں، جگہ جگہ چوراہے اور باغیچے بنے ہُوئے تھے جن میں رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ باغیچوں میں ننھے مُنّے بچے کھیل رہے تھے۔ فوارے اپنا ردھم دکھا رہے تھے اور سب سے بڑھ کر ہر طرف سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔

برگوش نے ایک مرتبان نما چیز کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بتایا کہ یہ آواز اُسی میں سے آ رہی ہے۔ ایسے مرتبان جگہ جگہ لگے ہُوئے تھے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ یہ موسیقی اُسی جوالا مُکھی کی ہے جس کا دُرِ شہوار ویشنا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

میں نے چپکے سے اپنے گندے ناخن اپنے بازوؤں میں گاڑ دیے تاکہ تکلیف سے ذہن اور آنکھوں میں آنے والے خمار کو دُور کر سکوں۔۔ پھر میں نے برگوش سے کہا۔ "اس وقت میری حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ ساری رات سمندر کے کھاری پانی میں تیرنے کے باعث میرے جسم میں کھُجلی اُٹھ رہی ہے۔ مجھے سخت بھوک اور شدید پیاس بھی لگ رہی ہے۔ اگر میرا نیا لباس نہ ملا تو میرا بدن عرق ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ ہم قید خانے کب پہنچیں گے۔ اگر وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر ہے تو میں وہاں جانے سے انکار کر دُوں گا اور سب چیزیں طلب کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

برگوش مسکرانے لگا۔

وہ جانتا تھا کہ مجھ پر بھی نشے کی سی کیفیت طاری ہے اور اُسی کے زیرِ اثر اس قسم کی گیدڑ بھبکی دے رہا ہُوں۔ تاہم اُس نے خوش اخلاقی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ایک عظیم عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولا۔ "ذرا اُدھر تو دیکھیے جناب۔"

میں نے اُس عظیم الشان عمارت کی طرف دیکھا جو سنگِ سفید سے تعمیر کی گئی تھی اور سُورج کی شعاعوں میں یوں جگر جگر کر رہی تھی جیسے ہیرے کی کنی پر روشنی کی کرن پڑ رہی ہو۔ اس عمارت کے بالائی حصے پر ایک قرمزی پرچم لہرا رہا تھا جس پر پوست کا پھول کڑھا ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے طراق شبستانی کا اژدہے والا نشان یاد آگیا جس میں اژدہا اپنی دُم خود ہی کھا رہا تھا۔

"یہ ہمارے شہنشاہ و نامدار کوتار اور ملکۂ عالیہ سمری کا محل ہے۔ اگرچہ میں کسی قسم کی پیش گوئی کا اہل نہُوں اور نہ ہی مجاز ہُوں۔۔ پھر بھی ممکن ہے کہ کسی روز آپ اس محل میں بُلائے جائیں اور شاہ و ملکہ کی مُلاقات سے نوازے جائیں۔"

۔۔ مگر اُس وقت میری ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں برگوش سے لڑ پڑوں۔

"تم پیش گوئی کرنے کے مجاز نہیں مگر اس کے باوجود تم نے پیش گوئی کی ہے۔ اب مجھے اس بات میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں رہا کہ یہ بات رومو میں قابلِ تعزیر ہے کیونکہ کسی پیش گوئی کے لیے سوچ اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور جو کچھ میں نے اس مختصر سے وقت میں دیکھا یا سُنا ہے اُس کے تحت سوچ اور غور و فکر کو ایک بہت بڑا جرم ہونا چاہیے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمھارے ہاں سوچ اور غور و فکر کی سزا کیا ہے؟ اپنا دماغ استعمال کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟ اس قسم کے مجرموں کو پھانسی دی جاتی ہے۔ قید میں ڈالا جاتا ہے یا افیون اور اس مسلسل موسیقی سے محروم کر دیا جاتا ہے؟"

اگرچہ برگوش میری باتوں سے بھنّا گیا لیکن وہ مُسکرانے لگا۔ اُس نے سر خم کیا اور مُونچھیں مروڑنے لگا اور مجھے جواب دینے سے پہلے اُس کا ایک ہاتھ تلوار کے دستے تک پہنچ گیا۔

"مُونا نے مجھے بتا دیا تھا جناب کہ آپ میرے لیے کچھ مشکلیں پیدا کر سکتے ہیں لہٰذا مجھے اُن کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں اپنے فرض سے غافل نہیں ہُوں۔ مجھے یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ میں آپ کے استفسارات کا جواب بھی دُوں چنانچہ میں اس ہدایت پر بھی ضرور عمل کروں گا۔ ہمارے ہاں سوچ اور غور و فکر پر نہ تو کوئی پابندی ہے اور نہ ہی کوئی سزا ہے۔۔۔ برتھان اور شبستان کی طرح ہمارے ہاں بھی جرم ہوتے ضرور ہیں لیکن ہم اُن لوگوں جیسی سزائیں نہیں دیتے۔ ہم جرم کی سزا جرم سے نہیں دیتے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

"لیکن تمھارے ہاں قید خانوں کا وجود تو تمھارے اس جواب کی نفی کرتا ہے۔ آخر مجھے بھی تو قید خانے ہی لے جایا جا رہا ہے لہٰذا کہو کہ یہ جھوٹ ہے۔"

برگوش مُسکرا کر بولا۔ "جھوٹ رومو میں بھی بولا جاتا ہے جناب۔ اس طور پر اُونچے طبقے میں تو کچھ زیادہ ہی بولا جاتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کا طریق ہی نہیں بلکہ اس میں ہماری بقا بھی مضمر ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے پھر مُونچھوں کو تاؤ دیا اور بات جاری رکھی۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ کون سی بات جھُوٹی ہے اور کون سی سچی ہے۔ آج جو جھُوٹ ہے کل سچ بن جاتا ہے اور آج جو سچ ہے کل اُسے جھُٹلا دیا جاتا ہے۔"

میں اُسے کہنے ہی والا تھا کہ اپنا یہ جھوٹ سچ والا فلسفہ بند کرے کہ اچانک اُس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "لیجیے۔ آپ کا قید خانہ بھی آ گیا۔ اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا جناب۔"

میں نے ادھر دیکھتے ہُوئے تعجب سے پُوچھا۔ "یہ قید خانہ ہے؟"

"جی ہاں۔ رومو کی ایک اور عجیب روایت۔ ہم لوگوں کو قید خانے میں مقید نہیں رکھتے۔ ہم مکمل آزادی دیتے ہیں۔ جب وہ یہاں تھوڑا سا عرصہ گزار لیتے ہیں تو خود بخود اپنے آپ کو قید خانے تک محدود کر لیتے ہیں۔ اگر آپ سوچیں، غور و فکر سے کام لیں اور مشاہدہ فرمائیں تو آپ کو ہمارا یہ انتظام ناقص معلوم نہیں ہوگا۔"

وہ مجھے جس قید خانے میں لایا تھا، وہ ایک نہایت وسیع و عریض احاطہ تھا جس میں ہر طرف درخت تھے، پھول تھے، چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں، فوارے تھے۔ ہر سایہ دار شجر کے نیچے سنگِ سفید کی سفید بنچ نما سلیں رکھی ہوئی تھیں اور ہر جگہ وہی میٹھی مگر پُرسوز موسیقی بھی سُنائی دے رہی تھی۔

اس احاطے میں بڑے بڑے میدان بھی تھے جہاں کچھ لوگ کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔

اگرچہ وہاں مجھے بہت سے زرد لوگ بھی باغبانی اور صفائی کرتے دکھائی دیئے مگر مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ قیدی ہیں یا قید خانے کے عملے کے لوگ ہیں۔ وہاں میں نے کوئی نگراں یا کوئی پہرے دار بھی نہیں دیکھا۔

ہماری بگھی احاطے سے گزرتی ہُوئی دُوسرے کنارے پر جا پہنچی جہاں بڑے بڑے درختوں کے عقب میں ایک منزلہ چھوٹی چھوٹی بہت سی عمارتیں بنی ہُوئی تھیں۔

برگوش بگھی سے اُترا اور ادب سے مجھے بھی اُترنے کا اشارہ کیا پھر وہ ایک عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔

"شاید آپ ایسا نہ سمجھتے ہوں مگر میں آپ کا دوست ہُوں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس مُونا کے دوست ہیں جس کی میں پرستش کرتا ہُوں اور یہ بھی کبھی فراموش نہ کیجیے گا جناب کہ وہ بھی آپ کی دوست ہے۔ اب میں چلتے چلتے آپ کو صرف اتنا اور بتا دینا چاہتا ہُوں کہ مُونا کی ہدایت پر آپ کو آپ کی اپنی حفاظت کے پیشِ نظر یہاں لایا گیا ہے۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ آپ سے پیچھا چھڑانا یا آپ کو کسی تکلیف و مصیبت میں مُبتلا کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت

تک میرے کام کیجیے گا جب تک وہ اپنی حسبِ منشا معاملات نہ سُلجھا لے۔ یہ آپ ہی کے فائدے کی بات ہے اور ہاں۔ مُونا پر مکمل اعتماد رکھیے۔"

اُس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی اور مطمئن ہو کر کہ ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا، ایک قدم میری طرف بڑھایا اور سرگوشیاں کرنے لگا۔

"ماضی میں مُونا نے مجھ سے بھی محبت کی ہے۔۔۔ لیکن یہ تب کی بات ہے، جب میں دُرِّ شہوار ونیشا کا پیغام لے کر بوتھان گیا تھا۔ اب وہ محبت اور رفاقت دَم توڑ چکی ہے لیکن مجھے اس کا کوئی گلہ، کوئی شکوہ اور کوئی پچھتاوا نہیں۔ اب مُونا صرف آپ کو چاہتی ہے، اور اس معاملے میں، میں اُس کی ہر ممکن مدد کروں گا اگرچہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔"

مجھے نہ تو مُونا پر اعتماد تھا اور نہ ہی برگوش پر۔ مگر حالات کے پیشِ نظر میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مُونا کے سابق محبوب کی حیثیت سے تم کیسی مدد کرو گے، میں خوب جانتا ہوں۔"

اُس نے قہقہہ لگایا اور بولا "میں آپ کا طنز سمجھتا ہوں جناب۔ مگر آپ، رومو کی روایتیں نہیں جانتے، ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ مرگِ محبت، آغازِ دوستی ہوتی ہے۔ اچھا جناب! اب مجھے اجازت دیجیے۔ ابھی مجھے قیدخانے کے ناظم سے آپ کی رہائی کے دستخط بھی لینے ہیں۔ ویسے آپ جب چاہیں اور جہاں آنا جانا پسند فرمائیں، یہاں آپ پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔"

میں نے سوچا کہ یہ بعد کی بات ہے، ابھی تو مجھے بہت کچھ سوچنا اور ان حالات میں اپنی بقا اور تحفظ کے لیے غور کرنا ہے۔

جب برگوش چلا گیا تو میں درختوں کے جھنڈ کے نیچے پڑی ہوئی بینچ نما سل پر بیٹھ گیا۔

قریب ہی کچھ لوگ شطرنج جیسا کوئی کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔ مگر اُس کے مُہرے یک رنگ تھے۔ البتہ وہ شاہ فرزیں اور پیادوں کی بجائے مختلف قسم کے پھُولوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ میں کافی دیر تک یہ کھیل دیکھتا رہا۔۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا اور نہ اُن لوگوں نے میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا ہی گوارا کیا۔

میں نے اُن کا جائزہ لیا۔

اُن میں ہر عمر کے لوگ شامل تھے مگر کسی کے چہرے اور آنکھوں سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ مجرم بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ وہ یا تو سیاسی "قیدی" ہو سکتے تھے یا پھر بے ضرر سے نیم دیوانے تھے۔

اس احاطے میں بیشتر لوگ مجھے اپنے آپ میں مگن دکھائی دیے۔ شاید افیون کے نشے نے اُنھیں ایسا بنا دیا تھا۔ میں اب تک یہ بھی نہ جان سکا تھا کہ اُنھیں اس نشے کا عادی بنایا گیا ہے یا وہ خود ہی اس عادتِ بد میں مُبتلا ہُوئے ہیں۔ بہر صُورت، اگر یہاں لوگوں کو منشیات کا عادی بنا کر اُن سے فہم و ادراک کی قوت چھین لی جاتی ہے تو میں اس سلسلے میں بے حد محتاط رہوں گا۔

میں بڑی دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔

مجھے خیال آیا کہ مونا کوئی نیا کھیل کھیل رہی ہے اور برگوش اُس کا مُہرہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے، اُس نے میرے اور اپنے تعلقات کا ذکر محض برگوش کے دل میں جذبۂ رقابت اُجاگر کرنے کے لیے کیا ہو، کافی غور و خوض کے بعد بھی میں اس نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ مُونا نے واقعی میرے لیے کیا ہے۔ تاہم میرے لیے یہ اَمر ضروری ہو گیا تھا کہ میں دُرِّ شہوار رومو ونیشا سے کسی نہ کسی طرح ملاقات کروں۔

وہاں کے اقتدار کی مالک وہی تھی۔

میں انھی سوچوں کے گرداب میں گھرا ہُوا تھا کہ ایک زرد آدمی، زرد لباس میں میرے پاس آیا۔ میں آپ کو بتانا بھُول گیا تھا، زرد لوگ، زرد رنگ کا لباس پہنا کرتے تھے اور یہ اُن کا مخصوص لباس تھا۔۔۔

وہ ایک فربہ اندام آدمی تھا۔ اُس نے میرے سامنے سر خم کرتے ہُوئے کہا "خوش آمدید جناب! میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہُوں۔ میرا نام کُن خوش ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ تشریف لائیں تو میں آپ کے لباس اور غسل کا بندوبست کر دوں۔ اس کے بعد کھانا اور آپ چاہیں تو خوش وقتی کے لیے کوئی ساتھی بھی لے آؤں گا۔ آج ہمارے پاس دیہات سے نئی خواتین تشریف لائی ہیں۔"

میں اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دیا۔

"مجھے کسی عورت کی ضرورت نہیں۔"

وہ مسکراتے ہُوئے بولا "بہرحال، غسل خانے اس طرف ہیں جناب۔"

میں نے سوچا کہ شاید اس سرزمین پر زرد رُو لوگوں کو حسبِ ضرورت جنم دیا جاتا اور اُن کی ذہنی استعداد کے مطابق اُن سے کام لیا جاتا ہوگا۔ یہاں کا حکمران طبقہ بھی ہمارے دَور اور دُنیا کی طرح پھُولوں اور حسنِ موسیقی سے لُطف اندوز ہونے میں مصروف رہتا لیکن جب ایسے طبقے کی عیاشی اور بے اعتدالیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو بغاوت کی چنگاری جمہوریت سے محلوں اور تاج و تخت پر جا پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ طراق بھی اُن لوگوں کی دہلیز تک آ پہنچا ہے۔

مجھے ایک گرم اور خوشبودار حمام میں نہلایا گیا اور پھر قیدخانے کی وردی دی گئی جو بڑی مشکل سے دستیاب ہوئی تھی۔

اب مجھے طعام گاہ کی طرف لے جایا گیا۔

طعام گاہ وسیع اور خنک تھی مگر جب کھانا میرے سامنے لایا گیا تو میں نے کھانے سے انکار کر دیا اور کُن خوش کو بلا کر ڈانٹنے لگا کہ کھانا اتنا شاندار اور پُرتکلف ہونے کے باوجود افیون سے آلودہ کیوں ہے مجھے قیدیوں جیسا کھانا دیا جائے۔

"جناب! جب قیدی پہلی بار یہاں آتا ہے تو اُسے ایسا ہی کھانا دیا جاتا ہے۔" اس نے دست بستہ جواب دیا۔

"دیکھو۔۔۔ تم قیدخانے کے ناظم ہو تو تمھارے پاس پہرے دار بھی ہوں گے، اُنھیں بُلاؤ تاکہ وہ مجھے مار مار کر افیون ملا ہُوا یہ کھانا کھانے پر مجبور کر دیں ورنہ مجھے بھی وہی کھانا دو جو دُوسروں کو دیا جاتا ہے۔"

"مگر جناب یہاں کسی پر ہاتھ اُٹھانا جُرم ہے۔ میں نہ تو خود کسی پر تشدد کر سکتا ہُوں اور نہ ہی کسی کو ایسا کرنے کا حکم دے سکتا ہُوں۔"

میں یہ سب کچھ صرف ہنگامہ آرائی کے لیے کر رہا تھا کہ بات آگے بڑھے تو میں شاید دُرِّ شہوار ونیشا تک جا پہنچوں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ مجھے ناکامی ہی ہوگی۔

"دیکھو اپنے بارہ آدمی بُلا لو کہ تمھیں اُن کی ضرورت پڑنے ہی والی ہے۔"

۔۔ وہ تب بھی نہ مانا تو میں اُٹھ کر ایک طرف چل دیا۔

وہ بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگا آیا تاکہ مجھے میرا کمرہ دکھا سکے۔

میں نے پلٹ کر کُن خوش کی طرف دیکھا اور کہا "تمھیں مجھ کو کمرہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے لیے خود ہی کمرہ تلاش کروں گا۔ میں بہت تھکا ہُوا ہُوں اور آرام کرنا چاہتا ہُوں۔ جب میں خُوب سو کر اُٹھوں تو مجھے اُسترا اور قینچی درکار ہو گی تاکہ میں اپنے بال اور داڑھی تراش سکوں۔"

"اُسترے اور قینچی کی ضرورت ہے جناب۔ ہمارے ہاں آج ہی ایک ایسی لڑکی آئی ہے جو بہترین حجام ہے۔"

"مجھے حجام لڑکی کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی وقت بھی میرے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ بس اب میرا پیچھا چھوڑو اور مجھے آرام کرنے دو۔"

"مگر آپ تنہا کمرے میں نہیں رہ سکتے جناب!" وہ گڑگڑایا۔ "قانون کے مطابق ہر کمرے میں دو قیدی رہنے چاہئیں اس لیے آپ۔۔۔"

"مگر میں یہاں راہ داری میں تو تنہا سو سکتا ہُوں نا؟۔۔ یا یہاں بھی تم کسی دوسرے قیدی کو سُلانا ضروری سمجھتے ہو؟"

"نہیں جناب" وہ بولا "آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ کمرے کے باہر جہاں آپ کا جی چاہے بیٹھیں یا لیٹیں۔ آپ یہاں سو بھی سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کو آرام دہ بستر اور تکیے وغیرہ کی ضرورت نہ ہو اور آنے جانے والوں کی وجہ سے آپ کی نیند میں خلل نہ پڑے۔"

چونکہ میں آرام کرنا اور پھر مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کہا "اچھا میں تمھارے لیے مزید کوئی مسئلہ نہیں بننا چاہتا۔ مجھے کمرہ دکھاؤ۔"

وہ میری اس بات سے خوش ہو گیا اور بولا "بہت بہت شکریہ حضور۔ مجھے پہلے ہی سے بتا دیا گیا تھا کہ آپ مسائل کھڑے کر سکتے ہیں مگر آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ ورنہ میں زرد آدمی ہُوں۔ خواہ مخواہ مارا جاتا اور جہاں تک کھانے کا معاملہ ہے تو جب آپ کو بھُوک لگے، آپ خود ہی کھا لیں گے۔"

میں اُس کی بات کا جواب دیے بغیر اُس کے پیچھے پیچھے چلتا اور سوچتا رہا کہ جب سو کر اُٹھوں گا تو باہر چلا جاؤں گا اور کوئی پھل وغیرہ توڑ کر کھا لوں گا تاکہ نشہ آلود غذا سے محفوظ رہ سکوں۔

اتنے میں زرد آدمی نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میں اس چھوٹے سے دروازے پہ رُک کر سوچنے لگا کہ اس کوٹھری میں دو آدمی کیسے رہ سکتے ہوں گے۔۔۔ مگر جب اندر قدم رکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک اچھا خاصا کمرہ تھا اور اس میں دو بڑے بڑے پلنگ بچھے ہوئے تھے جن میں سے ایک پہ وہ دراز تھا۔

اُسے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔

میرے نزدیک یہ ناممکن تھا۔

وہ تن و توش میں میرے برابر ہی تھا اُس نے مجھ جیسی ہی وردی پہن رکھی تھی مگر اس کے بال ترشے ہوئے تھے اور داڑھی مونچھ صاف تھی چہرے سے داڑھی اور دھول مٹی صاف ہونے کے باوجود میں اُسے پہچان گیا کیونکہ رخسار اور آنکھ پر زخم کے نشان اُس کی سب سے بڑی پہچان تھے۔

وہ بھی بغور مجھے دیکھتا رہا۔

"اوہ۔۔۔ تو یہ آپ ہیں۔ مُونا کی ناک کی قسم میں نے تو یہ سوچ لیا تھا کہ آپ بوتھان کی غلاظتوں میں غرق ہو گئے ہوں گے۔"

میں غلاظتوں کے فرزند ساحر کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

"میں تمھارے بارے میں یہ سمجھا تھا کہ تم زیرِ زمین سُرنگ

میں جاں بحق ہو گئے ہوگے۔ تم سے زیادہ فکر مجھے تمھارے اس خزانے کی تھی جو تم نے اپنی آنکھ کا زخم بنا کر چھپا رکھا تھا۔ بہر صورت تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر جب میں اُس سے ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھا تو اچانک میری نگاہ زرد آدمی پر پڑی جو میرے پیچھے کھڑا ساحر کو کچھ اشارے کر رہا تھا۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ میری اور ساحر کی ملاقات محض اتفاق نہیں ہے بلکہ جان بُوجھ کر اس کا انتظام کیا گیا ہے... لیکن یہ اہتمام کس نے اور کیوں کیا ہے؟

"ایسا صرف مُونا ہی کر سکتی ہے، میرے ذہن نے میرے سوال کا جواب دیا۔

میں نے ساحر سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا ہاتھ دبایا تو اُس نے بھی زور آزمائی دکھانا چاہی مگر جلد ہی بول اُٹھا۔

"بس بس جناب! اتنا ہی کافی ہے اگر آپ نے میرا پنجہ توڑ ڈالا تو میں آپ کی خدمت کیا خاک کر سکوں گا؟"

اتنے میں مجھے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی... آواز آئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

زرد آدمی جا چکا تھا۔

ساحر میری طرف بڑھا اور کمرے کی ایک دیوار میں لگے موسیقی والے مرتبان نما کھوکھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہنے لگا۔ "اس سے ہوشیار رہیے گا۔ مجھے تو تم سے بھی لگاؤ ہے اور اپنی زندگی بھی عزیز ہے... میرا مطلب ہے کہ میں موسیقی پسند کرتا ہوں... مگر یہ لوگ اس آلے سے صرف موسیقی ہی نہیں سنواتے بلکہ خود بھی دوسروں کی باتیں سنتے ہیں۔"

"اچھا!" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں... میں یہ تو نہیں جانتا کہ کیسے؟ شاید ہَوا کی لہروں سے آواز دوسری طرف پہنچ جاتی ہوگی۔ لیکن اگر بات سرگوشی میں کی جائے تو کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے یک چشم ساحر کی صحیح آنکھ میں دیکھا۔

اُس میں دھوکا یا فریب نہیں بلکہ صرف شرارت تھی۔ گویا وہ ابھی اُن کی سازش کا شکار نہیں ہُوا تھا۔ شاید اسے افیون استعمال نہیں کرائی گئی تھی۔

شاید ساحر نے میری سوچ بھانپ لی اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ "کیا آپ کھانے کو کچھ لائے ہیں جناب۔ مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تب تو مُونا کے گلاب لبوں کی قسم۔ مجھے وہ نشہ آور کھانا ہی کھا لینا چاہیے تھا۔ اب پیٹ میں چوہے نہیں بلکہ بلّیاں بھی دوڑنے لگی ہیں۔"

❁

میری خواہش پر اس کمرے میں ایک میز، کُرسی اور کاغذوں کے ایک ڈھیر کے ساتھ قلم اور دوات بھی لا کر رکھ دی گئی۔ یہ چیزیں میں نے اس لیے منگوائی تھیں کہ بولنے کی بجائے ہم لکھ کر ایک دوسرے سے بات چیت کر لیا کریں کیوں کہ مسلسل سرگوشیوں کے باعث بھی اُن لوگوں کا مشکوک ہو جانا یقینی تھا۔

مگر جب یہ چیزیں آگئیں اور میں نے ساحر سے لکھ کر بات کرنا چاہی تو وہ بولا۔ "مُونا کی مست انکھڑیوں کی قسم۔ آپ کے اس غلام نے بچپن میں لکھنے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ مجھے تو ہر وقت پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا اُن دنوں چھوٹی موٹی چوری چکاری سے کام نہیں چلتا تھا اس لیے لکھنے پڑھنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔"

میں اس کے یہاں تک پہنچنے اور حقیقتِ حال جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ اس لیے مجھے اور کچھ نہ سُوجھا تو میں نے کہا۔ "آؤ۔ باہر چل کر ہوا خوری کریں۔"

ہم کمرے سے نکل کر میدان کے پاس سبزہ زار میں آگئے۔

جب میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا کہ ہمارے آس پاس نہ تو موسیقی کا کوئی کھوکھا ہے اور نہ ہی کوئی آدمی موجود ہے تو میں نے ساحر سے پوچھا۔ "تم وہاں سے کہاں غائب ہو گئے تھے اور یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

"میں سُرنگ میں کُودا تو ضرور تھا... مگر اس وقت پانی اتنا اونچا تھا کہ ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا اس لیے واپس نکل آیا تھا جب اس چوراہے پر پہنچا تو دیکھا کہ سارے لوبھانی سپاہی ہلاک ہو چکے ہیں۔ لہٰذا موقع غنیمت جان کر میں نے مرنے والوں کی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔ جب کبھی شبستانی اُدھر سے گزرتے، میں کسی لاش کی طرح لیٹ جاتا تھا۔ مُردوں کی تلاشی لینے پر پتہ چلا کہ اُن میں سے بیشتر کی جیبیں پہلے ہی سے صاف ہو چکی ہیں اور کچھ دیر بعد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جیبیں صاف کرنے والے اُنھی لاشوں میں سے تین آدمی تھے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بزدل زخمی ہونے اور مرنے سے

پہلے ہی یوں ڈھیر ہو گئے تھے۔ جیسے شبستانیوں نے اُنھیں تہ تیغ کر دیا ہو۔ چنانچہ میں نے رنگے ہاتھوں اُن بدمعاشوں کو پکڑ لیا... پھر ہم نے آپس میں فیصلہ کیا کہ فی الوقت وہاں سے فرار ہو جانا چاہیے ساحل پر پہنچ کر لُوٹ کا مال برابر بانٹ لیں گے۔"

اتنے میں کچھ قیدی گزرے تو ساحر چُپ ہو گیا۔ جب وہ قیدی عمارت میں داخل ہو گئے تو اُس نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ "ساحل پر پہنچنے کے بعد میں نے پہلے تو اُن سے یہ دریافت کیا کہ ردمو کیسے پہنچیں گے۔ اُن میں سے ایک نے کہیں کشتی چھپا رکھی تھی۔ مگر وہ مال کے بٹوارے سے پہلے وہ جگہ بتانے پر آمادہ نہیں تھا اور جب بٹوارے کی نوبت آئی تو اس نے زیادہ حصّہ طلب کیا میں راضی ہو گیا کہ پہلے وہ کشتی والی جگہ بتا دے پھر میں دیکھوں گا کہ وہ اپنا حصّہ کیسے لے جاتا ہے... مگر ہمارے دو ساتھی زیادہ حصّہ دینے پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے اُنھیں ختم کر دیا۔ پھر میں نے کشتی والے سے پوچھا۔ بول اب کیا کہتا ہے؟ یہ بتاتا ہے کہ کشتی کہاں ہے یا نہیں، اُس نے وہ جگہ تو بتا دی مگر اُن مرنے والوں کے مال سے اپنا حصّہ طلب کرنے لگا۔ آپ خود ہی سوچیے کہ بغیر محنت کے کوئی چیز لینا یا مانگنا کتنی خراب بات ہے۔ پہلے تو میں نے اُسے سمجھانا چاہا کہ میری طرح قناعت پسند بنو اور جو مل گیا ہے اُسے غنیمت سمجھو مگر وہ بے حد لالچی نکلا اور اپنی بات پر اَڑ گیا۔ مجبوراً مجھے اس کو بھی مارنا پڑا۔ مگر جناب! مُونا کی قسم، میں نے اپنے دوستوں کو بڑے احترام سے ریت میں دفن کیا، مال متاع سمیٹا، کشتی نکالی اور اِدھر کو چل پڑا۔"

"مگر تم یہاں قید خانے میں کیسے پہنچ گئے؟" میں نے پوچھا۔

"پہنچا کہاں جناب، پہنچا دیا گیا۔ جب میری کشتی ردمو کے ساحل پر لگی تو وہاں دوسرے لوگ ہی نہیں، سپاہی بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے سوالات کیے اور پھر مجھے گرفتار کر لیا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں خود سپاہی ہُوں اور کیسا سپاہی ہُوں۔ میں چاہتا تو ردمو کے چار چھ فوجی ناشتے کے طور پر چٹ کر جاتا مگر میں نے سوچا کہ میزبانوں سے لڑنا جھگڑنا بد اخلاقی ہے چنانچہ یہاں تشریف لے آیا اور اب مجھ سے بھوک کے مارے بولا بھی نہیں جا رہا۔"

ہم فوارے سے اُٹھ کر عمارت کی طرف چل دیے۔

"تم نے یہاں کھانا کیوں نہیں کھایا؟" میں نے پوچھا۔

"اُسی وجہ سے جس کی بنا پر آپ نے نہیں کھایا۔ یہاں یہ لوگ کھانے میں افیون ملا دیتے ہیں تاکہ لوگ اپنے آپ میں مگن رہیں اور کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ تبھی تو آپ نے دیکھا کہ یہاں قید خانے میں زندگی کی رفتار کتنی سست ہے۔ وہ کھیلتے بھی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے رقص فرما رہے ہُوں... مگر میں اپنے آپ کو افیون سے محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہُوں۔"

مجھے ساحر کی صورت میں ایک اچھا ساتھی اور جانثار مل گیا تھا وہ جنگجو اور بہادر بھی تھا۔ گھٹیا حرکتوں کے باوجود اُس میں خوبیاں بھی تھیں۔

"تمھیں یہ کیسے معلوم ہُوا کہ وہ کھانے میں افیون ملاتے ہیں؟ کیا تم پہلے بھی ردمو آ چکے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

وہ میرے اس سوال پر خاموش رہا اور کچھ سوچنے لگا۔ میں سمجھا وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا... مگر اُس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہم لوبھان میں اتفاقاً ملے تھے، پھر بچھڑ گئے اور اب تقدیر نے ہمیں دوبارہ ملا دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ستارے ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہیں اور مستقبل کی جھولی میں اچھائی یا بُرائی جو کچھ بھی ہے، ساجھی ہے، اس لیے میں آپ پر اعتماد کرتا ہُوں۔"

"میں تمھارے اعتماد کو کبھی دھوکا نہیں دوں گا لیکن تم جو کچھ بھی بتاؤ، اس میں تمھاری اپنی خواہش اور مرضی شامل ہونی چاہیے۔ میرا مطلب ہے کسی کا یا میرا دباؤ نہیں... اور ہاں.. مجھے تمھارے ماضی سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کیا تھے اور کیا کرتے رہے ہو لیکن جیسا کہ تم نے کہا ہے کہ ہم مستقبل کے ساجھی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں صرف مستقبل میں دلچسپی رکھتا ہُوں۔ اب تمھاری مرضی ہے کہ مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بتاؤ یا نہ بتاؤ۔"

"میں اپنے ماضی کے کچھ ڈھکے چُھپے گوشے آپ کو ضرور دکھاؤں گا۔" وہ بولا۔ "میں یہاں پہلی بار نہیں آیا بلکہ میں تو یہاں کافی عرصے تک رہ چکا ہُوں۔ میں یہاں فوج میں ملازم تھا، اس لیے جانتا ہُوں کہ یہاں کی فوج کتنی کمزور ہے۔ میں پہلے اس لیے خاموش ہو گیا تھا کہ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں ان کا سابق فوجی ہُوں تو یہ فوراً مجھ پر بھگوڑے کا الزام لگا دیں گے۔"

"بھگوڑوں کو یہاں کیا سزا دی جاتی ہے؟ میرا خیال ہے، فوجی بھگوڑوں پر بھی تشدد نہیں کیا جاتا ہوگا۔"

"نہیں جناب۔ اُن پر تو ایسا ظلم کیا جاتا ہے کہ تصوّر سے میری رُوح تک کانپ جاتی ہے، فوجی بھگوڑے کو یہ لوگ پہلے منشیات کا عادی بناتے ہیں اور پھر ایک دُور دراز جزیرے پر عمر قید کی سزا بھگتنے بھیج دیتے ہیں۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے رُکا پھر مجھے اپنی

اکلوتی آنکھ مارتے ہوئے بولا "ایک ایسے جزیرے پر جہاں خواتین کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔"

"یہ تو بڑی سخت سزا ہوئی" میں نے کہا۔

"اور کیا جناب۔ اسے غیر انسانی بلکہ غیر فطری سزا کہا جا سکتا ہے۔"

ہم ایک ایسی جگہ کے قریب سے گزرے جہاں کچھ عمر رسیدہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ہماری جانب نگاہ تک نہیں اٹھائی ہم آگے بڑھ گئے۔

"آپ نے دیکھا جناب کہ یہ کتنا ذلیل نشہ ہے۔ زندگی بھر کے لیے آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتا" ساحر نے کہا۔

"سچ کہتے ہو، ساحر۔ یہ تو زندہ رہنے کے باوجود مرجانے کے برابر ہے" میں نے کہا۔

"بالکل جناب۔ بلکہ ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ اور ہاں حضور، میں کوئی کام ادھورا نہیں کرتا۔ جو اقدام کرتا ہوں اُسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاتا ہوں۔ میں صرف ردمو کا فوجی بھگوڑا نہیں بلکہ شبستانی بھگوڑا بھی ہوں اور بوتھان کی وردی تو آپ میرے تن پر ملاحظہ فرما ہی چکے ہیں۔"

میں اُس کی بات پر ہنس پڑا "میں نے تمھارے جسم پر وردی ہی نہیں دیکھی، جنگ لڑتے اور لوگوں کو مارتے بھی دیکھا ہے"

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں آقا۔ آپ اُس کمان دار کی بات کر رہے ہیں۔ جسے میں نے خنجر سے مارا تھا۔ دراصل چکر یہ ہے جناب کہ مجھے اپنی زندگی سے کبھی پیار نہیں رہا۔ میں نے ہمیشہ مرنے کی کوشش کی ہے مگر ہمیشہ اس تن و توش کے باوجود بزدل نکلا ہوں یا قدرت نے مجھے موت کے مُنہ میں جانے سے بچا دیا ہے۔ اس لیے میں ردِعمل کے طور پر دوسروں کو مار ڈالتا ہوں اسی بنا پر شبستان کے بہت سے فوجی افسر مجھے جانتے ہیں اور وہاں کے فوجی بھگوڑوں کی سزا یہ ہے کہ اُنھیں ایک پہیّے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور پھر ایک ایک کرکے اس کی ہڈیاں توڑ دی جاتی ہیں۔"

میں اس اطلاع پر چونک کر رُک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے ساحر سے شبستانی فوجوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا... مگر اُس وقت میں نے اس سلسلے میں خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔

"تو اس وقت تم دو ملکوں کی فوجوں کو مطلوب ہو؟" میں نے کچھ دیر بعد تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"میں اپنے آپ کو بوتھانی فوج کا حقیقی بھگوڑا نہیں سمجھتا ...کیونکہ مجھے بوتھان میں زبردستی بھرتی کیا گیا تھا اس میں میری اپنی خواہش اور مرضی کو قطعی دخل نہیں تھا۔"

"مگر تم تو پیدائشی بوتھانی ہو۔"

"جی ہاں ...۔ ایک کوڑے کا ڈھیر میری جائے پیدائش تھی"

ہم دونوں پھر ایک مقام پر ٹھہر گئے جہاں موسیقی کا کھوکھا اور زرد آدمی نہیں تھے۔

"دیکھو ساحر! میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے تمھارے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں... البتہ مستقبل سے ضرور ہے۔ میں تم سے وفاداری کی توقع رکھتا ہوں اور جو لوگ مجھ سے دھوکا کرتے ہیں، میں اُنھیں کبھی نہیں بخشا کرتا، یہاں جنگ ہونے والی ہے اور مجھے ردمو کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ اس لیے مجھ سے بہت سی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں... مگر تم تینوں ملکوں اور ان کی فوجوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو اور میری مدد کر سکتے ہو۔ اس کے صلے میں تمھیں نہ صرف تحفظ دوں گا۔ بلکہ ہر ممکن فائدہ بھی پہنچاؤں گا۔ کیا تم بوتھان کے کاہن ٹالپ کو جانتے ہو؟"

"تھُو..." ساحر نے تھُو کہتے ہوئے کہا "کس غلیظ آدمی کا نام لے لیا آپ نے؟"

"میں نے اُسے اتنی بڑی زک پہنچائی ہے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا اور زندگی کے ہر لمحے انتقام کی آگ میں سُلگتا رہے گا۔ میں نے اُس سے نہ صرف مُونا چھین لی بلکہ اُسے دونوں ہاتھوں سے بھی محروم و معذور کر دیا ہے۔ وہ طمراق سے سمجھوتا کر چکا ہے اور شبستانی فوجیں کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتی ہیں۔ لہٰذا جس طرح تم فوجی بھگوڑے کی حیثیت سے خطرے سے دوچار ہو، اُسی طرح میں بھی ہوں۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں... اور ہاں! کشتی کے ذکر پر یاد آیا کہ جب تم کشتی پر یہاں پہنچے اور گرفتار کیے گئے تو تمھیں بھی اسی جیل میں کیوں لایا گیا جہاں مجھے لایا گیا ہے؟ میرا خیال ہے، ایسا جان بُوجھ کر کیا گیا ہے۔"

ساحر کچھ دیر سوچتا رہا... پھر بولا "میں نہیں جانتا جناب۔ آپ مجھ سے بہتر اور تیز سوچنے والے آدمی ہیں میں تو یہی سمجھا تھا کہ اتفاق نے ہمیں پھر ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔

جن دنوں ہم دلدلی جھاڑیوں میں رُوپوش تھے اور مُونا مجھ سے دُور دُور رہتی تھی، میں برگا سے باتیں کیا کرتا تھا اور میں نے اُسے ساحر کا قصّہ بھی کئی بار سُنایا تھا۔ تب میں نہیں جانتا تھا کہ برگا دراصل مُونا کا جاسوس ہے۔ اس کا انکشاف تو مجھ پر فرار کے بعد ہُوا تھا۔ چنانچہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ اس معاملے میں شامل ہو۔ لہٰذا میں نے ساحر کو برگا کا حلیہ بتاتے ہوئے پُوچھا "کیا یہاں پہنچنے کے بعد تم نے کسی ایسے نوجوان کو دیکھا ہے؟"

"ہاں، نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا ایک نوخیز افسر تو مجھے ملا تھا اور اُس نے مجھ سے باتیں بھی کی تھیں"

"کیا وہ فوجی وردی میں تھا؟ اُس کا عہدہ کیا تھا؟"

"وہ ساحلی دستے کا کمان دار تھا جناب۔ اس کے پیچھے متعدد فوجی کھڑے تھے۔"

"اُس نے تم سے کیا کیا پوچھا تھا۔ اس کے بارے میں وہ... سب کچھ بتاؤ جو تم جانتے ہو۔"

"اوہ..." ساحر نے ہتھیلی پر مُکّا مارتے ہوئے کہا "تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی تو مجھے یہاں کے مریل سپاہی لگے ہی نہیں تھے... وہ سچ مچ کے عسکری نظر آتے تھے۔ یہ بات میرے ذہن سے کیوں نکل گئی؟"

"کیا تمھیں ساحل سے سیدھے یہیں لایا گیا تھا؟" میں نے پوچھا

"جی ہاں... اور اُنھوں نے مجھ سے راستے میں کوئی بات بھی نہیں کی کیونکہ اُنھیں بولنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔"

"اُس نوجوان افسر نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا تھا؛ مثلاً یہ کہ میں بھی اسی جگہ آؤں گا؟"

"نہیں آقا... اُنھوں نے آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تھا" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا "مگر اُس نے تو جنگی لباس پہن رکھا تھا اور اُس کے شانے پر دُرِشہوار ولیشتا کا نشان لگا ہُوا تھا جو آتش فشاں میں رہتی ہے۔"

ہم اس وقت عمارت سے پہلے، ایک آخری بنچ کے پاس سے گُزر رہے تھے جو سہ پہر کی ڈھلتی دھوپ میں چمک رہی تھی ساحر اس پر بیٹھنا چاہتا تھا... مگر میں نے اُسے روک دیا "کمرے میں چل کر تھوڑی دیر سو لیتے ہیں۔ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ ہمیں آرام کر لینا چاہیے۔ کچھ ہونے والا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ جو ہونا ہے، ہوتا رہے گا... مگر یہ پاپی پیٹ کچھ کھانے کو مانگ رہا ہے۔"

"بھُوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے مگر اندھیرا ہو جانے دو پھر باہر جا کر دیکھیں گے۔ فی الوقت تو میں سونے سے پہلے تم سے دُرِشہوار ردمو کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ واقعی آتش فشاں میں رہتی ہے؟ ... مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے تو جوالا مُکھی سے دُھواں نکلتے دیکھا ہے۔"

"ہم نے دُرِشہوار کو نہیں دیکھا۔ ویسے، وہ سیاہ موتی بھی کہلاتی ہے" ساحر نے بتایا۔

ہم کمرے میں آ گئے جہاں اُس دیواری کھوکھے سے موسیقی مسلسل جاری تھی۔ ساحر نے اس کی طرف اشارہ کیا تو میں نے سرگوشی کی۔ "میں گاتا رہوں گا، تم میرے کان میں بولتے رہنا۔ تم اُس بڑھیا کے بارے میں کیا جانتے ہو جسے دُرِشہوار کہا جاتا ہے؟"

یہ کہہ کر میں گانے لگا۔ یہ گانا نہیں بلکہ وہ لوری تھی جو میری ماں مجھے سُلانے کے لیے گایا کرتی تھی اور اس کے بول کچھ یوں تھے "میں نے خوابوں میں دیکھا، میرا مُنّا محلوں میں رہتا ہے!"

میں اپنی بھونڈی آواز میں بار بار یہی بول دُہراتا اور ساحر میرے کانوں میں وہ معلومات انڈیلتا رہا جو اُسے حاصل تھیں

"آپ اُسے بُڑھیا سمجھتے ہیں آقا؟ مُونا کی مست اداؤں کی قسم! اگر کسی نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ وہ بُڑھیا ہے تو وہ اوّل درجے کا دروغ گو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نانی یا دادی ہو... مگر وہ ایسی نانی یا دادی ہے جس پر سو جوانیاں نثار کی جا سکتی ہیں۔ میں تو اس کا ذکر سُن کر دل ہار بیٹھا تھا... مگر مجھ جیسا عاشق نامراد ایسی محبوبہ سے صرف خوابوں اور خیالوں ہی میں باتیں کر سکتا ہے خیر... اگر مُونا نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ اُس کی نانی یا دادی ہے تو ٹھیک ہی بتایا ہو گا کیونکہ ولیشتا پر عمر اور زمانے نے کوئی نقش پا نہیں چھوڑا۔ اُسے دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے اُس نے ابھی ابھی نوعمری کی دہلیز پر قدم رکھا ہو۔ سیاہ موتی اُسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نہ تو سفید فام ہے اور نہ ہی سُرخ... یا سیاہ رنگ کی... وہ گندمی رنگت رکھتی ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ گرگٹ کی طرح اُس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے آقا؟ گرگٹ کیا ہوتا ہے؟"

"گرگٹ ایک چھپکلی نما جانور ہوتا ہے جو خطرے کی بُو سُونگھ کر اپنا رنگ بدل لیتا ہے۔"

"میں نے تو ایسا جانور کبھی نہیں دیکھا۔"

"لعنت بھیجو گرگٹ پر، تم ولیشتا کی بات کرو" میں نے سرگوشی کی اور پھر گانے لگا۔

"میرا خیال ہے اُسے سیاہ موتی اُسی کہانی کی وجہ سے کہا جاتا ہے جو یہاں زبان زدِ عام ہے اور کہانی یہ ہے کہ جوالا مُکھی کی تہ میں گوبھی کے پھول جتنا ایک سیاہ موتی اور اُس بادشاہ کی تلوار رکھی ہوئی ہے جس نے اپنے دور میں یہ جزیرہ دریافت کیا تھا اور

اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ ۔ ۔ مگر اس قسم کی کہانیوں پر تو بچّے یا احمق لوگ ہی یقین کر سکتے ہیں، آپ اور مجھ جیسے عقل مند نہیں۔ ۔ ۔ اور ہاں مُونا کی من موہنی مسکراہٹ کا واسطہ، اب گانا بند کر دیجیے کہ بھُوکے پیٹ اسے برداشت کرنا میرے بس سے باہر ہے۔"

میں نے گانا بند کرتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا "اچھا یہ بتاؤ کیا واقعی اس عورت کا کوئی وجود ہے۔ میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کیوں کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہی اقتدار کی مالک ہے اور اگر یہ سچ ہے تو ہمیں بہرصورت اس تک پہنچنا پڑے گا۔"

"وہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بے تمام تر حسن و دانائی کے ساتھ وجود رکھتی ہے مگر جو الائکتھی سے باہر آتی اور جو اُس کی تنہائی میں مخل ہونا چاہتا ہے، ولیشتا کے محافظ اُسے قتل کر دیتے ہیں مُونا کے پیکر کی قسم، کوئی اسے اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک کہ۔ ۔ ۔" ابھی ساحر اتنا ہی بتا پایا تھا کہ راہ داری میں کچھ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور تلواروں سے تلواریں ٹکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ۔ ۔ پھر ان میں چیخ و پکار کا شور بھی شامل ہو گیا۔

میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔

اُسے مقفّل تو کیا ہی نہیں جا سکتا تھا مگر۔ اس وقت وہ بند ضرور تھا اور لڑائی جھگڑے کی آوازیں دم بہ دم قریب آتی جا رہی تھیں۔ اتنے میں مجھے ایک جانی پہچانی آواز۔ ۔ ۔ سنائی دی۔

"بس اب قتل و غارت گری ختم کر دو۔ جو بچ گئے ہیں انھیں کسی کمرے میں بند کر دو اور دروازے پر اُس وقت تک تالا لگا رہنے دو۔ جب تک کہ ہم کافی دُور نہ نکل جائیں۔"

میں نے ساحر کی طرف پلٹتے ہوئے سرگوشی کی "ہاں تو تم کہہ رہے تھے کہ اس سے کوئی نہیں مل سکتا جب تک کہ۔ ۔ ۔"

"وہ خود کسی سے نہ ملنا چاہے اور خود ہی کسی کو نہ بلوائے۔"

"میرا خیال ہے کہ پھر تو وہ وقت آگیا ہے ساحر۔ بس ایک لمحے میں معلوم ہو جائے گا۔"

اتنے میں دروازہ پاٹوں پاٹ کھُلا اور برگا عسکری وردی میں تلوار تھامے اندر آگیا۔ اس کے شانے پر واقعی ولیشتا کے محافظ دستے والا نشان تھا اور وردی خون آلود ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "مجھے آپ سے دوبارہ ملنے اور خیر و عافیت سے دیکھنے پر بے پناہ خوشی ہوئی ہے۔ جناب۔ بہرحال، مجھے آپ کو لانے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے اگر آپ تیار ہوں تو دیر نہ کیجیے کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر سر خم کیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے ایک نظر اُسے دیکھا تو مجھے اپنی غلطی یاد آگئی کہ میں تو اسے ایک عام سا نوخیز لڑکا سمجھتا تھا۔ حالاں کہ اب وہ ایک عسکری عہدے دار اور جنگ جُو لگ رہا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔

"ہمیں دُرِشہوار و لیشتا کے ہاں جانا ہے۔ جناب اور سفر کافی طویل ہے۔ معاملات ہماری توقع کے خلاف بہت تیزی سے آگے بڑھے ہیں۔ ردمو بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو گیا ہے۔ ہمارے جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق اگرچہ طراق حملے کی تیاریاں مکمل نہیں کر پایا۔ مگر اس نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا ہے۔ ۔ ۔ کچھ ہی دیر قبل شبستانیوں کا ایک دستہ ہمارے ساحل پر اُترا ہے اور ہمیں اس کی بھی خبر لینی ہے۔"

میں برگا کی یہ باتیں سن کر باہر آیا تو ساحر کسی خادم کی طرح میرے پیچھے پیچھے آگیا۔ برگا اور اُس کے سپاہیوں نے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لیا میں نے راہ داری اور عمارت کے باہر کچھ لاشیں پڑی دیکھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مرنے والوں میں وہ کمان دار بھی شامل تھا جو صبح مجھے اس قید خانے میں چھوڑ گیا تھا۔

برگا نے اپنی تلوار سے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کبھی یہ میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ اچھا آدمی تھا۔ مگر اس نے مختلف راستہ اختیار کر لیا۔ یہ بھی آپ کو لینے آیا تھا کہ اتنے میں، میں یہاں پہنچ گیا۔"

"یہ تو مُونا کا آدمی تھا۔ کیا اُسی نے اُسے بھیجا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔ اسے مُونا نے نہیں بھیجا تھا۔ یہ کسی زمانے میں مُونا دیوی سے محبت کرتا تھا لیکن آج وہ آپ کو شاہ کوتار اور ملکہ سمری کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ آپ خوش بخت ہیں کہ میں عین وقت پر پہنچ گیا اور میرے ساتھی بزدل نہیں بلکہ سچ مچ کے سپاہی ثابت ہوئے۔"

میرا سر چکرا رہا تھا اور مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی لیکن میں نے برگا سے کچھ نہیں کہا۔ برگا نے مجھے ایک تلوار اور پیٹی دی یہ تلوار اُس تلوار سے بہت عُمدہ تھی جو دلدلی علاقے میں میرے زیرِ استعمال رہ چکی تھی اور جسے مُونا نے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے حالات میرے حق میں پلٹا کھا رہے ہوں۔

"ہم آپ کو مکمل ساز و سامان بعد میں دیں گے اب ہمیں جلد از جلد مضافات میں پہنچنا ہے۔ میرے پاس آدمی کم ہیں اور مقابلہ بہت سخت ہے۔ میں محل کے محافظوں سے مزید کوئی جھڑپ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر آپ میری بات کا مطلب نہ سمجھے ہوں تو یہ بتاتا چلوں کہ ہمارے ہاں خانہ جنگی کا آغاز ہونے والا ہے۔"

"خانہ جنگی؟ وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"شاہ کوتار اور ملکہ، ردمو پر مکمل اقتدار کے طالب ہیں انھوں نے دُرِشہوار کے خلاف شورش برپا کر دی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ دُرِشہوار کے پاس ذاتی محافظ دستہ ہے جس پر وہ آسانی سے قابو پالیں گے اور پورے اقتدار کے مالک بن جائیں گے۔ ۔ ۔ مگر اس شورش کے لیے انھوں نے بڑے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے کیونکہ اس وقت طراق نے ہمارے ساحل پر ہراول دستہ اتار دیا ہے۔"

"کیا تم اسے اتفاق سمجھتے ہو برگا؟" میں نے کہا "کیا یہ وقت شاہ کوتار اور اس کی ملکہ کے لیے بھی کڑا نہیں ہے؟ ۔ ۔ ۔ یا وہ ردمو کے ساتھ غداری پر تُل گئے ہیں؟ اس سلسلے میں مُونا کا کردار کیا ہے؟ تم نے اب تک اُس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ آخر کیوں؟" میں نے برگا پر سوالوں کی بوچھار کر دی "کیا اُسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟"

اس وقت تک ہم قید خانے کے احاطے سے کافی دُور ریت کے کھیتوں کے درمیان آچکے تھے۔ میں نے ایک بار پیچھے دیکھا تو مجھے سورج کی الوداعی کرنوں میں شاہ کوتار کا اونچا محل، جگر مگر کرتا دکھائی دیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والی زرد لڑکیاں بھی اب کھیتوں سے اپنے گھروں کو واپس جا رہی تھیں۔

میرے سوالوں پر برگا نے اپنے آدمیوں کو رُکنے اور ذرا آرام کرنے کا حکم دیا۔ ساحر نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ ۔ پھر وہ بھی سپاہیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں اور برگا اُن سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔

"میں بہت سے معاملات سے ناواقف ہوں جناب اور اگر مجھے اُن کے بارے میں علم ہوتا تو بھی شاید بہت کچھ نہ بتاتا۔ یہ جو کچھ بھی ہُوا ہے، اچانک اور غیر متوقع طور پر ہُوا ہے۔" ایک لمحے کے لیے وہ رُکا پھر کہنے لگا "جہاں تک میں جانتا ہُوں، مُونا محل میں حفاظت سے ہے۔ تاہم اُسے زیرِ حراست رکھا گیا ہے۔ یہ ایک سیاسی اقدام ہے جس کے متعلق میں فی الوقت اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے۔ باقی ساری باتیں بھول جاؤ۔ ۔ ۔ مگر یہ بتاؤ کہ شبستانی کہاں اُترے ہیں اور اُن کی نفری کیا ہے؟ اُن کا سردار کون ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں؟ کیا ہمارے پاس بھی اتنی نفری ہے کہ ہم اُن کا مقابلہ کر سکیں؟"

برگا مسکراتے ہوئے بولا "آپ کے کچھ سوالوں کے جواب تو دے سکتا ہُوں، کچھ کے نہیں دے سکتا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خوش بختی سے ہم نے شبستانیوں کا ایک آدمی گرفتار کر لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ اُس سے مل کر بے حد خوش ہوں گے، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ اس سے خود ہی پوچھ گچھ کرنا پسند کریں گے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ برگا۔ اُس قیدی سے پوچھ گچھ کرنے میں مجھے کون سی خاص دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

برگا نے ایک قہقہہ لگایا اور اپنے آدمیوں کو اُٹھنے کا حکم دیتے ہوئے بولا "اُس قیدی کا نام ثالپ ہے جناب۔ ہم نے جب اُسے گرفتار کیا تو وہ زرد آدمی کے بھیس میں تھا۔"

"اوہ۔ تو وہ سیدھا محل تک پہنچنا چاہتا تھا" میں نے سوچا "ایک اور سازش۔ ہاں ثالپ کے اس اقدام سے سازش کی بو آتی ہے۔ اسے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ ہم طراق کے آدمیوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ کتنے بہادر اور جنگجُو ہیں، یہ میں بوبھان میں دیکھ ہی چکا ہُوں۔ شاہ کوتار نے شاید اُس وحشی طراق سے خفیہ معاہدہ کر لیا ہے کہ ردمو کی شکست کے بعد مکمل اقتدار اُنھیں دے دیا جائے گا۔ وہ نہیں جانتا کہ بعد میں طراق اپنے معاہدے سے منکر بھی ہو سکتا ہے اور مُونا کا کیا ہو گا؟ مگر میں اس کے بارے میں کیوں سوچوں؟" ان خیالات نے میرے ذہن میں کھلبلی سی مچا دی۔

"ثالپ کہاں ہے؟" میں نے برگا سے پوچھا۔

"یہاں سے ایک میل دُور جہاں ہماری نگہبانی کی چوکی ہے۔ کیا ہم وہاں چلیں؟"

"مجھے اُس کا شوقِ دیدار تو نہیں ہے برگا لیکن میں اُس کے مُنہ سے حقیقتِ حال سُننا یا اُگلوانا ضرور چاہتا ہُوں۔ ۔ ۔ وہ ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔"

ہم پھر آگے چل پڑے۔

"میں نے اُس سے پوچھ گچھ کی کوشش کی تھی مگر اُس نے کہا کہ وہ مجھے نہیں بلکہ بڑے افسروں کو بتائے گا دراصل اُس کا مقصد اپنے کسی جاننے والے افسر سے ملنا ہے۔" برگا نے جواب دیا۔

"اگر وہ اب بھی یہی اصرار کرتا ہے تو کیا تم اس کی یہ۔ ۔ ۔ خواہش پوری نہیں کر سکتے؟"

"میں اپنے کمان دار سے کہہ سکتا ہُوں جناب۔"

"تو پھر ضرور کہو اور اُس وقت مجھے سامنے آنے کے لیے مت کہنا!"

برگا نے میری تجویز مان لی۔

میں جانتا تھا کہ وہ وقت آگیا ہے جب حالات سے نمٹنے کے لیے مجھ سے کہا جائے گا۔ تب سربراہی میرے حصے میں آئے گی۔ میں رُک کر اُس تلوار کا جائزہ لینے لگا جو برگا نے مجھے دی تھی یہ ایک عمدہ تلوار تھی۔

خوں ریزی کا وقت آگیا تھا مگر اُس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔



میں اپنے ساحلی جھونپڑے کے ایک کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کمرے میں ہلکی ہلکی اور میٹھی میٹھی تمازت پھیلی ہوئی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کل مجھے ماضی کے سفر پر جانا ہوگا۔ اس لیے میں... رضا ہمدانی کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی فون کی گھنٹی بجے گی۔ اور وہ کہے گا "آج رات یہاں سے روانہ ہو جانا میرے بیٹے کل صبح تمہاری روانگی ہے اور ہاں یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ڈاکٹر فریدوں... وقت کا کتنا پابند ہے!"

جب بہت دیر تک فون کی گھنٹی نہ بجی تو میں اُسی طرح آنکھیں موندے موندے پھر نیند کے جزیرے میں اُتر گیا اور خواب دیکھنے لگا تھا۔ وہ بڑا ہی عجیب سا خواب تھا!

میں نے دیکھا کہ ایک غار میں لیٹا ہوا ہوں۔ مجھ پر میٹھی میٹھی سی غنودگی طاری ہے اور میں آنکھیں کھولنا چاہتا ہوں مگر وہ نیم وا ہو کر رہ جاتی ہیں اور اِن آدھ کھلے جھروکوں سے جھانکتا ہوں تو "وہ" مجھے غار کے تپتے اور دھڑکتے فرش پر اپنی طرف آتی دکھائی دیتی ہے۔ غار کے فرش کو چھو کر دیکھتا ہوں... تو وہ واقعی دھڑک رہا ہے، لرز رہا ہے اور کہیں سے مسلسل ایک گڑگڑاہٹ کی صدا سنائی دے رہی ہے۔ جب یہ گڑگڑاہٹ بڑھتی ہے تو اُس غار اور اُس دھرتی کے دل کی دھڑکن بھی بڑھ جاتی ہے... اور ان دھڑکنوں کے درمیان وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہی ہے اور اُسے دیکھ کر میری دھڑکنیں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔

وہ تھی ہی ایسی کہ اُسے دیکھ کر یا تو دلوں کی دھڑکنیں ایک دم تیز ہو جاتیں یا پھر دل دھڑکنا ہی بھول جاتا۔

میں نے ایسا ملکوتی حُسن اور ایسا شاداب سراپا، ایسی باوقار چال، ایسی شبنمی آنکھیں اور ایسے یاقوتی لب نہ تو پہلے کبھی دیکھے تھے اور نہ ہی شاید کہیں دیکھ سکوں گا۔ اُس کا قد میرے ہی جتنا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھ رہی تھی اور قدم کے ساتھ اُس کے چہرے کے رنگ قوسِ قزح کے رنگوں میں ڈھلتے جا رہے تھے۔ کبھی اس کے چہرے پر گلاب کھِل اُٹھتے تھے اور کبھی وہ طلائی رنگ کے دکھائی دینے لگتے تھے۔

وہ میرے قریب آکر رُک گئی۔

چند لمحے اپنی شبنمی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر میری آنکھوں کے پٹ اپنے آپ بند ہو گئے لیکن میرے حواس جاگتے رہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے ہیولہ مجھ میں سما گیا ہو، اُس نے مجھے اپنی ہستی میں سمو لیا ہو۔ وہ کیفیت بڑی لُطف انگیز تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔

کچھ دیر بعد مجھے ایسا لگا۔ جیسے میرا جسم ہلکا پھُلکا ہو گیا ہو، تب مجھے اُس کی آواز سنائی دی "آہ... بے ہوشی میں بھی تم کتنے اچھے ہو سرفروش!" اور اُس کی اِس بات پر میں نے سوچا کہ کیا میں واقعی بے ہوش ہوں؟ اگر میں بے ہوش ہوں تو پھر یہ خواب کیسے دیکھ رہا ہوں؟... یا بے ہوشی میں بھی خواب نظر آتے ہیں؟

میں نے آنکھیں کھولنا چاہیں مگر وہ نہ کھل سکیں۔

اتنے میں پھر اُس کی آواز سنائی دی "ولیشتا تمہیں سدا بے ہوش نہیں رکھے گی، سرفروش... وہ اتنی خود غرض اور دھوکے باز نہیں ہو سکتی۔ اب وہ تمہیں آپ خرد ہلائے گی!"

چند لمحوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے ہونٹوں سے ایک پیالہ لگا دیا گیا ہے میں نے وہ پیالہ پی لیا اور تھوڑی دیر بعد میرے بھاری پپوٹے ہلکے ہوتے چلے گئے۔ ذہن پہ چھائی ہوئی دُھند میں بھی شگاف پڑنے لگے اور میں نے آنکھیں کھول دیں میرا خواب ٹوٹ چکا تھا... مگر وہ اب تک میرے سامنے کھڑی تھی اور میں اپنے ساحلی جھونپڑے کے کمرے میں نہیں بلکہ ایک غار کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ جیسے سنگِ سُرخ کی سِلوں سے بنایا گیا تھا۔

وہ بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔

پہلے تو وہ مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "کیا اب بھی تمہارا سر چکرا رہا ہے؟ چوٹ کا کیا حال ہے؟"

"چوٹ؟!... کیسی چوٹ؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں سر پر جو چوٹ لگی تھی اب اُس کا کیا حال ہے؟"

میں نے جلدی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو مجھے اپنی کھوپڑی پر ایک بڑا سا گومڑا محسوس ہوا اور میرے منہ سے بے ساختہ ایک "آہ" نکل گئی۔ اُس نے میرا سر ایک مہربان ماں کی طرح اپنے سینے پر رکھ لیا اور اپنی اُنگلیوں سے میرے بال سہلانے لگی۔

"تم ولیشتا ہو نا؟" میں نے پوچھا۔

ہاں... اپنے کچھ دوستوں کے لیے میں ولیشتا ہوں۔ عوام کے لیے روموکی وَرِ شَہوار ہوں اور کچھ لوگ مجھے سیاہ موتی کے نام سے بھی پکارتے ہیں... لیکن اصلی سیاہ موتی اور تلوار کے متعلق ہم بعد میں بات کریں گے اور اگر ہماری مذہبی روایت کے مطابق تم ہی وہ شخص ہو جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے تو تم آتش فشاں کی تہ سے وہ تلوار اور موتی میرے پاس لے آؤ گے... لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں چوٹ سے تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ یا ختم ہو گئی ہے؟"

"ابھی تو صرف ہاتھ لگانے سے ٹیس اُٹھتی ہے۔" میں نے گومڑے کو ہاتھ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ میرے ہاتھوں میں شفا بخش تاثیر ہے۔ لاؤ مجھے دیکھنے دو۔" اس نے کہا اور اپنی نرم و نازک اُنگلیاں گومڑے پر پھیرنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پھر نیند کی وادی میں ڈوبنے اور اُبھرنے لگا ہوں اور میری سوچنے سمجھنے کی... صلاحیت ہی ختم ہوتی جا رہی ہو۔

میں نے اپنی غنودگی دُور کرنے کے لیے پوچھا "میں کب سے بے ہوش پڑا تھا؟"

"آج سورج جب تیسری بار اُبھرا ہے تو تم ہوش میں آئے ہو"

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا کہ مجھے سر پر چوٹ کیسے آئی۔ مگر مجھے کچھ بھی یاد نہ آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں بہت کچھ بھول چکا تھا، اگر میری یادداشت یکسر خراب ہو جاتی تو مجھے اپنا ساحلی جھونپڑا اور رضا ہمدانی یا ڈاکٹر فریدوں بھی یاد نہ آتے مگر وہ تو یاد آئے تھے! پھر یہ کیوں یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں اس غار میں کیسے پہنچا اور مجھے سر پر چوٹ کیسے آئی؟ یہ تو ولیشتا ہی بتا سکتی تھی۔

"مجھے یہ چوٹ کیسے آئی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تمہارے آدمیوں برگا اور ساحر نے بتایا تھا کہ تمہارے سر پر بڑے زور سے ضرب لگائی گئی تھی۔ تب وہ تمہیں یہاں اُٹھا لائے تھے۔ تم اس عرصے میں بڑی عجیب سی باتیں بڑبڑاتے رہے ہو۔ کبھی تم کسی رضا کو پکارتے تھے اور کبھی فریدوں کو کوستے تھے اور یہ کہتے تھے کہ وہ تمہیں واپس کیوں نہیں بُلاتا... خیر ہٹاؤ، اس قصے کو، اگر تم میدانِ جنگ میں خود نہ پھنسے ہوتے تو تمہاری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی!"

اس کی اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ چوٹ مجھے میدانِ کارزار میں آئی ہے مگر میں کس سے برسرِ پیکار تھا؟ اتنے میں ولیشتا نے خود ہی یہ گتھی بھی سلجھا دی۔

"شبستانی جہاز اپنے بھگوڑے اور بزدل سپاہیوں کو لے کر فرار ہو گیا۔ تم نے اُن سے زبردست جانی قیمت وصول کی ہے، سرفروش، تمہارے کہنے کے مطابق ٹالپ پر تشدد جاری ہے۔ بھگوڑے شبستانی تمہارا پیغام طراق کو پہنچا دیں گے۔ مگر ٹالپ کا فیصلہ تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔"

ولیشتا کی باتوں سے پتہ چلا کہ ٹالپ پر تشدد کا حکم میں نے دیا تھا۔ میں تشدد پسند نہیں اور کسی کو ذرد یا کرب میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ اگر میں نے تشدد کا حکم دیا ہو گا تو اس کی کوئی وجہ بھی ضرور ہو گی جو اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہی تھی۔

میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ جیسے بھی ہو آگے بڑھوں اور معاملات پر حاوی رہوں کہ یہی میری بقا کے لیے ضروری تھا۔ پھر میں نے ذہن سے یہ سارے خیالات جھٹک دیے اور اُٹھ کھڑا ہوا لیکن میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

ولیشتا یہ دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"تین روز تک میں نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ شاید اسی لیے میرے اندر نقاہت آگئی ہے۔" میں نے کہا۔

ولیشتا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی "اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ایسا ہی ہو گا!"

میں اُس کے قہقہے اور اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکا اور یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے مجھ پر طنز کیا ہو۔ "یہ حقیقت ہے ولیشتا کہ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے لیکن کھانے سے پہلے میں نہانا چاہتا ہوں، مجھے نئے لباس کی بھی ضرورت ہے۔ پھر میں پہلے اپنے خادم ساحر اور اُس کے بعد برگا سے ملاقات کرنا چاہوں گا۔ برائے مہربانی یہ سب انتظام کروا دو۔"

ولیشتا نے جو آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی، قریب رکھی ایک تھالی پر چوبی ہتھوڑی سے ضرب لگائی، تو ایک زرد لڑکی نظریں جھکائے وہاں آگئی۔ ولیشتا نے اُسے حکم دینے سے پہلے مجھ سے کہا "اپنے خادم کو سمجھا دینا کہ وہ میری کنیزوں پر نظر نہ رکھے۔ وہ تمہاری خیر و عافیت پوچھنے کے بہانے میری کنیزوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا ہے۔ اُسے بتا دینا کہ زرد لڑکیوں سے میل جول کی سختی سے ممانعت ہے!"... پھر اُس نے اپنی کنیز کو ہدایات دیں اور مجھے اُس کے ساتھ جانے کا اشارہ کر دیا۔

کنیز اُسی طرح ادب سے نگاہیں جھکائے اور ہاتھ باندھے میری رہبری کرتی ہوئی متعدد دشر نگوں سے گزرتی ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں ایک خوبصورت پردہ آویزاں تھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو وہاں سیاہ پتھر کا ایک بہت بڑا ٹب نما برتن رکھا ہُوا تھا اور کہیں سے اس میں گرم گرم بھاپ اُٹھاتا پانی گر رہا تھا۔ میں نے غسل خانے کی دیوار کو چھُو کر دیکھا۔ وہ اتنی گرم تھی کہ میں نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا اور ٹب نما برتن میں اُتر گیا۔

ابھی میں غسل کر رہا تھا کہ پردہ ہٹا اور ساحر وہاں آگیا... مگر اس کا حُلیہ بدلا ہُوا تھا اُس کی ایک آنکھ تو پہلے ہی ضائع ہو چکی تھی مگر اُس کے سامنے والے دانت بھی غائب تھے۔ جب وہ مُسکرایا تو مجھے اُس کے خالی مسوڑھے دیکھ کر ہنسی آگئی۔

"مُونا دیوی کے شوخ قہقہوں کی قسم! آپ کو تندرست دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہُوئی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ وہ بڑے زور کی جھڑپ تھی مالک۔ اُس بدبخت نے پیچھے سے آپ پر پوری قوت سے ضرب لگائی تھی مگر میں نے اُسے دُوسری ضرب لگانے کا موقع نہیں دیا اور اپنی شمشیر آب دار اُس کی پُشت میں گھونپ دی.. مگر یہ تو بتایئے جناب والا کہ جو لڑکی آپ کو یہاں تک چھوڑنے آئی تھی وہ جِنا تو نہیں تھی؟" اُس نے ٹب نما برتن میں کوئی سفوف گراتے ہُوئے پُوچھا۔

اُس کے سوال پر مجھے ونیشتا کی بات یاد آگئی۔

"ونیشتا نے مجھے ہدایت کی ہے کہ زرد لڑکیوں بالخصوص اُس کی کنیزوں سے میل جول کی سخت ممانعت ہے اور ہاں تم نے اس برتن میں کون سا سفوف ملایا ہے؟"

"یہ خوشبُودار سفوف ہے جناب۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے آپ کی مردانہ وجاہت پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے بے ہوشی کی کوئی دوا ملائی ہے؟"

"وہ تو مجھے اس کی خوشبُو سے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر یہ ہے کیا چیز؟"

"یہ ایک معدنی نمک ہے۔"

"اچھا!.. مگر میں نے تمھیں جو ہدایت کی ہے، اُس پر عمل کرنا۔ سمجھ گئے؟"

"میں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہُوں، حضور۔ وہ تو... دراصل جِنا مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ میں سمجھا کہ شاید ہنسنے کے بعد کے مراحل بھی...!"

"خاموش رہو اور میری بات غور سے سُنو۔ جب میں کوئی سوال کروں، تب اپنا مُنہ کھولنا ورنہ خاموش رہنا۔"

"... پھر میں نے اُسے بتایا کہ میری یادداشت کھو گئی ہے اس لیے وہ مجھے جُملہ حالات سے باخبر کرے۔

"میں تو اسی وقت سے بتا سکتا ہُوں جب بوتھان میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے کہا۔

"یہ بوتھان کیا ہے؟"

"ارے!" وہ حیرت سے بولا۔ "اگر آپ بوتھان بھول گئے ہیں تو پھر مُونا بھی آپ کو یاد نہیں ہوگی۔"

"یہ مونا کیا چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آئے ہائے۔ ہائے۔ قسم مُونا دیوی کے جاہ و جلال کی۔ اس ظالم نے بڑی ظالم چوٹ ماری ہے آپ کو۔ ایسی ظالم کہ آپ سب کچھ بھول گئے۔ آپ کو وہ خود بھی یاد نہیں ہوگی جس کی وجہ سے آپ بچ گئے۔"

"کون سی خود؟ بکتے ہی جاؤ گے یا کچھ بتاؤ گے بھی؟"

"بتاتا ہُوں آقا۔" ساحر بولا۔ "شبستانیوں سے جھڑپ کے دوران آپ خود کے بغیر لڑ رہے تھے کیونکہ آپ کے ناپ کی خود ان لوگوں کے پاس نہیں تھی۔ چنانچہ جب میں نے ایک مُردہ شبستانی کی تلاشی لی تو مجھے یہ بات بھی یاد آگئی اور میں نے اُس کی خود اُتار کر زبردستی آپ کو پہنا دی تھی۔ یہ ایک شبستانی خود تھی جو بڑی ہوگی مگر کٹ نہیں پائی۔ ملاحظہ فرمایئے۔" اُس نے اپنا خود اُتار کر میرے سامنے کر دیا۔

اُس میں تلوار کا نشان تھا اور ایک گڑھا بھی پڑا ہُوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اژدہے کے مُنہ اور دُم کے نیچے یہ الفاظ بھی کندہ نظر آگئے۔ "ماسترا اوردا"۔ میں نے ساحر سے پُوچھا۔ "ماسترا اوردا" کا کیا مطلب ہے؟"

"میں دیوتا کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"اوہ۔ میں طمراق سے ملنا پسند کروں گا۔ ذرا وہ تولیہ تو اُٹھانا۔"

ساحر نے مجھے تولیہ دیتے ہُوئے کہا۔ "اگر آپ اُس سے ملیں گے تو میں بھی اُسے شرفِ ملاقات بخشوں گا۔ ہم نے اُس کے ہراول دستے کی جس طرح پٹائی اور توہین کی ہے۔ پھر جس طرح اُس کے چہیتے ٹالپ کو پکڑا اور آپ نے اُسے جو پیغام بھیجا ہے، یہ ساری باتیں اُس کے تن بدن میں آگ لگا دیں گی اور وہ خود ہی ہماری ملاقات کو دوڑا آئے گا۔"

"میرے پلّے کچھ بھی نہیں پڑا نہ جانے تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ اب مزید وقت ضائع کیے بغیر اس وقت سے لے کر جب ہماری ملاقات ہوئی تھی، ساری اہم باتیں مختصراً بتا دو۔" میں نے ساحر کو حکم دیا۔

اُس نے مختصراً وہ باتیں بتا دیں جنھیں وہ خود جانتا تھا اور

وہ اس نے مجھ سے سنی تھیں۔

تب میں نے اُسے حکم دیا۔ "جاؤ برگا کو تلاش کرو اور اُسے ہو کہ وہ مجھ سے وہاں ملے جہاں ٹالپ قید ہے.. پھر ونیشتا کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ مجھے جیسے ہی فرصت ملی میں اس سے ملنے آؤں

ا۔ ہاں۔ ذرا دُہرانا تو میں نے کیا کہا ہے؟"

ساحر نے میری ہدایات دُہرا دیں۔

"قدرت نے غالباً ہمیں ایک دُوسرے کی مدد کے لیے مِلایا ہے۔ شاید ہم ایک ساتھ جئیں اور ایک ساتھ مریں گے۔ اس لیے میں تم پر اعتماد کرتا ہُوں مگر چونکہ تم بے حد جھُوٹے ہو لہٰذا مجھے ڈر ہے کہ تم نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں کہیں اُن میں جھُوٹ کی ملاوٹ نہ ہو۔"

"مُونا کی قسم آقا میں نے ایک لفظ بھی جھُوٹ نہیں کہا!"

"بس تو پھر دیر نہ کرو اور جا کر برگا کو تلاش کرو۔"

"ایک بات بتانا البتہ بھُول گیا تھا!"

"وہ کیا؟"

"آپ نے زرد لوگوں کے ناموں کے اندراج اور ان پر پابندی کے جو احکام جاری کیے ہیں وہ مجھے پسند نہیں آئے۔"

"جاؤ... فوراً دفع ہو جاؤ..." میں نے دھاڑ کر کہا۔

وہ بھاگتا ہُوا چلا گیا مگر چند لمحوں بعد پھر لوٹ آیا اور پردہ ہٹا کر جھانکتے ہُوئے بولا۔ "اگر آپ ٹالپ کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اُس کے پاس جانے میں دیر نہ کیجیے۔ وہ لاکھ موٹا سہی مگر ایک وقت آتا ہے جب موٹے آدمیوں میں بھی خون باقی نہیں رہتا۔"

*

ٹالپ کو دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اپنے دَور اور دُنیا میں، میں کبھی اتنا ظالم اور تشدد پسند نہیں تھا۔ نہ جانے میں نے کیا سوچ کر اس پر تشدد کا حکم دے دیا تھا۔ وہ لوگ اُسے چرکے لگاتے اور پھر زخموں کو داغ کر ٹالپ کی چیخوں سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں اُس وقت چمڑے کی شاندار وردی اور اسلحے سے لیس تھا۔ میں نے ٹالپ کو غور سے دیکھا۔ اُس وقت مجھے اُس کے بارے میں صرف اتنا ہی یاد تھا جتنا ساحر نے بتایا تھا۔ میں نے تلوار سے اس کے کٹے ہُوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پُوچھا۔ "تمھارے ہاتھ کو کیا ہُوا ہے پُجاری؟"

ٹالپ نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "خوب! لڑکی کاٹا اور خود ہی پُوچھ رہے ہو کہ میرے ہاتھ کو کیا ہُوا ہے؟"

"اگر میں نے تمھارا ایک ہاتھ کاٹ دیا ہے تو دُوسرا بھی کاٹ سکتا ہوں اور گردن بھی اُڑا سکتا ہُوں کیا خیال ہے تمھارا؟"

"تو دیر مت کرو اور میری گردن اُڑا دو۔ اس عذاب سے تو بہتر ہے کہ میں مر جاؤں اور یاد رکھو، مُونا دیوی تم سے میری موت کا انتقام لے گی۔"

"اگر تم نے مجھے یہ نہ بتایا کہ طمراق کے پاس کتنی فوج اور کتنے جہاز ہیں، وہ اپنی فوجیں کہاں کہاں اُتارے گا اور اُس کا منصُوبہ کیا ہے... اور تم کس سازش کے تحت یہاں بھیجے گئے ہو تو تمھاری یہ گردن اُڑانے والی آرزو ضرور پُوری کی جائے گی پُجاری۔"

... لیکن ٹالپ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔

"میں تمھیں صرف پانچ ساعتوں کی مُہلت دیتا ہُوں۔ سوچ لو۔ اگر تم نے اپنی زبان نہ کھولی تو تمھارے لیے بہت بُرا ہوگا۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا گیا۔

مجھے ضروری انتظامات کرنے میں کچھ دیر لگ گئی جب میں دوبارہ ٹالپ کے پاس آیا تو وہ بولا۔ "میں سب کے سامنے بات نہیں کر سکتا۔"

میں نے سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔ ٹالپ نے کہا۔ "طمراق نے دراصل مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ وہ تمھاری بہادری کے قصے سُن چکا ہے اور تم سے دوستی کا آرزومند ہے۔ اگر تم ہمارے دوست بن جاؤ تو میں اپنے ساتھ تمھارا یہ سلوک بھی بھُول جاؤں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رومو تباہی سے نہیں بچ سکتا۔ شاہ کوتارا اور ملکہ سمری بھی یہاں سے بھاگ کر بوتھان جا چکے ہیں اور اُنھوں نے شاہ طمراق کی اطاعت قبول کر لی ہے... اس صورت میں تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہماری دوستانہ پیش کش قبول کر لو۔"

ان باتوں کے دوران میرے ذہن میں ایک بات بجلی کی طرح کوند گئی۔

"مُونا کے بارے میں کیا کہتے ہو پُجاری؟"

وہ مسکرایا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی یہ مُسکراہٹ بڑی ذُومعانی تھی۔ "شاہ کوتارا اُسے ایک یرغمال کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے گیا ہے!"

"لیکن ایک یرغمال کی حیثیت سے اُس کی اہمیت ہی کیا ہے؟"

ٹالپ پھر ذُومعانی انداز سے مُسکرایا اور بولا۔ "یہاں اب بوتھان میں چپّے چپّے پر ہمارے جاسوس پھیلے ہُوئے ہیں۔ جن دنوں تم دلدلی علاقے میں چھُپے ہُوئے تھے، تمھارے آدمیوں میں ہمارا ایک جاسوس بھی شامل تھا۔ اُس کی زبانی ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم اور مُونا دیوی ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہو۔ بس یہی بات اُسے اہمیت بخش دینے کے لیے کافی ہے۔"

"تمھارا جاسوس جھوٹا تھا۔" میں نے اُسے جواب دیا اور سوچنے لگا کہ اگر میں مُونا سے محبت کرتا تو میں نے ساحر کو یہ بات ضرور بتائی ہوتی اور وہ، مجھے نسیان میں مُبتلا ہونے کی وجہ سے یہ بات بھی ضرور بتاتا مگر اُس نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

"ہمارا جاسوس جھوٹا نہیں ہو سکتا... اور اگر فرض کر لیا جائے کہ اُس نے جھوٹ بولا ہے تو بھی مُونا کی اہمیت اس لیے ہے کہ وہ دلیشتا کی نواسی ہے۔ کیا وہ یہ چاہے گی کہ مُونا کی بوٹیاں، گِدھ نوچ کھائیں؟"

"تم دلیشتا کو نہیں جانتے بُچاری کہ وہ کیسی عورت ہے۔ اُسے ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں۔ خیر چھوڑو۔ تم نے میری مُہلت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔" یہ کہہ کر میں نے محافظوں کو بُلایا اور اُنھیں حکم دیا کہ ٹالپ کو لے چلیں۔

محافظ ٹالپ کو جوالا مُکھی کے دہانے پر لے گئے جہاں دو شہتیروں کے ساتھ ایک جھُولا باندھ دیا گیا تھا۔

"اسے جوالا مُکھی میں اُلٹا لٹکا دو۔" میں نے محافظوں کو حکم دیا۔

محافظوں نے رسّے سے اُس کے پاؤں باندھے اور اُسے اُلٹا لٹکا دیا۔ جوالا مُکھی سے تھوڑی دیر بعد دُھواں اور گرم بُخارات اُٹھنے لگے۔ چند لمحے بعد جب اُسے نکالا گیا تو وہ بے سُدھ تھا۔ میں ڈر گیا کہ کہیں وہ مر نہ گیا ہو۔ مگر جب میں نے اُس کے دل پر ہاتھ رکھا تو وہ ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ میں نے محافظوں سے کہا کہ وہ اُس کے مُنہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں۔

جب وہ ہوش میں آیا تو میں نے کہا "تم لوگوں کو دوزخ سے ڈرایا کرتے تھے... مگر تم کو پتہ نہیں تھا کہ دوزخ کیا ہوتی ہے۔ اب تم نے اُس کی ایک جھلک دیکھ لی ہے۔ صاف صاف بتاتے ہو یا دُوسری جھلک بھی دکھاؤں؟"

"نہیں نہیں۔ میں سب کچھ بتاتا ہُوں۔ سب کچھ بتا دُوں گا۔" وہ کانپ کر بولا۔

"اور یہ بھی یاد رکھو کہ اگر ایک بات بھی جھُوٹ ثابت ہُوئی تو تمھیں اس دوزخ کا ایندھن بنا دیا جائے گا۔" پھر میں نے اُسے سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر حکم دیا "جلو اب شروع ہو جاؤ۔ اپنی داستان سُنا ڈالو۔" اس وقت افسروں کا ایک گروہ بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے دلیشتا کو بھی بلوایا تھا لیکن وہ وہاں نہیں آئی تھی۔

ٹالپ سے سب کچھ اُگلوانے کے بعد کوئی ایک گھنٹے تک مجلس مشاورت جاری رہی اور میں افسروں کو مختلف ہدایات

دیتا رہا۔۔ پھر میں نے اُنھیں رُخصت کر دیا۔ ساحر میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا "دلیشتا چاہتی ہے کہ آپ آج شام اُس کے پاس ضرور آئیں۔ وہ حجلۂ موسیقی میں آپ کی منتظر رہے گی۔ اُس کی ہدایت ہے کہ آپ وہاں تنہا آئیں۔"

"یہ حجلۂ موسیقی کہاں ہے اور میں اُسے کیسے یا کہاں تلاش کروں گا؟"

"میری محبوبہ۔۔ ارے نہیں، جناب! میری خیال محبوبہ آپ کو وہاں لے جائے گی۔ میں نے سارا انتظام کر دیا ہے۔"

"دیکھو یہ خواتین کے چکر چھوڑ دو ورنہ کسی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔" میں نے اُسے پیار سے ڈانٹا۔ "اور سنو۔ میں نے تمھیں فقیروں اور اُٹھائی گیروں کا سربراہ اس لیے بنایا ہے کہ تم اُن سے کام لو گے۔ اگر اُن سے خاطر خواہ کام نہ لیا گیا اور وہ اپنا فرض پورا نہ کر سکے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے خواتین کی وجہ سے غفلت شعاری کی۔ پھر مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

"میں اپنا فرض خُوب جانتا ہُوں مالک۔ آپ کا خادم ہمیشہ فرض کو محبت پر ترجیح دیتا آیا ہے۔"

"تو پھر اب یہاں وقت برباد نہ کرو۔ تمھارے بھکاری اور اُٹھائی گیرے ہی میری خفیہ فوج ہے اور میں انھی پر انحصار کر رہا ہوں۔"

ساحر جانے لگا تو برگا ایک ٹوکری میں بہت سے کاغذات لیے وہاں آ گیا اور بولا "اگر آپ تیار ہوں تو میں آپ کو وہ سب دکھاؤں جس کا آپ نے حکم دیا تھا۔"

"میں تیار ہُوں برگا۔"

"تو پھر تشریف لایے۔" وہ بولا "کام بہت ہے اور

بہت کم رہ گیا ہے۔"

*

ہم اس وقت ایک ایسی پگڈنڈی پر چل رہے تھے جس پر لاوے کی بھری پڑی ہُوئی تھی۔ اچانک میری نگاہ دو پہاڑیوں کے درمیان سے ایک انسانی ہیولے پر جا پڑی جس کے چاروں طرف شعلے لپک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے دلیشتا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہو اور اُس کے اِردگرد شعلے لپک رہے ہوں... مگر اُس کو احساس تک نہ ہو۔

میں دَم بخود وہیں رُک گیا۔

"آپ رُک کیوں گئے جناب؟" برگا نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ دلیشتا ہے۔"

"ہاں جناب! وہ درِ شہوارِ ردمو ہی ہے۔ وہ میری نانی ہے۔ اس کی ساحرانہ قوتوں کا راز انھی شعلوں میں مضمر ہے۔"

میرے ذہن میں پھر ایک بار جھماکا ہُوا۔

"وہ مُونا کی بھی نانی ہے۔ اُس کا مطلب ہُوا کہ تم مُونا کے بھائی ہو؟"

"جی ہاں۔۔ لیکن ہم سوتیلے بہن بھائی ہیں۔ اُس کا باپ آپ ہی کی طرح بہادر تھا اور میرا پردیسی باپ بھی جنگجو تھا۔ وہ بھی اسی طرح نہ جانے کہاں سے آئے تھے اور نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اسی طرح ایک روز آپ بھی چلے جائیں گے۔ اب آیے دیر ہو رہی ہے۔"

... پھر جب ہم پوست کے کھیتوں سے گُزر رہے تھے تو برگا نے بتایا "آپ کے حکم پر افیون کا سارا ذخیرہ جلا دیا گیا ہے۔ تمام زرد لوگ زمین کھودنے اور ناکہ بندی کے کام پر لگا دیے گئے ہیں۔"

"افیون کی بندش کا کیا اثر پڑا ہے؟"

"شروع شروع میں تو اُس کا بہت بُرا اثر پڑا تھا، جناب۔ لوگوں نے لُوٹ مار کی، احتجاج کیا اور پھر فیونا کو جلا ڈالا۔"

"جلا ڈالا!" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو بہت ہی خوبصورت تھا۔"

برگا نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور کہا "لیکن خود آپ ہی نے تو یہ حکم دیا تھا کہ افیون کو خاکستر بنا دیا جائے۔"

مجھے یہ سُن کر ایک بار پھر ساحر پر غصّہ آ گیا۔ اُس کم بخت نے اس سلسلے میں بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا مگر میں نے سوچا کہ اس میں بے چارے ساحر کا کوئی قصور نہیں۔ نسیان میں تو میں خود ہی مبتلا ہو گیا ہُوں۔ میں نے اُسے ہر بات تو بتا نہیں رکھی تھی اور نہ وہ ہر بات دُہرا سکتا تھا۔

اتنے میں ہم ایک گُنبد کے قریب پہنچ گئے۔ یہ گُنبد شہتیروں سے بنایا گیا تھا اور کوئی تین سو ہاتھ بلند تھا۔ وہاں کچھ زرد لوگ ہمارے منتظر تھے۔ اُنھوں نے گُنبد کے بالائی حصّے کی چرخی کے ساتھ لمبا رسّہ لٹکا رکھا تھا۔ جونہی ہم چوکی پر سوار ہُوئے، وہ رسّہ کھینچنے لگے اور چوکی اُوپر اُٹھنے لگی۔

"ہمیں گھوڑوں کی بھی شدید ضرورت پڑے گی برگا۔" میں نے کہا۔

"ردمو میں گھوڑے نہیں ہوتے جناب۔ ہم نے کبھی ان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔"

"لیکن اب ردمو کو گھوڑوں کی ضرورت ہے۔"

"طمراق کے پاس ہزاروں گھوڑے ہیں، جناب۔ گھوڑوں سے بھرے ہوئے کئی جہاز ہمارے ساحل سے کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہیں۔"

اتنے میں ہم گُنبد کے بالائی حصّے پر پہنچ گئے۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے چاروں طرف شفاف شیشے لگے ہُوئے تھے۔ کمرے میں متعدد میزیں اور متعدد کُرسیاں پڑی ہُوئی تھیں۔ برگا ایک بڑی میز کے قریب رُک گیا اور ٹوکری سے کاغذ اور نقشے نکال کر میز پر پھیلانے لگا۔

میں نے کمرے کے ایک جانب نیچے دیکھا۔

سارا جزیرہ میرے سامنے تھا۔

میں نے اُسے اتنا چھوٹا جزیرہ نہیں سمجھا تھا۔ میری دائیں جانب جوالا مُکھی والی پہاڑیاں تھیں۔ میری نگاہیں پہاڑیوں کے درمیان پتھر کے ایک مُسطح چبوترے پر مُرتکز ہو کر رہ گئیں۔ جس کے اِردگرد دُھوئیں میں لپٹے ہوئے شعلے بھڑک رہے تھے۔

"اس کی ساحرانہ قوتوں کا راز اسی آگ میں مضمر ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے برگا نے یہ الفاظ دوبارہ کہے ہوں۔ میں نے پلٹ کر برگا کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اُسی طرح میز پر مختلف کاغذات رکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے اُس کے قریب جا کر پوچھا "تمھارے پاس نمائشی نہیں بلکہ سچ مچ کے کتنے جنگجو سپاہی ہیں؟"

"شاہ کوتار کے کٹھ پتلی سپاہیوں کی بڑی تعداد تو جزیرہ چھوڑ کر فرار ہو چکی ہے۔ میرے پاس صرف درِ شہوار کے ایک ہزار سپاہی ہیں۔"

یہ سُن کر میں وہاں سے ہٹ گیا۔ صرف ایک ہزار سپاہی طمراق کے لشکرِ جرّار کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے! میں طمراق کے جنگ آزماؤں کو لڑتے دیکھ چکا تھا۔ اس کی فوج میں نیزہ باز اور تیر انداز بھی تھے۔ شمشیر زن تھے اور گھُڑ سوار بھی تھے۔ یہ ایک ہزار سپاہی تو پہلے ہی

ریلے میں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیے جائیں گے۔ اس صورتِ حال میں ردموکی تباہی یقینی نظر آ رہی تھی۔ بچنے کی اگر کوئی صورت تھی تو صرف یہ تھی کہ سپاہ کو لڑانے کی بجائے طمراق کا اور میرا مقابلہ ہو جائے۔

اگر مجھے اس سلسلے میں کوئی سہولت حاصل تھی تو صرف اتنی کہ مجھے شبستانیوں کے منصوبے کا علم ہو چکا تھا وہ بھی اگر ٹالپ نے جھوٹ نہ بولا ہو لیکن میرا خیال تھا کہ ٹالپ کی جو دُرگت بنی تھی اُس کے تحت اُس نے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کی ہوگی۔ اب صرف ایک ہی امکان باقی رہ جاتا تھا کہ کسی طرح طمراق کو یوں گھیر لیا جائے کہ وہ باعزت طریقے سے نہ نکل پائے اور میری دعوتِ مقابلہ قبول کرنے پر تیار ہو جائے۔

اتنے میں برگا میرے قریب آ گیا اور بولا۔ "آپ کے احکام کی تعمیل ہو چکی ہے جناب۔ زرد اور دُوسرے لوگ قلعہ بندی اور ناکہ بندی میں لگا دیے گئے ہیں۔ جہاں جہاں آپ نے جال بچھانے کو کہا تھا۔ وہاں جال بھی بچھا دیے گئے ہیں۔ وہ زرد لوگ جو جنگ نہیں لڑ سکتے، اُنھیں بھی بھرتی کر لیا گیا ہے اور اُنھیں مصنوعی تلواریں اور نیزے فراہم کر دیے گئے ہیں۔ ہم اُنھیں مسلسل گشت کرواتے اور دُشمن کو یہ تاثر دیتے رہیں گے کہ ہمارے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں ہے۔ ہم اُنھیں ایک پہاڑی سے دُوسری تک لاتے اور پھر اوٹ میں واپس بھیج کر واپس منگواتے رہیں گے۔ ہم دُشمن کے جاسوس پر بھی نظر رکھیں گے اور اُنھیں قتل کرنے کی بجائے اُن سے معلومات حاصل کریں گے۔ ہم اپنے حُسنِ سلوک سے اُنھیں اپنا ساتھی بنانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے اور ہمیں اُمید ہے کہ اس میں کامیاب رہیں گے کیونکہ لوگ طمراق کو دل سے پسند نہیں کرتے۔ میں نے ساحل پر کچھ دستے متعین کر دیے ہیں مگر سپاہ کا بیشتر حصّہ آتش فشاں کے پاس ہی رہنے دیا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک جانب اشارہ کیا جہاں فوج کے خیمے نصب تھے اور رُدمی اکھاڑوں کی یاد دلا رہے تھے۔

برگا تو مجھے اُن احکام کی تفصیل بتا رہا تھا جو میں چوٹ کے باعث پیدا ہونے والے نسیان کی وجہ سے بھول چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس بار اپنے دُور اور دُنیا میں واپسی تقریباً ناممکن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر میں پکڑا گیا یا مارا گیا تو ڈاکٹر فریدول کو اپنے تجربے سے کیا فائدہ پہنچے گا۔ البتہ میرے گرفتار ہونے یا مارے جانے پر ٹالپ کو دلی خوشی ہوگی۔

وہ انگیٹھی پر سُرخ کی ہُوئی خُود مجھے ضرور پہنا دے گا۔

یہ سوچ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

"آپ ہنس رہے ہیں جناب تو ضرور کوئی خوشی کی بات ہوگی مجھے بھی اُس خوشی میں شریک کیجیے" برگا نے کہا۔

میں اُس کی بات پر قہقہے لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مجھ سے ٹالپ کے انتقام میں شریک ہونے کی درخواست کر رہا تھا۔

"کاش میں تمھیں بتا سکتا کہ مجھے کس بات پر ہنسی آئی تھی۔ باتیں چھوڑو۔ تھوڑی دیر پہلے تم میری دانشمندی کی تعریف کر رہے تھے تو بتاؤ کہ میری وہ دانشمندی کیا تھی۔ میں اپنی تعریف سُن کر خوش ہونا چاہتا ہُوں"۔ میں نے کہا۔

"میں وہ تحریر پڑھے دیتا ہُوں جو آپ نے مجھ سے لکھوائی"۔ برگا وہ تحریر پڑھ کر سُنانے لگا اور مجھے حیرت ہونے لگی۔ ہر بار ماضی کے سفر پر آ کر خود بھی ماضی کا کردار بن جاتا ہُوں۔ میرے اندر بھی وہی خامیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اُس دور کے انسانوں پر ہوتی تھیں بلکہ میں اُن سے کہیں زیادہ چالاک اور مکار بن جاتا ہُوں۔ برگا پڑھ رہا تھا۔

"تم نے دعوا کیا ہے کہ تم ردمو کے خوبصورت شہر پر قبضہ کر لو گے مگر وہاں تمھیں راکھ کے ڈھیروں اور ملبے کے سوا کچھ نہ ملے گا"۔ تو جناب یہ تھا آپ کا پیغام طمراق کے نام اور یہی کچھ بھی ہے"۔

"تمھارے پاس اس خط کا جواب بھی ہوگا؟"

"ہاں جناب۔ اُس نے لکھا ہے کہ چاہے ردمو خاک اور راکھ کا ڈھیر ہی کیوں نہ بن جائے مگر وہ انتقام لینے ضرور آئے گا کیونکہ وہ ہمیشہ ردمو میں آباد ہونے کا خواب دیکھتا رہا ہے۔ اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اُس نے پُجاریوں کی ایک جماعت کو تشدد کے نئے طریقے دریافت کرنے پر مامور کر دیا ہے تاکہ وہ طریقے آپ پر آزمائے جا سکیں"۔

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہُوئے بولا۔ "پھر تو ہمیں اُس کا انتظار کرنا چاہیے برگا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے مرنا ہی تو پڑے گا۔۔ مگر یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ اُس نے میرے لیے تشدد کے کون سے نئے طریقے ایجاد کروائے ہیں"۔

"مگر جناب میں تو اپنے سپاہیوں کو یہ ہدایت کر چکا ہُوں کہ اگر ہم جنگ ہار جائیں تو گرفتار ہونے کی بجائے خود ہی ایک دُوسرے کا کام تمام کر دیں۔ دُرِ شہوار دشتا بھی یہی کرے گی اُسے اور مجھے فکر ہے تو صرف ٹونا کی جسے طمراق نے قید کر لیا ہے۔ وہ اُسے یہاں ضرور لائے گا اور اُس کے عوض سودے بازی کرنا چاہے گا لیکن یہ بے حد ضروری ہے کہ ٹونا ردمو کے لیے زندہ رہے۔ میرا خیال ہے کہ دُرِ شہوار دشتا نے اس سلسلے میں آپ سے بات کی ہوگی۔ اگر نہیں کی تو ضرور کرے گی"۔

میں نے سوچا کہ اُس نے مجھے بُلوایا ہے تو شاید آج رات وہ یہی بات کرے۔ مجھے حیرت تھی کہ ٹونا شاہ کوتار کے قبضے سے طمراق کے پاس پہنچ کر کیسا محسوس کر رہی ہوگی۔

برگا پھر بڑی میز پر پہنچ کر کہنے لگا۔ "اب تک تو آپ کا منصوبہ کامیاب رہا ہے جناب۔ ہم نے دفاعی انتظامات اس طرح کیے ہیں کہ جزیرے کا شمالی حصّہ دفاعی اعتبار سے طمراق کو کمزور ترین محسوس ہو جب کہ وہی حصّے ہیں جہاں ہمارا دفاع مضبوط تر ہے۔ وہ یقیناً سارا زور شمالی حصّے پر ہی ڈالے گا۔ مگر جزیرے کے دُوسرے حصّوں پر بھی حملہ کرے گا"۔

میں نے ایک نظر پھر جزیرے پر ڈالی۔

ہر طرف روشنیاں جھلملانے لگی تھیں اور مغربی جانب شعلے اُٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔

فیونا اب تک جل رہا تھا۔

جوالا مُکھی سے بھی شعلوں کی زبانیں لپکتی دکھائی دے رہی تھیں۔

برگا نے نقشے سے نظر ہٹا کر شمالی بندرگاہ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "طمراق کے ہراول دستے ادھر بڑھ رہے ہیں۔ صبح تک اُس کے جہاز پہنچ جائیں گے اور وہ حملے کا آغاز کر دے گا۔ ہم جو کچھ کر سکتے تھے، کر چکے۔ اب اور کیا حکم ہے؟"

میں نے برگا کو کچھ ہدایات دیں اور واپسی کے لیے تیار ہو گیا کہ اب ہر طرف اندھیرا پھیل رہا تھا اور مجھے دُرِ شہوار دشتا سے ملنا تھا۔

☼

ساحر نے شب میں خوشبو ملاتے ہُوئے کہا۔ "شبستانی صبحِ کاذب کے وقت حملہ کریں گے جناب"۔

"یہ خبر پرانی ہو چکی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ "کوئی نئی خبر سناؤ"۔

"طمراق کے ایک سو گھڑ سوار ساحل پر پہنچ گئے ہیں اور اسی جانب بڑھ رہے ہیں"۔

"ہاں۔ یہ اطلاع البتہ نئی ہے۔ تم اُن سے نمٹو گے۔ تمھیں یہاں سے سیدھے برگا کے پاس جانا ہے۔ میں اُسے ہدایت کر چکا ہوں کہ وہ محافظوں کا ایک دستہ تمھاری کمان میں دے دے۔ اب میری باتیں ذرا غور سے سُنو۔۔۔"

۔۔۔ پھر میں نے اُسے بھی کچھ ہدایات دیں اور غسل میں مصروف ہو گیا۔

☼

حِنا مختلف سُرنگوں میں میری رہبری کرتی ہُوئی سر جُھکائے آگے آگے چل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر سُرنگ گہرائی میں جا رہی ہے اور اُس کے ساتھ ہی خُنکی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ مجھے کپکپی محسوس ہونے لگی۔

وہ مجھے ایک بڑی کھوہ کے دہانے پر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

اس کھوہ میں اُسی پُراسرار موسیقی کی آواز گونج رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں اُس موسیقی کے مرکز یا مخرج پر کھڑا ہُوں۔ میں نے کھوہ کی دیواروں پر نظر ڈالی تو مجھے ہر طرف دراڑیں ہی دراڑیں دکھائی دیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں مکڑی کے کسی بہت بڑے جالے کے درمیان کھڑا ہُوں۔

ہر دراڑ سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی اور یہ ساری آوازیں مل کر ایک عجیب سی گونج اور عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھیں جس میں صدائے بازگشت کی ڈوبتی آواز بھی شامل تھی اور اُونچے سُروں کے تیز جھناکوں کی آمیزش بھی تھی۔

میں نے کھوہ کی چھت پر نظر ڈالی تو مجھے اُس میں لاتعداد سُوراخ نظر آئے جیسے وہ شہد کا چھتہ ہو۔

اگرچہ یہ کھوہ پہاڑی کی گہرائی میں واقع تھی مگر نہ معلوم کہاں سے تازہ ہوا بھی مسلسل آ رہی تھی۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو فیونا میں جگہ جگہ موسیقی کے کھوکھوں کا راز مجھ پر عیاں ہو گیا۔ یہ پُورے کا پُورا جزیرہ ہی آتش فشاں تھا اور اُس میں لاتعداد سُرنگیں پھیلی ہُوئی تھیں اور یہ موسیقی اُنھی کے ذریعے ہر جگہ منتقل ہو رہی تھی۔ ابھی میں اِنھی خیالوں

میں کھویا ہُوا تھا کہ مجھے وِشتا کی آواز آئی۔

"سرفروش ۔۔" اُس نے پکار کر کہا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ اس کھوہ میں موجود نہیں تھی۔ آواز دوبارہ آئی تو میں نے اندازہ کر لیا کہ آواز میرے سامنے والی کسی دراڑ سے آئی ہے۔

"سرفروش"!۔ تیسری پُکار پر مجھے پتہ چل گیا کہ آواز کس دراڑ سے آئی ہے۔

میں بے دھڑک اُس دراڑ میں چلا گیا۔

کچھ فاصلے پر مجھے روشنی کی جھلک دکھائی دی۔

میں اُس کی طرف بڑھنے لگا اور ایک چھوٹی سی کھوہ میں آ گیا جس کے درمیان ایک چھپر کھٹ تھی اور اس کے گرد سیاہ پردے آویزاں تھے۔

"سرفروش!" پردوں کے اندر سے وِشتا کی مدھم آواز سُنائی دی تو میں نے آگے بڑھ کر چھپر کھٹ کا سامنے والا پردہ ہٹا دیا۔ اس پر وِشتا ساکت لیٹی ہُوئی تھی۔ اُس کے پیٹ پر دوائیں گھوٹنے والی ایک کھرل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کا رنگ کبھی گُلابی ہو جاتا تھا، کبھی سفید، کبھی کیسری، کبھی گندمی اور کبھی تپے ہُوئے تانبے جیسا۔۔۔ میں اُس حُسنِ خوابیدہ سے مسحور ہو کر رہ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی ماہر صنم تراش نے دُنیا کی سب سے حسین عورت کا مجسمہ بنا کر چھپر کھٹ پر رکھ دیا ہو۔

"سرفروش"۔ اُس کے نیم وا لبوں نے پھر میرا نام لیا۔

"روسوکی دُرِ شہوار، وِشتا۔ میں آ گیا ہُوں۔"

اُس کے کنول کٹوروں کے پٹ ہلکے سے کھُل گئے۔ لیکن اُس وقت اُن کی آنکھوں میں پیار کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ کسی بھکاری کی جھول کی طرح بالکل خالی تھیں۔ اُن میں سمندر کا سا سکوت تھا جب کہ وہ ٹھہرا ہُوا ہو۔ مگر اُس کی کوکھ میں طوفان پل رہے ہوں۔

وہ کچھ بھی نہیں بولی، بس خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ڈول رہا ہوں اور ڈوب رہا ہُوں۔

میں نے اپنے آپ کو اُن آنکھوں کے سحر کی گرفت سے بچانے کے لیے کہا: "کیا تم نے مجھے ایک دُوسرے کو دیکھنے کے لیے بُلایا ہے وِشتا؟ یہ وقت اس آنکھ مچولی کا نہیں دُرِ سیاہ۔ میں تمھیں کچھ تلخ حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا ہُوں۔ اگر میں طمراق کو اپنے ساتھ تنہا مقابلے پر نہ لا سکا تو یہی تمھارے اس جزیرے کا مقدر بن جائے گی۔"

اُس نے ایک ہاتھ بُلند کرتے ہُوئے جواب دیا: "میں نے تمھیں اِن باتوں کے لیے نہیں بُلایا سرفروش! اب اس معاملے سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"کیا۔۔۔!" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تو پھر کس کا سروکار ہے؟"

"تمھارا۔۔" اس نے نگاہیں مجھ پر مرکوز کرتے ہُوئے کہا۔ "یہ معاملہ تمھارے ہاتھوں میں ہے یا مُونا کے سراپا میں۔۔۔ تم اُسے بچا کر یہاں تک لے آؤ تا کہ وہ اپنی میراث سے محروم نہ رہے۔"

مجھے اُس کی اس بے نیازی پر تاؤ آ گیا۔

"تمھارے پاس ان پہیلیوں کے لیے وقت ہو گا لیکن میرے پاس نہیں ہے، چند گھنٹے بعد پو پھٹنے والی ہے اور اُس وقت مجھے طمراق سے مقابلے کے لیے شمالی بندرگاہ پر ہونا چاہیے۔ اگر اجازت ہو۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا سر خم کر دیا۔

وِشتا اُٹھ کر کہنی کے بل لیٹ گئی۔ لیکن مجھے اُس کا انداز بھی نہ سمجھا سکا۔

وہ بڑی گمبھیر آواز میں بولی: "تم نہیں جاؤ گے۔ تم یہیں رُکو، میری بات سُنو گے اور کوئی سوال کیے بغیر اُس پر عمل کرو گے۔"

نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے مجھے اُس حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑے گی۔

"سامنے الماری میں ایک مقدس ساغر اور مشروب صُراحی رکھی ہے۔ اُنہیں وہاں سے اُٹھا لاؤ۔" جب میں صراحی ساغر اُٹھا لایا تو وہ اُٹھ بیٹھی تھی اور وہ کھرل جو پہلے اُس کے پیٹ پر رکھی ہوئی تھی، اُسے اُس نے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ مسکراتے ہُوئے میری طرف دیکھا تو میں اُس کے حُسن بے پناہ سے مبہوت ہو کر رہ گیا۔

اُس نے میری آنکھیں پڑھ لیں اور بولی: "نہیں سرفروش! اب یہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب ایک اسرار ختم ہو گیا ہے اور شروع ہونے والا ہے۔ میں یہ دُنیا چھوڑنے والی ہُوں اور میری جگہ تم دُوسری عورت کو لانے والے ہو۔"

دوسری عورت سے اس کی مراد غالباً مُونا تھی لیکن مُونا کو طمراق کے پنجے سے کیسے نکال کر یہاں لا سکتا تھا۔

وِشتا اب کھرل میں کوئی چیز کُوٹنے لگی تھی پھر اُس نے ایک ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہُوئے کہا: "مشروب۔"

میں نے مشروب کی صُراحی اور مقدس ساغر اُسے دے دیا۔ اُس نے ساغر بھرا اور کھرل والا سفوف اُس میں ڈالا تو سا بُلبلے اُٹھنے لگے۔ وِشتا نے جام میری طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔ "پیو۔۔۔!"

میں نے بغیر کسی احتجاج کے وہ جام اپنے لبوں سے لگا لیا۔

"آؤ۔۔۔ اب میرے ساتھ بیٹھو۔" وِشتا نے نیا حکم دیا اور میں اُس کے ساتھ چھپر کھٹ پر بیٹھ گیا۔ اگرچہ چند لمحے پہلے میں اُس کی رفاقت کے لیے ترس رہا تھا۔۔ مگر وہ مشروب پینے کے بعد میری اُس آنند کا شعلہ بُجھ سا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جو کچھ بھی ہو رہا ہے، خواب میں ہو رہا ہو۔ مجھے وِشتا کے حسین سراپا سے اُٹھنے والی خوشبو تو آ رہی تھی مگر یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ خوشبو اور یہ مہک کہیں دُور سے آ رہی ہو۔ ہر طرف عُود و عنبر کے مرغولے اُٹھ رہے ہیں اور اُن مرغولوں میں وِشتا کا چاند سا چہرہ چمک رہا ہے۔۔۔ مگر میری نگاہ کسی ایک چیز پر زیادہ دیر نہیں ٹِک رہی تھی۔ میری حالت اس مے خوار جیسی ہو گئی تھی جسے سرور میں ہر شے دُھندلی دُھندلی دِکھائی دینے لگتی ہے مگر اس کیفیت کے باوجود میں مکمل ہوش و حواس میں تھا۔

۔۔۔ اور پھر یکایک وِشتا کے ہاتھ میری گردن تک پہنچ گئے۔ اُن میں زندگی کی کوئی گرمی اور کوئی حرارت نہیں تھی بلکہ اس کے ہاتھ برف کی مانند یخ ہو رہے تھے جیسے وہ ایک جیتی جاگتی عورت کے نہیں بلکہ کسی لاش کے ہاتھ ہُوں۔۔۔ پھر اُس نے ممتا کی ماری ماں کی طرح مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تب وہ سرگوشیوں میں مجھے ہدایات دینے لگی۔۔۔ اور اُس کا ہر لفظ میرے ذہن کی لوح پر نقش ہوتا چلا گیا۔

جب وہ سب کچھ کہہ چکی تو آخر میں بولی: "آؤ، ستارے اپنے اپنے بروج میں آ چکے ہیں۔ وہ وقت بھی آ گیا ہے جس کی میں صدیوں سے منتظر تھی۔"

اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے ایک ایسی کھوہ میں لے گئی جس کے بیچوں بیچ ایک حوض تھا جس کی شکل آنکھ جیسی تھی اور وہ حوض اس نیم روشن کھوہ میں کسی حسینہ کی چشمِ مست ہی لگ رہا تھا۔ اس کا پانی سیاہ اور بے حد ٹھنڈا تھا۔

وِشتا نے مجھے اشارہ کیا اور میں اپنی زرہ اُتارنے لگا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ میرے ہاتھوں میں شفا بخش تاثیر ہے۔ ان کا لمس آفات سے محفوظ رکھتا ہے۔" یہ کہتے ہُوئے وہ میرے کندھوں پر ہاتھ پھیرنے لگی: "میں وہیں تمھاری راہ دیکھوں گی مگر یاد رکھو، سرفروش۔۔۔ میں نے تمھیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تمھارے لیے زندگی اور موت میں سے صرف ایک ہی چیز باقی رہ گئی ہے۔ وہ زندگی بھی ہو سکتی ہے اور موت بھی۔۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

میں نے زرہ اُتاری اور اُس سیاہ حوض میں سر کے بل کُود گیا۔

پانی یخ تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں مگر وہاں اندھیروں کے ڈیرے تھے۔ حوض ایک کنویں سے قدرے چوڑا تھا مگر میرے بازو بار بار اُس کے دیواری پتھروں سے جا لگتے تھے اور اُس کی تہ نہ جانے کتنی گہرائی میں تھی کہ آ ہی نہیں پاتی تھی۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ پانی کے دباؤ سے میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ میرا جی چاہا کہ مزید نیچے جانے کی بجائے دوبارہ سطح پر آ جاؤں۔۔۔ مگر میں نے جی کڑا کیا اور گہرائی میں اُترتا چلا گیا۔۔۔ اور میرے ہاتھوں نے بالآخر تہ کو چھو ہی لیا۔

جیسا کہ وِشتا نے کہا تھا، تہ میں ایک بڑی تلوار اور گیند کے برابر ایک موتی موجود تھا۔ میں نے ایک ہاتھ میں موتی اور دوسرے میں تلوار پکڑی اور اُوپر آنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ سطحِ آب پر جانے سے پہلے ہی میرا دم ٹوٹ جائے گا۔

ابھی میں درمیان ہی میں تھا کہ کسی لجلجی سی چیز نے میرے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کی لپیٹ اتنی تیز تھی کہ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی اُس نے میرے دونوں بازو میرے جسم کے ساتھ جکڑ دیئے۔ میں نہ تو ہاتھ چلا سکتا تھا اور نہ ہی کسی اور طریقے سے اُس موذی اژدھے کا مقابلہ کر سکتا تھا جس کی گرفت لمحہ بہ لمحہ میرے جسم کے گرد تنگ ہوتی جا رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ میری ہڈیاں چٹخ جائیں گے۔

وِشتا نے مجھے اس بَلا کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا ورنہ میں اپنا خنجر لے کر پانی میں اُترتا۔ میں اتنا بے بس ہو چکا تھا کہ مجھے اپنی موت یقینی معلوم ہونے لگی۔

اژدھے کا کساؤ دم بہ دم بڑھ رہا تھا۔

اچانک اُس کی دُم میرے مُنہ پر آ لگی۔

مجھے اور کچھ نہ سُوجھا تو میں نے اس کی دُم میں اپنے دانت گاڑ دیئے اور اُسے بُری طرح چبانے لگا۔

اچانک اژدھے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ اپنی دُم چھڑانے کے لیے تیزی سے اُوپر جانے لگا مگر میں نے اس کی دُم نہ چھوڑی۔

سطحِ آب کے قریب پہنچ کر اُس نے ڈُبکی لگائی اور نیچے جانے لگا تو میں نے دُم چھوڑ دی اور اُوپر آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہو، میں کنارے پر پہنچ چکا تھا اور میں نے وہ بڑی تلوار نیام سے نکال لی تھی۔۔۔ مگر وہ حوض سے باہر نہ آ سکا۔

تلوار اتنی چمک دار اور تیز تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی

اسے آب دی گئی ہو۔ اُس کے دستے پر لعل و جواہر لگے ہُوئے تھے اور سیاہ موتی سے قوسِ قزح کے رنگوں کا دھوکا ہو رہا تھا۔ مَیں نے جلدی جلدی لباس پہنا اور دونوں چیزیں لے کر اُسی کھوہ میں آ گیا، جہاں دیشتا چھپر کھٹ پر لیٹی ہُوئی تھی۔

مَیں نے تلوار اس کے پہلو میں رکھ دی۔ صراحی اور ساغر اُٹھائے اور اُن کے ساتھ ہی سیاہ موتی بھی الماری میں رکھ دیا۔ . . پھر میں دیشتا کے قریب آیا۔ ایک نظر اُس حُسنِ خوابیدہ پر ڈالی تو بے اختیار مجھے جھُرجھُری سی آ گئی۔

مَیں نے ایسا مکمل سراپا اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حُسنِ کمل کا بہترین نمونہ تھی۔ . . لیکن مجھے اس کی ہدایات پر عمل کرنا تھا۔ اس لیے مَیں چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اُسی طرح آنکھیں موندے تیز تیز سانسیں لیتی رہی۔ . . پھر مَیں نے تلوار نیام سے نکالی اور اُس کی نوک دیشتا کے دِل پر رکھ کر پُوری قوت سے اس پر دباؤ ڈالا تو تلوار اُس مرمریں پیکر کے آر پار ہو گئی۔

دیشتا کے مُنہ سے صرف ایک چیخ نکلی۔

وہ ایک بار سُکڑی سمٹی اور ڈھیلی پڑ گئی۔

اَب جو مَیں نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی تو دہشت سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے سامنے حُسنِ مجسم دیشتا کی بجائے ایک ایسی بڑھیا کی لاش پڑی تھی جس کے چہرے پر جھُریوں نے جال بُن رکھا تھا۔

مَیں نے دیشتا کی ہدایت کے مطابق لاش اُٹھائی اور کھوہ کے اُس دہانے کی طرف بڑھ گیا جس کی وہ نشاندہی کر چکی تھی۔ یہ دہانہ مجھے ایک طویل سُرنگ میں لے آیا۔ . . اور یہ سُرنگ اُس چبوترے کے قریب ختم ہُوئی جہاں آج شام مَیں نے دیشتا کو شعلوں کے درمیان کھڑے دیکھا تھا۔

اگر اس وقت دِن کی روشنی ہوتی تو مجھے وہاں سے وہ مینار بھی دِکھائی دے جاتا جہاں برگا مجھے لے گیا تھا اور جہاں سے مَیں نے پُورے جزیرے کا معائنہ کیا تھا۔

مَیں نے دیشتا کی لاش، جو اَب بے حد ہلکی پھُلکی لگ رہی تھی، اپنے سر سے اُوپر اُٹھائی اور اُسے آتش فشاں کے شعلوں میں پھینک دیا۔ ایک لمحے کے لیے شعلے اور دُھواں گڈمڈ ہو گئے۔ مَیں نے ہاتھ اُٹھا کر دیشتا کو آخری سلام کیا اور وہاں سے واپس چل دیا۔

جب مَیں حجلۂ موسیقی سے باہر آیا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں یکسر بدل چُکا ہُوں اور پہلے والا سرفروش بن چُکا ہُوں۔ اَب مجھے اپنے ماضی کی ہر بات یاد آ رہی تھی اور میرا مرضِ نسیان بالکل ختم ہو گیا تھا۔ مَیں اس قسم کی باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا اور اپنی یاد داشت کی خرابی کو سَر پر آنے والی چوٹ کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ . . مگر اس طرح یادداشت کا ایک دم ٹھیک ہو جانا، میرے لیے حیرت انگیز تھا۔

مَیں اپنی کھوہ میں آ کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

نیند نے فوراً ہی مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

پو پھٹنے سے نصف گھنٹہ پیشتر جب ساحر نے مجھے جگایا تو میں بالکل تازہ دم تھا۔

"ہم نے پچاس شبستانیوں کو تہِ تیغ کر دیا ہے۔ سو سے زیادہ قیدی بنا لیے ہیں اور اُن کے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا ہے مگر اس جھڑپ میں ہمارے بھی بیس سپاہی ہلاک ہو گئے ہیں۔ مَیں نے قیدیوں کو آپ کا پیغام دے کر آزاد کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھیوں تک ضرور پہنچا دیں گے۔" ساحر نے بتایا۔

"بہت خوب۔ . . مگر یہ بات ناکافی ہے۔ مَیں چاہتا ہُوں طراق کے سارے فوجیوں کو میرے چیلنج کا علم ہو جائے۔ کیا تمھارے بھکاری اور اُٹھائی گیرے تمھاری ہدایات پر عمل کر رہے ہیں؟"

"ہاں۔ . . مَیں نے اُسی مقصد کے لیے اشتہار بھی لکھوا کر انھیں دے دیے ہیں تاکہ وہ انھیں ساحل پر پہنچنے والے شبستانیوں میں تقسیم کر دیں۔" . . پھر اُس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "مَیں نے پہلے کبھی کوئی جنگ محض الفاظ سے جیتتے ہُوئے نہیں دیکھی۔ . . لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ترکیب کارگر ثابت ہو گی۔ مَیں خود بھی سپاہی ہوں اور جانتا ہوں کہ کوئی سپاہی خواہ مخواہ اور بلا مقصد اپنی جان دینا پسند نہیں کرتا۔ وہ آسان ترین فتح کا خواہش مند ہوتا ہے۔ آپ نے اُن کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔"

"یہ تو وقت آنے پر ہی معلوم ہو سکے گا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔" مَیں نے جواب دیا اور غسل کرنے چلا گیا۔

⚙

کچھ دیر بعد میرے دائیں جانب ساحر اور بائیں جانب برگا گھوڑوں پر سوار شمال بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے چند عسکری افسر تھے۔ ساحر نے میرے لیے بطورِ خاص ایک سیاہ گھوڑا منتخب کیا تھا اور اس کی خاطر اُس کے سوار کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ برگا کا گھوڑا نقرہ تھا اور ساحر بھُورے رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا۔

راستہ چلتے ہوئے ساحر نے اپنی واحد ٹھیک آنکھ سے مشرقی اُفق کی جانب دیکھا اور بولا۔ "موسم بتا رہا ہے کہ آج شام سے پہلے پہلے سمندر میں سخت طوفان آئے گا جو اس جزیرے کو بھی زد میں لے لے گا۔"

مَیں نے سوالیہ نگاہوں سے برگا کی طرف دیکھا کہ اس سلسلے میں اس کی کیا رائے ہے۔ اُس نے بھی ساحر کی تائید کی اور کہا۔ "اگر طوفان سمندر میں موجود طراق کے جہازوں سے ٹکرا جائے تو جہاز پاش پاش ہو کر ریلے میں ساحل سے آ ٹکرائیں گے تب ہم شبستانیوں سے بآسانی نمٹ سکیں گے۔"

اگرچہ طوفان ہمارے حق میں تھا لیکن میرا منصوبہ طراق سے شمالی بندرگاہ میں مقابلہ کرنے اور اُسے گھیرنے کا تھا۔ اب اس صورت میں بندرگاہ اُس کے جہازوں کے لیے مفید پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ تاہم میرے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ ہی اتنی نفری کہ مَیں اپنے منصوبے میں کوئی تبدیلی کر سکتا۔

مَیں نے اس معاملے کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

ہمارے ایک جانب زمین بتدریج ڈھلان کی شکل میں، سمندر سے جا ملی تھی اور اس میں نرم ریت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمیں اس حصّے میں ایک جگہ گرد اُڑتی دِکھائی دی۔ ساحر کی تجربہ کار آنکھوں بلکہ اکلوتی آنکھ نے فوراً پہچان لیا کہ وہ شبستانیوں کا ایک اور ہراول دستہ ہے۔

"کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس دستے میں کتنے سپاہی ہوں گے؟" مَیں نے پوچھا۔

ساحر کی بجائے برگا بول اُٹھا۔ "اس دستے میں تقریباً ایک سو آدمی ہیں جناب! اور انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے اس لیے اُن کا رُخ ہماری طرف ہو گیا ہے۔"

مَیں نے فوراً چار عسکری عہدے داروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے دستے کو ترتیب دیں پھر مَیں نے ساحر سے کہا۔ "تم شمالی بندرگاہ چلے جاؤ اور حالات معلوم کرو۔"

"اس طرح تو مَیں اس معرکے میں حصّہ لینے سے محروم رہ جاؤں گا۔"

"ابھی ایسے بہت سے موقعے آئیں گے ساحر۔ وہاں کے حالات معلوم ہونا بہت ضروری ہیں۔ جاؤ۔"

وہ بادلِ نخواستہ اُدھر چل دیا۔

افسروں نے دستے کو ترتیب دے دیا۔ انھوں نے تین صفوں میں ایک مربع بنا لیا۔ اگلی صف میں سپاہی نیزے لے کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ اُن کے پیچھے تیر انداز اور نیزہ باز تھے۔ . . بیچ میں مَیں، برگا اور دوسرے افسر۔ . . اُدھر شبستانیوں کے دستے نے ایک نیم دائرے کی صورت اختیار کر لی تھی۔

"اَب تک انھیں حملہ کر دینا چاہیے تھا مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم سے صُلح کی بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔" برگا نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ اُن کا ایک کمان دار صف سے آگے بڑھ رہا تھا۔ برگا اُسے دیکھ کر بولا۔ "مَیں اسے جانتا ہوں۔ یہ کمان دار بہزاد ہے۔ بڑا تجربہ کار، جنگجو اور ظالم ہے۔ شاید وہ بات چیت کرنے کے لیے آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس وقت صُلح کر لینی چاہیے تاکہ جانی نقصان سے بچ جائیں۔"

"نہیں برگا۔" مَیں نے اُسے ٹوک دیا۔ "جنگ ہونی چاہیے۔ تاکہ مَیں تمھارے سپاہیوں کے لڑنے کی استعداد کا اندازہ کر سکوں۔"

کمان دار بہزاد نے صف سے نکل کر اپنے ہاتھ بلند کر لیے جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ پُرامن طور پر بات کرنا چاہتا ہے۔ . . پھر وہ اپنا گھوڑا ہماری طرف بڑھانے لگا۔ میں نے بھی اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

"مجھے تیر چلانے کی اجازت دیجئے جناب! میں ابھی اس کے دِل میں تیر پیوست کر دوں گا۔ اگر نہ کر دوں تو میری گردن اُڑا دیجئے گا۔" ایک تیر انداز بولا۔

"اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں، جوان۔ پہلے بات کر لینے دو۔" مَیں نے اُسے جواب دیا اور اپنا گھوڑا بہزاد کے سامنے لے آیا۔

"کیا تم ہی وہ اجنبی ہو جس کا نام سرفروش ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں۔ . . لیکن تم لڑنے کی بجائے بات چیت کیوں کرنا چاہتے ہو؟" مَیں نے جواباً کہا۔

"فکر نہ کرو۔ مَیں تم سے ضرور لڑوں گا لیکن پہلے وہ پیغام سُن لو جو مَیں طراق کی طرف سے تمھارے لیے لایا ہُوں۔"

"بتاؤ، کیا پیغام ہے؟"

"میرے مالک نے کہا ہے کہ وہ ایک بہادر جنگجو کی حیثیت سے تمھاری قدر کرتا ہے مگر وہ تمھارا دوست نہیں ہے۔ ہر وہ آدمی جو تمھاری طرح اُسے گیدڑ بھبکیاں دیتا ہے، اس کے لیے دِل چسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ بہرصُورت وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مَیں بھی اُس سے ملنے کا مشتاق ہوں۔" مَیں نے کہا۔

"تو پھر بہت آسانی سے یہ معاملہ طے ہو سکتا ہے۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ ہمارے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ اُن کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ تم نے جو جنگی تیاریاں کی ہیں، انھیں ختم کر دو کیوں کہ یہ باتیں میرے آقا کے لیے اشتعال انگیز ہیں۔ . . وہ کسی تباہ حال ملک کا فاتح نہیں بننا چاہتا۔ تمھارے ساتھ ایک معزز مہمان

جیسا سلوک کیا جائے گا۔ تم جب تک چاہو، یہاں رہ سکتے ہو۔ اگر تم پسند کرو تو تمھیں تمھارے شایانِ شان عہدہ بھی مل سکتا ہے۔ میرے مالک کا کہنا ہے کہ دُرِ سیاہ وفیشا حسبِ معمول یہاں کی رُوحانی پیشوا رہے گی اور اُسے بالکل نہیں چھیڑا جائے گا۔"

"ردمو پر کس کی حکمرانی ہوگی؟ غدار شاہ کوتار اور ملکہ سمری کی یا مُونا کی؟" میں نے سوال کیا۔

"کوتار اور اُس کی ملکہ کو قتل کر دیا گیا ہے کیوں کہ انھوں نے ردمو سے غداری اور وفیشا سے بغاوت کی تھی۔ وہ تمھیں بھی قیدی بنانا چاہتے تھے اور میرا آقا طمراق سازشیوں کو پسند نہیں کرتا۔"

"اور مُونا کا کیا بنا جسے کوتار اور سمری اپنے ساتھ تمھارے آقا کی حفاظت میں لے گئے تھے۔ کیا اُسے بھی قتل کر دیا گیا ہے؟"

میرے اس سوال پر کمان دار بہزاد نے بڑے زور سے ایک ہاتھ اپنی ران پر مارا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا: "اس کا مطلب ہے کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تمھیں مُونا کا التفات حاصل ہو چکا ہے اور تم اَب بھی اُس کی رفاقت کے متمنی ہو۔"

مجھے یہ سُن کر غصّہ آگیا۔

"فضول باتوں کی ضرورت نہیں۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

بہزاد کی آنکھیں بھی غصّے سے سکڑ گئیں۔

"تمھارا یہ لب و لہجہ میری شان کے خلاف ہے۔ میں شبستانی سپاہ کا کمان دار ہوں۔"

"اچھی بات ہے، بہزاد۔ میں معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے اپنے سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔"

"مُونا میرے آقا کے ساتھ اس کے جہاز پر ہے۔ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جا رہا ہے مگر دیویوں جیسا نہیں۔ اگر تم ہتھیار ڈال دو تو میرا خیال ہے کہ میرا آقا فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے مونا بھی تمھیں لوٹا دے گا۔"

صُلح کی یہ پیش کش متوقع تھی کیوں کہ ٹالپ مجھے بتا چکا تھا کہ طمراق کے فوجی بھی مسلسل جنگوں سے اُکتا اور تھک چکے ہیں... دوسرے سپاہ کا ایک بڑا حصّہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

میں نے اپنا لب و لہجہ نرم کرتے ہوئے پوچھا: "کیا تمھارے آقا کو میرا پیغام مل چکا ہے اور اُسے میرا مقابلہ منظور ہے؟"

"ہاں، اُسے تمھارا وہ پیغام مل چکا ہے جو تمھارے ہرکارے ساحل پر کھڑے ہو کر زور زور سے سُناتے ہیں۔ جسے ہماری سپاہ میں بددلی پھیلانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میرا آقا وہ پیغام سُن چکا ہے اور اس نے اُس پیغام پر کوئی توجہ نہیں دی۔"

"اس نے کوئی توجہ نہیں دی؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔ "میں نے تو سُنا تھا کہ وہ بہادر ہے... مگر وہ بُزدل نکلا اور میرے ساتھ مقابلہ کرنے سے ڈر گیا ہے۔"

"طمراق کسی سے نہیں ڈرتا سرفروش۔"

میں نے قہقہہ لگایا اور کہا: "ہاں... وہ اس دیوتا سے نہیں ڈرتا جس کے لیے وہ کام کرنے کا دعوا کرتا ہے۔"

"ہاں... لیکن وہ تم سے تنہا مقابلہ کیوں کرے؟ اس سے اُسے کیا فائدہ ہوگا؟"

"بے شک اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔" میں نے بہزاد کو جواب دیا: "ہم دونوں کے تنہا مقابلے کا فائدہ تو تمھیں اور تمھاری سپاہ کے ہر آدمی کو پہنچ سکتا ہے لیکن اُسے نہیں پہنچے گا۔ وہ گزشتہ بیس سالوں سے اَن گنت سپاہیوں کو جنگ کا ایندھن بناتا آرہا ہے۔ ہر سپاہی کو اپنی جان اتنی ہی عزیز ہوتی ہے جتنی کہ ایک جرنیل کو... مگر جرنیل تو اس دوران گنتی کے مرے ہوں گے جب کہ ہزاروں سپاہی موت کے گھاٹ اُتر گئے اور تاج ردف طمراق کے سر پر رہا... اگر تم نے یہ جنگ جیت لی تو تمھیں کھنڈروں اور لاشوں کے سوا یہاں کچھ نہیں ملے گا... پھر یہ جنگ بھی تم آسانی سے نہیں جیت سکو گے۔ ہم سے زیادہ جانی نقصان تمھارا ہوگا۔ اگر تمھیں میری باتوں پر یقین نہیں تو جاؤ اور اپنے سپاہیوں سے پوچھ لو کہ وہ مرنا چاہتے ہیں یا زندہ رہنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ بھی انسان ہیں، جانور نہیں ہیں۔ وہ کب تک اپنی خوشیاں اپنے ہاتھوں قتل کرتے رہیں گے اور کب تک اپنی جانوں کی قربانی دیتے رہیں گے؟"

بہزاد نے میری اس تقریر کے بعد پہلے تو زمین پر تھوک دیا، پھر بولا: "میں یہ ساری باتیں سُن چکا ہوں سرفروش۔ یہ سب تمھاری افواہیں ہیں لیکن ان سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا کیوں کہ طمراق تم سے تنہا مقابلہ کر کے جنگ کا فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں ہے۔"

"مگر میرا خیال ہے کہ اُسے میری یہ دعوتِ مبارزت قبول کرنا پڑے گی۔" میں نے اعتماد اور یقین سے کہا: "کوئی آدمی خود اُن خطرات سے مُنہ نہیں موڑ سکتا جن سے وہ اپنی فوج کو دوچار کرنا چاہتا ہو۔ میں نہیں سمجھتا، تمھارا آقا اتنا احمق ہوگا کہ خود تو موت سے ڈرے مگر اپنے سپاہیوں سے یہ توقع رکھے کہ وہ موت سے نہ ڈریں۔ بالآخر اُسے مجھ سے مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔ میں ساحل کی طرف جا رہا ہوں اور چلّا چلّا کر کہوں گا کہ وہ بُزدل ہے... اور مجھ تنِ تنہا کے مقابلے میں خود تنِ تنہا نہیں آنا چاہتا۔ میں اس سے ایسی سودے بازی کروں گا کہ وہ اُس سے انکار نہیں کر سکے گا اور اگر اُس نے انکار کر دیا تو اپنے جرنیلوں اور سپاہ کے سامنے اُس کی عزت و حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہے گی اور اُس کے افسر ایک ہفتے کے اندر اندر ہی سازشوں اور بغاوت پر اُتر آئیں گے۔"

"تم ساحل پر نہیں جاؤ گے۔" بہزاد بولا: "تمھیں ساحل تک پہنچنے ہی نہیں دیا جائے گا۔ مجھے اسی مقصد کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے گھوڑا موڑا اور اپنی صفوں کی طرف دوڑاتا چلا گیا۔

میں بھی اپنا گھوڑا اپنی صفوں کے درمیان لے آیا۔

برگا اور میرے کمان دار میرے دلائل سے خوش نظر آتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن سے متوقع نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

اتنے میں بہزاد کے سپاہیوں کا پہلا دستہ گھوڑے دوڑاتا ہوا ہماری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا: "سپاہیوں کو نہیں بلکہ پہلے اُن کے گھوڑوں کو نشانہ بناؤ۔ تیر انداز، نیزہ باز اور بھالے پھینکنے والے سب کے سب یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ سواروں کے مقابلے میں ہم پیدل سپاہیوں سے بآسانی نمٹ سکتے ہیں۔"

جونہی گھڑ سوار زد میں آئے، پہلے تیر اندازوں اور پھر نیزہ بازوں نے گھوڑوں کو نشانے پر رکھ لیا۔ گھوڑے گرنے لڑکھڑانے اور پلٹنے لگے تو اُن کے سوار اُترنے پر مجبور ہو گئے۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اُن کو تیروں اور بھالوں نے ڈھیر کر دیا۔ بہزاد کی دوسری اور تیسری ٹولی کا بھی یہی حشر ہوا تو آخری چالیس آدمیوں کے ساتھ اُس نے پیدل ہی ہم پر حملہ کر دیا۔

وہ غصّے سے اندھا ہو رہا تھا اور جنگی چالوں سے بھی انحراف کر رہا تھا ورنہ یہ حماقت ہرگز نہ کرتا کہ ہم تو چاہتے بھی یہی تھے۔

میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ بہزاد کے ریلے کو روکنے کے بجائے درمیان سے ہٹ جائیں اور انھیں اندر آنے دیں جب وہ اندر آجائیں تو اُن کی واپسی کا راستہ بند کر دیا جائے۔

میرے سپاہیوں نے ایسا ہی کیا۔

بہزاد اور اُس کے سپاہی جونہی یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھے، ہمارے سپاہی پیچھے ہٹنے لگے۔ بہزاد اسے اپنی کامیابی سمجھتے ہوئے ہمارے حصار میں آگیا اور جب اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ بُری طرح پھنس گیا ہے تو اس وقت تک واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو چکا تھا۔

وہ ہر طرف سے گھِر گئے تو میں نے بآوازِ بلند اپنے آدمیوں کو پکارا: "بس... اَب انھیں قتل نہ کرو۔"

یہ سُن کر بہزاد اور بچے کھچے سپاہی تعجب سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔ خود برگا اور میرے دوسرے ساتھی بھی اس حکم پر حیران تھے مگر ہمارے سپاہیوں نے قتلِ عام سے ہاتھ روک لیا تھا۔

"میں نے سنا تھا کہ تم شیطان ہو۔ یہ بات مجھے درست معلوم ہوتی ہے۔ میرے نصف سے زیادہ آدمی مارے جا چکے ہیں۔ تم لوگ باقیوں کو بھی بآسانی ٹھکانے لگا سکتے تھے۔ تم نے اپنے آدمیوں کو روک کیوں دیا ہے؟" بہزاد اُلجھن سے بولا۔

میں اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیا اور اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا، وہ پھر بول اُٹھا۔

"میں یہ مقابلہ ہار چکا ہوں لیکن میں اس توہین پر موت کو ترجیح دوں گا اور ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔"

میں نے اُسے جواب دینے کی بجائے اپنے کمان داروں سے کہا: "یہ لوگ ہمارے قیدی ہیں۔ ان سے کوئی بُرا سلوک نہ کیا جائے اور نہ ہی ان پر اَب کوئی سپاہی حملہ کرے، تاوقتیکہ میں ان کے بارے میں کوئی دوسرا حکم نہ دوں۔"

یہ حکم دے کر میں بہزاد کی طرف پلٹا اور بولا: "آگے آؤ بہزاد... میں تم سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم ہمیں اپنے پھندے میں لے کر بات کرنا چاہتے ہو، میں تمھیں غلط سمجھا تھا۔ تم شیطان نہیں بلکہ احمق ہو۔ اتنے احمق کہ جنگ کا پہلا اصول بھی نہیں جانتے ورنہ اَب تک تم ہمارے پرخچے اُڑا چکے ہوتے۔"

میں نے اس کی بات اَن سُنی کر دی اور شبستانی سپاہیوں سے بولا: "شبستانی دلاورو! میں سرفروش ہوں۔ تم نے میرا نام سُنا ہو گا اور یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں نے تمھارے جرنیل کو مقابلے کی دعوت دی ہے لیکن جن لوگوں کو اس دعوت کا علم نہیں ہے، میں اُن کے لیے دُہرا رہا ہوں۔ غور سے سُنو اور یاد رکھو کہ میں تمھیں تمھارے ہتھیاروں سمیت باعزت طور پر رہا کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم واپس جا کر طمراق کو میری باتوں کی یاد دہانی کرا دو اور یہ ہے میری دعوتِ مبارزت...

"میں لبِ ساحل طمراق سے تنِ تنہا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں... اُسے بھی تنہا ہونا چاہیے۔ میں اس مقابلے میں صرف تلوار اور ڈھال استعمال کروں گا لیکن وہ اپنی مرضی کے مطابق جتنے ہتھیار استعمال کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ چاہے تو مقابلے میں گھوڑا اور نیزہ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ میں اُسے یہ رعایت اس لیے دے رہا ہوں کہ وہ بُزدل ہے اور مجھ سے مقابلہ کرنے سے ہچکچا رہا ہے مگر مجھے اپنے زورِ بازو پر بھروسا ہے۔ میں یقیناً اُسے شکست دوں گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھی تم لوگ موت کے مُنہ سے بچ جاؤ گے کہ اس

مقابلے کے بعد جنگ نہیں ہوگی۔ اگر میں جیتا تو بھی جنگ نہیں ہو گی اور تم سب زندہ رہو گے۔ مجھے سپاہیوں یا کمان داروں سے کوئی دشمنی نہیں۔ کمان دار اور سپاہی تو اوپر سے دیئے جانے والے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ تم طراق کی خاطر کیوں جان دو۔ جب میں اُسے مقابلے کی اتنی سہولتیں دے رہا ہوں تو پھر اُسے بھی اپنے سپاہیوں کو جنگ کا ایندھن نہیں بنانا چاہیے۔ اگر وہ مقابلے سے گریز کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ بزدل ہے اور اُسے تمھاری جانوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ . . پھر ایک بزدل بادشاہ کیوں زندہ رہے؟"

جونہی میں نے یہ تقریر ختم کی، بہزاد بول اُٹھا: "یہ ہمارے آقا کو پھانسنے کی ایک چال ہے جسے وہ خوب سمجھتا ہے؟" پھر وہ اپنے سپاہیوں سے بولا: "اگر کسی نے اس جھوٹے شیطان کی بات پر کان دھرے اور یہ بات ان لوگوں تک پہنچائی جو یہاں موجود نہیں ہیں تو انھیں عبرت ناک سزا دی جائے گی:"

مجھے اس ضدی شخص کی بات پر تاؤ تو بہت آیا . . مگر میں اپنا غصّہ پی گیا۔

"یہ تمھارا جھگڑا نہیں ہے۔ اس لیے تم اس میں نہ پڑو۔ میں نے تم سے باعزت رہائی کا جو وعدہ کیا ہے، اُسے ضرور پورا کروں گا لیکن اگر تم بہزاد کی باتوں میں آئے تو میرے ایک اشارے سے تم سب یہیں ڈھیر ہو جاؤ گے۔ تم بہادری سے لڑے ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ تم اپنی جان ہی دے کر بہادر کہلاؤ . . . کیا طراق نے تمھارے عزیزوں، تمھارے پیاروں اور تمھارے بال بچّوں کا کوئی خیال کیا ہے؟ وہ تمھارے بچّے یتیم کرتا، تمھاری ماؤں سے بیٹے، بیویوں سے اُن کے سہاگ اور بہنوں سے بھائی چھینتا آیا ہے محض اس لیے کہ اُس کی برتری برقرار رہے۔ وہ اپنی برتری برقرار رکھنے کے لیے خود مجھ سے مقابلہ کیوں نہیں کر لیتا؟" میں نے سپاہیوں سے کہا۔

میری اس بات پر بہت سے سپاہیوں کے سر اثبات میں ہلے تو بہزاد چیخ اُٹھا: "تمھاری زبان کی کاٹ ہتھیار سے کم نہیں ہے سرفروش۔ دیکھنا یہ ہے کہ تمھاری تلوار بھی تمھاری زبان کی طرح کاٹ رکھتی ہے یا نہیں؟ . . . مرد ہو تو آؤ پہلے میرے ساتھ ہی مقابلہ کر کے دیکھ لو؟"

وہ ہر حال میں لڑنے مرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ اُسے ٹھکانے لگا دوں . . . مگر میں چاہتا تھا کہ سپاہی میری شمشیر زنی کا اندازہ نہ لگا سکیں تو بہتر ہے اس لیے میں نے اس سے کہا: "تم پہلے ہی لڑائی میں تھک چکے ہو اور زخمی بھی ہو، اس لیے میں تم سے نہیں لڑنا چاہتا:"

اُس نے قہقہہ لگایا اور بولا: "یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس طرح تم اپنی بزدلی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو۔ کیا اسی برتے پر میرے آقا سے مقابلہ کرو گے:"

مجھے غصّہ آ گیا اور میں نے کہا: "کیا تم میرے ہی ہاتھوں مرنا چاہتے ہو؟"

"مرنے سے پہلے میں تمہیں بھی اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تم میرے آقا کو للکار سکو؟" یہ کہہ کر وہ میرے سامنے آ گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے مارنا یا زخمی کر دینا چاہتا ہے تاکہ مقابلے کی نوبت ہی نہ آ سکے۔ میں نے مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اُسے جلد از جلد ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تاکہ اُس کے آدمی مجھ سے مرعوب ہو جائیں۔ .

چند لمحے بہزاد سے کھیلنے کے بعد میں نے ایک نپے تُلے وار سے اُس کی گردن اُڑا دی اور اس کا سر نیزے کی اَنی پر بلند کر کے ایک سپاہی کو دیتے ہوئے کہا: "جاؤ دوستو . . . اپنے آقا کو میرا پیغام اور دعوتِ مبارزت دینے کے ساتھ ساتھ بہزاد کا سر بھی تحفے میں دے دینا۔ اگر وہ کسی گیدڑ کی طرح بزدل نہیں ہے تو چند گھنٹے بعد جب میں بندرگاہ کے ساحل پر پہنچوں گا تو اُسے اپنا منتظر پاؤں گا۔ اگر جنگ کے متعلق میری باتیں تمھاری سمجھ میں آ گئی ہوں تو اپنے دوستوں کو بھی بتا دینا۔ طراق سے یہ بھی کہہ دینا کہ ایک بار وہ اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال کر دیکھے . . . اور ہاں مجھے طراق کے ساتھ ساتھ مُونا کا بھی انتظار رہے گا:"

جب بہزاد کے باقی ماندہ چالیس شبستانی سپاہی رُخصت ہو گئے تو میں نے برگا سے زخمیوں کی تفصیل طلب کی اور کہا کہ جو سپاہی مرہم پٹی کے بعد چلنے کے قابل ہوں، انھیں ساتھ لے لیا جائے اور باقی زخمیوں کی دیکھ بھال کی جائے۔

برگا نے بتایا: "ہمارے ہاں جنگ کے زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال نہیں کی جاتی بلکہ انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے تاکہ وہ زخموں کے کرب اور باقی زندگی معذوروں کی طرح گزارنے سے بچ جائیں:"

"نہیں برگا . . . بہت سے زخمی ٹھیک ٹھاک ہو جاتے ہیں اس لیے تم انھیں ختم نہیں کرو گے۔ انھیں زندہ رہنے کا موقع دینا چاہیے:"

اتنے میں ایک عُہدے دار نے بتایا کہ میرا خادم بندرگاہ سے واپس آ رہا ہے۔ میں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو واقعی ساحر گھوڑا دوڑاتا چلا آ رہا تھا۔

اُس نے آتے ہی مُنہ لٹکا کر کہا: "میں جانتا ہوں کہ کیا ہوا ہو گا۔ آپ نے مجھے اس دلچسپ کھیل سے محروم کر دیا:"

"پہلے مجھے بندرگاہ کے بارے میں بتاؤ:" میں نے قدرے سختی سے کہا۔

"طراق کے جہاز بندرگاہ کے باہر لنگر انداز ہو چکے ہیں مگر ابھی تک اُن میں سے ساحل پر کوئی نہیں آیا۔ ہوا یہاں کی نسبت وہاں کافی تیز ہے اور سمندر میں بڑی بڑی لہریں اُٹھنا شروع ہو گئی ہیں۔ میں نے اپنے ہرکاریوں اور اُتھانی گیروں کو چلّا چلّا کر پیغام دینے سے روک دیا ہے کیوں کہ ہَوا کے شور سے اُن کی آواز جہازوں تک نہیں جا سکتی:"

"کیا چھوٹی کشتیاں بھی طوفان کی وجہ سے ساحل پر نہیں آ سکتیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں . . . ابھی طوفان میں اتنا زور پیدا نہیں ہوا کہ چھوٹی کشتیاں ساحل پر نہ آ سکیں . . . مگر میرا خیال ہے کہ شبستانی آج حملہ نہیں کرنا چاہتے ورنہ اُن کے جہازوں پر تیاریوں کی ہلچل بھی نظر آئی ہوتی۔ آج وہ ساحل پر نہیں اُتریں گے:"

"اور میرا خیال یہ ہے کہ ان جہازوں سے ایک مرد، ایک عورت اور ایک گھوڑا ساحل پر ضرور آئے گا؟" میں نے ساحر کو جواب دیا۔

"طراق بزدل نہیں اور وہ بے وقوف بھی نہیں ہے اس لیے شاید وہ نہ آئے؟"

"یہ باتیں تمھاری سمجھ سے باہر ہیں۔ اب دستے کو حکم دو کہ تیز رفتاری سے بندرگاہ کی طرف روانہ ہو جائے؟"

☸

میں اور ساحر سب سے آگے آگے تھے۔

جب ہم بندرگاہ کے قریب پہنچے تو میں نے برگا کو حکم دیا کہ دستے کو وہیں روک دے تاکہ جہازوں سے اُسے دیکھا نہ جا سکے۔ پھر میں نے ساحر کو ایک قرنا دلوایا اور کہا: "اگر قرنا چار مرتبہ بجایا جائے تو اپنے سپاہی لے کر آگے بڑھنا اور لڑنے مرنے کے لیے تیار رہنا لیکن مجھے اُمید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی؟"

برگا چند لمحے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا: "دیشتا کی رُوح آپ کی مددگار ہو؟"

اس کا مطلب تھا کہ اُسے دیشتا کی موت کا علم ہو چکا تھا مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں ساحر کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

کچھ دُور جانے کے بعد ساحر نے کہا: "آپ کی ترکیب کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ طراق آپ کا منتظر ہے۔ آپ نے اتنا شور مچایا کہ اُسے آنا ہی پڑ گیا؟" اُس نے یہ کہتے ہوئے ساحل کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اُس جانب دیکھا۔

ساحل پر سمندر سے کچھ دُور ایک سیاہ خیمہ نصب تھا۔ خیمے کے باہر متعدد نیزے گڑے ہوئے تھے۔ ایک نیزے کے ساتھ اژدہا چھاپ ڈھال لٹک رہی تھی اور ایک سیاہ گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ خیمے کے دروازے پر ایک شبستانی محافظ کھڑا تھا اور دروازے پر پردہ جھول رہا تھا۔

"وہ خیمے میں ہو گا؟" ساحر نے کہا: "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ خیمہ اور گھوڑا طراق کا ہے۔ میں یہ دونوں چیزیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں؟"

میں نے اچھی طرح ساحل کا جائزہ لیا۔

وہاں کوئی اوٹ نہیں تھی جس کے پیچھے سپاہی چھُپ سکتے البتہ دُور سمندر میں لنگر انداز جہاز ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ساحر کو جہاز گننے کا حکم دیا اور خود بھی سرسری طور پر شمار کرنے لگا۔

میرے اندازے کے مطابق وہ تین سو تھے مگر ساحر نے اپنے نیزے سے ریت پر لکیریں لگا کر گنا تو وہ تین سو چھ نکلے۔

"میرے خیال میں دو سو جہازوں پر سپاہی ہیں اور ایک سو پر گھوڑے اور سامانِ رسد ہے؟"

"ہر جہاز پر کتنے سپاہی ہوں گے؟"

"ایک جہاز پر دو سو سپاہی ہُوا کرتے ہیں جناب . . ." وہ بولا۔

اس کا مطلب تھا کہ طراق اپنے ساتھ چالیس ہزار جنگجو لایا تھا جب کہ ہماری نفری ایک ہزار سے بھی کم رہ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ چالیس کا مقابلہ ایک آدمی کیسے کر سکتا ہے۔ جنگ کی صورت میں وہ ہمارے سپاہیوں کو ایک گھنٹے کے اندر اندر فنا کر سکتے تھے۔

"اب تو آپ کو اُس سے تنہا ہی مقابلہ کرنا پڑے گا؟" ساحر بولا: "لیکن آپ اُس سے کیسے جیتیں گے؟"

"تم دیکھتے جاؤ؟" میں نے جواب دیا: "آؤ چلیں . . . تم ایک مرتبہ قرنا پھونک کر برگا کو خبردار کر دو کہ طراق ساحل پر پہنچ چکا ہے؟"

ساحر نے قرنا پھونک کر میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ . . پھر

رازدارانہ لہجے میں بولا "اب ہم بالکل تنہا ہیں یہ تو بتاؤ کہ آپ طراق کو ٹھکانے لگانے کے لیے کیا چکر چلائیں گے؟"

"چونکہ تم خود چکر باز آدمی ہو اس لیے سب کو چکر باز ہی سمجھتے ہو... میں اُسے شکست دینے کے لیے طاقت اور مہارت سے کام لوں گا۔"

"مگر آپ نے تو اُسے بہت سی سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے۔ وہ ہر قسم کا ہتھیار استعمال کر سکتا ہے جب کہ آپ کے پاس صرف تلوار اور ڈھال ہے۔"

"جنگیں اور مقابلے ہتھیاروں یا سپاہیوں کی تعداد سے نہیں بلکہ جذبے سے جیتے جاتے ہیں۔"

جب ہم خیمے سے سو قدم دُور رہ گئے تو ساحر نے کہا "کہیں خیمے میں قبستانی سپاہی نہ چھپے ہوئے ہوں' آپ اکیلے ہیں اس لیے تنہا آگے نہ جائیں۔"

"تم فکر نہ کرو اور یہیں کھڑے رہو۔" یہ کہہ کر میں گھوڑے سے اُتر گیا اور اس کی لگام ساحر کو تھما دی۔

یکایک خیمے سے ایک دراز قد شخص اور مونا باہر آ گئے۔

"یہی ہے... طراق یہی ہے۔" ساحر بولا۔

طراق قد میں میرے برابر مگر جسامت میں مجھ سے دُبلا تھا۔ وہ زرہ بکتر میں بھی بے حد پھرتیلا لگ رہا تھا۔ مُونا سفید لباس میں بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے ایک بار چمکیلی سمندر آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور نظریں جُھکا لیں۔

طراق مسلسل میری طرف دیکھتا رہا۔

"کیا تم وہی آدمی ہو جسے سرفروش کہتے ہیں؟" اس نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

"ہاں... کیا میں طراق سے مخاطب ہُوں؟"

"تم شاہِ شبستان' شاہِ برتھان اور شاہِ رومو سے ہی مخاطب ہو۔"

"شاہِ شبستان و برتھان تک تو درست ہے مگر رومو کا ابھی فیصلہ نہیں ہُوا۔" میں نے اختلاف کیا۔

"مجھے تم سے ملاقات کرنے کے لیے بہت انتظار کرنا پڑا ہے۔" وہ بولا۔ "مگر میں اس قسم کی ملاقات نہیں چاہتا تھا کیوں کہ میں تمھیں قتل کرنے کا خواہش مند نہیں ہُوں۔"

"میں آپ کی تائید کرتا ہُوں کیوں کہ مجھے بھی قتل ہونے کا شوق نہیں ہے۔"

"لیکن اس مقابلے کی دعوت تمھی نے دی ہے۔ کیا تم اپنی شرائط پر قائم ہو؟ میں گھوڑے پر سوار رہوں گا اور تم پیدل رہو گے۔"

"میں اپنی شرائط کے ایک ایک لفظ کا پابند ہوں۔"

اُس نے ایک نظر مُونا پر ڈالی اور بولا "اگر تم جیت گئے تو مُونا تمھیں مل جائے گی لیکن اگر تم ہتھیار ڈال دو اور میرے پاس آ جاؤ تو بھی مُونا تمھیں مل جائے گی۔ تم جانتے ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ دیوی نہیں بلکہ ایک حسین لڑکی ہے لیکن دُنیا میں اس سے بھی زیادہ حسین لڑکیاں موجود ہیں اور ایسی لڑکیاں کی میرے پاس کوئی کمی نہیں۔"

"میں جانتا ہُوں کہ مُونا کیا ہے اور دُنیا میں اس سے زیادہ حسین لڑکیاں بھی موجود ہیں مگر میرے لیے اس کے حصول کی وجہ درِ شہوار درشتا ہے۔"

"ہاں... میں اس وجہ سے بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اگر تم جیت گئے تو یہ تمھاری ہوگی... پھر تم اسے اپنے پاس رکھو یا دریا کے حوالے کر دو یہ تمھاری مرضی ہوگی۔"

"اگر میں جیت گیا تو صرف مُونا ہی مجھے نہیں ملے گی بلکہ تم رومو پر حملہ بھی نہیں کرو گے۔" میں نے کہا۔

"اس معاملے میں کچھ مشکلات درپیش آ سکتی ہیں۔" وہ بولا۔ "اور اس کے ذمّے دار بھی تم خود ہی ہو۔ تم نے بڑی چالاکی سے میرے ساتھ مقابلے کی چال چلی ہے اور تمھاری یہ چال کامیاب ثابت ہُوئی ہے۔ اگر میں مقابلے پر نہ آتا تو میری حیثیت واقعی دو کوڑی کی رہ جاتی اور میرے سپاہی مجھ سے باغی ہو جاتے۔ اگر میں مقابلے میں ہار جاؤں تو میرے بعد کیا ہوگا... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ظاہر ہے کہ اپنی موت کے بعد میں کوئی وعدہ نہیں نبھا سکوں گا اور اس کا انحصار میرے کمان داروں پر ہوگا کہ وہ رومو اور رومو کے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔"

طراق کی یہ دلیل معقول تھی۔

وہ صاف سُتھرا کھیل کھیل رہا تھا۔

"تمھارے ساتھ یہی ایک آدمی ہے یا کوئی اور بھی ہے؟" اُس نے ساحر کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پُوچھا۔

"صرف یہی ایک ہے۔" میں نے جواب دیا اور اُس کے خیمے پر نگاہ ڈالی۔

وہ میرا مقصد سمجھ گیا اور اُس نے اپنے سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی نے خیمے کی طناب کھول دی۔

خیمہ گر پڑا۔

اُس میں کوئی بھی نہیں تھا۔

"کیا تم ڈر رہے تھے کہ کہیں اس میں میرے سپاہی نہ چھپے ہوئے ہوں؟"

"میرے ذہن میں یہ خیال ضرور آیا تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن میں خوف زدہ نہیں ہُوں۔"

"تم بہت چالاک ہو سرفروش۔ میں ایک عظیم سربراہ ہُوں مگر تم نے میری دُکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ کر مجھے بے بس کر دیا۔ اب مجھے تمھیں قتل کرنے میں لُطف آئے گا۔"

"تو پھر اس معاملے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ مُونا میرے اور تمھارے آدمی کی مشترکہ حفاظت میں رہے گی۔ اگر میں جیت گیا تو یہ میرے ساتھ جائے گی ورنہ تمھارے پاس رہے گی۔ ہمارے ان آدمیوں کو تو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا؟"

"قبول... تم کہاں مقابلہ کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے ساحل کا جائزہ لیا اور کہا "یہی جگہ مناسب ہے۔ میں وہاں کھڑا رہوں گا۔" یہ کہتے ہُوئے میں نے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے وہ سمت اس لیے پسند کی تھی کہ کم از کم وہ پشت کی طرف سے مجھ پہ حملہ نہ کر سکے اور صرف سامنے یا دائیں بائیں سے ہی حملہ آور ہو۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا "تیار رہو اور مجھ سے رحم کی توقع ہرگز نہ رکھنا۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے سپاہی کو اشارہ کیا جو اُس کا گھوڑا لے آیا اور اُسے سوار ہونے میں مدد کرنے لگا۔

میں نے ایک نظر مُونا پر ڈالی جو طراق کے سپاہی اور ساحر کے درمیان کھڑی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہوں۔

میں اپنی ڈھال اور تلوار تولتا ہُوا اپنے منتخب مقام پر جا کھڑا ہُوا۔ میرے پیچھے کچھ فاصلے پر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور کافی فاصلے پر طراق کے جہاز کھڑے تھے۔

ہوا کچھ اور تیز ہو گئی تھی اور لہریں اُونچی ہوتی جا رہی تھیں۔

طراق نے بائیں ہاتھ میں ڈھال اور دائیں ہاتھ میں نیزہ سنبھالا اور گھوڑے کو میری طرف بڑھا دیا۔ میرا خیال تھا کہ نرم اور گیلی ریت کی وجہ سے گھوڑا رفتار نہیں پکڑ سکے گا مگر وہ میدانِ جنگ کا تربیت یافتہ گھوڑا تھا۔ ہر قدم پہ اُس کی رفتار بڑھتی ہی چلی گئی۔

طراق کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ دائیں بغل میں نیزہ دبائے میری طرف اُڑتا چلا آ رہا تھا۔

ایسے موقعوں پہ میرا ذہن کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ اگر میں اپنی جگہ سے ہلنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کرتا تو اُس کا نیزہ میری ڈھال پھٹنے کی بجائے میرے سینے میں پیوست ہو گیا ہوتا۔

میں نے سوچا تھا کہ جب گھوڑا میرے قریب سے گزر کر آگے جائے گا تو میں اس کی پچھلی ٹانگوں پر تلوار کی ضرب لگاؤں گا... مگر گھوڑے کی ٹانگوں پر چمڑا باندھ کر انھیں ضرب لگنے سے محفوظ کر دیا گیا۔

اس طرح میرے لیے مقابلے کی ایک چال بے کار ہو کر رہ گئی تھی۔

جب طراق نے دوسری مرتبہ مجھ پہ نیزے سے حملہ کیا تو میں نے اپنا رُخ اس طرح بدل لیا کہ اُس کا گھوڑا ساحل کی بجائے سمندر کی طرف نکل جائے اور اُس کی ٹانگیں ریت میں دھنس جائیں... مگر میری یہ ترکیب بھی ناکام رہی۔

گھوڑا گیلی ریت اور لہروں تک پہنچا ضرور تھا مگر طراق بھی بلا کا شہسوار تھا وہ کئی کاٹ کر اُسے دھنسنے سے بچا لے گیا۔

اب وہ میری اس چال سے بھی محتاط ہو چکا تھا اس لیے اُس نے سامنے سے حملہ کرنے کی بجائے دائیں جانب گھوڑا موڑ دیا اور جب پلٹا تو اُس کے بائیں ہاتھ میں نیزہ تھا۔ ڈھال شانے سے لٹک رہی تھی اور دائیں ہاتھ سے وہ زنجیر سے بندھا ہُوا چھوٹا سا خاردار گُرز گھما رہا تھا۔

اب میں اُس کے دُہرے حملے کی زد میں تھا۔

عین اُسی وقت مجھے سر میں شدید ٹیس محسوس ہوئی۔ یہ ٹیس اس بات کی علامت تھی کہ کمپیوٹر مجھے تلاش کر رہا ہے۔ میں نے ڈاکٹر فریدوں کو کوسا کہ بجت آ پہنچا۔۔۔ مگر مجھے اتنی مہلت ضرور مل گئی کہ میں اُچھل کر دُور جا گِروں۔

میرے گرتے ہی تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی

جہاز پر طراق کے سپاہیوں نے نعرہ لگایا۔ میری توجہ ابھی اُدھر ہی تھی کہ طراق پھر میرے سر پر پہنچ گیا۔

میں نے اُلٹی قلابازی لگائی اور پھر اس کے دونوں ہتھیاروں کی زد سے بچ گیا۔ لیکن اس کے نیزے نے میری ڈھال ٹیڑھی کر دی۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے ڈھال کے ذریعے اُس کا نیزہ چھیننے کی بھی ایک ترکیب پر عمل کیا تھا۔ میں نے طراق کی طرف دیکھا اُس کے نیزے کی اَنی ٹیڑھی ہو گئی ہے اس لیے وہ دُوسرا نیزہ منتخب کر رہا تھا۔

میرے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ میں نے اپنی ڈھال میں اُوپر نیچے دو سوراخ کر کے ایک زنجیر ڈھیلی کر دی اس طرح ڈھال کے اگلے حصّے میں زنجیر سے ایک کڑا سا بن گیا۔

اگر طراق کے نیزے کی اَنی اس زنجیر کے حلقے میں اٹک جائے تو میں آسانی سے اُسے نیزے سے محروم کر سکتا ہُوں اور اگر ایک بار نیزہ میرے ہاتھ آ گیا تو پھر میری جیت یقینی بن سکتی تھی۔

اتنے میں طراق پھر تلوار لہراتا اور نیزہ بڑھاتا ہُوا میری طرف لپکا۔

میرا خیال تھا کہ وہ بیک وقت دونوں ہتھیاروں سے حملہ آور ہو گا۔۔۔ مگر اُس نے صرف تلوار سے ہی حملہ کیا اور تلوار شانے سے میری زرہ کا ٹکڑا اُڑا لے گئی۔

جہازوں سے پھر نعرہ ہائے تحسین گونجنے لگے۔

ابھی میں سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ طراق پلٹ آیا۔ وہ پھر تیزی سے تلوار لہراتا ہُوا آ رہا تھا۔۔۔ مگر جب قریب آیا تو اُس نے تلوار کی بجائے نیزے سے حملہ کیا جسے میں نے ڈھال پر روکا اور خلافِ توقع اُس کی اَنی زنجیر میں اٹک گئی۔۔۔ مگر اس کم بخت نے نیزہ اتنے زور سے بغل میں دبا رکھا تھا کہ وہ اُس سے نکل نہ سکا اور مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرا بازو کسی نے کھینچ کر جسم سے الگ کر دیا ہو۔

میں نے بھی ڈھال نہیں چھوڑی اور نیزے کو جھٹکا دیا تو طراق گھوڑے سے گر پڑا۔

قدرت شاید مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھی لیکن طراق نے مجھے نیزہ نکالنے کی مہلت نہیں دی اور پلٹ کر تلوار سے مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں پیچھے ہٹنے کی بجائے ایک دم جھکائی دے کر اُس سے ٹکرا گیا۔۔۔ اُس کے ہاتھ سے بھی تلوار چھوٹ گئی اور میں نے بھی ڈھال پھینک دی۔

ہم دونوں گُتھم گُتھا ہو گئے اور لڑھکنیاں کھانے لگے۔ لڑھکنیاں کھاتے ہُوئے ہم ڈھلان کے باعث پانی کی طرف جا رہے تھے۔

نہ تو مجھے خنجر نکالنے کا موقع مل رہا تھا اور نہ ہی وہ اس مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا۔

اچانک پانی کی ایک لہر ہم دونوں کے اُوپر سے گزر گئی۔ اتفاق سے اُس وقت میں اُوپر تھا۔ اس لیے میں نہ صرف تھپیڑے سے محفوظ رہا بلکہ میری آنکھیں بھی نمکین پانی میں بھیگنے سے بچ گئیں۔ جب کہ طراق محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ ایک ہاتھ سے آنکھ ملنے لگا۔

یہی موقع میرے لیے غنیمت تھا۔

میں نے اُس کا ہاتھ مروڑ کر اُس کا خود اُتارا اور اُسی سے اُس کے سر اور مُنہ پر ضربیں لگانے لگا۔۔۔ اُس نے مُنہ بچانے کے لیے میری طرف پیٹھ کی تو میں نے اُسے دبوچ لیا اور پورا دباؤ ڈالنے لگا۔ پانی کی لہریں اب تیزی سے آنے لگی تھیں۔ میں نے پُوری قوت سے طراق کا مُنہ پانی میں ڈبوئے رکھا حتیٰ کہ اُس کا دم گھُٹ گیا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے اُسے ٹانگوں سے پکڑا لیا اور گھسیٹتا ہُوا کنارے پر وہاں لے گیا، جہاں میری ڈھال گری تھی اور نیزہ پڑا ہُوا تھا۔ میں نے نیزہ نکال کر طراق کی گردن میں گاڑ دیا۔ اپنی تلوار اُٹھائی اور اس جگہ چلا گیا جہاں ساحر اور طراق کے سپاہی کے ساتھ مُونا کھڑی تھی۔

اس نے مجھے دیکھ کر اپنے آنسو پونچھ لیے۔

اس نے سپاہی سے کہا: "جاؤ۔ اپنے آقا کی لاش کی حفاظت کرو اور کشتی کے منتظر رہو۔"

سپاہی چُپ چاپ طراق کی لاش کی جانب بڑھ گیا۔

"جاؤ ساحر۔۔۔ مُونا کے لیے طراق کا گھوڑا لے آؤ۔ ہم آتش فشاں کی پہاڑیوں تک پہنچ جائیں گے تو یہ گھوڑا تمھارا ہو جائے گا۔"

ابھی میں نے بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ میرے سر میں پھر ایک شدید ٹیس اُٹھی اور میں بھنّا کر رہ گیا۔

ساحر ایک دم میرے قدموں میں بیٹھ گیا اور اکلوتی آنکھ سے آنسو پونچھتے ہُوئے بولا: "میں تو یہ سمجھا تھا کہ آج آپ زندہ نہیں بچیں گے۔ اُس کے پاس گھوڑا تھا، نیزہ تھا، تلوار تھی، گرز تھا، ڈھال تھی، خنجر تھا اور اس کے سپاہی نعرے لگا کر اس کی ہمت بھی بڑھا رہے تھے۔۔۔ مگر آپ کے پاس صرف عزم اور جذبہ تھا۔ میرے لیے آپ کا بچ جانا ہی سب سے بڑا انعام ہے۔۔۔۔ مجھے کوئی اور انعام مت دیجیے۔"

میں نے اس کے شانے تھپ تھپاتے ہُوئے کہا: "کھڑے ہو جاؤ۔ اب تم رومو کے ایک محافظ دستے کے کمان دار ہو، اس لیے یہ گھوڑا تمھیں رکھنا ہو گا۔ جاؤ اُسے یہاں لے آؤ۔"

جب ساحر گھوڑا لینے چلا گیا تو مُونا ایک قدم میری طرف بڑھی اور بولی: "تمھیں مجھ سے نفرت ہو گئی ہو گی۔ لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تمھارا پیار میرے دِل میں بڑھتا جا رہا ہے۔ تم نے تین بار مجھے موت کے چنگل سے چھڑایا ہے اور میں نے ہر بار تمھیں زحمت ہی دی ہے لیکن مجھے دیوتا شہوار و شیتا کی قسم، آیندہ تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

"مجھے اَب بھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں تو تمھارے دیس میں اجنبی ہُوں جو آج نہیں تو کل چلا جائے گا۔"

"نہیں۔۔۔ اب تم کبھی مجھ سے جدا نہیں ہو گے۔" وہ رونے لگی تھی۔

مجھے سر میں پھر ٹیس محسوس ہُوئی۔

کمپیوٹر نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا اور اب کسی بھی لمحے مجھے اپنے دَور اور اپنی دُنیا میں منتقل کر سکتا تھا اس لیے میں نے مُونا سے کہا: "میں یہاں نہیں رہ سکتا مُونا تمھیں کیا کرنا ہے۔ اس کا فیصلہ تم خود کرو گی۔ کیا تم جانتی ہو دیشتا نے مجھ سے کیا کہا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ میں جانتی ہُوں۔ جب میں بچّی تھی، تب سے جانتی ہُوں کہ یہ دن بھی آنا ہی تھا لیکن تم مجھے بچا سکتے ہُو سرفروش! مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا مُونا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

اتنے میں ساحر گھوڑا لے آیا۔

"اگر تم مجھے نہیں لے جا سکتے تو کیا دیوتا شہوار نے تمھیں بتایا تھا کہ کیا کچھ ہونا ہے اور کیسے ہونا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ اُس نے مجھے بتا دیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"سرفروش۔۔۔!" اچانک مُونا چیخ پڑی۔ اُس کی چیخ بڑی دلدوز تھی۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا لیکن اگلے ہی لمحے چاروں طرف آگ اور شراروں کا رقص محسوس ہونے لگا۔ اُدھر ساحل سے بے پناہ شور بلند ہو رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا تو سینکڑوں سپاہی تلواریں، نیزے اور تیر کمان لیے ہماری طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اُسی لمحے میری منتقلی شروع ہو گئی۔ میرا جسم سمٹنے لگا۔ اچانک ایک سرسراتا ہُوا تیر آیا اور میری پسلیوں میں پیوست ہو گیا۔ میرے حلق سے ایک طویل کراہ نکل گئی۔ میرے مرنے اور اپنے دَور میں واپس جانے کا عمل بیک وقت شروع ہو گیا۔

میں سمٹتا جا رہا تھا اور میری پسلیوں میں پیوست تیر جیسے میرے دِل کی گہرائیوں میں اُترتا جا رہا تھا۔۔۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں بے ہوش ہو گیا تو ایسی صورت میں میری اپنے دَور میں منتقلی رُک جائے گی اور کمپیوٹر میرے مُردہ جسم کو قبول نہیں کرے گا۔ میرے ذہن میں اندھیرے ہی اندھیرے اُتر گئے اور میرا جسم ساکت ہو گیا۔



بڑی ہی عجیب صورت حال تھی۔

ایک طرف تو میرا جسم تحلیل ہو رہا تھا اور دُوسری طرف موت تیزی سے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ ایک طرح سے مَیں دُہری موت کا شکار ہو رہا تھا۔ ڈُوبتے ہُوئے ذہن کے ساتھ مَیں صرف یہی سوچ رہا تھا کہ اگر میرے دماغ نے جسم تحلیل ہونے سے پہلے پہلے کام کرنا بند کر دیا تو کمپیوٹر میری ہستی کو فی الفور رَدّ کر دے گا اور مَیں جہاں ہُوں، وہیں رہ جاؤں گا... گویا کئی صدیوں پہلے کے اس گمنام دَور میں موت سے ہمکنار ہو جاؤں گا۔

ذہن پر تاریکی کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

جسم کے تحلیل ہونے کا عمل بھی بڑی سرعت سے جاری تھا۔

اچانک مجھے یُوں لگا جیسے مَیں زندہ تو ہُوں لیکن میرا نام و نشان تک مِٹ چُکا ہے۔ میری ہستی بکھر گئی ہو اور میرا ذہن موت کی بھاری سِل تلے ناکارہ ہو کر رہ گیا ہو... اور اندھیروں نے مجھے نگل لیا ہو۔

☆

ذہن بیدار ہُوا تو اپنی ہستی اور اپنے وجُود کا احساس ہونے لگا۔ اس کے باوجود یہ ڈر اور یہ خوف بھی لاحق رہا کہ آنکھ کُھلے گی تو مَیں اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے قُدرت کی عدالت میں کھڑا ہُوں گا...

لیکن جب چشمِ تصوّر بند ہُوئی اور ظاہری آنکھیں ماحول کی تصویر میرے ذہن میں منتقل کرنے لگیں تو مجھے سب سے پہلے ڈاکٹر فریدوں کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بڑے ہی شفیق انداز میں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"ڈاکٹر..." مَیں نے گُھٹی گُھٹی سی آواز میں کہا: "مَیں زندہ ہُوں... یا آپ بھی انتقال فرما کر میرے ساتھ جہنم رسید ہو چکے ہیں؟"

"ہم دونوں ہی زندہ ہیں۔" وہ ہنس کر بولا: "اس بار تم بال بال بچے ہو۔ اگر تمھیں یہاں پہنچنے میں صرف بیس سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو تمھاری موت یقینی تھی۔ کمپیوٹر نے جیسے ہی تمھاری تجسیم کی، مَیں نے دیکھ لیا کہ تم قریب المرگ ہو۔ تمھاری واپسی پر مَیں ہمیشہ کسی نہ کسی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے تیار رہتا ہُوں۔ میری یہی احتیاط پسندی کام آ گئی اور تمھیں فوری طبی امداد بہم پہنچا دی گئی جس کے نتیجے میں تم نہ صرف زندہ ہو بلکہ مَیں دیکھ رہا ہُوں کہ تمھاری زندہ دلی بھی برقرار ہے۔ تمھاری یہی خوبی تمھیں دُوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔"

مَیں نے ایک طویل سانس لی تو میری پسلی میں خفیف سی ٹیس اُٹھی اور یہ سانس ایک کراہ میں ڈھل کر رہ گئی۔

"اتنی لمبی سانسیں نہ لو، ڈیئر!" ڈاکٹر فریدوں نے بڑے پیار سے کہا: "کہیں ٹانکے نہ کُھل جائیں۔ تمھیں اس بستر پر آج تیسرا ہفتہ ہے۔ اُمید ہے کہ آیندہ چند ہفتوں میں تم بالکل تن دُرست ہو جاؤ گے۔ اس

وقت تک کے لیے تمھیں مکمل چھٹی دی جاتی ہے۔ اگلے ہفتے ٹانکے کُھل جائیں تو تمھیں یہاں سے رُخصت کر کے ساحلِ سمُندر میں بھیج دیا جائے گا۔"

مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔

... اور گہری نیند میں ڈُوب گیا۔

وسطِ مارچ کے دن تھے۔

مَیں صحت یاب ہونے کے بعد تفریحی چھٹیاں منا رہا تھا اور اب مجھے اس شعر پر یقین آ چکا تھا کہ...

وقت دونوں طلسم رکھتا ہے
آپ ہی زخم اور آپ ہی مرہم

اگر ایسا نہ ہوتا تو مَیں شاید لالہ رُخ کو کبھی نہ بھول پاتا جو میری زندگی میں بہاریں لائی تھی لیکن مجھے خزاؤں کی تحویل میں دے کر نہ جانے کس کے آنگن میں جا اُتری تھی۔ تب مجھے انگریزی زبان کی یہ مثل بہت یاد آنے لگی... کہ مرد، عورتوں کے لیے تاج و تخت چھوڑ دیتے ہیں لیکن عورتیں اُن کے لیے صرف کانٹے چھوڑ جاتی ہیں... مگر وقت نے میرے دل پر لگنے والا یہ گھاؤ جلد ہی بھر دیا اور میری سوچ کی راہیں بدل گئیں۔ اب مَیں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ مرد کا لگایا ہُوا زخم مرد اور عورت کا لگایا ہُوا گھاؤ عورت ہی بھر سکتی ہے۔

اُن دنوں میرا یہ گھاؤ عینی شیرازی بھر رہی تھی۔ وہ بلاشُبہ دلکش و دلآرا لڑکی تھی۔ وہ گھر سے تو تہران یونیورسٹی میں داخلہ لینے آئی تھی لیکن شہرت، دولت اور گلیمر اسے نگار خانے کی چہار دیواری میں گھسیٹ لائے تھے۔ اب وہ اداکارہ بن رہی تھی لیکن اسے فلموں کے ہیرو زہر سے زیادہ ناپسند تھے۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی کہ یہ ہیرو جو پردۂ سیمیں پر رستم و سہراب دکھائی دیتے ہیں اور ایک مُکّے سے چھ چھ آدمی گراتے نظر آتے ہیں، چڑیا کا سا دل رکھتے ہیں اور درحقیقت عورتوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں جبکہ مرد کو ایک ٹھوس چٹان کی طرح ہونا چاہیے... اور مَیں اس لحاظ سے اس کے معیار پر پُورا اُترتا تھا۔

اُس روز بھی شوٹنگ کے بعد وہ سیدھی میرے اپارٹمنٹ پہنچ گئی تھی اور وہاں سے ہم سمندر کے ساحل پر اُسی ہٹ کی جانب چل دیے تھے جو مجھے آرام کرنے کی غرض سے بطورِ خاص دیا گیا تھا۔

عینی تو تھوڑی دیر سمندر میں نہانے کے بعد تولیا لپیٹ کر ریت پر لیٹ گئی... مگر مَیں غروبِ آفتاب تک لہروں سے کھیلتا رہا اور ساحل سے کافی دُور نکل گیا۔ اچانک مَیں نے دیکھا کہ عینی مجھے اشارے سے اپنی طرف بُلا رہی ہے۔

جب مَیں ساحل پر پہنچا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کیا ہُوا؟" مَیں نے حیرت سے پُوچھا۔

"سردی کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے اور تم پُوچھ رہے ہو کہ کیا ہُوا۔"

"ارے!" مَیں نے تعجب سے کہا: "تمھیں یہاں ساحل پر سردی لگ رہی ہے اور مجھے نہاتے ہُوئے بھی محسوس نہیں ہُوئی۔"

"مجھے بھی محسوس نہ ہوتی اگر میرے اندر قطبی ریچھوں جیسی خاصیت ہوتی۔" وہ جھلا کر بولی پھر کپڑے، تولیے اور اپنا بیگ سمیٹنے لگی۔

مجھے اُس کی بات پر ہنسی آ گئی: "تمھارے خیال میں، مَیں کوئی قطبی ریچھ ہُوں؟" مَیں نے پوچھا۔

"ہو تو نہیں مگر تمھارے اندر اُن کی کم از کم دو خاصیتیں ضرور ہیں۔ اب ہٹ میں چلو، مجھے بھُوک بھی بڑے زور کی لگ رہی ہے۔"

"بھُوک لگ رہی تھی تو کچھ کھا لیتیں یا آدم خور بننا چاہتی ہو؟"

"تم کبھی اپنی زندگی میں سنجیدہ بھی ہُوئے ہو، سرفروش؟" وہ جھینپ کر بولی۔

"مَیں ہمیشہ ہر بات پُوری سنجیدگی سے کرتا ہُوں۔"

"غلط... بالکل غلط۔" وہ بولی: "مَیں اتنے دنوں سے تمھیں پڑھ رہی ہُوں۔ مَیں نے تمھاری ایک ایک حرکت کا جائزہ لیا ہے اور تمھارا تجزیہ کیا ہے۔ اب مَیں اس نتیجے پر پہنچی ہُوں کہ تم ایک خُود پسند آدمی ہو جو اپنی خوش وقتی کے لیے تو کسی کو ساتھ رکھ سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے کسی عورت کا ساتھ نہیں دے سکتا یا دینا ہی نہیں چاہتا۔ کیوں، آخر تم ایسے کیوں ہو سرفروش؟"

مجھے عینی کی ان باتوں سے صدمہ محسوس ہُوا۔ مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ ایک شوگرل ایسا بھی سوچ اور سمجھ سکتی ہے۔ دُوسرے اُس کا یُوں سوچنا اور مجھ میں دلچسپی لینا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ بھی ایک گھر اور ایک مرد کے تحفظ کے خواب دیکھ رہی ہے اور وہ مجھ سے ایسی توقع باندھ رہی ہے... لیکن میرے ساتھ تو اب بھی وہی مجبوریاں تھیں جنھوں نے لالہ رُخ کو مجھ سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اس لیے مَیں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا: "دیکھو عینی۔ اس وقت میرا مُوڈ کچھ اور ہے جبکہ تم مجھے بحث میں اُلجھانا چاہتی ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ باتیں تم کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھو؟"

"نہیں سرفروش۔ مَیں بہت دنوں سے اس موضوع پر تم سے بات کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اب بات چھڑ گئی ہے تو مَیں کسی فیصلے پر پہنچنا بہتر سمجھتی ہُوں۔"

"اچھا تو پھر کھانے کے بعد اس موضوع پر بات کریں گے۔" مَیں نے فی الوقت پہلو بچایا اور ہٹ میں پہنچتے ہی باتھ رُوم میں گھس گیا۔

جب مَیں نہا کر اور کپڑے بدل کر نکلا تو عینی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ رہی تھی۔ مَیں نے پُوچھا: "کس کی کال تھی؟"

"کوئی مسٹر رضا تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔"

"اوہ..." میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا اور مَیں فون کی طرف بڑھ گیا۔ شاید مجھے پھر کسی نئے سفر کے لیے بُلایا جا رہا تھا۔ مَیں نے ریسیور

کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مینی کی طرف دیکھا تو میرا بڑھتا ہوا ہاتھ رُک گیا۔

وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے کہہ رہی تھی: "میں کچھ کھانا وانا تیار کرتی ہوں۔ جب تک تم آقائے رضا سے بات کر لو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر رضا کا نمبر ملایا۔

دُوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ چند لمحوں بعد آقائے رضا کی آواز سُنائی دی: "ہیلو۔ رضا بول رہا ہوں۔"

"آپ نے مجھے یاد کیا تھا جناب؟"

"ہاں سرفروش۔ میں تمھیں کئی بار رِنگ کر چکا ہوں مگر تم شاید ہٹ میں نہیں تھے۔ خیر... کل صبح کا پروگرام بن چکا ہے مگر ڈاکٹر فریدوں کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے ضرور مل لینا۔"

"خیریت تو ہے جناب؟" میں نے پوچھا۔

"ہے بھی اور نہیں بھی۔ جب تم آؤ گے تو بات ہو گی۔"

"آپ نے تو مجھے فکر اور تجسّس میں مُبتلا کر دیا ہے جناب۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے... مگر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مصروفیت جاری رکھو۔" اور اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے فون بند کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ آقائے رضا مجھ سے اپنے بچّوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ اُن میں اور مجھ میں اگرچہ ایک افسر اور ماتحت کا رشتہ تھا مگر وہ ایک افسر کی بجائے ایک بزرگ کی حیثیت سے میرا زیادہ خیال رکھتے تھے اور میری خاطر ڈاکٹر فریدوں سے بھی اُلجھ جایا کرتے تھے۔ ہر چند کہ اُنھوں نے مجھے پریشان نہ ہونے کی تلقین کی تھی مگر اُن کی اپنی آواز سے پریشانی ہی جھلک رہی تھی۔ اس لیے جب مینی کھانا تیار کر کے لے آئی تو میں نے کہا: "کھانا جلدی سے کھا لو مینی! مجھے فوری طور پر واپس جانا ہے۔"

"مگر تم نے تو رات بھر یہیں قیام کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

"میں تمھاری رفاقت سے کسی نسبتاً زیادہ اہم کام کی وجہ سے ہی محروم ہو رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

یہ سُن کر مینی کا چہرہ اُتر گیا۔ خود میرا ارادہ بھی ڈانواں ڈول ہونے لگا مگر پھر تجسّس میری سوچوں پر غالب آ گیا اور میں اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

"میں حیران تھا کہ ڈاکٹر فریدوں کو کمپیوٹر کی بجائے اچانک دماغ کی سرجری سے کیوں عشق ہو گیا ہے۔ وہ سائنس دانوں کی بجائے دماغ کی سرجری کرنے والے ڈاکٹروں سے کیوں ملنے لگا ہے۔ بالآخر آج یہ عقدہ کھُل ہی گیا۔" رضا کہہ رہے تھے اور میں اُن کے سامنے بُت بنا بیٹھا تھا۔

"وہ کیا ہے جناب؟"... میں تجسّس پر قابو نہ رکھ سکا تو پوچھ ہی بیٹھا۔

"وہ تمھارے دماغ کا آپریشن کرنا چاہتا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میرے لہجے میں بے پناہ حیرت سِمٹ آئی۔

"اُسے بہت دُور کی سُوجھی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمھارے دماغ کو کمپیوٹر سے مربُوط کر دے۔ یعنی جب تم ماضی کے اندھیرے سفر پر جاؤ تمھاری ہر سوچ کمپیوٹر تک پہنچتی رہے اور کمپیوٹر تمھاری ہر سوچ سے اُس کو آگاہ کر دے۔"

"لیکن وہ تو پہلے بھی میرے دماغ پر قسم قسم کی شعاعیں ڈال کر عجیب سے عمل کرتے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ سب کچھ تمھاری یادداشت بڑھانے کے سلسلے میں تھا۔ اُس نے اُس عمل کے ذریعے تمھاری یادداشتوں کے لیے ایک ذخیرہ گاہ فراہم کر دی تھی... مگر اب وہ تمھارے دماغ کو براہِ راست کمپیوٹر سے مربُوط کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے تمھارے دماغ کا نازک ترین آپریشن ضروری ہے جو جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جب وہ تم سے بات کرے تو تم انکار کر دو۔"

"لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" اُنھوں نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا: "میں نے ڈاکٹر فریدوں کو دو ٹوک جواب دے دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا فیصلہ تم خود کرو گے۔ بہرحال، تم انکار کر دینا۔"

... مگر میں جانتا تھا کہ جب وہ قوم و وطن کے نام پر مجھ سے آپریشن کروانے کو کہے گا تو میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ تاہم میں نے رضا کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیا کہ جیسا وہ چاہتے ہیں میں ویسا ہی کروں گا اور آپریشن کے لیے انکار کر دوں گا۔

دُوسری صبح میں لنگوٹ باندھے کمپیوٹر چیمبر کی الیکٹرک کرسی پر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں نے حسبِ معمول میرے جسم پر عجیب سا مرہم لگا دیا تھا اور الیکٹروڈز بھی چسپاں کر دیے تھے۔ اب صرف کمپیوٹر کا سوئچ آن کرنے کی دیر تھی لیکن ہمیشہ کے برعکس آج ڈاکٹر فریدوں سوئچ آن کرنے کی بجائے مختلف میٹروں کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا... پھر اُس نے لیجر جیسا ایک موٹا سا رجسٹر اُٹھایا اور اس میں اندراج کرنے لگا۔ وہ کمپیوٹر کے مختلف میٹر دیکھتا، کچھ حساب کرتا اور رجسٹر میں درج کرتا جاتا۔ میں کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا، آخر بول پڑا:

"یہ سب کیا ہے ڈاکٹر؟ کیا کمپیوٹر میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

ڈاکٹر فریدوں نے کوئی جواب دینے کی بجائے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر اندراجات مکمل کرنے کے بعد رجسٹر ایک جانب رکھتے ہوئے بولا: "گڑبڑ تو کوئی نہیں سرفروش... مگر میں اس بار ایک نیا تجربہ کرنے والا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر متعدد چھوٹے بڑے میٹر نصب تھے: "میں نے کمپیوٹر میں کچھ نئے آلات کا اضافہ کیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ اس نئے تجربے کے متعلق تمھیں بھی پہلے سے آگاہ کر دوں۔"

"کیا آقائے رضا بھی اس نئے تجربے کے متعلق جانتے ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"اُونھوں۔ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اگر اُسے معلوم ہو جاتا تو وہ میرے لیے خواہ مخواہ کی مشکلات پیدا کر دیتا۔ گھبراؤ نہیں سرفروش۔ اس نئے تجربے میں کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی ہُوا بھی تو بے حد معمُولی نوعیت کا ہو گا۔"

"پھر بھی آپ مجھے اس نئے تجربے اور معمُول کے خطرات سے آگاہ کر دیں تو بہتر ہے۔"

ڈاکٹر فریدوں وہی موٹا رجسٹر اُٹھا لایا اور اُسے کھول کر دکھاتے ہوئے بولا: "یہ دیکھو۔"

میں نے رجسٹر کو غور سے دیکھا۔ اس پر سائنس اور حساب کی نشانیاں بنی ہُوئی تھیں جنھیں سمجھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

"یہ کیڑوں مکوڑوں کی تصویریں میری سمجھ سے باہر ہیں ڈاکٹر۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں۔ یہ میرے تجربات کا ریکارڈ ہے۔ میں کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ تمھیں اُسی زمانے میں دوبارہ بھیج دُوں جہاں تم پہلے بھی جا چکے ہو۔ اسی لیے میں نے کمپیوٹر کی سیٹنگ میں تبدیلی نہیں کی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تمھیں دوبارہ اپنی بقا کی جدوجہد نہیں کرنا پڑے گی۔ تم اُس دَور کے لوگوں اور وہاں کے مقامی حالات سے آگاہ ہو چکے ہو گے۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہو گا کہ وہاں کن معدنیات کے خزانے موجُود ہیں۔ دراصل اس پروجیکٹ پر حکومت کی بہت بڑی رقم خرچ ہو چکی ہے اور وہ اس رقم کا نعم البدل چاہتی ہے۔ اگر دورِ گزشتہ کے خزانے مثلاً ہیرے اور یورانیم وغیرہ دورِ حاضر میں منتقل کیے جا سکیں تو ہماری قوم اور ہمارا ملک دُنیا کا امیر ترین ملک بن سکتا ہے چنانچہ اُن خزانے منتقل کرنے کے لیے ایک علٰحدہ پروجیکٹ بھی قائم کیا جا چکا ہے۔ تجربات ہمارے ہیں۔ کمپیوٹر کی یہ وہی سیٹنگ ہے جس میں تم تاشیہ سے ملے تھے۔"

میں یہ سُن کر خوش ہو گیا کہ اس طرح تاشیہ سے ایک بار پھر ملاقات ہو جائے گی... پھر مجھے خیال آیا کہ تاشیہ کے دَور میں تو مجھے ایسا کوئی خزانہ دکھائی نہیں دیا تھا جس سے ہمارا ملک دُنیا کا امیر ترین مُلک بن سکے۔ اس لیے میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"مگر ڈاکٹر، مجھے اس دَور میں بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اُس کی بجائے مجھے اُس دَور میں منتقل کریں جس میں میں نے سرزمین سِراما پر یورانیم کی کانیں دیکھی تھیں۔"

"میں سب سمجھتا ہوں سرفروش۔" ڈاکٹر بولا: "اس دَور میں تو میں تمھیں صرف تجربے کے طور پر چند گھڑیوں کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اس دَور میں پہنچ گئے تو پھر میں تمھیں سِراما والے دَور میں بھی بھیج دُوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنے تجربے کی کامیابی کا پُورا پُورا یقین نہیں ہے اور پھر مجھے کمپیوٹر میں کچھ نئی تبدیلیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔"

ڈاکٹر فریدوں نے رجسٹر بند کر کے مجھے گھُورتے ہُوئے کہا: "پچھلی مرتبہ تم نے کب سفر کیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تمھیں واپس آئے کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"تقریباً چھ مہینے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور ان چھ ماہ میں میں کمپیوٹر کی کارکردگی بڑھانے کے لیے تقریباً اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس میں تبدیلیاں آئی ہیں اور اس کی کارکردگی پہلے سے کہیں بہتر ہو گئی ہے۔"

"اچھی بات ہے جناب۔" میں کچھ لاجواب سا ہو کر بولا: "اس کی بہتر کارکردگی کا بھی پتہ چل جائے گا۔ بھیجیے مجھے تاشیہ کے دَور میں۔"

"خوب۔ یہ ہُوئی نا بات۔" ڈاکٹر مُسکرا کر بولا: "تیار ہو جاؤ۔" اور یہ کہتے ہُوئے اُس نے کمپیوٹر کا سُرخ سوئچ آن کر دیا۔

میٹر بورڈ پر بلب جلنے بجھنے لگے۔

سوئیاں حرکت میں آ گئیں۔

میرے اعضا سے بندھے ہُوئے الیکٹروڈز میں برقی رَو... دوڑنے لگی۔

میں نے سوچا کہ ابھی درد کی شدید لہر اُٹھے گی اور میرے جسم کا رُواں رُواں تحلیل ہو کر سالموں میں تقسیم ہو جائے گا۔ یہ سالمے ماضی کے کسی دَور میں یکجا ہوں گے اور وہاں میں ایک بار پھر اپنی بقا کی جدوجہد میں مصرُوف ہو جاؤں گا لیکن جتنی دیر میں میں نے یہ ساری باتیں سوچیں اتنے وقت میں تو مجھے ماضی کے کسی دَور میں پہنچ بھی

جانا چاہیے تھا... مگر میں اب تک وہیں تھا۔ مجھے اپنے جسم اور سر میں درد محسوس ہُوا تھا مگر پہلے جیسا نہیں۔ یہ درد الیکٹروڈز میں برقی لہر دوڑنے کی وجہ سے تھا اور مجھے سالموں میں تقسیم کرنے والا نہیں تھا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہو گئی تھی۔

اتنے میں مجھے کمپیوٹر کی ایک مشین سے گاڑھا گاڑھا دُھواں نکلتا دکھائی دیا اور چیمبر میں کونے سے لپکنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر فریدوں کھانستے ہُوئے جلدی جلدی مختلف سوئچ آف کر رہا ہے۔

میں نے اپنی کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن برقی لہروں نے مجھے ہلنے بھی نہیں دیا۔ اتنے میں ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کا مین سوئچ آف کر دیا۔ الیکٹروڈز کی برقی رَو ختم ہو گئی۔ میں نے اپنے جسم کے ساتھ چپکے الیکٹروڈز اتار پھینکے اور کمپیوٹر چیمبر سے نکلنے ہی والا تھا کہ وہ نظارا دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

میرے اور ڈاکٹر فریدوں کے درمیان بھُورے رنگ کے دُھوئیں کا ایک بگولا سا بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا... پھر یہ دُھواں ایک ہیولے میں بدلنے لگا اور آخر میں اس نے بالکل واضح شکل بلکہ جسامت اختیار کر لی۔ میں نے ایسی عجیب الخلقت ہستی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس مخلوق کو دیکھ کر دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ نہ تو آدمی تھا اور نہ ہی کوئی جانور تھا۔

اُس کے ہاتھ میں پتھر کا ایک بھدا سا بھاری کلہاڑا تھا۔ وہ ڈاکٹر فریدوں کی طرف دیکھ کر بڑے مکروہ اور خوفناک انداز میں غرّایا۔ پھر کلہاڑا سنبھالے اُس کی طرف بڑھا تو ڈاکٹر فریدوں چلّایا۔

"بچاؤ... مجھے بچاؤ، سرفروش!"

ڈاکٹر فریدوں کی پکار پر مجھے جیسے ایک دم ہوش آ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ وحشی ڈاکٹر فریدوں پر کلہاڑے کا وار کرتا، میں اُچھلا اور میری فلائنگ کِک نے اُسے مُنہ کے بل گرا دیا۔

اگرچہ وہ قد میں مجھ سے نصف تھا مگر اُس میں بلا کی طاقت اور پھُرتی تھی۔ اُس کے جسم پر گھنے بال تھے اور اُس سے عجیب سی بدبُو آ رہی تھی۔ وہ گرتے ہی فوراً اُٹھا اور مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کلہاڑے کے وار سے بچا سکا۔

دُوسرے وار سے پہلے ہی میں نے اُس کی کلائی پکڑ کر مروڑی اور جھٹکا دیا تو کلہاڑا اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے کلہاڑا دُور پھینک دیا۔ اُس نے اپنا خونخوار جبڑا کھولا اور بڑے بڑے نوکیلے دانت میرے نرخرے میں گاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے اُس کے جبڑے پر کراٹے کی ضرب لگانا چاہی مگر اُس نے سر جھُکا لیا۔ تاہم یہ ضرب اُس کے سر پر پڑی تو وہ بلبلا اُٹھا اور "غزرررگ... غزرررگ گ رر... غزرررگ گ" کی آوازیں نکالنے لگا۔

معاً کہیں دُور سے ڈاکٹر فریدوں کی آواز آتی محسوس ہُوئی۔ "خُدا کے لیے اسے ختم نہ کر دینا سرفروش۔ اسے جان سے نہ مارنا۔ اسے زندہ رہنے دینا!"

ڈاکٹر فریدوں کی اس بات سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ وحشی مخلوق بار بار میرے نرخرے میں دانت گاڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور ڈاکٹر مجھے اُس کو زندہ رکھنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ چکنے سانپ کی طرح بار بار میری گرفت سے نکل جاتا تھا... پھر میں نے وہ کیا جو مجھے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔

میں اُس سے چند قدم دُور ہو گیا۔

وہ وہیں کھڑا مجھے نفرت سے گھُورتا اور غرّاتا رہا۔

میں نے اُسے غچّہ دینے کے لیے اپنا بایاں بازو اُٹھایا۔ وہ میرے بازو کو دیکھنے لگا۔ اچانک میں نے اپنے دائیں پاؤں سے اُس کے جبڑے پر زوردار ٹھوکر لگائی۔ وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس وقت تک میرے جسم پر اُس کے نوکیلے پنجوں سے کافی خراشیں آ چکی تھیں۔ میں نے لپک کر کلہاڑا اُٹھا لیا اور اُسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر فریدوں دوڑ کر بیچ میں آ گیا۔

"ارے ارے کیا غضب کرتے ہو۔ خُدا کے لیے اسے مت مارو۔ یہ تو میری محنتوں کا ایسا انعام ہے جو کبھی میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا... اوہ... کوئی گڑبڑ تو ضرور ہو گئی تھی مگر... مگر اُس گڑبڑ سے قدرت نے کتنا بڑا انعام دے دیا ہے۔"

"انعام؟" میں نے تعجب اور غصّے سے دُہرایا۔ "مگر یہ آیا کہاں سے ڈاکٹر... اور آپ اس خونخوار وحشی کو بچا کیوں رہے ہیں؟"

ڈاکٹر اُس وحشی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور بڑے پیار سے اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے بولا: "یہ کہاں سے آیا ہے میں نہیں جانتا... لیکن یہ ماضی کے اُس دَور سے آیا ہے جب انسان ارتقا کی ابتدائی منزلوں سے گزر چکا تھا۔ یہ انسانی ارتقا کی درمیانی منزلوں کا مظہر ہے۔ لاکھوں سال پہلے ہم اس جیسے یعنی انسان اسی منزل سے گزر رہا تھا۔" وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہُوا اور کہنے لگا: "مگر ہمیں اس کی آمد اور وجود صیغۂ راز میں رکھنا ہو گا۔ یہ انتہائی اہم راز ہے سرفروش جو کسی قیمت پر بھی کسی کو معلوم نہیں

ہونا چاہیے۔ تم سمجھ گئے نا؟ یہ میرا حکم ہے۔"

"آقائے رضا کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے؟" میں نے پُوچھا۔

ڈاکٹر چند لمحے سوچتا رہا... پھر بولا "میرا خیال ہے اُسے تو بتانا پڑے گا مگر اور کسی کو نہیں۔ اب تم یہیں ٹھہرو اور اس کا خیال رکھو۔ میں بے ہوشی کا انجکشن لے کر آتا ہُوں۔ اسے کچھ دیر کے لیے بے ہوش رکھنا پڑے گا ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو خود ہی ختم کر دے... یعنی اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے۔ میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا اور میں اس وحشی کو دیکھنے لگا جو میرا خون پینا چاہتا تھا لیکن اب شکست خوردہ پڑا تھا۔

وہ اپنے بڑے بڑے نتھنوں سے سانس لے رہا تھا اور اُس کے مُنہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ تاہم وہ ساکت پڑا تھا۔ میں نے جس ہاتھ اور پاؤں سے اُسے ضربیں لگائی تھیں اب وہ بُری طرح دُکھنے لگے تھے۔ کمرے میں کمپیوٹر کی وائرنگ جلنے کے ساتھ ساتھ اُس وحشی کی بدبُو بھی پھیلی ہُوئی تھی۔ مجھے ڈاکٹر فریدوں پر حیرت ہو رہی تھی کہ اُسے اپنا کمپیوٹر جل جانے کا ذرا بھی دُکھ نہیں ہُوا بلکہ وہ اس وحشی کو پا کر بے حد خوش تھا۔

میں نے اُسے پاؤں سے چھُو کر دیکھا۔

اُس کے جسم پر پسینے سے گیلے بال، مٹّی سے اَٹے ہُوئے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر فریدوں ایک ٹرے میں ضروری سامان رکھے آ گیا۔ مجھے ڈاکٹر فریدوں پر ہنسی آ گئی۔

"یہ ہنسی کی بات نہیں سرفروش بلکہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ تمہیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔ ہم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ماضی کے اندھیرے دَور سے زمانہ حال میں اس کی آمد سائنس کی بہت بڑی دریافت ہے۔"

"لیکن اب ہمیں کرنا کیا ہے اور یہاں سے کہاں جانا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ میں نے اپنے اختیارات سے کام لیتے ہُوئے سارے عملے کو یہاں سے بھیج دیا ہے تاکہ کسی کو اس نیم انسان کی آمد اور موجودگی کا علم نہ ہو سکے۔ تم ایسا کرو کہ جا کر رضا کو بُلا لاؤ۔ فوراً..."

"اگر آپ اجازت دیں تو پہلے میں اسے ایک گھُونسہ اور جڑتا جاؤں۔" میں نے بھنّا کر کہا۔

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس وحشی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا جو سب سے پہلے اُسی کو مارنا چاہتا تھا اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ ڈاکٹر فریدوں کا خون پی چکا ہوتا۔

★★

جب میں اور آقائے رضا کمپیوٹر چیمبر میں پہنچے تو ڈاکٹر فریدوں پیمائشی فیتے سے اس وحشی مخلوق کے مختلف اعضا ناپ کر ایک رجسٹر میں لکھتا جا رہا تھا۔ وہ آقائے رضا کو دیکھتے ہی خوشی سے چہک کر بولا: "دیکھو رضا۔ قدرت نے ہمیں بن مانگے کتنے بڑے انعام سے نواز دیا ہے!"

آقائے رضا نے استہزائیہ تبسّم سے کہا: "یہ انعام کس باغِ حیوانات کی زینت بنایا جائے گا؟"

"باغِ حیوانات!" فریدوں نے حقارت سے جواب دیا: "تم چڑیا گھر کی بات کرتے ہو رضا؟ اگر میرا بس چلتا تو میں اسے تم سے بھی چھُپا لیتا۔ اب اسے کوئی چوتھا آدمی نہیں دیکھ سکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں چوتھے آدمی یعنی وزیرِ اعظم کو تو اس کے درشن کروانا ہی پڑیں گے ورنہ تم نہ تو کمپیوٹر کی تباہی کا کوئی جواز بتا سکو گے اور نہ ہی اپنے تجربات کے لیے مزید سرمایہ حاصل کر سکو گے۔"

آقائے رضا کی یہ بات ڈاکٹر فریدوں کی سمجھ میں آ گئی چنانچہ رات کے بارہ بجے جب وزیرِ اعظم تشریف لائے تو وہ انسان نما جانور ایک چھوٹی سی کھاٹ پر بے ہوش پڑا تھا اور لمبے ربر کی نلکیوں کے ذریعے غذا دی جا رہی تھی۔

"یہ کیا بلا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟" وزیرِ اعظم نے پُوچھا۔

"یہ ہزاروں سال پہلے کا انسان ہے جنابِ والا اور میں نے وقتی طور پر اس کا نام غزرگ تجویز کیا ہے کیونکہ یہ ہر وقت غزرررگ رر... غزرررگ رر کرتا رہتا ہے۔ غزرگ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ذریعے سائنس دانوں کو انسانی ارتقا کی گمشدہ کڑیاں مل جائیں گی۔ اس لیے میں اپنی تحقیق مکمل ہونے تک اسے سب سے چھُپا کر رکھنا چاہتا ہُوں۔"

...اور اس نے جو کچھ وزیرِ اعظم سے کہا تھا وہی کیا بھی تھا۔

سب سے پہلے مجھے غزرگ کو اُٹھا کر دُوسرے تہ خانے میں لے جانا پڑا کیونکہ وہ اتنا وزنی تھا کہ نہ تو ڈاکٹر اُسے اُٹھا سکتا تھا اور نہ ہی آقائے رضا... غزرگ سے اتنی بدبُو خارج ہو رہی تھی کہ میں اُسے تہ خانے میں چھوڑنے کے بعد سیدھا باتھ رُوم میں گیا اور بڑی دیر تک نہاتا رہا... مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی بدبُو میرے مساموں میں رچ گئی ہو۔

ڈاکٹر فریدوں کو غزرگ کیا ملا کہ وہ سب کچھ بھُول گیا۔ اُسے نہ تو اپنے تن من کی پروا رہی اور نہ ہی کمپیوٹر کا کوئی خیال رہا۔ وہ

نمرگ کے لیے ایک "خصوصی رہائش گاہ" بنوانے میں مصروف ہوگیا اور جب بڑے تہ خانے میں یہ رہائش گاہ تعمیر ہوگئی تو اس نے مجھے اور آقائے رضا کو وہاں پہنچنے کا حکم دے دیا۔

نمرگ حسبِ معمول اپنی کھاٹ پر بے ہوش پڑا تھا۔

ڈاکٹر فریدوں نے تہ خانے میں بنے ہوئے ایک غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ ہے نمرگ کی اور تمھاری رہائش گاہ۔"

"جی؟" میں نے تعجب سے کہا: "میری اور نمرگ کی رہائش گاہ؟"

"ہاں... تم بھی نمرگ کے ساتھ ہی رہو گے۔"

"مگر میں اس بدبو دار وحشی کے ساتھ کیوں رہوں، ڈاکٹر؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں چیخ پڑا اور آقائے رضا نے بھی میری تائید کر دی۔

"یہ قوم اور وطن کی سربلندی کا سوال ہے، رضا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ علمی تحقیق کا معاملہ ہے سرفروش، ذرا غور سے دیکھو۔ میں نے اس تہ خانے میں یہ غار ہی نہیں بنوایا بلکہ یہاں مصنوعی چٹانیں، جھاڑیاں اور چھوٹی سی دلدل بھی موجود ہے۔ میں نے حتی الوسع ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو نمرگ کے لیے نیا اور یکسر اجنبی نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے رہن سہن، عادات واطوار اور حرکات وسکنات کا مطالعہ کر سکوں۔ اگرچہ میں نے اس مقصد کے لیے متعدد خفیہ روزن بھی بنوالیے ہیں جن سے نمرگ پر نظر رکھی جا سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ یہ تم سے کیا اثرات قبول کرتا ہے اور اس کی دماغی صلاحیت کتنی ہے؟ ہماری یہ تحقیق، سائنس کی دنیا میں ایک نیا باب کھول دے گی اور ہماری سربلندی کا باعث ہوگی۔"

"مگر میرے لیے اس کے ساتھ رہنا ناقابلِ برداشت ہے ڈاکٹر۔" میں نے احتجاج کیا۔

"قوم و وطن کی سرخروئی اور برتری کے لیے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں برخوردار۔ ہماری زندگی قوم کی امانت ہے اور پھر... یہ تمھارے لیے زندگی یا موت کا کوئی سوال نہیں کیونکہ تم اس سے زیادہ طاقت ور ہو۔ یہ بہتا ہوگا جب کہ تمھارے پاس ایک مضبوط ڈنڈا ہر وقت موجود رہے گا۔ میں تمھیں پستول رکھنے کی بھی اجازت دیتا مگر خطرہ ہے کہ کہیں تم اشتعال میں آکر نمرگ کو مار نہ ڈالو۔"

اگرچہ میں نے اور آقائے رضا نے کافی احتجاج کیا۔ مگر ڈاکٹر فریدوں اپنی بات پر اڑا رہا۔ دراصل اس نے بالا ہی بالا وزیرِ اعظم سے اس سلسلے میں منظوری بھی لے لی تھی۔ میں موت سے نہیں ڈرتا کہ موت تو برحق ہے لیکن نمرگ کے ساتھ مستقل قیام اور اس کی ناقابلِ برداشت بدبو ایک عذاب تھا جو مجھے برداشت کرنا ہی پڑا۔

غار میں ایسے خفیہ روزن بھی بنے ہوئے تھے جن سے تازہ اور سرد ہوا مسلسل آتی رہتی تھی۔ غار کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا الاؤ روشن کر دیا گیا تھا مگر غار کے باہر بالکل اندھیرا تھا۔ پھر ڈاکٹر فریدوں نے باہر لاؤڈ اسپیکر چھپا کر نصب کروائے تھے جن سے حسبِ ضرورت کام لیا جا سکتا تھا۔ ان اسپیکرز کو مختلف ٹیپ ریکارڈرز سے مربوط کر دیا گیا تھا۔

یہ سارے انتظامات دکھانے کے بعد ڈاکٹر نے کہا: "میں نے متعدد روزنوں میں مووی کیمرے بھی فٹ کر دیے ہیں۔ ان لمحات کی عکاسی بے حد ضروری ہے جب نمرگ ہوش میں آکر ماحول کا جائزہ لے گا۔ تب میں ٹیپ ریکارڈرز آن کر دوں گا جن سے خوفناک آوازیں آئیں گی۔ بادلوں کی گھن گرج بھی سنائی دے گی اور درندوں کی دھاڑیں بھی آئیں گی۔ تب یہ وحشی اس غار کو ہی اپنے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ سمجھے گا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہے گا۔"

"اور اگر وہ دبک کر نہ بیٹھا رہا تو؟" میں نے سوال کیا: "اس نے مجھ پر حملہ کر دیا تو؟"

"تب تم خود ہی اس سے نمٹ لینا۔ پہلے بھی تو تم اسے ہلاک کیے بغیر نمٹ ہی چکے ہو۔" ڈاکٹر نے کہا: "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھوکا ہوگا اور بھوک میں حملہ آور بھی ہو سکتا ہے مگر میں نے اس کے لیے گوشت کا انتظام کر دیا ہے۔"

"ہاں ڈاکٹر۔" آقائے رضا نے کہا: "سرفروش کا گوشت اس کے لیے خاصا لذیذ ثابت ہوگا۔"

"تم ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو رضا۔ میں نے تازہ گوشت منگوا رکھا ہے۔ جب نمرگ ہوش میں آئے گا تو سرفروش دوستی اور خیرسگالی کے اظہار کے لیے اسے وہ گوشت پیش کرے گا۔ جلو اب نمرگ کو اٹھا کر غار میں لٹا دو سرفروش۔" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے نمرگ کو غار میں لٹا دیا اور کھال کا بنا ہوا وہ لباس پہن لیا جو ڈاکٹر فریدوں نے میرے لیے تیار کروایا تھا۔ اس لباس میں بلاشبہ میں ایک گوریلا ہی نظر آتا تھا۔ غار اور اس کے باہر کا ماحول مجھے بار بار "دس لاکھ سال پہلے" نامی ایک فلم کی یاد دلا رہا تھا۔

ڈاکٹر فریدوں نے ٹیپ ریکارڈرز ٹیسٹ کیے اور باہر جا کر ایک خفیہ روزن سے جھانکنے لگا۔ آقائے رضا بھی ایک سوراخ سے نمرگ اور میری پہلی ملاقات کا منظر دیکھنے کا منتظر تھا مگر نمرگ ابھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔

میں بھینسے کی تازہ کھال میں گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے

لیے بیٹھا رہا۔ بالآخر ڈیڑھ گھنٹے بعد نمرگ کے جسم میں جنبش ہوئی اور وہ ہلنے جلنے لگا۔ ڈاکٹر فریدوں نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیے اور... لاؤڈ اسپیکرز پر جھینگروں اور دوسرے حشرات الارض کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر اژدہوں کی پھنکار اور درندوں کی دھاڑیں بلند ہوئیں تو نمرگ نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے یہ آوازیں سننے لگا...

پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارے، اپنے بال نوچے اور چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلتا ہوا الاؤ کے قریب آگیا۔

جوں جوں درندوں کے لڑنے کی آوازیں بڑھیں، نمرگ کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ وہ سیدھا کھڑا ہوگیا... پھر آہستہ آہستہ غار کے دہانے کے قریب آیا اور کان لگا کر سنتا رہا۔ اتنے میں اس کی نگاہ لکڑیوں کے ڈھیر پر جا پڑی۔ اس نے کچھ لکڑیاں اٹھائیں اور انھیں الاؤ میں جھونک دیا۔ شعلے بڑھے تو وہ ان کی روشنی میں ادھر ادھر یوں دیکھنے لگا جیسے اسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ غالباً وہ اپنا کلہاڑا ڈھونڈ رہا تھا مگر جب کلہاڑا اسے نہ ملا تو وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارنے اور بال نوچنے لگا۔ اس کی غراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ جھنجلا رہا ہے۔

میں غار کے باہر اندھیرے میں چھپا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

یکایک ڈاکٹر فریدوں نے سرگوشی کی: "جاؤ سرفروش۔ وہ زیادہ جھنجلا گیا تو کہیں کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔"

میں نے نمرگ کی طرف دیکھا۔ اس نے یوں کان کھڑے کر رکھے تھے جیسے یہ سرگوشی سن چکا ہو۔ پھر وہ یوں تن کر کھڑا ہوگیا جیسے کسی ان دیکھے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

میں ایک ہاتھ میں گوشت اور دوسرے میں پکڑا ہوا ڈنڈا فرش پر مارتے ہوئے غار کی طرف بڑھنے لگا۔ نمرگ ڈنڈے کی آواز سے چوکنا ہو کر چند قدم پیچھے ہٹا اور غرانے لگا۔ اگرچہ اس کی یہ حرکت صاف بتاتی تھی کہ وہ خوف زدہ ہے مگر اس کی تیز ہوتی ہوئی غراہٹ اور بار بار آگے پیچھے ہونے والا سر اس کے غصے کا مظہر بھی تھا۔

میں کن انکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا الاؤ کی طرف بڑھا اور ڈنڈا سیدھے ہاتھ میں تھام کر اس طرح روشنی میں کھڑا ہوگیا کہ وہ ڈنڈے کو بخوبی دیکھ سکے۔

نمرگ اپنی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ اس کا سر مسلسل آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا مگر گوشت کی بو پا کر اس کی غراہٹ بدل گئی تھی۔

میں نے اس کی غراہٹ غور سے سنی اور پھر بالکل اسی طرح خود بھی غرانے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ بہت زیادہ ڈر گیا یا اس نے اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ طاقت ور سمجھا تو یقیناً مجھ پر حملہ کر دے گا ورنہ اسے سدھانا مشکل نہ ہوگا۔

میں نے اسی طرح اپنا سینہ کھجاتے ہوئے ڈنڈا پھینک دیا اور آہستہ آہستہ "نمرررگ۔ نمرررگ" کہنے لگا۔

یہ اگرچہ ایک احمقانہ سی حرکت تھی.. مگر اس میں ایک پکار اور ایک بلاوا سا تھا جیسے کوئی پچکار پچکار کر کسی بچے کو بلاتا ہے۔

نمرگ نے ایک بار ڈنڈے کو اور پھر میری طرف دیکھا۔

چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔

اچانک اس کی غراہٹ میں نرمی آگئی۔

میں نے جھول سے گوشت کا ایک لوتھڑا نکال کر اسے دکھایا اور مسلسل بولتا بھی رہا۔

نمرگ کے نتھنے پھڑکنے لگے اور اس کی باچھوں سے رال ٹپکنے لگی۔ اچانک اس نے اپنا ہاتھ یوں بڑھا دیا جیسے گوشت مانگ رہا ہو۔ ساتھ ہی اس کی غراہٹ ایک مخصوص لفظ میں ڈھل گئی۔ اب وہ "نمرررگ نمرررگ" کی بجائے "نمرواہ... نمرواہ" کہہ رہا تھا۔

میں نے بھی یہی لفظ دو تین بار دہرایا اور گوشت کا ٹکڑا اس کی طرف اچھال دیا۔ نمرگ نے اسے ہاتھوں میں دبوچا اور لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف بڑھا، ایک نوکدار لکڑی منتخب کی، گوشت کا ٹکڑا اس میں پرویا اور بھوننے کے لیے الاؤ پر رکھ دیا۔

اس کی یہ حرکت صاف بتاتی تھی کہ وہ جانوروں کی حدود سے نکل کر انسانی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ میں نے اس روزن کی طرف دیکھا جس سے ڈاکٹر فریدوں جھانک رہا تھا۔ خوشی کے مارے اس کی باچھیں کانوں تک کھلی ہوئی تھیں۔

اگرچہ نمرگ نے مجھ سے گوشت مانگ لیا تھا مگر ابھی اسے مجھ پر پوری طرح اعتماد نہیں ہوا تھا۔ وہ مسلسل میری طرف دیکھے جا رہا تھا اور اس نے الاؤ کو حدِ فاصل بنا لیا تھا۔ جب گوشت کا وہ پارچہ بھن گیا تو اس نے جلدی سے اسے لکڑی سے نکالا اور دو ہی لقموں میں چٹ کر گیا۔

میں نے دوسرا پارچہ اس کی طرف اچھال دیا۔

اس نے بھوننے والا عمل دہرایا.. مگر اب کے اس نے پارچے کے تین لقمے کیے پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے غرایا: "نمرررنا۔ نمرررنا۔"

میں نے بھی اس کی نقل کی تو اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور اپنے سینے کے بالوں کو ٹٹولنے لگا۔

اتنے میں غار کے باہر لاؤڈ اسپیکرز پر پھر درندوں کی

دھاڑیں گونجنے لگیں۔ مُرگ خوفزدہ ہوگیا۔ اُس نے مجھ سے نگاہیں ہٹا کر باہر کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹنے لگا۔

میں غار کے دہانے کی طرف بڑھ کر ہوا میں مُکا لہراتے ہوئے چلّایا جیسے درندوں کو للکار رہا ہوں۔ مگر جب درندوں کے آنے کی بجائے اُن کی آوازیں بھی معدوم ہوگئیں تو میں نے مُرگ کی طرف پلٹ کر دیکھا تاکہ اُس کا ردِ عمل معلوم کرسکوں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اپنے ہاتھ باندھے یُوں مُنہ کھولے کھڑا ہے جیسے ہنس رہا ہو۔

اُس کی غرّاہٹ "ہاہ ہاہ ہاہ" پر مشتمل تھی۔ کبھی کبھی وہ خوشی سے اُچھل بھی پڑتا تھا۔

"مان گئے نا اُستاد۔ اب تمھاری میری خوب نبھے گی مگر تمھیں میرے ساتھ دوستی کرنا پڑے گی مُرگ۔" میں نے کہا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کچھ سمجھ بھی رہا ہے یا نہیں مگر میں مُنہ آئی بکتا رہا اور اشاروں سے سمجھاتا رہا کہ کوئی ادھر آیا تو اُس کی گردن مروڑ دوں گا۔ پھر میں اپنے ڈنڈے کی طرف بڑھا جو تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر مُرگ فوراً چوکنا ہوگیا۔ اُس کا قہقہہ غرّاہٹ میں بدلا اور نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔

میں بڑی نرمی سے بولتا رہا: "مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ مُرگ۔ ہم ایک دُوسرے کے دوست ہیں اور میں اپنی دوستی کا ثبوت دینا چاہتا ہوں۔ بس تم آرام سے میری طرف دیکھتے رہو۔"

... مگر مُرگ اطمینان سے دیکھنے کی بجائے زور زور سے سینہ کوبی کرنے لگا۔

جُونہی میں نے ڈنڈا اُٹھایا، وہ الاؤ سے دور ہٹ کر کونے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ مجھ سے بُری طرح خوفزدہ تھا۔ مگر میں نے اُس پر توجہ دیے بغیر ڈنڈے کو گھٹنے پر مار کر دو ٹکڑے کیا اور الاؤ میں پھینک دیا۔

مُرگ کی غرّاہٹ اور بے چینی ایک دم دُور ہوگئی۔ وہ بڑے تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے مُرگ سے بے نیازی برتتے ہوئے جھولی سے گوشت کا ایک پارچہ نکالا اور اُسی مُرگ والی لکڑی میں پرو کر اُسے آگ پر رکھ دیا۔ باہر پھر ویسی ہی خوفناک آوازیں گونجنے لگیں۔

مُرگ پہلے تو ڈرا... مگر پھر آہستہ آہستہ الاؤ کے قریب آگیا۔ اتنے میں وہ پارچہ بھی بھُن گیا تھا جسے میں نے الاؤ میں رکھا تھا۔ میں نے اُسے لکڑی سے نکالا اور پھُونکیں مار مار کر ٹھنڈا کرتے ہوئے کھانے لگا۔ اس دوران میں نے مُرگ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید بھُنتے ہوئے گوشت کی خوشبُو نے پھر اُس کی اشتہا جگا دی تھی۔ وہ پھر اسی انداز میں غرّانے لگا جیسے گوشت طلب کر رہا ہو۔

میں نے جھولی سے گوشت کا ایک پارچہ نکالا مگر اُسے اُچھالنے کی بجائے ہاتھ میں پکڑے پکڑے اُس کی طرف بڑھا دیا۔

مُرگ نے جھجکتے ہوئے دو تین بار ہاتھ بڑھایا۔ واپس کھینچ ... پھر اُس نے وہ پارچہ جھپٹ ہی لیا۔

ایک لمحے کے لیے اُس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھُو گئیں تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں نے سردی میں کسی ٹھٹھرے سانپ کو چھُو لیا ہو۔

مُرگ وہ پارچہ بھُوننے لگا۔

میں کھاتا اور خواہ مخواہ کی بکواس کرتا رہا۔ اس دوران مُرگ نے اپنی توجہ مجھ سے ہٹالی اور کچا پکا پارچہ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ جب وہ اپنا پیٹ بھرنے سے فارغ ہوگیا تو میں اُٹھا، بڑے زور سے ایک جماہی لی اور جھولی اُٹھا کر غار سے باہر جانے لگا۔

ڈاکٹر فریدوں نے ایک بار پھر حشرات الارض والے ٹیپ چلانے شروع کر دیے تھے۔

مُرگ بھی اُٹھ کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اُس کے حلق سے "غزمرد... غزمرد" قسم کی آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔

میں نے غار کے دہانے پر مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے بُلانے لگا۔

میں اُس کی طرف بڑھ گیا۔

مُرگ جو اَب تک الاؤ کی دُوسری جانب ہی رہا تھا، آگے بڑھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ میرے قدموں سے لپٹ گیا۔ اُس نے میرے ساتھ دوستی کرلی تھی۔ میں نے جھولی میں پڑے ہوئے گوشت کے دونوں پارچے اُسے دے دیے۔ وہ خوشی کے مارے اُچھلنے اور "مُرہاہاہا۔ مُرہاہاہا" کرنے لگا۔

●

آیندہ چند روز میں مُرگ کے ساتھ اُسی غار میں گزارے۔ اب وہ میرے اشارے اور میں اُس کی غرّاہٹیں سمجھنے لگا تھا۔

اس دوران ہمیں اندازہ ہوگیا کہ اُس میں دماغی صلاحیت برائے نام ہی ہے۔ اُسے اب تک یہی پتہ نہیں چلا تھا کہ آخر اتنے عرصے سے غار کے باہر رات کا اندھیرا کیوں چھایا ہُوا ہے۔ اُس پر اس سارے عرصے میں یہی تاثر رہا کہ باہر رات ہے اور رات کو باہر نکلنا خطرناک ہوتا ہے۔ گویا یہ غار ہی اُس کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ہے جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔ جونہی الاؤ مدھم

پڑنے لگتا، وہ اُٹھ کر چند لکڑیاں اُس میں جھونک دیتا۔

جب میں وقتِ مقررہ پر گوشت کا راشن لینے کے لیے غار سے باہر نکلتا تو وہ غار کے آخری حصّے میں ایک جگہ بیٹھ جاتا اور میرا انتظار کرنے لگتا۔

● اس دوران ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کی مرمت کرلی تھی۔

"وہ کمپیوٹر سیٹ کرچکا تھا... مگر وہ تمھیں ماضی کے سفر پر بھیجنے کی بجائے مُرگ میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔" آقائے رضا نے ملنے پر مجھے بتایا۔

"اگر آپ نے مجھے اس غار اور مُرگ سے نجات نہ دلائی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں برخوردار۔ میں پہلے ہی وزیرِ اعظم سے مِل چکا ہوں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر فریدوں سے کہا ہے کہ وہ بِلا تاخیر تمھیں اور مُرگ کو ماضی کے اسی دور میں منتقل کردے کیونکہ مالیاتی مجلس اور شاہ ان تجربات کا نتیجہ دیکھنے کے منتظر ہیں۔ چونکہ مُرگ تم سے کافی مانوس ہوگیا ہے اس لیے وہ اپنے دَور اور دُنیا میں تمھارا مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر فریدوں نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لینا چاہا پھر اُسے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ بس اب ایک دو روز کے اندر ہی تمھیں مُرگ کے دَور میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

اُسی رات ڈاکٹر فریدوں نے جو گوشت بھجوایا، اُس میں نشہ آور دوائیں ملی ہُوئی تھیں اور مجھے وہ گوشت کھانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ مُرگ کو کمپیوٹر چیمبر میں لانے سے پہلے بے ہوش کر دینا چاہتا تھا تاکہ مُرگ ڈر کے مارے یا گھبرا کر کوئی توڑ پھوڑ نہ کر بیٹھے۔

دُوسری صُبح مجھے مُرگ کو اُٹھا کر کمپیوٹر چیمبر لے جانا پڑا۔

ڈاکٹر فریدوں بے حد اُداس تھا۔ مُرگ کی واپسی پر اُس کی کیفیت ایسی تھی جیسے کسی سے اُس کی محبُوبہ ہمیشہ کے لیے چھینی جارہی ہو۔ وہ بار بار ٹھنڈی سانس لیتا اور کہتا: "ہائے۔ تم نے میرے ساتھ بڑی دُشمنی کی ہے، رضا۔ اگر تم وزیرِ اعظم سے نہ ملتے تو مُرگ نہ جاتا۔ یہ سب تمھاری سازش کی وجہ سے ہُوا ہے۔"

"مگر تم جب چاہو مُرگ کو واپس بُلا سکتے ہو ڈاکٹر۔" آقائے رضا نے مُسکرا کر کہا۔

"نہیں۔ مُرگ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ سرفروش کو تو اس لیے واپس بُلایا جاسکتا ہے کہ اس کے دماغ پر سائنسی عمل کیے جاچکے ہیں مگر مُرگ کا دماغ نہ انسان کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی اس پر سائنسی عمل کیے جاسکتے ہیں۔"

بہرکیف ڈاکٹر فریدوں کو دل پر پتھر رکھنا ہی پڑا اور مُرگ کو میرے ساتھ الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیا گیا۔ وہی سارے عمل دُہرائے گئے جو اس موقعے پر کیے جاتے تھے۔ پھر ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کا سُرخ سوئچ آن کر دیا۔ مجھے اور مُرگ کو برقی جھٹکا لگا۔

مجھے درد کی شدت میں اتنا ہی محسوس ہُوا کہ میں مُرگ بن گیا ہوں اور مُرگ ایک گرد ہے... پھر ہم دونوں پاش پاش ہو کر فضائے بسیط میں تحلیل ہوگئے۔

✸ تجربے نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ جب کمپیوٹر ماضی کے کسی دَور میں منتقل کرے تو میں کچھ دیر تک ساکت پڑا رہوں اور جب تک ماحول کا اچھی طرح جائزہ نہ لے لوں اپنی جگہ سے خفیف سی حرکت بھی نہ کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ایک دلدلی قطعے پر جھاڑیوں کے درمیان، زمین پر منہ کے بل لیٹے پایا تو پتہ چلا کہ میرے نیچے اور سامنے گھاس لہلہا رہی ہے مگر اس گھاس کا رنگ سبز نہیں بلکہ سُرخ ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا تو ہر طرف اس عجیب سی گھاس کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے سُرخ گھاس کا ایک سمندر ہے جو چاروں طرف پھیلا ہُوا ہو... پھر یکایک کہیں قریب سے دو مہیب درندوں کی خوفناک آوازیں آنے لگیں جیسے وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر دھاڑ رہے ہوں۔

چند لمحے بعد اُن درندوں میں لڑائی ہونے لگی اور اُن کی خوفناک آوازوں سے غیظ و غضب کی ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

اچانک ایک درندے کی آواز موت کی چیخ بن کر فضا میں گونجی جیسے دوسرے درندے کی فاتحانہ دھاڑ نے نگل لیا پھر ماحول پر ایک عجیب سا پُراسرار سناٹا چھا گیا۔

ان آوازوں نے مجھے ڈاکٹر فریدوں کے ٹیپ ریکارڈرز کی یاد دلا دی اور اس کے ساتھ ہی مجھے نرگ یاد آگیا۔ اُسے بھی تو میرے ساتھ ہی ماضی کے اِس دَور میں منتقل کیا گیا تھا... مگر وہ اس وقت کہاں ہے؟ کیا وہ کسی دوسرے دَور میں چلا گیا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر کمپیوٹر نے ہمیں، نرگ کے دَور اور دُنیا کی بجائے ماضی کے کسی دوسرے دَور میں بھیج دیا ہو تو وہ میرے کس کام کا؟ وہ تو اُلٹا میرے لیے مصیبت ہی بن جائے گا۔

میں اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

لمبی لمبی گھاس کے اس سمندر میں مجھے نرگ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے آفتاب غروب ہونے والا ہو اور شام اُترنے والی ہو۔

معاً مجھے اپنے بائیں جانب دَھب دَھب کرتے کسی دوڑتے ہوئے جانور کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دائیں جانب سے سانپ کی سی تیز پھنکار کی آواز بھی آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی اور موت کا دوسرا کھیل شروع ہونے والا ہو۔

میں مارے خوف کے وہیں منجمد سا ہو کر رہ گیا۔

اگلے ہی لمحے کسی نے میرے بازو پر زور سے لکڑی ماری۔

میں نے جلدی سے لکڑی تھام لی اور پلٹ کر دیکھا۔ لکڑی کا دوسرا سرا نرگ کے ہاتھ میں تھا وہ خونخوار انداز میں غرّانے لگا۔

میں نے جھٹکے سے لکڑی چھین لی۔

نرگ مجھ پر جھپٹا اور اپنے نوکیلے دانت میری گردن میں گاڑ دینا چاہے۔ مگر میں نے بڑے زور سے اُس کے ماتھے پر مُکا مارا تو وہ چکرا کر گر پڑا۔

میں اُس پر لکڑی سے حملہ کرنے ہی والا تھا، مجھے یاد آگیا کہ اُس کی دماغی صلاحیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے وہ مجھے اس نئے ماحول اور نئے دَور میں بھول چکا ہو گا۔ لہٰذا اُسے ایک بار پھر "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" والا سبق دینا پڑے گا۔ چنانچہ جونہی نرگ کے حواس بحال ہوئے اور اس نے آنکھیں کھولیں، میں نے اُسے مارنے کے لیے لکڑی بلند کی۔ وہ فوراً میرے قدموں سے لپٹ گیا۔

اُس نے ایک بار پھر طاقت کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے ویسی ہی آواز نکالی جیسی کہ نرگ بھُوک کا اظہار کرنے کے لیے غار میں نکالا کرتا تھا وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ایک طرف اشارہ کرنے لگا۔

میں نے بھی لکڑی سے اُسی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُسے اُدھر بڑھنے کے لیے ٹھوکا دیا تو وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کی حرکتوں سے اندازہ ہوتا تھا جیسے یہ جگہ اس کی دیکھی بھالی ہو... اور اِس کا مطلب تھا کہ کمپیوٹر نے ہمیں واقعی اُسی کے دَور میں منتقل کیا ہے۔

نرگ تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ اُسے تو گھاس میں چلنے سے کوئی تکلیف محسوس نہ ہُوئی جبکہ میرے جسم پر جگہ جگہ خراشیں آگئیں۔ یہ گھاس درانتی کی مانند کاٹ رکھتی تھی۔ پھر ایک جگہ وہ گھاس زمین پر بچھی دکھائی دینے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس ٹکڑے پر کسی نے گھاس کو روند کر زمین پر بچھا دیا ہو۔ اس قطعے کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا چشمہ اُبل رہا تھا۔ یہ چشمہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہاں جانور پانی پینے اور آرام کرنے کے لیے آتے ہوں گے اس لیے گھاس زمین پر بچھ گئی ہے۔

نرگ چشمے پر پانی پینے لگا اور پھر وہ چشمے میں لیٹ گیا۔ شام سر پر آ رہی تھی اس لیے میں نے اُسے ٹھوکا دیا اور بھُوک یاد دلائی تو وہ بادلِ نخواستہ چشمے سے نکلا اور میری رہنمائی کرنے کے بجائے ایک جانب جا کر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے مجھے قریب آنے اور دیکھنے کا اشارہ کیا۔

میں اُس کے قریب جا کر اُدھر دیکھنے لگا۔

کچھ فاصلے پر مجھے گھاس کے درمیان ایک راستہ سا دکھائی دیا اور یہ راستہ دُور اُن پہاڑیوں تک چلا گیا تھا جن کی چوٹیوں پر جگہ جگہ دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پہاڑیاں وہاں سے ایک میل دُور ہوں گی۔ یہ دُھواں آگ کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ آگ، درندوں سے حفاظت کے لیے جلائی گئی ہو گی۔ ممکن ہے وہاں نرگ کے بھائی بند رہتے ہوں۔ اگر ہم وہاں پہنچ جائیں تو ہمیں خوراک اور پناہ مل جائے گی۔

میں نے مسکراتے ہوئے نرگ کی طرف دیکھا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو نرگ ہنس پڑا "نرہاہاہا۔ نرہاہاہا"۔ اور پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے اُچھلنے لگا پھر وہ میری رہنمائی کے لیے آگے آگے چل دیا۔ مجھے آغائے رضا کی بات یاد آگئی۔ نرگ واقعی اپنے دَور اور دُنیا میں میرا مددمعاون ثابت ہو رہا تھا اب وہ تیزی سے اس راستے پر پہاڑیوں کی طرف اُچھلتے ہُوئے بڑھ رہا تھا۔ میں اس سے تقریباً پچاس قدم پیچھے تھا کہ اچانک ایک جگہ زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور میں ریت کی دلدل میں اُترتا چلا گیا۔ صورتِ حال کا احساس ہونے تک میں کمر تک ریت میں دھنس چکا تھا۔

میں نے نرگ کو آواز دی تو وہ پلٹ کر میرے قریب آگیا۔

اب مجھے پتہ چلا کہ وہ اُچھل اُچھل کر راستہ کیوں طے کر رہا تھا۔ ... یہ راستہ ریت کی دلدل سے گزرتا تھا۔ اس لیے جہاں دلدل آتی تھی، وہ اُچھل کر اُسے پار کر لیتا تھا۔

میں سخت ترین مشکل حالات میں بھی گھبرایا نہیں کرتا مگر اس طرح ریت میں دھنس کر بے بسی سے جان دینا بھی مجھے منظور نہیں تھا۔ میں نے نرگ کی طرف دیکھا تو مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشیانہ چمک ناچتی دکھائی دی۔ میں اپنے آپ کو ریت سے نکالنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اِس طرح اور زیادہ تیزی سے اس میں دفن ہوتا چلا جاتا۔ نرگ بھی میری بات نہیں سمجھ رہا تھا اور ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

... پھر ایک ترکیب میری سمجھ میں آگئی۔

میرے دونوں ہاتھ ابھی تک ریت سے باہر تھے۔ میں نے وہی لکڑی نرگ کی طرف بڑھائی جو اُس نے میرے بازو پر ماری تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لکڑی پکڑ کر کھینچے گا تو میں دلدل سے نکل آؤں گا مگر اپنی طرف اُٹھی ہُوئی لکڑی دیکھ کر وہ بُری طرح بدکا اور پیچھے ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا... پھر اُس نے زمین پر پڑے کچھ چھوٹے چھوٹے پتھر اُٹھائے اور مجھے مارنے لگا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ نرگ کے بھائی بند اپنے شکار کو گھیر گھار کر یہاں اپنے پیچھے لگا کر اِدھر ہی لے آتے ہوں گے اور جب وہ اس دلدل میں پھنس جاتا ہو گا تو اُسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے ہوں گے۔

نرگ کا پھینکا ہُوا پہلا پتھر میرے کندھے پر لگا۔ میں نے اُسے لکڑی سے ڈرایا تو نرگ دو قدم پیچھے ہٹا اور اس نے دوسرا پتھر کھینچ مارا۔ اگر میں جلدی سے سر نہ جھکاتا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی۔ تیسرا پتھر میرے سامنے ریت میں گرا اور اس سے پہلے کہ وہ گہرائی میں اُتر جاتا۔ میں نے ٹٹول کر اُسے نکال لینا چاہا مگر اُسے تلاش نہ کر سکا۔ میں نے نرگ کی طرف دیکھا، وہ چوتھا پتھر مارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں بھی تیار ہو گیا اور جونہی پتھر میرے قریب آیا، میں نے اسے دبوچ لیا۔

نرگ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے وہ پتھر کھینچ مارا جو اس پیٹ میں جا لگا۔ نرگ دَرد کے مارے بلبلا اُٹھا اس نے باقی ماندہ پتھر پھینک کر اپنا پیٹ پکڑ لیا اور پیچھے ہٹنے لگا۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر لکڑی کا نوک دار سرا راستے کی پکی زمین کی طرف بڑھایا تاکہ اگر وہ وہاں گڑ جائے تو میں اُسے پکڑ کر ریت کی دلدل سے نکل آؤں۔ مگر لکڑی ٹھوس زمین سے چند انچ اِدھر ہی رہ گئی۔ میں نے اِدھر کھسکنے کے لیے زور لگایا تو سینے تک ریت میں دھنس گیا۔

اب موت میری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہی تھی اور میں چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ جب مجھے مرنا ہی تھا تو بے بسی سے زندہ دفن ہونے کی بجائے موت سے پنجہ لڑانا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر لکڑی کا نوک دار حصہ ٹھوس زمین میں گاڑنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

لکڑی کا نوک دار حصہ ٹھوس زمین میں گڑ ہی گیا۔

میں آہستہ آہستہ لکڑی پر دباؤ ڈال کر ٹھوس پگڈنڈی کی طرف بڑھنے لگا۔

چند انچ سرکنے کے بعد میں پُوری قوت سے لکڑی پر دباؤ ڈالتا تھا تاکہ وہ مزید گڑ جائے۔ اس طرح بالآخر میں بھُربھُری موت کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس دوران میں نمرگ غائب ہو چکا تھا۔ شاید وہ اپنے بھائی بندوں کو بلانے گیا تھا کہ شکار پھنس چکا ہے۔۔۔ وہ آئیں اور مجھے ریت سے نکال کر میرے گوشت سے ضیافت اڑائیں۔

میں نے اپنے بدن سے ریت جھاڑی لکڑی نکالی اور اُس سے راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اب اُتر تی شام کے مٹیالے اندھیر میں پہاڑیوں پر آگ جلتی دکھائی دینے لگی تھی اور میں جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ابھی میں بمشکل پانچ سو گز ہی گیا تھا کہ مجھے نمرگ کی آواز بلکہ چیخ سنائی دی۔ وہ اپنے بھائی بندوں کو بلانے نہیں گیا تھا بلکہ سامنے والے موڑ کے پیچھے چھپا میری موت و حیات کی کش مکش کا تماشا دیکھ رہا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ موت خود اُسی کی تاک میں ہے۔

میں اُس کی موت کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

چیونٹیاں کھانے والے جانور یعنی مورخور جیسے ایک بہت بڑے جانور نے جس کی زبان کم از کم بیس فٹ لمبی تھی، نمرگ کو اپنی زبان میں لپیٹ رکھا تھا اور اس کی گرفت اتنی سخت ہو گئی تھی کہ نمرگ آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا، پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہڈیاں کڑکڑائیں اور وہ جھرجھرا کر رہ گیا۔ عظیم الجثہ مورخور کی زبان سمٹنے لگی۔۔۔ پھر اس نے جبڑا کھولا اور نمرگ کو نگل گیا۔ وہ خبیث جانور اب مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ اُس کا منہ اژدہے کا سا اور جسم مگرمچھ جیسا تھا۔ وہ پانچ فٹ اونچا اور تقریباً تیس فٹ لمبا تھا۔ وہ ہلے جلے بغیر ہی میری طرف دیکھے جا رہا تھا کہ کب میں بھاگنے کی کوشش میں آگے بڑھوں اور اس کی زبان اسپرنگ کی طرح اچھل کر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لے۔

مجھ پر اس خوفناک بلا نے کپکپی سی طاری کر دی۔ میں نے آج تک اس قسم کی کسی مخلوق کا ذکر کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا۔ اس قسم کے جانوروں کا ذکر تو صرف دیومالائی قصّوں اور کہانیوں میں ہی آتا ہے۔۔۔ لیکن اب پتہ چلا کہ ہر خیال کے پیچھے کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔

میرے لیے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اُس کے سامنے سے کیسے گزروں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی قبیل کی ایک اور بلا گھاس سے برآمد ہوئی۔ دونوں نے اپنی لہراتی ہوئی زبانیں نکالیں اور پھنکارتے ہوئے ایک دوسرے سے معرکہ آرائی میں مصروف ہو گئیں۔ یہ دونوں جانور اپنی زبانوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جکڑ گئے تھے پھر وہ لوٹنے لگے اور ان کی اس زور آزمائی سے زمین تھرتھرانے لگی۔

میں موقع غنیمت جان کر وہاں سے بھاگ اُٹھا۔

نمرگ کا دَور عجیب الخلقت بلاؤں کا دَور ثابت ہو رہا تھا جس نے مجھے بُری طرح دہلا کے رکھ دیا تھا۔ نمرگ جس سے مجھے معاونت کی اُمید تھی، وہ بھی دُشمن نکلا اور مارا گیا تھا۔۔۔ پھر بھی مجھے اس کی موت پر دُکھ ہو رہا تھا۔ اس وقت تک میں دو بار موت کو چکمہ دے کر بھاگ نکلا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ آنے والا وقت میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ تاہم میں پہاڑیوں پر جلتی آگ کو منزل بنا کر بھاگتا چلا گیا۔

میرے پیچھے اب مختلف درندوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میں نے کئی جگہ گھاس میں سرسراہٹ اور پھنکاریں بھی سُنیں مگر ہر آواز میری رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میں گھاس کے سمندر سے نکل آیا۔ اب وہ پہاڑیاں تقریباً پانچ سو گز دُور رہ گئی تھیں جن کے غاروں میں الاؤ جل رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار کم کر دی اور پلٹ کر دیکھا۔ کوئی درندہ یا کوئی بلا اس وقت میرا تعاقب نہیں کر رہی تھی لیکن آگے مجھے کیسے وحشیوں سے پالا پڑنے والا ہے، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

میں دم لینے کے لیے رُک گیا۔

ابھی میری سانس بھی درست نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے کچھ فاصلے پر دھپ دھپ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ہر چند کہ اب شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا مگر اُفق کے پس منظر میں مجھے اُس خوفناک بلا کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا جو ایک اچھے خاصے گھر جتنی بلند تھی۔ اس کے سر پر سینگ تھے اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر سونگھنے کے لیے اپنا منہ اوپر اُٹھا لیتی تھی۔ میں نے کسی شکاری کتے کی طرح دوڑ لگا دی اور پہاڑیوں کے قدموں تک بھاگتا چلا گیا پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بلا بھی کچھ فاصلے پر رک گئی تھی۔ شاید وہ آگ سے خوفزدہ تھی۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ خود ہی پلٹ گئی تو میری جان میں جان آئی اور میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ اس عمل کے ساتھ ہی میرے نتھنوں میں ویسی ہی بدبُو بھی دَر آئی جیسی کہ نمرگ سے آیا کرتی تھی۔۔۔ مگر اس بدبُو میں گوبر اور بھنے جانے والے گوشت کی بُو بھی شامل تھی۔

گوشت کی خوشبو باقی ہر بُو پر غالب آ گئی اور اس نے میری اشتہا بڑھا دی۔ میں ایک غار کی طرف رینگنے لگا۔ چونکہ وہ

رشی اوپر تھے اور ہوا بھی اِدھر سے آ رہی تھی اس لیے وہ میری بُو نہ ونگھ سکے اور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

سب سے پہلے غار کے دہانے کے باہر ایک چھوٹی سی تون نما چٹان کھڑی تھی۔ میں نے اس کی اوٹ لے کر غار کا جائزہ یا۔ الاؤ کے اردگرد مجھے دس ہیولے دکھائی دیے۔ ان کے قد قریباً چار فٹ، ٹانگیں چھوٹی، ہاتھ لمبے اور سر بڑے بڑے تھے۔ ن کی یہ جسمانی ساخت صد فی صد نمرگ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مخلوق نمرگ ہی کی قبیل سے تعلق رکھتی تھی۔ ان دس نمرگوں میں سے چار نر اور چھ مادہ تھیں۔ چاروں نر الاؤ کے اس طرف اور مادہ دوسری طرف تھیں۔ ہر مذکر کے پاس انڈا یا کلہاڑا رکھا ہوا تھا اور ہر چند لمحوں بعد وہ غار کے باہر۔۔ دھیرے میں دیکھتے اور سونگھتے تھے جیسے کسی بھی ناگہانی خطرے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہوں۔ دو عورتیں لکڑیوں میں گوشت کے پارچے پرو کر انھیں بھون رہی تھیں۔ دو بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں اور باقی دو غالباً کھانے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

میرے پاس حملے یا مدافعت کے لیے صرف وہی لکڑی تھی مگر وہ کلہاڑیوں اور ڈنڈوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ میرے لیے غار میں جانا بھی ناگزیر تھا کہ پیچھے جنگل میں بلائیں موت کا روپ دھارے مجھے لقمہ بنانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ بھونے جانے والے گوشت کی بُو نے میری اشتہا کو بہت بڑھا دیا تھا اور اب مجھے سردی بھی لگ رہی تھی۔ میں نے بلا تاخیر غار میں جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں نے وہ لکڑی وہیں پھینک دی کیونکہ وہ ہتھیار ثابت نہیں ہو سکتی تھی دوسرے نمرگ میرے ہاتھ میں لکڑی دیکھ کر فوراً مشتعل ہو جاتے اور خوف یا غصّے میں حملہ کر دیتے مگر نہتا ہونے کی صورت میں شاید وہ حملہ کرنے میں عجلت نہ دکھاتے۔

میں آگے بڑھ کر غار میں داخل ہو گیا اور نمرگ کی وہی غرّاہٹ دُہرانے لگا جو وہ گوشت مانگنے کے لیے حلق سے نکالا کرتا تھا۔ سارے نمرگ میری طرف متوجہ ہو گئے مگر غار میں ایک گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ اپنی جسامت سے دُگنا نمرگ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے تھے ورنہ اُن کے ڈنڈے اور کلہاڑے اُن کی دسترس سے باہر نہیں تھے۔

میں پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ غرّایا تو مادہ نمرگوں میں بھگدڑ سی مچ گئی انھوں نے اپنے بچے اُٹھائے اور بھاگ کھڑی ہوئیں، نر نمرگوں نے بھی اُن کی تقلید کی اور جاتے وقت اپنے ہتھیار اُٹھانا بھی بھول گئے۔ مگر ایک جوان نمرگ جو میرے سامنے تھا وہ نہ بھاگ سکا اور غرّانے لگا۔ میں اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس کی طرف جانے لگا تو دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر الاؤ پھلانگتا ہوا وہ بھی بھاگ نکلا۔

اب میں غار میں تنہا کھڑا تھا۔

نمرگ واپس بھی آ سکتے تھے اور اپنے ساتھ بہت سے بھائی بند بھی لا سکتے تھے اس لیے میں نے جلدی سے ایک کلہاڑا اور ڈنڈا منتخب کیا اور الاؤ کے دوسری طرف بیٹھ کر وہ گوشت کھانے لگا جو بھننے کے بعد ہڑبونگ میں الاؤ کے قریب ہی گر پڑا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کس جانور کا گوشت ہے مگر اس وقت وہ مجھے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم محسوس نہ ہوا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا، پیٹ بھرا تو میری ہمت و قوت بھی لوٹ آئی۔ اب میں ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔

اس وحشی دَور میں آنے کے بعد اگرچہ بدترین وقت گزر چکا تھا مگر میں جانتا تھا کہ درندے کچھ دُور اندھیرے میں اور نمرگ غار کے باہر کھڑے میری جانب دیکھ رہے ہیں۔ درندے خوفناک آوازوں کے ساتھ دھاڑ رہے تھے جبکہ نمرگ خاموشی سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ درندے آگ کے خوف سے اندر نہیں آ سکتے تھے مگر نمرگ نہ صرف اندر آ سکتے تھے بلکہ باہر سے پتھراؤ بھی کر سکتے تھے لیکن یہ رات تو بہر حال مجھے یہاں گزارنا ہی تھی۔ گوشت کھانے کے بعد میں نے پانی کے لیے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر وہاں کوئی برتن نہیں تھا البتہ مجھے کسی جانور کی کھال کا ایک ٹکڑا اور سُوکھی بیلوں کا ایک ڈھیر ضرور دکھائی دے گیا۔ میں نے وہ کھال لنگوٹ کی طرح سُوکھی جنگلی بیل سے باندھ لی۔ ہر چند کہ میں وحشی دَور میں تھا مگر تہذیب میرے لاشعور میں اتنی رچ بس چکی تھی کہ میں ایسا کرنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔

اب مجھے نیند محسوس ہونے لگی مگر یہ نیند مجھے ہمیشہ کے لیے بھی سُلا سکتی تھی اس لیے میں ایک کونے میں بیٹھ کر نیند کو بھگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بار بار اپنی آنکھیں ملتا اور رانوں پر زور زور سے چٹکیاں لیتا تھا لیکن نیند جیسے آنکھوں کی منڈیروں پر آ بیٹھی تھی۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگتیں مگر میں انھیں زبردستی کھول لیتا اور جماہیاں لینے لگتا تھا۔

ایک بار میں نے آنکھیں کھول کر جماہی لی تو یہ دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی کہ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔۔۔ اور مجھے گھور رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں غصّے کی بجائے خوف کی پرچھائیاں

میر رہی تھیں۔

وہ ایک جوان نرگ آئی۔ وہ میری طرف دیکھنے کے ساتھ ساتھ پلٹ کر پیچھے اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی تھی اور بادلِ نخواستہ کچھ آگے بڑھ آتی تھی پھر وہ مجھے اپنی طرف بُلانے لگی۔

اس کی حرکات دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں سمجھ گیا کہ نرگوں نے اسے رشوت کے طور پر بھیجا ہے لیکن پھر میں نے خود ہی اپنی یہ سوچ رَد کر دی کیونکہ نرگ کی ذہنی استعداد میرے سامنے تھی، یہ وحشی مخلوق ابھی انسانوں کی سوچ، بالخصوص اُس گھٹیا سوچ تک نہیں پہنچ سکی تھی جس کے تحت وہ ہمارے دَور اور دُنیا میں اس قسم کی رشوت دیتے لیتے ہیں۔ اس نرگ خاتون کو غالباً پہلی نظر کی محبت کا جذبہ میری طرف کھینچ لایا تھا۔

میں مسکراتا اور اس سے باتیں کرتا رہا۔

وہ میری باتیں تو کیا خاک سمجھتی مگر بڑے پیار سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں کبھی اُس سے پیار بھرے مکالمے بولنے لگتا اور کبھی ڈاکٹر فریدوں کو کوسنا شروع کر دیتا جس نے لالہ رُخ کو مجھ سے برگشتہ کرکے اس وحشی مخلوق کو میری محبت میں مبتلا کر دیا تھا۔

نرگ خاتون کی آمد سے میری نیند اُڑ گئی اور وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا جب غار کے باہر صبح کاذب کا اُجالا پھیلنے لگا تو وہ اُٹھی اور چپ چاپ غار سے باہر چلی گئی۔

میں کچھ دیر وہیں بیٹھا آگ تاپتا رہا اور جب باہر اچھا خاصا اُجالا پھیل گیا تو میں کلہاڑا اور ڈنڈا لیے غار کے دہانے پر پہنچ گیا۔

میرے سامنے تقریباً نصف میل دُور سُرخ گھاس کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑیوں میں جگہ جگہ بنے ہوئے غار شہد کے کسی چھتے کی یاد دلا رہے تھے اور ہر طرف قبرستان کی سی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میں جانتا تھا کہ نرگ اِدھر اُدھر غاروں میں چھپے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہوں گے مگر وہ میرے سامنے نہیں آرہے تھے۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ میرا جی چاہا کہ کسی غار میں جا کر دیکھوں مگر پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ خواہ مخواہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے کیا فائدہ تھا۔

ایک غار کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں رُکنے پر مجبور ہو گیا۔

اس غار کے باہر مجھے سُرخ مٹی کی بنی ہوئی ایک بھدی سی انگیٹھی دکھائی دے گئی۔ اس انگیٹھی کے ساتھ جنگلی بیل کی بٹی ہوئی رسّی بھی بندھی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کانگڑی کی طرح اُٹھایا جا سکتا ہے۔ انگیٹھی کے قریب کچھ بھدے سے آلات بھی رکھے ہوئے دکھائی دیے ان میں کچھ کھُردرے سے پتھر، سوئی کی طرح نوکیلی ہڈیاں، پتھر کی سان اور ہتھوڑے وغیرہ شامل تھے۔ میں نے بیٹھ کر ان اشیا کا جائزہ لیا تو مجھے چقماق کے کچھ ٹکڑے اور چقماق کا بنا ہُوا ایک دو دھاری بھدا سا چاقو بھی نظر آ گیا۔

میں نے چاقو اور انگیٹھی اُٹھا لی۔

انگیٹھی میں راکھ بھری ہوئی تھی۔ میں نے اُسے اُلٹ دیا۔ راکھ میں کچھ انگارے موجود تھے، میں نے انھیں دوبارہ انگیٹھی میں ڈالا اور کانگڑی کی طرح لٹکا کر چل دیا۔ تاہم میں اس غیر معمولی ذہین نرگ کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولا جو اس وحشی اور غیر مہذب دَور میں شاید لوہار کا کام کرتا تھا اور نرگوں کے لیے ہتھیار بناتا تھا اس کی یہ کانگڑی مجھے سردی سے بچا سکتی تھی اور چاقو بھی بوقتِ ضرورت کام دے سکتا تھا۔

میں نے وہیں کھڑے ہو کر اطراف کا جائزہ لیا۔ جنگل میں واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نرگوں میں مزید قیام بھی ناممکن تھا اس لیے میں نے پہاڑیوں کے دوسری طرف جانے کا فیصلہ کر لیا اور چڑھائی چڑھنے لگا جو نصف گھنٹے میں مکمل ہو گئی۔

میں نے پہاڑی کی چوٹی سے نیچے دیکھا۔ میرے سامنے ایک وسیع میدانی علاقہ تھا جس میں جابجا پہاڑی نالوں کی گزرگاہیں دکھائی دے رہی تھیں مگر اُن کے کسی گڑھے میں بھی پانی نظر نہ آیا۔ میں آگے بڑھنے لگا۔

چند گھنٹوں کی مسافت مجھے ایک ایسے جنگل کے کنارے لے آئی جو میرے دائیں بائیں تاحدِ نظر پھیلا ہُوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ شام سے پہلے پہلے بارش شروع ہو جائے گی... مگر اس جنگل میں داخل ہونے سے مجھے ڈر سا لگ رہا تھا کیونکہ وہاں نہ تو پرندوں کی چہکار تھی اور نہ ہی درندوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف ایک مہیب اور بے کراں سناٹا طاری تھا۔ البتہ جب ہَوا درختوں کے بیچ سے گزرتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عورتیں قبروں کے سرہانے کھڑی اپنے پیاروں کی یاد میں سسکیاں لے رہی ہوں۔

میں چلتے وقت بچا کھُچا گوشت بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ کر میں نے وہ گوشت کھایا اور جنگل کے باہر ہی ایک طرف بڑھنے لگا کیونکہ جنگل میں کسی بھی درخت کی اوٹ میں موت گھات لگا سکتی تھی لیکن پھر میں نے جنگل میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا... مگر مشکل یہ تھی کہ جنگل کے کنارے والے درختوں پر عجیب سی گھنی گھنی بیلیں یوں چڑھی ہوئی تھیں جیسے ان کا جال تان دیا گیا ہو۔ سارے درخت اسی جال میں جکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ آخر ذرا ایک جگہ مجھے اندر گھسنے کے لیے ایک چھوٹا سا موکھا مل گیا۔ میں نے کلہاڑے اور چاقو سے بیلیں کاٹیں اور راستہ بناتا ہُوا آگے بڑھنے لگا۔

یوں تو اس گھنے جنگل میں خاصا اندھیرا تھا مگر جب وہ گہرا ہو گیا تو میں نے اندازہ لگایا کہ شام ہو گئی ہے اور اب مجھے سونے کا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔ تھوڑی دُور آگے بڑھنے پر مجھے ایک چھوٹا سا صاف قطعہ اراضی دکھائی دیا۔ میں نے وہیں رات گزارنے کا ارادہ کر لیا۔

اب میرے پاس نہ تو کھانے کے لیے کچھ تھا اور نہ ہی پینے کو پانی تھا... پھر مجھے رات کو آگ جلانے کے لیے خشک لکڑیاں بھی درکار تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے کچھ خشک جھاڑیاں اور درخت دکھائی دے گئے۔ میں ان کی ٹہنیاں کاٹنے کے لیے اُدھر گیا تو مجھے قریب ہی کہیں ایک نالہ بہنے کی آواز آئی۔ میں آواز کی سمت بڑھا تو واقعی مجھے ایک چھوٹی سی ندی دکھائی دی جس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ میں جلدی جلدی نہایا اور پیاس بجھانے کے بعد لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اب میرا رزق کہاں سے اُترے گا۔

جب میں اُس صاف جگہ انگیٹھی جلانے لگا تو مجھے اپنے عقب میں کچھ کھٹکا سا محسوس ہُوا۔ میں نے جلدی سے وہ چقماق والا چاقو نکال لیا مگر اس کا دستہ نہ ہونے کے باعث گرفت مضبوط نہیں رکھی جا سکتی تھی تاہم میں نے اُسے ممکنہ مضبوطی سے تھام لیا۔ اتنے میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی جانور میرے قریب آ گیا ہو۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی کھال سے خارج ہونے والی بُو سے ہُوا تھا۔ میں ایک دم پھرتی سے گھوم گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ نرگ قسم کا کوئی جانور نما آدمی ہوگا مگر وہ ایک خرگوش نکلا تاہم یہ خرگوش بھی جسامت میں چھوٹی سی بھیڑ سے کم نہیں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر نہ تو خوفزدہ ہُوا اور نہ ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی... بلکہ اپنی لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس نے پہلے کبھی مجھ جیسا آدمی نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ نتھنے پھڑکاتا اور سونگھتا ہُوا میرے قریب آ گیا۔ میں نے ایک دم اُسے دبوچ کر اُس کے گلے پر چاقو پھیر دیا۔

میں نے زندگی میں اس سے زیادہ آسان شکار کبھی نہیں کیا تھا۔

خرگوش ذبح کرنے کے بعد میں نے اپنے اِردگرد ایک حلقے میں لکڑیاں پھیلا کر آگ جلا دی تاکہ کوئی جانور اندر نہ آسکے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بہت سی فالتو لکڑیاں بھی رکھ لیں تاکہ یہ اَلاؤ رات بھر جلتا رہے۔ پھر میں نے خرگوش کا کچھ گوشت بھُونا اور پیٹ کی آگ بُجھانے کے بعد ایک خمدار ٹہنی سے سُوکھی بیل باندھ کر بھدی سی کمان بنائی اور بہت سے تیر بھی تراش لیے۔ ان تیروں کا سرا چاقو سے چیر کر میں نے اُن میں چھوٹے چھوٹے چقماق اَٹکا دیے... پھر الاؤ میں مزید لکڑیاں ڈال کر لیٹ گیا۔ اگرچہ جنگل میں اب بھی گمبھیر خاموشی تھی اور مجھے خرگوش کے سوا کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا، تاہم لیٹتے وقت میں نے ایک ہاتھ میں کلہاڑے کا دستہ اور دوسرے میں ڈنڈا تھام لیا تھا۔

لیٹتے ہی مجھے گہری نیند آ گئی۔

... پھر نہ جانے کیا ہُوا کہ مجھے اپنے سارے جسم میں سُوئیاں سی چُبھتی ہُوئی محسوس ہوئیں اور پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھنے اور دَرد کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے شدید کھُجلی بھی ہونے لگی۔ میں نے اپنی پنڈلیاں کھُجانا چاہیں تو مجھے اپنی ٹانگوں سے کچھ لجلجی سی چیزیں چمٹی محسوس ہُوئیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو خوف و دہشت سے میری چیخیں نکل گئیں۔ میرے اَنگ اَنگ سے لجلجی جونکیں چمٹی ہُوئی میرا خون چُوس رہی تھیں۔

میں بڑی تیزی سے انھیں اپنے جسم سے نوچ نوچ کر پھینکنے لگا... مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ پیٹھ سے چمٹی ہُوئی جونکیں نوچنا میرے بس سے باہر تھا اور اب تک وہ میرا اتنا خون پی چکی تھیں کہ مجھے نقاہت کا احساس ہونے لگا تھا۔ اگر میں گزشتہ رات کا جاگا ہُوا اور دن بھر کا تھکا ماندہ نہ ہوتا تو شاید مجھے اتنی گہری نیند نہ آتی۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ درد کی وجہ سے میری آنکھ بروقت کھُل گئی۔

میں نے پیٹھ سے چمٹی ہُوئی جونکوں سے پیچھا چھُڑانے کے لیے اَلاؤ سے جلتی ہُوئی ایک لکڑی اُٹھالی اور اُسے اپنی پیٹھ پر پھیرنے لگا۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہُوئی اور جونکوں سے نجات مل گئی۔

میری پیٹھ پر اتنی جونکیں تھیں کہ جلتی ہُوئی لکڑی سے میری پیٹھ کہیں کہیں سے معمولی طور پر جلی ورنہ جونکیں ہی اس کا شکار ہوتی رہیں۔

مجھے جونکوں پر اتنا زیادہ غصّہ تھا کہ اُنھیں اپنے پیروں تلے روندنے لگا مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ بڑی تیزی سے زمین میں سوراخ کرتی ہُوئی غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ اِن اَرضی جونکوں کا ذکر بھی میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا

اور اب یہ بھی دیو مالائی داستانوں کی مخلوق ہی معلوم ہوتی تھیں۔

میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا تو مجھے اس پر گرمی دانوں کی طرح سینکڑوں نشانات نظر آئے۔ ہر نشان جونکوں کی نشانی تھا۔ میں گرتا پڑتا اس ندی کی طرف بھاگا جہاں میں کل شام نہایا تھا۔ ٹھنڈے پانی نے میرے جسم کی جلن اور خارش تو مٹا دی۔ مگر نقاہت دُور نہ کرسکا۔ یہ نقاہت صرف خوراک ہی ختم کرسکتی تھی۔ گزشتہ رات میں نے جو خرگوش شکار کیا تھا، ابھی اُس کا تین چوتھائی گوشت باقی تھا۔ میں واپس آیا اور اُسے بھوننے میں مصروف ہوگیا۔

پیٹ بھرنے کے بعد میں نے ایک لمبی سی شاخ کے ساتھ چاقو باندھ کر بھدا سا بھالا بنالیا اور خشک بیلیں تلاش کرنے لگا تاکہ اُن کا جھولا بنا کر کسی درخت سے باندھ سکوں اور رات کو اُسی جھولے میں سویا کروں۔

❦

اُس رات، دن بھر کے سفر کے بعد میں جھولے میں سویا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جنگل کسی پہاڑ کی ڈھلان پر واقع ہو۔ اس لیے کہ میرا سفر بتدریج چڑھائی کی طرف جاری تھا۔ گزشتہ تین دن کے دوران اندازاً میں تین ہزار فٹ اونچائی پر پہنچ چکا تھا۔ اسی عرصے میں، میں نے نئے سرے سے تیر کمان اور بھالا بنالیا تھا اور تین خرگوش شکار کیے تھے لیکن اس جنگل میں مجھے کبھی کسی پرندے کی چہکار یا درندے کی دھاڑ سنائی نہیں دی تھی اور قبروں کا سا ہولناک سناٹا میری روح پر بوجھ بنتا جارہا تھا۔ مگر چوتھی صبح میری آنکھ کوؤں کی سی کائیں کائیں سے کھلی۔

میں کائیں کائیں کی ان آوازوں سے بھی خوفزدہ ہوگیا۔ کیونکہ یہ کوؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری، تیز اور سمع خراش تھیں۔ تاہم میں ان پرندوں کو دیکھنے کے اشتیاق میں آنکھیں ملتا ہوا آگے چل پڑا۔

ابھی میں تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ مجھے وہ پرندے نظر آگئے، یہ کوّے نہیں بلکہ بڑی بڑی خمدار چونچوں والے آبی پرندے تھے۔ ایک پرندے کی چونچ میں مجھے خاصی بڑی ایک مچھلی بھی دکھائی دی۔ جب میرے جذبۂ تجسس کی تسکین ہوگئی تو میں ٹھہر گیا اور ایک مقام پر اپنا ناشتہ تیار کرنے لگا۔ شاید اُن پرندوں کو بھی میری موجودگی کا احساس ہوگیا تھا اس لیے وہ ایک دائرے میں میرے سر پر اُڑنے لگے تھے۔

ان پرندوں کی بڑی تعداد بتاتی تھی کہ کہیں قریب ہی کوئی دریا یا جھیل ضرور ہوگی جس کے آس پاس کسی آبادی کا امکان بھی تھا اور یہ آبادی میرے لیے یقینی خطرہ تھی۔ لہٰذا اس روز میں نے بڑی احتیاط سے سفر کیا۔

تیسرے پہر میں ایک ایسے راستے پر آنکلا جو شاید کافی عرصے سے زیرِ استعمال نہیں تھا۔ تاہم یہ راستہ مجھے چوکنا کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں تقریباً آدھ گھنٹے تک جھاڑیوں میں چھپا اس کا جائزہ لیتا رہا... پھر اللہ کا نام لے کر اُسی پر چل پڑا۔

یہ راستہ آگے جاکر اچانک ایک کھائی میں اُتر گیا۔

جب میں کھائی عبور کرکے دوبارہ اوپر چڑھنے لگا تو دائیں ہاتھ کا موڑ مُڑتے ہی جو نظارہ مجھے دکھائی دیا، اُس نے میرے قدم وہیں روک لیے۔

میرے سامنے کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا سنگی بُت ایستادہ تھا۔

اس بُت کی اونچائی کم از کم دو سو ہاتھ تھی۔ اس کی تخلیق انسانی ہاتھوں کی مرہونِ منت تھی اور بنانے والے کوئی معمولی انسان نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ یہ مجسمہ سازی کا ایک اچھوتا نمونہ تھا۔ مجسمے کی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں اور ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے جہاں سے میں اُسے دیکھ رہا تھا، وہاں سے اس کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ اس کا رُخ دوسری جانب تھا۔

میں مجسمے کا چہرہ دیکھنے کے لیے کانی چکر کاٹ کر سامنے پہنچا تو دہشت کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گئی۔ مجسمے کا آدھا چہرہ ایک نقاب سے ڈھکا ہُوا تھا لیکن آنکھیں اور کھوپڑی دکھائی دے رہی تھی اور یہ دونوں چیزیں کسی مُردے کی کھوپڑی اور آنکھوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔ مجسمے کے نقاب پر بھی مُردے کی کھوپڑی کی تصویر بنی ہُوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے موت مجسم و منجمد ہوکر اسی چٹان پر کھڑی ہوگئی ہو۔

میں نے اِردگرد دیکھا۔ وہاں میرے سوا کوئی ذی رُوح نہیں تھا۔

ہر طرف گمبھیر سناٹا تھا۔

وہ آبی پرندے اور اُن کی آوازیں بھی جیسے ابدی خاموشی میں معدوم ہوگئی تھیں۔

میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر میں نے مجسمے کو قریب سے دیکھنے کا فیصلہ کرلیا اور چٹان پر چڑھنے لگا۔ مجسمے کے ٹخنے میں مجھے ایک دروازہ نظر آیا۔ میں نے ایک ہاتھ میں برچھا اور دوسرے

ہاتھ میں چاقو سنبھالا اور اُس دروازے میں داخل ہوگیا۔

اندر خاصا اندھیرا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا یہاں تک کہ میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوگئیں۔ میرے سامنے ایک چکّردار تنگ زینہ تھا۔ دیواروں سے ویسی ہی سیلن کی بُو آرہی تھی جو طویل عرصے تک بند پڑے رہنے والے مکانوں یا مقبروں سے آتی ہے۔

میں زینہ چڑھنے لگا۔ تقریباً بیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک چھوٹا سا کمرہ ملا جو غالباً مجسمے کے گھٹنے میں بنایا گیا تھا۔

میرے سامنے ایک مُردے کا پنجر پڑا تھا۔

میں نے اپنے برچھے سے اُسے چھوُا تو پنجر کی ہڈیاں خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئیں۔

شاید اُسے مرے ہُوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔

مجسمے کے چہرے تک پہنچتے پہنچتے مجھے دو اور کمرے ملے جو پہلے کمرے سے قدرے کشادہ تھے۔

ہر کمرے میں ویسے ہی پنجر بھی ملے مگر کوئی ہتھیار، کوئی زیور یا دوسری چیز نہ ملی۔

چوتھے کمرے میں خاصی روشنی تھی یہ روشنی مجسمے کی آنکھوں سے اندر آرہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کمرے میں قربان گاہیں نظر آئیں۔

ہر قربان گاہ پر ایک ایک بہت بڑی کتاب کُھلی رکھی نظر آئی۔ میں نے ایک کتاب کو چھوُا تو وہ بھی خاک میں بدل گئی۔ یہ کتابیں تھیں، انھیں کس نے لکھا تھا اور ان میں کیا لکھا گیا تھا؟ ان سوالوں کے جواب مجھے کسی سے نہیں مل سکتے تھے وقت کے طویل سفر نے ہر چیز کو فرسودگی اور اسرار کی دبیز گرد میں دفن کردیا تھا۔ ... سوچوں نے پھر میرے ذہن پر یلغار کردی۔ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس دورِ وحشت میں اتنا بڑا مجسمہ تعمیر کیا؟ ہوسکتا ہے وہ ہم سے پہلے تہذیب، ارتقا کی منزلیں طے کرچکی ہو۔ وہ لوگ پڑھے لکھے ہوں گے، تبھی تو یہ کتابیں یہاں رکھی ہیں۔ وہ کسی دیوتا کی عبادت بھی کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے، یہ مجسمہ اُسی دیوتا کا ہو ... مگر ان لوگوں پر کیا بیتی؟ اُن کی نسلیں کیسے معدوم ہوئیں؟

میری سوچوں کا سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا کہ آبی پرندوں کی کرخت آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ میں آگے بڑھ کر مجسمے کی آنکھوں سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک پیالہ نُما جھیل چمک رہی تھی پرندے اُس پر پرواز کرتے ہُوئے مچھلیاں پکڑ رہے تھے ... مگر میں اُن پر زیادہ دیر توجہ نہ دے سکا۔ میری نگاہیں اُن گھروں کا جائزہ لینے لگیں جو جھیل میں تیرتے ہوئے تختوں پر بنائے گئے تھے۔ کچھ گھروں سے تھوڑا تھوڑا دُھواں اُٹھ رہا تھا۔

اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی جو مٹی کے ایک بڑے برتن میں مُوسل سے کچھ کُوٹ رہی تھی۔

میں نے غور سے دیکھا تو مجھے وہ عورت نرگ نسل سے کچھ بہتر نسل کی معلوم ہُوئی۔ اس نے کھال کے ٹکڑوں سے ستر پوشی کررکھی تھی۔ تیرتے تختوں پر بنے ہُوئے یہ جھونپڑے بھی اس خیال کی تائید کرتے تھے کہ یہ نسل نرگوں سے زیادہ تہذیب و ترقی یافتہ ہے۔ اگر ڈاکٹر فرہاد یہ نسل دیکھتا تو اسے بن مانس سے تعبیر کرتا یا اس کا کوئی ایسا نام بتاتا جسے زبان مشکل ہی سے ادا کرپاتی۔

یہ نسل پتھروں اور لکڑیوں کے ہتھیار استعمال کرتی تھی... کاشت کاری سے بھی آشنا تھی کہ جھیل سے جنگل تک کوئی فصل لہلہاتی دکھائی دے رہی تھی۔ جھیل کے کنارے سے گھروں تک جانے کے لیے چھوٹی چھوٹی گول کشتیاں استعمال کی جارہی تھیں۔ میں جھیل کی طرف جانے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ ناگاہ میری نظر کھیتوں میں کام کرنے والے ایک گروہ پر پڑگئی اور میں نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ یہ نسل نرگوں سے کہیں زیادہ ظالم اور خونخوار تھی۔

یہ بن مانس قسم کے لوگ کھیتوں میں غلاموں سے کام لے رہے تھے اور ان غلاموں میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی سارے غلام ستر پوشی سے محروم تھے۔ عورتوں میں جوان بھی تھیں اور بوڑھی عورتیں بھی تھیں۔ بن مانس نُما نگران کھیتوں میں کام کرنے والوں پر کوڑے برسا رہے تھے مگر یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہُوا کہ وہ مرد غلاموں کو تو کبھی کبھار یا ایک آدھ ہی کوڑا مارتے تھے مگر عورتیں مسلسل اُن کے تشدد کا نشانہ بن رہی تھیں... اور پھر اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ غلام عورتیں اور مرد میری طرح مکمل انسان تھے۔ نرگ یا بن مانس نہیں تھے۔

کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے کے لیے انھوں نے ڈنڈوں پر ہانڈی نہیں لٹکائی تھی بلکہ مُردہ غلام کھمبوں کے ساتھ باندھ دیے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا مگر اس کے ساتھ ہی خوف سے جھرجھری بھی آگئی۔

اتنے میں کھیتوں میں کام کرنے والی ایک عورت گر پڑی۔ ایک بن مانس نُما نگران اس کی طرف لپکا اور اس پر کوڑے

برسانے لگا۔ وہ بے چاری بمشکل تمام اُٹھی اور پھر گر پڑی... اور اس بار ایسی گری کہ دوبارہ نہ اُٹھ سکی۔ نگران نے جھک کر اس کا جائزہ لیا اور ساتھیوں کو بُلانے لگا۔ وہ اُدھر گیا تو ایک غلام لڑکی جو کم عمر اور کافی خوبصورت تھی، کھیت سے جنگل کی طرف کھسکنے لگی۔ شاید وہ وہاں سے فرار ہونا چاہتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل کانپ گیا کہ اگر اُن ظالم نگرانوں نے اُسے بھاگتے دیکھ لیا تو کوڑے مار مار کر اس کے پرخچے اُڑا دیں گے... مگر مجھے یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہو گیا کہ وہ دونوں نگران اس مردہ عورت کو گھسیٹ کر ایک خالی کھمبے کی طرف لے جا رہے تھے تاکہ اُسے باندھ کر پرندوں کو ڈرانے کا کام لے سکیں۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب وہ کھیت سے نکل کر تیزی سے جنگل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ اتنے میں بن مانس نگران کی نگاہ اُس پر پڑ گئی۔ وہ لاش چھوڑ کر اُس کی طرف دوڑے۔ ان کی رفتار لڑکی سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ میں لاشعوری طور پر چیخ اُٹھا۔ "بھاگو... اور تیزی سے بھاگو، لڑکی۔"

... اور پھر مجھے اپنی اس حرکت پر خود ہی ہنسی آ گئی۔

اب لڑکی جنگل سے تقریباً سو گز دُور رہ گئی تھی لیکن بن مانس ہر لمحے اُس کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ میری دھڑکنیں بھی ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھیں۔ اُس وقت تو مجھے اپنا دل مٹھی میں بند ہوتا محسوس ہونے لگا جب بن مانس لڑکی کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اُن میں سے ایک نے اُسے بڑے زور سے کوڑا مارا۔

لڑکی گر پڑی۔

دونوں بن مانس بھی خود کو نہ روک سکے، وہ لڑکی سے ٹکرائے اور خود بھی گر پڑے۔ اتنے میں لڑکی اُٹھی اور راستہ بدل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگی۔ بن مانس بھی تیزی سے اُٹھے لیکن اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے آپس میں ٹکرا گئے۔ میرا دل یہ منظر دیکھ کر خوشی سے بھر گیا۔ لڑکی کو تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی اور وہ نگرانوں کے رفتار پکڑنے سے پہلے ہی جنگل کے کنارے پہنچ گئی تھی۔

"شاباش۔ نکل جاؤ لڑکی۔" میں ایک بار پھر بے ساختہ چیخ پڑا، مگر یہ دیکھ کر میرا دل بُجھ سا گیا کہ جنگلی بیلوں کی وجہ سے لڑکی کو جنگل میں جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا اور بن مانس پھر اُس کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

اب لڑکی کبھی ادھر بھاگتی تھی اور کبھی اُدھر جاتی تھی یہاں تک کہ اس میں اور نگرانوں میں بمشکل تیس قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ نگرانوں نے فاتحانہ نعرہ لگایا۔ لڑکی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور پھر میری حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ لڑکی نے پوری ... سے زقند بھر کر آگے چھلانگ لگا دی تھی۔

وہ بیلوں کا جال توڑتی ہوئی جنگل میں داخل ہو گئی ... نگران بھی اب بیلوں تک جا پہنچے تھے۔ میری آنکھیں ایک ... پھر حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بن مانس بیلوں کے اندر ... کی بجائے وہیں رُک گئے تھے اور آپس میں تبادلۂ خیالات کر ... لگے تھے۔

میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ جنگل میں داخل کیوں نہیں ... اور لوٹ کیوں گئے ہیں؟

غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے بن مانس نگران کھیت ... کام کرنے والے غلاموں کو چھوٹی ڈونگی کشتیوں میں بھر کر جھیل ... بڑے تختے پر بنے ہوئے ایک کشادہ جھونپڑے میں لے گئے ... کچھ مرد غلام اُن کے لیے کھانا لانے لگے۔

ایک ایسا ہی مرد غلام جب دوسرے جھونپڑے میں ... ہُوا تو بن مانسوں کی قبیل کی دو عورتیں اُس کی طرف یوں ... لگیں جیسے وہ اُن کا محبوب رہا ہو۔ تب میں نے اندازہ لگایا کہ ... مخلوق میں غالباً مردوں کی کمی ہے اسی لیے مرد غلاموں کے ... ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔

وہ رات میں نے مجسّمے کے سر والے کمرے میں بسر ... صبح دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جُوں جُوں میں آگے بڑھ ... دوبارہ گھنا ہوتا گیا۔ دن بھر کے سفر میں مجھے کوئی خرگوش بھی نہیں دیا۔ تاہم ابھی میرے جھولے میں پہلے خرگوشوں کا کافی گوشت ... تھا جو دو تین روز تک میرے پیٹ کی آگ بُجھا سکتا تھا۔

دن کے تیسرے پہر میں ایک چشمے پر پہنچا تو پانی ... ستانے کے لیے رُک گیا۔ چشمے کا پانی نمکین تھا اور بعد ... پر پانی خشک ہونے کے بعد وہاں نمک جم کر رہ گیا تھا۔ میں ... کہ اگر یہاں کہیں جانور ہوں گے تو پانی پینے ضرور آتے ... چنانچہ چھپ کر بیٹھ گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد چھوٹے قد کا ایک ہرن وہاں آ ... پینے لگا۔

یہ ہرن جسامت میں سیامی بلی سے کچھ ہی بڑا ... اسے بآسانی شکار کر سکتا تھا مگر میں نے اُسے ہلاک نہیں ... وہ جانے لگا تو کچھ فاصلے سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔

تھوڑی دُور جا کر وہ اپنے گلّے میں مل گیا۔

ہرنوں کا گلّہ دیکھ کر میری یہ فکر دُور ہو گئی کہ اب ... بھروں گا۔ اتنے میں سارے ہرن ایک جانب دیکھنے ...

... وہاں سے بھاگ نکلے۔ میں نے اُدھر دیکھا لیکن مجھے کوئی ذی رُوح ... دکھائی نہ دیا۔

میں آگے چل پڑا۔

جنگل میں ہر جگہ ہرنوں کے کُھروں کے نشانات موجود تھے۔ ... اس کا مطلب تھا کہ میں جب چاہوں گا، ضرورت کے مطابق شکار ... کر لوں گا۔

غروبِ آفتاب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے مجھے یوں محسوس ... ہُوا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہو۔ جنگل کے سنّاٹے میں مجھے اپنے ... پیچھے کھٹکا سا سنائی دیا تو میں چونک گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا مگر درختوں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

اگرچہ دوبارہ مجھے کوئی آواز یا کھٹکا سنائی نہیں دیا تھا مگر ... میری چھٹی حس مجھے یقین دلا رہی تھی کہ کوئی میرے پیچھے لگا ہُوا ہے۔

جب شام اُتری تو میں نے ایک مقام پر اَلاؤ روشن کر لیا ... اور جنگلی بیلوں سے دو تین پھندے بنا کر راستے میں اس طرح رکھ ... دیے کہ اگر کوئی انسان میرا تعاقب کر رہا ہو تو وہ یہ پھندے دیکھ ... لے۔ جب شام کا اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تو میں الاؤ سے ہٹ کر اندھیرے ... میں چُھپ گیا۔

میں جانتا تھا کہ اگر تعاقب کرنے والا انسان ہے تو وہ پھندوں ... سے بچ کر وہاں سے گزرے گا جہاں اس وقت میں پہنچ گیا تھا۔ ... وہاں بھی میں نے دو تین پھندے لگائے اور پھر اَلاؤ کے پاس ... آ کر گوشت بھُوننے لگا۔

گوشت بھُوننے میں، میں نے جان بُوجھ کر زیادہ دیر لگائی ... کیونکہ اُس کی بُو دُور تک پھیلتی ہے۔ احتیاطاً میں نے جنگل کی طرف ... اپنا رُخ رکھا تاکہ وہاں سے کوئی مجھ پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ میں نے ... اپنے اِرد گرد مزید دو تین اَلاؤ بھی جلا دیے اور گوشت کھانے کے ... بعد یُوں سر جھکا کر بیٹھ گیا جیسے نیند مجھ پر غالب آ گئی ہو... میرے ہتھیار ... میری دسترس میں تھے۔

اس حالت میں بیٹھے بیٹھے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور ... اب نیند سچ مچ مجھ پر غالب آنے لگی تھی۔ میں سونے کا ارادہ ہی کر رہا ... تھا کہ اتنے میں پہلے کھٹکا ہُوا، پھر ایک ہلکی سی چیخ نے مجھے بتا دیا ... کہ میرا تعاقب کرنے والا اس پھندے میں پھنس گیا ہے جو میں نے ... اندھیرے میں لگایا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک جلتی ہُوئی لکڑی ... اُٹھائی، ایک ہاتھ میں بھالا تھاما اور دوسرے میں چاقو لیے ... اس طرف لپکا تاکہ اپنے دُشمن کو پہلے ہی ریلے میں ختم کر دوں مگر جونہی

میں نے اپنا بھالا تولا، جلتی ہُوئی لکڑی کے لرزتے شعلے میں مجھے اس کی جھلک دکھائی دے گئی۔

یہ وہی لڑکی تھی جو کل کھیت سے فرار ہُوئی تھی۔

وہ پھندے میں پھنس کر سر کے بل درخت کی شاخ سے لٹکی ہُوئی تھی۔

میں اس کا بھرپور جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھا تو اُس نے اپنے ناخنوں سے میرا مُنہ نوچ لینا چاہا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے مجھے کوستے ہُوئے مجھ پر تھوک دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اب اس کا کیا کروں؟ ... کہ وہ بن مانسوں کی قید سے فرار ہو کر جنگل میں سفر کر رہی ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی منزل بھی ضرور ہو گی۔ اگر وہ مجھے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھ کر مجھ پر اعتماد کرے تو نرگ کی طرح میری رہنمائی کر سکتی ہے۔ اس دوران میں لڑکی اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی اور گالیاں بکتی رہی۔ آخر وہ تھک ہار کر چپ ہو گئی۔

میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کی عمر بمشکل بارہ تیرہ سال تھی اور وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ میری نگاہیں اُس پر جم کر رہ گئیں۔

"کون ہو تم اور مجھے کیوں شکار کیا ہے؟ تم اُن وحشیوں میں سے تو نہیں لگتے؟" وہ بولی۔

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جن کے جسم پر بال ہیں۔ تم نہ تو اُن میں سے ہو اور نہ ہی ہم میں سے ہو۔"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی: "واقعی تم ہمیں نہیں جانتے؟"

"اگر میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔"

"پہلے مجھے اس مصیبت سے نکالو پھر بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔" وہ تلملا کر بولی۔

میں بیلوں کا پھندا کاٹنے لگا۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تم جمشیدیوں کو نہیں جانتے۔ ہم جمشیدی تو دُور سے جمشیدی نظر آتے ہیں۔ پہلے جمشیدی اسی علاقے میں رہتے تھے۔ ساری دُنیا انھیں جانتی ہے مگر تم کہتے ہو کہ تم جمشیدیوں کو نہیں جانتے۔"

مگر جونہی اس کا ایک پاؤں پھندے سے آزاد ہُوا اور میں نے ... سے اُتارا تو وہ ایک دم تیزی سے بھاگی۔ شاید وہ یہ نہیں

جانتی تھی کہ دوسرے پاؤں کے پھندے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ میں نے وہ سرا کھینچ لیا۔

وہ دھڑام سے گر پڑی۔

میں اُس کے قریب گیا تو وہ بلّی کی طرح میرا سینہ نوچنے لگی۔ میں نے اُس کی کنپٹی پر ہلکا سا ہاتھ مار کر اُسے بے ہوش کر دیا۔ بیلوں سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اُٹھا کر الاؤ کے پاس لے آیا۔ اُسے آرام سے آگ کے قریب لٹانے کے بعد میں دوبارہ گوشت بھوننے لگا۔ اس دوران میں، میں کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتا بھی رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور جب حواس میں آئی تو میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا: "پہلے میں بولوں گا اور تم غور سے سنو گی۔ پھر میری بات کا جواب دو گی۔ یاد رکھو اب میں حکم دوں گا اور تم اُس کی تعمیل کرو گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟"

"ٹھیک ہے تم جو کہو گے، میں کروں گی۔"

"خوب۔ نام کیا ہے تمھارا؟"

"دیپا۔"

"مجھے جمشیدیوں کے بارے میں بتاؤ۔"

وہ بھونے جانے والے گوشت کی خوشبو سے بے تاب ہوتے اور رال ٹپکاتے ہوئے بولی: "میں بہت بھوکی ہوں۔ ان وحشیوں کی قید میں پچھلے ایک سال سے میں نے گوشت نہیں کھایا پہلے مجھے گوشت کھلاؤ، پھر سب بتا دوں گی۔"

میں گوشت کا پارچہ اُس کے سامنے ہلا کر خود کھانے لگا۔

وہ رال ٹپکاتی اور نفرت سے مجھے دیکھتی رہی۔

"پہلے تم بتاؤ گی اور پھر کھاؤ گی۔ اگر تم نے نہ بتایا تو تمھیں ایک بوٹی بھی نہیں ملے گی، حالانکہ میرے پاس بہت سارا گوشت موجود ہے۔"

وہ بڑے زور سے کسمسائی اور اپنے آپ کو بیلوں کی گرفت سے چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگی... مگر جب ناکام ہو گئی تو بولی: "ٹھیک ہے۔ میں تمھارا حکم مان رہی ہوں... پھر بھی تم نے مجھے گوشت نہ کھلایا تو جب تم سو جاؤ گے، میں تمھیں قتل کر دوں گی۔"

"میں تمھیں گوشت ضرور کھلاؤں گا۔ مجھے اپنے قبیلے یا قوم کے بارے میں بتاؤ۔" یہ کہہ کر میں گوشت کا ایک بڑا پارچہ بھوننے لگا۔

"میں جمشیدی ہوں جو پہاڑوں پر رہتے ہیں۔ جمشیدیوں کی حکمران ایک عورت ہے جسے ملکۂ جم کہا جاتا ہے۔ وہ بہت بوڑھی اور قریب المرگ ہے۔"

میں نے سوچا کہ دیپا مجھے اس لامتناہی جنگل سے نکال سکتی ہے۔ اگر جمشیدیوں کی کوئی ملکہ ہے تو وہ لوگ یقیناً تہذیب سے آشنا ہوں گے۔ چنانچہ میں دیپا کا ایک ایک لفظ غور سے سنتا اور ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ جب وہ میرے تمام سوالوں کے جواب دے چکی تو میں نے اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور بھنا ہوا گوشت اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ مریضوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔

جب وہ شکم سیر ہو چکی تو الاؤ کے قریب لیٹ گئی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی: "میں نے تمھیں اپنے اور اپنی قوم کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تم بھی مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم دُور دراز علاقے سے آئے ہو گے کیونکہ تم جمشیدیوں سے زیادہ قد آور، توانا اور خوبصورت ہو۔"

"ہاں۔ میں بہت دُور سے آیا ہوں۔ اس جنگل کے درختوں کے جتنے پتے ہیں نا، اگر تم اتنے دن سفر کرو تو بھی وہاں نہیں پہنچ سکو گی۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم بہت بوڑھے ہوتے۔" وہ بولی۔

"میں تو جادو کے ذریعے یہاں آیا ہوں، میرا نام سرفروش ہے۔"

"سرفروش!" اُس نے دُہرایا۔

"ہاں۔ تمھاری زبان سے اچھا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر مجھے نہ تو تم اچھے لگتے ہو اور نہ ہی تمھارا نام... تم جن نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہو، ان سے مجھے خوف آتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تمھارے دل میں کیا ہے مگر میں اُسے کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔"

بلاشبہ وہ بڑی تیز طرار لڑکی تھی۔ بہر حال میں اُس پر اپنی کوئی کمزوری عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔

"آئندہ مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرنا۔ مجھے تمھاری کسی کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا اور تمھیں اس وقت تک ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا جب تک تم خود ایسا نہیں چاہو گی۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں دوستوں کی طرح ایک دوسرے کی مدد کریں۔ تم میرے سوالوں کے جواب دیتی رہو اور میری رہنمائی کرتی رہو۔ اس کے بدلے میں تمھیں تمھاری قوم اور تمھارے گھر تک پہنچا دوں گا اس لیے کہ تم تنہا اس جنگل میں سفر نہیں کر سکو گی۔ راستے میں پیش آنے والے خطروں کا مقابلہ نہیں کر سکو گی۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی: "تم ٹھیک کہتے ہو سرفروش راستے میں کاشیوں سے سابقہ پڑے گا اگر ہم اُن کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ تمھیں مار کر تمھارا گوشت کھا جائیں گے اور میرے ساتھ اتنا ذلیل سلوک کریں گے کہ میں جانبر نہ ہو سکوں گی لیکن تمھیں ابھی سے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی وہ ہم سے چار یوم کی مسافت پر ہیں۔ بہر حال مجھے تمھاری دوستی کی پیش کش منظور ہے۔"

"تم خاصی سمجھ دار لڑکی ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اب جب ہم دوست بن گئے ہیں تو میرے ہاتھ پاؤں بالکل آزاد کر دو۔ یا تمھارے وطن میں لوگ، دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟"

میں اس کی بات پر ہنس پڑا: "نہیں۔ ہمارے ہاں دوست ایک دوسرے پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے اس لیے میں تمھیں پوری طرح آزاد کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُسے بیلوں کی جکڑ بندی سے آزاد کر دیا۔

اُس نے بازو کے گرد لپٹی ہوئی بیل چھڑائی اور اچانک اتنے زور سے میرے منہ پر ماری کہ میں اُلٹ کر گر پڑا اور جب میں نے اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔

یکایک اندھیرے سے اس کا قہقہہ سنائی دیا پھر آواز آئی: "الوداع سرفروش... اور سنو... مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تمھارے وطن میں سبھی بے وقوف ہوتے ہیں۔"

اُس کے قہقہے دُور ہوتے چلے گئے۔

پہلے تو میں اُسے کوستا اور اپنی آنکھیں ملتا رہا... پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آ گئی۔ وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ میں بے وقوف تھا جو اس کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ جمشیدی مکر و فریب میں ہم سے کم نہیں ہیں۔ ابھی میں انھی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ناگاہ جنگل کے گمبھیر سناٹے میں ایک چیخ نما دھاڑ گونج اُٹھی۔ آواز اتنی ہیبت ناک اور دہشت انگیز تھی کہ میں نے ڈراکولا فلموں کی کسی ٹیپ پر بھی نہیں سُنی تھی۔ ہر چند یہ مہیب آواز میلوں دُور سے آئی تھی... مگر اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے اور میں خود بھی بے ساختہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس آواز میں زندگی اور موت کا تمام تر کرب اور عذاب سمٹا ہوا تھا۔

میں کچھ دیر گوش برآواز کھڑا رہا مگر جب وہ شیطانی چیخ دوبارہ سنائی نہ دی تو لیٹ گیا لیکن اب نیند میری آنکھوں سے بہت دُور جا چکی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے الاؤ کے پار پھیلے ہوئے اندھیرے سے دیپا کی آواز سُنائی دی: "سرفروش...!"

آواز اتنی مدھم تھی کہ میں نے اسے اپنے تصور کا کرشمہ ہی سمجھا اور چپ چاپ لیٹا رہا... مگر چند لمحے بعد پھر دیپا کی آواز آئی: "سرفروش۔ مجھے افسوس ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ میں الاؤ کے پاس آنا چاہتی ہوں۔"

میں نے کروٹ بدل کر جماہی لی اور کہا: "تم واپس آنا چاہتی ہو؟ میرا خیال تھا کہ تم جنگل میں تنہا رہنا زیادہ پسند کرتی ہو۔"

"نہیں... مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"مگر تمھیں تو مجھ سے بھی ڈر لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... لیکن جنگل میں اور زیادہ ڈر لگتا ہے۔ مجھے اپنے پاس آنے دو آقائے سرفروش۔"

"تم میری دوست نہیں ہو اس لیے میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ شب بخیر دیپا۔" یہ کہہ کر میں پھر سوتا بن گیا... مگر مجھے الاؤ کے باہر اُس کے چلنے اور حرکت کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کچھ دیر بعد پھر اُس کی آواز آئی۔

"معاف کر دو، نا آقائے سرفروش! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اور سردی بھی لگ رہی ہے۔ مجھے الاؤ کے پاس آنے دو نا۔"

"آ جاؤ... مگر مجھے پریشان مت کرنا۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" میں نے بالآخر کہہ دیا۔

وہ آہستہ سے آئی اور پرے الاؤ کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے بظاہر اپنی آنکھوں کو بازو سے چھپا رکھا تھا مگر میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ پہلے آگ تاپتی رہی... پھر اُس نے ہاتھوں سے پورے جسم کی گرد اور بالوں سے پتے وغیرہ جھاڑے۔ اس کے بعد وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی میرے پیچھے آ گئی۔ میرا جی چاہا کہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر اور کروٹ لے کر دیکھوں کہ وہ کیا کر رہی ہے مگر پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ چند لمحوں بعد میں نے اُس کا بازو اپنے بازو پر محسوس کیا۔ ساتھ ہی اُس کی آواز آئی: "آقائے سرفروش! کیا تم سو گئے؟"

"تم واپس کیوں آ گئیں؟" میں نے لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"میں جنگل میں ڈرتی اور سوچتی رہی کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور تم سچے ہو۔ اب ہم ایک دُوسرے کے دوست ہیں اور میں تم پر اعتماد کرتی ہوں۔"

"وہ آواز کیسی تھی؟" میں نے پوچھا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے اس بات سے اس پر کپکپی طاری ہو گئی ہو۔ وہ کسی خوفزدہ بچّے کی طرح میرے قریب آگئی اور بولی: "وہ کاشیوں کا نعرہ تھا۔ وہ رات کو شکار کھیلتے ہیں اور عام طور پر اپنے ٹھکانے سے زیادہ دُور نہیں آتے۔ البتہ جب اُن کے پاس غذا نہیں ہوتی تو وہ اتنی دُور بھی آجاتے ہیں۔۔۔ مگر اب مَیں اُن کا ذکر نہیں کرنا چاہتی مَیں صرف تمھاری بات کرنا چاہتی ہُوں اور تمھاری باتیں سُننا چاہتی ہُوں۔ اگر مَیں یہ کہوں کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے تو تمھارے تاثرات کیا ہوں گے؟"

اُس کی زبان سے یہ بات سُن کر مجھے بے حد تعجب ہُوا کیونکہ وہ بمشکل بارہ تیرہ سال کی لڑکی تھی: "کیا تمھارے ہاں بارہ تیرہ سال کی لڑکیاں جذبۂ محبت سے آگاہ ہو جاتی ہیں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"ہمارے ہاں بارہ سال میں لڑکی شادی کر لیتی ہے۔" وہ بھاری آواز میں بولی اور پھر تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری محسوس ہونے لگی۔ یہ ریشمی اندھیرا صبح تک مجھے انوکھے خواب دکھاتا رہا۔

ہمیں سفر کرتے ہُوئے چوتھا روز تھا۔ ہم بتدریج بلندی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان چار دنوں میں دیپا نے ثابت کر دیا تھا کہ عورت چاہے ہمارے دَور اور دُنیا کی ہو یا ماضیٔ بعید سے تعلق رکھتی ہو، اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ وہ ہر وقت بولتی ہی رہتی ہے۔ چوتھے روز راستے میں ہمیں ایک چشمہ ملا تو ہم نے غسل کیا۔ جب ہم چشمے سے نکلے تو مَیں دیپا کو حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کا حُسن بے حد نکھر گیا تھا اور وہ پہلے والی دیپا تو معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔

وہ توجہ کا مفہوم بھانپ گئی اور مسکرا کر بولی: "آفتابی کتابوں میں لکھا ہُوا ہے کہ جب تک۔۔۔!"

آفتابی کتابوں کے ذکر پر مجھے وہ بڑی بڑی کتابیں یاد آگئیں جو مجسّمے کی کھوپڑی والے کمرے کی قربان گاہوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ پھر دیپا کی یہ بات بھی ذہن میں اُتر آئی کہ جمشیدی ایک زمانے میں وہاں آباد تھے۔ مَیں نے دیپا سے اس سلسلے میں پُوچھا تو وہ بولی۔۔۔

"مَیں مذہب کے بارے میں بہت کم جانتی ہُوں۔ ہمارے بزرگ اکثر راتوں کو آگ کے گرد بیٹھ کر مذہب کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ عجیب سی کہانیاں سُناتے ہیں کہ سب سے پہلے دُنیا کا انڈا پیدا ہُوا۔ اُسی بیضۂ ارض سے بزرگ مہرشناس نے جنم لیا۔ وہ دانائے راز تھا۔ اُس نے مذہبی کتابیں لکھی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جمشیدی اُس کی تعلیمات سے رُوگردانی کرتے چلے گئے اور کتابوں کے اَوراق پر لکھی تحریر مدھم پڑتی چلی گئی۔۔۔ پھر ایک ایسا دَور آیا کہ کوئی جمشیدی اُنھیں پڑھنے کے قابل نہ رہا۔ وہ بدی اور گناہوں میں ڈُوب گئے۔ اُنھی گناہوں کی سزا میں اُنھیں جلاوطن ہونا پڑا اور وہ آج تک جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

مجھے ایک بار پھر اُن کتابوں کا خیال آگیا جن کی تحریر معدوم ہو چکی تھی اور جو خود بھی قربان گاہوں پر رکھے رکھے خاک ہوگئی تھیں۔

مجھے سوچ میں ڈُوبے دیکھ کر دیپا بولی: "اب بدی سے مت ڈرو کہ میری طرف توجہ ہی نہ دو۔"

اگلی صبح ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا۔

ڈھلان شروع ہوتے ہی دیپا نے بتا دیا کہ اب ہم کاشیوں کی حدُود میں داخل ہو رہے ہیں۔

"کاشی کیسے ہوتے ہیں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"اُن بالوں والے وحشیوں سے زیادہ وحشی۔ اُن سے کہیں توانا قدآور۔۔۔ بڑے ظالم اور چالاک۔۔۔ اگر اُنھوں نے تمھیں قتل کر دیا یا بڑھنے کی اجازت دے دی تو دونوں صورتوں میں مجھے نہیں چھوڑیں گے اور مَیں اُن کا شکار ہونے کی بجائے موت کو ترجیح دیتی ہوں۔ اپنا یہ چھوٹا سا چاقو دے دو تاکہ مَیں اُن کے جبر کا نشانہ بننے سے پہلے ہی اپنے آپ کو ختم کر سکوں۔"

مجھے اُس کی بات کا اس لیے یقین نہ آیا کہ وہ مبالغہ آرائی سے بہت کام لیتی تھی۔ مَیں نے کہا: "اگر مَیں تمھیں چاقو نہ دُوں تو؟"

"تو پھر مَیں خودکشی کیسے کروں گی؟ کسی ہتھیار کے بغیر کوئی اپنے آپ کو کیسے ختم کر سکتا ہے؟"

"کیا تم یہ سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔ اگر مَیں زندہ اُن کے ہتھے چڑھ گئی تو جب تک میرے اندر زندگی کی رمق باقی رہے گی، وہ مجھے اپنے ستم کا نشانہ بناتے رہیں گے۔"

یہ سُن کر مَیں نے اپنا چاقو اُسے دے دیا کہ وہ چاہے اُس سے خودکشی نہ کرے مگر کسی حد تک مدافعت تو کر ہی لے گی۔

دوپہر تک ہم ایک ایسے میدان میں پہنچ گئے جس کے پس منظر میں پہاڑ سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ اُس طرف سے آنے والی ہَوا کافی خنک تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُن پہاڑوں کی چوٹیوں نے برف کے کلس سجا رکھے ہوں گے۔

دیپا نے وہ پہاڑ دیکھے تو گہری سنجیدگی سے بولی: "ان پہاڑوں کے اُس پار جمشیدیوں کا مسکن ہے۔ وہ انھی پہاڑوں کی وادی میں رہتے ہیں جن سے تمھیں ہر قیمت پر فتح حاصل کرنی چاہیے۔ مَیں اپنے عزیزوں کے علاوہ اپنا شہر، اپنا گھر اور اپنا آنگن دیکھنا چاہتی ہُوں۔ بزرگ مہرشناس تمھیں کاشیوں پر فتح یاب کرے۔"

ایک چھوٹی سی کھائی سے گزرنے کے بعد مجھے میدان میں

تین سو قدم دُور ایک جھونپڑا نظر آیا۔ اس کی چھت مسطح تھی اور اُس کے ارد گرد چہار دیواری بنی ہوئی تھی جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اِس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اُسے بارش کا پانی جمع رکھنے کے لیے بنایا گیا ہوگا۔۔۔ پھر اچانک ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

میرے ٹھٹکنے کا باعث وہ کاشی تھا جو پتھروں سے تعمیر کردہ اُس جھونپڑے کی چھت پر بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کم از کم آٹھ فٹ لمبا اور بھاری بھرکم تھا۔ وہ بندر اور گوریلے کی دوغلی نسل معلوم ہوتا تھا اور اُس کے جسم پر بڑے بڑے بال تھے۔ اُس کا مُنہ کسی شکاری کتّے کے مُنہ کی طرح لمبوترا تھا۔ پھر وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اچانک ہی کہیں غائب ہوگیا۔

پہلے تو مَیں اس کے اس طرح غائب ہونے پر سٹپٹا گیا پھر میری سمجھ میں آگیا کہ وہ چھت میں واقع سُوراخ سے اندر اُتر گیا ہوگا۔

مَیں نے دیپا کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اُس کی گھگھی بندھی ہُوئی تھی۔ مَیں اُس کاشی کی کمر سے بندھی تلوار دیکھ چُکا تھا۔ اُس کے مقابلے میں میرے پاس ایک خود ساختہ بھدا سا بھالا اور تیر کمان تھے۔ مَیں نے دیپا سے اپنا چاقو واپس لینا چاہا مگر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ اُس کے بغیر وہ خودکشی نہیں کر سکے گی اور اُس کا خودکشی کر لینا ہی بہتر ہوگا۔ اتنے میں جھونپڑے کی چھت کے سوراخ سے گاڑھا دُھواں بلند ہونے لگا۔

دیپا بمشکل ہکلاتے ہُوئے بولی: "وہ۔۔۔ وہ اس دُھویں کے ذریعے۔۔۔ دُوسری چوکیوں کو۔۔۔ خبردار کر رہا ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر سب سے زیادہ اہم۔۔۔ یہی چوکی ہے۔۔۔ اگر ہم۔۔۔ یہاں سے نکل گئے تو شاید بچ جائیں۔"

اتنے میں کاشی چھوٹی سی چار دیواری سے کُود کُود کر باہر آنے لگے۔ مَیں اُنھیں شمار کرتا رہا۔ وہ تعداد میں دس تھے۔ ایک اُن کا کمان دار تھا اور نو ماتحت تھے۔ اُنھوں نے سینگوں والے خود پہن رکھے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ وہ ہمارے دَور اور دُنیا کی طرح عسکری نظم وضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جب اُن کے کمان دار نے اُنھیں صف آرا ہونے کا حکم دیا تو مَیں بُری طرح چونک گیا۔ چونکنے کی وجہ آٹھ فٹ کے قوی الجثہ کمان دار کی زنانہ آواز تھی۔ مَیں نے دیپا سے پُوچھا: "کیا یہ عورتیں ہیں؟"

"نہیں۔۔۔" وہ بولی: "کاشیوں میں کوئی عورت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہماری عورتوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں۔ اُن سے جو اَولاد ہوتی ہے، وہ سب کی سب لڑکوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ آؤ واپس بھاگ چلیں۔ یہ جنگل میں ہمارا پیچھا نہیں کریں گے کیونکہ ان کی حد اسی میدان تک ہے۔"

"اب فرار کا وقت نہیں رہا۔ مجھ پر اعتماد رکھو اور وہی کرو جو مَیں کہتا ہُوں۔ میرے پیچھے چھُپ جاؤ اور اب اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مَیں ان سے نمٹ لُوں گا۔" مَیں نے اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا حالانکہ مجھے خود اپنے زندہ رہنے کی بھی کوئی اُمید نہیں تھی۔

کاشی کمان دار نے اپنے دستے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور آٹھ فٹ قد والے وہ بندر نُما گوریلے تربیت یافتہ عسکریوں کی طرح میری طرف بڑھنے لگے۔ اُن کا کمان دار اُن سے چار قدم آگے تھا۔ مَیں اپنے برچھے کا سہارا لے کر یُوں کھڑا ہوگیا جیسے میرے لیے اُن کی کوئی وقعت ہی نہ ہو اور وہ میرے لیے کیڑے مکوڑے ہوں۔ مَیں اُنھیں اپنے رویّے سے حیران کرنا چاہتا تھا جبکہ خود ٹھنڈا اور پُرسکون رہنا چاہتا تھا۔

جب وہ مجھ سے بیس قدم دُور رہ گئے تو کمان دار نے اُنھیں رُکنے کا حکم دیا۔ سب ایک دم رُک گئے اور اُنھوں نے تلواریں نکال کر کمان دار کو سلامی دی۔ وہ اُنھیں آخری ہدایات دینے لگا: "میرے دُوسرے حکم تک یہیں آرام سے کھڑے رہو۔ مجھے اس معاملے سے نمٹنے میں دیر نہیں لگے گی اور یاد رکھو۔ کمان دار کی حیثیت سے اس لڑکی پر سب سے پہلے میرا حق ہوگا۔"

یہ ہدایات دینے کے بعد وہ میری طرف آیا اور پانچ قدموں کے فاصلے پر رُک گیا۔ اُس نے تلوار بڑی بے پروائی سے پکڑ رکھی تھی۔ وہ مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر دیپا کی طرف متوجہ ہوگیا جو کھائی کے کنارے ایک چٹان کی اوٹ میں چھُپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اِدھر کیا دیکھتے ہو؟ مجھ سے بات کرو اور یہ مت بھُولو کہ وہ میری بیوی ہے۔" مَیں نے کہا۔

کاشی کمان دار نے غور سے میری طرف دیکھا بلکہ اپنی نگاہیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں موت کی طرح سرد اور بے حس تھیں۔ وہ کافی دیر تک سانپ کی طرح ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔۔۔ پھر اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے اور سفید نوکیلے دانت دکھائی دینے لگے۔

"تم کیا چیز ہو، کہاں سے آئے ہو، کیا چاہتے ہو اور تمھیں کہاں جانا ہے؟" اس نے پُوچھا۔

"میرا نام سرفروش ہے۔ مَیں آدم زاد ہُوں۔ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ پہاڑوں کے اُس پار جانا ہے۔ اگر ہم تمھاری اجازت کے ساتھ یہاں سے گزر جائیں تو بہتر ہوگا اور ہاں، تم نے میرے اعزاز میں جو

سلامی دی ہے اس کے لیے شکریہ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں، بھالا بغل میں دبایا اور بے نیازی سے مسکرایا تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس سے مرعوب یا خوف زدہ ہوں۔

اُس بندر نما گوریلے کی زرد آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اُبھری۔ اُس نے اپنی تلوار میری طرف سیدھی کی۔ اگرچہ یہ دو دھاری تلوار کسی سخت لکڑی کی بنی ہوئی تھی... مگر اسے مہلک بنانے کے لیے پھل میں چقماق جڑے ہوئے تھے اور وہ ایک ایسی ہستی کے ہاتھ میں تھی جو مجھ سے دو فٹ اُونچا اور تین گنا زیادہ وزنی تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ دھونس سے کام چل جائے گا... مگر اس سے کام نہیں چل سکا تھا۔ وہ استہزائیہ انداز سے مسکرانے لگا۔

"تم کہتے ہو کہ تمھارا نام سرفروش ہے مگر مجھے اس سے کیا غرض؟ میرا نام پونگ ہے مگر تمھیں اس سے کیا غرض۔ تم کہتے ہو کہ تمھیں پہاڑ کے اُس پار جانا ہے لیکن مجھے جمشیدیوں سے ایسا کوئی پیغام نہیں ملا کہ اُن کے لیے تمھاری آمد متوقع ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے، آخر؟"

میں اگرچہ ماضی کے متعدد سفر کر چکا تھا لیکن ایک بندر نما گوریلے کو بولتے اور عقل مندی کی باتیں کرتے دیکھ کر خاصا متعجب تھا، تاہم میں نے کہا "جمشیدیوں کو میرا انتظار نہیں ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتے اور جان بھی کیسے سکتے ہیں کیونکہ میں ایک بہت دُور دراز علاقے سے آیا ہوں۔ بہرکیف مجھے اُن کے پاس جانا ہے اور مجھے اُن کے پاس جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک عود کر آئی اور مجھے دیپا کی بات یاد آگئی کہ وہ بے حد سفاک ہوتے ہیں اور اُنھیں وحشیوں کی یلغار روکنے کے لیے اس سرحد پر مامور کیا گیا ہے چونکہ اُن کی نسل میں عورتیں جنم نہیں لیتیں اس لیے وہ اس خدمت کے عوض جمشیدیوں سے مجرم عورتیں حاصل کرتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھار وحشی کچھ غلام عورتیں اُنھیں دے کر جمشیدیوں پر حملہ کراتے ہیں اور بہت سے مرد و زن کو غلام بنا کر لے جاتے ہیں۔ دیپا بھی اسی طرح وحشیوں کے ہتھے چڑھی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ پونگ تمھیں یہاں سے گزرنے دے گا۔ پھر تم جانو اور دُوسری چوکیوں والے جانیں مگر یہ لڑکی تمھیں ہمارے حوالے کرنا ہو گی۔ ادھر کافی عرصے سے جمشیدیوں نے مجرم عورتیں نہیں بھیجیں اور پھر ہماری چوکی تو یُوں بھی سب سے آخر میں واقع ہے۔"

دیپا مجھے بتا چکی تھی کہ اُن کی قوم کی وہ عورتیں جنھیں بھیانک جرائم کی پاداش میں موت کی سزا دی جاتی ہے، ان کاشیوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں مگر اُن میں سے بہت سی عورتیں خودکشی کرلیتی ہیں۔

"میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ وہ میری بیوی ہے اس لیے وہ میرے ساتھ ہی جائے گی۔"

"تو پھر نہ تو تم جاؤ گے اور نہ ہی وہ جائے گی۔" وہ ہوا میں تلوار چلاتے ہوئے بولا۔ "میں تمھیں قتل کر کے اُسے حاصل کروں گا مگر جہاں سے بھی تم آئے ہو، وہاں احمق ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

میں دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنا بھالا تولا جس کا پھل لکڑی کا بنا ہوا تھا، تیر کمان بھی کھلونوں جیسی تھی جبکہ میرے مدِمقابل کے پاس دو دھاری تلوار تھی۔ اُس کا جُثہ دیکھ کر تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گھنے بالوں کی وجہ سے نہ تو بھالا کارآمد ثابت ہو گا اور نہ ہی تیر اُس کے جسم میں پیوست ہو سکیں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ میں کوئی نوک دار چیز چبھتی محسوس ہوئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

دستے کے ایک گوریلے نے اپنی تلوار کی نوک میری پیٹھ سے لگا دی تھی اور باقی میرے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ اب مجھ پر بیس زرد آنکھیں بیک وقت جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں نفرت اور غصہ ہی نہیں، وحشت بھی لہریں لے رہی تھی۔ میری پیٹھ میں تلوار چبھونے والا برہمی سے بولا۔ "زیادہ بکواس نہ کرو اجنبی۔ کمان دار سے لڑو اور مر جاؤ مگر مرنے میں دیر نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ دیپا کی طرف دیکھنے لگا۔

"بکواس بند کرو۔" کمان دار چلّایا۔ "اس قسم کی باتیں قواعد اور ضوابط کے خلاف ہیں۔ اگر اب کوئی بولا تو شکار پر اُس کا کوئی حق نہیں ہو گا۔ اب اپنا حلقہ تنگ کرو۔ یہ احمق بہادر لگتا ہے لیکن میں اسے بھاگنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔"

اُنھوں نے میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کر لیا مگر پونگ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ شاید میرے حملے کا منتظر تھا جبکہ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے قریب آئے اور وار کرے تاکہ مجھے یہ اندازہ ہو سکے کہ اُس کا طریق جنگ کیا ہے۔ جب وہ کوئی غلطی کرے تو میں اُسے کاری ضرب لگا سکوں لیکن اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ وہ مجھ سے دو ہاتھ زیادہ قدآور تھا۔ اُس کا وزن چھ سو پونڈ تھا جبکہ میرا صرف دو سو پونڈ تھا... پھر اُس کے پاس دو دھاری تلوار بھی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بار موت میرا مقدر بن ہی چکی ہے تو بہادروں کی طرح مرنا چاہیے۔

"کھڑے کھڑے دیکھ کیا رہے ہو بزدل۔ حملہ کرو نا۔" میں نے کہا۔

اچانک پونگ مجھ پر جھپٹا اور اس نے تلوار سے میری کھوپڑی دو ٹکڑے کر دینا چاہی... مگر میں عین وقت پر ہٹ گیا۔ وہ غصے کے مارے کھول اُٹھا اور پھر میری طرف بڑھا۔ اس بار میں نے پہل کی اور اپنا بھالا اُس کے سینے پر دے مارا۔ اُس نے بھالا کھینچا تو اُس کا پھل ٹوٹ گیا۔ اُس نے پھل نکال کر میری طرف پھینکا۔ میں نے اُسے ٹوٹے ہوئے بھالے پر روکا اور اُسی سے پھر وار کر دیا۔

پونگ پیچھے ہٹا اور پیٹھ میری طرف موڑلی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے بھالے سے اُس کی پیٹھ پر بھی ضرب لگائی۔ اس کی تلوار میرے بھالے سے چھوٹی تھی اس لیے مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی مگر میرا بھالا اُسے مسلسل زخمی کر رہا تھا۔ ہر چند کہ یہ زخم معمولی تھے مگر اُن سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا اگر خون اسی طرح نکلتا رہا تو جلد ہی وہ نقاہت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اُس کے ساتھیوں کا گھیرا ہمارے ہاں کے باکسنگ رِنگ کے برابر تھا چنانچہ میں نے باکسنگ کی طرح ہی اُسے پے در پے بھالے مارنے شروع کر دیے۔

وہ جھنجلا کر اندھا دُھند تلوار چلانے لگا مگر میں تو ایک باکسر کی طرح بجلی کی رفتار سے پھدک رہا تھا۔ اس لیے اُس کا ہر وار خالی جا رہا تھا تاہم ایک بار اُس کی تلوار سے میرے بال کٹ ہی گئے۔

اب میں ایسی اداکاری کرنے لگا جیسے بُری طرح تھک گیا ہوں۔ میرا دم اُکھڑ رہا ہے اور میں کسی بھی لمحے گر پڑوں گا۔ یہ دیکھ کر پونگ کی باچھیں کھل گئیں۔ اُسے اپنی فتح کا یقین ہو گیا۔

میں جلدی سے پیچھے ہٹا۔

پونگ اس اطمینان کے ساتھ رُک گیا کہ اب تو میں خود ہی تھکن سے چُور ہو کر گرنے والا ہوں مگر میں جونہی اُس کی تلوار کی زد سے نکلا، کمان پر تیر چڑھایا اور چلّا کھینچنے لگا۔ پونگ نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"تم اس کھلونے کے ساتھ پونگ سے لڑنا چاہتے ہو۔ اس رسّی اور لکڑی کے ٹکڑے سے پونگ کو مارو گے؟"

عین اُسی وقت میں نے تیر چھوڑ دیا۔

پونگ نے اُسے بائیں ہاتھ سے روکنا چاہا تو وہ اُس کی ہتھیلی میں گڑ گیا۔ اس نے تلوار پھینک دی اور ہتھیلی سے تیر نکالنے لگا۔ یہی وہ نازک اور فیصلہ کُن لمحہ تھا جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ اب تک مجھے سستانے اور اپنی قوت بحال کرنے کا وقت بھی مل چکا تھا چنانچہ میں نے زقند بھری اور اُس سے ٹکرا گیا۔

وہ سمجھا کہ اس کا شکار خود ہی اُس کی گرفت میں آگیا ہے لہٰذا اس نے مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر میری ہڈیاں توڑ دینا چاہیں لیکن اس سے پہلے ہی میرے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھے اُس کی آنکھوں میں گڑ گئے تھے۔ میں نے اپنے انگوٹھوں کو گھمایا تو اُس نے ایک چیخ کے ساتھ نہ صرف مجھے چھوڑ دیا بلکہ زور سے ہٹایا تو اُس کی آنکھوں کے ڈیلے بھی باہر آگئے۔

وہ درد کے مارے چیخنے اور دھاڑیں مارنے لگا۔

اس کے ساتھی حیرت سے بُت بنے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آسکا کہ ہُوا کیا ہے۔

میں نے لپک کر پونگ کی تلوار اُٹھا لی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اُس کے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ وہ ابھی تک دم بخود اپنے سردار کو تڑپتا اور چلّاتا دیکھ رہے تھے۔ میں نے پونگ کو چڑانے کے لیے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ "ادھر آؤ پونگ! میری آواز کی سمت بڑھو بزدل۔ اب بتاؤ کہ احمق کون ہے؟ اگر مجھے ختم کر سکتے ہو تو آؤ نا۔"

وہ دھاڑتا ہوا اُٹھا اور اپنی باہیں پھیلا کر اس سمت لپکا جدھر میں کھڑا تھا۔ میں نے اپنے پیر مضبوطی سے جمائے، دونوں ہاتھوں سے تلوار سیدھی کی اور اُسے چڑایا۔ "آؤ... اور آگے آؤ بدبخت۔"

اس نے آواز سے میری سمت کا اندازہ لگایا اور پوری قوت سے جھپٹا تو تلوار کی نوک اُس کے نرخرے میں اُترتی چلی گئی۔ وہ ایک دھاڑ کے ساتھ رُکا اور پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی میں نے تلوار کھینچ کر نکالی تو خون کا ایک فوارہ سا اُس کی گردن سے اُبلنے لگا۔

میں نے دوبارہ تلوار اُس کے سینے میں گھونپی۔ وہ مرتے دم تک تلوار مجھ سے چھیننے کی کوشش کرتا رہا مگر اُس کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ میں نے اپنا پیر اُس کی لاش پر رکھ کر اُس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے۔ میں نے خون آلود تلوار بلند کرتے ہوئے کہا۔

"فیصلہ ہو چکا۔ میں نے تمھارے سردار کو مار دیا ہے اس لیے اب میں تمھارا سردار ہوں اور نئے سردار کی حیثیت سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم سب کو ایک ایک بیوی اور نرم فرائض پر مامور کیا جائے گا... یہ میرا... سرفروش کا وعدہ ہے۔ اس پر اعتماد کرو یا مجھ سے لڑو اور پونگ کی طرح مارے جاؤ۔" یہ کہہ کر میں پونگ کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ یہ اُس جوئے کا آخری مرحلہ تھا جو میں نے کھیلا تھا۔ میں پونگ کا سر کاٹنے لگا مگر میرے کان اُس کے ساتھیوں کی باتوں پر لگے تھے۔

"اُس نے ہمارے سردار کو قتل کیا ہے۔ اسے مار ڈالو۔" ایک نے کہا۔

"تو حکم دینے والا کون ہے؟ اب ہم سب برابر ہیں۔ اُس نے وعدہ کیا ہے کہ سب کو ایک ایک بیوی ملے گی۔" دُوسرا بولا۔

"مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ یہ اتنی بیویاں کہاں سے لائے گا؟ اس کے پاس تو ایک ہی عورت ہے اور اس پر بھی اپنا ہی حق جتاتا ہے۔ میری مانو تو اسے مار ڈالو اور لڑکی کو پکڑ لو۔"

"اُس نے پونگ کو مار کر اچھا ہی کیا ہے۔ ورنہ وہ لڑکی کو ہم تک آنے ہی نہ دیتا۔"

"سُنو بے وقوفو۔" پانچواں بولا۔ "ہم اسے کسی بھی وقت مار سکتے ہیں مگر پہلے اس سے پُوچھ لو کہ یہ عورتیں کہاں سے لائے گا اور ہمیں زم فرائض پر کیسے مامُور کرے گا؟"

"اسے مارنا اتنا آسان نہیں۔ یہ مرنے سے پہلے ہم میں سے دو چار کو مار ہی ڈالے گا اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ آؤ اس سے بات کریں۔" چھٹے سیلنے نے فیصلہ دیا تو میری جان میں جان آئی۔

میں پونگ کا سر تلوار کی نوک پر اُٹھاتے ہُوئے اُن کی طرف پلٹا اور بولا۔ "تمھارا فیصلہ بڑا دانش مندانہ ہے۔ میں پونگ کا سر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم دُوسری چوکی کو اطلاع کے ساتھ ساتھ یہ خوشخبری بھی سُنا دو کہ انھیں بھی بیویاں ملیں گی۔ میں سب کو آسائشیں بھی فراہم کروں گا۔ تم سوچتے ہوگے کہ کیسے؟ دیکھو جس طرح میں یہاں کا سردار بنا ہُوں، اسی طرح جمشیدیوں کا بھی سردار بنوں گا اور اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔"

میں نے یہ بات اس لیے کی تھی کہ اگر جھُوٹ بولنا اور دھونس جمانا پڑے تو پھر بلا جھجک بہت بڑی بات کرنی چاہیے۔ صرف اسی طرح اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں... مگر میں نے دیکھا کہ وہ ابھی تک تذبذب میں مُبتلا تھے۔

میں نے اپنے جھُوٹ اور دھونس میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک اور چال چلی۔ پونگ کے سر سے تلوار نکالتے ہُوئے میں نے اُن میں سے ایک سے کہا: "اسے لے جاؤ اور کسی تھیلے میں ڈال کر لے آؤ۔ جاؤ۔ دیر مت کرو۔"

اُس نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو خاموش کھڑے رہے پھر وہ آگے بڑھا اور پونگ کا سر اُٹھا کر جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

اُس کے ساتھی اُسے جاتا دیکھتے رہے۔

میری دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوگئیں۔ وہ میری دھونس میں آگئے تھے مگر پُوری طرح نہیں۔ میں نے ترُپ کا ایک اور پتّہ پھینکا اور تلوار زمین پر رگڑ کر صاف کرتے ہُوئے بولا...

"سمجھنے کی کوشش کرو کاشیو!... اگر تم مجھ سے لڑتے ہو تو تم میں سے کچھ میرے ہاتھوں میں ضرور مارے جائیں گے لیکن اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ جمشیدیوں میں پہنچ جاؤں اور اُن کا سردار بن جانے کے بعد اپنا وعدہ نبھاؤں تو تم کتنے فائدے میں رہو گے؟ سب کو ایک ایک بیوی مل جائے گی۔ مجھے آزما کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟"

مجھے جمشیدیوں میں پہنچ کر سردار بننے اور کاشیوں کو بیویاں فراہم کرنے کی کوئی تمنا نہیں تھی۔ یہ میں تو جانتا تھا مگر کاشی نہیں جانتے تھے۔ وہ بار بار بیوی کا تذکرہ سُن کر میرے جھانسے میں آ ہی گئے۔

اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور بولے: "ہم میں سے چھ نے تمھارے حق میں اور تین نے تمھارے خلاف مشورہ دیا ہے، سرفروش۔ اس لیے تم جا سکتے ہو مگر اپنا وعدہ نہ بھُول جانا۔"

جب وہ اپنا فیصلہ سُنا کر جھونپڑے میں چلے گئے تو میں دیپا کے پاس گیا اور اُسے لے کر جھونپڑے سے دُور ایک لمبا چکر کاٹتے ہُوئے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اُس وقت تک نہ تو دیپا کے کسی سوال کا جواب دیا اور نہ ہی اپنی رفتار کم کی جب تک کہ وہ جھونپڑا یا چوکی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

پونگ سے میرا مقابلہ دیکھنے کے بعد دیپا مجھ سے بے حد متاثر ہوگئی تھی۔

جب دُوسری چوکی قریب آئی تو اُس نے مجھے پہلے سے بتا دیا۔

"وادی میں جانے کا کوئی دُوسرا راستہ بھی تو ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... صرف ایک ہی درّہ ہے اور اس پر کاشیوں کی چوکی ہے۔"

"تو پھر ہم اُدھر سے نہیں جائیں گے۔ ورنہ اس بار وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں آقا۔ میں بلا چُون و چرا آپ کے حُکم کی تعمیل کروں گی۔"

میں نے اُس کے بدلے ہُوئے لب و لہجے اور رویّے پر اُسے تیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا: "یہ طے ہو چُکا ہے کہ تم مجھے آقا نہیں بلکہ سرفروش کہہ کر مخاطب کیا کرو گی۔"

دیپا کی آنکھیں مُسکرا رہی تھیں لیکن اُس نے ہونٹوں پر آنے والا تبسّم روک لیا... اور پھر ہم دونوں ہی کھِل کھلا کر ہنس دیے۔

⧉

دیپا ٹھیک ہی کہتی تھی کہ وادی میں داخل ہونے کا صرف وہی ایک راستہ تھا جس پر کاشیوں کی چوکی تھی لیکن میں نے اپنی کوہ نوردی کے تجربوں سے کام لیتے ہُوئے پہاڑ عبُور کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ ہر چند کہ یہ ایک حماقت تھی مگر میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نہ تو واپس جا سکتا تھا اور نہ ہی درّے کی جانب بڑھ سکتا تھا۔

جُوں جُوں چڑھائی بڑھتی گئی، سردی میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور راستے کی دُشواریوں میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ دیپا کی حالت سردی کے مارے غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جب اُس سے چلنا دوبھر ہوگیا تو میں نے

اُسے اپنی پیٹھ پر اُٹھا لیا اور اُس وقت تک سفر جاری رکھا جب تک کہ شام کا اندھیرا گہرا نہ ہوگیا۔

اب اندھیرے میں آگے بڑھنا خُود موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے میں نے رات بسر کرنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنا شروع کر دی تاکہ ٹھنڈی ہَوا سے کچھ تو تحفظ حاصل ہو سکے۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے ایک ایسی جگہ بھی مِل گئی۔ یہ دو چٹانوں کے درمیان ایک غار سا تھا۔ میں اس اندھیرے غار میں داخل ہوگیا۔

ابھی میں نے دیپا کو اپنی پیٹھ سے اُتارا ہی تھا کہ اندھیرے میں کسی جانور نے مجھے اتنے زور سے ٹکر ماری کہ میں لڑکھڑاتا ہُوا دُور جا گرا۔ اگر فوری طور پر نہ سنبھلتا تو دو قدم دُور رہ جانے والی ڈھلان سے قلابازیاں کھاتا ہُوا ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا گرتا۔

اُس جانور کی ٹکر سے مجھے یہ محسوس ہوگیا تھا کہ اُس کا صرف ایک بڑا سا سینگ مجھے اتنے زور سے لگا ہے جس نے مجھے اس بُری طرح اُچھال دیا ہے۔ میں نے کمر کی پیٹی سے چقماق کا چاقو نکالا اور فوراً ایک طرف ہٹ گیا کہ وہ جانور ڈکراتا ہُوا پھر میری طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے اپنا ایک بازو اپنے چہرے پر ڈھال بنا لیا تاکہ اُس کی ٹکر کہیں مجھے اندھا ہی نہ کر دے اور دُوسرے ہاتھ میں چاقو تھام کر انتظار کرنے لگا کہ وہ کب مجھ پر حملہ کرتا ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ اندھیرے میں مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں اُس نے پھر مجھے ٹکر ماری جو میرے کندھے پر لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے بجلی کی سی پھُرتی سے اُس کا ایک سینگ پکڑ لیا اور اُچک کر اُس کی گردن پر سوار ہوگیا... پھر میں دیوانہ وار اُس پر چاقو سے حملہ کرنے لگا۔ وہ جانور بھی بہت طاقتور لگتا تھا۔ اُس کی گردن پر لمبے لمبے بال تھے، اس لیے چاقو آسانی سے اُس کی گردن میں پیوست نہیں ہوتا تھا۔ دُوسرے اب وہ بُری طرح اُچھل اُچھل کر مجھے گرانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں وہ بدبخت ڈھلان کی طرف نہ مُڑ جائے ورنہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے مرے گا... مگر اس کُود پھاند کے دوران جانور نے لاتیں، مُکّے، نوچ کر وحشیوں کی طرح اُس کی گردن پر وار کرنے لگا۔

خُون کے فوّارے مجھے تر بتر کرنے لگے مگر میں دیوانگی اور جوشِ وحشت میں اُس پر مسلسل وار کرتا رہا۔ وہ ٹھنڈا ہوگیا لیکن میرا چاقو والا ہاتھ پھر بھی نہ رکا۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مر چکا ہے تو میں نے اپنی دیوانگی پر ایک قہقہہ لگایا اور دیپا کے پاس پہنچ گیا۔

وہ اندھیرے میں سردی کے مارے گٹھری بنی ہُوئی تھی۔ میں نے ٹٹول کر اُسے چھُوا تو وہ بولی: "میں سردی سے مر رہی ہُوں۔ تم بھی صبح تک زندہ نہیں بچو گے۔"

"نہیں دیپا۔ ہم دونوں زندہ رہیں گے۔ میں ابھی تمھیں سردی سے نجات دلاتا ہُوں۔" اُسے دلاسا دے کر میں دوبارہ اُس مُردہ جانور کے قریب آیا اور ٹٹول ٹٹول کر اُس کی کھال اُتارنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے نیم بے ہوش دیپا کو اُس خُون آلُود کھال میں لپیٹ دیا۔ تھوڑی دیر بعد دیپا کو ہوش آگیا۔

"او سرفروش مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنی ماں کی آغوش میں ہُوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"سو جاؤ..." میں نے کہا اور خُود بھی اُس کھال کے ساتھ پیٹھ لگا کر سو گیا۔

✵

دو روز بعد ہم پہاڑ کی چوٹی عبُور کر چکے تھے اور اب ڈھلان کا سفر کر رہے تھے۔ پہاڑی مینڈھے کی وہ کھال ہمارے پاس تھی مگر تیسرے روز وادی میں پہنچنے کے بعد ہم نے اُسے پھینک دیا۔ دیپا نے بتایا کہ ابھی اُس کے شہر تک پہنچنے میں کئی دن لگیں گے۔

"وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہمیں نہا دھو لینا چاہیے۔ ورنہ تمھارے قبیلے کے لوگ ہمیں اس حال میں دیکھ کر کوئی شیطانی مخلوق سمجھیں گے اور مار ڈالیں گے یا خُود ہی خوف سے مر جائیں گے۔"

...اور میں نے اُسے جھُوٹ نہیں کہا تھا۔ میرے جسم پر اب بھی مینڈھے کے خُون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ دیپا بھی لڑکی کی بجائے بھُتنی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے چہرے خاک آلُود تھے اور ہمارے جسموں سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اب ہمیں کسی چشمے یا پہاڑی ندی کی تلاش تھی۔

راستہ چلتے چلتے اچانک ہی مجھے اپنی کنپٹیوں میں درد کی ٹیسیں سی محسوس ہونے لگیں۔ ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے تلاش کر رہا تھا۔ وہ مجھے کسی بھی وقت بُلا سکتا تھا۔ کل، پرسوں، ایک ہفتے یا ایک گھنٹے بعد... میں نے دیپا کی طرف دیکھا اور مجھے اُس بھُتنی پر پیار آگیا۔

ٹیسیں تھوڑی دیر بعد ختم ہوگئیں۔

تین روز بعد ہم ایک ایسے شہر میں پہنچے جو شاید صدیوں سے ویران پڑا تھا۔ اس مُردہ شہر میں چھوٹی چھوٹی نہروں کا جال سا بچھا ہُوا تھا مگر اب ان میں پانی کی بجائے گھاس پھُونس اور جھاڑیاں اُگی ہُوئی تھیں۔ جگہ جگہ مکانوں اور معبدوں کے کھنڈر رفتگان کا ماتم کر رہے تھے۔ کہیں کہیں ایسے مجسّمے بھی استادہ تھے جیسا میں نے جبل پر دیکھا تھا۔ ان مجسّموں کے چبوتروں پر کسی عجیب سی زبان کے الفاظ کندہ تھے۔ جنھیں دیپا بھی نہ پڑھ سکی۔ اُس نے صرف اتنا بتایا کہ کسی زمانے میں اُس کی قوم یہاں آباد تھی مگر چونکہ لوگوں نے آسمانی کتابوں کی تعلیمات سے

گردگردانی کر لی تھی۔ اس لیے انھیں اپنے اس شہر سے بھی جلاوطن ہونا پڑا۔
ہم کئی گھنٹے اس مُردہ شہر میں گھومتے رہے۔

ہمارے پاس وہ پہاڑی برف بھی ختم ہو چکی تھی جسے چُوس چُوس کر ہم اپنی پیاس بجھاتے آئے تھے۔ اب ہمیں شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔۔ مگر وہاں پانی کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چلتے چلتے ہم ایک بڑے معبد کے پاس پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ ایک چھوٹی سی جھیل کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ مجھے اس بات پر بڑا تعجب تھا کہ جب شہر کی ہر ندی گھاس پھونس سے اٹ گئی ہے اور باؤلیاں خشک ہو چکی ہیں تو یہاں پانی کہاں سے آگیا؟ پھر خیال آیا کہ غالباً اس ننھی سی جھیل کی تہ میں کوئی چشمہ ہوگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں پانی لیا تو وہ بہت ٹھنڈا اور میٹھا نکلا۔ ہم نے پہلے تو خوب ڈٹ کر پانی پیا اور پھر نہانے کے لیے اس میں اُتر گئے۔

غسل کے بعد میں جھیل کے کنارے لیٹ گیا۔

دیپا ایک بار پھر حسین سامری مجسمہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ عبادت کرنا چاہتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے باری باری مشرق اور مغرب کی طرف مُنہ کر کے اور ہاتھ اُوپر اُٹھا کر دل ہی دل میں کچھ پڑھا اور مجھے بتایا کہ وہ اُس پہاڑی جانور کی رُوح کے لیے دُعا مانگ رہی تھی جس کی کھال نے اُسے موت کے مُنہ سے بچایا تھا اور جس کے گوشت سے ہم اب تک پیٹ بھرتے آئے تھے۔

گوشت کا ذکر آتے ہی میری بھوک چمک اُٹھی مگر وہاں اب تک کوئی شکار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یہاں سے چلو ورنہ بھوکوں مر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ..." وہ بولی۔ "بھوک مجھے بھی لگ رہی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ کچھ فاصلے پر ایسے درخت ہیں جن کے پھل بہت میٹھے ہوتے ہیں۔"

ہم دونوں تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔

اچانک ایک آواز نے میرے قدم روک لیے۔

مجھے رُکتا دیکھ کر دیپا بھی رُک گئی۔ "رُک کیوں گئے؟" اُس نے پُوچھا۔ "تمھیں کوئی آواز سنائی دے رہی ہے؟"

"نہیں تو ..." وہ حیرت سے بولی۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اُسے وہ آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔۔ مگر ڈاکٹر فریدوں نے میرے دماغ پر جو سائنسی عمل کیے تھے، ان سے میری قوتِ سماعت بھی بہت بڑھ گئی تھی اور میں نے کسی کی سرسراہٹ سُن لی تھی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بالآخر وہ مجھے دکھائی دے گیا۔ ہم سے کوئی پچاس گز دور ایک بہت بڑا اژدہا درخت کے ٹہنے سے لٹکا ہوا تھا۔ اگر میری سماعت تیز نہ ہوتی تو ہم چند منٹوں بعد اُس کے پیٹ میں آ گئے ہوتے۔ میں نے دیپا کو وہ اژدہا دکھایا اور پھر ہم راستہ کاٹ کر بھاگتے چلے گئے۔

چند میل آگے جا کر ہم اُن درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئے جن پر وہ پھل لگے ہوئے تھے۔ اُن کی شکل تو سیب جیسی تھی مگر وہ جسامت میں تربوز سے کم نہیں تھے۔ میں نے درخت پر چڑھ کر چار پانچ پھل توڑے۔ اُن کا چھلکا بہت سخت مگر گُودا نرم اور شیریں تھا۔ تین پھل کھانے سے ہی ہمارے پیٹ بھر گئے اور ہم آگے بڑھ گئے۔

اب ہمارے سامنے بڑا ہی خوبصورت علاقہ تھا۔

دونوں طرف چھوٹی چھوٹی آبشاریں اور ندیاں تھیں۔ میں نے رات گزارنے کے لیے ایک آبشار کے ساتھ مسطح چٹان منتخب کی اور ہم سرِ شام ہی سو گئے چونکہ ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے لیٹتے ہی ہمیں نیند بھی آ گئی تھی۔

علی الصباح جب میری آنکھ کھلی تو فضا میں ایک عجیب سی بُو رچی ہوئی تھی اور یہ بُو ایسی ہی تھی جیسے کہیں گوشت جل رہا ہو۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر میری نگاہ دُھویں کی ایک لکیر پر جا پڑی جو وادی سے اُوپر اُٹھتی چلی گئی تھی۔

یہ کیسی آگ اور کیسا دُھواں تھا؟ یہ جاننے کے لیے میں نے دیپا کو جگانا چاہا مگر اُسے نیند میں مسکراتے دیکھ کر رُک گیا۔ شاید وہ کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہی تھی اور خود بھی بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ ماضی کے ہر سفر میں مجھے خوبصورت لڑکیاں ملی تھیں اور ہر لڑکی اپنی مثال آپ تھی۔ دیپا کو دیکھ کر مجھے تاشیبہ اور لالی یاد آ گئیں۔ انھوں نے بھی مجھے کیسا ہی کی طرح ٹوٹ کر چاہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے سر میں درد کی شدید لہریں اُٹھتی محسوس ہوئیں۔ ڈاکٹر فریدوں اور اُس کا کمپیوٹر میری تلاش میں تھے اور شاید کمپیوٹر نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر میں دُھویں کے بادل سے اُٹھ رہے ہوں اور یہ دُھواں کسی شور مچاتے راکٹ سے خارج ہو رہا ہو۔ ڈاکٹر فریدوں شاید مجھے واپس بُلانے کی تیاری کر رہا تھا مگر میں ابھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور چٹان پر لوٹنے لگا کہ درد میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

دفعتہً مجھے اپنے چہرے اور سر پر برف سی گرتی محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ دیپا میرے مُنہ پر آبشار کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی اور دہشتی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "کیا ہُوا ... تمھیں کیا ہو گیا ہے سرفروش؟"

میں نے سر جھٹکا اور اُٹھ بیٹھا۔ دیپا روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں بالکل ٹھیک

ہُوں دیپا۔ تم نے مجھے کیوں جگا دیا اور یہ پانی ؟ کیا میں کل نہایا نہیں تھا ؟"

"مگر تم نیند میں بڑبڑا رہے تھے، رو رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ مجھے یُوں لگا جیسے تمھارا جسم تو یہاں ہے مگر تمھاری رُوح کہیں چلی گئی ہے۔ تم مجھے اکیلا چھوڑ گئے ہو۔ میں بہت ڈر گئی تھی سرفروش۔ مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ اُسے کیا معلوم کہ میں کسی وقت بھی ذرّوں میں تبدیل ہو سکتا تھا۔

میری سمجھ میں نہ آسکا کہ ڈاکٹر فریدوں آتنی جلد واپسی کے درپے کیوں ہے ؟

میں نے دیپا کی توجہ ہٹانے کے لیے دُھویں کی بلند ہوتی لکیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پُوچھا۔ "یہ دُھواں اور بُو کیسی ہے ؟"

"شاید وہ مُردے جلا رہے ہیں۔ میں نے کبھی مُردے نذرِ آتش ہوتے تو نہیں دیکھے لیکن اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ ہمارے ہاں کبھی کبھی زرد موت کی وَبا آتی ہے جس سے ہزاروں انسان مر جاتے ہیں اور اُنھیں زمین میں دفن کرنے کی بجائے نذرِ آتش کیا جاتا ہے۔"

میں یہ سُن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اگر یہاں کوئی وَبا پھُوٹی ہُوئی ہے تو میں بھی اُس کا شکار ہو سکتا ہُوں۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ پھر میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

"یہ زرد موت کی وبا ہے کیا بلا ؟" میں نے پُوچھا۔

"میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔" وہ بولی۔ "بڑے کہتے ہیں کہ ہر جشیدی کو زندگی میں ایک بار اس وَبا کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ پہلے اِس مرض کا شکار شدید سر درد میں مُبتلا ہوتا ہے، پھر اس کی بغلوں میں گلٹیاں سی پیدا ہو جاتی ہیں، ناک اور کانوں سے خُون رِسنے لگتا ہے، اُس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے اور آخر میں وہ ہنستے ہنستے مر جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے قہقہوں والی موت کی وبا بھی کہتے ہیں۔"

"قہقہوں والی موت ؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔

"ہاں۔ جب مریض کا آخری وقت آتا ہے تو وہ قہقہے لگانے لگتا ہے۔ یہ قہقہے دراصل موت کی چاپ ہوتے ہیں اور سب سمجھ جاتے ہیں کہ اب وہ نہیں بچے گا۔"

"مریض کتنی دیر تک قہقہے لگاتا ہے ؟"

"کبھی گھنٹوں اور کبھی چند منٹ۔۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے کوئی ایسا مریض کبھی نہیں دیکھا۔"

اس کے بعد میں نے دیپا سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ ہم چُپ چاپ آگے بڑھتے رہے اور اُس مقام کے قریب آ گئے جہاں مُردے جلائے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر جشیدی ایسی خطرناک وَبا کا شکار ہیں تو یقیناً ان میں افراتفری پھیلی ہوئی ہو گی۔ وہ خوفزدہ ہوں گے اور ایسے حالات میں اُنھیں زیر کرنا مشکل نہیں ہو گا۔

کچھ دیر بعد ہم ایک بستی کے قریب پہنچ گئے۔ جس کے مکانات مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے تھے۔ کچھ مکانوں کے دروازوں پر زرد نشان پڑے ہُوئے تھے۔ میں نے اُن کے بارے میں دیپا سے کوئی سوال نہیں کیا۔

بستی کے بعد مجھے پہلا شمشان دکھائی دیا۔ یہ تقریباً بیس فٹ گہرا اور سو فٹ مربع نما گڑھا تھا جس میں مَردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے۔

"وہ دیکھو۔ ہمارے شہر کی عمارتیں نظر آ رہی ہیں۔"

میں نے ادھر نگاہ ڈالی تو واقعی شہر کی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چھکڑوں کی ایک قطار بھی آتی دکھائی دی۔ ان چھکڑوں میں زرد موت کے شکار ہونے والے مُردے بھرے ہوئے تھے۔

ہم تربوزی سیبوں والے درختوں کے ایک جُھنڈ میں چھپ کر یہ دلخراش منظر دیکھنے لگے۔ مُردے جلانے والے، چھکڑوں سے لاشیں گڑھے میں پھینکتے، اُن پر کوئی تیل چھڑکتے اور آگ لگا دیتے۔ اُنھیں اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ آنکھ اُٹھا کر بھی ادھر اُدھر دیکھتے۔

میں نے مُردے لانے اور جلانے والوں کو غور سے دیکھا، وہ زرد رنگ کپڑے پہنے ہُوئے تھے۔ اُن کے سینے اور بازو کھلے ہُوئے تھے لیکن اُن کے چہرے زرد رنگ کے لمبے لمبے نقابوں میں چھپے ہُوئے تھے جن کے زرد سوراخوں سے وہ دیکھ سکتے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی... مگر دیپا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"آؤ سرفروش۔ میں یہ منظر نہیں دیکھ سکتی۔ یہاں قریب ہی میرے کچھ عزیز رہتے ہیں۔ وہاں ہمیں کھانا اور لباس مِل جائے گا۔ چلو۔"

ہم چُھپتے چُھپاتے شہر کے باہر ایک ایسے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے جو ایک پہاڑی پر انھی تربوزی سیبوں والے درختوں کے ایک کُنج میں بنا ہُوا تھا۔ یہاں دیپا نے مجھے دو بُوڑھی عورتوں اور ایک لحیم و شحیم آدمی سے متعارف کروایا۔ وہ عورتیں دیپا کی پھوپھیاں تھیں اور موٹا آدمی غالباً اُن کا محبُوب یا شوہر تھا۔ اُس کا نام موک تھا۔ اُن لوگوں نے ہماری خاطر و مدارت کی اور ہمیں صاف ستھرے لباس بھی دیے جو سُوت سے کھڈیوں پر بنے ہوئے کپڑے کے تھے۔

دیپا اپنی پھُوپھیوں کے ساتھ دُوسرے کمرے میں چلی گئی۔ موک مشروب کا ایک لوٹا لے کر میرے پاس آ بیٹھا۔ یہ مشروب اُنھی تربوزی سیبوں سے بنایا گیا تھا اور بہت تیز و تلخ تھا۔ چونکہ مجھے مو...

...معلومات حاصل کرنا تھیں، اس لیے میں اُس کی ہاں میں ہاں ملانے اور پینے لگا۔

"بُوڑھی ملکہ جھیل میں تیرتے چبوترے پر اپنے خیمے میں دم توڑ رہی ہے اور سازندے بار بار وہی ایک ہی دُھن بجائے جا رہے ہیں جو بُوڑھی ملکہ کو بہت مرغوب ہے۔ جب بوڑھی ملکہ مر جائے گی تو ننھی شہزادی دلآرا تاج و تخت سنبھالے گی... مگر یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب دلآرا زندہ رہ جائے... اس لیے کہ بُزرگِ دانشمند اور کمان داروں کے درمیان اقتدار کے حصُول کی چپقلش جاری ہے۔"

موک پیالے بھر بھر کر خُود پیتا، مجھے پلاتا اور مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ گو مجھے سخت متلی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر مجھے مُلک خاص طور پر دارالحکومت میں رُونما ہونے والے تازہ ترین واقعات معلومات حاصل ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے دیپا کے اشاروں پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جو بار بار دُوسرے کمرے سے سر نکال کر مجھے اپنے پاس بُلا رہی تھی۔

مَیں نے موک کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ یہاں بھی ہمارے دور کی دُنیا کی طرح حصولِ اقتدار کے لیے سازشوں اور مکر و فریب سے کام لیا جا رہا ہے۔

"مجھے بزرگِ دانشمند کے بارے میں کچھ بتاؤ کہ وہ کون ہے ؟ کیا وہ وزیر ہے یا ملکہ کا مشیرِ خاص ہے ؟" مَیں نے پُوچھا۔

"وہ بڑا عیّار اور مکّار آدمی ہے پردیسی ! جتنا میں فربہ ہوں اتنا ہی دُبلا ہے، اس کی کھوپڑی پر ایک بال بھی نہیں مگر اس کا سینگ جیسا بہت بڑا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ساحرانہ قوتیں بھی رکھتا ہے۔ وہ بوڑھی ملکہ کا وزیرِ اعلیٰ، دستِ راست اور مشیرِ خاص ہے بلکہ ملکہ تو برائے نام ہے ورنہ حکومت وہی کرتا ہے۔ اب اگر ننھی شہزادی اُس کے قابو میں نہ رہی تو وہ اُسے قتل کروا دے گا۔"

اتنا کہہ کر موک رُکا، اُس نے پیالہ خالی کر کے دوبارہ بھرا اور بولا۔ "مجھے ننھی شہزادی پر ترس آتا ہے میرے دوست ! وہ بہت معصوم اور بے حد حسین ہے۔"

مَیں نے ایک کھُلے ہُوئے دریچے سے باہر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا اور چاند ابھی طلوع نہیں ہُوا تھا۔ ہوا میں مُردے جلنے کی ہلکی ہلکی بساندرچی ہُوئی تھی۔

مَیں نے موک کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ کچھ کر گزرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں وقت پھر نہیں آ سکتا۔ موک نے یہ بھی بتایا تھا کہ بُزرگِ دانشمند کی اپنی خصوصی سپاہ بھی ہے اور خفیہ مخبر بھی جو اُسے پل پل کی خبریں بہم پہنچایا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُسے میرے یہاں آنے کی خبر بھی مِل چُکی ہو۔

موک مسلسل پیتا اور بولتا رہا مگر مَیں نے معذرت کر لی۔

اس دوران دیپا بھی شاید مایوس ہو کر سو گئی تھی اور اس کی پھُوپھیاں تو شام سے پھر دِکھائی ہی نہیں دی تھیں۔ بالآخر موک نے بڑے زور سے ایک ڈکار لی اور اُسی چوبی چوکی پر لیٹ گیا جس پر ہم بیٹھے ہُوئے تھے۔ میں اسی وقت کا منتظر تھا۔ جلدی سے اُٹھ کر گھر سے نِکل گیا۔ حلق میں اُنگلی ڈال کر قے کی اور پھر اندر آ کر اُس کمرے میں چلا گیا جس کے دروازے سے دیپا اشارے کر رہی تھی۔

وہ اُس کمرے میں تنہا ایک چٹائی پر پڑی تھی۔ میری راہ دیکھتے دیکھتے اُسے نیند آ گئی تھی۔ مَیں بڑی آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

چراغ کی ٹمٹماتی لَو میں وہ مجھے کسی بچّے کی طرح معصوم نظر آئی۔ ویسے بھی وہ بمشکل بارہ تیرہ سال کی تھی اور اس نے بچپن کی دہلیز ابھی ابھی پار کر کے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ پہلے تو مَیں نے اُسے جگانا چاہا مگر یہ سوچ کر رُک گیا کہ مَیں جس مہم پر جانے والا ہُوں، وہ اس سے بے خبر اور لاتعلق ہی رہے تو بہتر ہے۔ اگر میرا منصوبہ ناکام ہو گیا تو وہ مجھ سے لاتعلق ہونے کی بنا پر محفوظ و مامون رہے گی۔ بصورتِ دیگر اُسے میری وجہ سے سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔۔۔ اور اگر مَیں اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو خود ہی اُسے ڈھونڈ لوں گا یا اُسے اپنے پاس بُلوا لوں گا۔

یہ سوچ کر میں نے اُس پر پیار بھری ایک الوداعی نِگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ موک چوکی پر لیٹا بڑے زور سے خرّاٹے لے رہا تھا۔ مَیں دبے قدموں چلتا ہُوا گھر سے نِکل گیا۔

چاند ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ مَیں اُس کی مدھم روشنی میں پہاڑی سے اُترا اور اُسی راستے پر چل پڑا، جدھر سے دیپا کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ دُور سے شمشان کے شعلے بھی میری رہبری کر رہے تھے۔ مَیں جلد ہی شمشان کے قریب پہنچ گیا اور تقریباً سو گز کے فاصلے پر چھُپ کر کھڑا ہو گیا اور اُسی لمحے مَیں نے اپنی زندگی کا وہ حیرت انگیز اور سنسنی خیز منظر دیکھا جس سے میری رُوح تک کانپ گئی۔

شعلے بھڑک رہے تھے اور لاشیں جل رہی تھیں لیکن مجھے یہ دیکھ کر شدید ترین حیرت کا جھٹکا لگا تھا کہ ایک شخص لاشوں کے سر الگ کر رہا تھا۔

مَیں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی اتنی سر بریدہ لاشیں نہیں دیکھی تھیں۔

*

اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لیے میرے پاس کھُدکا لباس اور پتھر کا ایک چاقو تھا۔ ہتھیار میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا بشرطیکہ

سوچا کہ جب وہ کڑے پہرے کے باوجود مجھے اپنے سامنے دیکھے گا تو مجھ سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا... اور ہماری یہ پہلی ہی ملاقات فیصلہ کن ہو گی۔ یا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا یا پھر موت میرا مقدر بن جائے گی۔

داخلی دروازے والے محافظ عمارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل کر پہرہ دینے لگے۔ ابھی پو پھٹنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ ساحل سے شاہی شامیانے کی طرف آنے جانے والے بجروں کے پھیرے ختم ہو گئے تھے مگر دور سے موسیقی کی لہریں اب بھی ہوا کے دوش پر یہاں تک پہنچ رہی تھیں اور اس کا مطلب تھا کہ ملکہ ابھی زندہ ہے۔

خشونی کی رہائش گاہ کے داخلی دروازے پر نصب مشعل کی روشنی میں محافظوں کے سائے کبھی سکڑ سمٹ جاتے اور کبھی طویل ہو جاتے تھے۔

میرے پاس ہتھیار کے نام پر صرف وہی ایک چقماق کا چاقو تھا جب کہ سپاہیوں کے پاس تلواریں خنجر اور بھالے تھے اور میں اُس وقت تک عمارت میں داخل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ دونوں کو ٹھکانے نہ لگا دوں۔ یوں تو انھیں ختم کر دینا میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن ان کی ہلکی سی آواز بھی دوسرے محافظوں کو ادھر متوجہ کر سکتی تھی۔ جس سے کھیل بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

جب سپاہی مسلسل چلتے ہوئے تھک گئے اور دم لینے کو رُک کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے تو میں بھاگ کر عمارت کے سرے پر باڑ کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔

محافظ کچھ دیر بعد پھر چلتے ہوئے عمارت کے سرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اب ایک محافظ میرے قریب تر آ رہا تھا اور دوسرا مخالف سمت میں جا رہا تھا۔

میری طرف آنے والا سپاہی اپنے قومی گیت کی دھن گنگناتا ہوا جب مجھ سے تین قدم آگے نکل گیا تو میں نے ایک دم اُٹھ کر پیچھے سے اپنا ایک ہاتھ اُس کے منہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اس کے نرخرے پر پھیر دیا۔

اُسے اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ وہ ذرا سی بھی جدوجہد ہی کر سکتا۔ اس کے گلے سے بہنے والے خون نے نہ صرف اس کی وردی تر بتر کر دی بلکہ میرے کپڑے بھی خون آلود ہو گئے... مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی بلکہ ان کا خون آلود ہونا میرے حق میں اچھا ہی تھا۔

میں نے جلدی سے سپاہی کو باڑ کی طرف گھسیٹا اور اُس کی تلوار اپنے قبضے میں کر لی جو چھوٹی مگر چوڑی اور دو دھاری تھی۔ میں نے جلدی سے تلوار کی پیٹی اپنی کمر کے گرد باندھی اور لاش باڑ کی جڑوں

میں پھینک کر سپاہی کی طرح داخلی دروازے کی طرف بڑھنے کو تیار ہو گیا۔ جونہی دوسرا محافظ عمارت کے سرے سے پلٹا میں آگے بڑھنا شروع کر دیا مگر درختوں کی چھاؤں سے گزرتے ہوئے میں نے تلوار پیٹی سے نکال لی اور اسے ٹانگ سے چپکا لیا تاکہ دور سے محافظ کی نظر اس وقت تک اُس پر نہ پڑ سکے جب تک وہ میری زد میں نہ آ جائے۔

...اور جب وہ تلوار کی زد میں آیا تو پہلے اُس کی گردن کٹی، کیونکہ میں نہ تو اس کا ساتھی تھا اور نہ ہی جمشیدی جو قدوقامت میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ وہ بے چارہ صرف اتنا ہی کہہ سکا: "بڑے شیطان کیسے بن گئے، نادری؟"

دوسرے لمحے اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔ میں نے اس کو مشعل کی روشنی کے دائرے سے گھسیٹ کر اندھیرے میں باڑ کے پاس پھینکی اور عمارت میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک کشادہ راہداری تھی جس میں چھوٹی سی شمع روشن تھی۔ میں نے تلوار سے لگے خون سے اپنے چہرے اور آنکھوں کے گرد لکیریں کھینچیں تاکہ زیادہ سے زیادہ خوفناک نظر آؤں اور پھر اوپر جانے والا زینہ طے کرنے لگا۔

اوپر کوئی محافظ نہیں تھا۔

وہاں بھی ایک ہی موٹی شمع جل رہی تھی۔

ایک کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ اس طویل و عریض کمرے میں کسی قسم کی تزئین و آرائش نہ تھی۔ ایک کونے میں بہت بڑی میز پر کاغذوں اور کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور دوسرے کونے میں ایک بستر پر بزرگ خشونی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔

میں دبے قدموں اُس کے قریب پہنچا اور اُس کے نوکِ شمشیر چبھوتے ہوئے بولا: "اُٹھ اے بزرگ دانشمند۔ ہوشیار خشونی اور استقبال کر موت کے فرشتے کا..."

خشونی کے تربوز نما سر سے چادر ہٹی اور اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھے گھورنے لگیں۔ میں اُس کے سامنے خون آلود اور خوفناک چہرہ لیے کھڑا تھا مگر خشونی کی پرسکون اور گمبھیر آواز سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"تم بڑے احمق ہو مُردہ بردار... ابھی میں زندہ ہوں۔ اپنا کام کرو اور مجھے آرام سے سونے دو۔" وہ بولا۔

میں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے قہقہہ لگایا: "میں مُردہ بردار نہیں ہوں اور یہ حقیقت تم اچھی طرح جانتے ہو

بے بننے کی کوشش نہ کرو اور یہ بتاؤ کہ تم پوری طرح بیدار ہو کر میری بات سمجھنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

خشونی پہلے میری طرف دیکھتا رہا پھر اُسی گمبھیر لہجے میں بولا۔ "تم ہمارے مُردہ بردار نہیں ہو... مگر تم کون ہو؟ یہاں کیسے پہنچے اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمھارے محافظوں کو تہ تیغ کرنے کے بعد یہاں پہنچا ہوں اور اُسی آسانی سے تمھیں بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں... اگر تم نے چون و چرا میرے احکامات کی تعمیل نہ کی تو یہ تربوز کاٹ کر تمھارے قدموں میں رکھ دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے یوں تلوار بلند کی جیسے اس کا تربوز نما سر کاٹنے کے لیے تیار ہوں۔

خشونی کا گھنٹی والی رسی کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رُک گیا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ بولا مگر یہ کہتے ہوئے اُس کی پلکوں سے محروم آنکھوں میں خوف کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ میرا مدمقابل میرے جوڑ کا تھا اور میں اس پر صرف طاقت سے ہی قابو پا سکتا تھا، فہم و فراست سے نہیں۔ میں نے تلوار پیٹی میں اُڑسی اور کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"سنو خشونی۔ تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے کیونکہ تم میری بات پوری طرح نہیں سمجھ پاؤ گے یا بہت کم سمجھو گے۔"

خشونی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم میرے چہرے مہرے اور قدوقامت سے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں نہ تو جمشیدی ہوں اور نہ ہی تمھاری دُنیا کا آدمی ہوں۔ میں زمان و مکاں کا سفر کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں نہ تو کوئی دیوتا ہوں اور نہ ہی شیطان یا بھوت پریت ہوں۔ مجھے تمھارے دَور کی دُنیا میں ایک خصوصی مہم پر بھیجا گیا ہے۔ جب میں اپنا کام مکمل کر لوں گا تو مزید کشت و خون کیے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر تم میری یہ باتیں سمجھ گئے ہو تو میری مخالفت کی بجائے میرا ہاتھ بٹاؤ تاکہ میں جلد از جلد یہاں سے واپس جا سکوں۔"

"میں تمھارے ہر لفظ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ اگر ان کے کوئی اور معنے ہیں تو وہ بھی بہت جلد سمجھ جاؤں گا۔ یہ زمان و مکاں کے سفر کا نظریہ میرے لیے... کوئی نئی بات نہیں۔ میں فی الوقت تمھاری اس بات کا یقین رکھتا ہوں کہ تم جلد چلے جاؤ گے، گر تمھارا مقصد میرے مفادات کے خلاف ہوا تو میں تم سے دشمنی کر سکتا ہوں اور ایسا سوچنا بھی حماقت ہے... اور سنو: میں تم سے خائف بھی نہیں ہوں۔ اگر تمھیں مجھ کو قتل کرنا ہوتا تو کر چکے ہوتے۔ اس کا مطلب ہے تمھارا مفاد میری موت سے نہیں بلکہ میری زندگی سے وابستہ ہے۔"





خشونی بلاشبہ بے حد ذہین آدمی تھا اور اُس کا دماغ کسی کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی طور بھی خود کو مجھ سے برتر سمجھے اس لیے میں نے دوبارہ تلوار نکالتے ہوئے کہا: "یہ تربوز تو میں اب بھی کاٹ سکتا ہوں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا: "جب سودے بازی کرنے آئے ہو تو وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ صاف صاف کہو کہ تم کیا چاہتے ہو اور میں تمھیں کس نام سے مخاطب کروں؟"

"میرا نام سرفروش ہے۔ میں یہاں تنہا آیا ہوں اور یہاں سے اکیلا ہی واپس جاؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ بوڑھی ملکہ کب تک دم توڑ سکتی ہے؟"

"جمشیدی مجھے بزرگ دانشمند کہتے ہیں اور میں واقعی دانشمند بھی ہوں لیکن اس سوال کا جواب دینا میرے بس سے باہر ہے۔"

"مگر تم اندازہ تو لگا سکتے ہو؟"

"وہ ایک پل، ایک گھنٹے، ایک دن یا ایک ماہ بعد مر سکتی ہے۔ یہ میرا اندازہ ہے۔"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ اس کی ذہنی حالت کیسی ہے؟"

"اس کی ذہنی حالت مخدوش ہے۔ وہ ماضی کی سنہری یادوں کی دُھند میں بھٹکتی رہتی ہے یوں تو کوئی بات بڑی مشکل سے سمجھتی ہے لیکن اگر موسیقی ایک لمحے کے لیے بھی بند ہو تو وہ چیخ اُٹھتی

ہے کہ یہ نغمہ جاری رہے۔

میں یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

چند لمحوں بعد خشونی دوبارہ بول اٹھا: "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے کس طرح یونگ کا کام تمام کیا تھا لیکن اس کے بعد تم درّے والی چوکی سے نہیں گزرے تھے بلکہ غائب ہو گئے تھے۔ پھر تم یہاں کیسے پہنچے سرفروش؟"

میں نے دیپا کا تذکرہ کیے بغیر جواب دیا: "پہاڑ عبور کر کے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ جمشیدیوں کی تاریخ میں کوئی بھی پہاڑ عبور نہیں کر سکا۔"

"مگر میں جمشیدی نہیں ہوں۔ میں بڑی پُراسرار قوتوں کا مالک ہوں اس لیے میں نے وہ دشوار گزار پہاڑ عبور کر لیا اور اب تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ خیر یہ باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ ملکہ اپنے مفاد کی کوئی تجویز، مشورہ سمجھنے بوجھنے کی اہلیت رکھتی ہے یا نہیں؟"

"ہاں... بلکہ وہ ان دستاویزوں اور احکامات پر دستخط بھی کر لیتی ہے جو میں اسے پیش کرتا ہوں۔"

"وہ دستاویزات اور احکامات تمہارے حق میں ہوں گے خشونی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "تاکہ بوڑھی ملکہ کی موت کے بعد زیادہ سے زیادہ اقتدار کے مالک تم ہی بنے رہو اور ننھی شہزادی دلآرا تمہارے قابو میں رہے۔"

"تمہاری سوچ میری سوچ سے ہم آہنگ ہے، سرفروش۔" وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا: "اس کا مطلب ہے کہ ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں یا کم از کم ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ تاہم اتنا اور بتا دو کہ تم میرے ذریعے اپنے بارے میں ملکہ کو کیا کہلوانا اور کس قسم کے حکم نامے پر اس کے دستخط کروانا چاہتے ہو؟"

خشونی میرا مقصد سمجھ گیا تھا۔

"تم کسی حد تک میرا مقصد سمجھ گئے ہو۔ تم ملکہ سے تخلیے میں ملو گے اور اس سے کہو گے کہ آج رات تم نے خواب میں دیکھا کہ..."

"اور یہ کوئی جھوٹی بات بھی نہیں۔" وہ میری قطع کلامی کرتے ہوئے بولا: "میں اب تک وہ خواب... بلکہ دہشت ناک خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"تم ملکہ سے کہو کہ خواب میں تمہیں ایک اوتار کے آنے کی بشارت دی گئی تھی اور میں وہی اوتار ہوں جو جمشیدیوں کو دکھوں اور مصیبتوں سے نجات دلانے آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری مذہبی کتابوں میں بھی ایک ایسے اوتار کی بشارت دی گئی ہے جو جمشیدیوں کو مصائب سے نکال کر خوش حال زندگی فراہم کرے گا۔"

اس بات پر پہلی بار مجھے خشونی کی آنکھوں میں حیرت، احترام اور خوف کے ملے جلے تاثرات کی جھلکیاں دکھائی دیں۔ شاید وہ میری ان معلومات پر متعجب تھا جو مجھے دیپا اور موک سے حاصل ہوئی تھیں۔

"جمشیدیوں کے بارے میں مجھے تمہاری معلومات پر حیرت ہے۔" اس نے کہا۔

"پھر کیا میں اوتار نہیں ہو سکتا؟" میں نے پوچھا۔

خشونی نے پہلی بار کھل کر قہقہہ لگایا اور بولا: "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں احمق نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ میں وہی کروں گا جو تم چاہتے ہو اس لیے کہ اگر تم اپنے وعدے پر قائم رہے تو مجھے اس سے فائدہ پہنچے گا۔ میں ایک عملی ہوں۔ جب تم اپنے کہنے کے مطابق واپس چلے جاؤ گے تو اقتدار آپ مجھے مل جائے گا اس لیے یہ سودا طے ہو گیا۔"

"تم بہت چالاک ہو خشونی۔" میں نے اس کے دل کی بات سمجھتے ہوئے کہا: "تم جانتے ہو کہ اگر مجھے اوتار تسلیم کر لیا گیا تو تمہارے مخالف کمان دار ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اور ملکہ کی موت کے بعد بغاوت کرنا چاہتے ہیں، وہ نہیں کر پائیں گے۔"

یہ سن کر اس کی آنکھیں احترام سے جھک گئیں۔ "تم میرے اندازے سے کہیں زیادہ فہم و فراست کے مالک ہو اور تمہارے اندر واقعی اوتاروں والی صفت ہے حالانکہ میں نہ تو جمشیدیوں کی کتابوں پر اعتقاد رکھتا ہوں اور نہ ہی اوتاروں کو مانتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے لگا۔

خشونی کا قد پانچ فٹ سے بھی قدرے کم تھا اور وزن سے زیادہ سو پونڈ رہا ہو گا۔

کپڑے پہننے کے بعد اس نے تکیے کے نیچے سے ایک زنجیر نکالی اور گلے میں ڈالنے لگا کہ میں نے کہا: "ذرا ٹھہرو۔" پھر اس کے ہاتھ سے زنجیر لے لی اور اس کا جائزہ لینے لگا۔

زنجیر لوہے کی بنی ہوئی تھی اور اسے کاریگری کا ایک نمونہ کہا جا سکتا تھا۔ وہ کافی وزنی بھی تھی۔ خشونی نے زنجیر کے لیے بے تابی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ پہننے والی ہے۔ اگر تم نے واقعی میرے محافظوں کو قتل کر دیا ہے تو ان کی لاشیں بھی ٹھکانے لگانا پڑیں گی۔"

میں نے زنجیر اسے واپس کر دی۔

اس نے جلدی سے اسے گلے میں ڈالا اور بولا: "جمشیدیوں کی مذہبی کتابوں میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ اوتار

شہزادی سے شادی کرے گا... مگر میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا شوہر کوئی غیر معمولی آدمی ہی ہونا چاہیے اور تم ایک غیر معمولی انسان ہو۔"

"ننھی شہزادی کی عمر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دس سال..."

مجھے یہ سن کر بڑی خجالت محسوس ہوئی۔ وہ ایک دس سالہ بچی سے میری شادی کی سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا: "تم بڑے دور اندیش ہو خشونی... مگر یہ باتیں اس وقت سوچنے کی نہیں ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ بولا: "میں نے تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ یہ بات بھی تمہارے ذہن میں رہے۔"

میرا دل اس خبیث سے شدید نفرت کا شکار ہو گیا۔

• •

اگلے چند گھنٹوں میں مجھے خشونی کی اہمیت و اہلیت کا صحیح اندازہ ہو گیا۔ وہ ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا اور اس کے نوکر، سپاہی اور محافظ اس کے احکامات کی اندھا دھند تعمیل کرتے تھے۔

اس دوران مجھے ویسا ہی قیمتی لباس دے دیا گیا تھا جیسا خشونی استعمال کرتا تھا۔ اب مجھے تلوار بھی دوسری فراہم کر دی گئی تھی جس کی نیام اور دستے پہ یاقوت اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے خشونی سے ان کے بارے میں پوچھا۔

وہ بے نیازی سے بولا: "یہ پتھر قریبی پہاڑوں کی کانوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی قدر قیمت نہیں بس یونہی آرائش کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔"

میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ ان کانوں کا معائنہ ضرور کروں گا۔ اس سفر سے پہلے ڈاکٹر فریڈل نے مجھے ارضیات پر بہت سی کتابیں پڑھنے کو دی تھیں اور اب میں اچھا خاصا ماہر ارضیات بن چکا تھا۔ میں خام دھاتوں کو بخوبی پہچان لیتا تھا اور مٹی کی تہہ دیکھ کر یہ اندازہ بھی لگا لیتا تھا کہ یہاں سے تیل برآمد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ علم الارض کا مطالعہ مجھے اس لیے کروایا گیا تھا کہ کمپنی کے اس پروجیکٹ پر کروڑوں کی رقم خرچ ہو چکی تھی اور حکومت ان اخراجات کا نعم البدل چاہتی تھی۔ چنانچہ معدنی دولت کو اپنی دنیا اور دور میں منتقل کرنے کے لیے بھی تجربات جاری تھے۔

میں انھی سوچوں میں ڈوبا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ مجھے مُردے ڈھونے والا ایک چھکڑا دکھائی دے گیا۔ وہ ہر گھر کے سامنے رکتا تھا۔ لوگ اپنے گھروں سے مُردے لاتے تھے اور چھکڑے پر پڑے مُردوں پہ ڈھیر کر دیتے تھے۔ خشونی نے بتایا تھا کہ اس سے پہلے زرد موت کی وبا کبھی اتنی شدت سے نہیں پھوٹی تھی اور اب تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ممکن ہے وقت مجھے اس وبا سے بھی کوئی کام لینے کا موقع دے دے۔ چنانچہ میں خشونی کے گھر کی بالائی منزل سے اس چھکڑے اور دور شمشان سے اٹھنے والے دھوئیں کی طرف دیکھتا رہا۔ خشونی نے ان دو محافظوں کی لاشیں بھی اسی چھکڑے میں پھنکوا دیں اور کسی نے بھی اس سے کوئی سوال نہ کیا۔

اچانک مجھے دیپا یاد آ گئی۔

میں نے سوچا کہ وہ اپنی بہنوں کے پاس محفوظ ہے۔ وہ وبا کے ڈر سے شہر میں نہیں آئے گی۔ اگر میرا منصوبہ کامیاب رہا تو اسے بلوا لوں گا یا خود جا کر مل لوں گا۔ زرد موت کی یہ وبا یوں تو شہر کے باہر بستیوں میں بھی پھیل چکی تھی... مگر شہر میں اس کا زور زیادہ تھا۔

میں دیپا اور موک سے اس وبا کے پھوٹنے کی وجوہ پر بحث کرتا رہا تھا۔ جمشیدیوں کی راجدھانی میں نہ تو جوہڑ تھے اور نہ ہی پسو وغیرہ تھے... پھر کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اچانک میری نگاہ دور ایک مکان پر جا پڑی جس کی بالائی منزل کی کھڑکی سے ایک عورت نے ٹب سے کوئی چیز نیچے گلی میں انڈیلی تو وہاں سے گزرنے والا ایک راہ گیر اس سے لڑنے جھگڑنے لگا...

پھر یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس عورت نے غلاظت انڈیلی تھی۔ وہاں سے آنے والی بدبو نے مجھے کھڑکی بند کرنے پر مجبور کر دیا۔

چھکڑے پر آتے ہوئے بھی مجھے شہر کی گلیوں سے بدبو آ رہی تھی۔ تو دراصل وبا کی باعث یہی گندگی تھی جس کی طرف جمشیدی کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ اتنے میں مجھے باہر سے لگاتار قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جیسا کہ دیپا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ خوفناک قہقہے واقعی موت کی چاپ لگتے تھے۔

موت نے پھر کسی کے دروازے پر دستک دی تھی اور کسی کی جان لیے بغیر وہاں سے ٹلنے والی نہیں تھی۔

اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی۔

خشونی اب تک واپس کیوں نہیں آیا؟ میں سوچنے لگا۔ ملکہ کے پاس جاتے وقت اس نے مجھ سے کہا تھا: "اگر میں ملکہ کو یہ یقین دلانے میں ناکام رہا کہ تم ہی وہ اوتار ہو جس کا جمشیدیوں کی مذہبی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے تو میں مستقبل کے متعلق کوئی خوش آئند وعدہ نہیں کر سکتا۔ محل کا ہر کمان دار اقتدار کا بھوکا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف سازش میں مصروف ہے اگر ان

میں اتحادہے تو صرف میرے خلاف ہے۔ اب تک تو میں اُن میں پھوٹ ڈلوا کر اقتدار سنبھالے رہا ہوں مگر ملکہ کی موت کے بعد حالات یکسر بدل جائیں گے۔"

میں کمرے میں ٹہلنے لگا اور سوچنے لگا کہ کہیں خشونی میرے ساتھ دُہری چال تو نہیں چل رہا؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیئے اب تو میں یہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میرے پاس ایک عمدہ تلوار تھی لیکن اگر سپاہیوں کا ایک دستہ مجھے گھیر لے تو میں کیا کر سکتا تھا؟ چند ایک کو مارنے کے بعد خود میرے مرنے کی باری بھی آ سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد خشونی آ گیا۔

میں اس پہ پھٹ پڑا "کہاں مر گئے تھے؟ میں تمھاری راہ دیکھتے دیکھتے پاگل ہو گیا ہوں۔"

خشونی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے ٹھنڈا ہونے کا اشارہ کیا اور اپنی زنجیرے کھیلتے ہوئے بولا "ملکہ کو یقین دلانا کوئی آسان کام نہیں تھا سرفروش۔"

"کیا اُسے یقین آ گیا ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں۔ لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک پڑا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اُس پہ بار بار غشی کے دورے پڑ جاتے ہیں۔ وہ قریب المرگ ہے اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ بات پوری طرح سمجھی بھی ہے یا نہیں۔ بہرکیف ہمیں جلدی سے وہاں پہنچنا چاہیے۔ کمان دار گدھوں کی طرح ملکہ کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔"

"تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو۔ چلو۔" میں نے کہا۔

ہم کمرے سے باہر آ گئے۔

جب میں خشونی اور ایک محافظ کے ساتھ گھر سے نکلا تو سوچ رہا تھا کہ مجھے خشونی کی بجائے کسی ایسے کپتان کا انتخاب کرنا چاہیے تھا جس کے جیتنے کا امکان زیادہ ہوتا لیکن عدم واقفیت اور حالات نے مجھے خشونی کو منتخب کرنے پہ مجبور کر دیا تھا اس لیے اب اچھے یا بُرے، ہر نتیجے کا سامنا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

ہم بجرے پر سوار ہو کر شاہی شامیانے کی طرف روانہ ہوئے جو ایک چوبی پلیٹ فارم پر نصب تھا اور اس پلیٹ فارم کے لنگر جھیل میں ڈال دیے گئے تھے۔ شامیانے سے وہی دھنی سنائی دے رہی تھی جس میں دل موہ لینے والی تیز مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔

جب ہم بجرے سے اُترے تو میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ... سے لوگوں کی آنکھوں میں ینہ ینگ دانشمند خشونی کے لیے نفرت ... ہوئی ہے لیکن بظاہر انھوں نے اس نفرت پر ادب و احترام ... پردے ڈال رکھے تھے اور وہ جو اس وقت خشونی کے اشارے ... اپنی گردن جھکا رہے تھے، کسی بھی لمحے اس کی گردن اُڑا ... تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے خشونی کے ساتھ سودا ... ایسی بھول بھلیوں میں قدم رکھ دیا ہے جس سے باہر نکلنے کا کو... راستہ نہیں اور خشونی نے اپنے خلاف نفرت کے جو بیج ... ہیں، ان کی فصل مجھے کاٹنا پڑے گی۔

تیرنے والے چوبی پلیٹ فارم پر نصب شامیانے ... کئی حصے تھے۔ سب سے آخر میں وہ حجلۂ مرگ تھا جس میں ... اجل رسیدہ ملکہ ایک حنوط شدہ لاش کی طرح موت کے فرشتے ... انتظار کر رہی تھی۔

جب ہم اُس حجلۂ مرگ کو جانے والے راستے کی طرف ... تو خشونی نے ملکہ کی خواب گاہ کے دروازے پر کھڑے پانچ کمان دا... کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "وہ گدھوں کی طرح ملکہ ... موت کے منتظر ہیں جیسے یہ میرے دشمن تھے اب تمھارے بھی ہو جائیں گے۔"

میں پہلی نگاہ میں ہی انھیں پہچان چکا تھا۔ وہ میرے ... کسی کتاب کے ایسے پانچ اوراق تھے جنھیں میں بار بار پڑھ چ... وہ سب نفرت، نخوت، ... ، ہوسِ اقتدار اور شک و شبہے ... بولتی تصویریں تھے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ میرے بار... میں شک و شبہے میں مبتلا ہو کر سوچتے رہیں کہ میں کون ہوں ا... کہاں سے آیا ہوں۔

خشونی نے پھر سرگوشی کی "مجھے تم کو اُن سے متعارف کرانا ... گا۔ تمھارے امتحان اور اداکاری کا یہی وقت ہے۔ اپنے آپ کو ... اور بہادر ظاہر کرنا۔"

خشونی نہیں جانتا تھا کہ میں ایسے مرحلوں سے کئی بار گز... تھا اسی لیے تم نے پہلے ہی اپنا سینہ تان لیا تھا۔ خشونی نے ... لہجے میں انھیں مجھ سے متعارف کرایا جس میں حقارت اور حکم ... دونوں شامل تھیں۔

"یہ بیشا ہے، یہ فزال، یہ نورنگ، یہ اساد اور یہ راخ... پہلے چار کمان داروں نے تو اپنے اپنے نام پر گردن اُٹھا... اور اپڑی بجائی ... مگر پانچویں یعنی راخش نے مصافحے کے لیے ... ہاتھ بھی میری طرف بڑھا دیا اور جب میں نے اس سے ہاتھ ...

تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ کسی آہنی شکنجے میں آ گیا ہو۔ میں نے دیکھا کہ کمان داروں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور پھر راخش کی گرفت میں شدت آتی چلی گئی۔ وہ اگرچہ اکہرے بدن کا آدمی تھا مگر اس کے کندھے چوڑے اور ہاتھ میں بے پناہ طاقت تھی۔ یہ ان لوگوں کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں درد کی شدت سے چلاؤں تاکہ وہ میرے اوتار ہونے کا مذاق اُڑا سکیں۔

راخش پوری قوت سے میرا ہاتھ بھینچ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی لیکن چونکہ میں شروع سے ہی یہ چال سمجھ گیا تھا اس لیے میں شدید تکلیف کے باوجود مسکراتا رہا۔ میں نے راخش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں دوسرے کمان داروں کی طرح نفرت اور خوف نہیں تھا۔ جب وہ اپنی پوری قوت آزما چکا تو میں نے اُس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ میرے بازو کی مچھلیاں پھڑپھڑانے لگیں اور راخش کے تاثرات بدلنے لگے۔ اب اُس کے چہرے پہ تکلیف کی تحریر پڑھی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس کے ساتھی کچھ متعجب سے ہو گئے۔ پھر راخش کا منہ کھلا اور اس کی پیشانی پہ پسینے کے قطرے جھلملانے لگے مگر وہ کب تک ضبط کرتا۔ بالآخر وہ ایک کراہ کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا "بس کرو۔ بس کرو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ اب میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور مسکراتے ہوئے کہا "بڑا اچھا مقابلہ تھا راخش۔ مجھے لطف آیا۔ تم بھی خاصے طاقتور ہو۔ جب کبھی وقت اور موقع ملا تو ہم پھر پنجہ لڑائیں گے۔"

راخش خاموشی سے اپنا ہاتھ ملتا رہا۔ اس کا ایک ساتھی بولا "مانا کہ یہ طاقت ور ہے مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اوتار ہے۔"

تیسرے کمان دار نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ بزرگ دانشمند ایسا اوتار ڈھونڈ لایا ہے جو اس کے کام آ سکے۔"

خشونی اُن کی اَن سنی کرتے ہوئے میرے ساتھ ملکہ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

خواب گاہ میں روشنی مدھم لیکن موسیقی کی آواز تیز تھی اور ایک کونے میں بڑے سے پلنگ پر ملکہ ساکت لیٹی ہوئی تھی۔

خشونی نے سرگوشی کی "میں تمھارے متعلق جو کچھ کہہ سکتا تھا ملکہ سے کہہ چکا ہوں۔ تم نے ان کمان داروں کو بھی دیکھ ہی لیا ہے۔ اب تمھیں ہر صورت میں ملکہ کی خوشنودی حاصل کرنی ہے۔ یہ تم کیسے کرو گے، میں نہیں جانتا۔ یہ تمھارا کام ہے۔ جاؤ۔"



آگے بڑھو۔"

موسیقی کے لہرے اور چھنا کے تیز تر ہو گئے۔ میں نے ملکہ کے جھریوں بھرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اگرچہ اس پہ چادر پڑی ہوئی تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس کا وجود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہو۔

میں کافی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ وہ آنکھیں کھولے تو کوئی بات کروں مگر وہ اُسی طرح بے حرکت پڑی رہی تو مجھے گمان گزرا کہ کہیں وہ مر گئی ہو لیکن اُسی لمحے اُس نے یوں آنکھیں کھول دیں جیسے اُس نے میری سوچ کی آواز سُن لی ہو۔

ملکہ کی بوڑھی اور کالی اور گہری آنکھیں میرے چہرے پر ٹِک گئیں۔ اُن نگاہوں میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ پھر ملکہ نے پُتلیاں گھما پھرا کر اوپر نیچے کر کے میرے قد و قامت کا جائزہ لیا۔ وہ شاید اپنا سر نہیں ہلا سکتی تھی آخر وہ کپکپاتے ہونٹوں سے بولی "تو تم وہ سرفروش ہو جس کا ذکر ہماری مذہبی کتابوں میں موجود ہے۔"

"ہاں۔ میں وہی ہوں ملکہ۔"

ملکہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں پھر میرے وجود کا جائزہ لینے لگیں۔ اُس کے ہونٹ یوں سکڑے جیسے اس نے

مسکرانے کی کوشش کی ہو۔

"کیا ہم اکیلے ہیں یا میری خواب گاہ میں کوئی اور بھی موجود ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے دروازے کی جانب دیکھا جہاں نیم روشن قنات کے ساتھ خشونی دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر ملکہ سے کہا: "خشونی دروازے کے پاس کھڑا ہے لیکن وہ ہماری گفتگو نہیں سن سکے گا۔"

ملکہ نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لیکن گمبھیر لہجے میں کہنے لگی: "تم اوّل درجے کے جھوٹے ہو سرفروش۔ نہ تو تم خشونی کو خواب میں دکھائی دیے تھے اور نہ ہی تم کوئی اوتار ہو۔ میں جانتی ہوں کہ ہماری کتابوں میں ایک نجات دہندہ کا تذکرہ ضرور کیا گیا ہے لیکن تم وہ نجات دہندہ نہیں ہو۔ بہرحال، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ذہین اور طاقت ور ہو۔ چہرے مہرے اور قدوقامت نے تمھیں مرعوب کن شخصیت عطا کر دی ہے اس لیے تم جھوٹے اوتار بن کر ہماری مذہبی کتب میں کیا گیا وعدہ ایک اچھے طریقے سے پورا کر سکتے ہو۔ یوں تو ہر جمشیدی کی طرح میں بھی احمق ہوں مگر ہر اعتبار سے نہیں۔ تم جو کوئی بھی ہو اور جہاں کہیں سے آئے ہو، مجھے تم پر اعتماد ہے۔ میں اپنی قوم کی باگ ڈور تمھارے ہاتھ میں دے رہی ہوں۔ یہ بہت بڑی ذمّے داری ہے۔ کیا تم اسے سنبھال لو گے؟"

"آپ کا کیا خیال ہے ملکۂ عالیہ؟"

"تمھاری آنکھوں میں دیوتاؤں کی سی چمک اور گہرائی ہے مگر تم دیوتا نہیں ہو۔ مجھے تمھاری ذہانت سے امید ہے کہ تم یہ ذمّے داری سنبھال لو گے۔ میں نے ایک طویل عرصے تک کاروبارِ مملکت چلایا ہے مجھے خشونی جیسے آدمی سے مدد لینا پڑی کہ اس سے بہتر آدمی نہ مل سکا لیکن میں تمھیں سچ کہتی ہوں کہ ایسے لوگ ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ اسی لیے مجھے زندگی بھر سکونِ قلب حاصل نہیں ہو سکا۔" اتنا کہہ کر اس نے آنکھیں موند لیں اور زور زور سے سانس لینے لگی۔

میں گھٹنوں کے بل پلنگ کے قریب بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ شاید اس کا دم اُکھڑ رہا ہے۔ اب بھی جیسے اس نے میری سوچ کی آواز سن لی۔

وہ آنکھیں کھولتے ہوئے بولی: "گھبراؤ نہیں۔ جو کام مجھے کرنے ہیں، وہ کر کے ہی مروں گی۔ مگر یاد رکھو، خشونی پر کبھی اعتماد نہ کرنا وہ بڑا عیار اور ظالم آدمی ہے۔"

"یہ میں بھی جان چکا ہوں ملکۂ عالیہ۔"

"اب میری وصیت غور سے سنو۔ میری موت کے فوراً بعد تم ننھی شہزادی دلآرا سے شادی کر وگے اور جمشیدیوں کے حکمران بن جاؤ گے۔ میری قوم عرصہ دراز سے اس وادی میں رہتی چلی آ رہی ہے۔ میرے مرنے کے بعد تم اسے لے کر شمال کی طرف چل دینا اور اس شہر کو جلا کر راکھ کر دینا۔ ہماری مذہبی کتب کہتی ہیں کہ جمشیدیوں کی منزل شمال میں بابِ تاباں کے پار ہے اور جمشیدیوں کو واپس آنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ کیا تم میری وصیت پر عمل کرنے کا وعدہ کرتے ہو؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں ملکۂ عالیہ کہ میں آپ کی قوم کی فلاح کے لیے جو کچھ بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔"

"تمھیں انتظامِ حکومت چلانے کے لیے خشونی کی مدد درکار ہوگی... مگر اس سے ہوشیار رہنا۔ اب جلدی سے اُسے اور کمان داروں کو بلاؤ۔"

میں نے ملکہ کے حکم کی تعمیل کی۔

ملکہ کے پلنگ کی ایک جانب میں اور خشونی جبکہ دوسری طرف پانچوں کمان دار کھڑے ہو گئے۔ ملکہ نے اپنے تن لاغر کی تمام تر قوت سمیٹ کر گمبھیر اونچی آواز میں اپنے عمائدینِ سلطنت کو ہدایات دیں کہ میں اوتار ہوں اور انھیں حکومت کے نظم و نسق میں میری مدد کرنی ہے۔ مجھے ننھی شہزادی دلآرا سے شادی کرنا ہوگی کہ یہ اس کی آخری خواہش اور حکم ہے۔

ملکہ کی یہ بات سن کر میں نے کمان داروں کی طرف دیکھا۔

راخش کے علاوہ باقی چاروں کی آنکھوں میں نفرت، حقارت اور عداوت کے سائے لہرا رہے تھے۔ اتنے میں موسیقی کے لہریے اور جھنکے ایک دم بند ہو گئے۔ خدا معلوم پسِ پردہ بیٹھے سازندوں کو کیسے یہ علم ہو گیا تھا کہ ملکہ مر چکی ہے۔

میں نے ملکہ کی طرف دیکھا۔

دم توڑنے کے بعد بھی اس کی آنکھیں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس کی آنکھیں بند کر کے چہرے پر چادر ڈال دی۔ پھر پلٹ کر تحکّم کے ساتھ کمان داروں سے مخاطب ہوا: "تم سب نے ملکہ کی آخری ہدایات سن لی ہیں اب میرے احکامات سنو۔" یہ کہہ کر میں نے بیلشا کو حکم دیا: "ملکہ کی تجہیز و تکفین کے ذمّے دار تم ہو جو آج ہی ہوگی لیکن تمام رسوم و رواج

اور پورے احترام کے ساتھ... جاؤ اور سارے انتظامات کرو کہ میرے پاس اپنے وعدے کی تکمیل کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔"

بیلشا نے میرا حکم سن کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا... مگر وہ اُس سے نظریں ملانے کی بجائے میری طرف دیکھتے رہے۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی بھی براہِ راست میری مخالفت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیلشا نے سر خم کیا اور باہر چلا گیا۔

اب میں فرزال کی طرف پلٹا جو لحیم و شحیم اور بڑا بدشکل تھا۔ "میں نہیں جانتا کہ عہدے کے اعتبار سے تم کس درجے کے آدمی ہو... مگر اس وقت سے تم سالارِ عسکر ہو۔ فوج کے تمام اختیارات اور ذمّے داریاں تمھارے سپرد ہیں۔ یہاں سے جاتے ہی ساری فوج شہر کے باہر شمال کے میدان میں جمع کرو اور میرے دوسرے حکم کے لیے منتظر رہو۔"

فرزال نے تعجب سے جواب دیا: "شمال کی طرف؟ یہ اقدام دانشمندی کے خلاف ہوگا جناب، کردبو بابِ تاباں سے ہمیشہ نگرانی کرتے رہتے ہیں اور وہ شمال میں کسی عسکری اجتماع کو پسند نہیں کرتے۔ شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ کردبو..."

"تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "بابِ تاباں اور کردبوں کو مجھ پر چھوڑ دو۔ جاؤ۔"

فرزال مزید کچھ بولے بغیر چلا گیا۔

میں نے سوچا کہ مجھے کردبوں اور بابِ تاباں کے بارے میں جلد از جلد معلومات حاصل کرنا پڑیں گی۔ تاہم میں نورنگ سے مخاطب ہوا۔

"نورنگ، تمھیں جتنے آدمی درکار ہوں انھیں اپنی کمان میں لے لو اور کوچ کی تیاری شروع کر دو... مگر یاد رکھو، یہ تیاری صرف فوج کے کوچ کی نہیں ہوگی۔ اس وادی کے ہر فرد کو یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا۔ تمھیں یہ بات اس وقت تک صیغۂ راز میں رکھنی ہے جب تک میں کوئی دوسرا حکم نہ دوں۔ کھانے پینے کے سامان اور دیگر ضروری اشیا کا انتظام بھی تمھاری ذمّے داری ہے۔ مجھے وقتاً فوقتاً انتظامات کی تفصیل سے آگاہ کرتے رہنا۔ جاؤ۔"

نورنگ نے چوتھے کمان دار اساد کی طرف دیکھا مگر وہ انجان بنا رہا تو نورنگ نے بھی سر خم کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے خشونی کی طرف دیکھا جس کا تربوز نما سر ایک کندھے کی طرف جھکا ہوا تھا اور وہ تصویرِ حیرت بنا یہ کارروائی دیکھے جا رہا تھا۔

"تمھاری ذمّے داری بڑی نازک ہے اساد۔ تم کسی کو یہ



نہیں بتاؤ گے کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو یا کس کے حکم پر کر رہے ہو۔ تمھیں اس شہر کو جلا کر راکھ میں تبدیل کر دینے کے انتظامات کرنے ہیں۔" میں نے کہا۔

"شہر کو جلانے کے انتظامات؟" خشونی نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں... ملکہ نے مجھ سے اس کام کا وعدہ لیا تھا۔ یہ شہر غلاظت کا ڈھیر بن چکا ہے جس سے وبائیں پھوٹتی ہیں اور ہر نئی وبا پہلی سے شدید ہوتی ہے۔ زرد موت کی وبا سے بچنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔" پھر میں نے اساد سے کہا: "جاؤ آتش زنی کا سامان اور اپنے کارندے جمع کرو... مگر ہر بات راز میں رہے کہ میں کوئی شورش پسند نہیں کروں گا۔"

اساد بھی چلا گیا۔

اب صرف راخش وہاں رہ گیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو خشونی نے مجھے ٹہوکا دیا... مگر میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ میں چھٹی حس کی رہبری میں ایک اور جوا کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ پلنگ کی دوسری طرف سے اس کے پاس آیا اور اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: "ایک بار پھر پنجہ آزمائی ہو جائے، دوست۔"

راخش نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ بڑھایا... مگر دوسرے ہی لمحے چونک کر ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہنے لگا: "نہیں جناب! میرا ہاتھ ابھی دُکھ رہا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہیں۔"

میں نے اپنے ہاتھ اس کے مضبوط شانوں پر رکھ دیے اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس نے بھی نظریں نہ چرائیں۔ اس کی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا تھا۔

"میں تمھیں کوئی حکم نہیں دوں گا راخش۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ تم میرے محافظ اور کمان دارِ اعلا ہو۔ تم مجھے پسند ہو اور میں

تمھیں ایک قابلِ اعتماد دوست سمجھتا ہوں۔"

راخش نے جواب دینے کے بجائے ملکہ کی میت پر نگاہ ڈالی اور کافی دیر تک اُسے دیکھتا رہا وہ دراصل کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ رہا تھا۔

"تم راجدھانی کی صورتِ حال اپنے ساتھیوں کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ ہو راخش تم جانتے ہو کہ وہ کیا ہیں، کیا بننا چاہتے ہیں اور طاقت واقتدار کو کیسے استعمال کریں گے۔ ان کے مقابلے میں، میں تمھارے لیے ایک نووارد ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم خاصے مردم شناس ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی سوچ سمجھ سے خود ہی کسی فیصلے پر پہنچو۔ تم چاہو تو صاف انکار کر سکتے ہو کیونکہ میں کسی ایسے آدمی سے کام نہیں لے سکتا جس پر مجھے اور جسے مجھ پر اعتماد نہ ہو۔"

راخش نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا اور کھٹ سے اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔ خشونی اس کی اس حرکت سے بُری طرح بدک گیا اور میں بھی چوکنا ہو گیا۔

راخش مجھے اسی طرح گھورتا رہا... پھر اس نے تلوار کو بوسہ دیا اور تلوار میری طرف بڑھا دی۔ میں نے بھی دستۂ شمشیر کو چوما اور تلوار اُسے لوٹا دی۔

اس نے مسکراتے ہوئے تلوار نیام میں ڈالی۔ ملکہ کی میت کی طرف دیکھا اور بولا "میں اپنی ملکہ کی آخری خواہش کی تعمیل کروں گا۔ میں اب بھی اس کا خادم ہوں اور آپ کے لیے بھی میری خدمات حاضر ہیں۔"

میں نے اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا۔ "شکریہ راخش تم مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ وفادار اور پُرخلوص پاؤ گے... اور اب میری بات غور سے سنو۔ اپنے اعتماد کے پچاس آدمیوں کا ایک دستہ بناؤ جو میرا محافظ دستہ ہوگا۔ تم اور دستے کے افراد میرے حکم کے بغیر مجھے تنہا نہیں چھوڑیں۔ تمھاری ایک اور ذمے داری بھی ہوگی۔ عسکریوں کے علاوہ تم ہر شہری کے ہتھیار ضبط کر لو گے اور یہ کام تمھیں فی الفور انجام دینا پڑے گا۔"

راخش کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اس نے خشونی کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب سمجھ کر میں نے کہا "ہاں۔ اگرچہ بزرگ دانشمند میرا مشیرِ اعلیٰ ہے... مگر تم اُس کے ذاتی دستے سے بھی ہتھیار لے سکتے ہو کہ اب بزرگ دانشمند میری حفاظت میں ہے اور اسے ذاتی دستے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس طرح اس کے اخراجات کم ہو جائیں گے۔"

خشونی نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا تربوزی سر ٹہلنے کی وجہ سے ادھر اُدھر جھولنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت اس کے ذہن میں کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اور وہ کیا سوچ رہا ہے۔

"اب میری حفاظت کے ذمے دار تم ہو۔" میں نے راخش سے کہا۔ "ملکہ کی تجہیز و تکفین کے بعد مجھے شہزادی سے شادی کرنی ہے۔ اس کے بعد ہمیں کوچ کرنا ہے۔ شادی کے انتظامات بھی تمھیں کرنا ہوں گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے ایک بار شہزادی سے مل لوں تاکہ مجھے اس سلسلے میں اس کے خیالات کا بھی علم ہو جائے۔ اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہو تو اس پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ ویسے میں تمھیں بتا دوں راخش اور تم چاہو تو سب کو بتا سکتے ہو کہ شہزادی ابھی صرف دس سالہ بچی ہے اس لیے اگر یہ شادی ہوئی تو محض ملکہ کی خواہش کے احترام میں، برائے نام ہی ہو گی کیونکہ میں اُن خبیث مردوں میں سے نہیں ہوں جو کم عمر لڑکیوں سے شادیاں رچاتے ہیں۔"

راخش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی آپ نے شہزادی کو دیکھا نہیں ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ہم جمشیدیوں میں طلائی دیوی کہلاتی ہے۔ میں اُس سے آپ کی ملاقات کا انتظام کر دوں گا۔ میرے لیے اور کوئی حکم؟"

"اپنے اعتماد کے چھ آدمی میرے ساتھ متعین کر دو اور سارے کمان داروں کو اطلاع بھجوا دو کہ آج رات بزرگ دانشمند کی رہائش گاہ پہ ایک مجلسِ مشاورت منعقد ہوگی۔ اور وہ سب غروبِ آفتاب کے دو گھنٹے بعد وہاں پہنچ جائیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا اور وہاں سے چلا گیا۔

جب اس حجلۂ مرگ میں میرے اور خشونی کے علاوہ کوئی تیسرا فرد نہ رہا تو اُس نے لب کشائی کی۔

"مجھے اسی بات کا خطرہ تھا۔ میں نے اپنی سوچ کے خلاف قدم اُٹھا کر دیکھ لیا۔ میں تمھیں اپنی مقصد برآری کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا مگر اب اُلٹا تم مجھے استعمال کر رہے ہو۔ یہ میرے لیے ایک سبق ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو اس سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا تو وہ دوبارہ ٹہلنے لگا۔

"یہ سب کیا ہے، سرفروش؟ کیا میں نظربند ہوں؟ مجھے قیدی بنا لیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا؟"

"جب تک تم میرے خلاف کوئی سازش نہیں کرتے یا میرے لیے مصیبت نہیں بنتے، نہ تو تم قید کیے جاؤ گے اور نہ ہی تمھیں قتل

...ے گا۔ مجھے اب بھی تمھاری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ پہلے ...ہ تم اس شہر اور اس قوم کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ ...ہو۔ جب میرا کام ختم ہو جائے گا تو میں یہاں سے چلا جاؤں ...یہاں زیادہ عرصے تک ٹھہرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی میں ...تمنا کرتا ہوں... پھر تم جانو اور یہ کمان دار۔ جب تک ...ے دوست ہو، میں بھی تمھارا دوست رہوں گا... یہ بات ...نا کہ سربراہ میں ہی ہوں اور حکم میرا ہی چلے گا۔"

"مجھے ان ساری باتوں سے اتفاق ہے بشرطیکہ تم واقعی جلد ...اں سے چلے جاؤ اس لیے کہ میں زیادہ دیر تک احمق اور ...تماشائی نہیں بنا رہ سکتا اور ہاں، تمھارا باب تاباں ...یوں کی سرزمین کی طرف کوچ کا فیصلہ دانشمندانہ نہیں ہے۔ ...دیوانگی ہے۔ کردیوں نے جمشیدیوں کو کبھی اُدھر کا رُخ نہیں کرنے ...ب تاباں کی طرف کوچ کا مطلب سب کی موت ہے۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے تو ملکہ نے ...ی وصیت کی تھی۔ بہرحال، مجھے باب تاباں اور کردیوں ...رے میں بتاؤ کہ یہ آخر ہیں کیا بلا؟"

...اور پھر جب خشونی نے مجھے باب تاباں اور کردیوں ...رے میں معلومات بہم پہنچائیں تو میں گنگ سا ہو کر رہ گیا۔

* *

جب میں راخش کے ساتھ شہزادی دلآرا سے ملنے جا رہا تھا ...محافظ ہمارے چھکڑے کے آگے، دو پیچھے اور ایک ایک ...بائیں چل رہے تھے۔ میں شہر کی گلیوں اور بازاروں کا ...ئزہ لیتا جا رہا تھا۔ مُردے ڈھونے والی گاڑیاں مختلف گھروں ...امنے رکتیں گھر والے مُردہ اُٹھا لاتے، گاڑی میں پھینکتے اور ...گاڑی چل دیتی۔ میں نے راخش کو حکم دیا کہ وہ مُردے ڈھونے ...گاڑیوں کو بند کرا دے اور گاڑی بانوں کو کسی دوسرے کام پر ...ے۔ زرد موت سے مرنے والوں کو گھروں میں چھوڑ دیا جائے ...جلنے کے ساتھ وہ بھی راکھ ہو جائیں گے۔

اتنے میں ہمیں ایک مکان سے موت کے قدموں کی چاپ ...قہقہے سنائی دینے لگے جو وبا کے شکار کی موت یقینی بنا ...تھے۔

"مجھے آپ کے شہر کو جلا دینے کے حکم پر تعجب ہوا تھا لیکن ...یہ دیکھنے اور سننے کے بعد احساس ہوا کہ یہ غلیظ شہر جتنی جلدی ...نذرِ آتش ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

کچھ دیر بعد ہماری گاڑی ایک بڑی عمارت کے سامنے رُک گئی اور راخش کے متعین کردہ محافظوں نے ہمیں سلامی دی تو میں سمجھ گیا کہ یہی شہزادی دلآرا کی رہائش گاہ ہے۔ یہ عمارت بھی پتھروں اور لکڑیوں سے تعمیر کی گئی تھی مگر خشونی کی رہائش والی عمارت سے بہت بڑی تھی۔ میں نے عمارت میں داخل ہونے سے پہلے راخش سے پوچھا...

"میں نے خشونی کے متعلق جو ہدایات دی تھیں اُن پر عمل ہو رہا ہے؟"

"ہاں جناب! اسے آپ کے حکم کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ وہ جہاں بھی جانا چاہے، بلا روک ٹوک جا سکتا ہے مگر اس کی کڑی نگرانی کی جائے گی۔ میں نے اُس پر نگاہ رکھنے کے لیے اپنے بہترین آدمی لگا دیے ہیں۔"

"خوب... لیکن اُسے یونہی بزرگ دانشمند نہیں کہا جاتا۔ اس کے جاسوس بھی تمھارے آدمیوں سے کم زیرک نہیں ہوں گے۔ خیر تم اس سے کب ملے تھے؟"

"جب تم نے اُس کے ذاتی دستے سے ہتھیار لے کر اُسے نہتا کیا تھا۔ میرے اس اقدام پر وہ خوش نہیں تھا۔ وہ اگرچہ مُنہ سے کچھ نہ بولا لیکن اُس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ بہت ناراض ہے۔ اور ہاں، اُس سے بہت سے لوگ ملنے کے لیے آ جا رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اُس کے مخبر تھے اگر آپ کہیں تو اُن کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی جائے؟"

"نہیں۔ میں اُسے ڈھیل دے کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ جب وہ میرے یا شہزادی کے خلاف کوئی باقاعدہ سازش یا اقدام نہیں کرتا، اُسے مت چھیڑنا۔ اچھا اب میں شہزادی سے مل لوں۔ مگر پہلے یہ بتاؤ کہ میرا لباس کیسا ہے اور میں کیسا لگ

رہا ہوں۔"

راخش نے ایک نظر مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا: "آپ اس عسکری لباس میں خوب جچتے ہیں اور ویسے ہی لگتے ہیں جیسا کہ میرے حاکم کو ہونا چاہیے۔" پھر اس نے سلام کیا اور چلا گیا۔

میں اندرونی دروازے کی طرف بڑھا تو ایک سیاہ پوش عورت جس کے گلے میں کھوپڑی جیسی زنجیر جگمگا رہی تھی، باہر آئی اور سرخم کرتے ہوئے بولی: "شہزادی حضور بے تابی سے آپ کی منتظر ہیں جناب۔ آئیے، تشریف لائیے۔"

وہ میری رہبری کرتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے تک لائی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"شہزادی سے ملاقات کے دوران کوئی مداخلت نہ کی جائے۔"

"بہتر جناب عالی۔" اس عورت نے جواب دیا اور میں کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک طویل و عریض کمرہ تھا مگر اس میں دو موم شمعیں جل رہی تھیں جن کی روشنی اس کمرے کے لیے ناکافی تھی۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سامنے نیم روشن گوشے میں ایک دیوان بھی رکھا ہوا تھا۔ شہزادی دلآرا مجھے کہیں دکھائی نہ دی حالانکہ اس سیاہ پوش عورت نے بتایا تھا کہ وہ میری منتظر ہے۔

... پھر اچانک ہی دیوان کے پیچھے سے سنہری بالوں والا ایک سر ابھرنے لگا۔ دو گہری سیاہ غزالی آنکھیں دکھائی دیں، گلابی ہونٹ نظر آئے اور وہ کھڑی ہو گئی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ لڑکی کم اور لڑکا زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بولنے میں پہل کی۔

"چونکہ پہلے میں تمھیں دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے دیوان کے پیچھے چھپ گئی تھی کہ تم مجھے نہ دیکھ سکو۔ جمشیدی تمھارے متعلق ٹھیک ہی کہتے ہیں۔"

میں نے سر ذرا سا خم کیا اور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ دیوان سے گھوم کر میرے سامنے آگئی وہ جو پہلی نظر میں مجھے لڑکا دکھائی دی تھی، ایسا پیکر جمال نکلی جو میری آنکھوں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

"پہلے مجھے یقین نہیں تھا کہ میں تمھیں پسند کروں گی... مگر تمھیں دیکھنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ہی میرے شوہر بنو گے۔ تم جمشیدیوں سے کتنے مختلف ہو۔ میرے کمان دار تم سے حسد کرنے لگیں گے۔ کیونکہ وہ مجھ سے شادی کے خواب دیکھتے رہے ہیں۔"

اس کی باتیں دلچسپ مگر بچوں جیسی تھیں۔ میں مسکراتا رہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کے کمان دار آپ سے محبت کرتے ہیں۔"

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی: "ان پر لعنت بھیجو۔ ادھر آؤ اور میرے پاس بیٹھو۔ مجھے بتاؤ کہ میری نانی کو عالم نزع میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں... انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ان کی خواہش تھی کہ ہماری شادی ہو جائے ورنہ میں یہاں نہ آتا۔"

"مجھے اپنی نانی سے بڑی محبت تھی اور آخری وقت میں مجھے ان کے پاس ہونا چاہیے تھا مگر جمشیدی رسم و رواج چھوٹوں کو بڑوں کی موت کا نظارہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ جب ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم یہ رسمیں ختم کر دیں گے۔ کھڑے کیوں ہو، بیٹھو نا۔"

مجھے اس دس سالہ لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر خفت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: "میں جس دنیا سے آیا ہوں، وہاں آپ کی عمر کی بچیوں سے شادی کا تصور بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔"

اس نے میری اس بات پر قہقہہ لگایا اور ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ عین اسی وقت وہی سیاہ پوش عورت اندر آگئی۔

"کمان دار راخش کا ہرکارہ آیا ہے اور وہ ان کے لیے کوئی بے حد اہم پیغام لایا ہے۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا تو اس نے کہا کہ اگر میں نے اطلاع نہ دی تو وہ زبردستی اندر گھس آئے گا۔"

یہ سن کر میں نے کہا: "میرا خیال ہے کہ کوئی بہت ہی اہم مسئلہ ہو گا اس لیے اجازت دیجیے میں اس سے بات کر کے پھر حاضر ہو جاؤں گا۔"

میں باہر آیا تو راخش کا قاصد میرا منتظر تھا۔ اس کے گلے میں راخش کے دستے کے نشان والی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔

"میں کمان دار راخش کا خصوصی قاصد زارا ہوں۔ ان کے پاس موک نامی ایک موٹا آدمی آیا ہے اور اس نے کسی لڑکی دیبا کا یہ پیغام دیا ہے کہ وہ سخت خطرے میں ہے اور اس کی التجا ہے کہ آپ فوراً اس کی مدد کو پہنچیں۔"

دیبا کا پیغام سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں ان الجھنوں میں پھنس کر اسے فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔

"موک نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے کس قسم کا خطرہ درپیش ہے؟"

"مجھے یہ تو معلوم نہیں جناب۔ وہ بزرگ دانشمند کے گھر آیا تھا۔ کمان دار راخش نے مجھے حکم دیا کہ یہ پیغام فوراً آپ تک پہنچا دوں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا: "تم میرے چھ محافظوں کے ساتھ میرے ساتھ چلو۔"

میں نے محافظوں کو آواز دی اور ہم سب تیزی سے موک کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ چونکہ جمشیدی قد و قامت میں مجھ سے چھوٹے تھے اس لیے وہ میری رفتار کا ساتھ نہ دے سکے اور مجھ سے قدم ملانے کے لیے انھیں دوڑنا پڑ گیا۔ جب ہم پہاڑی پر واقع اس مکان کے قریب پہنچے تو میرے محافظ دروازے پر زرد موت کا پیلا نشان دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

میرا بھی دل دھک سے رہ گیا۔

کیا دیبا زرد موت کی وبا میں مبتلا ہو گئی ہے؟

پیامبر نے زرد نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا: "اس گھر میں کوئی داخل نہیں ہو گا جناب۔"

"میں نے کسی سے داخل ہونے کو نہیں کہا۔" میں نے اسے جواب دیا: "تم کیا کہتے ہو؟"

"میں بھی نہیں جاؤں گا جناب۔ ہمیں وبا والے مکان میں جانے کی اجازت نہیں۔"

اتنے میں اندر سے قہقہے کی آواز آئی۔

یہ مردانہ قہقہہ موک ہی کا ہو سکتا تھا۔

وہ مسلسل قہقہے جو موت کی چاپ کہلاتے تھے۔

"تم سب یہیں میرا انتظار کرو۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے مکان میں داخل ہو گیا۔

موک اسی میز کے قریب فرش پر دراز تھا جس پر ہم نے اس رات مشروب پیا تھا اور باتیں کی تھیں۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا اور اس پر کرب کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔

وہ مسلسل موت کے قہقہے لگا رہا تھا۔

میں اسے نظر انداز کرتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس میں اس شب دیبا سوئی تھی۔

وہ کمرہ خالی تھا۔

میں دوسرے کمرے میں گیا۔ اس کی پھوپیاں اپنے اپنے بستر پر مر چکی تھیں۔

دیبا نے مجھے بلایا تھا... مگر وہ خود کہاں گئی؟

اب صرف موک ہی زندہ رہ گیا تھا مگر وہ اس قابل نہیں تھا کہ بات کر سکے تاہم میں اس کی طرف دوڑا اور گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ کر اسے مخاطب کیا: "موک... موک آنکھیں کھولو۔ میں سرفروش ہوں موک۔ دیبا کہاں ہے؟"

اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور قہقہے لگانا بند کر کے کچھ بولنا چاہا... مگر اس کی سوجھی ہوئی سیاہ زبان سے الفاظ ادا نہ ہو سکے۔ میں نے میز پر رکھا ہوا برتن اٹھا کر دیکھا کہ شاید اس میں وہی مشروب ہو... مگر اس میں تربوز نما سیب کا رس تھا۔ میں نے کچھ رس اس کے چہرے پر اور کچھ اس کے حلق میں ٹپکایا تو اس کے قہقہے بالکل تھم گئے۔

میں نے جلدی سے پوچھا: "دیبا کہاں ہے، موک؟"

"کاشی... کاشی آگئے... اس کی... بے... بے حرمتی کی... پھر... پھر اسے شمشان میں... پھینک دیا... زندہ... زندہ شمشان میں... تم چال میں... آگئے ہو... انھوں نے کہا... سرفروش کو بلاؤ... دیبا نے انکار کر دیا... تم کیوں آئے... پھنس گئے... وہ... وہ چھپے ہوئے ہیں... انھوں نے... وبا والے چاقو سے... ہمیں زخم لگائے دیکھو... یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا زخمی بازو دکھایا اور خاموش ہو گیا۔

میں سمجھ گیا کہ انھوں نے زرد موت کا شکار ہونے والے کسی مردے کے جسم میں چاقو گھونپ کر اسے جراثیم آلود کر لیا ہو گا اور پھر اس چاقو سے انھیں زخم لگائے ہوں گے اتنے میں مجھے باہر سے ایک چیخ کے ساتھ تلواریں ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف بھاگا اور یہ دیکھ کر دروازے ہی میں رک گیا کہ میرے چھ محافظوں میں سے تین ڈھیر ہو چکے تھے۔ اور چھ کاشی باقی تین محافظوں سے برسرپیکار تھے۔ وہ تین محافظ، کاشیوں کی لمبی تلواروں کی زد سے بچتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس وقت میرے پاس تلوار اور خنجر تھا۔ میں نے دروازے سے باہر نکلتے ہی تلوار نیام سے نکالتے ہوئے بآواز بلند کہا: "محافظو! تم لوگ ہٹ جاؤ۔"

میری آواز پر کاشیوں نے ہاتھ روک لیے اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میرے محافظ موقع غنیمت جان کر بھاگے اور میرے قریب آگئے۔ ان میں سے ایک زخمی ہو چکا تھا اور اس کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔

"یہ درختوں میں چھپے ہوئے تھے جناب۔ زارا نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ وہ دھوکے سے ہمیں یہاں لایا ہے۔ بہت سے کاشی مکان کے چاروں طرف چھپے ہوئے ہیں۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب چاروں طرف سے بندر نما کاشیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں، جو مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے زخمی محافظ سے کہا: "فکر نہ کرو جوان۔ ہمت نہ ہارو۔

ہم اُن سے نمٹ لیں گے:

... پھر میں نے بہاڑی کے نیچے دیکھا تو کھیل کر رہ گیا۔ غدار محافظ زار کاشیوں کو حملہ کرنے کا منصوبہ سمجھا رہا تھا کیونکہ وہ بے پناہ جسمانی طاقت رکھنے کے باوجود برائے نام ذہنی صلاحیت رکھتے تھے۔ میں نے سوچا کہ زارا نے کس کے کہنے پر یہ چال چلی ہوگی؟

... اور دوسرے ہی لمحے ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔

میں نے خشونی کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا اور اُس کے دستے کو نہتا کروانے کے بعد مطمئن ہوگیا تھا۔ میں کل رات کی باتیں بھول گیا تھا۔ خشونی نے بتایا تھا کہ اُسے کاشیوں کے پیغام سے یہ تو معلوم ہوگیا ہے کہ میں نے بلونگ کو قتل کردیا تھا پھر غائب ہوگیا تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر دیپا کا ذکر نہیں کیا تھا ورنہ کاشیوں نے اُسے دیپا کے متعلق بھی ضرور بتایا ہوگا۔ میں نے اُس کا ذکر اس لیے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ محفوظ و مامون رہے... مگر خشونی کے جاسوسوں اور مخبروں نے اُسے دیپا کے متعلق بتا دیا ہوگا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے۔ وہ دیپا پر تشدد کرکے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوگا۔

میں نے کتنی بڑی بھول کی تھی۔

اتنے میں زارا نے کاشیوں کو حملے کا سارا منصوبہ سمجھا دیا تھا۔ کاشی مکان کے چاروں طرف سے اوپر آنے لگے اور زارا خود ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ وہ خود اس معرکے میں حصہ نہیں لینا چاہتا تھا تاکہ محفوظ رہ کر اپنے آقا کو ہمارے حشر کا آنکھوں دیکھا حال سُنا سکے۔

میں نے اپنے باقی ماندہ محافظوں سے کہا: مکان کے اندر چلے جاؤ۔ ہمیں چار کھڑکیوں اور ایک دروازے کا دفاع کرنا ہے۔ میں دروازے پر رہوں گا۔ تم کھڑکیوں سے دفاع کرنا۔ کاشی ان چھوٹی کھڑکیوں سے اندر نہیں آسکتے۔ آؤ۔

"مگر اس دروازے پر تو موت کا وبائی نشان لگا ہوا ہے۔" ایک محافظ بولا۔

"باہر اس سے بھی زیادہ خطرناک وبا تمھیں دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ دیر مت کرو، اندر چلو۔"

اُدھر کاشی بھی آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے تاکہ ہم مکان میں گھس جائیں تو وہ ہمیں گھیر کر ختم کردیں۔

کمرے میں آتے ہی موک کی لاش دیکھ کر مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے محافظوں سے کہا: یہ لاش اُٹھا کر ایک کھڑکی میں ٹھونس دو۔ اس طرح ایک کھڑکی محفوظ ہوجائے گی۔

محافظوں نے بمشکل لاش اُٹھا کر پچھلی طرف والی ایک کھڑکی میں ٹھونس دی۔ بے چارہ موک آدھا اندر اور آدھا باہر لٹکنے لگا۔ میں نے دوسری کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تقریباً بیس کاشی مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ابھی وہ تقریباً پچاس قدم دُور تھے۔ ان کے پاس لمبی چوبی تلواریں تھیں جن کی نوک پر چقماق کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ میرے دو محافظوں کے پاس برچھے بھی تھے۔ زخمی کے پاس صرف تلوار تھی۔ میں نے برچھے والے ایک محافظ کو پچھلی ایک کھڑکی پر اور دوسرے کو سامنے والی کھڑکی پر متعین کیا۔ خود دروازہ اور اس کے قریب والی کھڑکی سنبھال لی اور زخمی کو کمرے کے وسط میں کھڑا کرتے ہوئے کہا: موک کی لاش پر نظر رکھنا اگر وہ اسے باہر کھینچیں یا اندر گرانے کی کوشش کریں تو تمھیں اس کھڑکی کا دفاع کرنا ہے ورنہ حسبِ ضرورت ہم لوگوں کی مدد کرتے رہنا۔ پھر میں نے برچھے والے محافظوں کو ہدایت کی کہ وہ تیزی سے برچھے کے ساتھ وار کرکے اُسے فوراً پیچھے ہٹا لیں تاکہ کاشی انھیں چھین یا توڑ نہ سکیں۔ اگر کاشی کھڑکی سے اندر آنے کی کوشش کریں تو وہ انھیں اس وقت تک نہ ماریں جب تک کہ وہ کھڑکی میں پھنس نہ جائیں۔

میری ہدایات سُن کر ایک نوجوان محافظ بولا: ہم صرف چار ہیں مگر وہ بہت زیادہ ہیں تاہم انھیں یہ فتح بہت زیادہ مہنگی پڑے گی جناب۔

میں نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی اور دروازے سے باہر دیکھا۔ کاشی دس دس کی دو قطاروں میں آگے بڑھ رہے تھے۔ جب اگلی قطار پانچ قدم کے فاصلے پر آگئی تو میں نے پوری طاقت سے چلاتے ہوئے کہا: آؤ کاشیو آؤ۔ میری تلوار تمھارے خون سے پیاس بجھانے کے لیے بے قرار ہے۔ آگے بڑھو اور موت کا مزا چکھو۔

مجھ پر اس وقت جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں نے اچانک چھلانگ لگا کر ایک کاشی کا بازو کاٹا اور دوسرے کے سینے میں تلوار گھونپ کر فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

دوسرے کاشی یہ دیکھ کر وہیں رُک گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اتنی جلدی اُن کے دو ساتھی ڈھیر ہوگئے ہیں۔ انھوں نے میرے ہاتھوں بلونگ کی موت کے قصے بھی سُن رکھے تھے اس لیے جب میں نے دوسری بار نعرہ لگایا تو وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگے اور پھر پلٹ گئے۔

میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ پچھلی کھڑکی والے محافظ کا برچھا خون آلود تھا اور دوسرے

کھڑکی میں موک کی لاش جوں کی توں ٹھنسی ہوئی تھی۔

میں دوبارہ دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔ اب پلٹنے والے کاشیوں کا کمان دار انھیں غیرت دلا رہا تھا۔

"بدبختو، صرف چار آدمیوں سے ڈر گئے ہو۔ آگے بڑھو اور انھیں ختم کردو۔ بزرگ دانشمند ہمیں بیویاں دے گا۔ دیپا سے ابھی... جاؤ اُن چاروں کے پیچھے اُڑا دو۔"

کاشیوں کے کمان دار کی بات سے مجھے خشونی کی دوسری چال بھی سمجھ میں آگئی۔ وہ مجھے ختم کرنے کے بعد کاشیوں سے بندرنما وحشیوں پر حملہ کروانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کوسا کہ میں نے زال کو فوج شمالی میدان میں جمع کرنے کا حکم کیوں دیا؟ وحشیوں کے ہتھیار لینے اور فوج کے شہر کے باہر جانے کے بعد خشونی بندرنما وحشیوں کو کھلی چھوٹ دے دے گا اور... مگر اس کے بعد مجھے کچھ اور سوچنے کی مہلت نہ مل سکی۔ بندرنما وحشی پھر دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تاکہ وہ اور قریب آجائیں مگر پیچھے ہٹنے سے ایک گڑبڑ ہوگئی کہ میں تلوار دائیں بائیں گھمانے سے قاصر ہوگیا۔ اب صرف اسے گھونپ ہی سکتا تھا چنانچہ میں نے یہی کیا۔ سب سے آگے والے کو گھونپنے کے بعد پیچھے ہٹ گیا لیکن دوسرے کاشی کی تلوار سے مجھے ران پر زخم آگیا مگر وہ بھی میرے خنجر کی زد سے نہ بچ سکا۔ اتنے میں تیسرے کاشی کی تلوار نے میری تلوار کو توڑ ڈالا لیکن اُسے دوبارہ تلوار اُٹھانے کی مہلت نہ مل سکی اور میں نے اُسے بھی مار دی۔

ایک نسبتاً چھوٹا کاشی کھڑکی سے کود کر مجھ پر پیچھے سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا سر اور کندھے اندر تھے اور باہر سے دو کاشی اسے اندر دھکیل رہے تھے مگر اس صورتِ حال میں وہ تلوار نہیں چلا سکتا تھا اس لیے جونہی اُس نے میری گردن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا میری تلوار کی ایک ہی ضرب نے اس کا سر کاٹ دیا جو کمرے کے فرش پر جا گرا اور اُس کی سربریدہ لاش نے دوسرے کاشیوں کے لیے کھڑکی بھی بند کردی۔

تب میں اُسے مارنے کے بعد دروازے کی طرف پلٹا تو دو کاشی بیک وقت دروازے سے اندر آنے کی کوشش میں پھنس گئے تھے۔ میں نے ایک ایک ضرب اُن کے ہاتھوں پر لگائی تو اُن کی تلواریں گر پڑیں اور وہ بُری طرح چیخنے لگے مگر نکلنے سے پہلے ہی میں اُن کے نرخرے کاٹ چکا تھا۔ اس طرح وہ دروازے کے سامنے ہی ڈھیر ہوگئے اور میں یہی چاہتا تھا تاکہ دروازے کے سامنے کوئی رکاوٹ آجائے۔

اتنے میں کاشیوں کے نائب کمان دار نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے اُس کا وار اپنی تلوار پر روکا تو اُس کی چوبی شمشیر ٹوٹ گئی ورنہ میری موت یقینی تھی۔ اُس کی تلوار ٹوٹتے ہی میں نے اُس کے چہرے پہ وار کیا۔ یہ وار اُس کی آنکھوں پر پڑا۔ وہ چیختا ہوا پیچھے ہٹا تو باقی بھی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

اُدھر پچھلی طرف سے کاشیوں نے موک کی لاش کے پیر پکڑ لیے تھے اور اُسے باہر کھینچ رہے تھے۔ میں نے اپنا زخمی محافظ اُدھر بھیجا مگر بدقسمتی سے ایک کاشی نے برچھا پھینکا جو محافظ کے سینے میں پیوست ہوگیا اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

میں نے اُس کے سینے سے برچھا نکالا اور جونہی ایک کاشی نے کھڑکی سے جھانکا، میں نے اُسی برچھے سے اُس کی کھوپڑی توڑ دی۔

میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

دروازہ دُشمنوں سے خالی تھا۔ دوسری کھڑکی کے پاس کھڑا محافظ بھی اب دم لے رہا تھا کہ اس کی کھڑکی سے بھی وہ بندرنما

وحشی ہٹ گئے تھے۔ اس نے بڑی تھکی بلکہ مجروح مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور بولا: "واقعی آپ اوتار ہی ہیں"۔

میں پچھلی طرف والی دوسری کھڑکی کی طرف پلٹا جہاں میرا دوسرا محافظ برسرپیکار تھا۔ ایک کاشی نے برچھے سے حملہ کرنا چاہا تو محافظ ایک طرف ہٹ کر اُسے پکڑ لیا۔ میں نے لپک کر تلوار سے برچھا توڑ ڈالا۔ اب برچھے کے پھل والا آدھا حصہ میرے محافظ کے پاس تھا اور باقی کاشی کے پاس۔ جو پیچھے ہٹ گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

اگرچہ کاشیوں کے حملے کا زور ٹوٹ گیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ اپنی تعداد کے بل بوتے پر پھر حملہ کریں گے۔ اتنے میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے محافظ نے کہا: "وہ شمشان سے مشعلیں لے آئے ہیں جناب اور اس مکان کو آگ لگانا چاہتے ہیں"۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو واقعی دو کاشی اُدھر سے جلتی ہوئی مشعلیں لے آئے اور زارا کئی کاشیوں سے سوکھی بیلوں کے گٹھر بنوا رہا تھا۔ کاشی یہ ترکیب کبھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ زارا نے کاشیوں کو پہاڑ کے نیچے چاروں طرف پھیلا دیا تاکہ مکان سے نکلنے کے بعد ہم فرار نہ ہو سکیں۔

مکان کو نذرِ آتش کرنے کی تیاریاں دیکھ کر میرے ایک محافظ نے اپنی تلوار پھینک دی اور روتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ جانتے ہیں کہ میں بہادروں کی طرح لڑا ہوں مگر آگ کا مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم ہتھیار ڈال دیں اور صلح کی بات چیت کر لیں۔ اس طرح ہماری جان بچ سکتی ہے"۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ ہتھیار ڈالنے سے وہ ہمیں زندہ چھوڑ دیں گے تو یہ تمہاری حماقت ہے جوان۔ ہم مرتے دم تک اُن کا مقابلہ کریں گے"۔

میرا دو ٹوک فیصلہ سنتے ہی وہ اُٹھا اور پھر ایک دم کمرے سے نکل کر کاشیوں اور زارا کی طرف بھاگتے ہوئے چلایا: "رحم... رحم... میں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں کاشیو... زارا... تم جمشید ہو، مجھ پر رحم کرو، زارا"۔

زارا کے گرد کھڑے وحشی کاشی ہٹ گئے۔ محافظ زارا کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ زارا نے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ ایک کاشی کو قتل کرنے کا اشارہ کیا اور دوسرے لمحے اس کاشی کی تلوار نے محافظ کو چھید ڈالا۔ محافظ بری طرح چیخنے اور تڑپنے لگا۔ زارا نے قہقہہ لگایا اور اپنی تلوار کی ایک ضرب سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

یہ منظر دیکھ کر میرے قریب کھڑا محافظ بولا: "وہ بڑا احمق تھا جناب، مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو بھی عزت سے آپ کے ساتھ ہی مروں گا"۔

اب کاشیوں نے سوکھی بیلوں کے گٹھر کو آگ لگا دی اور چھ کاشی وہ جلتے ہوئے گٹھر اُٹھا کر مکان کی طرف دوڑے۔

میں نے پچھلی کھڑکی سے دیکھا۔ اُدھر سے بھی ایسا ہی منظر نظر آیا۔

اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ یا تو باہر نکل کر مرتے دم تک اُن سے لڑتے رہیں یا پھر مکان میں رہ کر بھسم ہو جائیں۔

کاشیوں نے چاروں طرف سے مکان میں وہ جلتے ہوئے گولے پھینک دیے اور مکان نے جو بیشتر لکڑی کا بنا ہوا تھا آگ پکڑ لی۔ کمرے میں دھواں بھرنے لگا۔

"اب آپ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں جناب؟ آیئے باہر نکلیں جو ہوگا سو دیکھا جائے گا"۔ میرے اکلوتے محافظ نے کہا۔

میں نے اسے جواب دینے کے بجائے پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے جوان؟"

"میرا نام خاور ہے جناب۔ میرا باپ راخش کے باپ کا ماتحت تھا اور میں راخش کے دستے کا سپاہی ہوں"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو خاور۔ ہم یہاں رہ کر راکھ نہیں بنیں گے"۔ میں نے اُسے اتنا ہی کہا اور جو کچھ میں دیکھ چکا تھا وہ اُسے نہیں بتایا۔ "آؤ ہم ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر آخر دم تک لڑیں گے"۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور ایک برچھا اُٹھاتے ہوئے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

جونہی ہم باہر نکلے۔ چاروں طرف سے وحشی کاشیوں کے قہقہے گونجنے لگے اور وہ ہماری طرف جھپٹے۔ ہم نے ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملا لی۔

میں نے بائیں ہاتھ میں برچھا تھام رکھا تھا اور میرے دائیں ہاتھ میں تلوار تھی۔ یہی حال خاور کا بھی تھا۔ کاشی اس خوش فہمی میں تھے کہ اب پہلے ہی ریلے میں وہ ہمارے پرخچے اُڑا دیں گے اس لیے وہ ہم پر جھپٹ پڑے۔ جب موت سر پر کھیل رہی ہو تو آدمی ایسی ہی بے جگری سے لڑتا ہے کہ اُسے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا۔ چنانچہ ہمارے برچھے اور تلواریں کاشیوں کا خون چاٹنے لگیں۔ کاشی کٹنے، گرنے اور مرنے لگے۔ ہمارے ارد گرد اُن کی لاشوں کے انبار سے لگ گئے۔ کچھ زخم ہمیں بھی آئے۔ ہم خون اور پسینے سے تر

ہو گئے مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ تاہم کچھ دیر بعد ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور موت آنکھوں کے سامنے ناچتی دکھائی دینے لگی۔ کاشیوں کے کمان دار نے مجھ پر اتنی شدت سے حملہ کیا کہ میری تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اُدھر میرا ساتھی بھی زخمی ہو گیا۔

اب میں برچھے سے مقابلہ کر رہا تھا لیکن میری سانس بری طرح پھول گئی تھی اور میں کسی بھی لمحے بے دم ہو کر گرنے والا تھا کہ اتنے میں درختوں کے پیچھے سے قرنا پھونکنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی راخش کا عسکری دستہ آگے بڑھا اور کاشیوں پر ٹوٹ پڑا۔ کاشی یہ دیکھ کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے مگر راخش کے سپاہی اُن کے پیچھے تھے۔

میں بآوازِ بلند چلایا: "راخش۔ میری بات سنو راخش... کاشیوں کو جان سے مت مارو انھیں گرفتار کر لو۔ زارا کو بھی قتل نہ کرنا۔ اُسے گرفتار کرنا۔ کیا تم نے میرا حکم سن لیا ہے راخش؟"

"میں نے آپ کا حکم سن لیا ہے جناب"۔ راخش نے جواب دیا اور پھر اپنے سپاہیوں کو ہدایات دینے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں بچے کھچے سارے کاشی گھیر لیے گئے اور زارا کو بھی نرغے میں لے لیا گیا۔ اب مجھے اپنا زخمی محافظ یاد آیا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "زندہ رہنا اچھا ہے جناب! لیکن کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"

میں نے اپنے دامن سے کپڑا پھاڑ کر اس کے زخم پر پٹی باندھتے ہوئے کہا: "یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے خاور... اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب تم نئے کمان دار ہو اور راخش کے نائب کی حیثیت سے کام کرو گے"۔

خاور نے سر جھٹک کر کہا: "دو دو معجزے ایک ساتھ کیسے رونما ہو سکتے ہیں جناب۔ میں موت کے منہ سے بھی بچ گیا اور آپ نے مجھے کمان دار بھی بنا دیا۔ کہیں میں کسی دوسری دنیا میں تو نہیں پہنچ گیا؟"

میں نے قہقہہ لگایا: "دوسری دنیا میں پہنچنے سے بال بال بچ گئے ہو۔ ورنہ وہاں سپاہی کی حیثیت سے ہی جاتے"۔ یہ کہہ کر میں راخش کی طرف متوجہ ہو گیا جو میرے قریب آ چکا تھا۔ وہ بھی اس لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا یا پھر اس کی وردی کسی کاشی کے خون سے آلودہ ہو گئی تھی۔

وہ بہت غصے میں دکھائی دیتا تھا: "میری سمجھ میں نہیں آتا ایک اوتار اتنا نادان کیسے ہو سکتا ہے جناب؟" وہ بولا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "اس معاملے میں اوتار کی نادانی کم اور سازش زیادہ ہے راخش۔ مجھے تمہارا یہ نائب یہاں لایا تھا"۔ میں نے زارا کی طرف اشارہ کیا جسے رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارا آدمی بھی غدار ہو سکتا ہے"۔

"مجھے افسوس ہے جناب۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ غدار خشونی کے ہاتھوں اپنا ضمیر بیچ چکا ہے۔ خیر اسے اپنی غداری کی پوری پوری قیمت ادا کرنا پڑے گی"۔

میں نے راخش سے کہا: "اب خاور اس کی جگہ کام کرے گا میں نے اُسے کمان دار بنا دیا ہے"۔ پھر میں راخش کو الگ لے گیا اور کہا: "تم کسی پر تشدد نہیں کرو گے۔ زارا سے میں خود ہی پوچھ گچھ کروں گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ خشونی نے میرے خلاف سازش کا کیا منصوبہ بنایا تھا اس کے بعد تم زارا کو قتل کر دینا"۔

"لیکن قتل تو اس کے لیے بڑی معمولی سزا ہوگی جناب۔ میں اُسے اس طرح زندہ رکھنا چاہتا ہوں کہ وہ موت کے لیے ترستا رہے۔ میں نے ہی اُسے اپنا نائب بنایا تھا مگر اس نے میرے ساتھ بھی غداری کی ہے۔ میں اُسے ایسی سزا دوں گا جس سے لوگ عبرت حاصل کریں گے"۔

"نہیں راخش تم وہی کروگے جیساکہ میں نے کہا ہے اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خشونی کو کوئی ضرر پہنچے۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

راخش نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا: "وہ اپنے گھر پر ہے جناب۔ میں نے وہاں اپنے محافظوں کی تعداد دُگنی کردی ہے اور خشونی کو ہدایت کی ہے کہ وہ گھر سے باہر نہیں جاسکتا۔ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ میں آپ کی وجہ سے متردّد اور پریشان ہوگیا تھا۔"

"تم نے جو کیا اچھا ہی کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم دونوں نادان نہیں اور خشونی محفوظ ہے مجھے اس سے کام لینا ہے کیونکہ اُسے ان کاشیوں پر قابو حاصل ہے، جو آزاد ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کو گھیر کر نہتا کردیا جائے۔ فرزال سے کہو کہ اُن کے لیے شمالی میدان میں پنجرے بنوائے۔"

"وہ بے دماغ وحشی صرف خشونی کا حکم مانتے ہیں۔ جب انھیں پتہ چلے گا کہ خشونی اقتدار سے محروم کردیا گیا ہے تو وہ جنگلوں میں بھاگ جائیں گے اور ان میں سے بہت کم ہمارے ہاتھ آئیں گے۔" راخش نے جواب دیا۔

"پروا نہیں راخش ... مگر ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ اب ایک بات اور بتادو۔ تمھیں یہ کیسے معلوم ہُوا کہ میں یہاں خطرے میں ہوں؟"

راخش نے سر جھکالیا اور بولا: "میں نے شہزادی کی سیاہ پوش خادمہ سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ زارا میرا پیغام لے کر آیا تھا جبکہ میں نے اُسے کوئی پیغام دے کر نہیں بھیجا تھا۔ پھر جس علاقے میں فوج نہ ہو، وہاں کاشی آکر عورتیں اُٹھا لے جاتے ہیں۔"

"مگر تمھیں یہ کیسے معلوم ہُوا کہ کاشی اس علاقے میں آئے ہُوئے ہیں؟"

"میرے بھی کچھ مخبر ہیں جناب۔ وہ مجھے زارا کے متعلق بتاچکے ہیں کہ زارا، خشونی کے ہاتھوں اپنا ضمیر بیچ چکا ہے لیکن مجھے اس بات کا ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ جب میں نے یہ سُنا کہ وہ میری طرف سے کوئی پیغام لایا تھا تو فوراً سمجھ گیا کہ یہ خشونی کی کوئی چال ہوگی اس لیے میں فوراً خشونی کے پاس پہنچ گیا اور ..." اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

"تم نے اُسے قتل تو نہیں کردیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں جناب۔ البتہ مجھے سچ اُگلوانے کے لیے اس پر تھوڑا سا تشدّد ضرور کرنا پڑا تھا مگر آپ فکر نہ کیجیے اُس کے زخم جلد ہی ٹھیک ہوجائیں گے۔"

"شکریہ راخش۔ آج تم نے میری جان بچائی ہے اور میں تمھارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اب میں چاہتا ہُوں کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔"

"نہیں جناب۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ پھر کسی خطرے میں مبتلا ہوجائیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں راخش۔ میں تھوڑی دیر بعد تم سے خشونی کے گھر ملوں گا۔ جاؤ اور ان قیدیوں کا بندوبست کرو۔"

جب راخش، کاشیوں اور زارا کو اپنے سپاہیوں کے نرغے میں لے کر چلا گیا تو میں شمشان کی طرف چل پڑا۔

شمشان میں اب بھی مُردے جل رہے تھے حالانکہ اب مُردے یہاں نہیں لائے جارہے تھے اور مُردے جلانے والے بُلا لیے گئے تھے۔ شمشان کے گڑھے میں بہت سے اَن جلے مُردے بھی پڑے تھے۔ میں نے اُن مُردوں میں دیپا کی میت تلاش کی کوشش کی جو کاشیوں کی بربریت کا نشانہ بنی تھی۔ وہ مل گئی۔ اس کا سر تن پر موجود نہیں تھا۔ میں نے جسم پہچان لیا اور پھر اُٹھا کر پہاڑی پر لے آیا، درختوں کے جھنڈ میں قبر کھودی اور اس میں اُسے لٹا کر دیکھنے لگا۔ مجھے وہ لمحہ یاد آگیا جب پہلی بار میں نے اُسے جھیل والے گوریلوں کی قید سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ پھر اس کے ساتھ گزرا ہُوا ہر لمحہ مجھے اپنے ذہن کے گنبد بے در سے صدا دینے لگا۔ میں اپنے سینے میں پتھر جیسا دل رکھنے کے باوجود آنسو نہ روک سکا۔ اس معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی نے میری خاطر جان دی تھی مگر مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔

میں نے اُس کی قبر بند کی اور کہا: "ہمیشہ کے لیے الوداع"

یہ کہہ کر میں بھاری دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ واپس چل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ہَوائیں اس کے سوگ میں بَین کررہی ہوں اور میرے اندر کوئی شے چھناکے سے ٹوٹ گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میری کھوپڑی پر جو ضرب پڑی، اُس سے یوں لگا جیسے میرے اندر ٹوٹنے والی شے کے ساتھ ساتھ وہ بھی چکنا چُور ہو۔

میری کھوپڑی کے یہ ریزے تاریکیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔

۲۲

میرے حواس ٹھکانے آئے تو میں خود کو گرتا ہُوا محسوس کررہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اُٹھا کر مجھے گہرے پانیوں میں پھینک دیا ہو ... میں کسی بمبار سے گرائے ہوئے بم کی طرح گہرائی میں اُتر تا چلا گیا۔

مجھے حیرت تھی کہ میرے ساتھ کیا ہُوا ہے۔ مجھ سے کسی نے غدّاری کی ہے یا ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹر نے مجھے واپس بلانے کا عمل شروع کردیا اور یہ عمل کسی وجہ سے پورا نہ ہوسکا اور میں کسی اور ہی سرزمین پر پہنچ گیا ہُوں۔

بالآخر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے اپنے اردگرد سبز روشنی دکھائی دی جو پانی سے چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ پیر مارنے شروع کردیے اور اُوپر اُٹھنے لگا۔

جب میں نے سطحِ آب سے سر نکالا تو میرے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا اور اس کا نمکین ذائقہ بتارہا تھا کہ میں کسی بحرِ ناپیدا کنار کے درمیان تیر رہا ہوں۔ جہاں میری بقا کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ہر طرف پھیلے ہُوئے سمندر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا جس کی تہ میں نادیدہ بلائیں خوراک کی تلاش میں گھوم رہی تھیں اور میں اُن کے لیے لقمۂ تر ثابت ہوسکتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہترین تیراک ہوں اور بیس میل تک تیرتے چلے جانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں مگر مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قریبی ساحل کس سمت کو ہے اور کتنی دُور ہے۔ پانی سے سر اُبھارنے کے ساتھ ہی لاتعداد اندیشے میرے ذہن میں اُبھرے اور مجھے موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا کرگئے۔ میں کم ہمت اور کم حوصلہ آدمی نہیں ہوں لیکن اس صورتِ حال میں میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا کہ اس وقت تک چُپ چاپ اپنی موت کا انتظار کرتا رہوں جب تک کہ شارک مچھلیوں کی خوراک نہیں بن جاتا۔ تاہم میں نے اپنے ربِّ عظیم کو پُکارا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے کسی سمت کنارہ دکھائی دیا اور نہ ہی دُور دُور نزدیک کسی کشتی کے بادبان نظر آئے البتہ بہت دُور سطحِ آب پر ایک سیاہ دھبّہ ضرور دکھائی دے گیا۔

یہ دھبّہ کیا تھا اور کیسا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ اگر وہ جہاز ہوتا تو پہلے مجھے اُس کے مستول دکھائی دیتے، کشتی ہوتی تو پھر بادبان نظر آتے۔ وہ کوئی جزیرہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ چند لمحوں میں اس کی جسامت بڑھ گئی تھی۔ میری نگاہیں اُس پر جم کر رہ گئیں ... اُس دھبّے سے ایک سفید لکیر اُوپر اُٹھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں میں تبدیل ہوگئی۔

سمندر کے بیچوں بیچ اُٹھنے والا دُھواں میرے لیے خاصا تحیّر خیز تھا۔ میں اُس کے سبب پر غور کرہی رہا تھا کہ اُس سے کچھ فاصلے پر ایک اور دھبّہ اور اس سے سفید لکیر اُٹھتی دکھائی دی۔ یہ لکیر بھی اُوپر جاکر دُھواں بن گئی ... اور اس کے ساتھ ہی میں سمجھ گیا کہ پانی سے یہ دُھواں کیوں اور کیسے اُٹھ رہا ہے۔ شاید وہاں کشتیاں یا جہاز جل رہے تھے۔

یہ دُھواں میرے لیے نوید بنا تھا۔ میں پُوری قوت سے اُس طرف تیرنے لگا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ اس وقت سمندر پُرسکون تھا ورنہ میں اتنی تیزی سے ہرگز نہیں تیر سکتا تھا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے بعد ... دور سے دو بادبانی جہاز جلتے ہُوئے نظر آگئے۔ میں نے تیرنے کی رفتار بڑھادی تاکہ اگر ان جہازوں کے ملاح جان بچانے کے لیے چھوٹی کشتیوں میں جارہے ہوں تو میں بھی اُن میں شامل ہوسکوں لیکن جب میں قریب پہنچا تو مجھے اُن جہازوں پر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ شاید وہ میرے آنے سے پہلے ہی جاچکے تھے۔

ان جہازوں کے قریب ہی مجھے کچھ تختے، شہتیر، رسّے اور صندوق تیرتے نظر آئے۔ میں نے جلدی جلدی تین تختوں کو ایک رسّے کے ساتھ باندھ دیا کہ جلتے ہُوئے جہازوں کو تو بالآخر ڈوب ہی جانا تھا ... اگر میں اُن سے کھانے پینے کا سامان نکال بھی لیتا تو اُسے کیسے سنبھالتا اور کہاں رکھتا؟ یہی سوچ کر سب سے پہلے میں نے تختوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔ اتنے میں ایک صندوق تیرتا ہُوا قریب آگیا۔ میں نے اُسے گھسیٹ کر تختوں پر رکھ لیا ... مگر جب اُسے کھولا تو اس میں کچھ کپڑے، خنجر اور ایک تلوار رکھی ہُوئی ملی۔ شاید یہ صندوق جہاز کے کسی افسر کا تھا۔ اگرچہ مجھے کسی ہتھیار کی بھی شدید ضرورت تھی مگر اس سے کہیں زیادہ اہم اَشیائے خوردونوش تھیں جن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے کسی تاخیر کے بغیر اُن جہازوں پر جانے کا فیصلہ کرلیا اور اُن میں سے ایک پر چڑھ گیا۔ اس جہاز کا آدھا حصّہ جل چکا تھا۔

اس وقت شام کا جھٹپٹا پھیلنے لگا تھا اور میں جلد از جلد کچھ اَشیائے خوردونوش اُن تختوں پر منتقل کردینا چاہتا تھا۔

جہاز کے عرشے پر کچھ ملّاحوں کی لاشیں بھی پڑی تھیں۔ کچھ لاشیں میں نے سمندر میں تیرتی ہُوئی دیکھی تھیں مگر وہ کون تھے اور کیسے لوگ تھے، یہ دیکھنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اتنا اندازہ ہی میرے لیے کافی تھا کہ دو مختلف گروہوں کے درمیان لڑائی ہُوئی، جس کے نتیجے میں یہ دو تجارتی جہاز جل رہے ہیں اور مخالف فریق کے جہاز یا کشتیاں ڈوب چکی ہیں جن کے تختے قریب ہی تیر رہے تھے۔

میں جہاز پر کھانے، شیلئے خوردونوش کے لیے نظریں دوڑا رہا تھا

کہ اچانک میری نگاہ جلتے ہوئے جہاز کی روشنی میں دُور سمندر پر جا پڑی اور میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ ایک چھوٹی کشتی میری ہی طرف آ رہی ہے۔ اس میں کچھ لوگ ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھے اور میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے، اس لیے میں نے فی الوقت یہی مناسب سمجھا کہ اُن کی نگاہوں میں نہ آؤں اور پہلے اُن کا جائزہ لے لوں۔ چنانچہ میں فوراً ڈوبتے جہاز سے اُتر کر تیرتے ہوئے تختوں پر لیٹ گیا۔ ۔ ۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ بھی یقیناً اشیائے خورد و نوش ہی کی تلاش میں یہاں آئے ہوں گے ورنہ تباہ شدہ اور جلتے ہوئے جہازوں کی طرف کیوں آتے؟ اور میرے لیے یہی بہتر ہوگا کہ میں ان تختوں پر ہچکولے کھا کھا کر موت کا انتظار کرنے کی بجائے اُن کا ہم سفر بن جاؤں۔ کشتی، موجوں کے رحم و کرم پر بہنے والے تختوں سے بہرصورت بہتر اور محفوظ تھی۔ ۔ ۔ اور ممکن ہے کہ خدا نے میری مدد کے لیے ہی انھیں بھیجا ہو چنانچہ میں نے بے ساختہ "ہیا ہو" کا نعرہ لگا دیا۔

میرے اس نعرے کا اُلٹا اثر ہوا۔

کشتی آگے بڑھنے کی بجائے ایک دم گھوم گئی، چپّو چلنے بند ہو گئے اور فضا میں سناٹا چھا گیا۔ یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے نعرے نے اُن سب کو گونگا اور بہرہ ہی نہیں، بلکہ پتھر کا بھی بنا دیا ہو۔ ۔ ۔ یا پھر انھیں اچانک ایک ساتھ ہی موت آ گئی ہو۔

"تم لوگ آتے آتے رُک کیوں گئے ہو۔ آگے آؤ نا؟" میں نے اُن سے کہا۔

"تم کون ہو؟" کشتی سے آواز آئی۔

"مجھے اپنا دوست سمجھو، دوستو؟" میں نے جواب دیا۔

کشتی والے لوگ آپس میں دھیمی آواز سے یُوں باتیں کرنے لگے جیسے مشورہ کر رہے ہوں پھر کشتی آگے بڑھی اور میرے تختوں سے چند فٹ کے فاصلے پر رُک گئی۔ میں اُن کی طرف اور وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اُن کے چہروں اور حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس تصادم کا ایک فریق تھے۔ میں نے انھیں اپنی طرف متوجہ پا کر کہا۔ "میری طرف یوں حیرت سے کیا تک رہے ہو؟ میں نے کہا نا کہ میں تمھارا دوست ہوں۔ کیا میں تمھیں اپنا دوست نظر نہیں آتا؟"

اُن میں ایک بار پھر کانا پھوسی شروع ہو گئی۔ آخر اُن میں سے ایک آدمی جو بشرے سے سردار لگتا تھا، اٹھا اور اُس نے مجھ سے سوال کیا۔ "تمھارا جہاز کون سا تھا؟"

"ان میں سے کوئی بھی نہیں؟" میں نے جلتے ہوئے جہازوں اور تباہ شدہ کشتیوں کے تختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں جنوب سے یہاں آیا ہوں جہاں دو روز پہلے میرا جہاز غرقاب ہو گیا تھا۔"

"وہ کیسے غرقاب ہو گیا جب کہ ان دنوں سمندر میں کوئی طوفان آیا نہ بارش ہوئی۔ کیا بحری قزاقوں نے اسے ڈبو دیا؟"

"بحری قزاق؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔

"اگر تم برقون کے بحری قزاقوں کو نہیں جانتے تو میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم کسی اور سرزمین سے آئے ہو؟ وہ بولا۔ "اور اگر تم برقون کے بحری قزاقوں سے لاعلم ہو تو اُن میں سے نہیں ہو سکتے۔ اب یہ تلوار پھینک دو اور نہتے ہو کر ہماری کشتی پر آ جاؤ۔ میں کسی ملاح کو قزاقوں کے لیے یہاں نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ یہاں آئیں اور تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے آدمیوں کی زندگی بھی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ چلو، جلدی کرو۔"

میں نے تلوار پھینک دی اور تختے سے کُود کر تیرتا ہُوا کشتی میں آ گیا۔ اُس نے غور سے میرا جائزہ لیا اور بولا۔ "میں نے تم جیسا لمبا تڑنگا اور قوی آدمی پہلے نہیں دیکھا۔ اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اگر تم نے کسی ہتھیار کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ہم تمھیں مچھلیوں کا لقمہ بنانے میں دیر نہیں کریں گے۔"

اتنے میں پیچھے سے کسی کی آواز آئی "سلطان۔ ۔ ۔ اُدھر دیکھو۔"

میں نے اور کشتی میں سوار ہر آدمی نے پلٹ کر دیکھا۔ جلتے ہوئے جہاز کے عقب سے مُڑ کر دو لمبی کشتیاں ہماری طرف آ رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان میں برقون کے قزاق سوار ہیں جن کا ذکر سلطان نے کیا تھا۔ یہ بات بھی فوراً میرے ذہن میں آ گئی کہ بحری قزاق مجھے ان لوگوں کا ساتھی اور اپنا دشمن تصور کرتے ہوئے بات کرنے کا موقع دیے بغیر ہی تہ تیغ کر ڈالیں گے۔ اتنے میں وہ کشتیاں ہمارے سر پر آ گئیں۔ سلطان بولا۔ "اب اُوپر والا ہی ہمیں بچائے تو بچائے ورنہ بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ ہم نے یہاں آ کر زبردست غلطی کی ہے۔"

میں نے کشتی میں پڑی ہُوئی تلواروں میں سے ایک کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سلطان نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے شک و شبے کی نگاہوں سے مت دیکھو سلطان! میں بتا چکا ہوں کہ تمھارا دوست ہُوں۔ نہ تمھارے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیں گے اس لیے وقت ضائع نہ کرو اور مجھے ایک تلوار دے دو۔"

سلطان نے کچھ کہنے کی بجائے ایک تلوار اور خنجر میری طرف بڑھا دیا۔ اتنے میں قزاقوں کی کشتیاں پہلو بہ پہلو آ گئیں۔ میں تلوار اور خنجر سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہُوا تاکہ قزاقوں کی جنگی ہیئت کا جائزہ لے سکوں۔ غنیمت یہ تھا کہ اُن کے پاس تیر کمانیں نہیں تھیں، ورنہ وہ پہلے ہی ہمیں ختم کر دیتے۔ اس وقت ہماری طرح اُن کے پاس بھی تلواریں ہی

تھے۔

قزاقوں کی ایک کشتی نے پہلو سے ٹکر ماری تاکہ ہماری کشتی ۔۔۔ جائے مگر اس ٹکر سے صرف ہماری کشتی کے ملاحوں کے ہی نہیں، قزاقوں کے قدم بھی ڈگمگا گئے اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر حملہ ۔۔۔ ، میں اُن پر ٹوٹ پڑا۔ میرے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ۔۔۔ خنجر۔ چونکہ بحری قزاقوں کے سردار نے ہماری کشتی میں کُودنے کا ۔۔۔ دہ بنایا تھا، اس لیے سب سے آگے وہی تھا اور سب سے پہلے ۔۔۔ تلوار بھی اُسی کے دل میں اُتری۔ چونکہ میرے بازو قزاقوں کی ۔۔۔ ت لمبے تھے اس لیے میری تلوار اور خنجر کی پہنچ اُن کی نسبت کہیں ۔۔۔ تھی، چنانچہ میں نے اُس سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ مارشل آرٹ ۔۔۔ شمشیر زنی کی تربیت نے مجھے نہ صرف ہتھیاروں بلکہ اپنی ٹانگوں ۔۔۔ بھی بھرپور کام لینا سکھا دیا تھا لہٰذا میں نے چند لمحوں کے اندر پانچ قزاقوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اب مجھ پر خون سوار ہو گیا تھا۔ میں ۔۔۔ کی سی کیفیت میں اُن کی کشتی پر کُود گیا اور پھرکی کی طرح گھومتے ۔۔۔ تلوار، خنجر اور پاؤں چلانے لگا۔ چند لمحے تو قزاق میرے مقابلے ۔۔۔ رہے مگر جب کوئی بھی مجھے ایک چرکا تک لگانے میں کامیاب ۔۔۔ سکا اور میری تلوار انھی کا خون چاٹتی رہی تو وہ ایک ایک کر کے ۔۔۔ میں کُود گئے۔ اب میں نے پلٹ کر اپنی کشتی کی طرف دیکھا تو ۔۔۔ قزاقوں کی دوسری کشتی، جس نے ہماری کشتی کے دوسرے ۔۔۔ سے حملہ کیا تھا، راہِ فرار اختیار کر رہی ہے۔ اتنے میں سلطان ۔۔۔ سے چلّا اُٹھا۔ "واہ میرے دوست، تم نے تو کمال کر دیا۔ اپنے ۔۔۔ مرے ہُوئے باپ کی قسم، ایسی لڑائی آج تک کسی نے نہیں دیکھی ۔۔۔ میرے چار ساتھی مر گئے ہیں لیکن ہم نے بھی اُن کے چھ آدمی ۔۔۔ کر دیے ہیں۔ جب اُنھوں نے تمھارے ہاتھوں اپنے ساتھیوں ۔۔۔ دیکھا تو بھاگ نکلے۔"

۔۔۔ اس دست بدست لڑائی کے دوران قزاقوں والی اور ہماری ۔۔۔ ایک دوسرے سے تقریباً بیس فٹ دُور ہو گئی تھیں۔ جب میں اپنی ۔۔۔ میں جانے کے لیے چھلانگ لگانے لگا تو سلطان بولا۔ "تم وہیں رہو۔ ۔۔۔ ان بدبختوں کی لاشیں پھینک کر وہ کشتی بھی لے چلیں گے۔"

پھر سلطان نے اپنے کچھ ساتھیوں کو لاشیں پھینکنے اور کچھ کو جلتے ۔۔۔ جہاز سے اشیائے خورد و نوش لانے کا حکم دیا اور میرے پاس ۔۔۔ کر سرد لہجے میں بولا۔ "تو تم جنوب سے آئے ہو؟"

"ہاں۔ ۔ ۔ میں جہاں گرد قسم کا آدمی ہوں؟" میں نے جواب دیا۔ "اپنے مرے ہُوئے باپ کی قسم، میں نے آج تک تم جیسا جنگجو نہیں دیکھا۔"

"مگر میں اپنے وطن میں ملاح نہیں، پیشہ ور عسکری تھا۔ ہماری طرف آزاد پیشہ ور عسکری بھی ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ ۔ ۔ میں نے اُن کے بارے میں سُنا ہے۔ تم اتنے اچھے جنگجو ہو کہ فارش کا کوئی بھی جہاز راں تمھیں دُگنی تنخواہ پر اپنا محافظ بنا لے گا۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ تم ہمیں مل گئے۔" پھر اُس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہُوئے بات جاری رکھی۔ "سلطان پسرِ ارسلان تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور تادمِ آخر تمھارا دوست رہے گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہُوئے کہا۔ "سرفروش بھی دوستوں کا دوست ہے اور زندگی کے آخری لمحے تک دوستی نبھائے گا۔"

"جب سلطان، جہاز رانوں کی انجمن سے کچھ کہتا ہے تو اس کے ارکان سلطان کی بات نہیں ٹال سکتے۔ دیکھتے جاؤ، سلطان پسرِ ارسلان تمھارے لیے کیا کرتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ پلٹا اور اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔

* *

ہمیں کشتیوں میں سفر کرتے ہُوئے پانچ روز ہو گئے تھے۔ ان پانچ دنوں میں میں نے مکمل آرام کیا تھا اور سوچتا رہا تھا مگر مجھے سلطان اور اس کے ساتھیوں کی باہمی گفتگو سے جو کچھ معلوم ہو سکا تھا اُس سے میں کسی فائدہ مند فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ ان لوگوں سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق وہ فارش کے باشندے تھے۔ فارش کے شمال میں سمندر کے بیچوں بیچ برقون کا جزیرہ واقع تھا جو بحری قزاقوں کی آماجگاہ ہی نہیں بلکہ ان کا دارالحکومت تھا۔ عسکری قوت کے اعتبار سے یہ جزیرہ پانچویں مملکت تھی۔ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران قزاقوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ اُن کے حوصلے بھی اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ سمندر میں تجارتی جہازوں کو لُوٹنے کے علاوہ فارش اور اس سے ملحق تین مملکتوں کے ساحلی علاقوں کو بھی تاخت و تاراج کرنے لگے تھے۔

سلطان اُن جلنے والے دو تجارتی جہازوں میں سے بڑے جہاز "ماہیِ سفید" کا نائب کپتان تھا۔ چونکہ یہ دونوں بڑے جہاز تھے اور اُن کا عملہ مسلح ہونے کے ساتھ ساتھ جنگی تربیت یافتہ تھا اس لیے قزاقوں سے تصادم میں اُنھوں نے قزاقوں کی دو جنگی کشتیاں ڈبو دی تھیں اور تین کو آگ لگا دی تھی مگر خود بھی آتش زنی سے نہیں بچ سکے تھے۔ سلطان نے بتایا تھا کہ عام طور پر جیت قزاقوں کی ہُوا کرتی ہے جو جہاز اور اُن پر لدا ہُوا سامان برقون لے جاتے ہیں جہاں جہازوں کے

عملے کو غلام بنا لیا جاتا ہے یا کبھی کبھی یرغمال وصول کرنے کے بعد انھیں رہا کر دیا جاتا ہے۔

سلطان کا خیال تھا کہ اگر موسم اسی طرح سازگار رہا تو وہ تین ہفتوں میں ساحلِ فارش تک پہنچ جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں سوائے سوچنے اور آرام کرنے کے میں اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لہٰذا آج بھی میں کھانا کھا کر جلدی سو گیا۔

دوسری صبح "جہاز . . . جہاز" کی مسرت انگیز آوازوں سے میری آنکھ کھلی تو میں حیران رہ گیا کیوں کہ سلطان نے بتایا تھا کہ ساحلِ فارش تک راستے میں کسی جہاز کے ملنے کا امکان نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کافی دور تک جنوب میں نکل آئے تھے جہاں قزاقوں کا خطرہ ہوتا ہے اور عام طور پر جہاز ادھر نہیں آتے چنانچہ ملاحوں کی اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اس طرف دیکھا جدھر ملاحوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بلاشبہ بہت بڑا جہاز تھا جس کے تین مستول تھے اور ہر مستول کے ساتھ تین تین بادبان لگے ہوئے تھے۔ جہاز پر سرخ اور نیلا رنگ کیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے سلطان نے پہچانا تھا کہ وہ فارش کا جہاز ہے۔

اس نے بتایا "یہ شاہی جنگی جہاز ہے سرفروش۔ فارش کی بحریہ کے پاس اچھا خاصا بیڑا ہے۔ اب ہمیں کشتیوں کے تکلیف دہ سفر سے نجات مل جائے گی۔"

سلطان نے مدد کا اشارہ دینے کے لیے جونری میں بھرا ہوا کوئی ایسا مسالہ جلایا کہ اس سے سبز رنگ کا دھواں اٹھنے لگا . . . تھوڑی دیر بعد جہاز سے بھی ویسا ہی دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہماری کشتیاں جہاز کے قریب پہنچ گئیں۔ جہاز کی ریلنگ سے داڑھیوں والے ملاح جھانک جھانک کر ہمیں دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک آدمی جو غالباً جہاز کا کپتان تھا، ریلنگ سے جھانکتے ہوئے چلایا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"ماہیِ سفید اور مرشاخ کے بچے کھچے ملاح۔ تین روز پہلے قزاقوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ انھوں نے ہمارے دونوں جہاز جلا دیے مگر ہم نے بھی ان کی دو کشتیاں جلائیں اور تین ڈبو دیں۔" سلطان نے جواب دیا۔

جہاز کے ملاحوں نے یہ سن کر تالیاں بجائیں اور خوشی کا نعرہ لگایا مگر کپتان بولا "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم لوگ بحری قزاق ہو اور ہمیں دھوکا دینا چاہتے ہو۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" سلطان غصے سے بولا "کیا تم سلطان پسر ارسلان کو نہیں جانتے؟"

اتنے میں ریلنگ پر جھکے ہوئے ملاح ہٹنے لگے اور ایک نیا چہرہ نیچے جھانکنے لگا۔ یہ سفید بالوں والے ایک ادھیڑ عمر آدمی کا چہرہ تھا۔ اس نے سیاہ پگڑی باندھی ہوئی تھی جس پر جہاز کے پرچم کی طرح پانچ برج کڑھے ہوئے تھے۔ سلطان اسے دیکھتے ہی چلایا۔

"عالی وقار شہزادے۔ کیا یہ تشور کا جہاز ہے؟"

"ہاں سلطان!" شہزادے نے جواب دیا اور کپتان سے کہنے لگا "یہ سلطان پسر ارسلان ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو جہاز پر سوار کر لو۔"

"لیکن عالی جاہ . . ."

"ہم جو کہتے ہیں، وہ کرو۔" شہزادے نے کپتان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ابھی ہم سفیر نہیں، ولی عہد ہیں۔"

کپتان نے سر جھکا دیا۔

چند لمحوں بعد جہاز سے اس کی سیڑھی لٹکا دی گئی اور ہم ایک ایک کر کے جہاز کے عرشے پر پہنچ گئے۔

شہزادہ شہریار نے چند سوالات کرنے کے بعد کپتان کو حکم دیا کہ میرے اور سلطان کے علاوہ باقی سارے آدمیوں کو لباس فراہم کر کے کھانا کھلا دے پھر وہ مجھے اور سلطان کو اپنے کیبن میں لے آیا جہاں اس نے الماری کھول کر مجھے اور سلطان کو بہت عمدہ لباس اور جوتے وغیرہ دیے اور خود باہر چلا گیا۔

ہم نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور باہر جانے لگے کہ اتنے میں شہزادہ کپتان کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اس نے ہمیں نشستوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سلطان سے بولا "ہاں پسر ارسلان۔ اب تم اپنی کہانی تفصیل سے سناؤ۔"

جب سلطان اسے ہر بات تفصیل سے بتا چکا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا "تو تم ایک آزاد عسکری ہو سرفروش۔ کیا تمھارے وطن میں تم جیسے اور بھی بہت سے آزاد جنگجو ہوتے ہیں؟"

"وہاں آزاد عسکری تو کافی ہیں عالی جاہ مگر مجھ جیسے بہت کم ہیں۔"

"ہوں . . ." وہ کچھ سوچتے اور سر ہلاتے ہوئے بولا "اگر تمھارے وطن میں سبھی تم جیسے ہوتے، دس دس قزاقوں کو تنہا ختم کرنے کی ہمت رکھتے تو ان کی ایک چھوٹی سی فوج نہ صرف ہماری چار مملکتوں پر چھا جاتی بلکہ وہ قزاقوں کو بھی تہس نہس کر دیتی۔" اتنا کہنے کے بعد وہ بآواز بلند بولا "فرح مہمانوں کے لیے کچھ لے آؤ۔"

کیبن کے عقبی دروازے پر آویزاں پردہ ہٹا تو ایک کشیدہ قد

وشاداب نہایت حسین لڑکی چرمی بوتل اور چاندی کے چار پیالے لیے نمودار ہوئی۔ وہ قد میں مجھ سے صرف چھ سات انچ کم تھی۔ اس کی چال میں وقار اور چہرے کے نقوش میں بلا کی جاذبیت تھی لیکن عام عورتوں کے برعکس اس نے میری طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ اس نے چرمی بوتل اور پیالے تپائی پر رکھ دیے پھر ایک نشست گھسیٹ کر شہزادے کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

کپتان نے پیالوں میں مشروب انڈیلا اور پیالے ہماری طرف بڑھا دیے۔ تب شہزادہ کہنے لگا "اگرچہ قزاقوں کو اپنی فتح کے لیے گراں قیمت ادا کرنا پڑی ہے لیکن اس سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کے پاس تقریباً دو سو جہازوں اور جنگی کشتیوں پر مشتمل بیڑا ہے۔ اس کے باوجود ہم ان کا مقابلہ کر سکتے تھے مگر مشکل یہ ہے کہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرے بھائی شاہ اسفند یار کا وزیرِ اعلیٰ شیرکوہ قزاقوں سے ملا ہوا ہے۔ جب میں نے اپنے بھائی کو اس کی غداری سے آگاہ کیا تو اس نے مجھ پر اعتماد کرنے کی بجائے کہا کہ میں شیرکوہ کے خلاف مزید ثبوت بہم پہنچاؤں۔ اس طرح شیرکوہ کو میرے خلاف سازش کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے میرے بھائی کے کان بھر دیے کہ میں اسے ہٹا کر خود تخت نشین ہونا چاہتا ہوں . . . اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ مجھے سفیر بنا کر مشرقی مملکت ترغون بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اب میں اپنی بیٹی فرح کے ساتھ ترغون جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا پیالہ خالی کر کے کپتان کی طرف بڑھا دیا جو اسے بھرنے لگا۔

اب شہزادہ مجھ سے مخاطب ہوا "تم جس مملکت سے بھی آئے ہو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ اتنا مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم قزاقوں کے دشمن ہو . . . پھر تمھاری بہادری میں بھی کوئی کلام نہیں۔ میں تمھیں جہاز پر کوئی اچھا سا عہدہ دے دیتا مگر اس طرح عملہ تم سے پرخاش رکھے گا لہٰذا فی الوقت میں تمھیں اپنا محافظِ خاص بنا سکتا ہوں۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

ظاہر ہے کہ میں جہازیوں اور ملاحوں کا کام نہیں جانتا تھا اس لیے مجھے محافظ بننے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم میں نے کہا "کیا آپ سلطان پسر ارسلان کو بھی ملازم رکھیں گے؟ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کا عہد کیا ہے۔"

"میں اسے بھی ملازمت دے سکتا ہوں۔ یہ اپنی اوائل عمر میں میرے سسر کے جہاز پر کام کر چکا ہے۔" پھر وہ اس سے مخاطب ہوا "میرے جہاز پر کام کرو گے سلطان؟"

"بسر و چشم عالی جاہ!" سلطان نے جواب دیا اور ہم دونوں ہی شہزادے کے ملازم ہو گئے۔

سلطان کے ساتھی ملاحوں کو بھی ان کی اہلیت کے مطابق جہاز پر کام دے دیا گیا۔ وہ سلطان کے ساتھ جہاز پر اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ محافظِ خاص کی حیثیت سے مجھے جہاز پر کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ میں دن کے وقت کئی گھنٹوں تک شمشیر زنی کی مشق کیا کرتا اور ورزش بھی میرا معمول تھی مگر دوسرے محافظ زیادہ تر بحری بخار میں مبتلا رہتے تھے۔ انھیں دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر قزاقوں نے ہم پر حملہ کر دیا تو یہ غریب ان کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے؟ وہ مجھے بڑے تعجب سے دیکھتے اور مجھے پینترے بدلتے دیکھ کر دم بخود رہ جاتے۔ کئی گھنٹوں کی مشق اور ورزش کے بعد میں جہاز کے عرشے پر اور نیچے گھوم پھر کر جہازیوں کو مختلف کام کرتے دیکھتا رہتا۔ اس دوران فرح نے کبھی مجھ سے کھل کر باتیں کیں اور نہ ہی اس کی کسی ادا سے یہ پتہ چل سکا کہ وہ مجھ میں کسی قسم کی دلچسپی رکھتی ہے۔ میری زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی جو میری کسی بات سے مرعوب نہیں ہوئی تھی ورنہ اب تک مجھے جتنی بھی عورتیں ملی تھیں، سب از خود میری طرف بڑھی تھیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ بڑھی تھیں۔

ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً دو ہفتے گزر چکے تھے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ میرے دل میں یہ تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ آخر فرح مجھے درخورِ اعتنا کیوں نہیں سمجھتی؟ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتا تھا، وہ اتنی ہی معمہ بنتی جاتی تھی۔

فرح کی طرح جہاز کا کپتان بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ اسے اپنے دلی تاثرات چھپانے میں مہارت حاصل تھی۔ جب کبھی قزاقوں کے بارے میں بات چیت ہوتی، میں اس کے چہرے کے تاثرات سے مطلق اندازہ نہ کر سکتا کہ اس کے دل میں کیا ہے؟ لیکن چھٹی حس مجھے بار بار یہ بتاتی تھی کہ وہ شیرکوہ کا آدمی ہے۔

چودھویں روز مجھے جہاز پر ایک عجیب سی ہلچل نظر آئی . . . جہازی جو پہلے ڈرے سہمے دکھائی دیتے تھے، اب خوش باش نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو مجھے بتایا گیا کہ جہاز جنوب مشرق میں اتنا آگے آ چکا ہے کہ اب قزاقوں کی یلغار کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ شہزادے اور فرح کے چہروں پر بھی بشاشت اتر آئی تھی لیکن کپتان کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میں نے اس پر اس لیے کوئی توجہ نہ دی کہ آج مجھے فرح کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک نظر آ گئی تھی اور میری طرف

دیکھتے وقت اُس کے ہونٹوں پر تبسم کے پھول کھل اُٹھتے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج رات جب چاندنی اپنا جادو جگائے گی اور وہ کیبن کے دریچے میں موجوں کی بے قراری کا نظارا کرنے آئے گی تو میں خود اُس سے بات کروں گا۔

اس رات جب چاند چمکا اور چاندنی چھٹکی تو میں کیبن کے دریچے کے پاس موجود تھا۔ فرح حسبِ معمول دریچے میں آکھڑی ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ میں اُس سے کوئی بات کرتا، مستول پر چڑھا ہُوا لڑکا زور سے چلّایا "قزاق آگئے۔ قزاق آگئے"۔

میں تیزی سے ہتھیار لینے دوڑا۔ شہزادے کے ذاتی ملازم چیختے چلّاتے نیچے اُتر گئے۔ سارے محافظ اپنے اپنے ہتھیار لیے کیبن کے سامنے جمع ہونے لگے۔ تنومند جہازیوں نے بھی تیغے اور تیر کمان سنبھال لیے۔ میں نے دیکھا کہ کپتان ایک ملاح کے ساتھ کھسر پھسر کر رہا ہے۔۔۔ پھر ملاح تیزی سے نیچے چلا گیا۔ میں نے ایک نظر قزاقوں کے چھوٹے جنگی جہازوں کی طرف ڈالی جو بڑی تیزی سے ہمارے جہاز کی طرف آرہے تھے۔ وہ تعداد میں نو تھے۔ اس صورتِ حال میں اُن سے مقابلہ کرنا اور بچ نکلنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن سا لگ رہا تھا۔

میں اُس وقت تک پُوری طرح ہتھیار بند ہو چکا تھا اور ریلنگ سے جھک کر سب سے آگے آنے والے جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میرے سامنے فرح کسی دُلہن جیسی سج دھج کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے بڑا خوب صورت گلابی لباس پہن رکھا تھا۔ کانوں میں ہیرے کے آویزے تھے۔ ماتھے پر جھومر جگمگا رہا تھا۔ کلائی سے کہنی تک جڑاؤ چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور موتیوں کے گلوبند نے اُسے ملکوتی حُسن عطا کر دیا تھا۔

میں اس کی سج دھج اور خیرہ کُن حُسن کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ دفعتہً وہ مُسکرا کر بولی "شاید تم یہ سوچ کر حیران ہو کہ یہ بار سنگھار کی کون سی تقریب ہے، لیکن اگر ہم مغلوب ہو گئے تو قزاق ان سب کو تہ تیغ کر دیں گے جنھیں وہ غلام بنانے کے قابل نہ سمجھیں یا جن سے اُنھیں یرغمالی کی رقم ملنے کی اُمید ہو" پھر اُس نے اپنے زیور دکھاتے ہُوئے بات جاری رکھی "یہ زیور اس بات کی ضمانت ہیں کہ میں متمول خاندان کی ایک معزز خاتون ہوں اور انھیں یرغمال کے طور پر ایک بڑی رقم مل سکتی ہے"۔

"لیکن وحشی قزاقوں کا سامنا کرنا بڑے حوصلے کی بات ہے۔۔۔ وہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں"۔

"میں ایک بہادر باپ کی جُرأت مند بیٹی ہوں سرفروش! اور مجھے آخری دم تک حوصلے سے کام لینا ہے۔ اس وقت میں تمھارے پاس اسی لیے آئی ہوں کہ اگر ہم مغلوب ہو جائیں تو تمھیں یاد رہے کہ میں تمھاری منگیتر ہوں"۔

"میری منگیتر، وہ کیسے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم بھی کتنے نادان ہو سرفروش! اتنا بھی نہیں جانتے کہ شہزادے کی بیٹی کا منگیتر کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح وہ تمھیں بھی یرغمال بنا کر لے جائیں گے"۔

میں سمجھا کہ شاید وہ مجھے محبت کی وجہ سے بچانا چاہتی ہے مگر اُس نے یہ کہہ کر میری غلط فہمی دُور کر دی "میں چاہتی ہوں کہ اگر ایسا وقت آئے تو کوئی میری حفاظت کے لیے موجود ہو"۔

مجھے یہ سُن کر ایک دھچکا سا لگا لیکن میں نے سوچا کہ قزاقوں کے ہاتھوں سے تہ تیغ ہونے سے زندہ رہنا بہتر ہے کہ اس طرح بقا کا امکان ہو سکتا ہے۔ اتنے میں مجھے مختلف آوازوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آوازیں قزاقوں کے جہازوں سے آرہی تھیں جو اب ہمارے جہاز کو چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ اتنے میں شہزادہ بھی وہاں آگیا۔ وہ فوجی وردی میں تھا اور ہتھیاروں سے لیس تھا۔ اُس نے فرح کو نیچے بھیج دیا۔ پھر مجھ سے کہا "یہ قزاق جانتے ہیں کہ ہم پر حملہ کرنا موت و حیات کی بازی لگانے کے مترادف ہے لیکن تیرو نے انھیں بہت سا سونا دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔ وہ ہر قیمت پر ہمیں راستے سے ہٹانا چاہتا تاہم قزاقوں کو سونا حاصل کرنے کے لیے جانوں کی قربانی دینا پڑے گی"۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔

میں نے قزاقوں کے جہازوں پر نظر ڈالی۔ وہ اپنے بادبان سمیٹ رہے تھے اور چپو چلا کر اپنے جہاز ہمارے جہاز سے لگے بڑھ رہے تھے۔ میں ان کا منصوبہ سمجھ گیا۔ وہ ہمیں دائرے میں گھیرے تھے تاکہ پھر دائرہ تنگ کر کے چاروں طرف سے ہم پر حملہ آور ہوں۔ ان کی تعداد ہمارے جہازیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ ہمارا جہاز برابر آگے بڑھ رہا تھا اور شہزادہ غالباً یہی ہدایت دینے کے لیے نیچے کپتان کے پاس گیا تھا۔

جب وہ عرشے پر واپس آیا اور اپنے محافظوں اور جہازیوں کو ہدایات دینے لگا تو جہاز ایک دم گھومنے کے باعث ایک طرف جھکا اور سب لڑکھڑا گئے۔ جہاز کے گھومنے کا یہ مطلب تھا کہ اس کے بادبان مستولوں سے ٹکرا کر پھٹ جائیں اور وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کون اور کیوں کر رہا ہے۔ میں تیزی سے دوڑا اور نیچے اُترنے لگا۔ کپتان ایک نیچے کے ساتھ کھڑا چلا چلا کر ملاحوں کو ہدایات دے رہا تھا جو مسکان پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اُس نے مجھے دیکھ کر اپنی تلوار میان سے نکالنا چاہی مگر میں نے اُسے یہ موقع نہ دیا اور اپنے تیغے کے ایک ہی بھرپور وار سے اس کی گردن اُڑا دی۔ پھر میں نے چلّا کر ملاحوں کو حکم دیا۔

"مسکان واپس اپنی جگہ لے آؤ اور جہاز کو سیدھا چلنے دو۔ کپتان غدار تھا"۔

ملاحوں کو یہ حکم دے کر میں تیزی سے اُوپر آیا مگر اتنی دیر میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ قزاق ہمارے جہازیوں پر تیر برسا رہے تھے تاکہ وہ عرشے کی ریلنگ سے ہٹ جائیں اور قزاق کمند پھینک کر اوپر آسکیں۔ میں نے چلّا کر شہزادے کو بتایا "کپتان غدار تھا۔ اس نے جہاز موڑنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اُسے قتل کر دیا ہے"۔

"شکریہ سرفروش۔ میں۔۔۔" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کے عقب سے چھ قزاق نمودار ہوئے اور ایک قزاق کا تیر شہزادے کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کر عرشے پر گرا، ذرا سا تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اندھا دُھند اُن قزاقوں کی طرف دوڑتا چلا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوتے، میں نے شہزادے کو تیر مارنے والے قزاق کا سر بھٹے کی طرح اُڑا دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر خون سوار ہو گیا اور میں خون ریزی کے جُنون میں مبتلا ہو کر دونوں ہاتھوں اور پاؤں سے کام لیتے ہوئے قزاقوں کے پرخچے اُڑانے لگا۔ اُن کے تیر انداز مجھ کو تیروں کا نشانہ اس لیے نہیں بنا سکتے تھے کہ اس طرح خود اُن کے ساتھیوں کے ہلاک ہونے کا زیادہ امکان تھا جو مجھے گھیرنے کے لیے چاروں طرف سے میری طرف بڑھ رہے تھے لیکن میرے لمبے دست و بازو اور میری تلوار انھیں قریب آنے کا موقع نہ دیتے ہوئے اُن کا خون چاٹے جا رہی تھی۔

میں نے چیتے کی طرح جست لگاتے ہوئے ایک نظر عرشے پر ڈالی۔ ہمارے بہت سے جہازی اور تقریباً سارے محافظ ڈھیر ہو چکے تھے اور مزید قزاق ہر طرف سے اُوپر آرہے تھے۔ ایک طرف ریلنگ کے پاس سلطان تین قزاقوں سے نبرد آزما تھا۔ پھر میری نگاہ اپنے جیسی قد و قامت والے ایک قزاق پر پڑی جو کیبن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

میں نے ایک زقند بھری اور اس کے مقابل پہنچ گیا۔

اُس نے میرا وار اپنے چوڑے پھل والے تیغے پر روک کر مجھے پیچھے دھکیلا اور اتنے زور سے تیغہ چلایا کہ ہوا میں شپ کی آواز آئی اور اگر میں بروقت ایک جانب جُھکائی نہ دے جاتا تو وہ تیغہ یقیناً میرے دو ٹکڑے کر ڈالتا۔

اب میں سنبھل کر اور پینترے بدل بدل کر اُس پر وار کرنے لگا مگر وہ بھی بلا کا تیغ زن تھا۔ نہ صرف ہر وار سے بچتا بلکہ جواب بھی دیتا جا رہا تھا۔ تلوار اور تیغے کے ٹکرانے سے چنگاریاں اُڑ رہی تھیں مگر ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر غالب نہیں آرہا تھا ناگاہ مجھے اپنے عقب سے نعرۂ تحسین کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے مدمقابل کو دھکیلا اور اچٹتی سی نظر پیچھے ڈالی تو پتہ چلا کہ ہمارے تمام آدمی ڈھیر ہو چکے ہیں اور بہت سے قزاق کھڑے ہمارا مقابلہ دیکھ رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میرے اعضا جواب دینے لگے ہوں لیکن یہ موت و حیات کا معاملہ تھا اس لیے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنے مدمقابل کے وار روکتا اور اس پر حملہ کرتا رہا۔

رفتہ رفتہ میرا مدمقابل بھی تھکنے لگا اور اُس کے حملوں میں پہلے والی شدت نہ رہی۔ اُس کے تیغے سے "شپ شپ" کی آوازیں بھی آنا بند ہو گئیں۔

میں اُس کے اندازِ مدافعت سے سمجھ گیا کہ اب وہ جست لگا کر مجھے گرانے کا ارادہ کر رہا ہے یہی اس کا آخری حربہ تھا اور میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔

پھر وہ لمحہ بھی آگیا۔

میں نے جونہی اس کا تیغہ اپنی تلوار پر روکا، اس نے مجھ پر جست لگائی، میں بجلی کی سی پھرتی سے ہٹا اور ہٹتے ہٹتے میں نے اپنی تلوار سے اس کا شانہ زخمی کر دیا۔

خون کی ایک لکیر اُس کے شانے سے سینے تک پھرتی چلی گئی۔ یہ زخم اگرچہ کاری نہیں تھا مگر میں اس کے نفسیاتی ردِ عمل سے خوب آگاہ تھا۔

وہ جھنجلا کر مجھ پر اندھا دُھند وار کرنے لگا لیکن اب ہر بار اس کے جسم کے کسی نہ کسی حصّے پر ایک نیا زخم اور ایک نیا چرکا لگ جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی تھی۔ بالآخر وہ ہانپتے ہُوئے دو قدم پیچھے ہٹا اور اُس نے پوری قوت سے تیغہ میری طرف اچھال دیا جو سنسناتا ہُوا میرے کان کے قریب سے گزر گیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے آگے بڑھ کر تلوار اُس کے سینے میں گھونپ دی۔

وہ ڈگمگا کر گرا تو پھر نہ اُٹھ سکا۔

میری اپنی حالت بھی غیر تھی۔

میں تھکن کے مارے اُسی پہ ڈھیر ہونے والا تھا مگر میں نے تلوار کی نوک عرشے سے ٹکا دی اور اس کا سہارا لے کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔

عرشے پہ ادھر اُدھر ہمارے محافظوں اور جہازیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ تین قزاقوں نے سلطان کو تلواروں کی زد میں لے رکھا تھا۔ باقی سب ایک نیم دائرے میں کھڑے تعجب سے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک پستہ قد مگر مضبوط جسم کا قزاق ایک قدم آگے بڑھا اور مجھ سے بولا۔ "قزاق برادری کے آئین کے مطابق تم نے سالار بسر آند کو تن تنہا اور ایمانداری سے شکست دے کر اپنا یہ حق تسلیم کروا لیا ہے کہ قزاق برادری میں شامل ہو کر اس سالار کی جگہ لے سکو جسے تم نے ہلاک کیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، کیبن کا دروازہ کھلا اور دو قزاق فرح کو بازوؤں سے پکڑے باہر لے آئے۔ اُس کا حسن پریشان دیکھ کر سارے قزاق دنگ رہ گئے بلکہ چند ایک کی تو بے ساختہ سسکیاں بھی نکل گئیں۔ اُن کی نگاہیں دیکھ کر میں فرح کی طرف بڑھا اور بولا۔ "اگر میں قزاق برادری میں شامل ہونے کا اہل سمجھا گیا ہوں تو میری منگیتر اور اس آدمی کو بھی تحفظ دیا جائے جسے تین آدمیوں نے گھیر رکھا ہے۔" میں نے سلطان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اگر تمہارے لیے میری یہ شرط قابلِ قبول نہیں تو پھر خود ہی اندازہ لگا لو کہ میں مرنے سے پہلے تم میں سے کتنے آدمی موت کی وادی میں دھکیل دوں گا۔"

قزاق ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک اس طرح بولا جیسے دوسروں کو یاد دہانی کرانا چاہتا ہو۔ "مگر ہمیں تو باپ کے ساتھ بیٹی کو بھی ختم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔"

یہ سن کر میں نے تلوار کے دستے پہ اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تاکہ اگر وہ نہ مانیں تو پہلے میں فرح کو ختم کر دوں اور پھر قزاقوں سے لڑتا بھڑتا خود بھی موت کو گلے لگا لوں... مگر اتنے میں اُسی پستہ قامت آدمی نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اگرچہ برادری کے آئین میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ہے لیکن جنگجو بہادروں کے لیے آئین میں لچک پیدا کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور تم بلاشبہ ایک بہادر جنگجو ہو۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ "اگر تم میں سے کسی میں اتنی ہمت ہے کہ اس کا مقابلہ کر سکے تو وہ سامنے آئے تاکہ سردار کے چناؤ کا فیصلہ کیا جا سکے۔" یہ سُن کر قزاقوں کے درمیان سناٹا چھا گیا... لیکن اگلے ہی لمحے درندگی سے بھرپور ایک قہقہے نے سناٹا مجروح کر دیا۔ سب چونک کر اُدھر دیکھنے لگے۔ میں بھی اُس طرف متوجہ ہو گیا جدھر سے قہقہے کی گرج اب بھی اُبھر رہی تھی۔

میرا خیال تھا کہ کوئی جیالا مجھ سے مقابلہ کرنے کا تہیہ کر چکا ہے اور وہ میری تضحیک کے لیے قہقہے لگا رہا ہے...... لیکن جب میں نے غور سے اُس قہقہہ لگانے والے کی طرف دیکھا تو ایک مجہول سا آدمی نظر آیا۔

"میں نے کہا تھا..." وہ شخص قہقہوں کے درمیان بولا۔ "سردار کے سر پہ موت ناچ رہی ہے... لیکن کسی نے میری بات پہ توجہ

نہیں دی تھی۔"

"خاموش رہو، منصور"۔ وہی مضبوط جسم والا قزاق غرّایا جو سالار پسرِ آذر کی موت کے بعد مجھ سے ہمکلام تھا۔ اس کی غراہٹ پر مجہول شخص کی مسکراہٹ اور قہقہے دم توڑ گئے۔

میں کن انکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھتا رہا۔ غالباً قزاقوں کے سالار نے اس کے ساتھ کوئی بے انصافی کی تھی جس پر وہ اس کی موت کا خواہاں ہو گیا تھا۔

مضبوط جسم والا پستہ قامت شخص ایک بار پھر اپنے ساتھی قزاقوں کو گھورنے لگا... کچھ دیر بعد میں نے اپنی بات دہرائی: "اگر کسی میں ہمت ہے تو سامنے آئے تاکہ سالار کے انتخاب کا مرحلہ نپٹایا جا سکے۔"

جب کوئی بھی میرے مقابلے کو سامنے نہ آیا تو وہ بولا۔ "اب تم ہی ہمارے سردار اور سالار ہو، اجنبی جنگجو"۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے مصافحے کے لیے میرا ہاتھ تھام لیا۔

★★

دوسری صبح میں قزاقوں کی ایک جنگی کشتی "برقِ طوفان" پر کھڑا دور اپنے جلتے ہوئے جہاز کو دیکھ رہا تھا۔ میرے قریب فرح اور اس سے کچھ فاصلے پر سلطان بھی یہ دلخراش منظر دیکھ رہا تھا۔ میرے بائیں جانب ہی پستہ قامت قزاق موجود تھا۔ اس کا نام تیمور تھا اور وہ اسی جنگی کشتی پر سابق سالار کا نائب تھا۔

حالات نے ایکا ایکی مجھے قزاقوں کی صف میں شامل کر دیا تھا اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا ورنہ میرے لیے یرغمال کی رقم کون دیتا؟ قزاقوں کا غلام بننے سے ان کا سالار بننا بہر طور اچھا ہی تھا لیکن میں جہاز رانی کی ابجد بھی نہیں جانتا... اس لیے جہاز کا بیشتر عملہ مجھے سالار تسلیم کرنے میں ہچکچا رہا تھا چنانچہ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور سارے جہازیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا...

"قزاق ساتھیو — سالار پسرِ آذر نہ صرف ایک بہادر جنگجو بلکہ جہاز رانی کا بھی ماہر تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں جہاز رانی کے رموز سے آگاہ نہیں ہوں۔ جب ہم لوگ برقون پہنچیں گے تو میں قزاق برادری کے کسی تجربہ کار سالار سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنا نائب بنا کر جہاز رانی کی تربیت دے اور جب میں یہ تربیت حاصل کر لوں گا تو اسی کشتی پر سالار کا عہدہ سنبھال لوں گا۔ اس وقت تک تیمور سالار کے فرائض انجام دیتا رہے گا۔"

میری اس مختصر تقریر کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ جہازیوں کے لٹکے ہوتے چہروں پر مسکراہٹ آگئی اور انھوں نے نعرہ ہائے تحسین اور تالیوں کے ساتھ میرے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

اب تک مجھے فرح اور سلطان سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ فرح اپنے باپ کی موت پر بے حد اداس اور غمزدہ تھی ادھر سلطان کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ اسے قزاقوں میں میری شمولیت پسند نہیں آئی لیکن میں جانتا تھا، جب میں اسے بتاؤں گا کہ یہ سب کچھ میں نے مصلحتاً کیا ہے اور صرف اسی صورت میں ہمیں فرار کا موقع مل سکتا ہے تو وہ میری مجبوری اور مصلحت کا تقاضا سمجھ جائے گا۔

کچھ دیر بعد قزاقوں کا یہ بیڑا دو حصوں میں بٹ گیا۔ وہ کشتیاں جنھیں نقصان پہنچا تھا یا جن کے زیادہ ملاح مارے گئے تھے، برقون کی طرف چل پڑیں اور باقی لوٹ مار کے لیے متضاد سمت میں روانہ ہو گئیں چونکہ "برقِ طوفان" کے پندرہ ملاح اور سالار لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ اس لیے وہ بھی ان کشتیوں میں شامل تھی جو برقون جا رہی تھیں۔

ہمارا یہ سفر سترہ روز جاری رہا۔

اس دوران میں میں سلطان اور فرح کو سمجھا چکا تھا کہ میں نے قزاقوں میں شامل ہونا کیوں منظور کیا تھا۔ اب فرح بھی مجھ سے کچھ بے تکلف ہو گئی تھی لیکن اس کی یہ بے تکلفی محض اس وجہ سے تھی کہ قزاق اسے میری منگیتر سمجھتے رہیں ورنہ تنہائی میں وہ حسبِ معمول مجھ سے اجتناب برتتی تھی اور چونکہ مرد کی یہ فطرت ہے کہ جو عورت اس سے اجتناب برتے وہ اس کی طرف کچھ زیادہ ہی متوجہ ہو جاتا ہے۔ گویا وہ اس کا مان توڑنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن جبر میری طبیعت کے خلاف ہے اس لیے میری خواہش تھی کہ وہ از خود میری طرف پیش قدمی کرے... شاید وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو خود ہی اپنے شہرہ یا کو کسی کے حوالے کر دیتی ہیں اور اسی بات نے میرے دل میں فرح کی محبت کی کسک بڑھا دی تھی۔

اٹھارویں روز ہمیں جزیرہ برقون دکھائی دے گیا لیکن تیمور نے بتایا کہ وہ رات کو جزیرے کی بندرگاہ میں داخل نہیں ہو سکتے اس لیے ہمیں رات سمندر ہی میں گزارنا پڑے گی۔ یہ قزاقوں کا قانون کہ وہ صرف دن کے وقت ہی کشتیوں اور جہازوں کو بندرگاہ میں داخل ہونے دیتے تھے تاکہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر دشمن ان کی بندرگاہ میں داخل نہ ہو سکیں۔

برقون ایک قدرتی قلعہ تھا اس کی جنوبی سمت میں ساحل کے ساتھ ساتھ تقریباً دو سو فٹ اونچی پہاڑیاں تھیں جن کے بیچ وہ کھاڑی اندر تک چلی گئی تھی جس میں بندرگاہ واقع تھی۔

یہ کھاڑی تین میل لمبی مگر صرف سو فٹ چوڑی تھی اور اس میں ایک وقت دو سو جہاز لنگر انداز ہو سکتے تھے۔ کھاڑی کے دونوں جانب گودیاں اور عمارتیں تھیں۔ برقون کا جزیرہ پہاڑوں کی وجہ سے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ بندرگاہ جنوبی حصے میں تھی۔ قزاق شمالی حصے میں غلاموں سے کھیتی باڑی کرواتے تھے اور قزاق برادری کم از کم ایک سال کا غلہ گوداموں میں جمع رکھتی تھی تاکہ اگر دشمن جزیرے کا محاصرہ کر لے تو بھی انھیں سامانِ خورد و نوش کی کمی محسوس نہ ہو۔

دوسری صبح جب ہماری کشتی کھاڑی کی طرف بڑھنے لگی تو کھاڑی کے دہانے پر سرخ جھنڈا بلند ہو گیا۔ تیمور نے بتایا یہ سرخ پرچم اس بات کی علامت ہے کہ کوئی جہاز بندرگاہ سے سمندر میں آ رہا ہے چنانچہ ہم سامنے سے ہٹ کر باہر آنے والے جہاز کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں نقارے کی لے تال کے ساتھ چپو چلانے کی شپ شپا شپ بھی سنائی دینے لگی اور پھر دہانے پر ایک کشتی نمودار ہوئی جسے دیکھ کر تیمور کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔

میں نے تیمور کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے کشتی کی طرف دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

کشتی کے عرشے پر ریلنگ کے قریب درمیانہ قد و قامت کی ایک خوبرو عورت کھڑی تھی جس نے سالار کا لباس پہن رکھا تھا۔

"یہ بہن شہلا کی 'بحری چڑیل' ہے جو مرمت کے بعد معائنے کے لیے سمندر میں لائی جا رہی ہے اور بہن شہلا کا نام تو شعلہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ بڑی تند عورت اور بہادر سالار ہے۔ اُسے خوں ریزی میں بڑا لطف آتا ہے لیکن جب اُسے یہ معلوم ہو گا کہ ہم نے شہزادہ شہریار کا جہاز لوٹا ہے تو جل بھن کے رہ جائے گی۔" تیمور نے بتایا۔

'بحری چڑیل' ایک چھوٹی سی جنگی کشتی تھی جسے بیس، بیس چپوؤں سے چلایا جاتا تھا۔ جب وہ کھاڑی کے دہانے سے باہر آئی تو چپو چلنے بند ہو گئے اور اس کے ملاح ستونوں پر بادبان چڑھانے لگے۔ شہلا چلا چلا کر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی۔ وہ مردوں کی طرح بڑی روانی سے گالیاں بھی بک رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ملاحوں کے مقابلے میں پستہ قد نظر آتی ہے مگر وہ اس کے احکامات پر یوں عمل کر رہے تھے جیسے غلام جابر مالکوں کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ وہ سبز رنگ کا برجس نما لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے سنہرے بال دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اس کی کشتی ہم سے کوئی پچاس گز دور تھی۔

معاً وہ پلٹی اور اپنی کرخت آواز میں تیمور سے مخاطب ہوئی: "اوہ تیمور۔ تم اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے؟ کہاں تک گئے تھے، تم؟"

"شہزادے شہریار کے جہاز تک۔ بہت عمدہ مالِ غنیمت ملا ہے اور ابھی انعام بھی ملے گا، اسے ختم کرنے کا"۔ تیمور نے جواب دیا۔

اتنا سنتے ہی وہ بپھر گئی: "تم لوگ یہ نہیں چاہتے کہ مجھے بھی مالِ غنیمت اور انعام میں حصہ ملے۔ تم مرد لوگ مجھ سے جلتے اور ڈرتے ہو کہ کہیں میں تم سے آگے نہ بڑھ جاؤں۔ کاش میری کشتی زیرِ مرمت نہ ہوتی۔ سالار کہاں ہے؟"

"وہ مر چکا ہے"۔ تیمور نے بتایا اور میری طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ ہے وہ شیر دل جس نے اُسے موت کے گھاٹ اتارا تھا... مزے کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ کہہ کر سالار کا عہدہ سنبھالنے سے انکار کر دیا کہ جہاز رانی سے ناواقف ہونے کے باعث اپنے ساتھیوں کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ یہ اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے کسی اچھے سالار سے تربیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ والدِ مرحوم کی قسم، تم نے اتنا مضبوط اور بہادر جنگجو کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہو گیا ہے"۔ وہ بولی اور پلٹ کر اپنے جہازیوں کو ہدایات دینے لگی۔

میرا جی چاہا کہ ہماری کشتی اس کی کشتی کے قریب ہوتی تاکہ میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکتا۔

اتنے میں اس کے ملاح کشتی کھینچنے لگے اور ہماری کشتی کھاڑی کے دہانے کی طرف بڑھنے لگی۔

تیمور نے مجھ سے کہا: "میرا خیال ہے کہ تم اُسے پسند آ گئے ہو۔ جبھی تو اس نے کہا تھا کہ ہاں میں نے اندازہ لگا لیا ہے۔ وہ بڑی عجیب عورت ہے سرفروش۔ صرف سالار ہی نہیں رہنا چاہتی وہ تو سالاروں کی انجمن کی رکن بھی بننا چاہتی ہے۔ سالار بننے سے پہلے یہ ترغون میں ناگ مندر کی مہا پجارن تھی اور اب ایک بار پھر ناگ پوجا کو فروغ دینا چاہتی ہے۔"

اس دوران فرح ہمارے قریب آ گئی اور وہ تیمور کی بات سننے کے بعد "بحری چڑیل" کی طرف دیکھنے لگی۔

تیمور مجھے ایک جانب لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ "میں

نہیں جانتا کہ فرح تمھاری منگیتر ہے یا نہیں۔ اگر واقعی ہے تو اس کی خیر مناؤ کیونکہ جب شہلا کسی پر نگاہ رکھتی ہے تو پھر اس کے ساتھ کسی دوسری عورت کا تعلق برداشت نہیں کر سکتی۔ ہماری قزاق برادری میں دستور ہے کہ جب دو عورتیں کسی ایک شخص کو چاہتی ہوں تو ایک عورت دوسری عورت کو مقابلے کی دعوت دے سکتی ہے اور اس مقابلے کا انجام کسی ایک عورت کی موت پر ہوتا ہے۔ شہلا ایسے مقابلوں میں خنجر، برچھونے سے کوڑے کے ساتھ لڑتی ہے۔ میں اُسے ایک بار ایک عورت سے لڑتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ یہ تمھاری قدوقامت کی عورت کے بھی پرخچے اُڑا سکتی ہے۔"

میں یہ سن کر اُلجھن میں پڑ گیا۔

اگر شہلا واقعی مجھ میں دلچسپی لینے لگی تو کیا ہوگا۔ میں اُسے یہ کہہ کر بھی نہیں ٹال سکتا تھا کہ فرح سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ میں تو پہلے ہی یہ اعلان کر چکا تھا کہ وہ میری منگیتر ہے اور قزاقوں کا قانون شہلا کو یہ اجازت دیتا تھا کہ وہ جب چاہے فرح کو مقابلے کے لیے للکار سکتی ہے۔

اس صورت میں فرح کی زندگی ایک بار پھر خطرے میں پڑ سکتی تھی جسے میں کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اب وہ واقعی میری کمزوری بنتی جا رہی تھی اور میں شاید اس سے محبت بھی کرنے لگا تھا۔

میں ان سوچوں میں گھرا ہوا تھا کہ ہماری کشتی کھاڑی میں داخل ہوگئی جس کے دونوں طرف اونچی اونچی چٹانیں تھیں۔ اگر کبھی دشمن کے جہاز کھاڑی میں آ جاتے تو اُن پر ان چٹانوں سے پتھر برسائے جا سکتے تھے۔

گودیوں میں بہت سے چھوٹے بڑے جہاز کھڑے تھے۔ بعض گودیوں میں پرانی کشتیوں کی مرمت جاری تھی اور بعض جگہ نئے جہاز بنائے جا رہے تھے۔ بڑی بڑی بھٹیوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور لوہا کُوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

گودیوں سے اوپر کشتی کھینچنے والے غلام مزدوروں اور گودی میں کام کرنے والوں کی بیرکیں تھیں۔ ان سے کچھ اونچائی پر دُکانیں اور دُکانداروں کے گھر پھر آزاد ملاحوں کی قیام گاہیں اور چوٹی پر قزاق برادری کے سالاروں کا اقامتی علاقہ تھا۔

گودیوں سے سالاروں کے علاقے تک تقریباً ایک میل کا فاصلہ تھا اور ان کے مکانات لگ بھگ پانچ سو فٹ کی بلندی پر واقع تھے۔ ان کے پیچھے بڑی مضبوط شہر پناہ تھی جس میں جگہ جگہ بُرج اور دروازے بنائے گئے تھے۔ فصیل کے عقب میں اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ قزاقوں کی یہ قلعہ بندی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ فارش، ترغون اور دوسری ریاستیں ان سے کیوں خوفزدہ ہیں اور قزاقوں کی لوٹ کا مال اور دولت کہاں صرف کی گئی ہے۔

ہماری کشتی کو اپنی گودی کی طرف بڑھتے دیکھ کر شہر کی ڈھلان پر بہت سے لوگ جمع ہوگئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارا خیر مقدم کرنے لگے۔

تیمور نے مجھ سے کہا: "لوٹ کی مہم پر جانے والے جہازوں میں سے سب سے پہلے ہماری کشتی واپس آئی ہے۔ اس لیے لوگ ہماری سرگرمیوں کی تفصیل جاننے کے لیے بے چین ہیں۔"

کھاڑی میں متعدد مقامات پر سطحِ آب سے اوپر اور زیرِ آب مضبوط زنجیریں ڈال کر رکاوٹیں بنائی گئی تھیں چنانچہ ہر رکاوٹ عبور کرنے سے پہلے مختلف اقسام کے جھنڈوں سے سگنل دیئے جاتے تھے۔ قزاقوں کا یہ انتظام گواہی دیتا تھا کہ انھیں تسخیر کرنا واقعی ناممکن ہے۔

کچھ دیر بعد شہر پناہ کے بُرج پر دو پرچم بلند ہوئے اور زرد رنگ کا دُھواں بھی اٹھنے لگا۔

تیمور یہ دیکھ کر خوشی سے سرشار ہو کر بولا: "آج رات قزاق برادری ہماری کامیابی پر جشن منائے گی جس میں شراب اور خواتین کی فراوانی ہوگی۔"

"کیا میں بھی اس جشن میں شریک ہو سکوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً..." تیمور نے جواب دیا۔

میں جشن میں شرکت کا اس لیے متمنی تھا کہ لوگوں سے مل کر حالات کا جائزہ لے سکوں اور ان امکانات کا بھی اندازہ لگا سکوں جو فرار کے لیے موزوں ہو سکتے ہوں۔

"برقِ طوفاں" کا استقبال کرنے والوں کے جوش اور نعرۂ تحسین سے مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ شہزادہ شہریار کو موت کے گھاٹ اُتارنے پر شیرکوہ نے بہت بڑے انعام کا وعدہ کیا ہوگا۔

جب ہماری کشتی گودی میں لنگر انداز ہوگئی تو تیمور چند چاق و چوبند ملاحوں کے گھیرے میں مجھے، فرح اور سلطان کو سالاروں کے علاقے میں واقع ایک مکان میں لے آیا جس میں دو بُرج بنے ہوئے تھے۔ چکردار زینہ طے کرتے ہوئے جب ہم بُرج کے بالائی کمرے میں پہنچے تو میں نے تیمور سے پوچھا۔

"اب ذرا یہ تو بتا دو کہ ہم لوگ یہاں مہمان سمجھے جائیں گے یا قیدی؟"

"قزاق برادری کے فیصلے تک تم لوگ قیدی شمار کیے جاؤ

گے اور باہر نہیں جا سکو گے تاہم سرفروش، تم سالار بیدار کی پیٹی باندھ کر ہمارے ساتھ جشن میں شرکت کر سکو گے۔" اس نے اپنے تھیلے سے نیلے رنگ کی سنہرے کام والی ایک پیٹی نکال کر مجھے دی اور بولا: "یہ بھی یاد رکھو سرفروش کہ یہ پیٹی باندھ کر تم کسی کو مقابلے کی دعوت دے سکتے ہو اور نہ ہی کوئی تمھیں للکار سکتا ہے۔"

میں نے وہ پیٹی باندھ لی اور سارے ہتھیار اُتار کر رکھ دیئے صرف خنجر کو پیٹی میں اُڑس لیا اور ایک چھوٹا سا چاقو بھی جوتے میں چھپا لیا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔ پھر میں نے سلطان اور تیمور سے کہا: "میں تم دونوں کو اپنا دوست سمجھتا ہوں اور اس ناتے کیا تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم لوگ فرح کی حفاظت کرو گے اور اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دو گے؟"

سلطان نے اثبات میں سر ہلا دیا اور تیز نگاہوں سے تیمور کی طرف دیکھا تو اس نے بھی سلطان کی تقلید کی۔

سفر کے دوران میں یہ دیکھ چکا تھا کہ ان دونوں کے درمیان گہرا رشتۂ دوستی استوار نہیں ہوا تھا تاہم وہ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور تیمور نے سلطان سے کبھی قیدیوں یا غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں جہاز رانی کے یکساں ماہر تھے اور ان کی دوستی میرے حق میں بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

شام کو میں تیمور کے ساتھ جشن میں شریک ہونے کے لیے گیا۔ وہ ملاح جو اپنی مہمات کے دوران سخت تنظیم کا مظاہرہ کر رہے تھے، اپنی کامیابی کا جشن مناتے ہوئے ہر پابندی سے بے نیاز تھے۔ ان کے لیے شراب اور خواتین کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے وہ اُدھم مچا رہے تھے۔ ان کے افسر اور سالار بھی اس ہنگامۂ ناؤ نوش میں برابر کے شریک تھے اور فارش پر حکمرانی کے خواب دیکھتے ہوئے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔

میرے لیے کسی مہذب مملکت پر قزاقوں کی حکمرانی کا تصور ناقابلِ برداشت تھا اس لیے میں وہاں سے کھسک لیا۔

ابھی چاند طلوع نہیں ہوا تھا۔ گلیوں میں اور سڑکوں پر جگہ جگہ مشعلیں جل رہی تھیں۔ کہیں کہیں بدمست ملاح زنانِ بازاری سے چہلیں کرتے پھر رہے تھے مگر جب ان کی نگاہ مجھ پر پڑتی تو وہ میری قدوقامت دیکھ کر کچھ دیر کو اپنی چہلیں بھول جاتے۔ بعض مقامات پر مجھے چار چار کی ٹولیوں میں پہرے دار بھی ملے لیکن میری کمر پر بیدار سالار کی پیٹی دیکھ کر انھوں نے مجھ سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔

ایک بازار سے گزرتے ہوئے بھاری تن و توش والے دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر ایک دروازے میں کھینچ لیا۔ ابھی میں اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ان میں سے ایک بولا۔

"چاندی کے صرف پانچ سکّے دیجیے جناب اور خوابوں کی دُنیا کا لطف اٹھائیے۔"

میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں تقریباً چالیس مرد اور عورتیں چاروں جانب دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے چھوٹی انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ وہ اُن میں کوئی سفوف ڈالتے ہیں تو نیلا دُھواں اٹھتا ہے۔ وہ اس دھوئیں کو ناک سے سانس لے کر اندر کھینچتے ہیں اور مستی میں عجیب عجیب آوازیں نکالتے ہیں۔

پورے کمرے میں ایک عجیب سی بو بھی رچی ہوئی تھی۔

میں نے ان دونوں آدمیوں کو ہٹایا اور اس خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔

اگرچہ میں اس "خواب گاہ" میں صرف چند لمحے ہی ٹھہرا تھا مگر میرا سر چکرانے لگا تھا اور روشنیاں میری آنکھوں میں چبھنے لگی تھیں۔ انگیٹھیوں میں ڈالا جانے والا سفوف شاید نشہ آور تھا۔

میں سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

.... پھر ایک جگہ مجھے ایک اور آدمی نے روک لیا۔

"آیئے جناب، کوڑوں کا رقص ملاحظہ فرمایئے۔"

میں اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

ایک بڑے ہال نما کمرے کے درمیان ریت بچھی ہوئی تھی جس پر دو لڑکیاں دیوانہ وار رقص کر رہی تھیں۔ چاروں کونوں پر ایک ایک کوڑا بردار کھڑا تھا۔ جب کوئی لڑکی کسی کوڑے بردار کے قریب جاتی، وہ اُسے کوڑا مارتا اور لڑکی کے رقص میں شدت آ جاتی۔ وہ دونوں پسینے میں شرابور تھیں۔

مجھے یہاں لانے والے نے سرگوشی کے لہجے میں بتایا۔ "یہ سمجھتی ہیں کہ رقص کے بعد گھر چلی جائیں گی حالانکہ انھیں جشنِ طرب کی خوشی میں کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔"

میرے جی میں آیا کہ اپنا خنجر اس کے سینے میں اتار دوں اور پھر کوڑے مارنے والوں کو بھی وہیں ڈھیر کر دوں لیکن مجھے تیمور کی تنبیہ یاد آ گئی اور میں وہاں سے باہر آ گیا۔

ان لڑکیوں کی مسرت آمیز وحشیانہ چیخیں مجھے کافی دُور تک سنائی دیتی رہیں۔

شاید وہ بھی نشے میں دھت تھیں۔

بازار سے گزرتے ہوئے میں نے متعدد مے خانے اور ایسی دکانیں بھی دیکھیں جہاں قسم قسم کی منشیات دستیاب تھیں۔ کہیں کہیں ایسے مناظر بھی دکھائی دیے جنھیں ہماری دنیا میں مغرب کے لوگ تہذیب کا نام دیتے ہیں مگر مشرق میں انھیں فحاشی کہا جاتا ہے۔

میں اور آگے بڑھا تو مجھے ایک شرابی، ایک عورت سے دست درازی کرتا نظر آیا۔ اگرچہ وہ عورت صورت اور چال ڈھال سے بے راہ رو دکھائی دیتی تھی مگر اس وقت وہ اس شرابی سے مزاحمت کر رہی تھی جس پر شرابی نے چاقو نکال لیا اور اس پر وار کیا تو اس عورت کا رخسار زخمی ہو گیا۔

یہ دیکھ کر ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میں نتیجے سے بے پروا ہو کر شرابی کی طرف لپکا اور اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا، میں نے اس کی گدی پر کراٹے کا ایسا ہاتھ مارا کہ وہ چکرا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

میں نے اس عورت کی طرف دیکھا تو اسے ایک تنگ اور تاریک گلی کی طرف دوڑتے پایا۔ میں نے سوچا کہ کہیں وہ غلط فہمی کی بنا پر مجھے اُچکا سمجھ کر میرے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے، اس لیے اس کو یہ بتا دینا چاہیے کہ میں نے یہ اقدام خود اسی کے بچاؤ کی خاطر کیا ہے۔

میں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

گلی میں اتنا اندھیرا تھا کہ وہ مجھے دکھائی نہ دے سکی مگر اس کے قدموں کی آواز میری رہنمائی کے لیے کافی تھی۔ آگے جا کر وہ آواز دائیں طرف مڑ گئی۔ پھر اوپر کی طرف جاتی محسوس ہوئی۔

اب اس آواز میں گونج بھی پیدا ہو گئی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کسی سُرنگ میں داخل ہو گئی ہے۔ ایسی سرنگوں کا پہاڑی پر ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ میں رُک گیا اور سوچنے لگا کہ اس کے تعاقب میں جاؤں یا نہ جاؤں؟

یکایک مجھے اپنے قدموں میں فرش لرزتا ہوا محسوس ہُوا۔

ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ میں وہاں سے ہٹتا، فرش کی ایک سِل میرے قدموں کے نیچے سے کھسک گئی اور میں تاریک تر خلا میں گرتا چلا گیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کافی اونچائی سے گرا ہوں اور اتنی اونچائی سے گرنے پر ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی ہے لیکن مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی اور چوٹ اس لیے نہیں آئی تھی کہ میں نرم گدّوں پر گرا تھا۔

یہ بات میرے لیے انتہائی تعجب انگیز تھی اس لیے میں نے فوراً اپنا خنجر نکال لیا۔

عین اسی وقت وہاں ایک ہلکی سی زرد روشنی پھیل گئی میں نے دیکھا کہ میں ایک کنواں نما بیس فٹ گہری اور ... فٹ چوڑی عمودی سُرنگ میں بیٹھا ہوں۔ جن گول گول گدّوں پر ... گرا تھا، وہ گہرے سبز رنگ کے تھے اور ان کا کپڑا اس مدھم ... روشنی میں چمک رہا تھا جو سرنگ میں بنے ایک دروازے کے شیشے سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔

شیشے پر دو بڑے بڑے سانپوں کی شبیہہ بنی ہوئی تھی یہ شبیہہ دیکھ کر تیمور کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا شہلا، ترغون میں ناگ پوجا کرنے والوں کی سب سے بڑی کاہن ...

یکایک شیشے والا دروازہ آہستگی سے کھلا اور شہلا ... آواز آئی۔ "میرے پاس آؤ سرفروش۔"

ایک لمحے کے لیے میں بھونچکا سا رہ گیا مگر جب دوبار مجھے مدھم آواز لیکن تحکم آمیز لہجے میں بلایا گیا تو میں نے خنجر کے دستے پر گرفت مضبوط کی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

سرنگ کا فرش بھی سبز پتھروں کا تھا لیکن اس پر ... رنگ کی اینٹوں سے سانپ بنے ہوئے تھے۔

دروازے سے گزر کر میں ڈھلان میں اترتا چلا گیا۔

تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد میرے سامنے ایک ... آ گئی۔

میں رُک گیا۔

اتنے میں پھر اسی لب و لہجے میں شہلا کی آواز آئی "رکو مت میرے پاس آؤ"۔۔۔

دفعتاً دیوار کی ایک بہت بڑی سِل ہٹ گئی اور میں ... اب میرے سامنے زینہ تھا۔

چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد میں رنگین فرش آ گیا۔ میں ... اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ میں ایک بہت بڑے ہال نما کمرے ... ہوں جس کی چھت گنبد جیسی تھی۔ ہال کے بیچوں بیچ قربان گ... قسم کا چار ہاتھ اونچا اور اتنا ہی لمبا چوڑا چبوترہ تھا جس پر سبز ... سے بنا ہوا ایک بہت بڑا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

سانپ کی آنکھوں میں زمرد جڑے ہوئے تھے جو زرد روشنی میں جگ مگ کر رہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے اُس خیـ... ناگ کی آنکھوں سے مسحور کن شعاعیں نکل رہی ہوں پھر اس سانپ کھلے منہ سے دُھواں اور ہلکے ہلکے شعلے نکلنے لگے۔

کمرے میں اچانک ہی ایک عجیب سی خوشبو پھیل گئی مـ...

...خوشبو ایسی نہیں تھی جس کا تجربہ مجھے خواب گاہ میں ہوا تھا۔ اتنے ... قربان گاہ کے عقب سے شہلا یوں بل کھاتی ہوئی اٹھی جیسے ناگن ...وم رہی ہو۔ اس نے بھی سبز رنگ کی ایک قبا اوڑھ رکھی تھی جس ...ے صرف اس کا چہرہ اور ہاتھ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے گلے ...سیاہ موتیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی اور سر پر سجی ہوئی کلغی، سانپ ...پھن کی یاد دلا رہی تھی۔

وہ لہراتی ہوئی آئی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پہلے تو میری ...کھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی، پھر بولی "آخر تم آ ہی گئے؟"

"اس کے سوا میرے لیے کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔"

"تمھیں اس لڑکی کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میں جانتی ...ی کہ تم خود کو نہیں روک سکو گے بالکل اسی طرح جیسے تم یہاں سے ...ار ہونے کے منصوبے بنا رہے ہو۔"

میں اپنے دل کی چوری پکڑے جانے پر دم بخود سا رہ گیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا ذہن و قلب اس کے لیے ...ب کتاب ہو۔ اس نے ٹیلی پیتھی کے کسی ماہر کی طرح میرے خیالات ...ھ لیے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ مجھے اس وقت خاموش ...یں رہنا چاہیے ورنہ میری خاموشی اس کی بات پر مہرِ تصدیق ...ت کر دے گی۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو شہلا؟" میں نے کہا۔

"میں صرف چہرے پڑھنا ہی نہیں جانتی۔ مجھے لوگوں کے ...ل اور ذہن پڑھنا بھی آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو کڑی ...نت سے حاصل ہوتا ہے اور یہ فن مجھے بتلاتا ہے کہ تم لفظوں سے ...ی اسی طرح کھیلنا جانتے ہو جیسے شمشیر اور خنجر سے کھیلنے میں ...ہر ہو۔"

"لیکن ایک قزاق کا اس فن سے کیا تعلق جس کی مہارت ...تم نے دعوا کیا ہے؟"

"قزاق میں بعد میں ہوں، پہلے کچھ اور ہوں۔ کیا تم مجھ سے ...رف زدہ ہو گئے ہو؟"

"ہاں۔ انجانے لوگوں سے خوفزدہ ہونا ہی چاہیے۔"

میری اس بات پر شہلا نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی "عورتیں ...تھاری جانی پہچانی مخلوق ہیں۔ تم بہت سی خواتین کو بہت اچھی ...رح جانتے ہو۔"

"ہاں یہ تو سچ ہے مگر۔۔۔"

"تو پھر میں ان میں ایک کا اضافہ کروں گی"۔ یہ کہتے ہوئے ...س کی آنکھوں میں جو چمک ابھری اور ہونٹوں پر جو تبسم آیا، اُسے میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

اگر وہ میرے دل کا چور پکڑ چکی تھی تو اب میں نے بھی اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

وہ وقت قریب آ گیا تھا جب وہ مجھے اپنی کمزوری بنا سکتی تھی۔

★★

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب ہم قربان گاہ کے سامنے فرش پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بے حد مسرور نظر آ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"اب میں تمھیں اچھی طرح جان گئی ہوں"۔ اس نے زیرِ لب کہا۔

"مگر اب بھی میں تمھیں اچھی طرح نہیں جان سکا۔"

"ہاں، تم جان بھی نہیں سکتے جب تک کہ میں خود نہ بتاؤں۔"

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گی؟"

"چونکہ میں تم سے بہت خوش ہوں اس لیے ضرور بتاؤں گی۔"

.... پھر اس نے بتایا کہ وہ ترغون کے شیش ناگ مندر کی مہا پجارن تھی اور اب بھی وہ ناگ کی پجارن ہے۔ برقون کا یہ جزیرہ ایک زمانے میں ناگ دیوتا کے پجاریوں کے لیے ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہاں ناگوں کی افزائش نسل کی جاتی تھی اور کنواری پجارنوں کو "ناگ دیوی" کی تربیت دے کر مختلف مقامات پر بھیجا جاتا تھا۔ وہ جگہ جہاں اس وقت ہم موجود تھے، ناگ پوجا کا بہت بڑا مندر تھا۔ جسے سرنگوں کے ذریعے دوسرے علاقوں سے ملا دیا گیا تھا۔ یہ سرنگیں آج بھی موجود تھیں لیکن ترغون کی پڑوسی ریاستیں ناگ دیوتا کے پجاریوں سے خائف ہو کر متحد ہو گئیں اور ان سب نے مل کر بہت سے پجاریوں کو قتل کر دیا اور باقی جلاوطن کر دیے گئے۔ تب ناگ دیویاں اپنے مذہب کو زندہ رکھنے کے لیے رُوپوش ہو گئیں۔

ایک سو سال قبل، جب قزاقوں نے اس جزیرے برقون پر غلبہ حاصل کر لیا تو مہا ناگ دیوی نے فیصلہ کیا کہ کچھ ناگ پوجا کرنے والی عورتیں قزاق برادری میں شامل کر دی جائیں اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ قزاق ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں یا وہ قزاقوں کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہیں یا نہیں۔

شہلا سے پہلے بہت سی عورتیں قزاق برادری میں شامل ہوئیں لیکن وہ پہلی ناگ دیوی ہے جس نے قزاق برادری میں شامل ہو کر سالار کا عہدہ حاصل کیا ہے۔

یہ داستان سنانے کے بعد وہ بولی۔ "اگر مجھے تم جیسا کوئی ساتھی

مل جائے تو میرے اثر و رسوخ میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ جب تم سالار جیسے بہادر اور تنومند شخص کو ہلاک کر سکتے ہو تو پھر برقون کا کوئی دوسرا سالار تمھارے سامنے نہیں ٹک سکتا اور اگر جہاز رانی سیکھ کر قزاق بن جاؤ تو تم خود بھی اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ دولت مند بن سکتے ہو۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ اگر ہم دونوں متحد ہو جائیں تو قزاق برادری میں ہمارا کوئی مدِ مقابل نہیں ہوگا۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"سالاروں کی جماعت شیرکوہ سے سونا حاصل کرنے کے بعد فارش پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وہ فارش کو فتح تو کر لیں گے لیکن ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ کاروبارِ مملکت چلا سکیں۔ تم نے انھیں جشن میں دیکھا ہوگا۔ کیا یہ لوگ رموزِ مملکت سمجھ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو صرف عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں۔ اس صورت میں ہم جیسے دو افراد، جن کی پشت پناہی کے لیے وفادار جنگ بجو اور ناگ مت کے لوگ موجود ہوں، کیا نہیں کر سکتے!"

یہ کہنے کے بعد اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جیسے اس کی تائید کر رہا ہوں۔

"تو پھر یہ طے ہو گیا کہ تم میرے ساتھ فارش پر حکمرانی کرو گے۔"

اس نے کہا۔ "اب تم انکار کرنا بھی چاہو تو نہیں کر سکتے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اگر میں تمھارا ساتھ نہ دوں تو یہاں سے زندہ نہیں لوٹ سکوں گا؟"

"ہاں..... اگر تم یہاں سے نکل جاؤ تو بھی موت کے شکنجے سے نہیں بچ سکو گے۔ میں قزاقوں کی جماعت کو تمھاری نیت سے آگاہ کر دوں گی۔ ہم ناگ دیویاں معمولی ہستیاں نہیں ہوتیں۔"

میں نے اس کے لب و لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ اس کے الفاظ میں وزن ہے اور اس سے بگاڑنا یا دشمنی مول لینا میرے لیے کسی طرح بھی سود مند ثابت نہیں ہوگا۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مجھے اپنا نائب بنائے گی اور جہاز رانی سکھائے گی۔ میں نے اس سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ سلطان میرے ساتھ کشتی پر کام کرے گا۔

جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو پو پھٹنے والی تھی۔

سارے ہنگامے ختم ہو چکے تھے اور گلیاں سونی تھیں۔

اپنی رہائش گاہ کی طرف آتے ہوئے میں نے سوچا کہ شہلا نے فرح کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی؟ اسے یقیناً یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں نے اُسے اپنی منگیتر بتایا تھا، پھر وہ اس سلسلے میں کیوں کچھ نہیں بولی۔ اس کی پُراسرار خاموشی میری سمجھ سے باہر تھی۔

دوسری صبح مجھے سلطان اور فرح کو سالاروں کی مجلس میں پیش کیا گیا۔

کچھ دیر رسمی کارروائی ہوتی رہی، پھر مجھے قربان گاہ کے پاس کھڑا کر کے میرے بازو میں ایک چڑ کا لگایا گیا۔ جب خون کی بوندیں قربان گاہ پر ٹپکنے لگیں تو مجھ سے یہ حلف دلوایا گیا...

"میں سالاروں کو گواہ بنا کر حلف اٹھاتا ہوں کہ قزاق برادری کے آئین کی پوری پابندی کروں گا اور قزاق برادری کے مفاد کی خاطر اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

شہلا نے مجھے اپنا نائب بنانے کے لیے اپنے پہلے نائب کو سالار کے عہدے پر ترقی دلوا دی تھی۔

وہ مجھے اس کا خنجر دیتے ہوئے بولی۔ "اسے اپنی کمر پر باندھ لو اور اس سے ویسے ہی کام لینا جیسے سابق نائب نے لیا۔"

میں نے حلف برداری کے بعد خنجر باندھتے ہوئے فرح کی طرف دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ اس رسمِ حلف برداری سے یہ سمجھی تھی کہ میں صدقِ دل سے قزاق بن گیا ہوں۔ اُسے قزاقوں سے انتہائی نفرت تھی کیونکہ انھوں نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔

رسم سے فارغ ہونے کے بعد میں نے تیمور سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم فرح کا ہمیشہ خیال رکھو گے۔"

"وہ تو میں رکھوں گا..... لیکن اس چڑیل شہلا نے تم پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے کہ تم اس کے نائب بن گئے ہو؟"

میں تیمور کو حقائق بتا سکتا تھا اور نہ ہی ناراض کر سکتا تھا اس لیے ہنس کر ٹال گیا۔

شہلا جلد از جلد کسی نئی مہم پر روانہ ہونا چاہتی تھی لیکن اُسے اس وقت تک اپنا یہ ارادہ ملتوی رکھنا پڑ گیا جب تک کہ میں اس کے نائب کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ ہو جاؤں۔ چنانچہ دس روز تک وہ کھلے سمندر میں مجھے تربیت دیتی رہی۔ اس مختصر سے عرصے میں میں نے نہ صرف بحری نقشہ پڑھنا سیکھ لیا بلکہ مستول اوپری سرے سے کشتی کی تہ تک ہر حصے سے مکمل آگاہی حاصل کر لی۔ اب میں شہلا کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو کر عملے کو ہدایات دے سکتا تھا اور مجھے وہ گالیاں بھی زبانی یاد ہو گئی تھیں جو سالار ملاحوں کو دیا کرتے تھے۔

گیارھویں روز جب ہم دوبارہ ناگ مندر میں قربان گاہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے تو شہلا نے مجھے اپنے قزاقی کے منصوبے کی تفصیل بتائی۔

یہ ایک بے حد خطرناک منصوبہ تھا لیکن کامیابی کی صورت میں بے پناہ مالِ غنیمت کی توقع بھی تھی۔

منصوبہ یہ تھا کہ ترغون کے شمالی حصے میں آبنائے خرم کے دہانے پر واقع شہرِ فروزاں کو لُوٹ لیا جائے۔ یہ آبنائے، فروزاں اور ترغون کے درمیان تھی اور جہاز، فروزاں کا چکر کاٹ کر دوسری طرف جانے کی بجائے آبنائے سے گزر کر وقت اور فاصلہ بچا لیا کرتے تھے مگر اس بچت کے لیے انھیں بھاری محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ محصول کی یہ رقم وہیں ایک چھوٹے سے قلعے میں رکھی جاتی تھی اور ریاستوں میں فروزاں جیسے چند ایک ہی چھوٹے شہر ایسے تھے جہاں بہت بڑی رقم بطور محصول جمع ہوتی تھی۔

شہرِ فروزاں کی حفاظت کے لیے جنگی جہاز اور کشتیاں دونوں طرف کے دہانوں پر موجود رہتی تھیں اس لیے اُسے لوٹنا آسان نہیں تھا البتہ رات کے وقت اگر دو تین جہاز آبنائے میں داخل ہو کر فروزاں کی حفاظت پر مامور محافظوں کو غچہ دینے میں کامیاب ہو جائیں اور قزاق بڑی خاموشی سے اچانک یلغار کر دیں تو یہ منصوبہ کامیاب ہو سکتا تھا۔

شہلا نے بتایا کہ اس کے پاس کچھ ایسے قدیم نقشے موجود ہیں جو بہت پہلے ناگ دیویوں نے تیار کیے تھے۔ ان نقشوں میں ایسی کھاڑیاں دکھائی گئی ہیں جو آگے جا کر آبنائے فروزاں میں مل جاتی ہیں۔ اگر ہم ان کھاڑیوں کے ذریعے آبنائے میں داخل ہو گئے تو باقی کام آسانی سے ہو جائے گا۔ قلعے پر چونکہ سالہا سال سے حملہ نہیں ہوا، لہٰذا اس کے محافظ حفاظتی اقدامات سے تقریباً بے نیاز ہو چکے ہوں گے اور کوئی مزاحمت نہیں کر پائیں گے۔

اس مہم میں شہلا کا نائب مرجان، جو اب جنگی کشتی عنکبوت کا کپتان بن چکا تھا، بھی شامل تھا۔

میں نے شہلا کو مشورہ دیا کہ تیمور کو بھی اس مہم میں شریک کر لیا جائے۔

"میں جانتی ہوں کہ تیمور ایک بہادر آدمی ہے اور اس کی کشتی برقِ طوفان ہماری دونوں کشتیوں سے بڑی ہے! اس میں عملہ بھی زیادہ آ سکتا ہے لیکن وہ میری بہ نسبت تمھارا دوست زیادہ ہے اس لیے میں اس پر کیسے اعتماد کر لوں؟"

"جب میں تمھارے ساتھ ہوں تو میرے دوست بھی تمھارا ساتھ دیں گے۔"

"واقعی؟" اس نے کہا۔ "لیکن میرا خیال اس سے مختلف ہے۔"

"یہ بھی تو سوچو کہ تیمور کو اس مہم کی کامیابی پر بہت کچھ مل سکتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کے لیے بھی تمھارا ساتھ دے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"اچھی بات ہے لیکن اگر اس نے ذرا بھی گڑبڑ کی تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ خیر..... اُسے مہم میں شریک کرنے پر ہمارے پاس تقریباً تین سو جنگجو ہو جائیں گے..... میں شرط لگاتی ہوں کہ ہماری کامیابی یقینی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں سالار کا عہدہ چھوڑ دوں گی۔"

"برقِ طوفان" کو مہم میں شامل کرنے کی وجہ سے روانگی میں مزید تاخیر ہو گئی کیونکہ وہ زیرِ مرمت تھی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے شہلا کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔

موسمِ سرما کا طوفانی موسم شروع ہونے میں صرف چھ ہفتے باقی رہ گئے تھے..... ان ایام میں، میں فرار کے امکانات پر بھی غور کرتا رہا۔ میں اپنے ساتھ فرح اور سلطان کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔ خشکی کے راستے فرار ناممکن تھا۔ برقون کی بندرگاہ کی آبادی ختم ہوتے ہی پہاڑ آ جاتے تھے۔ بالفرضِ محال ان پہاڑوں کو عبور کر لیا جاتا۔ تب بھی آگے جا کر ہمیں کشتی چاہیے تھی کہ اس کے بغیر ہم جزیرے سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔

میں خود تو اس مہم کے دوران فرار ہو سکتا تھا لیکن فرح اور سلطان کو قزاقوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا جو میرے فرار پر اُنھیں اذیت ناک سزائیں دے سکتے تھے۔ تاہم میں مہم کی تیاریوں کے دوران میں، برقون کے شمالی حصے کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتا رہا۔

شہر پناہ کے بعد پہاڑ اور پہاڑوں کے بعد میدانی علاقہ تھا جہاں غلاموں سے کاشتکاری کروائی جاتی تھی۔ اس علاقے میں کچھ دولت مند سالاروں نے دیہی مکانات بنوا رکھے تھے اور اُن کے پاس چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی تھیں جن سے فارش کے ساحل تک سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے اب تک فرار کا کوئی منصوبہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

..... پھر ہماری روانگی کا دن بھی آ گیا۔

ہم پو پھٹے کھاڑی سے نکلے اور کھلے سمندر میں آ گئے۔

موسم سازگار اور ہوا موافق تھی۔ اس لیے بارھویں روز ہمیں آبنائے فروزاں کے دہانے پر واقع وہ چھوٹی سی پہاڑی نظر آ گئی جس پر ایک بُرج بنا ہوا تھا۔

اس بُرج سے سمندر میں آنے جانے والے جہازوں پر نگاہ رکھی جاتی تھی۔ شہلا نے جہازوں کو آبنائے سے پہلے لنگر انداز کرانے کی بجائے آگے بڑھنے کا حکم دیا تاکہ بُرج کے نگہبانوں کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ ہماری کشتیاں آبنائے سے نہیں گزریں گی۔

جب ہم آبنائے سے آگے بڑھ گئے تو شہلا نے اپنے صندوق سے نقشے کی ایک نلکی اور چاندی کی چھوٹی سی صندوقچی نکالی اور حکم دیا کہ پتوار چلانے بند کر دیئے جائیں .... پھر وہ دیدبان کے کیبن میں نقشہ پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔

میں اور سلطان اس کی ہدایات کے انتظار میں دروازے ہی پر رُک گئے تھے۔

پہلے تو وہ چند لمحے کچھ بڑبڑاتی رہی پھر کیبن میں ویسی ہی عجیب سی خوشبو پھیل گئی جیسی مجھے ناگ مندر والی سرنگ میں گرنے کے بعد آئی تھی۔

مجھے ایک جھرجھری سی آ گئی۔

وہ نظارا ہی ایسا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ مجھے دیدبان کے اس پار سمندر میں ایک سبز سی عظیم الجثہ چیز ابھرتی دکھائی دی اور دوسرے ہی لمحے یوں محسوس ہوا جیسے ہماری کشتی کا نچلا حصہ کسی چیز سے رگڑ کھا رہا ہے۔

اتنے میں شہلا نے باآوازِ بلند ایک لفظ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ شہلا نے پھر وہی لفظ دُہرایا۔ ایک بار پھر پھنکار کی آواز آئی اور ہماری کشتی کے سامنے پانی میں پانچ لکیریں ابھریں اور آگے بڑھنے لگیں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھنکار کیسی تھی اور یہ لکیریں کیسی ہیں کہ شہلا دھاڑی....

"چپّو چلاؤ —— تیمور اور مرجان سے کہو کہ وہ ہماری کشتی کے پیچھے پیچھے آئیں"۔

میں عملے کو ہدایات دینے لگا۔

میرا ذہن اب بھی شہلا کی حرکات اور ان لکیروں میں الجھا ہوا تھا جو ہماری کشتی کے آگے آگے بڑھ رہی تھیں۔

شام کا اندھیرا اُترنے کے ساتھ ساتھ وہ لکیریں سمندری چٹانوں کی طرف گھوم گئیں۔ اب میں جان چکا تھا کہ شہلا اپنی کشتی ان لکیروں کے پیچھے پیچھے لے جا رہی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی سمندری مخلوق ہماری رہبری کر رہی تھی۔

ہماری کشتیاں چٹانوں کے جال سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔

نہ جانے ہم کتنی دیر تک اندھیرے میں خطرناک چٹانوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ آخر شہلا کی آواز آئی "چپّو چلانے بند کرو اور سرفروش ملاحوں سے کہو کہ لنگر ڈال دیں"۔

تینوں کشتیوں کے لنگر ڈال دیئے گئے۔

ہمارے چاروں طرف اندھیرا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اچانک شہلا نے وہی عجیب و غریب لفظ ایک مسرت انگیز مگر وحشیانہ نعرے کی صورت میں دُہرایا۔

جواب میں پھر ایک طویل پھنکار سنائی دی۔

اس کے ساتھ ہی پانی میں ابھرنے والی وہ لکیریں پلٹ گئیں جنھوں نے ہماری اس مقام تک رہبری کی تھی۔

میری سمجھ میں اب تک نہیں آ سکا تھا کہ یہ کیا اسرار ہے۔

اتنے میں شہلا میرے قریب آ گئی۔ وہ بڑی نڈھال اور تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ اس نے میرا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ جواب نہیں دیں گے لیکن میری پکار پر وہ آ گئے وہ زندہ ہیں اور میرا حکم مانتے ہیں، سرفروش لیکن تم ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے"۔

"یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت ہم کہاں ہیں؟" میں نے کہا

"ہم ایک چھوٹے سے دریا کے حصار میں ہیں اور ہماری منزلِ مقصود یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ ہم کل دن بھر یہیں آرام کریں گے اور رات کو فروزاں پر حملہ کر دیں گے۔

"اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو....؟"

"یہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا" وہ اطمینان سے بولی "ایک زمانے میں یہاں بھی ہمارا ناگ مندر ہوا کرتا تھا۔ دن کی روشنی میں تمھیں اس کے کھنڈر نظر آ جائیں گے۔ جب حاکم نے اسے مسمار کیا تھا، اس نے یہاں کے لوگوں کو یہ حکم دے دیا تھا کہ آئندہ کوئی بھی اس منحوس جگہ کا رخ نہ کرے۔ توہم پرست لوگ بھولے سے بھی ادھر نہیں آتے۔ اسی لیے ہمیں کوئی بھی نہیں دیکھ پائے گا"۔

کہہ کر شہلا سونے کے لیے اپنے کیبن میں چلی گئی۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شہلا کی باتوں نے میری نیند اڑا دی تھی۔

وہ کون تھے جو شہلا کی پکار پر آ گئے تھے۔

وہ کون تھے جن کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہیں.... مگر میں ان کے متعلق کوئی سوال نہیں کر سکتا؟

میں نہ جانے کتنی دیر تک عرشے پر بیٹھا یہی سوچتا رہا۔

.... پھر پَو پھٹنے لگی۔

میں نے صبح کاذب کی روشنی میں دیکھا کہ ہماری کشتیاں پاٹ کے بیچوں بیچ لنگر انداز ہیں۔ پاٹ کے دونوں طرف کی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ جن پر چھتری دار درختوں کا جنگل ہے اور اس

عقب میں دُور ایک برج دکھائی دے رہا ہے جس کی کھلی کھڑکیوں سے روشنی جھانک رہی ہے۔ یہ کھڑکیاں کسی مُردے کی کھوپڑی میں آنکھوں کے سوراخوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں اس لیے میں نے منہ پھیر لیا اور چادر لپیٹ کر وہیں عرشے پر سو گیا۔

چوکیداروں کے علاوہ تینوں کشتیوں پر لوگ سہ پہر تک سوتے رہے .... پھر اُٹھ کر تیاریاں کرنے لگے۔ ہتھیاروں پر ایک بار پھر دھار لگائی گئی اور قزاقوں نے سیاہ لباس پہننے کے ساتھ ساتھ اپنے چہروں پر بھی سیاہی مل لی .... تاکہ وہ اندھیرے میں اندھیرے ہی کا ایک حصہ بن جائیں۔

جب ہر طرف رات کا اندھیرا پھیل گیا تو شہلا نے سالاروں اور ان کے نائبین کا ایک مختصر سا اجلاس طلب کیا اور ہدایات دینے لگی

"برق طوفان" کا عملہ سیدھا شہر میں داخل ہوگا اور عنکبوت کا عملہ بندرگاہ میں .... بحری چڑیل" کے لوگ قلعے پر دھاوا .... بولیں گے جہاں محصول کی رقم رکھی جاتی ہے۔ یاد رکھو کہ تمھیں کسی فوجی دستے کے ساتھ جھڑپ کرنے اور خواہ مخواہ لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے شہری کسی حد تک مسلح ہوں لیکن تم لوگ ان سے نمٹنا جانتے ہو۔ بندرگاہ جانے والی کسی بھی کشتی کو بندرگاہ سے نہ نکلنے دیا جائے۔ ایسی کشتیوں کو لوٹ کر آگ لگا دی جاتے۔ شہر میں جانے والے لوگ بھی دکانیں لُوٹ کر انھیں نذرِ آتش کر دیں"۔

لُوٹنے کے بعد خواہ مخواہ دُکانوں اور جہازوں کو آگ لگانا قزاق برادری کے اصولوں کے خلاف تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ جو چیزیں ساتھ نہیں لے جائی جا سکتیں، وہ دوسری بار لوٹ کر ساتھ لے جائی جا سکتی ہیں۔ شاید اسی بنا پر تیمور نے گول مول سے انداز میں شہلا سے کہا....

"اگر ہم شہر کو آگ لگا دیں گے تو خود ہمارا بھی وہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا، خواہر"۔

"حالات کے اعتبار سے آخری فیصلہ تمھیں خود کرنا ہوگا بلند سالار"۔ شہلا نے جواب دیا۔ "میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ جب ہم واپس جا رہے ہوں تو شہر سے شعلے اور دُھواں بلند ہوتا دکھائی دیتا رہے"۔

اس اجلاس کے بعد لنگر اٹھا دیئے گئے اور کشتیاں آگے بڑھنے لگیں۔

شہلا کل کی طرح آج بھی اپنے "عمل" میں مصروف ہو گئی۔

اس کے جواب میں جب پھنکار کی آواز سنائی دی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

یہ پھنکار یقیناً بہت بڑے بڑے سانپوں کی رہی ہوگی۔

دو گھنٹے بعد ہمیں کچھ فاصلے پر مختلف رنگوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔

"وہ مینارۂ نور ہے، سرفروش! اپنے منجنیق چلانے والوں سے کہو کہ وہ تیار ہو جائیں"۔ شہلا نے کہا۔

میں نے منجنیق چلانے والوں کو ہدایات دیں اور انھوں نے منجنیق میں سیسے کے گولے بھر لیے۔

اس سے پہلے کہ ہماری کشتیاں لنگر انداز ہوتیں مینارۂ نور سے نگرانی کرنے والوں نے انھیں دیکھ لیا اور "قزاق آ گئے۔ قزاق آ گئے" کے نعرے بلند ہونے لگے۔

منجنیق سے پھینکے ہوئے گولوں نے مینارۂ نور کی روشنیاں گل کر دیں مگر اب وہ لوگ ہوشیار ہو چکے تھے اور یہ توقع رائگاں ثابت ہوئی تھی کہ وہ مقابلے کے بغیر ہی مغلوب ہو جائیں گے۔ تاہم جونہی کشتیاں کنارے سے لگیں، میں اور میرے ساتھی کود پڑے۔

ادھر تیمور نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا "جلدی کرو ہمیں کافی دُور جانا ہے"۔

..... پھر اس کے آدمیوں کے گُھسنے اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اسی دوران میں بھی ساتھیوں کے ہمراہ اس راستے پر آ گیا تھا جو قلعے کی طرف جاتا تھا۔

جونہی ہم درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچے تیروں کی ایک بوچھار آئی۔ میرے کچھ آدمیوں کی کراہیں بلند ہوئیں مگر دوسرے برق رفتاری سے اس جھنڈ کی طرف بڑھتے چلے گئے اور انھوں نے وہاں چھپے ہوئے تیراندازوں کو دوسری بار تیر چلانے کا موقع نہیں دیا۔

اب دست بدست لڑائی ہونے لگی۔

تلواروں سے تلواریں ٹکرائیں اور چنگاریاں اُڑنے لگیں۔

میرے سامنے چھوٹے قد کا ایک آدمی اپنے قد سے بڑی تلوار لیے ڈٹ گیا لیکن اس کی لمبی تلوار ہی اُس کی موت کا باعث بن گئی۔ کیونکہ وہ چھتری دار درخت کے نیچے تھا جس کی شاخوں نے اُسے تلوار چلانے کا موقع ہی نہیں دیا اور وہ میرے پہلے ہی وار میں ڈھیر ہو گیا۔

یہ معرکہ چند ہی لمحوں میں انجام کو پہنچ گیا اور میں اپنے آدمیوں کو لے کر فصیل کی طرف بڑھ گیا۔

فصیل پر محافظ موجود تھے۔

دوسری فصیل کے ساتھ ہی ایک خندق بھی تھی جس کی وجہ سے آٹھ ہاتھ اونچی فصیل سولہ ہاتھ بلند ہو گئی تھی اور اتنی اونچی

فصیل پر چڑھنا ناممکن تھا لیکن خوش قسمتی سے خندق کے کنارے ایسے درخت موجود تھے جن کی شاخیں فصیل تک پہنچ رہی تھیں۔

میں نے کچھ قزاقوں کو ان درختوں کے ذریعے فصیل پر جانے کا حکم دیا اور کچھ قزاق درخت کاٹنے پر لگا دیئے باقی کو آڑ لے کر تیراندازی کی ہدایات دیں تاکہ فصیل پر آنے والے محافظ مزاحمت نہ کرسکیں اور ہم وہاں تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو جائیں۔

بہت سے قزاق درختوں پر کلہاڑے چلانے لگے۔

اُدھر فصیل پر جو بھی پہرے دار آتا، تیرانداز اسے ڈھیر کر دیتے۔ تھوڑی ہی دیر میں چار درخت کٹ کر فصیل پر گرے اور پل کا کام دینے لگے۔

ہم بندروں کی طرح درختوں کی شاخوں کو پکڑتے ہوئے فصیل پر چڑھ گئے اور اندر کودنے لگے۔

فصیل کے اندر ایک تکون کی صورت میں تین عمارتیں بنی ہوئی تھیں جن کی حفاظت کے لیے اب گنتی کے محافظ رہ گئے تھے۔ یہ محافظ بھی زیادہ دیر تک مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور ایک ایک کر کے تہ تیغ ہو گئے۔ اس وقت تک میرے بھی چھ ساتھی ہلاک یا بُری طرح زخمی ہو چکے تھے۔

مَیں نے قلعے کے کماندار کی لاش کی تلاشی لی تو مجھے اس کمرے کی چابی مل گئی جہاں محصُول کی رقم رکھی جاتی تھی۔ جلد ہی قزاق سونے چاندی کے سکّوں سے بھرے صندوقچے اور دُوسرا سامان اُٹھا کر واپس جانے لگے۔ اب قلعے میں محافظوں کی طرف سے صرف ایک ہستی باقی رہ گئی تھی اور وہ تھی کمان دار کی بیس سالہ بیٹی... قزاق اس کی بے حُرمتی کر کے اُسے مار ڈالنا چاہتے تھے مگر مَیں نے انھیں سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا کہ اُسے قیدی بنا کر کشتی میں پہنچا دیا جائے۔

توقع کے خلاف یہ مُہم بہت آسان ثابت ہُوئی۔

جب ہم قلعے سے واپس جانے لگے تو مجھے بندرگاہ اور شہر سے شعلے اور دُھواں اُٹھتا دکھائی دیا۔ تیمور اور مرجان نے شہلا کی ہدایات پر پُورا پُورا عمل کیا تھا۔

جب ہم درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کچّے راستے پر آئے تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو ایک دم رُک جانا پڑا۔

ہمارے سامنے ایک مسلح فوجی دستہ موجود تھا۔

ہر فوجی نے سینہ بند اور خود پہن رکھا تھا اس لیے انھیں آسانی سے مارنا بھی ممکن نہیں تھا۔ دُوسرے ان کے پاس نیزے تھے جو قریب آنے سے پہلے ہی ہمیں موت سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ اس صُورتِ حال میں انھیں راستے سے ہٹا کر کشتی میں پہنچنا ناممکن ہو گیا تھا۔

مَیں نے فی الفور ایک فیصلہ کیا اور اپنے آٹھ آدمیوں کو خزانے کے صندوقوں کی حفاظت کے لیے پیچھے بھیج دیا۔ کچھ آدمیوں کو دکھاوے کے لیے سامنے رکھا اور اُنھیں ہدایت کی کہ وہ حملے کے لیے آگے نہ بڑھیں بلکہ اپنی جگہ ڈٹے رہیں اور اگر فوجی دستہ آگے بڑھے تو پہلے تیروں سے ان کی ٹانگیں زخمی کر دیں۔ کچھ قزاقوں کو ساتھ لے کر مَیں ڈھلان سے اُتر گیا تاکہ کاوا کاٹ کر اس دستے پر پیچھے سے حملہ کر سکوں اور اُن میں ابتری پھیلا دُوں۔

مَیں جُونہی کاوا کاٹ کر پیچھے آیا، یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ شہلا تنہا ہاتھ پاؤں کے بل چلتی ہُوئی مسلح سپاہیوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ایک سپاہی کے ٹخنوں پر خنجر سے وار کیا، دُوسرے کے پیٹ میں گھونپا اور تیسرے کی گُدی کو نشانہ بنایا۔ اتنے میں میرے ساتھی پیچھے سے سپاہیوں پر ٹُوٹ پڑے۔ اگرچہ سپاہی تعداد میں بہت زیادہ تھے مگر اُن کی ساری توجہ میرے سامنے والے ساتھیوں کی طرف تھی جب اُن پر پیچھے سے حملہ ہُوا تو وہ اس ناگہانی اُفتاد سے بُری طرح بوکھلا اُٹھے اور فرار ہونے لگے۔

اُدھر سامنے والے سپاہی اپنے پیچھے افراتفری دیکھ کر پلٹے تو میرے ساتھی اُن پر ٹُوٹ پڑے۔ اس صُورتِ حال میں سپاہیوں کی اکثریت کو تو اپنے ہتھیار استعمال کرنے کا موقع ہی نہ مِلا اور وہ اپنے بھاگتے ہُوئے ساتھیوں کی تقلید میں اندھا دھند فرار ہونے لگے۔

اس وقت تک مجھ پر جنگی جنُوں سوار ہو چکا تھا چنانچہ مَیں ایک ہاتھ سے تلوار اور دُوسرے سے خنجر چلا رہا تھا اور میرے پاؤں کسی سپاہی کے پیٹ پر پڑ رہے تھے تو کسی کے گھٹنوں کا نشانہ لے رہے تھے۔

اتنے میں تیمور کا نعرہ بھی "مالِ غنیمت اُٹھاؤ" نعرے لگاتا اُدھر آتا دکھائی دیا تو بچے کھچے سپاہی بھی حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہُوئے اب ہمارے لیے میدان صاف تھا۔ میرے ساتھی مالِ غنیمت لے کر کشتیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ اس دوران مرجان اور اس کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے اور شہلا چلّا چلّا کر ہدایات دینے لگی۔

چند لمحوں کے اندر اندر لُوٹ کا مال کشتیوں پر لاد دیا گیا۔

"کیا ہم اسی راستے سے واپس جائیں گے جدھر سے آئے تھے؟" مَیں نے شہلا سے پُوچھا۔

"نہیں سرفروش۔ وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہم اس دہانے سے باہر نکلیں گے لیکن ہم دُوسرے دہانے سے کُھلے سمندر میں جائیں گے۔ ایک بار پھر منجنیق والوں کو تیار رہنے کا حکم دو حالانکہ مَیں سمجھتی ہُوں۔ اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

شہلا کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔

فردزاں کے جنگی بیڑے اور بحری سپاہ کی توجہ اسی جانب

تھی جبکہ ہماری کشتیاں دُوسرے دہانے سے نکل گئیں۔

ہر چند کہ اس طرف بھی فردزاں کے جنگی جہاز گشت پر تھے مگر چونکہ ہم نے اپنی کشتیوں پر بادبان نہیں چڑھائے تھے لہٰذا انھیں یہ شک بھی نہ گزرا کہ ہم فرار ہو رہے ہیں۔ مجھے فردزاں کی انتظامیہ کی ناقص کارکردگی کا یقین ہو گیا اور مَیں سوچنے لگا کہ اگر قزاق دو سو جنگی جہازوں اور کشتیوں کا بیڑا لے آئیں تو وہ چاروں ریاستوں پر بآسانی قبضہ کر سکتے ہیں۔ پھر مجھے اپنی اس سوچ پر تعجب ہونے لگا کیونکہ یہ ایک قزاق ہی کی سوچ ہو سکتی تھی۔

کُھلے سمندر میں بادبانوں کے علاوہ ملّاح مسلسل تیس گھنٹوں تک باری باری کشتیاں کھیتے رہے اور جب شہلا کو یقین ہو گیا کہ اب ہم تعاقب کرنے والوں کی زد سے بہت دُور نکل آئے ہیں تو اُس نے ملّاحوں کو آرام کرنے کی ہدایت کی اور کشتیاں بادبانوں کی مدد سے آگے بڑھنے لگیں۔

چوبیس گھنٹے آرام کے بعد شہلا نے مالِ غنیمت تقسیم کرنے کا فیصلہ دے دیا۔ مالِ غنیمت کی تقسیم پر کوئی جھگڑا نہیں ہُوا۔ ہر کارکن کے حصے میں اتنی رقم آ گئی کہ وہ کئی سال تک آرام کی زندگی گزار سکتا تھا۔

جب مالِ غنیمت تقسیم ہو گیا تو شہلا قیدیوں کی طرف متوجہ ہُوئی۔ قیدیوں میں قلعے کے کمان دار کی بیٹی، بارہ امیر شہری، تین سالار اور ایک فوجی عہدے دار شامل تھا، ان کے لواحقین سے ان کی رہائی کی خاصی اچھی قیمت وصول کی جا سکتی تھی۔ شہلا نے حکم دیا کہ قیدیوں کو اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ جب قیدی اُس کے سامنے لایا جاتا تو وہ اُسے حکم دیتی: "جُھکو!" اگر کوئی اُس کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی تاخیر کرتا تو وہ اُس کے چہرے پر اتنے زور سے چابک ملرتی کہ چمڑی اُدھڑ جاتی اور خُون بہنے لگتا۔ پھر وہ اس پر تابڑتوڑ سوالات کرنے لگتی۔ نام...؟ ...عہدہ؟... خاندان؟... دولت؟... پیشہ؟ وغیرہ وغیرہ۔ کبھی کبھی وہ اُس کے سامنے کھڑے ہو کر یُوں بل کھانے لگتی جیسے کوئی ناگن جُھوم رہی ہو۔ اگر قیدی اس کی طرف دیکھتا تو وہ تڑاخ سے چابک مارتی اور قیدی کی چمڑی اُدھڑ جاتی۔ اس کے بعد وہ یرغمال کی رقم کا تعین کرتی۔ بعض قیدی اتنی بڑی رقم کا سُن کر رونے اور فریاد کرنے لگتے کیونکہ اُنھیں یہ اُمید نہیں تھی کہ اُن کی آزادی کے لیے اتنی بڑی رقم ادا کی جا سکے گی۔

جب عسکری افسر کو اس کے سامنے لایا گیا اور وہ اُس سے استفسار کر چکی تو مجھ سے بولی: "تمھارا کیا خیال ہے سرفروش، ایک ایسے عسکری کے بدلے جو شراب کے نشے میں لڑنے کے قابل نہ رہا ہو، کوئی یرغمال کی رقم ادا کر سکتا ہے؟... نہیں... میرا خیال ہے کہ اسے غلام بنا لیا جائے۔ یہ کم از کم کھیتوں پر سال دو سال نکال ہی لے گا۔"

یہ سُنتے ہی اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل جُھکا ہُوا افسر ایک دم اُٹھا اور اُس نے شہلا کی گردن دبوچ لینا چاہی مگر ایک محافظ نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر اتنے زور سے خنجر مارا کہ وہ دستے تک جسم میں گڑ گیا اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔ شہلا محافظ کی اس کارکردگی پر خوش ہوتے ہُوئے بولی: "تمھیں میرے حصے سے سونے کے دو سکّے ملیں گے۔"

اب کمان دار کی بیٹی کو شہلا کے سامنے پیش کیا گیا۔

شہلا نے حسبِ معمول اُس سے سوالات شروع کیے۔

"نام؟"

"عذرا۔" اس نے جواب دیا۔

"خاندان؟"

"بس ایک باپ تھا جو مارا گیا۔" اور یہ بتاتے ہُوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تمھاری طرف سے کوئی یرغمال کی رقم ادا کر سکتا ہے؟"

"نہیں... مَیں لاوارث ہُوں۔" عذرا نے جواب دیا: "مجھ پر رحم کرو۔"

"ہاں۔ مَیں تم پر رحم کر سکتی ہُوں۔" یہ کہتے ہُوئے شہلا کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک آ گئی۔ ایسی چمک جو شکار کو مسحُور کرنے کے لیے سانپ کی آنکھوں میں آ جاتی ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے جُھرجُھری سی آ گئی۔

"قزاق برادری کے آئین میں عورتوں کا مقابلہ بھی شامل ہے۔ اگر تم مجھ سے مقابلہ کرو اور جیت جاؤ تو تم آزاد کر دی جاؤ گی اور اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو مَیں تمھیں اپنے ملّاحوں کے حوالے کر دُوں گی۔" شہلا نے کہا۔

"نہیں نہیں مَیں مقابلہ کروں گی۔" عذرا نے جواب دیا۔

مَیں اُس کے اس جواب پر صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مَیں جانتا تھا کہ شہلا اُسے مقابلے پر اُکسا کر اپنی ایذا پسند فطرت کو تسکین پہنچانا چاہتی ہے۔ وہ اُسے تڑپا تڑپا کر اور سِسکا سِسکا کر مارے گی اور اس کی کرب ناک آہوں اور کراہوں سے لطف حاصل کرے گی۔ میرا جی چاہا کہ مَیں ایک ہاتھ مار کر شہلا کو ختم کر دُوں۔ مَیں ایسا کر سکتا تھا مگر اس طرح میری ہی نہیں فرح اور سُلطان کی موت بھی یقینی بن جاتی۔ مجھے اپنی تو پروا نہیں تھی مگر اپنی وجہ سے دُوسروں کی موت نہیں چاہتا تھا اس لیے دل پر جبر کا پتھر رکھ کر خاموش کھڑا رہا۔

"تم کون سا ہتھیار پسند کرو گی؟" شہلا نے پُوچھا۔

"تلوار۔" وہ بولی لیکن مجھے یقین تھا کہ اُس نے آج سے پہلے پھل کاٹنے والی چُھری کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں اُٹھایا ہو گا اور اسے تلوار پکڑے دیکھ کر میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بعض اوقات بڑے بڑے تیغ زن اناڑیوں کے ہاتھوں مار

کھا جاتے ہیں۔ وہ اناڑیوں سے ماہرانہ وار کی توقع کرتے ہیں مگر اناڑی اُن پر ایسا وار کرتا ہے جس کے بارے میں وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ہو سکتا ہے' عذرا، شہلا کی موت کا فرشتہ ہی ثابت ہو۔

عذرا نے دو تین بار ہوا میں تلوار چلائی۔ وہ سچ مچ ہی اوّل درجے کی اناڑی تھی۔ شہلا نے اپنے جُوتے اُتار کر پھینکے' سر پر ایک رُومال باندھا اور اُس کے سامنے آ گئی۔

ملّاح چاروں طرف سے پندرہ قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"کیا تم تیار ہو؟" شہلا نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں تیار ہُوں۔" عذرا بولی۔

شہلا نے ایک ہاتھ میں چابک اور دُوسرے میں لمبا سا خنجر تھام لیا اور اپنی جگہ جم کر کھڑی ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ آگے کیوں نہیں بڑھی۔ اگر وہ چاہتی تو آگے بڑھ کر ایک لمحے کے اندر اندر عذرا کو ختم کر سکتی تھی مگر وہ تو عذرا کے ساتھ بلّی اور چُوہے والا کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔

عذرا تلوار چلاتے ہُوئے تیزی سے آگے آئی۔

شہلا نے پھرتی سے اُس کا وار خالی دیا اور بڑے زور سے اُس کے پیٹ پر چابک مارا۔ عذرا مارے درد کے دُہری ہو گئی۔

شہلا دو قدم پیچھے ہٹ کر مسکرانے لگی۔

عذرا سیدھی ہُوئی اور اُس نے شہلا پر پھر وار کیا مگر اس بار بھی شہلا نے وار خالی دیا اور خنجر سے اُس کے شانے پر ایک چرکا لگا کر پیچھے ہٹ گئی۔

عذرا درد سے کراہ اُٹھی اور اُس کے ہاتھ سے تلوار چھُوٹ گئی۔

شہلا نے اُس کے شانے سے خوُن بہتے دیکھا تو اُس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ ناچتے اور بل کھاتے . . . کے انداز میں آگے بڑھی اور اس نے عذرا کے چہرے پر چابک مارا۔

عذرا پھر تڑپ اُٹھی . . . مگر اُس نے تلوار اُٹھائی اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر شہلا کی طرف بڑھی۔

شہلا جست لگا کر سامنے سے ہٹ گئی۔

عذرا نے اچانک گردش کرنا شروع کر دی۔ شہلا یہ دیکھ کر ذرا سا چکرائی مگر خنجر تولتے ہُوئے آگے بڑھی لیکن جونہی عذرا خنجر کی طرف متوجہ ہُوئی' شہلا نے تلوار پر چابک مارا اور خنجر سے عذرا کے چہرے پر چرکا لگا دیا۔

عذرا نے تلوار پھینک کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

اب شہلا پر خوُن سوار ہو گیا۔ وہ اُچھل اُچھل کر عذرا پر خنجر سے وار کرنے لگی۔ عذرا کی ہر چیخ پر شہلا وحشیانہ نعرہ لگاتی اور ہر نعرے کے ساتھ عذرا کے زخموں میں ایک اور زخم کا اضافہ ہو جاتا۔

میں زیادہ دیر تک اس خونریزی کا تماشا نہ دیکھ سکا اور ریلنگ کے پاس آ کھڑا ہُوا۔

اتنے میں تیمور میرے پاس آیا اور بولا: "چلو اچھا ہُوا کہ شہلا کو ایک شکار مل گیا۔ اب وہ کچھ عرصہ تک فرح کی طرف توجہ نہیں دے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر عذرا' شہلا کی اذیت پسند فطرت کو تسکین نہ دیتی تو وہ جاتے ہی فرح کو مقابلے کی دعوت دے ڈالتی . . . اور اُس کا بھی یہی حشر کرتی جو اُس نے عذرا کا کیا ہے۔"

میں اس تصوّر سے ہی کھول کر رہ گیا۔

تیمور نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا "کھولنے کی ضرورت نہیں سرفروش! اس وقت کے لیے کچھ سوچو اور کوئی تدبیر کرو جب شہلا' فرح کو دعوتِ مقابلہ دے گی۔"

★★

ترغون سے برقون واپسی تک چار ہفتوں کے دوران' میں یہی سوچتا رہا کہ شہلا کو جلد از جلد اپنے کیفرِ کردار تک پہنچ جانا چاہیے اور میری اس مسلسل سوچ کا باعث اُس کی ظالمانہ حرکات کم اور اس کی اپنی ذات زیادہ تھی جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں' شاید اسے لوگوں کے دلوں کا حال پڑھنا آتا تھا چنانچہ ایک رات اُس نے مجھ سے کہا۔

"تم مجھے بڑی آسانی سے قتل کر سکتے ہو سرفروش' سالاروں کی جماعت بھی شاید میرے قتل اور قاتل کے سلسلے میں زیادہ تفتیش کی زحمت نہ کرے کیونکہ میں سالار برادری میں زیادہ مقبول نہیں ہُوں . . . لیکن یاد رکھو کہ میرا قتل' فرح اور سُلطان کی موت ثابت ہو گا اور اُن کی موت عذرا کی موت سے کہیں زیادہ کرب ناک ہو گی۔"

میرا جی تو چاہا کہ میں اسی وقت شہلا کو ختم کر دُوں لیکن میں فرح اور سُلطان کی زندگیوں سے نہیں کھیل سکتا تھا۔ سُلطان کے ساتھ میں نے دوستی کا حلف اُٹھایا تھا اور فرح سے مجھے محبت ہو گئی تھی۔

میری داستانِ حیات پڑھنے والوں کو میرے اس اعتراف پر تعجب ہو گا اور وہ سوچیں گے کہ میں جو کبھی لالہ رُخ کو دیوانہ وار چاہتا تھا' اُسے کتنی آسانی سے بھُول گیا اور پھر عام مقولہ ہے کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے تو میں فرح سے کیوں اور کیسے محبت کرنے لگا تھا

میرا خیال ہے کہ محبت ایک بار نہیں' بار بار کی جا سکتی ہے۔ محبت کے خَلا کو صرف محبت ہی سے پُر کیا جا سکتا ہے' عورت کا لگایا ہُوا زخم کوئی عورت ہی بھر سکتی ہے۔ میں لالہ رُخ کو کبھی نہیں بھُول سکا اور نہ ہی کبھی بھُول سکتا ہُوں۔ اُس کی یاد کے زخم ہمیشہ تازہ ہی

رہے ہیں لیکن میں نے اُن پر فرائض کی چادر ڈال دی ہے۔ دُوسرے آخری ملاقات میں اُس نے یہ بتایا تھا کہ وہ مجھ سے مایُوس ہو کر کسی اور سے شادی کرنے والی ہے۔ میری مجبُوریاں' اُسے اپنانے اور حقیقتِ حال بتانے میں حائل تھیں اس لیے میں نے بڑی خاموشی کے ساتھ صبر کا زہر پی لیا تھا . . . اور اب یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیسی ہے؟ میں نے کبھی اُس کا کھوج لگانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ میں اُس کی ازدواجی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن فرح نے اپنے مزاج اور رکھ رکھاؤ سے میرے سازِ دل کے اُن تاروں کو پھر سے چھیڑ دیا تھا' جو مدتوں سے خاموش تھے۔

میں جذبات کی رَو میں بہہ کر نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا ہُوں حالانکہ بات شہلا کی کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سالار برادری میں غیر مقبول تھی مگر جب ہم برقون پہنچے اور اُس نے مالِ غنیمت میں سے قزاق برادری کو اُس کا حصّہ دیا تو سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گزشتہ تین سالوں کے دوران کسی سالار نے قزاق برادری کو اتنی بڑی رقم اور سونا چاندی نہیں دی تھی۔

اگرچہ اس مُہم کی کامیابی میں میرا بھی بڑا دخل تھا لیکن چونکہ مہم کی سربراہ شہلا تھی اس لیے کامیابی کا سہرا اُس کے سر باندھا گیا اور قزاق برادری کے وہ سالار جو پہلے اُسے درخورِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے تھے اب اُس کے اردگرد منڈلانے لگے اور سالاروں کی انجمن اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔

موسمِ سرما کے طوفانِ بادوباراں شروع ہو چکے تھے اس لیے قزاقوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ اس موسم میں وہ برقون میں آرام اور عیش کیا کرتے تھے۔

میں موسمِ بہار کی آمد تک فرار کے لیے تیار ہو جانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی تمام تر توجہ' معلومات فراہم کرنے پر لگا رکھی تھی۔ شیر کوہ آئندہ گرمیوں میں بغاوت کرنا یعنی قزاقوں سے فارش پر حملہ کروانا چاہتا تھا اور مجھے اُس وقت سے پہلے پہلے وہاں پہنچ کر شاہ اسفندیار کو خبردار کرنا تھا۔

اُدھر شہلا مجھے فرح سے دُور رکھنا چاہتی تھی اس لیے کوشاں تھی کہ میں علٰحدہ مکان کرائے پر لے لُوں۔ مجھے ابھی تک سالار نہیں بنایا گیا تھا مگر اُس کے ایما پر میں نے تین کمروں والا ایک مکان لے لیا کیونکہ میں اُس سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

یہاں وہ اکثر میرے پاس آتی اور مستقبل کے منصوبے بنایا کرتی تھی۔ اسی دوران اُس نے کبھی بھی فرح کا ذکر نہیں کیا اور اس سلسلے میں اُس کی خاموشی میرے دل میں مستقل اندیشے اور وسوسے پیدا کرتی رہی کہ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اس لیے میں فرح سے ملنے میں احتیاط برتتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ شہلا کے آدمی مجھ پر نظر رکھتے ہوں گے اس لیے فرح کبھی کبھار خُود ہی مجھ سے ملنے آ جایا کرتی تھی۔

ایک رات جب سخت سردی تھی اور لوگ سرِ شام ہی اپنے گھروں میں دُبک گئے تھے' میرے دروازے پر دستک ہُوئی۔

دستک کا انداز بتاتا تھا کہ فرح آئی ہے۔

اُس کے یُوں بے وقت آنے پر میں ٹھٹک گیا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا کہ کہیں پڑوسی نہ جاگ جائیں۔ میں نے دروازہ کھولا تو واقعی فرح اور سلطان کھڑے تھے۔

میں اُنھیں اندر لے آیا اور آنے کی وجہ پُوچھی۔

اُنھوں نے بتایا کہ آج اُن کی رہائش گاہ کے باہر کچھ پُراسرار سے لوگ گھُوم رہے ہیں اور آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ اس لیے وہ یہاں آ گئے ہیں۔ اُن کی اس بات نے میرے دل میں وہ سارے خدشے اُبھار دیے جو مجھے ڈستے رہتے تھے۔ ابھی میں اس سلسلے میں کوئی اقدام کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سیڑھیوں پر متعدد قدموں کی چاپ سُنائی دی اور پھر دھڑ سے دروازہ کھُل گیا۔

اس سے پہلے کہ میں یا سُلطان باہر جاتے' شہلا ایک ہاتھ میں خنجر اور دُوسرے میں چابک لہراتی ہُوئی اندر آئی اور غصّے کے عالم میں دھاڑی . . .

"تیری یہ جرأت کہ تُو اس مرد سے ملاقات کرے جسے میں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے . . . یا تو مجھ سے مقابلہ کرو یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!"

فرح، شہلا کے تیور دیکھ کر دم بخُود رہ گئی اور خوفزدہ ہو کر خاموش بیٹھی رہی۔

مجھ سے اس کی توہین برداشت نہ ہو سکی۔ میں نے تلوار اُٹھالی اور شہلا کا سر قلم کرنے کے لیے آگے بڑھا تو مرجان کُود کر بیچ میں آ گیا۔ میں اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اُسے موت کھینچ کر میرے سامنے لے آئی تھی۔ میں نے اُس کا وار روکنے کے ساتھ ساتھ اپنی تلوار اس طرح گھمائی کہ وہ اس کی زد سے اپنی گردن نہ بچا سکے۔

وہ ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔

یہ دیکھتے ہی شہلا اُلٹے قدموں بھاگی۔ میں اُس کے پیچھے لپکا تو اُس کے دو محافظوں نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے سامنے آنے والے محافظ کو دُوسرے پر دھکا دیا تو دُوسرے محافظ کی تلوار اس کی پُشت میں پیوست ہو گئی اور دونوں ہی گر پڑے۔

اس سے پہلے کہ دُوسرا محافظ اُٹھتا' سُلطان نے اُسے بھی ختم

کر دیا اور بولا: "اب ہمارا یہاں رہنا موت کو آواز دینے کے مترادف ہے، سرفروش!"

"تم ٹھیک کہتے ہو، سلطان!" میں نے اُسے جواب دیا اور فرح سے کہا۔

"جلدی سے کچھ گرم کپڑے پہن لو۔"

اتنے میں باہر سے کسی نے پکار کر پوچھا: "یہ آوازیں کیسی ہیں سرفروش؟"

میری بجائے سلطان بول اُٹھا: "یہ قزاق برادری کا معاملہ ہے۔ کسی سالار کو بُلا لاؤ!"

وہ آدمی سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔

اُس کے جاتے ہی ہم چھت پر پہنچے اور وہاں سے دُوسری چھت پر آکر سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئے۔

گلی تاریک اور ویران تھی۔ ہم تیزی سے سڑک پر آئے اور پھر پہاڑوں کی طرف چل دیے۔

ابھی تک خطرے کا اشارہ نہیں ہُوا تھا۔ ہمیں شمالی حصّے کی شہر پناہ تک پہنچنے کی مہلت مل گئی۔ اب صرف سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک پہنچنا اور باہر نکل جانا تھا کہ اتنے میں خطرے کا طبل بجنے لگا اور اس کے ساتھ ہی نیچے مختلف مقامات پر چنگاریاں اُڑانے والی مشعلیں جل اُٹھیں لیکن ہم رُک نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ہم شرابی ملاحوں کی طرح جھُومتے جھامتے دروازے تک پہنچ گئے جہاں چار پہرے دار سردی سے سکڑے سمٹے ایک کونے میں بیٹھے ہُوئے تھے۔

"رُک جاؤ..." اُن میں سے ایک بولا۔

"آں... کیوں؟" میں نے کسی بدمست شرابی کی طرح پُوچھا۔

"خطرے کا طبل بجا ہے۔" وہ بولا: "کوئی بھی سالارِ اعظم کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جا سکتا۔" اور یہ کہتے کہتے اچانک اس کی نگاہ فرح کے چہرے پر جا پڑی۔

اگرچہ اُس نے اپنا چہرہ شال سے چھپا رکھا تھا مگر اُس کی خُوبصورت آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ عورت ہے۔

پہرے دار اُس کی طرف بڑھتے ہُوئے بولا: "ارے واہ۔ کیا دیدار بھی نہیں کراؤ گی؟"

ابھی وہ فرح کا دیدار نہیں کر پایا تھا کہ سُلطان کا خنجر اُس کے سینے میں اُتر گیا اور میں دُوسرے پہرے داروں پر ٹُوٹ پڑا۔

دو تو ڈھیر ہو گئے مگر تیسرا بھاگ نِکلا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ شہر کی بجائے پہاڑوں کی طرف دوڑا تھا۔ میں نے سُلطان اور فرح کو اپنی تقلید کرنے کا کہہ کر شور مچا دیا اور تیزی سے پہرے دار کے پیچھے دوڑ لگا دی: "ارے بھائی پہرے دار۔ ٹھہرو۔ سُنو تو!"

سُلطان اور فرح نے بھی یہی کیا اور بُرج میں دُبکے ہُوئے پہرے داروں نے جھانک کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اس طرح شور مچا کر فرار ہو سکتا ہے۔ ہم تقریباً ڈیڑھ میل تک دوڑتے چلے گئے۔

اب ہمارے سامنے پہلا درّہ تھا اور یہاں بھی محافظ موجود تھے۔ اِتفاق سے کمان دار مجھے پہچانتا تھا۔

"کیا بات ہے سرفروش؟ کوئی گڑبڑ ہے کیا؟" اس نے پُوچھا۔

"بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے، دوست!" میں نے ہانپتے ہُوئے جواب دیا: "سیڑھیوں والے دروازے پر کچھ لوگوں نے چار دل پہرے داروں کو قتل کر دیا ہے۔"

"اوہ... کیا وہ پکڑے گئے؟"

"نہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں شمالی چوکیوں سے کچھ پہرے دار لے کر اُنھیں تلاش کروں۔"

"کچھ دیر پہلے یہاں سے چند آدمی گزرے تو تھے... کیا میں آپ لوگوں کو اپنے تین گھوڑے دے دُوں؟ یہ گھوڑے ضروری پیغام بھیجنے کے لیے ہوتے ہیں اور یہ معاملہ بھی کافی اہم ہے۔"

"ارے واہ، میرے دوست، بہت بہت شکریہ۔ جلدی کرو تاکہ ہم بلاتاخیر آگے بڑھ سکیں۔"

جب فرح اور سُلطان گھوڑوں پر سوار ہو گئے تو میں نے دیکھا کہ نیچے ڈھلان پر دو آدمی تیزی سے قصبے کی طرف چیختے چلّاتے آرہے ہیں۔ میں کُود کر اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور کمان دار سے بولا: "یہ سونے کا سکّہ قبول کرو دوست کیونکہ تم نے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔"

"شکریہ جناب۔ خُدا آپ کو کامیاب کرے۔" وہ بولا۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

راستہ تنگ مگر ہموار تھا اس لیے ہم گھوڑے دوڑاتے چلے گئے۔ اس طرح ایک گھنٹے میں ہم نے تقریباً آٹھ میل کا فاصلہ طے کر لیا اور جنگل تک پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے پختہ راستہ چھوڑ دیا اور جنگل میں گھُس گئے تاکہ گھوڑے تھوڑی دیر دم لے سکیں اور میں سُلطان اور فرح کو اپنا منصُوبہ بتا سکوں۔ چنانچہ ایک جگہ میں نے گھوڑا روک لیا اور اُن سے کہا۔

"میں نے فرار کا جو منصُوبہ بنایا تھا، اُس کے اعتبار سے ہم یکسر... بے سروسامان ہیں۔ اب ہمیں سرما کی طوفانی ہواؤں میں سمندر کا سفر کرنا ہوگا اور اس سفر کے لیے کوئی کشتی بھی چُرانا پڑے گی... مگر اس سے پہلے ہمیں خوراک اور مزید کپڑوں کے لیے کسی گھر میں گھُسنا پڑے گا۔"

"خدا پر بھروسہ رکھو دوست۔ یُوں تو اس موسم میں کشتیاں سمندر سے ساحل پر کھینچ لی جاتی ہیں مگر اوپر والا کوئی معجزہ دکھائے گا اور کشتی

مِل جائے گی مگر ہم فارِش کی بجائے ترغون جائیں گے۔ وہ فارِس کے مقابلے میں قریب ہے اور ہَوا بھی موافق مِلے گی۔" سلطان نے کہا۔

"لیکن ہمارا فارِش جانا ضروری ہے کیونکہ ہمیں شاہ اسفندیار کو قزاقوں کی سازش سے خبردار کرنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

فرح نے بھی میری تائید کی۔

"اگر ہم صحیح وسلامت فارِش پہنچ گئے تو وہاں ہمیں یہاں سے بھی زیادہ خطرہ ہوگا۔ شیرکوہ کو بھی قزاقوں سے کم نہ سمجھو۔"

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ شیرکوہ صرف ایک آدمی ہے جب کہ یہاں پچاس ہزار قزاق ہیں اور اب اُن کا ہر فرد ہمارے خُون کا پیاسا ہو چکا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا گھوڑا پھر پہاڑی رہگزر کی طرف موڑ دیا۔

ہم صُبح تک سفر کرتے رہے۔ کہیں کہیں ہمیں غلاموں کی جھونپڑیوں میں روشنی دکھائی دی تھی مگر خُدا کا شکر ہے کہ کسی سے آمنا سامنا نہیں ہُوا۔

صبح کے وقت ہم گھنے جنگل میں گھُس گئے جہاں ہم نے گھوڑے باندھ دیے اور سکڑ سمٹ کر لیٹ گئے تاکہ تھوڑی سی نیند لے کر تازہ دم ہو جائیں۔

ہم نہ جانے کتنی دیر تک سوتے رہے کہ اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں سے میری آنکھ کھُل گئی۔ میں نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ لیا مگر ہلے جلے بغیر ہی لیٹا رہا۔

گھڑ سوار رُکے بغیر آگے بڑھ گئے۔

میں نے سُلطان اور فرح کی طرف دیکھا جو گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے اُنھیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور سوچنے لگا کہ اب ہمیں گھوڑے یہیں چھوڑ دینے پڑیں گے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم چھُپ چھُپا کر آگے بڑھیں کیونکہ قزاق کتّوں کی طرح ہر طرف ہماری بُو سُونگھتے پھر رہے تھے۔

جب سُلطان اور فرح نیند سے بیدار ہُوئے تو میں نے اُنھیں صُورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہم درختوں کی آڑ میں پیدل ہی آگے بڑھنے لگے۔

تین دن بعد ہم اپنی تلاش کرنے والے کتّوں کی نگاہوں میں آنے سے بال بال بچے، جھاڑیوں میں چھُپ کر چلنے کی وجہ سے ہم بار بار گر پڑتے تھے اور ہمیں چوٹیں بھی آتی تھیں لیکن ہم نے سفر جاری رکھا۔

راستے میں ہمیں کسی مقام پر بھی کوئی کشتی دکھائی نہیں دی۔

رات کو بھی رُکنا مناسب نہیں تھا۔ ہم آگے بڑھتے رہے لیکن اب ہمارا سب سے اہم مسئلہ کہیں سے اشیائے خورد و نوش حاصل کرنا تھا۔ اگرچہ مجھے اور سلطان کو بھی بھُوک پیاس ستا رہی تھی مگر فرح کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اُس سے چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔

کسی آبادی میں جانے کا مطلب موت کے مُنہ میں جانا تھا تاہم ایک مقام پر ہمیں غلاموں کی جھگیوں کے آخر میں ایک گودام نظر آگیا۔ اُس کے سامنے سمندر میں کوئی کشتی گشت نہیں کر رہی تھی اور جھگیوں میں غلام دروازے اور کھڑکیاں بند کیے سو رہے تھے۔

میں نے اپنی تلوار ہاتھ میں لے لی اور ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں۔

میں روٹی اور سُوکھی مچھلی کے تصوّر میں اتنا غرق تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

اچانک مجھے فرح کی چیخ سُنائی دی اور پھر اُس طرح اُدھوری رہ گئی جیسے کسی نے اُس کا مُنہ بند کر دیا ہو۔

میں فوراً پلٹا اور یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ سُلطان زمین پر پڑا ہے اور دو آدمیوں نے فرح کو ڈنڈا ڈولی کر رکھا ہے۔

میں تلوار سونتے اُدھر لپکا تو ایک درخت کے پاس سے گزرتے ہُوئے کوئی چیز بڑے زور سے میرے سر سے ٹکرائی اور میں اُس کی ضرب سے مُنہ کے بل گر پڑا۔ ایک لمحے کو یُوں محسوس ہُوا جیسے میں سمندر کی گہرائی میں ڈُوبتا جا رہا ہُوں اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

★★

جب مجھے ہوش آیا تو میں یہ جان کر حیرت زدہ رہ گیا کہ میں کسی زنداں کے یخ بستہ فرش کی بجائے ایک نرم و گرم بستر پر لیٹا ہُوا ہوں۔ میں نے اُوپر نگاہ کی تو پتہ چلا کہ یہ کسی کشتی کے سالار کا کیبن ہے۔ ہچکولوں سے اندازہ ہُوا کہ موجوں پر رواں دواں ہے۔

معاً دروازہ کھُلا اور ٹھنڈی ہَوا کے جھکڑ کے ساتھ تیمور اندر آیا۔

تب مجھے احساس ہُوا کہ میں "برقِ طوفان" پر سوار ہُوں۔

"جراح نے بتایا ہے کہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ لہٰذا میں تمھارے سوالوں کا جواب دینے آگیا ہُوں۔" تیمور نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

میں نے سب سے پہلا سوال کیا: "کیا ہم قیدی ہیں؟"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمھیں شہلا کے شکاری کتّوں کے حوالے کر دُوں گا؟"

یہ سُن کر مجھے کچھ اطمینان ہُوا اور میں نے پُوچھا: "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم خلیج دارا کی طرف جا رہے ہیں اور توقع ہے کہ تین ہفتوں میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

خلیج دارا، مملکتِ فارِش میں واقع تھی۔ اس لیے میں نے سوال کیا: "تمھارا اور تمھارے عملے کا کیا ہوگا؟"

"میرا عملہ میرے ساتھ ہے۔ شاہ اسفندیار اُن قزاقوں کو معاف

کردیتا ہے، جو قزاقی سے تائب ہو کر اچھے شہری بن جائیں اور آیندہ کوئی غلط حرکت نہ کریں۔ تم سوچو گے کہ میں نے قزاق برادری کو چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا؛ بات دراصل یہ ہے کہ اب شہلا کو سالاروں کی جمعیت میں اقتدار حاصل ہو گیا ہے لہٰذا اُن سے انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ شہلا کی فطرت میں انتقام لینا شامل ہے' اس لیے وہ ہر اُس فرد کو اپنا نشانہ بنائے گی جسے وہ پسند نہ کرتی ہو یا تمھارا دوست سمجھتی ہو۔ اس صُورتِ حال میں وہ مجھے اپنے انتقام کا نشانہ ضرور بناتی۔"

میں تیمور سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا مگر مجھے چکر آنے لگے۔ وہ مجھے سونے کا کہہ کر باہر چلا گیا۔

میں تقریباً بارہ گھنٹے سوتا رہا۔

دُوسرے روز فرح میرے لیے کھانا لے آئی۔ وہ بے حد مسرور دکھائی دیتی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تیمور کو بھی ہماری تلاش کی مُہم پر بھیجا گیا تھا اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم اُسے مل گئے۔

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں "برقِ طُوفاں" کا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو۔ میں نے اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا۔

"پہلے چند روز تک تو اُنھیں یہ خیال ہی نہیں آئے گا کہ ہم فرار ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چند روز تک ہماری واپسی کا انتظار کریں گے اس طرح ہمیں کم از کم آٹھ دس روز کی مہلت مِل جائے گی۔ تب وہ ہماری تلاش کے بارے میں سوچیں گے۔ ممکن ہے طوفانی موسم کی وجہ سے وہ تلاش کا خیال ہی ترک کر دیں۔" تیمور نے وضاحت کی۔

میں اس وضاحت سے مطمئن ہو گیا۔

●

سُلطان اور تیمور دونوں تجربہ کار جہازراں تھے' اس لیے موسم کی خرابی کے باوجود بیسویں روز ہم خلیجِ دارا تک پہنچ گئے۔

"اب ہمیں کوئی ایسی بندرگاہ تلاش کرنا پڑے گی' جہاں شیرکوہ کے دستے موجُود نہ ہوں اور بندرگاہ کے محافظ بھی اتنے بُزدل نہ ہوں کہ ہمیں دیکھتے ہی خطرے کا طبل بجا دیں اور ہمیں اپنے بارے میں وضاحت کا موقع ہی نہ مِل پائے۔" تیمور نے کہا... پھر وہ سُلطان کی طرف متوجہ ہو گیا: "بندرگاہِ رُودگی کے بارے میں کیا خیال ہے' وہ قریب بھی ہے؟"

"رُودگی سے ملحق ہی شیرکوہ کی جاگیر ہے۔ وہاں جانا اپنی موت کو دعوت دینا ہو گا۔" سُلطان نے جواب دیا۔ "اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم ارموس سے گزر کر رزمانہ پہنچ جائیں۔"

"اگر بادِشمالی نے طوفانی صُورت اختیار کر لی تو؟" تیمور نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ طوفان بہرصُورت خطرناک ہُوا کرتے ہیں اور رُودگی جانے میں بھی یہ خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رُودگی' رزمانہ کی بہ نسبت قریب ہے۔"

"ٹھیک ہے' ہم رزمانہ جائیں گے۔" تیمور نے فیصلہ کر دیا۔

جُوں جُوں رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا، بادِشمالی میں شدّت آتی جا رہی تھی اور پھر اُس نے طوفان کی شدّت اختیار کر لی۔

نصف شب کے قریب جب ہم ارموس کے سامنے سے گزر رہے تھے ہماری کشتی بپھری ہُوئی موجوں کے درمیان گھِر گئی۔ کوہ پیکر طوفانی لہریں کبھی اُسے ایک جانب جُھکا دیتیں اور کبھی دُوسری جانب۔ اس کیفیت نے چپّو چلانے ناممکن بنا دیے۔ ان لہروں میں کشتی کا موڑنا بھی انتہائی خطرناک تھا۔ کشتی مُڑتے ہُوئے پانی کے طوفانی ریلے سے اُلٹ سکتی تھی۔

ہم نے کشتی کو غضب ناک موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور ملّاح اُمڈ اُمڈ کر آنے والا پانی باہر نکالنے لگے مگر جتنا پانی وہ نکالتے تھے، اس سے زیادہ اندر آ جاتا تھا۔

دو گھنٹوں میں ہَوا اور طوفانی لہریں کشتی کو اُس طرف دھکیل لے گئیں جدھر چٹانیں تھیں اور یہی سب سے زیادہ خطرناک بات تھی۔ کشتی کسی بھی وقت چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتی تھی۔

اس صُورتِ حال میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ یا تو ہم کشتی چھوڑ دیں یا پھر اسی میں موت کا انتظار کرتے رہیں۔

ابھی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ کشتی پانی میں چھُپی ہُوئی کسی چٹان سے ٹکرا گئی۔ دُوسری لہر نے اُسے چٹان سے اُچھال کر دُور کر دیا مگر تیسری لہر نے پھر اُسے زیرِ آب چٹان پر پٹخ دیا۔ اب وہ کسی لمحے بھی ٹُوٹ سکتی تھی چنانچہ تیمور نے نعرہ لگایا: "کشتی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ!"

سُلطان نے بتایا کہ یہ چٹانیں ساحل کے قریب ہیں۔ اگر طوفان نہ ہوتا تو ہم بآسانی تیر کر ساحل تک پہنچ سکتے تھے۔ اُس کے اس انکشاف پر میں نے تیمور اور سلطان کو مشورہ دیا کہ اگر ساحل قریب ہے تو وہاں تک رسّہ پہنچا دیا جائے تاکہ اُس کے سہارے سب ساحل تک پہنچ سکیں ورنہ طوفانی لہریں آدھے سے زیادہ آدمیوں کو نِگل لیں گی۔

میری اس تجویز پر سُلطان نے لبیک کہا اور اپنی کمر سے رسّہ لپیٹ کر پانی میں اُتر گیا۔ سب یہ دیکھنے کے لیے ڈگمگاتی ہُوئی کشتی کی ریلنگ تھام کر کھڑے ہو گئے کہ طوفانی لہریں سُلطان کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔

سُلطان تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ ایک طوفانی لہر نے اُسے نِگل

لیا اور وہ پانی میں غائب ہو گیا۔ بیشتر لوگوں کے مُنہ سے سسکاری نِکل گئی لیکن اُس لہر کے گزرنے کے بعد ہمیں سُلطان کا سر اُبھرتا دکھائی دے گیا اور اس کے ساتھ ہی سب نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ اب سُلطان ہمیں آدھا دھڑ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

وہ شاید کسی زیرِ آب چٹان پر پہنچ گیا تھا۔ پھر دُوسری لہر آنے سے پہلے ہی اُس نے ڈبکی لگا دی۔ جب لہر گزر گئی تو ہمیں پھر اُس کا سر پانی سے اُبھرتا دکھائی دیا۔ اب وہ کافی فاصلے پر پہنچ چُکا تھا۔ تیسری بار جب وہ ہمیں دکھائی دیا تو وہ پانی میں چل رہا تھا اور لہریں اُس کے گھٹنوں تک جھاگ اُڑا رہی تھیں۔

وہ ساحل پر پہنچ گیا تھا۔

سب نے ایک بار پھر نعرہ لگایا مگر اُن کا یہ نعرہ اُدھورا ہی رہ گیا۔ ایک لہر نے کشتی کو اُٹھا کر پٹخ دیا تھا، کشتی کے نچلے تختے ٹُوٹ گئے تھے اور اب اُس کا لمحوں میں ڈُوب جانا یقینی تھا۔

اتنے میں سُلطان نے اپنی کمر سے رسّہ کھولا اور اُسے ایک چٹان کے ساتھ باندھ دیا۔ اب ایک ایک کر کے عملہ اُترنے لگا۔ جُوں جُوں رسّے کو پکڑنے والے آدمی بڑھتے گئے' وہ تن کر کمان کے چلّے کی طرح ہو گیا۔

"تم فرح کو لے جاؤ تیمور۔ شاید اسے تیرنا بھی نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"نہیں دوست۔ مانا کہ تم نے سالار پسرِ آذر کو مار کر سالار بن چکے ہو مگر میں نے اس کشتی پر بارہ سال کام کیا ہے۔ اس لیے میں آخر تک کشتی پر رہُوں گا۔ تم فرح کو لے جاؤ۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے شہزادہ شہریار کے کاغذات اور انگوٹھی موم جامے میں پہلے ہی لپیٹ رکھی تھی۔ اسے مضبوطی کے ساتھ کمر سے باندھا اور فرح کو لے کر پانی میں اُتر گیا۔

طوفانی لہریں بار بار ہمیں ڈبونے کی کوشش کر رہی تھیں' اُدھر فرح کے حواس بھی جاتے رہے اور وہ ڈر کر مجھ سے اس طرح لپٹ گئی کہ میرے لیے موجوں سے لڑنا مشکل ہو گیا لیکن میرے آگے' پیچھے والے ملّاحوں نے ایک دُوسرے کے ہاتھ تھام کر ہمیں اپنے حصار میں لے لیا اور بالآخر ہم بھی ساحل تک پہنچ گئے۔

میں نے پلٹ کر کشتی کی طرف دیکھا تو وہ تقریباً ڈُوب چکی تھی اور تیمور اُس پر کھڑا ہاتھ ہلا کر خُدا حافظ کہہ رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک لہر نے کشتی اور تیمور کو نِگل لیا۔ وہ چاہتا تو اپنی جان بچا سکتا تھا مگر وہ "برقِ طوفاں" کو اپنی محبوبہ سمجھتا تھا۔ اسی کے ساتھ ڈُوب گیا۔

"سپاہیوں کا ایک دستہ ہماری طرف آ رہا ہے' سرفردش!" سُلطان نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے پلٹ کر ساحل کی طرف دیکھا۔

دو قطاروں میں ایک دستہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ اُنھوں نے سینہ بند باندھ رکھے تھے جن پر شیرکوہ کا نشان کندہ تھا۔ یہ دیکھ کر فرح کے مُنہ سے سسکاری نکل گئی۔ دستے کا کماندار آگے بڑھا اور بولا...

"میں مملکتِ فارش کے قانون کے مطابق اور علاقۂ ارموس کے جاگیردار نیز وزیرِ اعلیٰ شیرکوہ کے نام پر حکم دیتا ہُوں کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ..." یہ کہہ کر اُس نے سپاہیوں کی طرف دیکھا جنھوں نے نیاموں سے تلواریں نکال لیں۔

اگرچہ میرے ساتھی قزاق بُری طرح تھک چکے تھے اور اُن کے پاس ہتھیاروں کے نام پر صرف خنجر ہی تھے... مگر اُن میں چند ایک تیار ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود وہ اس تازہ دم اور مسلح دستے کا مقابلہ نہیں کر سکتے' اس لیے میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُنھیں روک دیا اور کماندار سے بولا...

"ہم نے قزاق برادری سے علیحدگی اختیار کر لی ہے کماندار!"

"میں اس بات کا مجاز نہیں کہ قزاقوں کو ایسے آدمی سمجھوں جنھیں معافی دی جا چکی ہو۔ اب تم ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرتے ہو یا میں اپنے دستے کو کارروائی کا حکم دُوں؟"

یہ کہتے ہُوئے اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک آ گئی جیسے اُس نے فرح کو پہچان لیا ہو اور یہ بڑی خطرناک بات تھی کیونکہ وہ ذرا سے بہانے کا سہارا لے کر ہلّہ بول دیتا اور فرح کو آسانی سے ختم کر سکتا تھا۔ میں نے فوراً اپنا خنجر نکالا اور اسے ریت پر پھینک دیا۔ میرے ساتھیوں نے بھی میری تقلید میں اپنے اپنے خنجر پھینک دیے۔

سپاہی اپنی اپنی کمر سے بندھی رسّیاں کھولنے لگے تاکہ ہمیں باندھ سکیں اور میں یہ سوچنے لگا کہ تقدیر بھی کتنی ستم ظریف ہے۔ ہم ارقون سے فرار ہو کر ساحلِ فارش تک آ گئے' میرے دوست تیمور نے اپنی جان دے دی کہ ہم بہ حفاظت ساحل پر اُتر جائیں... لیکن اس کے بعد تقدیر نے کیسا ستم ڈھایا کہ ہم جن سے بچنا چاہتے تھے' اُسی کے سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے مقدر نے ہمیں فرار کا موقع ہی اس لیے دیا ہو کہ ہم سیدھے شیرکوہ کے ہاتھوں میں جا پہنچیں۔

●

ہمیں دو روز تک عسکری پڑاؤ کے ایک گودام میں رکھا گیا اور پھر ایک دستہ ہمیں اپنی نگرانی میں لے کر فارش کی راج دھانی' درخشاں کی طرف چل پڑا۔

ہم چھ روز پیدل سفر کرنے کے بعد درخشاں پہنچ گئے۔

یہاں تک تو معاملات ٹھیک ٹھاک ہی رہے اور ہم پر کوئی زیادتی

یا تشدد نہیں کیا گیا۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ اروس کی جاگیر صرف تین ماہ قبل ہی شیرکوہ کو عطا کی گئی ہے کیونکہ اُس نے مالیے کی وصولی میں شہزادہ شہریار کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا، اُس کے مقابلے میں زیادہ رقم داخل خزانہ کرکے یہ ثابت کیا تھا کہ شہریار مالیے کی رقم میں غبن کر رہا تھا۔ اس لیے شاہ اسفندیار کی نگاہوں میں اُس کی توقیر بڑھ گئی ہے۔

میرا خیال تھا کہ شیرکوہ مُجھ سے قزاقوں کے بارے میں پُوچھے گا لیکن ایسا نہیں ہُوا۔

ہمیں ایک قلعے میں بند کر دیا گیا۔

شاید شیرکوہ کسی کو بھی یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ اُس کا قزاقوں سے بھی کوئی رابطہ ہے۔

قلعے میں مجھے اور سُلطان کو ایک الگ تھلگ کوٹھری میں رکھا گیا جو تنگ و تاریک، سیلن زدہ اور بے حد ٹھنڈی تھی۔ کوٹھری میں مچھروں اور پسُوؤں کی بھی بہتات تھی تاہم ہمیں ہتھکڑی یا بیڑی نہیں پہنائی گئی تھی اور کھانا بھی بروقت دیا جاتا تھا۔

ہمیں اس زنداں میں آئے تقریباً دو ہفتے ہو گئے تھے مگر کسی نے بھی کوئی پُوچھ گچھ نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمیں محبوس کرکے بھُول گئے ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ فرح کو کہاں رکھا گیا ہے اور وہ کیسی ہے۔ مجھے رہ رہ کر اس کا خیال آتا تھا مگر میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔

تیرھویں رات ہماری کوٹھری کا دروازہ کھُلا اور محافظ نے مجھ سے کہا: "تمھیں کوئی لینے آیا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ محافظ کے پیچھے کوئی سر تا پا سُرخ لبادے میں ملبوس کھڑا ہے۔ وہ فرح نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اُس کا قد لمبا تھا اور آنے والے کا قد چھوٹا تھا۔ وہ شیرکوہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ بہت فربہ آدمی ہے... تو پھر وہ کون ہو سکتا تھا؟ کس کا پیامبر... مگر کس کا؟ پھر میں نے سوچا کہ وہ شیرکوہ کا پیامبر ہو گا۔ اُسی نے مجھے بلوایا ہو گا۔ اگر اُسے ذرا سا بھی شُبہ ہو گیا کہ میں شہریار کی مہم پُوری کرنے آیا ہُوں تو وہ فی الفور مجھے قتل کرا دے گا اس لیے میں ذہنی طور پر ہر خطرے کے لیے تیار ہو گیا۔

کوٹھری کے دروازے سے نکلتے ہُوئے لبادہ پوش نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ کسی لڑکی کا ہاتھ ہو... مگر اُس نے ہاتھ پر دستانہ چڑھا رکھا تھا، اس لیے مجھے پتہ نہ چل سکا کہ وہ مرد ہے یا عورت... بہرکیف وہ جو کوئی بھی تھا مجھے قلعے کی متعدد راہداریوں سے نکالتا ہُوا ایسے زینے پر لے آیا جو اُوپر کی بجائے نیچے جاتا تھا۔

زینہ اُترنے کے بعد ہم پھر متعدد راہداریوں سے گزرے۔ میں نے جا بجا ہتھیاروں کے انبار لگے دیکھے۔ کہیں تلواروں کا ذخیرہ کیا گیا تھا تو کہیں نیزے رکھے ہُوئے تھے۔ کہیں خنجروں کے ڈھیر تھے تو کہیں تیروں کے انبار دکھائی دے رہے تھے۔

چلتے چلتے بالآخر ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں راستہ ختم ہو کر ایک سنگی دیوار بنی ہُوئی تھی۔ میرے رہبر نے آگے بڑھ کر دیوار کو دبایا تو دروازے کے برابر ایک سِل گھوم گئی۔ وہ اس کے اندر داخل ہوا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اندر بہت اندھیرا تھا مگر ٹٹولنے پر مجھے پتہ چل گیا کہ یہ ایک چکر دار زینہ ہے۔ میں اُس کے پیچھے احتیاط سے چلنے لگا اور سوچنے لگا کہ اس قلعے میں بھی ویسے ہی زیرِ زمین راستے، سُرنگیں اور زینے ہیں جیسے کہ ناگ مندر میں تھے۔ کہیں یہ بھی کوئی ناگ مندر تو نہیں اور میں کسی دُوسری ناگ دیوی کے حضور تو نہیں جا رہا ہُوں؟

... لیکن جب زینہ طے کرکے ہم نے ایک دروازے میں قدم رکھا تو پتہ چلا کہ وہ ایک گول کمرہ ہے۔ جہاں نہ کوئی قربان گاہ ہے اور نہ ہی شیش ناگ کا مجسمہ ہے۔ اس کمرے کی کھڑکیوں سے درخشاں عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں پھر مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ کمرہ کسی بُرج کی بالائی منزل پر واقع ہے۔

کمرے کی دیواروں پر سُرخ پردے آویزاں تھے اور فرش پر سُرخ قالین بچھا ہُوا تھا۔ ایک طرف آرام دہ بستر لگا ہُوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کمرہ کسی شاہی افسر ہی کا ہو سکتا ہے۔ اتنے میں میرے رہبر نے اپنا لبادہ اُتار کر پھینک دیا اور میں اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

میرے سامنے ایک حسین عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے بے ساختہ سوال کیا: "تم کون ہو؟"

"کیا تم کوئی اور خوبصورت سوال نہیں کر سکتے قزاق سالار؟" اُس نے ہنستے ہُوئے جواب دیا۔

"باقی سوال تو بعد میں بھی کیے جا سکتے ہیں خاتُون، یہ سوال میرے لیے زیادہ اہم ہے۔"

"میں وزیرِ اعلیٰ شیرکوہ کی بیگم ہُوں۔ تم مجھے لیلیٰ کہہ کر پُکار سکتے ہو۔"

"مجھے یہاں لانے کا مقصد؟" میں نے پُوچھا۔

"بہت سی باتیں سمجھی جاتی ہیں سرفروش، پُوچھی اور بتائی نہیں جاتیں۔" اُس نے جواب دیا۔

اب میں اپنی یہاں آمد کا مقصد جان چُکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ دُوسری شہلا ہو... لیکن وہ لمبی چوڑی تمہید کے بعد بولی تو میں بھونچکا رہ گیا۔

"میرا شوہر مملکت سے غدّاری کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے تم قزاقوں سے سازباز کر رکھی ہے۔ وہ مجھ پر ہی نہیں، کسی پر بھی اعتماد نہیں کرتا لیکن میرے علاوہ کسی دُوسرے کے سامنے ڈینگ بھی نہیں مار سکتا۔ بہرحال، مجھے اُس کے منصُوبے کا پتہ چل گیا ہے۔ اس لیے میں تم سے کچھ کام لینا چاہتی ہُوں۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم اپنے شوہر سے غدّاری کیوں کرنا چاہتی ہو؟"

"اس لیے کہ میرا شوہر نہ پہلے کبھی میرا وفادار رہا ہے اور نہ ہی اپنے منصُوبے کی تکمیل کے بعد رہے گا۔ بلکہ اگر اُس کا منصُوبہ کامیاب ہو گیا تو وہ سب سے پہلے مجھے ہی اپنے راستے سے ہٹائے گا۔ جب وہ اتنا خود غرض ہے تو میں کیوں نہ بنُوں؟ شہریار کے قتل کے بعد تخت کا کوئی وارث نہیں رہا کیونکہ شاہ اسفندیار لاولد ہے اور ملکہ کے مرنے کے بعد اُس نے دُوسری شادی نہیں کی لیکن اگر کوئی خوبصورت عورت اُسے وارثِ تخت و تاج دے سکتی ہو تو وہ اُس سے اس صُورت میں ضرور شادی کرے گا کہ اُس نے شاہ پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔"

"احسان سے تمھارا مطلب اس پُر شیرکوہ کی سازش بے نقاب کرنے سے ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ہاں۔" وہ تائید میں بولی۔

"اس طرح وہ مارا جائے گا اور تم بیوہ ہو جاؤ گی۔ تب شہنشاہ اسفندیار تمھارا ممنونِ احسان ہو گا، تم سے شادی کرکے تمھیں ملکہ بنا لے گا۔ یہی ہے نا تمھارا منصُوبہ؟"

"ہاں۔ شاید تم مجھے انتہائی لالچی سمجھ رہے ہو مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ میرا شوہر بہت گھٹیا فطرت کا آدمی ہے۔ اُس نے دولت کے لالچ میں مجھ سے شادی کی تھی کیونکہ میرا باپ بہت بڑا جاگیردار تھا اور میں اُس کی اکلوتی اولاد تھی۔ اُس نے میرے باپ کی جاگیر پر قابض ہونے کے لیے اُسے زہر دلوا دیا۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو بہادر ہو اور دربارِ شاہ کا ایک معتبر افسر بھی ہو۔"

"مگر میں تو ایسا افسر نہیں ہُوں۔"

"تم ایسے معتبر افسر بن سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟" میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہماری مملکت میں زمانۂ قدیم سے یہ دستُور چلا آ رہا ہے کہ اگر کوئی آدمی بھرے دربار میں شاہی سُورما کو مقابلے کی دعوت دے اور مقابلے میں اُسے مار ڈالے تو وہ اُس کی جگہ شاہی سُورما بن سکتا ہے۔ پہلے چونکہ شاہی سُورما کو نہایت اہم فرائض انجام دینا ہوتے تھے اس لیے سب سے بہادر آدمی کو شاہی سُورما منتخب کرنے کے لیے یہ طریقہ رائج کیا گیا تھا مگر آج کل شاہی سُورما اہم خدمات کی بجا آوری کے لیے کم اور نمائش کے لیے زیادہ ہوتا ہے۔ ویسے وہ دربار کا ایک قابلِ عزّت فرد ضرور ہوتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ تم بہت اچھے تیغ زن ہو۔ اگر تم شاہی سُورما افراسیاب پر غالب آ جاؤ تو تمھیں اس کی جگہ شاہی سُورما بنا دیا جائے گا۔ تم شاہ کے محافظِ خاص کی حیثیت سے کام کرتے ہُوئے میرے شوہر پر نظر رکھو گے اور اُس کے منصُوبے کی تفصیلات معلوم کرکے مجھے بتاؤ گے پھر جب مناسب وقت آئے گا، ہم دونوں مل کر شاہ اسفندیار کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیں گے۔"

"کیا شیرکوہ مجھے شاہی سُورما کو مقابلے کی دعوت دینے دے گا؟"

"اگر تم دربار میں پہنچ کر دعوت دو تو شیرکوہ اس مقابلے کو کسی صُورت نہیں رُکوا سکتا لیکن دربار میں پہنچنے سے پہلے وہ تمھیں قتل ضرور کروا سکتا ہے۔ اُسے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تم شہزادہ شہریار کا ادھُورا کام پُورا کرنا چاہتے ہو۔"

"اُسے یہ کیسے معلوم ہُوا؟"

"فرح نے اُسے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

یہ سُن کر مجھے ایسا دھچکا سا لگا کہ میں بے اختیار اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس پر لیلیٰ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھاتے ہُوئے بولی: "غلط مت سمجھو سرفروش، فرح نے تمھارے ساتھ غدّاری نہیں کی۔ شیرکوہ نے حفاظت کے بہانے فرح کو اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔ اُس نے فرح کو ایک ایسا نشہ آور مشروب پلا کر یہ بات معلوم کی ہے جس کے زیرِ اثر آدمی جھُوٹ نہیں بول سکتا۔ فرح، شیرکوہ کے سوالوں کا سچ سچ جواب دینے پر مجبُور تھی۔"

اب جبکہ حقیقتِ حال شیرکوہ پر منکشف ہو چکی تھی، میرے لیے دوبارہ زنداں کی کوٹھری میں جانا، موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں لیلیٰ کی تجویز پر عمل کر دُوں لیکن مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر بھی تھی۔

"میرے ساتھیوں کا کیا ہو گا؟" میں نے پُوچھا۔

"کیا تم اُنھیں شاہ کے انصاف سے بچانا چاہتے ہو؟"

"اُس کے فیصلے میں شیرکوہ کا مشورہ زیادہ شامل ہو گا اور میں جانتا ہُوں کہ وہ اُسے کیا مشورہ دے گا۔ میرے ساتھیوں نے محض میری وجہ سے قزاقوں کا ساتھ چھوڑا ہے۔ اگر تم اُنھیں زنداں سے نکالنے میں میری مدد نہیں کر سکتیں تو میں بھی تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"تم خود ہی اپنے ساتھیوں کو بچا سکتے ہو، سرفروش۔"

"وہ کیسے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اگر تم شاہی سُورما سے مقابلہ جیت لو تو شاہ اسفندیار سے ساتھیوں

ل رہائی کی درخواست کرد تو وہ اسے ہرگز رد نہیں کرے گا۔"

"تم اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتیں؟"

"میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ کچھ لوگوں کو یہ یقین دلا دوں کہ وہ قزاقی چھوڑ چکے ہیں اور معافی چاہتے ہیں۔ اس سے اُنھیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ اُن پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔"

★★

یہ آراستہ و پیراستہ کمرہ بھی میرے لیے قید خانہ ہی تھا۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے گیارہ دن ہو گئے تھے۔ لیلیٰ آتی تھی اور میرے ساتھ کچھ وقت گزار کر چلی جاتی تھی۔ ادھر میں اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

فرح کے بارے میں مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اب تک شیرکوہ کی تحویل میں ہے جو بہت جلد اپنے سازشی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والا ہے اور اس کے لیے خفیہ طور پر تیاریاں کر رہا ہے۔ جونہی موسم سرما کے طوفان ختم ہوں گے شیرکوہ کے ساتھ ساتھ قزاقوں کی تیاریوں میں بھی تیزی آ جائے گی اور فارس پر حملہ کر دیں گے۔ اگر میں یونہی اس عیش گاہ میں مقید رہا تو شیرکوہ کامیاب ہو جائے گا اور شاہ اسفندیار کے ساتھ ساتھ یا تو فرح کو ختم کر دے گا یا پھر اسے اپنی ملکہ بنا لے گا۔

میں لیلیٰ پر اپنے ان جذبات کا اظہار تو نہیں کر سکتا تھا لیکن معاملات کی سنگین نوعیت کے تحت اُسے اکساتا ضرور رہتا تھا کہ جو کرنا ہے، جلدی کیا جائے۔

بارھویں روز جب لیلیٰ آئی تو اُس کے ساتھ دو گونگے اور بہرے ملازم بھی تھے۔ وہ میرے لیے درباری لباس اور میرے پسندیدہ ہتھیار لائے تھے۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہو گیا لیکن لیلیٰ نے یہ خبر سنا کر میری خوشی پر اوس ڈال دی کہ شیرکوہ آج فرح کا مقدمہ شاہ اسفندیار کے سامنے پیش کرنے والا ہے... یا تو وہ اس کے قتل کا حکم صادر کروانے میں کامیاب ہو جائے گا یا پھر اُسے اپنی قید میں رکھنے کی منظوری حاصل کر لے گا اور پھر وقت آنے پر اُسے قزاقوں کے حوالے کر دے گا۔

اس کا مطلب تھا کہ فرح بالآخر شہلا کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی جو اُس کے خون کی پیاسی تھی۔ اس تصور سے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

میں جلدی جلدی تیار ہوا اور لیلیٰ کے ساتھ چل پڑا جو آج مجھے دربار میں پہنچا دینا چاہتی تھی۔

جب ہم پیچ در پیچ راستوں اور محل کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے دربار کے محراب دار دروازے میں داخل ہوئے تو لیلیٰ نے سرگوشی میں کہا: "یاد رکھو، شیرکوہ کی باتوں سے طیش میں نہ آنا۔ شاہی سُورما کو دعوتِ مقابلہ دینے سے پہلے وہ کسی وقت بھی تمھیں قتل کرا سکتا ہے اس لیے فرح کو کوئی اشارہ مت کرنا اور موقع ملتے ہی سُورما کو مقابلے کی دعوت دے دینا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا چہرہ رومال میں یوں چھپا لیا جیسے میرے سر اور چہرے کے زخموں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ اُنھیں دیکھ کر کراہیت محسوس کریں۔

گنبد والے دربار کے وسیع و عریض کمرے میں زرق برق لباس پہنے اس وقت تقریباً پانچ سو مرد اور عورتیں موجود ہیں۔ سبز پتھر سے تعمیر شدہ اس کمرے کی شان و شوکت قابلِ دید تھی۔ بڑے بڑے دو پیل پایوں کے درمیان سنہرا تخت رکھا ہوا تھا۔

میں سب سے پچھلی قطار میں کھڑا ہو گیا۔

چند منٹ بعد چوب دار نے آواز لگائی: "باادب باملاحظہ ہوشیار عالم پناہ، شہنشاہ اسفندیار تشریف لاتے ہیں!"

چوب دار کی اس صدا پر دربار میں موجود ہر فرد ادب سے کھڑا ہو گیا اور جونہی اسفندیار دربار میں داخل ہوا، سب نے اپنا ایک ایک گھٹنا ٹیک کر اس کا استقبال کیا۔

اسفندیار نے اپنا بازو اُٹھا کر ان کے استقبال کا جواب دیا اور سنہرے تخت پر متمکن ہو گیا۔

شیرکوہ کے اشارے پر باری باری کئی آدمی آگے بڑھے اور ادب سے اپنی اپنی عرض داشت پیش کرنے لگے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے، میں نہیں سُن سکا۔

چند آدمیوں کے بعد شیرکوہ نے محافظوں کو اشارہ کیا۔ وہ فرح کو لیے آگے بڑھے تو ہاتھ بے ساختہ اپنی تلوار کے دستے پر چلا گیا مگر میں ضبط کرتے ہوئے اپنے آپ کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔

شیرکوہ نے شاہ اسفندیار سے کچھ کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا محافظ شیرکوہ کے اشارے پر اُسے واپس لے جانے لگے۔

فرح کا رنگ زرد تھا اور وہ بے حد کمزور دکھائی دے رہی تھی اُس کے خوبصورت چہرے پر اداسیوں اور مایوسیوں کی پرچھائیاں تھیں میرا دل اُسے دیکھ کر تڑپ اُٹھا لیکن اس صورتِ حال میں، میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے لیلیٰ کی طرف دیکھا تو اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اپنے بال سنوارے یہی وہ اشارہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور تخت سے بیس قدم کے فاصلے پر رک کر سر خم کرنے کے بعد اپنا رومال چہرے سے ہٹا دیا۔

سب مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

محافظوں نے تلواریں نکال لیں مگر حکم کا انتظار کرنے لگے ، کہ میں نے شاہ اسفندیار سے کہا۔۔۔

"عالم پناہ۔ یہ خاکسار سرفروش خدمتِ عالی میں اس لیے حاضر ہے کہ مملکت کے قدیم دستور کے مطابق شاہی سُورما کو دعوت بلڑنے سکے مگر یہ خاکسار اس مقابلے میں کامیاب ثابت ہو پ کا حلفِ وفاداری اٹھائے اور اُس وقت تک اپنے فرائض دیتا رہے جب تک کہ کوئی دُوسرا اُسے مغلوب نہیں کر لیتا۔"

یہ سُنتے ہی شیرکوہ بول اُٹھا: "یہ نہیں ہو سکتا عالی جاہ کیونکہ یہ قزاق ہے۔"

"نہیں شیرکوہ!" شاہ نے رعب دار آواز میں جواب دیا: "قانون ہے کہ اگر کوئی شاہی سُورما کو مقابلے کی دعوت دے تو یہ دعوت بت پر قبول کی جائے۔ جب تک ہم اپنی مملکت کے حکمران ہیں، قانون میں کوئی رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔" پھر وہ نقیب خاطب ہوا: "شاہی سُورما کو طلب کیا جائے۔"

... لیکن نقیب کے صدا لگانے سے پہلے ہی درباریوں نوں کو چیرتا ہوا ایک گرانڈیل آدمی آگے بڑھا اور شاہ کے ے سر خم کرتے ہوئے بولا: "آپ کا غلام افراسیاب حاضر ہے پناہ اور وہ اس بڑبولے کی دعوت قبول کرتا ہے۔"

میں نے افراسیاب کو غور سے دیکھا۔ وہ قد میں مجھ سے چند انچ تھا مگر اس کا سینہ چوڑا اور بازو بہت لمبے تھے۔ وہ اپنے ڈیل ڈول سے بن مانس ہی لگتا تھا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی ں کر لیا کہ وہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"ہمیں تم سے یہی اُمید تھی افراسیاب!" اسفندیار بولا۔

"عالم پناہ چونکہ یہ ذلیل قزاق مسلح ہو کر آیا ہے لہٰذا اجازت کہ حضور کا قیمتی وقت برباد کیے بغیر اور بلاتاخیر مقابلہ شروع لئے۔" یہ کہتے ہوئے افراسیاب نے اپنی تلوار اور لمبا خنجر نکال یکھنے میں کسی تلوار سے کم نہیں تھا۔

"میں شاہی سُورما کی آرزو پوری کرنے کو تیار ہوں عالی جاہ یا مجھے ایک ڈھال مل سکتی ہے؟"

شاہ اسفندیار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک محافظ رہ کیا جس نے آگے بڑھ کر اپنی ڈھال مجھے دے دی۔ یہ دو ڑی ایک چوبی ڈھال تھی جس پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ اُس کے کانسی کی ایک تھالی نصب تھی۔ میں نے ڈھال کو ہاتھ پر اس کے وزن کا اندازہ کیا اور موت و زیست کے اس کے لیے تیار ہو گیا۔

نقیب کے اشارے پر شہنائی بجنے لگی اور درباری چند قدم پیچھے ہٹ گئے... پھر محافظ آگے بڑھے اور اُنھوں نے تقریباً تیس فٹ کے دائرے کا احاطہ کر لیا جس میں میں اور افراسیاب ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو لقمۂ اجل بننا تھا۔

میں نے آج تک کسی ایسے تیغ زن کا مقابلہ نہیں کیا تھا جو ایک کی بجائے دو تلواروں سے لڑتا ہو۔ افراسیاب نے تلوار اور خنجر کو دفاعی حالت میں لاتے ہوئے تلوار سے میرے سر پر ضرب لگانا چاہی تو میں نے تلوار کو ڈھال سے روکا مگر عین اُسی وقت اس نے خنجر میرے پیٹ میں گھونپنے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

اگر میں ہٹنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کرتا تو خنجر میرے جسم کے آر پار ہو جاتا۔

میں نے پیچھے ہٹ کر اُس پر وار کیا تو اُس نے تلوار اور خنجر کو اس طرح ملا لیا کہ اُن کی ایک قینچی سی بن گئی اور اُس نے میرا وار اُسی قینچی پر روک لیا۔

افراسیاب اتنا پھرتیلا تیغ زن تھا کہ مجھے اُس کے دُہرے حملوں سے بچنے کے لیے بار بار پینترے بدلنے پڑ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس پر غلبہ پانا تو بعد کی بات ہے، پہلے اپنا بچاؤ کرنا ضروری ہے۔

وہ میرا ہر وار ایک تلوار پر روک کر دُوسری تلوار سے مجھ پر وار کیے جا رہا تھا۔ اُس کی تلوار میری تلوار سے زیادہ چوڑی تھی اس لیے اُس کی ضرب بھرپور پڑتی تھی چنانچہ اُس کا ایک وار روکتے ہوئے میری ڈھال دو نیم ہو گئی۔

درباریوں نے بے ساختہ نعرۂ تحسین بلند کیا۔

افراسیاب کا حوصلہ دو چند ہو گیا اور وہ زیادہ تیزی، زیادہ پھرتی سے حملے کرنے لگا۔

ہر گزرتے پل کے ساتھ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب اس کا مقابلہ کرنا پہلے سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں پسینے سے شرابور ہو گئے! افراسیاب کے ہاتھ کسی مشین کی طرح چل رہے تھے۔ اگر میری ٹانگیں بھی مشین کی طرح نہ چلتیں تو وہ اب تک مجھے ختم کر چکا ہوتا۔ میں دو بار اس کے حملوں سے مرتے مرتے بچا تھا جبکہ میں خود اُس پر ایسا کوئی وار نہیں کر سکا تھا چنانچہ اب درباری افراسیاب کو بڑھ چڑھ کر داد دینے لگے تھے۔ اُنھیں یقین ہو گیا تھا کہ جیت اُسی کی ہو گی۔

اب میں نے ایک اور چال چلی۔

ہم پہلے ایک مختصر دائرے میں لڑ رہے تھے۔ میں نے اسے تھکانے کے لیے آہستہ آہستہ دائرہ بڑھانا شروع کر دیا۔ شروع میں تو اُس پر

کوئی اثر نہ ہُوا... پھر اس کے چہرے پر تھکن کے آثار دکھائی دینے لگے لہٰذا وہ جھنجلا کر وار کرنے لگا اور کوشش یہ کرتا رہا کہ اس کے وار کاری ثابت ہوں مگر میں بچ نکلتا جاتا جس سے اُس کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ بات میرے حق میں اچھی تھی۔

جلد ہی میں خود بھی تھکن محسوس کرنے لگا۔

... پھر ایک بار جب اُس نے تلوار سے میری گردن پر وار کرتے ہوئے خنجر میرے پہلو میں گھونپنا چاہا تو میں نے جھکتے اور پیچھے ہٹتے ہوئے اچانک بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کا خنجر والا بازو زخمی کر دیا۔ میری تلوار اُس کی کہنی سے کلائی تک چرکا لگانے میں کامیاب ہو گئی اور اُس سے خون بہنے لگا۔

میں نہیں جانتا کہ اس وقت لوگوں نے میرے لیے نعرۂ تحسین بلند کیا تھا یا وہ افراسیاب کی ہمت بندھانے کے لیے چیخے تھے۔ البتہ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ افراسیاب اپنا خون دیکھ کر مجھ پر اندھا دھند جھپٹنے لگا تھا اور یہی اُس کی غلطی تھی۔

میں نے ایک چرکا اُس کی گردن اور دوسرا ران پر لگا دیا۔

اُس کا خون فرش پر گرنے لگا... مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ زخم لگنے کے بعد اُس میں پہلے سے زیادہ پھرتی آگئی ہے جبکہ تھکن کے مارے میرا دم ٹوٹنے لگا تھا۔ میں نے اپنی بچی کھچی قوت سمیٹی اور اُس کے وار روکنے لگا۔

... پھر افراسیاب بھی تھکن کے مارے ہانپنے لگا۔

اسے ہانپتا دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ پہلے وہ مجھ پر حملے کر رہا تھا اور میں دفاع میں مصروف تھا مگر اب میں اس پر تابڑ توڑ وار کر رہا تھا اور وہ دفاع پر مجبور ہو گیا تھا۔ پھر اُس کا دفاع بھی کمزور پڑنے لگا اور مجھے اپنی فتح یقینی معلوم ہونے لگی۔

میں اُس پر آخری وار کرنے کے لیے لپکا تو فرش پر گرے ہوئے خون کی وجہ سے میرا پاؤں پھسل گیا اور میں پیٹھ کے بل گر پڑا۔

میرے گرنے سے پانسہ پلٹ گیا۔

افراسیاب جو میرے وار سے مرنے والا تھا، مجھے تہِ تیغ کرنے کے لیے جھپٹا لیکن اس سے پہلے کہ اُس کی تلوار میرا خون چاٹتی، میں نے اس کا وار ٹوٹی ہوئی ڈھال سے روکنے کے ساتھ ساتھ پاؤں سے اُس کے گھٹنے پر زوردار ٹھوکر لگائی تو وہ اُلٹ گیا۔

میں نے اُلٹی قلابازی لگائی، زقند بھری اور اپنی تلوار اُس کے سینے میں گھونپ دی۔

یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا تھا۔

افراسیاب کھانسا تو اُس کے منہ سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

میری حالت بھی غیر تھی۔ میں تھکن کے مارے گرنے ہی والا تھا۔ میں نے ڈھال فرش پر پھینکی اور تلوار کی نوک اُس میں گاڑ کر ٹیک گ[...] پھر میں اسفندیار کی طرف پلٹا اور میں نے اپنا سر خم کر دیا۔

درباریوں پر سکوت طاری تھا۔

اسفندیار نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا: "تم نے اپنے آپ کو شاہی سورما بننے کا اہل ثابت کر دیا ہے سرفروش۔"

شاہ کی یہ بات سنتے ہی درباری مجھے مبارک باد دینے لگے [...] شہنائی پھر سے بجنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد جب محافظ مجھے میری نئی قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے تو میں نے دروازے سے گزرتے ہوئے لیلیٰ اور فرح کی طرف دیکھا۔ مجھے اُن دونوں کی آنکھوں میں اُمید کی جوت جلتی دکھائی دی۔ [...] چاہا کہ میں فرح سے بات کروں لیکن موقع ایسا تھا کہ مجھے دل پر جبر [...] آگے بڑھ جانا پڑا۔

★★

شاہی سورما کا حلف اُٹھاتے ہی سب سے پہلے میں نے شا[ہ] سے اپنے ساتھیوں کو معاف کرنے کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ [...] اُنھیں گودی میں کام پر لگا دیا گیا۔

مجھے سلطان سے کھل کر بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھ[ا]۔ میں نے اُسے یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ گودی میں کام کرنے والے لو[گوں] پر کڑی نظر رکھے اور یہ معلوم کرے کہ شیرکوہ کے وفادار کون کون ہیں [اور] مخالف کون سے ہیں... پھر ہو سکے تو وہ شیرکوہ کے مخالفوں کو اپنا بنالے اور اُن کی تنظیم میں مصروف ہو جائے۔

شاہی سورما کی حیثیت سے مجھے کام کم اور اپنی نمائش زیادہ [کرنی] پڑتی تھی۔ میں اس پرندے کی مانند تھا جسے سونے کے پنجرے میں [ڈال] دیا گیا ہو تاہم مجھے اپنے اور لیلیٰ کے منصوبے کے اعتبار سے آزادا[نہ] پھرنے کے مواقع حاصل تھے۔ میں نے برقوں میں جو باتیں سنی تھیں [ان] کی تائید و تصدیق ہو گئی۔ شیرکوہ نئے سال میں اپنے ارادے کو عملی ش[کل] دینے والا تھا۔

فرح اب تک شیرکوہ کے قبضے میں تھی اور وہ اُسے کسی وق[ت] اپنی جاگیر پر بھیج سکتا تھا۔ کئی ہفتوں کی کوشش کے باوجود اس تک [نہیں] پہنچ سکا تھا۔ میں اسے جلد از جلد شیرکوہ کے قبضے سے نکالنا چاہت[ا تھا] تاکہ اگر شیرکوہ پر غلبہ حاصل کر لیا جائے تو اُس کے آدمی فرح کو یرغمال [بنا کر] کوئی سودے بازی نہ کر سکیں لیکن اب تک کوئی ایسی صورت [نہیں] نکل سکی تھی۔

سلطان نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ایسے لوگوں کی ایک [فہرس]ت تیار کر لی تھی جو شیرکوہ کے خلاف تھے۔ میں ہر دوسرے تیسرے [دن ش]ام کے وقت غریبوں کے محلے میں واقع ایک مے خانے میں اس [سے مل]ا کرتا تھا۔ یہاں جاسوسی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ایک شام جب میں سلطان سے ملنے کے بعد محل جانے کے [لیے گھو]ڑے پر سوار ہوا تو ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ بادلوں کے باعث [شہر] اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اپنی عبا اوڑھ لی اور تلوار کو نیام [سے ن]کال لیا تاکہ بوقتِ ضرورت بلا تاخیر اپنا دفاع کر سکوں۔

میں بمشکل ایک یا ڈیڑھ میل ہی گیا ہوں گا کہ اچانک گلی سے [ایک] لبادہ پوش نکلا اور میری طرف لپکا۔ میں نے فوراً اپنی تلوار بلند کر لی۔

"گھوڑے سے اُترو اور میرے ساتھ چلو، سرفروش۔" وہ بول پڑا۔

یہ آواز سنتے ہی میرا ہاتھ وہیں کا وہیں رُک گیا۔ لبادہ پوش کوئی مرد [نہیں] بلکہ لیلیٰ تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی بہت ہی اہم بات ہو گی جو لیلیٰ [اس غ]لیظ علاقے میں آئی ہے۔

میں نے گھوڑے سے اُتر کر اُسے ہانک دیا اور خود لیلیٰ کے ساتھ [چل]ا جو مجھے ایک اندھیری گلی میں نیچی چھت والے ایک سائبان میں [لے گئ]ی۔ یہاں چار آدمی ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے سامنے بیٹھے تھے۔ [انھو]ں نے کالک لگا کر اپنے چہرے سیاہ کر رکھے تھے۔

"یہ میرے محافظ ہیں۔" لیلیٰ نے انکشاف کیا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"بتاتی ہوں۔ کیا تمھارے گودی والے دوست تیار ہیں؟"

"ہاں..." میں نے جواب دیا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔ "شیرکوہ کل سے اپنے منصوبے پر عمل [کر]نے والا ہے۔ اس کے آدمی گودی میں آگ لگا کر بحریہ کی رسد اور کچھ [جہاز]وں کو تباہ کر دیں گے۔ اس ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے وہ عسکری [دستے] طلب کرے گا جو دراصل محل کو گھیرے میں لے لیں گے اور شاہ [اسفن]دیار کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ قزاقوں کی آمد تک اُسے نشہ آور دواؤں [کے ذ]ریعے کٹھ پتلی بنا کر کام لیا جاتا رہے گا۔ شیرکوہ فرح کو آج رات ہی [یہاں] سے کہیں مضافات میں بھیج رہا ہے۔"

اس پر میرا خون کھول اُٹھا مگر میں نے فرح کے بارے میں پوچھنے [کے] بجائے سوال کیا: "کیا تم جانتی ہو کہ گودی میں ہنگامہ اور آتش زنی کون [ک]ریں گے؟"

لیلیٰ نے اثبات میں سر ہلایا اور کئی افسروں کے نام بتا دیے جو پہلے [ہی] سے سلطان کی فہرست میں موجود تھے۔

میں نے جلدی سے سلطان کے نام ایک رقعہ لکھ کر لیلیٰ کو دیتے ہوئے کہا: "اسے اپنے کسی محافظ کے ذریعے فوراً سلطان کو بھجوا دو جو غالباً ابھی تک ملاحوں کے مے خانے میں بیٹھا ہو گا۔ گودی کے معاملات سے وہ بخوبی نمٹ لے گا۔"

لیلیٰ نے وہ رقعہ اپنے ایک محافظ کو دے کر بھیج دیا... پھر بولی: "اب وقت آگیا ہے کہ ہم فوراً شاہ اسفندیار کو حقائق سے آگاہ کر دیں۔ میں ثبوت کے طور پر شیرکوہ کی تحریروں کے علاوہ وہ تحریریں بھی ساتھ لیتی آئی ہوں جو تم برقوں سے لائے تھے۔"

"تمھیں شیرکوہ کی تحریریں کیسے مل گئیں۔ وہ تو اُنھیں بڑی حفاظت سے رکھتا ہو گا۔"

"ہاں... وہ بہت محفوظ مقام پر تھیں۔ اس کا ایک معتمدِ خاص جو مجھ پر نظر رکھتا ہے، ان کا محافظ تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کچھ وقت گزارا، مشروب میں بے ہوشی کی دوا پلائی اور اُس کی تجوری سے وہ دستاویزی ثبوت حاصل کر لیے۔ اب اگر ہم اسفندیار کو ان ثبوتوں کی مدد سے قائل کر لیں تو باقی سارا کام آسانی سے ہو جائے گا۔ درباریوں میں سے بہت کم لوگ شیرکوہ کے دوست ہیں اور تم اُنھیں بخوبی سنبھال لو گے۔ شاہی محافظ، شاہ کے وفادار ہیں۔ اگر اُنھیں خبردار کر دیا جائے تو وہ اُس وقت تک محل کو شیرکوہ کے ساتھیوں سے بچائے رکھیں گے جب تک کہ وفادار عسکری دستے وہاں نہ پہنچ جائیں لیکن بہتر ہو گا کہ اب مزید وقت باتوں میں برباد نہ کیا جائے۔ ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔"

گھوڑے تیار تھے اس لیے ہم فوراً ہی چل پڑے۔

محل کے پہرے دار مجھے شاہی سورما کی حیثیت سے پہچانتے تھے اس لیے کسی نے بھی مجھے شاہ کے ذاتی محل میں داخل ہونے سے نہ روکا۔

لیلیٰ بھی میرے ساتھ تھی۔

ہم نیم روشن پیچ در پیچ راستوں اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے محل کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں اسفندیار کی خواب گاہ تھی۔

خواب گاہ کے بیرونی حصے میں بھی روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ چھت سے آویزاں ایک قندیل کی مدھم روشنی میں مجھے چار محافظ پہرہ دیتے نظر آئے۔

میں سیدھا اُن کی طرف بڑھ گیا۔

یہ محافظ شاہی دستے سے منتخب کیے جاتے تھے اور اُن پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اُن میں سے کچھ افسر میرے ذاتی دوست ضرور تھے مگر اس وقت اُن میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ البتہ اُن میں سے ایک سالار بہزاد نے مجھے پہچان لیا۔

"کہو سرفروش! اس وقت کیسے آنا ہوا اور یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ وزیرِ اعلیٰ کی بیگم اور اُن کے ملازمین ہیں۔ ہمیں شاہِ معظم سے بے حد اہم بات کرنی ہے۔"

بہزاد نے تعجب سے لیلیٰ کی طرف دیکھا اور بولا: "جو بات کرنی ہے، مجھے بتا دو۔ مَیں صبح سب سے پہلے شہنشاہ کے گوش گزار کر دوں گا۔"

"نہیں بہزاد... وہ باتیں ہم تمھیں نہیں بتا سکتے اور وہ اسی وقت شہنشاہ کے گوش گزار کرنا ضروری ہیں۔"

بہزاد کوئی جواب دیے بغیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا، شاید وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کیا واقعی کوئی اہم بات ہو سکتی ہے جس کے لیے شہنشاہ کو نیند سے بیدار کیا جائے۔

"اچھی بات ہے، مَیں شہنشاہ کو تمھاری آمد سے آگاہ کرتا ہوں۔" یہ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اگر تمھیں اپنے شہنشاہ سے محبت ہے تو دیر مت کرو۔"

یہ سُن کر اُس نے مشعل اُٹھائی اور شہنشاہ کی خواب گاہ کا زینہ چڑھنے لگا۔

مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہُوا کہ شاہ کی حفاظت کے لیے صرف چار محافظ متعین کیے گئے ہیں جنھیں شیرکوہ کے آدمی چٹکی بجاتے میں ختم کر سکتے تھے۔ مَیں نے بے ساختہ پلٹ کر راہداری کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ آ تو نہیں رہے... مگر راہداری خالی تھی۔

مَیں مطمئن ہو کر بہزاد کی طرف دیکھنے لگا جو اُوپر پہنچ کر دستک دے رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد دروازہ کُھلا اور وہ اندر چلا گیا۔

ہمیں بہزاد اور شاہ کی گفتگو، بھنبھناہٹ کی طرح سُنائی دینے لگی۔

بہزاد نے واپس آ کر بتایا کہ صرف مَیں اور لیلیٰ ہی شاہ سے مل سکتے ہیں لیکن مجھے اپنے ہتھیار محافظوں کے حوالے کر دینا ہوں گے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی لیلیٰ نے ہامی بھر لی اور مجھے اپنی تلوار بہزاد کے حوالے کرنا پڑ گئی جو میرے نکتۂ نظر سے ایک غلطی تھی۔

مَیں اور لیلیٰ، شاہ کی خواب گاہ میں داخل ہُوئے تو وہ اپنی کشادہ مسہری پر بیٹھا ہُوا تھا اور اُس کی تلوار اُس کے زانو پر رکھی تھی نیند سے بیدار ہونے کے باعث اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری جانب دیکھا تو مَیں نے لیلیٰ کو اشارہ کیا کہ وہ شاہ کو حقائق سے آگاہ کرے کیوں کہ شاہی ادب و آداب وہ مجھ سے بہتر جانتی تھی۔

لیلیٰ نے بات یوں شروع کی...

"جہاں پناہ! آپ کے برادرِ محترم نے آپ کو بالکل صحیح بتایا تھا کہ میرا شوہر شیرکوہ قزاقوں کے ساتھ مل کر آپ سے غدّاری کرنا چاہتا ہے۔"

اس تمہید پر شاہ کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اس کی باتیں غور سے سُننے لگا۔

لیلیٰ نے اُسے شیرکوہ کی سازش کی تفصیل بتاتے ہُوئے بات جاری رکھی: "مَیں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے، اس کے دستاویزی ثبوت بھی ساتھ لائی ہوں۔ یہ ملاحظہ فرما لیجیے۔" یہ کہتے ہُوئے اس نے وہ تمام کاغذات شاہ کے حوالے کر دیے۔

شاہ نے وہ کاغذات ایک طرف رکھتے ہوئے کہا: "اگر یہ تمام باتیں سچی ہیں تو تم نے اپنے شوہر کی گردن اُڑا دینے کا خود بھی بندوبست کر دیا ہے، خاتون!"

لیلیٰ نے بڑی خوب صورت اداکاری کرتے ہُوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی: "مَیں جانتی ہوں عالم پناہ! لیکن میں شوہر کو وطن کی محبت پر ترجیح نہیں دے سکتی۔"

عین اسی وقت سیڑھیوں پر کئی آدمیوں کے چڑھنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ ایک دھماکے سے کُھلا اور ایک شخص شدید زخمی حالت میں اندر آیا۔ لیلیٰ ایک چیخ مار کر اس کی طرف لپکی لیکن وہ شخص اس کے بازوؤں کا سہارا ملنے سے پہلے ہی فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ کُھلے دروازے کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور ہونٹ بے آواز حرکت کر رہے تھے۔

مَیں نے پریشانی کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھا۔

دروازے کا خلا کسی ایسے فریم کی طرح خالی تھا جس سے تصویر نکال لی گئی ہو۔ میں دوبارہ اُس زخمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُس کے متحرک لبوں سے اَب مدھم آواز نکلنے لگی تھی۔

لیلیٰ اس کی طرف جُھک گئی۔

مَیں نے بھی اُس کے لبوں سے کان لگا دیا۔

"وہ... وہ آ رہے ہیں!" زخمی کہہ رہا تھا: "شہنشاہ کی زندگی... خطرے میں ہے۔"

اتنا سُنتے ہی مَیں نے لپک کر اُس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور زینے کی طرف لپکا۔

چار آدمی تلواریں سُونتے تیزی سے اُوپر آ رہے تھے۔ اگلے دو آدمیوں نے میرے سینے اور پیٹ میں تلواریں گھونپنا چاہیں مگر مَیں بائیں جانب ہٹتے ہُوئے ایک پاؤں پر گھوما اور دوسرے پاؤں سے آگے والے کو زوردار ٹھوکر رسید کی تو وہ لُڑھکتا ہُوا سیڑھیوں سے نیچے جا گرا...

ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مَیں نے اُس کی گردن پر جوڈو کا وار کیا۔

اُس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی جسے مَیں نے ہَوا میں ہی اُچک لیا اور دو آدمیوں کی طرف متوجہ ہُوا جو اُن کے پیچھے آ رہے تھے۔

اُن دو سے نمٹنا تو میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن اب زینے پر بہزاد اور لیلیٰ کے دو ملازموں کے لیے مزید آٹھ دس آدمیوں کو روکنا مشکل ہو گیا تھا۔

مَیں چار چار سیڑھیاں ایک ساتھ اُترتا ہُوا نیچے آیا اور پھر مجھ پر حملہ شروع ہو گیا۔

حملہ آور بھی اچھے تیغ زن تھے۔

مَیں نے تلوار کے ساتھ ساتھ اپنی ٹانگوں سے بھی کام لینا شروع کیا اور چار آدمی تہ تیغ کر ڈالے۔

اسی دوران حملہ آوروں میں سے ایک نے میز اُلٹ دی جس کی وجہ سے لیلیٰ کے دونوں محافظ گر پڑے اور مارے گئے۔

اَب مَیں اور بہزاد چھ آدمیوں سے مقابلہ کر رہے تھے لیکن یہ مقابلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔

تین حملہ آور مارے گئے اور تین بُری طرح زخمی ہو کر گر پڑے۔

باہر سے بہت سے آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں آئیں اور پھر محافظ دستے کے سپاہی تلواریں سونتے اندر آ گئے۔

وہ صورتِ حال سے بے خبر تھے۔ اس لیے میری طرف لپکے لیکن بہزاد نے بیچ میں آ کر انھیں روک دیا ورنہ وہ میری بوٹیاں اُڑا دیتے۔

عین اُسی وقت خواب گاہ کا دروازہ کُھلا اور شاہ اسفندیار کے ساتھ لیلیٰ نمودار ہُوئی۔

لیلیٰ نے لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ملاحظہ فرمایئے جہاں پناہ... یہ اُن لوگوں کی لاشیں ہیں جو حضور کا چراغِ زندگی گُل کرنے آئے تھے۔ کیا اَب بھی آپ کو میری باتوں پر یقین کرنے میں تامّل ہے؟"

"نہیں خاتون! تمھاری باتیں بڑی حد تک درست ہیں۔ اَب ہمیں شیرکوہ سے بات کرنا ہی پڑے گی۔"

"بشرطیکہ وہ آپ کو مل جائے۔" لیلیٰ نے کہا: "میرا خیال ہے وہ اب تک شمال کے عسکری پڑاؤ میں پہنچ چُکا ہو گا جس کے دستے وہ آپ کی گرفتاری کے بعد یہاں لانا چاہتا تھا۔"

"ہُوں..." شاہ نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا: "اَب ہم وہ کاغذات دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ شیرکوہ کے ساتھ پُورا پُورا انصاف کر سکیں۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اپنی خواب گاہ میں واپس چلا گیا۔

مَیں نے سالار بہزاد کی طرف پلٹ کر کہا: "کیا تم اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ شیرکوہ کی قیام گاہ پر جا سکتے ہو، سالار! وہ خود تو وہاں نہیں ہو گا لیکن شاید اُس کے چند گُرگے وہاں موجود ہوں۔"

بہزاد نے حفاظتی دستے میں سے بارہ مضبوط آدمی منتخب کیے اور وہاں سے چل دیا۔ اگرچہ مجھے عسکری دستوں کو حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں کسی نے بھی ایک لفظ نہ کہا اور میرے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کرنے لگے۔

مَیں نے وفادار عسکری کمان داروں اور بندرگاہ کی انتظامیہ کو پیغامات بھیجے اور محل کے محافظوں کو خبردار کیا کہ اَب شیرکوہ کے آدمی محل میں قدم نہ رکھنے پائیں۔

جوں جوں متعلقہ افسروں کو اطلاع ملتی گئی، وہ میرے پاس آتے اور ہدایات لیتے رہے۔ وہ لوگ میرے احکام کو شاہی احکام سمجھ رہے تھے۔ لیلیٰ میرے ساتھ کھڑی مسرور انداز میں یہ کارروائی دیکھتی رہی۔

پو پھٹے جب لاشیں وہاں سے ہٹا دی گئیں تو شاہ اسفندیار کی خواب گاہ کا دروازہ کُھلا اور وہ باوقار انداز سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گیا۔

اُس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سُرخ تھیں اور اُس نے بغل میں وہ کاغذ دبا رکھے تھے جو لیلیٰ نے اُسے دیے تھے۔ شاید وہ اَب تک انھی کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔

"تم نے ہمارے اور وطن کے لیے شان دار خدمات انجام دی ہیں خاتون!" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا: "تمھارا کارنامہ بھی قابلِ داد ہے، سرفروش! گزشتہ تین صدیوں میں کسی شاہی سُورما نے شاہی خاندان کے لیے ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔"

اتنے میں ایک محافظ اندر آیا جس کے پیچھے پیچھے بارہ ملّاح تھے، انھوں نے دو بڑے بڑے صندوق اُٹھا رکھے تھے۔ ان ملّاحوں میں سُلطان بھی شامل تھا۔

وہ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بولا: "مجھے تمھارا پیغام وقت پر مل گیا تھا، سرفروش!" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کی نگاہ شاہ پر جا پڑی۔ اُس نے سرخم کرتے ہُوئے کہا: "عالم پناہ... گودی کے افسروں میں کچھ غدار بھی شامل تھے، انھیں ملاحظہ فرما لیجیے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ملّاحوں کو اشارہ کیا۔

ملّاحوں نے صندوق فرش پر رکھ کر ان کے ڈھکنے کھول دیے۔ شاہ بُری طرح چونک گیا۔

لیلیٰ کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

مجھے اُبکائی آ گئی۔

دونوں صندوقوں میں بہت سے کٹے ہُوئے سر موجود تھے۔

لیلیٰ نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہُوئے شاہ سے کہا: "بہت جلد

حضور اپنے مزید دشمنوں کو بھی اسی حالت میں ملاحظہ فرمائیں گے، جہاں پناہ!"

"ہم اپنی وفادار سپاہ کی کمان تمھارے سپرد کرتے ہیں سرفروش! تم جو مناسب سمجھو، کرو۔" یہ کہہ کر وہ پھر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

مَیں نے فوراً گھر گھر تلاشی لینے اور ہتھیار ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔

"اس ہنگامے کا ذمّے دار شیرکوہ ہے۔ اگر اُسے ختم کر دیا جائے تو یہ ہنگامہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ وہ شمال کے عسکری پڑاؤ میں ہو گا۔ اس سے پہلے کہ اس پڑاؤ کے دستے شہر کا رُخ کریں، منتخب افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا مگر پُوری طرح مسلح دستہ شمالی پڑاؤ میں پہنچ کر شیرکوہ کو ختم کر دے یا گرفتار کر لے۔" میں نے لیلیٰ سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس دستے کی کمان تم خود سنبھالو گے؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"ہاں... اس دستے کی کمان میں خود سنبھالوں گا۔" میں لیلیٰ کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ یہ اقدام فرح کی وجہ سے کر رہا ہُوں۔

کچھ دیر بعد مَیں پچاس جنگجو سپاہیوں کے ساتھ اُسی مشرقی دروازے سے باہر جا رہا تھا جس سے کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک قیدی کی حیثیت سے لایا گیا تھا۔

دن کی روشنی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی اس لیے شہر سے نکلتے ہی ہم نے گھوڑے دوڑا دیئے اور ایک گھنٹے میں پڑاؤ کے قریب پہنچ گئے۔

ہم نے اپنے گھوڑے ایک ایسی جگہ روک دیئے جہاں سے وہ پڑاؤ کے پہرے داروں کو دکھائی نہ دے سکیں جو صدر دروازے پر موجود تھے۔

یہ پڑاؤ دو سو گز چوڑا اور تین سو گز لمبا تھا جس کے اِردگرد آٹھ فٹ اونچی کچی دیوار بنی ہُوئی تھی۔ پڑاؤ کے وسط میں صرف ایک پختہ عمارت تھی جب کہ اس کے اطراف ... نصب تھے۔

طے شُدہ منصو... کے مطابق مجھے، بہزاد اور سلطان کو رسّیوں سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ ہم جب چاہیں، ایک جھٹکے سے انھیں کھول سکتے تھے... پھر بہزاد کے ایک نائب نے کمان سنبھال لی اور سب کے سب قہقہے لگاتے اور شور مچاتے ہوئے پڑاؤ کی جانب چل دیئے۔

میرا، بہزاد کا اور سلطان کا مُنہ ڈھانپ دیا گیا تھا اسی لیے مَیں منزل کے فاصلے کا تعیّن صرف آوازوں سے ہی کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد محافظوں کی آواز آئی۔

"ٹھہر جاؤ... کون ہو تم لوگ؟"

"ہم کچھ قیدی لائے ہیں جنھیں وزیرِ اعلا دیکھنا پسند فرمائیں گے۔" بہزاد کے نائب نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔

میرا دل شدّت سے دھڑک اُٹھا تھا۔

"مگر وزیرِ اعلا اس وقت سو رہے ہیں۔" محافظ کچھ دیر بعد بولا۔

مَیں نے اطمینان کی ایک سانس لی کہ شیرکوہ وہاں موجود تھا۔

"میرا خیال ہے، وہ ان قیدیوں کو دیکھنے کے لیے اپنے جگائے جا... کا بُرا نہیں منائیں گے۔ قیدیوں کے چہروں سے کپڑے ہٹا دو۔" بہزاد کے... نے کہا۔

ہمارے چہروں سے کپڑے ہٹا دیے گئے۔

مَیں نے دیکھا کہ ہم بہت سے محافظوں اور ایسے سپاہیوں پر... ہُوئے ہیں جو مکمل لباس میں نہیں تھے۔ غالباً وہ سب کے سب ہمار... سپاہیوں کا شور سُن کر مشعلیں اُٹھائے تماشا دیکھنے آ گئے تھے۔

"وزیرِ اعلا قیدیوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ تم سے بات بھی کرنا... گے۔ اس لیے گھوڑوں سے اُتر جاؤ اور انھیں ہمارے گھوڑوں کے ساتھ... دو۔" محافظوں کے کمان دار نے کہا۔

"شکریہ کمان دار۔" بہزاد کے نائب نے جواب دیا۔ "مگر ہمیں یہ... زیادہ دیر نہیں رُکنا کیوں کہ ہمارا پڑاؤ قریب ہی ہے اور ہمیں شہر سے... ہونے والوں پر نظر رکھنی ہے اور تم تو جانتے ہی ہو کہ ایسے موقعوں پر اچھ... مالِ غنیمت مِل جاتا ہے لہٰذا گھوڑے کھولنے کی ضرورت نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

چھ آدمی ہم تینوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ باقی پڑاؤ کے درو... پر ہی کھڑے رہے۔

کمان دار ہمیں پختہ عمارت کے پاس رُکنے کا اشارہ کر کے ا... گیا۔ چند لمحے بعد شیرکوہ آنکھیں ملتا ہُوا باہر آ گیا اور جُونہی اس کی نظر... پڑی، وہ خوش ہو گیا۔

"یہ بھی اچھا ہُوا کہ یہ لوگ تمھیں یہاں لے آئے، قزاق۔ مجھے... ہے کہ تم فرح کو اور فرح تمھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہو گی۔"

شیرکوہ کی اس بات سے پتہ چل گیا کہ فرح بھی اسی پڑاؤ میں ہے۔ مَیں نے جھٹکے سے رسّی کھولی اور گھوڑے کی زین سے شیرکوہ... چھلانگ لگا دی۔ اگرچہ وہ لحیم شحیم آدمی تھا مگر میرے دھکّے سے گر... اس سے پہلے کہ وہ اپنا خنجر نکالتا، مَیں نے اُسے بالوں سے پکڑ کر اس... فرش سے ٹکرانا شروع کر دیا۔

چند ہی لمحوں میں شیرکوہ کی مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ بے... ہو گیا۔

پہلے تو محافظ یہ نظارا دیکھ کر گُم صُم سے رہ گئے مگر جلد ہ... کر انھوں نے میری طرف بڑھنا چاہا تو ہمارے چھ ساتھیوں نے تل... سونت کر اُن کا راستہ روک لیا۔

بہزاد نے اپنے گھوڑے سے کمان دار کے گھوڑے پر جست... اور اُسے گرا دیا۔ مَیں نے اور دلاور نے بے ہوش شیرکوہ کو کمان دار کے... پر ڈال کر انھی رسّیوں سے جکڑ دیا جن سے ہمیں دِکھاوے کے لیے باندھ کر یہاں لایا گیا تھا۔

اتنے میں چھ سواروں کے علاوہ ہمارے باقی سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے اور انھوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا۔

مَیں نے شیرکوہ کو ہلایا جُلایا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

"فرح کہاں ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

مَیں نے ایک مشعل اُٹھا کر اُس کے چہرے کے قریب کی تو وہ بول پڑا۔ "وہ... اندر... پچھلے کمرے میں ہے۔"

مَیں مشعل پھینک کر اندر جانے لگا تو ایک سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کی گردن اُڑا دی اور پہلے کمرے میں داخل ہو گیا۔

دوسرے کمرے کا دروازہ مقفل تھا۔ مَیں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پوری طاقت سے اپنا کندھا دروازے پر مارا تو وہ ٹوٹ گیا۔

فرح، فرش پر بے سُدھ پڑی تھی۔ اس کا لباس دریدہ اور حالت غیر تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس پر تشدّد کیا گیا ہو۔ مَیں نے اُسے جگانا چاہا مگر پتہ چلا کہ اُسے کوئی نشہ آور مشروب پلا دیا گیا ہے۔

مَیں نے اُسے اُٹھایا اور باہر لا کر اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار کرتے ہُوئے کہا۔ "واپس چلو!"

سلطان نے شیرکوہ والے گھوڑے کی راس تھام رکھی تھی۔ ہم واپس جانے لگے تو کچھ سپاہیوں نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر ہمارے ساتھی انھیں روندتے اور کاٹتے ہُوئے آگے بڑھ گئے۔

پڑاؤ سے نکلتے ہی ہم نے گھوڑوں کو پُوری رفتار سے دوڑا دیا تاکہ جتنا زیادہ ہو سکے، تعاقب کرنے والوں سے دُور نکل جائیں۔ اگر شمالی پڑاؤ کے سپاہیوں نے ہمارا تعاقب کیا بھی ہو گا تو وہ ہم تک نہیں پہنچ پائے اور ہم شہر میں داخل ہو گئے۔

شہر میں وفادار دستے گشت کر رہے تھے۔ ایک دستے نے ہمارا راستہ روکنا چاہا مگر مجھے اور بہزاد کو پہچان کر وہ سامنے سے ہٹ گیا... جب ہم محل پہنچے تو شاہ اسفندیار، لیلیٰ کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔

ہم شیرکوہ کو نرغے میں لیے، شاہ کے حضور پیش ہُوئے تو وہ ناشتہ چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس وقت وہ بے حد تازہ دَم لگ رہا تھا۔ اُس نے شیرکوہ سے کہا...

"ہمیں تم سے یہ توقع نہیں تھی شیرکوہ... تمھیں اپنے کیے کی سخت ترین سزا ملے گی۔"

"مجھے اپنی سزا کی پروا نہیں ہے۔" شیرکوہ غرّایا۔ "لیکن میرے مرنے کے بعد آپ اور یہ ذلیل عورت بھی زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گی!"

یہ کہتے ہُوئے اُس نے دائیں جانب والے سپاہی کے پیٹ میں ایک ہاتھ سے مُکا مارا اور دوسرے سے اُس کی تلوار چھین کر شاہ کی طرف لپکا۔

شاہ جلدی سے ہٹ گیا لیکن لیلیٰ نہ ہٹ سکی۔ شیرکوہ نے تلوار اُس کے سینے میں گھونپ دی۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ مَیں دخل نہ دے سکا۔ جُونہی مجھے صورتِ حال کا اندازہ ہُوا، مَیں نے طیش میں اُسے اُٹھا کر بالکونی سے نیچے پھینک دیا اور وہ تقریباً سو ہاتھ اُونچائی سے گرنے کے بعد گوشت کے لوتھڑوں میں تبدیل ہو گیا۔

میں لیلیٰ کی طرف بڑھا اور بولا۔ "مَیں احمق تھا کہ مَیں نے اُسے..."

لیلیٰ نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش کر دیا۔ "وہ... وہ دِل برداشتہ... ہو کر... سب کر سکتا تھا... تمھارا... اس میں... کوئی قصور نہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک ہچکی لی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

شاہ اسفندیار نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر لیلیٰ کی طرف نم آنکھوں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔ "اسے شاہی اعزاز کے ساتھ ایک ملکہ کی طرح، ملکہ ہی کے پہلو میں دفن کیا جائے گا۔ اس نے وہی کچھ کیا ہے جو اِن حالات میں ایک ملکہ کرتی!"

... پھر وہ بالکونی کی طرف بڑھا اور شہر پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ وہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے جو اُس نے اور تم نے شروع کیا تھا۔"

اگلے تین روز میرا اور شاہ اسفندیار کا بیشتر وقت جنگی جمعیت کے اجلاسوں میں گزرا۔ شیرکوہ نے شاہ پر قاتلانہ حملہ اس وقت ہی کروایا ہوگا جب وہ قزاقوں کو بُلا چکا ہوگا اور وہ پہنچنے والے ہوں گے۔ چنانچہ غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ مملکت کو قزاقوں کی تاخت و تاراج سے کیسے بچایا جائے؟ ایک تازہ ترین اطلاع کے مطابق قزاق چار سو جنگی جہازوں اور کشتیوں پر مشتمل بیڑا لے کر برقون سے روانہ ہو چکے تھے اور وہ دو تین ہفتوں کے اندر فارش پہنچ سکتے تھے۔ اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ دیگر تین مملکتوں سے دفاعی معاہدے کیے جاتے۔ چھ سو میل لمبے ساحلی علاقے کی حفاظت کے لیے اگر فوج پھیلا دی جاتی تو دفاع کے اعتبار سے یہ بہت بڑی غلطی ہوتی، اگر قزاق اس علاقے میں کسی ایک مقام پر حملہ کرتے تو سپاہ کو یکجا کر کے وہاں تک لانے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ کر بہت سے شہروں کو لُوٹ چکے ہوتے اور بکھری ہوئی سپاہ کے دستوں کو بھی تباہ کر ڈالتے۔

ان تمام حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے تجویز پیش کی کہ کسی طرح قزاقوں کو کسی ایسے علاقے میں ساحل پر آنے کے لیے مجبور کر دیا جائے جہاں ہماری بحری اور بری سپاہ خاصی تعداد میں موجود ہو... مگر قزاقوں کو اس کی موجودگی کا علم نہ ہو۔ اس طرح ہماری سپاہ انھیں بڑی آسانی سے ہمیشہ کے لیے تہس نہس کر دے گی۔

میری اس تجویز پر ایک نوجوان کمان دار نے بتایا کہ راج دھانی کے شمال میں ایک بڑا دریا ہے جس کے کنارے، گھنے جنگل واقع ہیں، اگر ہمارے جہاز سمندر سے اُس دریا میں چلے جائیں تو قزاق انھیں نہیں دیکھ سکیں گے اور جنگل میں چھپی ہوئی سپاہ کا بھی انھیں پتہ نہیں چلے گا۔

"تمھاری تجویز تو معقول ہے کمان دار۔" میں نے کہا۔ "لیکن بوقتِ ضرورت دریا سے ہمارے کتنے جہاز ایک ساتھ سمندر میں آسکیں گے؟"

"موجودہ صورت میں تو وہ ایک ایک یا دو دو کر کے نکل سکتے ہیں لیکن اگر ہم مزید راستے بنا لیں تو حسبِ ضرورت، جہازوں کو اندر اور باہر لایا جا سکے گا۔ راستے بنانا کوئی مشکل کام نہیں کیوں کہ ہماری سپاہ بڑی آسانی سے ریت ہٹا کر دریا کی شاخوں کو جہاز رانی کے قابل بنا سکتی ہے۔"

شاہ داتی جماعت کے عہدے داروں نے یہ تجویز قابلِ عمل قرار دیتے ہوئے منظور کر لی لیکن اَب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ قزاقوں کو اس طرف جانے کے لیے کیسے مجبور کیا جائے؟

"اگر یہ مشہور کر دیا جائے کہ شاہی خزانہ اور عوام کی دولت شمال کے کسی شہر منتقل کر دی گئی ہے تو قزاق اُدھر کا رُخ کر سکتے ہیں اور اُن پر عقب سے حملہ بھی کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر شیرکوہ زندہ ہوتا تو ہم اُس سے یہ جھوٹ بول دیتے اور وہ اُسے سچ سمجھ کر قزاقوں کو آگاہ کر دیتا۔" شاہ اسفندیار نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اَب تو یہی ہو سکتا ہے کہ شیرکوہ کی طرف سے یہ پیغام قزاقوں تک پہنچا دیا جائے۔"

"میں آپ سے اختلاف کی جسارت پر معافی چاہتا ہوں... عالی جاہ!" میں نے کہا۔ "شیرکوہ کی موت کی خبر عام ہو چکی ہے جو قزاقوں تک ضرور پہنچے گی لہٰذا وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ ان کے ساتھ چال چلی جا رہی ہے۔ انھیں شمال میں تمام خزانے کے منتقل ہونے کا یقین اس صورت میں دلایا جا سکتا ہے کہ میں ایک کشتی میں خود ہی اُن سے جا ملوں۔"

"تم اُن کے پاس جاؤ گے، سرفروش؟" شاہ نے تعجب سے پُوچھا۔ "وہ تمھیں قتل کر دیں گے کیوں کہ تم نے اُن سے غدّاری کی ہے۔"

"وہ بے شک ایسا کر سکتے ہیں جہاں پناہ... مگر میں انھیں یہ یقین دِلانے کی کوشش کروں گا کہ محض جاسوسی کے لیے غدّاری کی تھی جو دراصل قزاق برادری کی خدمت ہے اور اس کے ثبوت میں، میں جھوٹے کاغذات اور نقشے لے جاؤں گا۔ مجھے پوری توقع ہے کہ وہ دھوکے میں آجائیں گے۔"

"لیکن ہم تمھاری زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے، سرفروش۔" شاہ اسفندیار بولا۔

"موت تو ایک نہ ایک دن آنی ہی ہے، جہاں پناہ۔ اگر میری موت سے بہت سی جانیں اور فارش تباہ ہونے سے بچ جائے تو وہ موت نہیں بلکہ میری زندگی ہوگی۔"

یہ میرا جواب تھا۔

▼

جنگی مجلس نے یہ منصوبہ منظور کر لیا۔ بحریہ کے جہاز، شمال کی طرف جانے لگے۔ فوجیں بھی اُدھر منتقل ہونے لگیں اور شہریوں کے ہتھیار انھیں واپس کر دیے گئے۔ چونکہ شہر کے گرد مضبوط فصیل موجود تھی، اس لیے وہاں زیادہ سپاہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ مشہور کرنے کے ساتھ ساتھ کہ خزانہ شمال کے ایک شہر تاران میں منتقل کیا جا رہا ہے، شہریوں کو خبردار کر دیا گیا کہ بوقتِ ضرورت انھیں بھی دفاعی جنگ لڑنا پڑے گی اس لیے وہ بھی جوش و خروش کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔

میں ہر صبح فرح کے ساتھ شہر کے سب سے اُونچے بُرج پر جاتا اور سمندر کی طرف دیکھتا رہتا۔ مجھے قزاقوں کے بیڑے کا انتظار تھا کہ وہ

آتا دِکھائی دے تو میں ایک کشتی میں اُس سے جا ملوں۔ فرح اس وقت کے تصوّر سے مغموم ہو جاتی تھی اور بعض اوقات تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی جھلملانے لگتے تھے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی اور اس نے میرے دل پر لگا ہُوا لالہ رُخ کی جُدائی کا زخم بھر دیا تھا۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچتا تھا کہ اَب کبھی اپنے دور اور اپنی سرزمین پر واپس نہ جاؤں اور باقی زندگی فرح کی چاہت کی چھاؤں میں بسر کر دوں لیکن مستقل طور پر یہاں رہنا بھی میرے بس کی بات نہیں تھی اور قزاقوں کو دھوکا دینے کے لیے اُن کے پاس جانا بھی ضروری تھا جو مجھے موت کے گھاٹ اُتار سکتے تھے۔

... اور پھر ایک روز یہ اطلاع بھی مل گئی کہ قزاقوں کا بیڑا صرف ایک روز کی مسافت پر رہ گیا ہے۔ آنے والی رات میرے اور فرح کے لیے جُدائیاں سمیٹ لائی۔ فرح روتی رہی اور میں اُسے جھُوٹی تسلیاں دیتا رہا۔ فرح سے پہلے بھی میری زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی تھیں لیکن کوئی بھی لالہ رُخ کی نعم البدل ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ انھیں جسم کی پُکار نے میری طرف بڑھنے پر مجبور کیا تھا لیکن فرح نے لالہ رُخ کی طرح رُوح کی گہرائیوں سے مجھے چاہا تھا۔ مجھے بھی اُس کے رُوپ میں اپنی گم گشتہ محبت مل گئی تھی لیکن حالات بڑی تیزی سے ہمارے درمیان جُدائی کی فصل اُگا رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے مقدّر میں زندہ لوٹ آنا لکھا ہے یا نہیں اس لیے میں رات بھر نہ سو سکا اور پو پھٹتے ہی گودی کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان، جسے شاہ اسفندیار نے کمان دار بنا دیا تھا، اپنی کشتی 'صاعقہ' پر میری راہ دیکھ رہا تھا۔

صبحِ کاذب کی روشنی پھیلنے سے پہلے 'صاعقہ' اپنے سفید اور نیلے بادبان پھیلائے سمندر کی آغوش میں آ چکی تھی۔

دوپہر کے وقت ہمیں قزاقوں کا بیڑا دکھائی دے گیا۔ کچھ دیر بعد اُفق پر اُن کے جہازوں اور کشتیوں کے بادبانوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے سلطان کو صُلح کا سفید جھنڈا بلند کرنے کے ساتھ ساتھ قزاقوں کا پرچم بھی مستول کے اُوپر باندھنے کا حُکم دیا اور خود ہتھیار بند ہونے کے لیے نیچے کیبن میں چلا گیا۔

جب میں تیار ہو کر دوبارہ عرشے پر آیا تو دیکھا کہ قزاقوں کی دو کشتیاں قطار سے الگ ہو کر ہماری کشتی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ مجھے یہ پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ اُن میں سے ایک شہلا کی 'بحری چڑیل' ہے۔ سلطان نے اپنے آدمیوں کو بھی مسلح ہونے کا حُکم دے دیا کیوں کہ بقول اُس کے شہلا ایسی عورت ہے جو انتقام یا مالِ غنیمت کے لالچ میں اندھی ہو جاتی ہے اور تب وہ قزاق برادری کے قوانین کی بھی پروا

نہیں کرتی۔

چند لمحے بعد جب بحری چڑیل اور قریب آگئی تو میں نے دیکھا کہ شہلا اُس کے عرشے پر کسی بُت کی مانند ساکت کھڑی ہے۔ اس کا عملہ بھی اُس کے پیچھے منجمد سا کھڑا تھا۔ وہ سب ہتھیار بند تھے۔ شہلا مجھے پہچان کر چلّائی۔ "کہو سرفروش! غدّاری سے تمھیں کیا حاصل ہُوا؟"

"تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں نے غدّاری کی ہے؟"

"تم نے شیرکوہ اور اس کے آدمیوں کو چُن چُن کر موت کے گھاٹ اُتارا پھر بھی یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ تم نے قزاق برادری سے غدّاری نہیں کی۔ شیرکوہ ہمیں مملکتِ فارش، کسی بھُنی ہوئی مرغی کی طرح طشتری میں سجا کر دینے والا تھا... مگر تم نے اُسے قتل کر دیا غدّار۔"

میں نے دیکھا کہ اُس کے عملے نے تلواروں کے دستوں پر ہاتھ رکھ لیے ہیں اور تیر اندازوں نے تیر چلّوں پر چڑھا لیے ہیں مگر میں اُن کی طرف توجہ دیے بغیر شہلا سے مخاطب ہُوا۔ "شیرکوہ جس طرح فارش سے غدّاری کر رہا تھا، اُسی طرح قزاق برادری سے بھی غدّاری کا مرتکب ہو رہا تھا۔ قزاق برادری اُس کی وجہ سے تباہ ہو جاتی۔"

یہ سُن کر شہلا تعجب سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ "شیرکوہ، قزاق برادری کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر فارش پر حکمرانی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ قزاق برادری سے اپنے دُشمنوں کا قلع قمع کرانے کے بعد خود قزاقوں پر ٹوٹ پڑتا اور پھر فارش کا نجات دہندہ بن کر حکومت کرتا۔ میرے پاس ان حقائق کا دستاویزی ثبوت ہے۔" میں شہلا کے تاثرات سے تو کوئی اندازہ نہ لگا سکا لیکن اُس کے آدمیوں نے کوئی جنبش یا کوئی حرکت نہیں کی اور خاموش کھڑے رہے پھر شہلا نے بھی انھیں اشارہ کر دیا کہ وہ حملہ نہ کریں۔

"تم نے صلح کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔ اس لیے کمان داروں کی

انجمن سے مذاکرات لازمی ہوگئے ہیں۔ ورنہ میں، تم سب سمیت کے پرخچے اُڑا دیتی۔ اپنی کشتی، میری کشتی کے پیچھے پیچھے لے آؤ۔"

ہماری کشتی 'بحری چڑیل' کے پیچھے چلنے لگی جب کہ دو کشتیوں نے دائیں بائیں سے ہمیں نرغے میں لے لیا۔ ہم تقریباً آدھ گھنٹے تک قزاقوں کی کشتیوں کی قطار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ میں اُن میں سے بہت سی کشتیوں اور ملاحوں کے بارے میں جانتا تھا۔ وہ لوگ ہماری طرف بڑے تعجب سے دیکھتے رہے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہماری کشتی پر قزاقوں کے پرچم کے ساتھ ساتھ سفید جھنڈا کیوں لہرا رہا ہے۔

اَب تک ہم ہراول دستے کی کشتیوں کے پاس سے گزرتے رہے تھے۔ اس دستے کے بعد جنگی ...ن کا بیڑا تھا جو تاحدِ نگاہ پھیلا ہُوا تھا۔

شہلا کی کشتی ایک بہت بڑے جہاز کے پاس رُک گئی جس پر کمان داروں کی انجمن کا سبز و سفید پرچم لہرا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے عرشے پر مسلح قزاق، ملاحوں کے ساتھ ساتھ انجمن کے پُورے ارکان بھی جنگی وردی میں ملبوس کھڑے ہیں۔

جہاز سے رسّے کی سیڑھیاں نیچے پھینک دی گئیں۔ میں اور شہلا اُوپر چلے گئے۔ اَب پتہ چلا کہ کپتانوں کے ساتھ اُوپر سے جھانکنے والے ملاح نہیں بلکہ کرائے کے سپاہی تھے۔ اَب میں شہلا کے تاثرات بھی پڑھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے بدگمانی، نفرت اور غصّے کا اظہار ہو رہا تھا۔ میرے لیے اس کے سینے پر سجا کمان داروں کی انجمن کا نشان بھی تعجب خیز تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اُس انجمن کی رُکن بن چُکی تھی اور یقیناً اس کی رائے وزن بھی رکھتی ہوگی۔

انجمن کے صدر نے رسمی کارروائی کے بعد شہلا سے کہا کہ وہ مجھ پر فردِ جُرم عاید کرے۔

شہلا نے نفرت سے میری طرف دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولنے لگی: "برادر کمان دارو! جانتے ہیں کہ یہ ایک کمان دار اور اس کے دو نائبوں کو قتل کر کے برقون سے فرار ہوگیا تھا۔ اس نے شیرکوہ اور اُس کے خاص آدمیوں کو چُن چُن کر قتل کیا ہے اور اس طرح قزاق برادری سے غدّاری کا مرتکب ہُوا ہے جس کی سزا اذیت ناک موت ہے۔"

اَب مجھے اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیا گیا۔

"یہ دُرست ہے کہ میں ایک کمان دار اور اُس کے دو نائبوں کو قتل کر کے برقون سے فرار ہُوا تھا لیکن یہ سب کچھ میں نے اپنے دفاع میں کیا تھا کیوں کہ وہ لوگ میرے مکان پر مجھے قتل کرنے آئے تھے اور حملے میں پہل انھوں نے ہی کی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرا فرار کا فیصلہ غلط تھا اور مجھے برادری کے سامنے پیش ہوکر انصاف کا طالب ہونا چاہیے تھا لیکن مجھ پر غدّاری کا الزام سراسر غلط ہے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو فارش پہنچنے پر قزاق ہونے کے جُرم میں قید کر دیا گیا تھا۔ اگر ہم غدّار ہوتے تو ہمارا استقبال کیا جاتا، ہمیں زندان میں نہ ڈالا جاتا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو قید و بند سے نجات دِلانے کے لیے شاہی سُورما کا مقابلہ کیا اور جب ہمیں آزادی مل گئی تو پتہ چلا کہ شیرکوہ صرف اسفندیار سے ہی نہیں بلکہ قزاق برادری سے بھی غدّاری کر رہا ہے۔ وہ دُہری چال چل رہا تھا تاکہ اسفندیار کی فوج سے قزاقوں کو ٹکرا کر دونوں کو تباہ کر دے اور خود مزے سے حکومت کر سکے۔ چنانچہ میں نے قزاق برادری کے مفاد میں اُسے شکست دی اور قزاقوں کو اُس کی چال کا شکار ہونے سے بچا لیا۔"

"تمھارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟" صدر نے سوال کیا۔

"ہاں..." میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"پھر اُسے انجمن کے سامنے پیش کرو۔"

اس سے پہلے کہ میں جعلی کاغذات پیش کرتا، شہلا نے مجھ سے کہا: "یاد رکھو سرفروش۔ اگر کوئی بات جھُوٹی نکلی تو تمھارے پرخچے اُڑا دیئے جائیں گے۔"

"مجھے جھُوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے شہلا۔ میں اَب بھی قزاق برادری کا ایک فرد ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم خود جھُوٹ بول کر بہت کچھ چھپا رہی ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ کتنے کمان دار ناگ دیویوں کی حکومت سنبھال کرنے کے لیے تمھارا ساتھ دیں گے، تو میں دیتا۔"

شہلا یہ سُن کر بوکھلا گئی۔

میرا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔

"شہلا مجھے غدّار سمجھتی ہے۔ اگر میں غدّار ہوتا تو بہت بڑا شاہی عہدہ چھوڑ کر آپ لوگوں کے پاس کیوں آتا، وہ دستاویز اور نقشے کیوں لاتا جن کی مدد سے خزانہ لُوٹا جا سکتا ہے۔" میں نے کمانداروں سے کہا۔

میری اس دلیل کا ان پر خاصہ اچھا اثر پڑا لیکن انھوں نے تقریباً دو گھنٹے تک جرح جاری رکھی اور مجھ سے حالات پوچھتے رہے۔ میں جانتا تھا کہ راج دھانی میں ہونے والے سارے واقعات سے وہ بخوبی آگاہ ہوں گے اس لیے میں انھیں صاف صاف بتاتا رہا کہ راج دھانی میں کیا ہو رہا ہے۔ بحریہ کے جہاز کس سمت گئے ہیں، اور خزانہ کہاں منتقل کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ میں نے انھیں یہ

...بتایا کہ بحریہ بے حد کمزور ہے۔ کمان داروں نے شاہ کو صاف صاف ...یا تھا کہ وہ قزاقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہ ہوگا کہ وہ اپنے جہاز ...ں چھپا لیں اور جب قزاق لُوٹ مار کر کے چلے جائیں تو وہ جہاز ...ں نے آئیں اس طرح کم از کم جہاز تو قزاقوں کی تاخت و تاراج ...بچ جائیں گے۔"

میری اس بات پر قزاقوں نے قہقہہ لگایا۔

"کتنا خزانہ تاران منتقل کیا گیا ہے؟" صدر نے پوچھا۔

"میں یقین سے نہیں بتا سکتا، البتہ سُننے میں آیا تھا کہ سونے ...بیس کروڑ سکّے بھیجے گئے ہیں۔ جن گاڑیوں میں خزانہ بھیجا گیا تھا، ...کا قافلہ ڈھائی تین میل لمبا تھا اور متعدد لشکری دستے اُس کی ...ظت کر رہے تھے۔" حقیقت یہ تھی کہ ان گاڑیوں میں سامانِ رسد ...جا گیا تھا مگر حفاظتی اقدامات اس طرح کیے گئے تھے جیسے خزانہ ...جا جا رہا ہو۔

"ہُوں..." ایک اعلا کمان دار بولا: "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ...ود یہ خزانہ ہمارے حوالے کرنا چاہتے ہوں اور اگر یہ سارا خزانہ ہمارے ...ہ لگ جائے تو..."

"ہمیں نہ تو ان کے جہاز جلانے کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی ...ج سے مقابلہ کرنے کی۔" صدر نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا: "خزانہ ...کے بعد شاہ اتنا مفلوج ہو جائے گا کہ ہم آیندہ سال زیادہ نفری ...ساتھ آکر بڑی آسانی سے اُس کا خاتمہ بالخیر کر سکیں گے۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں۔" شہلا بولی: "وہ خزانہ شمال کی طرف کس ...ام پر بھیجا گیا ہے؟"

"جہاں تک میری معلومات کا تعلّق ہے، وہ اُسے کسی ایک ...م یا شہر میں نہیں رکھیں گے۔ میں نے ایک نقشہ چُرایا ہے جس میں ...علاقہ دِکھایا گیا ہے جہاں خزانہ منتقل کیا گیا ہے مگر اس علاقے میں ...شہر واقع ہیں۔"

"وہ نقشہ کہاں ہے؟"

"میری کشتی میں۔" میں نے جواب دیا۔

کچھ آدمی نقشہ لینے کے لیے میری کشتی پر چلے گئے اور کچھ اشیائے ...رد و نوش لے آئے۔ انجمن کے اعلا کمان دار نے مجھے بھی کھانے ...میں شریک کر لیا۔ اس دوران وہ سب نقشہ بھی دیکھتے رہے۔ جب ...کھانا ختم ہوگیا تو کمان دارِ اعلا نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔

"قزاق برادری کے قانون کے مطابق اَب اس مسئلے پر رائے ...شماری ہو جانی چاہیے کہ ہم منتقل شدہ خزانہ حاصل کرنے کے لیے ...شمال حصّے میں جائیں یا نہ جائیں۔"

رائے شماری میں اُنیس کمان داروں نے شمال کی طرف جانے اور چھ نے نہ جانے کا فیصلہ دیا۔ جب اکثریت کا فیصلہ منظور کر لیا گیا تو میری جان میں جان آئی۔

ابھی میں پُوری طرح اطمینان کی سانس بھی نہ لے پایا تھا کہ شہلا بول اُٹھی: "برادر کمان دارو! تم نے اس شخص کی اطلاعات پر بھروسا کرتے ہُوئے شمال میں جانے کا فیصلہ تو کر لیا ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ شخص ہمارے ساتھ غدّاری کرتے ہُوئے پھر شاہ اسفندیار سے نہیں جا ملے گا؟ اس لیے یہ فیصلہ ابھی ہو جانا چاہیے کہ سرفروش کس کی نگرانی میں رہے گا۔"

"کیا تم اس کی نگرانی کی ذمّے داری قبول کرنے کو تیار ہو...؟" کمان دارِ اعلا نے پوچھا۔

"ہاں... میں تیار ہُوں۔" شہلا نے جواب دیا۔

بہت سے کمان دار بے ساختہ ہنس پڑے اور شہلا کے چہرے پر غم و غصّے کی پرچھائیاں تیر گئیں۔

کچھ دیر بعد جب میں جہاز کے عرشے پر آیا تو چار مسلح سپاہی میرے دائیں بائیں آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ بارہ لشکری اور کچھ ملاح رسّی کی سیڑھی سے اُتر کر میری کشتی میں جا رہے ہیں۔ اب گویا میں اور میری کشتی، شہلا کی تحویل میں تھے۔

میں غصّے کے مارے کھول اُٹھا لیکن بہتری اسی میں تھی کہ خاموش رہوں۔ میرا مقصد پُورا ہو چکا تھا۔ قزاقوں کا بیڑا اَب شمال کی طرف جا رہا تھا۔

میں جانے کے لیے پلٹا تو دیکھا کہ شہلا میرے سامنے کھڑی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھتے رہے۔

"کمان دار تو وہ سونا بانٹنے میں مصروف ہیں جس کا میرے خیال میں کوئی وجود ہی نہیں ہے لیکن شہلا خوش آئند خیالوں سے بہلنے

والی عورت نہیں ہے، سرفروش! تم بار بار مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ اگر اس بار بھی تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمھارے حق میں بہت بُرا ہوگا۔ اگر میں مر بھی گئی تو میرے ساتھی تمھیں نہیں بخشیں گے۔" یہ کہتے ہُوئے شہلا نے سمندر کے پانی پر نظر ڈالی۔

میں نے اُس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو میری ہڈیوں میں خوف کی لہر اُترتی چلی گئی۔ اس وقت بھی جہاز کے ساتھ ساتھ ویسی ہی لکیریں اُبھر رہی تھیں جیسی میں ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا... وہی سمندری مخلوق اَب بھی شہلا کی ہم سفر تھی جس نے فردزاں کا خزانہ لُوٹنے کے لیے اس کی رہنمائی کی تھی۔

▼ ▼

ساتویں روز ہمیں وہ سرسبز پہاڑیاں دِکھائی دے گئیں جو اس دریا کے دہانے کے عقب میں واقع تھیں جس کے ذریعے فارش کی بحریہ کا بیڑا اندر، دریا میں جا کر چھُپا ہُوا تھا۔ نقشے کے مطابق اس کے بعد کے علاقے میں شاہی خزانہ منتقل کیا گیا تھا۔

قزاقوں کے بیڑے نے دریا کے دہانے سے گزرنے کے بعد لنگر ڈال دیئے اور جو کشتیاں ساحل تک جا سکتی تھیں، کنارے جا لگیں۔ آٹھویں روز تیس ہزار قزاق ساحل پر اُتار دیئے گئے۔

مجھے پرچم بردار جہاز پر پابند کر دیا گیا اور ہماری کشتی اُسی جہاز کے ساتھ باندھ دی گئی۔

نویں دِن جب میں صبح ناشتے کے انتظار میں عرشے پر ٹہلتا ہُوا سوچ رہا تھا کہ فارش کے جو جہاز عقب سے حملہ کرنے والے تھے، وہ ابھی تک دریا کے دہانے سے برآمد کیوں نہیں ہُوئے؟ کیا فارش کے کمان دار قزاقوں کا بیڑا دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں ابھی سوچوں میں گھِرا ہُوا تھا کہ مجھے شہلا کی 'بحری چڑیل' قریب سے گزرتی دکھائی دی۔ شہلا نے ہاتھ لہرا کر پرچم کو سلام کیا اور مجھے دیکھ کر رُخ پھیر لیا۔

مجھے ایک لمحے کے لیے پھر اُسی سمندری مخلوق کا خیال آ گیا، جسے شہلا اپنے ساتھی کہتی تھی مگر میں یہ خیال ذہن سے جھٹک کر پھر اُنھی سوچوں میں ڈوب گیا کہ آخر فارش کی فوجیں کس بات کا انتظار کر رہی ہیں؟ تیس ہزار قزاق ساحل پر اُتر کر چار حصّوں میں تقسیم ہونے کے بعد چار مختلف مقامات کی طرف بڑھ گئے تھے مگر ابھی تک کہیں سے بھی یہ اطلاع نہیں آئی تھی کہ اُن کا فارش کی فوج سے تصادم ہُوا ہے، البتہ کہیں کہیں سے بلند ہونے والے دھوئیں کی لکیریں یہ بتا رہی تھیں کہ قزاقوں نے وہاں سے گزرتے ہُوئے، بستیوں کو آگ لگا دی ہے۔

اتنے میں ایک ملّاح میرا ناشتہ لے آیا۔

میں وہیں عرشے پر بیٹھ کر وہ بدمزا ناشتہ کرنے لگا۔ میرا نگران سپاہی جنگلے سے لگا آبی پرندوں کا نظارا کر رہا تھا اور سامنے ایک ملّاح رنگ کی بالٹی لیے منجنیق کے پایوں پر رنگ کرنے میں مصروف تھا۔

ناشتہ کرتے ہُوئے اچانک میری نگاہ دریا کے دہانے کی طرف اُٹھی تو مجھے ایک جہاز سے دُھواں اُٹھتا دکھائی دیا جو ساحل کے قریب ہی لنگر انداز تھا... پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو اور جہازوں سے دھواں اور شعلے بلند ہونے لگے۔ اَب مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ فارش کے فوجی دریائی دہانے کے ٹیلوں کی اوٹ سے منجنیقوں کے ذریعے اُن جہازوں پر جلتے ہُوئے تیل کی ہانڈیاں پھینک رہے ہیں۔ اگر مجھے قزاقوں کی قید سے نجات حاصل کرنا تھی تو اس سے بہتر کوئی وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ ذراسی تاخیر میرے اور میری کشتی کے عملے کے لیے موت کا پیغام لا سکتی تھی۔ اس وقت میرے پاس کھانے کی چھُری کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے نگران سپاہی کی طرف دیکھا جو اَب تک جنگلے پر جھُکا ہُوا تھا۔

میں تیزی سے اُس کی طرف لپکا۔ ایک ہاتھ اُس کی تلوار کے دستے پر رکھا اور دوسرے سے اُسے دھکا دے کر سمندر میں پھینک دیا۔ اَب میں سیدھا اُس ملّاح کی طرف بڑھا جو رنگ کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے رنگ کی بالٹی اُٹھائی اور اُسے چمنی میں پھینک دیا جو نیچے باورچی خانے تک جاتی تھی اور جہاں اس وقت باورچی، ناشتہ تیار کر رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں چمنی سے گاڑھے دُھوئیں کے ساتھ شعلے بھی دِکھائی دینے لگے، اتنے میں تین ملّاح تلواریں سونتے میری طرف لپکے لیکن وہ میرے سامنے ٹِک نہ سکے۔ میں نے پہلے ملّاح کا وار لپکے نگران سپاہی کی تلوار سے روک کر اُسے پیچھے آنے والوں پر دھکیل دیا۔ تینوں گرے تو میری تلوار نے انھیں اُٹھنے کا موقع نہیں دیا پھر میں رسّے کے رستے سے پھسلتا ہُوا نیچے اُترا اور اپنی کشتی پر کُود گیا۔

اس وقت چند ملّاح کشتی کے عرشے کو دھو رہے تھے اور دو سپاہی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ میری طرف لپکتے ہُوئے آئے تو میں نے ایک ملّاح سے بالٹی چھین کر آگے آنے والے سپاہی پر دے ماری۔ وہ گرا تو اُس کے ہاتھ سے تلوار چھُوٹ گئی... دوسرے کو میں نے جھجکتے پایا تو اُسے تلوار لہرا کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر لات مار کر گرا دیا۔ پہلے سپاہی کی تلوار، جو اَب سلطان کے ہاتھ میں آ چکی تھی، دوسرے کا کام بھی تمام کر گئی۔

"کشتی کے رسّے کاٹ دو اور اسے ساحل کی طرف لے چلو۔" میں نے سُلطان سے کہا۔

سُلطان وہ رسّے کاٹنے لگا جن سے کشتی بندھی ہُوئی تھی۔ ملّاح نیچے بھاگے تاکہ پتوار چلانے والوں کو خبردار کر سکیں مگر اُوپر آنے والے

ایک سپاہی نے یہ منظر دیکھ کر دوسرے سپاہیوں کو خبردار کر دیا جو نیچے ناشتہ کر رہے تھے۔ میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا اور تلوار اس سپاہی کی پُشت میں گھونپ دی جو اپنے ساتھیوں کو خبردار کر رہا تھا۔ اُس کے ساتھی میری طرف لپکے تو میرے عملے نے اُن پر پیچھے سے چپوؤں کے ذریعے حملہ کر دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھیر ہو گئے اور کشتی ساحل کی طرف چل پڑی۔

میں دوبارہ اُوپر کو دوڑا تاکہ حالات کا جائزہ لے سکوں۔

اَب ساحل کے قریب لنگر انداز قزاقوں کے بہت سے جہازوں میں آگ لگ چکی تھی اور بہت سے جہاز افراتفری میں لنگر اُٹھا رہے تھے۔ اُدھر دریا کے دہانے سے فارش کے بحری جہاز باہر آ رہے تھے۔ ان جہازوں کی منجنیقیں، پتھر اور کھولتے ہُوئے تیل کی ہانڈیاں برسا رہی تھیں۔ ہماری کشتی، ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ شاید قزاق یہ سمجھ رہے تھے کہ پرچم بردار جہاز میں آگ لگ جانے کے باعث ہماری کشتی آزاد کر دی گئی ہے کیوں کہ اب پرچم بردار جہاز سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ سُلطان اُوپر آیا تو میں نے کہا۔ "کشتی جنوبی سمت والے جہازوں کی طرف لے چلو۔ ہم ان جہازوں پر حملہ کریں گے۔"

وہ پھر نیچے چلا گیا۔

شہلا کی 'بحری چڑیل' کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اتنے میں ایک کشتی ہماری طرف بڑھتی دِکھائی دی۔ میں نے سلطان کو بُلایا اور اُسے سمجھا دیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جب وہ کشتی قریب آ گئی تو ہم نے اپنی منجنیق سے اُس پر سیسے کے گولوں کی بوچھار کر دی، جس سے اُس کے متعدد ملّاح ہلاک ہو گئے تب انھیں پتہ چلا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں سُلطان نے ایک جانب کے چپو کشتی کے اندر کھنچوا لیے۔ اب ہماری کشتی دوسری کشتی کے پہلو سے لگی ہُوئی گزری تو اُس کی ایک جانب کے چپو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وہ ہماری کشتی کی ٹکر سے دوسری طرف جھُک گئی۔ ہم نے چکر کاٹ کر دوبارہ اُسے ٹکر ماری تو وہ اُلٹ کر ڈوبنے لگی۔

ایک اور کشتی کے ساتھ بھی ہم نے یہی سلوک کیا اور تیسری کشتی پر، جلتے ہوئے رسّے کا گٹھا، منجنیق کے ذریعے پھینک دیا۔ کشتی نے آگ پکڑ لی اور اُس کا عملہ سمندر میں کُودنے لگا۔

ہم تھوڑی سی دیر میں قزاقوں کی تین کشتیاں تباہ کرنے پر مسرور اور چوکس تھے شکار کی تلاش میں تھے کہ اتنے میں سُلطان چلّا اُٹھا۔ "ہوشیار! 'بحری چڑیل' اِدھر آ رہی ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا، 'بحری چڑیل' جلتے ہُوئے پرچم بردار جہاز کے عقب سے نکل کر بڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ شہلا کشتی کے اگلے حصّے میں بازو پھیلائے کھڑی تھی... پھر یکایک اُس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے تو میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ سطحِ آب سے پانچ سمندری بلاؤں نے سر نکالے اور وہ شہلا کی طرف دیکھنے لگیں۔ شہلا نے ایک ہاتھ سے ہماری کشتی کی جانب اشارہ کیا تو سُرخ انگارہ آنکھوں اور سبز کھپروں والی وہ اژدہا نُما بلائیں ہماری طرف دیکھنے لگیں... پھر اُن کے سر پانی میں ڈوب گئے اور سطحِ آب پر پانچ بڑی بڑی لکیریں اُبھریں، جن کا رُخ ہماری طرف تھا۔

ناگ دیوی شہلا نے سمندر کی گہرائیوں سے اپنے ساتھی بُلا لیے تھے۔

... پھر اُن پانچوں بلاؤں نے اپنے سر پانی سے نکال کر جبڑے کھول لیے۔ یہ نظارا بے حد دہشت ناک تھا لیکن اُسے دیکھ کر میرا خوف جاتا رہا اور میں اُن کا مقابلہ کرنے کی سوچنے لگا لیکن سلطان نے پہل کرتے ہوئے منجنیق کا رُخ اُن کی طرف موڑ کر فاصلے کا اندازہ کیا اور منجنیق چلا دی۔

سیسے کے گولوں کی بوچھار نے اُن پانچ میں سے ایک کو نشانہ بنا دیا۔ اُس کی باہر نکلی ہُوئی گردن کے کھپرے اور گوشت کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ اُس نے بڑے زور کی پھُنکار ماری اور تڑپ کر غرقاب ہوتا چلا گیا۔

ایک اژدہے کی ہلاکت نے عملے کے حوصلے بلند کر دیئے۔ انھوں نے کمانوں میں تیر چڑھائے اور چلّے کھینچ کھینچ کر چلانے لگے۔ تیر اُن بلاؤں کو لگے مگر بے اثر ثابت ہُوئے اور اُچٹ کر پانی میں گر پڑے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے نیزے سنبھال لیے اور اُن کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔

میں نے چلّا کر ہدایت دی: "اُن کی آنکھوں کو نشانہ بنایا جائے اور بحری چڑیل پر منجنیق سے حملہ کر دو۔"

جب اژدہے قریب آئے تو انھوں نے اپنے سر پانی کے اندر کر لیے اور پھر ہمیں یوں محسوس ہُوا جیسے ہماری کشتی اُلٹ جائے گی۔ وہ پانی میں ہماری کشتی کے نیچے سے اُبھرے تھے جس سے ہماری کشتی ایک دم ڈگمگانے لگی اور وہ ایک طرف جھُکی تو ملّاحوں کے قدم بُری طرح اُکھڑ گئے۔

دو ملّاح ریلنگ نہ تھام سکے اور پانی میں گر پڑے۔ دوسرے ہی لمحے دو اژدہوں نے اُنھیں نگل لیا۔

یہ نظارا دیکھ کر ملّاح منجنیق پر یوں چڑھ گئے جیسے بندر کسی درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔ صرف میں اور سُلطان ہی عرشے پر رہ گئے۔ اتنے میں ایک اژدہے نے سر نکالا اور بڑے زور سے منجنیق پر مارا تو منجنیق ٹوٹ

گئی اور اُس کے شہتیر اژدہے کے سر پر گر گئے۔ میں نے لپک کر اپنی تلوار اُس کی ایک آنکھ میں گھونپ دی۔

اژدہا تڑپا، اُس نے بڑے زور سے سسکاری لی اور سر پیچھے کھینچ کر سمندر میں غائب ہو گیا۔

اَب میں نے اور سُلطان نے کلہاڑے اُٹھا لیے۔ اتنے میں ہمیں اپنے پیچھے سے چیخ و پکار سُنائی دی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ تین ہاتھ موٹے اژدہا نے عرشے پر ایک ملاح کو اپنے مُنہ میں لے رکھا تھا اور اُسے نگلنا ہی چاہتا تھا کہ دوسرے ملاح نے مردانہ وار آگے بڑھ کر نیزے سے اژدہے کے سر پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ اژدہے نے پہلے ملاح کو چھوڑ دیا اور اُس ملاح کی طرف متوجہ ہُوا جو دیوانہ وار اُس کے سر پر نیزے سے وار کر رہا تھا۔ اتنے میں میں اور سلطان وہاں پہنچ گئے اور ہم نے کلہاڑوں سے اُس کے سر پر پے در پے وار کرنا شروع کر دیئے۔ اژدہے کے سر سے بدبودار گاڑھا گاڑھا خون نکلنے لگا۔ خدا جانے وہ کتنا لمبا تھا کہ اپنے وزن سے لڑھکتا ہُوا پانی میں گم ہو گیا۔

اس وقت تک میرے دو ملاح ہلاک اور ایک زخمی ہو چکا تھا۔ جب کہ شہلا کے تین ساتھی... یعنی تین اژدہے ہلاک ہو چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اَب وہ باقی دو کو واپس بُلا لے گی... مگر شاید اس پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے دُور سے اپنے ہاتھ بُلند کیے اور پھر ایک دَم گرا دیے۔ چند لمحے بعد دو اژدہے پانی سے سَر اُٹھائے ہماری طرف بڑھے اور اپنے سر بھاری کشتی کے عرشے پر مارنے لگے۔ وہ اتنے بھاری تھے کہ کشتی اُن کے وزن سے پانی میں بیٹھنے لگی اور سطحِ آب سے صرف چند ہاتھ اُونچی رہ گئی۔ اُن کی ہر ضرب سے تختے چر چرا اُٹھتے تھے اور یُوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ٹُوٹ جائیں گے۔

مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ عرشے پر اَب صرف مَیں اور سلطان ہی باقی رہ گئے ہیں۔ باقی سارا عملہ سمندر میں کُود کر جان بچانے کے لیے ساحل کی طرف جا رہا تھا۔

"اژدہے آدمیوں پر غالباً اسی وقت حملہ کرتے ہیں، جب وہ شہلا کی نگاہ میں ہوں۔ اگر ہم شہلا کو دکھائی نہ دیں تو وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے۔" مَیں نے سُلطان سے کہا۔

"مگر اس وقت تو یہ بدبخت کشتی ڈبونے کی فکر میں ہیں۔" وہ بولا۔ "آؤ انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک اژدہے کی طرف لپکا اور اس پر وار کرنے لگا۔

مَیں دُوسرے اژدہے پر ٹوٹ پڑا۔ ہمارے کلہاڑوں کی ضربوں سے وہ کشتی پر سر پٹخنا بھُول گئے اور اس طرح مچلے کہ اُن کے جسموں کی ٹکر سے مَیں اور سُلطان اُچھل کر پانی میں جا گرے۔

اب اژدہے بڑی آسانی سے ہمیں نگل سکتے تھے لیکن اس خیال کے تحت کہ شاید شہلا کی نظروں سے اوجھل ہونے پر وہ میری طرف متوجہ نہ ہوں، مَیں پانی کے اندر ہی اندر تیرتا چلا گیا۔ جب میرا دَم ٹوٹنے لگا تو مَیں اُبھرا اور پانی سے سَر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں ساحل کی طرف جانے کی بجائے متضاد سمت نکل آیا تھا۔ اژدہے اَب تک کشتی پر سر پٹخ رہے تھے جو اَب ڈُوبنے ہی والی تھی۔ سلطان مجھے کہیں بھی نظر نہ آیا تو مَیں بحریۂ فارش کی اُس کشتی کی طرف بڑھ گیا جس پر قزاقوں اور بحریہ کے جوانوں کے درمیان جنگ جاری تھی۔

جب میں سُکان کا رسّہ پکڑ کر کشتی پر پہنچا تو پتہ چلا کہ اُس کشتی کی دُوسری جانب قزاقوں کی ایک کشتی موجود ہے جس سے قزاق اُس کشتی پر کُود رہے ہیں۔ بحریۂ فارش کی کشتی کے بہت سے ملاح مارے جا چکے تھے اور اُن کی لاشیں عرشے پر بکھری ہُوئی تھیں۔ مَیں نے ایک مُردہ ملاح کی تلوار اُٹھائی اور قزاقوں پر ٹوٹ پڑا۔

جب مجھ پر جنگی جنوں طاری ہو جاتا ہے تو مجھے اپنا ہوش نہیں رہتا۔ اس جنگی جنوں میں مَیں نے قزاقوں کی اُس ٹولی پر حملہ کر دیا جو اس کشتی پر کشت و خون میں مصروف تھی۔

میرے ہاتھ پاؤں مشینی انداز میں چلنے لگے۔ میری ٹانگیں قزاقوں کو ٹھوکریں مار رہی تھیں اور تلوار اُن کی گردنیں اُڑا رہی تھی۔ اس حالتِ جنوں میں مجھے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ مجھ پر عقب سے حملہ نہیں ہو سکتا کیونکہ میری پُشت پر بحریہ کے جوان ہیں جن کے حوصلے میرے وہاں پہنچنے پر بُلند ہو گئے تھے۔

کچھ قزاق مجھے پہچان کر دوبارہ اپنی کشتی پر جانے لگے۔ اُن کا تعاقب کرتے ہُوئے مجھے شہلا دکھائی دے گئی جو دُوسری کشتی پر کھڑی تھی۔ اَب مجھے احساس ہُوا کہ دُوسری کشتی 'بحری چڑیل' ہے۔

شہلا پر نگاہ پڑتے ہی میرے خُون میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ مَیں اندھا دُھند 'بحری چڑیل' پر کُود گیا۔ قزاقوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مَیں لٹو کی طرح گھُوم کر اُن کے پرخچے اُڑانے لگا۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد شہلا تک پہنچ جاؤں۔

شہلا نے جب اپنے ساتھیوں کو گاجر مُولی کی طرح کٹتے اور پسپا ہوتے دیکھا تو اُس نے اپنا خنجر میری طرف پھینکا۔ اگر مَیں ایک جانب ہٹنے میں ذرا سی بھی دیر کرتا تو وہ خنجر میرا بازو چھیدنے کے بجائے میرے سینے میں پیوست ہو گیا ہوتا۔

شہلا کی اِس حرکت نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ مَیں دھاڑتا ہُوا آگے بڑھا اور مزاحمت کرنے والے تین قزاقوں میں سے

پیٹ میں لات ماری، دُوسرے کے نرغرے میں تلوار گھونپی ...ی گردن پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا... مگر جب راستہ صاف ...نے کشتی سے چھلانگ لگا دی اور سمندر میں کُود گئی۔ مَیں نے ...نے آنے والے مزید دو قزاقوں کا صفایا کیا اور پھر دوڑتا ہُوا ...کُود گیا۔

شہلا مجھ سے تقریباً بیس ہاتھ آگے تیزی سے تیرتی جا رہی ...یں اس کے خنجر سے، بازو پر لگنے والے زخم کی وجہ سے زیادہ ...نہیں تیر پا رہا تھا۔ سمندر کے نمکین پانی نے مجھے احساس دلایا ...م پر اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے زخم لگ چکے ہیں جن میں شدید ...ہی تھی... مگر میں کسی قیمت پر بھی شہلا کو زندہ نہیں چھوڑنا ...ا اگرچہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ گھٹنے کی بجائے بڑھتا جا ...مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور اس کا تعاقب جاری رکھا۔

شہلا ساحل کی طرف جا رہی تھی اور میری نگاہیں اسی پر جمی ہوئی ...ں اُسے یہ مہلت نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ پھر اُن سمندری بلاؤں ...ے۔ اگر وہ انھیں بلانے میں کامیاب ہو جاتی تو میری موت

...کا یک میں نے دیکھا کہ شہلا نے تیرنا بند کر دیا اور وہ اُتھلے پانی ...ی۔ اُس کا بالائی دھڑ پانی سے اُوپر تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد ...اس نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ ...وں کو طلب کر رہی ہے میں نے اپنی تمام تر قوت سمیٹی اور ...آگے بڑھنے لگا چند لمحے بعد اُس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف ...ے۔ میں جان گیا کہ اس اشارے کے ساتھ ہی سمندری بلائیں ...سطحِ آب سے بلند کر لیے ہوں گے اور اب تیزی سے میری طرف ...۔ اتنے میں میرے پاؤں بھی زمین سے لگ گئے میں ایڑی ...لگا کر آگے بڑھنے لگا۔ جب میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ...ٹ کر دیکھا۔

...اقعی دو اژدہے اپنے ہیبت ناک مُنہ پھاڑے تیزی سے ...آ رہے تھے۔

...یں اندھا دُھند ساحل کی ریت پر بھاگتا چلا گیا لیکن تھوڑی ...ا کر گر پڑا۔ میں نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ اژدہے، شہلا کے ...ں سے سر لگائے ہوئے تھے۔ شہلا نے میری طرف اشارہ کیا ...ے ہوئے پانی سے نکل آئے۔ میں اُٹھا اور دوڑنے لگا۔ میرے ...گڑھے بھی تھے اور ٹیلے بھی... مگر میں انھیں پھلانگتا چلا گیا ...امنے کچھ فاصلے پر ایک خیمہ نصب تھا، میں اس میں گھس گیا ...ے میں تیل کے بہت سے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ میں ان کے

درمیان گھُستا ہُوا وسط میں پہنچا تو مجھے کچھ نیزے رکھے نظر آئے۔ میں نے جلدی سے تین نیزے اُٹھا لیے جو تقریباً دس ہاتھ لمبے تھے۔ اب میں کسی حد تک اژدہوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

میں نیزے لے کر خیمے سے نکل آیا لیکن اژدہے کہیں بھی دکھائی نہ دیے۔ میں ایک ٹیلے کی طرف بڑھا اور اس پر چڑھ کر ساحل کی طرف نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شہلا اُسی طرح کھڑی ہے اور دونوں اژدہے اس کے سامنے کنڈل مارے بیٹھے ہیں شاید وہ اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ میں دِکھائی دوں تو وہ انھیں پھر میرے پیچھے لگائے۔

جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، اُس نے اژدہوں کو اشارہ کیا یہ دیکھتے ہی میں نے ایک نیزہ اُس کی طرف پھینکا مگر نیزہ اس تک نہیں پہنچ سکا اور ریت میں گڑ گیا۔

اب دونوں اژدہے پھر رینگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک اژدہا آگے تھا اور دوسرا پیچھے... اگلے اژدہے نے پھنکارنے کے لیے جیسے ہی مُنہ کھولا، میں نے دوسرا نیزہ اس کی طرف پھینک دیا۔ نیزہ اُس کے جبڑے میں گڑ گیا اور وہ بُری طرح اُچھلنے لگا۔ دوسرا اژدہا شاید زیادہ زخمی تھا اس لیے وہ سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اتنے میں میری نگاہ شہلا کی طرف اُٹھ گئی اور میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ سلطان آہستہ آہستہ پیچھے سے اُس کی طرف بڑھ رہا ہے... اور پھر اس نے اپنا خنجر اُس کی پیٹھ میں اتار دیا۔

شہلا نے ایک دلدوز چیخ ماری اور اژدہوں کو بُلانے کا اشارہ کیا مگر وہ اژدہا جسے میں نے نیزہ مارا تھا تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا تھا جب کہ دوسرا اژدہا پلٹ کر شہلا کی طرف جانے لگا... یہ دیکھ کر میں چلایا "بھاگو سلطان!"

وہ میری آواز پر کاوا کاٹ کر ریت پر دوڑنے لگا۔ شہلا نے اژدہے کو اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھانا چاہا مگر چکرا کر گر پڑی اژدہے نے جو اس کے قریب پہنچ چکا تھا، اُسے ہی نگل لیا... اور پھر سمندر میں اُتر کر نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

میں اطمینان کی سانس لے کر ٹیلے پر بیٹھ گیا۔

سلطان ہانپتا ہُوا آیا اور میرے قریب گر گیا۔ وہ بھی تھکن سے نڈھال تھا جب وہ قدرے دم لے چکا تو بولا "ہماری بحریہ نے تو کمال ہی کر دیا، سرفروش! قزاقوں کے ایک تہائی سے زیادہ جہاز جل چکے ہیں اور باقی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔"

"بحری چڑیل، کا کیا ہُوا؟"

"معلوم نہیں... مگر سچ مچ کی بحری چڑیل، شہلا تو مر ہی چکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھرجھری لی۔ پھر بولا "اگر نگ ملیاں

ایسی ہوتی ہیں تو اچھا ہی ہُوا کہ ان کے مندر مسمار کردیے گئے۔"

اتنے میں نشری باجے کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں اور سلطان کھڑے ہوکر اُن درختوں کی طرف دیکھنے لگے جہاں سے آواز آرہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد درختوں کی اوٹ سے فارس کی فوج کے دستے باہر آنے لگے۔ سب سے اگلے دستے کا کمانڈر بہزاد تھا۔ اُس نے ہمیں دیکھا تو دوڑتا ہُوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

"مبارک ہو، سرفروش۔ ہماری فوج نے قزاقوں کو شکستِ فاش دے دی ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اور یہ سب تمھاری وجہ سے ہُوا ہے۔ شاہ اسفندیار تم سے بے حد خوش ہے۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ تم قزاقوں سے بچ نکلو گے تاہم اس نے کہا تھا کہ اگر تم بچ گئے تو وہ تمھاری شادی اپنی بھتیجی فرح سے کردے گا اور تمھیں اپنا ولی عہد بنائے گا۔"

"نہیں بہزاد۔ مجھے ولی عہد بننا منظور نہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

اب میں اُسے کیا بتاتا اور کیسے بتاتا کہ کمپیوٹر مجھے کسی بھی وقت اپنے دَور اور اپنی سرزمین پر واپس بُلا سکتا ہے میں اُسے یہ کہہ کر ٹال گیا کہ میں صرف جنگجو بنا رہنا زیادہ پسند کرتا ہُوں۔

"شاہ اسفندیار نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم قزاقوں کے ساتھ گرفتار ہوجاؤ تو تمھیں راجدھانی بھیج دیا جائے لہٰذا تم روانگی کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"میں تیار ہُوں بہزاد۔" میں نے جواب دیا کیونکہ میں جلد از جلد فرح سے ملنا، اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔

بہزاد نے فوراً ایک گاڑی کا بندوبست کیا۔ میں اُس میں سوار ہُوا اور تھکن کے مارے لیٹ گیا لیکن میرے ذہن پر فرح کی یادیں چھائی ہوئی تھیں۔ فرح، جس نے میرے دل کا گھاؤ بھر دیا۔ جو لالہ رُخ کے بعد میری محبت کے آسمان پر روشن ستارہ بن کر چمکی تھی۔ میں اس کے ساتھ گزارے اور آنے والے خوش بخت لمحوں کے تصوّر میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکلخت میری کنپٹیاں سنسنا اٹھیں اور میرے سر میں شدید درد ہونے لگا شاید کمپیوٹر میری تلاش میں تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا لالہ رُخ کی طرح میں فرح کی محبت سے بھی محروم رہ جاؤں گا کہ مجھے اپنا جسم پارہ پارہ ہوتا محسوس ہُوا، رگوں کی طنابیں کھنچنے لگیں اور پھر میں تاریک خلاؤں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆

ایک مشہور مقولہ ہے کہ انسان زنجیروں سے جکڑے جاسکتے ہیں ۔ ۔ ۔ لیکن ان کی سوچوں پر پہرے بٹھائے جاسکتے... مگر ڈاکٹر فریدون نے یہ مقولہ غلط ثابت وہ جب چاہتا تھا، میری سوچوں پر پہرہ لگا دیتا تھا... بلکہ زیادہ موزوں ہوگا کہ اس نے میرے دماغ میں کا غذ جیسا ایک کرسٹل لگا کر میری سوچوں پر مستقل چوکی بٹھادی تھی جو کہ ہمارے درمیان رابطے کا کام بھی کرتی تھی۔ میرے دماغ میں کرسٹل نصب کرنے کے لیے اس نے میری کھوپڑی کا آ تھا اور اس آپریشن کے لیے مجھے اپنے سر کے بال منڈوا تھے۔ اس دَور میں جبکہ مرد بھی لڑکیوں کی طرح لمبے بال ہیں، مجھے بِل براشر بننا پڑا تھا۔ اپنے خوبصورت بال کٹو مجھے مطلق احساس نہیں ہُوا تھا کہ بعد میں کوفت اور خو کی ندامت بھی ہوگی۔ یہ احساس تو مجھے اُس وقت ہُوا فریدوں نے اپنے اس کرسٹل والے تجربے کو عملی طور کے لیے مجھے خیابانِ شیراز تک پیدل جانے کی ہدایت

میں خیابانِ شیراز پر ٹہلتا ہُوا جب قصرِ کسریٰ پر مُڑنے لگا تو اچانک مجھے اپنے دماغ میں ٹِک کی سی آواز اُبھرتی سُنائی دی اور میرے قدم قصرِ کسریٰ والی سڑک کے بجائے شاہراہِ پہلوی کی طرف اُٹھنے لگے۔ میں چُپ چاپ چلتا رہا۔ ہر بار ٹِک کی موہوم آواز کے ساتھ میرے قدم اُسی کوئی موڑ مُڑ جاتے۔ ایک بار تو ٹِک ٹِک۔ ٹِک ٹِک کے پُورا ہی گھوم کر پھر اُس راہ پر چل پڑا جس پہ چلا جارہا سب اُسی کرسٹل کا کرشمہ تھا جو اَب اگرچہ میرے دماغ کا جزو بن چکا تھا لیکن براہِ راست ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹر سے منسلک تھا اور اُسی کی زیرِ ہدایت کام کررہا تھا۔

یہ صورتِ حال مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہُوئی۔ چاہتا تھا... مگر دماغ اُس کی نفی کردیتا تھا اور اپنی لیتا تھا۔ دل و دماغ کی اس کش مکش سے مجھے اُلجھن ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ اگر میرا ذہن کمپیوٹر کے تابع وجود کا مقصد ہی کیا رہے گا؟ آدمی فرائض کی بجا آوری کچھ پابندیاں تو برداشت کرسکتا ہے... مگر اپنے ذہن مستقل حکمرانی قبول نہیں کرسکتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ڈ کو صاف صاف بتادوں گا کہ مجھ سے یہ ذہنی غلامی نہیں ہوسکتی۔

میری سوچوں کا کارواں ابھی یہیں تک پہنچا کی آواز کے ساتھ یُوں محسوس ہُوا جیسے میرا ذہن ایک

نے سوچا کہ مجھے کیفے شیراز جانا چاہیے۔ میں اُس راستے رسٹل نے میرے قدم نہیں روکے اِس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر ے کمپیوٹر نے اسے میری سوچوں سے آگاہ کردیا تھا اور میرے ذہن سے کمپیوٹر کی گرفت ہٹالی تھی۔

ڈاکٹر فریدوں نے جس مقصد کے لیے میرے دماغ میں وہ لگایا تھا، اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔ وہ اس بار جب کمپیوٹر مجھے ماضی کے نادیدہ جزیروں میں میرے اور اُس کے درمیان رابطہ قائم رہے۔ کرسٹل نے س خواب کو تعبیر بخش دی تھی۔

جب میں کیفے شیراز میں داخل ہُوا تو وہاں موجود تقریباً سبھی نگاہیں میری طرف اُٹھ گئیں۔ میری جانب دیکھنے والوں لڑکیاں بھی شامل تھیں جن کی نگاہوں میں میرے لیے ے پیغام ہونے چاہئیں تھے... مگر اُن میں تعجب اور تم تھا۔ میں یہ دیکھ کر کھول سا گیا اور آخری میز کی طرف ۔ اتنے میں مجھے کسی لڑکی کی سرگوشی جیسی آواز سُنائی بائیل براشر نہیں ہوتا۔"

نے پلٹ کر دیکھا مگر متعدد میزوں پر لڑکیاں بیٹھی میں سے یہ آوازہ کس نے کسا تھا، یہ تو مجھے معلوم نہ ان کے کھنکتے قہقہے میرے خون میں چنگاریاں سی ے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خواہ مخواہ کی ندامت بھی ئی اور میں قہوہ پینے کی بجائے کیفے شیراز سے باہر

سی۔" میں نے چلا کر ایک ٹیکسی روکی اور سیدھا ڈاکٹر ہ دفتر پہنچ گیا۔

ندو تو کبڑا سائنس داں اُس وقت بڑے خوش گوار ۔ مجھے دیکھتے ہی بولا: "آؤ آؤ سرفروش۔ تم بعینہٖ اُنھی چلتے رہے جو کمپیوٹر نے تمھارے لیے منتخب کیے تھے ندی کو وہ نقشہ دکھا چکا ہوں۔ تم خیابانِ شیراز سے الی سڑک پر مُڑنا چاہتے تھے... مگر میں نے کمپیوٹر تھیں شاہراہِ پہلوی..."

ار رہنے دیجیے ڈاکٹر۔" میں نے غصّے سے اُس کی بات یہ مستقل ذہنی غلامی میرے لیے ناقابلِ برداشت

تمھاری ذہنی کش مکش کا علم ہوگیا تھا برخوردار اسی کمپیوٹر اور کرسٹل کے باہمی رابطے کا سوئچ آف کردیا تھا۔

مگر تم بہت جلد اس کے عادی ہوجاؤ گے اور نئے سفر میں تمھیں اس سے بڑی مدد ملے گی۔"

"مجھے نئے سفر پر کب جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً ایک ماہ بعد۔"

"سنو ڈاکٹر! مجھے آج ہی بھیج دو۔ یا تو میں ابھی اور اسی وقت جاؤں گا یا پھر کبھی نہیں جاؤں گا۔" میں نے باغیانہ لہجے میں اپنا فیصلہ سُنادیا۔

"یہ... یہ تم کہہ رہے ہو سرفروش؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"ہاں۔ یہ میں کہہ رہا ہوں ڈاکٹر۔ اب مجھے زندگی سے پیار نہیں رہا۔ یا تو مجھے آج اور ابھی بھیج دو... یا پھر میری بجائے وہ آدمی جائے گا جسے میرے نعم البدل کے طور پر تربیت دی جارہی ہے۔ مجھے اپنے اس فیصلے کے لیے ہر سزا قبول ہے۔"

"مگر ہُوا کیا ہے سرفروش؟ تم نے ایسا کیوں سوچا؟"

وہ میرے فیصلے پر حیران ہی نہیں پریشان بھی ہوگیا تھا لیکن رضا آفندی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، رضا آفندی بول اُٹھا

"تم سائنس دانوں کے سینوں میں دل نہیں بلکہ پتھر دھڑکتے ہیں ڈاکٹر... سرفروش انسان ہے۔ آخر کب تک موت کے مراحل سے گزرتا رہے گا؟"

ڈاکٹر فریدوں مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

"مُلک و مِلّت کی طرف سے عائد ہونے والی ذمّے داریوں کا مجھے بھی پُورا پُورا احساس ہے ڈاکٹر... لیکن تمھارے یہ تجربات اُن ذمّے داریوں کے لیے کم اور سائنسی ارتقا کے لیے زیادہ ہیں اور پھر سرفروش اُن ذمّے داریوں سے رُوگردانی تو نہیں کررہا۔ یہ تم سے صرف درخواست کررہا ہے کہ اسے فوری طور پر بھیج دیا جائے۔" رضا آفندی نے میری وکالت کی۔

"مگر یہ ناممکن ہے رضا۔"

"کیوں؟" رضا آفندی کی بجائے میں نے پوچھا۔

"اِس لیے کہ ابھی میرا کرسٹل والا تجربہ ادھورا ہے۔ اگرچہ ارتکازِ توجہ سے تمھارے خیالات کمپیوٹر تک اور کمپیوٹر کی ہدایات کرسٹل تک پہنچ سکتی ہیں لیکن ابھی کوڈ فیڈنگ کا بہت سا کام باقی ہے جو میں ایک مہینے میں مکمل کروں گا پھر تمھارے اور میرے درمیان پیغامات کی ترسیل بہت آسان ہوجائے گی اور اگر کبھی تمھیں کوئی خطرہ پیش آگیا تو میں تمھاری رہنمائی اور مدد کرسکوں گا۔"

"خطرہ کب نہیں ہوتا، ڈاکٹر؟ ہر سفر کے دوران مجھے اپنی

بقا کی خاطر جنگ کرنا پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر یہ بھی تو سوچو برخوردار کہ بقا کی اس جنگ میں تمھاری وجاہت ہمیشہ مددگار ثابت ہُوئی ہے۔ کیا یُل براینر کے اس رُوپ میں ماضی کی کوئی شہزادی تمھیں پسند کرسکتی ہے؟ اس لیے اُس وقت تک تو رُک جاؤ جب تک تمھارے سر پہ بال نہیں اُگ آتے..."

ڈاکٹر نے یہ کہہ کر گویا میرے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔

"میں اور میرے بال گئے جہنم میں، اگر مجھے فوری طور پر بھیجتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں جا رہا ہوں۔ اپنی سکیورٹی فورس سے کہہ دو کہ وہ مجھے شُوٹ کر دے۔" یہ کہہ کر میں چل پڑا۔

ڈاکٹر فریدوں کسی کیکڑے کی طرح اُچھلتا ہُوا میرے سامنے آیا اور راستہ روکتے ہُوئے کہنے لگا: "اچھی بات ہے، برخوردار چلو۔"

... اور تقریباً نصف گھنٹے بعد میں کمپیوٹر چیمبر کی کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔

حسبِ معمول دھماکے ہُوئے، میں نے اپنے آپ کو پگھلتے دیکھا اور پھر درد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ کمپیوٹر نے مجھے ماضی کے اندھیروں میں منتقل کر دیا تھا۔

جب میرے حواس درست ہُوئے اور فہم نے کام شروع کیا تو میں نے حسبِ معمول اپنے آپ کو زمین پر پیٹ کے بل لیٹے پایا لیکن میرے نیچے زمین پر گھاس اُگی ہُوئی تھی اور سامنے درخت تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس بار کمپیوٹر نے مجھے ماضی کی انوکھی سرزمین کے کسی جنگل میں منتقل کیا ہے۔

میں نے سر اُٹھا کر اردگرد دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میری گردن میرے سر کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ ہو۔ میں نے ٹھوڑی زمین پر ٹِکا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ میں جنھیں درخت سمجھ رہا تھا، وہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں۔ میں نے سوچا کہ پھر یہ جھاڑیاں مجھے اتنی بڑی کیوں لگ رہی ہیں اور میں اپنا سر کیوں نہیں اُٹھا سکتا؟

میں نے اُٹھنا چاہا تو اُٹھ بھی نہ سکا۔

اچانک میری نگاہ میرے ہاتھوں پر جم گئی۔

مجھے زبردست ذہنی دھچکا پہنچا اور میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔

میں نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ اگر حقیقتاً ایسا ہی تھا تو بھی میں اُس پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے آپ کو یہ یقین دِلا ہی نہیں سکتا تھا کہ میں ایک بالشتیا بن چکا ہُوں۔ لمبے چوڑے بازو اور ہاتھ نوزائیدہ بچوں کی طرح پلپلے اور چھوٹے ہو چکے تھے۔ میرا وجود ایک ٹوٹ بٹوٹ بچے میں بدل گیا تھا۔ میرا سر اتنا ہی بڑا تھا جتنا کہ چھ فٹ سے زیادہ قامت کے آدمی کا ہونا چاہیے۔

شاید کمپیوٹر میرے سالمے دوبارہ یکجا کرنے میں پُوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"اوہ میرے خُدا۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ کمپیوٹر کی غلطی سے میں عجیب الخلقت بن گیا ہوں۔ اگر کوئی مجھے دیکھ لے تو وہ ابھی مجھے ختم کر دے گا۔ میں زندہ کیسے رہوں گا؟ اس ہیئت میں اپنی بقا کی جدوجہد بھی نہیں کر سکتا۔ نوزائیدہ بچہ تو ہمیشہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ کیا میں یہاں بھوک سے بلک بلک کر مر جاؤں گا... اگر میں نوزائیدہ بچے کے جسم اور پُورے مرد کے سر والا نہ ہوتا تو شاید کوئی مجھ پر رحم کرتے ہُوئے اپنا لیتا لیکن موجودہ حال میں تو وہ بھُوت اور چھلاوا سمجھ کر فوراً مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہیں گے... اور نجات کا مطلب میری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ میں کتنا بے بس ہو گیا ہوں کہ کروٹ بھی نہیں لے سکتا۔"

یہ سوچیں مجھے پاگل کیے دے رہی تھیں۔

اس سے پہلے ماضی کے ہر سفر میں، میں اپنا تحفظ کرنے کے قابل ہُوا کرتا تھا لیکن اس بار میرے پاس نہ تو وہ جسم تھا اور نہ پہلے جیسی طاقت تھی۔ البتہ میرا دماغ بالکل صحیح و سلامت تھا اور اس میں نصب کرسٹل بھی کام کر رہا تھا۔

"خُداوندا... میری مدد کر۔" میں نے بآوازِ بلند کہا۔ گویا میں بول سکتا ہوں... لیکن سوال یہ تھا کہ میری قوّتِ گویائی کیا کام آ سکتی ہے؟ اگر میں بولوں، کسی کو آواز دوں اور کوئی میری پُکار پر اِدھر آ بھی جائے تو ایک نوزائیدہ بچے کو بولتے دیکھ کر اُس پر کیا بیتے گی؟ اُس کا ردِّعمل میری موت بھی بن سکتا ہے۔ اپنی بقا کے لیے مجھے کسی نہ کسی کو تو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے بولنے اور آواز دینے کی بجائے بچوں کی طرح رونا اور چلّانا چاہیے۔ اگر مقدر میں ہوگا تو کوئی مجھے بچا لے گا ورنہ تو ویسے بھی ہے۔ یہ سوچ کر میں کسی نوزائیدہ بچے کی طرح آواز بنا کر رونے لگا۔

رونے کے ساتھ ساتھ میں دل ہی دل میں دُعا مانگتا جا رہا تھا کہ خُدا کرے، میرے دماغ میں نصب کرسٹل میری سوچوں کو کمپیوٹر تک پہنچا دے تاکہ ڈاکٹر فریدوں کو صُورتِ حال کا علم ہو سکے اور وہ مجھے واپس بُلا لے۔

میں کچھ وقفے کے بعد رونا بند کر دیتا تھا کیونکہ رونے سے مجھے نقاہت محسوس ہونے لگی تھی۔ اتنے میں مجھے عورتوں کی خوشبو آئی۔ جی ہاں عورتوں کی خوشبو... ماضی کے اندھیرے زمانوں کے ہر سفر نے مجھے نیم وحشی انسانوں کی تھوڑی بہت خصوصیات بخش دی تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اگر میرے آس پاس عورتیں موجود ہوں تو اُن کی آواز یا گفتگو سُنے بغیر ہی مجھے ان کی موجودگی کا احساس ہو جاتا تھا۔ جانوروں کی سی اس حِس نے مجھے بتا دیا تھا کہ اردگرد کہیں نہ کہیں عورتیں موجود ہیں اور چونکہ عورتوں میں ممتا کا جذبہ ہوتا ہے اس لیے میں زور زور سے رونے لگا تاکہ میری آواز اُن تک پہنچ جائے تو شاید کوئی ممتا کی ماری اِدھر آ نکلے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

خاموشی کے وقفے میں مجھے ایک عورت کی آواز سُنائی دی جو کسی سے کہہ رہی تھی: "یہ آواز کیسی تھی طاؤسہ؟"

"شش!" دوسری عورت نے جواب دیا۔ "مجھے تو کسی بچے کے رونے کی آواز معلوم ہُوئی تھی۔"

"بچے کی آواز کیسے ہو سکتی ہے؟" پہلی عورت بولی۔ "تم تو جانتی ہو کہ اس حرم میں بچوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ یقیناً یہ ہَوا کی سرسراہٹ ہوگی۔ آؤ چلیں۔"

یہ سُن کر میں ایک بار پھر زور سے رویا اور اُن کا ردِّعمل جاننے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"یہ بچے ہی کے رونے کی آواز ہے روشنی۔ تم جانتی ہو کہ حرم کی عورتیں اپنا جُرم چھپانے کے لیے بچے جھاڑیوں میں پھینک دیتی ہیں۔" اس آواز میں نرمی اور ملائمت تھی۔ میں اس توقع پر پھر زور زور سے رونے لگا کہ شاید یہ عورت مجھے بچانے پر آمادہ ہو جائے۔

چند لمحے بعد جھاڑیاں ہٹائی گئیں اور دو عورتوں کے چہرے جھانکتے دکھائی دینے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور رونے لگا۔ ایک عورت بولی: "ہاں بچہ ہی ہے۔ چلو بھاگ چلیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا الزام ہمارے سر آ جائے۔"

"نہیں روشنی۔ میں اس معصوم کو مرنے کے لیے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" دوسری نے جواب دیا۔

"... تم اس معصوم کو مرنے کے لیے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں" دوسری نے جواب دیا۔ لہجہ تنبیہہ آمیز تھا۔

"تم نے اس معصوم کو غور سے نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ کسی عفریت کا بچہ لگتا ہے۔ ذرا اس کا سر تو دیکھو؟"

طاؤسہ نے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اسے لُبھانے کے لیے قلقاریاں مارنے لگا۔

اتنے میں دوسری عورت جس کا نام روشنی تھا، بولی: "کسی مصیبت میں پھنسنے سے پہلے ہی یہاں سے چل دو طاؤسہ۔ اگر سُہراب کو پتہ چل گیا تو ہمارے سر قلم کر دیے جائیں گے اس مکروہ عفریت زادے کے لیے کوئی خطرہ مول نہ لو۔"

"تمھیں تو میرے المیے کا علم ہے، روشنی۔" طاؤسہ گلوگیر ہو کر بولی۔ "اُس خبیث کاہن نے میرے بچے کو میرے بطن میں ہی قتل کر ڈالا تھا... میں قانون کے احترام میں خاموش رہی حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے ہونے والے بچے کے قاتل، اُس کاہن کا خون پی جاؤں جو ماؤں کی گود آباد ہونے سے پہلے ہی اُن کی کوکھ اُجاڑ دیتا ہے۔"

"چُپ ہو جاؤ طاؤسہ۔ تمھیں اپنے بچے کے غم نے پاگل کر دیا ہے ورنہ ایسی باتیں کبھی نہ کرتیں۔ میں تمھیں اس عفریت زادے کے لیے جان کا خطرہ مول نہیں لینے دوں گی۔ چلو۔" یہ کہتے ہُوئے روشنی نے طاؤسہ کا بازو تھام لیا... مگر طاؤسہ نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھُڑا لیا۔

"نہیں روشنی۔ میں اسے مرنے نہیں دُوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اسے اُن دیوتاؤں نے میرے لیے بھیجا ہے جن کے بارے میں وہ بڈھا کاہن کچھ بھی نہیں جانتا مگر جن کے نام لے لے کر ہمیشہ ہمیں ڈراتا رہتا ہے۔ اگر میں اسے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ دوں گی تو دُہری لعنتوں کا شکار ہو جاؤں گی۔ میں اسے کہیں چھُپا کر اس کی پرورش کروں گی اور اپنے مقتول بچے کا نعم البدل سمجھوں گی۔ جہاں تک تمھارا تعلق ہے، نہ تو تم نے اسے دیکھا ہے اور نہ ہی کچھ اس کے بارے میں جانتی ہو۔ میرا مطلب سمجھ گئی ہو نا تم؟"

"ہاں سمجھ گئی ہوں۔ مجھے اپنی جان عزیز ہے اس لیے میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم نہ ماری جاؤ۔"

"تم میری فکر نہ کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

روشنی چلی گئی تو میں طاؤسہ کی طرف دیکھ کر مُسکرانے اور ہمکنے لگا تاکہ وہ اپنا ارادہ نہ بدل دے... پھر مجھے اپنی ان بچکانہ حرکتوں پر سچ مچ ہنسی آ گئی جنھیں طاؤسہ نے میری معصومیت پر محمول کیا اور میرے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولی: "ارے واہ میرے مُنّے۔ بول میرے پاس رہے گا؟"

میں نے اسے مزید رجھانے کے لیے غوں غاں شروع کردی۔
اُس نے مجھے اُٹھاتے ہوئے کہا: "ارے گندے اب میں تجھے نہلاؤں گی کہاں؟ خیر، پوتڑوں سے کام چلالوں گی۔ میرا خیال ہے تو بھوکا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری دیکھ بھال اس انداز میں شروع کردی جیسے میں واقعی اس کا بچہ تھا۔

بقا کی یہ کتنی عجیب و غریب صورت تھی۔

میں نے سوچا، اگر میں زندہ رہ گیا اور کبھی کسی کو یہ داستان سُنائی تو وہ مجھے دیوانہ سمجھے گا اور میری کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ آخر میں بچہ بھی بن سکتا تھا۔۔ اگر کرسٹل کے ذریعے ڈاکٹر فریدوں کو اس صُورتِ حال کا علم نہ ہوسکا تو شاید وہ بھی میری بات پر یقین نہ کرے۔ میں ڈر بھی رہا تھا کہیں یہ عورت طاؤسہ کسی وجہ سے مجھے حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دے۔ اتنے میں وہ میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔۔۔

"ارے لال۔۔۔ روشی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ دیکھو نا تمھارا سر تو اچھے خاصے مرد کے سر جتنا ہے۔ کہیں تم سچ مچ کوئی بھتنے تو نہیں ہو؟"

میں لاشعوری طور پر اُسے جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ رُک کر غوں غاں کرنے لگا۔ وہ پھر بولی: "چاہے تم بھتنے ہو یا عفریت، میں تمھیں مرنے نہیں دوں گی۔ کہیں چھُپا کر پالوں گی۔ مگر کہاں؟ پورے حرم میں چوکیدار گشت کرتے رہتے ہیں۔ اگر انھوں نے دیکھ لیا تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر مجھے اپنے بازوؤں کی پناہ میں لیے جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں کسی طرف بھاگنے لگی۔ کبھی کبھی وہ رُک کر اِدھر اُدھر بھی دیکھتی جاتی تھی۔ بالآخر وہ ایک ویران اور شکستہ عمارت میں داخل ہوئی اور مجھے ایک کوٹھڑی میں لٹا کر چلی گئی۔

قدرت نے میرے تحفظ کا سامان کردیا تھا۔ اُدھر کرسٹل سے بھی اشارے ملنے لگے تھے۔ ڈاکٹر فریدوں کو پتہ چل گیا تھا کہ کمپیوٹر کی کسی خرابی کے باعث میرے سالمے میری حقیقی عمر کی بجائے ایک نوزائیدہ بچے کی جُون میں یکجا ہوگئے ہیں۔ اب وہ مجھے اس

شکل میں بُلا بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا وجود کمپیوٹر کے مرحلے سے گزرنے کے جھٹکے برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ کرسٹل کے ذریعے مجھے انتظار کرنے کا پیغام دے رہا ہے۔ میرے لیے انتظار کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس طرح چار دن گزر گئے۔

اُس وقت تو میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سی جگہ تھی مگر بعد میں مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بارہ دری کے عقب میں واقع نوکروں کے حجرے تھے۔ اب یہ حجرے اور بارہ دری تقریباً کھنڈر بن چکی تھی۔

طاؤسہ کچھ کچھ وقفوں کے بعد آتی، مجھے بوتل سے دُودھ پلاتی اور کپڑوں میں لپیٹ کر، لٹا کر، سُلا کر چلی جاتی۔ حجرے کی تاریکی کے باعث اسے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میرا وجود بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پہلے روز جب وہ میرے لیے دُودھ کی بوتلیں اور کپڑے لائی تھی، میں اُس کی واپسی کے بعد گھٹنوں چلنے لگا تھا۔ دوسرے روز مجھے چلنا آگیا تھا اور تیسرے روز میں دوڑ سکتا تھا۔ میرے بال بھی تیزی سے اُگنے لگے تھے۔ چوتھے روز میں حجرے کا دروازہ کھول کر چوری چھُپے باہر کا ایک چکر بھی لگا آیا تھا، مگر چوتھے ہی دن طاؤسہ کو بھی میری تیز افزائش کا احساس ہوگیا تھا اور وہ اس پر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے بھتنا سمجھ کر چھوڑ نہ دے۔ اب وہ وقت قریب تر آتا جارہا تھا، جب اُس پر کچھ حقائق منکشف کرکے اُسے اعتماد میں لے لیا جاتا کیونکہ اس سرزمین پر وہی ایک مہربان ہستی تھی جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔

میرے دماغ میں نصب کرسٹل کے اشارے مسلسل بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر مجھے فوری طور پر میری اصلی ہیئت میں لانے کے لیے کوشاں ہے مگر اب میں فوری طور پر اپنی اصلی عمر اور جسامت نہیں چاہتا تھا۔ اس کی وجہ وہ باتیں تھیں جو میں نے بارہ دری میں آنے والی عورتوں سے سُنی تھیں۔ وہ چھُپ کر اس کھنڈر نما عمارت میں آتیں اور ایک دوسرے کا دُکھ درد بانٹنے کے ساتھ ساتھ آسودگی بھی حاصل کرتیں۔ میں اندھیرے گوشوں میں چھُپ کر انھیں دیکھتا اور اُن کی باتیں سُنتا رہتا تھا۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ میری موجودہ افزائش برقرار رہے جو ایک دن میں ایک سال کے برابر تھی۔ میں چھ روز میں چھ سال کا ہوچکا تھا چنانچہ میں نے ارتکازِ توجہ سے کمپیوٹر کے ذریعے ڈاکٹر فریدوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کردیا تھا۔

بارہ دری کے کھنڈر میں آنے والی عورتوں کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوچکا تھا کہ ازمیر کا یہ علاقہ آذر بائیجان میں واقع

اُسے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"اوہ۔ میں پاگل ہوجاؤں گی۔ زنجیریں اور موت میرا مقدر بن جائیں گی۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی "تم یقیناً کوئی بدرُوح ہو۔"

"نہیں طاؤسہ۔ میں آدمی ہوں۔ مجھ سے تمھیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تمھارا بال بھی کوئی بیکا نہیں کرسکے گا۔"

ہے اور سہراب اس علاقے کا مالک و حاکم ہے۔ اُس کے حرم میں پانچ سو عورتیں محبوس ہیں۔ وہ ضعیف العمر بھی ہے اور اولادِ نرینہ سے محروم بھی۔

میں حجرے کی کھڑکی سے حرم کے وسیع و عریض باغ کا نظارا کرچکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ میلوں میں پھیلا ہُوا ہے۔ اس میں جابجا فوارے لگے ہوئے تھے اور انواع و اقسام کے خوش رنگ پھول روش روش اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ کبھی کبھی اس باغ میں محافظ بھی گھومتے نظر آتے تھے۔ وہ بڑی بڑی شلواریں پہنتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بھالے اور کمر سے تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ ایک بار تو مجھے یُوں محسوس ہُوا تھا جیسے اُنھوں نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ میں ڈر کے مارے ایک اندھیرے گوشے میں دُبک گیا تھا اور گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا۔ ابھی میں اس قابل نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ کرسکوں۔

ساتویں روز میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب مجھے طاؤسہ سے کھُل کر بات کر ہی لینی چاہیے۔ اس لیے کہ وہ میری بڑھتی ہوئی جسامت سے خوفزدہ ہونے لگی تھی اور اپنے خدشوں کا برملا اظہار بھی کر بیٹھی تھی۔ ہُوا یوں تھا کہ حسبِ معمول جب شام کے اندھیرے میں وہ دُودھ لائی تو میں اپنی جسامت چھُپانے کے لیے بستر میں سُکڑ گیا۔ اُس نے مجھے اُٹھایا تو میرا وزن محسوس کرتے ہوئے بولی: "تم تو دیو کے بچے بنتے جارہے ہو مُنّے۔ میرا خیال ہے، تم دنیا بھر میں واحد بچے ہو جس کا صرف سات روز میں اتنا وزن ہوگیا ہے۔ روشی ٹھیک ہی کہتی تھی کہ تم عفریت زادے ہو۔"

"وہ جھُوٹ بکتی تھی۔" میں بولا تو طاؤسہ نے ڈر کے مارے مجھے چھوڑ دیا اور آنکھیں پھٹ پھٹا کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا: "مجھ سے ڈرو مت طاؤسہ۔ میں عفریت زادہ یا بھتنا نہیں بلکہ بچے کی جُون میں ایک مرد ہوں۔"

میری توقع کے عین مطابق طاؤسہ بے ہوش ہوگئی۔

میں نے دُودھ پی کر برتن خالی کیا پھر چھپتا چھُپاتا ایک فوارے سے برتن میں پانی بھر لایا۔ طاؤسہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اُس کے مُنہ پر چھینٹے مارے پھر اُس کی ہتھیلیاں اور تلوے سہلانے لگا۔ کچھ دیر بعد اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور بولی۔

"میں نے بڑا خوفناک خواب دیکھا تھا مُنّے۔ یا پتہ نہیں کیا ہُوا تھا۔ مجھے یُوں لگا تھا جیسے تم مرد کی آواز میں بول رہے ہو۔"

"ہاں۔ میں بولا تھا۔" میں نے اُس کی ہتھیلی تھپتھپاتے ہوئے کہا: "مجھ سے مت ڈرو طاؤسہ۔ میری بات غور سے سُنو اور

"میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا ہے۔ تم۔۔۔ تم کیسے اتنے بڑے ہوگئے ہو؟ مردوں کی طرح کیسے بول رہے ہو؟" یہ کہتے کہتے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"پہلے تم میری پُوری بات سُن لو پھر سب سمجھ جاؤگی۔ دیکھو میں ایک ایسی دُنیا سے آیا ہوں جسے تم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔ مگر یہاں آتے وقت کسی غلطی نے مجھے ایک بچے کی جُون دے دی ہے۔ اب اس غلطی کی اصلاح کی جارہی ہے اور ایک مہینے کے اندر اندر میں پھر مرد کی جُون میں آجاؤں گا۔ اُس وقت تک مجھے تمھاری مدد اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ میں اس احسان کے بدلے تمھارے لیے وہ سب کچھ کروں گا جو تم چاہوگی۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر تم بھتنے، شیطان یا جادُوگر ہو۔" اُس نے کہا۔

"میں ان میں سے کوئی بھی نہیں اور اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو میں بیک وقت بھتنا، شیطان اور جادُوگر ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم صرف ایک مہینے تک میری مدد کرتی رہو۔ مجھ سے ڈر کر مجھے موت کے حوالے مت کرو۔"

"اب مجھے تم سے ڈر تو نہیں لگ رہا لیکن بچے کی جُون میں

مرد والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
"وقت آنے پر یہ بات بھی تمھاری سمجھ میں آجائے گی۔"
"اچھا اگر تم جادوگر ہو تو وعدہ کرو کہ اپنے کسی سحر سے مجھے بچے کی ماں بنا دو گے۔ مجھے میرا اپنا بچہ چاہیے جس کے لیے میری ممتا تڑپ رہی ہے۔" طاؤسہ اب مجھے جادوگر سمجھ رہی تھی۔
"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب میں پوری طرح اپنی جون میں آجاؤں گا تو تمھاری یہ خواہش ضرور پوری ہو جائے گی۔" میں نے اپنی بقا کے لیے جھٹ ایک ایسا وعدہ کرلیا جو میں نہیں، قدرت ہی پورا کر سکتی تھی۔ "مگر تم بھی وعدہ کرو کہ میرا ساتھ دو گی اور جو میں پوچھوں گا بتاؤ گی۔"
"ہاں۔ میں اپنی ممتا کی پیاس بجھانے کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"
"مجھے ازمیر اور شہراب کے بارے میں وہ سب کچھ بتاؤ جو تم جانتی ہو۔"
وہ مجھے اُس سرزمین اور شہراب کے متعلق بتاتی رہی، میں سنتا اور اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیتا رہا۔ یہ منصوبہ بے حد خطرناک تھا لیکن مجھے ماضی کے ہر سفر میں قدم قدم پر خطرات سے دوچار ہونا پڑا تھا اور اس سفر میں بھی میرے لیے ہر قدم پر خطرے تھے بلکہ کچھ زیادہ اور شدید قسم کے تھے کیونکہ میں ایک بچے کی جون میں تھا تاہم اُن سے رُوگردانی بھی ممکن نہیں تھی۔ اس لیے میں نے طاؤسہ کو اعتماد میں لیتے ہوئے بتا دیا کہ اُسے کیا کرنا ہوگا۔ وہ خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔
"نہیں نہیں۔ بابا، ایسا نہیں کروں گی۔ وہ تمھارے ساتھ مجھے بھی تہِ تیغ کر دیں گے۔"
"اگر وہ ساری باتیں سچی ہیں جو تم نے شہراب اور کاہن ارژنگ کے بارے میں بتائی ہیں تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے طاؤسہ کو قائل کرنے کے لیے دلیلیں دینا شروع کیں۔ "تم کہتی ہو کہ شہراب لاولد ہے اور وارثِ تاج و تخت کی شدید آرزو رکھتا ہے۔ کاہنِ اعظم ارژنگ نے اُسے پیش گوئی کی ہے کہ دیوتا اُس کے پاس ایک ایسا بچہ بھیجیں گے جو غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہوگا اور شہراب اُسے اپنا جانشین مقرر کرے گا۔ یہی بچہ بڑا ہو کر سلطنتِ ازمیر کی عظمتوں میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ شہراب کا نام بھی روشن کرے گا۔ تم نے یہی بتایا تھا نا؟"
"ہاں۔ یہ باتیں سچ ہیں۔ بڈھا شہراب ان باتوں پر یقین بھی کرتا ہے مگر کاہنِ اعظم پرلے درجے کا مکار، ظالم اور جھوٹا ہے۔ وہ شہراب کی بیٹی فرازیہ سے محبت کرتا اور شہراب کو راستے سے ہٹا کر اُسے تخت پر بٹھانا چاہتا ہے۔ دونوں شہراب کی موت کے منتظر ہیں یا موقع ملتے ہی وہ اُسے قتل کر دیں گے۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر تم شہراب کے پاس پہنچ جاؤ اور کہو کہ تمھیں دیوتاؤں نے بھیجا ہے تو وہ تمھاری بات پر یقین کرلے گا مگر کاہن ارژنگ تمھیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"
"یہ بعد کی بات ہے طاؤسہ۔ تم کسی طرح مجھے شہراب کی خواب گاہ تک پہنچا دو۔ وہاں مجھے دیکھنے اور مجھ سے بات کرنے والا وہی پہلا آدمی ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس لیے میری مدد کرو اور مجھے شہراب تک پہنچا دو۔"
میری اس بات پر وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "حرم کا ایک چوکیدار فیل تن مجھ پر نظر رکھتا ہے اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر اظہارِ محبت کرنے سے باز نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے۔"
"تو پھر آج ہی اُس سے ملو طاؤسہ اور کوئی صورت نکالو۔"
"میں اس سے مل لوں گی مگر تم نے میرے لیے ایک مشکل پیدا کر دی ہے۔ جب تک میں یہ نہیں جانتی تھی کہ تم مرد ہو، تب تک تو تمھیں مُنّا کہتی رہی، اب تمھیں کیا کہوں؟"
"سرفروش۔ میرا نام سرفروش ہے۔ تم مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہو۔ اب صبح ہونے والی ہے، تم چلی جاؤ کہیں ایسا نہ ہو، کسی کو پتہ چل جائے کہ تم رات بھر حرم سرا سے غائب رہی ہو۔"
"حرم سرا میں میرے پاس الگ کمرہ ہے اور شہراب کئی مہینوں سے میرے پاس نہیں آیا۔ وہ بیمار ہے اور اب اُس کی راتیں اپنی خواب گاہ میں تنہا ہی سوتے گزرتی ہیں۔ دوسرے میں ایک خفیہ راستے سے یہاں آتی ہوں اس لیے کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں رات بھر یہاں رہی ہوں۔" تاہم یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا، اب میں چلتی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔"
جب طاؤسہ چلی گئی تو میں کمبل اوڑھ کر حجرے کے کونے میں لیٹ گیا مگر بھوک کے مارے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا، اگر منصوبے پر عمل درآمد ہو گیا اور وہ کامیاب ثابت ہوا تو مجھے حسبِ خواہش کھانا ملنے لگے گا اور اگر منصوبہ ناکام رہا تو پھر کھانے سے ہی نہیں، ہر شے سے بے نیاز ہو جاؤں گا۔
میں نے ارتکازِ توجہ سے کمپیوٹر کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہا مگر ایسا محسوس ہوا کہ میرے دماغ کا کرسٹل ہڑتال پر ہے۔ شاید ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر سے اس کا رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

میں ایک بار پھر سہراب اور اپنے منصوبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر سہراب واقعی اتنا ہی توہم پرست ہے جتنا کہ طاؤسہ نے بتایا تھا تو منصوبے کی کامیابی کے امکانات روشن تھے۔ انھی سوچوں میں مجھے نیند آگئی پھر اچانک اُس وقت میری آنکھ کھلی جب اندھیرے میں کوئی مجھے اپنے بازوؤں میں بھر کر اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے لگا تو طاؤسہ کی آواز آئی۔
"ارے ارے۔ یہ میں ہوں سرفروش۔"
یہ سُن کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے کہا۔ "مجھے یوں اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ ویسے ہی جگا دیا ہوتا۔"
"میں اپنی ممتا سے مجبور ہوں سرفروش۔ خیر سنو۔ اگر کل رات مجھے تمھاری باتوں پر یقین نہ آیا ہوتا تو اب آجاتا۔"
"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔
"ایک ہی دن میں تمھارا وزن کم از کم دس پونڈ بڑھ گیا ہے اور بالوں میں گھنگر آگئے ہیں۔" وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابھی غذا اور گوشت کے بغیر وزن کیوں کر بڑھ جاتا ہے۔" میں بھی اُلجھ کر رہ گیا۔
"اگر تمھارا دیوانوں کا سا منصوبہ کامیاب ہو گیا اور تم صبح تک زندہ رہ گئے تو جو چاہو گے تمھیں مل جائے گا۔"
"کیا تم فیل تن سے ملی تھیں؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔
"ہاں۔ وہ انسان نہیں، وحشی ہے وحشی۔ اس نے مجھے کافی پریشان کیا ہے، مگر اُس نے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ سہراب کی خواب گاہ کے باہر پہرا دینے والے کو آج شام ایک ایسی بُوٹی کھلا دے گا جس سے وہ بیمار پڑ جائے گا پھر اس کی جگہ رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دے گا۔"
"اگر اُس کی بجائے کوئی دوسرا آدمی منتخب کر لیا گیا تو؟" میں نے پوچھا۔
"اس کا امکان نہیں ہے کیونکہ خواب گاہ کی چوکیداری کوئی پسند نہیں کرتا۔" طاؤسہ نے وضاحت کی۔
"تم مجھے حرم سرا میں کیسے لے جاؤ گی؟"
"یہ مرحلہ بھی آسان ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی سہیلی روشی کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہماری مدد کرے اور اس محافظ کو تھوڑی دیر کے لیے کہیں اِدھر اُدھر لے جائے جو خواب گاہ کے راستے پر متعین ہے۔"
"کیا تمھیں یقین ہے کہ روشی ایسا کرے گی؟"
"ہاں۔ میں اُس کے کچھ راز جانتی ہوں۔ میں نے اُن کے افشا کی دھمکی دے کر اُسے راضی کر لیا ہے۔ جب وہ محافظ کو حرم کے کسی گوشے میں لے جائے گی تو میں تمھیں محل کے اندر لے جاؤں گی۔ رات کے وقت محل کی راہداریاں سُونی ہوتی ہیں۔ صرف سہراب کی راہداری میں پہریدار ہوتا ہے اور آج فیل تن وہاں ہوگا۔ وہ آہستہ سے خواب گاہ کا دروازہ کھول دے گا اور میں تمھیں وہاں چھوڑ کر باہر آجاؤں گی۔ اگر دیوتا نے چاہا تو سہراب سو رہا ہوگا اور کوئی دوسری گڑبڑ بھی نہیں ہوگی۔" طاؤسہ نے ساری تفصیل سمجھا دی۔ میں نے اس پر تھوڑی دیر غور کیا اور کہا۔
"ٹھیک ہے۔ تم جتنا کر سکتی تھیں، کر رہی ہو اور میں تمھارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔" پھر میں نے جلدی جلدی وہ دودھ پیا جو طاؤسہ لائی تھی۔ "آؤ چلیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
"ابھی نہیں۔ ہم آدھی رات کو جائیں گے جب محل کے بیشتر چوکیدار اونگھنے اور چُھپ کر سو جاتے ہیں۔"
آدھی رات کو جب ہم حرم کے باغ سے گزرے تو واقعی چوکیدار لالٹینوں کے کھمبوں، درختوں اور ستونوں سے ٹیک لگائے سو رہے تھے۔ ہر کام اُسی طرح ہُوا تھا جیسے طاؤسہ نے بتایا تھا۔ وہ مجھے سہراب کی خواب گاہ میں چھوڑتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ "اگر تمھارا منصوبہ کامیاب ہو جائے تو مجھے مت بھول جانا۔"
"ایسا کبھی نہیں ہوگا طاؤسہ، یہ میرا وعدہ ہے۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ جب وہ چلی گئی تو میں سہراب کے پلنگ کی پائنتی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور صبح کے اُجالے کا انتظار کرنے لگا۔
میں نہیں جانتا تھا کہ آنے والی صبح میرے لیے نویدِ مسرت لاتی

ہے یا پیغامِ اجل :

میں نے ارتکاز توجہ سے کمپیوٹر کے ذریعہ ڈاکٹر فریدوں کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا مگر میرے دماغ والا کرسٹل کام نہیں کر رہا تھا میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس نے یوں ہڑتال کیوں کر دی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا وقت پورا ہو گیا ہو اور قدرت مجھے اتنی مہلت نہ دینا چاہتی ہو کہ ڈاکٹر فریدوں صورت حال سے آگاہ ہو سکے۔ بہرکیف اب تو میں شیر کی کچھار میں آ ہی گیا تھا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں شیر کو زیر کرنے والا ہوں یا شیر مجھے لقمہ بنانے والا ہے۔ میں نے خراٹے لینے والے سہراب کی طرف دیکھا۔ اس کے دانت اور بال جھڑ چکے تھے، ناک طوطے کی چونچ سے مشابہ تھی اور جھریوں نے اس کے چہرے پر ہی نہیں گردن پر بھی ڈیرے ڈال رکھے تھے وہ اتنا ضعیف دکھائی دیتا تھا کہ کسی بھی لمحے موت اُسے اپنے پنجوں میں دبوچ سکتی تھی۔

جب صبح کا اجالا پھیلا اور روشنی دریچوں کے پردوں سے چھن کر سہراب کے چہرے پر پڑنے لگی تو وہ کسمسایا اور اس نے ایک مکروہ جماہی لے کر اپنی کیچڑ بھری آنکھیں کھول دیں جو مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ میں بولا: "مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ میں ہی وہ بچہ ہوں جس کی پیشن گوئی کاہنِ اعظم ارڈنگ نے آپ سے کی تھی۔ دیوتاؤں نے مجھے بچے کے جسم مگر بڑے آدمی کے سر اور فہم و ادراک کے ساتھ آسمانوں سے بھیجا ہے تاکہ آپ مجھے اپنا جانشین بنا سکیں۔"

یہ کہتے ہوئے مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر بھی اُترتی محسوس ہوئی کیونکہ اگلے چند لمحے فیصلہ کن تھے۔ اگر سہراب نے ڈر کے مارے اپنے محافظ کو آواز دے دی تو میرے بچنے کا امکان نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ وہ اُسی طرح ایک ٹک مجھے گھورتا رہا۔ پھر اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ بڑے ٹھنڈے مگر گمبھیر لہجے میں بولا۔

"اگر تم کوئی بھتنے ہو تو بھاگ جاؤ کہ میں پیرانہ سالی کی اِس منزل میں تم سے خوف زدہ نہیں ہو سکتا لیکن اگر تم میرا وہم یا بھتنے نہیں بلکہ حقیقت میں وجود رکھتے ہو تو ذرا میری چٹکی لو تاکہ میں یقین کر سکوں، حالانکہ اس کے باوجود میں تمھارے وجود کو تسلیم کرنے سے شاید انکار کر دوں۔"

میں نے اپنے ننھے سے ہاتھ سے اُس کے ہاتھ پر چٹکی لیتے ہوئے کہا: "میں نہ تمھارا وہم ہوں نہ بھتنا۔ میں دیوتاؤں کا فرستادہ بچہ ہوں مگر ایک بھرپور مرد کے سر اور دماغ کے ساتھ۔ کیا تمھیں میرا سر بہت بڑا دکھائی نہیں دیتا؟"

"بچکانہ جسم کے ساتھ اتنا بڑا سر تو مجھے مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔" وہ بولا۔

"اور میری آواز کیسی لگتی ہے؟"

"سو فیصد مردانہ۔"

"کیا یہ دونوں باتیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ مجھے دیوتاؤں نے بھیجا ہے؟" میں نے پوچھا تو سہراب بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا۔

"میں اتنا احمق نہیں جتنا لوگ اور خاص طور پر ارڈنگ سمجھتا ہے۔ میں جادو یا معجزات پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بڑا توہم پرست ہوں، میں اُن کی تردید نہیں کرتا کہ ان کے ایسا سمجھنے سے مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

سہراب کی ان باتوں نے میری ساری توقعات پر پانی پھیر دیا۔ میں نے فوری طور پر اپنے منصوبے میں ترمیم کی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مجھے اُن میں علم اور تجربے کے ساتھ ساتھ عیاری اور مکر بھی جھانکتے دکھائی دیے۔

"تمھاری آنکھوں میں بچوں کی معصومیت نہیں بلکہ ایک مبہم خوف کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مگر ایک بچے کے جسم پر یہ سر اور یہ آنکھیں کس کام کی؟" اس نے کہا۔

"اگرچہ آپ سحر اور معجزات پر اعتقاد نہیں رکھتے لیکن ان دونوں کا میری یہاں آمد سے گہرا تعلق ہے۔ میں کسی اور دُنیا سے آیا ہوں اور میرا وجود ایک دن میں ایک سال کے برابر بڑھتا ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے خادم خواب گاہ میں کب آتے ہیں؟"

سہراب نے گھنٹی بجانے والی رسّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں جب چاہوں انھیں بُلا سکتا ہوں۔"

"خوب۔ اب ذرا ادھر ملاحظہ فرمایئے۔" یہ کہہ کر میں نے چند اُلٹی قلابازیاں کھائیں، کُرسی کے ہتھوں پر سر کے بل کھڑا ہوا اور ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے فرش پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سہراب میری یہ حرکتیں تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ نے کبھی کسی عام بچے کو ایسی حرکتیں کرتے دیکھا ہے؟"

"تم اپنی ان حرکتوں سے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ تمھیں دیوتاؤں نے بھیجا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا

"ان حرکتوں سے مجھے تمھاری بات کا یقین نہیں آ سکتا۔" وہ بولا اور مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک تھی جو بتا رہی تھی کہ اُس نے میرے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ پھر بول اُٹھا۔ "البتہ جیسا کہ تم نے کہا ہے، تمھاری عمر ایک دن میں ایک سال بڑھ جاتی ہے تو اس طرح تمھیں چند روز میں جوان ہو جانا چاہیے۔ اگر تم واقعی جوان ہو گئے تو ٹھیک، ورنہ تمھاری گردن اُڑا دی جائے گی۔"

"مجھے منظور ہے جناب۔" میں نے کہا۔ "اب میں چند حقائق کا اعتراف کروں تو بہتر ہے کیونکہ آپ ویسے نہیں ہیں جیسا آپ کو سمجھا جاتا ہے۔"

"لوگ سمجھتے ہیں کہ میں احمق ہوں، سٹھیا گیا ہوں اور میری عقل ماری گئی ہے۔ یہی نا؟"

"جی ہاں۔" میں نے تائید کی۔

"میں بے وقوف تو ہو سکتا ہوں لیکن میری ضعیف العمری مجھے فاترالعقل نہیں بنا سکتی۔"

"اسی لیے میں یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ پہلے میں نے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے کاہن ارڈنگ کی پیش گوئی کے مطابق دیوتاؤں نے نہیں بھیجا۔ میں نے اُسے ٹکا سا بنا دیا کہ اُسے بے وقوف بنانا آسان نہیں تھا۔"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ارڈنگ جھوٹا اور مکّار ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اُس کی باتوں پر یقین رکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے قہقہہ لگانا چاہا مگر اس کی ہنسی کھانسی میں بدل گئی۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد اُس نے اپنی بات کا سرا پھر سے جوڑا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ چوری چھپے کسی بچے کو تربیت دے رہا ہے اور اُس موقعے کی تلاش میں ہے جب اُسے سامنے لے آئے اور اُسے میرا جانشین مقرر کرا دے۔ جب میں مر جاؤں گا تو وہ فرازیہ کو قتل کرا دے گا اور اس بچے کا نگران بن کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔"

"اس صورت میں جب آپ نے میرا بھید پرکھنے کے لیے مجھے کچھ دنوں کی مہلت دی ہے تو میرے ساتھ اس کا رویّہ کیسا ہو گا؟"

سہراب نے پھر قہقہہ لگایا اور بولا: "تم نے تو اُس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا ہے بھتنے۔ اُس کا سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا ہے۔ وہ یقیناً تمھیں قتل کرا دینا چاہے گا۔"

"تب تو آپ کو اُس وقت تک میرا تحفظ کرنا چاہیے جب تک میں دوبارہ جوان نہیں ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"لوگ مجھے احمق سمجھتے اور میرے خلاف سازشیں کرتے ہیں مگر میں شکاری کتے کی طرح چوکنا رہتا ہوں اس لیے میرا خیال ہے کہ میں تمھیں اس کی دستبرد سے محفوظ رکھوں گا۔ ویسے تمھارا نام کیا ہے؟"

"سرفروش۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ عجیب سا نام ہے... خیر یہ بات ایک بار پھر کان کھول کر سن لو، اگر تم دنوں میں جوان نہ ہوئے تو میں ارڈنگ کو تمھارے قتل کی زحمت نہیں دوں گا بلکہ خود ہی تمھاری گردن اُڑا دوں گا۔ اب بولو تم کیا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے عمدہ خوراک۔ خاص طور پر گوشت۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد لباس؟" وہ بولا۔

"لباس کے ساتھ ایک چھوٹی سی تلوار بھی تاکہ میں اپنے آپ کو قدرے محفوظ محسوس کر سکوں۔"

"یہ سب تمھیں مل جائیں گے۔" اُس نے گھنٹی کی رسّی کھینچتے ہوئے کہا۔ "آج ہی میں تمھیں اپنے دربار میں وزیروں اور مشیروں سے متعارف کرواؤں گا۔ شہزادی فرازیہ اور کاہن ارڈنگ سے تو بطورِ خاص ملاؤں گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اپنی پیش گوئی کے مطابق دیوتاؤں کی طرف سے بھیجے جانے والے وارثِ تاج و تخت بچے کو سامنے پا کر اُن کے چہروں پر ملال کے کتنے رنگ بکھرتے ہیں۔ وہ اُس بچے کا استقبال کن تاثرات سے کرتے ہیں جو بقول ارڈنگ بڑا ہو کر ازمیر کو آشوریوں کی یلغار سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دے گا۔"

"یہ آشوری کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ خلیج کے اُس پار رہتے ہیں اور بار بار ازمیر پر چڑھائی کرتے ہیں۔ ہمارے آباو اجداد ہمیشہ اُن سے مغلوب ہوتے رہے ہیں۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ مرنے سے پہلے اُن تمام شکستوں کا بدلہ لوں گا۔ ارڈنگ

نے پیش گوئی کی تھی کہ دیوتاؤں کی طرف سے بھیجا جانے والا بچہ بڑا ہو کر آشوریوں کو شکستِ فاش دے گا۔ اب اگر تمھاری بات سچ ثابت ہوئی اور قتل ہونے سے بچ گئے تو تم ہی آشوریوں پر فوج کشی کرو گے۔"

اتنے میں دو فربہ اندام غلام خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ سہراب اُنھیں ہدایات دیتا رہا اور وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ اُن کے چہروں سے حیرت و استعجاب مترشح تھا۔ جب وہ تعمیلِ احکام کے لیے چلے گئے تو سہراب بولا۔

"یہ جنوبی علاقے کے غلام ہیں۔ مجھے آشوریوں کو غلام بنانے کی حسرت ہی رہی ہے سرفروش۔ اوّل تو وہ بدبخت ہاتھ ہی نہیں آتے اور اگر کوئی زندہ گرفتار ہو جائے تو غلام بننے کی بجائے موت کو ترجیح دیتا اور خودکشی کر لیتا ہے اور سنو، حرم سراؤں کا کام کرنے والے غلاموں کو آختہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات میں تمھیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر تم واقعی جوان ہو گئے تو تمھاری وجہ سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ میرے حرم میں پانچ سو عورتیں ہیں۔ تم اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ تمھارے لیے نئی حرم سرا فراہم کر دی جائے گی۔"

اتنے میں غلام کھانا، لباس اور تلوار لے آئے۔ میں بھوکے وحشیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانے کے دوران ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کا کرسٹل پھر سے کام کرنے لگا ہے۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ میری افزائش کا تعلق براہِ راست کرسٹل سے تھا۔ جب کرسٹل کام نہیں کرتا تھا تو میری افزائش رُک جاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کرسٹل اور کمپیوٹر کے درمیان کم از کم اُس وقت تک ضرور رابطہ قائم رہے جب تک کہ میں اپنی اصلی حالت پر نہیں آ جاتا ورنہ سہراب میری گردن اُڑائے بغیر نہیں رہے گا۔

*

• سہراب نے میرے تحفظ کا وعدہ یوں پورا کیا کہ میری حفاظت کے لیے بارہ سپاہیوں کا ایک دستہ مقرر کر دیا۔ اس دستے کا سالار کپتان اوغیر تھا۔ اوغیر سہراب کا وفادار تھا۔ جب سہراب نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بولا...

"اس عجیب الخلقت بچے کی حفاظت کوئی بڑا کام نہیں ہے عالی جاہ۔ یہ یہیں آپ کے محل میں رہے گا۔ میرے بارہ وفادار سپاہیوں میں سے چھ دن کو اور چھ رات کو ہر وقت اس کی حفاظت پر مامور رہیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بات جاری رکھی۔ "میں نے دربار میں اسے دیکھا تھا۔ تب سے اب تک اس مختصر سے وقت میں کافی بڑا ہو گیا ہے اور یہ ایک معجزہ ہے۔ لوگ بھی اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔

"لوگوں کو اسے دیکھنے کے لیے اُس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک یہ پوری طرح اپنی جسامت میں نہیں آ جاتا اور میں اسے اپنا ولی عہد مقرر نہیں کر دیتا۔ مگر میں اسے اپنا ولی عہد بنانے کا اعلان اُس وقت کروں گا جب یہ آشوریوں سے جنگ جیت کر اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دے گا۔ یہ تو بتاؤ اوغیر کہ کاہن ارژنگ اور شہزادی فرازیہ کے تاثرات کیا ہیں؟ دربار کے بعد وہ مجھے دکھائی نہیں دیے۔ ارژنگ تو خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہے۔"

سہراب کی اس بات پر کپتان اوغیر نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "وہ بڑا مایوس ہے ... آقا۔ خاص طور پر سرفروش کو اغوا کرنے کی کوشش ناکام کے بعد تو وہ بہت ہی دل شکستہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ خاموشی سے کسی نئی سازش کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ شہزادی فرازیہ نے البتہ اپنے جاسوس چھوڑ دیے ہیں لیکن وہ اُسے حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں بتا سکیں گے۔ ویسے ارژنگ پر شہزادی کا اعتماد بھی متزلزل ہو گیا ہے اور ہاں، کوڑے کے ڈھیر سے ایک بچے کی سربریدہ لاش بھی ملی ہے۔ میرے جاسوسوں نے بتایا ہے کہ وہ غالباً اُسی بچے کی ہے جسے کئی مواقع پر ارژنگ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔"

یہ سُن کر میں خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ "وہ اُسی بچے کو آپ کا ولی عہد بنانے کی سوچ رہا تھا مگر جب میں آ گیا تو اُس نے بچے کو ٹھکانے لگا دیا۔ میرا خیال ہے کہ جوان ہونے کے بعد بھی میری اُس کی نہیں بنے گی۔"

• •

خدا کا شکر ہے کہ میرے کرسٹل اور کمپیوٹر میں رابطہ قائم رہا اور میں ایک بار پھر وہی سرفروش بن گیا جو قد آور، جسیم، توانا اور مارشل آرٹس کا ماہر تھا۔ میں نے سر کے بال تو مناسب حد تک ترشوا لیے تھے لیکن داڑھی بڑھنے دی تھی۔ اب میں چہرے مُہرے سے ازمیر کا باشندہ نظر آتا تھا۔ ایک اور فرق جو میں نے اپنے اندر محسوس کیا، وہ یہ تھا کہ میں اپنی دُنیا اور اپنے دَور کا ایک عام سا آدمی نہیں رہا تھا بلکہ میرے اندر مکاری اور عیاری آ گئی تھی۔

اس دوران کاہن ارژنگ اور شہزادی فرازیہ خاموش رہے تھے۔

سہراب نے حسبِ وعدہ میرے لیے علیحدہ حرم فراہم کر دیا تھا۔ یہ حرم اُس کے محل کے باغ کے دوسرے کنارے واقع تھا۔ اُس نے اوغیر اور اُس کے بارہ سپاہیوں کو میرا محافظ دستہ بنا کر میری تحویل میں دے دیا تھا۔ جس دن مجھے اپنے حرم میں منتقل ہونا تھا، ایک جلوس نکالا گیا۔ میں سفید گھوڑے پر سوار تھا جبکہ غلاموں نے سہراب کی پالکی اٹھا رکھی تھی۔ یہ جلوس راجدھانی کی سڑکوں سے گزرا تو دُور رویہ کھڑے لوگ حیرت سے مجھے دیکھتے رہ گئے۔ انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کوئی بچہ دنوں

ں مجھ ایسا بھرپور مرد بن سکتا ہے۔

جب ہم نئے محل میں پہنچے تو سہراب نے کہا۔ "ہجوم میں ارژنگ ے بے شمار جاسوس شامل تھے۔ جب وہ اُسے بتائیں گے کہ معجزہ رونما ہو چکا ہے تو اُسے یقین نہیں آئے گا۔ وہ اسے میری کوئی چال سمجھے کیونکہ وہ خود چالباز ہے۔ دیکھیں اب وہ کیا کرتا ہے؟ آؤ پہلے میں ںھیں تمھارا محل دکھا دوں، اس کے بعد ہم آشوریوں کے ساتھ نمٹنے کی ت چیت کریں گے۔"

ہم محافظ دستے کے چھ سپاہیوں کے گھیرے میں محل سے لہ باغ اور مختلف راہداریوں سے گزرے۔ اس باغ میں بھی روش ںٹ پھول اور جا بجا فوارے بہار دکھا رہے تھے۔ محل کی عمارت سنگ یدے بنی ہوئی تھی اور دروازوں پر خواجہ سرا متعین تھے۔ راہداریا ے گزرتے ہوئے مجھے دبے دبے نقرئی قہقہے سُنائی دیے اور کچھ نوعمر یوں کی جھلک بھی دکھائی دی جو بے حد خوبصورت اور نازک اندام ں۔ کمروں کے دروازوں پر سنگِ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ فرنیچر ِس کا بنا ہوا اور ہاتھی دانت سے مرصع تھا۔

ظروف سونے اور چاندی کے تھے لیکن یہ عجیب سی بات ہے کہ ان قہقہوں اور سرگوشیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مجھے کسی عورت طلب محسوس نہ ہوئی اور ہم آگے بڑھ کر اُس کمرے میں آ گئے جہاں تخت ا ہوا تھا۔

سہراب نے اوغیر کے علاوہ سپاہیوں کو دروازے پر ٹھہرنے کا دیا اور مجھ سے کہا کہ میں چبوترے پر رکھے ہاتھی دانت کے تخت بیٹھ جاؤں۔ میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی تو وہ خوش ہوتے ے بولا۔

"تم اس تخت پر بیٹھے ہوئے سجتے ہو سرفروش۔ کیوں اوغیر؟"

"آپ بجا فرماتے ہیں عالی جاہ۔" اوغیر بولا۔ "ارژنگ کی پیشگوئی ثابت ہوئی ہے اور آپ کو ولی عہد مل گیا ہے۔"

یہ سُن کر سہراب نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "ہاں۔ اُس کا جھوٹ ان گیا ہے۔ مجھے تین ہفتوں میں ایک ایسا وارثِ تخت مل ہے جو ازمیر جیسی دس سلطنتوں پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ کاش میں رایوں کو شکست خوردہ دیکھنے تک زندہ رہ سکوں۔ میری کچھ اور ہشیں بھی ہیں۔ اوغیر، تم ذرا باہر چلے جاؤ۔"

اوغیر نے سرِ تسلیم خم کیا اور باہر چلا گیا۔ تب سہراب مجھ سے الب ہوا۔

"تم نے جو کچھ کہا تھا، وہ سچ نکلا اور یہ معجزے سے کم نہیں۔ تم بنا عجیب و غریب اور پُراسرار قوتوں کے مالک ہو اور بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے ایک بار پھر جوان بنا دو۔"

"اگر آپ اسے میری گستاخی نہ سمجھیں تو میں عرض کروں گا کہ میری ساحرانہ قوت آپ کو دوبارہ جوان بنانے سے قاصر ہے۔" میں نے اُدب سے جواب دیا۔

یہ سُن کر اُس نے ٹھنڈی سانس لی، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اگر تم مجھے دوبارہ جوانی عطا نہیں کر سکتے تو نہ سہی میری صحت ہی بحال کر دو تاکہ مجھے کچھ عرصہ زندہ رہنے کی مہلت مل جائے اور جو کچھ میں نہیں کر سکا، تمھیں کرتا دیکھ سکوں۔"

"یہ بھی میرے بس سے باہر ہے میرے عظیم محسن۔ آپ اُس بیماری

میں مُبتلا ہیں جسے میری دُنیا میں سرطان کہا جاتا ہے اور یہ لاعلاج مرض ہے۔ اگر یہ میرے بس میں ہوتا تو مَیں اپنی زندگی دے کر آپ کی حیات کو طول دے دیتا۔"

سہراب کو سوچتے وقت اپنی چوبچ دار ناک کھجانے کی عادت تھی۔ وہ اپنی ناک کھجاتا اور سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"یہ بھی اچھا ہے سرفروش کہ مَیں دوبارہ جوان اور صحت مند نہیں بن سکتا ورنہ سب سے پہلے مَیں تمھیں قتل کر دیتا۔ اب تمھارا میرا نباہ ہو جائے گا اور مَیں اپنی قوتِ ارادی سے اُس وقت تک ضرور زندہ رہوں گا جب تک کہ تم آشوریوں کو مغلوب کر کے میرے خوابوں کو تعبیر نہیں دے دیتے۔"

جب سہراب چلا گیا تو مَیں نے ادغیر کے ساتھ حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا۔ وہ بلاشبہ ایک تجربہ کار سپاہی تھا۔ مَیں نے اُس سے آشوریوں کے متعلق بات کی تو وہ بولا۔

"سہراب آشوریوں کو مغلوب دیکھنے کا آرزومند ہے لیکن اُن پر غالب آنا بہت مشکل ہے۔ وہ ہم سے زیادہ اچھے جنگجو ہیں۔ وہ کوہستانی علاقے میں رہتے ہیں جہاں گاڑیاں کارآمد نہیں رہتیں۔ پھر وہ چھپ کر حملہ کرتے اور بھاگ جاتے ہیں۔ مَیں زندگی بھر اُن سے نبرد آزما رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُن پر فتح حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سہراب کو وعدوں پر ٹالتے رہیں۔ وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہے گا لیکن بظاہر جنگ لڑنے کی تیاریاں ضرور شروع کر دیں۔ اس طرح فوج منظم ہو جائے گی اور آشوری بھی متوقع حملے کے پیشِ نظر متردد و پریشان ہوں گے۔ مگر خلیج عبور کر کے حملے کی غلطی ہرگز نہ کیجیے گا ورنہ کاہن اعظم نگ کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ آپ جھوٹے اور نام نہاد بہادر ہیں۔"

مَیں ادغیر کو پسند ضرور کرتا تھا لیکن اُس کا یُوں برتری کے انداز میں مشورہ دینا مجھے پسند نہ آیا۔ اس طرح وہ آگے چل کر ہر معاملے میں دخل اندازی کر سکتا تھا اس لیے مَیں نے اُسے پہلے ہی قدم پر ٹوک دینا مناسب سمجھا اور بولا۔ "مَیں جھوٹا نہیں ہوں ادغیر۔ مَیں نے جو کہا تھا وہ سچ ثابت کر دکھایا۔"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "مَیں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن مَیں نہیں سمجھتا کہ آپ کا کوئی معجزہ آشوریوں کو شکست دے سکتا ہے۔ ویسے آپ ولی عہد اور مرضی کے مالک ہیں۔ مَیں صرف ایک کپتان اور آپ کا مخلص خادم ہوں۔"

"بس تو پھر اتنا یاد رکھو کپتان کہ فیصلے کرنا میرا کام ہے اور اُن پر عمل کرنا تمھارا۔" مَیں نے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ مَیں یہ بات کبھی نہیں بھولوں گا۔" اُس نے جواب دیا۔

"آج رات تمھیں میرا ایک کام کرنا ہو گا ادغیر۔ اُس کے بدلے میں تمھارے اور تمھارے آدمیوں کے لیے کچھ کروں گا۔ کیا تمھیں عورتوں سے دلچسپی ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"یقیناً جنابِ عالی۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ وضاحت کریں گے؟"

"تم جانتے ہو کہ سہراب نے مجھے حسین و جمیل عورتوں پر مشتمل ایک حرم دیا ہے۔ فی الوقت مجھے حرم کی ان حسیناؤں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" مَیں نے کہا۔

"یہی ایک بات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ آپ عام انسانوں سے بلند ہیں ورنہ کوئی ایسا مرد ہے جو حُسن و جوانی سے گریز کرے۔" ادغیر بولا۔ "آپ آج رات مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟"

"سہراب کے حرم میں طاؤسہ نامی ایک عورت شامل ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ آج رات تم اُسے یہاں لے آؤ۔ تم چاہو تو سہراب کو بھی یہ بات بتا سکتے ہو۔ جب اُسے اُس کے بُلاوے کا مقصد معلوم ہو گا تو اُسے بھی طاؤسہ کے یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"میرے خیال میں اُسے بتانا مناسب نہیں ہو گا۔ ہرچند کہ وہ اب عورتوں سے بے نیاز ہو چکا ہے مگر اس سلسلے میں جذبۂ رقابت سے بے نیاز نہیں ہوا۔ تاہم آپ طاؤسہ کو کیوں بُلانا چاہتے ہیں؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ادغیر۔ اس کام کے عوض تم اپنے اور اپنے آدمیوں کے لیے جتنی کنیزیں چاہو، میرے حرم سے لے سکتے ہو۔"

"شاید آپ میرا مطلب نہیں سمجھے جناب۔ مَیں نے وجہ اس لیے پوچھی تھی کہ اب آپ کا اور سہراب کا رشتہ باپ بیٹے جیسا ہو گیا ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ آپ کے اور اُس کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ تاہم یہ کام آسانی سے ہو جائے گا۔ طاؤسہ آج رات آپ کی خواب گاہ میں پہنچ جائے گی۔"

اور رات کو طاؤسہ میری خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ جونہی اُس نے مجھے دیکھا، گھٹنوں کے بل جھکی اور کانپنے لگی۔ مَیں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے طاؤسہ؟ کیا تم مجھ سے خوفزدہ ہو؟"

"ہاں شہزادے۔ اب آپ ولی عہد ہیں اور مَیں وہی معمولی سی کنیزِ حرم۔" وہ بولی۔

"لیکن مَیں تمھارے لیے صرف سرفروش ہوں طاؤسہ اور صرف سرفروش ہی رہوں گا۔ مَیں تمھارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر حرم میں نہیں آ سکتا تھا۔ اسی لیے مَیں نے تمھیں زحمت دی ہے۔ تمھیں یہاں آنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "ادغیر کی بات کسی میں ٹالنے کی ہمت ہے نہ اس پر اعتراض کرنے کی۔"

"تمھاری سہیلی روشی کیسی ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"اب اُسے یہ پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میری بجائے اُس نے تمھیں پہل تحفظ نہ دیا ورنہ وہ انعام کی حقدار ٹھہرتی۔"

"ارے ہاں۔ انعام کی مستحق تو تم ہو اور تمھیں انعام ضرور ملے گا۔"

"مجھے کسی انعام کی نہیں بچّے کی ضرورت ہے اور تم نے وعدہ کیا تھا کہ جب تم اپنے اصلی رُوپ میں آ جاؤ گے تو مجھے بیٹا ضرور ملے گا۔" اس نے مجھے وہ وعدہ یاد دلایا جو مَیں نے محض اپنی جان بچانے کے لیے کر لیا تھا اور جسے صرف قدرت ہی پُورا کر سکتی تھی۔

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے طاؤسہ۔ تم نے پہلے بھی مجھ پر احسان کیا تھا اور اب بھی مَیں تم سے ایک اور احسان کا متمنی ہوں۔"

"وہ کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"مَیں جانتا ہوں کہ میرے بارے میں لوگ بہت سی باتیں کر رہے ہیں اور میرے خلاف سازشیں بھی کی جائیں گی۔ اس لیے مَیں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اعتماد کی کچھ سہیلیوں سے کہو کہ وہ میرے بارے میں جو کچھ سُنیں یا اُنھیں کسی سازش کا علم ہو تو وہ تمھیں بتا دیا کریں اور تم وہ سب مجھے بتا دیا کرو۔"

"یہ کوئی بڑی بات نہیں سرفروش۔ حرم کی عورتوں کو اُن لوگوں سے بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے جن سے وہ چوری چھپے ملتی ہیں لیکن سہراب کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ مَیں تمھارے لیے کیا کر رہی ہوں ورنہ وہ رقابت میں میرا سر قلم کروا دے گا۔"

"اُسے بالکل معلوم نہیں ہو گا طاؤسہ۔ تم بے فکر رہو۔" مَیں نے اُسے یقین دلایا۔

کچھ دیر بعد جب وہ میری خواب گاہ سے نکلی تو بڑی آسودہ اور مطمئن تھی۔

مَیں بستر پر لیٹ کر حالات پر غور کرنے اور مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اتنے میں وہ گھنٹیاں بج اُٹھیں جو دروازے پر آویزاں پردے کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ مَیں فوراً چوکنا ہو گیا۔ رات کو اس وقت میری خواب گاہ میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن گھنٹیوں نے کسی کی آمد کا اعلان کیا تھا۔ مَیں نے لپک کر کرسی پر رکھی تلوار اُٹھا لی اور اُس پردے کی طرف بڑھا جو کچھ اُبھرا ہُوا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اُبھار اس بات کا ثبوت تھا کہ کوئی پردے کے پیچھے چھپا ہُوا ہے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر تلوار کی نوک اُس اُبھار پر رکھ دی اور بولا۔

"باہر آ جاؤ ورنہ تلوار تمھارے جسم کے آر پار ہو جائے گی۔"

پردے کے پیچھے سے آواز آئی۔ "تم شہزادی فرازیہ سے مخاطب ہو سرفروش۔ ادب سے بات کرو۔"

• •

فرازیہ کی آواز میں بڑی نغمگی اور کھنک تھی۔ مَیں تین قدم پیچھے ہٹا اور بولا۔

"مَیں چشم براہ ہوں شہزادی۔ باہر تشریف لائیے۔"

پردہ درمیان سے وا ہُوا تو گھنٹیاں پھر بج اُٹھیں اور

شہزادی باہر آکر رُک گئی۔ وہ اتنی حسین ہوگی، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ سرو قد تھی، ماہ وش تھی اور ازمیر کی پہلی عورت تھی جس کے حسین سراپا کا بالائی حصّہ بھی لباس میں مستور تھا۔ اُس کے بال سُرخ تھے اور آنکھیں سبز زمرّد کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے تیکھے خدوخال، دیکھنے والے کو پہلی نظر میں دیوانہ بنا دینے کے لیے کافی تھے۔ میں دو قدم مزید پیچھے ہٹا اور قدرے جُھک کر اُسے تعظیم دیتے ہُوئے بولا۔

" مجھے خوشی ہے کہ بالآخر ہماری ملاقات ہو گئی لیکن یہ ملاقات اس انداز میں متوقع نہیں تھی۔" آپ کب سے پردے کے پیچھے کھڑی تھیں؟ اور یہاں کیسے آئیں؟"

اُس نے جواب دینے کی بجائے سبز سمندروں جیسی گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی تیز سانسیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ کافی دیر سے پردے کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس امر کی گواہی اس کے چہرے پر چمکنے والے پسینے کے قطرے بھی دے رہے تھے پھر وہ بولی۔

" میں اُس وقت سے یہاں کھڑی ہوں جب تم اُس کشتی سے باتیں کر رہے تھے اور تمھاری خواب گاہ میں دریچے سے داخل ہُوئی تھی..."

" مگر باہر محافظ موجود ہے۔" میں نے کہا۔" کیا وہ آپ کا آدمی ہے؟"

" نہیں۔ وہ تمھارا وفادار ہے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ پہلے کبھی میں بھی اِس محل میں رہتی تھی۔ یہاں دریچے تک پہنچنے کے لیے ایک زمین دوز خفیہ راستہ موجود ہے۔ میں اسی راستے سے آئی اور انتظار کرتی رہی کہ تمھارا محافظ حوائجِ ضروری کے لیے ہٹے تو میں اندر آجاؤں۔"

" اوہ۔ مجھے واقعی اُس راستے کا علم نہیں تھا۔ آپ کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں گی تشریف رکھیے۔" اور ساتھ ہی میں نے کُرسی کی طرف اشارہ کیا۔ مگر وہ کُرسی کی بجائے بستر پر بیٹھ گئی اور عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی جن میں غصّہ بھی تھا اور غرور بھی... میں خاموش ہی رہا تو وہ بولی۔" تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیوں آئی ہوں؟"

" میرا خیال ہے کہ آپ خود نہیں آئیں بلکہ ارژنگ نے آپ کو بھیجا ہے۔"

" ہاں یہ صحیح ہے۔" اُس نے کہا۔" وہ تم سے ملنا اور باہمی دلچسپی کے معاملات پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔"

" تو وہ خود ہی مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا؟" میں نے پُوچھا۔

" فی الوقت وہ بے حد مصروف ہے اس لیے خود نہیں آسکتا۔"

" آپ ٹھیک کہتی ہیں شہزادی۔ وہ میرے اور سُہراب کے خلاف سازش کی منصوبہ بندی میں اتنا مصروف ہے کہ اُسے مجھ سے ملنے کا وقت نہیں مل سکتا۔ وہ سُہراب کی موت کا بھی شدّت سے منتظر ہے۔ اُسے کہہ دیجیے گا کہ وہ اتنا بے صبرا نہ بنے سُہراب کسی بھی وقت مَر سکتا ہے۔ اُس کے بعد اُسے صرف مجھ سے نمٹنا پڑے گا۔"

شہزادی فرازیہ بڑے اطمینان سے میری بات سُنتی اور مُسکراتی رہی پھر اُس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔" تمھیں ارژنگ کے بارے میں بڑی غلط فہمی ہے سرفروش۔ تم نے اس کے متعلق صرف سُہراب اور اُس کے دوستوں کی باتیں سُنی ہیں تمھیں یک طرفہ باتوں سے نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے۔"

" آپ کی دلیل میں وزن ہے شہزادی۔" میں بولا۔" میں آپ کے کاہنِ اعظم سے کب اور کہاں ملوں؟"

وہ بستر سے اُٹھ کر میرے قریب آگئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس کا شاداب مہکتا سراپا پُکار بن کر رہ گیا ہو۔ اُس کے نیم وا لب بہت ہلکے تھرتھرا رہے تھے اور سانسیں اُلجھی اُلجھی سی لگ رہی تھیں۔

" کل دوپہر کو... نصف النہار کے وقت۔ کیا تم نے اہراموں والا میدان دیکھا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

" کیا وہ اہرام بھی دیکھ چکے ہو جو سُہراب اپنے لیے تعمیر کروا رہا ہے؟" فرازیہ نے پوچھا۔

" ہاں۔ مگر میں نے اُسے دُور سے دیکھا تھا۔" میں بولا اور اس کے ساتھ ہی مجھے سُہراب کی بات یاد آگئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کے آباو اجداد نے اپنے لیے چھوٹے چھوٹے اہرام تعمیر کروائے تھے مگر وہ اپنے لیے اُن سے کئی گُنا زیادہ وسیع و عریض اور بلند اہرام بنوا رہا ہے جس کے نیچے بھُول بھلّیاں ہوں گی تاکہ اس کے مرنے کے بعد کوئی بھی اُس کی قبر سے ہڈّیاں نکال کر اُن کی بے حُرمتی نہ کر سکے۔" میں سُہراب کی اس سوچ پر مُسکرا دیا۔ شہزادی فرازیہ میری مُسکراہٹ کے کچھ اور معنی لیتے ہُوئے بولی۔

" تمھیں ارژنگ سے نہیں ڈرنا چاہیے سرفروش بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میری طرح وہ بھی تم سے کچھ خوفزدہ ہے اور مفاہمت کی شرائط طے کرنا چاہتا ہے۔"

" میں اُس سے ضرور ملوں گا شہزادی۔ مگر تنہا نہیں آؤں گا۔"
نے کہا۔

" ٹھیک ہے۔ وہ زیرِ تعمیر اہرام کے درمیانی حصّے میں رہتا
اب اپنے محافظ کو دروازے پر بلاؤ تاکہ میں دریچے سے
کل جاؤں۔"

یں نے دروازے پر جا کر محافظ کو پُکارا تو وہ دریچے کی
یل دی۔ جب محافظ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے کہا۔
ں کہیں پائیں میں ایک زمین دوز خفیہ راستہ ہے کہاں؟ یہ
ہیں جانتا مگر ہے ضرور۔ تم کچھ آدمیوں کے ساتھ اُسے تلاش
ور جب تک وہ راستہ تلاش نہ کر لو، میرے پاس نہ آنا۔"

محافظ نے مجھے تعظیم دی اور چلا گیا۔

میں نے بستر پر لیٹ کر ارتکازِ توجہ سے دوبارہ کمپیوٹر کو
بھیجنا چاہا لیکن میرا کرسٹل کام نہیں کر رہا تھا اس لیے میں
یا۔

• •

دوسرے روز جب میں، اوغیر اور محافظ دستے کے ساتھ گھوڑے
محل کے جنوب میں واقع اہراموں والے میدان کی طرف بڑھ رہا تھا
یر بڑا کبیدہ خاطر تھا۔ میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور میدان
زہ لینے لگا۔ یہ میدان چاروں طرف میلوں تک پھیلا ہُوا تھا۔ اس
جا بجا مخروطی اہرام بنے ہُوئے تھے۔ انھی کے درمیان سہراب کا
م اہرام بھی زیرِ تعمیر تھا۔ اتنے میں اوغیر بول اُٹھا۔
" آپ کا یہ اقدام نہ میری سمجھ میں آیا ہے اور نہ سہراب اسے پسند
گا۔ ارژنگ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا جناب! ایک جانب وہ
ن اعظم ہے اور دوسری طرف وہ مقبروں کے درمیان ایک زیرِ تعمیر
م میں رہتا ہے۔ سازشیں اور کالا جادو کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ
ہمیں کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

میں نے اُس کی بات پر ایک نظر اپنے دس مسلّح سواروں کی
دیکھا۔ میں خود بھی پوری طرح مسلّح تھا اور اوغیر بھی... میں نے
ہُوئے اوغیر سے کہا۔

" اگر ہم لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں کاہنوں پر غالب
آ سکتے تو ہمیں سپاہ گری چھوڑ دینی چاہیے اوغیر... تمھیں
ہٹ ہو رہی ہے تو میں خود اُن سے نمٹ لوں گا اور ہاں... اگر
ں یہ ملازمت پُر خطر نظر آتی ہے تو تم مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہو۔"

" آپ میرا مطلب نہیں سمجھے جناب!" اوغیر نے جواب دیا۔
پ تو دیوتا یا دیوتاؤں جیسے انسان ہیں اور اُن چیزوں سے خوفزدہ

نہیں ہو سکتے جن سے ایک عام آدمی ڈرتا ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ ارژنگ اور اُس کے کاہن بڑے خوف ناک ہیں۔ اُن کے پاس عجیب الخلقت بلائیں ہیں جنھیں دیکھ کر آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔"

" وہ اُن بلاؤں سے کیا کام لیتے ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

" وہ بلائیں اُن کے خزانے کی حفاظت کرتی ہیں جناب! اگر کوئی خزانہ چُرانے کے لیے بھُول بھلّیوں میں جاتا ہے تو بلائیں اُس کا خون پی جاتی اور پرخچے اُڑا دیتی ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ اُن کاہنوں کے پاس، جن کا سربراہ ارژنگ ہے، بہت بڑا خزانہ ہے۔"

" جب تک میں یہ بلائیں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ مجھے یقین نہیں آئے گا۔" میں نے اُسے جواب دیا اور زیرِ تعمیر مقبرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

سہراب کا یہ اہرام سطحِ زمین سے تقریباً تین سو فٹ اُونچائی تک بن چُکا تھا اور ابھی اس کی تعمیر جاری تھی۔ اس کے چاروں طرف مختلف قسم کی عجیب سی مشینیں اور ہزاروں مزدور کام کر رہے تھے۔ سنگِ مرمر سے تیار ہونے والی یہ یادگار فنِ تعمیر کا نادر نمونہ تھی۔ اوغیر نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہُوئے کہا۔" میں نہیں سمجھتا کہ سہراب اپنے اس مقبرے کی تکمیل تک زندہ رہ سکے گا۔ یہ تین سو ہاتھ اُونچائی تک بن چُکا ہے مگر وہ اسے مزید تین سو ہاتھ اونچا بنوانا چاہتا ہے۔ ہاں اگر اُس کے پاس مزید ایک لاکھ غلام ہوں تو شاید یہ اُس کی زندگی میں مکمل ہو جائے۔"

" اس اہرام کا معمار کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

" اُس کا نام فرہاد ہے۔ وہ ایک باکمال معمار ہے۔ میں نے ہی اُسے عین اُس وقت گرفتار کیا تھا جب اُس نے خلیج عبور کر کے ازمیر کی سرزمین پر قدم رکھے تھے۔"

" لیکن مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ آشوری ہتھیار ڈالنے اور غلام بننے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔" میں نے تعجب سے کہا۔

" یہ سچ ہے جناب!" اوغیر بولا۔" مگر فرہاد کا معاملہ استثنا میں شمار ہوتا ہے۔ لوگ سہراب کو احمق سمجھتے ہیں مگر وہ بڑا مردم شناس ہے اُس نے فرہاد کو اپنی قابلیت اور ذہانت دکھانے کا موقع دیا۔ اب وہ آزاد شہری ہی نہیں، ایک بڑا عہدے دار بھی ہے۔"

" میں اُس سے ملنا اور کچھ باتیں کرنا چاہوں گا اوغیر۔" میں نے کہا۔" اگر مجھے آشوریوں پر فوج کشی کرنی ہے تو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لوگ کیسے ہوتے ہیں۔"

" آپ کی مرضی جناب، ورنہ میں آشوریوں پر چڑھائی کو حماقت

سمجھتا ہوں۔ جہاں تک فرہاد کا معاملہ ہے۔ وہ کوئی عام سا آشوری نہیں بلکہ ایک قابل اور پڑھا لکھا آدمی ہے۔ دراصل آشوریوں کے سربراہ حُمیر سے اس کا اختلاف ہوگیا تھا جو بڑا وحشی اور ظالم آدمی ہے۔ اس لیے فرہاد وہاں سے فرار ہو کر یہاں آگیا۔"

"حُمیر کے متعلق بعد میں بات کریں گے مگر آج ارژنگ سے ملاقات کے بعد تم مجھے فرہاد سے ضرور ملاؤ گے۔" میں نے ادغیر کو حکم دیا تو وہ سر جھکا کر راضی ہوگیا۔

ہم اہرام کے مغربی اور شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مشرقی جانب آئے تو غار نما دروازے پر دو کاہن کھڑے دکھائی دیئے۔ اس سرزمین پر آمد کے بعد میں نے پہلی بار "کوّے" دیکھے تھے۔ چونکہ یہ لوگ ازسرتاپا سیاہ لبادوں میں لپٹے رہتے تھے، اس لیے عرفِ عام میں کوّے کہلاتے تھے۔

مَیں نے محافظ دستے کے سپاہیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا اور ادغیر کے ساتھ اُن کاہنوں کی طرف بڑھ گیا۔ ادغیر نے اُن میں سے طویل القامت کاہن سے کہا۔

"ولی عہدِ سلطنت کاہن ارژنگ کو شرفِ ملاقات بخشنا چاہتے ہیں۔ اس تک ہماری رہ نمائی کرو۔" یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی شمشیر کے دستے پر چلا گیا۔

کاہنوں نے ادغیر کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اپنی ہیروں کی مانند چمکتی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔ انھوں نے اپنے سیاہ لبادوں پر سفید پٹیوں میں خم دار خنجر اُڑس رکھے تھے جن کی نیام میں ہاتھی دانت کی تھیں۔ جب وہ بولے تو پتہ چلا کہ اُن کی آواز بے حد کرخت ہے جس سے بے رحمی بھی جھلکتی ہے۔ دراز قد کاہن نے کہا۔ "کیا تم ہی سرفروش ہو؟"

"ہاں . . ." مَیں نے جواب دیا۔ "مجھے ارژنگ کے پاس لے چلو۔" اور یہ کہتے ہوئے مَیں گھوڑے سے اُتر گیا۔ ادغیر نے بھی میری تقلید کی مگر مَیں نے اُسے وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور دراز قد کاہن کے پیچھے پیچھے جانے لگا جو سر جھکائے میری رہ نمائی کر رہا تھا۔

ہم غار نما دروازے سے پُرپیچ راستہ طے کرتے ہوئے ایک بڑے ہال میں پہنچے جس کی ہر جانب بہت سی راہداریاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ساری راہداریاں ایک ہی طرز کی تھیں اور اُن میں روشنی کا عجیب انتظام تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر راہداری میں کسی پہیے کی تاروں کے پیچھے سے روشنی ڈالی جا رہی ہے جس سے اندھیرا اور اجالا لکیروں میں بٹ گیا ہے۔ کاہن نے ایک دیوار سے آویزاں شمع دان اُتارا اور حسبِ سابق خاموشی سے میرے آگے آگے چلنے لگا۔ یہ راہداری ہمیں ایک اور ہال میں لے آئی جس کے چاروں طرف ویسی ہی راہداریاں بنی ہوئی تھیں۔ کاہن اور مَیں ایسے متعدد کمروں سے مختلف سمتوں کی راہداریوں سے گزرتے رہے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ مَیں زندگی بھر ان بھول بھلیوں سے نہیں نکل سکتا۔ اب کاہن کی رفتار تیز ہوگئی تھی، جیسے وہ مجھے بھول بھلیوں میں اُلجھا کر خود نکل جانا چاہتا ہو۔ مَیں نے بھی اپنی رفتار بڑھا لی تاکہ اگر وہ میرے ساتھ کوئی چال چلے تو میں اُسے تلوار کی نوک پر رکھ لوں۔ درجنوں کمروں اور راہداریوں کو عبور کرتے ہوئے بالآخر وہ ایک سُرنگ میں داخل ہُوا جس کے اختتام پر تنگ سیڑھیاں اُوپر چلی گئی تھیں۔ یہ زینہ چڑھنے کے بعد ہم ایک گول کمرے میں آئے جس کے وسط میں ایک گڑھا تھا اور اس گڑھے پر ایک چوبی چبوترہ بنا ہُوا تھا۔ کاہن نے مجھے اُس چبوترے پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔

جب میں چبوترے پر چڑھا تو وہ چوکی نما چبوترہ ایک دم تیزی سے نیچے جانے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں کسی گہرے کنوئیں میں گر رہا ہوں۔ مَیں نے بے ساختہ اپنی تلوار نکال لی اور دُکھ سے سوچا کہ مجھے ادغیر کو اپنے ساتھ لانا چاہیے تھا مگر اَب کیا ہو سکتا تھا۔ اچانک وہ چبوترہ یوں تھم گیا جیسے لفٹ رُک جاتی ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ اس کھوہ میں چاروں طرف دروازے بنے ہوئے ہیں مگر اُن میں سے صرف ایک سے روشنی اندر آرہی تھی۔ مَیں اُسی دروازے سے باہر نکل آیا۔

یہ ایک بڑا کمرہ تھا جس کی ایک دیوار کے ساتھ آگ جل رہی تھی اور مدّھم سی سُرخ روشنی اُسی آگ سے پھُوٹ رہی تھی۔

کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری تھی جس سے مجھے اُلجھن ہونے لگی مگر میں تلوار تھامے وہیں کھڑا رہا . . . پھر میری دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی چلی گئیں۔ اس مدّھم روشنی میں مجھے ایک ہیولا اپنی طرف بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

یہ شہزادی فرازیہ کا ہیولا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی، میرے قریب آئی اور رُک گئی۔

آج، وہ کل رات سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی اور اس نے نازمیر کی عام خواتین کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے جسمانی حُسن نے مجھے مسحور سا کر دیا۔ وہ شہہ دینے والے انداز میں نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرائی مگر پھر ایک دم مڑ گئی اور بولی۔

"اپنی تلوار نیام میں ڈال لو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ارژنگ تمھاری راہ دیکھ رہا ہے۔"

میں نے تلوار نیام میں ڈال دی مگر میرا ہاتھ اُس کے دستے پر ہی رہا اور میں فرازیہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کمرے سے بھی متعدد راہداریاں نکلتی تھیں۔ وہ ایک راہداری میں داخل ہوئی جو ہمیں ایک اور کمرے میں

لے آئی۔ یہاں بہت سے انسانی پنجر رکھے اور لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے یوں
سوس ہُوا، جیسے یہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اتنے میں فرازیہ بولی: "ارژنگ
ہت بڑا عالم ہے سرفروش۔ یہ پنجر کسی کو ڈرانے کے لیے نہیں لٹکائے گئے
ہ ان پر تجربے کرتا ہے۔ یہ جسمِ انسانی کے مطالعے کی غرض سے یہاں رکھے
ئے ہیں ارژنگ ایک ایک عضو کی ہڈی کا نام جانتا ہے۔"

پھر ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک کونے میں
ی جل رہی تھی۔ آگ کی تپش سے کمرہ خاصا گرم ہو رہا تھا۔ فرازیہ نے
ا: "جب ارژنگ کو کسی ایسے اوزار کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے
ں نہ ہوں تو وہ خود اُسے ڈھال لیتا ہے۔ اس نے بہت سی کلیں
ایجاد کرنی ہیں جو خود بخود کام کرتی ہیں۔"

میں نے فرازیہ کو کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے لگا کہ ارژنگ کوئی
م سا کاہن نہیں اور اس سے برابر کی ٹکر ہوگی۔

فرازیہ چمڑے کے ایک بھاری پردے کے پاس رُک گئی اور
: "ارژنگ تمھارا منتظر ہے۔ پہلے وہ خود علیحدگی میں تم سے بات کرے
ا۔ جاؤ۔"

میں پردہ ہٹانے کے لیے آگے بڑھا تو فرازیہ ایک دم تیزی میں
ئی اور مجھ سے ٹکرا گئی۔ اس حسین ٹکرے سے میرے جسم میں جیسے برقی
رو دوڑ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارژنگ سے ملاقات کے بعد تمھاری اور میری ملاقات
ی ہوگی۔ میں تمھارے متعلق جاننے کے لیے بے چین ہُوں۔" پھر اُس
نے سامنے سے ہٹ کر خود ہی پردہ ہٹا دیا اور میں اندر چلا گیا۔

یہ کمرہ نسبتاً چھوٹا اور مختلف چیزوں سے اَٹا ہُوا تھا۔ کہیں مختلف
نوروں کے پنجر رکھے تھے اور کہیں انسانی کھوپڑیاں۔ ایک جانب
بیق اور ایسے آلات بھی رکھے نظر آئے جو سائنسی لیبارٹریوں میں
تعمال کیے جاتے ہیں۔ کمرے کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی اور
ش دان کے سامنے ہی ایک بڑی میز کے پیچھے ارژنگ بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ
ب الداخل والے کاہنوں کی طرح سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا۔

"آگ کی روشنی میں آجاؤ سرفروش۔ تقریباً تین ہفتے پہلے جب
ں نے تمھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو تم بچے تھے۔ روشنی میں آجاؤ تاکہ وہ
جزہ میں بچشمِ خود دیکھ سکوں جو ان تین ہفتوں کے دوران تمھاری شکل میں
رنما ہُوا ہے۔"

میں آتش دان میں بھڑکنے والے شعلوں کی لرزتی روشنی میں آگیا۔
یا تم ہی کاہنِ اعظم ارژنگ ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں ہی ارژنگ ہوں اور تم ہی وہ سرفروش ہو جسے میں
نے ایک بچے کی شکل میں دیکھا تھا۔ کس شعبدے نے تمھیں دنوں میں اتنا
بھرپور جوان بنا دیا ہے؟ میں اُس شعبدے سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اپنے سینے میں سمیٹا ہُوا تمام علم نذر کرنے کو تیار ہوں۔"

میں روشنی سے اندھیرے میں پلٹ گیا۔ خدا معلوم یہ اُس کمرے کے ماحول یا کاہن ارژنگ کی شخصیت و آواز کا اثر تھا یا کچھ اور کہ مجھے اپنے دل میں خوف و ہراس کروٹیں لیتا محسوس ہُوا۔ میں نے اپنے

جسم میں بھی ایک لرزہ سا محسوس کیا مگر اُس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمھاری خواہش پُوری کر دی ہے ارژنگ۔ اب تم اپنا رُخ روشنی کی طرف موڑ دو تاکہ میں بھی تمھیں دیکھ سکوں۔"

وہ ہنسا اور یہ کہہ کر اُس نے اپنا رُخ روشنی کی طرف موڑ دیا۔

"تم یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہو سرفروش۔"

میں نے آتش دان کی لرزتی روشنی میں اُس کے چہرے پر نظر ڈالی جو زعفران کی طرح زرد تھا اور اُس میں دو بڑی سیاہ آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اُس کا سر لمبوترا اور گردن کسی کرگس کی طرح لمبی تھی جس میں نیلی رگیں اُبھری ہُوئی یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے جونکیں چمٹی ہُوئی ہوں۔ ان سب سے زیادہ عجیب یہ بات تھی کہ نہ اُس کے سر پر بال تھے، نہ داڑھی مونچھیں اور نہ بھویں۔ وہ ایک انڈے کی طرح سفید اور چکنا نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر تعجب ہُوا کہ شہزادی فرازیہ اُسے کیسے پسند کرتی ہے۔ اتنے میں وہ یوں بول اُٹھا جیسے اُس نے میرا ذہن ایک کھُلی کتاب کی طرح پڑھ لیا ہو۔ "صورت کسی کی ذات، شخصیت اور علمیت کی مظہر نہیں ہوتی نہ جسمانی ساخت سے آدمی کی مہارت اور ہنرمندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تم نے مجھے اچھی طرح دیکھ لیا ہے مگر تم نے وہ کچھ نہیں دیکھا جو میں اصل میں ہُوں۔ بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو سرفروش۔ نہ تم بے وقوف ہو اور نہ میں نادان ہُوں مجھے وقت کا زیاں قطعی پسند نہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ صرف سچ بولیں تو معاملات بہت جلدی اور بڑی آسانی سے طے ہو جائیں گے۔ کیا تم میرے اس خیال سے متفق ہو؟"

"میں اصولی طور پر اس خیال سے متفق ہُوں۔" میں نے اُس کی پشت پر دیوار سے آویزاں اجرامِ فلکی کے ایک نقشے پر نظر ڈالتے ہُوئے جواب دیا۔ اس نقشے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ستارہ شناس بھی ہے۔ وہ پھر بولنے لگا۔

"میں ایک عملی آدمی ہُوں اور طاقت کا خواہاں ہُوں۔ میں اب بھی طاقت ور ہُوں مگر مجھے مزید طاقت و قوت درکار ہے تاکہ وہ سب کچھ کر سکوں جو کرنا چاہتا ہُوں۔ میں تمھیں بآسانی قتل کروا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا محض اس لیے نہیں کیا کہ میرے خیال میں تم میرے اچھے معاون ثابت ہو سکتے ہو اور میں بھی تمھاری مدد کر سکتا ہُوں۔ اگر یہ بات درست ہے تو ہمارے مابین ایک دوسرے کے خلاف مخاصمت سراسر حماقت ہوگی۔"

"یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ میں تمھاری معاونت کر سکتا ہُوں مگر تم میرے مددگار کیوں کر بن سکتے ہو؟ یہ امر وضاحت طلب ہے۔"

وہ ہنسا اور بولا۔ "میں بہت سے طریقوں سے تمھارا معاون بن سکتا ہُوں سرفروش۔ میں تمھیں مفید مشورے بھی دے سکتا ہُوں، بھی کر سکتا ہُوں، تمھارے مفاد میں وحشت و بربریت سے بھی گریز کروں گا اور تمھارے لیے خزانوں کے دروازے بھی کھول دوں گا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تمھاری جان کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

مجھے اُس کی اس بات پر تاؤ آ گیا۔ میں نے دستۂ شمشیر پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔ "تم بار بار میرے قتل کی بات کر کے میری غیرت کو للکار رہے ہو۔ اگر تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ مجھے موت کے گھاٹ اُتار سکتے ہو تو ابھی اسی وقت ایک کوشش کر کے اپنے آپ کو کیوں نہیں آزما لیتے؟"

یہ سُن کر اُس کی آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے لیکن وہ ہنستے ہُوئے بولا۔ "میرا طریقِ کار کچھ اور ہے سرفروش۔" پھر اس نے اپنی کھوپڑی کو انگلیوں سے بجاتے ہُوئے بات جاری رکھی۔ "میری طاقت تلوار میں نہیں دماغ میں ہے۔ میری بات غور سے سنو، ہم بچے، نادان غلام یا سیدھے سادے آدمی نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تمھارا تعلق کس سرزمین، کس ملک سے ہے؟"

اس کا اندازِ تخاطب ایسا تھا جیسے وہ کسی بچے سے ہمکلام ہو۔ اس پر غصّہ تھا اور میں اُسے بآسانی قتل کر سکتا تھا لیکن اس کے بعد مقبرے کی بھُول بھلیوں سے نکل کر باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ "یوں سمجھ لو کہ میں کسی دوسرے سیارے سے آیا ہُوں، کیسے؟ یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ باتیں تمھاری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔"

"اتنے خودپسند اور مغرور و متکبّر مت بنو سرفروش۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں وہ باتیں نہیں سمجھ سکتا؟ کیا تم یقین کرو گے کہ میں بہت پہلے یہ جان چکا ہُوں کہ کائنات میں صرف ہمارا سیارہ ہی نہیں اور بھی بہت سے سیارے ہیں۔ میں زمان و مکاں کے نظریے سے بھی آگاہی رکھتا ہُوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو لیکن ایک مہینے میں تمھارا جوان ہو جانا دیوتاؤں کا معجزہ نہیں۔ یہ دماغ اور علم کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ میں نہ اسے سمجھ سکتا ہُوں نہ ایسا کر سکتا ہُوں لیکن اگر اس کی وضاحت کی جائے تو میں اسے سمجھ بھی جاؤں گا اور کر سکوں گا۔ تم کوئی مافوق البشر نہیں ہو کہ مجھ سے اپنے آپ کو برتر محسوس کرو۔ میں تمھیں زندہ رکھنا اور تم سے سب کچھ سیکھنا چاہتا ہُوں جو تم جانتے ہو۔ مرنے مارنے کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔"

اس کی ان باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ میری ٹکر کا مدِّمقابل ہے۔ میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے ارژنگ۔ وقت آنے پر میں تمھیں بتا دوں گا کہ میں کون ہُوں اور یہاں کیسے آیا ہُوں۔ سمجھنے کا دار و مدار تمھاری صلاحیت و اہلیت پر ہے۔ اس کے بدلے میں تم میری جان و امان کے علاوہ کیا دے سکتے ہو؟"

"تمھیں تحفظ کے علاوہ طاقت اور آزادی بھی ملے گی اور میں تمھیں خزانہ دوں گا یا وہ جگہ دکھا دوں گا جہاں سے تم وہ خزانہ حاصل کر سکو گے۔"

"مگر کس قسم کا خزانہ؟" میں نے پوچھا۔

اس پر اُس نے میز کی دراز کھولی اور کوئی چیز نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے اُسے اُٹھا کر دیکھا تو فرطِ حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ ایک بہت بڑا ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ جو آتشدان کی روشنی میں اس طرح چمک اُٹھا کہ میری آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

میں نے وہ ہیرا اُٹھایا تو اُس کا وزن محسوس کر کے دنگ رہ گیا۔ وہ کم از کم دس پونڈ وزنی تھا۔ میں نے اُسے آتش دان کے سامنے رکھ کر دیکھا تو یوں محسوس ہُوا جیسے اُس کی ہر نوک سے شعلے لپک رہے ہیں۔ میں نے سوچا کاش میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ اتنے میں ارژنگ بول اُٹھا۔

"میں جانتا ہُوں کہ یہ تمھارے لیے بے حد قیمتی ہے۔ اس کی طلب تمھارے چہرے پر لکھی ہُوئی ہے اور یہ بھی جانتا ہُوں کہ اب تم میرے ساتھ سودے بازی کی سوچ رہے ہو۔"

میں نے وہ وزنی ہیرا میز پر رکھتے ہُوئے جواب دیا۔ "تم کسی حد تک ٹھیک سمجھے ارژنگ۔ یہ پتھر تمھیں کہاں سے ملا اور کیا ایسے پتھر آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں؟"

ارژنگ نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور بولا۔ "معلومات حاصل کرنے کے لیے تمھیں بھی معلومات فراہم کرنا پڑیں گی سرفروش۔ یہ بتاؤ کہ تمھاری سرزمین پر اس پتھر کو کیا کہا جاتا ہے؟"

"ہمارے ہاں اسے ہیرا کہتے ہیں اور یہ قیمتی تصور کیا جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہیرا...! میں نے یہ لفظ کبھی نہیں سُنا۔ مہندس فرہاد نے مجھے اس کا استعمال دکھایا تھا۔ یہ پتھر تک کاٹ دیتا ہے۔" وہ بولا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا یہ پتھر یہاں دستیاب ہے؟"

"یہ ازمیر میں نہیں ملتے سرفروش۔ آشوریوں کے ملک میں عام ہیں مگر وہ اسے قیمتی نہیں سمجھتے۔ وہاں اس پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں سے بادشاہوں اور ملکاؤں کے مجسمے بنائے جاتے ہیں۔ وہ بھی اُس وقت جب وہ مر جائیں۔ اگر تم اسے قیمتی سمجھتے اور حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمھیں خلیج کے پار آشوریوں کے ملک پر حملہ کرنا پڑے گا۔ مگر یہ آسان کام نہیں۔ آشوریوں کا سردار شمیر بڑا جنگجو ہے۔ اُسے شکست دینے والا اُس سے زیادہ بہادر اور جنگجو ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بھی جنگجو نظر آتے ہو۔ مگر کیا تم حقیقتاً بھی جنگجو ہو؟"

"یقیناً۔" میں نے اُسے جواب دیا۔ "اگر تمھارے پاس کوئی جنگجو سُورما ہو تو اُسے آزما سکتے ہو۔"

ارژنگ نے میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ "ہاں میرے پاس جنگجو سورما ہے لیکن میں وقت آنے پر اُسے تمھارے مقابل لاؤں گا۔ اب ہمیں پھر اُسی موضوع پر آ جانا چاہیے۔ اگر تمھیں ہیرے درکار ہیں تو تمھیں آشوریوں پر فوج کشی کرنا ہوگی۔ تم ان پر میری مدد کے بغیر فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ بولو کرتے ہو سودا؟"

میں اُس کی اِس بات پر سوچنے لگا کہ آخر اُس کے دل میں کیا ہے۔ وہ مجھے خاموش دیکھ کر قدرے بے تابی سے بولا۔ "میں یہ بات تمھیں ابھی نہیں بتانا چاہتا تھا مگر شاید یہ تمھیں فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے، اس لیے بتلائے دیتا ہُوں کہ سہراب مر چکا ہے۔ اُسے مرے ہُوئے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہُوا کہ وہ مر چکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آئینے کے عکس کے ذریعے جو پیغام دیے جاتے ہیں، اُن سے۔ کیا تم نے یہاں آئینوں کے ذریعے پیغاموں کی ترسیل ہوتے نہیں دیکھی؟"

میں کئی بار آسمان پر آئینوں کی چمک دیکھ چکا تھا مگر اُس کا مقصد نہیں سمجھ پایا تھا۔ ہمارے ہاں اس طریقِ کار کو ہیلیوگراف کہا جاتا ہے۔ مجھے ارژنگ کی بات کا یقین آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ "تمھیں کیا پیغام ملا ہے؟"

"سہراب طبّی امداد ملنے سے پہلے ہی مر گیا۔ یہ ایک گھنٹہ پہلے کی بات ہے اور میرے جاسوس مجھے غلط اطلاع دینے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

اس خبر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہرچند کہ سہراب ضعیف و ناتواں تھا لیکن بڑی حد تک میرا محافظ و محسن تھا۔ اس نے مجھے اپنا ولی عہد منتخب کیا تھا۔ اب اُس کی موت کے بعد مجھے اپنی طاقت، تلوار اور عیّاری سے کام لینا تھا کہ میرے حامی اور دوست بہت کم تھے۔ ادغیر اور اُس کے بارہ سپاہی میرے لیے کیا اور کتنا کچھ کر سکتے تھے؟ ارژنگ نے مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا۔

"تمھیں یہ سودا کر ہی لینا چاہیے سرفروش۔ نہ میں اپنے لیے کوئی مشکلات و مصائب چاہتا ہُوں نہ تم اپنے لیے پسند کرو گے۔ اگر میں تمھیں قتل کروا دوں تو گھاٹے میں رہوں گا کیونکہ اس علم سے محروم ہو جاؤں گا جو تمھارے پاس ہے۔ کہو، معاہدہ کرتے ہو یا نہیں؟"

"فی الوقت میں تمھارے ساتھ معاہدہ کرنے کو تیار ہوں ارژنگ۔ بتاؤ مجھے کن شرائط پر کاربند رہنا ہوگا؟"

ارژنگ مسکرایا تو اُس کے جھڑے ہُوئے دانتوں والے مکروہ مسوڑھے دکھائی دینے لگے۔ وہ میز پر پڑی ایک کھوپڑی سے کھیلتے ہُوئے بولا۔

"تم دانش مند بھی ہو سرفروش۔ پہلے میری بات سنو، پھر میں تمھارے اعتراضات سنوں گا اگر ہُوئے تو... سب سے پہلے میں یہ چاہتا ہُوں کہ تم شہزادی فرازیہ سے شادی کر لو۔ اسی طرح تخت و تاج پر تمھارا اقتدار

اہلِ ازمیر کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ لوگ مجھ سے ڈرتے اور نفرت کرتے ہیں۔ مجھے ان کی نفرت کی پروا نہیں ہے مگر یہ میرے منصوبوں کے آڑے آتی ہے اس لیے میں پس پردہ رہنا چاہتا ہوں۔ بظاہر تم اور فرازیہ سلطنت پر حکمرانی کرو گے۔ سہراب کی تدفین کے فوری بعد تم دونوں کی شادی ہو جانی چاہیے اور شادی کے بعد آشوریوں پر لشکر کشی۔ میں انھیں تباہ و برباد دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ میرا مذاق اُڑاتے ہیں اور میری مخالفت کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر پہلی بار غصے اور نفرت کے تاثرات آئے۔ "ان کا سردار میر ایک مغرور اور ظالم آدمی ہے۔ اُسے تکبر کی سزا ملنی ہی چاہیے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہ ہیں۔ آشوریوں کے ملک پر قابض ہونے کے بعد ہمارے شمالی علاقے شورش و یلغار سے محفوظ ہو جائیں گے پھر میں مشرق، مغرب اور جنوب کے ممالک فتح کر دوں گا۔ کہو تم مجھ سے متفق ہو؟"

"بشرطیکہ افواج کی کمان مکمل طور پر میرے سپرد کر دی جائے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں فوج کے افسروں کا انتخاب اپنی پسند سے کروں گا اور آشور لور اسے جتنے ہیرے جواہرات لوٹوں گا، انھیں مالِ غنیمت میں سے میرا حصہ سمجھا جائے گا۔ اگر فرازیہ شادی کے لیے تیار ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"مجھے تمھاری شرائط منظور ہیں اور فرازیہ وہی کرے گی جو میں چاہوں گا۔ اب تم محل میں جاؤ اور میری ہدایات کا انتظار کرو لیکن اپنی تیاریاں جاری رکھو۔"

"اچھی بات ہے ارژنگ میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں جانے کے لیے پلٹا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور بولا۔

"سنو۔ فرازیہ تمھاری منتظر ہے۔ وہ بے وقوف نہیں، تم ابھی سے اس پر توجہ دو اور ہاں کسی گڑبڑ کی مت سوچنا کہ میرے جاسوسی ذرائع بہت وسیع ہیں اور اس طرح ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اگرچہ ہم دوست نہیں مگر ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں بن سکتے۔ جذباتی فیصلے ہمیشہ غلط ثابت ہوتے ہیں اس لیے دل کو دماغ پر حاوی مت ہونے دینا۔"

میں باہر جانے لگا مگر حجرے کا پردہ ہٹانے سے پہلے رُکا اور پلٹ کر بولا۔ "میں فرہاد مہندس سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ آشوریوں پر لشکر کشی کے دوران مجھے اس سے کام لینا ہوگا۔"

"بے شک ملو اور اُس سے جو طے کرنا ہو کرو۔ دیوتا ہماری حفاظت کریں۔"

میں باہر نکل گیا۔

دوسرے کمرے میں فرازیہ میری راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی سبز کھولا میں انوکھے تاثرات لیے میری طرف بڑھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک چھوٹے سے حجرے میں لے آئی۔ میں نے اُس کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لی تھی لیکن یہ عجیب سی بات ہے کہ مجھے اُس کی طلب بالکل محسوس نہ ہوئی۔ تاہم میں نے ارژنگ کی ہدایت پر اس کی خواہش کا احترام کیا۔ مگر ایک فرض ناخوشگوار کی طرح۔

ہم اس حجرے میں جب تک رہے، مجھے ہر طرف ایک ناگوار سی بُو پھیلی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ جیسے کہیں چمڑا جل رہا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ میں فرازیہ کو بھی مطمئن نہیں کر سکا۔ اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سا تبسم کھیلتا رہا۔ جاتے وقت میں نے پلٹ کر فرازیہ کی طرف دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ ماحول اور اس کی ہنسی اپنے اندر عجیب سا اسرار لیے ہوئے تھی۔ میں نے فرازیہ سے پوچھا۔

"یہ... یہ سب کیا ہے تمھیں کس بات پر ہنسی آئی؟"

اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔ "کچھ نہیں سرفروش۔ تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکو گے۔ جاؤ تمھیں دیر ہو رہی ہے۔"

مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا مگر حالات کے تحت میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اس لیے چپ چاپ اس راہداری میں آگیا جس کی طرف فرازیہ نے اشارہ کیا تھا۔

اس راہداری میں وہی طویل قامت کاہن میری رہنمائی کو موجود تھا۔ وہ مجھے اوپر اسی دروازے پر لے آیا جہاں سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا اوغیر بڑے مضطرب انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اُس نے خشمناک نگاہوں سے کاہن کو گھورتے مگر خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کو آنے میں مزید کچھ تاخیر ہو جاتی تو میں آپ کی تلاش میں اندر آنے ہی والا تھا اور پھر مجھے جو 'کوا' دکھائی دیتا، میں اُس کا سر کاٹے بغیر نہ رہتا۔" اتنے میں کاہن غائب ہو گیا تھا اُدھر سپاہی کچھ دُور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں نے اوغیر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میری بات توجہ سے سنو اوغیر اور اُس کے بعد فیصلہ کرو۔ حالات بدل چکے ہیں اور مجھے دوستوں کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔"

پھر میں نے اُسے اپنی اور ارژنگ کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو تفصیل سے بتا دی۔ اوغیر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اُس نے مجھے اوپر سے نیچے دیکھا اور پوچھا۔ "آپ نے اُس کی باتوں سے اتفاق کیوں کیا؟"

"میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا اوغیر۔ میں اپنے آپ کو تنہا اور کمزور محسوس کرتا ہوں۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نے اور میرے آدمیوں نے آپ کی وفاداری کا حلف اُٹھایا ہے اور اُسے ہر قیمت پر پورا کریں گے۔" وہ بولا۔

"اوغیر، ذرا عقل سے کام لو میرے دوست۔ درجن بھر سپاہی اور ہم تم کس کس کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟"

"میری آواز پر بہت سے لوگ لبیک کہنے کو تیار ہو جاتے۔ کاہنوں سے نفرت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

"تم کتنے آدمی جمع کر سکتے تھے اوغیر؟"

"ایک ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ۔" وہ بولا۔

"اور ازمیر میں کاہنوں کی تعداد کتنی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "مجھے ایک جذباتی آدمی کی حیثیت سے نہیں، فوجی افسر کی حیثیت سے جواب دو۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "ارژنگ کے چیلے دس ہزار سے کم نہیں ہوں گے مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر مجھے ایک ہزار جنگجو مل جائیں تو میں بھیڑوں کی طرح سارے کاہنوں کے سر اڑا سکتا ہوں۔ اس لیے ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے اور ارژنگ سے پہلے..."

"نہیں اوغیر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ کھیل میں اپنے طریقے سے کھیلوں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی جناب۔ میں نے سہراب سے جو وعدہ کیا تھا، وہ ضرور نبھاؤں گا لیکن آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ ارژنگ آپ کو آشوریوں پر لشکر کشی کے بہانے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ جب تک ہم آشوریوں کو مغلوب نہیں کریں گے، کوئی دوسرا ملک فتح نہیں کر سکتے۔"

"شاباش۔ اب تم ایک سپاہی کی طرح سوچ رہے ہو اوغیر۔ ان سازشوں سے میں خود نمٹ لوں گا۔ فی الوقت تم فرہاد مہندس کے پاس لے چلو۔"

میدان میں ایک مقام پر متعدد ہٹ بنے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے بڑا ہٹ مہندس فرہاد کا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ میز پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اس کا قد میرے جتنا مگر سینہ مجھ سے زیادہ چوڑا اور ہاتھ میرے ہاتھوں سے زیادہ بھاری تھے۔ اس کے سر اور سینے کے بال بھورے تھے اور آنکھیں کشادہ روشن۔ اوغیر نے مجھے اُس سے متعارف کرایا تو وہ اسی طرح اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے بولا۔ "اچھا تو تم ہو وہ سرفروش۔ جس نے ایک ماہ کے اندر اندر جوانی کی منزلیں طے کی ہیں۔ میں بچشمِ خود تمھیں دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے ان احمق مقامی باشندوں کی کسی بات کا اعتبار نہیں ہے لیکن یہ سب کیسے ہوا؟ میں اس شعبدے کا راز جاننے کے لیے اچھی خاصی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"کاہن ارژنگ بھی یہی کہتا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

فرہاد نے غصے سے میز پر مکا مارا اور بولا۔ "اس کالے کرگس کا نام میرے سامنے مت لو۔ مجھے اس کے ذکر سے متلی ہونے لگتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اہلِ دماغ کا دیوانہ ہے۔ وہ میرے فن کے راز معلوم کرنے کا بھی خواہاں ہے۔ میں ہمیشہ اُسے جھوٹ بتاتا ہوں۔ وہ بھی اتنا کائیاں ہے کہ ان جھوٹوں پر یقین نہ کرنے کے باوجود میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کہنے کے ساتھ اس آنکھ مچولی میں مجھے بڑا مزا آتا ہے۔"

میں فرہاد کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنے لیے ایک پیالے میں اس کے سامنے رکھی صراحی سے مشروب انڈیلا تو اوغیر خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ "یہ پینے پلانے کا نہیں، سوچنے اور تیاریاں کرنے کا وقت ہے جناب۔"

"تمھارا کیا خیال ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" میں نے پوچھا تو اوغیر سے پہلے فرہاد بول اُٹھا۔

"تم ایک جنگجو کماندار کی طرح بات کرتے ہو، سرفروش۔ کیا تم جنگجو ہو؟"

"یقیناً۔ اور آنے والا وقت یہ ثابت کر دے گا۔ میں تم سے جنگ ہی کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے آشوریوں پر لشکر کشی کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں تمھیں ایک کپتان کا عہدہ، مکمل اختیارات اور مالِ غنیمت میں سے حصہ دوں گا۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں... اب جبکہ سہراب مر گیا ہے، میں ہر کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہنچا دینا چاہتا ہوں۔" اس نے دو ٹوک جواب دے دیا۔

"میں تمھیں حکم بھی دے سکتا ہوں فرہاد، مگر میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے کہ ناخوش کارکن سے بہتر کام کی توقع فضول ہے۔ جہاں تک اہرام کی تکمیل کا معاملہ ہے تو اس میں عجلت کی ضرورت نہیں۔ سہراب اس نامکمل مقبرے میں بھی آرام کی ابدی نیند سوتا رہے گا۔ میں آشوریوں پر جلد از جلد اور ان کی غفلت میں یلغار کرنا چاہتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں آبنائے پر ایک پُل کی تعمیر کا متمنی ہوں تاکہ کشتیوں اور ہوا پر انحصار ختم ہو جائے۔"

یہ سن کر فرہاد ہنسنے لگا اور بولا۔ "تم کشتیوں کا پُل بنوانا چاہتے ہو سرفروش۔ مگر یہ تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ آشوریوں نے تیر کر اس پُل کو درمیان سے کاٹ دیا تھا اور وہ ازمیری جو ڈوبنے سے بچ کر کنارے تک پہنچ گئے تھے، آشوریوں نے انھیں بھی تہِ تیغ کر دیا تھا۔ کشتیوں کے پُل کی بجائے کوئی اور ترکیب سوچو۔"

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اوغیر کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ "یہ سچ ہے جناب چھ سال پہلے سہراب نے بھی پُل تعمیر کروایا تھا۔"

"تم جنگجو تو ہو سکتے ہو مگر کماندار نہیں ہو سکتے سرفروش" فرہاد بولا۔ "تم آشوریوں کو کبھی مغلوب نہیں کر سکو گے۔"

"میں انھیں شکستِ فاش دوں گا فرہاد" میں نے نرم لہجے میں، مگر عزم سے کہا "تم نے میرا پورا منصوبہ تو سنا ہی نہیں۔ میں بیک وقت دو پل بنوانا چاہتا ہوں۔ ایک وہ جو پانی کے اوپر دکھائی دے اور دوسرا زیرِ آب۔ وہ سطحِ آب سے ایک ہاتھ نیچے ہونا چاہیے اور پہلے پل سے دور واقع ہو۔ پہلا پل دن کی روشنی میں دھوم دھڑکے سے اور دوسرا رات کے اندھیرے میں خاموشی سے تعمیر کیا جائے مگر یہ کام مشکل اور تمھارے بس سے باہر ہے فرہاد۔ چلو اوغیر" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

فرہاد نے پھر میز پر ہاتھ مارا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "دو پل! ... ایک سطحِ آب پر اور دوسرا زیرِ آب۔ بلاشبہ اچھوتا خیال ہے جو میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرا پل کامیابی کا باعث بن جائے مگر جیسا تم نے کہا تھا، کام خاصا مشکل ہے۔"

"مشکل ہی نہیں ناممکن ہے" میں نے کہا "میں نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر تمھارے بس میں نہیں۔ بہرصورت تمھارے مشروب کا شکریہ فرہاد۔"

فرہاد نے ایک نظر مجھے دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا "میں تمھارا مطلب خوب سمجھتا ہوں سرفروش۔ تم مجھے اشتعال دلانا چاہتے ہو؟ میں اشتعال میں آکر تو نہیں، مگر چیلنج سمجھ کر زیرِ آب پل بناؤں گا لیکن تمھیں اس کا معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔"

"وہ معاوضہ کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا اوغیر نے تمھیں وہ کہانی سنائی ہے جس کی وجہ سے میں نے جلاوطنی اختیار کی تھی؟"

"نہیں" میری بجائے اوغیر نے جواب دیا "تم نے مجھے اپنی کہانی سنائی ہی کب تھی۔"

فرہاد نے جو کافی نشے میں تھا چند لمحے سوچا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر بولا "ہاں میرا خیال ہے کہ میں نے تمھیں اپنے فرار کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ بہرکیف میں جلاوطنی سے قبل ایک عورت سے محبت کرتا تھا۔ اس کا نام شبانہ تھا اور دیوتاؤں نے اسے میرے لیے آسمانوں سے بھیجا تھا مگر حمیر کے ایک کپتان شمروز کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔ میری غیرموجودگی میں اس نے حمیر سے اجازت حاصل کی اور اسے اپنا لیا۔ جب میں لوٹا تو وہ شمروز کے شبستان میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے حمیر سے کہا کہ مجھے شمروز سے مقابلے کی اجازت دی جائے اور اگر میں جیت جاؤں تو میری محبت، میری شبانہ مجھے مل جانی چاہیے مگر حمیر نے یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح اسے اپنے ایک کپتان کی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ یہ مت سمجھیے کہ شمروز کوئی کمزور سا آدمی تھا۔ نہیں، وہ شہزور جنگجو تھا لیکن جب آدمی کسی عورت سے محبت کرتا ہے، تو وہی محبت اسے شیروں سے لڑجانے کی ہمت عطا کر دیتی ہے۔ اگر حمیر مجھے اجازت دے دیتا تو شبانہ کی محبت مجھے فنِ سپہ گری بھی سکھا دیتی اور میں شمروز پر غالب آجاتا۔ خیر... شبانہ شمروز کی ہو گئی لیکن اس کی روح میری تھی۔ ہم شمروز کی غیبت میں یا چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے رہے مگر ایک بار رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ ہم جانتے تھے کہ اس جرم کی سزا موت ہے۔ چنانچہ انھوں نے میرے سامنے میری محبوبہ، میری محبت شبانہ کو گھوڑے کی کاٹھی سے باندھ کر گھسیٹا اور جب اس کے نرم و نازک جسم کی کھال ادھڑ گئی تو اسے گھوڑے کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔ اس منظر نے میرے خون میں انگارے بھر دیے۔ میں سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا۔ لڑتا بھڑتا ان کی گرفت سے آزاد ہوا اور تیر کر آبنائے عبور کی تو اوغیر کے ہاتھوں پکڑا گیا۔" اتنا کہہ کر وہ دم لینے کو رکا تو میں نے کہا۔

"بیشتر محبت کرنے والوں سے ان کی محبوبائیں اسی طرح چھن جایا کرتی ہیں فرہاد۔ بہرصورت تم بچ نکلے، یہی غنیمت ہے۔"

"میں موت سے ڈر کر نہیں بھاگا تھا سرفروش۔ میں نے یہ زندگی اپنے لیے نہیں چاہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اسی وقت مر گیا تھا جب شبانہ کو اذیت دی جا رہی تھی۔ مجھ پر یہ زندگی شبانہ کا قرض ہے۔ میں تب سے اب تک لمحہ لمحہ انتقام کی آگ میں سلگتا رہا ہوں جو صرف شمروز کے خون سے ہی بجھ سکتی ہے۔ مجھ سے صرف اتنا وعدہ کرو کہ تم مجھے شمروز کا بریدہ سر دو گے اور اس کے بدلے میں دو پل ہی نہیں، دو اہرام بھی تعمیر کر دوں گا۔"

"اگر ہم آشوریوں کے ساحل پر اتر گئے اور شمروز سے سامنا ہو گیا تو میرا وعدہ ہے کہ تمھارے رقیب کا سر تمھارے قدموں میں رکھ دیا جائے گا۔" میں نے اسے یقین دلایا تو وہ میرا ساتھ دینے کو تیار ہو گیا۔

ہم راجدھانی لوٹ آئے اور میں اسی شب سہراب کے محل میں منتقل ہو گیا۔ حالات نے بڑی تیزی سے پلٹا کھایا تھا اور مجھے ان کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔

●

سہراب کی تدفین کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر میری اور فرازیہ کی شادی ہو گئی لیکن ایک ہی ہفتے کے اندر اندر ہم علیحدہ علیحدہ خواب گاہوں میں سونے لگے۔ یا تو فرازیہ کاہنِ اعظم ارژنگ کے زیرِ اثر تھی یا میں اسے مطمئن و مسرور نہیں رکھ سکا تھا۔ بہرکیف مجھے اس علیحدگی کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ میری خواب گاہ اس کے بغیر سونی نہیں رہی تھی۔ میں طاؤسہ کو بلوا لیا کرتا تھا جو مجھے محل میں اڑنے والی افواہوں اور سازشوں

سے بھی باخبر رکھتی تھی۔

اس دوران مجھے ارژنگ سے صرف اتنا پیغام موصول ہوا کہ میں آشوریوں پر لشکر کشی میں تاخیر نہ کروں۔

مجھے یہ اطلاعات بھی برابر موصول ہو رہی تھیں کہ ازمیر کے کونے کونے سے لوگ راجدھانی میں جمع ہو رہے ہیں اور کاہن ارژنگ نے انھیں سہراب کے اہرام کی تکمیل میں مزدوروں کے ساتھ لگا دیا ہے۔ یہ صرف ایک دکھاوا تھا ورنہ ارژنگ کا مقصد انھیں یکجا کر کے اپنی افرادی قوت بڑھانا تھا جبکہ مجھے اپنی افرادی قوت بڑھانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ سہراب کے عسکریوں میں بددلی پھیلی ہوئی تھی اور ان کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے ان کی تنظیمِ نو کے لیے اوغیر کو فوج کا کماندارِ اعلیٰ بنا دیا۔

فرہاد بھی اب کپتان کے عہدے پر فائز تھا اور اس نے اپنا شعبہ سنبھال لیا تھا۔ بقول طاؤسہ ازمیر کے عوام میرے ان اقدامات کو بنظرِ پسندیدگی نہیں دیکھ رہے تھے۔

میں کئی بار ارتکازِ توجہ سے کرسٹل کے ذریعے کمپیوٹر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر اس میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ خدا جانے ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر اور کرسٹل کا باہمی رابطہ منقطع کر دیا تھا یا میرا کرسٹل ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر خیال آیا کہ ایک بار میں نے ڈاکٹر فریدوں سے کہا تھا کہ میں مستقل ذہنی غلامی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اس بنا پر ڈاکٹر فریدوں نے وقتی طور پر رابطہ منقطع کر دیا ہو...

ایک صبح میں اوغیر، فرہاد اور ایک لمبے تڑنگے محافظ کے ساتھ آبنائے پر زیرِ تعمیر کشتیوں کے پل کا معائنہ کرنے کے لیے چل دیا۔ یہ پل راجدھانی سے ایک یوم کی مسافت پر واقع تھا۔ فرہاد نے اپنی زرہ بکتر اور خود بنات خود بنوائے تھے جو ازمیری فوج سے مختلف تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔

"آشوری اسی قسم کے خود استعمال کرتے ہیں۔ جب ہم خلیج کے اس پار جائیں گے تو وہ مجھے اپنی ہی فوج کا فرد سمجھ کر مجھ پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس طرح مجھے شمروز کے قریب پہنچنے اور اسے تہِ تیغ کرنے کا موقع مل جائے گا جو میرا مقصدِ حیات ہے۔"

اس پر اوغیر نے بے ساختہ کہا "میرا خیال ہے کہ تم نے پھر بے تحاشا پینی شروع کر دی ہے۔ اسی لیے یہ بھول گئے ہو کہ ہمارے فوجی تمھیں آشوری سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔"

"جب تک پل تعمیر نہیں ہو جاتے، تم شراب نہیں پیو گے فرہاد۔" میں نے اسے حکم دیا جسے وہ ماننے پر مجبور تھا۔

شام کے جھٹپٹے میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سطحِ آب پر پل بنایا جا رہا تھا۔ یہاں پر آبنائے صرف نصف میل چوڑی تھی۔ آبنائے کی دوسری جانب پہاڑیوں پر الاؤ روشن تھے۔ میں نے پل کے لیے کام کرنے والے لوگوں سے گپ شپ کی اور ان سے خوراک اور سہولتوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ مطمئن تھے مگر فرہاد کا کہنا تھا کہ وہ سست اور کاہل الوجود ہیں اس لیے اسے کوڑوں سے کام لینا پڑے گا ورنہ کام کی رفتار میں تیزی نہیں لائی جا سکتی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بہترین کارکن زیرِ آب پل کی تعمیر کے لیے رات کو کام کرتے ہیں۔

"وہ پل کہاں بن رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

فرہاد نے ایک نقشہ میرے سامنے پھیلا دیا اور ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہاں۔ اس پل سے نصف میل دور مشرق کی جانب۔ وہاں بھی آبنائے کی چوڑائی اتنی ہی ہے جتنی یہاں ہے مگر ساحل سے پہاڑیاں ایک میل کے فاصلے پر ہیں۔ اگر ہم اس پار اتر گئے تو بڑی آسانی سے پہاڑیوں تک جا سکیں گے۔"

میں نے فرہاد اور اوغیر سے کہا۔

"تم لوگ اپنی سوچ کا یہ منفی انداز بدل دو۔ ہم یقیناً آشوریوں کے ساحل پر اتریں گے۔ یاد رکھو فرہاد، زیرِ آب پل بنانے والے دن کے وقت ہرگز ہرگز دکھائی نہ دیں۔ رات کو کام کرتے ہوئے بھی روشنی یا آگ نہیں جلنی چاہیے اور اوغیر۔ دن کے وقت تمھارے زیادہ سے زیادہ آدمی سطحِ آب پر زیرِ تعمیر پل کے لیے کام کرتے رہیں اور آشوریوں کو اپنی طرف متوجہ رکھیں۔ اس مقصد کے لیے کچھ گروہ باری باری آشوریوں پر حملے بھی کریں مگر آشوری ساحل پر ایک گھنٹے سے زیادہ نہ رکیں اور لوٹ مار کر کے فوراً لوٹ آئیں۔"

"لوٹ آنا ناممکن ہے جناب۔ اس لیے کہ آشوری مرد ہی نہیں عورتیں اور بچے بھی جنگجو ہیں۔ دوسرے اس طرح کے حملوں میں صرف ہمارے سپاہی ہی نہیں، بہت سی کشتیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا "مزید آدمی بھرتی کرو اور مزید کشتیاں بنواتے رہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آشوریوں کی تمام تر توجہ مغرب کی جانب رہے، وہ اسی طرف جمع ہو جائیں اور مشرق کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھیں۔"

"یہ ناممکن ہے سرفروش" فرہاد بولا "آشوریوں کے پاس ساحل کی دیکھ بھال کے لیے اڑنے والا خصوصی دستہ ہے۔"

"اڑنے والا دستہ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ اپنے بازوؤں کے ساتھ باریک چمڑے کے بڑے بڑے پر باندھ لیتے ہیں اور چمگادڑوں کی طرح پرواز کرتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں" فرہاد بولا اور پھر اس نے مجھے پروں کی تصویر بنا کر دکھائی۔ یہ پر بہت ہلکی لکڑی اور چمڑے سے بنائے جاتے تھے اور گلائیڈر کی بھونڈی شکل تھے۔ ان کے ذریعے بلندی کی طرف سے پستی کی جانب پرواز کی جا سکتی تھی، مگر نیچے سے اوپر نہیں جایا جا سکتا تھا۔

"چمڑے کے پروں والے یہ آدمی پل پر حملہ کر چکے ہیں وہ اپنے ساتھ آگ کی ہانڈیاں بھی لاتے ہیں تاکہ اُنھیں کشتیوں پر پھینک کر نذرِ آتش کر دیں۔ میرے چار آدمی اُن کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔" اوغیر بولا۔

"کیا کشتیوں میں آگ لگی تھی؟"

"نہیں۔ ہانڈیاں نشانے پر نہیں گری تھیں۔"

"اور اُن اُڑنے والے آشوریوں کا کیا ہوا؟"

"وہ پانی میں گرے تو ہم نے تیروں سے اُنھیں ہلاک کر دیا۔" اوغیر نے بتایا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اُنھیں اسی طرح الجھائے رکھو۔" میں نے کہا۔

فرہاد جمائیاں لینے لگا تھا۔ اُس نے کہا۔ "مجھے ایک جام پینے کی اجازت دے دیجیے تاکہ مجھے آرام کی نیند آ جائے۔"

"نہیں فرہاد۔ اگر تمھیں نیند نہ آئے تو زیرِ آب پُل کے بارے میں سوچتے رہنا۔"

دوسری صبح میں نے اُن لوگوں کے کیمپ کا معائنہ کیا جو رات کے وقت زیرِ آب پُل تعمیر کر رہے تھے۔ انھوں نے لکڑی کے شہتیر، تختے اور دوسرا ساز و سامان ریت میں چھپا رکھا تھا۔ فرہاد نے کہا۔

"ہمارے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمیں اندھیرے میں خاموشی سے کام کرنا پڑتا ہے ہر چند کہ میرے کارکن بہترین تیراک ہیں، مگر وہ بھی پانی میں زیادہ دیر تک سانس نہیں روک سکتے۔ اس لیے یہ پُل دوسرے پُل کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے اور اس کی تکمیل میں بہت زیادہ وقت لگے گا۔"

"نہیں فرہاد۔ یہ دونوں بیک وقت مکمل ہونے چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "میرے منصوبے کا سارا دار و مدار ہی اس بات پر ہے۔"

"تو پھر میرے کارکنوں کو پانی میں سانس لینا سکھا دو۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ یہ میں کر سکتا ہوں۔ کیا تمھارے پاس خیموں والا کپڑا اور بھٹی ہے؟"

"ہاں۔"

"تو مجھے کچھ کپڑا، دھاگا اور سوئی لا دو۔" میں نے کہا۔

جب مجھے یہ چیزیں فراہم کر دی گئیں تو میں نے کپڑا کاٹ کر اُسے نلکیوں کی طرح سیا اور کہا کہ اب ان نلکیوں کو کولتار میں بھگو کر سکھایا جائے تو ان کے اندر پانی نہیں جائے گا مگر ہوا جا سکے گی۔

فرہاد بولا۔ "لیکن ہوا کیسے جائے گی؟"

"بھٹیوں کی پھکنیوں کے ذریعے۔" میں نے وضاحت کی پھر میں نے فرہاد کو ماسک کی تصویر بنا کر دکھائی جسے پہن کر اس کے کارکن بڑی دیر تک زیرِ آب کام کر سکتے تھے۔ فرہاد یہ طریق کار سمجھ کر دنگ رہ گیا اور بولا۔ "دیوتاؤں کی قسم۔ یہ ہو سکتا ہے۔ اب میرے کارکن تیزی سے کام کر سکیں گے۔"

پھر میں اُسے وہیں چھوڑ کر اوغیر کے ساتھ مغربی پل کی طرف چل دیا۔ اوغیر بولا۔ "اب بھی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی جناب کہ آپ ارژنگ کے حکم کی تعمیل کیوں کر رہے ہیں جبکہ وہ آپ کا مخالف اور دشمن ہے۔"

"میں خود بھی آشوری سرزمین جانا چاہتا ہوں اوغیر۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہاں ہیرے بکثرت ملتے ہیں بلکہ وہاں ہیروں کے پہاڑ ہیں۔ ہیرا بہت چمک دار پتھر ہوتا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"وہ پتھر جو فرہاد پتھر کاٹنے کے لیے استعمال کرتا ہے؟" اوغیر تعجب سے بولا۔ "اس سے بچوں کے کھلونے بھی بنائے جاتے ہیں جنھیں وہ سورج کے سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں تو اُن سے قسم قسم کی رنگین شعاعیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ آپ کو ان پتھروں سے کیا دلچسپی ہے؟"

"ہمارے ہاں وہ پتھر بڑے قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر جہاں سے آپ آئے ہیں، وہاں کے لوگ پاگل ہیں۔ پتھر بہرصورت پتھر ہوتا ہے۔ آپ نہ اُسے کھا سکتے ہیں، نہ پی سکتے ہیں نہ اوڑھ سکتے ہیں پھر ان کی خاطر انسانی جانوں کی بھینٹ کہاں تک جائز ہے آپ ان کے لیے جنگ کیوں لڑنا چاہتے ہیں؟"

"میں اسے اپنے لیے ضروری سمجھتا ہوں اوغیر۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو مت دو۔"

"میں اپنے قول سے منحرف نہیں ہو سکتا جناب! مگر مجھے بے مقصد جنگ و جدل سے نفرت ہے۔" اس کے بعد ہم نے کافی دیر تک ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ آخر اوغیر نے خاموشی توڑی۔ "آپ یہ جنگ کب شروع کریں گے؟"

"جب زیرِ آب پُل مکمل ہو جائے گا۔ اس دوران دوسرا پُل صرف تین چوتھائی مکمل ہو جانا چاہیے۔"

"تین چوتھائی؟" اوغیر نے تعجب سے دوہرایا۔ "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ باقی ٹکڑا ہمارے سپاہی تیر کر پار کر لیں گے تو یہ ناممکن ہے ان کے بھاری خود اور زرہ بکتر اُن کی غرقابی کا باعث بن جائیں گے۔"

مجھے اوغیر کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں بولا۔ "تم ہمیشہ منفی سوچتے ہو اوغیر۔"

"میں منفی نہیں سوچتا سچ کہتا ہوں جناب۔"

"کبھی روشن پہلو پر بھی غور کر لیا کرو یار، میں اُس نامکمل پُل کو گھاٹ کے طور پر استعمال کروں گا۔ باقی ٹکڑا کشتیوں کے ذریعے عبور کیا جانے گا۔ اس گھاٹ سے کشتیاں مسلسل ساحل کی طرف بڑھتی رہیں گی حمیر کو یہ تاثر دیا جائے گا کہ ہم اپنی پوری قوت سے حملہ کر رہے ہیں لیکن اصل حملہ ہم زیرِ آب پُل کے ذریعے کریں گے۔"

"مگر ہم اتنی سپاہ کہاں سے لائیں گے جناب؟" اوغیر نے پوچھا۔

"کیا میں نے تمھیں اپنے منصوبے کی ہر تفصیل بتائی ہے اوغیر؟"

"نہیں جناب۔ اچھا کمان دار بہت سی باتیں راز میں رکھتا ہے۔" وہ بولا۔ "میں سمجھا کہ . . ."

"تم غلط سمجھے۔" میں نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "حمیر یہ سمجھے گا کہ ہم نے اپنی ساری قوت وہاں لگا دی ہے۔ میں اُسے تاثر بھی یہی دینا چاہتا ہوں لیکن میں کچھ چیدہ چیدہ عسکریوں کے ساتھ زیرِ آب پُل پار کر کے حمیر پر عقب سے حملہ کروں گا۔ چونکہ وہ اپنے سامنے تم سے برسرِ پیکار ہو گا اس لیے وہ پیچھے سے کیے جانے والے ناگہانی اقدام سے سراسیمہ ہو کر حواس باختہ ہو جائے گا اور اس پر فرار کی راہیں بھی مسدود ہو جائیں گی۔ اب بولو کیا خیال ہے تمھارا؟"

"میرا خیال ہے یہ منصوبہ کامیاب رہے گا۔" وہ بولا۔ "تاہم ہمارے پاس بہت کم لشکری ہیں۔ فوج کا ایک دستہ یہاں کام کر رہا ہے اور نو دستے راجدھانی میں زیرِ تربیت ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں کہ وہ کیا خاک جنگ لڑیں گے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اور تمھارے افسر اس وقت تک اُنھیں اتنی تربیت دے دیں کہ وہ بظاہر فوجی نظر آنے لگیں اور حمیر اُنھیں دیکھ کر مرعوب ہو جائے۔ اصلیت کا پتہ اُسے اس وقت ہی چلے گا جب ہمارے سپاہی پکڑے جائیں گے اور وہ ان سے پوچھ گچھ کرے گا۔"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی جناب۔" اوغیر بولا۔ "یہ آشوری اپنے دشمنوں کو غلام نہیں بناتے بلکہ فی الفور قتل کر دیتے ہیں۔"

"پھر تو بہت اچھا ہے اوغیر۔ تم فوراً راجدھانی روانہ ہو جاؤ اور اُن کی تربیت ایک ہفتے کے اندر اندر مکمل کر لو۔"

جب اوغیر چلا گیا تو میں اپنے خیمے میں آیا اور ٹرانزسٹر کے ذریعے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد رابطہ قائم ہو گیا اور میں نے ڈاکٹر فریدوں کو ہیروں کی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ہیروں کے حصول کے لیے مجھے جنگ لڑنے کی اجازت دے دی گئی کیونکہ اب ڈاکٹر فریدوں خزانوں کی منتقلی کے لیے بھی کمپیوٹر بنا رہا تھا۔

●

اوغیر نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ایک ہفتے کے اندر اندر ہی میری فوجیوں کی تربیت مکمل کر دی۔ وہ جنگ لڑنے کے اہل تو نہیں تھے لیکن تربیت یافتہ عسکری ضرور نظر آتے تھے۔ میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ آشوری اُن کی تعداد سے مرعوب ہو جائیں اور اوغیر اُس وقت تک اُنھیں اُلجھائے رکھے کہ میں آزمودہ کار سپاہیوں کے مختصر لشکر کے ساتھ آشوریوں کے عقب میں نہ پہنچ جاؤں۔

جس روز میں نے سطحِ آب اور زیرِ آب بننے والے پُلوں کا معائنہ کیا تھا، اُس کے ٹھیک دسویں دن جنگ کا آغاز ہو گیا۔

منصوبے کے مطابق اوغیر نے مغربی پُل کے ساتھ لاتعداد کشتیاں تیار رکھی تھیں اور اُس کے پاس دس ہزار فوجی تھے اُس نے سرِ شام ہی فوجی دستے آشوری ساحل پر اُتارنا شروع کر دیے تھے جن کے لیے حمیر وہاں موجود تھا۔ اس کی افرادی قوت بھی تقریباً اتنی ہی تھی مگر اُن میں جوان، بوڑھے، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے اور جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا عورتیں اور بچے بھی جنگ میں حصہ لیا کرتے تھے۔ بقول فرہاد آشوری قوم خوف کے لفظ سے ناآشنا تھی اور ان کا بچہ بچہ جنگ میں مرنا اپنی خوش نصیبی تصور کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کا فلسفۂ حیات ہی یہی ہو تو اس کا بہادر اور جنگجو ہونا لازمی ہے۔

جب اوغیر نے میدانِ کارزار میں اپنے دستے اُتارنا شروع کیے! میں تین ہزار آزمودہ کار سپاہیوں کے ہمراہ زیرِ آب پُل کے قریب ٹیلوں کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ ان تین ہزار فوجیوں میں ایک ہزار شہسوار تھے اور باقی پیدل۔ فرہاد بھی آشوریوں جیسے سینگ والے خود اور زرہ بکتر کے ساتھ میرے ہم رکاب تھا۔

رات بھر ہمیں مغربی پُل سے آشوریوں کے جنگی نعرے، ہاؤ ہو کی آوازیں، چیخ و پکار، طبلِ جنگ اور شمشیر و سپر ٹکرانے کی آوازیں آتی رہیں۔ مغربی پُل کے سامنے ہی پہاڑیاں واقع تھیں جن پر الاؤ اور مشعلیں جلتی رہیں۔ یہاں حمیر کے سارے لشکری جمع تھے۔ حمیر کو اب تک زیرِ آب پُل کا علم نہیں ہوا تھا ورنہ وہاں بھی اس کے لشکریوں کی نقل و حرکت نظر آتی۔ میں مطمئن تھا کہ ہم اس بے خبری کے عالم میں پیچھے سے ٹوٹ پڑیں گے تو اس کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارۂ کار نہیں رہے گا۔

پو پھٹے میں نے اپنے فوجیوں کو کوچ کا حکم دیا میں نے اپنے سپاہیوں کو ایک ایک ہزار کے تین دستوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک دستے کا کپتان فرہاد اور دوسرے کا افراسیاب تھا۔ تیسرا دستہ خود میری کمان میں تھا۔ جب ہم زیرِ آب پُل عبور کرنے لگے۔ ہمیں آبنائے میں بہت سی لاشیں تیرتی دکھائی دیں۔ ان میں صرف ایک لاش آشوریوں کی تھی اور یہ لاش بھی کسی مرد کی نہیں بلکہ عورت کی تھی باقی ساری لاشیں ازمیریوں کی تھیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اوغیر کو حمیر کے ساتھ اُلجھنے یا اُسے اُلجھائے رکھنے کی کتنی بڑی قیمت

ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

زیرِ آب پل سے نصف میل دُور پہاڑیاں تھیں آبنائے سے وہاں تک کا علاقہ ایک سرسبز چراگاہ پر مشتمل تھا۔ جب گھڑسواروں نے پُل عبور کر لیا اور پیدل دستے آنے لگے تو یکایک پہاڑیوں سے آشوریوں کا ایک اڑنے والا فوجی آگ کی ہانڈیاں اُٹھائے ہماری طرف پرواز کرتا دکھائی دیا... میں اُسے تعجب سے دیکھتا اور سوچتا رہ گیا کہ حمیر اِدھر سے غافل نہیں تھا۔ اور شاید اس نے اپنے لشکری ان پہاڑیوں کے پیچھے چھپا رکھے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ ہم آگے بڑھیں گے تو خود ہی ان کے نرغے میں آ جائیں گے اور میرا سارا منصوبہ چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ اتنے میں وہ اُڑتا ہوا آشوری قریب آ گیا۔ اُس نے آگ کی ایک ہنڈیا پھینکی جو ہم سے کچھ دُور گری مر... سری پھینکنے سے پہلے ہی میں نے اس پر بھالا پھینکا جو اُس کے پیٹ میں... ست ہو گیا اور وہ آبنائے میں جا گرا۔

میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشوں کے تحت اپنی سپاہ وہیں درمیانی میدان میں صف آرا کر لی اور کچھ لوگوں کو پہاڑیوں کی طرف ٹوہ لگانے کے لیے بھیجا، جو جلد ہی لوٹ آئے اور انھوں نے بتایا کہ ان کے عقب میں انھیں حمیر کا لشکر دکھائی نہیں دیا۔ اب میں نے ایک دستہ دائیں طرف سے اور ایک بائیں طرف سے آگے بڑھایا اور قلب کا دستہ خود لے کر آگے بڑھا۔ میں نے اپنے کپتانوں کو ہدایات دی تھیں کہ انھیں آشوری لشکر کے پیچھے جا کر ایک قوس کی شکل میں پھیل جانا ہے اور میرا اشارہ ملتے ہی حملہ کر دینا ہے مگر حملہ کرتے وقت کچھ سپاہیوں کو پہاڑیوں کے تنگ دروں پر موجود رہنا ہے تاکہ کوئی آشوری بچ کے نہ نکلنے پائے۔ اگر وہ لوگ ہتھیار ڈال دیں تو انھیں گرفتار کر لیا جائے ورنہ مرد عورت کی تخصیص کیے بغیر انھیں ختم کر دیا جائے۔

جب میں اپنے دستے کے ساتھ پہاڑیوں میں داخل ہوا تو اچانک ایک پہاڑی کے پیچھے سے "یاہُو" کا نعرہ سُنائی دیا اور آشوری جنگجو سامنے آنے لگے۔ میں نے اپنے دستے کو رُکنے کا اشارہ کیا اور خود چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آشوری مختلف پہاڑیوں سے میرے دستے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حمیر نے میرے ساتھ وہی چال چلی تھی جو میں اُس کے ساتھ چلنا چاہتا تھا۔ میرا دستہ چاروں طرف سے آشوریوں کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے دائیں اور بائیں دستے کس حال میں ہیں۔ میں نے اپنے نائب کو حکم دیا کہ وہ اُن آشوریوں پر تیر برسانا شروع کرا دے جو مختلف پہاڑیوں سے اُتر کر حملے کی غرض سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ لوگ ہم پر انڈوں سے دُگنی جسامت کے پتھر برسا رہے تھے۔ میرے سپاہیوں نے اُن پر تیروں کی بوچھار شروع کر دی مگر وہ بلا خوفِ مرگ تیروں کی بارش میں آگے بڑھتے اور ڈھیر ہوتے رہے۔ میں

یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُن کی اکثریت بوڑھوں اور ایسے لوگوں کی تھی جو غالباً کسی جنگ کی وجہ سے معذور ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ان یلغار ختم ہو گئی.... میرے اندازے کے مطابق وہ سو سے کم تھے۔ اتنے میں فرہاد کا ایک پیامبر گھوڑا دوڑاتے ہوئے میرے پاس اُس کا پیغام لایا کہ یہ حملہ آور صرف اتنے ہی تھے۔ انھیں پیرانہ سالی اور معذور ہونے کی بنا پر پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس لیے میں آگے بڑھتا رہوں۔ اس دوران میرے نائب نے اپنے جو آدمی مختلف پہاڑیوں پر ٹوہ لینے کے لیے بھیجے تھے، وہ بھی لوٹ آئے اور اُنھوں نے بھی فرہاد کے پیغام کی تصدیق کر دی تو میں اپنے دستے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

جب میں حمیر کے لشکر کے عقب میں پہنچا تو میرے دائیں بائیں والے دستے پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے اور درختوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ حمیر کا لشکر ہمارے سامنے کی پہاڑیوں کے پیچھے تھا اور یہ پہاڑیاں مغربی پُل کے سامنے واقع تھیں۔ ان دستوں کے جاسوسوں نے میدانِ کارزار کا جائزہ لے لیا تھا۔ فرہاد اور افراسیاب نے بتایا کہ حمیر کے لشکر کا بیشتر حصہ پہاڑیوں کے ڈھلوانوں پر اپنی باری کا منتظر ہے جب کہ ایک چوتھائی کے قریب آشوری اگلی صفوں میں اوغیر سے مصروفِ پیکار ہیں۔ جونہی اوغیر کا دستہ ساحل پر اُترتا ہے وہ یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور اُسے پسپا کر کے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہر ریلے میں اوغیر کو ان کی نسبت بہت زیادہ جانی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے مگر اوغیر یکے بعد دیگرے سپاہیوں سے بھری کشتیاں ساحل پر بھیجتا جا رہا ہے۔ بیشتر کشتیاں بھی آشوریوں کے ہاتھوں جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔

میں نے خود بھی آگے بڑھ کر چوری چھپے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور پھر اپنے سپاہیوں کو حملے کا حکم دے دیا۔ میرا گھوڑا اپنے شہسواروں سے آگے آگے تھا جب ہم پہاڑیوں کی چوٹیوں سے ڈھلوانوں پر اُترنے لگے تب آشوریوں کو پتہ چلا کہ وہ دونوں طرف سے نرغے میں آ چکے ہیں اب ان میں کچھ آشوریوں کا رُخ ہماری طرف تھا اور کچھ اوغیر کی جانب۔ میں نے اپنے کپتانوں کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ وہ پہلے آشوری لشکر کے بیچوں بیچ گھُس کر اُنھیں دو حصوں میں تقسیم کر دیں پھر دائیں بائیں مڑ کر موقع دیکھتے ہوئے بھالوں، تلواروں اور کلہاڑوں سے کام لیں۔

ڈھلوانوں والے آشوریوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور اُن میں سے بیشتر کے پاس پتھروں کے سوا کوئی آلاتِ حرب نہیں تھے لیکن وہ بلا خوف و خطر آگے بڑھتے تھے اور پتھر برساتے ہوئے ہمارے گھوڑوں کی گردنوں سے لپٹ جاتے تھے اُن کی اس حرکت سے ہمارے گھوڑے بدکنے لگتے تھے۔ آشوری میرے سواروں کی تلواریں چھینتے اور اُنھی سے سواروں کو قتل کر دیتے تھے۔

ایک جگہ مجھے کچھ آشوریوں نے گھیر لیا۔ دو آدمی میرے گھوڑے

کی گردن سے لٹک گئے اور تین نے مجھ پر دائیں بائیں سے حملہ کر دیا مگر میں نے زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا گولا گھُما کر ان کے سر پاش پاش کر دیے۔ اُن کا حشر دیکھنے کے باوجود کچھ عورتیں میری طرف لپکیں مگر میرے ساتھیوں نے انھیں مجھ تک پہنچنے سے پہلے ختم کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک آشوری عورت نے مرنے سے پہلے میرے ایک سپاہی کے نرخرے میں اپنے دانت گاڑ دیے تھے۔

ہمیں عقب سے حملہ آور دیکھ کر اوغیر کی ہمت بڑھ گئی تھی اور اب اُس کے اناڑی سپاہی بھی بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ اتنے میں فرہاد میرے پاس آ گیا۔ اُس کے بازو میں ایک تیر پیوست تھا مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر بولا۔

"وہ بدبخت شموز مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ اگر کسی ازمیری نے اُسے مار دیا ہے۔ تو دیوتاؤں کی قسم میں اُس ازمیری کا خون پی جاؤں گا۔"

"یہ تو بعد کی بات ہے پہلے اپنے بازو سے تیر تو نکلوا دو۔" میں نے کہا۔

"تو پھر ذرا اس کا سرا توڑ دو۔"

میں نے تیر کا سرا توڑ دیا۔ اس نے تیر نکال پھینکا اور بولا "میں اپنے شکار کو کہاں اور کیسے تلاش کروں شہزادے؟"

"وہ حمیر کے ساتھ ہوگا۔"

"وہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"حمیر کہاں ہے؟ ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

اس نے پہاڑی کے نیچے ایک طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا "وہ دیکھو۔ چھوٹے قد کا مگر چوڑا چکلا جو آدمی کلہاڑا گھما رہا ہے، وہی حمیر ہے۔"

میں نے بغور اُسے دیکھا۔ وہ آدمیوں کے جھرمٹ میں بڑی چابکدستی سے چوڑے پھل اور لمبے دستے والا کلہاڑا گھما رہا تھا۔ اُس کا سینہ اور شانے غیر معمولی طور پر کشادہ تھے۔ وہ جدھر بھی رُخ کرتا، اوغیر کے دو چار سپاہی کھیت ہو جاتے۔ یہ دیکھ کر فرہاد بولا۔

"یہ اوغیر بھی عجیب احمق ہے۔ اپنے آدمیوں کو حمیر کے ساتھ دست بدست لڑنے کے لیے بھیجتا اور کٹوائے جا رہا ہے۔ اُسے تیر کا نشانہ کیوں نہیں بنا دیتا؟"

"میں نے اُسے کہا تھا کہ وہ حمیر کو زندہ گرفتار کرے۔ اسی لیے وہ اُسے تیروں کا نشانہ نہیں بنا رہا ورنہ یہ تو اُس کے لیے بہت آسان تھا۔"

"مگر تم اسے زندہ گرفتار کیوں کرنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تاکہ وہ اپنے بچے کھچے ساتھیوں پر حکمرانی کر سکے اور میرا دوست بن کر مجھے سیریوں کی کانوں تک پہنچا دے۔" میں نے سچ سچ بتا دیا۔

"یہ تمھاری بھول ہے سرفروش۔ دیکھ لینا۔ اوّل تو کوئی آشوری زندہ ہی نہیں بچے گا اور اگر بچ کر گرفتار ہو گیا تو خودکشی کر لے گا۔ دوسرے حمیر خود بھی جب تک زندہ ہے گرفتار نہیں ہوگا۔ اگر اُسے فرار کا راستہ نہ مل سکا تو وہ اپنے ہی کلہاڑے سے اپنا سر پاش کر دے گا۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا فرہاد۔ دیکھو اوغیر کے آدمی اُسے گھیر کر چٹانوں کے قریب لے جا رہے ہیں تاکہ وہ فرار نہ ہو سکے۔ اب اُس کے محافظ بھی اتنے نہیں رہے۔ صرف پانچ آدمی کب تک بچا سکیں گے۔"

"تم نہیں مانتے تو تمھاری مرضی، اور ہاں آج تو میں شراب پی سکتا ہوں نا؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے پیٹی سے لٹکی شراب کی ایک کُپی اتار لی۔

"یہ کہاں سے آئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے دستے کو آشوریوں کے خیموں سے دو سو کُپے ملے ہیں اور آشوری شراب اتنی تیز اور تلخ ہوتی ہے کہ آدمی دو گھونٹ پیتے ہی ہوش و حواس گنوا بیٹھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج میرے سپاہی یہ شراب پی کر ہم سب کے لیے دردِ سر بن جائیں گے۔"

اتنے میں مجھے ایک طرف سے قہقہوں کی صدا سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فرہاد والے دستے کے سپاہی تھے جنھوں نے پی رکھی تھی اور آشوریوں کی اُن عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے جنھیں گرفتار کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے نائب کو حکم دیا کہ جب تک فتح کا اعلان نہیں ہو جاتا انھیں عورتوں سے دُور رکھو۔ وہ اپنے دستے کے کچھ سپاہیوں کے ساتھ ان کی طرف بڑھ گیا۔

اب جو میں نے ان چٹانوں کی طرف نگاہ دوڑائی جدھر اوغیر کے سپاہی حمیر کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے تو دنگ رہ گیا کہ وہاں نہ حمیر ہے اور نہ اس کے محافظ۔

"حمیر کہاں گیا؟" میں بے ساختہ چلایا۔

فرہاد نے بھی اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور میں نے بھی مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اتنے میں اوغیر نے نیلگوں دھوئیں والی آگ جلا کر مکمل فتح کا اعلان کر دیا۔ آشوری عورتیں یہ دیکھ کر بین کرنے لگیں اور ہمارے سپاہی نعرہ ہائے مسرت بلند کرنے لگے۔ میں نے فرہاد سے کہا "ہم نے جنگ تو جیت لی مگر حمیر کی گرفتاری کے بغیر میرا منصوبہ ادھورا رہ جائے گا۔"

"یہی حال میرا بھی ہے سرفروش۔" وہ کُپی منہ سے ہٹاتے ہوئے بولا "شبابہ کی ہڈیاں مجھ سے شموز کے سر کا قصاص طلب کر رہی ہیں اور وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے آشوریوں کی لاشیں بھی چھان ماری ہیں مگر اُس مردود کی لاش نہیں ملی۔"

اتنے میں اوغیر کا ایک پیغام بر گھوڑا دوڑاتے ہوئے آیا اور اُتر کر سیلوٹ کرتے ہوئے بولا "کماندارِ اعلیٰ! اوغیر نے آپ کو جنگ جیتنے کی مبارک باد بھیجی ہے.... اور اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا

ہے کہ عمیر گرفتار نہیں ہوسکا۔ وہ فرار ہوگیا ہے۔"

"کیسے اور کہاں فرار ہوگیا ہے؟" میں چلایا۔ "میں نے اُسے چٹانوں کے قریب اپنے سپاہیوں میں گھرا ہوا دیکھا تھا۔"

"آپ بجا فرما رہے ہیں شہزادے۔" پیامبر بولا۔ "وہ جان بوجھ کر اُن چٹانوں کی طرف پسپا ہوا تھا کیونکہ اُن چٹانوں میں سرنگیں بنی ہوئی ہیں جنھیں مصنوعی طور پر جھاڑیوں وغیرہ سے چھپا دیا گیا تھا وہ ان میں سے کسی سرنگ میں فرار ہوگیا ہے اور اُسے اس وقت تلاش کرنا ناممکن ہے۔"

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" فرہاد بولا۔ "مجھے یہ بتانا یاد ہی نہیں رہا کہ ان چٹانوں میں شہد کے چھتے کی طرح بیسیوں سرنگیں اور غاریں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ مردود دشمن وہ بھی انہی میں سے کسی سرنگ یا غار میں روپوش ہوگیا ہوگا۔"

"اوہ۔ تو پھر کل صبح میں عمیر کو تلاش کروں گا اور تم میرے ساتھ آؤ گے تاکہ اپنے رقیبِ رُوسیاہ کو تلاش کر سکو۔"

"میں ضرور آؤں گا بشرطیکہ یہاں آنے سے پہلے مجھے جگا دیا جائے۔"

"کمانڈار کے لیے آپ کی طرف سے کوئی پیغام شہزادہ عالی مقام؟" پیامبر نے مجھ سے پوچھا۔

"اُسے ہماری طرف سے شاندار فتح پر مبارکباد۔ آج رات وہ ہمارے خیمے میں ہمارے ساتھ کھانا کھائے گا، اور ہاں۔ کیا اُس نے جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگا لیا ہے؟"

"جی ہاں۔ ہمارے چھ ہزار سپاہی کھیت رہے۔ تقریباً ایک ہزار شدید زخمی ہیں کمانڈار نے پوچھا ہے کہ کیا انھیں تکلیف سے نجات دلانے کے لیے ختم کر دیا جائے؟"

"نہیں۔ اُن کا علاج کیا جائے اور ان کے آرام پر بھرپور توجہ دی جائے۔ باقی باتیں رات کے کھانے پر ہوں گی۔"

پیامبر نے سیلوٹ کیا اور وہاں سے چلا گیا۔

میں نے ایک نظر میدانِ کارزار پر ڈالی جو آشوریوں اور ازمیریوں کی لاشوں سے اٹا ہوا تھا نیچے آبنائے میں بہت سی کشتیاں اب تک جل رہی تھیں اور گرفتار ہونے والی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ اُن کے بچے رو رہے تھے اور فاتح سپاہی قہقہے لگا رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ یہاں بھی سب کچھ ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا ہمارے دَور اور ہماری دُنیا میں ہوتا ہے۔

●

فرہاد نے سچ ہی کہا تھا کہ اُس کے دستے کے سپاہی دردِ سر بن جائیں گے۔ انھوں نے آشوریوں کی شراب پورے لشکر میں تقسیم کر دی۔ میں غروبِ آفتاب تک مدہوش سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے بمشکل دُور رکھ سکا اور جب سارے زخمی، آشوری بچے اور عورتیں ازمیری ساحل پر منتقل کر دی گئیں تو میں بھی اپنے خیمے میں آگیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے غسل کیا، لباس بدلا اور اپنے خادموں کو آواز دی تو پتہ چلا کہ وہ غائب ہیں۔ اتنے میں اودغیر بھی نہا دھو کر آگیا اور اُس نے بتایا کہ خادموں کو آواز دینا فضول ہے۔ وہ سب فتح کا جشن منا رہے ہیں اور فتح کا جشن جس انداز سے منایا جا رہا تھا اس پر انسانیت ماتم کناں تھی۔ کہیں سے آشوری عورتوں کے بین بلند ہو رہے تھے کہیں سے چیخیں۔ وہ ازمیری جو آشوریوں کو وحشی کہا کرتے تھے اس وقت خود وحشی بنے ہوئے تھے۔

میں نے اودغیر کے ساتھ ساتھ فرہاد کو بھی رات کے کھانے کی دعوت دی تھی مگر وہ نہیں آیا تھا اُس کے خیمے سے کبھی اُس کے بے سُرے گانے کی آواز آتی تھی اور کبھی اول جلول بکنے کی۔

خادموں کے نہ ہونے کے باعث میں نے اور اودغیر نے مل کر کھانا تیار کیا اور جب کھانے بیٹھے تو اودغیر نے کہا۔

"فرہاد ٹھیک کہتا ہے جناب۔ عمیر کو تلاش کرنے کی کوشش حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگی اگر وہ خود بخود سامنے نہ آنا چاہے تو آپ اُسے کبھی تلاش نہیں کر پائیں گے اس سے زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ ہم جلد از جلد راجدھانی لوٹ جائیں اور ارژنگ کے کالے کرتوں سے نمٹیں مجھے میرے جاسوسوں نے مطلع کیا ہے کہ وہ زیرِ تعمیر مقبرے سے محل سرا میں منتقل ہوگیا ہے اور ملکہ فرازیہ کا خود ساختہ نگران بن گیا ہے۔ ہم نے جنگ جیت کر اگرچہ آشوریوں کو ایک طویل عرصے تک سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے لیکن اگر ہم ان کی بجائے ارژنگ اور اُس کے کرتوں کی سرکوبی کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

"تمہارا مشورہ اپنی جگہ درست ہے اودغیر مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اس پر عمل نہیں کرسکتا۔ میں عمیر کو ضرور تلاش کروں گا تم یہیں رہو گے اور اپنے ان بے قابو سپاہیوں کی تنظیم نو کر کے عسکری قواعد کا پابند بناؤ گے۔"

"سپاہی یہ حرکتیں نشے کے زیرِ اثر اور فتح کی خوشی میں سرشار ہو کر کر رہے ہیں صبح جونہی اُن کا نشہ اُترے گا ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے ویسے اگر آشوری ہم پر غالب آجاتے تو وہ بھی ہماری عورتوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھتے۔"

کھانے کے بعد ہم خیمے سے باہر نکل آئے تاکہ تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوسکیں۔

خیمہ گاہ میں ہر طرف مشعلیں اور الاؤ جل رہے تھے۔ سپاہی جشن و طرب منانے میں مصروف تھے۔ اُن کے قہقہوں میں بربریت کا شکار ہونے والی عورتوں کی چیخیں بھی شامل تھیں جو میری برداشت سے باہر ہوتی

...ی تھیں اس لیے میں فرہاد کے خیمے کا پردہ ہٹا کر اندر چلا گیا۔ اودغیر بھی ... میرے پیچھے تھا۔

خیمے کے وسطی کھمبے کے ساتھ ایک شمع دان لٹکا ہوا تھا اس کی روشنی خیمے کا اندھیرا دور کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ خیمے کے ایک کونے ... کے ڈھیر پر لیٹا فرہاد بڑے مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔ اچانک اس کے قریب بیٹھی ہوئی ایک لڑکی اُٹھی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر فرہاد کے ... کا خنجر اٹھا لیا۔

اس لڑکی کی عمر بمشکل سولہ سال ہوگی۔ وہ آشوری حسن کا شاہکار تھی۔ اس کے سنہرے بال ۔۔۔ شانوں پر لہرا رہے تھے اور بڑی بڑی آنکھیں ... ہوئی تھیں۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ خنجر فرہاد کے سینے ... کر اس کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے مگر جب اس نے خنجر اس طرح اٹھایا جیسے اپنے دل میں گھونپ دینا چاہتی ہو تو میں نے مسکراتے ہوئے ... سے کہا: "ایسا نہ کرو لڑکی۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے ... کچھ بھی نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم اس خیمے میں کیسے آگئیں؟ کیا ... جانتا ہے کہ تم یہاں ہو؟"

"اس عالم میں تو اسے اپنا ہوش بھی نہیں ہے۔" لڑکی کی بجائے ... عیر بولا۔

میں نے لڑکی سے نگاہیں ہٹائے بغیر اودغیر کو خاموش رہنے کے ... کہا اور اسی نرم لہجے میں دوبارہ لڑکی سے مخاطب ہوا: "میں ازمیر کا ... سرزمین ہوں لڑکی اور تمہیں قول دیتا ہوں کہ ہم سے تمہیں کوئی ... نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس لیے بے خوف و خطر ہم سے بات کرو اور خنجر ... دو۔"

لڑکی خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ اس ... ہونٹوں کی کلیاں نیم وا ہوئیں اور وہ بولی: "مجھے تمہارے متعلق ... بتایا گیا تھا کہ تم دیوتا سمان ہو مگر تمہیں دیکھنے کے بعد اس بات سے میرا یقین ... اُٹھ رہا ہے کیونکہ تم مجھے دیوتاؤں جیسے نظر نہیں آتے۔"

اس پر اودغیر ہنس پڑا۔ میں نے کہا: "میں نہیں جانتا کہ دیوتا کیسے ... ہوتے ہیں۔ بہرصورت اس سلسلے میں پھر کبھی بات کریں گے پہلے یہ تو ... بتاؤ تم یہاں کیوں اور کیسے آئی ہو؟"

"میں ایک آشوری لڑکی ہوں۔ تمہارے سپاہیوں کے ایک گروہ نے مجھے پکڑ لیا تھا مگر اتنے میں فرہاد وہاں پہنچ گیا۔ اس نے انھیں حکم دیا کہ مجھے چھوڑ دیں مگر وہ نہ مانے اور لڑنے لگے۔ تب فرہاد نے ان میں سے دو کو زخمی کر دیا اور مجھے اپنے ساتھ خیمے میں لے آیا۔ میں نے اس کے خنجر سے خودکشی کرنا چاہی تھی اس نے مجھے روک دیا اور بتایا کہ وہ خود بھی ایک آشوری ہے۔ پھر اس نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیں جو صرف ایک آشوری ہی جان سکتا ہے۔ تب مجھے یقین آگیا اور میں نے ... کر لیا۔ ... کروں گی۔ پھر وہ تو نشے میں سو گیا مگر مجھے بھوک کے مارے نیند نہیں آسکی۔"

میں نے اودغیر سے کہا کہ وہ میرے خیمے سے بچا ہوا کھانا لے آئے۔ ... تو لڑکی نے میری طرف ... کہا: "فرہاد نے کہا تھا کہ وہ تم سے اجازت لے کر مجھے اپنے پاس رکھے گا۔"

"کیا تم اس کے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ بھی آشوری ہے اور میں بھی۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ملازبہ۔"

"اچھی بات ہے ملازبہ۔ اگر وہ تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہے گا تو مجھے اجازت دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

اتنے میں اودغیر کھانا لے آیا اور ملازبہ اس پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑی۔ میں نے اودغیر سے کہا: "... ہمارے ... موجود رہیں گے۔ ... شراب سے ... میں سوچتا ہوں جب تمہیں نیند آنے لگے تو مجھے جگا دینا ... مجھے فرہاد کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔"

یہ کہہ کر میں ... کے خیمے سے باہر آگیا۔

اب ہوا میں خنکی آگئی تھی اور ابھی خاصی سردی ... تھی۔

میں نے اپنے خیمے کے ... اور اپنا ... بستر پر لیٹ گیا۔ ... میں ... جیسے ... ... وصول کر لیا ہو اور واقعی ایسا ہی تھا ... نے مجھے ... گیسٹر ... ہوتے ... خیالات ... سنبھلی گئیں ... گے ... اس کی ... دی گئی ہے اگرچہ ... کی نقل و حرکت ... ہیروں کی تلاش والی مہم جاری رکھنی چاہیے اس ... کے بعد ... سے ... ہوتے ہوتے بند ہو گئے۔

مجھے اپنی کنپٹیوں میں ... محسوس ہونے لگا۔

میں نے افق کی جانب دیکھا۔ صبح کاذب کا اجالا ہونے ... پھیلنے لگا تھا میں نے خیموں کے باہر سوئے ہوئے ... سپاہیوں کو ... ملازم کو جگایا اور انھیں حکم دیا کہ وہ جلدی سے ... تاکہ ... سے ... جا سکے۔

★ ★

فرہاد نے کل رات اتنی ... پی تھی کہ ... کے بعد ... ہوش میں آیا اگر ... کو ... آنکھیں بھی ... ملازبہ کے ... نے ... جلدی ... یہ خوش قسمت ... کہ ... ملازبہ ہے۔

میں نے اُسے جلدی سے تیار ہونے کے لیے کہا تو وہ ٹال مٹول کرتے ہوئے بولا۔

"ہم حمیر اور شمروز کو تلاش نہیں کر سکیں گے شہزادے۔"

جب سے فرازیہ کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی، سب مجھے شہزادہ کہنے لگے تھے۔ کبھی کبھی مجھے اس اندازِ تخاطب پر ہنسی بھی آجاتی تھی۔ میں نے فرہاد کے مُنہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے کہا۔ "یہ بہانے رہنے دو فرہاد۔ میرا خیال ہے، شراب نے تمھیں اتنا بزدل بنا دیا ہے کہ تم شمروز سے ڈرنے لگے ہو اسی لیے اس کی تلاش سے گریز کرنا چاہتے ہو۔"

"دیوتاؤں کی قسم میں اُس مردود سے نہیں ڈرتا۔ وہ مجھے مل جائے تو میں اُس کے خون سے شبابہ کا قصاص ادا کروں گا مگر مشکل یہ ہے کہ پہاڑیوں کی اُن غاروں میں انھیں تلاش کرنا ناممکن سا ہے۔ آپ نہیں جانتے، اُن پہاڑیوں کے نیچے غاروں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ ہم انھیں ڈھونڈنے کی بجائے خود کھو جائیں گے۔"

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے اُسے جواب دیا۔ "اگر اب ہم حمیر کو گرفتار نہ کر سکے تو پھر زندگی بھر وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ بس تم جلدی سے لباس تبدیل کر لو۔" اتنے میں اوغیر بیس سپاہی اپنے ساتھ لے آیا اور بولا۔

"اس وقت صرف یہی لوگ آپ کے ساتھ چل سکنے کے قابل ہیں شہزادے، باقی سپاہیوں کو اتنا ہوش بھی نہیں کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ سکیں۔"

"کوئی بات نہیں اوغیر۔ اتنے ہی بہت ہیں۔ کیا انھیں ضروری سامان دے دیا گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ ہتھیاروں کے علاوہ ان کے پاس رسیاں اور مشعلیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد میں فرہاد اور نازیہ کے علاوہ بیس جوانوں کے ساتھ آشوری ساحل کی ایک پہاڑی غار میں داخل ہو چکا تھا لیکن جیسا فرہاد نے بتایا تھا، یہ غاریں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ حمیر نے اپنے فرار کے لیے کون سی سُرنگ منتخب کی ہوگی۔ فرہاد نے مشعل کی روشنی متعدد غاروں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ مہم ترک کر دو شہزادے۔ حمیر اور سیروں کی چٹانوں تک پہنچنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں اور پھر وہ اب تک ان میں سے کسی سُرنگ میں بیٹھ کر اپنی گرفتاری کا انتظار نہیں کر رہا ہوگا۔ وہ اپنے پہاڑوں میں پہنچ کر بچے کھچے آشوریوں کو اکٹھا کر رہا ہوگا۔"

"تم یہ بات یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو فرہاد؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا اندازہ یہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اور اس کے بچے کھچے ساتھی کسی سُرنگ کے موڑ کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں اور اچانک ہم پر ٹوٹ پڑیں۔"

اگرچہ فرہاد کی بات میں وزن تھا مگر میں اپنی بات پر اَڑ گیا اور بولا

"خدشوں سے خوفزدہ ہونا بزدلی ہے فرہاد۔ ہم دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ غاروں میں ڈھونڈیں گے۔"

"مگر یہ غار بھول بھلیوں سے کم نہیں شہزادے۔"

"رسیاں اسی مقصد کے لیے لائی گئی ہیں فرہاد۔ ہم کسی چٹان کے ساتھ رسیاں باندھ کر مختلف غاروں میں داخل ہوں گے اور پھر انہی رسیوں کی رہنمائی میں واپس آجائیں گے۔ اگر حمیر اور اس کے ساتھی کہیں دکھائی دے جائیں تو ان پر نہ تیر چلائے جائیں اور نہ حملہ کیا جائے۔ بس مجھے مطلع کر دیا جائے پھر اُن پر قابو پانا میرا کام ہے۔" میں نے وضاحت کی تو فرہاد بولا۔

"کاش آپ مجھے شراب لانے دیتے تاکہ مجھے ان غلط اقدامات کا احساس تو نہ ہوتا۔"

اس سے پہلے کہ میں فرہاد سے بحث کرتا، نازیہ بول اُٹھی۔ "جب میں چھوٹی تھی اور اپنے بھائی کے ساتھ ساحل پر کھیلا کرتی تھی تو ایک بار ان غاروں میں آئی تھی۔ ان میں سے ایک غار کئی میل لمبی ہے جو وادی تک جاتی ہے اور یہ وادی ہمارے پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔"

"پھر وہ اُسی غار سے گئے ہوں گے۔ وہ کون سی سرنگ ہے نازیہ؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

نازیہ نے وہ سُرنگ دکھائی اور ہم سب اُس میں داخل ہو گئے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد ایک مقام پر ہمیں ایک آشوری کی لاش دکھائی دی۔ جس نے زخموں کی وجہ سے دم توڑ دیا تھا۔

میں بے ساختہ بول اُٹھا۔ "وہ اسی راستے سے گئے ہیں فرہاد!"

"ہاں۔ اس لاش کی موجودگی تو یہی بتاتی ہے۔" وہ لاش کو پاؤں سے سیدھا کرتے ہوئے بولا۔ "یہ حمیر کے محافظوں میں سے ایک تھا۔ مگر میں نے جن خدشوں کا اظہار کیا ہے، وہ اپنی جگہ اب بھی موجود ہیں۔ آپ کے ساتھ مٹھی بھر سپاہی ہیں جو جنگجو وحشی آشوریوں کے سامنے نہیں ٹِک سکتے۔ میری حالت بھی ابتر ہے۔ اب صرف آپ اور یہ لڑکی ہی باقی رہ جاتے ہیں اور اس لڑکی کے بارے میں اب تک متذبذب ہوں کہ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔"

یہ سن کر نازیہ نے غصّے سے فرہاد کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں نے تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا کہ مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں کہ تم مجھے قابلِ اعتماد سمجھتے ہو یا ناقابلِ اعتماد۔"

میں نے بغور لڑکی کے تاثرات کا جائزہ لیا لیکن اس کی آنکھوں یا چہرے کے تاثرات سے کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکا۔ وہ مجھے اپنی طرف گھورتا پا کر بولی۔

"میں نے تمھیں سچ بتایا ہے۔ یہ سرنگ وادی کی طرف جاتی ہے اور

...ی اُن پہاڑوں میں واقع ہے جہاں آشوری بادشاہ رہتے ہیں۔ اب ...ارا جی چاہے کرو۔ جاؤ یا نہ جاؤ تمھاری مرضی۔"

"ہم جائیں گے نازیہ۔" میں نے کہا۔ "مگر تم ہمارے آگے آگے چلو گی ...ہمارے تیر اندازوں کی زد میں رہو گی۔" پھر میں نے اپنے سپاہیوں سے ...اس پر نظر رکھنا۔ اگر یہ فرار ہونا چاہے تو اسے تیروں سے چھید ڈالنا۔"

نازیہ مسکرائی اور ہم سے پچیس تیس قدم آگے آگے چلنے لگی۔

تقریباً نصف گھنٹے تک اُسی سرنگ میں چلنے کے بعد وہ ایک اور ...ب میں داخل ہوئی۔ ہم بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھے اور وہ تیروں کی زد ...تھی۔ مگر اس سُرنگ میں جا بجا مینار نما چٹانیں بھی تھیں۔ کچھ دُور چلنے کے ...اس نے مشعل بلند کی اور اس کی روشنی ایک اور غار کے دہانے پر ڈالتے ...ے بولی۔ "یہ سیدھی وادی میں نکلے گی۔"

وہ غار میں داخل ہو گئی۔

جب ہم اس غار میں داخل ہوئے تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ اچانک ...چٹان کے پیچھے سے آشوری نکلے اور انھوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میں اور فرہاد نے ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ ملائی اور ان کا مقابلہ کرنے ...لیکن یہ مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ انھوں نے ہم پر جال ...پھینک کر ہمیں بے بس کر دیا تاہم اُس وقت تک ہم گیارہ آشوریوں کو ...ن کے گھاٹ اُتار چکے تھے۔

جال میں پھانسنے اور بے بس کرنے کے بعد انھوں نے ہمیں رسیوں ...باندھ دیا۔ ہمارے سپاہیوں کے سر قلم کر کے نیزوں پر بلند کیے اور ...لیاں اُٹھا کر چل دیے جن کے ساتھ میں اور فرہاد بندھے ہوئے تھے۔

میں جو حمیر کو گرفتار کرنا چاہتا تھا، اب خود حمیر کا قیدی بن گیا تھا۔ آشوریوں نے مجھ سے شاہی قیدی کا سلوک کیا۔ انھوں نے میرے ...ر پاؤں کھول کر ایک بڑے جھونپڑے میں نظر بند کر دیا۔ جس کے باہر کڑا ...وتھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ فرہاد کو کہاں لے گئے ہیں۔

دوسرے دن مجھے ایک ایسی جگہ لے جایا گیا جسے مقتل کہا جا سکتا ہے ...ل حمیر، شموزا اور فرہاد موجود تھے۔ فرہاد کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور اس ...پاؤں بھی جکڑ دیے گئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ اُسے وہ سزا دی جانے والی ...جو آشوری قانون کے مطابق غداروں کو دی جاتی ہے اور وہ سزا یہ تھی ...مجرم کو کلہاڑے کی پانچ ضربیں لگائی جاتی تھیں دو ضربوں سے اس کے ...ؤں کاٹے جاتے تھے، دو ضربوں سے ہاتھ اور پانچویں سے گردن۔

شمروز نے، جو صورت ہی سے انتہائی مکار اور رذیل نظر آتا تھا، ...سے درخواست کی کہ فرہاد کو سزا دینے کا کام اُس کے سپرد کر دیا جائے اور ...نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنے دانت

شمروز کے نرخرے میں گاڑ دوں لیکن میں پندرہ بیس آشوریوں کے نرغے میں گھرا ہوا تھا اور مجھے اس لیے وہاں بلایا گیا تھا کہ میں بچشمِ خود اپنے ساتھی کو موت کے گھاٹ اُترتا دیکھوں۔

فرہاد کو ایک چبوترے پر لٹا دیا گیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں چار کھونٹوں سے جکڑ دیے گئے۔

شمروز جو دبلا پتلا مگر دراز قد آدمی تھا کلہاڑا لے کر اس کی طرف بڑھا میں نے فرہاد کی طرف سے اپنا مُنہ پھیر لیا۔ مگر بھالوں کی زد پر مجھے اس کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔

شمروز فرہاد کے قریب آیا تو فرہاد نے اُس کے مُنہ پر تھوک دیا۔ شمروز کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹا اور جوشِ وحشت میں اُس نے دو ضربوں سے فرہاد کے دونوں پاؤں کاٹ دیے۔ یہ منظر دیکھ کر غم و غصّے کے مارے میرے مُنہ سے کراہ نکل گئی مگر آفرین ہے فرہاد پر اس کے مُنہ سے سسکاری تک نہ نکلی اس نے دوبارہ شموز کی طرف مُنہ کر کے تھوک دیا۔

شمروز آگ بگولا ہو کر پھر آگے بڑھا اور اس نے فرہاد کے ہاتھ بھی کاٹ دیے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس وقت کھولیں جب فرہاد کا سر کٹ چکا تھا اور اُسے نیزے پر بلند کیا جا رہا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ غم، غصّے، نفرت، اور ندامت کی شدت سے مجھے متلی سی ہونے لگی۔ میرے ضمیر نے مجھے سانپ کی طرح ڈسنا شروع کر دیا کہ فرہاد میری وجہ سے اتنی کرب ناک موت کا شکار ہوا تھا۔ میں اپنے ضمیر کی ملامت کا بوجھ نہ اُٹھا سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں ایک سطح مرتفع پر بنے ہوئے جھونپڑے میں پڑا تھا۔ میں نے بمشکل اُٹھ کر جھونپڑے اور سطح مرتفع کا جائزہ لیا۔ یہ پہاڑی نہیں بلکہ ایک اونچا ٹیلہ تھا اور اس کے اردگرد ہر طرف اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں جن پر آشوری محافظ متعین تھے۔ میں گرتا پڑتا دوبارہ جھونپڑے میں آیا تو مجھے شدید بخار ہو رہا تھا۔ میں کھالوں کے بستر پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

نہ جانے کتنے دن بخار میں پُھنکتا رہا۔ کبھی کبھی نیم بے ہوشی اور غنودگی کی کیفیت میں مجھے مختلف لوگوں کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ اسی عالم میں اکثر مجھے ایک لڑکی کی آواز بھی آتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ خواب ہی کی کیفیت میں، میں نے اُس سے اس کا نام پوچھا تھا۔ اس نے اپنا نام سمیرا بتایا تھا۔

مگر جب میرا بخار ٹوٹا تو پتہ چلا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی۔ حمیر کی بیٹی سمیرا میری بیماری کے دوران بھی آتی رہی تھی اور اب بھی ہر

دوسرے روز آیا کرتی تھی۔

مجھے صحت یاب ہونے کے بعد اسی بندی خانے میں رہتے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے بارے میں آشوریوں کے ارادے کیا ہیں مگر میرا ارادہ بہر طور وہاں سے فرار حاصل کرنے کا تھا۔ اسی لیے میں نے اُن سے کھالیں اور سُوئی دھاگا منگوایا تھا اور انھوں نے بلا چون و چرا یہ چیزیں مہیا کر دی تھیں۔ میں ان کھالوں کو ایک دوسرے کے ساتھ سی کر ایک غبارہ تیار کر رہا تھا کہ وہاں سے صرف پرواز کے ذریعے ہی فرار ممکن تھا۔ دوسری کوئی صورت اس لیے نہیں تھی کہ اس کا پاس فٹ اونچے ٹیلے پر صرف سیڑھی کی مدد سے آیا یا اُترا جا سکتا تھا۔

فرہاد کی عبرتناک موت نے میرے دل میں ہی نہیں روح تک میں گھاؤ ڈال دیے تھے۔ اس کی موت کا منظر میری لوحِ ذہن پر اس طرح نقش ہو گیا تھا کہ کسی طور پر مٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ہر بار اس کی یاد میری آنکھوں میں آنسو بھر دیتی تھی۔ میرا ضمیر مجھے مسلسل کچوکے دیتا رہتا تھا اور میں خود اپنی نگاہوں سے گر گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں خود اس کا قاتل ہوں۔

میں روزانہ اپنے جھونپڑے سے باہر نکل کر ٹہلنے کے بہانے اطراف کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ میرے چاروں طرف پہاڑیوں پر ہمہ وقت محافظ چوکس رہتے تھے اور دن میں کئی بار اُڑنے والے آدمی بھی کسی بلند پہاڑی سے پرواز کرتے ہوئے میرے سر پر سے گزر جاتے تھے اور میں سوچتا رہ جاتا تھا کہ آشوریوں نے گلائیڈر تو بنا لیے ہیں مگر انھیں غبارہ بنانے کا خیال کیوں نہیں سُوجھا۔ میں غبارے کی وجہ سے روز ہوا کا رُخ بھی معلوم کیا کرتا تھا جو گزشتہ پچیس دنوں میں اٹھارہ روز تک شمال سے جنوب کی طرف چلتی رہی تھی۔

آشوریوں کی یہ قید نظر بندی سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ مجھے اچھا کھانا دیتے تھے۔ جھونپڑے کو گرم رکھنے کے لیے مجھے کافی ایندھن بھی فراہم کر دیا گیا تھا اور میں اُس ٹیلے پر گھوم پھر بھی سکتا تھا۔

سمیرا ہر دوسرے روز میرے پاس آتی تھی۔ وہ درمیانہ قد و قامت کی نازک اندام لڑکی تھی۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ حسین تو نہیں تھی لیکن اُس کے بال بہت لمبے اور ہونٹ گلاب رنگ تھے۔ وہ چوری چھپے نہیں بلکہ حمیر کے حکم پر آتی تھی اور اُس کی آمد کا صرف ایک مقصد تھا کہ وہ ایک بیٹے کی ماں بن جائے۔ میں اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ مجھے اُس پر اعتماد بھی نہیں تھا۔ مگر اُس کی آمد خوش وقتی کا باعث ضرور بنتی تھی۔ سمیرا بھی مجھے پسند نہیں کرتی تھی۔ اُسے بھی مجھ پر اعتماد نہیں تھا مگر وہ اپنے باپ کا حکم ماننے پر مجبور تھی۔

میری سمجھ میں یہ ایک بات نہیں آتی تھی کہ حمیر مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کئی بار اُسے پیغام بھی بھیجا... مگر اس نے مجھے حاضری کا اِذن نہیں دیا تھا۔ آخر کیوں؟ یہ سوال میری مستقل سوچ بن گیا تھا۔

ایک روز میں غبارے کے لیے کھالوں کی سلائی میں مصروف تھا کہ اتنے میں جھونپڑے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے کھالیں کونے میں رکھ دیں اور آنے والے کی راہ دیکھنے لگا۔

وہ سمیرا تھی۔

حسبِ معمول نہ اُس کے گلاب رنگ ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری اور نہ آنکھوں میں تاثرات دکھائی دیے۔ وہ آئی اور بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح سمٹ سمٹا کر الگ بیٹھ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق اُس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ اپنا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں رکھتے ہوئے بولی۔

"تم ٹھیک ہو نا؟ تمھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" وہ ہمیشہ اپنی گفتگو کا آغاز اسی فقرے سے کیا کرتی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں سمیرا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر تمھارا باپ مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتا۔ میں کوئی عام قیدی نہیں، میں وہ آدمی ہوں جس نے اُسے میدانِ جنگ میں شکستِ فاش دی۔ اُسے تو مجھ جیسے مردِ میدان اور بہادر مدِ مقابل سے ملنے کے لیے بے تاب ہونا چاہیے تھا۔"

"وہ بے تاب تو ضرور ہے مگر یہ خبر سننے کے لیے کہ میں ایک بچّے کی ماں کب بنوں گی۔ شمروز اُسے برابر اُکسا رہا ہے کہ تم باپ بننے کے قابل ہی نہیں اسی لیے تمھیں اُس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ تم سے بھی وہی سلوک کرے جو اُس نے فرہاد سے کیا تھا۔ وہ تمھیں نہ دیوتا تسلیم کرتا ہے نہ دیوتاؤں کا فرستادہ۔ اور ہاں اُس نے نازیہ سے شادی کر لی ہے جو اس کے بچّے کی ماں بنے گی۔ وہ اپنے آپ کو تم سے زیادہ بہتر ہونے کا دعوا کرتا ہے۔"

"اس سلسلے میں تمھارے باپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا باپ اب بھی تمھیں دیوتا سمجھتا ہے۔ وہ شمروز سے کہتا ہے کہ اگر تم دیوتا نہ ہوتے تو اُسے ہرگز ہرگز شکست نہ دے سکتے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ میں تمھارے بیٹے کی ماں بنوں۔ وہ بچّہ آدھا آشوری اور آدھا دیوتا ہوگا۔ وہ آشوریوں کی عظمتِ رفتہ واپس لائے گا اور ہماری خوش بختی کا ضامن ہوگا۔ کبھی کبھی تو تمھارے متعلق میرے باپ اور شمروز میں تلخ کلامی کے بعد لڑنے تک کی نوبت آ جاتی ہے۔"

سمیرا کی اِن باتوں سے مجھے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ حمیر نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا اور شمروز کس قدر میرے خون کا پیاسا ہے۔ اب تک میں نے سمیرا کی خواہش پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کوئی ثبوت دینا ہی پڑے گا۔ اُس دن میں نے سمیرا پر ہر وہ حربہ

آزمایا جو ایک مرد کسی خاتون کے دل و جان پر حکمرانی کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے قرب و وصال کی ان گھڑیوں اُس پر وارفتگی سی طاری کردی۔ اس آنکھیں یوں بند ہوگئیں جیسے خمار نے اس کے پپوٹے بوجھل بنا دیے ہوں۔ اس نے پلکوں کی چلمن ذرا سا ہٹائی اور سرور کے عالم میں بولی "آج سے پہلے تو کبھی ایسا محسوس نہیں ہُوا تھا سرفروش۔"

"آج محبت نے ہمارے دلوں پر دستک دی ہے سمیرا۔" میں نے اُسے جواب دیا "آج ہمارے دلوں کا ملاپ ہُوا ہے۔ اب تمھارے بغیر میری زندگی ادھوری رہے گی۔"

"میں بھی یہی محسوس کر رہی ہُوں سرفروش۔ لیکن تم آشوری نہیں ہو اس لیے ہماری شادی نہیں ہوسکتی۔" وہ بولی۔

"پھر میں تمھارے بغیر کیسے زندہ رہوں گا سمیرا؟" میں نے بالکل اُسی طرح جھوٹ بولا جیسے ہمارے دَور میں لڑکیاں اور لڑکے ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کے لیے بولتے ہیں۔

"ایک صورت ہے سرفروش۔ تم میرے محبوب اور نگران بن کر میرے ساتھ رہو گے میں جلد ہی تمھیں اپنے باپ سے ملاؤں گی اور یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ رکھوں گی۔"

"مگر شمروز اس کی مخالفت کرے گا سمیرا۔"

"میرا باپ اُس کی بات بائیں کان سے سنتا ہے اور میری دائیں کان سے۔ شمروز میری محبت میں حائل نہیں ہوسکتا سرفروش۔ ہمیں کوئی ایک دوسرے سے جُدا نہیں کرسکے گا۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے سوچا کہ میں بھی کتنا احمق تھا ورنہ اب سے بہت پہلے یہ حربہ استعمال کرچکا ہوتا۔ ہر چند کہ یہ ایک گھٹیا بات ہے مگر میں اپنی بقا کے لیے ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ دراصل فرہاد کی موت نے مجھے اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا کردیا تھا۔ میں اُس کا مجرم ضرور تھا مگر ماضی ایک ایسی چیز ہے جسے خدا بھی نہیں لوٹاتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب فرہاد کی موت اور ماضی کا ماتم نہیں کروں گا۔ اس سوچ نے اُس سرفروش کو پھر زندہ کردیا جو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا جانتا تھا۔

اُسی رات میرے دماغ میں نصب کرسٹل نے پھر کام شروع کردیا۔ جب سے ٹیلے پر نظر بند کیا گیا تھا، کرسٹل نے کام کرنا بند کردیا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں میری ذہنی حالت کی وجہ سے بہت متفکر تھا۔ میں نے ارتکازِ توجہ سے اُسے غبارے کے ذریعے فرار ہونے کی اطلاع دے دی اور پھر سو گیا۔ بہت دنوں کے بعد مجھے اُس رات گہری نیند آئی تھی۔

صبح وہ مجھے لینے کے لیے آگئے۔ انھوں نے نہ مجھے زنجیروں سے جکڑا نہ رسیوں سے۔ بس اپنے نرغے میں لے لیا۔ ہم سیڑھی کے ذریعے ٹیلے سے اُترے اور وادی سے گزرے تو راستے کے دونوں جانب لوگ کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے مگر دیکھنے والوں کی اکثریت عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی، مرد بہت کم تھے۔

محافظوں کا دستہ مجھے اپنے گھیرے میں لیے ایک بہت بڑے غار میں داخل ہُوا حمیر اسی غار میں دربار لگایا کرتا تھا۔ غار میں بیسیوں مشعلیں جل رہی تھیں۔ سامنے حمیر پتھر کے قدرتی تخت پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کے اردگرد محافظ اور سامنے دو رویہ مجلسِ مشاورت کے ارکان موجود تھے۔ منصب دار کے گلے میں زنجیریں پڑی تھیں جو اُن کے مناصب کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ عہدے داروں کی پیشانیوں پر نیلے نشانات اُن کے عہدوں کی نشان دہی کرتے تھے۔

سمیرا تخت کے نیچے بیٹھی تھی جب میں محافظوں کے نرغے میں وہاں پہنچا تو اس کے گلاب رنگ ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ اُتر آئی۔ حمیر کے دائیں جانب شمروز اور اس کی نئی بیوی نازیہ بیٹھے تھے نازیہ نے نہ سر اُٹھایا نہ کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ البتہ شمروز مجھے دیکھ کر نفرت سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ میں نے سوچا کہ فرہاد تو شمروز کے خون سے تبابہ کا قصاص ادا نہیں کرسکا تھا مگر میں اس کے خون سے فرہاد کا قصاص ضرور ادا کروں گا۔

اُس وقت حمیر کے سر پر خود کی بجائے ایک آہنی تاج تھا۔ اُس کے شانے حیرت انگیز حد تک چوڑے تھے۔ اس کی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں مگر اُس کی بینائی کمزور ہوچکی تھی اس لیے اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نہ اس کے سامنے جُھکا نہ سر خم کیا کہ آشوری یہ دونوں عمل معیوب سمجھتے تھے۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔

"تم نے اپنے سحر کا نیا کرشمہ دکھایا ہے شہزادے۔ میری بیٹی کسی دوسرے مقصد کے لیے تمھارے پاس جایا کرتی تھی مگر اب وہ تمھاری زندگی چاہتی ہے۔ وہ تمھیں اپنے محافظ، محبوب اور جنگجو کی حیثیت سے رکھنے کی طلب گار ہے اور وہ بتاتی ہے کہ تم بھی رضامند ہو۔ کیا یہ سچ ہے شہزادے؟"

"ہاں۔ یہ درست ہے۔" میں نے جواب دیا تو شمروز نے میری طرف غصے سے دیکھتے ہوئے تھوک دیا اور بولا۔

"یہ جھوٹ ہے سردار۔ قیدِ تنہائی سے نجات حاصل کرنے کے لیے پہلے اس نے سمیرا سے محبت کا ڈھونگ رچایا اور اب یہ آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ اسے میرے حوالے کردیجئے تاکہ میں اسے اس کے دوست فرہاد کے پاس بھیج دوں۔"

حمیر نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "سزا دینے کا اختیار مجھے ہے شمروز۔ فرہاد کو سزا میں نے دی تھی اُس پر عمل تم نے کیا تھا اپنے آپ کو یہیں تک محدود رکھو۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم ایک ماہ کے اندر اندر جوان ہوگئے تھے؟"

"جی ہاں۔ یہ بھی سچ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے جاسوسوں نے مجھے بتایا تھا مگر مجھے یقین نہیں آیا تھا۔"

"اور مجھے اب بھی یقین نہیں ہے۔" شمروز پھر بیچ میں ٹپک پڑا حمیر نے اُسے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں دوسری بار تنبیہہ کر رہا ہُوں شمروز کہ یہاں کا بادشاہ میں ہُوں یاد رکھو کہ تیسری بار اس تنبیہہ کی ضرورت محسوس نہیں کروں گا۔"

شمروز نے قہرِ درویش برجانِ درویش اپنا سر جھکا لیا مگر اُس کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ اگر اُس کا بس چلے تو وہ مجھے ابھی ابھی قتل کر ڈالے۔ پھر بولا۔

"تم نے مجھے شکست دی ہے شہزادے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ جان چکا ہُوں کہ تم زیرِ آب پُل عبور کرکے میرے عقب میں پہنچے تھے۔ نے تمھارے کمان دار اعلا اور غیر کو دونوں پُل تباہ کرتے دیکھا ہے لیکن زیرِ آب پُل تعمیر کرنے کا خیال بھی کسی دیوتا ہی کو آسکتا ہے، عام انسان کو نہیں۔ مگر پُرانے دیوتاؤں نے ہم سے مُنہ موڑ لیا ہے۔ اس لیے ہمیں ایک نئے دیوتا کی ضرورت ہے۔ کیا تم ویسی ہی جادوئی قوت پر اب بھی قادر ہو؟"

"کون سی جادوئی قوت؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"بچوں کو ایک ماہ کے اندر اندر جوان بنا دینے والی ساحرانہ قوت۔ نے میری قوم کے بیشتر مرد جنگ میں موت کے گھاٹ اتار دیے ہیں اب ری قوم میں گنتی کے مرد باقی رہ گئے ہیں لیکن ہمارے پاس بچوں کی تات ہے میں چاہتا ہُوں کہ تم انھیں فوراً جوان بنا دو تاکہ میں پھر ے اپنی فوج تیار کرسکوں۔"

حمیر کی خواہش پُوری کرنا میرے بس میں نہیں تھا لیکن صورتِ حال تقاضہ یہ تھا کہ میں اُسے بہلاوا دوں۔ اس لیے میں نے کہا "میں ایسا کرسکتا ں لیکن اس کے لیے کچھ وقت لگے گا اور مجھے تمھاری مدد کے ساتھ ساتھ ک دار پتھروں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ میں نے سُنا ہے کہ تمھارے ہاں اُن روں کی بڑی بڑی چٹانیں ہیں۔"

یہ سُن کر حمیر کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا "تم حلفیہ کہتے ہو ایسا ممکن ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "بشرطیکہ مجھے ہر قسم کی آزادی حاصل ہو میرے کام میں مداخلت نہ کی جائے۔ اس سلسلے میں میں سب سے پہلے اں جانا چاہوں گا جہاں وہ چمک دار پتھر ملتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آیا کہ چمک دار پتھروں سے تمھاری کیا مراد ہے؟" ں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس کی مراد اس پتھر سے ہے۔" اس کا ایک منصب دار اور ایک پتھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بات جاری رکھی "میں اس سے اپنے خنجر کو دھار لگایا کرتا ہُوں۔"

منصب دار نے جو پتھر حمیر کو دیا تھا وہ ٹینس کی گیند کے برابر تھا۔ حمیر نے وہ پتھر مجھے دیتے ہُوئے پوچھا "تمھاری مراد ایسے پتھروں سے ہے؟"

میں نے پتھر کا جائزہ لیا۔ وہ وزن میں اُس پتھر سے نصف کے برابر ہوگا جو مجھے ارژنگ نے دکھایا تھا مگر یہ بھی خالص ہیرا تھا جس کی چکا چوند سے میری آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ میں نے اُسے منصب دار کو لوٹاتے ہُوئے کہا "ہاں میری مراد ایسے ہی پتھروں سے ہے۔ مگر مجھے اس سے بہت زیادہ بڑے پتھر چاہئیں۔ اس لیے کہ اگر مجھے بچوں کو جنگجو جوان بنانا ہے تو پہلے مجھے اُن کے قدِ آدم مجسّمے بنانا ہوں گے۔"

میری اس بات پر دربار میں خاموشی چھا گئی۔ حمیر خاموشی سے مجھے گھورنے لگا مگر شمروز خاموش نہ رہ سکا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولا۔

"یہ دیوتا کی قوت نہیں سردار، کالا جادو ہے۔ یہ ہمارے بادشاہوں اور ملکاؤں کے مقدس مقابر تک نہیں جا سکتا اور پھر یہ چمک دار پتھروں کے مجسّمے ہی کیوں بنانا چاہتا ہے؟ اسے ابھی قتل کردو سردار۔ اسی وقت۔ اگر یہ کوئی دیوتا ہے تو شیطانی دیوتا ہے۔ بدارواح کا نمائندہ ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی نازیہ بول اُٹھی "یہ دیوتا ہے یا نہیں میں نہیں جانتی مگر یہ بدی سے بالاتر ہے۔ یہ میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا تھا اور اس نے جو قول دیا تھا اُس پر بھی پورا اُترا تھا۔ میں سوتی رہی اور یہ میری عزت کا محافظ بن کر پہرہ دیتا رہا۔"

شمروز اس کی طرف پلٹا اور اُسے تھپڑ مارتے ہوئے بولا "بکواس بند کر عورت، مردوں کی مجلس میں عورتیں نہیں بولا کرتیں۔"

سمیرا جو اس دوران مُسکرا کر اور سر ہلا کر میری ہمت بڑھاتی رہی تھی شمروز سے بولی "تم نے اپنی بیوی کو سچ بولنے پر مارا ہے۔ تم..."

"اس نے ہماری باتوں میں دخل دیا تھا۔" وہ سمیرا کی بات کاٹتے ہُوئے بولا۔

"اور تم ہمیشہ میرے والد کی باتوں اور معاملات میں دخل دیتے رہتے ہو۔" سمیرا نے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا "مجھے تم سے نفرت ہے۔ اور ہر گزرتے پل کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دیوتاؤں کا شکر ادا کرو کہ میں ملکہ نہیں ہُوں۔" پھر وہ حمیر سے مخاطب ہوئی "آپ آشوری قوم کے سردار اور بادشاہ ہیں آبا جان۔ میں آپ سے التجا کرتی ہُوں کہ وہی کریں جو شہزادہ سرفروش کہتا ہے۔ کیونکہ آپ کو فوج کے لیے جوانوں کی ضرورت ہے اور مجھے اس کی۔" اتنا کہہ کر وہ اُٹھی اور حمیر کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ حمیر کے چہرے پر مسرت کے تاثرات اُگ آئے۔

"کیا واقعی میں آدھے دیوتا کا نانا بننے والا ہُوں؟" وہ بولا۔

سپاہی نے زرہ پہن کر سر جھکا لیا۔ جمیر نے بیلچے سے مٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شمروز سے کہنے لگا۔ "شمروز، ایک محافظ دستے کے ساتھ شہر سے نکلو تاکہ بلند شاہوں اور دشمنوں کے مقابلے کے لیے ایک بار پھر تیار ہوں۔ اگر شہر والے سر فروشی سے مقابلہ نہ کر سکے تو ان کی ساری بستیاں اور شہر ان کے ساتھ تباہ ہو جائیں گے اور عبرت بن جائیں گے۔"

★ ★

وہ دستہ جس کی حفاظت میں، میں شاہی مقابر کی طرف جا رہا تھا، آخری شاہی دستہ تھا کیونکہ بیشتر آشوری مرد جنگ میں کام آ چکے تھے۔ اس دستے میں بیس سپاہی شامل تھے۔ ہم استر پہاڑیوں کے درمیان جا رہے تھے اور کبھی کبھی کوئی زلزلہ سا آتا تو ہم سب ٹھہر جاتے تھے۔

ہم جنوب مشرق کی طرف جا رہے تھے جدھر ایک قلعہ واقع تھی۔ میں مختلف وادیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے راستے کی نشانیاں بھی ذہن میں نقش کر رہا تھا۔ آخری وادی کا اختتام ایک سرسبز میدان پر ہوا۔ بیابان اور صحرا کے اس میدان جیسا نہیں تھا جس میں زمیری بلند شاہوں کے کھنڈر بنتے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس اس میدان کے بیچ میں ایک پہاڑی واقع تھا۔ غروب آفتاب کے وقت جب اس کی چوٹی پر میں اس کے پہلو پر پہنچا تو اس کی بلندی منظر ایک عجیب سی روشنی سے منور ہو گیا۔ شمروز اور محافظ دستے کے سپاہیوں کی اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر میری نگاہوں کے لیے وہ روشنی کا عالم تھا۔ اس لیے کہ وہ شفق ہی روشنی کی چٹانوں سے پھیلتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سورج اس کے نشیب میں غروب نہیں ہو رہا بلکہ طلوع ہو رہا ہے۔

جب ہم پہاڑی کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ یہ کسی زمانے میں آتش فشاں تھا مگر اب سرد ہو چکا ہے۔ شمروز نے ایک کان کے دہانے پر پڑاؤ ڈال دیا اور مجھ سے بولا۔ "آگے کا راستہ ہم سب کو پیدل طے کرنا ہے۔ آؤ اب ہم مقابر کی طرف چلتے ہیں۔ اگر چاہو تو پڑاؤ کر دیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس تفریح کو جتنی جلدی ختم کر لیا جائے بہتر ہے۔ کیا تم چلنے کے لیے تیار ہو؟"

مجھے اس شخص سے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ وہ اپنے رویے سے اس بات کا اظہار کرتا رہا تھا کہ میرا یہ سفر بے کار ہے۔ میں اسے ختم کر ڈالوں مگر پھر میں نے سوچا اور بولا۔ "میں تیار ہوں۔"

شمروز نے محافظوں میں سے دس آدمی منتخب کیے۔ مشعلیں لیں اور ہم کان میں داخل ہو گئے۔ ایک مشعل بردار ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ کچھ دور جا کر یہ کان ایک طویل و عریض ہال میں بدل گئی جو مشعلوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی شیش محل میں آ گئے ہوں۔ ہال کے اطراف ہیروں کی چٹانیں تھیں اور ہر چٹان سے ان گنت رنگین

آتش دانوں میں روشنی تھی۔ میری نگاہیں خیرہ ہونے کے باوجود چٹانوں پر جمی تھیں لیکن شمروز مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ آخر وہ بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا یہ چٹانیں دیکھ کر تمھارے چہرے پر حرص و ہوس کیوں ٹپکنے لگی ہے۔ تم تو ان ہیروں کو یوں دیکھ رہے ہو جیسے کوئی جنگجو اچھا ہتھیار پا کر نامرد کسی حسینہ کو دیکھتا ہے۔"

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔ "وہ مجسمے کہاں ہیں؟ میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شمروز نے یہ سن کر اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔ اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کچھ کہا اور پھر مجھ سے بولا۔ "عام آدمیوں کو آشوری شہنشاہوں کے مجسمے دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تم میرے آگے آگے چلو گے تاکہ تمھیں اس کا موقع نہ ملے کہ میں اسے فرار کی کوشش پر محمول کر سکوں۔"

میں نے ایک مشعل ہاتھ میں لی اور آگے آگے چلنے لگا۔ راستہ طویل نہیں تھا۔ یہ ایک گلیارے پر ختم ہو گیا جس کے بعد ایک گہرا گڑھا تھا۔ گڑھے کے دوسری جانب گلیارے پر آشوری بادشاہوں اور ملکاؤں کے مجسمے ایستادہ تھے۔ میں نے مشعل کی روشنی گڑھے پر ڈالتے ہوئے جھانکا تو دم بخود رہ گیا۔ مشعل کی روشنی اس کی گہرائی تک پہنچنے میں ناکام رہی تھی۔ اتنے میں پیچھے سے شمروز کی آواز آئی۔

"مستقبل کے مجھے تو تمھیں قتل کرنے کی خوشی نصیب نہیں۔ مگر میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ تم اس گڑھے کی گہرائی میں گر کر میرے لیے مصیبت کھڑی کرو اور میں جمیر کو یہ یقین نہ دلا سکوں کہ تم خود ہی اس کنوئیں میں گرے تھے۔" پھر اس نے میرے کی چٹان کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اسے گہرائی میں پھینکتے ہوئے بولا۔ "سنو، پھر بتاؤ کہ اس کی گہرائی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔"

مگر مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ شمروز ہنسا اور بولا۔ "پاتال۔ آوازیں نہیں آیا کرتیں چھوٹے دیوتا۔"

میں گلگر سے پیچھے ہٹ گیا اور اچانک میری نگاہ اس پر پڑی جو سامنے والی گلگر پر اپنی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار حسین عورتیں دیکھی تھیں لیکن ایسا حسن اب تک نگاہوں سے نہیں گزرا تھا۔ اس پیکر شباب نے مجھے نگاہ ہی نگاہ میں دیوانہ کر دیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کا حصول ہی اب میرا مقصد ہے۔ اتنے میں مجھے اپنی پشت پر کسی تیز کی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو شمروز اپنی تلوار کی نوک سے دوبارہ ٹہوکا دیتے ہوئے بولا۔

"یہ ترچھے جمال زرتاج ہے۔ ہزار ہا سال پہلے کی آشوری ساحرہ نے شاہی مجسموں کی روایت ڈالی تھی۔ جانتے ہو کیا خاتون تم بھی تنہیں ہے۔ وہ اب بھی زندہ ہے شمروز۔ یہ صفائی آپ میری زبان پر آ گئے

"میں تمھاری اس بات سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ یہ آج بھی ...والوں کو مسحور کر لیتی ہے لیکن تم صرف اُسے دیکھنے نہیں آئے تھے۔ ...سرے مجسموں پر بھی نگاہ ڈالو اور چلو کہ ہم رات بھر یہاں نہیں رُک سکتے۔"

لیکن میں اتنی جلدی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے ایک منصوبے ...ل کرنا تھا اور اُسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے شمروز کو باتوں میں ...ائے رکھنا تھا۔ اسی لیے میں نے کہا۔ "میں کسی ایک مجسمے کو غور سے دیکھنا ...ہتا ہوں بلکہ بچوں کو جنگجو جوان بنانے کے لیے مجھے ان میں سے ایک ...زدرکار ہوگا تاکہ اس کے مطابق دوسرے مجسمے تیار کروا سکوں۔ ورنہ ...ری ساحرانہ قوت بے نتیجہ ثابت ہوگی۔"

شمروز نے میری بات پر قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تمھاری یہ خواہش ...ری نہیں کی جا سکتی چھوٹے دیوتا۔ جب مجسمے وہاں رکھ دیے جاتے ہیں ...پھر انھیں کوئی نہیں چھو سکتا۔ دوسرے ان مجسموں تک صرف اُسی ...ورت میں پہنچا جا سکتا ہے جب کوئی اس گڑھے پر سے پھلانگ کر دوسری ...رف جا سکے۔ اگر تم اتھاہ گہرائی والے اس گڑھے کو پھلانگ سکتے ہو تو جمیر کو ...اکر ادھر آ جانا۔"

میں نے ایک بار پھر درمیانی گڑھے پر نگاہ دوڑائی۔ صرف ایک مقام ...پر اس کی چوڑائی کم تھی مگر یہ بھی پندرہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ میں آہستہ ...آہستہ شمروز کی طرف کھسکنے لگا۔

"شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ یہ مجسمے اُدھر کیسے پہنچائے گئے ہوں گے۔ ...بس بتاتا ہوں۔ جب کوئی آشوری بادشاہ یا ملکہ مرتی ہے تو اس کا مجسمہ ...بنا کر یہاں لایا جاتا ہے پھر آشوریوں میں سے وہ تندرست و توانا مرد اور ...عورتیں جو ملکہ بننے کے متمنی ہوں، اس گڑھے کو پھلانگنے کی کوشش کرتے ...ہیں، جو کامیاب ہو جائے اُسے ملکہ یا بادشاہ بنا لیا جاتا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا اس کوشش میں لوگ گڑھے میں گر جاتے ہیں؟" میں نے اس ...کی طرف سرکتے ہوئے پوچھا۔

"لاتعداد۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا جمیر کو بھی بادشاہ بننے کے لیے اس گڑھے کو پھلانگنا پڑا تھا؟"

"دو بار۔" وہ بولا۔ "اس سے پہلے نو آشوری اس کوشش میں پاتال ...پہنچ چکے تھے۔ جمیر دسواں تھا۔ جب وہ دوسرے گلگر پر پہنچا تو رسیوں اور ...جال کے ذریعے مجسمہ ادھر پہنچا دیا گیا۔ پھر رسیاں اور جال دوبارہ کھینچ لیے گئے ...اس لیے کہ بادشاہ بننے کے متمنی کو اسی طرح ایک بار پھر گڑھا پھلانگنا پڑتا ہے۔"

میں نے مزید سرکتے ہوئے اس گلگر کا جائزہ لیا۔ وہاں مجسموں کے آگے ...صرف پانچ فٹ جگہ تھی۔ میں نے شمروز سے کہا۔

"تم بھی تو جمیر کے ہم عمر دکھائی دیتے ہو۔ تم نے یہ گڑھا پھلانگنے کی ...کوشش کیوں نہیں کی تھی؟" مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، میں اس سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نے اُس کی توجہ ہٹانے کے لیے فوراً کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ اس گڑھے کو پھلانگنا بے حد خطرناک ہے۔ میں ہوتا تو یہ جرأت کبھی نہ کرتا۔" یہ کہہ کر میں اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

"یہ بات نہیں تھی سرفروش۔ جمیر مجھ سے پہلے..."

"رہنے دو شمروز۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے اس لیے یہ کوشش نہیں کی ہوگی کہ اس بزدلی کے باعث بہادروں سے زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکو۔"

یہ سنتے ہی شمروز آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور تلوار بلند کرتے ہوئے بولا۔ "کوئی دیوتا اور آدمی مجھے ایسا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف لپکا۔ میں نے فوراً جھکائی دے کر اُسے ٹانگوں سے پکڑا اور اپنے سر پر سے اُچھال کر گڑھے میں پھینک دیا۔ اس کی چیخ تو بلند ہوئی مگر صدائے بازگشت پیدا نہ ہو سکی۔

میں نے سب سے پہلے اپنی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے کہ کہیں اُس کی تلوار سے مجھے کوئی چرکا تو نہیں لگا ورنہ میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ مگر وہاں کوئی تازہ زخم نہیں تھا۔ البتہ پُرانے زخموں کے کچھ کھرنڈ باقی تھے۔

میں نے ایک بار پھر زرتاج کے مجسمے پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہزار ہا سال گزرنے کے باوجود وہ زندہ ہے اور اُس نے مجھے دیکھ کر اپنی بانہیں پھیلا دی ہیں۔ جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہے۔ "میں صدیوں سے تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں سرفروش، آخر میں کب تک انتظار کے ساحل پر یوں بانہیں پھیلائے کھڑی رہوں گی۔ آؤ میرے محبوب میرے پاس آ جاؤ۔"

"میں آؤں گا زرتاج۔ میں ضرور آؤں گا۔ جہاں تم نے صدیوں میرا انتظار کیا ہے، وہاں تھوڑے سے دن اور۔" مجھے یاد نہیں کہ میں نے یہ الفاظ کہے تھے یا یہ صرف میرے دل کی آواز تھی۔ میں نے زرتاج پر نگاہ واپسی ڈالی اور شمروز کی جان سے فرہاد کے خون کا قصاص ادا کر کے پڑاؤ پر لوٹ آیا۔

جب محافظ دستے کو میں نے بتایا کہ شمروز پھسل کر گڑھے میں گر پڑا ہے تو انھوں نے میرے اس جھوٹ کو سچ تسلیم نہ کیا۔ اگر انھیں جمیر کی ہدایت یاد نہ ہوتی تو وہ اسی وقت میرے پرخچے اُڑا دیتے مگر انھوں نے میرے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑ دیے اور وادی میں واپس لے آئے۔

اب میں ایک بار پھر اُسی ٹیلے پر قید یا نظر بند کر دیا گیا اور سمیرا کی آمد و رفت پر بھی پابندی عاید کر دی گئی لیکن ایک دن پچھلے پہر وہ محافظوں کو رشوت دے کر میرے بندی خانے پہنچ ہی گئی۔ میں سمجھا، شاید وہ میری رہائی یا فرار کی راہ ہموار کر کے آئی ہے اس لیے میں نے اُسے اپنے حصار میں لے لینا چاہا مگر اُس نے مجھے سختی سے روک دیا اور ایک خنجر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"میرا باپ کسی بھی معاملے کا فیصلہ فوری طور پر نہیں کیا کرتا۔ وہ تخلیے میں سوچتا رہتا ہے اور کسی سے حتیٰ کہ مجھ سے بھی بات نہیں کرتا جب وہ کسی فیصلے پر پہنچتا ہے تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُس کا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اُس کا فیصلہ تمھارے حق میں نہیں ہوگا۔"

"کیا تم بھی مجھے شمروز کا قاتل سمجھتی ہو سمیرا؟"

"ہاں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم نے اپنے دوست فرہاد کا انتقام لینے کے لیے اُسے مار ڈالا۔ یہ صرف میرا ہی نہیں ہر آشوری کا خیال ہے اگرچہ میری اور اس کی نئی بیوی نازیہ کی نظر میں شمروز کی موت کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن وہ میرے باپ کا وفادار دوست اور آشوری قوم کا اہم منصب دار تھا، اس لیے وہ تمھیں ضرور سزا دے گا۔"

"یہ سزا کس قسم کی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ وہ لرزتے لہجے میں بولی: "وہ تمھیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے جائیں گے اور چٹان سے باندھ کر لوٹ آئیں گے تاکہ گدھ تمھاری بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں۔ یہ بڑی کربناک موت ہوگی۔ اگرچہ تم نے محبت کے نام پر مجھے بے وقوف بنایا ہے پھر بھی میں تمھارے لیے ایسی موت کا تصور نہیں کر سکتی۔ یہ خنجر میں اسی لیے لائی ہوں۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ میں اس سے اپنی شہ رگ کاٹ لوں؟"

"اگر تمھارے اندر اتنی ہمت ہے تو۔ یہ موت جیتے جی گدھوں کے لقمے بننے سے بہتر ہوگی۔" پھر وہ واپسی کے لیے پلٹی مگر چند قدم جا کر رُک گئی۔ اب آنسو اس کی پلکوں کی منڈیروں سے اُتر آئے تھے۔ وہ بولی: "میں دوبارہ نہیں آ سکوں گی اور تمھیں کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔ بہتر ہوگا کہ میں تمھارے بچّے کی ماں نہ بنوں۔ اگر بن گئی تو اُسے اپنے ہاتھوں مجھے مارنا پڑے گا۔"

"تم خود اپنی ممتا کا گلا گھونٹو گی سمیرا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ تم نے محبت کے نام پر مجھا اور میں نے اپنے باپ کو دھوکا دیا ہے۔ مجھے کوئی ایسی یادگار نہیں چاہیے جو زندگی بھر میری شرمندگی کا باعث بنے۔ الوداع سرفروش۔ یہ خنجر تمھاری مشکل آسان کر دے گا۔"

اُس خنجر نے میری مشکل آسان ضرور کی مگر اُس انداز میں نہیں جس طرح سمیرا چاہتی تھی۔ اس کے جاتے ہی میں خنجر سے چارپائی کی رسیاں کاٹیں اور اس کی ایک پٹی نکال کر خنجر اس کے ساتھ باندھ دیا۔ یہ بھالے کی ایک بھونڈی شکل بنی پھر میں نے آگ جلائی اور جب وہ خوب بھڑک اٹھی تو میں نے اُس پر گیلی لکڑیاں ڈال دیں تاکہ اُن کے سُلگنے سے دھواں پیدا ہو جسے میں غبارے میں بھر سکوں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں جھونپڑے سے باہر گیا تاکہ ہوا کا رُخ بھی معلوم ہو جائے۔ ہوا حسبِ معمول شمال سے جنوب کی طرف چل رہی تھی اور خاصی تیز تھی۔ اتنے میں اُڑنے والا ایک

محافظ میرے سر پر سے گزر گیا۔ میں نے جنوبی پہاڑیوں کی طرف دیکھا جن کے عقب میں وہ آبنائے واقع تھی جسے عبور کر کے میں نے آشوریوں کو شکست دی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں وہاں تک پہنچ جاؤں تو تنہا نہیں رہوں گا کیونکہ آشوری عام آدمیوں کو دفن نہیں کرتے اور وہاں اب تک بہت سی ایسی لاشیں پڑی ہوں گی جن کے ہتھیار اور زرہ بکتر میرے کام آ جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ چمڑے کا یہ غبارہ مجھے اُن پہاڑوں تک پہنچا بھی سکے گا؟ کچھ بھی ہو فرار تو ہونا ہی تھا کہ پھر شاید اس کا موقع کبھی نہ مل پاتا۔ تمیر کسی وقت بھی تخلیے سے نکل کر میری موت کا فیصلہ صادر کر سکتا تھا۔

جونہی سورج غروب ہوا اور میں نے غبارے میں دُھواں بھرنا چاہا کہ بندی خانے کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ یہ دستک موت کی دستک تھی۔ میرا دم سینے میں اٹکنے لگا کہ وہ مجھے لینے آئے تھے۔ میں نے اپنا وہی بھونڈا سا بھالا اُٹھایا اور دروازے پر پہنچ گیا۔ مگر یہ دستک ایک ایسے محافظ کی تھی جو میرے لیے کھانا اور پانی لایا تھا۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا کہ پھر نہ جانے کب ملے۔

میں چاہتا تھا کہ چاند چڑھنے سے پہلے وہاں سے نکل جاؤں تو بہتر ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آشوری کے اُڑنے والے محافظ رات کے اندھیرے میں پرواز کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تاہم میں نے اس امکان کو رد نہ کیا اور جلدی سے چمڑے کا غبارہ باہر گھسیٹ لایا۔

میں نے غبارے کی دُہری سلائی کی تھی مگر اس کے باوجود اس سے ہوا خارج ہونا لازمی تھی۔ میں دل ہی دل میں دُعا مانگتا رہا کہ ایک بار وہ مجھے آشوریوں کے گھیرے سے باہر پہنچا دے پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے غبارے میں گرم ہوا یعنی دُھواں بھرنے کے لیے چمڑے کا ایک پائپ تیار کر رکھا تھا۔ اس کا ایک سرا میں نے غبارے کے منہ سے باندھا اور دوسرا سرا آتش دان کی چمنی سے جوڑ دیا۔ اس طرح دُھواں غبارے میں داخل ہونے لگا۔

میں نے غبارے سے لٹکنے کے لیے چمڑے کے تسمے بھی بنا رکھے

تھے۔ مگر یہ ناکافی تھے میں نے اس ڈر کے مارے مزید چمڑہ نہیں مانگا تھا کہ کہیں آشوری مشکوک نہ ہو جائیں اور یہ تحقیق نہ کرنے لگیں کہ آخر نیا چمڑا مجھے کس لیے درکار ہے۔ میں نے یہ تسمے غبارے کے منہ کے پاس باندھ دیے تاکہ انھیں پکڑ کر لٹک سکوں۔ اگر تسمے زیادہ ہوتے تو میں ان کا جھولا بنا کر آرام سے بیٹھ جاتا مگر میں نے لٹکنا بھی غنیمت جانا۔

اب غبارہ پھولنے لگا تھا مگر اس میں متعدد جگہوں سے تھوڑا تھوڑا دھواں خارج بھی ہو رہا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ یہ غبارہ مجھے اُٹھا کر پرواز بھی کر سکے گا یا نہیں۔ تاہم میں نے آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈال دیں تاکہ وہ جتنا زیادہ پھول سکے اُتنا ہی بہتر ہے۔

تھوڑی دیر میں غبارہ پھول کر تن گیا۔ میں نے اس پر مکّے مار کر جائزہ لیا تو وہ مجھے فٹ بال کی طرح سخت محسوس ہوا۔ اب وہ فرش سے اُٹھ کر دُھواں بھرنے والے پائپ کے ساتھ جھولنے لگا۔ میں نے جلدی سے اپنا بھونڈا بھالا اور سمیرا کا دیا ہوا خنجر سنبھالا۔ اتنے میں اُڑنے والا ایک محافظ میرے سر سے گزر گیا۔ اس نے غبارہ دیکھ لیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ اُڑنے والے محافظ رات کو بھی میری نگہبانی کرتے تھے۔ اور اب جبکہ اُس نے پھولا ہوا غبارہ دیکھ لیا تھا تو اُس کا مشکوک ہو جانا لازمی تھا اور یہ صورتِ حال سب کو چوکنا کرنے کے لیے کافی تھی۔

میں نے جائزہ لینے کے لیے ٹیلے سے نیچے جھانکا تو مجھے اندھیرے میں مشعلیں متحرک نظر آئیں وہ مشعلیں میرے بندی خانے والے ٹیلے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ گویا اُڑنے والے محافظ نے انھیں بھی خبردار کر دیا تھا یا وہ تمیر کے فیصلے پر مجھے لینے کے لیے آ رہے تھے۔ اب لمحے کی تاخیر بھی میرے لیے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ میں نے اردگرد کی پہاڑیوں پر نظر ڈالی تو وہاں بھی مشعلوں کو متحرک پایا اور نیچے سے آوازیں بھی سُنائی دینے لگیں۔ وہ لوگ محافظوں کو چوکس کر رہے تھے۔

یہ دیکھ کر میں غبارے کی طرف لپکا۔ آخری تسمے سے میں نے پائپ کو ایک جگہ گرہ لگائی اور اپنے ہاتھ اُن تسموں میں ڈالنے لگا جو میں نے لٹکنے کے لیے باندھے تھے۔ اتنے میں مجھے ان آشوریوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں جو ٹیلے پر چڑھ رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی پائپ کو کاٹنا شروع کیا تاکہ غبارہ آزاد ہو کر پرواز کرنے لگے مگر بھالے کی لکڑی بھی مزاحم ہو رہی تھی اور چمڑہ بھی سخت تھا اس لیے اُسے کاٹنے میں سخت دقت پیش آ رہی تھی۔ اتنے میں بندی خانے کا دروازہ پیٹا جانے لگا۔ ہر دستک کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں اور چمڑا کاٹنے کی رفتار بھی۔

پھر ایک جھٹکے کے ساتھ انھوں نے دروازہ توڑ دیا اور میری طرف بھاگے۔ عین اُسی وقت پائپ کا چمڑا بھی کٹ گیا اور غبارہ ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر اُٹھنے لگا۔ آشوریوں کے پہنچتے پہنچتے وہ بیس فٹ بلند ہو چکا تھا۔ ایک آشوری نے اپنا بھالا میری طرف پھینکا مگر وہ مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ البتہ ایک تیر غبارے میں پیوست ہو گیا۔ مگر اس سے غبارے کو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا اور وہ ہوا کے رُخ پر پرواز کرنے لگا۔

کچھ دیر کی پرواز کے بعد میرے ہاتھ دُکھنے لگے کہ وہ میرا وزن سہارے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ پر زور ڈال کر دوسرے کو آرام دینا چاہا تو میرا توازن بگڑنے لگا۔ ہر گزرتے پل کے ساتھ میرے ہاتھوں کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا بایاں ہاتھ مفلوج ہو گیا ہے۔ میں نے چاندنی میں نیچے دیکھا تو دل دہل کر رہ گیا۔ غبارہ پہاڑیوں سے کافی بلندی پر پرواز کر رہا تھا اگر میں اُسے چھوڑتا یا وہ میری گرفت سے چھوٹ جاتا تو وہ نیچے گر کر میری ہڈیاں بھی سُرمہ بن جاتیں۔ میں نیچے کی بجائے سامنے دیکھنے لگا۔

سامنے بھی موت مُنہ پھاڑے کھڑی تھی۔

غبارہ تیزی سے ایک ایسے پہاڑ کی طرف بڑھ رہا تھا جس کی بلند چوٹی برف سے ڈھکی ہوئی تھی اور غبارہ اس مخروطی چوٹی سے ڈیڑھ دو سو فٹ نیچے تھا۔ اگر وہ اسی رفتار کے ساتھ پہاڑ سے ٹکراتا تو بھی میری ہڈی پسلی ایک ہو جانا یقینی تھی۔

ابھی میں لمحہ لمحہ قریب آنے والی موت کا استقبال کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ مجھے اس پہاڑ سے اُڑنے والا ایک محافظ اپنی طرف پرواز کرتا دکھائی دیا۔ وہ سیدھا غبارے کی جانب آ رہا تھا۔ شاید مشعلوں کے اشاروں سے اُسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ اُس شے سے بھڑ جائے جو مجھے اُٹھائے اُڑتی چلی جا رہی ہے۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ میں غبارے کو کنٹرول بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اور کچھ نہ سُوجھا تو میں سرکس کے بازی گروں کی طرح جھولنے لگا۔ میری اس حرکت سے غبارہ بھی قدرے اِدھر اُدھر ڈولنے لگا لیکن اس میں خطرہ یہ تھا کہ کہیں تسمے نہ ٹوٹ جائیں۔ مجھے جھولتا دیکھ کر اُڑنے والا محافظ بھی خوفزدہ ہو گیا اور اُس نے بھی اپنے پروں کو حرکت دی۔ اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کمبخت غبارے سے ٹکرانے کی بجائے مجھ سے ٹکرا گیا اور اس کے چمڑے والے پر پھٹ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ میری ٹانگیں پکڑنے میں کامیاب ہوتا، میں نے بھالا اس کے سینے میں اُتار دیا۔ اُس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے پیروں کو حرکت دے کر اُسے چمڑے کے پَر سے نکال لیا۔ اس کارروائی کے دوران غبارہ پہاڑ سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے سے گزر گیا۔

اُس وقت میں صرف ایک قمیص پہنے ہوئے تھا۔ مجھے سخت سردی لگ رہی تھی اور میرے ہاتھ یخ ہو کر اکڑ گئے تھے۔ اب ان میں شدید ٹیسیں بھی اُٹھنے لگیں۔ میں نے بائیں ہاتھ والے تسمے میں اپنا دایاں

پیرا اڑانے کی کوشش کی تو غبارے کا چمڑا ایک جگہ سے پھٹ گیا اور اس میں بھرا ہوا دھواں تیزی سے خارج ہونے لگا۔ دھوئیں کے اخراج کے ساتھ ہی وہ نیچے آنے لگا۔ اتنے میں چاند بادلوں میں چھپ گیا۔

اب غبارہ نیچے آرہا تھا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سامنے کوئی پہاڑی ہے یا غبارہ زمین پر گرے گا۔ نیچے مجھے کہیں کوئی مشعل بھی دکھائی نہ دی۔ غبارے کے نیچے آنے کی رفتار بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اگر وہ زمین پر گرا تو بھی میری موت یقینی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ خداوندا، اگر مجھے مارنا ہی تھا تو وہیں مار دیتا۔ یہاں تک لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے میں چاند بادلوں سے نکل آیا اور غبارہ گرنے سے پہلے میں نے دیکھ لیا کہ نیچے پانی ہے۔ دوسرے لمحے میں چھپاک سے پانی میں گر گیا۔ مگر تیزی سے گرنے کے باعث مجھے پانی سے بھی چوٹ محسوس ہوئی تاہم یہ ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھ تسموں سے نکالے اور غبارے کو دبا دبا کر اس کی باقیماندہ ہوا خارج کر کے اُسے ڈبو دیا۔ پھر میں نے چاروں طرف جائزہ لیا تو پانچ سو گز کے فاصلے پر مجھے ساحل کی ریت چمکتی دکھائی دے گئی۔ میں تیرتا ہوا کنارے پر آیا اور بے دم سا ہو کر ریت پر لیٹ گیا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے اندازہ لگایا کہ غبارہ تقریباً آدھ گھنٹہ پرواز کرتا رہا تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ابھی پوری رات باقی تھی۔ میں بندی گھر سے تو نکل آیا تھا مگر ابھی خطرے سے نہیں نکلا تھا۔ میرے پاس نہ خوراک تھی، نہ پینے کا پانی اور نہ کوئی ہتھیار۔ میری قمیص بھیگ چکی تھی، میں ننگے پاؤں تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ تقدیر لے مجھے کہاں لا پھینکا ہے۔ وہاں ہر طرف خاموشی تھی جسے صرف ساحل سے ٹکرانے والی لہریں توڑ رہی تھیں۔

میں نے سوچا کہ یہ وہی آبنائے ہوگی۔ مگر میں اس وقت کون سے ساحل پر تھا؟ یہ آشوری بھی ہو سکتا تھا اور ازمیری بھی۔ میں نے قرب و جوار کے ماحول سے اندازہ لگانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ساحل سے کچھ دُور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے ہیں۔ مگر ایسی پہاڑیاں تو دونوں ساحلوں پر تھیں۔ میں نے مزید مغزماری بہتر نہ سمجھی اور قمیص اُتار کر خوب نچوڑنے کے بعد دوبارہ پہن لی۔ میرے لیے پہلا مسئلہ کسی محفوظ مقام کی تلاش تھا کہ رات گزار سکوں۔ اتنے میں میری نگاہ کچھ دُور ایک آدمی پر جا پڑی جو کنارے کے قریب اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر جب میں قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ کسی سپاہی کی لاش ہے جو گل سڑ چکی تھی یا مچھلیوں کی خوراک بننے کے بعد لہروں نے اُسے کنارے پر لا پھینکا تھا۔ اُس کے بکتر اور تلوار سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ازمیری ہے اور آشوریوں کے ہاتھوں مرا تھا۔ وہ تیرا بھی تک اُس کی

پسلیوں میں اٹکا ہوا تھا جو اُس کی موت کا باعث بنا تھا۔ میں نے اس کی نیام سے تلوار نکال کر دیکھی۔ اس غریب کو اسے استعمال کرنے کی موقع ہی نہیں ملا تھا کیونکہ وہ بے داغ تھی اور اُس کی دھار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کا زرہ بکتر بھی قابلِ استعمال تھا۔ ہر چند کہ وہ میرے جسم کے ناپ سے کچھ چھوٹا تھا مگر میں نے اُسے اپنے تن پر سجا لیا اور پھر دو ٹیلوں کے درمیان ایک غار نما کھنڈ میں سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو سورج نکلنے والا تھا۔ میں رینگتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ اتنے میں مجھے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں چھپکلی کی طرح زمین سے چپک گیا۔ چند لمحوں بعد مجھے دس بارہ گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ جب کچھ اور قریب آئے تو میں پہچان گیا کہ وہ ازمیری ہیں۔ میں نے فرطِ مسرت سے ایک نعرہ لگایا اور ٹیلے پر جا کھڑا ہوا۔ میں آشوری نہیں بلکہ ازمیری ساحل پر پہنچ چکا تھا۔ میرے نعرے کی آواز پر گھڑ سوار میری طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تلواریں نیاموں سے نکال لیں اور اپنے گھوڑے میری طرف دوڑا دیے۔ انھوں نے مجھے آشوری سمجھا تھا اس لیے وہ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے مگر میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے انگلیاں پھیلا دیں اور ہتھیلیاں دکھائیں تو انھوں نے گھوڑوں کی باگیں کھینچ لیں کیونکہ میں نے انھیں ازمیری طریقے سے سلام کیا تھا۔

جب ان سواروں کا سرغنہ قریب آیا تو وہ مجھے پہچان گیا اور سیلوٹ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ آپ ہیں شہزادہ سرفرِدش؟ ہم تو سمجھے تھے کہ آشوریوں نے آپ کو قید یا قتل کر دیا ہوگا۔"

"قتل تو نہیں مگر قید ضرور کیا تھا اور اگر انھوں نے مجھے قتل کر دیا ہے تو پھر میں سرفرِدش کا بھوت ہوں۔ ایسا بھوت جو بہت بھوکا ہے سب سے پہلے مجھے کھانا کھلاؤ اور یہ بتاؤ کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو اور کہاں خیمہ زن ہو؟"

"ہم گشت پر ہیں جناب۔ ہمارے خیمے یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر ہیں۔ کمان دار اوغیر آپ کی بخیریت واپسی پر بہت مسرور ہوگا۔"

جب ہم پڑاؤ پر پہنچے اور میں نے اس کا معائنہ کیا تو اُسے بہت بُری حالت میں پایا۔ سپاہیوں کی وردیاں پھٹ چکی تھیں اور ہتھیار خراب ہو چکے تھے۔ سپاہیوں کی حالت بھی بہت خستہ تھی کچھ تو گھوڑوں کی زین پر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے میں نے صوبے دار سے کہا۔

"ان لوگوں کو آرام کی ضرورت ہے اور تم لوگ اتنی قلیل تعداد میں کیوں ہو؟"

"ساحل کے گشت کے لیے کمان دار ان سے زیادہ سپاہی نہیں دے سکتا جناب۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا تو وہ خاموش ہی رہا۔ میں جھنجلا گیا۔ "کچھ بولو نا منہ سے مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو۔ آشوریوں کی قید میں جانے کے بعد مجھے ازمیر کے حالات کا کوئی علم نہیں ہے۔"

"ازمیر کے حالات بدتر ہو گئے ہیں جناب، خانہ جنگی کی نوبت آ چکی ہے مگر ابھی اس کا آغاز نہیں ہوا۔" وہ بولا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ سب اس کاہن ارژنگ کی وجہ سے ہے؟"

"جی ہاں۔ اس کالے کوّے اور ملکہ فرازیہ کی وجہ سے۔ کوا اب محل میں رہتا ہے اور فوج میں پھوٹ ڈلوانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ اُس کے اور کمان دار اوغیر کے مابین تلخ کلامی بلکہ رزم آرائی کی نوبت آ چکی ہے۔ ارژنگ نے فوج میں اپنے کوّے پھیلا دیے ہیں جو عسکریوں کی مدد کے بہانے انھیں نفاق کا زہر پلا رہے ہیں اور ارژنگ کی وفاداری کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ فوج پر چھا گئے ہیں اور کوئی ان کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

یہ سُن کر میری بھوک اُڑ گئی۔ میں نے کہا۔ "اور اوغیر کیا کر رہا ہے؟"

"وہ... وہ آج کل اپنی وفادار فوج کے ساتھ اہراموں والے میدان میں آ گئے ہیں اور وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ روزانہ ارژنگ کے ساتھ مذاکرات کرتے ہیں ان کی ملاقات میدان اور محل کے درمیان ایک مقام پر ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ آپ بہت بڑے وقت پر لوٹے ہیں شہزادے۔"

"نہیں جوان۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں بالکل ٹھیک وقت پر لوٹا ہوں۔ ازمیر میں خانہ جنگی نہیں ہونی چاہیے اور میں خانہ جنگی نہیں ہونے دوں گا۔"

"مگر کیسے جناب؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے پاس اس سوال کا جواب تھا بھی نہیں مگر میں جانتا تھا کہ ایسے مواقع پر قدرت خود ہی میری راہنمائی کرتی ہے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی میری رہنمائی کرے گی۔

●

اوغیر ازمیریوں کے میدان مقابر میں خیمہ زن تھا اور میں اُسی کے سامنے اُس کے خیمے میں بیٹھا اپنی داستان سُنا رہا تھا۔ یہاں آتے ہی میں نے حجامت کروائی تھی، نہایا تھا اور نیا لباس پہن کر کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔

اوغیر اب فوج کا سربراہ بن چکا تھا اور اس نے شان دار وردی زیب تن کر رکھی تھی۔ میں نے اپنی داستان بیان کرتے ہوئے کچھ باتیں اُس سے بھی چھپالی تھیں۔ آخر میں اوغیر بولا۔

"آپ کے آشوریوں کی قید سے نجات پانے اور واپس آنے

سے مجھے دلی مسرت ہوئی ہے۔ اب آپ زمامِ اقتدار سنبھالیں گے تو مجھے کچھ سکون ملے گا۔"

"نہیں اوغیر۔" میں نے جواب دیا۔ "فوج کی سربراہی تم نے سنبھال لی ہے ازمیر کی زمامِ اقتدار بھی تمھیں ہی سنبھالنا پڑے گی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شہزادے؟ سہراب نے آپ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔" وہ بولا۔

"میں ولی عہدکی تمام تر ذمے داری سے دستبردار ہو چکا ہوں اوغیر۔ اور پھر حالات پر قابو پانے کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ازمیر تمھارے زیرِ سایہ پھلے پھولے گا۔ اب اس سلسلے میں مزید بحث نہ کرو اور مجھے ارژنگ کے متعلق ساری باتیں تفصیل سے بتاؤ۔"

اس سے پہلے کہ اوغیر کچھ بتاتا، ایک کوّا خیمے میں داخل ہوا اور تعظیم و اخلاق بالائے طاق رکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"کاہنِ اعظم ارژنگ آج رات تمھارا انتظار کریں گے۔ ملکہ فرازیہ بھی اُن کے ساتھ ہوگی۔"

اوغیر نے اُسے جواب دینے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھے گھورنے لگا۔ میں نے بھی اُس کاہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس نے اوغیر سے کہا۔ "تم کاہنِ اعظم سے ملنے کے لیے تنہا مقبرے میں آؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اوغیر اس کے تحکمانہ لہجے اور اندازِ تخاطب سے کھول اُٹھا تھا۔ وہ کافی دیر تک ارژنگ اور اس کے کوّوں کو گالیاں بکتا رہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سمجھایا۔

"خواہ مخواہ اپنا خون مت جلاؤ اوغیر۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ وہ کس حد تک آگے جا چکے ہیں۔"

"پہلے میں اُس کی عیاری اور مکاری کا جواب عیاری اور مکر سے دینا چاہتا تھا مگر اب مجھے اُس سے کھلم کھلا جنگ کرنی پڑے گی۔" اوغیر بولا۔ "ورنہ وہ میرے باقی ماندہ سپاہیوں اور افسروں کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لے لے گا۔"

آشوریوں سے برسرِپیکار ہونے سے پہلے میں دیکھ چکا تھا کہ کاہنِ اعظم ارژنگ کے چیلے ملک کے کونے کونے سے راج دھانی میں جمع ہو رہے تھے مگر میں اُن پر کوئی توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اب وہ اوغیر کے لیے دردِ سر بن گئے تھے۔ میں نے اوغیر سے کہا۔

"کوّوں سے نمٹنا تمھارا مسئلہ ہے اوغیر۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ارژنگ نے مجھے ملاقات کے لیے کیوں نہیں بلایا۔ حالانکہ اُسے میری واپسی کا علم میرے یہاں پہنچنے کے چند لمحے بعد ہو گیا ہوگا۔"

"وہ ہم سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کر کے ہمیں ایک دوسرے سے لڑوانا چاہے گا شہزادے۔ اسی لیے اس نے صرف مجھے بلایا ہے۔"

"اس کی یہ چال کامیاب نہیں ہوگی اوغیر۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ محل چھوڑ کر سہراب کے مقبرے میں تم سے ملنا چاہتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ یہ مقبرہ تمھارے فوجیوں کے گھیرے میں ہے۔"

"یہ بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں شہزادے۔ ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہو چکا ہے جس کے تحت وہ ہفتے میں دو بار سہراب کے مقبرے میں آتا ہے۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ یہاں کوئی ایسی چیز ضرور ہے جس کے لیے وہ یہاں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے اس سلسلے میں نہ کوئی تحقیق کی ہے اور نہ کروں گا کیونکہ مقبرے کے متعلق میں نے ایسی خوفناک کہانیاں سُن رکھی ہیں جن سے میرا خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگتا ہے۔"

مجھے اوغیر کی اس بات پر ارژنگ سے اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی وہ میز کی دوسری جانب بیٹھا کسی مُردے کا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ دوسرے کوّوں کی طرح اس کی آنکھیں بھی دہکتے انگاروں کی طرح سرخ نظر آ رہی تھیں۔ پھر مجھے فرازیہ اور وہ حجرہ یاد آ گیا جہاں ایک عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور فرش پر مچھلیوں کے سے کچھ کھپرے بھی پڑے تھے ان یادوں سے مجھے جھرجھری آ گئی میں نے کچھ سوچتے ہوئے اوغیر سے کہا۔

"اگر میں ارژنگ کا کام تمام کر دوں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں شہزادے۔ یہ کارِ ثواب تو میں خود انجام دینے کا متمنی ہوں۔ مگر تم اُسے کس طرح قتل کر سکتے ہو؟ وہ ہر وقت محافظوں کے گھیرے میں رہتا ہے۔"

اتنے میں میری نگاہ خیمے کی ایک قنات پر جا پڑی جو اندر کی جانب کچھ اُبھری ہوئی تھی اور یہ اُبھار بتاتا تھا کہ باہر کوئی آدمی ہماری گفتگو سُن رہا ہے۔ میں نے اوغیر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خنجر نکال کر آہستہ آہستہ قنات کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور پسینے کی بوندیں مجھے اپنی پیشانی پر رینگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں نے خنجر پر ہاتھ کی گرفت سخت کر لی اور بلند آواز میں اوغیر کو مخاطب کیا۔

"ہم دونوں ارژنگ کو ختم کرنا چاہتے ہیں اوغیر لیکن ہمارا یہ اقدام دانش مندی کے خلاف ہوگا۔ ہمیں اس کے ساتھ بات چیت کے ذریعے معاملات طے کرنا ہوں گے اور اس وقت تک امن و سکون سے

تا جب تک کہ وہ خود جنگ نہیں چھیڑتا۔" یہ کہنے کے ساتھ ہی میں ت میں اُبھری ہوئی جگہ خنجر گھونپ دیا۔ باہر سے ایک ہلکی سی چیخ ی اور پھر کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ہم دونوں بھی بھاگ کر باہر آئے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ قنات پر خون کا ایک ایاں نظر آ رہا تھا۔

"اب کوّے بھی زرہ بکتر پہنتے ہیں شہزادے۔ اس لیے اُسے خم نہیں لگا اور وہ بھاگ گیا۔" پھر اوغیر خیمے کے دروازے پر کھڑے ے پاس آیا اور پوچھا۔ "تم نے یہاں سے کسی کوّے کو بھاگتے ہے؟"

"نہیں جناب۔" وہ بولا۔ "میں ابھی ابھی یہاں آیا ہوں۔"

اوغیر نے اُس کا اور اُس کے دستے کا نام پوچھا اور میرے ساتھ آ گیا۔

"مجھے تمھارے اس محافظ کے بیان پر شک ہے۔" میں نے اوغیر سے کہا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ کوّوں نے میرے بہت سے آدمیوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا ہے۔ میں اس سپاہی کے خلاف سخت اقدام کر کے دوسروں میں بددلی نہیں پھیلانا چاہتا اس لیے اسے کسی سخت اور گندے کام پر لگا دوں گا۔"

"اب اصل موضوع پر آ جاؤ اوغیر۔ میں ہر طور ارژنگ کو قتل کرنا چاہتا ہوں اور اُسے آج ہی موت کے گھاٹ اتار کر رہوں گا۔"

"مگر اس کا جاسوس ہماری باتیں سُن چکا ہے۔ وہ اُسے خبردار کر دے گا اور آپ ارژنگ کے جال میں پھنس جائیں گے۔"

"ایک امکان یہ بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر میں تنہا وہاں جاؤں تو وہ مجھے قتل نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنی قید میں رکھنا پسند کرے گا کیونکہ وہ مجھ سے علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ چاہے گا کہ میں خود ہی اس تک پہنچ جاؤں۔"

پھر ہم کافی دیر تک ایک منصوبے کی تفصیلات پر غور اور بحث کرتے رہے۔ آخر میں اوغیر بولا۔ "اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے شہزادے مگر میں آپ کو روک بھی نہیں سکتا۔ اگر آپ ارژنگ کو ختم کر دیں تو ازمیر کو ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات مل جائے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملکہ فرازیہ کا قتل بھی ضروری ہے ورنہ اہالیانِ ازمیر اسی طرح عذاب میں مبتلا رہیں گے۔"

"کیا میں تم پر اعتماد کر لوں کہ تم وہی کرو گے جو ہمارے درمیان طے ہوگا؟"

میری اس بات پر اوغیر نے اپنی تلوار میز پر رکھی اور پھر اس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں اپنی شمشیر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہی کروں گا چاہے زندہ بچوں یا مارا جاؤں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد میرے خیمے میں آ جانا اور اپنے ساتھ چھ ایسے محافظ بھی لیتے آنا جو کوّوں کے حلقۂ اثر میں نہ ہوں۔"

مجھے اوغیر نے جو خیمہ دیا تھا وہ سب سے الگ تھلگ تھا۔ وہاں ہم اُس کے قابلِ اعتماد محافظوں کے پہرے میں بلا تکلف خفیہ بات چیت کر سکتے تھے چنانچہ ہم نے وہاں اطمینان سے تمام معاملات پر بحث کی اور تفصیلات طے ہونے کے بعد جب اوغیر واپس جانے لگا تو میں نے کہا... "اپنے محافظ بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ اوغیر۔ اب میں جو کچھ کروں گا تنہا ہی کروں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ وعدے کے مطابق تم طاؤسہ کا پورا خیال رکھو گے۔"

"آپ مطمئن رہیں شہزادے۔ ایسا ہی ہوگا۔"

"اور تم اس کے بچّے کو بھی قتل نہیں ہونے دو گے۔"

"اگر ہمارا منصوبہ کامیاب ثابت ہوا اور میں برسرِ اقتدار آگیا تو آیندہ ازمیر میں کوئی بچہ قتل نہیں ہوگا جناب۔ یہ تو بدبخت ارژنگ کی چال ہے کہ وہ ہمارے بچوں کو قتل کروا دیتا ہے تاکہ اُس کے کالے کوڑوں کی نسل پھلتی پھولتی رہے اور اس کی افرادی قوت بڑھتی رہے۔"

"اچھا او غیرت۔ الوداع۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہے بہرحال تم اچھے سپہ سالار اور وفادار دوست ہو۔ میں ہمیشہ تمھیں یاد رکھوں گا۔"

"میں بھی آپ کو کبھی نہیں بھول سکوں گا شہزادے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ازمیری اور آشوری تو میں بھی مدتوں آپ کو یاد رکھیں گی۔"

پھر اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

چاند چڑھنے میں کافی دیر تھی اس لیے میں لیٹ گیا اور ارتکازِ توجہ سے کمپیوٹر کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ ڈاکٹر فریدوں کو موجودہ صورتِ حال اور اپنے آیندہ پروگرام سے آگاہ کر دوں مگر کوشش کے باوجود رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ تھک ہار کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آنکھیں بند ہوتے ہی زرتاج میرے تصور میں اُتر آئی۔

جب پہلی بار میں نے اُسے آشوری شاہوں کے مقبرے کی گیلری میں دیکھا تھا تو ثمر فند نے کہا تھا کہ ہزار ہا سال گزرنے کے باوجود زرتاج کے حُسن کا سحر زندہ ہے اور وہ آج بھی دیکھنے والوں کو بُری طرح مسحور کر لیتی ہے۔ اس دروغ گو کی یہ بات بالکل سچ تھی۔ زرتاج کے طلسمی حسن نے اس وقت سے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ میری سوچوں میں یوں گھُل مل گئی تھی جیسے بارش کے قطرے سمندر کے پانی میں گھُل مل جاتے ہیں اور پھر کبھی جُدا نہیں ہو پاتے۔

میں نے اپنی بند آنکھوں سے دیکھا کہ زرتاج کا ہیرے کی چٹان سے تراشا ہُوا جسم گوشت پوست میں ڈھل گیا ہے اور اس کی ساکت وصامت مورتی سانسیں لینے لگی ہے اس کے ہونٹوں پر تبسم کی کلیاں چٹکنے لگی ہیں اور سحر کار آنکھوں میں چاہت کی چاندنی چھا گئی ہے۔ وہ اس اتھاہ گہرائی والے تاریک اندھے کنویں کی کگر پر کھڑی، بانہیں پھیلا کر مجھے پکار رہی ہے: "میں انتظار کے ساحل پر کھڑے کھڑے تھک گئی ہُوں سر فروش راب تو آجاؤ۔" اور اس کی اس پکار پر مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے وقت کی طنابیں ٹوٹ گئی ہیں اور میں وجود سے عدم کی جانب چل رہا ہُوں یا زرتاج عدم سے وجود میں آگئی ہے۔ مجھے اپنے دل کے دالان سے ایک چاپ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ چاپ گزرتے وقت کی تھی یا زرتاج کی، میں نہیں جان سکا تھا۔ میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ زرتاج میرا مقصدِ حیات بن چکی ہے۔

میں نے بیسیوں زندہ عورتوں سے ہوس آرائی کی تھی، اُن میں سب سے زیادہ لالہ رُخ کو چاہا تھا، اُس سے عشق کیا تھا مگر جب میں اُسے نہیں پا سکا تھا تو ایک روز میں نے سوچا تھا کہ اب کسی ایسی عورت سے عشق کروں گا جسے مرے ہُوئے صدیاں گزر چکی ہوں۔ وہ عورت مجھے مل گئی تھی۔ وہ زرتاج تھی اور سچ مچ اس سے عشق ہو گیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ کسی مجسمے سے عشق کرنا دیوانہ پن ہے لیکن یہ جاننے کے باوجود میں اپنے آپ کو اُسے چاہنے اور اس سے عشق کرنے پر مجبور پاتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہے مگر ایسا تھا۔ ان تمام عورتوں میں سے جو اب تک مجھے مل تھیں، سب سے زیادہ محبت مجھے زرتاج سے ہو گئی تھی۔

پھر میں نے سوچا کہ ڈاکٹر فریدوں سے کہوں گا کہ آیندہ وہ مجھے تاریک ماضی کے اس سفر پر بھیج دے جس میں میری ملاقات زرتاج سے ہو جائے لیکن پھر خیال آیا کہ ابھی اس کا کمپیوٹر ماضی کی پیمائش پر قادر نہیں ہے۔ ڈاکٹر فریدوں کو تو خود اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ اس کا کمپیوٹر مجھے ماضی کے کس دور میں منتقل کرے گا۔ اس لیے ڈاکٹر فریدوں کے توسط سے زرتاج کے زمانے تک رسائی ممکن نہیں اور زرتاج سے دُوری کا تصور بھی جان لیوا ہے۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب پاگل سوچیں ہیں مگر ان پاگل سوچوں کے گرداب سے نکلنا بھی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ سوچیں اپنے آپ ہی ذہن میں در آتی تھیں اور مجھے دیوانگی کی سرحدوں کی جانب دھکیلتی چلی جاتی تھیں۔

اچانک دُور سے ہنہنانے والے گھوڑوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں یوں اُٹھ بیٹھا جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہے۔

میں نے خیمے سے نکل کر آسمان کا جائزہ لیا چاند افق پر طلوع ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے اپنی مہم پر روانگی کی تیاری کرنے لگا۔

میں نے کمر سے تلوار لٹکائی اور پیٹی میں دو خنجر اُڑس لیے۔ بائیں بازو سے ایک چھوٹی سی فولادی ڈھال باندھی اور پتلی ڈوری کا گولا لے کر باہر آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ ارژنگ مقبرے کے حجرے میں میرا انتظار کرے گا مگر اُس حجرے تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک ایسی بھول بھلیوں سے گزرنا تھا جس میں بھٹکنے کے بعد آدمی مقبرے سے باہر نہیں نکل سکتا اس لیے میں نے یہ ڈوری منگوائی تھی تاکہ مقبرے میں داخل ہوتے ہی اس کا ایک سرا داخلی دروازے کے ساتھ باندھ دوں اور پھر جہاں جہاں سے گزروں اسے بچھاتا جاؤں تاکہ واپسی کے لیے یہ میری رہنمائی کر سکے۔

★★

چاند چڑھنے کے ایک گھنٹہ بعد میں سہراب کے مقبرے کے

دروازے پر پہنچ گیا۔ رات بہت تاریک تھی، میدان میں جا بجا الاؤ دہک رہے تھے لیکن مقبرے کے دروازے پر نہ کوئی مشعل جل رہی تھی نہ کوئی کاہن وہاں موجود تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ارژنگ کے زخمی ہونے والے جاسوس نے اُسے میری آمد سے مطلع کر دیا ہوگا۔ اس لیے اُس نے اپنے حجرے تک پہنچنے کے لیے میرا راستہ صاف کر دیا ہے۔

میں نے مقبرے کے داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر اندر نگاہ دوڑائی طویل راہداری کے دوسرے سرے پر مجھے ایک مشعل تو جلتی دکھائی دی لیکن اس میں کوئی ذی روح، کوئی آواز نہیں تھی۔ ہر طرف خاموشی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میں اللہ کا نام لے کر آگے بڑھ گیا۔

یہ راہداری مقبرے کے وسطی ہال تک آتی تھی جو گول تھا۔ اس گول ہال سے چاروں طرف ایک ہی طرز کی درجنوں راہداریاں مختلف سمتوں کو جا رہی تھیں۔ میں باری باری ہر راہداری میں جھانکنے لگا تمام راہداریاں تاریک تھیں مگر چوتھی کے ایک سرے پر مشعل جل رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مشعلیں میری رہنمائی کے لیے روشن کی گئی ہیں۔ ورنہ یا تو ہر راہداری تاریک ہوتی یا ہر راہداری میں مشعلیں جلتی نظر آتیں۔

میں اس راہداری سے پھر ایک گول کمرے میں پہنچا۔ جہاں سے ہر طرف راستے نکلتے تھے اُن میں سے ایک راستے پر میری رہنمائی کو مشعل موجود تھی۔ میں اس راہداری میں بڑھ گیا اچانک مجھے وہی چمڑا جلنے کی سی بدبو آئی جو پہلے اس وقت آئی تھی جب میں ارژنگ سے ملنے کے بعد باہر نکلا اور اس حجرے میں گیا تھا جہاں فرازہ میری منتظر تھی۔ یہ عجیب بدبُو اتنی ناگوار تھی کہ مجھے متلی محسوس ہونے لگی۔ میرا جی چاہا میں واپس چلا جاؤں اور میرے لیے واپس جانا آسان تھا کیونکہ پہلی راہداری میں داخل ہوتے وقت میں نے دیوار میں ایک خنجر گاڑ کر ڈوری باندھ دی تھی اور اُسے فرش پر بچھاتا آیا تھا لیکن پھر میں نے بدبو سے بچنے کے لیے سانس روک لی اور آگے بڑھنے لگا۔

اس راہداری کے بعد مجھے کسی راستے پر مشعل دکھائی نہ دی تو میں رُک گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں خنجر اور ڈوری تھی دوسرے میں تلوار۔ میں نے تلوار نیام میں ڈالی اور مشعل اُتار کر اس مقام کا جائزہ لینے لگا۔ اتنے میں مجھے اپنے سر کے اوپر روشنی کا جھماکا محسوس ہُوا جس سے میرے سامنے کا فرش روشن ہو گیا مگر قبل اس کے کہ میں سر اُٹھا کر اس جھماکے کا منبع دیکھتا، چھت کا پتھر سرک کر اپنی جگہ پہنچ چکا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ لوگ بخوبی جانتے تھے، اس وقت میں نے پلٹ کر اور مشعل بلند کر کے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی نہیں تھا۔ البتہ آندھی کی طرح تیز مگر بہت گرم ہوائیں آنے لگی تھیں جیسے کسی مافوق الفطرت قوت نے صحرائی طوفان کا رُخ اس راہداری میں موڑ دیا ہو۔ اس بگولے کے ساتھ ریت یا کسی دوسری چیز کے ذرّے بھی اُڑ کر آ رہے تھے اور چھرّوں کی طرح میرے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ میں نے پیٹھ موڑ کر آنکھیں بند کر لیں اور سر جھُکا کے بیٹھ گیا۔ پھر اچانک طوفانی ہوا بند ہو گئی۔ میں اُٹھ کر آگے بڑھنے لگا۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ راہداری میں ایک بچے کی چیخیں اور بھیڑیے کی غراہٹ گونجنے لگی۔ میں نے آگے پیچھے دیکھا مگر راہداری خالی تھی۔ چیخیں اور غراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔

آگے جا کر یہ راہداری تنگ ہونے کے ساتھ ساتھ چکر دار زینے کی طرح بل کھاتی چلی گئی۔ یہاں آ کر ڈوری بھی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے دوسرے لمحے میں آگے بڑھ گیا کہ ڈر کر پیچھے ہٹ جانا میری فطرت کے خلاف تھا۔

چکر دار راہداری طے کرتے ہُوئے مجھ پر ایک دم غنودگی سی طاری ہونے لگی غنودگی کا یہ حملہ یا دورہ اتنا شدید تھا کہ میں فرش پر گر پڑا۔ فرش اور دیواروں سے ایک عجیب سی خوشبو پھُوٹنے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کہاں سے سانپ کی سی تیز پھنکار بھی سُنائی دینے لگی تھی۔ میں نے چند لمحوں کے لیے سانس روکی تو غنودگی دُور ہونے لگی۔ پھر یہ عجیب سی خوشبُو بڑے نفیس عطر کی خوشبُو میں بدل گئی۔ اس خوشبُو نے میرے اوسان بحال کر دیئے اور سانپ کی وہ پھنکار بھی چاندی کی ننھی مُنّی گھنگریوں کی جھنکار میں ڈھل گئی جیسے دُور کہیں کوئی رقاصہ جھانجر باندھے دیوانہ وار ناچ رہی ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بھُول بھلیاں طلسم کدہ کیوں بن گئی ہیں۔ وہ ساحر کون ہے جو یہ سحر پھونک رہا ہے۔ یا یہ ازمیر کے باشندوں کی بھٹکی ہُوئی روحیں ہیں جو سہراب کے اس غیر مکمل مقبرے میں گھُس آئی ہیں تاکہ اس کی ہڈیوں کی حفاظت کر سکیں پھر میں نے ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور اس طلسماتی ماحول کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تلوار کی نوک اپنی ران میں چبھونے لگا۔ اس چبھن نے سوچوں کی وہ دُھند اور غنودگی یکسر ختم کر دی اور میں اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگا۔

کچھ دُور آگے جا کر چکر دار راہداری ختم ہو گئی۔ اب میرے سامنے سیدھا راستہ تھا لیکن وہاں گھُپ اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دُور جا کر مجھے رُکنا پڑا کیونکہ راستے کے بیچوں بیچ ایک گڑھا آ گیا تھا۔ میں نے مشعل کی روشنی میں گڑھے کی طرف قدم بڑھائے اور اس کی گہرائی کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ مشعل کی روشنی اس کی تہ تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ میں نے گڑھے کی چوڑائی کا اندازہ لگایا۔ وہ تقریباً نو یا دس فٹ تھی اور اُسے لمبی چھلانگ مار کر عبور کیا جا سکتا تھا۔

میں نے پیچھے ہٹ کر دو چار مرتبہ اُٹھک بیٹھک کی تاکہ پچھلے چھلانگ

لگانے کے لیے تیار ہو جائیں پھر میں نے مشعل گڑھے کی دوسری طرف پھینک دی تاکہ مجھے اس کے دونوں کنارے نظر آتے رہیں۔ اب میں کچھ پیچھے ہٹا تاکہ دوڑ کر چھلانگ لگا دوں لیکن جونہی میں دوڑتا ہوا گڑھے کے پہلے کنارے کے قریب پہنچا، مجھے دوسرے کنارے پڑی مشعل دور ہوتی نظر آئی۔ اب میرے لیے اپنے آپ کو روکنا بھی ناممکن تھا اور وہ فرش بھی آگے کو کھسکتا جا رہا تھا جس پر مشعل پڑی تھی۔ رُکنے کی صورت میں میں اتھاہ گہرائی میں گرتا اور دوسرے کنارے نہ پہنچ پانے کا مطلب بھی یہی تھا۔ میں نے چشم زدن میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کیا اور ایک نعرے کے ساتھ اپنی تمام تر قوت سمیٹ کر چھلانگ لگا دی۔ اگر میں دو لمحوں کی دیر کرتا یا مشعل والا فرش صرف چھ انچ اور آگے سرک جاتا تو میری موت یقینی تھی۔

چھلانگ لگا کر میں دوسرے کنارے پہنچ تو گیا تھا مگر خوف کی ایک سرد لہر نے مجھے جیسے مفلوج سا کر دیا تھا۔ میں کچھ دیر فرش پر پڑا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ جب میرے اوسان بحال ہوئے تو یہ خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا کہ ارژنگ یقیناً فرہاد سے کہیں زیادہ بڑا مہندس ہے اور اب تک میں جس طلسمی ماحول سے گزرا تھا، وہ سب ارژنگ ہی کا مرہونِ منت ہے۔

میں اس راستے پر آگے کو چل پڑا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک دیوار میں تین دروازے نظر آئے یہ دروازے کسی چمکدار دھات کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے عکس کا جائزہ لیا تو حیران رہ گیا۔ میرے سامنے ایسا سرفروش کھڑا تھا جسے دورِ جدید کی تہذیب چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ وہ ہزاروں سال پہلے کا وحشی نظر آتا تھا جس نے اپنی بقا و ردِ مقابل کو مغلوب کرنے کے لیے ایک ہاتھ میں تلوار تھام رکھی تھی اور دوسرے بازو پر ڈھال باندھی ہوئی تھی اس کی آنکھوں سے وحشت و بربریت اور مکاری جھلک رہی تھی مجھے اپنا یہ روپ دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ میں نے ماضی کے وحشی انسانوں کی طرح بڑے زور کا قہقہہ بلند کیا اور تلوار اس پر دے ماری۔ قہقہے اور ڈھال پر تلوار کی ضرب کی آوازیں راہداری میں گونجنے لگیں۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

میں نے کمرے میں جو کچھ دیکھا وہ میری رگوں میں دوڑنے والا خون منجمد کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کمرے میں فرش نہیں تھا بلکہ یہ ایک چھوٹی سی باؤلی تھی جس کی گہرائی میں سرخ شعلے لپک رہے تھے مگر اس سے کسی قسم کا دھواں نہیں اُٹھ رہا تھا۔ کمرے میں گرمی کی بجائے بے حد خنکی تھی جس سے مجھ پر کپکپی سی طاری ہو گئی پھر اس سرد آگ سے بہت سے لوگوں کے رونے، چیخنے چلانے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں بھی غیر انسانی سی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گزری صدیاں اپنے عہد میں ہونے والے ظلم، جبر، تشدد، نادانیوں اور ناکامیوں پر ماتم کناں ہوں۔ نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں بھی خود بخود آنسو آ گئے جیسے میں بھی ماضی کے دکھوں پر اشک بار تھا۔ میں نے جلدی سے آنسو پونچھ کر دروازہ بند کر دیا۔ خداوندا، یہ کیسا طلسم ہے، جو لوگوں کو اشک ریزی اور ماتم گساری پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے ارژنگ کو اپنی سوچوں سے کہیں زیادہ پایا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ مجھے بری طرح پچھاڑ کے رکھ دے گا۔ میں جسمانی طور پر اس سے زیادہ طاقتور سہی لیکن ذہنی طور پر وہ مجھ سے بہت آگے لگتا تھا۔

میں نے دوسرے دروازے کا پٹ کھولا تو میرے لیے مزید حیرتیں منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ اس کمرے کی تاریکی میں کوندے لپک رہے تھے بادل گرج رہے تھے اور سیاہ رنگ کی موسلا دھار بارش جاری تھی اور اس بارش میں وہ مردوں کے ڈھانچے قطار در قطار کسی میدانِ کارزار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے استخوانی ہاتھوں میں تلواریں اور بھالے تھے، یوں لگتا جیسے وہ کمرہ نہیں بلکہ بہت بڑا میدان ہے پھر سیاہ رنگ کی وہ بارش سرخ رنگ میں بدل گئی۔ یوں جیسے لہو برس رہا ہو۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر خون کی بوچھاڑ محسوس کرنا چاہی مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرا ہاتھ ویسے کا ویسا خشک ہے اس کا یہ مطلب تھا کہ کوندل کی لپک، بادلوں کی گرج اور مردہ ڈھانچوں کی فوج سب کا سب فریبِ نظر تھا۔ اس شعبدے پر میں دنگ رہ گیا۔

میں نے تیسرا دروازہ کھولا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اسی سے گزر کر ارژنگ کے حجرے یا محل تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس کمرے کی سامنے والی دیوار میں ایک چوکور سوراخ سے ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی میں آگے بڑھ کر اس سوراخ سے آگے جھانکنے لگا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا اور اس پلنگ پر فرازیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں کمرے کی ایک دیوار میں بنے ہوئے موکھے پر مرکوز تھیں اور وہ آہستہ آہستہ کسی کو پکار رہی تھی۔ "آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ آ بھی جاؤ۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ فرازیہ کی نہیں زرتاج کی آواز ہے جو مجھے پکار رہی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے بدبو کے ایک بھبکے نے مجھے زرتاج کے تصور کی دنیا سے باہر کھینچ لیا اور میں اس موکھے کی طرف حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

اس موکھے سے ایک عجیب الخلقت جانور نما انسان یا انسان نما جانور نکل رہا تھا اس کے جسم پر مچھلی کی طرح کھپرے تھے، سر پر سینگ اوپر کا دھڑ عورت کا اور نیچے کا مردوں جیسا تھا۔ یہ بدبو اسی سے آ رہی

تھی مگر فرازیہ کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ اسی عجیب الخلقت ہستی کو پیار سے پکارے جا رہی تھی۔

پھر میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اُس نے فرازیہ اور ارژنگ کے خلاف میرے دل میں غصے اور نفرت کے شعلے بھڑکا دیے۔ میرا جی چاہا کہ میں ابھی اندر جا کر فرازیہ کے پرخچے اڑا دوں۔ پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ شاید اس طرح ارژنگ تک نہ پہنچ سکوں جو اصلی مجرم تھا اور جس نے فرازیہ کو اس فعلِ قبیح کی علت میں مبتلا کر کے اس پر قابو پا لیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ بھی فریبِ نظر یا شعبدہ نہ ہو۔ اس لیے میں وہیں کھڑا رہ گیا کچھ دیر بعد میں نے کمرے میں دوبارہ جھانکا تو وہ عجیب الخلقت بلا وہاں نہیں تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

فرازیہ پلنگ پر بے سُدھ سی پڑی تھی لیکن بے ہوش نہیں تھی میں نے تلوار سے پلنگ کی پٹی پر ٹھک ٹھک کی تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نیلی آنکھوں میں نشہ سا گھلا ہوا تھا۔ وہ بولی۔

"کیا تم نے اُسے میرے ساتھ دیکھ لیا ہے؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا اور سوچا کہ یہ فریبِ نظر یا شعبدہ نہیں بلکہ حقیقت تھی۔

"اوہ!" فرازیہ نے بے ساختہ اور تاسف بھرے لہجے میں کہا "پھر تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ میں ارژنگ کے ہاتھوں کٹھ پتلی کیوں بنی ہوئی ہوں؟"

"ہاں۔ یہ بھی سمجھ چکا ہوں۔ مگر وہ کیا بلا تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ارژنگ اور اس کے چیلے ان عجیب الخلقت بلاؤں کی افزائش ...ل کرتے ہیں۔ ارژنگ کا کہنا ہے کہ یہ بلائیں انسان سے کئی گنا زیادہ طاقتور مگر دماغی طور پر بہت کمزور ہوتی ہیں۔ وہ ان کی افزائشِ نسل کر رہا ہے تاکہ ایک فوج بنا سکے جو پہلے ازمیر اور اس کے بعد دوسرے ممالک ...ح کر سکے۔"

"یہ خواہش پرانی مگر طریقہ مختلف ہے فرازیہ۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا ...ہ تم کس حد تک گر چکی ہو؟"

"ہاں سرفروش۔ جب اس نشے کی طلب کا دورہ ختم ہوتا ہے تو میں ...نے آپ پر نفرین بھیجتی ہوں اور اس زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگتی ...ں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خباثت کے علوی کی طرح پھر میری ...ب جمنے لگتی ہے۔ اس سے پہلے کہ پھر وہ وقت آئے، میں تم سے ... احسان کی آرزومند ہوں۔ اگر تم مجھ پر یہ احسان کرنے کا قول دو تو میں ...الوسع تمہاری مدد کروں گی۔ تمہیں ان خطروں سے آگاہ کر دوں گی جو ...یں پیش آئیں گے۔ ان سے نمٹنا تمہارا کام ہے۔ اگر تم ان سے بچ نکلے ...ارے لیے اس بھول بھلیاں سے نکلنا ناممکن ہو گا مگر میں تمہیں اس سے نکلنے کا راستہ بتا دوں گی بس شرط یہ ہے کہ تم مجھ پر ایک احسان کر دو۔"

"وہ کیا فرازیہ؟"

"مجھے مار ڈالو سرفروش۔ میرا سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے جانا۔ وہ اس وقت تمہارے کام آئے گا جب مگرڑا سے تمہارا سامنا ہو گا۔"

"وہ کون یا کیا بلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

فرازیہ یہ سن کر رونے لگی پھر سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "وہ دو بلاؤں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی سب سے خوفناک ترین بلا ہے سرفروش۔ وہ ارژنگ کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ آدم خور ہے اور ارژنگ اس کا پیٹ بھرنے کے لیے مظلوم انسانوں کو اس کے سامنے پھینکواتا ہے۔ اب جبکہ تم یہاں تک پہنچ گئے ہو تو اس سے تمہارا سامنا ضرور ہو گا۔ اگر تم نے مگرڑا کو مار دیا تو سمجھو کہ تم نے ارژنگ کو مار دیا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس آدم خور بلا کو شاید ہی مار سکو لیکن اب تم واپس بھی نہیں جا سکتے کہ اب ارژنگ تمہیں باآسانی ختم کر دے گا۔ تم یہاں تک محض اس لیے پہنچ پائے ہو کہ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے ورنہ بہت پہلے مار دیے جاتے۔ براہِ کرم مجھے فوراً مار ڈالو ورنہ ارژنگ مجھے بھی عجیب الخلقت بلاؤں کی پیدائش کے لیے استعمال کرنے لگے گا۔ تمہیں اپنے دیوتاؤں کی قسم مجھے مایوس نہ کرو۔ میری موت ازمیر کی عورتوں کو بلاؤں کی تخلیق سے بچا لے گی۔"

"نہیں فرازیہ۔ میں عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا۔"

"ایسا نہ کہو سرفروش۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قدموں سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے بولنے لگی۔ "ارژنگ چاہتا ہے کہ میں حرم سرا کی عورتوں کو اس فعلِ قبیح کا عادی بنا دوں۔ میں اپنی تمام تر کمینگی کے باوجود ایسا نہیں کرنا چاہتی لیکن طلب کے دوروں میں شاید میں اتنی نیچ ہو جاؤں۔ دیکھو مجھے قتل کرنے کا قول دے دو تاکہ میں تمہیں ان بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ بتا دوں ورنہ تم مگرڑا اور ارژنگ کو مارنے کے باوجود خود بھی بھول بھلیوں کی دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جاؤ گے۔"

میں نے سوچا کہ اس کی موت ازمیر کی بہت سی عورتوں کو بچا سکتی ہے اور پھر ادھیڑ نے بھی یہی کہا تھا۔ وہ یہ بھی سچ کہتی تھی کہ بھول بھلیوں سے نکلنا ناممکن ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اُسے کہا۔ "بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ بتاؤ فرازیہ۔"

"تم قول دیتے ہو کہ مجھے مار ڈالو گے؟"

"ہاں۔ میں قول دیتا ہوں۔"

"تم پہلی بار جب ارژنگ سے ملنے اس کے حجرے میں گئے تھے تو تم نے آتش دان میں آگ جلتی دیکھی تھی؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ آتش دان ایک دھوکا ہے اس میں جلنے والی انگیٹھی ہٹا دینا اس کے نیچے ایک جنگلا ہے۔ وہ جنگلا اوپر اٹھاؤ گے تو تمھیں ایک سرنگ نظر آئے گی۔ یہ سرنگ تمھیں ایک ایسے راستے پر لے جائے گی جو میدان میں جا نکلتا ہے۔ اب جلدی سے میرا سر قلم کر دو۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا سر نگوں کر لیا۔ "شکریہ سرفروش دیر نہ کرو۔"

"الوداع فرازیہ۔" یہ آخری الفاظ تھے جو اُس نے زندگی میں سُنے۔

★★

اس کمرے میں موکھے کے علاوہ ایک دیوار میں دروازہ بھی تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک سیدھی راہداری تھی۔ میں ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں فرازیہ کا بریدہ سر لیے مشعل کی طرف بڑھتا رہا جو راہداری کے ایک سرے پر جل رہی تھی۔ مگر میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا راستہ اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ ایک آہنی دروازے کے سامنے ختم ہو گیا۔ مشعل اس دروازے کے پاس ہی جل رہی تھی۔ یہاں ایک بار پھر مجھے بدبو کے بھبکے آنے لگے اور یہ بدبو بہت تیز تھی میں دروازے کے قریب رُک گیا جو اس بدبو کا مخرج تھا۔ اتنے میں مجھے اپنے سر پر چھت کے سوراخ سے ارژنگ کی آواز آئی۔

"خوش آمدید سرفروش۔ میرا خیال تھا کہ تم یہاں تک نہیں پہنچ پاؤ گے مگر فرازیہ میرے قابو سے باہر ہو گئی۔ خیر... میں نے تم جیسا بہادر جنگجو اب تک نہیں دیکھا۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے لیکن یہ بڑی افسوس ناک بات ہو گی کہ ہم تم آپس میں متحارب ہوں۔ نہیں سرفروش، ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں لڑنا چاہیے۔ اس وقت تک اس دروازے میں داخل نہ ہونا جب تک میں خود تمھارے پاس نہ پہنچ جاؤں۔"

"بس یہی کہنا تھا یا کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"صبر سے کام لو سرفروش۔ ہم دونوں صاحبِ فہم و فراست ہیں۔ تمھاری طاقت اور عسکری تجربہ اور میرے علم کا اشتراک ہمیں ساری دُنیا کا فرمانروا بنا سکتا ہے۔ ہم دونوں برابری کی بنیاد پر حکومت کر سکتے ہیں۔ بس میرے وہاں پہنچنے تک دروازہ مت کھولنا۔"

"سنو ارژنگ۔ میں یہ دروازہ ضرور کھولوں گا، تم تک خود ہی پہنچوں گا اور تمھیں موت کے گھاٹ اُتار کر ہی رہوں گا۔ چونکہ تم کاہن ہو اس لیے میرے آنے تک اپنے دیوتاؤں کی عبادت کرتے رہو۔"

میری بات کے جواب میں ارژنگ کا قہقہہ سنائی دیا۔ پھر وہ بولا "مجھے اس بات کا افسوس رہے گا سرفروش کہ میں نے تمھیں لقمۂ اجل کیوں بنوایا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ خودسر لوگ احمق ہوتے ہیں۔ وہ کسی کی نہیں مانتے اور تم بھی خودسر ہو۔" اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ پھر میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی بہت تیز بدبو کے بھبکے نے میرا دماغ اُڑا دیا۔

میرے سامنے ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں اگرچہ مشعلیں جل رہی تھیں مگر ان کی روشنی کمرے کی وسعت کے لیے بہت کم تھی۔ اس کمرے کا فرش بھی پتھر کا نہیں تھا۔ میں نے چند قدم آگے بڑھائے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے قدم گندگی کے ڈھیر سے آلودہ ہو گئے ہیں۔ میں وہیں رُک گیا۔ اچانک ایک خوفناک پھنکار کے ساتھ مجھے ایک اندھیرے گوشے سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی خطرناک درندہ ہڈیاں چبا رہا ہو۔ میں نے آنکھوں پر زور ڈال کر اُدھر دیکھا تو دہشت کے مارے مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں مگرڑا کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ارد گرد بہت سی انسانی کھوپڑیاں اور ڈھانچے بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں زیادہ دیر تک اس مکروہ نظارے کی دید کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو کچھ ہونا ہے، جتنی جلدی ہو جائے، بہتر ہے۔

چونکہ میں ابھی تک مگرڑا کو اچھی طرح نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس لیے میں نے قریب پڑی ایک کھوپڑی کو پاؤں کی ٹھوکر سے اس اندھیرے گوشے کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

"سامنے آؤ مگرڑا۔ روشنی میں آؤ تاکہ میں تمھارا خاتمہ کر سکوں۔"

مجھے اس اندھیرے اور نسبتاً گہرے گوشے میں سرسراہٹ اور شُوکار سُنائی دی۔ میں نے ایک ہاتھ سے تلوار اور دوسرے سے فرازیہ کا بریدہ سر بلند کر لیا۔

پھر مگرڑا روشنی میں آ گیا اور اُسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں لاشعوری طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مگرڑا دھیرے دھیرے میری طرف بڑھنے لگا۔ اُس کا مُنہ مگرمچھ کی طرح لمبوترا مگر جسم اژدہے کی مانند تھا۔ وہ رینگنے کے ساتھ ساتھ اپنے دو چھوٹے چھوٹے مگر بھاری اور مضبوط پیروں سے چل بھی سکتا تھا اس کے جسم پر بڑے بڑے کھپرے تھے اور اتنے مضبوط دکھائی دے رہے تھے کہ اگر تلوار سے ضرب لگائی جاتی تو تلوار ٹوٹ سکتی تھی مگر وہ نہیں کٹ سکتے تھے۔ اُس پر اگر کہیں کاری ضرب لگائی جا سکتی تھی تو وہ اُس کے پیٹ کا نچلا حصّہ تھا۔

مگرڑا رُک کر اپنی خوفناک آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اتنے میں اوپر سے ارژنگ کا قہقہہ بھی سُنائی دیا۔ گویا وہ میری اور مگرڑا کی کشمکشِ زیست و مرگ کا تماشا دیکھ رہا تھا اور یہی وہ قہقہہ تھا جس نے مجھے مگرڑا کا لقمہ بنانے سے بچا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں تو مگرڑا کی آنکھوں کی مقناطیسیت سے مسحور ہو چکا تھا۔ قہقہے نے مجھے چونکایا تو میں نے مگرڑا کی توجہ ہٹانے کے لیے فرازیہ کا سر اس کی طرف اچھال دیا۔ مجھے فرازیہ کی دو باتیں بھی یاد آ گئیں۔ پہلی یہ کہ ارژنگ کی یہ عجیب الخلقت بلا ذہنی طور پر بہت کمزور ہے، دوسری یہ کہ میرا سر لے جانا، مگرڑا سے سامنا کرتے ہوئے تمھارے بہت کام آئے گا اور وہ واقعی کام آ رہا تھا۔ مگرڑا نے مجھ سے توجہ ہٹا لی تھی اور فرازیہ کا سر اُدھیڑنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میرے لیے یہی وقت غنیمت تھا۔ میں تیزی سے لپکا اور تلوار کی ایک ہی ضرب سے میں نے اُس کا ایک پیر کاٹ دیا۔ مگرڑا تیزی سے مڑا مگر مجھ پر حملہ کرنے سے پہلے اُس کی نگاہ اپنے کٹے ہوئے پیر پر پڑ گئی۔ وہ اپنا پیر چبانے میں مصروف ہو گیا۔

میں تیزی سے گھوم کر دوسری جانب آیا مگر اب خوف مجھ پر بُری طرح مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے مگرڑا کے دوسرے پیر پر ضرب لگائی لیکن وہ تیسری ضرب سے الگ ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی مگرڑا کی پھنکار سے وہ تہ خانہ نما وسیع کمرہ گونجنے لگا۔ اب مگرڑا پھر کر اچھلنے اور لوٹنے پلٹنے لگا تھا۔ اتنے میں تہ خانوں، دیواروں میں بنے ہوئے سوراخوں سے گاڑھا دُھواں خارج ہونے لگا جس سے مجھ پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا دُھواں دُھند کی طرح پھیلا تو مگرڑا میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور دیوار ٹٹول کر کھسکنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ مگرڑا میری تلاش میں ہے۔ دُھوئیں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور غالباً وہ مجھے دیکھ بھی سکتا تھا۔ اتنے میں ارژنگ کا قہقہہ پھر سنائی دیا قہقہے سے پیدا ہونے والی نفرت اور غصّے نے مجھے ہمت دلائی۔ میں ایک بار پھر اپنی توانائی سمیٹ کر آگے کو کھسکا تو میرا پیر ایک کھوپڑی پر پڑ گیا۔ میں نے جلدی سے وہ کھوپڑی اُٹھالی اور اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں انگلیاں ڈال دیں۔ اتنے میں مجھے اندھیرے میں مگرڑا کی آنکھیں چمکتی دکھائی دے گئیں وہ میرے سر پر پہنچ چکا تھا اس کی سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی اور بدبو کے تیز بھبکے سے مجھے قے محسوس ہونے لگی۔

اتنے میں مگرڑا نے اپنا جبڑا کھولا اور میری گردن دبوچنا چاہی تو میں نے وہی کھوپڑی اُس کے کھلے جبڑے میں ٹھونس کر اپنا ہاتھ نکال لیا۔ ساتھ ہی خود بھی اُس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ کھوپڑی کڑچ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گئی اور مگرڑا اُسے چبانے میں مصروف ہو گیا۔ میں لاشعوری طور پر کود کر اس کے سر پر سوار ہوا اور ہاتھ سے اُس کے اوپری کھپرے ٹٹولتے ہوئے نچلا حصّہ تلاش کرنے لگا جہاں کھپرے نہ ہوں۔ سرد، سخت اور چکنے کھپروں کی وجہ سے سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا دوسرے موت کا خوف بھی ہیجان کیے جا رہا تھا مگر میں نے سوچا کہ اس کے بعد شاید مگرڑا پر حملے کا موقع نہ مل سکے اس لیے آخری کوشش کر کے ہی اس کا لقمہ بننا چاہیے۔ ابھی میرے ہاتھ نے اس کے پیٹ کا وہ حصّہ تلاش کیا ہی تھا جہاں کھپرے نہیں، صرف کھال تھی کہ مگرڑا کھوپڑی کی ہڈیاں نگل کر پھر مجھے تلاش کرنے لگا تھا اور شاید اُس نے اپنے سر پر میرا بوجھ محسوس کر لیا تھا۔ اُس نے سر اُٹھا کر مجھے گرانا چاہا لیکن گرنے سے پہلے میں نے اپنی تلوار اُس کے پیٹ میں گھونپ دی اور پھر دونوں ہاتھوں سے تلوار کا دستہ پکڑ کر اُسے زیادہ سے زیادہ چیرنے کی تگ و دو کرنے لگا۔

مگرڑا بڑے زور سے تڑپا۔ میں زمین پر گر پڑا۔ اس کے پیٹ سے بہنے والا خون مجھے تر بتر کر گیا مگر میں نے تلوار پر گرفت نہ چھوڑی اور اُسے گھماتا اور گھونپتا رہا۔ مگرڑا کی تڑپ میں شدت آ گئی ایک بار وہ اُچھلا تو میں اُس کے نیچے آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ مگرڑا کے اینٹھنے اور تڑپنے سے میری حالت ابتر ہو گئی پھر آہستہ آہستہ وہ دم توڑنے لگا۔ میں نے اپنی تلوار نکالی لیکن اب میں تھکن اور مگرڑا کے نیچے دبنے سے اتنا چُور ہو چکا تھا کہ مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے مردہ مگرڑا کے ساتھ پیٹھ لگا لی اور دم لینے لگا۔ اب دھواں بند ہو چکا تھا اور ارژنگ کے قہقہے بھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ فرار تو نہیں ہو گیا۔ اگر وہ بھاگ نکلا تو پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا اور اس خیال نے مجھے پھر توانائی بخش دی۔ اب ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ میں نے اس غلیظ تہ خانے کا جائزہ لیا تو مجھے ایک اور دروازہ دکھائی دے گیا۔ اس دروازے میں پٹ نہیں تھے بلکہ جنگلا تھا جسے ایک زنجیر کے ذریعے بند کیا گیا تھا۔ میں نے زنجیر پر تلوار سے ضربیں لگانا شروع کر دیں زنجیر بہت مضبوط تھی۔ ہر ضرب کے ساتھ میرا غصّہ بڑھتا اور طاقت گھٹتی جا رہی تھی بالآخر زنجیر ٹوٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی تلوار بھی۔

میں نے وہ جنگلا نما دروازہ کھول دیا اور ٹوٹی ہوئی تلوار کا دستہ لیے آگے بڑھنے لگا جس کے ساتھ صرف چار انچ پھل رہ گیا تھا۔

یہ ایک سیدھی سُرنگ تھی جس میں جا بجا مشعلیں جل رہی تھی۔ سُرنگ کے اختتام پر بائیں جانب ایک راہداری ملی۔ یہ راہداری مجھے اسی کمرے میں لے آئی جہاں پہلی مرتبہ فرازیہ نے میرا استقبال کیا تھا۔ سامنے ہی چمڑے کا وہ پردہ آویزاں تھا جس کے دوسری جانب ارژنگ آتش دان کے پاس بیٹھا ملا تھا۔

میں نے رُک کر آگے پیچھے دیکھا، کوئی آواز نہیں تھی۔ ارژنگ کے کالے کوتے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے؟ پھر مجھے یاد آ گیا کہ منصوبے کے مطابق اوغیر نے کوتوں پر حملہ کر دیا ہو گا اور وہ سب اس سے مقابلے میں مصروف ہوں گے۔

میں نے آگے بڑھ کر چرمی پردہ ہٹا دیا۔

یہ وہی کمرہ تھا، وہی میز تھی، وہی ساز و سامان تھا، دیوار پر

اجرامِ فلکی کے وہی نقشے آویزاں تھے مگر نہیں تھا تو ارژنگ۔ وہ واقعی فرار ہوچکا تھا اور اس کا ثبوت وہ انگیٹھی تھی جو آتش دان سے ہٹا دی گئی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر آتش دان کا سرنگ والا جنگلا اُٹھایا اور سرنگ میں اُتر گیا۔ فرازیہ نے مجھے سچ ہی بتایا تھا۔

میں نے تلوار کا دستہ پھینک دیا اور خنجر نکال کر آگے بڑھنے لگا۔ سرنگ کے اختتام پر ایک ایسی راہ داری ملی جس میں ایک آدمی بآسانی دوڑ سکتا تھا۔ اس راہداری میں ایک مشعل جل رہی تھی۔ میں دوڑنے لگا۔ جب میں سرے پر پہنچا تو راہداری بائیں جانب مڑ گئی میں بھی مڑا تو بہت دُور سامنے مجھے ایک مشعل متحرک نظر آئی۔ یہ ارژنگ تھا جو مشعل اُٹھائے بھاگ رہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔

اچانک ارژنگ رُک گیا۔ میں نے بھی قدم روک لیے۔ وہ غالباً یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ مگر میں اندھیرے میں تھا اگر میں نے بھی اس کی طرح مشعل اُٹھائی ہوتی تو اُسے پتہ چل جاتا۔ وہ مطمئن ہوکر پھر بھاگنے لگا میں نے پنجوں کے بل اُس کا تعاقب دوبارہ شروع کر دیا۔

کچھ دُور جاکر راستہ تنگ ہونے لگا مگر اب تازہ ہوا کے جھونکے بھی محسوس ہونے لگے تھے اور اُن میں پھولوں کے ساتھ ساتھ مٹی کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ اب ہم اہراموں والے میدان میں پہنچ چکے تھے۔ میرے اور ارژنگ کے درمیان اب تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا تھا اور یہ فاصلہ میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا تاکہ اُسے یہ معلوم نہ ہوسکے کہ موت اس کے تعاقب میں ہے۔

کچھ دُور جاکر ارژنگ رُک گیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مشعل اس نے بلند کر رکھی تھی لہٰذا نیچے اندھیرا تھا۔ میں چیتے کی طرح دبے پاؤں سیڑھیوں کے قریب پہنچا۔ اپنا خنجر تولا اور پھر ایک دم بولا: "ارژنگ!"

ارژنگ جو باہر نکلنے ہی والا تھا، ٹھٹکا اور پلٹا تو اُس کے سر اور چہرے سے سیاہ نقاب ہٹ گیا اُس نے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے کہا: "یہ تم ہو سرفروش؟"

"سرفروش نہیں تمھاری موت!" میں نے جواب دیا اور خنجر تول کر پھینکا جو اُس کی گردن میں پیوست ہوگیا۔ ارژنگ کے مُنہ سے ایک چیخ اُبھری۔ اس نے لوہے کے زینے سے ہاتھ ہٹاکر خنجر نکالنا چاہا مگر توازن قائم نہ رکھ سکا اور زینے سے گر پڑا۔ میں اس کے پاس گیا۔ وہ ابھی زندہ تھا اس نے بمشکل تمام کہا: "نادان۔ ہم دونوں ۔ حکمرانی" مگر موت نے اُسے اپنی بات پُوری کرنے کی مہلت نہ دی۔

میں نے ارژنگ کی لاش اپنے کندھے پر ڈالی اور زینہ چڑھنے لگا۔ زینے کے اوپری تختے پر پھولوں کی ایک چھوٹی سی کیاری بنی ہوئی تھی۔ میں نے تختہ ہٹایا اور باہر نکل کر ارژنگ کی لاش ایک طرف پھینک دی۔ چاند اور ستارے آسمان پر چمک رہے تھے اور ہر طرف سے بھاگنے دوڑنے اور چیخنے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ متحرک مشعلیں شاہد تھیں کہ ان کی روشنی میں چُن چُن کر کوکوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے۔ اتنے میں ایک مشعل بردار گھڑ سوار دستہ اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اُن کے نیزوں پر کاہنوں کے سر تھے۔ جب وہ قریب آئے تو ان کے سوار نے مجھے پہچان لیا اور لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

"یہ کون ہے جناب؟"

"ارژنگ۔" میں نے جواب دیا۔

"ارژنگ؟" اُس نے تعجب سے دُہرایا۔ "کاہن اعظم۔ کالے کوکوں کا سردار؟ مگر شہزادہ حضور۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ۔ ۔ ۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں۔" میں نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا: "اس کے ساتھ اب جو سلوک کرو تمھاری مرضی مگر اوغیر کو ضرور بتا دینا اور ہاں، تمھارا حملہ کیسا رہا؟"

"بہت کامیاب رہا جناب۔ جن کوکوں نے ہتھیار ڈال دیے، انھیں ہم نے گرفتار کرلیا ہے اور جنھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ان کے سر نیزوں پر سجا دیے گئے ہیں۔ مقبرے کے سارے دروازے بھی بند کیے جا رہے ہیں تاکہ اگر کوکوں نے اس میں پناہ لی ہو تو اب باہر نہ آسکیں۔"

"خوب۔ یہ دروازہ بند کرنا بھی نہ بھولنا۔" میں نے زمین دوز راستے کی طرف اشارہ کرکے کہا: "اسے بند کرکے اس پر بڑے بڑے پتھر رکھوا دو۔"

"بہتر جناب۔" اور اس نے اپنے ساتھیوں کو پتھر لانے کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے بولا: "کیا آپ میرے ساتھ چل کر لباس تبدیل کرنا اور آرام کرنا پسند کریں گے؟"

"وہ میں خود ہی کرلوں گا۔ اوغیر کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ اب ہماری ملاقات نہیں ہوگی اور آج رات ہی میں کسی کا ایک گھوڑا چُرا کر یا مانگ کر لے جاؤں گا۔ اور ہاں اُسے کہہ دینا کہ وہ طاؤس سے وعدہ نبھانا نہ بھولے۔"

"بہتر جناب۔" وہ ادب سے بولا اور میں اُسے وہیں چھوڑ چل دیا۔

★★

مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں سچ مچ نیم دیوانہ ہوگیا۔ مجھے ہر وقت زرتاج کی خاموش پکار سُنائی دیتی تھی۔ وہ

کی چٹان سے تراشا ہوا مجسمہ تھی مگر میں اُس کی محبت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اُس کا صدیوں قائم رہنے والا سحر مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا اور یہ اُسی سحر کا کرشمہ تھا کہ اب میں اپنے دور اپنی دُنیا میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا بلکہ زرتاج کے ساتھ رہنے کا متمنی تھا۔

میں نے اُسی شب آبنائے عبور کرلی تھی اور صبح کا اُجالا پھیلنے سے پہلے ایک پہاڑی غار میں چھپ گیا تھا دن میں کئی بار آشوری گھڑ سوار میرے قریب سے گزرے۔ میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اب مجھے ساحلی علاقے میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ ان کا خیال شاہی مقابر کی طرف نہیں گیا ورنہ وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے پہنچ چکے ہوتے۔

میں تین راتوں کے سفر کے بعد مردہ آتش فشاں پر پہنچ گیا جس کے وسط میں مجسموں کی گیلری واقع تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہاں کوئی محافظ نہیں ہوگا۔ ان تین روز میں مجھے کھانے کو بھی کچھ نہیں ملا تھا۔ ہتھیاروں کے نام پر میرے پاس ایک تلوار اور ایک خنجر تھا جو چلتے وقت میں نے ایک ازمیری افسر سے لے لیے تھے اور اب مجھے ان کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔

میں نے دو چقماق تلاش کیے اور انھیں ٹکرا کر ایک مشعل جلائی۔ یہ مشعل لے کر میں کان میں داخل ہوگیا اور بڑے ہال تک جا پہنچا۔ مشعل کی روشنی میں اس کی چٹانوں والی دیواریں جگمگا اٹھیں اور اس کے ہر ٹکڑے میں مجھے اپنا عکس دکھائی دینے لگا۔ مگر یہ عکس اس سرفروش کا تھا جسے صدیوں پہلے مرجانے والی ایک عورت کی محبت نے نیم دیوانہ بنا دیا تھا۔ میں نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ اٹھاکر اپنے آپ کو سلام کیا پھر میں اس اتھاہ گہرے گڑھے کی کگر پر آگیا جس کے دوسرے کگر پہ مجسمے ایستادہ تھے اور ان میں سے ایک زرتاج کا تھا۔

میں نے مشعل بلند کی تو زرتاج روشنی میں نہا گئی۔ اس کے انگ انگ سے رنگ پھوٹنے لگے۔ وہ ان سب عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھی جو اب تک میں نے دیکھی تھیں پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زرتاج کہہ رہی ہو: "آخر تم آ ہی گئے میرے محبوب!"

"ہاں زرتاج میں آگیا ہوں۔ اپنی بانہیں یونھی پھیلائے رکھو پھر جب میں اُس کگر پر پہنچوں تو مجھے اُن کے حلقے میں سمیٹ لو۔"

میں گڑھے کے اُس مقام پر آیا جہاں وہ کم سے کم چوڑا تھا۔ میں چوڑائی کا جائزہ لے رہا تھا کہ میرے دماغ والا کرسٹل پھر اشارے دینے لگا۔ یوں تو وہ کئی دنوں سے مجھے اشارے دے رہا تھا مگر میں نے ان پر درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر فریدوں کو میری ذہنی حالت کا علم ہوچکا ہے اور اب وہ ہدایات دینا چاہتا ہے۔ ان ہدایات کا مطلب و مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا کہ میں اپنے دل سے زرتاج کی محبت نوچ کر پھینک دوں اور یہ میرے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ مگر اس وقت اشارے بہت واضح اور طاقتور تھے۔ مجھے ارتکازِ توجہ کے بغیر ہی یہ پیغام مل گیا۔

"اپنے ارادے سے باز آجاؤ۔ واپسی کے لیے تیار رہو اور جو کچھ لاسکتے ہو لیتے آؤ۔"

میں نے اس پیغام پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ میری محبت کو، میری خوشیوں کو پھر قتل کر دینا چاہتے تھے۔ میں اپنے دور اور دُنیا میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں بھی یہاں کی طرح دُکھ تھے، درد تھے، بیماریاں تھیں، فریب تھے ... میرا جی بھر چکا تھا اب میں کسی جنگ و جدال میں حصہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری تمنا تھی تو صرف اتنی کہ زندگی کا آخری لمحہ زرتاج کے ساتھ بسر ہوجائے۔

میں نے اشاروں پر کوئی توجہ نہ دی اور گڑھے کی چوڑائی کا اندازہ لگانے لگا۔ وہ پندرہ فٹ یا چند انچ کم زیادہ تھی۔ اگر ایک بار میں اس کگر پر پہنچ جاؤں تو دوبارہ ادھر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ حمیر تھا جو دوبارہ ادھر آگیا تھا لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا تھا اور کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں زرتاج کی آواز سنائی دی۔

"دیر کیوں کر رہے ہو سرفروش۔ اِدھر آؤ نا میرے پاس۔"

"میں آرہا ہوں زرتاج۔ میں آرہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے آخری بار گڑھے میں جھانکا۔ اتھاہ گہرائی میں مجھے اندھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں پیچھے ہٹا اور آخری حصے تک چلا گیا جو کگر سے تقریباً تیس ہاتھ تھا۔ اتنے کم فاصلے میں رفتار پکڑنا مشکل تھا لیکن مجھے تو بہرطور زرتاج کے پاس پہنچنا تھا۔ نہ پہنچ سکا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ زرتاج کے لیے جان دینا بھی کم خوشی کی بات نہیں تھی۔

"آجاؤ سرفروش۔" اس کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر فریدوں کا پیغام ملا: "تمھاری ذہنی کیفیت دیوانوں کی سی ہوگئی ہے۔ واپسی کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"نہیں۔" میں چلّایا: "اس وقت تم مجھے واپس نہیں بلاسکتے ڈاکٹر۔" اور اس کے ساتھ ہی میں نے گڑھا پھلانگنے کے لیے دوڑ لگا دی۔

میں ہوا میں اچھلا اور جب گڑھے کے درمیان پہنچا تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں دوسری کگر تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ تاہم میں نے اپنے بازو آگے کو پھیلا دیے۔ یہ سب ایک سیکنڈ کے اندر اندر ہوگیا۔ میں دوسری کگر تک نہ پہنچ سکا مگر میرے بازو پہنچ گئے اور جسم خلا میں جھولتا رہ گیا۔ میں نے کگر پر اُبھرے ہوئے ٹکڑے بڑی مضبوطی سے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیے تھے لیکن میرے اندر اتنی توانائی نہیں رہی

تھی کہ اپنے آپ کو گھسیٹ کر اوپر جا سکوں۔ میں اس وقت کا انتظار کرنے لگا کہ میرے ہاتھوں کی توانائی جواب دے جائے تو انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے پر میں اتھاہ گہرائی میں گر کر شروز سے جا ملوں لیکن جونہی میں نے زرتاج کی طرف دیکھا' وہ مسکراتے ہوئے بولی: "رُک کیوں گئے ہو میرے پاس آؤ نا۔"

زرتاج کے ان الفاظ نے میری ساری کھوئی ہوئی توانائیاں مجھے لوٹا دیں۔ میں نے ایک نعرہ لگایا اور دوسرے لمحے میں لگر پر تھا۔ میں اُٹھا اور مجسموں کے درمیان سے گزر کر زرتاج کی طرف بڑھنے لگا۔

کرسٹل نے بتایا: "تیار رہو۔ واپسی کے لیے تیار رہو۔ جو لینا ہے لے لو۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" میں چلایا اور زرتاج کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ زندہ ہے۔ میں نے کہا: "تم مجسموں میں کیوں کھڑی ہو زرتاج؟"

"میں جانتی تھی کہ مجسموں کی تلاش تمھیں یہاں لائے گی۔ اس لیے میں مجسمہ بن کر یہاں کھڑی ہو گئی اور صدیوں تک تمھاری راہ دیکھتی رہی۔ آؤ میری بانہوں میں سما جاؤ۔ مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لو۔"

اور میں نے آگے بڑھ کر اُسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ ہم دونوں گر پڑے اور لگر کی طرف لڑھکنے لگے۔ میں نے کہا: "ہم اتھاہ گہرائی میں گرنے والے ہیں زرتاج۔"

"ڈرو مت سرفروش۔ موت تمھیں ہمیشہ کے لیے مجھ سے ملا دے گی۔ میں زندہ ہو کر تمھیں نہیں مل سکتی تھی مگر تم مر کر مجھے مل سکتے ہو۔ یا تم میری خاطر، اپنے پیار کی خاطر نہیں مر سکتے؟"

"اگر میرے پاس ہزار زندگیاں ہوتیں تو میں اپنی ہر زندگی تمھارے نام پر نچھاور کر دیتا زرتاج۔" میں نے جواب دیا۔ اب ہم لڑھکتے ہوئے لگر کے کنارے تک پہنچ گئے تھے پھر میرے سر میں درد کی شدید لہر نے مجھے بے ہوش کر دیا۔

★★

زرتاج اگرچہ اب بھی میری بانہوں کے حصار میں تھی مگر اس نے دم توڑ دیا تھا۔ ان لوگوں نے اُسے مار ڈالا تھا۔ اس کا جسم پھر پتھر ہو چکا تھا: "زرتاج۔" میں زور سے چیخا۔ مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اور گہرائی کی تہ میں آ گرے۔ ہمارے قریب ہی شروز کی لاش پڑی تھی۔

یہ عجیب سی بات تھی کہ گڑھے کی اتھاہ گہرائی میں روشنی تھی۔ مجھے بہت سے پنجر اور کھوپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے زرتاج سے کہا: "مجھے ڈر لگ رہا ہے زرتاج۔" مگر وہ کچھ نہ بولی۔ میں بھول گیا

تھا کہ وہ دوبارہ ہیرے کی چٹان میں ڈھل گئی ہے، بے جان مجسمہ بن گئی ہے۔

اور پھر میں رونے لگا۔ یہاں تک کہ روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔

★★

جب میں ہوش میں آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میں کئی روز سے اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا۔ میرے ہوش میں آتے ہی برین سرجن ڈاکٹر قدسی کو اطلاع دے دی گئی۔

ڈاکٹر قدسی نے میرا معائنہ کیا اور بولا: "تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمھیں جلد ہی یہاں سے چھٹی مل جائے گی۔ بے ہوشی کے دوران تم کچھ بولتے رہے ہو۔ میری ہدایت یہ ہے کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، کچھ عرصے کے لیے وہ کام چھوڑ دو۔"

کچھ روز مزید آرام کرنے کے بعد جب مجھے اسپتال سے چھٹی ملی تو رضا آفندی مجھے لینے آ گیا۔ اس دوران مجھ سے ڈاکٹر سے ملنے دیا گیا نہ ڈاکٹر فریدوں کو۔ رضا آفندی میری خیریت دریافت کرنے کے بعد مجھے ڈاکٹر فریدوں کے پاس لے گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا: "اب تم اپنی ذہنی کیفیت میں کچھ فرق محسوس کرتے ہو؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کمال ہے بھئی۔ یعنی دماغ سے کرسٹل ہٹا لینے کے بعد تمھیں کوئی فرق محسوس ہی نہیں ہوا۔"

"کیا وہ میرے دماغ سے نکال دیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ گڑبڑ اسی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اب کے تم جو مجسمہ لائے ہو وہ اربوں روپے کی مالیت کا ہے۔ ذرا ساتھ آؤ۔"

ہم تینوں اس کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں چلے گئے۔ ڈاکٹر فریدوں نے ایک خاص قسم کی آہنی تجوری کا دروازہ کھول دیا۔ الماری میں زرتاج کا مجسمہ استادہ تھا۔ ڈاکٹر فریدوں بولا: "جب کبھی رات کو مجھے نیند نہیں آتی، میں اس مجسمے پر روشنی ڈالتا ہوں تو اس کے انگ انگ سے رنگ پھوٹنے لگتے ہیں اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ مجھے گوشت پوست کی عورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس سے دیوانہ وار چاہنے لگا ہوں اور مجھے کہیں دُور سے ایک آواز سی آتی ہے کہ میں کب سے انتظار کے ساحل پر کھڑی تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں فریدوں، کیا تم نے بھی ایسا محسوس کیا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں ڈاکٹر۔" میں نے صاف جھوٹ بول دیا۔

ڈاکٹر اور رضا آفندی نے بے ساختہ ایک ساتھ قہقہہ لگایا تو مجھے یاد آیا کہ میری ذہنی کیفیت اُن سے ڈھکی چھپی نہیں تھی پھر اس نے تو واپسی پر میری یادداشت کا ذخیرہ ٹیپ پر منتقل کر لیا ہوگا۔ میں نے ایک آخری نظر زرتاج کے مجسمے پر ڈالی اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔

★★

زرتاج کے مجسمے کی جو مالیت بتائی گئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکٹر فریدوں بالآخر کمپیوٹر سے منافع کمانے کی پوزیشن میں پہنچ گیا ہے... چند روز بعد ہی وہ میرے لیے نئے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس بار وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُرجوش تھا۔

... اور پھر وہ مقررہ دن بھی آ پہنچا۔

کمپیوٹر رُوم کی وہ کرسی آج بھی مجھے موت کی کرسی دکھائی دے رہی تھی۔ میں وقفے وقفے سے اس کرسی پر مر رہا تھا اور تھوڑے عرصے بعد جب کمپیوٹر کا ریسیور میرے ذرات سمیٹ کر تجسیم نو کر دیتا تو میں دوبارہ زندہ ہو جاتا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور الیکٹروڈز میرے جسم سے منسلک کر دیے گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک تند بگولے کی لپیٹ میں آ گیا ہوں جو مجھے برق رفتاری سے چکر دیتے ہوئے اوپر ہی اوپر لیے جا رہا ہے ساتھ ہی مجھے بادگرد کی سنسناتی ہوا کے تھپیڑے لٹو کی طرح گھما بھی رہے ہیں۔ پھر ایک دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے اور میں گردش کرتے ہوئے بگولے کی زد سے نکل کر اتھاہ اندھیرے خلا میں گرنے لگتا ہوں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ میں جوں جوں نیچے آتا ہوں گرنے کی رفتار میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھے ایک نہیں، متعدد پیراشوٹ سنبھالے ہوئے ہیں۔ جوں ہی میرے پاؤں زمین پر ٹکتے ہیں میں لڑھکنیاں کھانے لگتا ہوں۔ تب میں لاشعوری طور پر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا دیتا ہوں تاکہ میں اپنے آپ کو لڑھکنیاں کھانے سے روک سکوں اور کچھ دور گھسٹنے کے بعد واقعی رُک جاتا ہوں۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ یہ سب ایک ڈراؤنا خواب تھا لیکن دُوسرے ہی لمحے گھسٹنے سے جسم پر آنے والی خراشوں نے اس خیال کو جھٹلا دیا۔ میں پتھریلی اور ڈھلوان زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں تاکہ دیکھ سکوں کہ میں کہاں ہوں مگر مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں بینائی سے محروم ہو گیا ہوں۔ میں بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگا لیکن اس کے باوجود مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا البتہ تیز ہوا کی سائیں سائیں اور بادلوں کی گھن گرج ضرور سُنائی دے رہی تھی۔ معاً یہ خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا، کہیں ایسا تو نہیں کہ میری بینائی بالکل ٹھیک ہو مگر گھور اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو؟ یہ سوچ کر میں نے اُوپر آسمان کی جانب نگاہ کی تو اُمنڈتے گھمنڈتے بادلوں کے بیچ ایک جگہ چاند کی ذرا سی جھلک دکھائی دے گئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے خُدا کا شکر ادا کیا اور خراشوں کا جائزہ لینے کے لیے جسم کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ لباس کے نام پر چند لتے جھول رہے ہیں لیکن کمر میں بندھی ہوئی چمڑے کی پیٹی اور اس میں اُڑسا ہُوا تیز دھار شکاری چاقو اپنی جگہ موجود ہے۔ میں نے ایک بار پھر خُدا کا شکر ادا کیا کہ اتنی لڑھکنیاں کھانے کے باوجود میں زخمی نہیں ہُوا تھا ورنہ چاقو کا ننگا پھل میرا پیٹ چیر کر انتڑیاں باہر نکال سکتا تھا۔

سرد ہَوا کے تیز جھکڑوں سے مجھ پر کپکپی طاری ہونے لگی تو میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اب میری آنکھیں اس اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میں جس ڈھلوان پر کھڑا تھا، اُس کے اُوپری جانب سر بہ فلک پہاڑ تھے اور باقی تین اطراف اندھیرے کے باعث کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ نیچے اُترتے ہُوئے سوچنے لگا کہ میں یہاں کیسے آ گیا ہُوں؟ مجھے جان بُوجھ کر یہاں بھیجا گیا ہے یا کمپیوٹر کی کسی غلطی یا خرابی نے مجھے یہاں لا پھینکا ہے؟ پھر میں نے ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا کہ ان کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا...

سر دست تو مجھے ایک بار پھر اپنی بقا کے مسئلے سے نمٹنا تھا۔ عین اُسی وقت مجھے اپنے قدموں کے نیچے زمین تھرتھراتی محسوس ہُوئی اور ایک دہشت انگیز گڑگڑاہٹ بھی سُنائی دی۔ پھر چند بڑے بڑے پتھر میرے سامنے سے لڑھکتے ہُوئے نیچے چلے گئے۔ میری جسامت سے کئی گنا ایک بڑا پتھر تو عین اُس جگہ سے گزرا جہاں چند لمحے قبل میں چت پڑا تھا۔ اگر اس وقت میں وہاں ہوتا تو میرا وجود گوشت کے بچکے ہُوئے لوتھڑوں میں بدل چکا ہوتا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سے

چند دھماکوں کی آواز آئی۔ یہ دھماکے اُنھی اُوپر سے لڑھکنے والے پتھروں کے تھے جو نیچے پڑے ہوئے پتھروں کے ساتھ ٹکرانے سے ہوئے تھے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ ڈھلوان زیادہ طویل نہیں ہے اور اس سے پہلے کہ کوئی اور بڑا پتھر یا چٹان میرا قیمہ بنا دے، مجھے نیچے جا کر اپنے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کر لینی چاہیے چنانچہ میں تیزی سے نیچے اُترنے لگا۔

ڈھلان کے اختتام پر ہر جگہ چھوٹے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور اُن سے پرے کچھ فاصلے پر ایک دیوار سی نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں بادل چھٹنے سے چاند نکل آیا تو پتہ چلا کہ وہ دیوار دراصل بلند و بالا درختوں کا ایک وسیع جنگل ہے۔ لڑھکتے پتھروں اور تند و تیز یخ بستہ ہوا سے بچنے کے لیے میں جنگل کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

جنگل بے حد گھنا تھا۔ سنسناتی ہوا میں درختوں کی جھومتی شاخیں یوں لگ رہی تھیں جیسے چڑیلیں بال کھولے وحشیانہ انداز میں رقص کر رہی ہوں۔ ہوا کے جھکڑوں سے ٹوٹنے والے درختوں کی چرچراہٹ پر اروارِ خبیثہ کی چیخوں کا گمان ہوتا تھا۔ پھر یہ بات بھی خارج از امکان نہیں تھی کہ جنگل ریچھوں اور بھیڑیوں جیسے درندوں کا مسکن بھی ہو سکتا ہے اس لیے میں جلد از جلد رات بسر کرنے کا کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لینا چاہتا تھا۔

ایک جگہ دو تناور درختوں کے درمیان گھنی اور خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور اُن میں داخل ہونے کا ایک چھوٹا سا قدرتی راستہ بھی موجود تھا۔ میں اُن جھاڑیوں میں گھس گیا۔ چاقو سے کچھ خاردار جھاڑیاں کاٹ کر راستہ بند کیا، سوکھے پتے سمیٹے اور اُنھیں بچھا کر لیٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ اس موسم اور ماحول میں مجھے نیند نہیں آئے گی تاہم میں تھوڑا سا آرام ضرور کر سکوں گا مگر لیٹتے ہی مجھ پر غنودگی چھا گئی اور میں نیند کی نرم و مہربان آغوش میں پہنچ گیا۔

خدا جانے وہ رات کا کون سا وقت تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی یا چھٹی حس نے مجھے گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ ہوا کی شدت میں قدرے کمی آ چکی تھی اس لیے اُس کی شوکار میں وہ دہشت نہیں تھی لیکن اب اس شوکار میں نفیریوں اور دف کی آواز ضرور شامل ہو گئی تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا کہ وہ واقعی نفیریوں اور دف ہی کی آواز ہے یا میرا واہمہ لیکن یہ میرا وہم نہیں تھا۔ ہوا کی لہریں کہیں دور سے ان سازوں کی آوازیں اپنے ساتھ لا رہی تھیں۔ اس جنگل اور ایسے موسم میں بھوت پریت ہی بزمِ طرب سجا سکتے تھے۔ اگر اُنھوں نے یہ بزمِ طرب سجائی تھی تو کہاں سجائی تھی؟ تھوڑی دیر کے بعد مجھے یہ اندازہ ہو سکا کہ سازینوں کی آوازیں بائیں جانب سے آ رہی ہیں۔ میں اُٹھ کر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک بہت دور جگنو کی طرح ایک چمک دکھائی دی مگر دوسرے لمحے غائب ہو گئی۔ نفیریوں اور دف کی آواز بھی کبھی ہوا کی سائیں سائیں میں مدغم ہو جاتی . . . اور کبھی اُبھر کر سماعت کو اپنے وجود کا یقین دلا دیتی تھی۔ جب بہت دیر تک وہ روشنی یا چمک پھر دکھائی نہ دی تو میں یہی سمجھا کہ وہ جگنو ہو گا لیکن ایک بار پھر وہ سُرخ چمک نظر آ گئی جو کسی الاؤ کی نشاندہی کرتی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ اس بے پایاں جنگل میں کوئی ذی ہوش خیمہ زن ہو کر الاؤ روشن نہیں کر سکتا تو پھر یہ آگ کیسی تھی اور ساز کیوں بج رہے تھے؟ میں نے اپنا چاقو اُٹھا کر پیٹی میں اُڑسا اور احتیاط سے اُس طرف چل دیا۔

ظاہر ہے کہ میں اتنے گھنے جنگل میں سیدھا اُس طرف نہیں جا سکتا تھا اس لیے کبھی وہ سُرخ چمک مجھے دائیں جانب نظر آتی تھی تو کبھی بائیں جانب۔ پھر کبھی وہ بہت دیر تک غائب ہو جاتی تھی تب سازینوں کی آواز میری رہنمائی کرتی تھی۔ بالآخر میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے الاؤ صاف دکھائی دیتا تھا مگر وہاں جانے میں بھی کئی خطرے تھے کیونکہ ایسے ویرانے اور جنگل میں خیمہ زن ہونے والوں نے اپنی حفاظت کے لیے پہرے کا انتظام بھی ضرور کیا ہو گا۔ یہ پہرے دار درختوں کی اوٹ یا اُن کی شاخوں میں چھپ سکتے اور ذرا سی آہٹ پر تیر چلا سکتے تھے۔ اس لیے میں گربہ پا اور چھپ چھپ کر آگے بڑھتا رہا۔

جب میں الاؤ کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ ایک سڑک کے کنارے جل رہا ہے جو جنگل کے بیچوں بیچ گزرتی ہے۔ میں اسی کچی سڑک پر آ گیا تھا اور سیدھے بائیں جانب موڑ کے ساتھ ہی الاؤ جل رہا تھا۔ میں نے سڑک پار کی اور مزید قریب آیا تو مجھے سازوں کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کی آوازیں بھی سُنائی دینے لگیں۔ پھر سازوں کی لَے ایک دم تیز ہو گئی اور دف پر بھی تیز تھاپ پڑنے لگی۔ لَے تال کی اس اچانک تبدیلی نے مجھے شک و شبہے میں مبتلا کر دیا کہ کہیں وہ میری آمد سے تو باخبر نہیں ہو گئے کہیں یہ لَے تال اطلاعی اشارہ تو نہیں؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اونچے سُروں میں بجنے والے یہ ساز ایک دم جھٹکے سے خاموش ہو گئے جیسے زمین نے شق ہو کر سازندوں کو نگل لیا ہو۔ اس اچانک چھا جانے والی خاموشی میں اب صرف ہوا کی شوکار باقی رہ گئی تھی اور یوں لگ رہی تھی جیسے بھٹکی ہوئی رُوحیں جنگل میں بین کرتی پھر رہی ہوں۔ میں عجیب مخمصے میں گرفتار تھا کہ آگے بڑھوں یا پلٹ جاؤں کہ اتنے میں تالیاں بجنے لگیں اور کچھ داد و تحسین سے "واہ وا... واہ وا" کہہ اُٹھے۔

وہ کون تھے؟ وہاں کیا ہو رہا تھا؟ یہ جاننے کا شوقِ تجسس

مجھے آگے بڑھنے پر اُکسانے لگا اور میں جھاڑیوں کی اوٹ میں رینگنے لگا۔ جب میں موڑ پر پہنچا تو پتہ چلا کہ اُس کچی اور ٹیڑھی میڑھی سڑک کے کنارے تقریباً سو گز کا ایک ٹکڑا جھاڑیوں اور درختوں سے صاف کر دیا گیا ہے جس کے پرلے کنارے نیم دائرے کی صورت چھ چھوٹے چھوٹے خیمے نصب تھے، درختوں کے ساتھ کچھ گھوڑے اور گدھے بندھے ہوئے تھے اور درمیان میں الاؤ جل رہا تھا جس کے ارد گرد تقریباً دس بارہ آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ یہ سب کے سب کھلی آستینوں والے چغے اور گھیر دار شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ لیکن اُن میں سے دو افراد کے چغے اور شلواریں چمک دار ریشمی کپڑے کی بنی ہوئی تھیں جبکہ باقی افراد کا لباس معمولی کپڑے کا تھا۔ ہر فرد کے پاس ہتھیار تھے اور ان میں سے پانچ آدمی اس وقت ہاتھوں میں ساز لیے بیٹھے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُن لوگوں کے درمیان ایک نازک اندام لڑکی بھی موجود ہے۔ اُس نے برائے نام مختصر لباس پر منکوں کے ہار پہن رکھے تھے اور اُس کے خوبصورت بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ لڑکی زور زور سے سانس لے رہی تھی جس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ رقص کرتی رہی ہے اور بُری طرح تھک گئی ہے۔

اس سے پہلے کہ اُن میں سے کسی کو میری آمد کا احساس ہوتا، میں اُٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اُن کے سامنے چلا گیا۔ میں نے یہ انداز اس لیے اپنایا تھا کہ اُنھیں پہلی نظر ہی میں یہ احساس ہو جائے کہ میں نہتا ہوں ورنہ وہ میری بات سُننے سے پہلے میرے سینے میں بھالا بھونک سکتے تھے۔

جونہی میں الاؤ کی روشنی میں اُن کے سامنے آیا، ہر فرد کے ہاتھ بے اختیار اپنے اپنے ہتھیاروں پر جا پہنچے۔ لڑکی میری ہیئت کذائی دیکھ کر اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اُس نے اپنا چہرہ اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔ اتنے میں عمدہ لباس والے دو آدمیوں میں سے ایک نے جو بوڑھا تھا کسی کو حکم دیا: "طغرل... ارغون۔ درخت پر چڑھ کر دیکھو۔ کوئی آ رہا ہو تو ہمیں خبردار کر دو۔"

یہ حکم سُنتے ہی دو ہٹے کٹے جوان اُٹھے اور بندروں کی سی پھرتی کے ساتھ ایک اُونچے درخت پر چڑھنے لگے۔ میں نے بوڑھے اور اُس کے ساتھ بیٹھے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ وہ باپ بیٹے لگتے تھے۔ بوڑھے نے تلوار اپنی گود میں رکھ دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا: "تم کون ہو اور تمھیں سلطنتِ بہرام میں قدم رکھنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟"

"میں ایک مسافر ہوں۔ مجھے لباس اور خوراک کی ضرورت ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ مہمان نواز ثابت ہوں گے۔"

"سلطنتِ بہرام کی سرحد میں بلا اجازت قدم رکھنے والوں کی مہمان داری تلوار سے کی جاتی ہے اجنبی۔ اگر ہم کسی ایسے آدمی سے ہمدردی برتنا چاہیں تو صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اُسے ترسا ترسا کر نہ ماریں بلکہ ایک ہی جھٹکے میں اُس کا سر تن سے جُدا کر دیں تاکہ وہ موت کے طویل کرب سے نہ گزرے اور اگر ہمیں اُس پر رحم نہ آئے تو ہم اُسے شہنشاہ ضرغام کے پاس بھیج دیتے ہیں جو اپنی سلطنت میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والوں کو تڑپا تڑپا اور سسکا سسکا کر مارتا ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"میں نے ایسا کوئی جُرم نہیں کیا جو میرے معزز میزبانوں کو میرے قتل پر اُکسائے۔"

"آخر تم ہو کون؟" اب نوجوان نے سوال کیا۔ "یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ تم نے کوئی جُرم کیا ہے یا نہیں۔"

"میرا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔" بوڑھا اس کی تائید کرتے ہوئے بولا: "یہ سلطنتِ بہرام کی سرحد کا وہ علاقہ ہے جو کہستانِ منگول سے ملتا ہے۔ تم سلطنتِ بہرام کے باشندے نہیں ہو اور منگول ہمیشہ ہمیں نقصان پہنچانے کے لیے ہماری سرحد میں داخل ہوتے ہیں۔"

"اگر آپ سچ سُننے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ دُنیا کے بارے میں آپ کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میں منگول نہیں، سلطنتِ آریانہ کا باشندہ ہوں جو کہستانِ منگول اور اُس کے بعد صحرائے اعظم کی دوسری جانب واقع ہے۔ میں وہاں کا شہزادہ ہوں۔ میرے ساتھ چند شہسوار بھی تھے۔ ہم سلطنتِ بہرام کے شاہ ضرغام کی خدمت میں آ رہے تھے کیونکہ ہم نے اُن کی طاقت کے بارے میں بہت سی داستانیں سُنی تھیں۔ ہم اُن کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"شہنشاہِ دوراں اعلیٰ حضرت ضرغام کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے یا سُنتے ہیں۔" نوجوان نے کہا۔ "اور پھر تمھیں ان معلومات سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟"

"ہم ایک دوسرے کی اچھی باتیں اپنا سکتے ہیں۔ دوسرے ہم اس حقیقت کی کھوج بھی لگانا چاہتے تھے کہ اعلیٰ حضرت ضرغام کے بارے میں یہ افواہ کہاں تک درست ہے کہ وہ عقل و دانش سے محروم ہیں یا آپ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ ہم بلا تصدیق اس افواہ پر یقین کر لیتے؟"

یہ بات سُن کر نوجوان کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس نے تعجب سے باپ کی طرف دیکھا جو اپنے تاثرات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میری اس بات نے اُنھیں کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں نے کہا: "ہم نے بہت زیادہ افراد پر مشتمل سفارت اس لیے مناسب نہیں سمجھی تھی کہ ہمیں صحرائے اعظم اور منگول علاقے سے گزرنا تھا اور منگول شاید فوجی دستے کو برداشت نہ کر سکتے۔ اس کے باوجود

جب ہم سرحد کے قریب پہنچے تو اُنھوں نے میری مختصر سی جماعت پر حملہ کر دیا۔ وہ بہت زیادہ تعداد میں تھے۔ اس لیے میرے پانچ شہسوار اُن سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ میں اور میرا ایک شہسوار بچ نکلا مگر ہم جنگل میں ایک دُوسرے سے بچھڑ گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھی پر کیا بیتی البتہ میں خود یہاں تک آ پہنچا ہوں۔"

"کیا منگول گھوڑوں پر سوار تھے یا پیدل؟" نوجوان نے سوال کیا۔

"بہت سے گھوڑوں پر سوار تھے مگر اُن کے ساتھ پیدل جنگجو بھی کافی تعداد میں تھے۔"

"کیا تم انھیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے تھے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"ایک جنگجو شہزادے سے اس قسم کی توقع وابستہ کرنا اُس کی بہادری اور مردانگی کی توہین کے مترادف ہے سردار۔ میں اُس وقت تک منگولوں کو تہ تیغ کرتا رہا تھا جب تک کہ میری تلوار ایک زرہ کو چیرتی ہوئی منگول گھڑ سوار کی پسلیوں میں نہ پھنس گئی۔ کیا آپ میرے لباس سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کس حال سے گزرا ہوں گا؟"

"لباس تو خاردار جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے بھی تار تار ہو سکتا ہے۔ تم جنگجو ہو، اس کا کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟"

"اس وقت میں کوئی ثبوت تو نہیں دے سکتا، البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ جس طرح چاہیں، مجھے آزما سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" بوڑھا بولا اور اُس نے تین بار تالی بجائی تو لڑکی اُٹھ کر خیمے کے اندر چلی گئی۔ بوڑھا اور اُس کا بیٹا چند قدم پیچھے ہٹ گئے اور باقی لوگوں نے بھی اُٹھ کر ایک نیم دائرہ بنا لیا۔ تب بوڑھے نے آواز لگائی: "طغرل۔ ارغون۔ یہاں آؤ۔"

چند لمحوں بعد ہی دو ہٹے کٹے درخت سے اُتر آئے اور بوڑھے کے سامنے مؤدب کھڑے ہو گئے۔ میں نے الاؤ کی روشنی میں غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں قد و قامت میں تقریباً میرے برابر تھے۔ اپنے سردار کا حکم سنتے ہی ایک نے کلہاڑا اور دُوسرے نے گرز اُٹھا لیا۔

بوڑھے سردار نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے پوچھا: "تم اسے دیکھ رہے ہو؟"

"جی ہاں سردار۔"

"یہ کہتا ہے کہ یہ سلطنت آریانہ کا شہزادہ ہے جو کہستانِ منگول کے جنوب میں بہت دُور واقع ہے۔ یہ ہمارے شہنشاہ سے ملنے آیا ہے۔"

اُن دونوں نے میری طرف دیکھا اور یُوں ناک سکیڑی جیسے انھیں بدبو آ رہی ہو۔ بوڑھا پھر بولنے لگا: "یہ کہتا ہے کہ منگولوں نے اس کی جماعت پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے آدمی مارے گئے مگر اس نے بھی بہت سے منگولوں کو تہ تیغ کر دیا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ تاہم یہ اجنبی ہے اور سلطنتِ بہرام میں کہستانِ منگول سے داخل ہوا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے میان سے تلوار نکالی اور میری طرف لہراتے ہوئے دھاڑا: "قتل کر دو اسے۔"

میں نے تعجب سے بوڑھے سردار کی طرف دیکھا جس نے اتنی آسانی سے میرے قتل کا حکم صادر کر دیا تھا جیسے اُس نے خادم سے پانی مانگا ہو۔ اُس کا حکم سنتے ہی طغرل اور ارغون اپنا اپنا ہلاکت خیز ہتھیار لیے محتاط انداز سے میری طرف بڑھنے لگے۔ میں نے بھی سردار سے نگاہیں ہٹا کر اپنی توجہ اُن پر مرکوز کر دی۔ اُنھوں نے اپنے اپنے ہتھیار پر گرفت تو مضبوط کر لی تھی مگر انھیں حملے کے لیے تولنا شروع نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھے یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ میں مدافعت کا کون سا انداز اپناؤں۔ میں نے پیٹی سے چاقو نکالنا چاہا مگر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اگر مجھے چاقو سے وار کرنے کا موقع مل سکے گا تو میں چاقو کا کام بھی اپنے ہاتھوں سے لوں گا۔ یہ ضروری نہیں کہ مدِمقابل کو جان سے مارا جائے اور اگر دشمن کو مارنا ہی مقصود ہے تو اُسے ہاتھ کی ضرب سے بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔

طغرل اور ارغون قدم قدم چلتے الاؤ کے قریب آ گئے۔ پھر ایک الاؤ کی داہنی اور دُوسرا بائیں جانب جانے لگا۔ اس وقت چاہتا تو دو قدم پیچھے ہٹ کر درختوں کے سائے کا فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ وہ لوگ مجھے نہ دیکھ پاتے مگر میں انھیں باآسانی دیکھ لیتا لیکن میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ دُوسرے یہ موقع بھی ایسا تھا کہ مجھے اُن لوگوں پر دھاک بٹھانا تھی۔ میں جانتا تھا کہ فتح و شکست تو مقدر کا کھیل ہے اور میں اُن کے ہاتھوں مارا بھی جا سکتا ہوں لیکن میں مرنے مارنے کا یہ کھیل مردانہ وار کھیلنا چاہتا تھا۔

طغرل اور ارغون اگرچہ بیک وقت میری طرف اس طرح بڑھ رہے تھے جیسے وہ پہلے بھی ایک ساتھ مِل کر اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں انسانی شکار کھیلتے رہے ہوں لیکن اُن کی حرکات و انداز میں ہم آہنگی نہیں تھی اور یہی ایک بات میرے حق میں تھی ورنہ میں نہتا تھا جبکہ اُن کے پاس کلہاڑا اور گرز تھے۔

جب وہ مجھ سے چند قدم دُور رہ گئے تو طغرل نے کلہاڑا سر سے بلند کر لیا گویا وہ ایک ہی وار سے میرے دو ٹکڑے کر دینے کا آرزومند تھا جبکہ ارغون بڑی تیزی سے گرز گھمانے لگا۔ گرز کے دائرے میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ جو چیز بھی اُس سے ٹکرائے، پاش پاش ہو کر رہ جائے۔ میں نے دیکھا کہ طغرل گرز کے دائرے سے بچتے ہوئے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ پھر اُس نے بھی کلہاڑا گرز کی طرح گھمانا شروع کر دیا اور دو قدم آگے آ گیا۔ اب اگر میں پیچھے ہٹتا تو کلہاڑے کی زد میں آ سکتا تھا اور آگے بڑھتا تو گرز میری کھوپڑی یا ہڈیاں چُور کر سکتا تھا۔ یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک اور ہلاکت آفریں تھی مگر گرز اور کلہاڑے کو باہمی تصادم

سے بچانے کے لیے وہ ایک دُوسرے سے دُور ہو گئے تھے۔ جب وہ میرے اور نزدیک آ گئے تو میں سمجھ گیا کہ اب گردش کرتا ہوا گرز اور کلہاڑا اُوپر نیچے دائرے بنائیں گے تاکہ ایک میرے سر اور دُوسرا میرے سینے کو نشانہ بنا سکے لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتے، میں برق رفتاری سے طغرل کی طرف جھکا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھونچکا سا رہ گیا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ میں اپنے بچاؤ کے لیے پیچھے ہٹوں گا مگر میں خلافِ توقع آگے آ گیا تھا۔ پھر اُس نے یہ اندازہ لگاتے ہوئے کہ میرا سر کہاں ہو گا، وہاں کلہاڑے سے ضرب لگائی لیکن اُس وقت تک میں دوبارہ اُسی برق رفتاری سے پیچھے آ چکا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اپنا داؤ آزمانا تھا۔ جونہی طغرل کا وار خالی گیا، میں نے اُسے کلہاڑا بلند کرنے کا موقع دیے بغیر سیدھے ہاتھ سے اُس کی کلائی پر کراٹے کی ضرب لگائی اور بڑے زور سے اُس کے پیٹ میں گھٹنا مارا مگر مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے میرا گھٹنا سیمنٹ کی بوری سے ٹکرا گیا ہو۔ طغرل یہ ضرب بھی برداشت کر گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اُسے ذرا سا بھی موقع ملا تو وہ میرا کام تمام کر دے گا اس لیے میں نے گھومتے ہوئے بڑے زور سے اُسے لات ماری جو اُس کے مُنہ پر لگنے کی بجائے سینے میں لگی اور وہ اُلٹ گیا۔ اس دوران ارغون جو محض اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے حملہ آور نہیں ہُوا تھا، اب تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں نے اُس پر بھی وہی داؤ آزمایا اور گرز کے دائرے سے نیچے جُھکائی دے کر اُس سے لپٹ گیا۔ شاید ارغون کا ایسی صُورتِ حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ بُری طرح گھبرا گیا اور اُس نے گرز دُوسرے ہاتھ میں لینا چاہا تو میں نے اُس کی کلائی پر ایک زوردار چاپ جڑ دی۔ وہ تلملایا تو ضرور مگر اُس نے گرز ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر اُوپر اُچھالا اور جب وہ گرنے لگا تو میں نے اُسے اپنے گھٹنے پر روکا تاکہ ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگنے سے وہ نڈھال ہو جائے لیکن وہ یہ ضرب برداشت کر گیا۔ اس دوران میں طغرل کو اُٹھنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ کلہاڑا تولے میری طرف لپکا تو میں نے ارغون کو اُٹھا کر اُس پر دے مارا۔ دونوں بُری طرح آپس میں ٹکرائے۔ ارغون کے ہاتھ میں پکڑا ہُوا گرز طغرل کے بازو پر پڑا تو اُس کے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ادھر ارغون بھی کراہے بغیر نہ رہ سکا کہ تصادم نے اُس کی بھی کئی پسلیاں توڑ دی تھیں۔ وہ دونوں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ گرز تو الاؤ میں جا گرا مگر میں نے کلہاڑا اُٹھا لیا۔ اب میرے دونوں دشمن بے بسی سے میرے سامنے پڑے ہُوئے تھے۔ میں اُن کے قریب گیا، کلہاڑا سر سے بلند کیا مگر پھر اُس کے پھل کو زمین میں گاڑ کر اُس پر پاؤں رکھتے ہُوئے پلٹا اور بوڑھے سردار کی طرف دیکھنے لگا۔

بوڑھا سردار اب تک ہاتھ میں شمشیرِ برہنہ لیے کھڑا تھا مگر وہ اور اُس کا بیٹا دونوں حیرت زدہ سے تھے۔ سردار کے ایک جانب اُس کا ایک محافظ توڑے دار بندوق تھامے اشارے کا منتظر تھا۔ اب وہ لڑکی بھی وہاں آ چکی تھی جو مقابلے کے آغاز سے پہلے خیمے میں چلی گئی تھی۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی جھلک رہی تھی۔ باقی ماندہ آدمی بھی تعجب سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی پیٹی میں اُڑسا ہُوا چاقو نکالا، سردار کے سامنے سر کو ہلکا سا خم کیا اور چاقو اس طرح زمین پر رکھ دیا جیسے میں نے مقابلہ جیتنے کے باوجود ہتھیار ڈال دیے ہوں۔

یہ دیکھ کر بوڑھے سردار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے تلوار نیام میں ڈالی اور میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کے بیٹے نے بھی تقلید کی اور جب وہ میرے قریب آ گئے تو سردار نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ تھاما تو وہ بولا: "میرے دوست ... مگر نہیں، ابھی میں تمھیں دوست نہیں کہہ سکتا اور اُس وقت تک نہیں کہہ سکتا جب تک کہ شہنشاہِ دوراں ایسا کہنے کی اجازت نہ دے دیں۔ تم اجنبی ہو اور قوانینِ سلطنت کسی اجنبی کو دوست سمجھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ تاہم اتنا مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم منگول نہیں ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم واقعی بہادر ہو اور تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ سچ ہی ہو گا۔ میں کلدانی جاگیر کا سردار نوروز ہوں اور میرے بیٹے کا نام مہروز ہے۔ باقی سب میرے ملازم ہیں۔ تمھاری دلیری نے مجھے تم کو خوش آمدید کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ خوش آمدید سرفروش۔"



کچھ دیر بعد میں ایک خیمے کے دروازے پر بیٹھا گرم گرم قہوہ پی رہا تھا۔ اب میرے جسم پر چیتھڑوں کی بجائے اُونی فرغل اور گھیر دار شلوار تھی۔ یہ لباس ارغون یا طغرل کا تھا اور اب اُن کے لیے بیکار تھا کیونکہ دونوں اُسے استعمال کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ایک کا بازو ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا اور دُوسرے کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اس لیے دونوں پٹیاں باندھے اپنے خیمے میں پڑے تھے۔

جونہی میرا پیالہ ختم ہُوا، میں نے اُسے اُس لڑکی کی طرف بڑھا دیا اور ایک بار پھر اُسے غور سے دیکھا۔ بڑی بڑی غزالی آنکھوں اور تیکھے نقوش والی وہ لڑکی سحر انگیز کشش رکھتی تھی۔ اُس نے جلدی سے میرا پیالہ بھر دیا جبکہ سردار نوروز بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ اس وقت تمھارے لیے بہتر لباس فراہم نہیں

کیا جا سکا لیکن مجھے اُمید ہے کہ اعلا حضرت شاہِ ضرغام سے ملاقات سے پہلے ہم عمدہ لباس کا بندوبست کر لیں گے۔"

"یہ تو بتائیے سردار کہ آپ لوگ منگولوں سے اس قدر شدید نفرت کیوں کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لٹیرے ہیں۔" مہروز نے جواب دیا۔ "جو سلوک انھوں نے تمھارے ساتھ کیے ہیں، وہی ہمارے سپاہیوں اور سرحد پر واقع بستیوں اور شہروں کے لوگوں کے ساتھ بھی کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنتِ بہرام کے لوگوں نے سرحدوں کے قریب رہائش ترک کر دی ہے۔ یہ لٹیرے کبھی شب خون مارتے اور کبھی گھات لگا کر مردوں کو قتل کر دیتے اور عورتوں کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔"

"شہنشاہ ضرغام نے ان کے انسداد کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"شہنشاہ نے ان شہروں اور بستیوں میں نئے لوگ بھیج دیے ہیں اور انھیں حکم دیا ہے کہ وہ لڑ کر منگولوں سے لڑتے ہوئے مر جائیں مگر راہِ فرار اختیار نہ کریں۔ جو لوگ مقابلہ نہیں کرتے اور فرار ہو جاتے ہیں، شہنشاہ انھیں اور اُن کی بیوی بچوں کو قتل کروا دیتا ہے، کبھی کبھی دُوسروں کے لیے انھیں زندہ جلایا جاتا یا خونخوار درندوں کے سامنے چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

"اوہ... تو ہم نے جو سُنا، وہ ٹھیک تھا۔"

"اور تم نے ہمارے شہنشاہ کے بارے میں کیا سُنا ہے؟"

"یہی کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کے لیے اس قسم کے احکام جاری کرتا رہتا ہے۔"

"ہاں، منگول اگر برابر کی تعداد میں ہوں تو ہمارے سامنے نہیں ٹک سکتے لیکن وہ اچانک اور بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ چونکہ ہمارے فوجیوں کو فرار ہونے کے بعد مرنا ہی پڑتا ہے، اس لیے وہ آخر دم تک منگولوں کا مقابلہ کرتے ہوئے تہِ تیغ ہو جاتے ہیں۔ شہنشاہ کے اس حکم کے نتیجے میں ہمارے لشکر کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے جبکہ منگولوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"اب سمجھ میں آیا کہ منگولوں کے خلاف شدید نفرت کا باعث کیا ہے۔" میں نے سردار کو جواب دیا اور دل میں شاہ ضرغام پر بھی نفریں کیے بغیر نہ رہ سکا جو اپنے عوام اور سپاہیوں کی جانوں سے کھیل رہا تھا۔ کوئی ذی ہوش حاکم اس قسم کے احکامات جاری نہیں کر سکتا۔

"ہم تمھیں اس لیے منگول سمجھ رہے تھے کہ تم اُن کے علاقے سے آئے تھے۔" مہروز بولا۔ "ورنہ منگولوں میں تم جیسے قدآور لوگ نہیں ہوتے۔ مسلسل گھڑسواری کے باعث نوے فی صد منگولوں کی ٹانگیں کمانوں کی طرح خمیدہ ہوتی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

"اور وہ تمھاری طرح لڑنا جانتے ہیں، نہ انھیں اپنے دشمن پر رحم آتا ہے۔ تم چاہتے تو طغرل اور ارغون کے سر بھٹے کی طرح اُڑا دیتے مگر تم نے انھیں معاف کر دیا۔" اس نے مزید کہا۔

"ہاں۔ انھوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی مگر وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے تو میں انھیں خواہ مخواہ زندگی سے محروم کیوں کرتا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ بے چارہ ارغون ایک بازو سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے۔ کاش میں اُس کی کوئی مدد کر سکتا۔"

"تم... تم اُس کی مدد کرنے کے متمنی ہو؟" سردار نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں سردار۔ اس حال میں پہنچنے میں اس کا ذاتی قصور نہیں ہے۔ میں یہاں ایک بے مایہ اجنبی ہوں اور نہیں جانتا کہ اس سرزمین پر کیسے اور کب تک رہ سکوں گا۔ ورنہ میں ارغون کو اپنے عملے میں رکھ لیتا، وہ ایک ہاتھ سے بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"کیا تمھارے وطن میں نوکروں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟" مہروز نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا اور سوچا کہ یہاں غالباً اُن غلاموں کو قتل کر دیا جاتا ہوگا جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

"ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ سلطنتِ جزائر میں غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔" سردار نوروز نے بتایا۔ "بہرصورت میں کوشش کروں گا کہ ارغون کو جان سے نہ مارا جائے اور اُسے کسی ایسے کام پر لگا دیا جائے جسے وہ آسانی سے کر سکے۔ تمھارے لیے ایک خیمہ خالی کر دیا گیا ہے۔ تم ہمارے ساتھ کھا پی تو سکتے ہو مگر قانون تمھیں ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔" یہ کہہ کر وہ باپ بیٹا اُٹھے اور اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔

●●

میں اپنے خیمے میں سمور دار کھالوں کے بستر پر سو رہا تھا کہ ایک ہلکی سی آہٹ نے مجھے جگا دیا۔ یہ آہٹ خیمے کے دروازے کا تسمہ کھولنے کی کوشش میں ہوئی تھی۔ کوئی باہر سے ہاتھ ڈال کر تسمہ کھولنے میں مصروف تھا۔ اگرچہ باہر پہرے دار موجود تھے لیکن خیمے میں آنے کی کوشش کرنے والے کو کسی نے نہیں روکا تھا۔ اس کا تو یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ کوئی سردار نوروز کے ایما پر مجھے ختم کرنے کی نیت سے آنا چاہتا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا اور سوچا کہ کاش اس وقت میرے پاس چاقو سے بہتر ہتھیار ہوتا۔ عین اُس وقت تسمہ کھل گیا، دروازے کا پردہ ہٹا اور کوئی بڑی احتیاط سے اندر آنے لگا۔ میں نے چاقو تولا اور اس پر پھینکنے ہی والا تھا کہ ہاتھ روک لیا۔ خیمے میں داخل

ہونے والی وہی رقاصہ تھی مگر اُس کی آمد کا یہ انداز بھی مشکوک تھا اس لیے میں آہستہ سے اُٹھ بیٹھا۔ رقاصہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی میرے قریب آئی تو دروازے کے پھڑپھڑاتے ہوئے پردے سے الاؤ کی روشنی کے جھماکے میں مجھے بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"اوہ شہزادے!" وہ بولی۔ "کیا آپ میرے خیر مقدم کو جاگ رہے ہیں؟"

"جاگ تو رہا ہوں لیکن تمھارے خیر مقدم کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمھاری آمد، مہمان نوازی کا ایک حصہ ہے یا کچھ اور؟"

"سردار نوروز نے مجھے مہمان نوازی کے لیے بھیجا ہے لیکن میرے آنے کا ایک اور مقصد بھی ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں لیکن اس بات کا علم سردار نوروز کو نہیں ہونا چاہیے ورنہ مجھے سخت سزا بھگتنا پڑے گی۔"

"تو پھر تمھیں یہ بات مجھے نہیں بتانا چاہیے تھی۔"

"نہیں شہزادے۔ یہ بتانا ضروری ہے۔ آپ اس سرزمین پر اجنبی ہیں اور ہر وہ اجنبی جو یہاں آتا ہے اسے جلد یا بدیر موت سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ قانون کے مطابق کسی اجنبی کا کوئی دوست نہیں ہونا چاہیے لیکن اس وقت یہاں آپ کے دو دوست موجود ہیں اور ان کا آپ کو علم ہونا چاہیے۔ شاید اس طرح آپ کی جان بچ جائے۔"

"میرے وہ دوست کون ہیں؟ کیا سردار اور اس کا بیٹا؟"

"نہیں۔ ایک دوست تو میں ہوں۔ فرزانہ میرا نام ہے۔ اپنی نانی کی نانی اور ماں کی ماں کی طرح میں کلدانی سرداروں کی کنیز ہوں اور آپ کا دُوسرا دوست ارغون ہے۔ ارغون دراصل میرا سوتیلا بھائی ہے۔ میرے باپ نے ایک آزاد عورت سے شادی کی تھی اور وہ اُس کے بطن سے ہے۔ وہ غلام نہیں لیکن اگر یہ بات کسی کو معلوم ہو گئی کہ وہ کنیز کا بھائی ہے تو اُسے غلام بنا دیا جائے گا اور مجھے اس بات کی کڑی سزا دی جائے گی کہ میں نے اس حقیقت کو اب تک کیوں چھپائے رکھا۔ میں اور ارغون دونوں آپ کے تہِ دل سے شکر گزار ہیں کیونکہ آپ نے اسے جان سے نہیں مارا۔ اب وعدہ کیجیے کہ آپ یہ راز کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارا راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

اتنا سُنتے ہی اُس نے اپنی باہوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔

●

صبح جب میری آنکھ کھلی تو سردار نوروز کے ملازم سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔ میں نے فرزانہ کو جگایا اور جب وہ چلی گئی تو میں بھی اپنے خیمے سے باہر نکل آیا۔ میرے میزبان ناشتے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے مل کر ناشتہ کیا اور اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جنگل کے درمیان سے گزرنے والا یہ کچا راستہ بہت خراب تھا۔ اردگرد کوئی آبادی تھی نہ جانوروں کے لیے چارہ دستیاب ہو سکتا تھا۔ موسمی حالات بھی سال میں چھ ماہ بہت خراب رہتے تھے۔ شہنشاہ ضرغام نے جان بُوجھ کر اس علاقے میں چوکیاں نہیں بنوائی تھیں۔ یہ علاقہ اپنی مشکلات کے باعث بذاتِ خود ایک دفاعی حصار کا کام دیتا تھا۔

ہم مسلسل سفر کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ ارغون کو ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھامنا پڑ رہی ہے اور راستے کی اونچ نیچ سے اُس کے شکستہ بازو میں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگتی ہیں لیکن سفر ناگزیر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قانون کے مطابق ہر سردار کو تین سالوں میں ایک بار شہنشاہ کی خدمت میں حاضری دینا لازمی تھی اور جو سردار ایسا نہیں کرتا تھا، اُسے باغی تصور کرتے ہوئے جان سے مار دیا جاتا تھا چنانچہ سردار نوروز اور مہروز شاہ، شاہ ضرغام کی سلامی کے لیے جا رہے تھے جو آج کل سلطنت کے جنوبی حصے کے ایک قلعے میں فروکش تھا۔ اُنھیں یہ دُشوار گزار راستہ محض اس لیے اختیار کرنا پڑا تھا کہ وہ جلد از جلد شہنشاہ کی خدمت میں حاضری دینا چاہتے تھے اور یہ راستہ نسبتاً مختصر تھا۔ اگر اُنھیں سلامی دینے میں تاخیر ہو جاتی تو بھی وہ سزا کے مستحق ٹھہرتے۔

مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی تھی کہ اس سلطنت میں کون سا جرم ایسا ہے جس پر سزائے موت نہیں دی جاتی۔ بس یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں شاہ ضرغام بلا اجازت مملکت میں داخل ہونے پر مجھے سزائے موت کا مستوجب قرار نہ دے دے لیکن پھر اس خیال سے دل کو دلاسا دے لیا کرتا کہ میں اُن سرداروں کے ساتھ جا رہا ہوں جو سلطنتِ بہرام اور شاہ ضرغام کے وفاداروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

تین روز کے اس سفر میں مجھے بارہا یہ خیال بھی آیا کہ میں گھوڑے سمیت فرار ہو جاؤں لیکن ہر بار یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا کہ جنگل میں کب تک چھپا رہ سکوں گا۔ دوسرے کہستان کے منگول بھی تو شہنشاہ ضرغام سے کم خونخوار نہیں ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں فرزانہ سے مشورہ کیا تو اُس نے کہا۔ "ایسا کبھی نہ کرنا شہزادے، ورنہ آپ کو جاسوس تصور کر لیا جائے گا۔ شاہ ضرغام، سردار مہروز کو یرغمال بنا کر سردار نوروز کو حکم دے گا کہ وہ آپ کو تلاش کر لائے۔ آپ کی تلاش میں ناکام ہونے والا فوجی دستہ، سردار نوروز اور مہروز قتل کر دیے جائیں گے اور اگر انھوں نے آپ کو تلاش کر لیا تو بھی آپ اور سردار جان سے مار دیے جائیں گے۔" اتنا کہہ کر اُسے جھرجھری آ گئی۔ "آپ اُس موت کا تصور بھی نہیں کر سکتے شہزادے... پہلے آپ کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائی پھیر دی جائے گی، پھر آپ کے جسم پر شہد لگا کر چیونٹیوں کے بل کے پاس ایک کھمبے سے باندھ دیا جائے گا۔"

یہ سُن کر مجھے بھی جُھرجُھری آگئی۔

●

چوتھے روز ہم جنگل سے نکل کر میدانی علاقے میں سفر کرنے لگے۔ اب ہمارا رُخ قدرے شمال کی طرف تھا۔ اس وقت شاہ ضرغام جس قلعے میں قیام پذیر تھا، وہ بحرِ سیمیں کے ساحل پر واقع تھا اور بحرِ سیمیں مشرق کی جانب ایک ہزار میل تک پھیلا ہُوا تھا۔

میدانی علاقے میں ہمیں متعدد آبادیاں اور شہر دکھائی دیے جس شہر میں فوجی چھاؤنی ہوتی اُس کے گرد فصیل پر چھوٹی بڑی توپیں اور پہرے دار دکھائی دیتے تھے لیکن جہاں جہاں فوجی چھاؤنیاں نہیں تھیں وہاں کی فصیلیں خستہ اور ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ فرناز نے بتایا کہ ہمارا شہنشاہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ اُسے نہ اپنے فوجی کمان داروں پر بھروسہ ہے نہ سرداروں پر۔ عوام کو تو ہتھیار رکھنے کی اجازت ہی نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ چاقو رکھ سکتے ہیں۔ اس پر مَیں نے پُوچھا: کیا لوہاروں پر بھی اس قسم کی پابندی عائد ہے؟

"سارے لوہار حکومت کے ملازم ہیں۔ وہ کسی کو ہتھیار فراہم نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی لوہار اس جُرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اُس کے مُنہ میں پگھلا ہُوا سیسہ ڈال دیا جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ شہر اور آبادیاں جہاں فوجی چھاؤنیاں نہیں ہیں منگولوں یا کسی دُوسرے دُشمن سے اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔"

"ہاں۔" وہ دُکھ سے بولی: "لوگوں کو شہروں کی فصیلیں مرمت کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ دو سال پہلے ایک شہر کے لوگوں نے ٹوٹی ہوئی فصیل کی مرمت کی تھی۔ شہنشاہ ضرغام نے شہر کے سربرآوردہ لوگوں پر تشدد کر کے زبردستی یہ اعتراف کرا لیا کہ وہ اُس کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے اور اُن کا یہ اعتراف اُن کی موت بن گیا۔"

"اور اس شہر کے باقی لوگ چُپ چاپ یہ ظلم برداشت کر گئے؟"

"وہ بھی شہنشاہ کی عقابی فوج کی غارت گری کا نشانہ بن گئے۔ عقابی فوج مظالم اور خوں ریزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اُس نے عوام کو قتل کیا، اُن کے گھروں کو آگ لگا دی اور اُن کے اندوختے لُوٹ لیے۔"

یہ تفصیل جان کر مَیں اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکا کہ شاہ ضرغام ایک جنُونی قسم کا خونخوار اور ظالم ترین آدمی ہے۔ اُسے تو یہ چاہیے تھا کہ وہ سرحدی علاقے کے لوگوں کو خود ہتھیار فراہم کرتا تاکہ وہ منگولوں کے خلاف مدافعت کر سکیں۔ اس کے برعکس اُس نے عوام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے لیے خصُوصی عقابی فوج تیار کر رکھی تھی اور اب مجھے اسی ظالم جنُونی کے سامنے پیش کیا جانا تھا۔

●

چھٹے روز ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

یہ کوئی شہر نہیں بلکہ ایک فوجی کیمپ تھا۔ چمنیوں سے بلند ہوتا گاڑھا دُھواں یہ بتا رہا تھا کہ وہاں ہتھیار ڈھالے جا رہے ہیں۔ دیوار کے باہر بڑی بڑی توپیں رکھی ہوئی تھیں بغیر پہیوں کے اُنھیں تختوں پر رکھ کر گھسیٹا جاتا ہوگا اور یہ صورتِ حال فوجی کارروائی کو سُست کر دیتی ہوگی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ ضرغام اُن سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کی بجائے اُن کی نمائش سے خوش ہوتا ہے۔

ہم کہیں رُکے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اتنے میں ایک فوجی دستے نے ہمارے دائیں بائیں چلنا شروع کر دیا۔ تقریباً سارے فوجی قدآور اور مضبوط و توانا تھے۔ اُن کے چہروں سے برستی ہوئی خشونت اس بات کی مظہر تھی کہ وہ عقابی فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیمپ سے گزرنے کے بعد ہم تقریباً ایک گھنٹہ سفر کرتے رہے۔ اب ہمارے سامنے سرسبز پہاڑیاں تھیں اور اُن کے دامن میں بڑے بڑے سفید مکانات بنے ہُوئے تھے۔ ہر مکان کا اپنا ایک باغیچہ تھا۔ جگہ جگہ مصنوعی جھیلیں بنی ہُوئی تھیں جن کے اردگرد خوشنما پھُول لگے ہُوئے تھے۔ ان پھُولوں کی وجہ سے فضا میں خوشبُو بکھری ہوئی تھی۔ کچھ اور آگے بڑھے تو ایک پہاڑی پر سُرخ پتھروں کا ایک اہرام بنا ہُوا تھا۔ اس اہرام کی چوٹی پر ایک چوبی محل تعمیر کیا گیا تھا اور محل کی چھت پر بہت سے نیزے گڑے ہُوئے تھے جن پر لاتعداد انسانی سر آویزاں تھے۔ ان میں سے کچھ سر تازہ کٹے ہُوئے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ کو چیل کوؤں نے آدھا نوچ لیا تھا اور باقی ہڈیوں میں بدل چکے تھے جن کے کھُلے ہُوئے جبڑے اور آنکھوں کے گڑھے بڑے ہیبت ناک نظر آتے تھے۔

وہ راستہ جس پر ہم جا رہے تھے، ہمیں اُسی پہاڑی پر لے گیا۔ جب ہم اُوپر پہنچے تو پتہ چلا کہ چوٹی پر بنی ہوئی عمارت اچھا خاصا قلعہ ہے۔ اس کے چاروں طرف مضبوط فصیل تھی جس میں بارہ بُرج بنے ہُوئے تھے۔ فصیل کے درمیان بنی ہُوئی عمارت چوکور تھی اور اُس کے چاروں کونوں پر فصیل کے بُرجوں سے بھی زیادہ اُونچے بُرج تعمیر کیے گئے تھے۔ مَیں ابھی پُورے ماحول کا جائزہ بھی لے نہیں پایا تھا کہ سردار نوروز نے آہستہ سے مجھے کہا: "ہم فصیل کے صدر دروازے پر گھوڑوں سے اُتر کر داروغۂ محل کے پاس جائیں گے، اپنے ہتھیار اُس کے حوالے کریں گے، پھر نہا دھو کر اور عمدہ لباس پہن کر باریابی کے منتظر رہیں گے کہ شاہِ شاہاں کب ہمیں قصرِ خونیں میں طلب فرماتے ہیں۔"

"قصرِ خونیں؟"

"ہاں۔ شہنشاہ نے اپنے محلات کے نام ایسے ہی رکھے ہیں خانۂ

مرگ، خانۂ شمشیر و سنان، پنجۂ عقاب، چاہِ عذاب وغیرہ وغیرہ۔۔ قصرِ خونیں سلطنتِ بہرام کا مضبوط ترین قلعہ ہے۔ پانچ ہزار غلاموں نے دس سال تک شب و روز اس کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ تین سال پہلے مکمل ہُوا اور شہنشاہ کا کہنا ہے کہ پچاس ہزار کا لشکر بھی اسے تسخیر نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔ یہ بات مَیں نے سلطنتِ آریانہ میں بھی سُنی تھی اور یہ بات صداقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔"

جب ہم داروغۂ محل "جسے قلعہ دار کہنا چاہیے" پہنچے تو اُس نے میری طرف بڑی چبھتی ہُوئی نگاہوں سے دیکھا۔ سردار نوروز نے اسے بتایا کہ مَیں سلطنتِ آریانہ کا شہزادہ ہُوں اور وہ مجھے شہنشاہ ضرغام کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا ہے۔

"میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس آدمی کو سردار نوروز لایا ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، اس کا فیصلہ شہنشاہ عالم پناہ ہی فرما سکتے ہیں لیکن اگر یہ شہزادہ ہے تو اسے شایانِ شان لباس میں اعلیٰ حضرت کے سامنے جانا چاہیے۔" قلعہ دار بولا۔

چنانچہ نہانے دھونے اور میرے لیے "شایانِ شان" لباس فراہم کرنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ مَیں نے اپنی پیٹی اور چاقو ارغون کے حوالے کر دیا تاکہ میرے اور اس کے درمیان اعتماد کی فضا قائم ہو سکے۔ پھر نئے لباس میں سردار نوروز اور مہروز کے ساتھ شہنشاہ ضرغام کی خدمت میں حاضر ہونے چل دیا۔

اہرام کی سیڑھیاں کافی اُونچی تھیں۔ اس لیے اُنھیں عبُور کرتے وقت خاصی دقت ہو رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاہ ضرغام نے جان بُوجھ کر ایسی سیڑھیاں بنوائی تھیں تاکہ جب کوئی اُس کے حضُور پیش ہو تو اُس میں اتنا دم ہی نہ رہے کہ وہ کوئی غلط حرکت کر سکے۔

اندرونی عمارت کی دیواروں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر توپیں رکھی ہوئی تھیں اور چھت سے بھی اُن کی نالیں جھانکتی نظر آرہی تھیں۔ ایک بُرج کے دروازے پر پہنچ کر سردار نوروز نے دل بیچ لٹکنے والی طلائی زنجیر کھینچی تو اندر کہیں بہت دُور گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھُلا تو مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازے کے سامنے کوئی راستہ نہیں بلکہ ایک سنگی دیوار تھی البتہ اس دیوار کے قدموں میں ایک چوکور موکھا سا بنا ہُوا تھا جس سے نیچے جانے والی سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں ہمیں ایک سُرنگ کے دہانے پر لے آئیں جو خاصی طویل تھی اور بتدریج اُوپر جا رہی تھی۔ سُرنگ کے دُوسرے سرے پر مجھے ایک قندیل یُوں ٹمٹماتی نظر آئی جیسے بہت دُور جگنو چمک رہا ہو۔

کافی دیر بعد جب ہم وہاں پہنچے، جہاں قندیل جل رہی تھی تو ہمارے پیچھے دروازہ بند ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی قندیل بھی بُجھ گئی۔ خُدا جانے یہ اتفاق تھا یا کوئی حفاظتی اقدام۔ سردار نوروز بولا: "میرا فرغل پکڑ لو اور چُپ چاپ چلے آؤ۔"

مَیں نے سردار کا فرغل تھام لیا اور وہ دیوار ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا۔ اب ہم پھر ایک سُرنگ سے گزر رہے تھے۔ یہ سُرنگ بھُول بھُلیاں قسم کی تھی۔ یہ سُرنگ ہمیں ایک چوکور کمرے تک لے آئی۔ یہ کمرہ بے حد وسیع و عریض تھا اور اس کی چھت کے گنبد سے روشنی کا ایک دھارا سا پھُوٹ رہا تھا۔ یہ دھارا آئینوں کے انعکاس کا نتیجہ تھا جنھیں ایسے زاویوں سے نصب کیا گیا تھا کہ غروبِ آفتاب تک وہ اُس کی کرنوں کو اس وسیع کمرے میں منتقل کر سکیں۔ کمرے کا فرش سُرخ اینٹوں سے بنا ہُوا تھا لیکن دیواریں سنگِ سفید کی تھیں۔ کمرے کے عین وسط میں سنگِ سیاہ کا ایک تخت بچھا ہُوا تھا اور اس تخت پر بہت چوڑے شانوں والا ایک آدمی اس طرح بے حس و بے حرکت بیٹھا تھا جیسے وہ انسان نہیں مجسمہ ہو۔ اُس کا سر مُنڈا ہُوا تھا مگر بیچوں بیچ گائے کی دُم جیسی ایک چوٹی اُوپر کو اُٹھی ہُوئی تھی۔ مَیں نے سوالیہ نگاہوں سے سردار نوروز کی طرف دیکھا تو اُس نے سر کی خفیف جنبش سے اثبات میں اشارہ کر دیا جس کا یہ مطلب تھا کہ ہاں۔ وہی شہنشاہ ضرغام ہے۔ پھر وہ نگاہیں جھُکا کر تخت کی طرف بڑھ گیا۔ مَیں اور سردار مہروز اُس کے پیچھے پیچھے تھے۔

ضرغام کے دائیں پہلُو میں مرصّع نیام والی ایک خمدار تلوار رکھی ہُوئی تھی اور بائیں جانب پھینکنے والے تین عدد چھوٹے بھالے۔ اُس کی پیٹی میں تین عدد خنجر بھی اُڑسے ہُوئے تھے۔ وہ چشم زدن میں بادشاہ سے جنگجو فرد بن سکتا تھا۔ اس کمرے کے چاروں کونوں میں عقابی فوج کے چار چار جوان بھی سنگی مجسّموں کی طرح بے حس اور بے حرکت کھڑے تھے۔ اُن میں سے تین تین جوان تو تلواروں اور خنجروں سے مسلح تھے جبکہ چوتھا تیر انداز تھا۔

تخت سے تقریباً دس قدم دُور سردار نوروز اور مہروز فرش پر مُنہ کے بل تقریباً لیٹ گئے اور فرش پر آہستہ آہستہ مُکے مارنے لگے۔ مَیں نے بھی اُن کی تقلید کی کہ شاہ ضرغام کو کورنش بجا لانے کا یہی طریقہ تھا۔

"یہ احمق کون ہے جس نے ہمارے سامنے سرنگوں ہونے میں تاخیر کر دی؟" ضرغام میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے گرجا: "اور تم نے اسے ہمارے حضُور لانے کی حماقت کیوں کی سردار نوروز؟"

سردار نوروز شاہ ضرغام کی بات پر لرزنے لگا اور بولا "یہ اجنبی ہے عالی جاہ جب ہم جنگل سے گزر رہے تھے، یہ ہم سے ملا اور اس نے بتایا کہ سلطنت آریانہ کا شہزادہ ہے جو کہستانِ منگول کے اُس پار کہیں واقع ہے۔"

"ہم نے آج تک کسی ایسی سلطنت کا نام نہیں سُنا۔"

"آپ کا ارشاد بجا ہے عالم پناہ۔ بندہ تو صرف اس اجنبی کے الفاظ دُہرا رہا ہے۔ کیا غلام اپنا بیان جاری رکھے عالی جاہ؟"

"ہاں۔ ما بدولت جاننا چاہتے ہیں کہ کلدانی سردار ایسے اجنبی کو کیوں لیے پھرتا ہے جو ہمیں دُنیا کا سب سے بڑا دروغ گو معلوم ہوتا ہے۔"

مجھے ضرغام کے ان الفاظ سے صاف اندازہ ہوگیا کہ اُس نے مجھے پسند نہیں کیا اور اُس کی ناپسندیدگی کسی بھی فرد کے لیے موت کا پیغام ہوتی تھی۔ وہ مجھے خونریزی نہیں نیم دیوانہ بھی معلوم ہُوا جو ایک جنبشِ ابرو سے ہم تینوں کو دیں جان سے مروا سکتا تھا۔

سردار نوروز نے اپنی تمام تر ہمت سمیٹ کر اُسے وہ رُوداد سُنا دی جو مَیں نے بیان کی تھی اور جو کچھ پہلی ملاقات میں ہُوا تھا وہ بھی بیان کر دیا۔ شاہ ضرغام کچھ نہ بولا اور خاموش بیٹھا ہمیں خونخوار نگاہوں سے گھُورتا رہا۔ پھر اُس نے اچانک تالی بجائی اور اس گمبھیر خاموشی میں تالی کی آواز کسی توپ کے گولے کی مانند گونج اُٹھی۔ تالی کی آواز سُنتے ہی عقابی فوج کے آٹھ جوان ہمارے دائیں بائیں آ گئے۔ شاہ ضرغام بھی اپنی تلوار میان سے نکال کر اس سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے گرجا۔

"یہ اجنبی اپنے آپ کو شہزادہ کہتا اور بتاتا ہے کہ یہ ہمارے طور طریقے سیکھنے آیا ہے۔ یہ جھُوٹ ہے۔ ہم نے کبھی سلطنتِ آریانہ کا نام نہیں سُنا۔ اس لیے یہ شہزادہ نہیں ہو سکتا۔ پرخچے اُڑا دو اس کے۔"

سپاہیوں نے اپنی تلواریں نیام سے نکال لیں۔ عین اُس وقت سردار نوروز گھُٹنوں کے بل بیٹھتے اور بھیک کے انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہُوئے بولا "رحم۔ عالی جاہ رحم۔"

شاہ ضرغام اسے تُند نگاہوں سے گھُورتا رہا۔ سپاہیوں نے تلواریں سر سے بلند کر لیں۔ تیر اندازوں نے تیر چلّے پر چڑھا لیے۔ وہ اشارے کے منتظر تھے کہ ضرغام نے تین بار اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا "ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے اس اجنبی کے لیے رحم کی درخواست کیوں کی؟"

"ممکن ہے یہ اجنبی جھُوٹ بولتا ہو عالم پناہ لیکن ہمارے ساتھ دورانِ سفر اس نے آئینِ سلطنت کی خلاف ورزی کی ہے نہ حضور کی شان میں کوئی غلط بات کی ورنہ اُسی وقت اس کی گردن مار دی جاتی۔ یہ چاہتا تو میرے دو جنگجو جوانوں کو قتل کر سکتا تھا مگر اُس نے اُن کی جاں بخشی کی اور اب وہ منگولوں کے خلاف لڑ کر قوم و وطن کی خدمت کر سکتے ہیں۔"

"کیا اس نے انھیں شکست دینے کے بعد اُن کی جاں بخشی کر دی تھی؟"

"جی ہاں جہاں پناہ۔"

"پھر تو یہ شخص نِرا احمق ہے۔ اگر سلطنتِ آریانہ کا کوئی وجود ہے تو وہاں کے شہزادے پاگل ہیں اور جب یہ شخص پاگل ہے تو ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیا یہ واقعی بہادر جنگجو ہے؟"

"مَیں نے ایسا دلیر جنگجو اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا عالم پناہ۔"

"ہم تمھاری بات پر یقین فرماتے ہُوئے اسے اپنی بحریہ کے ملاحوں میں شامل کیے لیتے ہیں۔ اسے بحرِ سیمیں پر ہمارے بحریے میں بھیج دیا جائے اور اگر یہ پاگل وہاں اپنے آپ کو شہزادہ سرفروش کہلوانا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

یہ سُنتے ہی چار سپاہیوں نے مجھے گھیر لیا اور باہر لے جانے لگے۔ مَیں نے جاتے جاتے سُنا۔ ضرغام سردار نوروز سے کہہ رہا تھا "تم نے ہمارے سامنے جرأت سے کام لیتے ہُوئے جس طرح اس پاگل کی وکالت کی ہے وہ ہمیں ناگوار گزری ہے۔ اس لیے ہم تمھیں تھوڑی سی سزا دینے پر مجبور ہیں۔ دس روز کے اندر اندر کلدانی قبیلے کے پچاس جنگجو، پچاس غلام اور پچاس کنیزیں ہمارے پاس بھجوا دی جائیں۔ پانچ سال بعد ان سب کو واپس بھیج دیا جائے گا۔"

شاہ ضرغام کے اس احمقانہ حکم پر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نیم دیوانہ ہے اور اُسے سلطنتِ بہرام کی رعایا پر مزید ظلم و ستم کا موقع نہیں ملنا چاہیے لیکن مَیں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مَیں اپنی جان پر کھیل کر اسے ختم بھی کر دیتا تو اس کا عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ منگول اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر سلطنت پر قابض ہو جاتے اور رعایا کے ساتھ ضرغام سے بھی زیادہ بُرا سلوک کرتے۔ اس لیے مَیں نے ضرغام کے خلاف ساری سوچیں اس وقت تک ملتوی کر دیں جب تک کہ اُس سے بہتر وارثِ تخت و تاج نہ مل جائے۔

میں اس سے پہلے بھی کئی بار غلام بنایا جا چکا تھا اور اب تک زندہ تھا اس لیے مَیں نے سوچا کہ اب کے بھی مجھے اپنے آپ کو اچھا غلام ثابت کرنا چاہیے اور اس موقعے کا منتظر رہنا چاہیے جب اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اور عملی اقدام کیا جا سکے۔

●●

اس رات مجھے قصرِ خونیں کے باہر ایک تنگ و تاریک زنداں میں

بس کر دیا گیا۔ صبح معمول سے ناشتے کے بعد عقابی فوج کے چار سپاہی زنجیریں اور بیڑیاں لیے وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے میرے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں زنجیر ڈال کر مجھے اُس زنداں سے باہر نکالا اور ایک ایسی جگہ لے آئے جہاں پہلے سے قیدیوں کی ایک قطار موجود تھی۔ مَیں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے ایک دیوار پر افُون کنزاد کھائی دیے وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا مگر ہم نے ایک دُوسرے کو کوئی اشارہ نہ کیا کہ وہ ہم دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

ہم زنجیروں میں جکڑے دن بھر دھوپ اور دھول میں سفر کرتے رہے۔ دو مرد اور ایک عورت چلتے چلتے گر پڑی۔ سپاہیوں نے انھیں زنجیروں سے آزاد کیا۔ سڑک کے کنارے لے گئے اور اُن کے سر تن سے جُدا کر دیے۔ مجھے اُن کے قتل پر حیرت نہ ہُوئی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ قتل کرنے سے پہلے کوئی اذیت نہ دی گئی۔ شاید اذیت رسانی کے مرض میں صرف شاہ ضرغام ہی مُبتلا تھا۔ اس صورتِ حال میں اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو تو مَیں اذیت کے عذاب سے بچ سکتا تھا۔

غروبِ آفتاب کے بعد ہمیں رُوکھا سوکھا کھانا اور پانی دیا گیا پھر زنجیروں میں جکڑے ہُوئے ایک کھُلی جگہ گھاس پر سُلا دیا گیا تا کہ اگلے دن سفر جاری رکھ سکیں۔ دُوسری صبح گارڈز کی نئی ٹولی آ گئی جو اپنے ساتھ مزید چار قیدی بھی لے آئی۔

ہم دس روز تک تقریباً بیس میل فاصلہ یومیہ طے کرتے رہے۔ دو تین قیدی تھکن کے مارے گر پڑتے اور قتل کر دیے جاتے تھے۔ میرے لیے بیس میل چلنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ گیارھویں دن ہم سمندر کے کنارے جا پہنچے۔ یہاں ہمیں نہانے کی اجازت دی گئی اور جب ہم نہا چکے تو اُن غلاموں کو ہم سے الگ کر دیا گیا جنھیں منڈی میں فروخت کیا جانا تھا۔ باقی غلاموں کو بندرگاہ گومانی پر شاہی بحریے میں بھرتی کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہاں ضروری کارروائی اور اندراجات کے بعد ہماری زنجیریں اور بیڑیاں کھول دی گئیں اور ہمیں غلاموں کی ایک بڑی بیرک میں جگہ دے دی گئی۔

اس بیرک میں ایسے غلام بھی رہتے تھے جنھیں شاہی بحریے میں کام کرتے ہُوئے سالہا سال گزر گئے تھے۔ وہ نئے غلاموں کے سوالوں کا جواب نہیں دیتے تھے اور بعض اوقات سوال کنندہ پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے اس لیے مَیں نے اپنی زبان بند اور کان کھُلے رکھے اور جتنی بھی معلومات اس طرح حاصل ہو سکتی تھیں حاصل کرتا رہا۔ ان معلومات کے مطابق بندرگاہ گومانی بحرِ سیمیں کے کنارے پر واقع تھی اور شمال میں بحرِ یاقوت تھا۔ ان دونوں سمندروں کو آپس میں ملاتی تھی جسے خلیج الجزائر کہتے تھے۔ بحرِ سیمیں کے مشرق میں پانچ چھوٹی چھوٹی مملکتیں قائم تھیں جنھیں املاکِ خمسہ کے نام سے پُکارا جاتا تھا۔ یہ سب مل کر مملکتِ بہرام کے نصف کے برابر بھی نہیں تھیں۔

مجھے یہ بھی معلوم ہُوا کہ سو سال پہلے ضرغام کے جدِ امجد نے سلطنتِ بہرام کے حکمرانوں سے حکومت چھین کر انھیں اماراتِ خمسہ کی طرف فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُن دنوں اُس کی بحریہ موجودہ بحریے سے پانچ گنا بڑی تھی اور بندرگاہ گومانی کی یہ بیرکیں اُسی زمانے میں تعمیر ہوئی تھیں۔

خلیج الجزائر پر بحری قزاق قابض تھے۔ وہ کبھی بحرِ سیمیں میں سے گزرنے والے جہازوں کو لُوٹ لیا کرتے تھے اور کبھی بحرِ یاقوت کے جہازوں کو۔ شاہ ضرغام محض ان قزاقوں کی وجہ سے بحریہ کو وسعت دینے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ وہ منگولوں کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے اپنی سپاہ کو ساحل کی نگرانی کے لیے نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس لیے قزاقوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ وہ اچانک آتے اور بحریے کے جہاز لے جاتے تھے۔

اب بندرگاہ گومانی میں نئی جنگی کشتیاں اور جہاز تیار کیے جا رہے تھے اور روزانہ سلطنت کے مختلف حصّوں سے غلام یہاں پہنچ رہے تھے یہ حالات میرے لیے بہت سازگار تھے۔ اگر قزاقوں سے مقابلہ ہو جاتے اور مَیں اُس میں اپنے جوہر دکھا سکوں تو مجھے آزادی مل جانے کا امکان تھا۔

ایک ہفتے بعد ہمیں مختلف جنگی کشتیوں پر تعین کر دیا گیا۔ یہ کشتیاں یک منزلہ تھیں اور انھیں دونوں جانب سے پچاس پچاس غلام کھینچتے تھے۔ ہر کشتی پر بادبانوں کے لیے دو دو مستول بھی نصب تھے۔ اُن کے اگلے حصّوں پر بڑی اور پچھلے حصّوں پر چھوٹی توپیں لگی ہُوئی تھیں۔ کشتیوں کا درمیانی حصّہ پتھر برسانے والی منجنیقوں کے لیے مخصوص تھا۔

غلاموں کے نگران ظالم اور اذیت پسند نہیں تھے لیکن چپو چلاتے وقت بھی غلاموں کو زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر غلام مسلسل حکم عدولی کرتے یا باغی ہو جاتے تو انھیں سمندر میں پھینک دیا جاتا تھا جس میں شارک مچھلیوں کی بہتات تھی۔ مجھے جس کشتی پر متعین کیا گیا اُس کا نام "کہسار" تھا۔ کبھی چند کشتیاں جنگی مشقیں کرتی تھیں اور کبھی پورا بیڑا ان مشقوں میں حصّہ لیا کرتا تھا۔ ان مشقوں کے دوران ایک بار دو کشتیاں اس بُری طرح آپس میں ٹکرائیں کہ ایک تو اپنے ملاحوں سمیت فوراً ڈوب گئی اور دُوسری کو بمشکل بندرگاہ تک لایا جا سکا۔ اُس شب مَیں سوچتا رہا کہ یہ حادثہ "کہسار" کو بھی پیش آ سکتا تھا اور آیندہ آ سکتا ہے کیا میرا جسم بھی شارک مچھلیوں کی غذا بن جائے گا؟ جب ہماری کشتی

کنارے پر آئی تو کسی نے کپتان کو پکارتے ہوئے کہا: "تمہارا مزید عملہ آ گیا ہے کپتان۔ چھ ملاح۔ ایک ترکھان اور ایک مددگار باورچی۔"

میں نے دیکھا ان آنے والوں میں ارغون بھی شامل تھا جس کا ایک بازو بے کار ہو چکا تھا مگر دوسرے کندھے پر ایک کلہاڑا لٹک رہا تھا۔ اُسے باورچی کے مددگار کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس کی آمد اتفاق پر مبنی ہے یا سردار نوروز نے اُسے جان بُوجھ کر یہاں بھجوایا ہے۔ میں نے ایک بار پھر ارغون کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ میری پیٹی اُس نے کمر سے باندھ رکھی تھی اور اُس میں میرا شکاری چاقو اسی طرح اُڑسا ہوا تھا۔ کلہاڑے اور چاقو کی موجودگی اس بات کی مظہر تھی کہ وہ غلام کی نہیں بلکہ ایک آزاد ملازم کی حیثیت سے کام کرے گا کیونکہ غلاموں کو کوئی ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

جب میں کشتی سے اُتر کر جانے لگا... تو ارغون کی طرف دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھا بلکہ چاہا کہ وہ بھی میری طرف نہ دیکھے۔ ہمارا ایک دُوسرے کی طرف دیکھنا یا کوئی اشارہ کرنا ہمیں مشکوک بنا دیتا اور ہم دونوں قابلِ تعزیر گردانے جاتے۔

●●

اب میں اور ارغون ایک ہی کشتی پر کام کر رہے تھے۔ میں اُسے کشتی پر مختلف کام کرتے دیکھتا تھا۔ وہ ایک بازو سے دو آدمیوں کے برابر کام کر سکتا تھا۔

ایک صبح غلاموں کو حکم دیا گیا کہ وہ پُوری کشتی کو اچھی طرح دھوئیں اور جہاں جہاں ضروری ہو، وہاں وہاں رنگ و روغن کریں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ ضرغام بذاتِ خود بحریہ کا معائنہ کرنے کے لیے آنے والا تھا۔

معائنے والے روز ساری کشتیاں اور جہاز بندرگاہ سے ایک میل دُور سمندر میں قطار کی صُورت لنگر انداز ہو گئے۔ یہ قطار تقریباً چار میل طویل تھی۔ ہر آدمی اپنی جگہ چاق و چوبند تھا۔ دوپہر بعد ساحل سے بگل، دو نقارے کی آواز آنے لگی۔ "کہسار" کے ملاح، ان کے نگران اور افسر قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

پھر بگل اور نقاروں کی آواز قریب آنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف کشتیوں سے افسروں کے احکامات گونجنے لگے۔ پھر ہماری کشتی کے کپتان نے بھی پُوری قوت سے چلاتے ہُوئے کہا۔

"کہسار کے غلامو... سر اُٹھاؤ اور عالم پناہ شہنشاہ ضرغام کا انصاف دیکھو اور اس سے فرماں برداری کا سبق سیکھو!"

یہ حکم سُنتے ہی تین سو غلام اُس جانب دیکھنے لگے جدھر کپتان نے اشارہ کیا تھا۔ ایک بجرا جسے چوبیس ملاح کھے رہے تھے لنگر انداز کشتیوں اور جہازوں کی قطار کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس بجرے کے لال پرچم پر سیاہ عقاب کی تصویر کڑھی ہُوئی تھی اور اس پرچم کے زیرِ سایہ شاہ ضرغام ایک سنگی مجسّمے کی طرح بیٹھا ہُوا تھا۔ شاہی بجرے کے پیچھے چھ کشتیاں آ رہی تھیں۔ یہ سلطنتِ بہرام کے معزز سرداروں کی کشتیاں تھیں جن میں سردار نوروز کی کشتی بھی شامل تھی۔ اتنے میں ایک دلدوز چیخ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ چیخ ایک چھوٹی سی کشتی سے اُبھری تھی جو شاہی بجرے کے پہلو سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس کشتی پر آٹھ نوکدار کھمبے گڑے ہُوئے تھے اور ہر کھمبے کے ساتھ ایک ایک آدمی بندھا ہُوا تھا۔ ان میں سے ایک کا سر کاٹ کر اُس کے قدموں میں رکھ دیا گیا تھا۔ باقی سات زندہ تھے مگر اُن کے چہروں پر موت کی زردی کھنڈی ہُوئی تھی۔ اس کشتی سے اعلان کیا گیا۔

"دیکھنے والی آنکھو ہوشیار۔ شہنشاہ عالم پناہ ضرغام کا انصاف دیکھو اور فرماں برداری کو اپنی فطرت بنا لو!"

اس اعلان کے ساتھ ہی عقابی فوج کے آٹھ سپاہی اپنی تلواریں سونتے دُوسرے کھمبے کے ساتھ بندھے آدمی کی طرف بڑھے اور اُنھوں نے اس آدمی کے مختلف اعضا پر بیک وقت آٹھ چرکے لگا دیے۔ وہ آدمی درد کے مارے تڑپ تو نہیں سکتا تھا مگر چیخ ضرور سکتا تھا اور اُس کی یہ چیخیں جگر خراش تھیں۔ میں نے اس ظلم کے شکار سے اپنی نگاہیں ہٹا لینا چاہیں لیکن وہ بے اختیار اُس مظلوم پر مرکوز ہو گئیں جسے دوبارہ چرکے لگائے جا رہے تھے۔ یہ مظلوم ارغون کا وہی ساتھی طغرل تھا جس نے جنگل میں میرے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔

طغرل شاید اُن آدمیوں میں سے ایک تھا جو شاہ ضرغام نے سردار نوروز سے پانچ سال کے لیے طلب کیے تھے اور "انصاف" اس کھیل میں طغرل کو ضرغام نے بطورِ خاص شامل کروایا ہو گا تاکہ کلدانی سردار کو یہ تاثر دے سکے کہ وہ اُس سے خوش نہیں ہے اور سردار نوروز کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جا سکتا ہے۔

جب طغرل کا سر قلم کیا جانے لگا تو میں نے اپنی نگاہیں [illegible] لیں اور دُوسری جانب دیکھنے لگا۔ کشتی کے ایک سرے پر مستول کے قریب ارغون کندھے پر کلہاڑا رکھے اپنے ساتھی کی طرف ایک ٹک [illegible] جا رہا تھا۔ وہ کسی ستون کی مانند سیدھا کھڑا تھا۔ جب طغرل کی آ[illegible] چیخ فضا میں بلند ہُوئی تو ارغون نے اپنے کندھے سے لٹکتا ہوا [illegible] اُتارا اور اُس کا پھل کشتی کے تختے پر گاڑ دیا۔ اُس کی اس حر[illegible] نگران نے اُسے گھورا تو ارغون نے ٹھنڈی سانس لے کر کلہاڑا [illegible] اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ اس دوران میں شاہ ضرغام کا بجرا اور [illegible] کشتیاں آگے بڑھ چکی تھیں۔ پھر ارغون جونہی جانے کے لیے پلٹا [illegible]

[illegible] کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کے پنجے ایک دُوسرے میں پھنسا کر ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ گویا میں اُسے بتانا چاہتا تھا کہ میں ہر حال [illegible] اُس کا ساتھ دُوں گا۔ وہ یہ اشارہ سمجھ گیا اور سر کی خفیف جنبش سے [illegible] ثبات کا اشارہ کرتے ہُوئے کشتی کے باورچی خانے میں چلا گیا۔

●●

دُوسری دن پچاس کشتیاں سمندر میں نکلیں تو بیس بڑے [illegible] جہاز بھی اُن کے ساتھ تھے۔ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ آج جہاز ہمارے ساتھ [illegible] ہیں مگر جب کشتیاں جنگی مشق کرنے کی بجائے آگے بڑھتی رہیں [illegible] تو پتہ چلا کہ جہازوں پر پانی، خوراک اور گولہ بارود لدا ہُوا ہے جو سمندر [illegible] اور ساحل کے مختلف مقامات پر متعین کشتیوں کو فراہم کیا جائے گا [illegible] وہ زیادہ سے زیادہ دن سمندر میں رہ کر سلطنتِ بہرام کے ساحلوں [illegible] حفاظت کر سکیں اور بحری قزاقوں کو تاخت و تاراج کا موقع نہ مل سکے [illegible] چھوٹی کشتیوں پر بوقتِ ضرورت آٹھ چھوٹی توپیں نصب کی جا [illegible] تھیں جبکہ جہازوں پر تیس سے پچاس توپیں لگی ہوئی تھیں... [illegible] وہ ازیں اُن میں عقابی فوج کے لڑاکا دستے بھی موجود تھے۔ جہازوں [illegible] ہوئی توپیں پانی کی سطح سے بلند ہونے کے باعث صحیح نشانہ لگا [illegible] تھیں اور دُور تک مار سکتی تھیں۔

ہمارا بیڑہ تین روز تک شمال کی طرف سفر کرتا رہا اور سمندر کے کنارے [illegible] پہاڑوں تک جا پہنچا جو سلطنتِ بہرام کی شمالی سرحد کہلاتے تھے۔ [illegible] بیڑا یہاں لنگر انداز ہونے کی بجائے آگے بڑھ گیا اور ایک ایسی سرزمین [illegible] سامنے جا رُکا جو کسی کی ملکیت نہیں تھی اور جس پر گھنے جنگل اُگے [illegible] تھے۔ آگے جا کر یہ جنگل کہستانِ منگول سے مل جاتے تھے۔

[illegible] کشتیوں اور جہازوں کا عملہ ساحل پر اُترنے کے بعد مختلف کاموں [illegible] مصروف ہو گیا۔ کچھ لوگ خالی برتنوں میں نہروں سے میٹھا پانی بھر کر [illegible] لگے۔ کچھ نے مچھلیاں پکڑنے کے جال پھیلا دیے اور کچھ درختوں کے [illegible] کاٹ کر صاف کرنے لگے تاکہ اُنھیں کشتیوں پر لادا جا سکے۔ تین [illegible] بیڑا لنگر اُٹھا کر آگے چل پڑا۔ میری معلومات کے مطابق وہ [illegible] کی طرف بڑھ رہا تھا جو بحری قزاقوں کے زیرِ تسلط تھی لیکن میں [illegible] میں کسی سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا اس لیے دن بھر چپّو [illegible] اور شام کو جب ملاحوں کی دُوسری ٹولی نے چپّو سنبھال لیے تو [illegible] ان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

●●

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہماری کشتی [illegible] آنے والے جہاز غائب ہیں۔ میں نے آنکھیں مل کر اِدھر اُدھر دیکھا [illegible] کہ ہمارے ساتھ صرف چھ کشتیاں ہیں۔ وہ بھی ایک دُوسرے سے بہت دُور۔ یہ صُورتِ حال دیکھ کر بے ساختہ میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے: "ہم راستہ بھُول کر بیڑے سے بچھڑ گئے ہیں۔"

مجھ سے آگے بیٹھا ہُوا دراز ریش ملاح ہنس پڑا اور بولا: "ہم راستہ بھُولے ہیں نہ بیڑے سے بچھڑے ہیں۔"

"تو پھر جہاز اور باقی کشتیاں کہاں ہیں؟"

"وہ امیر البحر اسکندر کے منصوبے کے مطابق گہرے سمندر سے گھُوم کر قزاقوں کے اڈّوں پر حملہ کریں گے۔"

"لیکن ہم تو شاہی بحریہ کے جہازوں اور کشتیوں کو سامانِ رسد فراہم کرنے آئے تھے۔"

"وہ سب ایک ڈھونگ تھا۔ امیر البحر سب کو تحفہ دے کر اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا تھا۔"

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اسکندر نے منصوبہ یہ بنایا تھا کہ جب قزاق جہازوں اور باقی کشتیوں سے برسرِ پیکار ہوں تو وہ ان سات کشتیوں کے ساتھ پیچھے سے اُن کے اڈّوں کو لوٹ لے اور سارا مالِ غنیمت خود ہڑپ کرنے کے ساتھ ساتھ فتح کا سہرا بھی اپنے سر باندھ سکے لیکن یہ کوئی دانشمندانہ منصوبہ نہیں تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ قزاق اپنا ہر فرد جنگ میں جھونک دیں اور اُن کے اڈّوں کا دفاع کرنے والا کوئی نہ ہو۔ قزاق اتنے احمق تو نہیں تھے کہ اُنھوں نے اُن راستوں پر نگہبانی اور دفاع کے لیے کوئی کشتیاں یا جہاز متعین نہ کر رکھے ہوں جن سے اسکندر اُن کے اڈّوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

"اسکندر نے اس منصوبے پر عمل کرنے کی اجازت کیسے لی ہو گی۔" میں نے سوچا۔ شاید وہ ضرغام کا بیٹا یا کوئی قریبی عزیز ہو گا ورنہ ایسے احمقانہ منصوبے پر عمل کرنے کی اجازت اُسے ہرگز نہ مل سکتی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ اس دراز ریش ملاح کو یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہو گئیں؟ اتنا تو مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ گزشتہ بیس سال سے شاہی بحریہ میں کام کر رہا ہے اور شاید اسی بنا پر اُسے منصوبے کا علم ہو گیا ہو گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُسے اعتماد میں لے کر منصوبے سے آگاہ کر دیا گیا ہو۔ بہرکیف حقیقت کچھ بھی ہو، میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ امیر البحر اسکندر ان سات کشتیوں کو موت کے مُنہ میں لیے جا رہا ہے جن میں سے ایک کہسار بھی تھی۔

دن بھر ساتوں کشتیاں مدھم رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں۔ شام کا جھٹپٹا پھیلنے سے پہلے ہمیں دُور سمندر میں وہ جزیرے دکھائی دینے لگے جنھیں اسکندر اپنا ہدف بنانے والا تھا۔ چنانچہ اندھیرا پھیلنے کے بعد کشتیاں ایک چھوٹے سے غیر آباد جزیرے کے کنارے لنگر انداز کر دی گئیں اور ایک گروہ کو یہ دیکھنے کے لیے بھیج دیا گیا کہ وہ اس جزیرے اور اس کے اردگرد سمندر کا جائزہ لے کر قزاقوں کی موجودگی اور انتظامات

کا شرارہ لگنے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد نگہبانوں کے علاوہ سب سو گئے۔ علی الصباح میری آنکھ اُس ملّاح کی چیخ و پکار سے کھل گئی جو مستول پر چڑھا ہُوا تھا اور چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا۔

"قزاق آ گئے۔ وہ سمندر کی طرف سے آ رہے ہیں۔ وہ ہم سب کو مار ڈالیں گے۔ کوئی اُن کے ہاتھوں موت سے نہیں بچ سکتا... بھاگو...!"

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک تیر سنسناتا ہُوا اُس کے سینے میں پیوست ہو گیا اور وہ سر کے بل مستول سے کشتی پر آ گرا۔ یہ تیر ہماری کشتی کے ایک عہدے دار نے چلایا تھا۔ کپتان نے سر ہلا کر اُس کے اس اقدام کی تائید کر دی کہ بزدلوں کو فوری طور پر موت کے گھاٹ اُتار دینا ہی سلطنت بہرام کا آئین تھا۔ مَیں نے کپتان کی طرف دیکھا جو صرف اپنی محنت اور صلاحیتوں کی بنا پر ملّاح سے کپتان کے عہدے تک پہنچا تھا۔ اُس کے چہرے پر تردّد کے تاثرات نمایاں نظر آ رہے تھے۔

مَیں نے سمندر پر نگاہ ڈالی تو مجھے قزاقوں کے سیاہ پرچموں والی کشتیاں تیزی سے آگے بڑھتی نظر آئیں۔ مَیں اُنھیں گننے لگا۔ وہ بیس سے زیادہ تھیں اور ہماری کشتیوں کے گرد نیم دائرے کی صورت بڑھ رہی تھیں۔ ہماری کشتیاں اُن کے نرغے میں آتی جا رہی تھیں۔ ہم جزیرے پر نہیں جا سکتے تھے اور سمندر کی طرف جانے کا مطلب قزاقوں سے بلاواسطہ تصادم تھا۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا تھا کہ ہم مردانہ وار قزاقوں کا مقابلہ کریں اور لڑتے ہوئے مر جائیں۔

قزاقوں کی کشتیاں ہم سے تین گنا زیادہ تھیں۔ وہ ہماری کشتیوں سے ہلکی تھیں اور اُن پر کام کرنے والا ہر فرد مسلح اور آزاد تھا جبکہ ہماری کشتیوں کے ملّاح زنجیروں سے جکڑے ہُوئے تھے اور اُن کو کوئی ہتھیار نہیں دیا گیا تھا چنانچہ قزاق ہماری کشتیوں پر اُترتے ہی قتلِ عام کر سکتے تھے اور زنجیروں سے جکڑے ہُوئے غلام ملّاح اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ مَیں نے یہ بھی سُنا تھا کہ کبھی کبھی قزاق بڑے بڑے عہدے داروں کو یرغمال کی رقم وصول کرنے کے بعد چھوڑ دیتے تھے اور تندرست و توانا ملّاحوں کو خوراک اور دُوسرے سازوسامان کے عوض بیچ دیتے تھے لیکن یہ اُس صورت میں ہوتا تھا جب اُن کا مقابلہ کیے بغیر ہتھیار ڈال دیے جائیں۔

اتنے میں کشتیوں پر نقارے بجنے لگے جو اعلانِ جنگ تھا۔ ساتوں کشتیوں کے لنگر فی الفور اُٹھا دیے گئے اور عہدے دار ملّاحوں کو حکم دینے لگے۔ کہسار کے توے ملّاحوں نے چپّو سنبھال لیے اور وہ قزاقوں کی کشتیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ مَیں نے چپّو چلاتے ہُوئے اپنی کشتیوں کی طرف دیکھا۔ سب سے آگے والی کشتی پر امیر البحر کا پرچم لہرا رہا تھا مجھے یہ سوچ کر خوشی ہُوئی کہ امیر البحر اسکندر موت سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔

اب مَیں نے اپنے کپتان کی جانب دیکھا جو نقارچیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جانتا ہے ہر آنے والا لمحہ ہمیں موت کے قریب تر لے جا رہا ہے لیکن موت کا سواگت کرنا بھی جیسے اُس کے فرائض میں شامل تھا۔ مَیں نے اُس کے چہرے پر لکھی عزم و ہمت کی تحریر پڑھتے ہی سوچ لیا کہ اس لڑائی میں مجھے وہ سب کچھ کرنا ہو گا جو مجھے آزادی اور ممتاز مقام دلانے کا باعث بن جائے۔ میرا خیال تھا کہ ارغون بھی یہی چاہے گا اور ہم دونوں مِل کر اُس منزل کی جانب بڑھ سکیں گے جو ہماری تقدیر بدل دے گی۔

قزاقوں کی کشتیاں اپنا گھیرا تنگ کرنے لگی تھیں۔ شاید اُنھوں نے ہماری سات کشتیوں کے بیچوں بیچ امیر البحر کے پرچم والی کشتی دیکھ لی تھی اور اب اُسے سبق سکھانا چاہتے تھے۔ اس لیے اُن کی کشتیوں کا زیادہ جمگھٹا بھی وسط میں تھا۔ عین اسی وقت ہماری کسی کشتی سے توپ چلنے کی آواز آئی۔ یہ حرکت کسی توپچی سے گھبراہٹ میں سرزد ہوئی تھی کیونکہ قزاقوں کی کشتیاں ابھی دو ڈھائی میل دُور تھیں جبکہ ہماری بڑی توپوں کی مار بھی صرف ڈیڑھ میل تک تھی۔ قزاقوں نے اپنی کشتیوں کے بادبان لپیٹ لیے تھے اور اُن کی کشتیاں گویا رُک گئی تھیں۔ انھیں ملّاحوں سے چپّو چلوانے کی بجائے آگے بڑھانے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ ہماری کشتیاں خُود ہی اُن کی طرف بڑھ کر اپنی تباہی کو آواز دے رہی تھیں۔

"کہسار" اپنے بیڑے کے ایک سرے پر تھی قزاقوں کا بیڑا دونوں پہلوؤں سے چھدرا تھا کیونکہ اُن کی تمام تر توجہ ہمارے وسط میں چلنے والی امیر البحر کی کشتی پر مرکوز تھی۔ مَیں نے سوچا کہ اگر کہسار تیز رفتاری سے آگے بڑھتی رہی اور اُس کا کسی قزاق کشتی سے تصادم نہ ہُوا تو وہ گھیرا توڑ کر آگے نکل سکتی ہے۔ ابھی مَیں ان اندازوں پر غور کر رہا تھا کہ کچھ بڑے بڑے پتھر سنسناتے ہوئے ہمارے سر پر سے گزر کر سمندر میں جا گرے۔ یہ پتھر قزاقوں کی ایک کشتی سے منجنیق کے ذریعے پھینکے گئے تھے۔ ہماری کشتی کی چار توپوں نے فوراً جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ اب ہماری اور قزاقوں کی کشتیاں ایک دُوسرے کی زد میں تھیں۔ وہ ہم پر پتھر برسا رہے تھے اور ہم گولے۔ ہماری دو کشتیوں میں آگ لگ گئی لیکن سنگ باری نے ہماری کشتی کے ایک مستول کو بھی اُڑا دیا۔ مستول کشتی پر گرا تو ہمارے کافی ملّاح زخمی ہو گئے اور کچھ اُس کے نیچے دب کر بھی مر گئے۔ اب جنگی جنُون طاری تھا۔ کسی کو کسی کا خیال نہیں تھا۔ ہر طرف موت رقص کر رہی تھی۔ آگ اور خوُن کا کھیل جاری تھا۔ نقارے بج رہے تھے توپیں گرج رہی تھیں، منجنیق چرچرا رہی تھیں اور ہر طرف سے زخمیوں کی آہ و بکا بلند ہو رہی تھی۔

توپوں کی مسلسل گولہ باری سے کہسار پر دھوئیں کی دبیز چادر پھیلی ہوئی تھی اور مجھے نظر نہیں آ رہا تھا عین اُس وقت وہ کس کشتی سے ٹکرائی۔ ہمیں بڑے زور کا ایک جھٹکا لگا اور مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہماری کشتی نے ایک قزاق کشتی کو درمیان سے جیسے چیر کر رکھ دیا تھا۔ دو ٹکڑے ہو جانے والی کشتی کے ملّاح کہسار پر کودنے لگے مگر تیر اندازوں اور بندوقچیوں نے اُنھیں بھون کر رکھ دیا۔ فضا میں مزید چیخیں اور کراہیں گونج اُٹھیں۔ اُسی وقت کہسار کو ایک اور زبردست جھٹکا لگا۔ ایک اور قزاق کشتی اُس سے ٹکرائی تھی۔ چپّو چلانے والے اس جھٹکے سے گر پڑے اور ایک دُوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔ مَیں بھی اُن میں دھنسا ہُوا تھا لیکن مَیں نے اپنے اُوپر گِرے ہُوئے ملّاح کو دھکیل کر ہٹا دیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا مگر صرف ایک قدم ہی آگے بڑھا سکا کیونکہ میرے قدموں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی جبکہ قزاقوں کی کشتی سے اُن کے جنگجو نعرے لگاتے ہُوئے ہماری کشتی پر کُود گئے تھے اور اُنھوں نے زنجیروں سے جکڑے ہُوئے غلام ملّاحوں کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا۔ اپنی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی موت کو دیکھ کر مَیں نے جھٹکے سے زنجیر توڑنے کی کوشش کی مگر زنجیر بہت مضبوط تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا کہ مَیں اپنا دفاع کر سکوں۔ بے بسی نے مجھے دیوانہ سا کر دیا اور میرے مُنہ سے ایک وحشیانہ نعرہ نکل گیا۔ عین اُسی وقت مَیں نے دیکھا کہ قزاقوں سے لڑنے والا ایک شخص پلٹا اور میرے قریب آ گیا۔ وہ ارغون تھا۔ اُس نے اپنا کلہاڑا بلند کیا اور ایک ہی ضرب سے میرے پاؤں کی زنجیر کاٹ دی۔ پھر وہ کلہاڑا مجھے دے کر تلوار لیے آگے بڑھ گیا۔ مَیں نے کلہاڑے سے دو ساتھیوں کی زنجیریں کاٹیں اور کلہاڑا اُنھیں دے کر آگے بڑھا تاکہ کوئی ہتھیار تلاش کر سکوں مگر مجھے کوئی ہتھیار دکھائی نہ دیا کیونکہ لڑائی کشتی کے دُوسرے سرے پر جاری تھی۔ مَیں بغیر کسی ہتھیار کے لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی اس عالم میں نہتا اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ مَیں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے آٹھ فٹ لمبا چپّو کا ایک ٹکڑا نظر آ گیا۔ مَیں نے وہ ٹکڑا اُٹھا لیا اور اندھا دھند دوڑتا ہُوا اُس سرے پر پہنچ گیا جہاں لڑائی جاری تھی۔ قزاقوں کی کشتی سے دھڑا دھڑ جنگجو جوان کُود رہے تھے۔ مَیں نے دیوانہ وار چپّو کا وہ ٹکڑا گھمانا شروع کر دیا۔ قزاق اگرچہ شمشیر بدست تھے مگر اُن کی تلواریں مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تلواریں پھینک کر مجھے مارتے یا تیروں کا نشانہ بناتے، مَیں نے نو دس قزاقوں کی کھوپڑیاں توڑ دیں۔ کسی کے پیٹ میں ڈنڈے کا سرا مارا تو کسی کی پسلیوں میں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس ٹکڑے میں میدان صاف ہو گیا۔ مَیں نے قزاقوں کے ہاتھوں سے گری ہوئی دو تلواریں اُٹھائیں اور وہیں سے اُن کی کشتی پر کُود گیا جہاں سے وہ ہماری کشتی پر کُود کر آ رہے تھے۔

مَیں ہمیشہ اس مقولے پر عمل کرتا رہا ہُوں کہ دُشمن سے اس کے اپنے میدان میں لڑو۔ مَیں جونہی قزاقوں کی کشتی پر کُودا سامنے سے ایک قزاق نے توڑے دار بندوق سے مجھ پر فائر کرنا چاہا مگر مَیں نے جھکائی دے کر تلوار اُس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ اتنے میں دو قزاق میری طرف لپکے۔ مَیں نے بیٹھے بیٹھے چپّو کا وہ ٹکڑا گھمایا جس نے اُن کی ٹانگیں توڑ دیں۔ وہ چیختے چلاّتے گِرے تو دو اور میری طرف لپکے۔ مَیں نے تلواریں پھینک کر اُسی چپّو سے اُنھیں بھی جہنم رسید کر دیا۔ اب مجھ پر خوُن سوار ہو چکا تھا۔ مَیں اندھا دھند قزاقوں پر ٹوٹ پڑا۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے اس عجیب و غریب ہتھیار کا مقابلہ کیسے کریں۔ وہ اُس کی زد سے بچنے کے لیے سمندر اور "کہسار" پر کُودنے لگے... لیکن ہر دو جگہ موت اُن کی منتظر تھی۔ اتنے میں ان غلام ملّاحوں کی ایک ٹولی بھی وہاں پہنچ گئی جنھوں نے اپنی زنجیریں خُود کاٹ لی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے قزاقوں کا صفایا ہو گیا۔ تب "کہسار" کے کپتان نے جو کافی زخمی ہو چکا تھا، چلاّ کر مجھے اپنی کشتی پر واپس آنے کا حکم دیا۔ اور مَیں تعمیلِ حکم میں وہاں پہنچ گیا۔

ارغون کپتان کے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی تھی کہ اس نے ایک بازو سے بہت سے قزاقوں کو جہنم رسید کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ سوچ کر دکھ بھی ہوا کہ اگر اس کا دُوسرا بازو مجھ سے مقابلہ کرتے ہوئے ناکارہ نہ ہو جاتا تو آج وہ اس سے بھی زیادہ بڑا کارنامہ انجام دیتا۔ ارغون نے ملاحوں کو چپّو سنبھالنے کا حکم دیا تو مَیں نے بھی چپّو سنبھال لیا لیکن اب ہم غلام ملاحوں کو زنجیر سے جکڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

"کہسار" آگے بڑھنے لگی تو ارغون نے کپتان کی ہدایت پر مجھے اپنے پاس بُلا لیا۔ مَیں سُکان پر پہنچا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ قزاقوں کا ایک جہاز تیزی سے ہماری کشتی کی طرف بڑھ رہا ہے اور جس طرح ہم نے قزاقوں کی ایک کشتی کو ٹکر مار کر دو ٹکڑے کر دیا تھا، اسی طرح وہ ہماری کشتی کو ٹکر مار کر دو ٹکڑے کر دینا چاہتی ہے۔ مَیں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور ارغون سے پُوچھا: "توپ تیار ہے؟"

"ہاں!"

"تو مجھی کو ہٹا دو۔ مَیں خود اُسے چلاؤں گا۔" یہ کہتے ہُوئے مَیں نے کپتان کی طرف دیکھا کہ وہ کوئی اعتراض تو نہیں کرتا مگر اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ مَیں لپک کر توپچی کی جگہ آیا اور ملاحوں کو ہدایات دینے لگا۔ ساتھ ہی مَیں نے ارغون سے کہا کہ وہ کہسار کا رُخ اس طرح رکھے کہ مَیں اپنی طرف بڑھنے والے جہاز کے درمیانی حصّے کو توپ کا نشانہ بنا سکوں۔ یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی کیونکہ قزاقوں کا جہاز بھی ہماری کشتی کو وسطی حصّے میں ضرب لگا کر دو نیم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ بھی رُخ موڑنے لگا۔ اب مَیں نے ایک اور ترکیب کی اور ٹوٹے ہُوئے چپوؤں کے ٹکڑے اُٹھا کر توپ کے نیچے رکھوا دیے تاکہ کشتی کی بجائے توپ کا رُخ موڑ دُوں۔ قزاق میری اس ترکیب کو نہ سمجھ پائے۔ مَیں نے فلیتہ جلایا اور جہاز کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب جہاز کہسار سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر رہ گیا تو مَیں نے نشانہ لے کر توپ داغ دی۔ دھماکے کے ساتھ کشتی کو ایک جھٹکا لگا اور ابھی ہم اس جھٹکے سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ قزاقوں کے جہاز سے یکے بعد دیگرے تین زبردست دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی اُس کے مستول اور ملّاح فضا میں اُڑتے دکھائی دیے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر جب تیسرے دھماکے کے ساتھ جہاز کے پرخچے اُڑ گئے تو مَیں سمجھ گیا کہ ہماری توپ کا گولہ قزاقوں کے ذخیرۂ بارود پر گرا تھا۔ اس میں کوئی کمال نہیں تھا بلکہ خوبیٔ تقدیر تھی جس نے قزاقوں کے سب سے بڑے جہاز کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔

مَیں نے ارغون کو حکم دیا کہ کہسار کو جتنی تیزی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے بڑھایا جائے کہ اب ہمارے آس پاس کوئی قزاق کشتی یا جہاز دکھائی نہیں دے رہا تھا اور ہم اُن کے نرغے سے نکل کر فرار ہو سکتے تھے۔

جب کہسار کے ملّاح اسے تیزی سے کھے رہے تھے، مَیں نے پلٹ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ ہماری باقی ساری کشتیاں تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ قزاق بھی اپنی بہت سی کشتیوں اور سب سے بڑے جہاز سے محروم ہو چکے تھے۔ سمندر پر گولے بارود اور جلتی ہوئی کشتیوں کا دُھواں پھیلا ہُوا تھا اور شاید اسی دُھویں کی وجہ سے وہ ہماری کشتی کو دیکھ نہیں سکے تھے جو پُوری رفتار سے انجانی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

دو گھنٹے بعد جب ہم کافی دُور نکل آئے تو کپتان نے کشتی کے عہدیداروں کو بلایا اور کہا۔

"تم لوگ جانتے ہو کہ کسی بھی جنگ میں بچ جانے والے شاہِ ضرغام کے غیظ و غضب کا شکار بننے سے بچ نہیں سکتے۔ اعلیٰحضرت کا عتاب صرف بچ جانے والوں تک ہی محدُود نہیں رہتا بلکہ اُن کی بیوی بچّوں کو بھی کرب انگیز موت کا جام پینا پڑتا ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ میری بیوی اور معصوم بچّے میری وجہ سے مظالم کا شکار ہوں۔ اس لیے مَیں کشتی کی کمان سرفروش کے سپُرد کرتا ہُوں۔ اب یہی کہسار کا کپتان ہو گا اور تم اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرو گے۔" اتنا کہہ کر وہ اُٹھا اور اپنے سر سے خود اُتار کر ایک نائب کو دیتے ہُوئے بولا۔ "آئین کی رُو سے مرنے والے کی خود اُس کے بچّوں کو پہنچا دی جاتی ہے۔ یہ میرے بچّوں کو پہنچا دینا۔" یہ کہنے کے بعد اُس نے کشتی سے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور زرہ بکتر کی وجہ سے چشم زدن میں ڈُوب گیا۔

تب ارغون آگے بڑھا اور اپنی کمر سے میری پیٹی اور چاقو اُتار کر دیتے ہُوئے بولا۔ "اپنی امانت سنبھالو کپتان!"

●●

دراز ریش ملّاح نے کشتی کی کمان سنبھال لی اور اُسے ایسے راستے پر ڈال دیا جو ہمیں جلد از جلد ایسی خشکی تک پہنچاتی جہاں سے کہسار کی مرمت کے لیے لکڑی مل جائے۔ کشتی اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ کسی حملے کا مقابلہ کر سکے۔ میرے لیے ابھی ایک اور مسئلہ حل طلب تھا۔ اس پر صرف غلام ملّاح ہی نہیں بلکہ آزاد عملہ اور سپاہی بھی سوار تھے۔ انھوں نے جان بچانے کے لیے اُنھوں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر مَیں جاننا چاہتا تھا کہ دو سو افراد میں سے کون کون میرا ساتھ دینے کو تیار ہے اور کتنے سلطنتِ بہرام واپس جانا چاہتے ہیں۔

دوسری شب جب کہسار ساحل سے جا لگی تو مَیں نے سب کو

آرام کرنے کا حکم دے دیا کیونکہ ہر فرد بُری طرح تھکا ہُوا تھا۔ خود میری اپنی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اگرچہ مَیں زخمی نہیں ہُوا مگر میرے جسم پر بھی بہت سی خراشیں آئی تھیں اور آنکھیں بھی سُوج گئی تھیں۔

تقریباً بارہ گھنٹے مکمل آرام کے بعد جب سب لوگ نہا دھو اور کھا پی کر تازہ دم ہو گئے تو مَیں نے انھیں ساحل پر جمع کیا اور خود کشتی پر کھڑا ہو کر اُن سے مخاطب ہُوا۔

"دوستو! تم نے جس بہادری سے یہ جنگ لڑی اور جیتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کشتی نے قزاقوں کی دو کشتیوں اور ایک بڑے جہاز کو ہمیشہ کے لیے سمندر کی تہ میں بٹھا دیا ہے لیکن یہ کارنامہ صرف کشتی کا نہیں بلکہ تمھارا تھا۔"

میری اس بات پر لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ مَیں پھر تقریر کرنے لگا: "ہم لوگ دشمنوں کے نرغے سے نکل کر ساحل پر لنگر انداز ہو چکے ہیں اور اب لنگر اُٹھانے سے پہلے ہمیں کشتی کی مرمت کرنی ہے لیکن مرمت کے بعد بھی یہ پہلے والی "کہسار" نہیں رہے گی۔ تب یہ شاہی بحریے کی کشتی تھی۔ اب یہ آزاد ہو گی اور اس پر کام کرنے والا ہر فرد بھی آزاد ہو گا۔ کسی کے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالی جائے گی، کسی کو سمندر میں نہیں پھینکا جائے گا اور کسی کے حلقوم پر تلوار نہیں پھیری جائے گی۔"

ایک بار پھر تالیاں بجیں اور نعرۂ ہائے تحسین بلند ہُوئے۔

"مَیں کہسار کو سلطنتِ بہرام کی بجائے اماراتِ خمسہ لے جانا چاہتا ہُوں اس لیے کہ سلطنتِ بہرام کے ساحل پر تو یقینی موت استقبال کرے گی لیکن یہ بات اماراتِ خمسہ کے بارے میں ابھی نہیں کہی جا سکتی۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ آپ لوگوں میں سے کچھ شاید اماراتِ خمسہ نہ جانا چاہتے ہوں اس لیے مَیں کسی پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ یہ فیصلہ خود آپ لوگوں کو کرنا ہے۔ جو لوگ میرا ساتھ دینا چاہیں، وہ میرے پاس آئیں اور میرے ساتھیوں میں اپنا نام لکھوا دیں۔ جو لوگ ہمارے ساتھ نہ جانا چاہیں، ہم اُنھیں کسی آبادی کے قریب ساحل پر اُتار دیں گے تاکہ انھیں کھانے پینے اور واپس جانے میں کوئی دقت نہ ہو اور وہ شاہ ضرغام کی پھر سے خدمت کر سکیں۔"

میری اس بات پر کچھ لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ انھوں نے یہ طنز محسوس کر لیا تھا کہ شاہِ ضرغام کی خدمت خود اپنے پروانۂ موت پر دستخط کرنے کے مترادف ہے۔ مَیں نے تقریر جاری رکھی۔

"آپ لوگ سوچ لیجیے اور جو لوگ میرا ساتھ دینا چاہیں۔ . . وہ فوراً اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا لیں۔"

فی الفور سوائے چند بوڑھوں کے سب نے اپنے ہاتھ اُٹھا دیے۔ یہ بوڑھے اپنے بچّوں کی محبت میں واپس جانا چاہتے تھے لیکن جب باقی لوگوں نے اُنھیں کپتان کی مثال دے کر سمجھایا کہ اُن کی واپسی اُن کے بال بچّوں کی موت بن جائے گی تو وہ بھی اماراتِ خمسہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اگرچہ مَیں خود یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں ہمارے ساتھ کیا حشر ہو گا لیکن وہاں بچ جانے کا پچاس فی صد امکان ضرور تھا جبکہ سلطنتِ بہرام میں ایک فی صد بھی نہیں تھا۔

اس فیصلے کے بعد "کہسار" کا ہر فرد کام میں مصروف ہو گیا۔ درخت کاٹ کر مستول بنائے گئے۔ مچھلیاں پکڑ کر خشک کر لی گئیں۔ پانی کا ذخیرہ کیا گیا اور بارود جو گیلا ہو گیا تھا، پھر سُکھا لیا گیا۔

یہ سارے کام دس روز میں مکمل ہو گئے۔ گیارھویں روز ہم نے اُن لوگوں کی قبر پر سلامی دی جو اس لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد جانبر نہیں ہو سکے تھے اور پھر ہم نے کشتی کا لنگر اُٹھا دیا۔

مَیں چاہتا تھا کہ ہماری کشتی شاہی بحریے یا قزاقوں کی نگاہوں میں آئے بغیر ہی بحرِ سیمیں تک پہنچ جائے۔ خُدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ پہلے روز ہی سمندر میں طوفان آ گیا اور بہت تیز ہوائیں چلنے لگیں جو اگرچہ موافق تھیں مگر وہ اپنے ساتھ بارش اور بادل بھی لے آئی تھیں۔ کشتی چپّو چلائے بغیر بہت تیزی سے جا رہی تھی مگر ملّاح اور سارا عملہ کشتی سے پانی نکالنے میں مصروف رہا ورنہ اُس کا ڈُوب جانا یقینی تھا۔ پانچویں روز جب طوفان تھما تو ہماری کشتی اندازے سے دو روز پہلے ہی بحرِ سیمیں پہنچ چکی تھی اور شاید طوفان ہی کے باعث ہم شاہی بحریے یا قزاقوں کی نگاہوں میں نہیں آ سکے تھے۔

چھٹی صبح ہمیں اُفق پر ایک جزیرہ دکھائی دیا۔ وہ ریش دراز اور پختہ کار ملّاح جو اب میرا دستِ راست بن چکا تھا اور جس نے اپنا نام تُوما بتایا تھا، جزیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ جزیرہ برنیال ہے کپتان۔ اماراتِ خمسہ میں سے ایک ریاست نیلاب کی ملکیت!"

جب کشتی آگے بڑھی تو مَیں نے دیکھا کہ یہ جزیرہ یا جزیرہ نُما ایک پہاڑی پر مشتمل تھا اور چونکہ پہاڑ سی عمُودی تھی، اس لیے اُس پر چڑھنا کوہ نوردی سے کم نہیں تھا۔ ابھی ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ہمیں اس جزیرے پر رُکنا یا آگے بڑھتے رہنا چاہیے کہ اچانک ہی مَیں چونک کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہاں سے سُرخ سُرخ دُھویں کا ایک مینار سا بلند ہو رہا تھا۔

دُھوئیں کا مینار دیکھ کر مَیں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

مَیں نے اپنے دستِ راست تُوما سے اس سلسلے میں بازپُرس کی تو اُس نے بتایا کہ یہ نگہبانی کرنے والوں کی طرف سے ایک اشارہ ہے۔ یعنی تین دھماکے ہُوئے اور سفید دُودھیا دُھوئیں کے تین

مرغولے نظر آئے۔ میں نے ساحل سے تین میل دُور کشتی رُکوا لی تاکہ وہ توپوں کی زد سے محفوظ رہ سکے۔ ۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کشتی کو روکے رکھنا بھی بیکار ہے۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ کشتی کو توپوں کی مار سے باہر رکھتے ہُوئے جزیرے کے گرد چکر لگاتے ہُوئے آگے بڑھا جائے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اسی ترکیب پر عمل کرنے کے لیے کہہ دیا۔

اس وقت تک ماہی گیری کی چند کشتیوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ تیزی سے ساحل کی طرف بھاگ نکلی تھیں۔ جزیرے کے گرد چکر کاٹتے ہُوئے بالآخر ہم ایک بندرگاہ کے سامنے آ گئے جس پر ایک بہت بڑا مینارہ بنا ہُوا تھا اور اس کے عقب میں بُرج دار شہر پناہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے تُوما سے کہا: "کشتی کو بندرگاہ میں لے چلو۔ ہم جزیرے کے بادشاہ سے ملیں گے"۔

"بادشاہ سے نہیں ملکہ سے"۔

"بادشاہ سے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ وہ مر چکا ہے اور شہزادہ بہت چھوٹا ہے چنانچہ سارے امورِ سلطنت ملکہ نے خود سنبھال رکھے ہیں۔ اُس کا نام ملکہ ترشینا ہے۔ وہ بڑی سُوجھ بُوجھ والی عورت ہے اس لیے رعایا اُس کا بہت احترام کرتی ہے"۔

میں نے تُوما سے مزید معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ یہ سلطنت بہت زیادہ مال دار نہیں ہے کیونکہ اس کے وسائل محدود ہیں۔ جنگلوں کی کمی کے باعث ریاست کے پاس زیادہ جہاز اور کشتیاں نہیں ہیں۔ صدر مقام کے ارد گرد شہر پناہ ہے جو کافی مضبوط ہے۔

جب "کہسار" بندرگاہ میں داخل ہونے لگی تو میں نے دیکھا کہ دونوں جانب عمودی چٹانیں ہیں جن پر قلعے بنے ہُوئے ہیں۔ بندرگاہ میں داخل ہوتے ہی تین جنگی کشتیوں نے ہمیں نرغے میں لے لیا۔ پھر دو کشتیاں پیچھے بھی آ گئیں۔ آگے والی کشتی پر کھڑے ہُوئے ایک افسر نے ہمیں حکم دیا۔ "چپّو چلانا بند کر دیے جائیں اور کشتی کا سارا عملہ اُوپر آ جائے۔ کوئی بھی نیچے نہ رہے۔ اگر اس حکم کی تعمیل نہ کی گئی تو ہم پانچ منٹ بعد گولہ باری شروع کر دیں گے"۔

میں کوئی جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے وہی کیا جو مجھ سے کہا گیا تھا۔ پھر ہماری کشتی آگے والی کشتی سے باندھ دی گئی۔ چار افسر ہماری کشتی پر آئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے حکم دیا: "اپنے ملّاحوں کو فوراً زنجیریں پہنا دو"۔

"نہیں جناب"۔ میں نے دو ٹوک جواب دیا۔ "اب یہ سب غلامی کی زنجیریں توڑ چکے ہیں اور اس کشتی پر انہیں زنجیریں نہیں پہنائی جائیں گی"۔

"کیا تم قزاق ہو؟" دوسرے افسر نے سوال کیا۔

"قزاقوں سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف دو ہفتے پہلے ہم نے قزاقوں کی تین کشتیاں اور ایک جہاز تباہ کر دیا تھا"۔

"غلط۔ ہم نے ایسی کوئی خبر نہیں سُنی"۔ تیسرا افسر بولا۔

"اگر امارتِ پرنیال کے افسر یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں دنیا کی ساری خبریں معلوم ہوتی ہیں تو یہ اُن کی خوش فہمی ہے"۔ ارغون بول اُٹھا۔

"اگر تم قزاق نہیں اور نہ ہی تمھاری کشتی پر کسی ملک کا پرچم ہے تو پھر تم کیا بلا ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" پہلے افسر نے سوال کیا۔

چونکہ یہ سوال معقول تھا اس لیے میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "دو ہفتے پہلے یہ کشتی سلطنتِ بہرام کے بحری بیڑے میں شامل تھی جس کا قزاقوں سے مقابلہ ہُوا۔ آپ کی مرضی ہے کہ یقین کریں یا نہ کریں مگر اب ہم آزاد ہیں۔ میرا نام سرفروش ہے اور میں کہستان منگول کے اُس پار کی ریاست آریانہ کا شہزادہ ہُوں۔ ہم یہاں خیرسگالی کے جذبات لے کر آئے ہیں مگر افسوس کہ ہمارا استقبال نہایت غیر دوستانہ طور پر کیا جا رہا ہے"۔

افسر نے قہقہہ لگایا اور کہا: "یہ ایک اور جھوٹ ہے کہ تم سلطنتِ آریانہ کے شہزادے ہو۔ ہم نے آج تک کسی ایسی سلطنت کا نام نہیں سُنا۔ اور ملکہ ترشینا جھوٹوں سے کوئی رُو رعایت برتتی ہے نہ اُس کے افسر..."

"جو ایسی دانشمند ملکہ کے افسر بننے کے اہل ہی نہیں"۔ میں نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا: "میرا خیال تھا کہ آپ لوگوں کا رویّہ شہنشاہِ ظلم و غارت گری ضرغام سے مختلف ہوگا لیکن افسوس کہ مجھے مایوسی ہوئی اور میں نے ملکہ ترشینا کے فہم و ذکا کے جو قصّے سُنے تھے وہ صرف قصّے ہی نکلے"۔

میری اور افسروں کی بات چیت سے کہسار کے افرادِ عملہ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور اُن کی جبینوں پر شکنیں اُبھر آئیں۔ پرنیال کے افسروں نے بھی یہ بات محسوس کر لی اور فضا کے مزید مکدّر ہونے سے پہلے اپنا رویّہ تبدیل کر لیا۔ پہلا افسر بولا: "کپتان سرفروش، تم کون ہو اور تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اس کا فیصلہ کرنا ملکہ محترمہ کا کام ہے ہمارا نہیں۔ کیا تم اپنے ایک افسر کے ساتھ ملکہ محترمہ کی خدمت میں چلنے کو تیار ہو؟"

یہ سُن کر تُوما اور بہت سے دُوسرے لوگ ہنس پڑے مگر میں نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھی اور ارغون سے بولا: "کپتان ارغون، ملکہ محترمہ سے شرفِ باریابی حاصل کرنے اور انہیں اپنے دوستانہ جذبات سے آگاہ کرنے کے لیے تم میرے ساتھ چلو گے"۔ ارغون نے اثبات میں سر خم کیا تو میں تُوما سے مخاطب ہُوا۔

"جب تک میں اور ارغون واپس نہیں آتے، تم اس کشتی کی کمان سنبھالے رہو گے۔ اگر غروبِ آفتاب تک ہم دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ہم لقمۂ اجل بن گئے ہیں یا ہمیں زنداں میں محبوس کر دیا گیا ہے۔ تب تم یہ کشتی لے کر یہاں سے چلے جانا"۔

"لیکن ہم آپ کو..."

"ہماری فکر مت کرنا۔ کشتی کے عملے کا تحفظ تمھاری ذمّہ داری ہے"۔

"بہتر جناب"۔

اب میں افسروں کی طرف پلٹا اور بولا: "ہم تیار ہیں"۔

افسروں نے ہمارے پھٹے پرانے لباسوں پر نظر ڈالی پھر پہلے افسر نے کہا: "ٹھیک ہے۔ آؤ"۔

اور ہم اُن کے ساتھ چل دیے۔

●

فصیل کے دروازے پر گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ ہم سب چھوٹے قد کے مضبوط گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ایک افسر کی رہبری میں سنگی فرش والی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ شہر پناہ بھی پیچ و خم کھاتی ہُوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ کچھ دُور چلنے کے بعد بارہ گھڑسواروں کے ایک دستے نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہم ایک سُرنگ نما راستے سے گزر کر کھلے میں آ گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ہم شہر کی فصیل سے باہر آ چکے ہیں۔ فصیل میں تقریباً سو سو گز کے فاصلے پر بُرج بنے ہُوئے تھے اور جگہ جگہ توپوں کی نالیں بھی باہر جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ اگرچہ فصیل بہت پُرانی تھی لیکن اُسے سر کرنا آسان نہیں تھا۔

وہ راستہ جس پر ہم چل رہے تھے، پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ دونوں طرف زیتون اور انگوروں کے باغ تھے۔ اُن میں چھوٹے چھوٹے درخت بھی لگے ہُوئے تھے جن کے تنے سیاہ تھے اور شاخیں زرد پھولوں سے لدی ہُوئی تھیں۔ کچھ لوگ یہ درخت کاٹ رہے تھے اور

بکھ انھیں چیر کر تختے بنانے میں مصروف تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ لکڑی بہت سخت ہے اسی لیے وہ لوگ پسینے سے شرابور تھے مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ لکڑی کے یہ چھوٹے چھوٹے تختے کس کام آتے ہوں گے۔ ارغون نے اندازہ لگا لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ چنانچہ بولا:

"یہ لوگ ان تختوں سے ڈرم یا پیپے بناتے ہیں۔ یہ بہت مضبوط لکڑی ہے اس لیے اس سے بنائے ہوئے پیپے اگر سمندر کی گہرائی میں بھی پھینک دیے جائیں تو سالہا سال تک خراب نہیں ہوتے بلکہ ان میں بھری ہوئی شراب یا خوراک بالکل محفوظ رہتی ہے۔"

مجھے ان پیپوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اب راستہ دشوار گزار ہوتا جا رہا تھا اور بعض مقامات پر تو ہمیں گھوڑوں سے اُتر جانا پڑتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم بائیں طرف مڑ کر ایک ڈھلان راستے پر آگئے۔ یہاں بھی ہمیں متعدد دروں اور سرنگوں سے گزرنا پڑا۔ دفاعی اعتبار سے یہ بہت محفوظ علاقہ تھا اور گنتی کے چند آدمی پورے پورے فوجی دستوں کو آگے بڑھنے سے باآسانی روک سکتے تھے۔ اتنے میں رہبری کرنے والے افسر نے کہا: "ہم ملکہ محترمہ کے محل میں پہنچنے ہی والے ہیں۔"

اگلا موڑ مڑتے ہی ملکہ کا محل دکھائی دینے لگا اور میں اُسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ ملکہ کا محل بھی قصرِ خونیں جیسا ہیبت ناک سنگی محل ہو گا جس میں سے جابجا توپیں جھانک رہی ہوں گی لیکن وہ تو اس کے برعکس سنگِ مرمر کی ایک سادہ مگر ایک منزلہ خوبصورت سی عمارت تھی۔ عمارت کے احاطے میں سنگِ سفید سے متعدد تالاب بنائے گئے تھے جن میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں اور حوضوں کے ارد گرد خوشبودار پھولوں کی کیاریاں پھیلی ہوئی تھیں جنھوں نے فضا کو معطر بنا دیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس محل میں رہنے والی ملکہ کیسی ہو گی؟

ملکہ کو ہماری آمد سے پہلے ہی باخبر کر دیا گیا تھا اس لیے جب ہم محل کے دروازے پر پہنچے تو بارہ خدمت گار اور دو مسلح سپاہی وہاں ہماری پذیرائی کو موجود تھے۔

میرا خیال تھا کہ یہاں لانے سے پہلے ہمیں غسل کرنے کا موقع دینے کے ساتھ ساتھ نئے لباس بھی فراہم کیے جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا اور اب میں اس خوبصورت ماحول میں سخت احساسِ کمتری محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو سلطنتِ آریانہ کا شہزادہ متعارف کرایا تھا مگر اس لباس میں میں خود کو ایک غلیظ خدمت گار محسوس کر رہا تھا۔

دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح سپاہی میری اور ارغون کی طرف

بڑھے تو میں چوکنا ہو گیا لیکن وہ ہمیں گھوڑوں سے اُترنے میں مدد دینے آئے تھے۔ پھر وہ خدمت گاروں کو ہدایات دینے لگے۔ جو باقی لوگوں کو ایک طرف لے گئے تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ اُن میں سے ایک بولا: "عزت مآب شہزادے۔ ملکہ عالیہ کا فرمان ہے کہ آپ دونوں کو فی الفور اُن کے حضور پہنچا دیا جائے لہٰذا تشریف لائیے۔"

میں نے یہ سن کر اپنی تلوار اُس کے حوالے کرنا چاہی تو وہ بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں جنابِ والا۔ ملکہ عالیہ آپ کو اس حال میں دیکھنا پسند فرمائیں گی تاکہ آپ کے متعلق صحیح اندازہ لگا سکیں۔ جہاں تک اُن کی حفاظت کا معاملہ ہے تو آپ مسلح ہونے کے باوجود اُن کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔" اُس کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔

محل کی مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے مجھے جہاں عود و عنبر کی خوشبو آئی وہاں کہیں دور سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز بھی آتی سنائی دی۔ قلعوں اور فصیلوں کی آڑ میں آزادی برقرار رکھنے والی اس ملکہ کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔

بالآخر ہم ایک طویل و عریض کمرے میں پہنچ گئے۔ جہاں سامنے کی دیوار کے ساتھ چبوترے پر ایک سفید چوبی کرسی رکھی تھی اور اس پر ایک کشیدہ قامت عورت پورے وقار کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر اُٹھی اور ہماری طرف بڑھنے لگی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہالی وُڈ کی کوئی حسین ترین اداکارہ ملکہ کا روپ دھار کے یہاں آگئی ہو۔ وہ بناؤ سنگھار سے بے نیاز تھی اور اس کی اسی سادگی نے اُسے ایک پُر تقدس اور ملکوتی حسن عطا کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُسے نہ زیوروں کی ضرورت تھی نہ ہتھیاروں کی۔ تاہم کہیں نہ کہیں بہت قریب ہی اُس کے محافظ ضرور موجود رہے ہوں گے۔ شاہ ضرغام اپنے ملاقاتیوں کو گرانڈیل محافظوں اور اپنے رعب و دبدبے سے مرعوب کرتا تھا تو ملکہ ترشینا اپنے حسن اور وقار سے۔ وہ ہم سے دس فٹ کے فاصلے پر رُک گئی اور ہنستے ہوئے

یوں بولی جیسے اُس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔

"ہاں۔ میرے محافظ موجود ہیں مگر وہ میرے اشارے کے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔ ہم پرنیال کے لوگ اجنبی لوگوں کو اُس وقت تک اپنا دشمن نہیں سمجھتے جب تک کہ ہمیں اُن سے کوئی گزند نہ پہنچے۔ آپ لوگوں نے بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کی بلکہ اُس امتحان میں کامیاب ثابت ہوئے جو عہدے داروں نے لیا تھا۔"

"امتحان؟" ارغون بے ساختہ بول اُٹھا۔

"ہاں۔ میرے افسر یہ جاننا چاہتے تھے کہ آپ لوگ خود پر اور اپنے آدمیوں پر کس حد تک قابو پا سکتے ہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آپ لوگ دانشمند بھی ہیں اور طاقت ور بھی اور اس قسم کے لوگ دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "ملکۂ عالیہ۔ اگر ہمیں ایک دوسرے کی تعریف ہی کرنا ہے تو پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے افسروں کی اداکاری پر انھیں مبارک باد دوں۔"

"جہاں تک اداکاری پر داد دینے کا تعلق ہے تو اس کے مستحق آپ بھی ہیں۔ میرے افسر آپ کی اس بات پر سچ مچ متعجب رہ گئے تھے کہ اگر آپ غروبِ آفتاب تک کشتی پر واپس نہ پہنچے تو آپ کا قائم مقام کشتی بندرگاہ سے باہر کیسے لے جائے گا؟ کیا آپ لوگوں کے پاس ایسے خفیہ ہتھیار ہیں جن کی مدد سے آپ کی کشتی ہمارا نرغہ توڑ کر باہر نکل سکتی ہے؟ وہ اب تک اس بات پر حیرت زدہ ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ اپنے افسروں سے بہت زیادہ جانتی ہیں ملکہ عالیہ۔"

"میرے پاس ایسے ملازمین بھی ہیں جو جہازوں اور کشتیوں کے متعلق وسیع معلومات اور تجربہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے 'کہسار' کا اچھی طرح سے جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ لوگوں کے پاس کوئی خفیہ ہتھیار نہیں ہے۔ دوسرے سامانِ رسد بھی اتنا کم ہے کہ اگر آپ ہماری جنگی کشتیوں کے نرغے سے بچ کر بندرگاہ سے باہر نکل بھی جائیں تو کسی دوسری بندرگاہ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔"

"آپ کی اطلاعات درست ہیں ملکہ عالیہ اور وہ اس بات کی بھی شاہد ہیں کہ ہم کسی بُری نیت سے نہیں آئے اور نہ ہی آپ کے دشمن ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"مجھے تمھاری بات سے اتفاق ہے۔ اب مجھے مختصر طور پر اپنی اور اپنے جہاز کی رُوداد سناؤ۔ اس کے بعد میں کپتان ارغون کو کہسار پر بھیج دوں گی اور یہ حکم بھی جاری کر دوں گی کہ ضروری سامانِ رسد کے ساتھ کشتی کی مرمت بھی ہمارے خرچے پر کی جائے۔"

"میں آپ کی اس عنایت کا شکر گزار ہوں ملکۂ عالیہ۔" میں نے کہا۔ "اور میرے عملے کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

"انھیں نہ صرف شہر میں آنے کی اجازت دی جائے گی بلکہ خرچ کے لیے مناسب بھتہ بھی دیا جائے گا بشرطیکہ وہ پرنیال کے قوانین کا احترام کریں اور جو ایسا نہیں کرے گا اُس کے خلاف قانونی اقدام کیا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی اور اپنی کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولی: "اب اپنی رُوداد سناؤ مگر مختصر انداز سے۔"

میں نے چند منٹوں میں اُسے سارے واقعات سنا دیے۔

"کیا یہ ساری باتیں سچی ہیں؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ارغون بول اُٹھا: "جنگل میں ہم سے ملنے کے بعد کی ساری باتوں کی میں تصدیق کرتا ہوں ملکہ عالیہ۔ میرا یہ ناکارہ بازو بھی اس حقیقت کا گواہ ہے۔"

ملکہ ترشینا بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی: "تم نے بڑی تیزی سے اپنے کپتان کی کچھ خصوصیات اپنا لی ہیں ارغون۔ بہرکیف تم واپس جا کر کشتی کو اپنی کمان میں لے لو اور مرمت کی دیکھ بھال کرو۔"

ارغون نے سر خم کیا، مجھ پر ایک نظر ڈالی اور دو خدمت گاروں کی رہبری میں باہر چلا گیا۔

اب ملکہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی: "تم یہیں رُکو شہزادے چند لمحوں میں میرے خدمت گار آئیں گے اور تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس وقت سے تم میرے مہمان ہو اس لیے اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور عقبی دروازے سے نکل گئی۔

اُس کے جاتے ہی میں کمرے میں بالکل تنہا رہ گیا لیکن مجھے یقین تھا کہ ملکہ کے پوشیدہ محافظ اب بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور چشمِ زدن میں مجھے ہلاک کر سکتے ہیں بشرطیکہ ملکہ یہ چاہتی ہو۔ میرے لیے یہ امر باعثِ اطمینان تھا کہ ملکہ نے ہمیں اپنا دشمن قرار نہیں دیا تھا۔ اگر وہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتی تو اب تک ہماری لاشیں بھی ٹھکانے لگائی جا چکی ہوتیں اور کشتی کے عملے کا بھی یہی حشر ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ملکہ ترشینا، شاہ ضرغام کی طرح اذیت پسند اور خونخوار نہیں تھی۔

ابھی میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ بغلی دروازے سے پانچ کنیزیں کمرے میں آگئیں۔ اُن میں سے ایک اَدھیڑ عمر کی تھی اور باقی چاروں نے جیسے ابھی ابھی شباب کی دہلیز پر قدم رکھے تھے۔ اَدھیڑ عمر عورت جو اُن کنیزوں کی نگراں معلوم ہوتی تھی بڑے ادب سے بولی: "ہمارے ساتھ تشریف لائیے شہزادۂ عالم!"

میں اُن کے ساتھ چل پڑا۔ ہم مختلف راہداریوں سے گزر کر ایک بڑے حمام میں پہنچے۔ جس کی دیواریں اور فرش سفید اور سبز سنگِ مرمر

کا تھا۔ حمام میں جو دیے جل رہے تھے' اُن کے ہلکے ہلکے دھوئیں سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ ایک کونے میں بہت بڑا ٹب رکھا ہوا تھا جس کے اُوپر سنہرے اور روپہلے رنگ کی بالٹیاں لٹک رہی تھیں۔ کنیزوں نے جلدی سے ٹب میں کچھ مسالے ڈالے' وہ بالٹیاں انڈیلیں اور باہر نکل گئیں۔ مَیں نے اپنا لباس ایک جانب لٹکا دیا اور ٹب میں لیٹ کر نیم گرم پانی سے غسل کا لُطف لینے لگا۔

جب مَیں جی بھر کر نہا چکا تو وہ لمبا سا چغہ پہننے لگا جو ایک کھونٹی سے آویزاں تھا۔ عین اُسی وقت حمام کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مَیں نے باآواز بلند کہا: "آجاؤ۔"

میرا خیال تھا کہ آنے والی کنیز یا اُن کی نگراں ہو گی مگر مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ملکہ ترشینا تھی اور اُس نے بھی ویسا ہی ایک لمبا ڈھیلا ڈھالا ریشمی چغہ پہن رکھا تھا۔ پہلے تو وہ چند لمحوں تک مجھے غور سے دیکھتی رہی' پھر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی۔ مَیں نے اُس کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لی تھی اس لیے مَیں نے اُس تحریر پر عمل کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا۔

●

ترشینا تخلیے میں اگرچہ صرف ایک عورت تھی لیکن وقفے وقفے سے وہ ملکہ بھی بن جاتی تھی اور ایک چھوٹی سی مملکت کی ملکہ ہونے کے ناتے سلطنتِ بہرام اور شاہ ضرغام کے بارے میں سوالات کرنے لگتی تھی۔ ایک بار اُس نے کہا: "شاہ ضرغام کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے' اُس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک جنونی آدمی ہے۔"

"وہ مکمل طور پر جنونی نہ سہی لیکن ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب وہ ہوش و خرد سے یکسر بے گانہ ہو جائے گا۔ وہ وقت کب آئے گا' یہ مَیں نہیں کہہ سکتا۔"

"کیا اُس کی یہ مجنونانہ کیفیت اُس کی حکمرانی پر اثر انداز ہوئی ہے؟"

"ہاں۔ اگر اُسے ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ کوئی اُس کے وقار اور اقتدار کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے تو وہ دیوانہ وار تشدد کرنے پر اُتر آتا ہے۔"

"پھر تو یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جا سکے گی اور اُس کے خلاف بغاوت ہو جائے گی۔"

"لیکن اس بغاوت کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ شاہ ضرغام اپنی مجنونانہ کیفیت کے باوجود سلطنتِ بہرام کی سالمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اگر اُسے اقتدار سے محروم کر دیا گیا تو سلطنت کے ایک حصے پر منگول اور دُوسرے پر قزاق قابض ہو جائیں گے اور وہ عوام کے ساتھ ضرغام سے بھی زیادہ بُرا سلوک کریں گے۔ اس لیے جب تک ضرغام کا کوئی

ہر نعم البدل نہ ملے' وہاں بغاوت نہ ہو تو اچھا ہے۔"

"تمہارے خیالات بھی شہزادہ آلپ کے خیالات سے ملتے ہیں۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہ اماراتِ خمسہ کے مشترکہ بیڑے کا امیر البحر اور میرے شوہر کا دوست ہے۔ مَیں امورِ سلطنت میں اکثر اُس سے مشورہ لیا کرتی ہوں۔"

رہنے دو۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ فی الوقت مجھے آسودگی کی ان گھڑیوں سے پُورا پُورا خراج وصول کر لینے دو۔"

اور ہم ایک بار پھر آسودگی کے ان لمحات سے خراج وصول کرنے میں مصروف ہو گئے۔

● دُوسری صبح جب مَیں بیدار ہوا تو مَیں نے دیکھا کہ ترشینا نرم تکیوں کے ایک ڈھیر پر جھکی ہوئی ایک خریطے پر کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ مَیں خاموشی سے لیٹا اُسے دیکھتا رہا۔ جب وہ لکھنے سے فارغ ہوئی تو خریطہ لپیٹتے ہوئے بولی: "مَیں شہزادہ آلپ کو خط لکھ رہی ہوں۔"

"وہ کون ہے؟" ایک بار پھر میرے مُنہ سے یہ سوال نکل گیا۔

"مَیں نے بتایا تو تھا مگر وہ اُس کا اُدھورا تعارف تھا۔ دراصل آلپ کے دادا سے شاہ ضرغام کے دادا نے سلطنتِ بہرام چھین لی تھی اور آلپ کے دادا کو اماراتِ خمسہ میں پناہ لینا پڑ گئی تھی۔ والیانِ اماراتِ خمسہ آلپ کے باپ دادا اور خود آلپ کی مدد تو کرتے آ رہے ہیں اور انھوں نے آلپ کو ایک بڑا عہدہ بھی دے رکھا ہے لیکن سلطنتِ بہرام کی بازیابی کے لیے وہ اُس کی کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں۔"

"کیا یہ زیادتی نہیں؟"

ترشینا نے جواب دیا تو بے حد سنجیدہ تھی۔ "اماراتِ خمسہ کی مجموعی طاقت سلطنتِ بہرام کی طاقت سے نصف بھی نہیں لہٰذا وہ اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر اس وقت ضرغام کے خلاف فوج کشی کی جائے تو کامیابی کا قوی امکان ہے کیونکہ اُس کے رویے نے اُس کے اپنے آدمیوں کو اندرونی طور پر اُس کا دشمن بنا دیا ہے۔"

"تو کیا آپ کے خیال میں شہزادہ آلپ کو سلطنتِ بہرام پر حملہ کر دینا چاہیے؟"

"مَیں یہ تو نہیں جانتی لیکن یہ ضرور چاہتی ہوں کہ سارے حالات اُس کے علم میں آ جائیں تو بہتر ہے۔"

"کیا تمہارے خیال میں وہ ضرغام سے بہتر ثابت ہو سکتا ہے؟"

"یقیناً... مَیں نے اُسے بلایا ہے تاکہ وہ تم سے معلومات حاصل کر سکے۔"

"وہ کب آئے گا؟"

"معلوم نہیں۔ آج کل وہ اس کوشش میں ہے کہ اُس کی شادی اماراتِ نیلاب کے والی کی بیٹی شہزادی عنبر سے ہو جائے۔ اس لیے اُسے خفیہ طور پر تنہا آنا پڑے گا۔"

●

ملکہ ترشینا اپنی رعایا میں اس لیے قدر و احترام سے دیکھی جاتی تھی کہ وہ تقریباً روزانہ رفاعی کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ وہ دُور دراز علاقوں میں جا کر عوام کے حالات معلوم کرتی' اُن کی ممکنہ آسائشوں کا خیال رکھتی' امورِ سلطنت کی انجام دہی کے لیے مجلسِ مشاورت کے اجلاس بلاتی اور فوجی کیمپوں کا معائنہ کرتی رہتی تھی۔ وہ اس محل میں کبھی کبھی تعطیلات منانے آتی تھی ورنہ اُس کا بیشتر وقت اُسی قدیم سنگی قلعے کے درمیان سیل زدہ رہائش گاہ میں گزرتا تھا جو شہر میں واقع تھا۔

جب وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوتی' مَیں چپکے سے بندرگاہ جا کر اپنے لوگوں سے مل آتا تھا۔ کشتی کی مرمت تسلی بخش طور پر جاری تھی اور ملاح سیر و تفریح میں اپنا وقت گزار رہے تھے۔ پرنیال کے لوگ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

روزانہ میرے دو چار گھنٹے ملکہ ترشینا کے کمانڈر کے ساتھ بھی گزرتے تھے۔ یہ کمانڈر وہی تھا جو پہلے دن تین افسروں کے ساتھ ہماری کشتی پر آیا تھا۔ وہ خاصا سمجھ دار آدمی تھا اور پرنیال کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک روز اُس نے مجھے بتایا: "تین سو سال پہلے میرے آبا و اجداد اماراتِ پرنیال کے والی تھے لیکن ملکہ کے اجداد نے سازش کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ تاہم اب ہمیں اس بات کا کوئی دُکھ یا شکوہ نہیں ہے۔ ہم ملکہ اور امارات کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں۔"

●

کمانڈر سے اس ملاقات کے دو روز بعد ایک خبر نے پرنیال میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی۔ قزاقوں کی ایک کشتی جزیرے کے شمالی ساحل کے قریب طوفان کا شکار ہو کر غرق ہو گئی تھی۔ اس کشتی کا آدھا عملہ تو ڈوب گیا لیکن آدھے لوگ تیر کر ساحل پر پہنچے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں گرفتار کرنے والے دستے کی قیادت خود ملکہ ترشینا کر رہی تھی۔ گرفتار شدگان نے جو کچھ بتایا وہ اہلِ پرنیال بلکہ پوری اماراتِ خمسہ کے لیے پریشان کن تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ منگولوں کی ایک فوج خلیج الجزائر کے سامنے سمندر کے ساحل پر خیمہ زن ہے اور اُنھوں نے قزاقوں کے پاس ایک وفد بھیجا ہے کہ وہ اُن کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ اُنھوں نے یہ بتائی ہے کہ وہ قزاقوں کے ساتھ دوستانہ معاہدے کے بعد سلطنتِ بہرام پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور انھیں سلطنت کی شمالی سرحد تک پہنچنے کے لیے قزاقوں کی مدد درکار ہے جس کے عوض

وہ قزاقوں کو سلطنت کے ساحل پر بندرگاہیں بنانے اور بستیاں بسانے کی اجازت دے دیں گے اور قزاق بڑی آسانی سے سلطنتِ بہرام کے مختلف علاقوں میں لوٹ مار کر سکیں گے۔

قزاقوں کے اس بیان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ شمال کی طرف سے قزاق اور جنوب سے منگول حملہ کریں گے تو شاہ ضرغام کو بیک وقت دو، دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا جس سے اس کی فوجی طاقت دو حصوں میں بٹ کر کمزور ہو جائے گی اور جب قزاقوں کو ضرغام کے بحریے سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا تو وہ اماراتِ خمسہ کی طرف بڑھیں گے۔ چنانچہ ملکہ ترشینا نے کہا: "اگر قزاق اماراتِ خمسہ کی طرف آئے تو برنیال سب سے پہلے اُن کے راستے میں پڑے گا۔ اس لیے منگولوں اور قزاقوں کا یہ گٹھ جوڑ میرے عوام کے لیے بے حد خطرناک ہے۔"

اب ہمیں شہزادہ آلپ کا انتظار تھا تاکہ اس سلسلے میں اس کی رائے بھی معلوم کی جا سکے۔ حسنِ اتفاق سے وہ دو روز بعد ہی برنیال پہنچ گیا جبکہ قزاقوں والی یہ خبر زوروں پر گرم تھی۔

شہزادہ آلپ تنہا نہیں آیا تھا بلکہ اس کے ساتھ تیس توانا محافظ بھی آئے تھے۔ ملکہ نے اس سے کہا: "کیا بات ہے شہزادے، تم نے محافظوں کی تعداد اتنی زیادہ کیوں بڑھا دی ہے؟"

"میں کسی کو یہ تاثر تو نہیں دینا چاہتا کہ اپنی جان کے خوف سے اتنے زیادہ محافظ اپنے ساتھ رکھتا ہوں لیکن ضرغام کے بارے میں جو اطلاعات ملی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں پر دیوانہ وار حملے کر رہا ہے۔ اگر وہ قزاقوں کی سرکوبی کے لیے فوج اور بحریہ بھیج سکتا ہے تو مجھے ختم کرنے کے لیے چند قاتل بھیج دینا اس کے ایک اشارۂ ابرو کا کام ہے مگر میں آسانی سے اس کے آدمیوں کا شکار نہیں بننا چاہتا۔"

شہزادہ آلپ کی بات سے میں پوری طرح یہ اندازہ نہ کر سکا کہ فوج اور بحریہ بھیجنے سے اس کی مراد وہ لڑائی ہے جس میں ہم بھی شامل تھے یا ضرغام قزاقوں کی سرکوبی کے لیے مزید فوج اور بحریہ بھیجنے والا ہے۔ اتنے میں وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ کہستانِ منگول اور صحرا کے پار سلطنتِ آریانہ جیسی کوئی سرزمین ہے تاہم مجھے تم جیسے جہاں گرد اور جنگجو سے مل کر خوشی ہوئی ہے جو ملکہ ترشینا جیسی ذی فہم ہستی کا دوست بھی ہے۔"

ترشینا اپنی تعریف پر قدرے شرما سی گئی اور بولی: "میرا خیال ہے کہ ہم ان مسائل پر علیحدگی میں بات چیت کریں جہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ ہو۔"

چنانچہ ہم تینوں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں کھانا چُنا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران ہم باتیں کرتے رہے۔ جب خالی برتن اُٹھا لیے گئے تو میں نے آلپ سے کہا: "آپ نے بتایا تھا کہ شاہ ضرغام قزاقوں کی سرکوبی کے لیے فوج اور بحریہ بھیجنے والا ہے۔ ذرا اس کی تفصیل تو بتائیے۔"

"مجھ تک پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق اُس نے دو سو سے زائد جنگی کشتیاں اور جہاز اکٹھے کیے ہیں۔ اُن پر کتنے فوجیوں کو بھیجا جا رہا ہے، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ تاہم اندازاً وہ دس ہزار سے زیادہ ہوں گے۔"

"وہ قزاقوں کو پیس دینا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس اتنے ملاح کہاں سے آئے ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"جبری بھرتی کے ذریعے۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے فرار ہونے والی کشتی کے عملے کو بھی معاف کر دیا ہے تاکہ انہیں بھی دوبارہ اپنے بحریے میں شامل کر سکے۔"

"ضرغام اور معافی!... یہ ناممکن ہے جناب۔ یہ صرف ایک جھانسہ ہے تاکہ وہ اُن سب کو تڑپا تڑپا کر مارے جو فرار ہو گئے تھے ویسے ضرغام کی تیاریوں پر قزاقوں کا ردِ عمل کیا ہے؟"

"انہیں ابھی ضرغام کی تیاریوں کا علم ہی نہیں ہو سکا۔ منگولوں کے ساتھ ان کا اتحاد صرف اسی طرح فائدہ مند ہو سکتا ہے کہ وہ سلطنتِ بہرام کی سرحدوں پر حملے کر دیں لیکن منگولوں کے پاس کشتیاں اور جہاز نہیں ہیں۔ اگر قزاقوں کو ضرغام کے ارادے کا علم ہو جائے تو وہ یقیناً اس سے خوف زدہ ہو جائیں گے اور منگولوں سے معاہدہ کر لیں گے۔"

میں شہزادہ آلپ کے اسی تجزیے کا منتظر تھا۔ چنانچہ میں نے کہا: "مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے جناب۔ اگر وہ ضرغام سے خوفزدہ ہو جائیں تو ہم قزاقوں سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

میری اس بات پر ملکہ اور آلپ نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا: "وہ اس طرح کہ ہم ان سے ملیں اور انہیں اپنے ساتھ ملا لیں۔"

"تم ہوش میں تو ہو سرفروش؟" آلپ بے ساختہ بولا۔

"ہاں جناب۔ میں نے یہ بات بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔ اگر ہم خاموشی سے بیٹھے منگولوں اور قزاقوں کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کا تماشا دیکھتے رہے تو ہم سے بڑا احمق کوئی نہیں ہو گا۔"

"میں اس سلسلے میں تفصیل جاننا چاہوں گا۔"

"یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ضرغام کے ارادے کی خبر پا کر قزاق گھبرا جائیں گے اور کسی بھی ایسے فریق سے معاہدہ کرنے پر تیار ہو جائیں گے جو ان کی مدد کر سکے۔ اب فرض کیجیے کہ اگر منگول اُن کی مدد نہیں کرتے تو اُن کی بجائے آپ یا اماراتِ خمسہ اُن کی مدد..."

"تم پاگل ہو گئے ہو سرفروش۔" آلپ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "والیانِ امارات کسی بھی ایسے منصوبے میں ملوث نہیں ہوں گے

جس کے لیے انھیں ضرغام سے جنگ لڑنا پڑے۔ دُوسرے مجھے اپنے عہدے سے ہاتھ دھونے کے ساتھ ساتھ شہزادی عنبر سے شادی کا خیال بھی دِل سے نکال دینا پڑے گا۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے پر میری گردن اُڑا دی جائے۔"

"والیِ نیلاب کے متعلق تو تمھارا یہ خیال ٹھیک ہو سکتا ہے۔" آلپ، ملکہ بولی: "کہ تمھارا ہونے والا سسر کمزور دل آدمی ہے لیکن کیا باقی والیانِ امارات بھی اُسی جیسے ہیں؟"

"نہیں۔"

"اگر اُن میں سے کوئی ایک تمھاری تجویز سے متفق ہو جائے تو کیا باقی اُس کی تقلید نہیں کریں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ کریں گے۔"

"تو پھر تمھیں سرفروش کی تجویز پر عمل کرنا چاہیے۔" ملکہ نے اسے کہا: "اس سلسلے میں تم اور کیا کہنا چاہتے ہو سرفروش؟"

"اگر شہزادہ آلپ قزاقوں سے ملیں اور دوستی و تعاون کا یقین دلائیں تو وہ اُن کے ساتھ معاہدے پر تیار ہو جائیں گے اور انھیں منگولوں پر ترجیح دیں گے کیونکہ منگولوں کے پاس کشتیاں اور جہاز نہیں ہیں۔ وہ صرف خشکی پر اچھے جنگجو ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر شہزادہ آلپ کو ایک یا دو امارتوں کی تائید حاصل ہو گئی تو یہ خاصے طاقت ور ہو جائیں گے اور اگر پانچوں امارتیں ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو جائیں تو یہ قزاقوں کی مدد سے ضرغام کو شکست دے کر اپنے اجداد کی کھوئی ہوئی سلطنت پھر سے حاصل کر لیں گے۔"

"سوچنے کی حد تک یہ باتیں ٹھیک ہیں۔" آلپ بولا: "لیکن عملی طور پر ان کے واقعی وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں یا نہیں جن کی تم توقع رکھتے ہو۔"

میں آدھی رات تک اسے اپنی دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر وہ بولا: "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بڑے ذی فہم ہو شہزادے اور جب کوئی منصوبہ بناتے ہو تو اُس کی تمام تر جزئیات پر بھی نگاہ رکھتے ہو۔ تمھارا یہ منصوبہ اگرچہ میرے لیے خودکشی کے مترادف ہے لیکن میں اسے محض اس لیے قبول کر رہا ہوں کہ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش تماشائی کی مانند بیٹھے رہنا بھی حماقت ہو گی۔"

"تو کیا آپ مجھے اور کہسار کے عملے کو اپنے ساتھ لے جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" آلپ بولا: "بلکہ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا تم مجھے اور میرے آدمیوں کو قزاقوں کے پاس خلیج الجزائر لے جا سکتے ہو؟"

"ضرور۔" میں نے جواب دیا: "حالانکہ میرے عملے کے کچھ لوگ وہاں جانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ انھیں قزاقوں سے نفرت ہے۔"

"کیا تمھیں اپنے عملے کی وفاداری پر شک ہے؟"

"نہیں۔ وہ تو اسی اُمید پر زندہ ہیں کہ ضرغام ختم ہو تاکہ وہ دوبارہ اپنے گھروں کو جا سکیں۔"

"بس تو پھر اپنے عملے کی ذمّے داری تم پر ہے۔" آلپ نے فیصلہ کُن انداز سے کہا اور محفل برخاست ہو گئی۔

◙

تیسرے روز 'کہسار' نے خلیج الجزائر کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ ملکہ ترشینا بھی ہمارے ساتھ آنا چاہتی تھی مگر میں نے یہ کہہ کر اُسے منع کر دیا کہ ہماری کشتی پر کسی خاتون کے سفر کرنے کی آسائشیں نہیں ہیں۔ اس لیے اُس نے اپنا کمانڈر، اُس کے دو ذاتی محافظ اور بارہ بہترین جنگجو ہمارے ساتھ بھیج دیے اور کہا: "تم نے مجھے اپنی دلیل سے قائل کر کے ساتھ چلنے پر تو مجبور کر دیا ہے مگر اب جلدی لوٹ آنا اور کامیاب لوٹنا۔"

سفر کے دُوسرے دن ملکہ ترشینا کے کمانڈر نے ایک ایسا شوشہ چھوڑا جس پر میرے علاوہ کشتی کے ہر فرد کے کان کھڑے ہو گئے اور انھیں کمانڈر کی بات میں بڑا وزن نظر آیا۔ اُس نے کہا تھا: "بہت ممکن ہے کہ قزاق ہمارے خلوصِ نیت پر یقین نہ کریں اور اگر انھیں یقین نہ آیا تو صلح و آشتی کے سفید پرچم کے باوجود جونہی ہماری کشتی اُن کی توپوں کی زد میں آئے گی، وہ گولہ باری کر کے ہمیں نیست و نابود کر دیں گے۔ اس لیے بہتر یہ ہو گا کہ ہم اپنے ساتھ کوئی ایسا ثبوت بھی لے جائیں جو انھیں ہماری باتوں اور خلوصِ نیت کا یقین دلا سکے۔"

"اس کی ضرورت نہیں کمانڈر۔" مجھ سے پہلے ارغون بول اُٹھا۔ "قزاق بھی صلح و آشتی کے پرچم کا احترام کرتے ہیں۔"

کمانڈر نے ارغون کی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ وہ کبھی کسی کم رتبہ آدمی کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: "میں سچ کہتا ہوں شہزادے کہ قزاق ہماری باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ ہاں اگر ہم شاہی بحریے کا کوئی جہاز پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائیں تو وہ فوراً یقین کر لیں گے کہ ہم ضرغام کے خلاف ہیں اور یہی بات انھیں ہم سے دوستی کے معاہدہ و تعاون کے لیے مجبور کر دے گی۔"

"خیال تو اچھا ہے کمانڈر مگر ہمیں شاہی بحریے کا جہاز کہاں سے ملے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میری اطلاعات کے مطابق شاہ ضرغام نے اپنے کچھ جہاز امارات خمسہ کے ساحلوں پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیج دیے ہیں۔" کمانڈر بولا۔

"وہ اماراتِ خمسہ کے ساحل پر اپنے جاسوس اور قاتل اُتارنا چاہتا ہو گا۔" شہزادہ آلپ نے خیال ظاہر کیا۔

"شاید۔" کمانڈر نے کہا: "لیکن اگر ہم اُن جہازوں میں سے ایک پر کسی طرح قبضہ کر لیں تو نہ صرف قزاقوں کو اپنی بات کا بہ آسانی یقین دلا سکیں گے بلکہ اماراتِ خمسہ کے والی بھی متفقہ طور پر آپ کی مدد کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

شہزادہ آلپ کمانڈر کی بات پر اثبات میں سر ہلا کر کچھ سوچنے لگا لیکن میرے نزدیک شاہی بحریے کے جہازوں پر حملہ کرنا حماقت تھی۔ دُوسرے اگر کمانڈر کو ضرغام کے جاسوس جہازوں کی آمد کا علم ہو چکا تھا تو اُس نے یہ بات وہاں پر نیال میں کیوں نہیں بتائی تھی۔ لیکن میں محض اس لیے کھُل کر کمانڈر کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بات شہزادہ آلپ کے دل کو لگی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا: "کمانڈر بالکل ٹھیک کہتا ہے سرفروش۔ اگر شاہی بحریے کا جہاز ہمارے ہاتھ لگ گیا تو اماراتِ خمسہ کا مشترکہ بیڑا اور فوج بڑی آسانی سے مل جائے گی۔"

میں نے شہزادہ آلپ کی تائید یا تردید کرنے کی بجائے خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھا اور کیبن سے نکل کر مُسکان پر آ گیا۔

دُوسری صبح طلوعِ آفتاب کے وقت دیدبان پر چڑھے ہوئے ملاح نے "جہاز... جہاز" چلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ تو میں بھی مستول پر چڑھ گیا۔ دُور افق پر کسی جہاز کے دو بڑے بڑے مستول دکھائی دے رہے تھے۔

ملاح کی آواز پر شہزادہ آلپ اور کمانڈر بھی عرشے پر آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب جہاز قریب آ گیا تو کمانڈر چلایا: "یہ جہاز شاہی بحریے کا ہے۔"

"موقع اچھا ہے سرفروش۔ جیسے بھی ہو اس پر قبضہ کیا جائے۔" آلپ نے فیصلہ سُنا دیا۔ اب میرے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے چلا چلا کر احکامات دینا شروع کر دیے۔

میرے دو سو آدمی جو تلواروں، تیر کمانوں، کلہاڑوں اور توڑے دار بندوقوں کا استعمال بخوبی جانتے تھے، اپنے اپنے ہتھیار چپو چلانے والی بنچوں کے نیچے رکھ کر ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ باقی توپوں اور منجنیقوں کے ساتھ ساتھ عرشے پر صف آرا ہو گئے تاکہ موقع ملتے ہی جہاز پر جا سکیں۔ شہزادہ آلپ اپنے محافظوں اور کمانڈر اپنے سپاہیوں کے حلقے میں کشتی کے اگلے اور پچھلے حصوں میں مستعد تھے۔ میں نے دیکھا، آلپ کے چہرے پر جوش جھلک رہا تھا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

نقارچیوں نے کشتی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے لے تال بڑھا دی لیکن میں نے انھیں تال مدھم کرنے کا حکم دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے آدمی تھک جائیں۔ انتظامات کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ شہزادہ آلپ زرہ بکتر پہنے ہوئے ہے اور خنکی کے باوجود پسینے میں شرابور ہو رہا ہے۔ اُس کے برعکس کمانڈر نے خود پہنا تھا نہ ہی زرہ بکتر۔ اُس کے پاس صرف ایک تلوار اور ایک خنجر تھا مگر وہ بھی پسینے سے شرابور تھا۔ وہ اسلحہ اور زرہ بکتر کی بجائے رفتارِ جنگ کا قائل معلوم ہوتا تھا لیکن شاید اپنی بیس سالہ ملازمت کے دوران اُسے جنگ لڑنے کا عملی تجربہ نہیں تھا ورنہ وہ اتنی بے پروائی نہ برتتا۔

میں نے شاہی جہاز کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ بھی چوکنا ہو گیا ہے۔ اُس کے بادبان بھی لپیٹ لیے گئے ہیں اور عملہ اپنی اپنی جگہ مستعد ہے۔ میں نے کشتی کی رفتار بڑھانے کا حکم دیا تاکہ کاوا کاٹ کر جہاز کے درمیانی حصّے کی سیدھ میں آ جائے۔ اتنے میں جہاز کے عرشے پر سفید رنگ کا دُھواں اُبھرا اور چند لمحوں بعد ہماری کشتی سے کوئی تین سو گز کے فاصلے پر توپ کے اُگلے ہوئے گولے نے پانی میں تلاطم برپا کر دیا۔ یہ دیکھ کر کمانڈر بولا: "اُن کا توپچی اناڑی معلوم ہوتا ہے۔"

"اتنا بھی نہیں کہ اُس کا تیسرا چوتھا گولا ہمیں نشانہ نہ بنا سکے۔" میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ کمانڈر کو شاید معلوم نہیں تھا کہ جہاز کے توپچی اندازہ لگانے کے لیے گولے داغ رہے ہیں۔ میں نے کشتی کی رفتار ایک دم تیز کروا دی تاکہ وہ آگے بڑھ کر توپوں کی زد سے نکل جائے اور یہی ہوا۔ اب کے گولے ہماری کشتی کے اُوپر سے سنسناتے ہوئے سو گز دُور جا گرے۔

میرے ملاح اگرچہ پسینے سے شرابور ہو گئے تھے مگر بیشتر کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ کچھ کی نگاہیں اپنے اسلحہ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ انھیں استعمال کرنے کے لیے مضطرب نظر آ رہے تھے۔ میں بڑی توپ کے پاس آیا اور تلوار لہراتے ہوئے دہاڑا: "کہسار کے جوانو... حملے کے لیے تیار رہو۔ نقارچیو۔ طبلِ جنگ بجاؤ۔"

کشتی کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ طبلِ جنگ نے جوانوں کے سینے جوش سے معمور کر دیے۔ جہاز قریب تر آنے لگا۔ توپچیوں نے فلیتے سلگا لیے اور میرے اشارے کا انتظار کرنے لگے۔ کشتی کچھ اور آگے بڑھی تو میں نے توپیں داغنے کا اشارہ کیا۔ بیک وقت چار توپوں نے گولے اُگلے اور اُن میں سے دو نشانے پر بیٹھے تو میں بے ساختہ چلّا یا۔

"شاباش جوانو۔"

توپچی مسکرائے اور دوبارہ توپوں میں گولے ڈالنے لگے۔ میں نے کمانڈر کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے عرشے پر کھڑے جوانوں کو لیٹ جانے اور جہاز پر کُودنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا تو شہزادہ آلپ کے محافظ اُسی طرح کھڑے رہے۔ میں غصّے سے دہاڑا: "لیٹ جاؤ۔"

شہزادہ آلپ نے میری آواز پر انھیں تعمیلِ حکم کا اشارہ کیا اور خود میرے پاس آگیا۔ اب دونوں طرف سے اندھا دُھند گولہ باری جاری تھی مگر میں اس تاک میں تھا کہ ہماری کشتی جہاز کے متوازی آ جائے تاکہ اُس کے پہلو میں جا کر میں اپنے جوانوں کو جہاز پر بھیج سکوں اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا۔ کشتی تیزی سے گھومی تو ایک جانب جُھک کر جہاز کے پہلو میں آ گئی۔ میں اور کمانڈر نے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے ریلنگ تھام لی لیکن شہزادہ آلپ اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑا رہا۔ اُس کی یہ جرأت قابلِ داد تھی کیونکہ دشمن آسانی سے اُسے اپنا نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے جہاز کی طرف دیکھا تو مجھے بڑا تعجب ہُوا کیونکہ جہاز کا عرشہ خالی تھا۔ کچھ لوگ اگلے اور کچھ پچھلے سرے پر کھڑے تھے۔ درمیانی حصّے میں چند ملّاح کلہاڑے لیے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کمانڈر بولا: "میرا خیال ہے کہ جہاز پر توپچیوں کے سوا کوئی سپاہی وغیرہ نہیں ہیں۔"

"یہ اُن کا مسئلہ ہے کمانڈر۔" میں نے جواب دیا۔ "اور اگر ایسا ہے تو ہمارے لیے جہاز پر قبضہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔"

یہ سُن کر کمانڈر کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ شاید اُسے یہ توقع نہیں تھی کہ ہم جہاز پر اتنی آسانی سے قابو پا لیں گے۔

ہماری توپیں مسلسل گولے برسا رہی تھیں اور جہاز کے تختے اُن سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُڑ رہے تھے۔ اتنے میں میرے ملّاحوں نے اپنے چپّو اندر کر لیے کیونکہ کشتی اب جہاز سے ٹکرانے والی تھی۔ عرشے پر لیٹے ہوئے جوانوں نے تو جہاز پر رسّے پھینکنے بھی شروع کر دیے تھے اور اُوپر چڑھنے والے تھے کہ جہاز کے درمیانی حصّے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو انکشاف ہُوا کہ مسلح سپاہیوں کے جتھے جہاز کے نچلے حصّے سے عرشے پر آ رہے ہیں اور ان سپاہیوں کی وردیاں مظہر تھیں کہ وہ عقابی فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ دشمن نے ہمیں یہ تاثر دینے کے لیے کہ جہاز پر کوئی فوجی دستہ نہیں ہے، انھیں جہاز کے نچلے حصّے میں چھپا رکھا تھا اور منتظر تھا کہ جونہی وہ ہماری کشتی کے نزدیک پہنچے، عقابی فوج کے جنگجو جوان جہاز سے ہماری کشتی پر کُود جائیں۔ اس صُورتِ حال میں دشمن کی اسکیم کامیاب رہی تھی اور ہم خود ہی اپنی کشتی جہاز کے نزدیک لا کر موت کے شکنجے میں پھنس گئے تھے۔ میں اُس وقت جب میں یہ جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ اب ہمیں کیا اقدام کرنا چاہیے، ملکہ ترشینا کا کمانڈر تلوار لہرا کر میری طرف لپکا اور اگر لاشعوری طور پر جھکائی دے کر قلابازی نہ لگاتا تو اُس کا بھرپور وار میری گردن اُڑا چکا ہوتا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اُس نے یہ حرکت کیوں کی ہے۔ ابھی میں دُوسری قلابازی لگا کر اُٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کمانڈر شاہی جہاز سے پھینکے ہوئے ایک رسّے سے لٹک چکا ہے اور اب وہ رسّہ تیزی سے جہاز پر کھینچا جا رہا ہے۔" اوہ۔" بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا اور اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، جہاز سے تیر اور گولیاں برسنے لگیں اور عقابی فوج کے جوانوں نے میرے ساتھیوں کے پرخچے اڑانے شروع کر دیے۔

جہاز کی ایک توپ نے ہماری کشتی پر رکھی بڑی توپ کو نشانہ بنایا تو توپ لڑھک کر کشتی کے نچلے حصّے میں اٹک گئی اور توپچی اس کے نیچے آ کر گوشت کے لوتھڑوں میں بدل گیا۔ میں نے شہزادہ آلپ کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر خُون کی لکیریں اُبھر رہی تھیں۔ شاید جہاز سے چلائی جانے والی توڑے دار بندوقوں کے چھرّوں نے اسے زخمی کر دیا تھا۔ اُوپر سے برسائے جانے والے پتھروں کے باعث اُس کی زرہ بکتر کہیں کہیں پچک گئی تھی مگر وہ مردانہ وار ڈٹا ہُوا اپنے محافظوں کو احکام دے رہا تھا۔ وہ بھی اپنی توڑے دار بندوقوں سے عقابی فوج کے جوانوں کو نشانہ بنا رہے تھے مگر ایک مرتا تو دو اُس کی جگہ آ جاتے۔

اس صُورتِ حال میں ہمارے بچاؤ کی صرف یہی ایک ترکیب باقی رہ گئی تھی کہ کہسار جلد از جلد جہاز سے دُور ہو جائے تاکہ میرے ساتھی بندوقوں اور تیروں کا نشانہ نہ بن سکیں اور عقابی فوج کو جہاز سے کشتی پر کُودنے کا موقع بھی نہ مِل سکے۔ اس لیے میں پھیپھڑوں کی پُوری قوت سے چلّایا۔

"ملّاحو... چپّو سنبھالو اور کشتی دُور ہٹاؤ۔"

ملّاحوں نے فی الفور میرے حکم کی تعمیل کی جبکہ عرشے پر موجود ساتھی عقابی فوج کے تیروں اور بندوقوں کی فائرنگ کا جواب دے رہے۔ کشتی پہلے جہاز کے پہلو سے ہٹی اور پھر تیزی سے آگے بڑھی۔ دیکھ کر شہزادہ آلپ بولا: "یہ کیا کر رہے ہو سرفروش۔ ہم اُس غدار کو نہیں بخشیں گے۔ کشتی جہاز کے قریب رہنے دو۔"

"یہ ناممکن ہے شہزادے۔ جہاز پر ہم سے کہیں زیادہ عقابی فوج کے جوان موجود ہیں۔ اس طرح ہمارا ہر آدمی مارا جائے گا۔ کمانڈر نے ہمیں دھوکا دے کر موت کے مُنہ میں پھنسوا دیا ہے لیکن ہمیں کسی طرح موت کی گرفت سے نکلنا ہے۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے آگے بڑھا اور توپچیوں کو ہدایات دینے لگا۔ چھوٹی توپوں کے گولے اُگلنے لگے جنھوں نے جہاز کو اپنے بچاؤ کے لیے رُخ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ہماری کشتی کو اُس کی توپوں کی مدد سے نکل جانے کا موقع مِل گیا۔ اب میں نے بادبان بھی کُھلوا دیے جو جلد ہی ہوا سے بھر گئے۔ اس طرح کشتی کی رفتار دُگنی ہو گئی اور ہم بہت جلد دشمن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

اب میں نے اپنے نقصانات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ دشمن

گولوں نے ہماری کشتی میں چھ سوراخ کر دیے تھے مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ سوراخ کشتی کے اُوپری حصّے میں ہوئے تھے جن سے پانی اندر نہیں آسکتا تھا۔ مَیں نے کچھ آدمی وہ سوراخ بند کرنے پر لگا دیے اور باقی لوگوں کو وہ بڑی توپ اُوپر کھینچنے پر مامور کر دیا جو پیچھے ہٹ کر نچلے حصّے میں اٹک گئی تھی۔

اب مَیں نے اپنے جانی نقصان کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ میرے تیس آدمی مارے گئے ہیں اور پچاس سے زیادہ زخمی ہو گئے ہیں۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جو میرے ساتھ لڑتے رہے تھے۔ شہزادہ آلپ بھی زخمیوں میں شامل تھا۔ اُس نے درد سے کم اور دُکھ سے زیادہ کراہتے ہوئے کہا: "یہ سب میرا قصور ہے سرفروش۔ مَیں ہی اُس غدّار کمانڈر کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اس لیے مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" یہ کہہ کر وہ کشتی سے پانی میں کودنا چاہتا تھا کہ مَیں نے اسے پکڑ لیا اور کہا۔

"بہادر ہو کر بزدلوں والی حرکت مت کرو شہزادے۔ جنگ میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ تم شاہی بحریے کا جہاز پکڑ کر قزاقوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے نا کہ ہم ضرغام کے دشمن ہیں۔ اب ہماری کشتی کی حالت اور زخمی انھیں یہ یقین دلا دیں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن... لیکن پتہ نہیں وہ غدّار کمانڈر ضرغام کو کیا بتلائے گا اور وہ دیوانہ بادشاہ کیا اقدام کرے گا۔"

"کمانڈر اسے ہمارے منصوبے کی ایک ایک بات بتلائے گا شہزادے۔ لیکن وہ اُسے یہ یقین نہیں دلا سکے گا کہ امارات خمسہ بھی تمھاری مدد کرنے کو تیار ہیں۔ اس لیے شاید ضرغام امارات خمسہ پر حملہ نہ کرے۔"

"لیکن وہ پاگل ہے سرفروش۔ وہ کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔"

"اس کے باوجود مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ اتنا پاگل اور احمق نہیں کہ خواہ مخواہ امارات پر حملہ کر دے۔ جب کمانڈر خود یہ نہیں جانتا کہ امارات تمھاری مدد کریں گی تو وہ ضرغام سے کیسے یہ جھوٹ بول سکتا ہے۔"

"مگر وہ یہ تو بتا سکتا ہے کہ ملکہ ترشینا ہماری حامی و مددگار ہے۔"

"ہاں۔"

"اس صورت میں ضرغام پرنیال پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔"

"اگر ضرغام پرنیال پر حملے کی غلطی کر بیٹھا تو اسے اپنے بیڑے کے بیشتر اور تقریباً آدھی فوج سے ہاتھ دھونا پڑے گا کیونکہ پرنیال دفاعی طور پر بہت مضبوط ہے۔"

اُس شب ہم نے تُوما اور دُوسرے مرنے والوں کی لاشیں اعزاز کے ساتھ سمندر کی نذر کر دیں اور شمال کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ وہاں قزاق ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے لیکن اب ان سے بات چیت ناگزیر ہو گئی تھی۔

مَیں نے توپیں اور بندوقیں کسی بھی وقت داغنے کے لیے تیار کروا دی تھیں۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ اگر غدّار کمانڈر نے ضرغام کو پیغام بھجوا دیا تو وہ ہماری سرکوبی کے لیے جنگی کشتیاں بھیج سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہی اقدام بحریے کا کوئی بڑا افسر کر بیٹھے۔ اسی باعث ہم ہر وقت کسی جھڑپ کے لیے تیار تھے۔ میرے ساتھ ساتھ شہزادہ کو بھی اب پُورا پُورا یقین تھا کہ میرے ساتھی اپنے آپ کو ضرغام کے حوالے کرنے کی بجائے مرجانا زیادہ پسند کریں گے۔

شاہی جہاز سے جنگ کے آٹھویں روز ہم خلیج الجزائر کے قریب پہنچ گئے اور ہم نے اپنی کشتی کا رُخ اُس پہاڑی علاقے کی طرف کر دیا جہاں قزاقوں کی نگہبان چوکیاں تھیں مگر اُس طرف جانے سے پہلے ہم نے مستولوں پر سفید پرچم نصب کر دیے تھے۔

اگرچہ ارغون اب بھی پُورے یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ قزاق سفید پرچم کا احترام کرتے ہوئے ہم پر حملہ نہیں کریں گے مگر اس کے باوجود مَیں نے اپنے عملے کو جوابی حملے کے لیے تیار رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قزاق نفسیاتی طور پر خوفزدہ ہو چکے ہیں اور خوفزدہ لوگ اکثر بوکھلا کر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جن کی توقع نہیں ہوتی۔

ہم نے ساحل سے چار میل دُور لنگر ڈال دیے تاکہ دُور مار توپوں کی زد سے باہر رہیں۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ ہمیں ساحل سے کوئی اشارہ ملے گا مگر نہ ہمیں کوئی اشارہ ملا اور نہ قزاقوں نے ایک دُوسرے کو کوئی اشارہ دیا یہاں تک کہ آفتاب غرُوب ہو گیا۔ تب مَیں نے آدھے آدمیوں کو سونے اور آدھے کو جاگنے اور چوکنّا رہنے کی ہدایات دے دیں۔

رات بخیر و خوبی گزر گئی۔ دُوسرے دن اور دُوسری رات بھی جب نہ کوئی اشارہ ملا اور نہ کوئی کشتی کی طرف آیا تو شہزادہ آلپ گھبرا گیا۔ "وہ لوگ آتے کیوں نہیں؟ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری خوراک اور سامانِ رسد یہیں کھڑے کھڑے ختم ہو جائے؟"

"میرا خیال ہے وہ ابھی یہی نہیں سمجھ پائے کہ ہم کون ہیں۔ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ انھیں ہمارے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ جب وہ کسی فیصلے پر پہنچ جائیں گے تو ہم سے رابطہ قائم کریں گے۔"

دوسری صبح یہ انتظار ختم ہو گیا اور ہمیں ماہی گیری کی ایک کشتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ پھر اس کے پیچھے چار جنگی کشتیاں نظر آئیں جو توپوں کی زد سے باہر ہی رُک گئیں مگر ماہی گیری والی کشتی قریب آ گئی اور اس پر کھڑے ہوئے ایک آدمی نے زور سے چلّا کر کہا: "اے ہو... کیا تم لوگ شاہی بحریے سے تعلق رکھتے ہو؟"

مَیں نے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے

بلند جواب دیا: "ہمارا ضرغام کے شاہی بحریے سے کوئی تعلق نہیں ہماری یہ کشتی سلطنتِ آریانہ کے شہزادے سرفروش کی کمان میں ہے اور اماراتِ خمسہ کے شہزادے آلپ کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ہم خلیج الجزائر کی قزاق برادری کے لیے ایک پیغام لائے ہیں اور اُن کے سربراہوں سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"تم کیا پیغام لائے ہو؟" اُس آدمی نے پُوچھا۔

چونکہ مَیں پہلے بھی بحری قزاقوں کے ساتھ وقت گزار چکا تھا اور اُن کے دستور جانتا تھا۔ اس لیے مَیں نے کہا: "یہ پیغام صرف برادری کے سات کپتانوں کے گوش گزار کیا جا سکتا ہے دوست۔"

ماہی گیری والی کشتی سے کوئی جواب نہ ملا جو ہماری کشتی سے تیس گز دُور کھڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ آپس میں کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس کشتی کے مسکان پر بیٹھے ہوئے دو آدمی اُٹھے اور ایک ڈنڈے سے بندھے ہوئے سبز پرچم ہلانے لگے مگر یہ اشارہ ہمارے لیے نہیں، چار جنگی کشتیوں کے لیے تھا جو چار میل دُور رُک گئی تھیں۔ یہ کشتیاں آہستہ آہستہ دائیں بائیں سے ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ پھر وہی آدمی جس نے سُرخ پگڑی باندھ رکھی تھی ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھاری خواہش کے مطابق تمھیں برادری کے کپتانوں سے ملا دیں کیونکہ تم امن دا آشتی کے سفید پرچم تلے آئے ہو۔ ہماری چاروں کشتیاں تمھاری کشتی کو اپنے گھیرے میں ساحل تک لے جائیں گی۔ اگر تم لوگوں نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو اپنی موت کے ذمّے دار تم خود ہو گے۔"

یہ سُن کر مَیں نے اطمینان کی سانس لی اور ارغون سے کہا: "کپتان ارغون۔ اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ چپّو سنبھال لیں اور قزاقوں کی کشتیوں کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُن کے درمیان چلتے رہیں۔"

ہمارا یہ سفر دو روز جاری رہا۔ تیسری صبح پانچوں کشتیاں ایک بندرگاہ میں داخل ہُوئی جہاں تقریباً تیس کشتیاں پہلے سے لنگر انداز تھیں۔ بندرگاہ پر شہتیروں سے بنی ہُوئی ایک عمارت پر قزاق برادری کے سات کپتانوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس عمارت کے آگے بہت سے نیم پختہ مکانات بنے ہُوئے تھے جبکہ عمارت کے سامنے لاتعداد خیمے نصب تھے جن کے درمیان کہیں گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور کہیں چھوٹے چھوٹے الاؤ جلا کر اُن پر کھانا پکایا جا رہا تھا۔ شہزادہ آلپ نے قزاقوں کی کشتیوں کو دیکھتے ہُوئے کہا: "کیا اسکندر سے لڑائی کے بعد ان کے پاس یہی کشتیاں باقی رہ گئی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان سے اتحاد کا معاہدہ بھی بے فائدہ ہو گا۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ اُن کے بیڑے کا ایک حصّہ ہیں۔" مَیں نے آلپ کو جواب دیا اور خیموں کی گنتی کرنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت وہاں تین ہزار منگول شہسوار خیمہ زن تھے اور اتنی بڑی تعداد کو سفارت کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ تو اچھی خاصی فوج تھی جو ایک لمحے کے نوٹس پر جنگ کے لیے تیار ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ سوچ پریشان کر رہی تھی کہ قزاقوں کو دعوتِ اتحاد دیتے ہی یہ سب شہسوار ہمارے دشمن بن جائیں گے۔ یہ بات مَیں شہزادہ آلپ کو بھی نہیں بتانا چاہتا تھا کیونکہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھی گھبرا اُٹھتا تھا جبکہ یہ بہت بڑی بات تھی۔

"کہسار" کا عملہ ناشتے میں مصرُوف تھا کہ ہمیں بندرگاہ سے ایک چپٹی کشتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ اس پر آگے وہی سُرخ پگڑی والا آدمی کھڑا تھا جس نے تین روز قبل ہم سے بات کی تھی لیکن اب اُس کے سر پر پگڑی کی بجائے خود تھا اور اُس نے سینہ بند اور جوشن بھی پہن رکھا تھا۔ اسے یوں لوہے میں ڈوبے دیکھ کر شہزادہ آلپ نے کہا: "انھیں ہم لوگوں پر اعتماد نہیں ہے یا منگولوں پر؟ بہرکیف آج رات سوتے وقت مَیں اپنی تلوار دسترس میں رکھنا نہیں بھُولوں گا۔"

شہزادہ آلپ کی یہ خیال آرائی اس بات کی مظہر تھی کہ وہ اندر سے خوفزدہ ہے۔

چپٹی کشتی کہسار کے پہلو میں آ کر رُک گئی۔ مَیں، شہزادہ آلپ اور ارغون آنے والوں کے استقبال کو موجُود تھے۔ اُس آدمی نے کہا: "میرا نام الماس ہے اور مَیں برادری کے سات سرداروں کا نمائندہ ہُوں۔"

"خوش آمدید الماس!" مَیں نے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کو اُس سے متعارف کرایا۔ پھر اُسے ہم اپنے کیبن میں لے آئے جہاں ہم نے مشروب اور نمکین سوکھی مچھلی سے اُس کی تواضع کی۔ مَیں نے پوچھا: "ہم جلد از جلد سات سرداروں سے ملنا چاہتے ہیں، کیا وہ بلا تاخیر ہمیں تھوڑا سا وقت دے سکتے ہیں؟"

"مَیں تمھیں اُن کے پاس لے جانے کے لیے آیا ہُوں کپتان سرفروش۔"

الماس کی اس بات پر مَیں نے آلپ اور آلپ نے میری طرف دیکھا اور ہم دونوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلا دیے۔ مَیں نے ارغون سے کہا: "کپتان ارغون۔ اب کہسار تمھاری کمان میں ہے خبردار! کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے اس کا وقار مجروح ہو۔" مَیں اس بات سے الماس کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ یہی وہ کشتی اور یہی وہ عملہ ہے جس نے لڑائی میں اُن کی کشتیاں اور ایک جہاز ڈبو دیا تھا اور اب بھی وقت پڑنے پر کہسار اور اُس کا عملہ مردانہ وار اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

ارغون نے اپنا ضخیم بازو اُٹھا کر سیلوٹ کیا اور بولا: "آپ

ے حکم کی تعمیل ہوگی شہزادے۔"

میں اور شہزادہ آلپ، الماس کے ساتھ اُس کی کشتی میں ساحل کی طرف چل دیے۔

●

قزاق برادری کے سات سرداروں سے ہماری بات چیت تین روز تک جاری رہی مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس بات چیت کے دوران تینوں دن چار منگول بھی اس مجلس میں شریک ہوتے رہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار منگولوں کو دیکھا۔ وہ قدرے پستہ قد مگر چوڑے چکلے آدمی تھے اور مسلسل گھڑ سواری سے اُن کی ٹانگیں کمانوں کی طرح خمیدہ ہوگئی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے سر کے بال دو چوٹیوں میں گوندھ رکھے تھے، اُن کی داڑھیاں تراشیدہ اور مونچھیں سرنگوں تھیں جن کو اُنھوں نے چربی مل کر گویا "کلف" لگا دیا تھا۔

قزاقوں کے سات سردار اور الماس ایک لمبی میز پر اکٹھے بیٹھے رہے۔ اُنھوں نے کمرہ گرم ہونے کے باوجود اپنے فرغلوں پر پوستین کے جیکٹ پہن رکھے تھے اور ہمہ وقت سر سے پاؤں تک مسلح رہے۔ اُن کے حلیے میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی لیکن وہ سب اس بات سے خوفزدہ تھے کہ شاہ ضرغام اُن پر حملے کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہے۔

وہ آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے جس پر منگول بظاہر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے لیکن میں اور آلپ بغور اُن کی باتیں سُنتے رہے۔ اُن کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایسے حلیفوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کے پاس گھوڑوں کی بجائے کشتیاں ہوں۔ وہ صرف اتنا یقین چاہتے تھے کہ کیا شہزادہ آلپ امارتِ خمسہ کا بحری بیڑا لا بھی سکتا ہے یا نہیں اور یہی وہ سب سے مشکل مسئلہ تھا جس کے بارے میں ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔

منگول اپنے نکتۂ نظر کی وضاحت ایک مترجم کے ذریعے کرتے تھے کیونکہ ہم ہی نہیں بلکہ قزاق سردار بھی اُن کے کرخت لب و لہجے سے اُن کی پوری بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

ہمارے اور منگولوں کے دلائل سُننے کے بعد قزاقوں کی طرف سے الماس بولا "ہم نے آپ دونوں فریقوں کے دلائل سُن لیے ہیں۔ اب ہم اپنی برادری سے مشورہ کریں گے اور اس کے بعد بتا سکیں گے کہ ہم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

اس فیصلے کے بعد اُنھوں نے دو روز کی مہلت مانگی تھی اور ہم نے یہ دو روز بڑے اضطراب میں گزارے۔ تیسرے روز اُنھوں نے جو فیصلہ سُنایا، وہ بڑا تعجب خیز تھا۔ الماس نے ہمیں اور منگولوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ فی الوقت کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اس لیے کہ ہم نے جو دیکھا اور سُنا ہے، وہ ہماری برادری کے تحفظ کے لیے ناکافی ہے۔ یہ فیصلہ اب کسی اور بُنیاد پر ہوگا۔" پھر وہ مجھ سے بولا "کیا تمھارے پاس کوئی ایسا سُورما ہے سردار سرفروش جو تم لوگوں کی طرف سے مبارزت میں نمائندگی کر سکے؟"

مجھ سے پہلے شہزادہ آلپ بول اُٹھا: "ہاں ہمارے ہاں ایسا سُورما ہے اور وہ ہے شہزادہ سرفروش۔"

"بہت خوب۔" الماس بولا اور اُس نے یہی سوال منگولوں سے بھی کیا۔ اُن کا نمائندہ بولا۔

"ہمارے پاس جنگجو بہادروں کی کوئی کمی نہیں۔ ہم ایک کیا دس دس سُورما منتخب کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر فوراً ایک سُورما منتخب کر لو۔" الماس نے جواب دیا۔ "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ شہزادہ آلپ اور تمھارے سورماؤں کے درمیان فیصلہ کرایا جائے۔ جس فریق کا سُورما دُوسرے فریق کے سُورما کو قتل کر دے گا، وہی فریق ہمارا حلیف بننے کا اہل تصور کیا جائے گا اور یہ مقابلہ کل صبح ہوگا۔"

اس فیصلے نے میرے اندر چنگاریاں سی بھر دیں اور میرا جی چاہا کہ میں اپنی تلوار سے قزاق سرداروں کے سر اُڑا دوں، چاہے اس کوشش میں خود بھی کیوں نہ مارا جاؤں۔ یہ احمق اتنا بڑا فیصلہ حقائق کو مدِنظر رکھ کر نہیں بلکہ دو افراد کی مبارزت کے نتیجے سے کرنا چاہتے تھے۔

جب ہم اپنی کشتی میں واپس آئے تو میں آلپ سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ قزاقوں اور ضرغام کے فیصلوں میں کوئی فرق نہیں۔ آلپ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"اس فیصلے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی سرفروش۔"

"وہ وجہ کیا ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے کہ وہ خوفزدہ ہیں۔ اس صورتِ حال میں وہ ہمیں یا منگولوں میں سے اپنی خواہش کے مطابق کسی ایک کو منتخب کرکے دُوسرے فریق کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ جب مبارزت کے ذریعے کوئی ایک فریق منتخب ہو جائے گا تو دُوسرا فریق اعتراض نہیں کر سکے گا اور وہ اُس کی مخالفت سے بچ جائیں گے۔"

شہزادہ آلپ کی یہ دلیل واقعی اپنے اندر وزن رکھتی تھی لیکن قزاقوں کی یہ مصلحت میری موت بھی بن سکتی تھی۔

●

اس شب سونے سے پہلے میں شہزادہ آلپ کے ساتھ کل کے مقابلے کے متعلق بات چیت کرتا رہا۔ آلپ نے کہا "تم اپنے مدِمقابل

[گھ]وڑے کی بجائے اُس پر حملہ کرنا۔ ہاں اگر خود تمھارا گھوڑا کارآمد نہ رہے تو [مد]مقابل کے گھوڑے کو بھی ناکارہ بنا دینا۔ اگر تمھیں اس کی مہلت [مل] سکے تو۔"

"میں تو سرے سے گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ تمھیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر وہ نہیں مانیں گے تو گھڑ سواری بھی کر لوں [گا۔] تلواریں بھی اپنی ساخت کے اعتبار سے ایسے مقابلوں کے لیے موزوں [ہیں]، یہ میرے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں ہوگا۔" میں گھڑ سواری سے اس لیے [گری]ز کرنا چاہتا تھا کہ مجھے منگولوں ہی کا کوئی گھوڑا دیا جاتا۔ یہ گھوڑے پستہ [قد] ہوتے ہیں۔ دُوسرے منگول اُن سے اور اُن کے گھوڑے منگولوں کی [حر]کات سے آشنا ہوتے ہیں جبکہ میں گھوڑے کے لیے اور گھوڑا میرے لیے ناآشنا ہوں گے۔ اس لیے میں شاید گھوڑے سے بھرپور فائدہ اُٹھا سکوں۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ میں پستہ قد منگولوں سے قدآور اور زیادہ وزنی ہوں۔ میری یہ خصوصیات گھوڑے کو جلد [تھ]کا سکتی ہیں اور تھکے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

●

صبح ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے اُڑتے پھر رہے تھے۔ جب میں کشتی سے ساحل پر آیا تو قزاقوں، سات سرداروں اور منگولوں کے گھوڑوں کی دُموں والے پرچم کے ساتھ ساتھ کہسار کا صُلح و آشتی والا سفید جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔

قزاقوں کے رہائشی علاقے اور منگولوں کے خیموں کے درمیان تین سو مربع گز کے ایک قطعہ اراضی پر جگہ جگہ نشانات نصب کرکے میدانِ مبارزت کی حد بندی کر دی گئی تھی اور میرے گھوڑے پر زین کسی جا رہی تھی۔ میں نے میدان میں جا کر زمین کا جائزہ لیا جو کافی سخت تھی اور اس پر اُگی ہوئی گھاس کا صرف اتنا فائدہ تھا کہ گھوڑوں کے دوڑنے سے دُھول نہ اُڑے۔ میں میدان کے اُس کنارے آ گیا جہاں میرا گھوڑا لایا گیا تھا۔ دُوسرے کنارے پر میرا مدِمقابل اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اپنے گھوڑے کا جائزہ لیا، زین اور لگاموں کو جانچا اور جب سوار ہونے لگا تو الماس بولا: "یہ مقابلہ ضروری ہے نا سرفروش؟"

"میں نہیں جانتا کہ یہ ضروری ہے یا نہیں لیکن میں اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" یہ کہہ کر میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

شہزادہ آلپ میرے قریب آیا اور اُس نے منگول ساخت کی ایک تلوار مجھے دی۔ میں نے تلوار تولی تو نفیریاں اور نقارے بجنے لگے۔ منگولوں کے ساز بھی اُن کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان کے چاروں طرف ایک ہجوم غفیر جمع ہو گیا جن میں کہسار کا عملہ بھی شامل تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میدان کے وسط میں آ گیا تاکہ جب میرا مدِمقابل میری طرف بڑھے تو میں اُس کے گھوڑے کی چال دیکھ سکوں۔

دُوسرے کنارے کھڑے ہوئے منگولوں کا مجمع پھٹا اور میرا مدِمقابل گھوڑے کو دُلکی چلاتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ میرے گھوڑے کی طرح اس کا گھوڑا بھی پوری طرح ساز و سامان سے لیس تھا البتہ اُس کی زین کے ساتھ کئی تھیلے اور دو مشکیزے بھی لٹک رہے تھے۔

منگولوں کی طرف سے دو سوار بھی میدان میں آ گئے جبکہ قزاقوں میں سے دو کپتان آگے بڑھے۔ وہ پیدل تھے۔ شاید وہ گھوڑوں سے گر کر تماشہ نہیں بننا چاہتے تھے اس لیے اُنھوں نے پیدل چلنے کو ترجیح دی تھی۔

میں اور میرا مدِمقابل ایک دُوسرے سے دس گز کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے اور ان چار منصفین سے مقابلے کے اُصول و ضوابط سُننے لگے جو کچھ اس قسم کے تھے۔

- مقابلہ اُسی وقت ختم ہوگا جب تم دونوں میں سے ایک مر جائے گا۔
- کوئی فریق اُس وقت تک ایک دُوسرے کے گھوڑے کو نشانہ نہیں بنائے گا جب تک کہ ایک فریق گھوڑے سے گر نہ پڑے یا خود اُتر نہ جائے۔
- کوئی فریق تلوار کے علاوہ کوئی دُوسرا ہتھیار استعمال نہیں کرے گا۔ تلوار گر جانے یا ٹوٹ جانے کے بعد وہ صرف اپنے ہاتھ استعمال کر سکتا ہے۔
- ہر آدھ گھنٹے کے بعد دونوں مقابلہ کرنے والوں کو دُوسرے تازہ دم گھوڑے فراہم کیے جائیں گے اور مقابلے کے اختتام تک کیے جاتے رہیں گے۔

اس اعلان کے بعد نفیریاں اور نقارے پھر بجنے شروع ہو گئے اور مقابلے کے یہ چاروں منصف ایک کنارے کو چل دیے۔ اُنھوں نے ہمیں بھی ایک دُوسرے سے دُور کرا دیا تاکہ اُن کا اشارہ ملنے پر گھوڑے دوڑا کر مقابلے کا آغاز کر سکیں۔

اب ہم مختلف کناروں پر کھڑے ایک دُوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمیں مقابلے کے لیے جو تلواریں دی گئی تھیں وہ کافی بھاری تھیں اور انھیں دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر استعمال کیا جاتا تھا چنانچہ اپنے مدِمقابل کی طرح میں نے بھی تلوار دونوں ہاتھوں میں تھام کر سر پر گھمائی۔ میرے مقابل نے مجھے تلوار گھماتا دیکھ کر اپنا چہرہ آسمان کی طرف اُٹھایا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے عجیب سا نعرہ لگایا۔

میں نے بھی جوابی نعرہ لگایا۔

میرے مدِمقابل منگول نے گھوڑا میری طرف دوڑا دیا۔

میں نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اب ہمارے گھوڑے تیزی سے ایک دُوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم نے لگامیں ڈھیلی چھوڑ رکھی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے تلواریں بلند کی ہوئی تھیں مگر میں نے اچانک تلوار کی گرفت بدل دی اور اُسے ضرب لگانے والی پوزیشن سے وار روکنے والی پوزیشن میں لے آیا۔ یہ دیکھتے ہی منگول نے اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھا دی۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ تلوار کے دستے سے ہٹا کر باگ تھام لی۔ میں نے یہ حرکت اُس وقت کی تھی جب وہ میرے بالکل نزدیک پہنچ گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں دونوں ہاتھوں سے تلوار تھامے رہوں گا اور وہ مجھے پہلے ہی وار میں میرا سر اُڑا دے گا چنانچہ جونہی وہ قریب پہنچا۔ میں نے باگ کھینچ کر گھوڑا ایک دم روک دیا۔ منگول نے اُوپر سے ضرب لگانے کی بجائے دائیں بائیں گھمائی تو میری تلوار . . . اس کا وار روکنے کو موجود تھی۔ دونوں تلواریں بڑے زور سے ایک دُوسرے کے ساتھ ٹکرائیں اور تصادم کی خوفناک آواز کے ساتھ ہی چنگاریاں نکلیں تو دیکھنے والے بے ساختہ واہ واہ چلا اُٹھے۔ منگول کا وار اتنا زوردار تھا کہ اُس کی تلوار میری تلوار سے ٹکرانے کے باوجود فرشِ زمین کو بھی ہل کی طرح چیرتی چلی گئی۔ اُسی لمحے میں نے پلٹ کر تلوار گھمائی جو سنسناتی ہوئی منگول کی گردن سے صرف ایک ڈانچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ گھوڑے کی تیز رفتاری نے منگول کی گردن کو تو اُڑنے سے بچا لیا تھا لیکن اُس کے بالوں کی دو چوٹیوں میں سے ایک کٹ کر دُور جا گری۔ تماشائیوں میں ایک غلغلہ اُٹھا اور منگول بُری طرح حیرت زدہ رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے ساتھی بھی متعجب رہ گئے ہوں گے کیونکہ اُس کنارے سے جہاں منگول کھڑے تھے کوئی صدا نہ اُبھری۔ شاید انھوں نے زندگی میں پہلی بار ایسا تماشہ دیکھا تھا جس میں اُن کے سُورما کی چوٹی کٹ کر دُور جا گری تھی اور وہ خُود موت کے مُنہ سے بال بال بچ گیا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ میرے مدِمقابل کی حیرت میں خوف بھی شامل ہو لیکن حیرت و خوف کی یہ کیفیت اُس پر سے فوراً گزر گئی۔ اُس نے گھٹنوں سے دباؤ ڈال کر گھوڑے کو موڑا اور میں یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ اُس کا گھوڑا تیز رفتاری کے باوجود اپنی پچھلی ٹانگوں پر یُوں گھوم گیا جیسے کوئی رقاصہ پنجوں کے بل گھومتی ہے۔ گھوڑا اُسی رفتار کے ساتھ میری طرف بڑھا تو منگول نے تلوار اُوپر اُٹھانے کی بجائے نیزے کی طرح سیدھی کر لی۔ میں گھوڑے کو وہیں روکے رہا اور جب منگول قریب آنے لگا تو میں نے دُوسرا ہاتھ بھی دستہ شمشیر پر جما کر حملے میں پہل کر دی۔ میں نے یہ ضرب اپنی پُوری قوت کے ساتھ لگائی تھی۔ اگر منگول ماہر شمشیر زن نہ ہوتا تو تلوار کے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ اگر دستۂ شمشیر پر اس کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی ہوتی تو وہ دُور جا گرتی اور اگر وہ شہسوار نہ ہوتا تو خاک میں لوٹتا نظر آتا لیکن وہ میرا وار روکنے کے بعد بھی زین پر موجود تھا اور اُس کی تلوار اُس کے ہاتھوں میں تھی۔

اب مجھے بخوبی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ میرا مقابلہ کسی معمولی جنگجو سے نہیں بلکہ ایسے ماہر شمشیر زن سے ہے جس کی زندگی گھوڑے کی پیٹھ پر گزری ہے اور جو طاقت کے اعتبار سے بھی مجھ سے کسی طرح کم نہیں۔ اُس کی پھرتی بھی لاجواب تھی کہ اُس نے وار روکنے کے ساتھ ساتھ اپنا گھوڑا موڑ لیا تھا اور اب میرے اردگرد کاوے کاٹ رہا تھا۔ اُسے صرف اسی صُورت ہی مغلوب کیا جا سکتا تھا کہ مقدر ساتھ دے اور فرشتۂ اجل ہم دونوں میں سے اُسے منتخب کر لے۔ مجھے اپنی خوش بختی کا تو یقین نہیں تھا لیکن اس اندازے پر پُورا پُورا یقین تھا کہ یہ مقابلہ کافی طویل ہو گا اور ہماری موت و حیات کے فیصلے میں تھکن اہم کردار ادا کرے گی۔ چنانچہ ہم پینترے بدل بدل کر ایک دُوسرے پر وار کرتے اور بچاتے رہے۔ لوہے سے لوہا ٹکراتا اور چنگاریاں اُڑتی رہیں۔ کبھی تماشائی یُوں خاموش ہو جاتے جیسے انھیں سانپ سُونگھ گیا ہو اور کبھی میدان نعرہ ہائے تحسین سے گونج اُٹھتا اور منگولوں کے فلک شگاف نعرے ہر بار میرے مدِمقابل میں نیا جوش، نیا ولولہ پیدا کر دیتے تھے کیونکہ اُن کی تعداد زیادہ تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ ہر بار جب میں منگول کی ضرب سے بچ جاتا، مجھے یہ خیال ضرور آتا کہ شاید دُوسری ضرب سے نہ بچ سکوں، شاید دُوسرا وار کاری ثابت ہو۔

منگول کبھی اپنے گھوڑے کو میرے چاروں طرف گھماتا، کبھی الف کر دیتا اور کبھی سرپٹ دوڑاتے ہُوئے ایک دم روک کر پلٹتا مگر میں نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا تھا کہ اپنے گھوڑے کو ایک مختصر سے دائرے میں محدود رکھوں تاکہ وہ تھک نہ جائے۔ اسی طرح میں نے حملے کرنے کی بجائے دفاع کو زیادہ اہمیت دی تاکہ خُود بھی نہ تھک جاؤں لیکن میرے ساتھ ایک گڑبڑ یہ تھی کہ میں منگولوں کی طرح مسلسل دونوں ہاتھوں سے تلوار نہیں تھام سکتا تھا اور ایک ہاتھ سے ایسی زوردار ضرب نہیں لگائی جا سکتی جسے منگول روک نہ سکے۔

پہلے راؤنڈ میں اگرچہ میں نے منگول کی ایک چوٹی کاٹ دی تھی جس نے وقتی طور پر میرے مقابل اور اُس کے ساتھیوں کو ہراساں کر دیا تھا لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ اگر چوٹی کٹنے کی بجائے اُسے کوئی زخم، کوئی چرکا آ جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا لیکن منگول اتنا چوکنا ہو چکا تھا کہ میری بھرپور کوشش کے باوجود اُسے ایک معمولی سا چیرا بھی نہ آیا اور آدھا

گھنٹہ گزر گیا۔ نفیریاں اور نقارے بجنے بند ہو گئے۔ منگول نے ہاتھ اٹھا کر مقابلہ روکنے کا اشارہ کیا اور گھوڑا دوڑاتا اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

میں بھی میدان کے کنارے آ گیا۔

میرا جی چاہا، منصفینِ مقابلہ سے کہوں کہ گھوڑے نہ بدلے جائیں اور مقابلہ مسلسل جاری رکھا جائے لیکن میں نے اپنی اس سوچ کو خود ہی رد کر دیا۔ یہ صورتِ حال خود میرے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے دوسرے گھوڑے کی زین، رکابوں اور لگام کا معائنہ کیا اور اس پر سوار ہو کر اسے چلایا پھرایا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد میں میدان میں آ گیا اور اپنے مدِمقابل کی راہ دیکھنے لگا۔ وہ بھی دوسرے گھوڑے پر سوار میری طرف آنے لگا۔ میں نے غور سے جائزہ لیا۔ اب کے بھی اس کے گھوڑے پر ویسا ہی ساز و سامان تھا جو میں پہلے راؤنڈ میں دیکھ چکا تھا۔

دوسرا راؤنڈ بھی پہلے راؤنڈ کی طرح نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا البتہ تماشائیوں کا جوش و خروش بڑھ گیا اور بعض اوقات تو ان کے نعرہ ہائے تحسین میں نقاروں کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔

تیسرے اور چوتھے راؤنڈ کی وہی صورتِ حال رہی۔ ہمیں ایک دوسرے سے موت کا کھیل کھیلتے ہوئے پورے دو گھنٹے گزر چکے تھے اور ان دو گھنٹوں میں کوئی ایک لمحہ، ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرا تھا جب میں نے یا میرے مدِمقابل نے ذرا سا بھی تغافل برتا ہو۔ اس لیے کہ وہی ایک سیکنڈ کا تغافل ہی موت کا روپ دھار سکتا تھا۔ وہی گھڑی موت کی گھڑی بن سکتی تھی۔

پانچواں راؤنڈ شروع ہوا تو آفتاب کی تمازت بڑھ گئی اور ہوا کا زور تھم گیا۔ اب کے جب میں میدان میں آیا تو میں نے دیکھا کہ منگول کی زین سے لٹکنے والا مشکیزہ خالی نہیں ہے۔ شاید وہ مشکیزے میں پانی بھر لایا تھا تاکہ جب وہ میری زد میں نہ ہو تو دو گھونٹ پی لیا کرے۔ میں نے سوچا کہ اگلے راؤنڈ میں میں خود بھی پانی کا مشکیزہ لے آؤں گا کیونکہ جسم میں موجود پانی تو پسینے کی صورت بہہ چکا تھا۔

موت و حیات کی جنگ ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ میں نے اس بار صرف خطرے یاد رکھے اور باقی ہر بات اپنے ذہن سے نکال دی۔ حملے ہوتے رہے، وار روکے جاتے رہے اور ہم پسینے میں ڈوب گئے۔ میں نے دیکھا کہ منگول کا گھوڑا تھک گیا ہے اور اس کی رفتار میں کمی آنے لگی ہے اس کی وجہ وہی تھی کہ میں اپنے گھوڑے کو ایک محدود دائرے کے اندر گھماتا پھراتا رہتا تھا جبکہ منگول اپنی شہسواری کے زعم میں گھوڑا گھماتا، بھگاتا، کاوے کاٹتا اور میرے چاروں طرف گھومتا رہتا تھا۔ دھوپ اور گرمی نے بھی اس راؤنڈ میں خاصا پریشان کر دیا تھا۔ منگول بار بار اپنے مشکیزے کی طرف ہاتھ بڑھاتا مگر شاید یہ سوچ کر رک جاتا کہ اس طرح پانی پینے سے اس کا وقار مجروح نہ ہو جائے۔

اس راؤنڈ میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے اور یہ مقابلہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ گرمی سے حلق میں کانٹے سے اُگنے لگے تھے اور گھوڑے بھی بری طرح ہانپ رہے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ منگول کا گھوڑا تھکے تھکے قدموں سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی رفتار دیکھ کر میرے دل میں امید کی ایک کرن پھوٹی کہ شاید آخری حملے کا وقت آ گیا ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی میں اپنی ساری توانائی سمیٹتے ہوئے بھرپور وار کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

منگول قریب آیا تو اس نے اچانک اپنا ایک ہاتھ تلوار کے دستے سے اٹھا لیا اور مشکیزے کے منہ سے بندھی رسی کو جھٹکے سے کھول کر مشکیزے کو اس طرح اچھالا کہ اس کے کھلے منہ سے ایک سیاہ مگر چمکدار لمبی سی چیز اڑتی ہوئی میرے گھوڑے کے قدموں میں آ گری۔ میرا گھوڑا بری طرح بدکا اور الف ہو گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ وہ سانپ تھا۔ گھوڑے کے ایک دم الف ہونے سے میں پیچھے کو نیچے گرنے لگا اور اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ گرتے ہوئے نہ صرف گھوڑے کی دولتی سے بلکہ سانپ سے بھی بچنا ہے اور تلوار پر بھی گرفت قائم رکھنی ہے اور اس کے ساتھ ہی میں زمین پر آ رہا لیکن اس سے پہلے کہ گھوڑے کے سُم یا سانپ کا پھن نیچے آتا، میں نے پیٹھ کے بل تیزی سے قلابازی لگائی اور کھڑا ہو گیا لیکن قلابازی کھاتے ہوئے تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس سے پہلے کہ میں اسے اٹھاتا گھوڑا سانپ کے ڈر سے پیچھے ہٹا تو مجھے بھی اپنے بچاؤ کے لیے برق رفتاری سے پیچھے ہٹنا پڑ گیا۔ اسی دوران منگول پلٹا اور اس نے تلوار سے مجھ پر ضرب لگانا چاہی۔ میں ایک دم اچھل کر ایک جانب ہو گیا ورنہ تلوار میرا پیٹ چاک کر دیتی۔ اب منگول نے پولو کے کھلاڑی کی طرح اپنی تلوار کی نوک سے میری تلوار اچھال دی جو کافی دور جا گری۔

مجھے گھوڑے سے گرتے اور پھر منگول کو میری تلوار پچاس فٹ دور اچھالتے دیکھ کر تماشائیوں میں جوش اور زبردست غلغلہ پیدا ہو گیا۔ منگولوں کے نعرہ ہائے تحسین سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی خود مجھے اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے رقصاں نظر آ رہی تھی کیونکہ اب میں نہتا ہی نہیں پیدل بھی تھا جب کہ میرا دشمن گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں تیغِ براں چمچا رہی تھی لیکن میں اب بھی مایوس نہیں تھا۔

میں نے منگولوں اور قزاقوں کے نعرے ذہن سے نکال دیے اور اپنے ساتھیوں کی مایوسی کا خیال بھی جھٹک دیا۔ اب میری ساری توجہ اپنے دشمن پر تھی جس نے دھوکے اور دغا سے مجھے موت کے دہانے پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا موڑا اور اس یقین و اعتماد کے ساتھ میری طرف بڑھنے لگا جیسے وہ فرشتۂ اجل ہو۔ اس نے گھوڑے کی رفتار مدھم کر دی۔ شاید وہ اپنے اس کارنامے کو زیادہ سے زیادہ بہادرانہ رنگ دینا چاہتا تھا، ایک ہی وار میں میرا سر بھٹے کی طرح اڑانے پر تیار تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سوچتا ہو میں موت کو اپنی طرف لپکتا دیکھ کر بھاگ اٹھوں گا اور وہ میرا تعاقب کر کے میرا ایک ایک عضو زخمی کر دے اور مجھے تڑپا تڑپا کر مارے مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اگر مجھے مرنا ہی تھا تو میں مردانہ وار موت کو ترجیح دیتا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے تلوار سونتے میرے قریب تر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی وحشت و بربریت نے مجھے بتا دیا کہ وہ میری موت کے کھیل کو طوالت نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس طرح جھپٹے گا جیسے عقاب کبوتر پر جھپٹتا ہے اور اسی طرح میری گردن اڑاتا چلا جائے گا جیسے اس نے میری تلوار اڑا کر دور پھینک دی تھی۔

میں اسی لمحے کا انتظار کرنے لگا جب وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر مجھ پر جھپٹے، یہی لمحہ تقدیر کا رخ پلٹ سکتا تھا، موت کا منہ موڑ سکتا تھا اور ہاری ہوئی بازی جیت سکتا تھا۔ اس لیے میری نگاہیں اس پر مرکوز تھیں اور وہ بڑے اعتماد سے دھیرے دھیرے آگے آ رہا تھا۔ پھر جونہی اس نے اپنے گھٹنے دبائے، وہ گھڑی آ گئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ اس کی تلوار اٹھی اور میری گردن اڑانے کے لیے لپکی لیکن اس وقت تک میں حرکت میں آ کر جھکائی دے چکا تھا۔ تلوار زن سے میرے سر پر سے گزر گئی۔ اسی لمحے میں نے سر اٹھایا اور گھوڑے کی دم پکڑ کر پیچھے کو جھول گیا۔ گھوڑا اس ناگہانی افتاد سے الف ہوا تو منگول نے تلوار کے دستے سے ہاتھ ہٹا کر اسے قابو میں کرنا چاہا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ میں نے گھوڑے کی دم چھوڑ دی اور جونہی اس کے اگلے پاؤں زمین پر ٹکے میں اچھل کر منگول کے پیچھے سوار ہو گیا اور میں نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال کر شکنجے کی طرح کس لیے۔ منگول نے تلوار چھوڑ دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ گھوڑا جو پہلے ہی بدکا ہوا تھا، مزید بدکا تو ہم دونوں دھڑام سے نیچے آ رہے مگر منگول کی گردن اب بھی میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی جو ہر لمحے تنگ ہوتا جا رہا تھا اس کے ساتھ ہی منگول کی مدافعت بھی گھٹتی جا رہی تھی۔ جلد ہی اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور پھر وہ بے حس و بے حرکت ہو گیا۔ میں چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اٹھا تو وہ میرے قدموں میں آٹے کی بوری کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئی تھیں۔

اب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ماحول پر سناٹا چھا گیا ہے۔ جیسے تماشائیوں کی زبانیں گنگ ہو گئی ہوں۔ میدان کے چاروں اطراف کھڑے ہوئے تقریباً دس ہزار افراد یہ تماشا دیکھ کر دم بخود سے ہو گئے تھے۔ پھر اچانک اس خاموشی کو شہزادہ آلپ کی آواز نے توڑ دیا۔

"زندہ باد سرفروش!" اور اس کے ساتھ ہی خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ گنگ زبانیں پھر سے نعرے لگانے لگیں۔ نقاروں پر پھر چوٹ پڑنے لگی اور فضا نفیریوں کی آواز سے گنگنا اٹھی۔

میں اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔

اتنے میں الماس ناچتا ہوا میدان میں آیا اور میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی شہزادہ آلپ اور اہسار کے لوگ بھی ناچتے ہوئے میدان میں آ گئے۔

"تم نے کمال کر دیا ہے شہزادہ سرفروش!" الماس باآوازِ بلند بولا۔ "قزاق برادری تمھارا اور شہزادہ آلپ کا ساتھ دے گی اور ہمیشہ تم لوگوں کی حلیف رہے گی۔"

میں نے سوچا کہ اسے منگول کی دغابازی سے آگاہ کر دوں مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اب اس انکشاف کا کیا فائدہ؟ ہو سکتا ہے کہ قزاق برادری الٹا مجھ پر ہی سانپ پھینکنے کا الزام لگا دیں اور کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔ اس شکست سے ان کے دلوں پر ویسے بھی سانپ لوٹ رہے ہوں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس وقت قزاقوں اور ہم پر حملہ کر دیں اور اگر ہم ان پر غالب بھی آ جائیں تب بھی اس جنگ سے ہماری طاقت کم ہو جائے گی۔

اتنے میں میرے ساتھیوں نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور نعرے لگاتے ہوئے لے جانے لگے۔ میں نے دیکھا کہ قزاقوں کی بہت بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ نعرے لگا رہی تھی۔

رات کا کھانا کھاتے ہوئے میں نے ساحل کی طرف دیکھا۔ منگولوں کے خیموں کے درمیان الاؤ جل رہے تھے۔ سات سرداروں کی عمارت میں لالٹین روشن تھے اور قزاقوں کے گھروں کے سامنے میدان میں مشعلیں جل رہی تھیں جہاں وہ میری جیت اور معاہدے کا جشن منا رہے تھے اور یہ جشن منانے میں وہ حق بجانب تھے۔ شہزادہ آلپ کے ساتھ قزاقوں کے معاہدے کا یہ مطلب تھا کہ اب وہ تنہا نہیں ہیں اور شاہ ضرغام کا مقابلہ انھیں صرف اپنے آپ نہیں کرنا پڑے گا۔ اس معاہدے کے ساتھ ہی قزاقوں نے سمندر اور ساحل کی نگرانی اور نگہبانی ترک کر دی تھی جسے میں نے اور آلپ نے اچھا نہیں سمجھا تھا اور حتی الوسع احتجاج بھی کیا تھا مگر قزاقوں کے نزدیک اب نگہبانی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے

قزاقوں کی تیس کشتیاں نیم دائرے کی صورت لنگر انداز تھیں اور وہ سمندر کی طرف سے آنے والے دشمن کا منہ توڑ جواب دے سکتے تھے لیکن ان کشتیوں کا آدھے سے زیادہ عملہ آج جشن میں شرکت کے لیے ساحل پر گیا ہُوا تھا جہاں وہ کھانے پینے اور ناچنے گانے میں مشغول تھے۔ مجھے خیال آیا کہ گڑبڑ کی صورت میں وہ اپنی کشتیوں تک کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟

آج ہماری کشتی کو وہاں لاکر لنگر انداز کیا گیا تھا جہاں سات سرداروں کی کشتیاں لنگر انداز ہوتی تھیں اور یہ گویا ایک قسم کا اعزاز تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دشمن قزاقوں کی کشتیوں کے حلقے کو توڑے بغیر کہسار تک نہیں پہنچ سکتا تھا جو ساحل سے دو سو گز دُور تھی اور یہ بڑی اہم بات تھی کیونکہ مجھے اور شہزادہ آلپ کو خدشہ تھا کہ آج رات منگول کوئی گڑبڑ ضرور کریں گے۔ آج کی شکست نے اُن کے سارے خواب اور سارے منصوبے مٹی میں ملا دیے تھے۔ وہ اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے قزاقوں کی کشتیوں کو نذرِ آتش کر سکتے تھے تاکہ اُن میں کوئی دم خم باقی نہ رہے اور انھیں یہ احساس بھی کچھ کے دیتا رہے کہ اُنھوں نے منگولوں کی بجائے شہزادہ آلپ کے ساتھ معاہدہ کرکے بدترین غلطی کی تھی۔ وہ یہ اقدام ضرغام کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ انتقاماً کر سکتے تھے کیونکہ قزاقوں نے اُن کا حلیف نہ بن کر اُن کی سخت توہین کی تھی۔ اس طرح وہ صرف قزاقوں کو ہی نہیں بلکہ شہزادہ آلپ کو بھی سزا دینا چاہیں گے۔

یہی وہ خدشے تھے جن کے تحت ہم نے قزاقوں سے کہا تھا کہ وہ نگرانی اور نگہبانی جاری رکھیں لیکن اُنھوں نے ہماری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم کھل کر اپنے خدشات کا اظہار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہم اپنی کشتی پر لوٹ آئے تھے اور اس سلسلے میں اپنے آدمیوں کے ذریعے جو کچھ کر سکتے تھے، کر چکے تھے۔

ﮪ

مَیں گزشتہ چار گھنٹوں سے اندھیرے میں بیٹھا ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں مجھے دُور سے ایک آواز سُنائی دی: "اوہُو ہُو ہُو ہُو ہُو!!!!!" مَیں ہمہ تن گوش ہو کر ساحل کی طرف متوجہ ہو گیا مگر مجھے کوئی غیر معمولی بات محسوس ہُوئی اور نہ کوئی دُوسری آواز سنائی دی۔ شاید یہ عجیب سا نعرہ کسی بدمست ملّاح نے لگایا تھا مگر پھر مَیں ایک سائے کو ساحل کے قریب لنگر انداز کشتیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر چونک اُٹھا۔ مَیں نے آنکھیں پھاڑ کر اور آگے کو جھک کر غور سے دیکھا تو مجھے اُس سائے کے پیچھے مزید چار سائے چوروں کی طرح بڑھتے نظر آئے۔ چند لمحوں بعد کسی کشتی سے "کون ہے؟" کی آواز بلند ہوئی اس کے جواب میں ساحل پر ایک مشعل جل اُٹھی۔ یہ مشعل اُس پہلے آدمی نے جلائی تھی۔ پھر اُس نے وہ مشعل سر سے بلند کر لی اور اس کے ساتھ ہی منگولوں کے جنگی نعرے سُنائی دینے لگے۔ وہ ہماری توقعات کے عین مطابق قزاقوں کی کشتیاں جلانے آ گئے تھے۔

مَیں اپنے آدمیوں کو مطلع کرنے کے لیے پلٹ گیا کیونکہ مَیں اُنھیں باآوازِ بلند ہدایات دے کر منگولوں کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے آدمیوں کو کیا کرنا تھا، یہ مَیں اُنھیں شام کو سمجھا چکا تھا۔ منگولوں کی آمد کے متعلق سُنتے ہی بیس ملّاح کہسار کے ساتھ بندھی ہُوئی چھوٹی کشتی پر اُتر گئے۔ ہر ملّاح کے پاس تیر کمان اور تلوار تھی۔

چھوٹی کشتی اندھیرے میں ساحل کی طرف چل پڑی۔

اتنے میں ارغون اور شہزادہ آلپ بھی ہتھیار بند ہو کر آ گئے۔ اُن کے پاس تلواریں اور خنجر تھے۔ آلپ کے پاس گرز نما ایک اور ہتھیار بھی تھا جو مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ارغون اپنا کلہاڑا لانا بھی نہیں بھُولا تھا۔ اُس نے کلہاڑے کی ایک ہی ضرب سے لنگر کی رسّی کاٹ دی۔ اب کہسار کسی بھی لمحے خاموشی کے ساتھ حرکت میں آ سکتی تھی۔

عرشے پر شہزادہ آلپ کے محافظوں کے علاوہ غدار کمانڈر کے آٹھ سپاہی بھی اپنے ہتھیار لیے موجود تھے۔ وہ کمانڈر کی غداری پر شرمسار تھے اور اُنھوں نے ہم سے التجا کی تھی کہ ان کو لڑائی میں حصّہ لینے دیا جائے تاکہ اُنھیں اپنی بدنامی کا داغ دھونے کا موقع مل سکے۔ یہ سب قریب کھڑی ماہی گیری کی ایک اور کشتی میں اُتر گئے۔

اس اثنا میں قزاقوں کی کئی کشتیوں سے شعلے اُٹھنے شروع ہو گئے تھے۔ منگولوں کی مشعلوں سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اب وہ کہاں ہیں۔ سات سرداروں کی عمارت کے قریب سے بندوقوں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں اور کشتیوں میں سوئے ہُوئے بچے کھچے قزاق بھی جاگنے لگے تھے چونکہ منگول جانتے تھے کہ قزاقوں کی بیشتر تعداد جشن میں شرکت کے لیے ساحل پر گئی ہوئی ہے اس لیے وہ اس مہم پر زیادہ تعداد میں نہیں آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ چند ہی سو سے زیادہ نہیں ہوں گے جو بچے کھچے قزاقوں سے نمٹنے کے لیے کافی تھے جب وہ کشتیوں میں آگ لگا کر قزاقوں کا راستہ روک لیتے تو باقی ماندہ منگول ساحل پر موجود قزاقوں پر حملہ کر دیتے۔ اس حملے کا مطلب قزاقوں کا قتلِ عام تھا۔ اُن کا یہ منصوبہ صرف اسی صورت میں ناکام بنایا جا سکتا تھا کہ میرے آدمی اندھیرے میں اُن پر ٹوٹ پڑیں اور انھیں واپسی کا موقع ہی نہ دیں۔ یہ تاخیر منگولوں کو تذبذب میں ڈال دے گی اور اس دوران میں قزاقوں کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا جائے گا۔ مَیں اسی منصوبے کے تحت کام کر رہا تھا۔

دُوسری کشتی بھی ساحل کی طرف چل دی جہاں پہلی کشتی

کے آدمی اندھیرے میں چھُپ کر منگولوں پر تیروں اور بندوقوں سے حملے کر رہے تھے۔

مَیں نے ملاحوں کو اشارہ کیا کہ وہ بھی کہسار کو ساحل کی طرف لے چلیں۔ دُوسرے لمحے کہسار بھی ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔

بندوقوں کے دھماکوں اور مرنے والے منگولوں کی چیخ و پکار نے ساحل پر ہلچل مچا دی تھی اور لوگ گھروں سے باہر آنے لگے تھے۔ اس لیے منگول اُن پر حملے بھی کرنے لگے تھے اور اُنھوں نے کچھ عمارتوں کو بھی آگ لگا دی تھی لیکن ان جلتی ہوئی عمارتوں کی روشنی ابھی پانی تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ اتنے میں بندوقوں کے مزید تڑاخوں نے مجھے بتا دیا کہ کہسار سے پہلے روانہ ہونے والی دُوسری کشتی بھی ساحل پر پہنچ چکی ہے۔ چند منٹوں بعد کہسار بھی ساحل پر پہنچ چکی اور اس کا عملہ بھی منگولوں کو اپنا شکار بنانے لگا۔ پھر کہیں سے ایک جلتی ہوئی مشعل آئی اور میرے ایک آدمی پر گری تو اس کے کپڑوں نے فی الفور آگ پکڑ لی۔ میرا آدمی کشتی پر لوٹنے کی بجائے سمندر میں کُود گیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو خطرے میں ڈالنے کی بجائے ڈُوب مرنے کو ترجیح دی تھی۔ اُس کا یہ ایثار دیکھ کر میرے آدمیوں کی کارکردگی میں شدّت آ گئی۔ وہ منگولوں کو بھُوننے لگے لیکن اب منگول بھی ہماری کشتی کو دیکھ چکے تھے۔ اُن کے تیراندازوں نے ہمارے لیے ساحل پر اُترنا مشکل بنا دیا۔

اس دوران ساحل پر جلتی ہُوئی عمارتوں کی روشنی نے اندھیرے کا سینہ چاک کر دیا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ پہلی کشتیوں کے جوان کشتیوں سے کُود کر آگے بڑھ رہے تھے اور شہزادہ آلپ اپنا عجیب و غریب گرز گھماتے ہُوئے محافظوں اور سپاہیوں کی رہبری کر رہا تھا۔

مَیں نے پلٹ کر سمندر کی جانب دیکھا تو پتہ چلا کہ قزاقوں کی متعدد کشتیوں میں لالٹین جل اُٹھے ہیں اور کسی کسی کشتی پر نقارے بھی بجائے جا رہے ہیں۔ کچھ کشتیاں جلتی ہوئی کشتیوں سے ہٹائی بھی جا رہی تھیں لیکن جشن میں شرکت کرنے والے قزاقوں میں سے اب تک کوئی بھی ساحل پر نہیں پہنچا تھا۔

اتنے میں مجھے ساحل سے شور سُنائی دیا۔ یہ شور قزاقوں کا نہیں بلکہ منگولوں کا تھا کیونکہ اس میں گھوڑوں کی ہنہناہٹ نمایاں تھی۔ اب شاید منگولوں نے عام حملے کا آغاز کر دیا تھا اور اس حملے میں میری دونوں پارٹیوں کا بچنا محال تھا اس لیے منگولوں کے اس حملے کو روکنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ مَیں نے ہر قیمت پر اُن کے حملے کو پسپا کرنے کی ٹھان لی۔ اب میرا خاموش رہنا اور اشاروں سے ہدایات دینا بے معنی تھا۔ اس لیے مَیں دہاڑ دہاڑ کر اپنے عملے کو ہدایات دینے لگا۔ توپچی اپنی اپنی جگہ مستعد ہو گئے۔ ملّاحوں نے کشتی کا رُخ موڑنا شروع کیا اور جب وہ گھوم کر کنارے کے قریب آئی تو منگولوں کا ہراول گھڑ سوار دستہ بھی اندھیروں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ تلواریں لیے گھوڑے دوڑاتے ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ منگولوں نے جوشِ انتقام میں یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ سمندر کی جانب سے جوابی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ انھیں پُورا پُورا یقین تھا کہ کشتیوں پر تو بس گنتی کے چند قزاق ہیں جو ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اس لیے وہ پیش از وقت فتح کے نشے میں سرشار کھُلم کھُلا آگے بڑھتے آ رہے تھے کہ اچانک ہماری توپوں نے گولے اگلے، خوفناک دھماکے ہُوئے اور منگولوں کی ایک بڑی تعداد کے پرخچے اُڑ گئے۔ میرا خیال تھا کہ اس پہلی گولہ باری نے اُن کے کم از کم دو سو افراد ہلاک کر دیے ہوں گے۔

توپچی ایک بار پھر توپوں میں سیسے کے ٹکڑے، تیم کیلیں اور جو بھی الا بلا سکتی تھی بھرنے لگے۔ اُدھر مرنے اور زخمی ہونے والے منگولوں اور اُن کے گھوڑوں کے شور میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور منگولوں کے دُوسرے دستے آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ شاید وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ چیخ و پکار قزاقوں کی ہے مگر جب وہ قریب آئے اور اُنھوں نے ہماری کشتی کو دیکھا تو اُن کی سمجھ میں آیا کہ یہ دھماکے قزاقوں کی کشتیوں پر رکھے بارود کے ذخیروں سے نہیں بلکہ ہماری توپوں کی گولہ باری سے ہُوئے تھے۔ یہ صورتِ حال سمجھنے کے بعد اُنھوں نے تلواریں نیام میں ڈال دیں اور تیر کمان سنبھال لیں۔ انھوں نے جلتی ہُوئی عمارتوں کی روشنی میں مجھے بھی پہچان لیا تھا اور ہر قیمت پر مجھے ہلاک کرنے کے لیے تُل گئے تھے۔ اتنے میں توپوں نے ایک بار پھر گولے اگلے اور ہر طرف موت کی چیخیں گونج اُٹھیں مگر منگولوں کے جوشِ انتقام میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ اندھیرے سے نکل نکل کر تیر اندازی کرتے رہے سنسناتے ہُوئے تیر کہسار کے تختوں میں بھی گڑتے رہے اور میرے ساتھیوں کے سینوں میں بھی لیکن اب ہم نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے اور نہ کشتی سے اُتر سکتے تھے۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس وقت تک قزاق بھی منگولوں سے برسرِ پیکار ہو چکے ہوں گے لہٰذا اُن کی طرف سے ہمیں کوئی مدد ملنے کی توقع نہیں تھی۔ جو کرنا تھا، ہمیں خود ہی کرنا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ پہلی کشتی والے اور شہزادہ آلپ کے محافظ اس وقت کہاں ہیں اور اُن کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ ہر شخص جنگی جنون میں مبتلا تھا۔ میرے ساتھی بندوقیں بھی چلا رہے تھے، تیر بھی پھینک رہے تھے اور توپیں بھی داغ رہے تھے۔ عین اُس وقت مجھے اپنے پیچھے ارغون کی چیخیں سُنائی دیں۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا۔ ارغون کے پیٹ میں ایک تیر پیوست ہو گیا تھا۔ اُس نے تیر نکال پھینکا مگر اتنے میں دو تیر اور آئے۔ ایک اُس کی بائیں آنکھ اور دُوسرا

اُس کی گردن میں گڑ گیا۔ وہ مُنہ کے بل گرا تو پھر جنبش نہ کر سکا۔ میں جانتا تھا کہ یہ تیر مجھے نشانہ بنانے کے لیے چلائے گئے تھے مگر اُن کا شکار ارغون ہو گیا۔

ارغون کی موت نے میرے دل میں انگارے بھر دیے۔ میں بے ساختہ چلایا: "کہسار کے جواں مردو۔ ہمیں اپنی کشتی کے عقار اور اپنے کپتان ارغون کی موت کا بدلہ لینے، قزاقوں سے دوستی کا حق ادا کرنے اور شہزادہ آلپ کو اس کا حق دلانے کے لیے فتح یاب ہونا ہے یا مردانہ وار مر جانا ہے۔ میرے ساتھ آؤ اور ثابت کر دو کہ جب تک ہم میں سے ایک فرد بھی زندہ ہے، منگولوں کی آرزو کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔" یہ کہہ کر میں کشتی سے کود پڑا۔ عین اُسی وقت توپ چلنے سے کشتی پیچھے ہٹ گئی اور میں ساحل کی بجائے پانی میں جا گرا لیکن جونہی میں نے پانی سے سر نکالا۔ مجھے تیروں کی سنسناہٹ کے ساتھ ساتھ اپنے پیچھے پانی کے چھپاکوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میرے ساتھی بھی دھڑا دھڑ کشتی سے پانی میں کود رہے تھے اور یہ پانی صرف کمر کمر گہرا تھا۔ میں نے تلوار سونتی اور آگے بڑھنے لگا۔ اب مجھ پر خون سوار ہو گیا تھا۔ وہی دو ہاتھوں سے پکڑنے والی تلوار جو دو دن کے وقت بھاری محسوس ہوئی تھی اب بہت ہلکی پھلکی لگ رہی تھی۔ میں دھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور منگولوں پر ٹوٹ پڑا۔

میں نہیں جانتا کہ میری تلوار کس پر اور کہاں پڑ رہی ہے مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ خون کے چھینٹے میرے چہرے اور لباس پر پڑ رہے تھے۔ میں ایک بگولے کی طرح گردش کر رہا تھا اور میرے ساتھ ساتھ میری تلوار بھی اُوپر نیچے، دائیں بائیں مسلسل حرکت میں تھی۔ میرے کان مرنے اور زخمی ہونے والوں کی چیخ و پکار سے سُن ہو گئے تھے تاہم میری آنکھیں ہر طرف دیکھ رہی تھیں۔

منگول مجھے تیروں کا نشانہ اس لیے نہیں بنا سکتے تھے کہ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا جس نے چلّہ کھینچنا محال کر دیا تھا۔ دُوسرے وہ میرے بجائے اپنے ساتھیوں کو شکار نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں کب تک اس جنُونی انداز میں تلوار چلاتا اور دُشمنوں کا خُون بہاتا رہا۔ وقت کا احساس ہی ختم ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے شہزادہ آلپ ایک ہاتھ سے تلوار اور دُوسرے سے اپنا عجیب و غریب گرز چلاتا نظر آیا۔ اُس کے ہمراہ بندوق بردار محافظ بھی تھے جنھیں بندوقیں بھرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے وہ بندوقوں کے بٹ سے منگولوں کے سر توڑ رہے تھے۔

پھر مجھے غدار کمانڈر کے سپاہی بھی نظر آ گئے جو اپنی چھوٹی تلواروں سے شمشیر زنی کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اُن میں سے شاید تین مر چکے تھے اور باقی کے پانچوں اپنی بدنامی کے داغ دھونے میں مصروف تھے۔

منگولوں کے اس دستے کی اکثریت موت کے گھاٹ اُتر چکی تھی کہ اتنے میں پھر اُن کا جنگی نعرہ سُنائی دیا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ ایک اور تازہ دم دستہ پہنچ گیا ہے۔ جونہی وہ اندھیرے سے نکل کر ہماری طرف بڑھنے لگا، کہسار کی توپیں جواب تک خاموش تھیں ایک بار پھر گرجیں اور اُنھوں نے آدھے سے زیادہ دستے کا صفایا کر دیا۔ میرے توپچی اب تک اس لیے خاموش تھے کہ اس گھمسان کے رن میں جب ہم دشمن سے گتھم گتھا ہو رہے تھے، وہ توپ چلا کر کہیں ہمیں بھی ختم نہ کر دیں۔

اس کے ساتھ ہی مجھے یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ سمندر سے قزاقوں کی دو کشتیاں بھی کہسار کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ پھر اُن کشتیوں کی توپوں نے بھی گولے اُگلے اور قزاقوں کے باقی ماندہ دستے کو بھی خاک و خون میں غلطاں کر دیا۔ ان کشتیوں کی آمد سے ثابت ہو گیا تھا کہ قزاق بھی جنگ میں شامل ہو چکے ہیں۔

ساحل کی طرف آنے والے منگولوں کے دستے پہلے توپوں کا شکار بنتے اور پھر ہم سے کٹتے مرتے رہے۔ یہ سلسلہ بہت جلد ختم ہو گیا اور بچے کھچے منگولوں نے راہِ فرار اختیار کر لی۔ صبح جب قزاقوں نے مرنے والے منگولوں کو شمار کیا تو پتہ چلا کہ تقریباً دو ہزار منگول موت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ اس کے برعکس قزاقوں کے تین سو آدمی مرے اور چھ سو سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔

کہسار نے اس جنگ میں چھبیس آدمیوں کی قربانی دی تھی جس میں ارغون بھی شامل تھا۔ تقریباً پچاس آدمی زخمی ہوئے تھے اور باقی سب تھک کر چُور ہو چکے تھے اور گولہ بارُود کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ قزاق ہمارے شکر گزار تھے کہ ہم نے منگولوں کا پہلا حملہ روک کر نہ صرف اُن کی کشتیوں کو تباہی سے بچایا تھا بلکہ منگولوں کو الجھا کر اُنھیں اتنا وقت دے دیا تھا کہ وہ منگولوں کے خلاف صف آرا ہو سکیں۔ اگر ہم یہ اقدام نہ کرتے تو اس وقت منگولوں کی بجائے تین ہزار قزاق مر چکے ہوتے۔

الماس نے جو خود بھی اس جنگ میں شدید زخمی ہو گیا تھا، قزاق کے سات سرداروں کی طرف سے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ یہ شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے چارپائی پر اُٹھا کر لایا گیا تھا۔ وہ بولا۔

"شہزادہ آلپ اور شہزادہ سرفروش۔ قزاق برادری آپ لوگوں کی تہ دل سے شکر گزار ہے اور اپنا مستقبل آپ کے ہاتھوں میں دیتی ہے۔ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس معاہدے سے ہمیں

اتنی جلدی اتنا بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اب میں آپ لوگوں سے صرف ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں اور وہ سوال یہ ہے کہ ہم آپ کی بہتر خدمت کس طرح کر سکتے ہیں؟"

"اپنے سارے جنگجو اور جہاز جمع کرو۔ زیادہ سے زیادہ توپیں گولہ بارود اور سامانِ رسد تیار رکھو اور پھر یہ سب لے کر جتنی جلدی پرنیال آ سکتے ہو، آجاؤ۔" یہ شہزادہ آلپ کا جواب تھا۔ "لیکن تمہارے جہاز اور کشتیاں مضبوط ہونی چاہئیں۔ شاہی بحریے پر حملہ کرنے کے وقت اور بارود برباد نہ کرنا۔ اگر امارات خمسہ کے کسی جہاز یا کشتی کو مدد کی ضرورت ہو تو اُسے ضرور مدد دینا۔ اب ہمارا مشترکہ ہدف صرف ایک ہے ضرغام کا بیڑا۔"

"ایک اور مقصد بھی ہے دوستو۔" میں نے کہا۔ "وہ ہے ضرغام کا سر اُڑانا اور سلطنت بہرام کا عقابی تاج شہزادہ آلپ کے سر پر رکھنا۔"

"ایسا ہی ہوگا محسنو۔" الماس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے بعد یہ مجلس برخاست ہوگئی۔

منگولوں کے ساتھ لڑائی میں کہسار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ملاحوں کی کمی پوری کرنے کے لیے پچاس قزاق میرے عملے میں شامل کر دیے گئے۔ گولہ بارود اور سامانِ رسد بھی فراہم کر دیا گیا۔ میرے لیے یہ بات باعثِ مسرت تھی کہ کم از کم پانچ سو قزاق میری کمان میں آنا چاہتے تھے مگر میں نے صرف پچاس قزاقوں کو اپنے عملے میں جگہ دی تھی۔

دوسرے دن غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی ہم نے لنگر اُٹھائے اور قزاقوں کے الوداعی نعروں کے شور میں پرنیال کی طرف روانہ ہو گئے۔

ම

جب پرنیال سے صرف ایک روز کی مسافت باقی رہ گئی تو ہمیں یہ پتہ چل گیا کہ ہماری غیر موجودگی میں پرنیال پر کیا گزری ہوگی۔ چنانچہ ہم نے اپنا راستہ بدل دیا اور جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔ اس راستے میں ضرغام کے بحریے سے مڈبھیڑ کا امکان نہیں تھا اور یہ اُمید بھی تھی کہ شاید امارات خمسہ کا کوئی جہاز مل جائے جو قزاقوں کے ساتھ معاہدے کی خبر الیان امارات کو پہنچا دے۔

ہمیں اس راستے پر کوئی جہاز تو نہ ملا البتہ پرنیال کی ایک ماہی گیر کشتی ضرور نظر آگئی جس میں چار افراد سوار تھے۔ اُن میں سے تین تو مر چکے تھے اور چوتھا دم توڑ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا لیکن چاروں افراد کے جسموں پر لگے ہوئے زخم یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ ضرغام کے پسندیدہ طریقِ ایذا رسانی کا شکار ہوئے ہیں۔

دو گھنٹے بعد مغرب سے آنے والی ہوا اپنے ساتھ دھواں اور جلنے کی بو بھی لے آئی۔ غروبِ آفتاب سے پہلے ہمیں جہازوں اور کشتیوں کے بہت سے اَدھ جلے تختے بھی نظر آگئے۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم نے کشتی کی رفتار بڑھا دی۔ جُوں جُوں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ تباہ شدہ کشتیوں کے تختوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

پو پھٹتے ہی ہم ساحلِ پرنیال سے جا لگے۔ جہاں جگہ جگہ دھویں کے بادل اُٹھ رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہنستا بستا پرنیال کھنڈروں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ہر طرف موت اور بربادی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور زندگی نہ جانے کن اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔

ہم چھپتے چھپاتے بندرگاہ کی طرف بڑھے مگر اب وہاں کشتیوں کی جگہ راکھ اور کوئلوں کے ڈھیر تھے۔ فصیل اور بچے کھچے بُرج دھویں سے سیاہ پڑ چکے تھے۔ جگہ جگہ لاشوں کے انبار تھے جن میں بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد اور ملکہ ترشینا کے گھریلو ملازم بھی شامل تھے لیکن پرنیال کے لوگوں سے کہیں زیادہ لاشیں ضرغام کے فوجیوں کی تھیں۔

"ہمارے دوستوں نے موت کے جام پینے سے پہلے اُنھیں بھی پلائے ہیں سرفروش۔" شہزادہ آلپ بولا۔

"ملکہ...!" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ تو تلاش کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ اس محترم خاتون پر کیا بیتی۔"

ہم نے زمینی راستے کی بجائے آبی راستے سے جانے کو ترجیح دی اور کہسار کو وہاں لے آئے جہاں سے ملکہ ترشینا کے سفید محل تک پہنچ سکتے تھے۔ وادی سے گزرتے ہوئے ہم نے جا بجا لاشوں کے ڈھیر دیکھے۔ ان لاشوں میں بھی اکثریت ضرغام کے فوجیوں کی تھی۔ ملکہ کے سپاہیوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک اُن کا مقابلہ کیا تھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ضرغام نے پرنیال کو تباہ کرنے کے لیے کتنا بڑا جانی نقصان برداشت کیا ہے۔ اس نقصان سے اُس کی عسکری قوت کو یقیناً دھچکا پہنچا ہوگا اور وہ خاصی کمزور ہو گئی ہوگی۔

جب ہم ملکہ ترشینا کے سنگِ سفید سے بنے محل کے قریب پہنچے تو وہ ایک کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دینے والا محاورہ اُس پر صدفی صد صادق آتا تھا۔ سنگِ سفید کی سلیں دھویں سے سیاہ پڑ چکی تھیں اور ہر جگہ ملبے کے نیچے دبی ہوئی لاشوں سے سڑاند اُٹھ رہی تھی۔ ہم نے بمشکل تمام ملکہ کی خواب گاہ کے ملبے سے اُس کی لاش ڈھونڈ نکالی۔ اُس کا چہرہ بُری طرح متورم نظر آتا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُسے بڑی کرب ناک

موت سے ہمکنار کیا گیا ہے۔

ہم اپنے ساتھ چالیس آدمی لے گئے تھے جو ہر طرح کیل کانٹے سے لیس تھے۔ اُن کی مدد سے ہم نے لاش نکال کر احترام سے ملکہ کو دفن کر دیا۔ میں بڑے آہنی اعصاب اور مضبوط دل گردے کا آدمی ہوں لیکن اس موقعے پر میری آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی دھند پھیل گئی۔

جب ہم ملکہ کو دفن کر چکے تو شہزادہ آلپ نے کہا: "میں تم سے شرط لگاتا ہوں سرفروش کہ اب مجھے والیانِ امارات خمسہ سے کچھ بھی نہیں کہنا پڑے گا۔ وہ از خود ہر قسم کی عسکری امداد دیں گے مگر دیکھنا یہ ہے کہ کونسی امارت کا جہاز سب سے پہلے آتا ہے۔"

ම

دوسری شام ہی امارتِ برمک کے تین جہاز ساحلِ پرنیال پر آ گئے۔ اُن سے پتہ چلا کہ پرنیال کی تباہی کی خبر ساری امارات تک پہنچ گئی ہے اور اُن کے جہاز بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔

میں نے جہازوں کے انتظار کے دوران قزاقوں کی ایک جماعت پرنیال کے ساحل پر بھیج دی تاکہ وہ اُن لوگوں کو تلاش کریں جو اس تباہی سے بچ گئے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہمیں ضرغام کے کچھ فوجی بھی مل جائیں گے جن سے ہمیں اُس کے آئندہ منصوبے کا علم ہو سکے گا۔ دو روز بعد جب قزاقوں کی یہ جماعت واپس آئی تو اپنے ساتھ دو اہم خوشخبریاں لے آئی۔ پہلی خوشخبری یہ تھی کہ ملکہ ترشینا کا پانچ سالہ بیٹا ضرغام کے ظلم کا شکار ہونے سے بچ گیا تھا۔ محل پر ضرغام کا قبضہ ہونے سے پہلے ملکہ کے دو وفادار ملازم اُسے وہاں سے نکال کر ایک کھوہ میں چھپ گئے تھے۔ قزاق پانچ سالہ شہزادے اور ملازموں کو ساتھ لے آئے تھے۔

دُوسری خوشخبری یہ تھی کہ پرنیال کے مشہور مضبوط پیپوں کی ایک بہت بڑی کھیپ تباہ ہونے سے بچ گئی تھی۔ یہ کھیپ تقریباً ایک ہزار پیپوں پر مشتمل تھی جنھیں ہم سامانِ رسد اور پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔

"ضرغام کے فوجیوں نے انھیں یہ سوچ کر تباہ نہیں کیا ہوگا کہ وہ قیمتی اور کارآمد نہیں ہیں۔" شہزادہ آلپ نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ پھر بولا: "تم مسکرا کیوں رہے ہو سرفروش؟"

"جب پرنیال میں آنے کے بعد مجھے ملکہ ترشینا کے محل کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں ارغون نے مجھے ان پیپوں کے بارے میں بتایا تھا کہ ان میں رکھی ہوئی چیز سمندر کی تہہ میں بھی صحیح سلامت رہتی ہے۔ اس بات سے مجھے ایک انوکھا خیال سُوجھا تھا جس نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔" میں نے آلپ سے کہا۔ "میری مسکراہٹ کا باعث وہ خفیہ اور تباہ کن اسلحہ ہے جو میں ان پیپوں سے تیار کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر ان پیپوں میں بارود بھر دیا جائے اور بارود میں لوہے کے ایک ٹکڑے کے ساتھ چقماق کو ٹکرایا جائے تو یہ پیپا بڑے سے بڑے جہاز کو اُڑا کر غرق کر سکتا ہے۔"

"مگر پیپا جہاز سے کیسے ٹکرائے گا اور پھر لوہے کو چقماق سے کس طرح رگڑا جائے گا؟"

"بارود، چقماق اور لوہے کا ٹکڑا پیپے کے اندر ہوگا مگر پیپے کے مُنہ پر ایک چمڑا اس طرح باندھ دیا جائے گا کہ اس کے اندر سے ایک تار لوہے کے ٹکڑے تک پہنچ جائے۔ پھر پیپے کو پچاس ساٹھ فٹ لمبے مستول نما ڈنڈے کے ساتھ باندھ دیا جائے گا اور لوہے سے مربوط تار اپنی کشتی تک لایا جائے گا تاکہ بوقتِ ضرورت اُسے کھینچا جائے تو لوہا چقماق سے ٹکرائے جس سے چنگاریاں پیدا ہوں اور بارود کو بھک سے اُڑا دیں۔ ہمیں کرنا یہ ہوگا کہ اپنی کشتی کے ساتھ پیپے والا زیرِ آب مستول دشمن کے جہاز تک لے جائیں اور پھر تار کھینچ کر بارود میں آگ لگا دیں۔ اس کے بعد دشمن کے جہاز کی تباہی یقینی ہے۔"

"اوہ سرفروش، تم بلا کے دانشمند ہو دوست۔" آلپ بولا۔ "لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے کہ ہماری کشتی دشمن کی توپوں کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے۔"

"یہ خطرہ تو بہر صورت رہے گا... چاہے ہم پیپے کو استعمال کریں یا نہ کریں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ بولو اس سلسلے میں کیا کرنا ہے؟"

"پیپوں میں بارود بھروا دیا جائے، لوہے کے ٹکڑے، چقماق اور تار اکٹھے کیے جائیں اور مستول نما ڈنڈے تیار کروائے جائیں۔ میں اپنی ہر کشتی اور ہر جہاز پر زیرِ آب تباہ کرنے والے ایسے متعدد "تارپیڈو" تیار رکھنا چاہتا ہوں لیکن یاد رہے کہ اس کی کارکردگی کے بارے میں ابھی کسی کو بھی کچھ نہ بتایا جائے۔"

"کیا تمھیں خدشہ ہے کہ ہمارے آدمیوں میں کوئی غدار نہ ہو؟"

"ہاں۔ ملکہ کے ایک غدار کمانڈر کی وجہ سے پرنیال تباہ ہو گیا ہے۔ اس لیے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر ضرغام کے کپتانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ پیپے بطور اسلحہ استعمال کیے جا رہے ہیں تو وہ اُن کا توڑ ڈھونڈ نکالیں گے۔"

***

قزاقوں کی جاسوس جماعت کی واپسی پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ جزیرے پر ضرغام کے فوجیوں کا کوئی وجود نہیں ہے چنانچہ ہمارے آدمی جا کر وہ پیپے لے آئے اور اُن میں بارود بھرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ روزانہ دُوسری امارات کی طرف سے جنگی کشتیاں اور جہاز بھی آنے لگے۔ اُن میں سے کچھ کشتیوں کو مزید بارود اور دیگر سازوسامان لینے کے لیے واپس بھی جانا پڑا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر قزاق بھی پچاس کشتیاں اور جہاز لے کر ساحل پر نیال پر پہنچ گئے۔ اماراتِ خمسہ کے جہازیوں اور افسروں نے پہلے تو انھیں شک و شبہے کی نگاہوں سے دیکھا اور ان سے دُور دُور رہے... پھر بہت جلد اُن سے مانوس ہو گئے کہ وہ بھی میری اور شہزادہ آلپ کی زیرِ کمان فوجیوں کے سے نظم و ضبط سے کام کرتے تھے اور دونوں کا مقصد ایک تھا یعنی ضرغام اور اُس کے مظالم کا خاتمہ۔

قزاقوں کے بعد امارتِ نیلاب کا پورا جنگی بیڑہ وہاں پہنچ گیا جس میں اٹھائیس کشتیاں اور جہاز شامل تھے۔ اماراتِ خمسہ میں نیلاب ہی سب سے بڑی امارت تھی۔ شہزادہ آلپ یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا اور اس نے نیلاب کے امیر البحر سے پوچھا: "سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہِ نیلاب نے اپنا پورا بیڑا کیسے بھیج دیا ہے؟"

"آپ کی ہونے والی ملکہ نے انھیں پورا بیڑہ بھیجنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دُوسرے وہ خود بھی نیلاب کا حشر پر نیال جیسا نہیں چاہتے۔"

تیسرے روز ایک نیا حیران کُن لیکن خوش آئند واقعہ رُونما ہوا۔ وہ یہ کہ سردار نوروز کا بیٹا سردار مہروز شاہی بحریے کے دو جہاز اور اپنے قبیلے کے جنگجو لے آیا۔ اُس نے بتایا کہ ضرغام نے کلدانی سردار نوروز کو قتل کرا دیا تھا۔ اس لیے اُن کے قبیلے نے چپکے سے ان دو جہازوں پر چھاپے مارے جو ساحل پر لنگر انداز تھے۔ جہازوں کا عملہ بھی ضرغام سے برگشتہ تھا لہٰذا اُنھوں نے کوئی مدافعت نہ کی اور ہم یہاں آ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ ضرغام کی ساری فوج میں برگشتگی پھیل چکی ہو گی۔" شہزادہ آلپ نے کہا۔

"نہیں جناب۔ عقابی فوج آخری دم تک اُس کا ساتھ دے گی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر ضرغام کو شکست ہو گئی تو عقابی فوج کے کسی جوان کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

●

جب ہم نے ساری تیاریاں کر لیں تو اپنی مجموعی طاقت کا اندازہ لگایا۔ ہمارے پاس ایک سو چالیس کشتیاں اور جہاز جمع ہو چکے تھے۔ اب میں جلد از جلد ضرغام کے بحریے پر حملہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اُسے اپنے بیڑے کو مزید وسعت دینے کی مہلت نہ مل سکے۔ شہزادہ آلپ بھی میرا ہم خیال تھا مگر روانگی سے ایک روز پہلے اُس نے کہا: "اگر تم مجھے اس بیڑے کا امیر البحر سمجھتے ہو تو تمھیں میری ایک بات ماننا پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"کہسار کا نام بدل دو۔"

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی معرکے سے پہلے اُس میں حصّہ لینے والے جہاز یا کشتی کا نام بدل دیا جائے تو شکست مقدر بن جاتی ہے اس لیے میں ہچکچا گیا حالانکہ میں توہم پرست نہیں ہوں۔ میں نے پوچھا: "تم اس کا کیا نام رکھنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا: "شعلۂ انتقام!"

یہ سنتے ہی میرے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے۔ مجھے کہسار کے پہلے کپتان، عنزل، سردار نوروز اور ملکہ ترشینا کے علاوہ وہ ان گنت اجنبی مظلوم یاد آ گئے جو ضرغام کے جور و استبداد کا شکار ہو چکے تھے۔ ہمیں ضرغام سے ان سب مظلوموں کا انتقام لینا تھا۔ میں نے کہا: "ٹھیک ہے۔ کہسار کا نام آج سے شعلۂ انتقام ہے اور یہی کشتی ہمارے بیڑے کی رہنمائی کرے گی۔ لنگر اُٹھانے کا حکم دیجیے امیر البحر آلپ!"

●

بیڑے کے لنگر اُٹھانے سے پہلے ہم نے مہروز کلدانی کی اطلاع پر مبنی منصوبہ بنایا تھا۔ مہروز نے بتایا تھا کہ ضرغام کے گولہ بارود کا بیشتر ذخیرہ پر نیال پر فوج کشی کے دوران خرچ ہو چکا ہے۔ چنانچہ میں نے آلپ کو مشورہ دیا تھا کہ ہمیں سلطنتِ بہرام کی راجدھانی تک جانے اور اُس پر حملہ کرنے کی بجائے گندھک کے جزیروں پر حملہ کرنا چاہیے جہاں سے ضرغام کو بارود کے لیے گندھک فراہم کی جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے بیڑے کو لمبا سفر طے نہیں کرنا پڑے گا اور ہمارے کارکن بھی تازہ دم رہیں گے مگر ضرغام یہ خبر سنتے ہی وہاں اپنا بیڑا لانے پر مجبور ہو جائے گا۔ طویل سفر کی وجہ سے اُس کے جہازوں اور جہازیوں دونوں کی حالت خراب ہو گی اور ہم اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں گے چنانچہ ہم سیدھے اُن جزیروں پر پہنچ گئے جہاں گندھک کی کانیں تھیں۔

اس وقت ان جزیروں کی حفاظت کے لیے صرف چار جہاز موجود تھے جو ہمیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے بلکہ ہم نے خود ہی انھیں بھاگنے کا موقع دیا تاکہ وہ ضرغام کو ہماری آمد کی اطلاع دے سکیں۔

جزیرے پر ضرغام کے صرف ایک ہزار غلام اور فوجی موجود تھے۔ انھوں نے ہمارے ایک سو چالیس جہاز اور کشتیاں دیکھتے ہی ہتھیار ڈال دیے۔ وہ ہمارے پچیس ہزار جوانوں کا مقابلہ کسی بھی صورت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے جزیرے کے ساحل پر موجود ساری توپوں پر قبضہ کر

میں نے اپنے جہازوں اور کشتیوں کے مستریوں کو منجنیقیں تیار کرنے پر لگا دیا تاکہ ضرغام کے بیڑے پر جلتی ہوئی گندھک برسائی جا سکے۔ اس کے بعد میں نے تمام کپتانوں کو بلوایا اور اُن پر اپنے خفیہ ہتھیار یعنی پیپوں والے "تارپیڈو" کا راز منکشف کر دیا۔ کپتان بہت خوش ہوئے اور اُنھوں نے پیپے بنانے والے اُن کاریگروں کی یاد میں ایک لمحہ خاموش رہ کر سلامی دی جنھیں ضرغام کے فوجیوں نے قتل کر دیا تھا۔

●

ہمیں ضرغام کے شاہی بیڑے کے لیے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چوتھے روز شام کو ہماری ایک جاسوس کشتی نے اطلاع دی کہ بیڑا آنے والا ہے۔ ہم تو اُس کے "استقبال" کی ساری تیاریاں مکمل کر ہی چکے تھے چنانچہ بیڑے کی راہ تکنے لگے۔

پو پھٹتے ہمیں اُفق پر شاہی بیڑے کے جہاز آتے دکھائی دے گئے۔ میں نے آخری بار کپتانوں کے ساتھ ملاقات کی اور اُنھیں بتایا کہ ہمیں ہر قیمت پر اور جلد از جلد ضرغام کے جہاز کو اپنا ہدف بنانا ہے۔

کچھ دیر بعد ضرغام کا بیڑا ہلالی شکل کے نیم دائرے کی صورت ہمارے بیڑے کو گھیرنے کے لیے آگے بڑھنے لگا لیکن ابھی وہ ہماری توپوں کی مار سے باہر تھا۔ میں نے اپنے بیڑے کی ترتیب ضرغام سے مختلف رکھی تھی۔ میری کشتیاں اور جہاز تین قطاروں میں نعل کی صورت تیار کھڑے تھے۔ ہر کشتی کے ساتھ وہی پیپوں والے "تارپیڈو" باندھ دیے گئے تھے جو پانی میں چھ فٹ ڈوبے ہوئے تھے اور دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بڑے جہازوں پر گندھک کی ہانڈیاں اور بالٹیاں پھینکنے والی منجنیقیں بھی تیار تھیں۔ اتنے میں شاہی بحریے کے جہازوں سے سفید دُھویں کے مرغولے اُڑتے اور دھماکے ہوتے سنائی دینے لگے لیکن وہ ہم تک نہ پہنچ پائے۔

میں نے طبلِ جنگ بجوا دیا۔ میری کشتیوں سے نعروں کی آواز سُنائی دینے لگی، ہر فرد چوکنا ہو گیا۔ میں نے سامنے والی قطار میں چھوٹی مگر بہت تیز رفتار کشتیاں رکھی تھیں۔ یہ دشمن کے لیے ایک قسم کا چارہ تھیں۔ جب شاہی بحریہ قریب آیا تو ہماری طرف سے بھی گولہ باری شروع ہو گئی۔ اُس وقت چھوٹی کشتیاں تیزی سے آگے بڑھیں۔ دشمن کے جہاز اُنھیں "تر نوالہ" سمجھتے ہوئے اُن کی طرف لپکے کہ ٹکر مار کر اُن کے پرخچے اُڑا دیں لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ہمارے پیپوں والے "تارپیڈو" خود اُنھی کے پرخچے اُڑا دیں گے۔ چنانچہ یہی ہُوا۔ بیشتر جہاز قریب آنے سے پہلے "تارپیڈو" سے ٹکرائے اور اُن کے پرخچے اُڑ گئے۔ اگرچہ اس پہلے ریلے میں ہماری تین کشتیاں تباہ ہو گئیں مگر دشمن کے آٹھ بڑے جہاز بھی منٹوں میں غرق ہو گئے اور اُن کی تباہی نے شاہی بیڑے کے جہازیوں کو ششدر کر دیا لیکن وہ ضرغام کے خوف سے پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتے تھے۔ انھیں اور کچھ نہ سُوجھا تو وہ اندھا دُھند چاروں طرف سے بڑھنے اور گولہ باری کرنے لگے۔

ہماری جوابی گولہ باری اور گندھک کی بالٹیوں نے بہت سی کشتیوں میں آگ لگا دی اور متعدد جہازوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ ہماری کشتیاں بھی اگرچہ تباہ ہو رہی تھیں لیکن پُرجوش جوان خود مرنے اور کشتی ڈوبنے سے پہلے "تارپیڈو" استعمال کرنا نہ بھولتے اور اُن کی یہی قربانیاں ضرغام کے بہت سے جہازوں اور کشتیوں کی غرقابی کا سبب بن گئیں۔ اس صورتِ حال سے گھبرا کر شاہی بحریہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصّہ سامنے رہ گیا اور دُوسرا ایک جانب ہٹ کر ہمارے بیڑے کے عقب میں آنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ہمارے جوانوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اُنھوں نے اپنے نقصان کے مقابلے میں شاہی بحریہ کا کم از کم چھ گُنا زیادہ نقصان کیا تھا۔

جب ضرغام کا بحریہ دو حصّوں میں بٹ گیا تو اُن کے پیچھے سے جہازوں کی ایک اور قطار نمودار ہوئی۔ یہ دیکھ کر میری رگ رگ میں چنگاریاں بھر گئیں کہ اُن کی رہبری کرنے والے جہاز پر ضرغام کا شاہی پرچم لہرا رہا ہے۔ جونہی آلپ کی نظر ضرغام کے جہاز پر پڑی، وہ دیوانہ وار تلوار لہراتے ہوئے چلّایا: "شعلۂ انتقام کو شاہی جہاز کی طرف بڑھاؤ!"

"خبردار۔ ایسا مت کرنا!" میں دہاڑا۔

آلپ یہ سُن کر غصّے کے مارے پاگل سا ہو گیا۔ اُس نے تلوار یُوں بلند کر لی جیسے میرے دو ٹکڑے کر دے گا۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ میں اسے کراٹے کی ایک ضرب سے دو تین گھنٹوں کے لیے بے ہوش کر دُوں... مگر اُس نے خود ہی اپنے غصّے پر قابو پا لیا اور پیچھے ہٹ گیا تو میں نے ملّاحوں کو حکم دیا: "کشتی کو پیچھے ہٹاؤ۔ باقی سب بھی پیچھے ہٹ کر نیم دائرے میں پھیل جائیں!"

شعلۂ انتقام تیزی سے پیچھے ہٹی تو دُوسری کشتیوں اور جہازوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں دراصل ضرغام کی جنگی حکمتِ عملی خود اُس پر آزمانا چاہتا تھا اور اُس کے لیے یہ بہترین موقع تھا کیونکہ اُس کا بیڑا دو حصّوں میں بٹ چکا تھا اور اُس کی وہ ترتیب ختم ہو گئی تھی جبکہ میں نیم دائرے کی شکل میں ضرغام کے جہاز کو اس طرح گھیر لینا چاہتا تھا کہ وہ ہمارے نرغے سے نہ نکل پائے۔

ہماری کشتیاں پیچھے ہٹیں تو ضرغام اور اُس کے ساتھ آنے والے جہاز آگے بڑھ آئے۔ اب دونوں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔ ضرغام اور اُس کے کپتانوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ہم پسپا ہو

رہے ہیں اور وہ تین اطراف سے گھیر کر ہمیں تباہ کر دیں گے مگر میں نے ایک دم اپنی کشتیوں کو آگے بڑھنے اور پھیلنے کا حکم دیا تو دائیں بائیں سے آنے والے ضرغام کے بیڑے کو اپنی گولہ باری ختم کر دینا پڑی کیونکہ اس طرح وہ ایک دوسرے کو نشانہ بنا سکتے تھے اب اُن کے لیے صرف یہی اقدام باقی رہ گیا تھا کہ وہ اپنی طرف بڑھتی ہوئی ہماری کشتیوں سے ٹکرا جائیں لیکن وہ اُن کے ٹکرانے سے پہلے "تارپیڈو" سے ٹکراتے اور بھک سے اُڑ جاتے تھے۔

یہی صورتِ حال سامنے سے آنے والے جہازوں کی تھی جب ضرغام کے کپتانوں نے اپنی کشتیوں اور جہازوں کی تباہی کا یہ منظر دیکھا تو وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ جہاز جو ضرغام کے جہاز کو گھیرے میں لیے آگے بڑھ رہے تھے اس صورتِ حال سے بُری طرح بوکھلا گئے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چار جہازوں کے رُخ مُڑ گئے۔ وہ راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ میں نے جوشِ مسرت سے اپنا خود اُتار کر پھینک دیا۔ اُن چار جہازوں کو مُڑتا دیکھ کر ضرغام کے بیڑے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور گندھک سے جلتے ہوئے جہازوں نے ہر طرف دھوئیں کے بادل پھیلا دیے۔

ہمارے جہازیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ وہ اندھا دھند گولہ باری کر رہے تھے، گندھک کی ہانڈیاں پھینک رہے تھے اور "تارپیڈو" ٹکرا رہے تھے۔ شعلۂ انتقام دھوئیں کے بادلوں کو چیرتی ہوئی ضرغام کے جہاز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب وہ دھوئیں کے بادل سے نکلی تو میں بے ساختہ چلایا "رسّے پر لیٹ جاؤ۔"

ابھی میرے حکم کی پوری طرح تعمیل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ضرغام کے جہاز سے چلائی ہوئی توپ نے شعلۂ انتقام کا ایک مستول اُڑا دیا اور میرے کئی ساتھی لقمۂ اجل بن گئے۔ دراصل ہماری کشتی ضرغام کے جہاز کے بہت قریب آ گئی تھی جسے ہم دھوئیں کی وجہ سے نہیں دیکھ سکے تھے۔ اُس سے داغی جانے والی توپ نے ہمارا مستول تو اُڑا دیا تھا لیکن یہ مستول خود ضرغام کے جہاز پر گر کر رسّوں میں اُلجھ گیا تھا اور اس طرح کشتی سے جہاز تک ایک پُل بن گیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے چلا کر حکم دیا "جوانو... جہاز پر چڑھ جاؤ۔ میرے پیچھے آؤ۔"

اور میں اندھا دھند مستول پر چڑھنے لگا۔ شہزادہ آلپ اور بہت سے دوسرے بھی میرے پیچھے آنے لگے۔ ضرغام کی عقابی فوج کے جوانوں کو ہماری آمد کا علم اُس وقت ہوا جب ہم تقریباً چالیس آدمی اُوپر پہنچ چکے تھے۔ وہ جان توڑ کر لڑنے لگے کیونکہ یہ خود اُن کی زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن اُن کے حوصلے پست ہو چکے تھے جبکہ ہمارے جوان بہت پُرجوش تھے۔ آلپ کے بندوقچیوں نے

انھیں بڑی تیزی سے نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اُن میں سے ایک افسر بھاگ کر سمندر میں کُودنے ہی والا تھا کہ اُس کی پُشت پر ایک ایسا بھالا لگا جو آر پار ہو گیا۔ میں اس قیمتی بھالے کو پہچانتا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے ضرغام کیبن کے دروازے میں کھڑا نظر آ گیا۔ وہ دُوسرا بھالا تول رہا تھا اور اب اس کا نشانہ کوئی بھگوڑا بزدل افسر نہیں بلکہ شہزادہ آلپ تھا۔

ضرغام نے آلپ کے چہرے کو نشانہ بنایا تھا مگر آلپ بجلی کی پھرتی سے ہٹا تو بھالا اُس کی زرہ کے دائیں شانے میں پیوست ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں تلوار تو تھی ہی مگر میں اپنا شکاری چاقو نکالتے ہوئے ضرغام کی طرف لپکا تاکہ اُسے تلوار نیام سے برآمد کرنے کا موقع نہ مل سکے مگر میرے قریب پہنچنے سے پہلے اُس نے تلوار نکال لی اور مجھ پر وار بھی کر دیا جسے میں نے اپنی تلوار پر روکا۔ مگر چونکہ ضرغام کی تلوار میری تلوار سے زیادہ لمبی تھی اور وہ بے حد پھرتیلا جنگجو تھا اس لیے اُس نے یکے بعد دیگرے مجھ پر تین وار کیے۔ تیسرے وار کو میں نے تلوار پر روک کر اس کی تلوار اٹکا دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دائیں پاؤں سے اُس کے چہرے پر ضرب لگائی۔ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو کراٹے کے اس داؤ سے ڈھیر ہو جاتا مگر ضرغام سنبھل گیا اور غیظ و غضب سے میری طرف بڑھا تو میں نے اُس کے ہاتھ پر پاؤں سے ضرب لگانے کے ساتھ ساتھ اپنا شکاری چاقو اُس کے جبڑے میں بھونک دیا جو اُس کے تالو کو چیرتا ہوا اُس کے دماغ تک جا پہنچا اور وہ ڈھیر ہو گیا۔

اتنے میں آلپ جو زرہ میں اٹکا ہوا بھالا نکال چکا تھا، لپکا اور اُس نے ایک ہی وار میں ضرغام کا سر قلم کر دیا۔

جب ضرغام کا پرچم اُتار کر اُس کا بریدہ سر مستول سے لٹکایا گیا تو بچے کھچے جہازوں اور کشتیوں نے سفید جھنڈے لہرا دیے۔ عقابی فوج کے گرفتار ہونے والے افسروں میں ملکہ ترشینا کا غدار کمانڈر بھی شامل تھا۔ الماس نے اسے دیکھتے ہی کہا "اسے میرے حوالے کر دیجیے۔ میں اسے پرنیال لے جاؤں گا اور اسی طرح موت کے گھاٹ اُتاروں گا جس طرح ملکہ ترشینا کو کرب انگیز موت سے ہمکنار کیا گیا تھا۔"

"نہیں الماس۔" میں نے جواب دیا "شہنشاہ آلپ کے دور میں کسی کو کرب ناک موت نہیں ملے گی۔"

●

شہزادہ آلپ کی شادی اور تاجپوشی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اُسے اپنے آباؤ اجداد کی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ مل گئی تھی اور رعایا کو لُٹا ہوا امن و سکون۔ عقابی فوج کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ قزاقوں کے دستے کہستانِ منگول کی سرحد پر متعین کر

دیے گئے تھے۔ میرے لیے سیر و تفریح کے علاوہ کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں کہستانِ منگول کے اُس جنگل میں شکار کھیل رہا تھا جہاں میری ملاقات کلدانی سردار نوروز سے ہوئی تھی اور مجھے ارغون اور طغرل سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ جنگل میں مجھے ایک چھوٹی سی جھیل دکھائی دی جس کے دُوسرے کنارے پر کچھ ہرن پانی پی رہے تھے۔ میرے اور ہرنوں کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں انھیں تیر سے شکار نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے کنارے اُن کی طرف بڑھنے لگا تاکہ وہ میرے تیر کی زد میں آ جائیں۔ اچانک ایک جگہ میرے پاؤں کیچڑ میں دھنس گئے اور ایسے دھنسے کہ میں جتنا انھیں باہر نکالنے کی کوشش کرتا تھا وہ اتنے ہی اور دھنستے چلے جاتے تھے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک ایسی دلدل میں پھنس چکا ہوں جس سے زندہ سلامت نکل جانا معجزے سے کم نہیں ہو گا۔

میرے پاس شکاری چاقو اور تیر کمان تو ضرور تھے لیکن کوئی رسّی وغیرہ نہیں تھی جسے میں کسی درخت پر پھینک کر باہر نکل سکوں۔ ہر چند کہ میں نے باہر نکلنے کی کوشش ترک کر دی تھی کہ اس طرح زور لگانے سے میں اور دھنس جاتا تھا لیکن اب بغیر حرکت کیے بھی میں آہستہ آہستہ دھنستا جا رہا تھا۔ اپنی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی موت نے میرے وجود میں دہشت کی سرد لہر دوڑا دی اور میں بے ساختہ اپنی مدد کے لیے چیخنے پکارنے لگا لیکن وہاں کوئی ہوتا تو میری مدد کو آتا...

جُوں جُوں وقت گزر رہا تھا، دلدل مجھے نگلتی جا رہی تھی یہاں تک کہ میں کمر تک دلدل میں دھنس گیا۔ اب مجھے خوف سے پسینہ بھی آ رہا تھا اور سر میں درد بھی ہونے لگا تھا جو ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا مجھے خیال آیا کہ شاید کمپیوٹر میری تلاش میں ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی دل میں آس کا دیا جل اُٹھا لیکن اس سوچ نے زندگی کی آس کا دیا جلد ہی بُجھا دیا کہ پہلے جب کبھی کمپیوٹر مجھے تلاش کرتا تھا، وقفے وقفے سے سر درد کے جھٹکے محسوس ہوتے تھے جبکہ آج سر درد آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

موت تو ہر ذی حیات کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے لیکن میں ماضی کے اس اندھیرے دَور میں یُوں بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں جنگ میں لڑتا ہوا مارا جاتا لیکن تقدیر نے میرے ساتھ کیسا بھیانک کھیل کھیلا تھا۔ میرے حصّے میں کیسی بھیانک موت لکھ دی تھی۔ میں انھی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اتنے میں میری نگاہ اُس طرف اُٹھ گئی جہاں میں نے ہرنوں کو پانی پیتے دیکھا تھا لیکن اب وہاں ہرن نہیں تھے بلکہ اُن کی جگہ ایک خوفناک مگرمچھ منہ کھولے میری طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا بلکہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ بھی رہا تھا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ مگرمچھ نہیں بلکہ میری موت ہے جو قدم بہ قدم میری طرف رینگتی آ رہی ہے۔ اُس کی بجائے اگر وہ کوئی درندہ ہوتا تو شاید میری حالت اتنی خراب نہ ہوتی کیونکہ وہ درندہ مجھے شکار کرنے کے لیے دلدل میں اُترتا تو خود بھی اس میں دھنس کر رہ جاتا لیکن یہ مگرمچھ تو کنارے پر رہ کر میری گردن اپنے لمبے جبڑے سے دبوچ سکتا تھا۔ اس کے آرا نما جبڑے سے چبائے جانے کے تصور سے مجھے جھرجھری آ گئی اور سر میں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔

مگرمچھ لحظہ بہ لحظہ میرے قریب تر آتا جا رہا تھا اور دلدل آہستہ آہستہ مجھے نگل رہی تھی۔ اچانک مجھے تیر کمان کا خیال آ گیا۔ میرے ہاتھ دلدل کی گرفت سے آزاد تھے۔ میں نے ترکش کا جائزہ لیا۔ اس میں چار تیر باقی تھے۔ میں نے ایک تیر چلّے میں چڑھایا اور اپنی طرف بڑھنے والے مگرمچھ پر چلا دیا۔ وہ اُس کی گردن میں لگا لیکن مگرمچھ کو آگے بڑھنے سے نہ روک سکا۔ میں نے دُوسرا تیر چلایا جو اُس کی اگلی ٹانگ میں پیوست ہو گیا لیکن مگرمچھ پھر بھی آگے بڑھتا رہا۔ اب میرے پاس صرف دو تیر باقی رہ گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر تیسرا تیر مگرمچھ کی آنکھ میں ترازو ہو جائے تو شاید میری طرف بڑھتی ہوئی موت کے قدم رک جائیں۔ میں نے اللہ کا نام لے کر تیسرا تیر چلّے میں چڑھایا اور مگرمچھ کے مزید قریب آنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ نشانہ خطا ہونے کا احتمال نہ رہے اور جب مگرمچھ قریب تر آ گیا تو میں نے خوف اور سر درد کے مارے کانپتے ہاتھوں سے تیر چلا دیا جو اُس کی آنکھ میں پیوست ہو گیا۔

مگرمچھ ایک لمحے کے لیے رُکا، اُس نے بڑے زور سے اپنی دُم زمین پر پٹخی اور ایک طرف گھومنے لگا۔ میں سمجھا کہ بلا ٹل گئی لیکن وہ بدبخت مجھے اپنی دُوسری آنکھ سے دیکھنے لگا اور پھر حالتِ غیظ میں میری طرف بڑھا تو مجھے چلّے میں تیر چڑھانے کا موقع بھی نہ مل سکا اور وہ میرے ہاتھوں ہی میں رہ گیا۔ اب اُس کا جبڑا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ موت میری آنکھوں میں رقص کرنے لگی۔ جبڑا میرے قریب تر آنے لگا اور جُونہی اُس نے مجھے دبوچنا چاہا، میں نے لاشعوری طور پر تیر اُس کے کھلے جبڑے میں سیدھا اڑا دیا۔ مگرمچھ نے جبڑا بند کرنا چاہا تو تیر کی نوک اُس کے تالو میں گڑ گئی اور تیر بیچ سے ٹوٹ گیا لیکن اب اُس کا اُوپری حصّہ بھی اسے چبھنے لگا جس سے بے تاب ہو کر وہ مچلنے تڑپنے لگا۔ ذرا سی طرح پیچھے ہٹ گیا مگر اس وقت تک خوف و دہشت اور سر درد نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور پھر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں لامتناہی خلا میں ڈوبتا جا رہا ہُوں

● جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ایک آرام دہ بستر پہ پایا۔ ساتھ ہی مجھے آفندی کی آواز آئی "کیسے ہو بیٹے؟"

میں نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ میرے بائیں جانب آقائے آفندی کُرسی پر بیٹھے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہوں جناب"۔

"خدا کا شکر ہے کہ کمپیوٹر تباہ ہونے سے پہلے تم واپس آ گئے"۔

"کیا؟... کیا کمپیوٹر تباہ ہو گیا؟" میں نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹے۔ مگر تم لیٹے رہو"۔

"مگر... مگر وہ کیسے تباہ ہو گیا؟"

"اس کے سرکٹ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ پروردگار کا احسان ہے کہ تمھاری واپسی کے بعد اس میں آگ لگی ورنہ شاید میں ڈاکٹر فرید دل کو قتل کر دیتا"۔

"ڈاکٹر فرید دل کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کمپیوٹر کی تباہی کے صدمے سے بیمار ہو گیا ہے"۔ آفندی نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب میں کچھ عرصے تک ماضی کے سفر پر نہیں جا سکوں گا"۔

"کچھ عرصے تک نہیں، ہمیشہ کے لیے بیٹے۔ اب تم ہمیشہ یہیں رہو گے جو چاہو گے کر سکو گے۔ محکمے کی طرف سے تمھیں اتنی رقم مل جائے گی کہ ساری زندگی عیش و آرام سے بسر کر سکتے ہو"۔

"لیکن اب زندگی میں رہ ہی کیا گیا ہے آقائے آفندی"۔

"تمھیں یہ معلوم نہیں کہ قتل کے جس مقدمے میں تمھیں سزائے موت دی گئی تھی وہ ختم ہو چکا ہے۔ تمھیں باعزت بری کر دیا گیا ہے اور اصلی قاتل کو سُولی پر لٹکے بھی مدت گزر گئی ہے"۔

"اوہ... یہ کب ہوا، کیسے ہوا؟"

"تمھاری داستان سننے کے بعد ہمارے محکمے نے پولیس کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس کیس کی ازسرِنو تفتیش کرے۔ تمھیں اس سلسلے میں جان بوجھ کر بے خبر رکھا گیا تھا مگر اب جب تمھیں ریٹائر کیا جا رہا ہے تو تمھیں اس حقیقت سے آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ تم بلاخوف و خطر آزادانہ زندگی بسر کر سکو۔ اپنا گھر بساؤ اور وہ ساری باتیں بھول جاؤ جنھوں نے تمھاری زندگی میں تلخیوں کا زہر گھول دیا تھا"۔

"کاش ایسا ہو سکتا"۔ میں نے جواب دیا اور آنکھیں موند کر سوچنے لگا کہ میں نے لالہ رُخ کے ساتھ گھر بسانے کے کتنے خوبصورت خواب دیکھے تھے۔ آرزوؤں کے کتنے تاج محل تعمیر کیے تھے مگر ہر خواب لُٹ گیا۔ ہر تمنا برباد ہو گئی۔ تقدیر بھی کتنی ظالم ہے کہ پہلے تو دل میں چاہتوں کے گلاب کھلاتی ہے پھر جدائی کی آندھیوں سے ان کی ایک ایک پنکھڑی بکھیر دیتی ہے۔

● ہسپتال سے نکلنے کے بعد میں سیدھا اپنے مدرسہ اسکول آیا جو مدتوں سے بند پڑا تھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو گزرے وقت کی ایک ایک یاد ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگی۔ وہی در و دیوار، وہی ساز و سامان تھا لیکن وقت بدل گیا تھا۔ ساتھی بچھڑ گئے تھے، خواب بکھر گئے تھے۔ صرف یادیں باقی رہ گئی تھیں۔ میں ایک گرد آلود کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ خدا قادرِ مطلق ہونے کے باوجود گزرا ہوا وقت نہیں لوٹاتا۔ کیوں؟ کیا وقت پر اس کا حکم نہیں چلتا؟ ابھی میں اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے لالہ رُخ کھڑی تھی۔

"لالہ رُخ تم؟... تم یہاں کیسے آ گئیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا

"تمھارے پاس آئی ہوں سرفروش"۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا تم مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہو گے؟"

"ہاں ہاں بیٹھو"۔ میں کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن... لیکن..."

"میں جانتی ہوں، تم کیا پوچھنا چاہتے ہو اور اس کا جواب یہ ہے کہ میری شادی نہیں ہوئی تھی"۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں نے عین وقت پر شادی سے انکار کر دیا تھا"۔

"مگر کیوں؟"

"اس سوال کا جواب اپنے دل سے پوچھو۔ اگر وہ جواب نہ دے سکے تو میں چپ چاپ چلی جاؤں گی"۔

"وہ جواب میں جانتا ہوں لالہ رُخ۔ یہ بتاؤ کہ ہم شادی کب کر رہے ہیں؟"

"اس کا جواب بھی اپنے دل سے پوچھو"۔

"وہ تو کہتا ہے کہ آج بلکہ ابھی"۔

"تو تم اپنے دل کا کہنا کیوں نہیں مانتے؟"

"ضرور مانوں گا۔ اب اتنا اور بتا دو کہ تم یہاں کیسے آ گئیں؟ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ آج، اس وقت میں یہاں ہوں؟"

لالہ رُخ کچھ دیر سوچتی اور مسکراتی رہی پھر بولی: "انھوں نے تو منع کیا تھا مگر میں تمھاری بات میں نہیں ٹال سکتی۔ مجھے انکل آفندی نے بتایا تھا"۔

"اوہ... تو آؤ... وہی ہمارا نکاح پڑھوائیں گے"۔ یہ کہہ کر میں نے لالہ رُخ کا ہاتھ تھاما اور جاتے ہوئے رُک کر بولا: "ایک بات اور بھی سُن لو لالہ۔ خدا گزرا ہوا وقت تو نہیں لوٹاتا مگر وہ گزرے وقت کی رُوٹھی ہوئی خوشیاں ضرور لوٹا دیتا ہے"۔